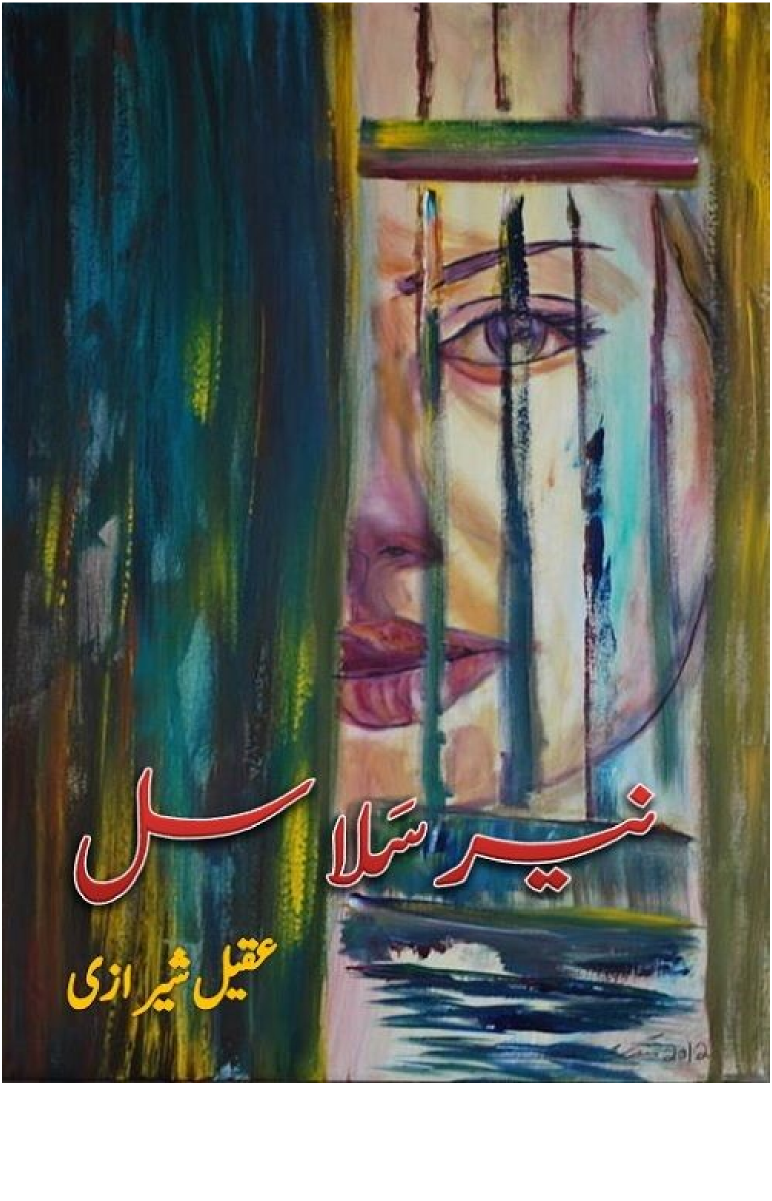
زیر سَلاسل
عقیل شیرازی

ناول

عقیل شیرازی

نیر سلاسل

وہ کلاس روم داخل ہوا تو استاد ڈائس پہ کھڑا لیکچر دے رہا تھا۔

اسے دیکھ کر استاد نے تیوری چڑھائی تو پوری کلاس ان کی نگاہ کے تعاقب میں مڑ کر دیکھنے لگی۔

'کیا میں آسکتا ہوں سر؟' سب کی نظروں سے خائف ہوئے بغیر وہ اعتماد سے بولا۔

اس کی بھاری مردانہ آواز کمرے میں گونجی اور کئیوں کو متاثر کر گئی۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے کھڑا تھا۔

'آپ اندر آ چکے ہیں مسٹر۔۔۔ اب تشریف رکھیں اور آئیندہ دیر سے آنا ہوا تو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پوری کلاس تو ڈسٹرب کر دی آپ نے۔' استاد نے جواباً سختی سے کہا اور اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

'جی بہتر سر۔ آج کیلیے میں معذرت خواہ ہوں۔ دوبارہ ایسی کوتاہی نہیں ہوگی۔' مودب لہجے میں کہہ کر اس نے جگہ کے لیے متلاشی نگاہ دوڑائی اور پھر آخری رو میں ایک خالی نشست دیکھ کر بیٹھ گیا۔

کلاس کے باقی طلباء اس کی شاندار شخصیت اور پر اعتماد انداز سے متاثر دکھائی دیے۔ وہ استاد سے یوں مخاطب ہوا تھا گویا کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی موجود ہی نہ ہو۔

لڑکیوں کے ساتھ ساتھ کلاس کے لڑکے بھی اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے لیکن وہ کسی پہ دھیان دیئے بغیر استاد

کی جانب متوجہ تھا۔

چمکتا ہوا سفید، بے داغ چہرہ بالکل جامد اور ذہانت سے پر اس کی خوبصورت آنکھیں ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھیں۔ چونکہ وہ لیٹ پہنچا تھا لہٰذا اس کی آمد سے کچھ دیر بعد ہی کلاس برخاست کر دی گئی۔ طلباء کتب اور بیگ اٹھائے باہر جانے لگے۔ ان میں سے چند اب بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اگلی کلاس اب ڈیڑھ گھنٹے بعد تھی۔

استاد ڈائس سے ہٹ کر اس کے پاس پہنچا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

'السلام وعلیکم سر۔۔۔

IamSafeerAhmad......

اس نے مصافحے کو ہاتھ بڑھایا۔

'وعلیکم السلام'۔۔۔ اسے کھڑا دیکھ کر استاد رک گیا تھا۔ 'اور کل کی کلاس میں جلدی آنا سارا لیکچر تو مس کر دیا تم نے۔۔۔' استاد نے اس کا مصافحے کو بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

'جی بہتر سر۔ مجھے بھی افسوس ہے۔' سفیر نے جواباً کہا۔

اس کا فرمانبردار انداز استاد کو بے حد بھایا۔

'ایک منٹ رکو بیٹا......' انہوں نے قریب سے گزرتی لڑکی کو اچانک اس طرح مخاطب کیا کہ وہ چونک کر حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

'بیٹا انہیں آج کا لیکچر نوٹ کروا دو۔ آپ سب سے پہلے کلاس میں موجود تھیں تو یقیناً سارا لیکچر نوٹ کیا ہوگا آپ نے۔' استاد نے گویا اس لڑکی کو حکم دیا تھا۔

لڑکی جو کہ سوالیہ نظریں لیے استاد کو دیکھ رہی تھی یکبارگی سفیر کو دیکھنے لگی۔

اور وہ اس دوران پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے بے پرواہی سے کھڑا رہا۔

"اوکے سفیر۔۔۔ اچھا بیٹا۔۔۔ لازمی نوٹ کروا دینا۔ خدا حافظ" لڑکی کے کسی جواب سے پیشتر استاد نے باری باری انہیں دیکھتے ہوئے کہا اور چلے گئے۔

اب وہاں صرف سفیر اور وہ لڑکی موجود تھے۔ وہ استاد کی لگائی ذمہ داری نبھانے کو وہاں رک تو گئی لیکن اس کے چہرے پہ جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔

سفیر جھک کر اپنے بیگ میں کتاب اور نوٹ بک ڈالنے لگا۔

وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا کہ اس کے ہر انداز سے لوگوں کے لیے بے نیازی جھلکتی تھی۔

'ہیلو مسٹر۔۔۔ میں ثومیہ ہوں۔ ثومیہ شاہ جہاں' ثومیہ کو بھی اس انداز کھلا تھا لیکن پھر بھی وہ تعارفی رسم نبھانے لگی۔

'Hisomia۔۔۔M safeer ahmad۔'

بیگ شولڈر پہ لٹکاتا وہ سیدھا ہوا تھا۔

"اور ثومیہ شاہ جہاں کافی ہیوی ویٹ نام نہیں کیا؟؟؟ یوں لگتا ہے کوئی مغلیہ شہزادی تاریخ کے ورق الٹ کر پلٹ آئی ہو۔۔" اپنے تعارف کے ساتھ اس نے ثومیہ کے نام پہ خوش دلی سے تبصرہ کیا۔ اس کے پہلے انداز و اطوار کے برعکس اب اس کا رویہ دوستانہ تھا اور ہونٹوں پہ خوش رنگ خفیف مسکراہٹ بھی۔

اس کی بات پہ وہ ساری کوفت بھول کر بے ساختہ ہنس پڑی۔ ثومیہ کو بظاہر اکھڑ دکھنے والے اس لمبے چوڑے لڑکے سے اس لطافت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

'اچھا میں اگر نام سے مغلیہ شہزادی لگتی ہوں تو یہ ان سینس ایک تعریف ہے۔ کبھی خود کو نہیں دیکھا؟ بنا تاثر چہرے کے ساتھ روبوٹ لگتے ہو۔ کلاس میں یوں اکڑے ہوئے داخل ہوئے تھے گویا کوئی سیکیورٹی گارڈ آیا ہو۔' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

اجنبیت کی دیوار ایک منٹ میں ڈھے گئی تھی۔ بے ساختگی سے کہتی ثومیہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ ایسا کوئی نہیں تھا جو اس کی پرسنیلٹی سے خائف نہ ہوتا ہو۔ لوگ عموماً اس کے رعب میں آ کر اس سے بات کرنے سے کتراتے تھے۔ یہ پہلی فرد تھی جس نے اس پر یوں بلا جھجک تبصرہ کیا تھا۔۔۔

سیکیورٹی گارڈ؟؟ وہ بڑبڑایا۔۔

یہ وہ آخری لفظ بھی نہیں تھا جو میں کسی سے اپنے بارے منفی طور سننے کی توقع کرتا۔۔۔ سفیر نے سوچا اور

ہولے سے مسکرا دیا۔

اچھا اب کینٹین چلتے ہیں۔میں نے ناشتہ نہیں کیا اور وہیں لیکچر بھی نوٹ کرلوں گا۔وہ عادتاً حکمیہ لہجے میں بولا۔

نہیں۔۔۔سٹوڈنٹس ڈیسک میں بیٹھتے ہیں۔وہاں تم لیکچر نوٹ کرلو اور پھر اکیلے کینٹین جانا۔میں اپنے فارغ وقت میں کچھ پڑھنا چاہتی ہوں۔اس کی بات کو رد کرکے ثومیہ نے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

اوہ۔۔۔ایٹی ٹیوڈ۔۔سفیر نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑے اور اس کے پیچھے چل دیا۔۔۔

☆......☆......☆

کچھ فاصلہ رکھ کر چلتے وہ دونوں سٹوڈنٹس ڈیسک میں آگئے۔

'یہ لو جناب اور جلدی لکھو لیکچر سارا۔پھر مجھے اس پہ کچھ نوٹ کرنا ہے۔'ثومیہ نے ایک نشست سنبھالی اور نوٹ بک اس کی جانب بڑھائی۔

وہ اس سے دو کرسیاں چھوڑ کر بیٹھا اور نوٹ بک پکڑ کر ورق پلٹنے لگا۔۔۔

اتنی گندی ہینڈ رائٹنگ کو سمجھ کر جس قدر ممکن ہوا جلدی لکھنے کی کوشش کروں گا۔بے پرواہی سے کہتا وہ سائیڈ پر رکھے اپنے بیگ سے پین اور نوٹ بک نکالنے کو مڑا۔

ثومیہ کی نوٹ بک کرسی کے ہتھے پر اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔

'اچھا یہ بات ہے۔چلو پھوٹو پھر شاباش۔میں سر سے کہہ دوں گی کہ جناب کو میری ہینڈ رائٹنگ سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔'ثومیہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی نوٹ بک جھپٹ لی۔

سفیر نے تیزی سے اس کا ہاتھ روکنا چاہا لیکن تب تک وہ نوٹ بک پر قبضہ جما چکی تھی۔وہ خفیف مسکرایا۔

'Hay look۔۔۔m sorry۔I was just kidding۔'

وہ معذرت خواہ تھا۔۔۔

'تمہاری رائٹنگ بہت اچھی ہے لیکن مجھ سے زیادہ نہیں۔'

عجیب معذرت کہ جس میں اپنی بڑائی شامل تھی۔

ثومیہ کے لیے یہ لڑکا حیران کن تھا۔اس نے بغور اس کی دلکش مسکراہٹ دیکھی۔

اچھا یوں پہلی ملاقات میں ہی تم ہنسی مذاق کرنے لگے ہو؟؟ کیا میں خود کو سپیشل سمجھوں یا یہ عنائیت سب پہ ہوتی ہے؟؟ وہ سنجیدہ لیکن طنزیہ لہجے میں پوچھنے لگی۔۔۔

سفیر کی شہد رنگ آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری اور شرارت کی ہلکی سی جھلک دے کر معدوم ہو گئی۔۔۔

'تو گویا تمہیں یقین ہے کہ ہماری دوسری، تیسری اور لگا تار ملاقاتیں ہوں گی اب؟؟؟ اور مجھے مذاق کے لیے ان کا انتظار کرنا چاہئیے؟ اور آج کے لیے تو تم ہی خود کو خوش قسمت سمجھو۔۔۔ کیونکہ یہ عنائیت میں واقعی سب پہ نہیں کرتا۔۔'

وہ دوبدو لہجے بولا اور نوٹ بک کے لیے ہاتھ بڑھایا۔۔۔اس کا ہر انداز حد کمال تک پر اعتماد تھا۔

ثومیہ وقتی طور پر چپ ہو گئی۔اس بات کو طول دینا اس نے غیر مناسب سمجھا۔اور نوٹ بک اسے تھما دی۔

'میری ہینڈ رائٹنگ گندی ہی سہی۔لیکن تمہاری کیسی ہے یہ بھی ابھی پتا لگ جائے گا۔' ثومیہ کا انداز اکسانے والا تھا۔

سفیر دونوں نوٹ بکس اوپر نیچے رکھے مطلوبہ پیج نکال کر نقل کرنے لگا۔

ثومیہ اچک کر نوٹ بک پر چلتا اس کا قلم دیکھنے لگی۔بلاشبہ اس کی ہینڈ رائٹنگ اچھی تھی اور ثومیہ کو بھی خود سے بہتر لگی۔وہ سیدھی ہو کر کوئی کتاب کھول بیٹھی۔لیکن سفیر کے متعلق سوچتی رہی۔وہ اسے سمجھ نہیں سکی تھی۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

'تم شکل سے اتنے روڈ کیوں لگتے ہو؟ باتیں تو نارمل ہیں تمہاری۔۔ کلاس میں بھی یوں آئے تھے گویا میدان جنگ میں داخل ہوئے ہوں۔' کتاب سے نگاہ ہٹا کر ثومیہ نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔

'چہرہ ہی ایسا ہے میرا۔اب کیا کروں؟ اور میدان جنگ میں ایسی تیاری اور حالت میں کون بیوقوف اترتے ہیں؟ لگتا ہے تم نے کبھی کوئی جنگی فلم نہیں دیکھی۔مصروف انداز میں لکھتا وہ سر اٹھائے بغیر بولا۔

اس جواب سے ظاہر تھا کہ اسے اپنی صورت کے خوب تر ہونے کا ادراک بھی ہے۔

ثومیہ اس کا انداز غفلت دیکھتی رہی۔

'تم کسی قدر مغرور اور خود پسند لگتے ہو مجھے۔لیکن کلاس میں سر کے ساتھ تمہارا رویہ بہت اچھا اور مودبانہ تھا۔' وہ سادگی سے بولی اور اپنے تجسس کو لفظ دینے لگی۔

سفیر نے سر اٹھایا اور اس کے چہرے پہ نظریں گاڑ دیں۔

ثومیہ کا نرم خوانداز جانچ کر وہ لفظ ترتیب دینے لگا۔

لگتا ہوں گا۔لیکن میں خود پسند نہیں ہوں۔۔۔بالکل بھی نہیں۔۔اور رویہ تمہارے ساتھ کیا غلط ہے میرا؟؟ پین اس نے نوٹ بک پہ چھوڑ دیا تھا۔

ثومیہ نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔یہ ایک بے اختیاری عمل تھا۔وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

ہاں تم مجھے خود شناس کہہ سکتی ہو۔الحمدللہ مجھے اپنی ذات پہ مکمل بھروسہ ہے۔اور یہ غرور جو ہے نا؟؟ یہ صرف خدا کو زیب دیتا ہے۔ہم انسان ہیں اور ہمیں بس اپنی پہچان ہونی چاہیئے۔ایک یقین سے کہہ کر وہ دوبارہ نوٹ بک پر جھکا اور لکھنے لگا۔

ثومیہ نے ہونٹ بھینچ کر پل میں دھوپ چھاؤں ہوتے اس لڑکے کو دیکھا اور پھر سر جھٹک دیا۔

" کبھی کبھی ہم مضبوط بنتے تعلقات پہچاننے میں بہت دیر کر دیتے ہیں۔۔۔"

وہ اب تک اسے "سفیر" سے زیادہ "ایک لڑکا" سوچ رہی تھی......۔

☆......☆......☆

وہ آج پھر دیر سے جاگا تھا۔اسے کل پروفیسر سے کیا گیا اپنا جلدی آنے کا وعدہ یاد آیا تو تیزی سے اٹھا اور یونیورسٹی جانے کی تیاری میں جت گیا۔

آئینے کے سامنے کھڑا بال بناتا وہ رخ موڑ کر دیوار گیر گھڑی سے برابر وقت بھی دیکھ رہا تھا اور بال تھے کہ سنور ہی نہیں رہے تھے۔آخر بارہ منٹ کی محنت رنگ لائی اور ہیئر برش چھوڑ کر اس نے قد آور آئینے میں اپنے وجود کا تنقیدی جائزہ لیا۔مضبوط کسرتی جسم پر بلیک ڈریس پینٹ اور ٹائیٹ سکائی بلیو شرٹ اس کی جسامت کا ہر انگ نمایاں کر رہی تھی۔گلے میں جھولتی ڈارک بلیو سلم ٹائی اور پاؤں میں نوکدار برانڈڈ نیو شوز کی جوڑی اسے طالب علم کی بجائے کوئی بینک جاب ہولڈر ظاہر کرتی تھی۔گھنیری پلکوں کی جھالر تلے خوبصورت گہری آنکھوں

میں بسا دلکش خمار دیکھنے والوں کو نظر چرا لینے پر مجبور کر دینے والا تھا تو لال ہونٹوں کی خوش رنگ گلال دھاریں، اور سفید رنگت میں بسی کھلتی ہوئی ایک عجب سی جاذبیت اس کی مردانہ وجاہت میں بے پناہ اضافے کا باعث تھیں۔

تیاری سے مطمئن ہو کر اس نے پرفیوم سپرے کیا اور خوشبوؤں میں بسا باہر نکل آیا۔

آنکھوں میں مخصوص چمک لیے پر اعتماد و متوازن چال چلتا بلاشبہ وہ بہت مکمل اور بھرپور مرد لگتا تھا۔

"رک سفیر کچھ کھا تو لے بیٹا۔۔۔یوں بھوکا چلا جائے گا کیا؟؟"

وہ برآمدہ عبور کر کے صحن میں آیا تو ذکیہ خاتون پانی کا پائپ لیے راستے میں کھڑی تھیں۔حسب معمول وہ صبح صبح صحن دھو کر فارغ ہوئی تھیں اور اب پائپ لپیٹتے اسے پکارا تھا۔

"نہیں ماما۔آلریڈی بہت لیٹ ہو گیا ہوں۔کل بھی انسلٹ ہوئی دیر ہونے کے باعث۔آپ پریشان مت ہوں میں وہیں سے کچھ کھا لوں گا۔"

اس نے رک کر ان کا ماتھا چوم کر کہا اور جانے کے لیے تیزی سے مڑا۔

"اچھا رک تو سہی بیٹا۔میری بات سن۔"انہوں نے پھر سے پکارا۔۔۔

"جی ماما۔۔۔جلدی پلیز۔۔۔بہت دیر ہو گئی۔"

وہ جوان سے ہٹ کر چند قدم ہی طے کر پایا تھا وہیں کھڑا کھڑا سوالیہ نظریں لیے انہیں دیکھنے لگا۔

"دیکھ بیٹا آج دوسرا دن ہے یونیورسٹی کا تو وہاں دوست بنانے کی کوشش کرنا۔تیرا کوئی دوست نہیں ہے۔ہر وقت اکیلا گھر میں پڑا رہتا ہے۔تیری عمر کے لڑکوں کے سو مشاغل ہوتے ہیں ایک ساتھ۔"

وہ پائپ چھوڑ کر اس کے قریب چلی آئیں اور پیار سے اس کے گالوں کو چھو کر کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اف۔۔ماما؟؟صرف یہ کہنے کو روکا آپ نے مجھے؟"

وہ یک دم چڑ گیا۔

"ماما میں کیا دوست بناؤں کہ کسی کو بھی مجھ سے مرعوبیت برتنے کے سوا کوئی رویہ رکھنا آتا ہی نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ یک دم چپ کر گیا۔

وہ حیرانی سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھنے لگیں۔

سفیر کی نظروں میں کل ثومیہ سے ملاقات و گفتگو کا منظر گھوما تو اس کی چہرے پر لکیر فکر کے بعد ایک خوش کن مسکان ابھری۔ اب تک اس کی زندگی میں ثومیہ پہلی فرد تھی جو اسے خود سے مرعوب دکھائی نہیں دی۔ اس کا اعتماد سفیر کو اچھا لگا تھا۔

" کیا خود ساختہ تخیل میں رہتا ہے تو سفیر۔ مجھے بڑی فکر ہے تیری۔ تو دوست بنائے گا تو بنے گا نا کوئی؟؟ پتھریلا چہرہ لیے الگ تھلگ بیٹھے رہو گے تو کون نزدیک آئے گا تمہارے؟ تم خود کو کچھ تبدیل کرو بیٹا۔ اپنے تاثرات میں لچک پیدا کرو۔ جیسا تمہارا رویہ و انداز ہوتا ہے اپنے سب کزنز کو بھی مغرور لگتے ہو تم۔ سب شکایت کرتے ہیں۔"

ان کی بات پر وہ اب کھل کر مسکرایا۔

"اوکے ماما۔۔۔ میں کوشش کروں گا ویسا بننے کی جیسا آپ چاہتی ہیں۔ فی الحال میں جاؤں؟؟"

انہیں تسلی دے کر سوالیہ انداز میں کہتا، ان کا جواب سنے بغیر وہ مڑا اور تیزی سے بیرونی دروازہ پار کر گیا۔

" کتنی بے سکونی ہے اس کی طبیعت میں۔ ہر وقت افراتفری میں رہتا ہے۔ لو بھلا اب میں پیچھے سے کھپتی رہوں گی کہ کچھ کھا کر نہیں گیا۔ یا اللہ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ پیدا کر۔ اسے تھوڑا دھیرج کر۔"

اس کے بعد پائپ سمیٹتی وہ تسلسل سے بڑبڑا رہی تھیں۔۔۔

☆......☆......☆

داخلی سیڑھیاں چڑھ کر طویل راہداری کو تیزی سے عبور کرتا وہ کلاس روم کی جانب بڑھنے لگا۔ راہداری کی بڑی بڑی کھڑکیوں کی سل پر بیٹھے طلبا اور ٹولیاں بنائے کھڑی خوش گپیوں میں مصروف طالبات نے اسے بصد شوق پلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر ان سب کی ستائشی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ اپنی دلکش شہابی شخصیت و پر اعتماد انداز و اطوار سے وہ ناقابل تسخیر اور ناقابل رسائی دکھتا تھا۔ اس کی آمد پر جیسے باقی سب فضول لگنے لگا۔ ہر کوئی اپنا موضوع و متن چھوڑ کر اس کی دید میں گم تھا۔ ان سب کی توجہ سے بے نیاز ہو کر وہ کلاس روم کے دروازے پر رکا اور مڑ کر ایک نگاہ غلط سب پر دوڑائی۔ اس کی شوخ نظروں سے نکلتی حرارت کی لپٹوں سے ہر کوئی ہڑبڑا کر ایک دوسرے میں مگن ہو گیا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور دروازہ کھول کر کلاس روم میں داخل ہو گیا۔

پروفیسر ابھی تک نہیں پہنچا تھا اور کلاس میں شوروغل کی فضا تھی۔ سفیر کی آمد کے ساتھ ہی یکبارگی خاموشی طاری ہوئی۔ اس کی شخصیت کا سحر تھا کہ کوئی کن انکھیوں سے تو کوئی براہ راست فقط اس کے صبیح و تازہ چہرے کی دید میں گم ہو گیا۔

وہ بے وجہ کھنکارا تو سب کی محویت ٹوٹی اور کئی ایک نے غیر محسوس انداز میں کھسک کر اسے خالی نشست فراہم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اطراف میں ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی اور پھر اس کی نظر ایک رو میں ٹک گئی۔ اس رو میں ثومیہ دو لڑکیوں کے درمیان بیٹھی ماحول سے بے نیاز ہو کر کتاب بینی میں مگن تھی۔ وہ متوازن چال چلتا ان تینوں کے سر پر پہنچا تو ثومیہ کے علاوہ باقی دونوں لڑکیاں اسے نرم مسکراہٹ دے کر دیکھنے لگیں۔

"السلام وعلیکم۔۔۔کیا آپ مجھے اس نشست سے نواز سکتی ہیں؟؟"

ان میں سے ایک کو مخاطب کر کے وہ احتراماً بولا۔

"جی۔۔۔"

لڑکی حیرت سے بولی۔ شاید وہ اس بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ ثومیہ نے بھی چونک کر سر اٹھایا لیکن کچھ کہے بغیر ماتھے پر لکیر فکر لیے اسے دیکھنے لگی۔

"یس پلیز۔۔۔دراصل میں ثومیہ کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی اگر آپ مجھے ان کے ساتھ جگہ فراہم کر دیں۔" اس نے جواباً وضاحت کی۔

"اٹس اوکے تشریف رکھیے"۔۔۔

وہ شولڈر بیگ، کتب اور دیگر اشیا سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ شکریہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ پوری کلاس ان کی طرف متوجہ تھی۔ سفیر کا خاص کر ثومیہ کے ساتھ بیٹھنے کا اصرار کرنا ایک بار سب کو متجسس کر گیا۔

ثومیہ نے ایک نگاہ سب کی متجسس و حیران نظروں پر کی اور اسے بیٹھتا دیکھ کر خاموشی سے اپنی کتاب پر دھیان کر لیا۔

"ہائے۔۔۔کیسی ہو مس؟؟ موڈ ٹھیک نہیں لگ رہا تمہارا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ موڈ کیوں خراب ہے تمہارا؟؟"

ایک بازو کا ٹھوکا دے کر اس نے ثومیہ کو یوں مخاطب کیا گویا ازلی واقفیت ہو۔اس بے تکلفانہ عمل پر جہاں ثومیہ نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا وہیں پوری کلاس میں دبی دبی ہنسی وسرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے سفیر؟؟ یہ کیا طریقہ ہے صبح صبح کلاس میں سنسنی پھیلانے کا۔آتے ساتھ میرے ساتھ بیٹھنے کی فضول ضد۔پھراب یہ بے تکلفی۔کیا مطلب ہے اس سب کا؟ رہی بات موڈ کی تو ایسا ہی ہوتا ہے موڈ میرا ہمیشہ۔۔۔اٹس نارمل ۔۔انڈراسٹینڈ۔اور پوچھ سکنے کی بھی خوب کہی کہ تمہیں اجازت درکار ہی کب ہوتی ہے کسی کام کے لیے۔۔۔ہونہہ"

اس نے تپ کر تفصیلاً جواب دیا تو اردگرد دیکھتا وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

"Oh۔۔۔u mean this۔"

اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"بات یوں ہے کہ تم سے کل کی اچھی انڈراسٹینڈنگ ہو چکی ہے اس وجہ سے میں نے تمہارے ساتھ بیٹھنا چاہا۔ہاں اس معاملے میں کوئی ضد بالکل نہیں کی میں نے۔وہ منع کر دیتی تو میں کہیں بھی بیٹھ جاتا۔جہاں تک بے تکلفی کی بات ہے تو معذرت کہ میرا یہ نارمل انداز ہے۔خصوصاً تمہارے لیے نہیں اپنایا۔اب مزید اس کی کیا وضاحت دوں؟"

سادہ ونرم لہجے میں صفائی دیتا وہ اتنی معصومیت سے بولا کہ ثومیہ کا غصہ ہوا ہو گیا۔ایک ہلکی مسکراہٹ دے کر خاموشی سے وہ آس پاس سٹوڈنٹس کو دیکھنے لگی جو اب اپنی اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

"یہ کلاس میں سنسنی پھیلانے کی بھی خوب کہی۔یہاں تو مجھے لگتا کہ میرے کسی عمل سے نہیں بلکہ میری موجودگی اور ہونے سے بھی سنسنی پھیل جاتی ہے۔سب یوں ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں کہ مجھے لگتا ماما ٹھیک ہی روز نظر اتارتی ہیں میری۔"

خوشگواریت سے اس نے اگلی بات کی تو وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔یہ بات تو اس نے بھی نوٹس کی تھی کہ یہاں لڑکے لڑکیاں سب اس کی شخصیت سے متاثر ہیں اور اس پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔اگر وہ ان کے طرز عمل پر ردعمل میں ایسا سوچتا تھا تو حق بجانب تھا۔

" کچھ زیادہ ہی خوش فہم ہو، ایسے بھی کوئی حور پرے نہیں ہو تم اچھا۔ تمہیں کل بھی کہا تھا کہ مغرور ہو تم۔"

وہ اس کی تائید کر کے اسے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا کل کی بات دہرا دی۔

" ہیں؟؟ حور پرا؟؟ یہ بھی کوئی لفظ ہوتا ہے کیا؟ ہاہاہا۔"

وہ بے ساختہ ہنسا تو ثومیہ اس کے خوش رنگ لبوں کے دلکش کٹاؤ اور ان کے نرم کناروں سے پھیلتی خوبصورت مسکراہٹ میں کھو گئی۔ بلاشبہ اس کی مسکراہٹ باندھ لینے والی تھی۔

"اور کل بھی کہا تھا تمہیں کہ میں خوش فہم نہیں خود شناس ہوں۔ مغرور ہوں نہیں بس لگتا ہوں سب کو۔ اور یہ میرے 'ہونے' کی بجائے سب کی 'سمجھ' کی غلطی ہے۔"

اعتماد سے کہتا وہ پھر بڑا بے نیاز لگا اسے۔ اس کی بات پر وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

" میرے خیال سے تم سے بحث کرنا فضول ہے۔ تم سمجھتے ہی نہیں کہ جب تک تم اپنے تاثرات میں نرمی نہیں لاؤ گے تم مغرور ہی لگو گے۔ کل بھی تمہیں کہا تھا کہ الفاظ نہیں اپنا انداز بدلو۔ لوگ تمہارے قریب ہونے لگیں گے۔" وہ جھنجلاہٹ زدہ لہجے میں اسے یوں سمجھانے لگی گویا اسے یقین ہو کہ یہ سمجھانا ضائع جائے گا۔ اسے بالکل امید نہ تھی کہ وہ اس کی بات پر ذرہ بھر بھی توجہ کر کے سوچے گا۔

" میں سوچتا ہوں کہ جسے میرے قریب ہونا ہے وہ میرے اصل کے قریب ہو۔ میں کسی کو اپنا دوست بنانے کے لیے خود پر ملمع کاری کیوں کروں؟ جب میرا دل بھی صاف ہے، چہرے کے تاثرات و انداز و اطوار بھی بالکل نیچرل ہیں میرے۔ کچھ بھی بناوٹی نہیں تو میں بناوٹ کیوں کروں؟؟ کیوں کسی کو خود سے قریب کرنے کے لیے خود کو خود سے دور کر دوں؟؟ کوئی ایک وجہ دو مجھے؟؟ کہا نا کہ میں چاہتا ہوں جسے میرے قریب ہونا ہے وہ میری اصل کے قریب ہو۔"

جواباً سفیر نے اتنی سنجیدگی سے سوالات کیے کہ وہ اس کے افکار پر حیران رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس قدر گہرائی میں سوچتا ہے۔ وہ کیسے اختلاف کرتی کہ وہ اچھے سے جانتی تھی کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہر کسی کا اپنا اپنا مطمع نظر ہوتا ہے۔

" ہمم صحیح۔۔۔ یقیناً اس معاملے میں ہماری مینٹل اپروچ ڈفیرینٹ ہے۔ میں شاید یہ سوچتی ہوں کہ انسان

کودوسروں کے قریب ہونے کو اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنا پڑے تو اس میں حرج نہیں ہوتا۔ بہرحال تمہارا اپنا نکتہ نظر ہے۔ میں اس سے متفق نہ ہو کر بھی اس کا احترام کرتے ہوئے چپ ہونا چاہوں گی اور بس۔"

وہ خوش دلی سے بولی تو سفیر مسکرا کر رہ گیا۔

اردگرد طلبا سے بے نیاز ان دونوں کی یہ گفتگو طویل ہوتی شاید لیکن پروفیسر کی کلاس میں آمد پر سارا ردھم ٹوٹ گیا۔ اور انہیں سب کے ساتھ پروفیسر پر توجہ مرکوز کرنا پڑی۔۔۔

"اپنی اپنی ذات میں رہ کر اپنے اپنے نظریات کی کھوج اور تسکین میں گم وہ دونوں بالکل نہیں جانتے تھے کہ زندگی کی راہگزر پر کب الگ افکار و نظریات کے حاملین دو لوگ ایک ساتھ چلنے لگتے ہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ کہ زندگی تغیرات کا نام ہے۔ مختلف الخیال ہونا معنی نہیں رکھتا۔۔۔ یکجا دل ہونا مفاہیم کا حامل ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

کلاس برخاست ہونے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے کلاس روم سے باہر نکلے۔ سفیر نے دیکھا کہ ثومیہ دو لڑکیوں کے ساتھ مصروف گفتگو ہے تو خاموشی سے کچھ فاصلہ رکھ کر ان سے آگے چلنے لگا۔ اس کے رویے سے اسے لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہی ہے۔ اور وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگلا لیکچر اب ایک گھنٹے بعد تھا۔ راہداری کی احاطے میں جاتی سیڑھیوں پر رک کر وہ مڑا اور اب کافی پیچھے رہ جانے والی ثومیہ کو دیکھا۔ کچھ سوچ کر اس نے سر کو خفیف جنبش دی اور سیڑھیاں اتر کر درمیانی احاطہ تیزی سے کراس کرتا وہ کینٹین کی جانب بڑھا اور داخل ہو کر ایک خالی میز کا انتخاب کر کے بیٹھ گیا۔

سن گلاسز لگائے وہ اردگرد سے یوں بے نیاز بیٹھا تھا گویا اس کے سوا کوئی دوسرا یہاں موجود ہی نہ ہو۔

کچھ وقت گزرا کہ ثومیہ لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ کینٹین میں آ گئی۔ خوش گپیوں میں مصروف رہ کر اس کے بلند و بانگ قہقہے نے سفیر کو چونکا دیا۔

وہ سب اس سے تین میزیں چھوڑ کر بیٹھیں۔ سفیر نے کتاب نکالی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ اس نے بمشکل چار صفحات ہی پڑھے ہوں گے کہ وہ اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔

" کیا کر رہے ہو سفیر؟؟ لگتا ہے ٹاپ کرنے کا ارادہ ہے جناب کا جو کہ کینٹین میں بھی کتاب کھولے بیٹھے

ہو۔؟" وہ مسکرا کر بولی اور ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"ٹاپ بھی ان شاء اللہ ہو جائے گا اگر ہونا ہوا تو۔ فی الحال تو میں اس مقولے کی صحت جانچ رہا ہوں کہ جس میں سیانے کہتے ہیں کتاب بہترین ساتھی ہے۔"

جواباً کہہ کر اس نے کتاب بند کی اور بیگ میں رکھ دی۔

"تم بتاؤ بڑی مصروف رہی ہو اپنی نئی دوستوں کے ساتھ۔ اور اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ کھاؤ گی کیا تم؟"

خوشدلی سے پوچھ کر اس نے قریبی سروس بوائے کو پکار لیا۔ پھر باہم مشورے سے انہوں نے فقط سنیکس اور چائے آرڈر کی۔

"نئی دوستوں کی بات کر رہے ہو تو بات ایسی ہے کہ سن کر پہلے سے مغرور تم اور مغرور ہو جاؤ گے۔ لہٰذا جانے دو اس ذکر کو۔"

اس کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرایا۔

"یعنی بات چیت جو بھی ہوئی میرے متعلق تھی ہاں۔"

وہ سرسری لہجے میں بولا جیسے وہ اس سب کا عادی ہو۔ ثومیہ ایک لمبا سانس بھر کر رہ گئی۔

"ہاں دراصل انہیں مجھ سے زیادہ تمہیں جاننے میں انٹرسٹ تھا۔ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ بڑا ہینڈسم ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور ایک تو بولی کہ تمہارا کزن ہے شاید۔ اپنے اپنے اندازے سب کے۔ خیر دفع کرو ہم کوئی اور بات کریں کیا؟"

اس نے تفصیل بتائی اور پھر اکتاہٹ سے موضوع بدلنے کا کہا۔ ان کی باتوں پر وہ صرف مسکرا کر رہ گیا اور کوئی بھی مزید تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

"ہاں جی کیوں نہیں۔ کئی موضوعات ہیں۔ اپنے متعلق بتاؤ کہاں رہتی ہو تم؟ تمہارے علاوہ فیملی میں اور کون کون ہے؟ والدین کیا کرتے ہیں؟ یا ایسا کچھ بھی جو تعارف میں آتا ہو۔"

وہ سنجیدگی سے تفصیلی تعارف کی بابت دریافت کرنے لگا تو ثومیہ کو شائستگی سے اس کا موضوع بدل دینا اچھا لگا۔

"میں فتح گڑھ رہتی ہوں۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ نمرہ ابھی سیکنڈ ائیر میں ہے۔ مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ اور ماما

ہاؤس وائف ہیں سمپل جبکہ بابا ایک گورنمنٹ جاب پر ہیں واپڈا ڈیپارٹمنٹ میں۔اور ایسا کچھ نہیں ہے خاص تعارف میں۔اب تم بتاؤ اپنے بارے میں یہی سب۔"

تفصیلاً جواب دے کر اب وہ اس کے بارے دریافت کرنے لگی۔

"میں اکلوتا ہوں اپنے والدین کا۔اور ہاں لاڈلا بھی۔امامیہ کالونی میں رہتا ہوں۔چھوٹی سی مڈل کلاس فیملی ہے ہماری۔ماما سادہ سی گھریلو عورت ہیں۔بابا ڈاکٹر ہیں۔اور بس۔۔۔"

خوشدلی سے کہہ کر وہ مسلسل مسکراتا رہا۔

اسی دوران سروس بوائے چائے اور اسنیکس رکھ کر چلا گیا۔

"چلو پیو چائے جلدی جلدی نیکسٹ لیکچر نیئر ٹو اسٹارٹ ہے۔"

ٹرے قریب کھسکا کر وہ چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔اس نے سنیکس اٹھا کر منہ میں رکھے اور کپ تھام لیا۔

"ایک بات کہوں تمہیں۔اسے پلیز کمپلیمینٹ ہی لینا میری طرف سے کیونکہ عموماً تمہیں ایسا فقرہ بولنے کی متحمل نہیں ہوسکتی میں۔"

چائے کا سپ لے کر وہ بولی تو اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ بے ساختہ متوجہ ہوا۔

"ہاں جی بولو۔۔۔اینڈ ڈونٹ وری مجھے باتوں سے اصل مفاہیم اخذ کرنا آتے ہیں۔"

"اوہ دیٹس گڈ۔"

کپ میز پر رکھ کر وہ بالوں کو ایک ادا سے جھٹک کر بولی۔سفیر ہمہ تن گوش رہا کہ وہ کیا کہتی ہے۔

"میرا خیال تھا کہ تم کسی ہائی فائی سوسائیٹی سے ہو اور تمہارا گھر کہیں گلبرگ، ڈیفینس، یا بحریہ میں ہوگا۔ مجھے کیا یہاں تمہاری شکل و صورت اور ایٹی ٹیوڈ سے تو سب کو یہی لگتا ہے۔"

وہ سرسری لہجے میں بولی اور سنیکس کھانے لگی۔

سفیر نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور بیگ اٹھا کر پشت پر پہنتے ہوئے اٹھ گیا۔

"ان شاءاللہ ویسی ہی کسی سوسائٹی میں گھر ہوگا میرا کبھی۔فی الحال چلو وقت کم ہے کلاس میں اب۔"

اس کے کہنے پر وہ بھی جلدی جلدی چائے کے دو تین سپ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں ہاں چلو بابا۔۔۔بہت دیر ہوگئی۔"

اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کلاس کی جانب بڑھنے لگے۔

☆......☆......☆

"السلام علیکم ماما جان۔۔۔"

لاؤنج میں داخل ہو کر اس نے ذکیہ بیگم کو سلام کیا۔وہ چائے پیتے ہوئے خبر نامہ سن رہی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔آ گیا میرا بچہ۔یہیں بیٹھو شاباش۔میں سادہ پانی اور چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔"

چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر وہ اٹھیں اور اس کے گال چھوتے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔

"اوکے مام۔۔۔"

یہ کہہ کر اس نے کھڑے کھڑے جھک کر ریموٹ اٹھایا اور اپنا پسندیدہ چینل ٹیون کیا۔

چینل بدل کر اس نے پہلے ریموٹ، پھر بیگ صوفے پر اچھالا اور دھم سے نرم و ملائم صوفے پر اپنا آپ گرا کر ٹانگیں پھیلائیں اور سر پشت سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

" لگتا ہے بہت تھک گئے ہو تم۔یونیورسٹی بھی تو کافی دور ہے۔خیر یہ پانی پیو تم پھر تمہارے چائے پینے تک تازہ روٹی پکاتی ہوں۔کھا کر سو جانا۔ٹھیک ہے۔"

وہ چائے لائیں تو اسے یوں نیم دراز دیکھ کر کہا۔وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو بیٹھا اور مسکرایا۔

" نہیں ماما۔کھانا نہیں کھاؤں گا مجھے بھوک نہیں ہے۔آپ بس میرے پاس بیٹھو۔اور یہ بابا نظر نہیں آ رہے۔کلینک آف کر کے آنا نہیں گھر آج دوپہر میں؟"

اس نے پانی کا گلاس ٹرے سے اٹھا کر پیا پھر اپنے والد منصور عالم کی بابت دریافت کیا۔

"فون آیا تھا ان کا کہ آج نہیں آئیں گے۔تبھی میں نے بھی اہتمام نہیں کیا خاص۔سوچا تم آئے تو سالن رکھا ہے روٹی تازہ پکا لوں گی بس۔"

انہوں نے سادگی سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے سفیر؟ مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

انہیں اس کی بے وجہ ہنسی سمجھ نہیں آئی تو تیز لہجے میں پوچھا۔

" کچھ نہیں ماما۔آپ بھی بڑی سادہ ہیں۔بابا کے ایک فون سے تسلی ہو جاتی ہے آپ کی۔وہ چاہے وہاں کسی حسینہ ماہ جبینہ کی پر پیچ زلفوں کے بل دیکھ دیکھ کر کسی پر تکلف دعوت سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔اور یہاں آپ پہلے سے رکھے سالن کے ساتھ دو تازہ روٹیاں سینک کر کھانے سے بھی مطمئن ہیں۔۔۔"

اس کی خوبصورت آنکھوں میں بھرپور شرارت ناچ رہی تھی اور وہ یقیناً انہیں ستانے کے موڈ میں تھا۔اس نے ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ بے ساختہ ہنس دیں۔

" بکواس کم از کم کیا کرو اپنے بابا کے متعلق۔مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔وہ اس طرح کے انسان نہیں ہیں۔سمجھے۔گدھا۔بات کرتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچتا کہ باپ کے بارے بات کر رہا ہوں۔"

انہوں نے ایک ہلکا تھپڑ اس کے چوڑے شانے پر مارا تو کپ رکھ کر وہ مصنوعی طور پر کاندھا مسلنے لگا۔

" افففف ماما۔۔۔ایک تو آپ اپنے 'مجازی' خدا کے بارے کوئی بھی منفی بات سننا پسند نہیں کرتیں۔حالانکہ جو میں کہتا ہوں وہ ایسا انہونا بھی نہیں ہے کہ آپ اس پر سوچیں بھی نہیں۔بھئی ینگ ہیں وہ، ہینڈسم ہیں۔میرے ساتھ کھڑے ہوں تو لوگ انہیں میرا باپ نہیں بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔تو پھر ایسی بھری جوانی میں کچھ بھی ہونا ممکن ہے۔خیال کریں ماما۔وارن کر رہا ہوں آپ کو کہ چیک رکھا کریں ان پر۔"

کندھا سہلاتا وہ مسلسل انہیں ستا رہا تھا۔اور اس کی بے تکی باتوں پر وہ سادگی سے ہنستی رہیں۔

"اچھا چھوڑو اپنے بابا کا ٹاپک۔یہ بتاؤ کہ کوئی دوست بنا کیا آج وہاں؟ آج تو بننا چاہیئے تھا دوسرا دن تھا آج۔"اس کے گھٹنے پر چپت لگا کر انہوں نے موضوع بدل دیا۔

اس نے چائے ختم کی اور کپ ٹرے میں رکھ کر میز پر تھوڑا پرے کھسکا دیا۔

" نہیں ماما۔دوست اتنی جلدی کہاں بنتے ہیں تعلیمی اداروں میں۔دیکھ بھال کر ہم مزاج دوست ڈھونڈنا پڑتے ہیں۔جو آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے مزاج کے ہر رنگ کو بھی سمجھ سکیں۔"

اس نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ فکرمندی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"سفیر اتنا دیکھ بھال کر بھی دوست نہیں بنائے جاتے۔ دوست تو بس جنہوں نے بننا ہو فوری بن جاتے ہیں۔ دوست بنانے سے پہلے انہیں اپنے انداز واطوار و عادات سے آگاہ کرنا چاہیں تو ہر کوئی دور بھاگ جاتا ہم سے۔ مجھے تو تمہاری سمجھ نہیں آتی کہ چاہتے کیا ہو تم۔ کوئی بندہ تمہیں اپنے معیار کا نہیں لگتا تو یقیناً تمہیں اپنا معیار کم کرنے کی ضرورت ہے۔ کمی کسی میں نہیں۔ زیادتی تم میں ہے۔"

انہوں نے جواباً تفصیل سے کہا تو یکبارگی اس کے ذہن میں ثومیہ آ گئی۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی کہ جانے کب وہ اس کا اتنا عادی ہوا کہ اس کے ساتھ بیٹھنے کی ضد کرنے لگا۔ اور پھر کینٹین میں لڑکیوں کا جھرمٹ چھوڑ کر وہ بھی تو خود بخود اس کی میز پر آ گئی تھی۔ باہم تعارف کے بعد انہوں نے اگلے تمام لیکچرز بھی ایک ساتھ اٹینڈ کیے تھے۔

ذکیہ بیگم جو کہ اپنی بات کے جواب کہ منتظر تھیں اسے کسی سوچ میں گم دیکھ کر چپ رہیں۔ اور اس کے چہرے پر پل پل آتے جاتے رنگوں کا بغور جائزہ لیا۔

"کیا ہوا اب؟ کیا سوچنے لگے؟ کوئی خاص بات بیٹا؟"

تخیلات کا دورانیہ طویل ہوا تو انہوں نے اسے ہلا کر پوچھا۔ وہ یک دم خیال سے باہر آ گیا۔

"آں ہاں ماما۔۔۔ وہ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی جنہیں دوست بننا ہو یا ہمارے قریب آنا ہو یوں ہی بلاوجہ آ جاتے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر آپ مجھے میرا رویہ تبدیل کرنے کا کیوں کہتی ہیں؟ ماما میں چاہتا ہوں کہ میں جیسا اندر سے ہوں اور جیسا باہر سے دکھائی دیتا ہوں، جسے میرا دوست بننا ہو وہ انہی عادتوں میں بنے جو میری قدرتی ہیں۔ میں فقط کسی کو دوست بنانے کے لیے خود کو تبدیل کیوں کروں؟ بس یہ میرا نکتہ نظر ہے۔"

ٹھہر ٹھہر کر بولتا وہ پراعتماد لہجے میں انہیں سمجھا رہا تھا۔

انہیں اس وقت وہ بالکل ایک ضدی بچہ لگا جسے کچھ بھی سمجھانا بے کار ہو گا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں تم سے بحث نہیں کرتی مزید۔ اب تم کمرے میں جاؤ اور کپڑے تبدیل کر کے آرام کرو۔ پھر شام کو جم بھی جانا ہوتا ہے تم نے۔ میں تمہیں جگا دوں گی مقررہ وقت پر لہٰذا بے فکری سے سونا۔ چلو اٹھو شاباش۔"

انہوں نے ایک پل میں گفتگو سمیٹ کر اسے کمرے میں جانے کا حکم دیا پھر بڑی محبت سے اس کے گال

پچکارے۔

"Okmama۔۔۔thanksalot۔Iamreallymuchtired۔Seeu۔"

اپنا یونیورسٹی بیگ اٹھا کر وہ اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے روم کی جانب بڑھ گیا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک الوہی مسکان سجی تھی۔ جانے وہ کیسے سوچ رہا تھا۔

"تو ثومیہ میری بے سبب دوست بن رہی ہے؟ میرے ظاہر و باطن کی ہر اصلیت کو جانے بغیر۔ اور ماما بھی تو یہی کہتی ہیں کہ دوست آپ کا ظاہر و باطن جانے بغیر بس دوست بن جاتے ہیں۔"

کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ بڑبڑایا تو حسین لبوں کی دلکش مسکراہٹ کا راز اچھل کر پورے کمرے میں پھیل گیا۔

☆......☆......☆

" کہاں رہ گئی تھیں تم ثومیہ۔ تمہارے بابا غصہ ہو رہے تھے کہ روزانہ دیر کیوں ہو جاتی ہے تمہیں؟ ابھی ابھی باہر نکلے ہیں کسی دوست کے ساتھ۔ شاید ارشاد انکل آئے تھے تمہارے ان کے ساتھ گئے ہیں۔ بڑی مشکل سے دھیما کیا انہیں میں نے۔"

وہ بیڈ کی الٹی جانب بیٹھی جھک کر جوتا اتار رہی تھی جب راشدہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور آتے ساتھ اسے باپ کی ناراضی سے آگاہ کیا۔

"سلام امی۔۔۔ سانس تو لینے دیں۔ آج پھر وین والے کی وجہ سے لیٹ ہوئی ہوں۔ سارا شہر گھوم کر سب لڑکیوں کا گھر پہنچا کر آخر میں ادھر کا رخ کرتا ہے۔ میں تو خود اتنا کالج میں نہیں تھکتی جتنا یہ وین کا لمبا سفر تھکا دیتا ہے۔ ابو کو سمجھائیں نا کہ لوکل آنے جانے دیں تو ہر روز وقت پر واپسی ہو۔ اور کیا نمرہ بھی نہیں آئی اب تک؟؟"

اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا اور اٹھ کر بیگ الماری میں ہینگ کرنے لگی۔

وعلیکم۔۔۔ کہہ کر راشدہ بیگم نے اس کا جوتا اٹھا کر ریک میں رکھا اور وہاں سے سادہ چپل اٹھا کر دی اس کو۔

"اچھا غصہ مت کرو میں بات کرتی ہوں آج تمہارے ابو سے۔ ہاں نمرہ آج خلاف معمول جلدی آ چکی ہے۔ اپنے کمرے میں نہا رہی ہے۔ تم بھی فٹافٹ فریش ہو کر آؤ تب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔"

ان کے کہنے پر وہ اثبات میں سر ہلاتی واش روم میں گھس گئی۔تو وہ ایک طائرانہ نگاہ اس کے کمرے پر دوڑاتی باہر نکل گئیں۔

"افففف امی کیا بتاؤں کتنے زوروں کی بھوک لگی ہے۔جلدی کھانا لگالیں۔ بلکہ رکیں میں آپ کی ہیلپ کرتی ہوں۔اور ثومیہ آگئی ناں؟؟"

وہ کھانے کی میز سیٹ کر رہی تھیں جب نمرہ بے صبری سے بھوک بھوک چلاتی ڈائیننگ میں داخل ہوئی۔اور پھر ثومیہ کی بابت پوچھتی ان کے ساتھ کچن کی جانب بڑھ گئی۔

"اے دھیرج لڑکی دھیرج۔۔۔باؤلی مت ہو۔بھوک میں صبر کرنا سیکھو۔اور آرہی ہے وہ فریش ہوکر۔تم تب تک یہ ڈونگے لے جاؤ سالن اور چاول کے۔برتن میں رکھ آئی ہوں۔تم یہ رکھ دو تو پانی لے جانا۔میں تب تک دو برتن کھنگال لوں۔سلیب بہت گندی ہوئی ہے۔"

انہوں نے قدرے ڈانٹ کر کہا تو وہ جی اچھا کہہ کر ڈونگے اٹھا کر باہر چلی گئی۔

"السلام علیکم۔۔۔آگئیں۔کیسا رہا دن؟"

وہ برتن ترتیب دے رہی تھی جب ثومیہ نے آکر اسے مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام۔ہاں آپی آج وقت پر آگئی ہوں۔ٹریفک زیادہ بلاک نہیں ملا۔اور ہمیشہ کی طرح اے ون رہا دن۔تم سناؤ کیسا گزرا دوسرا دن۔وہ کل والا اکڑو ملا کیا آج بھی؟قسم سے بڑا تجسّس رہا سارا دن کہ جانے آج تمہاری اس سے ملاقات ہو کہ نہ ہو۔"

جواب دے کر اس نے سرگوشی میں رازداری سے سفیر کے متعلق پوچھا تو ثومیہ نے میز کے گرد گھوم کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چپ کر یار۔پاگل ہوئی ہو؟امی نے سن لیا تو فٹ ابا کو بتائیں گی۔پھر دیکھنا کیا حال کرتے ابا ہم دونوں کا۔"ڈپٹ کر کہتے اپنا ہاتھ اس نے منہ سے ہٹایا تو وہ شریر نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اچھا بس یہ تو بتادو کہ آیا تھا آج؟یہ سننے کو بے چین ہوں۔"

نمرہ نے لجاجت سے کہا تو وہ ہنس دی۔

"ہاں بابا آیا تھا اور ملا بھی۔ اب منہ بند رکھو باقی باتیں رات کو کمرے میں کریں گی۔"

اس نے خوشدلی سے کہا اور دونوں ایک ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

"امی آجائیے۔ آپ کی دختران نیک اختران دونوں میز پر براجمان ہیں۔"

بیٹھتے ہی نمرہ نے کچن کی جانب منہ کر کے آواز لگائی جبکہ وہ دانتوں سے سلاد کترنے لگی۔

"آگئی بھئی۔ واویلا مچادیتی ہو تم تو۔ آفت ہو۔ ابا تمہارے اسی وجہ سے غصہ کرتے ہیں تم دونوں پر کہ بولتی بہت ہو۔" یہ کہہ کر انہوں نے ثومیہ کے ساتھ والی نشست سنبھالی۔ اور ان دونوں کو پلیٹس میں کھانا ڈال کر دینے لگیں۔

"بس امی۔ بابا کی تو جانے دیجئیے۔ انہیں اپنی اولاد کے علاوہ دنیا کے ہر فرد میں اچھائی نظر آتی ہے۔ اور وہ ہمارے علاوہ کسی کی بھی خوبیوں کا اعتراف کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دل میں طے کر رکھا ہے کہ ہم میں کوئی بھی بات یا ہمارا کوئی عمل متاثر کن نہیں ہو سکتا۔"

ان کی بات پر ثومیہ کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی درشت ہو گیا۔

"یہ تم کیسے بات کر رہی ہو بیٹا اپنے ابو کے بارے میں؟ غلط فہمی ہے تمہاری کہ وہ گھر میں ہماری خوبیوں کے معترف نہیں ہوتے۔ بس غصے کے تیز ہیں تو اکثر غصہ آیا رہتا ان کو۔ ورنہ وہ ایسے نہیں ہیں کہ ہمیں اہمیت نہ دیں۔" جوان بیٹی کے سامنے انہوں نے جواباً شوہر کا دفاع کرنا چاہا۔

دونوں بہنوں کی نظر ملی اور نمرہ نے اپنی پلیٹ پر سر جھکا لیا۔

"امی میری بات پر غور کریں میں نے تو فقط اپنی اور نمرہ کی اہمیت اور خوبیوں کا ذکر کیا تھا۔ اس پر سوچئے گا ضرور کہ یہاں آپ نے اپنا نام کیونکر شامل کیا ہمارے ساتھ؟؟"

ثومیہ نے جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھ کر کہا اور پھر انہیں نظریں چراتا دیکھ کر بات بدل دی۔

"اچھا امی چھوڑیں اس بات کو آج آپ نے کھانا بہت مزے کا بنایا ہے۔ ہمیشہ کی طرح۔ کاش کبھی میں اور نمرہ بھی ایسا کھانا بنانا سیکھ سکیں۔"

وہ خوشگوار لہجے میں بولی تو نمرہ نے فوری اس کی تائید کی۔ وہ باہم در آئی سنجیدگی کا اثر کم کرنا چاہتی تھیں۔

"بالکل صحیح کہہ رہی ہے امی یہ۔ بہترین ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ میں۔ میری دوستیں جب آئی تھیں انہوں نے آپ کے ہاتھ کی بریانی کھائی تھی۔ اب تک یاد کرتی ہیں وہ۔"

ماں اور بہن کو باری باری دیکھتے ہوئے وہ بولی تو راشدہ بیگم ہنس دیں۔ ان کا دھیان بٹ گیا تھا یا انہوں نے دھیان کا بٹنا ظاہر کیا تھا یہ بات اللہ بہتر جانتا تھا لیکن اس وقت وہ مسکرا رہی تھیں۔

"ہاں تو اور بنا دوں گی نا۔ ہاٹ پاٹ بھر کر لے جانا۔ بڑی پیاری بچیاں تھیں۔ بڑی عزت کرنے والی۔ ماشاءاللہ۔" انہوں نے شائستگی سے کہا اور اٹھ گئیں۔

"میں چائے بناتی ہوں۔ تم دونوں کھانا کھا کر برتن سمیٹ لینا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کچن کی جانب مڑ گئیں۔

ان دونوں کی نظریں پھر سے ملیں اور نمرہ نے اپنا چمچ پلیٹ میں چھوڑ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔

"اب کیا ہوا؟؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

ثومیہ نوالہ منہ کے پاس روک کر بولی۔

"تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں آپی لیکن تمہیں امی کے سامنے یہ سب نہیں بولنا چاہئیے تھا۔ ابو اگر گھر میں کسی کو اہمیت نہیں دیتے تو اس پر امی بھی تم سے زیادہ ہی کڑھتی ہوں گی دل میں۔ لیکن یوں واضح اظہار کرنے سے ان کی دل آزاری ہوئی ہے۔"

اس سے چھوٹی ہو کر بھی وہ اس سے زیادہ بہتر تجزیہ پیش کر رہی تھی صورتحال کا اور ثومیہ کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔

"ٹھیک کہتی ہو یار تم۔ کم از کم امی کے لفظوں کی تشریح نہیں کرنی چاہئیے تھی مجھے۔ ان کے لفظوں میں ڈھکے چھپے شکوے کو ان کے منہ پر واضح نہیں کرنا چاہئیے تھا مجھے۔ لیکن میں بھی کیا کروں نمرہ۔ جب ابو کو ہر کسی کے سامنے اس کی بے جا تعریفوں کے پل باندھتے اور اپنی خامیاں و کمیاں، کجیاں سرعام گنواتے دیکھتی ہوں تو دل کرتا ہے کہ اسی وقت ٹوک دوں کہ یہ شخص آپ کی فیملی سے افضل خصوصیات کا مالک ہرگز نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے زندگی میں کسی سے بھی بلاوجہ متاثر ہونا سیکھا ہی نہیں۔ اچھا اسی کو سمجھوں گی زندگی بھر جو اچھا ہو گا۔۔۔

اور بس۔" نمرہ کی بات کے جواب میں وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔ایک منٹ میں اس نے اپنے اندر کی ساری کڑواہٹ اگل دی۔

نمرہ نے تاسف اور ہمدردی کے ملے جلے تاثرات سے خود سے پانچ سال بڑی بہن کو دیکھا۔اور پلیٹ پرے کھسکا کر گلاس میں پانی بھرنے لگی۔اس کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔۔۔

" کہ زندگی رویوں کی پلیٹ میں بعض اوقات اتنے واشگاف سوال کرتی ہے کہ ان کے جواب لہجوں کی اوٹ میں رہ کر ہوا ہونے لگتے ہیں

☆......☆......☆

" چلو اب فٹافٹ آج کی ملاقات کا سارا احوال سناؤ۔وہ آیا تھا تو کیسے ملاقات ہوئی؟ کیا باتیں ہوئیں؟ ہینڈسم لگ رہا تھا کیا؟ آج باقی کلاس کا رویہ کیسا رہا اسے دیکھ کر؟"

رات کو دونوں اپنے مشترکہ کمرے میں سونے لیٹیں تو نمرہ نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔اور ثومیہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھی۔

" خبردار جو اب ملاقات کا دو نمبر لفظ استعمال کیا میرے بارے میں۔۔۔میں وہاں اس اکھڑ سنگھ سے ملاقاتیں کرنے نہیں جاتی۔انڈراسٹینڈ۔"

وہ غصے میں تنک کر بولی۔تو نمرہ ہنس پڑی۔

" اوہو آپی ایسا کوئی مطلب نہیں تھا میرا۔سمپلی سٹوری بتادو میری ماں آج کی کہ جو جو بھی ہوا۔اور بس۔"

وفور شوق میں بھیگا اس کا لہجہ انتہائی متجسس تھا۔اور چہرے پر بھی اسی قسم کے تاثرات تھے۔اس کا نارمل انداز دیکھ کر وہ بھی دھیرج ہو گئی۔

" ارے کیا بتاؤں یار کہ پورا چیکو نکلا آج وہ۔میری اتنی انسلٹ ہونا تھی اگر میں خود اعتماد سے نہ رہتی اور کنفیوژ ہو کر ادھر ادھر جھانکنے لگتی تو۔یہ تو میرا رویہ تھا کہ کسی کو بات کا موقع نہیں دیا میں نے ورنہ اس نے تو آج کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مجھے بدنام کرنے کی۔"

اسے ہاتھ ہلا ہلا کر بولتی دیکھ کر اس کی کوئی بات نمرہ کے پلے نہیں پڑ رہی تھی اور یہ بات اس کے چہرے پر

متجسس تاثرات سے صاف جھلکتی تھی کہ ہوا کیا تھا بھئی؟

"اب شکل وصورت اچھی ہو انسان کی، لوگ اس سے جلد متاثر ہو جایا کریں، اور ہر کوئی اس پر بلا وجہ یا بے سبب توجہ دے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ منہ اٹھا کر خودی جو مرضی فیصلہ کر لے؟؟ بتاؤ بھلا یہ بھی کوئی تہذیب ہے؟"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے نمرہ سے سوال کیا تو وہ ہونق بنی اس کی شکل دیکھے گئی۔ اور وہ جو اپنے جواب کی منتظر تھی اس کی خاموشی پر حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

" کیا ہوا تمہیں اب؟ یوں منہ اٹھا کر کیا دیکھ رہی ہو؟ کوئی غلط بات کر دی میں نے کیا؟"

وہ معصومیت سے یوں بولی کہ نمرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ارے پہلے تفصیل تو بتاؤ مجھے کہ ہوا کیا تھا؟ خودی بات کر کے خودی فیصلے سنا کر ان پر میری مہر تصدیق کی طالب ہو۔ بھئی ایسے میں تو کوئی بھی رائے دینے سے قاصر ہوں جب تک کہ تم مجھے پوری بات نہ سناؤ کہ یہ شکل و صورت اچھی ہونے اور لوگوں کے جلد متاثر ہونے کا ذکر خیر کس حوالے سے کیا جا رہا ہے؟"

وہ دوٹوک انداز میں بولی تو ثومیہ کو احساس ہوا کہ واقعی اب تک بتایا تو اسے کچھ بھی نہیں گیا۔ اس نے اپنے سر پر ایک ہلکی چپت لگائی اور بولنا شروع کیا۔

"اے لو۔ ٹھیک کہتی ہو تم۔ میں بھی مسئلہ بتائے بغیر فتویٰ لینے چلی تھی۔"

وہ خجل سی بولی تو نمرہ مسکرا دی۔

"ہوا یوں کہ کلاس شروع ہونے سے پہلے جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو میرے ساتھ دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جناب نے پوری کلاس پر ایک نگاہ غلط دوڑائی اور خراماں خراماں ہماری جانب بڑھنے لگے۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ کوئی اوٹ پٹانگ کام کرے گا۔ میں نے کتاب پر دھیان کر لیا سارا۔ وہ جناب آیا اور میرے ساتھ بیٹھی لڑکی کو نہایت ادب سے سلام کر کے بولا کہ مجھے ثومیہ کے ساتھ نشست فراہم کریں گی تو میں شاکر و ممنون ہوں گا۔"

جلے بھنے لہجے میں وہ یہاں تک بولی کہ نمرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ ہنستی چلی جا رہی تھی۔

"واہ واہ واہ آپی۔۔۔یہ سفیر پاگل ہے کیا؟ یا پراعتماد زیادہ ہے؟ بھلا یوں کون کرتا ہے۔۔۔خیر یہ بتاؤ پھر کیا ہوا؟" دوران ہنسی اس نے تبصرہ کر کے سوال کیا اور اٹھ کر تکیہ گود میں لیے آلتی پالتی مارے بیٹھ گئی۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ایک بار تو اس لڑکی کے منہ سے بھی یہ لمبا سا 'لفظ جی' نکلا۔یقیناً اسے بھی قطعاً امید نہیں تھی کہ وہ یہ فرمائش کرے گا۔کہ بھئی ابھی کلاس میں کسی کو جانتا ہی کون ہے؟ سب ناواقف ہیں ابھی باہم۔خیر یہ کہ بھلا ہو اس کا اس نے کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے اٹھ گئی۔وہ اگر ضد کر جاتی تو اور تماشا ہوتا۔"

بات کے اختتام پر ہاتھ اٹھا کر اس نے باقاعدہ شکر ادا کیا۔

"ہاہاہا آپی۔میری تو ہنسی نہیں رک رہی کہ کیا حالت ہوئی ہوگی تمہاری۔"

نمرہ بولی اور پھر سے ہنسنے لگی۔

"دفع ہو تم۔تمہیں ٹھٹھے لگانے کے سوا آتا کیا ہے۔پاگل ہو تم۔" وہ فوراً غصہ کر گئی۔

"غصہ تو نہ کرو اب۔تم تو کل کہہ رہی تھیں کہ ڈیسینٹ بندہ ہے۔بس ذرا چہرے مہرے سے اکھڑ لگتا ہے۔یہ ڈیسینسی ہے اس کی؟؟"

نمرہ یک دم سنجیدہ ہوئی اور سفیر کے متعلق اس کی کل کی رائے پر سوال کیا تو وہ کچھ سوچنے لگی۔پھر چند لمحاتی توقف کے بعد بولی۔

"یار اچھا لڑکا ہے وہ بس اس کا مسئلہ ہے کہ کسی سے خود سے دوستی نہیں کرتا۔اور آج میرے ساتھ اس وجہ سے بیٹھا کہ کل کی واقفیت تھی مجھ سے اس کی۔مطلب وہ مجھے آوارہ نہیں لگا۔بس کبھی کبھی کئی باتوں سے خود پسند لگتا ہے۔جسے وہ خود شناسی کا نام دیتا ہے۔میں اب تک اسے ٹھیک سے سمجھ نہیں سکی۔اکلوتا بیٹا ہے وہ اپنے والدین کا۔شاید اس وجہ سے کچھ زیادہ لاڈ پیار ملا اسے اور وہ اہمیت پانے کا عادی ہے۔میں نے اسے اہمیت ملنے پر کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا ہاں بس یہ کہ وہ بخوبی جانتا ہوتا ہے کہ اسے اہمیت دی جا رہی ہے۔اس سب کو وہ بالکل نارمل لیتا ہے۔عجیب کیس ہے سمجھو۔"

ٹھہر ٹھہر کر بولتی وہ اس کی ذات کا تجزیہ کر رہی تھی اور نمرہ اس کے چہرے پر نمایاں بکھرے الجھن کے رنگ دیکھ رہی تھی۔

"سچ کہتی ہو تم آپی کہ مجھے بھی وہ بندہ بڑا الجھا ہوا سا لگا ہے سن کر۔ خیر یہ بتاؤ کہ کوئی سہیلی بنی کہ نہیں آج؟ سفیر نامہ بہت سنا لیا اب کوئی دوست بننے کا قصہ بھی سنا دو۔"

وہ چپ ہوئی تو نمرہ نے دانستہ موضوع بدلا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ اب وہ سفیر کے ذکر سے کسی قدر ڈسٹرب ہو رہی ہے۔

"لو جی۔ اب سہیلیوں کا بھی سنو۔ لڑکیاں تو پاگل ہوئی پڑی ہیں کلاس کی اسی کے پیچھے۔ مجھ سے علیک سلیک بڑھا رہی تھیں اس کی معلومات لینے کو۔ جو کہ میرے پاس تھیں ہی نہیں۔ قسم سے ایسی لڑکیوں نے ہی ان چند خوش شکل لڑکوں کا دماغ ساتویں آسمان پر رکھا ہوتا ہے۔"

اور پھر جلے بھنے لہجے میں وہ اسے لڑکیوں کی اس سے ملاقات، سفیر کے متعلق مختلف تفصیلی سوالات اور کینٹین میں دوبارہ سفیر سے تعارف کا قصہ سنانے لگی۔

نمرہ حیرت سے تو کبھی ہنسی و مسکراہٹ میں اس کی ہر بات بغور سن رہی تھی۔ اس کے لیے یہ اب بڑا دلچسپ قصہ بن گیا تھا۔

☆......☆......☆

لاہور شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد کی مشترکہ داخلی وسیع سڑک پر سیاحوں کا جم غفیر تھا۔ ملکی اور غیر ملکی مختلف رنگ و نسل کے افراد کے مابین نہایت لاتعلقی سے چلتا ایک دراز قد، مجسم پیکر جمال، اور دلکش مضبوط جسامت کا حامل وہ حسین تر لڑکا سب سے منفرد لگ رہا تھا۔ وہ جہاں سے گزرتا خوشبو کا ایک نرم جھونکا اس کے وجود سے پھوٹ کر ماحول میں بکھر جاتا۔ اردگرد لوگ اس کی گلال رنگت میں گھلی جاذبیت اور سفیدی کو محویت سے تکتے ہوئے بے ساختہ رکنے لگے۔ تو کوئی ایک نے عمدہ ملبوس سے جھلکتے اس کے چوڑے شانوں اور پتلی کمر کو پشت سے دور تلک تاڑا۔ اس کی شربتی آنکھوں میں عجب ملال ٹھہرا تھا کہ جس کی بدولت وہ آس پاس سے بے نیاز ہو کر ایک توازن سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

بادشاہی مسجد کی اونچی سیڑھیوں کے سامنے رک کر وہ مسجد کے دیو قامت دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔ دروازے کے مغلئی نقش و نگار کو بغور دیکھتا وہ گویا اس کی ہئیت ماپ رہا تھا۔ پھر نگاہ ہٹا کر وہ بلند قامت مینار دیکھنے

لگا۔ مینار کی چوٹیوں پر اس کی نگاہ رکی اور یک بیک اس کی سنجیدہ آنکھوں میں کوئی رنگ چھلکنے لگا۔۔۔سختی سے بھینچے لب چٹکے اور ان کے دلکش کناروں سے مجروح مسکان ابھری۔ایسی مسکان کہ جس میں کانپتے لبوں پر لو دیتی آنکھوں سے کوئی بین جھلکتا تھا۔

"اس شاہی مسجد کے بلند میناروں کو گواہ کر کے کہوں گا کہ تم سے انہی کے جیسی لازوال محبت کرتا ہوں۔"

سرسراتی ہوا نے اس کے کانوں میں عہد ماضی سے چھین کر کوئی گرم سیال ڈالا کہ کانوں کی لوئیں تن کر سرخ ہو گئیں۔

اس کے سرخ ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ سمٹی اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے ابتدائی چبوترے پر آ رکا۔یہاں رک کر وہ مڑا اور ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مزار اقبال پر ڈال کر شاہی مسجد کے صحن میں جانے کو پلٹ گیا۔

"صاحب جوتے وہاں جمع کروا دیں۔یہاں جوتے پہن کر نہیں جایا جاتا۔"

وہ مرکزی صحن سے دو قدم کی دوری پر تھا کہ ایک گارڈ تیزی سے اس کی جانب آیا اور اس کے لانگ شوز کو دیکھتے ہوئے مودب لہجے میں بولا۔

"اوہ سوری۔۔۔میں ابھی جمع کروا دیتا ہوں۔شکریہ۔"

وہ پلٹ کر مسجد کے داخلی چبوترے پر آیا اور وہاں شوز کیپر کو جوتا جمع کروا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ مسجد کی پہلی راہداری میں دھرے متبرکات اور اس سے متصلہ وضو خانہ کراس کر کے یادگار پاکستان کی طرف کھلتی راہداریوں میں آ کھڑا ہوا۔طویل راہداری دور تک ویران تھی۔

راہداری کے پیہم دھاروں اور گولائیوں میں دور دور تلک سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا اس کے وجود سے ٹکرا کر گزرنے لگی۔اس کی موجودگی کا احساس پورے صحن اور طویل تر راہداریوں میں پھیلتا چلا گیا۔ایک ہاتھ دیوار سے ٹکائے وہ راہداری سے پار کھلی فضا میں خلاؤں کو تکنے لگا۔

"کہاں گم ہو شہزادے؟یوں لگتا ہے رستہ بھٹک گئے ہو تم۔"

کسی نے اس کے بالکل پاس سرگوشی کی۔وہ تیزی سے پلٹا اور مخالف سمت سے آتی ہوئی تیز ہوا سے ٹکرا کر رہ گیا۔وہاں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔

"تنہائی میں دوسراہٹ کا احساس ہونا یا تو محبت ہوتا ہے یا پھر کوئی ملال۔۔۔"

ایک سنجیدہ بازگشت کے لفظ کھلے اور حروف اس کے آس پاس بکھر کر رقص کرنے لگے۔وہ بڑھ کر بے تابی سے راہداریوں میں گھومنے لگا۔اس کے چہرے پر ایسا کرب جاگا کہ گویا من مندر میں کوئی انگارہ دہک رہا ہو۔

"سنو تم کہیں بھی جاؤ تو لوٹ آنا۔ان راہداریوں میں بھٹکتی ہوئی میری اک 'یاد' ملے گی۔"

کبھی مذاق میں کہی گئی ایک بات آج اس کے لیے ایک اذیت ناک حقیقت بن گئی تھی۔راہداری میں ایک سے دوسرے سرے تک بے کراں ہو کر بھاگتا وہ اسی "یاد" کی کھوج میں تھا۔وہ مختلف جگھوں پر رکتا، بام و در پر لکھی مختلف تحاریر پڑھتا، وہاں لکھے ناموں میں سے کوئی اسم تلاشتا وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگا۔اندرونی خلفشار کی ابتلا سے گھبرا کر وہ دیوار کے سہارے دھیرے دھیرے نیچے بیٹھنے لگا۔اس کی آنکھوں سے کرب بہنے لگا۔کسی نے وقت کی پرسکون شاخوں کو اس کی ذات کے اندر پوری شدت سے جھاڑا تھا کہ اس کا ہر قرار ملنے لگا تھا۔۔۔سارا اطمینان مچل گیا تھا۔۔۔

دیوار پر جہاں اس نے سر کی پشت کو سہار رکھا تھا وہاں اس کی دائیں جانب آنکھوں کے بالکل پاس اس نے کچھ حروف کو چمکتے دیکھا۔خوشخطی میں چند نام یوں تحریر تھے کہ گویا ان کی حقیقت ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو گی۔اس نے تڑپ کر اپنا ماتھا ان اسماء سے ٹیک دیا۔اسے جیسے کوئی گوہر نایاب ملا تھا۔ماتھا ہٹا کر وہ انگلیوں سے ان کو یوں چھونے لگا جیسے ان کا احساس اپنی پوروں میں قید کرنا چاہتا ہو۔اس کے ہر عمل سے اضطراب جھلکتا تھا۔

"جلدی آؤ یار۔۔۔ہمیں واپسی کے لیے نکلنا ہے۔تمہاری یہ خطاطی اگلی بار دیکھوں گا کہ کیا پتا تب یہ زیادہ لطف دے۔"

حروف یہاں بھی ٹوٹ رہے تھے اور وہ ان کو جوڑنے کی ناکام سعی کرتا ہی تو تھک کر یہاں آیا تھا۔یہاں درج ناموں کو چھو کر اپنی انگلیاں دیکھتا وہ زار و قطار رونے لگا۔گزشتہ ادوار سے اب تک کئی محبتوں کی امین ان ساکت و جامد دیواروں نے اس کی اذیت کو پوری شدت سے خود پر جھیلا۔ایک بار پھر وہ کسی کی گمنام آہ و بکا کی گواہ ہوئی تھیں۔صدیوں سے ان راہداریوں میں بھٹکتی ہوا نے ایک بار پھر کسی کی سسکیاں سمیٹ لیں۔اس ہوا کی بدولت کئی سالوں تک ان جوان لبوں کی لرزش کو اس تاریخی مسجد کے پیچ و خم میں بھٹکنا تھا۔ہوائیں جانتی تھیں

کہ اس کے کانپتے وجود سے بہتا ملال اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسجد کے صحن میں رینگے گا۔ کچھ لمحات اسی پر درد فسوں میں گزرے اور پھر اس کا رونا بتدریج کم ہوتا گیا۔

"ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی ہم جو نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ ایک وقت آتا ہے کہ اسی سے لپٹ کر رو دیتے ہیں۔۔۔"

اس نے مدت بعد آج اس فقرے کی حقیقت کا دکھ جھیلا تھا۔

وہ خاموشی کے ساتھ اپنے شفاف ناخن سے دیوار پر درج ان ناموں کی خطاطی پر دہرائی کرنے لگا۔ آنسوؤں سے اس کا اندرون جیسے دھل کر نتھر گیا تھا۔

تبھی راہداری کے آخری سرے سے وہاں لڑکے لڑکیوں کا ایک مخلوط گروپ داخل ہوا۔ ان سب نے تحیر سے راہداری کے مختلف در و دیوار کھوجتے اس حسین دیوتا کو دیکھا۔ وہ بے قراری سے دیواروں پر درج ہوئے مختلف نام و نشان جانچ رہا تھا۔ پہلے اس کی دیومالائی شخصیت نے سب کو اپنے ٹرانس میں لیا اور پھر اس کی "حرکات" نے انہیں باندھ لیا۔ سب کی سوالیہ نظریں اس پر جمی تھیں۔ ان سب نے باری باری ایک دوسرے کو نا سمجھی سے دیکھا۔ یکا یک ایک لڑکا نے آگے بڑھ کر مرعوبیت سے اس پراسرار لڑکے کا شانہ ہلایا۔

"بات سنیں۔ آپ کچھ ڈھونڈ رہے ہیں کیا؟؟"

سوال پر سر اٹھا کر اس نے شعلہ جلتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ لڑکا اسے چھوڑ کر یک بیک پیچھے ہٹا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں سے کہیں زیادہ ایک عجیب سی لپک تھی۔ شرربار آنکھیں۔۔۔ سب کچھ گنوانے والی۔۔۔ دلفگار آنکھیں۔۔۔

لڑکے کو قریب ہوتا دیکھ کر باقی سارا گروپ بھی اس کے قریب آچکا تھا۔ اب ایک دم اسے ہٹتا دیکھ کر وہ سب بھی ایک قدم پیچھے ہوئے۔ کچھ تو تھا اس کے اضطراب میں کہ سب کو اس تک کھینچ لایا۔۔۔

کچھ تو تھا اس کی بے چینیوں میں کہ سب پیچھے ہٹ گئے تھے۔

ان سب کو دیکھ کر بتدریج اس کی کیفیت متوازن ہوئی۔ دو انگلیوں کی مدد سے اس نے آنکھوں میں بسے گرم سیال کو نرمی سے جھٹک دیا اور اٹھ کر اس لڑکے کے پاس آیا۔

"ہاں میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔لیکن میں بھول گیا تھا شاید کہ کچھ چیزیں اور کچھ لوگ ڈھونڈ نے سے بھی نہیں ملتے۔"

اس نے مصافحہ کو ہاتھ آگے بڑھا کر پراعتماد لب ولہجہ میں کہا۔اور پھر پورے گروپ پر ایک جانچتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ پہلے کا ٹوٹا، بکھرا شخص اب کہیں نہیں تھا۔لڑکے نے مشینی انداز میں اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا تو اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دوبارہ اس کی نظروں میں جھانکا۔وہ لڑکا نظر چرا کر دائیں بائیں جھانکنے لگا۔

" آپ کہتے ہو کہ کچھ چیزیں اور کچھ لوگ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔۔۔لیکن ڈھونڈ نے والے تو خدا کو بھی پا لیتے ہیں۔۔۔"

گروپ میں پیچھے کھڑی ایک لڑکی نے ساتھیوں کو ہٹا کر اس کے مقابل آتے ہوئے کہا۔سب نے حیرت سے اس لڑکی کی جرات کو دیکھا جو اس شاندار شخص کے سامنے بے دھڑک بولی تھی۔

اور وہ اس سوال پر پھر سے وہی مجروح ہنسی ہنسنے لگا۔

اس کے طرز عمل پر جہاں لڑکی کے ماتھے پر بل ابھرا وہیں اس کے ساتھی الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

" وہ خدا ہوتا ہے محترمہ۔وہ انسان کے تلاشنے پر خود سامنے آجاتا ہے۔کھوجنے والوں کی " کوشش " سے زیادہ یہ خدا کا " ظرف " ہوتا ہے کہ وہ انہیں مل جاتا ہے۔آپ لوگوں کے ظرف کو خدا کے مقابل مت پرکھو کہ جو اپنی تلاش کا ادراک پا کر مزید چھپنے لگتے ہیں۔۔۔"

دوٹوک انداز میں یہ کہتے اس کا لہجہ جذبات سے گندھا تھا۔اس کے جواب پر اس لڑکی سمیت سارے چپ ہو گئے۔

" شکریہ دوست۔اور آپ سب کا بھی شکریہ۔۔۔کسی کی حالت دیکھ کر ٹھہر جانے والے بہت کم ہوتے ہیں۔آپ سب شاید ان میں سے ہو۔خود سے یہ احساس کبھی جدا مت کرنا۔تم سب یوں ہی رہنا۔۔۔خدا حافظ۔"

انہیں خاموش پا کر اس نے لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور پھر یہ کہتے ہوئے تیزی سے مڑ کر

راہداری کی سیڑھیاں اتر گیا۔

اس کی بات پر ایک پل کے لیے وہ سب ہل بھی نہ سکے۔انہوں نے وہیں ساکت رہ کر احساسات کا درس دیتے اس بھرپور اور شاندار مرد کو بادشاہی مسجد کا وسیع صحن عبور کرتے دیکھا۔

اس کے جانے پر سب سے پہلے وہ لڑکی سنبھلی اور مڑ کر وہاں گئی جہاں وہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔اس نے جھک کر دیوار پر جہاں اس کی انگلیاں متحرک تھیں وہ نام پڑھے اور چونک گئی۔۔۔ان میں سے ایک نام اس کا جانا پہچانا تھا۔۔۔

http://sohnidigest.com سوہنی ڈائجسٹ

یہ اندرون لاہور میں واقع نیلی مسجد کی ذیلی گلی میں،ایک مغلیہ طرز تعمیر کے حامل پرانے مکان کی پہلی منزل کے ایک کشادہ کمرے کا منظر تھا۔کمرے کی مشرقی دیوار میں موجود دیو قامت کھڑکی میں لگے زرد شیشوں سے صبح صادق کی نرم زردیلی دھوپ چھن چھن کر پورے میں برس رہی تھی۔قرینے سے مرتب کمرہ،اس کی نیل رنگ دیواریں،ان پر ٹنگے مختلف فریم،تصاویر،مختلف فنی شاہ پارے اور دائیں دیوار کے ساتھ دیو قامت آبنوسی الماری جس میں متنوع الموضوعات کتابیں دھری تھیں،سب اس کمرے سے وابستہ فرد کے ادبی ذوق کی عکاس تھیں۔ کتابوں کی الماری سے متصل ایک آرام دہ کرسی،اس کے سامنے دھرا چھوٹا میز،اور اس پر ترتیب سے رکھے مختلف صفحات و قلم بھی اس فرد کی دلچسپیوں کا اظہار تھے۔۔۔کمرے کے وسط میں بچھے پلنگ پر ایک لڑکا بازو اطراف میں پھیلا کر اوندھے منہ لیٹا تھا اور اس حالت میں وہ اس کمرے کی واحد بے ترتیب "شے" لگ رہا تھا۔

کھڑکی سے آتی دھوپ کی بدولت اس کی سفید رنگت،بکھرے کالے بال،ہونٹوں کے نرم و گداز دھارے، اور بند آنکھوں کے خوبصورت ابھار پر موجود اس کی گھنیری پلکیں خوب جچ رہی تھیں۔۔۔چہرے پر مسلسل پڑتی دھوپ کی بدولت اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں،سر اٹھا کر دیوار گیر گھڑی سے وقت دیکھا اور واپس تکیے پر سر گرا کر اسی حالت میں لیٹ گیا۔اس کی آنکھوں پر پڑتی شفاف روشنی سے ان کی چمکدار پتلیوں کا گہرا بھورا رنگ نمایاں ہو کر خوبصورت منظر پیش کرنے لگا۔کھڑکی سے آتی دھوپ کے عین سامنے پلنگ پر لیٹا وہ بہت حسین لگ رہا تھا۔لیکن اس کی تمام تر خوبصورتی کے باوجود کچھ تھا جو اس منظر میں عجیب تر تھا۔اور وہ عجیب تر یقیناً اس کا ڈھیلا ڈھالا سست انداز،اور چہرے پر ثبت اکتاہٹ آمیز تاثرات تھے۔۔۔کروٹ بدلتے ہوئے ہونٹ بسورتا وہ سیدھا لیٹ گیا۔اس کی آنکھوں میں یاسیت کے وہ رنگ نمایاں ہوئے کہ جیسے کوئی خوش کن تخیل خواب گیر یت سے لوٹ کر "حقیقت" کا ادراک پاتا ہے۔۔۔

"زندگی راستوں میں رہ جائے تو تم منزلوں کو پالینا۔۔۔وہاں راستوں میں رہ جانے والی یہی زندگی تمہیں والہانہ گلے لگا لے گی۔کبھی نہ دور جانے کے لیے۔"

ماضی کی ایک یاد نے در دل پر دستک دی تو اس کے چہرے پر اذیت بڑھنے لگی۔وہ اٹھا اور چپل اڑس کر

کھڑکی میں آرکا، پھر دونوں پٹ کھول کر ان نے سل پر جھک کر نیچے گلی میں جھانکا۔۔۔

موٹر سائیکل پر دودھ لٹکائے جاتے نثار انکل، ایک دوسرے کی پونیاں کھینچتی ہوئیں سکول جاتی وہ پرائمری کی بچیاں، ننھے کو سائیکل کے آگے چھوٹی گدی پر بٹھائے گزرتے نور بھائی، دکانوں کے تھڑوں کی معمول پر آتی رونقیں، سامنے بیکری پر بڑھتا رش، اور گلی کے ایک سے دوسرے سرے تک افراد کے مابین پھیلی وہی غیر محسوس سی "لاتعلقی"۔۔۔سب کچھ جوں کا توں تھا۔اس سب کو روز اسی طرح دیکھتا وہ اس منظر سے بھی اکتا چکا تھا۔

"اٹھ گیا لاٹ صاحب۔۔۔چل نیچے آجا جلدی ناشتہ تیار کر دیتی ہوں تب تک تیرا۔"

کمرے میں داخل ہو کر ایک ڈھلتی عمر کی عورت نے اسے مخاطب کیا تو وہ کھڑکی سے پلٹ کر پلنگ کے پاس آرکا۔

"آجاتا ہوں خالہ۔کبھی تو چین کی نیند سونے دیا کرو۔ ہر وقت سر پر سوار رہتی ہو قسم سے۔۔۔" سستی سے کہتا وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اس کی بات پر دوسرے کونے سے پلنگ سے چادر درست کرتی کنیز بیگم کے ہاتھ رک گئے۔

"سدھر جا مصطفین۔۔۔یہ میں ہوں جو تیرے نخرے برداشت کرتی ہوں۔کوئی اور کرائے دار ہوتا تو کب کا سامان سمیت اٹھا کر باہر مارتی میں اس کو۔"

وہ گھوم کر اس کے بالکل سامنے آئیں اور قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"جانے دو خالہ۔ یہاں رہتا ہی کون؟؟اتنی دھونس کون برداشت کرتا آپ کی میرے علاوہ؟؟شکر کیا کرو کہ میں اتنے سالوں سے یہاں ٹکا ہوا ہوں۔ورنہ آئے روز پھڈا رہتا آپ کا کسی نہ کسی سے۔"

بے پرواہی سے کہہ کر وہ اٹھا اور کمرے سے متصل غسل خانہ میں گھس گیا۔

" کرایہ دے دے پچھلے دو ماہ کا اور چلتا بن تو یہاں سے۔اتنی بدتمیزی اب اور برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔۔۔میں ہی پاگل ہوں کہ صفیہ کا بیٹا جان کر فدا ہوئی رہتی ہوں۔۔۔"اس کے پیچھے بلند آواز میں بولتی وہ پلنگ کا بستر ترتیب دینے لگیں۔

"اللہ معافی۔۔۔لوگ صحیح کہتے ہیں کہ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔سالوں گزرے دیکھ بھال کرتے کہ آگے

پیچھے کوئی نہیں اس کا۔ پھر بھی ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ بے دید کہیں کا۔۔۔"

تکیہ کراؤن پر ٹکاتے وہ بڑابڑائیں۔اور پھر ماتھے پر بل ڈالے وہ رائیٹنگ ٹیبل کے سامنے کمرے میں دھری واحد کرسی پر آ بیٹھیں۔

"اللہ بخشے صفیہ کو۔۔۔ بروز محشر اسے منہ دکھانے کی فکر نہ ہوتی تو سارے کس بل نکالتی تیرے میں۔ بتائے دیتی ہوں تجھے کہ سدھر جا تو۔اس سے پہلے کہ میں سب تعلق بھول جاؤں اور تیرا دال دلیہ اٹھ جائے میری چنگیر سے۔۔۔ پھر اتنے بڑے شہر میں واسطہ ہوا ناں رنگ برنگ لوگوں سے تو ساری عقل اور اکڑ ٹھکانے آ جائے گی تیری۔"

یکا یک غسل خانہ کی جانب منہ کر کے وہ با آواز بلند بولیں۔

" کام نہ کاج۔۔۔ دشمن اناج۔۔۔ سارا دن اینٹھتا ہے۔ارے میں کہتی ہوں کہ یہ دکانوں کے کرائے یا زمینوں سے آئے " ٹھیکے " کے پیسوں سے ہی ساری زندگی گزرے گی کیا تیری؟؟؟ یا ساری زندگی تعلیم ہی حاصل کرتا رہے گا کیا؟؟ جب پوچھو تو آج فلاں کورس اور اب فلاں سیمسٹر۔۔۔ میں پوچھتی ہوں کوئی کام بھی کرے گا کہ نہیں تو؟؟"

پھولے ہوئے سانس میں وہ مسلسل بول رہی تھیں۔ان کی بات پوری ہوتے ہی وہ کھٹ سے دروازہ کھول کر باہر آیا اور بالکل ان کے سامنے آ رکا۔۔۔

"اففففف۔۔۔ بس کر دو خالہ کنیز۔کیوں بول رہی ہو آج اتنا؟؟ خالو سے کوئی جھگڑا ہوا تھا کیا رات کو؟ اتنا شور کرو گی تو کون کم بخت رکنا چاہے گا یہاں۔کوئی احسان نہیں کر رہیں رکھ کر یہاں۔ مارکیٹ ریٹ سے اضافی کرایہ دیتا ہوں، اور کھانے کے پیسے الگ۔۔۔ پھر میری وجہ سے آپ دونوں بوڑھے، بوڑھی، ایک بیٹی اور اس گھر کی حفاظت مفت میں ہو جاتی ہے کہ بھئی ایک ہٹے کٹے مرد کی موجودگی میں کسی کی جرات نہیں کہ اس گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔۔۔ ورنہ یہ جس رنگ برنگ زمانے کے ڈراوے آپ مجھے دے رہی ہو ناں، یہ دراصل آپ کو ہی نگل جائے۔اس مکان سمیت۔۔۔ ہاں جی۔"

گیلا منہ پونچھ کر اس نے تولیہ جان بوجھ کر پلنگ پر اچھالا تو وہ فوراً اٹھ کر پلنگ تک گئیں۔

"نوکر نہیں ہوں تمہاری کہ تم گند پھیلاؤ اور میں پیچھے پیچھے سمیٹتی رہوں۔ایک بار کمرہ ترتیب دے لوں تو تہذیب سے رہا کر۔۔۔"

گیلا تولیہ اٹھا کر انہوں نے کھڑکی کے صاف سل پر دھوپ میں پھیلا دیا۔

وہ بڑھ کر الماری سے کپڑے نکالنے لگا۔۔۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے خالہ۔میں کب کہہ رہا ہوں کہ نوکر ہو آپ میری۔آئندہ خیال رکھوں گا۔۔۔"

الماری کے پٹ تھامے کھڑا وہ مڑ کر شرارت سے مسکرایا۔

"ہمیشہ یہی کہہ کر "یہ خیال" تو کبھی نہیں رکھتا۔میں جیسے جانتی نہیں تجھے۔اور یہ ہٹے کٹے مرد کی بھی خوب کہی۔۔۔کبھی اس مرد صاحب نے غور سے شیشہ دیکھا ہے کیا؟ایک چپیڑ ماروں نا میں تو ساری "مردانگی" ہوا ہو جائے گی۔بڑا آیا میرے گھر کی حفاظت پر مامور ہونے والا۔۔۔"

اس کے لہجے میں دبی شرارت کی جھلک پا کر انہوں نے اس کا تمسخر اڑایا۔

جواباً وہ کھل کر مسکرایا۔۔۔وہ ہمیشہ ان کو یوں ہی تنگ کیا کرتا۔۔۔ان لوگوں کا تعلق بھی عجیب تر تھا۔کسی کی بھی سمجھ میں نہ آنے والا۔آپس میں پل پل دھوپ چھاؤں ہوتا ان کا یہ تعلق برسوں سے یونہی چلا آرہا تھا۔

اب بھی اسے ہنستا دیکھ کر کنیز بیگم کے ماتھے پر باقی رہ جانے والے مصنوعی بل بھی چھٹنے لگے۔

وہ کپڑے نکال کر ان کے قریب چلا آیا۔

"خالہ بالکل پریشان مت ہو آپ۔میں بس یونیورسٹی کے فوراً بعد جاب کروں گا کوئی بہترین قسم کی۔۔۔مجھے بھی صرف زمینوں اور دکانوں کے سہارے زندگی نہیں گزارنی۔"

ان سے نظریں ملا کر وہ کسی قدر اداسی سے بولا تو اس کے لہجے کی نادیدہ نمی بھانپ کر کنیز بیگم کے دل کو کچھ ہوا۔ان کے منہ سے اپنی ماں صفیہ کا ذکر سن کر یقیناً وہ دلگرفتہ تھا۔

"چل اب۔۔۔کوئی بات نہیں۔جیسا تجھے مناسب لگتا ہے کر۔۔۔مجھے ان معاملات کا کہاں پتا ہے زیادہ۔"بس یہ کہہ کر وہ نظر چرا گئیں۔

"اچھا خالہ یہ کپڑے استری کر دو۔آج ہفتہ ہوا یونیورسٹی کلاسز شروع ہوئے اور میں بس طبیعت کے بوجھل

پن کی وجہ سے آج جا رہا ہوں۔"

مدھم لہجے میں کہہ کر اس نے کپڑے آگے بڑھائے تو انہوں نے مسکرا کر تھام لیے۔

"ایمان کر دیتی ہے استری۔تو بھی آ جا نیچے تب تک ناشتہ کر لے۔"

انہوں نے بشاشت سے اسے ساتھ چلنے کو کہا۔

"ہاں آپ جاؤ میں بیگ تیار کر کے آتا ہوں۔"

اس کی بات پر وہ "اچھا" کہہ کر دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

"ایک منٹ رکو خالہ۔۔۔"

اس کی پکار پر وہ دہلیز پہ رکی منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"میں پرسوں کرایہ دے دوں گا دونوں مہینوں کا۔۔۔دراصل گاؤں جانا نہیں ہوا دو ماہ سے اس لیے دیر ہوئی کرائے کی۔اب اپنے دوست راجو کو کہا ہے گاؤں میں کہ ان سے لے کر میرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دے شہر جا کر۔۔۔تو کل بھیجے گا وہ پیسے۔"

مصروف انداز میں بیگ میں کتابیں اور رجسٹر رکھتا وہ سرسری لہجے میں بولا تو ان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی۔وہ ایسا ہی تھا۔کرائے کی بات ہمیشہ یوں ہی سرسری لہجے میں کرتا جیسے ان کے درمیان ایسا کوئی معاملہ ہو ہی نہیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔آ تا رہے گا وہ بھی۔تو بس آ اب فٹافٹ۔۔۔سارا وقت تو جھگڑے میں ہی ضائع کر دیا تو نے۔اس لیے سمجھاتی ہوں مت الجھا کر مجھ سے۔پر ناں جی۔۔۔مجال ہے ذرا بھی اثر ہو۔۔۔اب یہ تو میں ہوں جو برداشت کر جاتی ہوں۔کوئی اور ہوتا تو کب کا تجھے اٹھا باہر پھینکتا۔۔۔"

اس کی بات کے جواب میں انہوں نے جو بولنا شروع کیا تو فائنلی بیگ چیک کرتا وہ زیر لب مسکرانے لگا۔
یہی ان کی ہر صبح کی ابتدا کا عمومی منظر تھا۔صلح صفائی اور بھرپور جذبات واحساس کے بعد بھی وہ جب چاہے پھر سے لڑنے لگتے۔۔۔

"زندگی میں کچھ لوگوں کو ہم اس قدر گہرائی سے جانتے ہیں کہ ان کے بظاہر تند و ترش رویوں اور لہجوں میں

ملفوف نرم و گرم معانی اور مفاہیم با آسانی اخذ کر لیتے ہیں۔۔۔اور وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہمارے "روح شناس" ہوتے ہیں۔۔۔"

خالہ کنیز اور مصطفین کا تعلق بھی کچھ ایسا ہی تھا۔۔۔

گرم لفظوں میں ڈھکے نرم لہجوں جیسا۔۔۔

برف لفظوں میں چھپے پگھلے ہوئے جذبوں جیسا۔۔۔

☆......☆......☆

لاؤنج سے ملحقہ ایک چھوٹی سی راہداری میں استری اسٹینڈ پر کھڑی کپڑے استری کرتی ایمان نے مصطفین کو سیڑھیاں اترتے دیکھا تو شرٹ کے دامن پر تیزی سے ہاتھ چلا کر اس نے شکنیں نکالیں اور جھک کر استری کا پلگ نکال کر کپڑے ہاتھوں میں لیے اس کے راستے میں آرکی۔اپنی جھونک میں چلتا وہ اس کے اچانک سامنے آنے پر ٹھٹک کر رک گیا۔اس کے ماتھے پر بل ابھرے۔۔۔

"ایمان نظر نہیں آتا تمہیں۔؟؟اندھی ہو کیا؟ابھی ٹکر ہو جاتی تو۔۔۔"

وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھور کر بولا۔

"مجھے نظر آتا ہے تو ہی سامنے آئی ہوں۔۔۔" وہ بولی تو اس کی آنکھوں میں تحیر در آیا۔

"تمہارے یہ کپڑے دینے۔۔۔"

اس کی متحیر نظروں کے جواب میں ایمان نے فوراً استری شدہ کپڑے آگے کیے تو تقریباً جھپٹ کر وہ انہیں قریبی صوفے کی پشت پر پھیلانے لگا۔اس کی جھنجلاہٹ پر وہیں کھڑی وہ بے طرح ہنسی۔وہ لب بھینچے ہوئے اس کی اطراف سے نکلنے لگا کہ اس کی حالت کا حظ اٹھاتی وہ جگہ بدل کر پھر سامنے آ گئی۔

"ہاں ایک بات تو رہ ہی گئی۔۔۔"

سرعت سے اس کے سینے پر دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں ٹکا کر اس نے بمشکل روکا،تو وہ آنکھیں پھاڑے اسے گھورتا ہوا بولا۔۔۔

"ایمان میں لیٹ ہو رہا ہوں۔جلدی بکو۔۔۔"

اس کی بات پر ایمان کی مسکراتی آنکھوں میں مزید شرارت عود آئی۔اس کے سینے سے ہاتھ ہٹا کر ایک نزاکت سے اپنی لٹ انگلی پر لپیٹنے لگی۔

"وہ یہ کہ دراصل میں نہیں تم اندھے ہو......تم ہی منہ اٹھائے، یہاں وہاں، ادھر ادھر پورے میں، گھومتے رہتے ہو۔۔۔دھیان تمہارا نہیں ہوتا حاضر۔۔۔ذہن تمہارا منتشر ہوتا ہے۔۔۔"ایک ادا سے، دائیں جانب سینے پر جھولتے اپنے لمبے سیاہ بالوں کو پکڑ کر وہ پیچھے کمر پر جھٹک کر بولی۔۔۔

"بس ہوگئی بکواس ختم تمہاری؟؟اب میں جاؤں؟؟"

اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ کر اسے سائیڈ پر ہٹاتا وہ آگے بڑھ کر ڈائننگ روم میں آیا۔

اس کے ہٹانے پر لگے دھکے سے سنبھل کر وہ اس کی پشت کو گھورتی ہوئی گھوم کر کچن کی جانب بڑھنے لگی۔

ڈائننگ اور کچن کا دروازہ لاؤنج میں الگ، الگ تھا لیکن اندر سارا حصہ مشترکہ تھا۔بس دونوں حصوں کے درمیان واقع ڈاٹ پر نفیس پردہ لٹکا کر دونوں حصوں کی علیحدگی کی نشاندہی کی گئی تھی۔۔۔

ڈائننگ میں داخل ہو کر اس نے کچن سے کنیز بیگم کو غیر موجود پایا تو دروازہ سے مڑ کر واپس لاؤنج میں جھانکا۔۔۔

" کہاں گئی ہو ایمان؟خالہ کدھر ہیں؟؟"

اپنی پکار کا جواب اس کی ہنسی کی صورت میں اسے کچن سے ملا تو وہ فوراً پلٹ کر کچن کی طرف آیا۔وہ کچن کے وسط میں بڑے کروفر سے کھڑی تھی۔

"ایک منٹ میں یہاں سے وہاں ہوتی ہو تم خود جبکہ ابھی مجھے کہہ رہی تھیں کہ میں یہاں وہاں، اور ادھر یا ادھر پھرتا ہوں۔"

اپنے اضطراری فعل پر بے وجہ خجل ہوتا وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"جانے دو اب۔۔۔ناشتہ میں بنا چکی ہوں تمہارا۔امی سامنے راشد کی دکان سے دہی لانے گئی ہیں۔۔۔بیٹھو تم میں لا رہی ہوں۔"

اس کی خجالت نظر انداز کر کے اس نے سنجیدگی سے کہا اور سلیب پر دھرا چولہا جلا کر سالن گرم کرنے لگی۔وہ

بڑی سی میز کے گرد رکھی خوبصورت کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔

"یہ استری شدہ کپڑے مجھے ناشتے کے بعد بھی دے سکتی تھیں تم۔ صبح صبح میرا راستہ "کاٹنا" ضروری تھا کیا؟؟؟"

ناشتے کی تیار ٹرے دیکھ کر وہ بولا تو ایمان اپنی مخصوص بھیدوں بھری مسکراہٹ چہرے پر سجائے اس کے قریب چلی آئی۔

"بالکل واپسی پر ہی لے جاتے تم۔ لیکن صبح صبح جو اپنے کرائے دار ہونے کے، احسانات وفوائد جتاتے، گنواتے رہے ہو نا امی کو۔۔۔ وہ سب بھاشن سنا میں نے۔ بس سمجھو اسی کا قرض اتارا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ پر اعتماد لہجے میں بولی اور اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"لو کھاؤ۔۔۔ میں پانی لاتی ہوں۔"

وہ مڑی، پھر کچن سلیب پر پہلے سے رکھا پانی کا جگ اور گلاس اٹھا کر واپس میز پر لا رکھ دیا۔۔۔

"وہ مباحثہ معمول ہے خالہ کا اور میرا۔۔۔ تمہیں ضرورت نہیں ہمارے درمیان ہونے کی۔"

ناشتہ کرتا سر جھٹک کر وہ مصروف انداز میں بولا تو لاؤنج میں کھلتے دروازے کی جانب بڑھتی وہ رک گئی۔

"میں تمہارے اور تمہاری خالہ کے درمیان نہیں آ رہی۔ میں بس تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ ایمان راجپوت کسی کے بھی "حفاظتی حصار" کی محتاج نہیں ہے۔۔۔ میں اپنی اور اپنے گھر کی حفاظت کرنا بخوبی جانتی ہوں۔ لہٰذا آئندہ تمہارے منہ سے ایسی کوئی گوہر افشانی ہرگز نہ سنوں میں۔۔۔ سمجھ گئے؟؟"

دو ٹوک لہجے میں کہتی وہ انگلی اٹھا کر گویا اسے تنبیہ کرنے لگی۔

"ہاں ہاں سمجھ گیا میری ماں۔۔۔ اب جاؤ اور گھر کے دیگر گوشوں میں بھی رونق افروز ہوتا کہ انہیں بھی "کھڑاک" پہنچے۔۔۔"

اس کے لب ولہجے پر زچ ہوتا وہ باقاعدہ ہاتھ باندھ کر بولا تو وہ زیر لب مسکرا دی۔۔۔

"ہاں جاتی ہوں۔۔۔ لیکن میں پھر کہہ رہی ہوں مصطفین تمہیں کہ اگر آئندہ ایسی کوئی ایک بھی بات کی تو

میں خود تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔۔۔" یہ کہہ کر ایک عجب وقار سے چلتی وہ باہر نکل گئی۔

مصطفین نے اچک کر اسے جاتا دیکھا اور پھر شکر ادا کر کے وہ چپ چاپ ناشتہ کرنے لگا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایمان سے اس بارے مزید کوئی بات یا بحث مزید بے عزتی کو دعوت دینے جیسا ہوگا...

☆......☆......☆

مری جی پی او کے باہر یخ بستہ ہواؤں میں شدید برفباری کے دوران چلتی، وہ نرم و نازک لڑکی اردگرد سیاحوں کی کثرت کے باوجود سب سے جدا لگ رہی تھی۔ اس کی انفرادیت کا سبب اس کا دلکش سراپا، رعنا حسن، اور اس پر طاری عجب سی معصومیت تھی۔ اس کامنی سی لڑکی کے پیچھے دونوں جوانب، تھوڑا فاصلہ رکھ کر چلتے، سخت گیر چہرے مہرے کے حامل چار سیکیورٹی گارڈز اسے کوئی اہم شخصیت ظاہر کرتے تھے۔ موسم کی مناسبت سے اس نے بلیک لانگ کوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس کی تراش سے اس کے نازک سراپے کے دلآویز خال و خد مزید نکھر کر واضح ہو رہے تھے۔ سر پر گلابی ربن سے مزین خوبصورت سفید ہیٹ تھا تو گلے میں فر کا دیدہ زیب مفلر جو اپنی موٹائی کی بدولت اس کا تقریباً آدھا چہرہ یوں چھپائے ہوئے تھا کہ پہچان ناممکن تھی۔ لانگ شوز پہنے برف سے ڈھکی گیلی سڑک پر وہ بڑے وقار سے قدم بڑھا رہی تھی۔ جی۔ پی۔ او کے مرکزی داخلی گیٹ پر وہ رکی تو اس کے گارڈز بھی مودب ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ اس نے جنگلہ دار گیٹ کے اندر اپنے بالکل سامنے، جی پی او کے وسیع و عریض احاطے پر نگاہ دوڑائی کہ جہاں مختلف ملکی اور غیر ملکی سیاح ٹولیاں بنائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ احاطے کے فرش پر جابجا بکھرے 'برف کے سفیدے' پر لوگوں کے گدلے پاؤں کے عکس ثبت ہو رہے تھے۔ لانگ کوٹ کی جیب سے فون نکال کر اس نے بڑی نزاکت سے کوئی نمبر ملایا اور فون کان سے لگاتے ہوئے گیٹ پار کر گئی۔ احاطہ کراس کرتے ہوئے اس کی نگاہ جی پی او کی عمارت کی گلابی اور لال چھتوں پر تھی۔ ملک چین جیسی طرز تعمیر کی حامل یہ تیز ڈھلوانی چھتیں یقیناً اکثر یہاں گرنے والی برف سے عمارت کے بچاؤ کے لیے تھیں۔ کیونکہ برف کے زیادہ دیر چھت پر قیام کرنے سے چھت اور عمارت کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ دوسری جانب شاید فون نہیں اٹھایا گیا تھا۔ چھت کو دیکھ کر اب وہ عمارت کے پہلے فلور کی سامنے والی راہداریوں کو دیکھتی ہوئی جی پی او کے داخلی اونچے چبوترے کی خوبصورت اور شفاف سیڑھیوں پر آ رکی۔۔۔

"سفید برف میں ڈھکی سفید عمارت۔۔۔شوٹ کے لیے اس سے بہتر جگہ نہیں ہوگی۔"

موبائل ہٹا کر دوبارہ نمبر ملاتے وہ بڑبڑائی۔اس کے سرد ہونٹ کانپے تو کوئی مترنم سر فضا میں بکھر گئے۔لبوں کی چٹک سے مسکان ابھری تو ہواؤں کے دھاروں نے کوئی دلنشین راز سارے میں اچھال دیا۔

ایسی مسکراہٹ کہ جس پر آس پاس بکھرے اس سارے برف زار کی کل نرماہٹ کا احساس شامل ہو۔

"ہیلو۔کہاں ہو تم؟؟ کب سے رابطے کی کوشش میں ہوں۔شوٹ کے لیے فائینل شیڈول میسج کر دو۔بار بار کی اس تبدیلی سے بڑی کوفت ہوتی ہے مجھے۔۔۔"

دوسری جانب فون کال اٹھائے جانے پر وہ قدرے رعب سے بولی۔گلے میں پڑا اس کا مفلر سرکا تو اس کا چہرہ عیاں کر ہو گیا۔دلکش نقوش کے حامل چہرے میں آنکھوں کی خوبصورت بناوٹ، قدرتی تہہ دار پپوٹے، اور اس کے دلنشین ہونٹوں کے نغمگیں کنارے واضح ہو کر منظر کا جلو بڑھا رہے تھے۔ستواں باریک ناک میں پہنی چھوٹی سی لونگ اس کے چہرے پر تکبر کا ہلکا سا تاثر جگا رہی تھی تو آنکھوں کی چمک اس کے اعتماد اور وقار کی جھلک دیتی تھی۔۔۔

"ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گی وقت پر۔لیکن اس سے پہلے تم آؤٹ ڈور مناظر کے سارے معاملات سلجھا لینا۔کسی پاکستانی پلیٹ فارم پر میرا اسین شوٹ کرنا آسان ہرگز نہیں ہوگا اور پھر جلد فری ہو کر مجھے رات کو ہی ترکی کی فلائیٹ لینی ہے۔"

یہ کہتے وہ نظریں اٹھا کر عمارت کی چھت پر جھکے دیو قامت درختوں کی برف پوش شاخیں دیکھنے لگی۔کہیں کہیں برف سفیدے سے جھلکتا پتوں کا سبزہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔

اس نے فون بند کیا اور عمارت کی اوپری راہداریوں کو دیکھتی ہوئی چبوترے پر چڑھ گئی۔وہاں موجود لڑکیوں کے ایک ٹولے نے اسے پہچانا اور چند پل کے لیے وہ سب ساکت ہو گئیں۔انہیں جیسے یقین نہیں آیا کہ وہ ان کے درمیان ہو سکتی ہے۔۔۔سکتہ ٹوٹا تو ٹین ایجر لڑکیوں کا وہ گروہ اس کی جانب تیزی سے بڑھا۔

"آہ۔۔۔ہمیں یقین نہیں ہو رہا کہ یہ آپ ہی ہیں گیتی۔۔۔یہاں مطلب ہمارے ملک میں؟؟ واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز۔۔۔"

ان میں سے ایک خوشی سے چیختے ہوئے بالکل قریب آئی تو اس کے گارڈز نے اسے روکنا چاہا۔

"ارے نہیں بھائی۔ لیٹ ہر کم ٹو می۔ اتنی محبت کون ٹھکراتا ہے بھلا۔"

گیتی نے بازو پھیلا کر جلدی سے کہا تو وہ لڑکی اس کے انداز پر جیسے مر مٹی۔۔۔

وہ بڑھی اور تیزی سے اس کے گلے لگ گئی۔

"بڑا سنا تھا کہ یہ 'انڈیا والے' 'بڑے دل کے ہوتے ہیں۔ بھئی آج دیکھ بھی لیا۔۔۔ سو نائس آف یو۔"

وہ ایک بار گیتی کو شانوں سے تھام کر الگ ہوئی اور یہ کہہ کر دوبارہ گلے لگا لیا۔ باقی لڑکیاں دور کھڑی شوق سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اور پاکستانیوں کی بے لوث محبت میں بھیگتے مجھے آج ایک ماہ ہو چکا ہے۔"

اسے خود میں بھینچ کر اس نے پھر نرمی سے ہٹایا اور گارڈز کو باقی لڑکیوں کو بھی آنے دینے کا اشارہ کر کے خود بھی ان کی جانب بڑھی۔

"کیسی ہو آپ سب؟ کیسے حالات ہیں؟ کیسا گزر رہا آپ سب کا مری ٹرپ؟؟"

سب سے علیک سلیک کرنے کے بعد وہ خوشدلی سے بولی۔

"ہم سب اچھے ہیں۔ سب کچھ اے ون ہے۔ اور آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سچ کہیں تو یقین نہیں ہو رہا کہ بھارتی فلم انڈسٹری کی مین لیڈ ہیروئین ہمارے درمیان ہیں۔"

ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے سب کی طرف سے جواب دیا تو گیتی کھل کر ہنسی۔

"آہ۔۔۔ ہاؤ سویٹ یو آل آر رئیلی۔۔۔ یقین تو اب کرنا ہی پڑے گا کہ بھئی میں ابھی موجود ہوں آپ سب کے ساتھ۔۔۔ اور یہ زندگی ہے میری جان یہاں کب کوئی، کہیں بھی مل جائے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔ سو کسی کے بھی ملنے پر حیران نہیں ہونا آئندہ۔ کیونکہ لوگ یونہی بچھڑ بھی تو جاتے ہیں۔۔۔"

لہجے کے دلکش اتار چڑھاؤ میں کہی گئی اس کی یہ بات اس قدر اثر انگیز تھی کہ وہ سب مبہوت ہو گئیں۔

"ہاں ایک بات کہ پاکستان بڑے خوبصورت رویوں کے مالک بہترین لوگوں کا ملک ہے۔ یہاں سے بہت پیار سمیٹ کر بھارت جا رہی میں۔ کوشش کروں گی یہ محبت وہاں سے آپ سب پر واپس نچھاور کر دوں۔"

پیار سے کہہ کر اس نے قریبی دو لڑکیوں کی کلائی پر ہاتھ دھرا تو وہ سب مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

" آپ بہت اچھی ہیں۔ ہمارے ملک کی پسندیدگی اور تعریف کا شکریہ۔ ہمیں بھی انڈیا بہت پسند ہے اور ہم سب دوستیں وہاں جانا چاہتی ہیں۔ خاص کر ہمیں تاج محل آگرہ اور تاریخی اہمیت کا حامل شہر لکھنو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

سب کی نمائندہ وہی لڑکی دوبارہ بولی تو اپنے ملک کے بارے ان کی رائے جان کر گیتی پورے دل سے مسکرائی۔

" ضرور آنا۔۔۔ تمہیں بھارت عام تاثر سے ہٹ کر ایک پیار بھرا ملک لگے گا۔ وہاں کے لوگ، ان کے رویے، انداز گفتگو اور دیگر انداز و اطوار سب آپ جیسا ہے۔ ہاں جب آؤ تو میرے گھر باندرہ لازمی آنا۔ چاہو تو نمبر لے سکتی ہو۔ ہمیشہ خوش آمدید۔ اب مجھے جانا ہو گا میں یہاں اپنے ایک پرائیویٹ سونگ کی لوکیشن ہنٹ کرنے آئی ہوں، جو جلد یہاں شوٹ ہو گا کیونکہ اس عمارت کی وہ سامنے کھلی راہداریاں اور یہ سیڑھیوں والا چبوترا اس کے لیے بہترین لگ رہا ہے مجھے۔"

انڈیا آنے کی دعوت دے کر اس نے اپنی فی الوقت مری آمد کا مقصد بتایا اور اجازت طلب لہجے میں جانے کا بتایا۔

" صحیح۔۔۔ ماشاء اللہ۔۔۔ ایک منٹ رکیں پلیز بس یہ بتا دیں کہ آپ اتنی اچھی اردو کیسے بول لیتی ہیں؟؟"

باقی لڑکیوں نے ایک طرف ہٹ کر اسے جانے کا راستہ فراہم کیا تو اس لڑکی نے تیزی سے سوال کیا۔ گیتی نے بڑھتے قدم روک کر بغور اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجب سی لپک کا تاثر تھی۔ قابل دید اعتماد تھا۔

" ہم اداکار لوگ ہیں چندا۔۔۔ زبان و بیان سے ماورا ہوتے ہیں اور لب و لہجوں کے ماہر۔۔۔ دنیا غور کرے تو ہم زبان سے نہیں اپنے انداز سے بات کرتے ملیں گے۔ ہاں ایک اہم تربات یہ بھی کہ اردو، عربی، فارسی، اور ہندی تو بہت ملتی جلتی زبانیں ہیں۔ کوئی بھی تھوڑی سی توجہ سے ان پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ ویسے فی

الحال یہ ایک زیرِ تکمیل فلم ہے میری جس کے لیے اردو لب ولہجہ ضروری ہے تو میں آف دا کیمرہ بھی یہی زبان اپنائے ہوئے ہوں تاکہ کردار کا لہجہ متاثر نہ ہو۔۔۔اب اجازت۔۔۔آدابِ وداع۔"

خالص اردو لہجے میں کہہ کر اس نے آخر پر دایاں مرمریں ہاتھ، ماتھے پر رکھ کر آداب کیا اور عمارت کے اندرون کی جانب بڑھ گئی۔۔۔

تب سے مودب کھڑے اس کے گارڈز نے اردگرد ایک شاطر نگاہ دوڑا کر مستعدی سے اس کا پیچھا کیا۔

"یار یہ کتنی خوبصورت ہے۔اور اس کا پیار بھرا انداز۔۔۔آہ آہ۔۔۔مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔۔۔"

پروقار چال چلتی دور جاتی گیتی کو دیکھتی ہوئی اس کے گلے لگنے والی پہلی لڑکی اس کی شخصیت کے سحر میں رہ کر کھوئی کھوئی بولی۔۔۔

باقی سب نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلا کر گویا اس کی تائید کی تھی۔۔۔

" کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں باقی سب کو اپنے لفظوں اور ذات کے سحر میں جکڑنا آتا ہے۔۔۔"

بھارتی معروف اداکارہ گیتی انہی " کچھ " میں سے ایک تھی۔۔

☆......☆......☆

گو کہ وہ گھر سے جلدی نکلا تھا لیکن صبح صبح ٹریفک کے اژدھام کی بدولت پندرہ منٹ کی تاخیر سے یونیورسٹی پہنچا۔نوٹس بورڈ سے اپنا کلاس شیڈول دیکھ کر، طویل راہداری میں بھاگتا ہوا وہ کلاس روم کے دروازے کے سامنے آرکا اور پہلے سے سنورے بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں پھر سے ترتیب دے کر دروازے پر لگے چھوٹے شیشے سے کلاس میں جھانکا۔

پروفیسر پروجیکٹر کی مدد سے کوئی کالم سلائیڈ کھول کر وائٹ بورڈ پر کچھ نکات سمجھانے میں مگن تھا۔جبکہ طلبا و طالبات نہایت خاموشی سے اس کی طرف متوجہ تھے۔ایک طائرانہ نگاہ سب پر ڈال کر، شیشے سے ہٹتے ہوئے وہ خود کلام ہوا۔

"ہمیشہ دیر کر دیتا ہے یار تو۔اب ہمت کر اور کلاس کا سکوت توڑ دے۔"

پھر بڑے اطمینان سے دروازے کھول کر وہ کلاس روم میں داخل ہوگیا۔

پروفیسر سمیت سب نے چونک کر اسے دیکھا۔اس کی آمد قطعی غیر متوقع تھی کہ باہر "ڈوناٹ ڈسٹرب" کا بورڈ بھی آویزاں تھا۔

"السلام علیکم سر۔بہت معذرت کہ میں دیر سے آیا۔۔۔اور اس سے پہلے یہ بھی معذرت کہ میں آج پہلے دن آیا ہوں۔کچھ نجی مصروفیات کی بدولت میں سیشن کے آغاز سے ایک ہفتہ بعد آیا ہوں۔یقیناً میں نے کلاس کو ڈسٹرب کیا ہے لیکن اس وقت یہ ضروری تھا۔میرا مطلب ہے میری مجبوری تھی کلاس میں یوں داخل ہونا۔"

پروفیسر سے مخاطب ہو کر تفصیلاً کہتے اس نے گاہے بگاہے پوری کلاس پر بھی نگاہ کی۔اس کے انداز اور کی گئی وضاحت پر کلاس میں دبی دبی ہنسی گونجی۔اپنی بات مکمل کر کے وہ بڑے اعتماد سے پروفیسر کو دیکھنے لگا جو کہ اس کی تیز رفتار وضاحت کا ہر جز سمجھنے کی کوشش میں تھے۔

"وعلیکم السلام مسٹر۔۔۔جہاں اتنا سب کچھ ایک سانس میں بتایا ہے، ساتھ نام بھی بتا دیتے تم تو مخاطب ہونے میں آسانی ہوتی۔اور کوشش کیا کرو کہ ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کی جائے۔بہر حال انرولمنٹ سلپ مجھے دو اور تشریف رکھو۔کل سے ٹھیک وقت پر آنا ورنہ یوں تو بالکل مت آنا کلاس میں۔سمجھ گئے؟؟"

انہوں نے تنبیہی لیکن نرم لہجے میں کہہ کر اسے بیٹھنے کی اجازت دی تو وہ مسکرایا۔

"جی بہتر سر۔سمجھ گیا میں۔بہت شکریہ اور مصطفین نام ہے میرا سر جی۔مصطفین شجاع۔"

مودب لہجے میں کہہ کر اس نے وہیں کھڑے کھڑے نشست کی تلاش میں پہلی رو میں جھانکا۔سٹوڈنٹس میں سے کئی ایک نے اس کے نام بتانے پر اظہار پسندیدگی کے طور پر لمبا سا "اوہ" کیا تو پروفیسر نے سب کو گھور کر خاموش کروایا۔

اس کے پر اعتماد، مودب انداز اور خوبصورت شخصیت نے سب کو اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔دلکش لبوں پر کھلتی خوش رنگ مسکان لیے وہ سب کو دیکھ رہا تھا۔اس کی خوبصورت، چمکتی ہوئی آنکھیں بلا کی جاذب تھیں۔

"بہت پیارا نام ہے بیٹا آپ کا۔اس کا مطلب کیا ہے؟؟ یقیناً یہ لفظ مصطفیٰ سے نکلا ہے۔ایم آئی رائیٹ؟؟"

پہلی رو میں براجمان ایک لڑکی اور لڑکے کے ساتھ ایک نشست خالی دیکھ کر وہ اس جانب بڑھا تو پروفیسر کی

بات پر پھر سے رک گیا۔ پوری کلاس کا سارا دھیان اب بھی اس پر مرکوز تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

" تھینکس سر۔۔۔ اور جی بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ مصطفین دراصل مصطفٰی کی جمع ہے۔ اور اس کا مطلب ہوتا ہے چنا ہوا۔۔۔ منتخب کیا گیا۔"

خوشدلی سے کہہ کر وہ ان کی طرف دیکھتا رہا تو جواباً مسکرا کر، اثبات میں سر ہلاتے انہوں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

وہ انہی لڑکی لڑکے کے ساتھ بیٹھنے کو آگے بڑھا۔

" لو جی۔ ایک اور تمہاری طرح کا عجوبہ آ گیا ہے سفیر۔ اور مبارک ہو کہ یہیں آ رہا ہے۔ ہمارے پاس۔ بیگ اٹھاؤ اپنا نشست سے۔"

ثومیہ نے طنزاً کہہ کر اسے چھیڑا تو پروفیسر کو غیر متوجہ دیکھ کر وہ بولا۔

" کسی کی اتنی ہمت نہیں کہ سفیر کے ساتھ خود سے بیٹھنے کی جرات کرے۔ دیکھنا مرعوب ہو کر خود ہی چلا جائے گا دوسری رو میں بیٹھنے کے لیے۔"

اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کسی قدر غرور سے کہا تو وہ لب بھینچ کر مصطفین کو اپنی جانب بڑھتا دیکھنے لگی۔ اس کی خود پسندی ہر بار اسے تپا دیتی تھی۔

" اور ابھی تم کہتے ہو تم مغرور نہیں ہو۔ اپنی ہی تعریفیں مرتب کر رکھی ہیں تم نے تمام الفاظ کی۔"

وہ بالکل قریب آ چکا تھا جب ثومیہ غصے میں بڑبڑائی۔ وہ خاموش رہا۔

" السلام علیکم دوست۔۔۔ یہ بیگ تمہارا ہے کیا؟؟ برائے مہربانی اٹھا لو تا کہ میں بیٹھ سکوں۔"

ان کے سر پر کھڑا وہ اعتماد سے نشست طلب کرنے لگا تو سفیر کی آنکھوں میں در آئی حیرت دیکھ کر ثومیہ سے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

سفیر بجائے بیگ اٹھانے اور سلام کا جواب دینے کے ثومیہ کو گھورنے لگا تو مصطفین نے حیرت سے ان دونوں کو باہم " مصروف " دیکھا۔ اسے دل ہی دل میں اس کا انداز کھلا لیکن نظر انداز کر گیا۔ پھر اس نے مڑ کر ایک نظر ڈائس کے اندر کھڑے پروفیسر کو دیکھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے مختلف صفحات الٹ پلٹ کرتے کسی مخصوص

صفحے کی تلاش میں تھے۔باقی کلاس میں سے بھی کچھ ان تینوں کی جانب اور کچھ باہم متوجہ تھے۔

"جناب بیگ اٹھالو اپنا۔مجھے بیٹھنا ہے۔کلاس رکی ہوئی کب سے میری وجہ سے۔"

بیگ اٹھا کر اس نے باقاعدہ اس کی گود میں رکھ دیا تو سفیر نے اپنے مخصوص انداز سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ثومیہ آگے ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھائی جی آپ کے ان نین نشیلوں کو بعد میں تاک لوں گا۔ابھی جب تک سر مطلوبہ صفحہ تلاش نہیں کر لیتے تب تک رسم تعارف نبھا لیتے ہیں۔کیا خیال ہے؟؟"

اسی انداز سے اسے دیکھتے وہ بھرپور اعتماد سے بولا تو ثومیہ ہنس پڑی۔وہ سفیر کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مصطفین صاحب یہ سفیر ہیں۔اور میں ثومیہ۔ان کے اطوار کا برا مت منائیے گا پلیز۔یہ دل کے بہت اچھے ہیں۔"

اسے متوجہ پا کر وہ خوشدلی سے بولی تو سفیر کو دیکھتے ہوئے اس نے ہونٹ سکیڑے۔

"اوہ اب سمجھا۔۔۔بے چارہ گونگا ہے۔اتنی اچھی شکل و صورت پر ایسا نقص ہونا۔۔۔چچ چچ چچ۔۔۔بہت افسوس ہوا مجھے۔سچی۔"

بغور اس کا چہرہ دیکھتا وہ تاسف سے بولا اور بات کے اختتام پر ثومیہ کی طرف نگاہ کی۔

"اچھا لگا آپ دونوں کا نام جان کر ثومیہ۔۔۔شکریہ۔لیکن آپ کے بھائی کے گونگے ہونے کا مجھے بہت افسوس ہے۔"

اس کا مصنوعی متاسفانہ انداز اور پھر لفظ "بھائی" پر زور دینا سفیر کو بے طرح تپا گیا جبکہ ہنسی ضبط کرتی ثومیہ سر کو کتاب پر جھکا گئی۔

"اوئے ہیلو۔۔۔زیادہ تیز بننے کی ضرورت نہیں ہے۔اور یہ کارکردگیاں دکھا کر سویٹ بھی مت بن۔سمجھا۔بہت برے لگتے ہیں وہ لوگ مجھے جو چالاک بننے کی کوشش کریں۔"

یکدم اس کا بازو تھام کر وہ سختی سے بولا تو مصطفین کی آنکھوں میں کوئی مبہم رنگ جھلک کر معدوم ہو گیا۔پھر

بڑے اطمینان سے اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت اپنی کلائی سے ہٹا کر وہ متوازن لہجے میں بولا۔

" تمہیں کیسے لوگ " اچھے " لگتے ہیں مجھے یہ جاننے میں قطعاً دلچسپی نہیں ہے سفیر۔ اور تیز، چالاک یا سویٹ مجھے " بننے " کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ الحمدللہ میں یہ سب پہلے سے ہوں۔۔۔"

اس کی بات پر سفیر نے سختی سے لب بھینچ کر پروفیسر کی طرف دیکھا جو انہیں متوجہ کرنے کے لیے ڈائس پر بورڈ مارکر بجا رہے تھے۔ کلاس دوبارہ شروع ہونے پر ان کے باہم رویے پر پریشان ہوتی ثومیہ نے بھی شکر کیا کہ ان دونوں کی بحث نے باقاعدہ لڑائی کا رخ اختیار نہیں کیا۔ ان دونوں کا یکا یک اتنا سنجیدہ ہو جانا اس کے لیے غیر متوقع امر تھا۔ گہرا سانس بھر کر اس نے مصطفین کو دیکھا جو ان دونوں سے توجہ ہٹا کر اب سامنے مرکوز کیے بیٹھا تھا۔ اس کی پراعتماد آنکھوں میں بے نیازی کی واضح جھلک تھی۔ جبکہ سفیر کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ ثومیہ کو ان دونوں کی خاموشی کسی طوفان کے پیش خیمہ کی مانند لگی۔ دل ہی دل میں سب عافیت گزرنے کی دعائیں کرتی وہ سامنے وائیٹ بورڈ پر دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

دوسری منزل کے تمام کمروں کے سامنے ایک طویل راہداری تھی جس میں بازار کی جانب بڑی بڑی کھڑکیاں رکھی گئی تھیں جن کی سل پر دو فٹ اونچی سیمنٹ کی جالیاں لگا کر انہیں کسی بھی قسم کی گراوٹ سے محفوظ کیا گیا تھا۔ قطار میں موجود تمام کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں اسی راہداری میں کھلتے تھے۔ بیرونی کھڑکیوں پر نرم و ملائم پردے لٹکائے گئے تھے جو ہوا کے دوش پر باہر وسیع بازار، اور راہداری کے اندر بیک وقت لہرا رہے تھے۔ طویل راہداری کے آخری سرے پر موجود ایمان انہی جالی دار کھڑکیوں میں سے ایک پر محویت سے کھڑی، سامنے موجود نیلی مسجد کے اونچے گنبد دیکھ رہی تھی۔ صاف ستھری راہداری کے لہراتے ہوئے سفید پردوں کے درمیان جھلک دیتا اس کا لال رنگ وجود ماحول کی دلکشی بڑھا رہا تھا۔ اس کے گلے میں پڑا لال رنگ دوپٹہ ہوا کی بدولت دونوں اطراف سے، ان پردوں کی ہمراہی میں لہرا رہا تھا۔ اپنے لمبے، سیاہ اور کھلے بالوں کو گردن کی بائیں جانب سے سینے پر پھیلائے وہ مسلسل ان پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم جھونکے اپنے گلال رنگ چہرے پر محسوس کر کے، اس کے دلکش لبوں کے خوش کناروں سے انتہائی ساحر مسکان ابھری اور ایک ادا سے کمر کو

مدھم سا خم دے کر وہ آسمان کی وسعتوں میں اڑتے پرندوں کے غول دیکھنے لگی۔ کسی خوش کن تصور سے اس کے دلنشین چہرے پر گویا دھنک کے ہر رنگ نے آن قیام کیا تو منقش کھڑکی کے چھوٹے رنگدار ستون کی ٹیک لگائے کھڑی ایمان کسی دیو مالائی کہانی کا کوئی مسحور کن کردار لگی تھی۔

" کتنا پرلطف ہوتا ہوگا نا یوں آسمانوں سے زمین پر جھانکنا۔۔۔ کاش کبھی میں بھی یوں ہی زمین دیکھوں۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تو آنکھوں میں گویا دیپ جل اٹھے۔

چمکتی ہوئی کانچ سی آنکھیں۔۔۔

خوابوں کی سلگی ہوئی آنچ سی آنکھیں۔۔۔

بازار سے گزرتے ایک سبزی فروش نے صدا بلند کی تو غول سے نگاہ ہٹا کر اس نے گلی میں دیکھا۔ ریڑھی پر سبزیاں سجائے بیچتا سبزی فروش بازار میں چلتے افراد کے درمیان دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ دکانوں پر معمول کی بھیڑ تھی تو مختلف تھڑوں پر ٹولیاں بنائے بیٹھے آوارہ گرد لڑکوں کا ہجوم بھی جوں کا توں موجود تھا۔ ان میں سے کچھ کن انکھیوں سے اسے تاڑ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ایمان کے ماتھے پر بل ابھرے اور بالوں کو ایک جھٹکے سے کمر پر پھینک کر اس نے گویا ان سب کو نخوت سے دھتکارا تھا۔

" بہت بگڑ رہا ہے اندرون لاہور سارا اب۔۔۔ امی ٹھیک کہتی ہیں کہ اب جوان لڑکیوں کے بے سبب کھڑکیوں سے جھانکنے کے دن ہوا ہوئے۔"

غصے میں بڑبڑاتی وہ پلٹ کر لہراتے ہوئے پردوں کے مابین چلنے لگی۔ وقتی اشتعال سے چہرے پر بکھری دھنک کے رنگ ایک پل کو معدوم ہو کر پھر سے ابھر آئے تھے۔ اس کے اٹھتے قدموں میں عجب نزاکت تھی۔ دوپٹے کا ایک کونا انگشت شہادت پر لپیٹتی وہ گویا ہواؤں سے گلے مل رہی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ کام کاج سے فراغت پا کر بالائی منزل پر یونہی گھومتی رہتی تھی۔ گھر کے اس حصے سے اسے عجب لگاؤ تھا۔

وہ راہداری میں کھلتی سیڑھیوں کے دہانے پر پہنچی کہ کنیز بیگم نیچے سے اوپر آتی دکھائی دیں۔ وہ رک کر ان کی منتظر ہوئی۔

" ایمانے تو یہاں گھوم رہی ہے پتر اور نیچے سارا گھر چھان مارا میں نے۔ میں سمجھی کام نمٹا کر سوگئی ہو شاید۔ یہ

مصطفین کا کمرہ بھی صاف کر دیا ہے کیا؟؟ یوں تو پہلے ہی صاف ہے۔ بس چادر، تکیہ کور اور تولیہ بدل دو اب۔"

ریلنگ تھامے اوپر آتی وہ پیار سے بولیں تو وہ مسکرا دی۔

"اس وقت نیند نہیں آتی مجھے امی۔ معلوم تو ہے آپ کو۔ اور کوئی ضرورت نہیں اس کا کمرہ صاف کرنے کی مجھے، نہ آپ کو۔۔۔ دیکھا نہیں کتنی بدتمیزی کر رہا تھا وہ صبح آپ سے؟؟ نوکر نہیں ہیں ہم اس کے۔ سمیٹے آ کر اپنے پھیلاوے خود۔"

نرم لہجے میں کہتے ہوئے یکا یک اس کا لہجہ سختی میں ڈھلا تھا اور ابروتا نے اس نے آخری سیڑھی پر پہنچی ماں کا ہاتھ تھام کر اوپر آنے میں مدد کی۔ اس کی بات پر وہ سمجھداری سے مسکرائیں۔

"بالکل جھلی ہے تو ایمانے۔۔۔ تجھے ابھی اس کی پہچان نہیں ہے۔ سونے جیسا دل ہے اس کا۔ کھرا تولہ۔۔۔ ایک دم خالص۔ اور یہ تو اس کا مجھ سے تعلق ایسا ہے کہ سگی خالہ سمجھ کر ہر لہجے میں بات کر لیتا ہے۔ ورنہ بڑی عزت کرتا ہے میری۔ تو خواہ مخواہ نہ دل پر لیا کر اس کی باتیں۔ کیونکہ وہ دل سے کچھ نہیں کہتا۔"

پیار بھرے لہجے میں انہوں نے اس کی تعریف کی تو وہ بے طرح چڑ گئی۔

"بس کریں امی۔ اتنا بھی بیبا نہیں ہے وہ جتنا آپ کو لگتا ہے۔ اور کرنی ہیں تو خود کریں خدمتیں اس کی۔ مجھے مت کہا کریں۔ میں نے تو صبح ناشتے پر دھمکی دے دی ہے اسے کہ آئندہ کوئی اوٹ پٹانگ بات کی تو سامان اٹھا کر باہر پھینکوں گی اس کا۔ اور دیکھنا آپ وہ باز نہیں آیا تو میں یہ کر بھی گزروں گی۔"

اس نے تنک کر کہا اور بات کے اختتام پر دونوں بازو سینے پر باندھے بڑے غرور سے گردن اکڑا لی۔ انہوں نے تعجب سے اس کا انداز دیکھا اور بولیں۔

"آئے ہائے یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔ تجھے کس نے کہا تھا اس سے ایسی بات کہنے کو؟ کیا سوچتا ہوگا وہ بن ماں باپ کا بچہ؟؟ کہ میں اب اکتا کر تیرے ذریعے اسے جانے کا کہلواتی ہوں؟؟"

اسے ٹہوکا دے کر انہوں نے فکرمندی سے کہا۔ ان کے لہجے میں گھلا کچھ دیر پہلے کا پیار اب مفقود تھا۔ مصطفین کے متعلق وہ شروع سے یوں ہی حساس تھیں۔ خود اسے کچھ بھی کہتیں لیکن کسی اور سے اس کی برائی ہرگز نہیں سن سکتی تھیں۔

"افوہ امی۔۔۔آپ کا کوئی حل نہیں ہے سچ مچ۔ یہ لہجے میں درد سموئے جسے آپ بن ماں باپ کا "بچہ" کہہ رہی ہیں نا۔۔۔وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ آج بیاہ ہو تو سال بعد ایک عدد بچے کی ماں نہیں تو باپ ضرور بن سکتا ہے۔لہٰذا یہ اموشنل ڈرامہ بند کریں پلیز۔"

بازو کھول کر ہوا میں جھلاتے وہ درشتی سے بولی تو کنیز بیگم اس کی بے باکی پر جیسے دھک رہ گئیں۔انہوں نے جھٹ اس کی کمر پر جھولتے لمبے بالوں کو اپنی مٹھی میں دبوچا اور جھنجھوڑ کر بولیں۔

"ناں تجھے شرم نہیں آتی ماں کے سامنے ایسی واہیات بات کرتے؟؟ آ لے آج تیرا باپ کام سے۔۔۔ سناتی ہوں اسے تیری جراتوں کے قصے۔فکر مت کر۔"

ایمان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوئے۔اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے بالوں میں آیا ان کا ہاتھ تھام لیا اور ایک جھٹکے سے باہر کھینچا۔

"بس بھی کریں امی۔۔۔حد ہوتی ہے جانبداری کی۔اس کی محبت میں آپ تو اپنی ہی بیٹی کے خلاف ہوئی جاتی ہیں۔اور بے شک بتایئے گا ابو کو۔میں نے کوئی غلط یا انوکھی بات تو نہیں کی۔ بلکہ آپ کیا میں خود کہہ دوں گی ان سے۔"

بال چھڑوا کر ان سے دور ہوتی وہ غصے سے بولی تو اس کے انداز بے نیازانہ نے انہیں مزید تپا دیا۔وہ جھکیں اور پاؤں سے چپل اتارنے لگیں۔

"میں جا رہی ہوں نیچے امی۔آپ آرام سے چاکری کر کے آ جانا اس کی۔اور کھانا بھی اب آپ خود تیار کریں گی۔مجھ سے نہیں ہوتا۔ہاں۔"

ان کے چپل اٹھانے سے پہلے وہ بھاگ کر سیڑھیوں پر رکی اور یہ کہتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔۔۔اس کا لال دوپٹہ اب پیچھے پیچھے، سیڑھیوں کے فرش پر دور تلک گھس رہا تھا۔

"بڑی بدتمیز ہو گئی ہے یہ۔کوئی بات نہیں سنتی دھیان سے۔مجال ہے کہ کسی بات، کسی نصیحت کا اثر لے۔۔۔"

اس کے بعد یہ کہتی وہ کمرے کی طرف بڑھنے لگیں۔

" کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں وہ بن ماں باپ کا...... "بچہ "۔۔۔" اس کے کمرے میں داخل ہوتے وہ بڑبڑائیں لیکن اس بار اسے "بچہ " کہنے میں انہیں قدرے تامل ہوا تھا۔

☆......☆......☆

کلاس برخاست ہونے پر جونہی پروفیسر باہر گیا مصطفین نے بھی اپنی کتاب اٹھائی اور ان دونوں کی جانب دیکھے بنا اٹھ کر چلا گیا۔ثومیہ نے اپنی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں رکھیں پھر تاسف بھری نگاہ سے بالوں میں انگلیاں پھنسائے بیٹھے سفیر کو دیکھا۔۔۔کلاس سے باہر جاتے سٹوڈنٹس کو دیکھ کر وہ سب کے چلے جانے کی منتظر رہی اور جونہی آخری لڑکی بھی اپنے عبائے کا کونا مٹھی میں دبائے باہر نکلی وہ گویا ہوئی۔

" یہ کیا حرکت تھی سفیر؟؟ اتنا سخت رویہ کیوں اپنایا تم نے؟؟ وہ اچھا لڑکا تھا۔لیکن تمہاری خود پسندی کا بھی اپنا عالم ہے۔اگر تمہاری توقع کے برخلاف وہ پراعتماد ہے یا تم سے مرعوب نہیں ہوا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ تم اخلاقیات بھول جاتے۔"

بیگ کاندھے پر ڈالتی وہ اٹھی اور اس کے سر پر کھڑے ہوکر ناصحانہ انداز میں کہا۔وہ پچھلے ایک ہفتے سے ہر روز ایک ساتھ بیٹھتے تھے اور اب باہم کافی گھل مل بھی چکے تھے لہٰذا اس نے بلا جھجک اور بے نقط سنائیں اس کو۔ اس کی باتوں سے اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور درشتی سے بولا۔

" تم یہ تقریر بند کروگی پلیز۔۔۔اس کی بدتمیزی نہیں ملاحظہ فرمائی تم نے اور میرا غلط رویہ دکھ گیا تمہیں۔کیسے مذاق اڑا رہا تھا وہ میرا۔آج تک کسی کی جرات نہیں کہ مجھ سے یوں بات کرے۔بس نہیں ہوا برداشت مجھ سے۔ اچھا کیا میں نے۔اب سامنے آیا یا مزید کوئی ایسی حرکت کی تو دیکھنا دانت بھی توڑوں گا اس کے۔۔۔ناں توڑے تو کہنا۔"

" اوہ کم آن سفیر۔۔۔خدارا اپنی اس خود پسندی کو خود شناسی کا نام دینا چھوڑ دو۔یہی تو تمہارا مسئلہ ہے کہ ہر کوئی تم سے مرعوب ہوتا ہے لہٰذا جو نہیں ہوا وہ تمہیں برا لگ گیا۔اس نے قطعاً کوئی مذاق نہیں اڑایا تمہارا۔وہ بس مذاق کررہا تھا۔تمہیں دراصل اس کا مذاق کرنا نہیں اپنے "اندازے" کا غلط ثابت ہونا کھلا ہے۔"

اس کی ہی طرح درشت لہجے میں کہتی وہ بڑے تیقن سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔کچھ کہے بنا وہ اٹھا

اور بیگ کندھے پر لٹکاتا اسے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔یقیناً وہ اب بھی مصطفین پر غصہ تھا یا شاید آئینہ دکھائے جانے کا برا مان گیا تھا۔

تیز تیز چلتا وہ راہداری کے وسط تک پہنچا کہ وہ بھاگتی ہوئی بمشکل اس کے ہمراہ ہوئی۔راہداری میں سب طلبا نے اسے یوں اس کے پیچھے بھاگتے دیکھا تو ایک دوسرے کو بھنویں اچکا کر "ملاحظہ کرنے" کی دعوت دی۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے سفیر؟؟تمہیں اندازہ بھی ہے کیا کہ تمہاری بدولت میرا بھی تشخص خراب ہوا ہوگا اس کی نظر میں۔میرے خیال سے ہمیں اسے مل کر اس سے معذرت کرنی چاہئیے۔"

تیزی سے اس کے ساتھ ساتھ چلتی وہ گویا اسے ترغیب دے رہی تھی۔اس کی بات پر وہ راہداری میں کھلتی سیڑھیوں کی ریلنگ تھامے رکا اور خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔

"اتنی تہذیب تمہیں ہی مبارک ہو۔میں نے کچھ غلط بی ہیو نہیں کیا۔وہ اسی رویہ کے قابل تھا جو میں نے اس سے رکھا۔خودرتی بھر تمیز نہیں تھی اسے۔اور اب میں کینٹین میں جا رہا ہوں۔تم جاؤ اور اپنا تشخص درست کر آؤ اس کی نظر میں اسے ڈھونڈ کر۔ملتے ہیں پھر اگلی کلاس میں۔"

غصے میں بات کرتے ہوئے اختتام پر اس کا لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا۔

اس کے طنز پر ایک پل کو متعجب ہو کر وہ اسے دیکھتی رہی۔وہ اس سے اس لب ولہجہ کی توقع نہیں رکھتی تھی۔سفیر بھی وہیں رک کر گویا اس کے "فیصلے" کا منتظر ہوا۔

"جاؤ تم کینٹین۔مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔اور کوئی ضرورت نہیں میرے ساتھ بیٹھنے کی اگلی کلاس میں۔مجھے نہیں پسند ایسی رعونت کسی میں بھی۔"جز وقتی توقف سے کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور طویل راہدری میں چل کر ایک بڑی سی کھڑکی کی سل پر آ بیٹھی۔

اس نے رک کر دور تلک اسے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر سیڑھیاں اتر گیا۔۔۔

☆......☆......☆

کلاس سے باہر نکل کر مصطفین راہداری کی تیسری کھڑکی کے پاس پڑے ایک اسٹیل بینچ پر آ بیٹھا،کندھے سے بیگ اتار کر اپنی دائیں جانب خالی نشست پر پٹخا اور چند طویل سانس بھرے۔یقیناً خود کو متوازن کرنے کی

یہ ایک لاشعوری کوشش تھی۔۔

" کیسے کیسے عجوبے موجود ہیں دنیا میں۔ سمجھتا کیا ہے وہ خود کو؟؟ گدھا۔ کلاس کا خیال نہ ہوتا تو سارے کس بل نکال دیتا میں اس کے۔"

سفیر کے خشک رویے پر اسے شدید غصہ آیا تھا۔ اس کا رویہ اس کے لیے بہت حیران کن بھی تھا کیونکہ اپنے تئیں اس نے کوئی غلط یا نامناسب بات نہیں کی تھی اس سے۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ پہلی ہی کلاس میں اس کے ایک ہلکے سے مذاق کی بدولت کسی سے جھڑپ ہو جائے گی۔ طبعاً چونکہ وہ ایک صلح جو شخص تھا لہٰذا اس جھڑپ کے چپقلش میں ڈھلنے کے خدشے کے پیش نظر انہیں نظر انداز کر آیا تھا لیکن غصہ اب تک برقرار تھا۔ طویل سانسیں بھر کر اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور پھر اٹھ کر نزدیکی واٹر کولر سے پانی پینے لگا۔ پانی پی کر دھیمے قدموں سے چلتا واپس اسی بینچ تک آیا تو دماغ بہت حد تک ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ جھک کر بیگ اٹھاتے اس نے خود کلامی کی۔۔۔

" دفع کرو یار۔۔۔ چل کر پروفیسرز سے ملا جائے تا کہ ایک ہفتے کی کلاسز کے نوٹس کا حصول ممکن ہو جو کہ چھوٹ گئیں مجھ سے۔"

وہ مڑا اور اساتذہ کے کمروں پر درج نیم پلیٹ پڑھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ایک کمرے کی نیم پلیٹ پڑھ کر وہ رکا اور قدرے تامل کے ساتھ دروازے کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوا۔ وہی پروفیسر جو کچھ دیر پہلے ان کی کلاس میں تھے ایک بڑی سی میز کے گرد بیٹھے کسی فائل کی ورق گردانی میں مگن تھے۔

" السلام علیکم سر۔۔۔"

اس نے مودب ہو کر سلام عرض کیا۔

اس کی آمد پر انہوں نے سر اٹھایا اور بشاشت سے بولے۔۔۔

" وعلیکم السلام۔۔۔ آؤ آؤ مصطفین بیٹا۔۔۔ تشریف رکھو۔"

انہوں نے اخلاقاً اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سوالیہ نظریں لیے منتظر رہے۔

" بہت شکریہ سر۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ مجھے دراصل ایک سلسلے میں آپ سے ضروری بات کرنی ہے اس وجہ سے حاضر ہوا ہوں۔"

"جی جی بولو بیٹا۔۔۔کیا مدد کر سکتا ہوں میں تمہاری؟؟"

نرم لہجے میں کہہ کر انہوں نے فائل بند کر کے ایک طرف کی اور عینک اتار کر میز پر رکھتے وہ گویا پوری طرح متوجہ ہوئے۔۔۔

چونکہ انہوں نے اسے بیٹھنے پر اصرار نہیں کیا تھا لہٰذا اس نے بھی فوری اپنی آمد کا مقصد بتانا مناسب سمجھا۔

"سر مجھے پچھلے ایک ہفتے کے تمام لیکچرز کے نوٹس درکار ہیں تو کائینڈلی اگر آپ مجھے فراہم کر دیں تو۔۔۔"

اس نے اپنی بات کا مقصد بتایا تو انہوں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اچک لی۔

"ہاں بیٹا میں سمجھ گیا۔آپ ایسا کرو کہ ایک سٹوڈنٹ ہے ثومیہ شاہجہان، اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ میں نے تمہیں سارے نوٹس فراہم کرنے کا کہا ہے۔وہ تمہاری مدد کر دے گی۔ٹھیک؟؟"

اسے کہہ کر انہوں نے دراز کھولی، ایک کتاب نکال کر اپنے سامنے میز پر رکھی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ثومیہ کا نام سن کر وہ جھجک گیا۔کچھ دیر پہلے ہوئی جھڑپ کی وجہ سے وہ دوبارہ ان کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اب یہاں سر کو یہ "تفصیل" کہنا بھی اسے غیر مناسب لگا۔اس کا تامل اور خاموشی جانچ کر پروفیسر کے ماتھے پر لکیر فکر ابھری اور بولے۔

"کیا بات ہے مصطفین؟؟ کیا سوچنے لگے ہو بیٹا؟؟ کوئی اور بھی مسئلہ ہے کیا؟؟ اگر ہے تو پوچھ سکتے ہو۔۔۔بولو۔"

ان کے مخاطب کرنے پر وہ جیسے خیال سے چونکا پھر انہیں کتاب کھولتے دیکھا اور واپس جانا مناسب سمجھا۔یقیناً وہ مصروف تھے۔

"جی نہیں سر۔۔۔اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔میں مل لیتا ہوں ثومیہ سے۔۔بہت شکریہ۔"

وہ مسکرایا تو انہوں نے بھی ایک الوداعی مسکراہٹ سے اسے نوازا پھر عینک لگائی اور سر جھکا کر کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔وہ مڑا اور آرام سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"افففففف یار۔۔۔کیا کروں اب؟؟ ثومیہ کے پاس کیسے جاؤں دوبارہ۔یقیناً وہ اسی" کھڑوس" کے ساتھ ہو گی کہیں۔۔۔اور یہاں سر کو بتانا بھی نامناسب تھا کہ آج پہلے ہی دن معرکہ سرانجام دے چکا ہوں میں۔

کیا کروں یار اب؟؟؟"

ایک ہاتھ کا مکا بنا کر اس نے ہتھیلی پر مارا اور راہداری میں بے سبب چلنے لگا۔ پھر یکا یک ایک خیال سے اس کے چہرے پر مسکان ابھری۔

"ارے کیا پتا یہ کوئی اور ثومیہ ہو؟۔۔۔ ثومیہ شاہجہان۔ ہاں یہ ممکن تو ہے۔"

ایک تھوڑی سی مسکراہٹ سے ہی اس کا چہرہ کھل گیا۔

"لیکن اگر یہ وہی ہوئی تو۔۔۔"

اگلے ہی خیال سے مسکراہٹ پھر سمٹ گئی۔ اس دوران بے دھیانی میں چلتا وہ دوبارہ سٹیل کے اسی بینچ پر آ بیٹھا۔ اردگرد نگاہ کی تو مختلف طلبا گروپس میں کھڑے طلبا کو دیکھ کر اس کا دھیان بٹنے لگا۔۔۔ کچھ طالب علم راہداری کی کھڑکیوں میں بیٹھے باہر صحن میں جھانک رہے تھے۔ کچھ مختلف دیواروں سے ٹیک لگائے باتوں میں مگن تھے۔

کاندھوں پر مختلف ڈیزائنیز کے بیگز لٹکائے، رنگا رنگ کپڑے، منفرد جوتے پہنے، ایک دوسرے کے ساتھ لیکن باقیوں سے بے نیاز ہر فرد الگ ہی دنیا کا باسی لگتا تھا۔ کسی نے ہاتھ میں فقط ایک رجسٹر تھام رکھا تھا، کوئی کتابیں اٹھائے چلا جا رہا تھا تو کوئی باہم ہنسی مذاق، کھینچا تانی میں مصروف تھا۔ اس کے قریب ہی لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ کسی صفحے کو باری باری پڑھتا، اس پر مباحثے میں مصروف تھا۔

باری باری سب کے چہرے پڑھتے اس نے عجیب سا تاثر دیکھا۔۔۔

اپنا آپ منوا لینے کا تاثر۔۔۔ بے نیازی کا تاثر۔۔۔

صرف "میں" کا تاثر۔۔۔

کچھ دیر کے لیے وہ سب کی سرگرمیاں نوٹ کرتا رہا اور پھر سر جھکا لیا۔

شاید وہ تھک گیا تھا۔۔۔

یقیناً وہ تھک گیا تھا۔۔۔

"اتنے چہروں میں سے کوئی ایک بھی تو شناسا نہیں ہے۔ اتنی دنیا ہے بندہ کسی کو ہاتھ بڑھا کر روک نہیں سکتا

کہ دو گھڑی بے سبب بات کر لی جائے۔ٹھیک کہتی ہے خالہ کنیز۔۔۔ یہ دنیا کسی کی نہیں ہے۔ بڑی بے ثبات ہے۔۔۔اور بڑی لاتعلق بھی۔"

اصل بات بھول کر وہ عجب سا اداس ہونے لگا۔خواہ مخواہ۔۔۔بے طرح۔۔۔اور بے سبب۔۔۔

اس کی خود کلامیوں میں عجب یاسیت کا رنگ جھلکتا تھا۔

اردگرد موجود افراد میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ سالوں گزرے کہ خاموشی سے سر جھکائے اپنے قدموں کو گھورتا وہ شخص "بیگانوں" میں کسی "اپنے" کا متلاشی ہے۔۔۔"

☆......☆......☆

ثومیہ کا غصے سے برا حال تھا۔ایک ہفتے کی اس دوستی میں یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا کہ اسے سفیر سے کوئی اختلاف ہوا ہو۔وہ دونوں ہر بات پر مختلف نظریات رکھتے تھے۔ ہر منظر پر مختلف نگاہ ہوتی تھی ان کی۔اگر وہ دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ تھی تو صرف اس وجہ سے کہ دونوں ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرنا جانتے تھے۔ سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ ثومیہ نے اسے کبھی کسی کا مذاق اڑاتے نہیں دیکھا تھا۔وہ ہمیشہ سب سے اخلاق و مروت سے پیش آتا تھا۔لیکن آج مصطفین سے اس نے جو سلوک روا رکھا وہ اس کے لیے نا قابل برداشت تھا۔ وہ ایسے کسی فرد کو اپنا دوست نہیں گردان سکتی تھی جو کسی کی عزت کرنا نہیں جانتا ہو۔جو کسی سے بے وجہ چپقلش بنا لے۔کھڑکی کی سل پر بیٹھ کر باہر وسیع صحن میں جھانکتے اس نے سفیر کو کینٹین کی طرف جاتے دیکھا تو اظہار غصہ و ناراضی کے طور پر اپنا رخ پھیر لیا۔

"بدتمیز۔۔۔ذرا نہیں سوچا کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔بس اپنی بات منوانے کا عادی ہے۔آئندہ اس سے بات بھی نہیں کرنی مجھے۔جہنم میں جائے۔شوخا۔۔۔مغرور کہیں کا۔خود پسند۔"

راہداری کی منقش چھت کو گھور کر اس نے اپنے دانتوں تلے گویا سفیر کو پیستے ہوئے کہا۔

"اسے فرق نہیں پڑتا لیکن مجھے ضرور پڑتا ہے کہ کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے۔کیسا گمان رکھتا ہے۔ مجھے مصطفین سے پرسنلی معذرت کرنی چاہیئے۔ایک بار تو ضرور۔۔۔"

سل پر دھرا بیگ پکڑ کر وہ اٹھ گئی۔جا بجا کھڑے طلبا کے درمیان بڑے وقار سے چلتی وہ متوازن رفتار سے

آگے بڑھ رہی تھی کہ ٹھٹک کر اچانک رک گئی۔۔۔

اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اسٹیل بینچ پر یا سیت سے سر جھکائے بیٹھا وہ یقیناً مصطفین ہی تھا۔اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ وہ اس قدر آسانی سے مل جائے گا۔

وہ آہستگی سے اس کے قریب گئی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟؟ مجھے ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔۔۔"

اس کے مخاطب کرنے پر اس نے ایک چونک کر سر اٹھایا اور پھر یکا یک اس کی آنکھوں میں تحیر ابھرا۔۔۔

اسے بھی قطعاً امید نہیں تھی کہ اتنی بڑی یونیورسٹی میں وہ اس قدر آسانی سے مل جائے گی۔

بلکہ خود چل کر اس کے سامنے آرکے گی۔اسے مخاطب بھی کرے گی۔

"تشریف رکھیں۔۔۔"

اپنی حیرت پر قابو پا کر اس نے اپنا بیگ اٹھا کر گود میں رکھا اور اسے جگہ فراہم کر کے سوالیہ نظریں اس پر گاڑ دیں۔اپنی بات سے پہلے وہ اس کی آمد کا مقصد جاننا چاہا۔کچھ دیر پہلے کلاس میں ہوئی بحث کے بعد اسے امید نہیں تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی دوبارہ ان سے مخاطب ہوگا۔

کچھ جھجکتی ہوئی وہ اس سے قدرے ہٹ کر بیٹھ گئی اور ہنکارا بھر کر چپ چاپ اسے دیکھا۔اس کے انداز پر اس نے واضح محسوس کیا کہ من ہی من اندر وہ بات کرنے میں کسی علت کا شکار ہے۔اسے یہ بھی لگا کہ وہ ضرور سفیر کے بارے میں بات کرنے ہی آئی ہوگی۔ورنہ ذاتی طور پر اسے کیا کام ہوسکتا تھا اس سے بھلا؟؟ جبکہ وہ ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔

"جی ثومیہ کہیئے آپ کو جو کہنا تھا۔اور اگر آپ سفیر کے رویے سے متعلق کچھ وضاحت دینا چاہتی ہیں تو پہلے بتادوں کہ اٹس فائن۔میں نے اس بات کو زیادہ نہیں سوچا۔"

ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر اس نے گویا اسے بات کا سرا مہیا کیا۔۔۔

یہ یقیناً جھوٹ تھا کیونکہ وہ اس کے غلط رویے پر اچھا خاصا کڑھا تھا کچھ دیر۔

"جی۔۔۔دراصل میں اسی کی بابت بات کرنے آئی ہوں۔دیکھیں مجھے اس کے رویے کا افسوس ہے۔اور

اس کی دوست ہونے کے ناطے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں اس کی طرف سے۔۔۔وہ بہت اچھا ہے۔بس آج جانے کیوں غلط بی ہیو کر گیا۔۔۔؟امید کرتی ہوں کہ آپ دل میں نہیں رکھیں گے۔"

ٹھہر ٹھہر کر بولتی وہ معذرت کے ساتھ ساتھ اس کی بھی صفائی دینے لگی۔۔بات کے اختتام پر اپنے لفظوں پہ خود وہ حیران ہوئی۔

"یہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟؟اس گدھے کی صفائیاں میں کیوں دینے لگی۔کھڑوس کہیں کا۔۔۔"

دل میں خود کو ملامت کرتے ہوئے اس نے کسی قدر مسکرا کر مصطفین کو دیکھا۔۔۔اس کی عمیق نظریں اپنے چہرے پر مرکوز پا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔اسے یوں لگا جیسے وہ اس کے چہرے سے اس کا اندرون جان لے گا۔۔۔

"جو بات ابھی آپ کے بھی فقط گمان تک ہے۔۔۔آپ وہ بات میرے یقین تک لانے پر کیوں مصر ہیں؟؟؟بہت معذرت کہ آپ کا چہرہ بتا تا کہ اپنے لفظوں کہ حقیقت پر آپ کو بھی شک ہے۔"

اور اسے ٹھیک لگا تھا۔۔۔

اس کے چہرے سے اس نے اس کا اندرون جان لیا تھا۔۔۔

نرم لہجے میں کہہ کر وہ ہلکا سا مسکرایا۔بے ساختہ اسے دیکھ کر وہ کچھ کہتی کہتی رکی اور پھر بے بسی سے اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

"بہر حال میں آپ کے آنے کی قدر کرتا ہوں۔میرے دل میں آپ کی عزت بڑھی ہے۔اور اس بات کو جانے دیجیئے کہ وہ کیسا ہے کیسا نہیں۔ہاں یہ بات میں جان چکا ہوں کہ آپ یقیناً بہت اچھی ہیں۔عمدہ اخلاق ہے آپ کا ماشاءاللہ۔۔۔"

خوشدلی سے کہتا وہ دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکا کر جھک کر اسے دیکھنے لگا۔۔۔

اس کی بات پر پہلی بار وہ پورے دل سے مسکرائی۔اسے اچھا لگا تھا اس کا یوں کہنا۔۔۔حساس رویوں کو سمجھ جانے والے لوگ اسے ہمیشہ سے بہت اچھے لگتے تھے۔۔۔اب بھی اس نے مزید اس بات کو طول دینا مناسب نہیں جانا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بہت شکریہ مصطفین۔۔۔اچھا لگا آپ سے بات کر کے۔میرے دل پر جو بوجھ تھا ہٹ گیا ہے۔سلامت رہیئے۔اور اب اجازت۔میں چلتی ہوں۔خدا حافظ"

یہ کہتی ہاتھ ہلا کر،اس کا جواب سنے بغیر وہ اچانک پلٹ گئی تو اسے یاد آیا کہ اسے بھی اس سے بہت ضروری کام ہے۔باتوں کے دوران وہ اپنا مقصد بھول گیا تھا۔۔۔

بیگ کاندھے پر لٹکاتا وہ اٹھا اور بینچ پر آخری نگاہ ڈال کر کچھ بھی یہیں نہ چھوٹ جانے یقین کرتا ہوا سرعت سے اس کے پیچھے گیا۔

"بات سنیں ثومیہ۔۔۔دراصل مجھے بھی آپ سے ایک کام ہے۔اور میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔"

وہ صحن میں اتر چکی تھی جب اس نے راہداری کی سیڑھیوں پر رک کر اسے پکارا۔وہ رکی اور مڑ کر دیکھا تو وہ بھاگنے کے سبب ماتھے پر بکھر جانے والے اپنے بال درست کر رہا تھا۔سورج کی کرنیں اس کی گہری بھوری آنکھوں میں پڑ کر چمکدار عکس دے رہی تھیں تو گلال رنگ ہونٹوں کی دلکش دھاریں بھی روشنی سے نکھر کر مزید واضح ہوئی تھیں۔چہرے پر کسی قدر بوکھلائے ہوئے تاثرات لیے ثومیہ کو وہ ایک معصوم بچہ لگا۔۔۔

ایسا بچہ کہ جو ایک بھرپور مرد میں پوشیدہ ہو۔۔۔

کچھ سوچ کر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

"اوہ۔۔۔تو آپ اسٹیل بینچ پر بیٹھے "وہاں" میری تلاش میں تھے۔۔۔امیزنگ۔۔۔کوئی ایسے کسی کو کیسے ڈھونڈ لیتا ہے؟؟"

اس کی بات پر وہ چونکا۔یقیناً وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

اس کے شریر لہجے میں دوستی کی جھلک پا کر وہ برجستگی سے بولا۔

"دراصل میں آپ کے ملنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔اور اتنی شدت سے کہ آپ مل بھی گئیں۔"وہیں" رہ کر۔۔۔بیٹھے بیٹھائے۔۔۔"

بغور اسے دیکھتا وہ دلکشی سے بولا تو وہ کھل کر ہنسی۔وہ محویت سے ہوا میں بکھرتی جلترنگ سننے لگا۔

"یہ کہنے میں تو اب آپ حق بجانب ہیں۔بھئی میں خود جو چلی آئی وہاں۔۔۔خیر یہ بتائیے کیا کام تھا مجھ

سے؟؟" اسی نرم ہنسی میں اس نے بات مکمل کی تو انہی سروں کی ہر دھن پر سرشار ہوتا وہ سیڑھیاں اتر کر اس کے مقابل آن رکا۔

" آپ ہی شاہجہان بھی ہیں نا؟؟ ثومیہ شاہجہان؟؟"

اس نے پورا نام دہرا کر پوچھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت در آئی کہ یہ پورا نام کیسے جانتا ہے اس کا۔۔۔

" جی جی بالکل میرا ہی نام ہے۔خیریت؟؟"

وہ سوالیہ نظریں لیے منتظر ہوئی تو وہ بشاشت سے گویا ہوا۔

" گڈ...... میں ابھی سر علی عبداللہ کے پاس پچھلی تمام کلاسز کے نوٹس لینے گیا تھا تو۔۔۔"

وہ یہاں تک پہنچا کہ ثومیہ نے بات اچک لی۔

" تو سر نے آپ کو میرا نام و پتا فراہم کیا کہ اس لائبریری سے آپ کو نوٹس مل جائیں گے۔۔۔ مکمل، کامل اور پورے کے پورے...... اففففف ایک تو سر نے بہت آگے لگا رکھا ہے مجھے۔۔۔ پہلے دن سے لے کر آج تک میں نیو کمرز کو نوٹس ہی مہیا کرتی آئی ہوں۔ پڑھا شڑھا میں نے بھی خاک نہیں ان سے۔۔۔ ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔۔۔"

جھنجلا کر کہتے اس نے بات کے اختتام پر اپنے ماتھے پر ہتھیلی ماری تو مصطفین کو اس سے نوٹس کا حصول مشکوک لگا۔ وہ ساری بات سمجھ گیا تھا کہ وہ آئے روز کی اس خدمت و مروت سے تنگ آئی ہوئی ہے۔

اس کی خاموشی اور تاثرات پڑھ کر وہ پھر بولی۔

" آپ کیوں پریشان ہو گئے۔ میں تو جنرل بات کر رہی تھی۔ ویسے بھی سر کی بات ٹالی تھوڑی نا جاتی ہے۔ چلیں لائبریری میں فوٹو کاپئیر ہے اس سے کاپی کروا دیتی ہوں۔"

اسے ہمراہ چلنے کا اشارہ کرتی وہ مڑی تو طویل صحن سے گزر کر وہ دونوں لائبریری کی جانب بڑھنے لگے۔

چپ چاپ اس کی ہمراہی میں چلتے اس نے گویا شکر ادا کیا تھا۔ کچھ پل اسی بے سبب خاموشی کی نذر ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کا مزاج سمجھنے کی کوشش میں تھے۔ دونوں کو باہم اس "اجنبیت" میں عجب کشش محسوس ہو رہی تھی۔۔۔

" آپ کا نام۔۔۔ثومیہ شاہجہاں۔ یہ کچھ تاریخی سا نام نہیں لگتا؟؟ بھاری بھرکم لفظ ہے شاہجہان۔۔۔"
وہ لائبریری کی سیڑھیوں تک پہنچے تھے کہ وہ رک کر سرسری لہجے میں بولا۔۔
اس کے سوال پر وہ بھی رکی اور اسے دیکھ کر پوری شدت سے ہنس دی۔
مصطفین نے سنا کہ ساز پھر سے چھڑ گیا تھا۔۔۔
سر پھر سے بکھر رہے تھے۔۔۔
اس کی شاندار ہنسی میں عجب موسیقیت تھی۔۔۔
لیکن موسیقیت کے علاوہ بھی کچھ نادیدہ تھا اس ہنسی میں۔۔۔
جو محسوس ہو کر بھی غیر محسوس سا تھا۔۔۔
فی الحال وہ اس کی جلترنگ ہنسی میں پوشیدہ اس راز کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔
" آپ اس قدر ہنس کیوں رہی ہیں میری بات پر؟؟"
اس کی ہنسی طویل ہوئی تو اس نے استفسار کیا۔
" کچھ خاص نہیں۔ دراصل میرے نام کے متعلق یہی یا اس سے کچھ ملتے جلتے الفاظ سفیر نے بھی کہے تھے جب ہم پہلی بار متعارف ہوئے تھے۔ ابھی آپ کے کہنے پر مجھے یہی خیال آیا کہ کس قدر ملتا جلتا خیال ہے آپ دونوں کا۔" ہنسی روک کر اس نے وضاحت کی اور پھر سے ہنسنے لگی۔
سفیر کے ذکر و خیال پر مصطفین یکدم سنجیدہ ہو گیا۔۔۔
ثومیہ نے اس کی بے طرح خاموشی کو پوری شدت سے محسوس کیا اور ہنسی روک لی۔۔۔
" ویسے آپ کا نام بہت اچھا ہے۔ مصطفین شجاع۔۔۔ بڑا منفرد۔ اور بہت خوبصورت بھی۔"
یہ کہہ کر وہ تیزی سے لائبریری کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔۔۔
وہ اس سے "سفیر" کے موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔
اس نے ایک پل کو رک کر اس کا موضوع بدلنا محسوس کیا تو اس کے لب چٹکے۔
یقیناً وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے سفیر سے اپنا تقابل اچھا نہیں لگا۔

پھر مسکراتا ہوا وہ بھی اس کے پیچھے لائبریری میں داخل ہو گیا۔۔۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر منصور عالم ابھی ابھی کلینک سے دوپہر کے کھانے پر گھر لوٹے تھے اور لاؤنج کے آرام دہ صوفے پر براجمان ٹی وی ریموٹ ہاتھ میں لیے وہ بے دلی سے مختلف چینل بدل رہے تھے۔ ڈریس پینٹ شرٹ پر نفیس سی ٹائی لگائے وہ بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ تازہ کی گئی شیو کی بدولت ان کی صحت مند جلد بہت چمکدار لگ رہی تھی۔ ان کا شمار ان مردوں میں ہوتا تھا جن پر عمر اپنی تاریخ رقم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ پینتالیس سال کی عمر میں بھی وہ بمشکل پینتیس سال کے لگتے تھے۔ سر کے گھنے بالوں سے جھلکتی سفیدی کو وہ خضاب لگاتے تو اور جوان لگتے تھے۔ خوش شکل، خوش گفتار، دراز قد اور چوڑے شانے۔۔۔ ان کا مجموعی شخصیت بہت شاندار تھی۔ لیکن فی الوقت ان کے چہرے پر تھکن کا تاثر نمایاں تھا۔ اکتا کر انہوں نے ٹی وی بند کیا اور ٹانگیں پھیلا کر انہوں نے بھرپور انگڑائی لی۔ پھر صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اسی وقت ذکیہ خاتون پانی لیے چلی آئیں۔

"یہ پانی پی لیں منصور۔ اور منہ ہاتھ دھو کر آ جائیں۔ میں تب تک کھانا لگا دیتی ہوں۔ آپ کی پسند کا شلجم گوشت پکایا ہے آج۔"

ٹرے درمیانی میز پر رکھ کر وہ فرش پر بیٹھیں اور پانی گلاس میں ڈال کر انہیں پیش کرتے ہوئے کہا۔ آنکھیں کھول کر وہ انہیں دیکھ کر مسکرائے اور گلاس تھام لیا۔

"تھینکس بیگم جان۔۔۔ آپ کی۔ خدمت گزاری کے تو ہم دلی معترف ہیں بھئی۔ آپ بخوبی جان جاتی ہیں کہ کب ہمارا کیا کھانے کا دل ہوتا ہے۔۔۔"

پانی پینے سے پہلے انہوں نے گلاس منہ کے قریب روک کر کہا تو وہ شرما کر نرمی سے مسکراتی ہوئی اٹھ گئیں۔

وہ ہمیشہ تنہائی میں یا پیار سے انہیں "بیگم جان" کہا کرتے تھے اور وہ یونہی شرما جایا کرتی تھیں۔

"سفیر کب تک آئے گا؟؟ کیا وقت ہو گیا ہے؟"

وہ مڑ کر دو قدم ہٹی ہوں گی کہ گلاس منہ سے ہٹاتے انہوں نے سوال کیا اور پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی سے

وقت دیکھنے لگے۔

"لو پونے ایک ہوئے ہیں۔ابھی تو بہت دیر ہے شاید اس کے آنے میں۔"

وہ رکیں تو انہوں نے مزید کہا۔

"جی بالکل۔۔۔ وہ کم از کم تین بجے واپس آتا ہے۔ یونیورسٹی دور بھی تو بہت ہے۔۔۔ خیر میں آتی ہوں۔"

ان کی تائید کر کے انہوں نے سرسری لہجے میں کہا اور باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ بھی فوراً اٹھے اور لاؤنج سے ملحقہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔تولیے سے منہ خشک کرتے وہ باہر نکلے تو میز پر کھانے کے برتن رکھ کر وہ تیزی سے بڑھیں اور ان سے تولیہ لے کر قریب دھرے اسٹینڈ پر پھیلانے لگیں۔دونوں میاں بیوی کی باہم کمال انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ہر کام میں ان کا ایک معمول مقرر تھا۔۔۔دونوں وہی معمول بخوبی انجام دیتے تھے۔یہ تولیہ لے کر پھیلانے والا بظاہر عام سا عمل بھی ان کا روزمرہ تھا۔

"ذکیہ بیگم عادتیں خوب بگاڑ رکھی ہیں آپ نے میری۔میرا ذرا ذرا کام بھی خود انجام دے دے کر۔۔۔"

پیار سے پکارا جانے والا یہ ان کا دوسرا نام تھا۔۔۔وہ ان کے نام سے "خاتون" ہٹا کر "بیگم" کا بدلاؤ کرتے تھے۔وہ دوبارہ صوفے پر جا بیٹھے اور پلیٹ میں کھانا نکالنے لگے۔ان کی بات سے سرشار ہو کر وہ مسکراتی ہوئی ان کے سامنے آ رکیں۔

"بس کیا کروں میں بھی۔۔۔ مجھے بھی عادت ہوگئی ہے آپ کے یہ چھوٹے چھوٹے اعترافی جملے سننے کی۔ سوچتی ہوں اگر یہ خدمت گزاری نہیں ہوگی تو یہ سب کہاں سننے کو ملے گا مجھے۔۔۔"

بشاشت سے انہیں چھیڑتی وہ بڑھیں اور ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ان کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسے۔

"یعنی ہم دونوں ایک دوسرے کی عادات کو خوب تقویت دیتے ہیں۔اور یہ اعتراف کی بھی خوب کہی ذکیہ بیگم آپ نے۔۔۔ بھئی یہ تو میری محبت ہے بس۔ جو آپ کی خدمت گزاری سے مشروط ہرگز نہیں ہے۔آپ نہ بھی خدمت کریں تو میری طرف سے آپ کی صلاحیتوں کو سراہنے میں کمی واقع نہیں ہوگی۔آزما لیجیئے۔۔۔"

ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ اخلاص سے بھرپور لہجے میں بولے۔ان کے اکسانے پر وہ بے ساختہ

نگاہ چرا گئیں۔

منصور عالم روز اول سے ایسے ہی تھے۔۔۔

کھلے اظہار کرنے والے۔۔۔

وارفتگیاں لٹانے والے۔۔۔

محبتیں نچھاور کرتے ہوئے۔۔۔

بات کر کے وہ اب کھانے کی طرف متوجہ تھے۔

" چھوڑیں یہ سب باتیں۔ ہر وقت آپ اسی موڈ میں ہوتے ہیں۔ ایک ضروری بات کرنی ہے مجھے آپ سے۔"

انہوں نے موضوع بدلنا چاہا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔

" ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ بولیں۔۔۔ کیا بات ہے؟؟"

منہ میں رکھا نوالہ چبا کر انہوں نے اسے نگلتے ہوئے کہا اور پانی ڈالنے کو جھک کر ہاتھ بڑھایا تو وہ بڑھیں اور خود پانی ڈال کر دیا۔ پھر ان کے پانی پی لینے کی منتظر ہوئیں۔۔۔

گلاس ہٹا کر انہوں نے سوالیہ نظریں ان پر گاڑ دیں۔

" میں سوچ رہی ہوں کہ سفیر کو بائیک لے دیں۔ کیونکہ بہت دور یونیورسٹی ہے اس کی۔ گارڈن ٹاؤن کا تو لوکل روٹ بھی بمشکل ملتا ہے۔ وہ روز کلاس میں بھی دیر سے پہنچتا ہے اور گھر بھی۔ یوں اس کا آدھا وقت ضائع ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے؟؟"

لہجے کے زیر و بم میں تفصیلاً کہہ کر انہوں نے ان کی رائے طلب کی تو کھانے سے ہاتھ روک کر وہ بولے۔

" آپ ٹھیک کہتی ہیں بیگم۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت تیز رفتاری سے بائیک چلاتا ہے۔ بس مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ کہیں گر، گرا کر کوئی نقصان نہ کروا لے اپنا تو میں یونیورسٹی داخلے کے ساتھ اسے بائیک بھی دلا دیتا۔ اب بھی میں تو یہی کہوں گا کہ سوچ لو آپ۔ یا اسے اچھی طرح سمجھا لو جو کہ ناممکن ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

فکر مند لہجے میں کہہ کر انہوں نے مشروط رضامندی ظاہر کی اور کھانا کھانے لگے۔ ان کی بات پر ذکیہ بیگم

کے ماتھے پر لکیر فکر ابھری۔

وہ جانتی تھیں کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ حقیقتاً بہت بے پرواہی اور تیز رفتاری سے چلاتا تھا۔ اب خاموشی سے کھانے کھاتے منصور عالم کو دیکھتے ہوئے انہوں نے پہلے سفیر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور مسکرا دیں۔

"اوکے۔۔۔ میں پہلے اس سے بات کرلوں۔ پھر آپ کو بتاؤں گی فائینلی۔"

ان کی بات پر انہوں نے خوشدلی سے "اوکے" کہہ دیا۔

ہمسفر کی عزت کرتے ہوئے محبتیں لٹانے والا ان دونوں کا کپل بہت شاندار تھا۔۔۔

☆......☆......☆

کینٹین میں ایک کارنر ٹیبل پر بظاہر کتاب کھولے بیٹھا وہ دل میں مسلسل کڑھ رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان کتاب کی بجائے مصطفین، پھر اس کے بعد ثومیہ سے ہوئی بحث پر مرتکز تھا اور ارد گرد موجود ہر فرد کا اس کے دلکش چہرے کے بنتے بگڑتے نقوش پر۔۔۔

"میری دوست ہو کر ایک بے ہودہ بلکہ اوچھے شخص کی جانبداری کی ہے اس نے میرے سامنے۔ جبکہ وہ جانتی بھی ہے کہ مجھے بالکل پسند نہیں آیا وہ مسخرہ۔۔۔"

غصے میں خود کلامی کر کے اس نے اچانک کتاب کے دونوں پٹ اس زور سے بند کیے کہ گویا ان دونوں کا کچومر نکالا ہو۔

بلاشبہ اس روپ میں بھی اس کے رخ کا ہر زاویہ قابل دید تھا۔۔۔

اور قابل داد بھی۔۔۔

دو میزیں چھوڑ کر بیٹھی لڑکیوں کے ایک گروپ نے باآواز بلند قہقہہ لگایا تو چونک کر انہیں دیکھتا وہ اپنے دھیان سے باہر آیا۔

ان سے نگاہ ہٹا کر اس نے اپنی موبائل اسکرین سے وقت دیکھا۔۔۔

"کلاس کا وقت تو بس ہوا ہی چاہتا ہے۔۔۔ فضول باتوں کو جھٹک کر مجھے اب جانا چاہیئے۔۔۔"

کتاب بیگ میں منتقل کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کینٹین کے مین کاؤنٹر پر جا کر اس نے بل پے کیا اور باہر نکل آیا۔

موسم اچانک بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم جھونکوں نے جھوم کر اس کے دلآویز لبوں کے خوب تر کناروں کو چھوا تو صحن کے وسط میں رک کر وہ گویا ان سے اپنا پورا وجود ٹکرانے لگا۔۔۔

موسم کی خوشگواریت کا اثر تھا کہ ان چھوئے لمحات کا فسوں۔۔۔ وہ بے طرح ہنس دیا تھا۔

کچھ دیر پہلے کا غصہ، ماتھے کے بل، اور تپتی نظریں۔۔۔ سب گویا اسی ہوا کے سنگ تحلیل ہو گیا تھا۔

ہوائیں ایسی ہی ہوتی ہیں ہر چیز بہا لے جانے والی۔۔۔

ہر شے مٹا دینے والی۔۔۔

اور سفیر کو ہمیشہ سے یخ بستہ ہواؤں میں رکنا اچھا لگتا تھا۔۔۔

وہ ان سے "گفتگو" کا عادی تھا۔۔۔

دوسری طرف وہ دونوں لائبریری سے فوٹو کاپی کروا کر باہر آئے تو موسم کی حیران کن تبدیلی پر ثومیہ نے بے ساختہ اظہار مسرت کیا۔ جبکہ وہ قدرے سنجیدہ تھا۔

"مجھے سرد موسم اور ٹھنڈی ہوائیں بہت پسند ہیں مصطفین۔۔۔ اور آپ کو؟؟"

بیگ کاندھے پر لٹکائے دونوں بازو پھیلا کر وہ اس کی جانب دیکھ کر پوچھنے لگی تو وہ یاسیت سے مسکرایا۔

اس کی آنکھوں میں پوشیدہ کرب کی ہلکی لکیر پڑھ کر اس نے آہستگی سے اپنے بازو سمیٹے اور سوالیہ نظریں لیے اس کے جواب کی منتظر رہی۔

کچھ لوگ بہت جلدی کسی کی حالت جان لیتے ہیں۔ یہ اس کی حساسیت تھی کہ وہ اس کی نادیدہ کیفیت جان گئی تھی۔

"ایک وقت تھا کہ مجھے بھی سرد ہوائیں اور ٹھنڈا موسم بہت اچھا لگتا تھا۔ پھر زندگی نے ایسے موسموں سے روشناس کروایا کہ فقط برف لہجے اور یخ بستہ رویے یاد رہ گئے۔۔۔ اب عالم یوں ہے کہ مجھے صرف "زرد موسم" اچھے لگتے ہیں۔"

لائبریری کی سیڑھیوں پر رک کر، صحن میں لگے درختوں کی چوٹیوں تکتا وہ کرب آمیز لہجے میں یوں کھویا ہوا بولا کہ ثومیہ کو یقین ہونے لگا کہ وہ اس پل اس کے سامنے "لائبریری کی سیڑھیوں" پر ہرگز نہیں ہے۔۔۔

اس کے نرم لہجے میں دبی حرارت پا کر اس کا دل پگھلا۔۔۔

جانے کیا دکھ تھا اسے کہ ہوائیں "چھیڑ" جاتی تھیں۔۔۔

جانے کیسا درد تھا کہ ہواؤں سے بھی یاد آیا۔۔۔

تو ہوائیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔۔۔

سب کچھ پلٹا دینے والی۔۔۔

اس کی بات پر ایک پل کو چپ رہ کر اس نے دیکھا کہ وہ اب درختوں کی چوٹیوں سے نگاہ ہٹا کر آسمان کی وسعت "جانچنے" لگا تھا۔۔۔

آہستگی سے دو سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس کے ساتھ جا ٹھہری۔۔۔

اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی کو بھی "اداس" نہیں دیکھ سکتی تھی۔

" کیا بات ہے مصطفین؟؟ بڑی گہری باتیں کرتے ہو؟؟ اگر مناسب سمجھو تو ہم اس موضوع پر مزید بات کر سکتے ہیں۔۔۔اس موسم سے کیوں اداس ہوئے تم؟؟"

نرمی سے اس کا شانہ ہلا کر اس نے موسموں کے اچانک بدلاؤ سے " پگھل" جانے والے اس شخص کو "جوڑنے" کی کوشش کی۔۔۔

اس نے چونک کر اسے " آپ" سے "تم" پر آتے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں بسے بے پناہ "احساس" کی بے تحاشا "تحاریر" پڑھتا، وہ خفیف سا مسکرایا۔

وہ بخوبی آگاہ تھا کہ " تعلق" بننے لگے تو" واسطہ "خود بخود" آپ" سے "تم" میں ڈھل جاتا ہے۔۔۔

اسے اس کا تم کہنا اچھا لگا تھا۔۔۔

گویا وہ اس کو اپنا دوست کہہ رہی تھی۔۔۔

اس نے بغور اپنا چہرہ پڑھتی ثومیہ کے تاثرات دیکھے اور دلکشی سے مسکرایا۔۔۔

"کچھ خاص نہیں ہے۔۔۔نہ ہی اتنا اہم کہ اس پر مزید گفتگو کی جائے۔یہ سمجھو کہ بس کبھی کبھی بے طرح ہی دل اداس ہوتا ہے۔اور یہ اداسی موسم سے مشروط نہیں ہوتی۔۔۔بعض اوقات اپنی کھوج کا ہر موسم "اداس رت" کا ہوتا ہے۔۔۔لہٰذا پریشان مت ہو تم۔۔۔"

نرم لہجے میں کہہ کر نظریں چراتا وہ سیڑھیاں اتر گیا تو ایک پل کو رک کر اس کے پیچھے ہو لی۔۔۔

حروفِ تم نے بتایا کہ وہ بھی اسے دوست مان چکا ہے۔

ہماری زندگیوں میں کچھ لوگ بے دھڑک داخل ہوتے ہیں۔

اپنی راہ خود بنا کر۔۔۔

زیست کی پر پیچ ڈگر کو ہموار کرتے ہوئے۔۔۔

ان دونوں کا جز وقتی تعلق بھی انہی "احساسات" میں ڈھل رہا تھا۔

اس کے لفظوں کی ہر گہر کو پوری شدت سے اپنے دل پر محسوس کرتی وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

ہوا کے پرزور تھپیڑوں میں آہستگی سے چلتے ان دونوں کے مابین کچھ دیر خامشی نے رقص کیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کاوش میں تھے۔۔۔وہ نہیں جانتے تھے کہ زندگی میں جنہوں نے "داخل" ہونا ہو وہ ہر سمجھ و بوجھ سے بالاتر ہو کر بھی ہو ہی جاتے ہیں۔

"مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ کوئی مجھ سے ایسی باتیں کرے۔میں اداس لہجوں سے شدید محبت کرتی ہوں۔ ابھی کی گئی تمہاری ہر بات میں نہیں جانتی کہ کس کا قصہ ہے۔مجھے لگتا ہے یہی باتیں میرے دل کا عالم کہتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟؟ کیا تم بتا سکتے ہو؟؟"

اس سے پہلے کہ رقصاں سکوت شدت اختیار کرتا وہ رکی اور خود سے ایک قدم آگے بڑھ چکے مصطفین کا بازو تھام لیا۔

وہ حیرت سے پلٹا تو چمکتی آنکھوں میں ہزار سوال اس کے منتظر تھے۔

اسے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ اسے یوں بھی روک سکتی ہے۔۔۔

وہ بھی نہیں جانتی تھی وہ اس سے ایسے اذکار کیوں چھیڑ بیٹھی ہے۔۔۔

"لفظوں کی منزلت ہی یہ ہے کہ یہ ہر شخص کی داستان کہتے ہیں۔ ہمارے اردگرد، آس پاس، اور ہمارے ساتھ بھی۔۔۔ ہزاروں ایسے لوگ بستے ہیں کہ جن کا درد "ہمارا درد" ہوتا ہے۔۔۔ لیکن ہم اس کا ادراک نہیں رکھتے۔۔۔ ہاں یہ درد کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ سب کا "سانجھا" ہوتا ہے۔۔۔ تو بات صرف اتنی سی ہے دوست کہ لفظ سب کی کہانی کہتے ہیں۔ ہر دل کا مکمل، کامل، پورا اور عمیق تر بیان ہوتے ہیں۔" اس کے قریب رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ اس کے ہر سوال کو "حروفِ تقویت" بخش کر مٹاتا چلا گیا۔ اس کے خوبصورت لبوں کے دلنشین کناروں سے کرب و بیان میں ڈوبے عجب سے سر فضا میں بکھرتے چلے گئے۔

وہ اس کے لفظوں کے سحر میں کھو رہی تھی۔۔۔

اور وہ سحر پھونک کر مڑ گیا تھا۔

ثومیہ آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔۔۔ ایک نزدیکی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ چپ چاپ اسے صحن پار کرتا دیکھنے لگی۔۔۔ پھر یکایک وہ چونک گئی۔

کچھ فاصلہ طے کر کے وہ اچانک رک گیا تھا۔ آنکھیں موندے منہ آسمان کی جانب کر کے اس نے دونوں بازو وا کیے اور ہواؤں کو گویا پوری تاب سے اپنے وجود سے ٹکرانے کی اجازت دے دی۔

یوں کہ جیسے اندرون کا سارا غبار بہنے دے رہا ہو۔

ان سے دور کھڑے سفیر نے تحیر سے ساکت ہو کر انہیں ہوا کے "دوش" پر دیکھا۔۔۔

وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ سرد ہوائیں ان دونوں کو اس کے سامنے لا کھڑا کریں گی۔

یونیورسٹی کے وسیع و عریض احاطے کے مختلف گوشوں میں رک کر ہواؤں سے "محو گفتگو" وہ تینوں بالکل نہیں جانتے تھے کہ "بظاہر" ایک دوسرے سے مختلف ہو کر ابھی ان کا اندرون کس قدر "یکساں" ہے۔۔۔

اور دن گزرتے ہیں کہ ایسی یکسانیت "ایک" ہو کر رہتی ہے۔

۞......۞......۞

یہ پی۔سی بھوربن کی پہلی منزل پر واقع خوبصورتی سے سجے ایک کشادہ کمرے کا منظر تھا۔ڈھیلا ڈھالا سادہ لباس پہنے گیتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے دھری ایک اونچی آرام کرسی پر براجمان تھی اور چست ملبوس میں ایک حسین لڑکی وائپس کی مدد سے اس کے چہرے سے میک اپ صاف کر رہی تھی۔ٹیرس کا دروازہ کھلا تھا اور سرد ہواؤں کی وجہ سے اس پر لگا سفید، جالی دار، پردہ مسلسل لہرا لہرا کر بیڈ کے ساتھ دھرے صوفوں کی پشت پر آن ٹکتا تھا۔کمرے میں رکھی مختلف سجاوٹی اشیا میں شیشے کا استعمال بکثرت کیا گیا تھا اور پورے ماحول میں "شفافیت" کی جھلک نمایاں تھی۔

" کیوں کر رہی ہو ایسا گائیتری؟؟ کیا ملے گا؟؟ اس سب کا انجام جانتی ہو نا؟؟"

اس کے ناک کی پن اٹھا کر میک اپ ریموو کرتی لڑکی نے ہاتھ روکے اور جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔اس کا انداز اور جرح کا لہجہ بتاتا تھا کہ وہ گیتی کی کوئی قریبی ہے اور اسے اختیار ہے کہ ایسا سوال کر سکے۔

سوال سن کر کچھ کہے بنا اس نے یوں ابرو اچکائے کہ گویا سوال سمجھنے سے قاصر رہی ہے۔

" زیادہ انجان مت بنو۔یہ عوامی جگہوں پر بنا سیکیورٹی کے رک جانا، پاکستانیوں سے بلا وجہ گھلنا ملنا، اور یہاں انڈسٹری میں بھی ہر ایک سے بے وجہ کا میل جول۔۔۔تمہیں پتا ہے نا کہ پاکستان میں تمہارا یہ رویہ بھارت میں اک طوفان مچا دے گا۔مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بس خود کو محدود رکھ کر چلنا چاہیئے یہاں۔اس ایک فلم کے لیے تم اپنا کیرئیر داؤ پر لگا رہی ہو۔یہ میں ابھی بتائے دیتی ہوں تمہیں۔۔۔"

تیزی سے ہاتھ چلاتی اب وہ قدرے غصے سے بولی تو اس کا ہاتھ تھام کر وہ ہنس دی۔

ہاتھ روکے جانے سے زیادہ وہ لڑکی اس کی "بے وجہ ہنسی" سے چونکی تھی۔

" آہستہ رگڑو ناز۔جلد چھیل دوگی کیا غصے میں؟؟ ظالم۔۔۔"

اس کا ہاتھ تھامے وہ سیدھی ہوتی ہوئی بولی جبکہ ناز چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

" میں جانتی ہو تم میرے لیے فکر مند ہو۔اور جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ غلط بھی نہیں۔ایسا ہونا عین ممکن ہے۔لیکن جانے کیوں میرا دل ایسا رویہ اپنانے کو کہتا ہے۔میں یہاں کسی سے بے رخی نہیں برت سکتی۔میرا دل مجھے ان

سب سے محبتوں پراکساتا ہے ناز۔میں اپنے من سے مجبور ہوں۔"

دلنشین لہجے میں کہہ کراس نے دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے کھلے بال سمیٹنے لگی۔

"ایک تو تم اور دوسرا تمہارا یہ کمبخت دل۔۔۔ سچی بہت تپ چڑھاتے ہو مجھے۔ذرا احساس نہیں تمہیں اپنی ویلیو کا۔میں تمہاری جگہ ہوتی نا گیتی۔۔۔تو سچ۔۔۔بڑی مغرور ہوتی میں۔"

بے بسی سے اسے دیکھتی ناز ہٹی اور دراز سے کچھ تلاشتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولی۔اس کی بات پر ایک بلند قہقہہ لگاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہ تو تم اب بھی ہو۔بڑا غرور کرتی ہو خود پر۔۔۔قسم سے"

سفید رنگ کی ایک چھوٹی بوتل لیے وہ پلٹی تو گیتی نے اسے چھیڑا۔

ناز کے لبوں پر ایک جاندار مسکراہٹ ابھری۔۔۔اس کی بات نے اسے مسرور کیا تھا۔

پھر اسے کھڑے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"چپ چاپ یہاں بیٹھو گیتو۔آج عرق گلاب لازمی لگانا ہے چہرے پر۔تم مجھے اپنے "دل کے قصے" سناؤ تو اس دوران میں اپنا کام کرلوں گی۔اور غرور میں خود پر نہیں تم پر کرتی ہوں۔۔۔کہ " گیتی" میری بہترین دوست ہے۔سپر اسٹار گیتی۔۔۔"

دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اس نے اسے واپس کرسی پر دھکیلا اور مان بھرے لہجے میں بولی۔

"افوہ۔۔۔اب یہ بھی۔۔۔عرق گلاب۔۔۔آہ۔۔۔بہت ضدی ہو تم ناز۔"

یہ کہہ کر وہ جیسے بے بسی سے واپس بیٹھی تو اس نے مسکراتے ہوئے اس کے دلکش لبوں پر انگلی رکھ دی۔۔۔یہ خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ تھا۔۔

ماتھے پر لکیر فکر لیے وہ یکدم سنجیدہ ہوگئی تو وہ اس کے منہ پر نرم روئی سے عرق ملنے لگی۔ان دونوں کے مابین جاری کئی لمحات ایک بے طرح خامشی کی نذر ہوئے۔

"مجھے " گیتی" ہونے کا غرور نہیں۔اور تمہیں گیتی کی دوست ہونے کا بھی غرور ہے۔۔۔"

کچھ دیر بعد کپکپاتے لبوں سے وہ بولی تو اس کے لہجے میں کچھ ایسا کانچ تھا کہ ناز کو ہاتھ روکنا پڑے۔اس

کے گداز ہونٹوں پر روئی کا گالہ رکھ کر وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھنے لگی۔۔۔

" گہری باتیں کرنے لگی ہو دوست۔۔۔ جو مجھے سمجھ آئیں بھی تو میں سمجھنا نہیں چاہتی۔۔۔ اور میں پھر کہوں گی کہ تمہیں اپنی پہچان ہی نہیں یا اپنی ذات کا ادراک نہیں ہے۔ جس دن تمہیں اپنی پہچان ہوگی نا۔۔۔ تم خود پر غرور کرنے لگو گی۔"

بھیدوں بھرے لہجے میں کہہ کر، اس کے لبوں پر دھرا روئی کا گالہ ہٹا کر وہ پھر سے گلاب ملنے لگی۔

دونوں کا لہجہ ایک ہو گیا تھا۔

زندگی میں یونہی ہی ہوتا ہے کہ دوست باتیں "الگ" بھی کریں تو لہجے "ایک" رکھتے ہیں۔

گیتی کی آنکھوں میں کئی رنگ ایک ساتھ ابھرے اور اپنی تاب دکھلا کر معدوم ہو گئے۔ جیسے چڑھے ہوئے پانی یکا یک اتر جاتے ہوں۔

ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھام کر اس نے نرمی سے ہٹایا اور ایک بے خود کیفیت میں کھو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

" گائیتری کے جیون میں وہ دن کبھی نہیں آئے گا ناز کہ جس دن وہ اپنی پہچان پا کر ایسی مغرور ہو جائے گی۔ میں نے بہت پہلے سے کبھی طے کر رکھا ہے سہیلی کہ میری ذات کا غرور میرے دوستوں کے لیے تو ہو سکتا ہے۔۔۔ میرے لیے نہیں۔"

اس کے مقابل رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتی وہ پورے یقین سے بولی اور پھر جواب سنے بنا ٹیرس کے کھلتے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے انداز و بیان پر ناز ایک پل کو ہل بھی نہ سکی۔ وہ مکمل ساکت تھی۔

" سو جانا ناز۔۔۔ نو بج گئے ہیں۔ مجھے نیند دیر سے آئے گی۔ کل سہہ پہر میں شوٹنگ ہے لاہور ریلوے اسٹیشن پر۔ سویرے سویرے نکلنا ہوگا۔ جی ٹی روڈ سے جانا ہے۔ سنا ہے کافی شہر آتے ہیں درمیان۔ سب دیکھتی جائیں گی۔ اسلام آباد سے فلائیٹ لیں تو یہ سب چھوٹ جائے گا۔۔۔ اور اختیار میں ہو کر بھی پاکستان کا کوئی حصہ چھوٹ جائے۔۔۔ یہ میں بالکل نہیں چاہوں گی۔"

ٹیرس کے دروازے کا پٹ تھامے وہ مڑی اور اسے مخاطب کر کے تفصیل سے کہا۔

اس کے حسین چہرے پر بکھرے مشتاق رنگوں کو دیکھتی ناز نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا اور آہستگی

سے مڑ کر ڈریسنگ ٹیبل سیٹ کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے اس موضوع پر مزید بات کرنا رائگاں ہوگا۔

گیتی بڑھی اور صوفے کی پشت پر پھیلی اپنی گرم شال اٹھا کر کاندھوں پر لپیٹتی کھلے ٹیرس میں نکل گئی۔ اس کے بال کھل کر پھر سے شانوں پر بکھر گئے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں سمیٹنا چاہا اور پھر واپس گرا کر کھلا چھوڑ دیا۔۔۔

اسے ہوا کے دوش پر ان کا لہرانا اچھا لگا تھا۔

ٹیرس کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے جھک کر اس نے دور تلک اندھیرے میں ڈوبے پہاڑوں کو دیکھا اور پھر ان بلند پہاڑوں کے چوڑے سینوں پر جلتی زرد روشنیاں دیکھ کر وہ نرمی سے مسکرائی۔۔۔

دلکش لبوں سے جاری حسین تر مسکراہٹ سے ہٹ کر اس کی دلنشین آنکھوں پر طاری انجان لپک بتاتی تھی کہ ان جلتی روشنیوں کے ساتھ ساتھ اس کا اندرون جل رہا ہے۔۔۔

صحن تخیل میں وہ اپنے بچپن کے حسین گھر میں تھی۔۔۔

☆......☆......☆

بے فکری سے کاندھے پر لٹکتا بیگ جھلاتی وہ لاؤنج میں داخل ہوئی اور چند قدم کے فاصلے پر ٹھٹک کر رک گئی۔ لاؤنج سے متصلہ ڈائننگ روم کی کرسیوں پر براجمان اپنے والد شاہجہان عادل کو دیکھ کر اس کی نظریں ایک پل کو ساکت ہوئی تھیں۔ راشدہ بیگم اور نمرہ بھی ان کے ساتھ بیٹھی تھیں یعنی وہ آج بھی اس سے پہلے گھر پہنچی تھی اور وہ لوگ یقیناً شاہجہان صاحب کی موجودگی کی بدولت ہی اس کا انتظار کیے بغیر کھانا کھا رہے تھے۔

گرم روٹی کو ہاتھ بڑھاتے رک کر انہوں نے بھی بغور اسے جامد دیکھا اور بے ساختہ ان کی پیشانی پر بل ابھرے۔ نمرہ گھبرا کر ماں کی جانب دیکھنے لگی جو خاموشی سے شوہر اور بیٹی کو "مد مقابل" دیکھ رہی تھیں۔

کم از کم ان کو ان دونوں کا انداز یہی لگا تھا۔

ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونے جیسا۔۔۔

ان کی غیر متوقع موجودگی سے لگنے والے جھٹکے سے سنبھل کر وہ اب پر اعتماد دکھائی دی۔

ان کے گھورنے کو نظر انداز کرتی وہ نظر جھکائے بغیر ان کی طرف بڑھی تھی۔ بغور اسے دیکھتے وہ روٹی توڑ کر نوالہ بنانے لگے۔

"السلام علیکم۔۔۔کیسے ہیں سب؟؟ وین والے کی بدولت میں آج پھر لیٹ ہوگئی ہوں ماما۔"

قریب آکر اس نے مودب لہجے میں سلام کیا اور پھر اعتماد سے ماں کو مخاطب کر کے بولی۔

اس کی بات پر انہوں نے شوہر کی پیشانی پر بڑھتی شکنوں کو دیکھا اور جلدی سے بولیں مبادا کہ وہ کچھ الٹا سیدھا بول دیتے۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ٹھیک ہیں سب۔کوئی بات نہیں۔کل اسے کہنا کہ جلدی آیا کرے روز روز دیر ہونا مناسب نہیں۔اور جاؤ ہاتھ منہ دھو آؤ۔کھانا کھالو پہلے اب۔ابھی تو گرم ہے۔"

ان کا محتاط لہجہ محسوس کر کے وہ عجیب طریقے سے مسکرائی اور سانس روک کر تھوک نگلتی نمرہ کو دیکھا۔ان میں سب سے بری حالت اس وقت اسی کی تھی۔صلح جو نمرہ کی لڑائی جھگڑے یا مباحثوں سے بہت جان جاتی تھی۔

"یہ تو میں اسے روز کہتی ہوں ماما۔لیکن اسے اثر کہاں ہوتا ہے۔؟ سب لڑکیوں کو اتنے دور دراز روٹس پر ان کے گھر پہنچا کر آخر پر فتح گڑھ کا رخ کرتا ہے۔بہت تنگ آچکی ہوں میں اس سے۔بابا میں لوکل آیا جایا کروں کیا؟؟ اجازت ہے؟؟ پلیز۔۔۔"

باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتی وہ ایک دم جرات سے پوچھنے لگی تو راشدہ بیگم نے پہلو بدل کر لب بھینچ لیے۔۔۔

وہ کمال معصومیت سے ان کی ساری "احتیاط" پر پانی پھیر چکی تھی۔

انہیں یقین تھا کہ اب ایک لامتناہی تکرار کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔۔۔

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسائے انہیں اضطراری حرکت دیتی وہ جواب کی منتظر تھی۔شاہجہان صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔وہ بھی اس سے ایسی دلیری کی توقع نہیں کرتے تھے۔ان دونوں بہنوں کی بچپن سے عادت تھی کہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات یا فرمائش بھی وہ ماں کے ذریعے ان تک پہنچاتی تھیں جسے قبول یا رد کرتے انہیں قطعاً کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔لیکن آج پہلی بار اس نے کسی کام کے لیے براہ راست ان سے اجازت طلب کی تھی۔سب کی نظریں خود پر مرکوز پا کر وہ بارعب آواز میں بولے۔

" کتنی دیر لگاتا ہے وہ یونیورسٹی سے گھر تک لانے میں اور در حقیقت سفر کتنا ہے؟؟"

ان کے معتدل لہجے پر نمرہ اور ماما نے کب سے اٹکا سانس خارج کیا۔

" کم از کم پونے دو گھنٹے میں بابا۔ جبکہ لوکل یہ سفر بمشکل ایک گھنٹے میں طے ہوتا ہوگا۔ وین کے روٹ کی بدولت مجھے دیر ہو جاتی ہے۔ وہ لڑکیوں کو اتارنے مختلف کالونیز میں گھس جاتا ہے پورے راہ۔۔۔ "

ان کے سوال پر وہ بشاش لہجے میں بولی۔ لہجے کی یہ بشاشت ان کی وقتی نرمی کا دین تھی۔

اس کے تفصیلی جواب پر انہوں نے ایک ہنکارا ابھرا تو راشدہ بیگم نے ایک پہلو مزید بدلا۔ وہ دل ہی دل میں سب اچھے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ پڑھتی نمرہ کو صاف لگا کہ آج یہ بابا سے بچ گئی تو ماما ضرور اس کا "ستیاناس" کریں گی کیونکہ وہ ہمیشہ دونوں بیٹیوں کو یوں باپ کے روبرو ہونے سے روکا کرتی تھیں۔

" اچھا ٹھیک ہے۔ تم لوکل آیا جایا کرو۔ خواہ مخواہ وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ لیکن خیال رکھنا کہ کوئی ایسی ویسی یا الٹی سیدھی بات میرے کانوں تک نہ پہنچے۔ اگر ایسا کچھ سنا میں نے تو تمہاری خیر نہیں۔ "

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتے ہوئے ڈائننگ سے نکل گئے۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ پھر انہیں اپنے کمرے میں جاتا دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی اب تک ساکت بیٹھی نمرہ کے قریب آرکی۔

" تمہیں بالکل ڈر نہیں لگا یوں ان سے مخاطب ہو کر؟؟ کیا سوچیں گے وہ کہ کتنی جرات بڑھ گئی ہے تمہاری۔ اور شرم کرو کہ اب میرے سامنے کھڑی ڈھیٹوں کی طرح مسکرا رہی ہو۔ "

راشدہ بیگم نے اپنے سامنے دھری پلیٹ غصے سے پرے کھسکائی اور ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام کر اسے گھر کا۔ وہ فکرمند تھیں کہ اب وہ بعد میں ان سے وضاحت طلب کریں گے۔

نمرہ نے بھی سر اٹھا کر اسے خود پر "سوار" دیکھا۔۔۔

وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

" ماما اس میں غلط کیا ہے؟ کیا انہونا کر دیا میں نے ایسا کہ وہ میری جراتیں ماپتے رہیں گے؟؟ میں نے وہ بات کی جو میرا حق ہے۔ وہی کہا جو حقیقت ہے۔ جب مجھے اس وین کی بدولت روز روز یہ گھوریاں سہنی پڑتی تھیں تو بہتر لگا مجھے کہ آج بات آر ہو یا پار لیکن ہو ضرور۔۔۔ اور پلیز ماما اب آپ بھی یہ جذباتی سین مت بنائیں۔ کچھ

نہیں سوچتے بابا بھی مزید اس پر۔ وہ سوچنے والوں میں سے نہیں کہنے والوں میں سے ہیں۔ لہٰذا کچھ کہنا ہوتا تو کہہ کر جاتے۔"

ان کی بات پر بے طرح چڑ کر وہ صاف گوئی سے بولی تو وہ تحیر سے اس کا انداز دیکھتی رہیں۔

یقیناً وہ بہت نڈر ہو رہی تھی۔

"ثومیہ۔۔۔ پلیز۔۔۔ یو ہیو ٹو اسٹاپ ہیئر ناؤ۔۔۔ بیٹھو چپ چاپ کھانا کھاؤ۔"

اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ کر اپنے شانے سے ہٹاتے ہوئے نمرہ نے کھینچ کر بٹھانا چاہا تو اسے اپنی بے لگامی کا احساس ہوا۔ راشدہ بیگم کا متفکر چہرہ دیکھ کر اس کے بھی عضلات ڈھیلے ہوئے۔ نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑواتے اس نے منظر سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔

"میں کھانا نہیں کھا رہی۔۔۔ یونیورسٹی سے کھایا تھا بہت کچھ۔ اب آرام کروں گی۔ سوری ماما۔۔۔ جاگ کر ملتی ہوں آپ سے۔۔۔"

کاندھے سے بیگ اتار کر مٹھی میں دبوچے یہ کہہ کر وہ آہستگی سے مڑی اور انہیں وہیں جامد چھوڑ کر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

فکرمندی سے اس کی پشت کو گھور کر راشدہ بیگم نے نمرہ کو دیکھا تو اس نے بے بسی سے شانے اچکا دیے۔۔

ان دونوں کا کھانا وہ "دونوں" بخوبی حرام کر چکے تھے۔

☆......☆......☆

مصطفین یونیورسٹی سے نکلا ہی تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لوکل بس کے انتظار میں کھڑا وہ بھیگنے لگا تو ایک رکشہ روک کر اس میں سوار ہو گیا۔ بیٹھ کر اس نے دیکھا کہ بارش سے بچاؤ کے لیے سفیر بھی ذیلی سڑک کے پار ایک شیڈ کے نیچے کھڑا تھا۔

"یہ پرنس یہاں کیا کر رہا ہے؟؟ یعنی یہ بھی لوکل آتا جاتا ہے؟؟"

اس نے سوچا اور سر جھٹک کر رکشہ ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوا۔

"بھائی نہر کے کسی بھی پل پر اتار دو۔ مجھے مال روڈ جانا ہے۔ وہاں سے جلو کی بس پکڑ لوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کپڑوں سے بارش کے قطرات جھاڑنے لگا۔

"جی بہتر باؤجی۔۔۔ستر روپے لوں گا۔"

چلنے سے پہلے رکشہ ڈرائیور کی تنبیہاً کہا تو اثبات میں سر ہلاتے اس نے چلنے کا اشارہ کیا۔

تھوڑا سفر طے ہوا تو سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے وہ فرنٹ گلاس سے درختوں سے چھن چھن کر برستی بارش دیکھنے لگا۔

"آئینوں پہ ٹھہرا سرد بارشوں کا عکس۔۔۔"

اس کی عادت تھی کہ وہ من پسند مناظر کو یوں ہی "عنوان" دیا کرتا تھا۔

قریب سے کوئی تیز رفتار گاڑی گزری تو سڑک پر بہتا بارش کا پانی چھپاکے کی آواز پیدا کرتا ہوا چھوٹے چھوٹے قطرے اڑا کر ارد گرد پھیل گیا۔

ماحول میں بارش سے بیدار ہوئی آہٹیں سنتا وہ بے طرح اداس ہونے لگا۔

وہ ایسا ہی تھا کہ بارشیں اسے بے سبب اداس کرتی تھیں۔

"کالیاں اٹاں کالے روڑ ھ مینہ برسا زوروزور۔۔۔"

صحن تخیل میں گونجتا بچپن کا اک شور اس کے چہرے پر عجب ترسی ہوئی مسکان ثبت کر گیا۔اسے یاد آیا کہ کس طرح اپنے بچپن میں وہ سب دوستوں کے ساتھ گلیوں میں بھاگتا ہوا برسات سے منسوب گیت گایا کرتا تھا۔

اس سے پہلے کہ یہ یادیں طوالت اختیار کرتیں اپنے سر پر گرتی پانی کی دھار محسوس کر کے اس نے چونک کر سر اٹھایا۔رکشہ کی چھت میں موجود ایک سوراخ سے پانی دھار کی مانند بہہ رہا تھا۔

"بیڑا غرق۔۔۔"

غصے سے کہہ کر اس نے فوراً لب بھینچ لیے۔

"باؤجی ذرا ایک طرف ہو کر بیٹھیں۔یہ چھت تھوڑا خراب ہو گیا ہے۔جلد مرمت کروا لوں گا۔"

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر ڈرائیور نے بیک مرر سے اسے دیکھا۔

"میری بلا سے۔۔۔جیسے میں تو روز اسی میں آیا جایا کروں گا نا۔۔۔"

وہ سوچ کر رہ گیا۔۔۔

یکا یک اس نے محسوس کیا کہ اس کی "یاسیت" پروان چڑھ کر اب "قنوطیت" میں ڈھل رہی ہے۔۔۔

"بارشیں کب تک ہوں گی؟؟ کچھ آئیڈیا ہے آپ کو؟؟ کوئی محکمانہ پیش گوئی؟؟"

مسکرا کر پوچھتا وہ گویا اس قنوطیت کو تھپکنے لگا۔

"باؤجی ٹیلی ویژن پر سنا تو تھا کہ یہ ہفتہ بارشوں میں گزرے گا۔دیکھیں اب۔"

ڈرائیور نے مڑ کر بتایا تو وہ بے ساختہ بولا۔

"اچھا آپ آگے دھیان کریں پلیز بارش ہو رہی ہے۔کہیں لگ نہ جائے۔"

"اوہ ناں گھبراؤ جی۔۔۔بڑا تجربہ ہے میرا۔۔۔"

اس کے ٹوکنے پر وہ ہنستے ہوئے آگے دیکھنے لگا تو اس نے بھی مزید گفتگو کی بجائے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔

کچھ دیر بعد نہر کا پل کراس کرتا ہوا مڑ کر وہ ایک نزدیکی بس اسٹاپ پر رک گیا۔

بس اسٹاپ کو مربعہ شکل میں چار گول ستونوں پر، ٹین کی چھت ڈال کر، چاروں طرف سے کھلا رکھتے ہوئے با قاعدہ تعمیر کیا گیا تھا اور چھت کی نیچے مسافروں کے لیے دو قطاروں میں ترتیب وار لکڑی کی مضبوط نشستیں نصب تھیں۔

"لیں باؤجی۔۔۔"شاہ دی کھوئی" پر لے آیا ہوں۔"جلو موڑ" کی بس ابھی آتی ہی ہو گی۔یہاں سے ہر پانچ سات منٹ کے وقفے سے لوکل بس مل جاتی ہے۔"

ڈرائیور کے کہنے پر وہ اترا اور شیڈ کے نیچے کھڑے ہو کر بٹوہ نکال کر اسے پیسے دیے۔

"ٹوٹے پیسے دو جناب۔کھلا نہیں ہے۔"

ڈرائیور نے سو کا نوٹ دیکھ کر بتیسی نکالی۔

لاہوری ڈرائیورز کی عادت ہے کہ جہاں نوٹ "تڑوانے" کا امکان نہ ہو وہاں سواری سے یہی جملہ

دہراتے ہیں۔اس سے اکثر لوگ سارے پیسے انہیں ہی دے دیتے ہیں اور ان کی کمائی بڑھ جاتی ہے۔

" کوئی بات نہیں۔۔۔آپ سو ہی رکھ لو بھائی۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ آہستگی سے مڑا اور ایک نشست پر بیگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

" بہت شکریہ باؤ جی۔سلامت رہو۔۔۔"

پوری باچھیں کھول کر اس نے شکریہ کہا تو وہ مسکرایا۔اسے اس کا انداز عجیب لگا تھا۔

یوں جیسے من کی مراد بر آئی ہو۔

ڈرائیور چلا گیا تو برستی بوندوں میں اس نے دور تلک اسے جاتے دیکھا۔۔۔

وہ ایسا ہی تھا۔۔۔

اپنی زندگی میں در آئے کسی وقتی تعلق، واسطے کو بھی دور تلک جاتے " دیکھنے " والا۔۔۔

کسی کا بھی " جانا " اس کے لیے ہمیشہ سے تکلیف دہ رہا تھا۔

وہ وقتی تعلقات بھی " سنبھال " رکھنے والا شخص تھا۔۔۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور بیگ ہاتھوں میں تھام کر شیڈ کے نیچے بے قراری سے چلنے لگا۔ایک سے دوسرے سرے تک جاتے وہ مسلسل کشادہ اور شفاف سڑک پر گر کر بکھرتی بارش دیکھتا رہا۔۔۔بارش کے ہر گرتے قطرے کے ساتھ اس کے چہرے کا کرب بڑھتا چلا گیا۔

اس کا اندرون سارا عجب کیفیات میں ڈھل رہا تھا۔۔۔

بس کا ہارن سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

برقی اشارہ عبور کر کے بس نزدیک آتی جا رہی تھی۔

اس نے شیڈ سے ہاتھ نکال کر ڈرائیور کو متوجہ کیا کیونکہ اسٹاپ پر اس کے علاوہ اور کوئی مسافر نہیں تھا تو اسے خدشہ لاحق ہوا کہ شاید وہ بس روکے بنا ہی گزر جائے گا۔

اس کا اشارہ دیکھ کر ڈرائیور نے بس ایک طرف کر کے روک لی تو وہ بھاگ کر اس میں سوار ہو گیا۔

بہت زیادہ رش کی وجہ سے مسافر باہم پھنسے، بمشکل کھڑے تھے۔

ٹھوکر سے جلو موڑ تک نہر کنارے کے ساتھ ساتھ، اس طویل تر روٹ پر بہت سے مسافران کی منازل واقع تھیں۔کئی کالونیز اور بستیاں اس روٹ کے ساتھ ساتھ موجود تھیں تو اس پر عموماً رش بھی زیادہ ہوتا تھا۔آج تو تیز بارش کی بدولت بھی لوگ بھیگنے سے بچنے کے لیے پچھلی بس کے انتظار کی بجائے اس اول دستیاب بس میں سوار ہوئے تھے۔

ایک ہینگر تھام کر وہ گیٹ کے نزدیک ہی کھڑا ہو گیا۔

کب سے بس کے دائیں بائیں سے گزرتا ایک موٹر سائیکل سوار اپنی مہارت کی داد پانے کو ایک دم بس کے آگے آیا تو ڈرائیور نے جلدی سے بریک لگالی۔

اچانک اور غیر متوقع لگنے والی اس بریک کے باعث تمام مسافر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔خواتین کے حصے سے تو باقاعدہ چیخیں بلند ہوئیں۔

ایک دوسرے کا پاؤں کچلنے کی مد میں دو افراد کے مابین مباحثہ شروع ہوا تو ماتھے پر بل ڈالے وہ بمشکل انہیں نظر انداز کر سکا۔

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ معاشرتی منفی رویہ جات کو جادو کی چھڑی سے ٹھیک کر دے۔اسے لوگوں کا خواہ مخواہ الجھنا بہت تکلیف دیتا تھا۔

"مال روڈ والے گیٹ پر آجاؤ جی۔اگلا اسٹاپ وہی ہے۔"

کنڈیکٹر کی آواز سن کر اس نے شکر ادا کیا۔

مال روڈ اتر کر اب اسے "باغ جناح" جانا تھا۔

ایسے ہر موسم میں وہ ادھر کا رخ کیا کرتا تھا۔

وہاں جا بجا اس کی عزیز تر "یادیں" بکھری تھیں۔

بس رکی تو اتر کر اس نے آسمان کو دیکھا۔بارش اب رک چکی تھی اور ٹھنڈی ہواؤں نے زور پکڑ لیا تھا۔

انہی سرد ہواؤں کی یخ بستگی جھیلتا وہ مال روڈ پر پیدل چلنے لگا۔

"باغِ جناح" نہر سے انارکلی کی طرف جا کر لگ بھگ دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور وہ ہمیشہ کسی بھی

اتصالی سڑک سے مال روڈ پر داخل ہو کر پیدل ہی باغِ جناح تک جاتا تھا۔

اس کشادہ سڑک کے دونوں اطراف اور بیچوں بیچ لگے بلند قامت درختوں کی وجہ سے یہاں ہر وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی تھیں۔

ان درختوں کے مابین چل کر، ان کے لہراتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹیں سننا اور خود سے باتیں کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ٹریفک کے تیز تر بہاؤ میں بھی اٹھتا، پتوں کا یہ بلند شور وہ اپنے دل پر ایک انجان دستک کی مانند محسوس کرتا تھا۔خزاں رسیدہ پتے اس کے قدموں میں گر گر کر ہوا کے دوش پر اڑتے تو اس کا اندرون ان کے ساتھ ساتھ گویا" تحلیل "ہونے لگتا تھا۔

مختلف مشاہدات کرتے ہوئے، خیالات کے کئی پہلو سوچتا وہ دھیرے دھیرے چل کر باغِ جناح تک پہنچا۔پٹیالہ ہاؤس گیٹ سے داخل ہو کر وہ چلڈرن پارک کی طرف جاتے کچے ٹریک کے سامنے آ رکا۔

ٹریک شدید گیلا دیکھ کر ان نے "اوہ" کہہ کر ہونٹ سکیڑے اور پارک کے بیچوں بیچ مختلف سمتوں کو جاتی تارکول کی مرکزی، کشادہ اور پختہ شاہراہ پر چلنے لگا۔

تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کانوں میں رس گھولتی بانسری کی آواز پر وہ چونک کر رک گیا۔دور مٹی سے بنی "مصنوعی پہاڑی" پر کوئی بڑے سر میں بانسری بجا رہا تھا۔

اس کے قدم بے ساختہ اس جانب اٹھنے لگے۔۔۔

کہ بانسری کی آواز پر وہ ہر بار یونہی کھنچا چلا جاتا تھا۔

طویل شاہراہ پر تیزی سے بھاگتا ہوا وہ پہاڑی کی برستی ہوئی آبشار کے سامنے آ گیا۔یہاں اس نے ہوا کی بدولت، آبشار کے اڑتے پانی کی پھوار میں رک کر اپنی آنکھیں موندلیں۔بانسری کی سریلی دھن میں چہرے پر گرتی اس نرم پھوار نے اسے عجب مسرور کیا تھا۔

چند سانسیں بھر کر اس نے خود کو متوازن کیا اور پتھروں کی تراشی ہوئی سیڑھیوں پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔

آس پاس موجود لوگوں نے حیرت سے اسے بیگ تھامے بے قرار ہو کر بھاگتے دیکھا۔

وہ چوٹی پر پہنچا تھا کہ آواز رک گئی۔۔۔

وہاں اب کوئی نہیں تھا۔

بانسری کے سارے سراب اس کے اندر تو تھے پر آس پاس کہیں نہیں تھے۔۔۔

اس کے چہرے پر اضطراب جاگا اور وہ گھوم کر یہاں وہاں بانسری بجانے والے کو تلاشنے لگا۔

پہاڑی پر رکھے لوہے کے بڑے واٹر ٹینک کے گرد چکرا کر وہ دوسری جانب آیا تو پہاڑی کے اس پار ایک بزرگ کو بانسری تھام کر اترتے دیکھا۔۔۔

وہ ان کو پہچانتا تو تھا پر جانتا نہیں تھا۔۔۔

وہ پہلے بھی یہاں بانسری بجایا کرتے تھے اور وہ ہمیشہ ان کی آواز پر دوڑا چلا آتا تھا۔

ہاں یہ اتفاق عجیب تر تھا کہ وہ ہر بار اس کے پہنچنے سے پہلے چلے جاتے تھے۔۔۔ان سے بات کرنے کی اس کی "شدید" خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکی تھی۔

اسے لگتا تھا کہ اس کی بے وجہ بے قراری کا علاج ان کے پاس ہے۔۔۔

اس بانسری کی صورت میں۔۔۔

کہ اس بانسری کے ہر سر میں وہ اپنی ذات "گھول" سکتا تھا۔

اب بھی انہیں دور جاتے دیکھ کر پہاڑی پھلانگتا ہوا وہ تیزی سے ان کے پیچھے اترنے لگا۔

وہ بہر طور آج ان سے ملنا چاہتا تھا۔

آسمان پر ساکت کھڑے کالے بادلوں نے اس کی بے چینیوں پر مضطرب ہو کر رقص کیا۔۔۔

ایک دوسرے سے ملتے ملاتے وہ اس کا درد "رونے" لگے۔۔۔اس کا "کرب" ان پر پوری شدت سے "عیاں" تھا۔۔۔وہ اگر ان کی بوندوں کے بکھرنے کا درد "آشنا" تھا تو وہ بھی اس کی بے چینیوں کا خوب "ادراک" رکھتے تھے۔۔۔بلاشبہ ان "دونوں" کا یہ "تعلق" عمیق تر تھا۔۔۔

بادل ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔سبھی کا درد روتے ہیں۔

بوند بوند۔۔۔

قطرہ قطرہ۔۔۔

اور سارے کا سارا بھی۔۔۔

☆......☆......☆

شدید بارش میں وہ جلا بھنا گھر داخل ہوا تو ذکیہ خاتون اسے لاؤنج میں صوفے درست کرتی ہوئی ملیں۔اس کی آمد سے بے خبر وہ گدیاں ترتیب دینے میں مگن تھیں۔

"السلام علیکم ماما۔۔۔بابا نہیں آئے آج بھی؟؟"

لاؤنج سے اوپری منزل کو جاتی سیڑھیوں پر رک کر اس نے قدرے دیر سے انہیں مخاطب کیا تو اس کے اضطراری انداز پر وہ چونک گئیں۔سیڑھیوں کی ریلنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ ہاتھ کی پشت پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔یہ کیا بلیوں کی طرح دبے پاؤں داخل ہوئے ہو؟ رکو یہیں میں پانی لاتی ہوں۔آتے ہی اوپر کہاں جا رہے ہو؟؟اور بابا تمہارے کچھ ہی دیر پہلے واپس کلینک گئے ہیں۔۔۔"

ہاتھ روک کر وہ مڑیں اور آہستگی سے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے ماما ابھی آیا ہوں۔آپ کا دھیان ہی نہیں تھا۔اور میں تھوڑی دیر آرام کروں گا۔تھک گیا ہوں بہت۔"

قنوطیت سے کہتا وہ مڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا تو انہوں نے سرعت سے اس کی کلائی پکڑ لی۔اپنی دھن میں آگے بڑھتا وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔

"رکو یہاں۔۔۔پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ غصے میں کیوں ہو تم؟؟ کسی سے جھگڑ کر آئے ہو نا؟ سچ سچ اور بالکل صحیح بتاؤ مجھے۔۔۔ابھی۔۔۔"

دوٹوک اور حکمیہ لہجے میں کہہ کر وہ اس کی آنکھیں پڑھنے لگیں تو سختی سے لب بھینچ کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔انہیں صاف لگا کہ وہ کسی ضبط کی کوششوں میں ہے۔

وہ ہمیشہ سے اس کے مزاج کی تیزی سے ڈرتی تھیں۔اس کے سکول۔۔۔اور پھر کالج کے بھی ہر دور میں

انہیں ہمیشہ یہی خطرہ لاحق رہا کہ وہ اب لڑ کر آتا ہے کسی سے کہ تب۔۔۔اور اکثر ایسا ہوتا بھی تھا۔

آج بھی اس کا غصہ اور انداز انہیں اسی خدشے میں مبتلا کر رہا تھا۔

"سفیر میں نے پوچھا ہے کہ کیا ہوا ہے؟؟ جلدی بتاؤ مجھے۔۔۔"

اسے جواباً خاموش پا کر انہوں نے سختی سے اس کی کلائی جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

" کچھ نہیں ہوا ماما۔ میں بس اس بے وقت کی بارش سے چڑ گیا ہوں۔ سارے کپڑے بھیگ گئے ہیں خواہ مخواہ۔ اتنا وقت بھی ضائع ہوا میرا اور بے سبب......۔۔"

نظر چرا کر اس نے بات بنانی چاہی تو انہوں نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔

"سفیر میں ماں ہوں تمہاری۔۔۔اور تمہارے مزاج کا ہر موسم خوب جانتی ہوں۔ تمہارے اندر کی ہر بات سے میں خوب آگاہ ہوں۔ لہٰذا چلو اترو اور وہاں بیٹھ کر مجھے اصل بات بتاؤ۔ اصل بات جانے بغیر میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ چلو۔۔۔"

اسے بازو سے تھام کر انہوں نے زینے سے اتارا اور کھینچتے ہوئے ایک صوفے پر لا بٹھایا۔

منہ بسورتا وہ چپ چاپ ان کے پیچھے آیا تھا۔

"یہیں انتظار کرو میں آتی ہوں۔۔۔بس ایک منٹ میں۔"

انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتیں وہ کچن میں چلی گئیں تو بیگ کاندھے سے اتار کر وہ گیلے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور تولیہ اسٹینڈ پر لٹکا تولیہ لے کر گیلے بال خشک کرنے لگا۔

اس کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔

ہر قسم کے تاثرات سے عاری۔۔۔

"شاباش۔۔۔اچھا کیا کہ بال خشک کر لیے۔ یہ جوس پیو اور غسل خانے میں تمہارا ٹراؤزر شرٹ موجود ہے۔ کپڑے بھی تبدیل کر لو۔۔۔پھر بات کرتے ہیں۔ ہاں۔۔۔"

وہ تولیہ رکھ کر واپس مڑ رہا تھا جب وہ دوبارہ داخل ہوئیں۔ قریب آ کر انہوں نے گلاس اسے تھمایا اور اس کے گال پچکارے۔

گلاس پکڑتے ہوئے اس نے بے بس نظروں سے انہیں دیکھا۔وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کے غصے کا سبب جانے بغیر وہ نہیں رہیں گی۔وہیں کھڑے کھڑے اس نے ایک سانس میں جوس ختم کیا اور گلاس واپس انہیں پکڑاتا غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔

"فریش ہو آؤ تم۔۔۔تب تک میں کھانا لاتی ہوں۔کچھ کھا بھی لینا۔۔۔بھوک لگی ہوگی۔"

پیچھے سے آئی ان کی پکار پر اس نے مڑ کر دیکھا اور انہیں جاتا دیکھ کر شانے اچکاتا غسل خانہ میں داخل ہو گیا۔

وہ اب اسے کھلائے بغیر کہاں رہنے والی تھیں۔

وہ ہمیشہ یوں ہی کیا کرتی تھیں۔اس کا غصہ بتدریج نرمی میں کیسے ڈھالنا ہے؟انہیں یہ ہنر خوب آتا تھا۔وہ بس اسے کتھارسس کی راہ فراہم کرتی تھیں۔

اس کا دھیان بٹا کر اس کا غصہ ڈھال دیتیں اور پھر بڑے آرام سے اس کی وجوہات بھی پوچھ لیتی تھیں۔ نارمل کرنے کے لیے وہ گویا اسے باقاعدہ ایک "پراسیس" سے گزارتی تھیں۔

اب بھی ان کا یہی ارادہ تھا۔

میز پر کھانا چن کر جب وہ فارغ ہوئیں تو وہ غسل خانہ سے برآمد ہوا تھا۔

اس کے بیٹھنے تک انہوں نے صوفوں پر دھرا اس کا بیگ اٹھا کر دائیں طرف واقع لکڑی کے دیوار گیر ریک میں رکھ دیا۔انہیں ذرا سی بے ترتیبی بھی ناپسند تھی۔ان کا پورا دن اشیاء کو ان کے مقامات پر رکھتے ہی گزرتا تھا۔

اس نے بنا کچھ کہے کھانا شروع کیا تو وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"ایک وعدہ کرو اگر تو تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے میرے پاس۔۔۔"

وہ جو ان سے اپنے آف موڈ کی جرح کی توقع کر رہا تھا ان کی بات پر چونک گیا۔اور پھر کسی خاص بات کا بھید عیاں کرتا ان کا لہجہ جانچتے اس کا دھیان بٹ گیا۔

"کیا ماما؟؟تجسس کیوں بنا رہی ہیں؟وعدہ چاہیئے تو لے لیں وعدہ۔۔۔"

حسین آنکھوں پر موجود دبیز پلکوں کی تان اٹھاتے ہوئے اس نے نوالہ منہ کے قریب روک کر کہا۔

اور ذکیہ خاتون بغور اس کے مزاج کے تبدیلی کی شرح ماپ رہی تھیں۔

ان کی سوچ سے یکسر بے خبر، نوالہ چباتے اس نے سوالیہ نظروں سے مسلسل انہیں دیکھا۔۔۔

"جانے دو خیر اب کیونکہ "یہ" وعدہ تو تم پہلے بھی کئی بار کر چکے ہو اور ہر بار توڑ دیتے ہو۔ تم پر وعدوں کا اثر زیادہ دیر قائم نہیں رہتا۔ اتنی بار کی وعدہ خلافی کے بعد اب تو تمہارے کسی بھی وعدے پر میرا یقین ہی نہیں ٹھہرتا۔۔۔"

اس کی آنکھیں میں دیکھتے انہوں نے کہنا شروع کیا تو لمحہ بہ لمحہ اس کے تاثرات بدلتے گئے۔ یکا یک بڑھتی اس کی آنکھوں کی چمک بتاتی تھی کہ وہ ان کی بات سمجھ گیا ہے۔

"کیا واقعی؟؟ بابا بائیک لے کر دے رہے ہیں مجھے آپ لوگ؟؟ پکا وعدہ کہ میں آہستہ چلاؤں گا۔ بڑی احتیاط سے۔۔۔ یہی بات ہے نا ماما؟؟"

مسرت سے بھرپور لہجہ میں پوچھتے اس نے اپنے اندازے کی تصدیق چاہی تو اس کے چہرے پر بکھرے رنگ پڑھ کر اثبات میں سر ہلاتی وہ بے ساختہ مسکرائیں۔

"واؤ۔۔۔ یو آر آسم ماما۔۔۔ سچ نا؟؟"

کھانے کی ٹرے ایک طرف ہٹاتا اٹھ کر، اب وہ ان کے قدموں میں آ بیٹھا اور ان کے ہاتھ تھام کر اس بات پر مہر یقین کا طالب تھا۔

ذکیہ بیگم نے دل ہی دل میں اس کی خوبصورت آنکھوں سے منعکس ہوتے ہر رنگ کی نظر اتاری۔۔۔

کچھ دیر پہلے کا اس کا شدید غصہ اب ہوا ہو چکا تھا۔

بائیک لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی شاید۔۔۔ لیکن اپنے والدین کی "فالتو" احتیاط کی بدولت اس کے لیے یہ امر ایک خواب بن چکا تھا۔ ایک چھوٹے سے خواب کی بار آوری نے اسے اتنا سرشار کیا تھا کہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی برہمی کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب رہی تھیں۔

اور وہ ایسا ہی تھا۔۔۔

چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر جان لٹانے والا۔۔۔

"ہاں بابا سچ کہہ رہی ہوں۔ کیا بچپنا کر رہے ہو۔ تم اٹھو شاباش اور کھانا مکمل کرو۔"

اس کے بال سنوارتے ہوئے انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا تو نرمی سے ان کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتا وہ ان کی گود میں سر دے کر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔

"نہیں بس۔۔۔ اسی قدر بھوک تھی اور بہت شکریہ ماما۔ ایم سو ہیپی۔۔۔ آپ ورلڈز بیسٹ پیرنٹس ہو۔۔۔ ریئلی۔" پیار بھرے لہجے میں کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں اور وہ مسکرا کر اس کے نرم بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔

کچھ دیر دونوں ماں بیٹا یونہی ایک دوسرے کی گہری محبت کا عمیق تر احساس چھوتے رہے۔۔۔

ان کی گود میں سر رکھے وہ یوں پر سکون تھا گویا بے سکونی سے نا آشنا رہا ہو۔۔۔

"اب تم مجھے تفصیل سے بتاؤ شاباش کہ یونیورسٹی میں کس سے جھگڑ کر آئے ہو؟ جھوٹ نہیں بولنا اور ٹالنا بھی مت۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی نہ کوئی بات لازمی ہے۔"

یہ استفسار کرتے انہوں نے اپنا لہجہ حتی الامکان متوازن رکھا تھا۔

یوں جیسے کوئی عام سی بات ہو جو وہ روزمرہ میں ڈسکس کرتے ہوں۔

آہستگی سے سر اٹھا کر وہ ان کی آنکھوں میں تحریر سوال پڑھنے لگا۔

عام سے ایک سوال کے ساتھ وہاں خاص سا ایک خدشہ بھی درج تھا۔ وہی خدشہ جو ہر اکلوتے اور جوان بیٹے کی ماں کو ہر وقت لاحق رہتا ہے۔۔۔

"سب خیر ہو" کا خدشہ۔۔۔

وہ آہستگی سے اٹھ کر ان کے ہمراہ بیٹھ گیا۔

اس کا چہرہ پھر سے سنجیدہ ہو گیا لیکن غصہ کا عنصر اب وہاں مفقود تھا۔

" کچھ خاص نہیں ہے ماما۔ بس آج ایک کلاس میٹ سے شدید بحث ہو گئی۔ اور اس مباحثے کی وجہ انتہائی فضول تھی۔۔۔ مطلب میرا خیال نہیں تھا کہ میں بھی کسی سے ایسے موضوع پر بحث کر سکتا ہوں۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ سب میری شان کے خلاف ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ آج ایسا ہوا بھی۔۔۔ بس اسی بات کی گرفت میں تھا اب

تک۔" دھیرے دھیرے اس نے بات مکمل کی تو انہیں لگا کہ وہ کسی اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے۔
" کوئی بات نہیں بیٹا۔۔۔زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جو " کبھی " نہیں کرنا چاہتے وہ "اکثر" کر جاتے ہیں۔کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے ہی عوامل پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔۔۔تم مجھے پوری بات بتاؤ تاکہ میں اس موضوع پر تمہاری مدد کرسکوں۔اور یہ میری شان کیا ہوتا ہے سفیر؟ کیا تم نے اپنے دل میں اپنا کوئی خاص مقام طے کررکھا ہے؟؟ اگر ہاں تو مجھے شدید حیرت ہے۔
یادرکھنا بیٹا کہ کسی "میں" کی کوئی "شان" نہیں ہوتی۔۔۔"
انہوں نے وہی لب ولہجہ اختیار کیا جو ایسے ہر موقعے پر کارگر ہوا کرتا تھا۔
اثبات میں سر ہلاتا وہ بالکل خاموش ہوگیا۔
ان کی آخری بات نے اسے لاجواب کیا تھا۔
اس کے دل میں خود کا ایک طے شدہ "مقام" تھا۔۔۔یہ وہ بخوبی جانتا تھا۔
ذکیہ خاتون خاموشی رہ کر بغور اس کے چہرے کے بدلتے رنگ وتاثرات جانچ رہی تھیں۔
کچھ پل اسی خاموشی میں سرک گئے۔
"ابھی ابھی آپ نے کہا ناماما کہ کبھی کبھی ہم اپنے آپ کے بھی خلاف ہوتے ہیں۔ہوادراصل یوں کہ میری ایک کلاس فیلو ہے ثومیہ۔پچھلے ایک ہفتے سے ہم ایک اچھے کمفرٹ لیول پر رہ کر دوست ہیں۔اور آج ایک نیا لڑکا آیا ہے کلاس میں۔انتہائی بدتمیز قسم کا......"
پھر لہجے کے زیر و بم میں دھیرے دھیرے اس نے آج مصطفین کی آمد اور ثومیہ سے بحث تک کی ساری روداد تفصیلاً کہہ سنائی۔
اپنے طور پر اس نے کسی بات کا کوئی پردہ نہیں رکھا تھا۔
وہ مسرت، حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چپ چاپ، اسے سنتی رہیں۔
اپنی بات کے اختتام پر اس نے گلاس بھر کر پانی پیا اور طویل سانس خارج کر کے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔

وہ اب پرسکون تھا۔۔۔

کامل آرام میں۔۔۔

ان سے بات کر کے ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

جبکہ ان کے تاثرات بتدریج فکرمندی میں ڈھلنے لگے۔

اس سارے قصے میں انہیں صرف اسی کا قصور نظر آیا تھا جو اپنے تیئں خود کو بے قصور سمجھ رہا تھا۔

مصطفین کو انہوں نے بس ایک لاابالی بچہ گمان کیا تھا جو شاید کچھ زیادہ "خوش مزاج" تھا جبکہ ثومیہ انہیں سمجھدار اور حساس لگی تھی۔

اس کی بند آنکھیں پڑھتے کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے لفظ ترتیب دیے اور پھر گویا ہوئیں۔

"دیکھو سفیر۔۔۔ بات یوں ہے کہ میرے خیال سے وہ بچی ٹھیک کہتی ہے۔ اکثر تم اپنی خود پسندی کو خود اعتمادی یا خودشناسی کا نام دیتے ہو۔۔۔ لیکن اس دلاسے سے تم خود کو مطمئن تو کر سکتے ہو لیکن دوسروں کو نہیں۔"

یہ سنتے ہی جھپاک سے کھلی اس کی آنکھوں میں تحیر ابھرا۔ اسے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ ان کی طرفداری کریں گی۔

اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے تھے کہ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ لب بھینچ کر چپ چاپ انہیں دیکھنے لگا۔

اس کا چہرہ پھر سے تپ گیا تھا۔

"ہاں بیٹا میں غلط نہیں کہہ رہی۔ تمہیں اپنے رویے میں تبدیلی کی ضرورت ہے یہ تو اس سے پہلے بھی میں اکثر تمہیں کہہ چکی ہوں۔ تم خود کو لاکھ دفعہ بھی "خودشناس" کہو لوگ تمہیں "خود پسند" ہی سمجھتے ہیں۔ ذرا رک کر سوچو تو سہی کہ ایسا کیوں ہے؟؟ رہی بات تمہارے ان کلاس فیلوز کی تو یہاں بھی سراسر تمہاری ہی غلطی دکھائی دیتی ہے۔ اس لڑکے کا رویہ اگر غلط لگا تھا تمہیں تو جواباً تمہارا بہت ہی غلط تھا۔ پھر اس انجان کے لیے تم نے ایک دوست سے بھی جھگڑا کیا۔ تمہیں اگر اس انجان سے معذرت نہیں کرنا تھی تو اپنی دوست پر طنز تو نہ کرتے۔ اور اگر اسے لگا کہ تم دونوں کو اس لڑکے سے معذرت کرنی چاہیئے تو سوچو کہ تمہاری بجائے اس نے ایک انجان شخص کی

طرفداری کیوں کی؟"

نرم لیکن دوٹوک لہجے میں انہوں نے اپنی بات پوری کی اور غیر محسوس انداز میں اس کے گرد سوالات کا ایک جال بن دیا۔

انہیں ثومیہ میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی تھی کیونکہ آج سے پہلے وہ کسی "دوست" سے اتنا اٹیچ نہیں تھا کہ اس کی پریشانی لے کر گھر آتا۔۔۔تو یقیناً وہ لڑکی کچھ خاص تھی لیکن اس وقت اس کو کریدنا انہیں غیر مناسب لگا۔

ان کی باتیں سن کر چند لمحات کو وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھ گیا۔۔۔

یوں جیسے اپنی ذات کے تجزیے میں مصروف ہو۔

خوش رنگ لبوں کے کپکپاتے دھاروں نے بتایا کہ اس کے سب حروف ساکت تھے۔

چپ کا یہ دورانیہ طویل ہوا تو ذکیہ خاتون نے محسوس کیا کہ ان باتوں پر غور کرنے کو اسے کچھ وقت درکار ہے۔۔۔کہ اپنا اندرون کھنگالنے کو انسان اکثر تنہائی چاہتا ہے۔

"جاؤ اوپر آرام کرو کچھ دیر۔اور میری باتوں کو سوچنا ضرور بیٹا۔اٹھو شاباش۔"

وہ اٹھیں اور پیار سے کہہ کر اسے بھی صوفے سے کھینچا۔

اثبات میں سر ہلاتا وہ کسی روبوٹ کی طرح اٹھا اور بیگ لے کر خاموشی سے زینے کی طرف بڑھا۔۔۔

اس کے اندر اور باہر بھی۔۔۔جلتی آنکھوں میں دبی چپ کی چیخوں کا شور تھا۔۔۔

دھیرے دھیرے زینوں پر قدم دھرتا وہ گویا اپنی ہستی کی پہچان کے سفر پر تھا۔

☆......☆......☆

مصنوعی پہاڑی سے اتر کر وہ تارکول سے بنی پختہ شاہراہ پر آیا تو وہ بزرگ اسے "دارالسلام لائبریری" کے سامنے سے گزرتے دکھائی دیے۔شولڈر بیگ سنبھالتا وہ تیزی سے ان کے پیچھے بھاگا لیکن اس سے پہلے کہ ان تک پہنچتا وہ لائبریری سے چند قدم کی دوری پر کھڑی ایک کار میں بیٹھے اور چلے بھی گئے۔ایک جھٹکے سے رک کر وہ زناٹے سے نکلتی گاڑی کو دیکھ کر رہ گیا۔

"آہ۔۔۔میں ان سے کبھی مل بھی سکوں گا کیا؟؟"

گھٹنوں پر ہاتھ رکھے جھک کر سانسیں ہموار کرتا وہ خود کلام ہوا۔

پھر آہستگی سے مڑ کر وہ "دار السلام لائبریری" سے متصل مسجد کی مناریں دیکھنے لگا۔ مسجد کے برآمدے میں بیٹھے لائبریری کے طلباء مختلف کتابیں کھولے پڑھ رہے تھے اور یہ یہاں کا عمومی منظر تھا۔

سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر وہ مڑا اور لائبریری کے عین سامنے واقع ٹریک پر چلتا ہوا دھیرے دھیرے "بارہ دری" گراؤنڈ کی جانب بڑھنے لگا۔

اس سڑک کی دونوں اطراف میں قطار در قطار، گھیر دار تنوں والے شاہ بلوط کے خوبصورت درخت لگے تھے۔ جن پر بیٹھے بے شمار پرندوں کی چہچہاہٹ، اس کے کانوں میں عجب سروں کا مدھر رس گھول رہی تھی۔

"بارہ دری" باغِ جناح کا سب سے خوبصورت گراؤنڈ تھا۔ اس میں چھوٹی لال ٹائلوں کے مختلف دیدہ زیب ٹریکس بنائے گئے تھے اور ان دوطرفہ ٹریکس کے مابین ایک سے دوسرے سرے تک پھیلے خوبصورت فواروں کا منظر نرالی چھب دکھاتا تھا۔ اس میں واقع ایک خوبصورت بارہ دری کی بدولت اس کا نام "بارہ دری گراؤنڈ" تھا اور ہر سال خزاں کے بعد یہاں آمد بہار کے سلسلے میں ایک خوبصورت فیسٹول کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ جس میں مختلف النسل رنگا رنگ پھولوں اور بیلدار پودوں کی نمائش کی جاتی تھی جسے دیکھنے کے لیے پہلے ہفتے میں تو گویا پورا لاہور امڈ آتا تھا۔ دو ماہ کی مدت تک جاری رہنے والے اس فیسٹول میں وقفے وقفے سے لوک موسیقی کے پروگرام رکھے جاتے تھے جس کے ملک کے نامور لوک فنکار عوام کے درمیان رہ کر پرفارم کرتے تھے۔ ان دنوں میں بھی عوام کا جوش اور شرکت دیدنی ہوتا تھا۔

تیز چلتی ہواؤں کی یخ بستگی محسوس کرتا وہ یہاں داخل ہوا اور فواروں کے اچھلتے پانی کا دلکش منظر دیکھتا ہوا دھیرے دھیرے لال روش پر چلنے لگا۔ اسی دوران آسمان سے پھوار برسنے لگی۔ اردگرد موجود افراد بھاگ کر اس پھوار سے پناہ کی تلاش میں قد آور درختوں کے موٹے تنوں سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں بارشوں سے بچتا دیکھ کر وہ اداسی سے مسکرایا۔

ایسی مسکراہٹ کہ جس میں ہواؤں کی نارسائی کا کرب شامل ہو۔۔۔

ایسی مسکراہٹ کہ جس میں ان چھوئے احساسات کا بھید ساکن ہو۔۔۔

"رحمت سے چھپتے ہیں بھلا۔۔۔"

انہیں "عنوان" دیتا وہ آگے بڑھتا رہا۔۔۔

سرسبز وشاداب گھاس بارش سے دھل کر مزید نکھر گئی تھی اور طویل قطاروں میں لگے ہر ہر پیڑ کے سبز پتوں پر لرزاں بارش کے قطرات پھسل کر آس پاس گر رہے تھے۔

لال اینٹوں کی پختہ روش پر چل کر آہستگی سے بارہ دری کی جانب بڑھتا وہ ان قطرات کے گر کر بکھرنے کا غم پوری شدت سے اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔

اسے بارش کے ان سرد پانیوں کی درختوں سے "جدائی" کا دکھ تھا۔۔۔

پھر سبز پتوں کے "زرد غم" کو روتا وہ بارہ دری کی منقش چھت کی خوبصورت بیرونی دھاریں دیکھ کر آگے بڑھنے لگا۔ تیز ہواؤں کی بدولت درختوں کی چوٹیوں سے گیلے خشک پتوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی شاخیں بھی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے قدموں تلے بکھر رہی تھیں۔

ان پر قدم دھرتا چہرے پر اذیت لیے وہ ان کی گراوٹ کے بین سننے لگا۔۔۔

بارہ دری سے چند قدم کے فاصلے پر وہ بے ساختہ رک گیا۔

کسی کو "بہت مصروف" دیکھ کر اسے رکنا پڑا تھا۔۔۔

ہاتھوں میں قلم دابے "محویت" سے ایک دستے پر "مسلسل" کچھ لکھتی وہ لڑکی بارہ دری کے ایک در سے ٹیک لگا کر سیڑھیوں پر نہایت مضبوطی سے قدم جمائے بیٹھی تھی۔

اردگرد سے بے نیاز ہو کر اپنے دھیان میں گم وہ رہ رہ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو بھی پونچھ رہی تھی۔ اس نے سکارف سے اپنا سر اور ماتھا ڈھانپ رکھا تھا جبکہ بڑی سی گولائی دار شال سے نکل کر اس کا لمبا نیل رنگ دوپٹہ ہوا کے دوش پر بارہ دری کے سفید مرمری فرش پر جا بجا بکھر رہا تھا۔۔۔

کم عمری میں بھی اس کے چہرے پر متانت کی جھلک تھی۔

مصطفین آگے نہیں بڑھ سکا۔۔۔ ایک پل کو مودب ہو کر وہ وہیں جم گیا تھا۔

لڑکی کی شخصیت اس قدر بارعب اور پروقار تھی کہ اسے دیکھ کر کسی کا بھی دل بے ساختہ احترامات بجا

لاتا۔۔۔ بارعب شخصیت کی حامل، لگ بھگ چھبیس، ستائیس سالہ اس لڑکی کو اس نے پہلے بھی یہاں کئی جگہوں پر بیٹھ کر اپنے دھیان میں گم لکھتے ہوئے دیکھا تھا۔

کبھی وہ اسے "قائداعظم لائبریری" کے داخلی احاطے کی وسیع سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آتی تھی تو کئی بار اس نے اسے مصنوعی پہاڑی کی آبشار کے سامنے دھرے سنگی بینچ پر بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔

مصطفین کو پارک میں ایزل لگائے مختلف فن شاہ پارے تخلیق کرتے این۔سی۔اے کے طلبا و طالبات، بانسری کی مدھر دھن بجاتا وہ بزرگ اور پارک کے تنہا گوشوں میں بیٹھ کر لکھتی یہ "اداس" قلمکار۔۔۔ یہ تینوں بہت اچھے لگتے تھے۔

ہر بار انہیں دیکھتے اس کی کوشش اور خواہش ہوا کرتی تھی کہ ان سے گفت وشنید ہو۔

اسے لگتا تھا کہ یہی تین قسم کے لوگ ہیں جو اداسیوں کا ہر "باب" عمدگی سے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔

کہ ان سے بات چیت کر کے اندرونی خلفشار کو کتھارسس کی راہ مل سکتی ہے۔

لیکن ان کو برا لگنے کے ڈر سے وہ ان سے بات کرنے سے اجتناب کرتا تھا۔

وہ لڑکی چند قدم کے فاصلے پر اس کی موجودگی سے یکسر بے خبر لکھنے میں مصروف تھی۔

گاہے بگاہے اس کا آنسو پونچھنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ آج بھی وہ کچھ "حساس تر" لکھ رہی ہے۔

اس کی مجموعی شخصیت سے متاثر رہ کر آج گفتگو کے ارادے سے وہ دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھا۔

شانے سے بیگ اتار کر اس نے دائیں ہاتھ میں جکڑ لیا تھا۔

☆......☆......☆

کمرے میں داخل ہو کر اس نے بیگ صوفے پر اچھالا اور وہیں بیٹھی جوتا اتار کر پاؤں مسلتے ہوئے انہیں آرام پہنچانے لگی۔ کچھ دیر بعد لمبے بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوئی اور لمبے لمبے سانس بھر کر خود کو متوازن کیا۔ ابھی ابھی اپنے سخت گیر باپ شاہجہان عادل سے ہوئی اس چھوٹی سی ملاقات نے اس کے سب عضلات کو تان دیا تھا۔ حتی المقدور اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنا ڈر ان پر ظاہر نہ کرے جبکہ درحقیقت اس کوشش کی تکمیل تک اس کا اندرون سولی پر ٹنگا رہتا تھا۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم مضبوط ہوتے نہیں بس خود کو ظاہر کرتے ہیں اور پھر اس مضبوطی کے ہر اظہار کی ہر کوشش ہمیں بہت سی "تھکان" عطا کرتی ہے۔۔۔

ہمارا اندرون ٹوٹ جاتا ہے۔۔۔اتنا کہ ہماری حالت ریختہ پر ہمیں بھی ترس آنے لگتا ہے۔لیکن ہم اپنی اس "مصنوعی مضبوط" کیفیت میں اتنی شدت سے مبتلا ہوتے ہیں کہ چاہ کر بھی اس سے نکل نہیں سکتے۔۔۔ہمیں بہر طور خود کو مضبوط ظاہر کرنا ہی پڑتا ہے۔

وہ بھی انہی کیفیات میں گھل رہی تھی۔

اپنے بابا سے اندرونی خوف میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کے سامنے خود کو بہت مضبوط ظاہر کرتی تھی۔

اور اب بھی وہ خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔بچپن سے اب تک ان کی ہر لعن طعن پر خاموشی اختیار کرتے کرتے اس کے اندر اک طوفان و شور جمع ہو چکا تھا۔

خاموشی طویل ہو جائے تو اندر شور کرنے لگتی ہے۔اس کا بھی یہی عالم تھا۔

اپنا چہرہ تھپتھپاتی ہوئی اٹھ کر وہ کمرے کی بائیں دیوار میں موجود بڑی سی کھڑکی پر جا رکی۔دونوں پٹ کھول کر اپنا آدھا وجود کھڑکی سے باہر نکالے،تیز ہوا میں لہراتی اپنی دراز زلفوں کو سمیٹتی وہ ان ہواؤں کا زور ناپنے لگی۔آسمان پر محوِ سفر بادلوں کی دربدری جانچ کر اس نے سن رسیدہ درختوں کے خزاں رسیدہ پتوں پر لرزاں برستی پھوار کے ننھے قطرات دیکھے۔ہوا کے زور سے یہ گیلے زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر پورے احاطے میں بکھر رہے تھے۔انہیں شاخوں سے چھوٹ جاتے دیکھ کر وہ بے طرح اداس ہوئی۔ہاتھ بڑھا کر ہتھیلی پر پھوار کا پانی جمع کرتی وہ نہیں جانتی تھی کہ "یاسیت" کا یہ پل اس اکیلی پر وارد نہیں ہوا تھا۔۔۔کہ دور کہیں،کوئی ہے جو ان اداسیوں کے ہر "باب" کو اس کے ساتھ ساتھ "پڑھ" رہا ہے۔۔۔

نمرہ نے کمرے میں آ کر اسے بستر پر محوِ استراحت ہونے کی بجائے،گم سم ہو کر کھڑکی کی سل سے لگے پایا تو حیران رہ گئی۔وہ آہستگی سے چل کر اس کے قریب آ رکی تو آنکھوں میں انجان کسک سموئے،اس کی آمد سے یکسر بے خبر وہ اپنے کسی عمیق تر دھیان میں کھوئی رہی۔

اس کے چہرے پر رقم تاثرات سے اسے صاف دکھائی دیا کہ وہ کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہے۔

"تم سوئیں نہیں اب تک؟ تمہیں نیند آئی تھی نا؟؟"

نرمی سے اس کا شانہ چھو کر اس نے سوال کیا اور جھک کر باہر موسم کی حالت دیکھی۔ بابا سے ابھی ہوئی اس کی "گفتگو" پر اسے سمجھانے سے پہلے وہ اسے کچھ وقت دینا چاہتی تھی۔

"آں ہاں۔۔۔نہیں۔۔۔مجھے نیند نہیں آئی تھی۔میں نے بس وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔"

وہ چونک کر پلٹی تو نمرہ نے بغور اس کا انداز دیکھا۔اس کا دوٹوک لہجہ بتا تا تھا کہ وہ بہت سے فیصلے کیے بیٹھی ہے۔

"اوکے یہاں سے تو ہٹو۔کھڑکی بھی خواہ مخواہ کھول دی تم نے۔ابھی ہوا کا رخ بدلا تو سارا اندر بھیگ جائے گا۔۔۔"

اس کی اطراف سے نکل کر وہ بڑھی اور کھڑکی کے پٹ باہم لگاتی سادہ لہجے میں بولی۔

عام پیرائے میں کی گئی اس کی بات کو اس نے جانے کا رنگ میں لیا کہ آزردگی سے مسکرادی۔

"اندر بھیگ جانے کے لیے ہواؤں کے رخ بدلنا ضروری نہیں ہوتا۔۔۔ اور بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔۔۔"

بیڈ کی طرف بڑھتے اس نے نمناک لہجے میں یوں کہا کہ اس کے ہر لب ولہجہ سے آشنا نمرہ کے ہاتھ کھڑکی کے کنڈے پر رک سے گئے۔مڑے بغیر لب بھینچے وہ ایک پل کو ساکت ہوئی تھی۔یعنی اسے بالکل ٹھیک لگا تھا کہ وہ کسی خلفشار میں ہے۔پھر کھڑکی سے پشت ٹکا کر اس نے وہیں رک کر اسے دیکھا۔کھڑکی کے گیلے شیشوں سے لگ کر اس کی کمر بھیگنے لگی۔باہر اب بارش پوری شدت سے برسنے لگی تھی۔

"اندر بھگونے کو تو لہجوں کی گرمی ہی کافی ہوتی ہے۔ہاں۔۔۔ہواؤں کو دوش مت دو تم۔۔۔کہ اندر بھیگ جانے پر "موسم" نہیں "مزاج" اثر کرتے ہیں۔ہوائیں تو بس، بہت بھیگا ہوا ہمارا یہ اندرون "چھانٹنے" کو چلتی ہیں۔" بیڈ کی الٹی جانب ٹکی ثومیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مزید کہا۔وہ جیسے اس کے مڑنے کی ہی منتظر تھی۔

اس کے زخم لہجے پر وہ بمشکل مسکرائی۔

"کیوں کرتی ہو ایسی باتیں یار؟؟ کیوں ہوتی ہو اس قدر اداس تم؟؟ مجھے خود سے اور سب سے بھی۔۔۔ لڑتی جھگڑتی یہ بہن نہیں چاہیئے۔۔۔ مجھے تمہارا وہی روپ اچھا لگتا ہے جس میں تم اپنے اس ہم جماعت کے غرور کی ایسی کی تیسی کرتی ہو۔ سو پلیز مجھے بس وہی قصے سنایا کرو۔۔۔ تمہاری یہ "ہوائی باتیں" مجھے سمجھ نہیں آتیں۔۔۔ اچھا۔۔۔"

اس کے لہجے کا استفہام بتدریج مزاح میں ڈھلا تھا۔ وہ اسے مزید اس نہج پر نہیں جانے دے سکتی تھی۔ اس نے اپنے والد شاہجہان عادل کا موضوع پھر کسی وقت پر اٹھا رکھنے کا سوچا۔

"حقائق سے منہ پھیر لینے سے ان کا وجود نہیں مٹتا نمرہ۔۔۔ اور ہماری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی سے وابستہ ہر حقیقت سے ہمیشہ چشم پوشی کرتے آئے ہیں۔ ہم بابا کے عجیب تر رویے اور ہم تینوں سے اکثر ہوئے غلط برتاؤ پر چپ سادھ لیتے ہیں۔ ہم انہیں نہیں بتاتے کہ ان کی بے سروپا باتوں اور ہماری ذات پر شکوک سے ہمارا دم گھٹتا ہے۔ حتیٰ کہ ہم تو یہ سب آپس میں بھی ڈسکس کرنے سے کتراتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی تم کر رہی ہو۔۔۔ جیسا کہ ماما ہمیشہ سے کرتی آئی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟؟ میں تمہیں، تم مجھے اور ماما ہم دونوں کو۔۔۔ ہم سب ایک دوسرے کو ہی کیوں سمجھاتے آئے ہیں؟ ہم میں سے کسی ایک نے بھی بابا کو یہ سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کی اب تک کہ وہ کب، کہاں اور کتنا غلط ہوتے ہیں؟؟ خاندان برادری میں سب کے سامنے جہاں چاہے وہ ہماری انسلٹ کر دیتے ہیں۔۔۔ کیوں نمرہ؟ ہم کیوں چپ رہتی ہیں؟ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟ کیا وہ ہمارے باپ نہیں ہیں؟ یا ہم ان کی بیٹیاں نہیں ہیں؟؟ بتاؤ ایسا کیوں ہے؟"

اس کی ہر اجتنابی کوشش کو روند کر وہ اسے سیدھا اس موضوع پر لے آئی تھی جس پر ابھی یا کم از کم ان الفاظ میں وہ اس کا سامنا ہرگز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں در آئے اشک دیکھ کر وہ کھڑکی سے ہٹی اور اس کے قریب آرکی۔

"یہ تم کیا کیا سوچتی رہتی ہو؟ یہی سب مجسّس پلتا ہے کیا تمہارے اندر؟؟ جانے دو یار۔ اس سب باتوں کا کیا فائدہ؟؟ کچھ حصول نہیں اس کا۔۔۔ خدارا دھیرج رہو۔ میں خاموش رہتی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہی

"چپ" اس کا واحد حل ہے۔ بابا کبھی نہیں جان سکتے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ جان بھی لیں تو وہ ہمارے احساسات سمجھ نہیں سکتے۔ اور زندگی کا یہ اصول ہوتا ہے کہ جب طے ہو جائے کہ کوئی آپ کے "احساسات" نہیں سمجھ سکتا تو اس پر اپنے "محسوسات" کبھی ضائع مت کرو۔ ورنہ سوائے مزید دکھ کے اور کچھ نہیں ملنے والا۔۔۔ تم بھی جلد از جلد یہ بات سمجھ لو ثومیہ کہ تمہارا باغی لب و لہجہ انہیں ہم پر مزید سختی پر اکسائے گا اور بس۔۔۔ سوا اس کے، نتائج کچھ بھی ناں ہوں گے۔۔۔"

اس کے بال سنوار کر، اسے دونوں شانوں سے تھامے وہ نرمی سے انہیں دباتے ہوئے بولی۔۔۔

نمرہ کا پر یقین لہجہ تھا کہ بااعتماد لفظ۔۔۔ اس کا غصہ تحلیل ہوتا گیا اور وہ بتدریج دھیمی ہو گئی۔ اس پل خود سے چھوٹی نمرہ اسے بہت بڑی لگی تھی۔

زندگی میں بڑا یا چھوٹا ہونا ہماری "عمر" نہیں بلکہ ہمارا "رویہ" طے کرتا ہے۔۔۔

اثبات میں سر ہلا کر وہ چپ رہی تو نمرہ نے بھی مزید گفتگو سے پرہیز کیا۔ ان دونوں کے مابین طاری اگلے کئی لمحات اسی بامعنی خاموشی کی نذر ہوئے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کے الفاظ و بیان کی گونج میں رہ کر ان کے اوزان ماپ رہی تھیں۔

"بڑی سمجھدار ہو گئی ہو نمرہ۔۔۔ کہاں سے سیکھیں یہ سب باتیں؟؟"

کچھ دیر بعد سر اٹھا کر وہ بولی تو نمرہ نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ اب متوازن تھا۔ سوال سن کر اس کی آنکھوں کی بڑھتی جوت میں یکا یک شرارت ناچنے لگی۔

" کہاں سے سیکھنا ہے جناب۔۔۔ وہیں سے جہاں سے تم نے موسموں سے گفتگو کرنا سیکھا ہے۔۔۔ ابھی دیکھا ہے میں نے صحن میں برستی ان سرد بارشوں سے تمہارا رازِ دل کہنا۔۔۔ بھئی مجھے بھی بتا دو۔۔۔ کوئی ایسی ویسی بات ہے تو۔ کب تک یوں ان بے جان کھڑکیوں سے لگی رہا کرو گی؟؟ معاملہ کیا ہے پیاری؟؟ ہاں؟؟۔"

چہرے پر آئی اپنی دراز لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑس کر وہ شریر لہجے میں بولی تو اس کی چھیڑ خانی پر وہ فقط مسکرا دی۔۔۔

پھر اٹھی اور اسے سامنے سے ہٹا کر وقار سے چلتی ہوئی دوبارہ اسی کھڑکی سے جا لگی۔

اس کا انداز کچھ کھویا کھویا تھا۔

اس نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔

پیچھے اپنا جالی دار دوپٹہ انگشتِ شہادت پر لپیٹتی نمرہ نے حیرت در حیرت اس کا یہ فدائی انداز دیکھا۔

" کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے یار۔۔۔ تمہیں پتا تو ہے کہ یہ بارشیں مجھے بچپن سے بہت پسند ہیں۔ ہاں بس ایک بات کہ یہ کھڑکیاں "بے جان" نہیں ہوتیں یار۔۔۔ بہت دلوں کے کئی راز ہوتے ہیں جوان کی سلوں پر دھرے سسک سسک کر سانس لیتے ہیں۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ جہاں میں ایسے بھی کہ جن کی یہ "رازدان" ہوتی ہیں۔۔۔"

کھڑکی کی سل پر نرمی سے ہاتھ پھیرتی وہ اس طرح سے بولی کہ نمرہ کے مسکراتے لب اور ہلتے ہاتھ یکبارگی ساکت ہوئے تھے۔

ایک پل کے لیے وہ تھم سی گئی تھی۔

اور وہ یہ کہہ کر ایک طرح سے اسے نظر انداز کرتی ہوئی پھر سے آسمان جھانکنے لگی تھی۔

اس نے نمرہ سے جواب طلب نہیں کیا تھا یا شاید اسے کسی جواب کی تمنا ہی نہیں تھی۔

"باہر ہوتی بارشیں شدید ہونے لگیں تو تمام تر رکاوٹوں کے باوجود بھی سارا "اندر" بھیگ جاتا ہے۔۔۔ جل تھل۔۔۔"

کھڑکی کی کل چوڑائی میں بنا منقش چھجا دیکھتی وہ عجب کرب سے بڑبڑائی۔

یقیناً بظاہر سنبھل جانے کے باوجود اس کا اندرون جذبات کے کسی انتہائی ریلے میں بہہ رہا تھا۔۔۔

نمرہ نے بے بسی اور تفکر کی ملی جلی کیفیت میں اب دوبارہ باہر جھانکتی اپنی اس حساس تر بہن کو دیکھا۔

اسے لگا کہ اس کے پاس فی الحال اسے اس کی تمام تر حساسیت کے ساتھ تنہا چھوڑ دینے کے سوا شاید کوئی چارہ نہیں ہے۔

کچھ کہے بنا وہ پلٹی اور دروازے پر رک کر ایک بار پھر اسے دیکھ کر باہر نکل گئی۔

دروازہ بند ہونے کی آواز پر ثومیہ نے مڑ کر دیکھا اور کھڑکی سے سر ٹکا کر پھر سے "بارشیں" دیکھنے لگی۔۔۔

کبھی کبھی ہم بے سبب "اداس" ہوتے ہیں تو کوئی موسم ہمیں خواہ مخواہ "چھیڑ" جاتا ہے۔۔۔

☆......☆......☆

لڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے من ہی من میں اسے مخاطب کرنے کے لیے لفظ ترتیب دیے۔

"السلام علیکم آپی۔۔۔ اگر آپ کو برا نہ لگے اور آپ معترض بھی نہ ہوں تو کیا میں آپ سے بات کر سکتا ہوں؟؟؟ پلیز ززز۔۔۔"

اس سے تین قدم دور رک کر اس نے سلام کیا اور مودب لہجے میں اجازت طلب کی۔ وہ چونکے بنا، آنسو صاف کر کے، بااعتماد نظروں اسے دیکھنے لگی۔

مصطفین نے دیکھا کہ اس کی ذہانت سے پر آنکھوں میں جھلک دیتا ایک تاثر حیرت کا بھی تھا۔

یقیناً اس کی غیر متوقع آمد اور پھر گفتگو کی خواہش پر وہ حیران ہوئی تھی۔

اپنا قلم صفحے پر چھوڑتے ہوئے دستہ بند کر کے اس نے بغور اس کا جائزہ لیا کیونکہ اس کے ادا کردہ جملے سے اسے لگا تھا کہ اس سے چند سال چھوٹا وہ کالج بوائے "آداب گفتگو" سے خوب واقف ہے۔

مودب لہجے میں کہہ کر اب احتراماً نظریں جھکائے وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

چہرے پر درج یاسیت کی لکیریں اور حزن و ملال کے گہرے رنگ لیے وہ برستی ہوئی پھوار میں کھڑا بے پرواہی سے بھیگ رہا تھا۔

ڈھلکے شانے اور جھکا ہوا سر اسے کوئی غمزدہ، ہارا ہوا شخص ظاہر کرتے تھے۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ اور اندر آجاؤ بھائی ورنہ آپ اور آپ کا یہ بیگ۔۔۔ مکمل طور پر بھیگ جاؤ گے۔"

تفصیلی جائزے کے بعد اس کی حالت ریختہ پر ترس کھا کر اس نے اس "رنجگی" سبب جاننے کے لیے اسے اجازت دے دی۔ ایک لکھاریہ ہونے کے ناطے مختلف انسانی رویہ جات کا عمیق تر مشاہدہ و کھوج کرنا اس کی اول ضرورت تھی۔

بااعتماد لہجے میں دی گئی اجازت پا کر وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ تین سیڑھیاں چڑھ کر بارہ دری میں داخل ہو گیا تو وہ فرش پر پھیلا اپنا لمبا دوپٹہ سمیٹ کر اپنی گود میں دباتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔۔۔

وہ اب بارہ دری کے دوسرے در سے ٹیک لگائے کھڑا رومال کی مدد سے اپنا گیلا چہرہ و بال خشک کر رہا تھا۔

"جی کہیئے بھائی کیا بات کرنا چاہتے تھے آپ مجھ سے؟؟ میں سن رہی ہوں۔"

خوبصورت آواز کے ساتھ مصطفین کو اس کا دوٹوک لہجہ گویا حد متعین کرتا ہوا سا لگا۔ یقیناً ایک لڑکی ہو کر وہ ہر "ایرے غیرے" سے بات چیت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک لڑکی ہو کر بھی وہ مردوں کے اس معاشرے میں ایک منفرد "شناخت" اور "نام" رکھتی ہے۔

"میرا نام مصطفین ہے آپی۔۔۔ مصطفین شجاع۔۔۔ اور آپ کو لکھتے ہوئے دیکھ کر میں متوجہ ہوا ہوں۔ اس پارک کے مختلف گوشوں میں اکثر دیکھا ہے میں نے آپ کو یونہی اپنے دھیان میں لکھتے ہوئے۔۔۔"

یہاں رک کر اس نے ہنکارا ابھرا تو وہ سنجیدگی کے ساتھ سوالیہ نظریں گاڑے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

اس کی آنکھوں میں تیرتا ایک واضح سوال اس کی آمد کا "مقصد" جاننے سے متعلق تھا۔۔۔

اس کے انداز سے مرعوب ہو کر وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لیے مزید بولا۔

"دراصل قلمکاروں سے ملنے کا میں ہمیشہ سے مشتاق رہا ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے ان کے لکھے جذبات و بیان اور احساسات کو ان کے روبرو ڈسکس کرنا۔۔۔ لیکن یہ اب تک صرف ایک خواہش ہے۔ حقیقت میں نہیں ڈھل سکی۔۔۔ آپ کو لکھتے دیکھ کر اسی سبب ہی رک گیا ہوں میں۔"

شانوں سے بارش کے قطرات جھاڑ کر اس نے دوبارہ بیگ پہن لیا۔۔۔

اس کا سلجھا ہوا انداز اور الجھی الجھی گفتگو۔۔۔

لڑکی کی آنکھوں میں یکا یک اس کے لیے پسندیدگی کی چمک ابھری۔ انتہائی مودب ہو کر کہتا وہ اسے بالکل ایک بچہ لگا تھا جو کسی بھی لکھاری سے اپنا اندرون کہنا چاہتا ہو۔

"ہممم ویل۔۔۔ نام بہت پیارا ہے آپ کا بھائی۔۔۔ اور یہ سب جو بھی آپ نے کہا۔۔۔ سب ٹھیک۔۔۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟؟ وجہ کیا ہے کہ آپ ان کے لکھے جذبات کو صرف ان سے ڈسکس کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کے آس پاس، ارد گرد یا شاید ساتھ بھی۔۔۔ کئی ایسے لوگ ہوں

گے جوان ہی سب محسوسات کے حامل ہوں۔۔۔جو لکھاریوں کے لکھے میں دبے احساسات کو، آپ ہی کی طرح جب چاہے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتے ہوں؟؟ تو میرا سوال یہی ہے کہ آپ کی نظر میں صرف ان سے ہی ملنا کیوں ضروری ہے؟؟"

اب کی بار اس کا لہجہ نرم تھا۔ وہ اسے ایک دلچسپ " کیس " لگا تھا۔۔۔اس نے دیکھا کہ بات چیت کے دوران اس کے چہرے کا ملال بھی کم ہو گیا تھا۔ تو گویا اسے حقیقتاً کسی ایسے سامع کی ضرورت تھی کہ جس کے سامنے وہ اپنا "اندرون" کہہ سکے۔

" بس یونہی۔۔۔ بلا وجہ اور بے سبب۔۔۔ یوں کہہ سکتی ہیں آپ کہ میرے آس پاس، اردگرد۔۔۔اور ساتھ بھی۔۔۔کوئی موجود ہی نہیں کہ جس سے یہ سب ڈسکس کر سکوں۔ کتابوں کے سوا میری کسی سے دوستی ہی نہیں ہے۔"

یاسیت سے کہتا ہوا وہ دوسرے در کی سیڑھیوں پر پاؤں دھر کر آہستگی سے بیٹھ گیا تو اس کے لفظوں پر وہ چونک گئی۔ وہ اسی کے الفاظ کو عمدگی سے الٹ پلٹ کر " بدل " رہا تھا۔

لفظوں کی ساحر اس لڑکی پر اس کی " حرف گری " پوری شدت سے آشکار ہوئی تھی۔۔۔

" اور ہاں مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی ہے کہ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو کہانیوں کے ہر کردار کو جب چاہے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتے ہیں۔۔۔کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کیا لکھ رہی تھیں؟؟"

اس کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر وہ مزید بولا تو وہ شفقت بھرے انداز میں مسکرائی۔

" میں ایک ناول لکھ رہی ہوں آج کل تو بس وہی تحریر کر رہی تھی۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں وہ لوگ بھائی جو جملوں کی تراکیب سے آگاہ ہوں۔۔۔ الفاظ کی ترتیب بدل کر ان کا مقام طے کرنے والے یقیناً الگ ہوتے ہیں۔۔۔اور میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ بھی لفظوں کا ہنر جانتے ہیں۔۔۔آپ خود کیوں نہیں لکھتے کچھ؟؟ آپ کے " بولنے " سے لگتا ہے کہ آپ " لکھ " بھی سکتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ حوصلہ افزا لہجے میں بولی۔ عقیدت بھرے اس کے رویے کی بدولت وہ اب اس سے گفتگو میں آسانی محسوس کر رہی تھی۔

اسے الفاظ کے مقام سے واقفیت رکھنے والا یہ بے ضرر سا لڑکا اچھا لگا تھا۔اسے مل کر اسے اپنا ایک چچازاد بھائی یاد آیا تھا جو اس کی عمر کا تھا اور اسی کی طرح باتیں کرتا تھا۔

"پھوار اب تیز ہو گئی ہے۔۔۔شاید اب یہ دیر تلک ہو۔۔۔سنا ہے ایسی بارشیں رکتی بھی نہیں ہیں۔۔۔اور یہی "سیلاب" لاتی ہیں۔۔۔جذبات میں۔۔۔اور درحقیقت بھی۔۔۔"

ہاتھ بڑھا کر بارش کا پانی جمع کرتا وہ اچانک موضوع سے ہٹ کر بولا۔۔۔اس کا "مشورہ" تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں تھا۔

لڑکی نے حیرت سے اس کا کھویا کھویا انداز پرکھا۔۔۔اس کی اچھی لفاظی سے ہٹ کر اسے اس کی ذہنی حالت پر بھی شبہ ہوا۔۔۔لیکن کچھ کہے بنا وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔وہ اسے بولنے دینا چاہتی تھی۔

"یہ ناول جو آپ لکھ رہی ہیں۔۔۔یہ بارشوں میں پگھل جاتے جذبوں کے متعلق ہے نا؟؟ابھی دور سے میں نے دیکھا کہ اسے لکھتے ہوئے آپ رو بھی رہی تھیں۔تو کیا یہ بارشوں سے اٹھتے کسی درد کا بیان ہے؟؟"

احترامی نظروں سے اسے دیکھتا وہ عجب کرب سے بولا تو وہ اس کی "حساسیت" کی دلی معترف ہوئی۔۔۔

سوال کر کے وہ اب بارش میں بھیگے ہاتھ سے اپنے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔شاید یہ لاشعوری فعل تھا۔

اسی دوران ہوا کے ایک تیز جھونکے نے آس پاس موجود قدآور درختوں کی چوٹیوں سے زرد پتے اور چھوٹی، خشک ٹہنیاں توڑ کر،ان کے سامنے موجود طویل لال روش پر اچھال دیں۔

پتوں کے گرنے پر ہوا کی سرسراہٹ میں شامل ہو کر عجب سا شور گونجا تھا۔

ان دونوں نے بیک وقت چونک کر ہوا کے دوش پر رقصاں ان پتوں کی دربدری دیکھی۔۔۔

یہ منظر دیکھتی اس لکھاریہ کی آنکھیں بے سبب جلنے لگیں۔کچھ کہتی کہتی وہ رکی تو اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔۔۔

زرد پتے اڑ اڑ کر ان کے پاؤں سے لپٹنے لگے تو مضطرب ہو کر گود میں دھرا رجسٹر پکڑ کر دوپٹہ سنبھالتی وہ کھڑی ہو گئی۔اسے اٹھتے دیکھ کر مصطفین بھی اٹھ کھڑا ہوا۔وہ بغور پہلی سیڑھی پر رک کر ہواؤں کو گھورتی اس لکھاریہ کو دیکھ رہا تھا۔اسے صاف لگا کہ اس کا دھیان اب کہیں "اور" ہے۔۔۔

"میں بارشوں سے چھلتے زخم نہیں۔۔۔ان کا مرہم لکھتی ہوں۔۔۔"

اس کی کپکپاتی آواز پر وہ ساکت ہوا تھا جبکہ بارہ دری کے ستون سے لگی وہ اب آسمان کی وسعتیں کھوج رہی تھی۔۔۔

"ہاں بھائی۔۔۔میں، ہمارے قدموں سے لپٹ کر لوٹ جانے والے، خزاں رسیدہ ان زرد پیلے پتوں کا کرب لکھتی ہوں۔۔۔میں لکھتی ہوں کہ پاؤں میں سر پٹختے ان پتوں کا "بین" کیا ہے؟ ان کی چرمراہٹ میں دبی شاخوں سے بچھڑ جانے کی چیخیں لکھتی ہوں۔۔۔ہواؤں کے زور پر ہوئی ان کی لرزش، جنبش اور گراوٹ کی "آہ و پکار" لکھتی ہوں۔۔۔"

اس کے گرم لہجے کے زیر و بم میں ایسی "کیفیات" نہاں تھیں کہ وہ یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اسے لگا وہ اس کے محسوسات کی "زبان دان" ہے۔۔۔

اتنا کہہ کر لکھاریہ نے آسمان سے نگاہ ہٹالی۔

پھر اپنے بھیگے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اس نے ٹوٹی ہوئی، چھوٹی اور خشک ٹہنیوں کو لال روش پر لڑھکتے دیکھا تو مصطفین کو لگا کہ آسمان کا سارا "نیل" اس کی حسین آنکھوں کے نرم کناروں میں آن ڈھکا ہے۔۔۔وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔۔۔

"میں درختوں سے ٹوٹ کر بکھرتی ان سوکھی "ٹہنیوں" کی "داستان" لکھتی ہوں بھائی۔۔۔میں ہواؤں سے زیر لب مخاطب ہو کر کی گئی ان کی سرگوشیاں سن لیتی ہوں اور پھر لفظوں کی کسی بھی تہہ میں ڈھال کر اپنے قارئین تک ان کا "درد" لاتی ہوں۔ مجھے بارش کے قطرات میں جذب ہوئی "ٹھنڈی اگن" کا خوب "ادراک" ہوتا ہے۔۔۔میں "نرم لہجوں" میں چھپے "گرم جذبوں" کا بیان لکھتی ہوں۔۔۔"

اس کے لہجے میں چبھتے کانچ سی جھلک تھی اور آنکھوں میں پھر سے سیل رواں تھا۔ اس کی باتوں پر مبہوت ہوا کھڑا وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔ اسے لگا کہ حساسیت کی انتہا کو چھوتی یہ نرم خو لکھاریہ اس کے دل کے قرین کا ہر قصہ بیان کر رہی ہے۔۔۔اس کا فسوں خیز لہجہ کمال تر "سحر گر" بھی تھا۔ اس کے تمام لفظوں میں مصطفین کے جذبات و احساسات کی حقیقت پوشیدہ تھی۔

یقیناً وہ حساس تر پہلوؤں کی بہترین ترجمان تھی۔

" آپ بولتی ایسا باکمال ہیں۔۔۔تو لکھتی کیسا لازوال ہوں گی؟؟"

سرسراتی ہوئی آواز میں وہ بمشکل بولا تو نظروں سے نزدیکی شاہ بلوط کے پیڑ کا گھیر ماپتی وہ جیسے کسی خیال سے لوٹی تھی۔۔۔

پھر لمبی پلکوں میں ٹکے پھوار کے قطرے صاف کر کے اس کی طرف دیکھتی وہ پہلی بار مسکرائی۔

اس کی خوبصورت مسکراہٹ میں اداسی کی ایک نمایاں جھلک تھی۔

یوں جیسے وہ پورے دل نہ ہنستی ہو۔۔۔

" یہ ادیب لوگ سبھی ایسے ہوتے ہیں شاید۔۔۔اداس اداس۔۔۔رنجیدہ۔۔۔"

دل میں سوچتا وہ جواباً مسکرایا۔۔۔

" میرے قارئین کہتے ہیں کہ لازوال لکھتی ہوں۔۔۔الحمدللہ۔۔۔اب اس بات میں حقیقت کتنی ہے۔۔۔ واللہ ھو اعلم۔۔۔"

اس کا لہجہ عجز سے بھرپور تھا۔اسے اس کی انکساری بہت اچھی لگی۔

" آپ کی باتیں بہت پیاری ہیں۔آپ سے گفتگو کے بعد مجھے لگا ہے کہ جیسے میں اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔آپ کا ہر بیان میرے دل کے اندرون کا قصہ کہہ رہا ہے۔۔۔مجھے یوں لگا کہ میری بے سبب اداسی کا کتھارسس ہو گیا ہے۔بہت شکریہ۔۔۔ایسا ہی اچھا بولتی اور لکھتی رہیئے گا ہمیشہ۔۔۔اس معاشرے کو آپ جیسے لکھاریوں کی اشد ضرورت ہے۔جو حساس جذبوں کو عمیق تر لکھ سکیں۔۔۔"

نرمی سے مسکرا کر وہ شائستگی سے بولا تو شال درست کرتی وہ خوشدلی سے ہنس دی۔۔۔اسے اس کا سادہ انداز بے حد بھایا تھا۔

" تھینک یو سو مچ لل برو۔۔۔مجھے بھی اچھا لگا آپ سے بات کر کے۔خاص کر یہ اچھا لگا کہ آپ کی لفاظی بہت اچھی ہے۔۔۔ہاں آپ کی بے سبب اداسیوں کو میں چاہوں گی کہ آپ لازمی اور جلد کھوج لو۔۔۔کیونکہ اداسیاں "مہربان" ہو جائیں تو دھمال کرتی ہیں۔ان میں ایسی " کرامت" ہوتی ہے کہ ذروں کو چمکنے کی جلا بخش

دیتی ہیں۔تو بس جلد از جلد ان پر قابو پا کر آپ بھی چمک جاؤ۔۔۔"

نرم لہجے میں وہ انتہائی خلوص سے گویا ہوئی تو اسے لگا کہ موسم واقعی خوشگوار ہے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اپنے اندر کا حبس چھٹنے لگے تو ہر موسم، خوشگوار موسم ہونے لگتا ہے۔۔۔

"جی آپی ان شاء اللہ۔۔۔اتنی پیاری بات بتانے پر بار دگر تشکر۔۔۔"

وہ خوشدلی سے بولا۔۔۔

"اوکے مصطفین بھائی۔۔۔اب میں چلتی ہوں۔بہت دیر ہوگئی آج۔اور جانے سے پہلے پھر کہوں گی کہ آپ خود لکھیئے۔۔۔ناولز۔۔۔افسانے اور کہانیاں۔۔۔آپ میں اسپارک ہے۔میں نے دیکھا ہے کہ آپ لکھ سکتے ہو۔اچھا خدا حافظ۔۔۔"

بارہ دری میں داخل ہو کر اس نے اپنا رجسٹر ایک واٹر پروف فائیل میں رکھا اور اس کے قریب رک کر خلوص سے کہتی ہوئی اچانک بارہ دری کی دوسری سمت کو جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔۔۔

خوشدلی سے مسکراتا وہ یکا یک گڑبڑا گیا۔اسے اس طرح اچانک اس کے چلے جانے کی توقع نہیں تھی۔۔۔

"افففف۔۔۔ابھی تو میں نے ان کا نام پوچھنا تھا۔۔۔"

چند پل کی سوچ بچار کے بعد وہ تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔۔۔بارہ دری کی سیڑھیاں اتر کر برستی ہوئی پھوار میں باوقار، متوازن چال چلتی وہ اسے کلاسیک فلم کا کوئی کردار لگی۔

اس کا لمبا نیل رنگ دوپٹہ اطراف میں لہراتا ہوا مسلسل پختہ روش کے لال فرش کو چھو رہا تھا۔

"ایک منٹ رکیں پلیز۔۔۔بات سنیں بہنا۔۔۔"

وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو اس کی پکار پر وہ اب بھی چونکے بنا مڑی تھی۔یقیناً یہ اس کا خود پر بے پناہ اعتماد تھا کہ یوں غیر متوقع طور پر بلائے جانے پر وہ چونکتی نہیں تھی۔

کچھ کہے بنا سوالیہ نظریں لیے وہ منتظر ہوئی تو ہنکارا بھر کر لفظ ترتیب دیتا وہ شائستگی سے گویا ہوا۔۔۔

"آپ کا نام کیا ہے؟؟دراصل پہلے یہ پوچھنا مجھے یاد نہیں رہا۔۔۔"

اس کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔۔۔پھر ایک لمحے کے لیے اس کے ماتھے پر لکیر فکر ابھری تو بغور اسے

دیکھتے مصطفین کو لگا کہ اپنا نام بتانے میں وہ کسی "جھجک" کا شکار ہے۔

"میں عشناء کوثر سردار ہوں بھائی۔۔۔"

گویا ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ نرمی سے بولی تھی۔ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا وہ حیرت سے چلایا۔۔۔

"واؤ۔۔۔ ریئلی؟؟ مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ میں "عطارد جزیرے کے خواب" رکھنے والی عشناء کوثر سردار سے مل رہا ہوں۔۔۔ الٹس آسم بہنا۔۔۔ آپ باکمال لکھتی ہیں۔ واقعی کمال۔۔۔ بہت اچھا اور بہترین۔۔۔"

اس کے لہجے میں بے پناہ عقیدت در آئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ تعظیم بجالایا۔

"پسندیدگی کا شکریہ مصطفین۔۔۔ اچھا لگا کہ آپ نے میرا ناول پڑھ رکھا ہے۔ اور اب میں جاؤں پلیز۔۔۔"

اپنی تعریف سن کر وہ سادگی سے مسکرا کر بولی۔ اس کے اجازت طلب کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ وہ جلدی میں ہے اور وہ یقیناً اس کا قیمتی وقت لے رہا ہے۔

"جی جی بہنا۔۔۔ میں نے "تقسیم" پر لکھا گیا آپ کا شاہکار ناول "ایک سو سولہ چاند کی راتیں" اور "عطارد جزیرے کے خواب"۔۔۔ دونوں پڑھ رکھے ہیں۔ اور اب تو باقی سب بھی لازمی اور جلد پڑھوں گا۔۔۔ بہت شکریہ۔۔۔ آپ کو دیر ہو رہی ہے اپ جائیں۔ کوئی بات نہیں۔ بس یہ بتا دیں کہ دوبارہ کب آئیں گی یہاں؟"

مسرت سے بھرپور لہجے میں کہتا وہ اسے جانے بھی دے رہا تھا اور سوال بھی کر رہا تھا۔ اس وقت خود سے مرعوب ہوتا مصطفین اسے کسی قدر کنفیوژ بھی لگا تھا۔

"مجھے اسی ہفتے میں لندن جانا ہے۔۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو شاید کبھی آؤں یہاں۔ مقدر میں ہوا تو پھر ملیں گے۔۔۔ ان شاءاللہ۔۔۔ بہر حال آپ سے مل کر اچھا لگا۔۔ خدا حافظ۔۔۔"

ٹھہر کر انتہائی نرمی سے اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا اور ہاتھ کی انگلیاں لہرا کر چلی گئی۔

اس کی شخصیت کے سحر میں رہ کر چند پل کے لیے وہ ہل نہیں سکا۔۔۔

اس کے "لفظوں" کے گرد اپنے "حرفوں" کا حصار باندھتی وہ دور جا رہی تھی۔۔۔

"آپ کے بولنے سے لگتا ہے کہ آپ لکھ بھی سکتے ہیں۔۔۔"

اس جملے کی بازگشت اسے کتھارسس کی نئی راہ سجھاتی ہوئی لگی۔۔۔

وہ دھیرے دھیرے، بے مقصد اسی سمت میں چلنے لگا۔

بارہ دری گراؤنڈ سے نکل کر جونہی وہ تارکول سے بنی اس طویل سڑک پر آیا بارش یکدم تیز ہوگئی۔

"میں بارشوں سے چھلتے زخم نہیں۔۔۔ان کا مرہم لکھتی ہوں۔۔۔"

برستی ہوئی تیز بارش میں "بدھا" کے ایک درخت کی ڈھال میں چھپ کر اس نے دور کشادہ سڑک پر، نہایت اطمینان سے چلتی "عشنا کوثر سردار" کے وجود کا مدھم پڑتا ہیولا دیکھا۔۔۔

اس کی بکھرے احساسات و جذبات کو عمدگی سے سمیٹ کر وہ اس کے سینے میں دہر کر گئی تھی۔۔۔

"کیا واقعی مجھے لکھنا چاہیئے؟؟ کیا اداسیاں بھی کرامت کر سکتی ہیں؟؟؟"

اس کی باتیں سوچتا وہ مختلف سوالات کھوجنے لگا۔۔۔

اس کے چہرے پر اب بھی بے پناہ "عقیدتوں" کا عکس تھا۔۔۔

☆......☆......☆

اگلی صبح کنیز بیگم کچن شیلف کے سامنے کھڑی ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں کہ اپنی خوبصورت، متورم آنکھیں ملتی ہوئی ایمان داخل ہوئی۔ اس کا ریشمی دوپٹہ بے ترتیبی سے گلے میں جھول رہا تھا تو کالی، الجھی زلفیں شانوں اور کمر پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ابھی ابھی نیند سے جاگ کر سیدھی یہیں چلی آئی تھی۔

"السلام علیکم امی جان۔۔۔کب جاگیں آپ؟ ابو چلے گئے کیا دکان پر؟؟"

اس کے ابو کی شاہ عالم مارکیٹ میں کاسمیٹکس کی ہول سیل شاپ تھی۔

اس کی آواز پر انہوں نے مڑ کر دیکھا اور پیشانی پر بل ڈال کر اسے گھورا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ہاں وہ آج بغیر ناشتے کے ہی چلے گئے۔ کہہ رہے تھے بہت دیر ہوگئی ہے۔ تم جاگ گئی ہو خیر سے۔۔۔منہ ہاتھ تو دھو آنا تھا۔ اور میں تبھی جاگی جب تم اپنے بکتے ہوئے گھوڑوں کے آخری دام وصولنے میں مگن تھیں۔ کتنی آوازیں دیں تمہیں۔ پر مجال ہے کہ کوئی اثر ہو۔ کروٹ تک نہیں بدلی تم نے میری آواز پر۔ اب

اس عمر میں صبح صبح اٹھ کر سارا کام کاج نہیں ہوتا مجھ سے۔ ہڈیاں دکھتی ہیں ہر وقت میری۔لیکن تمہارا اس سب سے کیا لینا دینا۔۔۔تمہیں پرواہ ہی کب ہے۔؟؟"

زور زور سے ہل کر پیڑا گول کرتے انہوں نے درشتی سے کہا تو ان کی باتیں گویا ان سنی کر کے اس نے پورا منہ کھول کر زوردار جمائی لی۔ پھر بازو ہوا میں معلق کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کیں اور ایک طویل ترانگڑائی لی۔اس حالت میں اس کی لمبی کمر کی جاذبِ نظر ڈھال اور دلکش جسامت کے سارے خال و خد نکھر کر واضح ہوئے تھے۔کنیز بیگم نے رک کر حیرت سے اس کا اندازِ تغافل جانچا اور دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں انگوٹھے سے ملا کر لعنت بھیجنے کا اشارہ کرتی ہوئی پھر سے پیڑا بنانے لگیں۔

" ہک ہاہ۔۔۔اف امی ایک تو آپ ہر وقت۔۔۔ بلکہ وقت بے وقت اپنا دکھڑا رونے لگ جاتی ہیں۔کون کہتا ہے آپ کو صبح صبح اپنی بوڑھی ہڈیوں کو یہ زحمت دینے کی؟؟ میں تو ہر گز نہیں کہتی۔آپ کو خود ہی شوق چڑھا ہے مصطفین کی خدمتوں کا۔ایک کرائے دار کے لیے ناشتے کی فکر میں گھل کر اب بندہ اپنی مرضی سے سوئے جاگے بھی ناں۔۔۔حد ہی ہوگئی ویسے۔۔۔مجھ سے اس اچھائی کی توقع آپ رکھیں بھی مت۔"

سیدھی ہو کر منہ پر ہاتھ دھر کر جمائی روکتی وہ بے نیازی سے بولی اور بڑھ کر گلاس میں بھر کر پانی پینے لگی۔

" آئے ہائے ہوگئی شروع سویرے سویرے تو جلن پھونکنے۔۔۔اے میں پوچھتی ہوں کیا بیر ہے تجھے خواہ مخواہ اس سے؟؟ ناشتہ اس کے ساتھ ساتھ تمہارے باپ کا بھی بنتا ہے۔وہ تک تو بنا کر دینے کی توفیق نہیں تمہیں۔بس خیال نہ کرنا ماں کا۔ہر وقت اعتراض ہی کرنا اس پر۔۔۔اور "اس" اچھائی کی کیا تم سے تو کسی بھی اچھائی کی توقع نہیں رکھ سکتی میں۔وہ اور شکلیں ہوتی ہیں جو ماں باپ کو سکھ دیں۔"

گھڑی ہوئی روٹی زور سے توے پر پھینکتے انہوں نے گویا ایمان کو پٹخا تھا۔

ان کے جھلائے ہوئے لہجے پر وہ زیرلب مسکرائی اور بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر اپنی "شکل" جانچی۔

"بس کریں امی۔۔۔ یہ دلائل یہاں میرے سامنے ناکافی ہیں آپ کے۔دیکھ رہی ہوں اب بھی۔۔۔اور روز یہی دیکھتی ہوں۔۔۔ناشتے کے نام پر، یہ رات کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ ایک تازہ خشک روٹی ابو کے لیے۔کبھی کبھی تو یہ بھی آج کی طرح ان کے جانے کے بعد ہی پکتی ہے۔اور سینکے ہوئے بریڈ پیسز کے ساتھ

خوشبودار آملیٹ، شہد، دہی کا باؤل، دودھ کا گلاس یا گرما گرم چائے۔۔۔ یہ سب اس کرائے دار کے لیے۔ ابو بے چارے کا تو بس نام ہی ہے۔ اصل ناشتہ تو اسی نواب کو ملتا ہے تمام تر لوازمات کے ساتھ۔ بس اب میرا منہ نہ کھلوائیں صبح صبح۔۔۔ ورنہ ابھی آپ کی اس نام نہاد مظلومیت کے پرخچے اڑا دوں گی۔۔۔"

وہ باری باری توے پر پکتی روٹی اور سلیب پر دھرے بریڈ، انڈوں اور دہی کے لفافوں کی جانب اشارہ کر کے تیز لہجے میں بولی تو کنیز بیگم نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کچھ عقل کرا ایمانے۔ آہستہ بک۔ نامراد ذرا لگام نہیں تیری زبان کو۔ سن لیا تو کیا سوچے گا وہ......"

"بن ماں باپ کا بچہ۔۔۔؟؟؟ یہی کہنے والی تھیں نا آپ؟؟ سنتا ہے تو سنے۔ اور ہر طرح سے جو مرضی سوچے۔ میری بلا سے۔۔۔"

ان کی بات درمیان سے اچک کر وہ اسی انداز میں بولی تو ان کی پیشانی کے بلوں میں اضافہ ہو گیا۔

"رک ذرا۔۔۔ ابھی تیری طبیعت بحال کرتی ہوں صبح صبح۔ باقی دن آرام سے گزرے گا۔ تیرا بھی اور میرا بھی۔۔۔"

چولہا بند کر کے ہاتھ میں بیلن لیے وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھیں تو ان کے ردعمل پر ہڑبڑا کر ان سے بچنے کو بھاگتی دروازے تک پہنچی وہ اپنی جھونک میں اندر آتے مصطفین سے ٹکرا گئی۔

"افوہ۔۔۔ تم اندھی ہووو۔۔۔"

اس کی ٹکر سے جھلا کر وہ مزید بولتا کہ پھر بیلن لہراتے اس کے پیچھے لپکتی کنیز بیگم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سرعت سے اس کے آگے ڈھال ہو کر وہ اسے بچانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں درج ہوتا اپنا بکھرا حلیہ پڑھ کر وہ قدرے شرمسار ہوئی۔

"اے اے رکو خالہ۔۔۔ کیا ہوا ہے؟؟ یہ کیسا اودھم ہے صبح سویرے؟؟"

اس نے ایک ہاتھ سے ایمان کا بازو تھام کر اسے اپنی اوٹ میں کر رکھا تھا تو دوسرے ہاتھ سے ان کا بیلن والا بازو سختی سے پکڑ کر وہ ان دونوں کے مابین کھڑا تھا۔

ایمان ایک ہاتھ سے اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔ یکدم اسے سامنے پا کر کنیز بیگم رک گئی تھیں۔ نا صرف

رکیں بلکہ چپ بھی تھیں۔اب اسے کیا بتاتیں کہ وہ کیوں اسے مارنے کو لپکی ہیں؟ اس کے سوال اور ششدر تاثرات نے بتایا کہ وہ ان کی " گفتگو " سے انجان رہا ہے۔

" بتاؤ خالہ۔۔۔کیا ہوا؟ کیوں "لٹھ " لیے اس کے پیچھے پڑی ہو؟؟"

ایک تو اس کا سوالیہ انداز دوسرے ان کے ڈھکے چھپے تاثرات۔۔۔ایمان شرارت سے مسکرائی۔وہ ماں کی حالت کا حظ اٹھا رہی تھی۔جنہیں کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

" تمہارے دانت اب کیوں نہیں ڈھک رہے؟؟ کیا معرکہ مارا ہے؟؟"

انہیں خاموش پا کر اب سوالیہ نظریں اس پر گاڑے وہ طنزیہ بولا تو یکدم سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس نے اپنے بازو پر موجود اس کے ہاتھ پر گرفت کی۔

اس نے تحیر سے اس کا بدلتا مزاج دیکھا۔

" کچھ نہیں ہوا یہاں۔۔۔تم اپنے کام سے کام رکھو۔کرائے دار ہو تو بس وہی بن کر رہو۔گھر کے ذاتی اور اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔سمجھے؟؟"

ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتی،قدرے جتاتے ہوئے لہجے میں وہ تفاخر سے بولی اور پھر کھا جانے والی نظروں سے خود کو گھورتی ماں کو دیکھا۔

اس کی بات پر وہ ایک بار پھر جز بز ہوئیں لیکن مصطفین کی موجودگی کے باعث چپ رہی تھیں۔

یہ نہیں کہ اس کی موجودگی میں اس پر سختی کرتے انہیں کوئی تامل ہوتا تھا لیکن اس وقت بات کا موضوع و متن ایسا تھا کہ انہوں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔

" اوہ۔۔۔نخرہ دیکھو ذرا اپنا۔۔۔بڑی آئیں تم مکان مالکن۔۔۔رہتیں نہیں کہیں اپنے ذاتی معاملات لے کر۔۔۔ابھی فقط تین سیکنڈز کی دیر ہوتی مجھے تو یہی اندرونی معاملات تمہاری چیخوں کی صورت میں،پورے محلے میں سماعتِ زدِ عام ہونا تھے۔ہاں جی۔۔۔"

اس کے لہجہ و انداز سے وہ بری طرح چڑ کر بولا تو اسے گھورتے ہوئے اس نے مزید کچھ کہنے کو لب کھولے۔

" اور یہ زیادہ گھورنے کی ضرورت نہیں مجھے۔سمجھیں؟؟ ابھی خالہ کو چھوڑوں نا ان کے بیلن سمیت تو سارے

کس بل نکال دیئے انہوں نے تمہارے۔جاؤ کام کرواپنا۔اس سے پہلے میں درمیان سے ہٹ جاؤں۔"

اس کے کچھ کہنے سے پیشتر انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتا وہ درشتی سے بولا تو اس نے بے بسی سے پہلے اسے اور پھر بیلن تھامے کھڑی اپنی ماں کو دیکھا۔ان دونوں کو باہم الجھتے دیکھ کر انہوں نے اپنا بازو چھڑوایا اور ایمان کو نظرانداز کرتی ہوئی واپس سلیب کی جانب بڑھتی ہوئی بولیں۔

"چل چھوڑ مصطفین۔۔۔آجا شاباش تو اندر۔۔۔ناشتہ دوں تجھے۔کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔بس یونہی اس کی کسی فضول بحث پر غصہ آ گیا تھا مجھے۔اب تم دونوں آپس میں لڑنا ناں شروع کر دینا۔موقع چاہیئے بس تم دونوں کو بھی بحث ومباحثہ کا۔۔۔"

بات مکمل کر کے تیلی سلگا کر وہ چولہا جلانے لگیں تو باری باری ان ماں بیٹی کو دیکھتے اس نے اظہارِ نا سمجھی کے طور پر شانے اچکا کر سر جھٹکا۔

ماں کی اس طرف ہوئی پشت کو دیکھ کر ایمان نے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے متوقع "انتقام" کا اشارہ کیا اور اپنے بکھرے بال سمیٹتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔

اس کی اس حرکت پر وہیں کھڑا وہ دلکشی سے مسکرایا اور ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"میں ناں ہوں یہاں تو تم لوگ تو آپس میں لڑ لڑ کر ہی مر جاؤ خالہ۔۔۔میری موجودگی پر شکر ادا کیا کرو۔۔۔سچی۔باعثِ رحمت ہے۔۔۔میں نہیں ہوں گا تو یہاں ثالثی کون کرے گا؟؟"

ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا وہ شریر لہجے میں بولا تو اس کا طنز سمجھ کر توے پر گھی ڈالتی وہ زیرِ لب مسکرائیں۔

"آہو۔۔۔بڑا آیا تو باعثِ رحمت ہو کر۔۔۔لگائیں نا دو میں نے تمہارے کانوں تلے تو ساری خوش فہمی نکل جائے گی تیری۔۔۔"اسی لہجے میں وہ دوبدو بولیں تو اس نے قہقہہ لگایا۔

یقیناً ان دونوں کے مابین کسی نئی بحث کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔۔۔

یہ "منظر" نہ سہی لیکن باہم یہ "رویہ" اس گھر کے افراد کا "معمول" تھا۔۔۔

☆......☆......☆

موسم کی خوشگواریت کے پیشِ نظر وہ آج مقررہ وقت سے بہت پہلے گھر سے نکل آیا تھا لہٰذا میٹرو بس کے "کینال اسٹیشن" پر اتر کر، کلائی سے بندھی گھڑی پر نگاہ ڈال کر اس نے دامن وقت میں موجود گنجائش کو جانا اور نہری کنارے کے ساتھ ساتھ بنے طویل فٹ پاتھ پر سیر کرتے ہوئے نہر کے اگلے پل "فیروز پور روڈ نمبر 2 المعروف لال پلی" تک جانے کا ارادہ کیا۔ایک سے دوسرے پل تک کا یہ تھوڑا سا فاصلہ اس سے پہلے وہ آٹو سے طے کرتا تھا۔وہاں سے یونیورسٹی روٹ کے لیے لوکل بس ملتی تھی۔ بیگ کندھے پر لٹکائے، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر اردگرد سے بے خبر، متوازن چال چلتا وہ صبح تر سا حسین لگ رہا تھا۔

چمکدار کشادہ پیشانی پر پڑا ایک مستقل بل، گہری آنکھوں کے نرم گوشوں سے جھلکتی حلاوت، گلاب گھلی سفید رنگت پر کالی سیاہ داڑھی کی ہلکی تراش، متناسب ستواں ناک کے عین نیچے سرخ لبوں کا دلآویز درمیانی خم اور ان کے نغمگیں بیرونی کناروں کی تیز تر دھار۔۔۔ بلاشبہ اس کے چہرے کے سارے خال وخد چاشنی سے بھرپور ایک دلپذیر منظر پیش کرتے تھے۔عمدہ تراشیدہ ملبوس سے جھلکتی، ورزشی جسم کی دلکش ڈھال اس کے وجود کا ہر انگ نمایاں کرتے ہوئے اس کی جاذبیت میں اضافہ کا باعث تھی تو چہرے پر جھلکتا بے نیازی کا تاثر ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے مغرور ظاہر کر رہا تھا۔

ساری رات برستی شدید بارش کے بعد صبح کی سرد ہوائیں جھوم جھوم کر پورے شہر میں سرسرا رہی تھیں۔

آسمان کے گرد ساکت کھڑے کالے بادلوں کا گھیر تھا تو خلاؤں میں ہجرتی پرندوں کی طویل قطاریں محو پرواز تھیں۔رات بھر ہواؤں کے زور سے ٹوٹ کر بکھرتے اپنے گھونسلوں کا غم رو رو کر وہ اب کسی نئے آشیاں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

اپنے سامنے موجود "اوور ہیڈ برج" کے نچلے اطرافی تختے پر ٹریفک پولیس کی جانب سے واضح حروف میں درج ایک پیغام کو پڑھ کر اس نے ٹریفک کے تیز ترین بہاؤ کو دیکھا۔

"کبھی نہ پہنچنے کی نسبت دیر سے پہنچنا بہتر ہے۔۔۔"

جملہ دہرا کر وہ بلاوجہ مسکرایا۔

"سب بکواس۔۔۔کون پڑھتا ہے یہ سب؟"

فٹ پاتھ پر لڑھکتے کسی مشروب کے سٹیل کین کو اس نے ٹھوکر مار کر نہر میں اچھال دیا۔

تاثرات سے عاری اس کے سپاٹ چہرے سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

نہر کی اطراف میں ترتیب وار لگے بلند قامت درختوں کے مسلسل ہلتے پتے "مدھر" آوازیں پیدا کرتے ہوئے ہوا کے زور سے ٹوٹ کر آس پاس بکھر رہے تھے۔

نہر کے گدلے پانی پر تیرتے اسٹیل کین کو اس نے دور تلک دیکھا۔

وہ "لال پلی" انڈر پاس کی ریٹیننگ وال کے نزدیک تھا کہ اچانک ہلکی بارش برسنے لگی۔

"اوہ شٹ۔۔۔بیگ گیلا ہو جائے گا۔۔۔"

چہرہ اٹھا کر آسمان پر موجود بادلوں کو گھورتے اس نے خود کلامی کی اور تیزی سے بھاگ کر کینال برج پر آیا۔

ایک حصہ کراس کر کے وہ پل پر تعمیر شدہ دونوں سڑکوں کے درمیانی فٹ پاتھ پر آ رکا اور ارد گرد کسی شیڈ کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔

پل کے پار نہر کنارے لگے ایک گھنے درخت کے نیچے دو تین ٹریفک پولیس وارڈنز بارش سے بچاؤ کے لئے سمٹے کھڑے تھے اور برلب نہر ذیلی سڑک پر واقع "پریسٹن یونیورسٹی" کے داخلی گیٹ سے چند قدم آگے تعمیر کردہ بس اسٹاپ بالکل خالی تھا۔

"بے وقوف کہیں کے۔۔۔ یہاں درخت سے لگ کر کھڑے رہنا آسان تھا یا تھوڑی زحمت کر کے بس اسٹاپ کی چھت تلے رکنا؟؟"

دل ہی دل میں ٹریفک وارڈنز کو مخاطب کرتا وہ پھر سے بھاگا اور درمیانی دو سڑکیں، اور ایک فٹ پاتھ عبور کرتا ہوا بس اسٹاپ پر جا رکا۔

بارش شدید ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اسٹاپ کی مضبوط چھت اس بارش کے سامنے خوب مزاحم ہے۔

ایک نشست پر اپنا یونیورسٹی بیگ رکھ کر وہ بالوں اور کندھوں پر گرے بارش کے قطرات جھاڑنے لگا۔

پھر دور دور تک کسی بھی ذی نفس کی غیر موجودگی محسوس کرتا وہ ایک نشست پر بیٹھ گیا۔

یقیناً موسم کے تیور جانچ کر افراد نے گھروں میں ٹکنا مناسب سمجھا تھا۔

تارکول کی شفاف سڑک پر بہتا بارشوں کا پانی دیکھ کر اسے لگا کہ آج یونیورسٹی بھی ویران ہو گی اور بہت کم سٹوڈنٹس آئیں گے۔روٹ بس کا انتظار طویل ہوا تو وہ اٹھا اور بس اسٹاپ کے فرش پر یہاں سے وہاں ٹہلتا ہوا بار بار گھڑی دیکھنے لگا۔

" آ بھی جائے اب بس۔۔۔لیٹ ہو جاؤں گا اسطرح تو میں۔واپسی پر بابا سے کہتا ہوں کہ آج ہی بائیک لے کر دیں۔اس ذلت سے تو جان چھوٹے میری۔"

ایک ہاتھ کمر کی ایک جانب ٹکائے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر وہ دور سڑک پر گھورتے ہوئے بولا۔

تبھی پہلے ہارن کی آواز سنائی دی اور پھر تیز برستی ہوئی بوندوں کے درمیان بس کا اگلا حصہ دکھائی دیا۔فرنٹ گلاس پر دونوں وائپرز تیزی سے چل رہے تھے۔اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بس نزدیک آ چکی تھی۔

اس نے سرعت سے بیگ اٹھایا اور پل کے چوراہے پر لگا برقی اشارہ عبور کرتے ڈرائیور کو ہاتھ ہلا ہلا کر بس روکنے کے لیے کہا۔

اس کا اشارہ پا کر ڈرائیور نے بس روکی تو اسی وقت پل پر رکتے ایک آٹو رکشہ سے نکلتی لڑکی کو دیکھتا وہ تیزی سے بس میں سوار ہو گیا۔پھر دروازے پر لگا ہینگر تھامے پائیدان پر رک کر اس نے باہر جھانکا۔اسے لگا کہ وہ لڑکی یقیناً اسی بس میں سوار ہونا چاہتی ہے۔آٹو ڈرائیور کو کرایہ تھما کر، اپنا بیگ سنبھالتی وہ بھاگ کر بس کی طرف ہی آنے لگی تو بے ساختہ اندر منہ کر کے اس نے پکار دی۔

"بس روکنا یار ایک منٹ۔کوئی بھاگ کر آ رہا ہے۔"

اس کی بات پر ڈرائیور نے اطرافی شیشے سے جھانکا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

سفیر نے مڑ کر باہر دیکھا تو چونک گیا۔

ہاتھ کا چھجا بنا کر ماتھے پر رکھے چہرے کو بارش سے بچاتی بالکل قریب آ چکی وہ لڑکی کوئی اور نہیں ثومیہ شاہجہان تھی۔

وہ دونوں گزشتہ روز مصطفین کو لے کر ہوئے مباحثے کی بدولت باہم ناراض تھے اور اس کے بعد تینوں

لیکچرز بھی انہوں نے الگ الگ بیٹھ کر گزارے تھے۔

ابھی ایک دم اسے سامنے پا کر وہ اگر حیران ہوا تھا تو غیر متوقع طور پر اسے بس کے دروازے میں ایستادہ دیکھ کر ایک پل کے لیے وہ بھی تھم گئی تھی۔

برستی بارش میں دونوں آمنے سامنے کھڑے کچھ کہے بنا ایک دوسرے کو بس "دیکھ" رہے تھے۔

دونوں کا غصہ ہوا ہو چکا تھا لیکن ناراضی اب بھی باقی تھی۔

ایک ساتھ کپکپا کر خاموش ہوئے دونوں کے لبوں نے خبر دی کہ وہ ایک دوسرے سے بات تو کرنا چاہتے تھے لیکن بات میں "پہل" نہیں۔۔۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوستوں میں در آئی فرضی انا "دوستی" کو بے نام "جھجک" سے دوچار کر دیتی ہے۔وہ بھی ایسی ہی کسی حالت میں مبتلا تھے۔

بس کے مسافران اور کنڈیکٹر نے ایک حسین "لڑکے" اور ایک خوبصورت "دوشیزہ" کو بغور ایک دوسرے کو "تاکتے" دیکھا اور معنی خیزی سے مسکرائے۔کئی ایک نے باہم کہنیاں مار کر دوسروں کو اس جانب متوجہ کیا۔

یہ ہمارے معاشرے میں پنپتی عام ذہنیت ہے کہ لوگ حقائق کا ادراک نہ رکھ کر اپنے ذاتی خیالات پر یقین کر لیتے ہیں اور پھر مثبت ہوں یا منفی۔۔۔وہ بہر طور اپنے نقطہ نظر سے ہٹتے نہیں۔۔۔اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ "حقیقت" کا باطن اپنے ظاہر جیسا نہیں ہوتا۔۔۔

"ظاہر "لازمی طور پر "حقیقت" کا "مشروط "پردہ ہے۔۔۔

دبی دبی ہنسیوں کی آواز ثومیہ تک پہنچی تو چونک کر، ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے بلآخر اس نے اسے مخاطب کیا۔

"پیچھے ہٹو سفیر۔تم کیوں سامنے تن کر کھڑے ہو؟؟ دیکھ نہیں رہے کہ میں بھیگ رہی ہوں؟؟"

اس کا لہجہ سخت تھا۔

"اوہ۔۔۔سوری۔۔۔مسٹ کم۔۔۔"

خجل ہو کر ایک طرف ہوتا وہ راستہ فراہم کرنے لگا تو اس کی گردن سے اچک کر ثومیہ کو اندر آنے کا کہنے کو

جھکا کنڈیکٹر ہڑبڑا گیا۔

"یار تم تو پیچھے ہو۔میرے اوپر کیوں چڑھے ہوئے ہو؟؟۔۔۔"

اپنے سر پر لگی کنڈیکٹر کی تھوڑی محسوس کر کے وہ جھلا کر بولا اور پھر ہاتھ چلا کر بگڑ چکے بال سنوارنے لگا۔

"باؤجی میں تو یہی کہنے لگا تھا کہ آپ دونوں اپنی "علیک سلیک" بعد میں کر لینا پہلے بس کو چلنے دو۔۔۔"

اندر داخل ہو کر سکارف سے کپڑے جھاڑتی ثومیہ کو دیکھتا کنڈیکٹر، بتیسی نکال کر طنزاً بولا اور فوراً مڑ کر پچھلے حصے کی جانب بڑھ گیا جبکہ اس کے برجستہ لہجے پر بس میں ایک قہقہہ پڑا تھا۔

یقیناً اس کے سفیر کا نام لینے سے وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں واقف کار ہیں۔

ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ثومیہ نے پہلے کنڈیکٹر کی پشت کو اور پھر اس کی بات پر زیر لب مسکراتے سفیر کو گھورا۔ نظر چرا کر وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

"تم سے تو نمٹ لوں گی میں۔پہنچو ذرا یونیورسٹی۔ایڈیٹ۔خوش شکل گدھا۔سارے لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"پونڈروں" میں شمار پانے پر خوش ہونے والے۔"

دانت پیس کر من ہی من میں اسے مخاطب کر کے اس نے سوچا اور لب بھینچ کر نشست کی تلاش میں نظر دوڑانے لگی۔وہ بغور اس کے سرد مہر تاثرات جانچ رہا تھا۔

ساری نشستوں پر مسافر موجود تھے لیکن کھڑے ہونے کو کھلی جگہ دستیاب تھی کیونکہ آج اتنا رش نہیں تھا کہ بس کھچا کھچ بھری ہو۔

ثومیہ کا تو لوکل روٹ پر یہ پہلا دن تھا لیکن وہ بخوبی جانتا تھا کہ کینال روڈ پر بس میں کھڑے ہونے کو جگہ ملنا بھی کار دار ہوتا ہے۔

نشست کی تلاش میں ناکام ہو کر اس نے ایک نظر ساتھ کھڑے سفیر پر ڈالی اور اسے نظر انداز کر کے کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکنے لگی۔

اس کا انداز دیکھ کر اس سے توجہ ہٹا کر وہ بھی شیشوں سے پار نہر کے پانی کی بالائی سطح پر دائروی حرکت پیدا کرتے تیز بارش کے موٹے قطرات دیکھنے لگا۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ آج اپنی وین سے کیوں نہیں آئی اور وہ متجسس تھی کہ کیا وہ ہر روز اسی روٹ سے آتا جاتا ہے؟

دل ہی دل میں وہ سفیر کی رہائشی "امامیہ کالونی" سے "فیروز پور روڈ نمبر "2 اور پھر اپنی یونیورسٹی تک کا روٹ مرتب کر رہی تھی۔

بظاہر ایک دوسرے سے بے نیاز ان دونوں کا سارا دھیان ایک دوسرے پر ہی تھا۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گرم جوش تعلقات سرد رویوں سے نمو پاتے ہیں۔۔۔

☆......☆......☆

گیتی کی زندگی ہمیشہ سے بس چند افراد تک محدود رہی تھی۔ اس کا بچپن ممبئی شہر میں ایک معروف شاہراہ پر واقع بڑے سے بنگلے میں گزرا تھا۔ اس کا باپ وجے کمار ایک بڑی سیاسی پارٹی کا فعال ترین رکن اور پارٹی کے داخلی و خارجی معاملات و امور سے متعلقہ اہم ترنشست کا عہدیدار تھا۔ اسی عہدے کا فائدہ اٹھا کر وہ ایک با اثر کاروباری شخصیت بھی بن چکا تھا۔ سیاست سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ نیک طینت اور نیک نام فرد تھا۔

بھارت کی اکثریتی آبادی ہندو اور دیگر مذہبی اقلیتیں بھی، دونوں اس کے مثبت چال چلن اور اچھے رویے کی بدولت اس کی عزت کرتے تھے۔ گیتی کی ماں شیتل فلم انڈسٹری کی ایک نامور فیشن ڈیزائنر تھی۔ پچھلی ایک دہائی کی تمام ہائی بجٹ، اے کلاس فلمز کی ڈریس ڈیزائننگ اس کے کریڈٹ پر تھی اور وہ ایک معیاری، مہنگا ترین "برانڈ نیم" بھی تھی۔ ان دونوں کو اپنی مصروف زندگیوں سے کبھی اتنی فرصت میسر نہیں آئی تھی کہ بہت پیار ہونے باوجود، اپنی خوبصورت، اکلوتی بیٹی " گائیتری دیوی " کو وقت اور توجہ دے سکیں۔ وجے کمار کا بیشتر وقت مختلف سیاسی و کاروباری دوروں کے سلسلے میں بیرون ممالک میں گزرتا تھا اور لگ بھگ ایسا ہی عالم اس کی ماں کی مصروفیات کا بھی تھا۔

والدین کی عدم موجودگی میں گیتی کا زیادہ تر وقت اپنی بوڑھی دادی "جمنا" کے ساتھ گزرتا تھا۔ یہ اس کا واحد خونی رشتہ تھا جس کے ساتھ وہ بہت سا وقت گزارتی تھی۔

گو کہ گیتی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس کی پیدائش کے فوراً بعد خاندانی ملازمہ بیلا کے سپرد کر دی گئی جو کہ

اپنے شوہر اور بیٹی نازنین کے ساتھ ان کے بنگلے کی انیکسی میں رہائش پذیر تھی لیکن گیتی کی نرم خو شخصیت پر دادی کی پرورش کا گہرا اثر اور عمیق تر چھاپ تھی۔ بیلا کا شوہر رام دیوان کا مستقل گھریلو ڈرائیور تھا۔ان کی بیٹی نازنین گیتی کی ہم عمر تھی اور بچپن سے ایک ساتھ پلنے بڑھنے کی بدولت دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ایک دوسرے کے بغیر ان کا ایک لمحہ بھی نہیں گزرتا تھا۔اس کی فرمائش وضد پر، ماں شیتل نے نازنین کا ایڈمیشن بھی اس کے ساتھ سکول اور پھر کالج میں بھی کروایا تھا۔یوں دورانِ تعلیم بھی اسے نئے دوست بنانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ناں ہی نازنین کی موجودگی میں اسے کسی دوست یا ہمراز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

گیتی کا سارا دن بھلے ہی ان ملازمین کے ساتھ گزرتا تھا لیکن رات وہ اپنی دادی کے ساتھ ان کے کمرے میں گزارتی تھی۔ہوش سنبھالنے کے بعد جب وہ تھوڑی بڑی ہوئی تو ان کے ساتھ ایک ہی بستر میں سونا شروع کر دیا۔ہر روز، رات دیر تلک وہ اسے مختلف فرضی کہانیاں سناتی تھیں اور جنوں، پریوں کی یہ کہانیاں سنتے کب وہ ان فرضی کرداروں میں اپنے آپ کو تصور کرنے لگی یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔۔۔

فرضی داستانیں سنتے ہوئے وہ من ہی من میں کئی کردار ادا کر چکی تھی۔

جوں جوں اس کی عمر بڑھی دادی کے قصے بھی "سمجھدار" ہوتے گئے اور اس کے اندر نہاں "اداکارہ" بھی نکھرتی چلی گئی۔ہاں دادی اس میں پنپتی اس "صلاحیت" سے بے خبر رہیں۔وہ کہانی کے مناظر اور جزئیات سے متعلق کی گئی اس کی ہر کھوج وسوال کو اس کی دلچسپی پر محمول کرتی تھیں۔

وہ گیارہ بارہ سال کی تھی کہ دادی نے اسے برصغیر پاک وہند کی داستان سنانا شروع کر دی۔وہ ہر روز اسے "تقسیم" سے پہلے، افراد کے مابین موجود محبت واخلاص وامن کے متروک ہوئے واقعات سنانے لگیں۔

دادی کا یہ پسندیدہ موضوع تھا تو وہ بھی بلا ناغہ نہایت دلچسپی سے یہ سب واقعات سنتی تھی۔کبھی اسے مختلف مذاہب کے حاملین کا یکجاء رہنے کا سن کر بہت اچھا لگتا تھا تو کہیں ماضی میں دو قوموں کا اپنے نظریات وعقائد کا احترام کرتے ہوئے ساتھ چلنا بھی بڑا پسند آیا۔۔۔

دادی اکثر اسے ایک واقعہ سناتی تھیں کہ تقسیم سے پہلے وہ پاکستان کے حصے میں آئے علاقہ، ضلع گوجرانوالہ کے مضافات میں واقع ایک تاریخی شہر "رسول نگر" کی رہائشی تھیں جہاں ہندو اور سکھ برادریاں بڑی بڑی

حویلیوں میں آباد تھیں۔ علیحدگی کا اعلان ہوا اور دونوں جانب ایک دم فسادات برپا ہونے لگے۔
جب ہندو مسلم اور سکھ ایک دوسرے کو مارنے، کاٹنے لگے تو کس طرح دادی اور ان کی ایک سہیلی ان فسادات میں پھنس کر اپنے خاندان سے الگ ہوگئی تھیں۔؟؟ اور کیسے پھر ایک مسلمان لڑکے نے مشکلات جھیلتے ہوئے انہیں بحفاظت لاہور لے جا کر ان کے خاندان سے ملوایا۔۔۔؟؟ یہ ایک لمبی کہانی تھی۔
ہر بار وہ محویت سے دادی کی آنکھوں سے جاری آنسوؤں کے درمیان یہ قصہ سنتی رہتی۔ دادی نے ہمیشہ اسے اخلاص و محبت کا درس دیا تھا۔ انہوں نے اسے یہی سکھایا تھا کہ پاکستانی قابل نفرت نہیں بلکہ لائق محبت ہیں۔
ساٹھ سال پہلے دادی اور ان کی سہیلی کو فقط انسانیت کے ناطے "دنگوں" سے بچانے والا وہ جوشیلا "پاکستانی" ہی گیتی کے بچپن کا پہلا پیار تھا۔
آنسوؤں میں گندھی، جذبات و احساسات سے بھرپور یہ داستانیں سن کر جانے کب اس کا دل ہندوستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کی محبت میں بھی دھڑکنے لگا۔۔۔وہ نہیں جانتی تھی۔
اس کا شعور اگر ہندوستان کے عشق میں مبتلا تھا تو اس کا لاشعور پاکستان کی چاہ سے لبریز ہوا تھا۔
وہ آئے روز نیوز چینلز پر سرحد پار سے ہوئی "دہشت گردی" کی خبریں سنتی اور گھبرا کر دادی کے پیار بھرے قصوں میں پناہ لیتی۔ یہاں اسے سکون محسوس ہوتا تھا۔ اس کا اندرون ایسے ہی "امن و آشتی" کا طالب تھا جیسا دادی کے قصوں میں بیان ہوتا تھا۔ میڈیا کے سہارے پاکستان پر الزام دھرتے اپنے ہی لوگوں کی زبان پر وہ بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ سرزمینِ پاکستان کے باسی دادی کے بیان کردہ "خاکوں" سے الگ یا ہٹ کر ہو سکتے ہیں۔
اس کا ذہن و دل اس کی روح تک میں آن بسی "پاکستانیت" کے آگے بے بس تھا۔
اس کے سکول میں کوئی بھی پاکستان کی برائی کرتا تو اسے شدید غصہ آ جاتا لیکن نازنین حق دوستی استعمال کرتے ہوئے اسے ایسے کسی بھی غصے کے اظہار سے روک لیتی تھی۔
"دادی یہ لوگ پاکستان سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟؟ اس کا کارن کیا ہے؟؟"

سکول سے واپسی پر وہ کبھی یہ سوال پوچھتی تو دادی کی "بوڑھی" آنکھوں میں "جوان" کرب جھلکنے لگتا۔

" کیونکہ انہوں نے پاکستانیوں کی محبت نہیں چکھی۔۔۔ یہ اس ذائقے سے نا آشنا ہیں۔"

ان کے مدھم لہجے میں کئی کانچ ٹوٹتے تھے اور وہ حیرت در حیرت پھر باقی کا سارا دن انہیں مسلسل روتا دیکھتی رہتی تھی۔

دادی کو اپنا گزشتہ شہر، اپنے لوگ اور وہاں گزرا وقت بہت شدت سے یاد آتا تھا۔۔۔ اور وہ ہر بار ان کی تمام تر "شدتوں" کی چشم دید "گواہ" رہی تھی۔۔۔

ان کے سارے "جذبات و محسوسات" کو اس نے ہمیشہ پوری "تاب" سے اپنے دل پر "جھیلا" تھا۔

پاکستان میں پل بڑھ کر، پاکستان سے بچھڑ جانے والی "جمنا" کا دکھ۔۔۔ ہندوستان میں پل بڑھ رہی، ہندوستان کی "گیتی" پر عیاں ہوتا رہا تھا۔۔۔

یوں ہی۔۔۔

رہ رہ کر......

ذرا ذرا کر کے۔۔۔

وہ "بے وجہ" "پاکستان کی" "بے تحاشا" محبت میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔۔۔

اس کے لاشعور میں یہ محبت بچپن سے ہی کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔

☆......☆......☆

اپنی تمام تر مردانہ وجاہت اور کامل حسن کی پوری چھب کے ساتھ، یونانی دیوتاؤں سی مضبوط جسامت کا حامل وہ دلنشین لڑکا، آج پھر چہرے پر "وہی" سوگوار تاثرات اور مغموم آنکھوں کی ساکت پتلیوں میں "ویسا" ہی کرب لیے "شاہی قلعہ" میں واقع "ہاتھی پیر" کے چوڑے زینوں پر گویا "بکھرا" پڑا تھا۔

پچھلے پندرہ منٹ سے اپنے قیمتی ملبوس کی پرواہ کیے بغیر، دونوں بازو اطراف میں پھیلائے، عہدِ مغلیہ کی اس شکستہ یادگار "ہاتھی پیر" کے عین وسط میں وہ بالکل جامد لیٹا ہوا تھا۔

مغلیہ دورِ حکومت میں ایک اونچے چبوترے کو، دو اطرافی مضبوط اور بلند دیواروں کی ڈھارس پر، چوڑی اور

کھلی سیڑھیاں بنا کر زمین سے ملایا گیا تھا۔ مغلیہ طرزِ تعمیر کی حامل ان سیڑھیوں کی، چھوٹی ٹائیلوں سے ہوئی خوبصورت، باترتیب چنائی اس دور کے معماروں کی کمال تر مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس کی تاریخِ تعمیر سے متعلق یہ بات سننے میں آتی ہے کہ ان سیڑھیوں پر شہزادوں کے بدمست ہاتھیوں کو سدھائے جانے کے لیے "سزا" کے طور پر تیز رفتاری سے بھگایا جاتا تھا اور اسی بدولت اس شاہکار تعمیر کو "ہاتھی پیر" کا نام دیا گیا تھا۔ جگہ کی قلت کے باعث دو اطرافی دیوار سمیت ان زینوں کو عین وسط میں ایک دیدہ زیب موڑ دیا گیا تھا جس کی منفرد بناوٹ نے اس "تعمیر" کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

اردگرد سے مکمل بے نیاز، اپنی ہی کسی "دھن" میں رہ کر، اسی موڑ پر وہ ساکت لیٹا تھا۔

ایک زینے کے کنارے پر سر ٹکا کر حسین آنکھوں کے نرم دھاروں میں عمیق خیالوں کا عکس لیے وہ خلاؤں میں نادیدہ "تشبیہات" کھوج رہا تھا۔

"لوگوں کے لہجے ان کے بدلنے کا پتہ دیتے ہیں۔ ہاں یہ لفظ ہی ہوتے ہیں کہ جو کسی کی ذات میں در آیا ہر "تبدل" عیاں کر دیں۔۔۔ تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟؟"

عہدِ ماضی کا ایک نمناک لمحہ یہیں اس کے آس پاس ایک "سوال" جھاڑ گیا۔ حروف کھل کر صحنِ دل میں محو رقص ہوئے تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ بیٹھ گیا۔

تشبیہات کی شکل بننے لگی تھی۔

"تمہیں ابھی لوگوں کی پہچان کہاں ہے یار؟؟ لوگوں نے بدلنا ہو تو لفظ یا لہجہ نہیں۔۔۔ سب سے پہلے وہ "صورتیں" بدلتے ہیں۔۔۔ اجنبیت کا غلاف پہن کر۔۔۔ غیریت کا لحاف اوڑھ کر۔۔۔ لہٰذا تم کسی کے لفظ یا لہجہ مت پرکھو۔۔۔ تم سب کی صورتیں پڑھنا سیکھ جاؤ۔ تمہیں لوگوں کی پہچان ہو جائے گی۔۔۔ یہ لہجوں اور لفظوں کا ہنر تو اپنوں کے لیے ہوتا ہے۔ جن سے بدل کر انہیں "غیر" کرنا ہو ان سے بس "رخ" بدلتے ہیں۔"

اس کے تہہ دار ہونٹوں کے دلکش خم کی لرزش سے جیسے کوئی جوان سسکی حدِ ضبط پھلانگ کر ہوا میں تحلیل ہوئی تھی۔

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گھنے بالوں میں پھنسا کر اس نے باقاعدہ انہیں نوچ لیا۔

کئی "صورتیں" وہ جیسے اب پڑھ رہا تھا۔۔۔

وقت گزر جانے کے بعد۔۔۔

بہت آگے بڑھ جانے کے بعد۔۔۔

اور شاید بہت پیچھے رہ جانے کے بعد بھی۔۔۔

اس کے دلکش سراپے اور پرکشش وجود سے جھلکتی ایک غیر محسوس "شفافیت" ہر کسی کو اس کی جانب متوجہ کر رہی تھی۔لوگ بصد شوق اسے "تاڑ" رہے تھے۔

وہ بذاتِ خود کسی طور بھی ایک حسین منظر سے کم نہیں تھا۔

"آہ......تیرے الفاظ و بیان کے اسی پختہ "بھید بھاؤ" نے میرا بڑا نقصان کیا ہے یار۔۔۔خدارا اب تو لوٹ آ۔۔۔"

وہ اٹھا اور ان حد درجہ چوڑے زینوں پر ہاتھیوں کی مانند بھاگنے لگا۔۔۔

بے قرار ہو کر۔۔۔

بے مہار ہو کر۔۔۔

اسے بھی کوئی خودساختہ "سزا" درکار تھی۔

اسے یوں بھاگتے دیکھ کر سیڑھیوں کے ابتدائی حصے پر، نیچے اور اوپر کھڑے لوگ یکبارگی تھم گئے تھے۔اس کی بے خود حالت سے جھلکتا اضطراب سب کو رکنے پر مجبور کر گیا تھا۔

خود اذیتی کی اس کیفیت میں مبتلا رہ کر، وہ تب تک زینوں کے اوپر سے ان کے وسطی موڑ تک بھاگتا رہا جب تک کہ اس کا سانس اتھل پتھل نہیں ہوا۔۔۔

اطرافی دیوار پر دونوں ہاتھوں کی ڈھال لے کر وہ رکا اور ماتھا ساتھ لگا کر پورا وجود اسی دیوار سے ٹیک دیا۔

ہولے ہولے لرزاں اس کے چوڑے شانوں نے "ماحول" کو خبردار کیا کہ وہ رو رہا ہے۔۔۔

جانے اس کی شخصیت میں کیسا سحر تھا کہ جامد کھڑے ان لوگوں میں، اسے مخاطب کرنے کی کوشش کسی نے بھی نہیں کی تھی۔

یہی وہ پل تھا جب لڑکے لڑکیوں کا "وہی" گروپ شاہی قلعہ کی بڑی کینٹین کے احاطے کی عقبی سیڑھیاں چڑھ کر وہاں داخل ہوا۔ باہم ہنستے ہنساتے سب جونہی "ہاتھی پیر" کی ابتدائی چوڑی دیوار تک آئے، وہاں کھڑے افراد کا غیر معمولی "سکتہ" محسوس کر کے وہ بے ساختہ خاموش ہوئے تھے۔

سب کے لبوں کی مسکان بتدریج سمٹی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر اظہارِ لاعلمی کے طور پر شانے اچکاتے ہوئے انہوں نے وہاں پہلے سے موجود ہر فرد کی نگاہ کا تعاقب کیا اور۔۔۔ پھر ایک ساتھ ان کی نظریں قلعے کی دیواروں سے "لپٹ" کر روتے اسی "دیوتا" پر جا ٹھہریں۔۔۔

اس مخلوط گروپ کی اسی "باہمت" لڑکی کے چہرے پر سے کئی رنگ ایک ساتھ ہو کر گزرے تھے۔ اس کی متجسس نظریں پورا ماحول "ناپ تول" رہی تھیں۔

"ارے یہ تو وہی لڑکا ہے جو اس روز بادشاہی مسجد کی راہداریوں میں تھا۔۔۔ ہم نے دیکھا تھا نا اسے؟؟ یہ وہی ہے نا؟؟"

اسے دیکھتے ہی ایک لڑکی حیرت سے چلائی تو سب غور کر کے اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"ہاں یہ وہی ہے۔۔۔ تم سب یہیں رکو۔ میں اس سے بات کر کے آتی ہوں۔" سب کو ہٹا کر وہی لڑکی تیزی سے آگے ہوئی اور ہاتھوں میں موجود کتابیں ایک ساتھی لڑکی کو تھماتے ہوئے کہا۔

پہلی سیڑھی پر قدم دھر کر لڑکے کے وجود کی ہر جنبش کو جانچتی، وہ کسی "فیصلہ کن" کیفیت میں مبتلا ہوگئی۔

پھر دو سیڑھیاں مزید اتر کر یکا یک وہ مڑی اور انگلی اٹھا کر خود کو جاتا دیکھتے اپنے ساتھیوں کو تنبیہی لہجے میں کہا۔ "پیچھے مت آنا۔۔۔ سب یہیں رکنا۔۔۔ اسے برا لگ سکتا ہے۔"

سادہ لہجے میں کہتی وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ اس کی بات میں ایک نمایاں "جھجک" کا تاثر تھا۔

"ہاں یار تم جاؤ۔۔۔ کوئی نہیں آئے گا۔۔۔ کسی نے جانا ہوتا تو یہاں اور بہت تھے تم سے پہلے بھی۔۔۔ تم ہی ناں جاتیں بس۔"

ایک لڑکی نے ہاتھ جھلا کر، ارد گرد موجود افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تو دھیمی مسکراہٹ دے کر وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتی اس کی جانب بڑھنے لگی۔۔۔

ایک حسین "انجان" لڑکی کو خوبصورت "جوان" لڑکے کی جانب بڑھتا دیکھ کر وہاں موجود ہر فرد کی دلچسپی اس منظر میں دوچند ہوئی تھی۔

لڑکے کے قریب رک کر اس نے سنا کہ وہ باقاعدہ "سسک" رہا ہے۔۔۔

جانے کیا دکھ تھا اسے کہ ہر بار امڈ آتا تھا۔۔۔؟؟

مغل بادشاہوں کی "باقیات" سے لگ کر وہ "شہزادوں" جیسا لڑکا جانے کیسے درد روتا تھا۔۔۔؟؟

اس کی ہچکیوں سے خوف کھا کر وہ پلٹی اور دو سیڑھیاں واپس چڑھ کر پھر رک گئی۔

سوالیہ اور متجسس نظریں لیے اس کا پورا گروپ اسی کو گھور رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ باقی سیاح اب چہ میگوئیاں کرتے ہوئے منظر سے چھٹنے لگے ہیں۔

"روتی صورتوں اور بسورتے چہروں پر لوگ زیادہ دیر کہاں رکتے ہیں بھلا؟؟"

لوگوں کو مڑتے دیکھ کر وہ یاسیت سے بڑبڑائی اور دل میں شکر بھی ادا کیا کہ "تماشائی" کم ہوئے ہیں۔

گروپ میں موجود ہر فرد ہاتھ جھلا جھلا کر اسے "پوچھو بھی" کا اشارہ کر رہا تھا۔ان کی اصرار پر دو سیڑھیاں اتر کر وہ دوبارہ لڑکے کے قریب گئی اور جھجکتے ہوئے اس کے کاندھے کو چھو کر اسے مخاطب کرنے کو ہاتھ بڑھایا۔

اس سے پہلے وہ اسے چھوتی،اس کا "ہونا" محسوس کر کے وہ یکدم چپ ہوا اور دیوار سے ہاتھ ہٹا کر آنسو پونچھتے ہوئے اس کی طرف رخ کیا۔

اس کی حسین آنکھوں کے لال ڈوروں میں تیرتے "نیلے کرب" سے سحرزدہ ہو کر اسے مخاطب کرنے کو اٹھا اس کا رعنائی ہاتھ ہوا میں ہی معلق ہو گیا اور کچھ کہنے کو کھلے لب بس تھرا کر رہ گئے۔

اسے یوں بالکل اپنے پیچھے کھڑی دیکھ کر اس کی آنکھوں سے درد چھٹ کر پہلے تحیر ابھرا اور پھر بغور اسے دیکھتے یکا یک اس کی نظروں میں "شناسائی" نے جھلک دی۔

یقیناً وہ بھی اسے "پہچان" چکا تھا۔۔۔

زندگی میں کچھ لوگوں سے واقفیت کے لیے ان سے بہت زیادہ میل جول ہونا ضروری نہیں ہوتا۔۔۔

کچھ لوگ اپنی کسی ایک بات یا ہم سے ہوئی کسی ایک ملاقات سے ہی ہماری زندگیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے

لیے "ٹھہر" جاتے ہیں۔

ان دونوں کا تعلق بھی فی الوقت بادشاہی مسجد کی طویل راہداریوں میں ہوئی اس ایک ملاقات پر محیط تھا۔ دونوں کو باہم ہوا وہ "مکالمہ" اب تک نہیں بھولا تھا۔

اس کی ساکت "حالت" دیکھ کر اپنی جامد "حیرت" پر قابو پاتا وہ ایک طرف ہو کر اس کے "حصار" سے باہر نکلا اور کچھ فاصلے پر رک کر کھنکارا۔

اس کی حرکت سے اس پر طاری سحر ٹوٹا تو اس نے کسی قدر خجالت سے پہلے اسے اور پھر دور سیڑھیوں کے ابتدائی سرے پر کھڑے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

اسے لڑکے کے سامنے آ کر اپنے بے طرح "تھم جانے" کا قلق ہوا۔

جبکہ کچھ دیر پہلے ہچکیوں میں روتے اس لڑکے کے چہرے پر اب بلا کا سکون اور اعتماد تھا۔

کسی کو سامنے پا کر اپنی بکھری حالت سمیٹ لینے کا ہنر وہ بخوبی جانتا ہے اس بات سے وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔اس سے ہوئی پچھلی ملاقات میں اس نے اس کا یہ "فن" بھی دیکھا تھا۔

"بات سنیں۔۔۔آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟؟ یوں عوامی جگہوں پر ایسے اوٹ پٹانگ "مظاہرے" کرنا۔۔۔کیا یہ "خودنمائی" کی کوئی کوشش ہے؟؟ یا واقعی کوئی "مسئلہ" ہے آپ کے ساتھ؟؟"

اسے مخاطب کر کے وہ "یہ" بولے گی۔۔۔یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔اس وقت بے اختیار ہو کر اس کے منہ سے بس یہی نکلا تھا۔

شاید لاشعوری طور پر وہ خود کو باور کروا رہی تھی کہ وہ اس پر "حاوی" نہیں ہو سکتا۔۔۔

یقیناً اسے ادراک نہیں تھا کہ پچھلی ملاقات میں ہی وہ اس پر "طاری" ہو چکا ہے۔۔۔

اس کا سوال سن کر لڑکے کی کشادہ پیشانی پر بے شمار بل ابھرے۔۔۔

اسے پہچان کر وہ اس سے اس لب ولہجہ کی توقع نہیں کر رہا تھا۔۔۔

یونیورسٹی اسٹاپ پر بس رکی تو وہ دونوں بس سے اتر کر آگے پیچھے یونیورسٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ بارش اب رک گئی تھی جبکہ ہوائیں اس قدر سرد تھیں کہ جذبات کو لپیٹ کر منجمد کیے دیتی تھیں۔ سارے راستے میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بیگانگی سے پیش آئے تھے۔

بظاہر سرد مہر رویہ......

اور لیا دیا انداز۔۔۔

انہوں نے ایک دوسرے کو بالکل بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔

دونوں باہم بات تو کرنا چاہتے تھے لیکن انا آڑے آتی تھی۔ دونوں اس انتظار میں تھے کہ پہلے "وہ" اسے مخاطب کرے۔۔۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم عزتِ نفس کے نام پر تعلقات میں در آئی انا کو پال لیتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے ہمارے عزیز تر وہ تعلقات نہیں بچتے۔۔۔ ہاں وہ انا باقی رہ جاتی ہے۔۔۔ ہمارے باقی تعلقات کو بھی نابود کرنے کے لیے۔۔۔

ہمیں تنہا کرنے کے لیے۔۔۔

اور المیہ تو یہ ہے کہ ہمیں اس "بات" کا ادراک بھی نہیں ہوتا کہ انا بچا کر ہم نے کیا کیا کھویا ہے اور کس قدر اکیلے ہو گئے ہیں۔۔۔؟

اور شاید ادھورے بھی۔۔۔

ہاں اگر کبھی ہمیں اس بات کا احساس ہو جائے اور ہم پلٹ کر ان تعلقات۔۔۔ ان رشتوں یا دوستوں کو ہاتھ بڑھا کر پھر سے چھونا چاہیں تو ہم پر ایک جان لیوا انکشاف ہوتا ہے۔۔۔ وہ یہ کہ اب ہم سے بہت پیچھے چھوٹ جانے والے وہ رشتے، تعلق اور وہ دوست بھی۔۔۔ یا تو ہم سے بہت آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں۔ یا بہت دور جا چکے ہوتے ہیں۔۔۔ پھر وہ ہماری دسترس میں نہیں ہوتے۔۔۔ ہم دوبارہ، کبھی بھی انہیں "حاصل" نہیں کر سکتے۔۔۔

چاہ کر بھی نہیں۔۔۔

وہ اب ہمارے لیے "شجرِ ممنوعہ" ہوتے ہیں۔

ان دونوں کے تعلق میں بھی ایسی ہی اک غیر محسوس سی انا جگہ بنا رہی تھی۔

لیکن وہ لاعلم تھے۔۔۔انہیں اس کا شعور نہیں تھا۔۔۔

دراصل ہمارے اندر پنپتی انا ہمارا "علم و شعور" باقی نہیں رہنے دیتی۔۔۔

ہمارا "علم" ہوتا تو ہے لیکن "کارآمد" نہیں رہتا پھر......

وہ دونوں باہم لاتعلق رہ کر یونیورسٹی داخل ہوئے اور دھیرے دھیرے بزنس ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگے۔

شدید بارش کی وجہ سے طالب علم بہت کم نظر آرہے تھے۔زیادہ تر طلباء نے یقیناً چھٹی کرلی تھی۔

ڈیپارٹمنٹ کی طویل راہداری بھی دور تلک ویران تھی۔بس تین لڑکیوں اور دو لڑکوں پر مشتمل ایک گروپ راہداری کے دو وسطی بینچز پر بیٹھا تھا۔وہ سب اس کے ہم جماعت تھے۔ان میں سے ایک لڑکی مریم کو وہ جانتی تھی۔ایک دو بار کینٹین اور کلاس میں بھی اس سے مل چکی تھی۔کافی ہنس مکھ لڑکی تھی وہ۔ہر وقت کھلکھلاتی رہتی تھی۔

انہیں دیکھ کر ثومیہ راہداری کے ابتدائی سرے پر رکی اور مڑ کر چند قدم دور اپنے پیچھے آتے سفیر کی طرف دیکھا۔اسے خدشہ تھا کہ وہ سب ان دونوں کا یوں "لاتعلق" ہو کر چلنا لازمی محسوس کریں گے۔

ایک پل کے لیے ان کی نظر ملی اور پھر دونوں نے رخ پھیر لیا۔

وہ آگے بڑھ گئی۔

اور وہ "وہیں" رک گیا تھا۔

پہلا لیکچر شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اور اس نے کلاس میں بیٹھنے کی بجائے باہر رہ کر انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

"السلام علیکم۔۔۔کیسے ہو آپ سب؟؟"

وہ اس گروپ کے پاس چلی آئی۔

باتوں میں مگن ہونے کی بدولت وہ اس کی آمد پر چونک گئے۔

"وعلیکم السلام ثومیہ۔۔۔ٹھیک ہیں ہم سب۔تم کیسی ہو؟؟"

مریم نے اس سے ہاتھ ملا کر سب کی طرف سے مشترکہ جواب کیا۔باقی سب بھی اس کی طرف متوجہ تھے۔

وہ سادگی سے مسکرادی اور پھر راہداری کے داخلی سرے پر نگاہ دوڑا کر بولی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں بالکل۔۔۔کیا ڈسکس ہو رہا تھا؟؟"

سفیر کو راہداری میں غیر موجود پا کر اس کے ماتھے پر لکیر فکر ابھری۔

"ابھی تو تھا۔۔۔یہ کدھر گیا ہے؟؟ آیا کیوں نہیں؟؟"

اس لڑکی سے سوال کر کے وہ مسلسل پیچھے دیکھ رہی تھی۔

"موسم کی خرابی پر بات ہو رہی تھی یار کہ بارش کی وجہ سے سٹوڈنٹس بہت کم آئے ہیں۔ہو سکتا ہے کہ لیکچرز بھی کینسل ہو جائیں آج۔۔۔ہماری کلاس سے بس ہم لوگ ہی آئے ہیں۔۔۔ابھی جو یہاں کھڑے ہیں۔اور کوئی نہیں آیا۔۔۔"

اس مرتبہ دوسری لڑکی نے جواب دیا۔

دونوں لڑکے وہاں سے اٹھے اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر آپس میں بات چیت کرنے لگے۔

"ارے۔۔۔بس۔۔۔؟؟ یہ تو بہت کم تعداد ہے۔لیکچرز یقیناً کینسل ہو جائیں گے یار۔۔۔مجھے پہلے پتا ہوتا تو میں بھی نہیں آتی۔"اتنی" بارش میں سمجھو کہ "اتنا" ہی ذلیل ہو کر آئی ہوں میں۔۔۔شٹ۔۔۔اب اسی طرح واپسی بھی ہوگی۔۔۔آہ۔۔۔"

حیرت سے چیخ کر ماتھے پر ہاتھ مارتے اس نے یوں فکر سے کہا کہ وہ سب ہنسنے لگیں۔

"ہمارا پہلا ری ایکشن بھی یہی تھا جب ہمیں باری باری پتا چلا کہ بس ہم ہی آئے ہیں۔ہاہاہا۔لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے۔؟ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔"

مریم نے قہقہہ لگایا۔۔۔

"لو جی۔۔۔کر لو پڑھائیاں۔۔۔یہاں اب تک پروفیسرز نہیں پہنچے اور ہم طلباء کی فکر میں گھل رہی ہیں۔"

ترتیب میں موجود اساتذہ کے کمروں میں سے نزدیکی دو پر لگے تالوں کی جانب اشارہ کر کے وہ مزید بولی تو سب نے ادھر دیکھا۔

"ہاں واقعی یار۔۔۔دیکھو۔۔۔باتوں میں لگ کر ہم نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔۔۔"

تیسری لڑکی جواب تک خاموش تھی اس نے ٹکڑا دیا۔

جواباً ثومیہ نے بے پرواہی سے شانے جھٹکے اور چل کر راہداری کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

کلاس کی فکر بھول کر اب وہ سفیر کے متعلق متجسس ہوئی۔

وہ اسے صحن میں ایک مخصوص جگہ پر یہاں سے وہاں چکراتا نظر آ گیا۔

کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت دیکھتا وہ یقیناً کلاس کے شروع ہونے کا منتظر تھا۔

"اوہ تو اس وجہ سے نہیں آیا کہ وقت سے پہلے کلاس میں پہنچ کر میرے ساتھ بیٹھنے یا نہ بیٹھنے کا فیصلہ ناں کرنا پڑے۔اکڑو کہیں کا۔۔۔خود پرست۔۔۔"

اس نے دل میں سوچا اور دانت پیسے۔

اسے پھر سے غصہ آنے لگا تھا۔

"ثومیہ یار۔۔۔ابھی تک سر علی عبداللہ بھی نہیں پہنچے۔اور صرف سات منٹ باقی ہیں اب ان کا پہلا لیکچر شروع ہونے میں۔"

مریم کے مخاطب کرنے پر اس نے بے توجہی سے سر ہلایا۔

"ہوں۔۔۔صحیح کہہ رہی ہو۔۔۔"

اس کے سرسری لہجے سے وہ سمجھ گئی کہ اس کا دھیان اب کہیں "اور" ہے۔اس نے بغور اس کا انداز جانچا۔

"ایک بات تو بتاؤ یار۔۔۔تمہارا وہ ہیرو کزن نہیں آیا اب تک؟؟ سفیر۔۔۔آئے گا بھی یا کہ نہیں آج؟؟؟"

دونوں ساتھی لڑکیوں کو اشارے سے اس نے اس کی "محویت" سے آگاہ کیا اور مشتاق لہجے میں سوال کیا۔

اس نے چونک کر پہلے اسے اور پھر کچھ فاصلے پر کھڑے ان دو لڑکوں کو دیکھا۔

وہ ان کی باتوں سے یکسر بے خبر اپنی گفتگو میں مگن تھے۔

ان سے مطمئن ہو کر وہ مسکرائی۔اس کے چہرے پر مسرت آمیز تاثر ابھرا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوستوں سے ہوئی شدید ناراضی کے باوجود بھی، ان کی ذات کا "حوالہ" بن کر ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔

ان کے ذکر پر ہم عجب سرشار ہونے لگتے ہیں۔۔۔

اسے بھی اس کا سفیر کے متعلق پوچھنا اچھا لگا تھا۔

"جی آیا ہوا ہے۔۔۔اور باہر صحن میں رک کر "ہوا خوری" سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔۔۔کم اینڈ لک۔۔۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ وہ میرا "کزن" نہیں ہے۔"

باری باری ان تینوں کو دیکھتی وہ شوخ لہجے میں بولی۔اس کی بات سن کر مریم تیزی سے اٹھی اور اس کے ساتھ جا رکی۔

کاندھے پر بیگ لٹکائے، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر، وہ پوری تاب سے صحن کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی ازلی بے زاری اور اکتاہٹ کا تاثر تھا جو اسے مغرور ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ "ممتاز" بھی کرتا تھا۔

نزدیک لگے پیپل کے پیڑ کی چوٹی پر چہچہاتی ہوئی چڑیاں دیکھتا وہ اپنے "دیکھے جانے" سے یکسر بے خبر تھا۔

"ہائے یہ کتنا ہینڈسم ہے ثومیہ۔۔۔ سچی۔۔۔انتہائی دلکش۔۔۔"

اسے دیکھ کر وہ فدائی لہجے میں بولی تو اس نے حیران ہو کر پھر سے تھوڑے فاصلے پر موجود ان دو لڑکوں کو دیکھا۔وہ اب بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

اسے اس کے کھلے ڈلے انداز پر حیرت ہوئی۔

"یہ بہت خوبصورت ہے پر اس میں ایک "برائی" ہے۔۔۔"

سفیر کو دیکھتی وہ اسی لہجے میں دوبارہ بولی تو اس نے سوالیہ نظریں اس پر گاڑ دیں۔

"کیا؟؟۔۔۔"

"یہ کمبخت بیٹھتا" صرف" تمہارے ساتھ ہے۔۔۔"

اس نے مزید " گوہرافشانی" کی تو وہ سب ہنسنے لگیں۔اس کے شگفتہ لب ولہجہ میں عریانی نہیں بس مزاح کا عنصر تھا۔۔۔

"ہاہاہا۔۔۔ بہت شریر ہو تم۔۔۔ میں کہہ دوں گی اسے کہ آئندہ تمہارے ساتھ بیٹھا کرے۔۔۔ کہ بھئی ستاروں سے آگے جہاں "اور" بھی ہیں۔۔۔"

اس کے شانے پر مکا مار کر اس نے سب کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا تو وہاں سب کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

لڑکوں نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر باہم ہنسی مذاق کرتے دیکھ کر مسکرا دیے۔

اس وقت اس کے لہجے میں وہی "استحقاق" جھلک رہا تھا جو دو بہترین دوستوں کا آپس میں ہوسکتا ہے۔

وقتی طور پر وہ بھول گئی تھی کہ وہ دونوں باہم کس قدر ناراض ہیں۔

"اے۔۔۔ وہاں دیکھو وہ کل والا لڑکا آرہا ہے جو پہلی مرتبہ آیا تھا کلاس میں۔کیا ہی سجیلے نین ہیں اس کے واہ۔۔۔اور کیا بھلا سا نام تھا اس کا یار۔۔۔آں۔۔۔"

مریم نے اچانک اسے کلائی سے پکڑ کر متوجہ کیا اور نام سوچنے لگی۔

ہنستے ہوئے اس کی نظروں کے تعاقب میں اس نے دور یونیورسٹی کے داخلی گیٹ کی جانب دیکھا۔

"مصطفین شجاع۔۔۔ یہ نام ہے اس کا۔۔۔ بے چارے نے اتنی "تفصیل" سے بتایا تھا اپنا نام۔۔۔ اور تم بس سجیلے نین ہی تاکتی رہیں۔۔۔ بھلا سا یہ نام بھول گئیں اس کا۔۔۔ ہاں۔۔۔؟؟"

اس نے جواباً برجستگی سے کہا تو کل کلاس میں ہوئی اس کی "دھواں دار" آمد کو یاد کر کے ایک اور قہقہہ پڑا۔

"چل یار یہ پاگل ہوگئی ہیں۔ادھر جا کر کھڑے ہوتے ہیں۔"

ان لڑکوں نے انہیں بے تحاشا ہنستے دیکھا تو یہ تبصرہ کر کے راہداری کے آخری سرے کی طرف چلے گئے۔

"نام کیسے یاد رہتا اس کا۔۔؟ عجب جناتی سا نام ہے یار۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ کوہِ قاف کے کسی نہ کسی باسی کا نام بھی یہی ہوگا۔۔۔ ضرور۔اور اس کا وہ جملہ یاد ہے کہ۔۔۔ معذرت خواہ ہوں سر جی میرا کلاس میں یوں داخل ہونا ضروری تھا۔۔۔ ہاہاہا۔اش۔۔۔اش۔۔اش یار۔۔۔ مجھے لگا جیسے یہ لکھنو سے آیا ہے۔"

مریم نے ہو بہو اس کی نقل کرتے ہوئے مزید ٹکڑا دیا تو وہ ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگیں۔

اب یقیناً اگلے چند منٹ کے لیے ان کا موضوع "مصطفین شجاع" تھا۔

مریم کھڑکی سے ہٹ کر اپنی ساتھی لڑکیوں کے پاس چلی گئی اور اب ایسی ہی کسی بات پر انہیں مزید ہنسا رہی تھی۔

جبکہ وہ ادھر ہی تھم کر مصطفین کو دیکھنے لگی۔اس کے بال بھیگے ہوئے تھے اور انہیں رومال سے صاف کرتا ہوا وہ اسی طرف آ رہا تھا۔اس کے چہرے پر نرم تاثر تھا اور لبوں پر ایک خوش رنگ مسکان۔۔۔لمبے لمبے سانس بھر کر سرد ہواؤں کو اپنے "اندر" اتارتا وہ بہت مسرور لگ رہا تھا۔

کل اس سے ہوئی ایک ملاقات میں ہی وہ "ہواؤں" کے ساتھ اس کا "عشق" جان گئی تھی۔کیسے نہ جانتی کہ وہ خود بھی ہواؤں کی "شدید محبت" میں مبتلا تھی۔

پھر یوں ہوا کہ صحن کے پار ڈیپارٹمنٹ کی طرف آنے والے پختہ ٹریک پر چلتا مصطفین خود سے کچھ فاصلے پر موجود سفیر کو دیکھ کر رک گیا تھا۔

اچانک۔۔۔اور یکا یک۔۔۔

جبکہ دور سے بغور اسے دیکھتی وہ چونک گئی تھی۔

انتہائی۔۔۔اور بہت زیادہ۔۔۔

"اللہ۔۔۔یہ رکا کس لیے ہے؟؟۔کہیں لڑ ہی نہ پڑیں دونوں۔۔۔"

اس کے ہونٹوں سے یہ خدشہ کسی سرگوشی کی مانند پھسلا تھا۔۔۔

☆......☆......☆

جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں دادی کے "قصوں" کی شوقین گیتی مختلف مدارجِ زیست طے کر کے جوان ہوگئی۔اس کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی "پاکستانیت" بھی پروان چڑھتی رہی۔وہ پاکستانیت جو کہ دادی کی کہانیوں میں کامل، پوری اور بھرپور شامل ہو کر اس کے اندر بھی مسلسل پنپتی رہی تھی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ کب بھارتی خمیر سے اٹھے اس کے وجود میں ایک انجانی سی محبت پاکستان کی بھی گندھ گئی۔لیکن اپنے سکول، کالج اور

پھر یونیورسٹی میں بھی تمام ساتھیوں کو ہمیشہ پاکستان مخالف نعرہ بازی کرتے دیکھ کر اس نے یہ بات اچھے سے سیکھ لی تھی کہ ایک "دشمن" ملک کے لیے اپنے اندر پلتی یہ محبت اسے کہیں ظاہر نہیں کرنی۔

کبھی بھی نہیں۔۔۔

کسی رنگ میں، کسی بھی جگہ نہیں۔۔۔

ہاں یہ ضرور ہوتا کہ ہر بار پاکستان کے ذکر پر اس کی دھڑکن تیز ہو جایا کرتی تھی۔کئی بار اسے لگتا کہ اس کے دل میں دبا پاکستان کی بے طرح محبت کا یہ "راز" اچھل کر ارد گرد "سارے" میں پھیل رہا ہے۔اس کے لیے اپنا "اندرون" سنبھالنا مشکل ہونے لگتا تھا۔

"وقت کبھی یا کہیں۔۔۔رکتا نہیں ہے۔" بظاہر عام سے اس فقرے کی "حقیقت" بہت قوی، اٹل اور چٹانی ہے۔

اڑتے وقت کے بہتے دھاروں میں پس کر گیتی کی زندگی میں بھی بہت کچھ "بدل" گیا تھا۔

وہ یونیورسٹی کے آخری سیمسٹر میں تھی جب اس کی دادی "جمنا" کا دیہانت ہو گیا۔ایک دفعہ تو اسے لگا کہ اس کی دنیا اٹھا کر کسی نے پورے زور سے پلٹ دی ہے۔

اس زور سے کہ وہ زار زار روئی۔۔۔

اس قدر شدید کہ وہ بے قرار روئی۔۔۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی کہ جن کے بنا ہمارا جینا دراصل "جینا" نہیں ہوتا۔

گیتی کے لیے ایسا ہی ایک فرد اس کی دادی تھیں۔اس کا واحد خونی تعلق کہ جس کے ساتھ اس نے جیون کی سرد رتوں اور راتوں میں بھی رشتوں کی حرارت تاپی تھی۔

کئی دنوں تک وہ سنبھل ہی نہیں سکی۔گھنٹوں ساکت بیٹھی رہتی۔کھانا کوئی کھلاتا تو کھا لیتی ورنہ بس گم سم۔۔۔

دادی کیا مریں اسے لگا کہ اس کے اندر بسا ان کے قصے، کہانیوں کا ہر کردار مر گیا ہے۔اک احساس کہ گویا اس کے اندرون کی ہر "تہہ" میں بسی "اداکارہ" بالکل ڈھے گئی ہو۔

اس کی زندگی میں شامل ہر "افسانوی" پہلو بے حد شکستہ ہوا۔اس کے نرم و نازک جذبات کو یہ پہلا دھچکا لگا تھا۔

اس واقعے کا ایک اثر اور ہوا کہ بھارت میں رہتی گیتی کے اندر بنا پاکستان کا "عکس" مزید گہرا ہو گیا۔وہ جمنا کے وطن سے محبت تو کرتی ہی تھی۔۔۔عشق بھی کرنے لگی تھی۔

اسے ملکِ پاکستان سے ہوئے جمنا کے "بچھڑن" کا دکھ تھا۔

اس کی ماں شیتل اور دوست نازنین ہمہ وقت اس کی دلجوئی میں لگی رہتیں۔وہ ہر طرح سے اس کا دل بہلانے کے ہزاروں جتن کیا کرتیں۔

اس بات سے وہ دونوں انجان تھیں کہ گیتی کا دل بہلانے کے لیے "کچھ" مخصوص "الفاظ" ہیں کہ جن کا "مرہم" کافی ہے۔

رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ وقت کی ہلتی شاخوں سے پھسلتے، یاسیت زدہ "لمحات" کو اس کی "بے رنگ و نور" حالت پر رحم آیا اور وہ اس کے تہی دامن میں "عرقِ صبر" جھاڑ کر گزرتے چلے گئے۔

انسان صبر" کرتے" نہیں، صبر ان کو" آ" جاتا ہے۔۔۔

اسے بھی آ گیا تھا۔۔۔

صبر آیا تو اس نے خود سے ایک عہد کیا کہ وہ کبھی نا کبھی دادی کے اول دیس ضرور جائے گی۔

ان فضاؤں میں جا کر دادی جمنا کے حصے کی "سانسیں" بھرے گی۔

ان گلیوں، بازاروں میں چل کر اپنے قدموں کے نشانات چھوڑے گی۔۔۔

لازمی۔۔۔اور بہر طور۔۔۔

حساس لوگوں کی محبت بڑی عجب سی ہوتی ہے کہ کسی کے لوٹ جانے کے بعد بھی اس کا "اظہار" ہوتا رہتا ہے۔

محبت "جاری" رہتی ہے تو عشق "طاری" رہتا ہے۔

الگ رنگ میں۔۔۔

منفرد ڈھنگ سے۔۔۔

یہاں بھی خود سے کیا گیا، بظاہر عجب اور ناممکن سا یہ "عہد" گیتی کا "اندازِ محبت" تھا۔

انسان جب کسی کام کی تکمیل کے لیے خود سے عہد باندھ لے تو خدا اس کے راستے ہموار کرتا جاتا ہے۔ غیر محسوس انداز میں ایسی ایسی راہیں بننے لگتی ہیں کہ جہاں سے کسی راہ کا گمان تک نہیں ہوتا۔

بے شک خدا سارے نیک وعدوں کا حقیقی "پاسبان" ہے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد گیتی کے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ جبکہ ماں اور باپ کی اپنے اپنے پیشے میں بے شمار مصروفیات تھیں۔ وہ سارا سارا دن وسیع بنگلے کی مختلف بالکونیوں میں چپ چاپ کھڑی رہتی۔ اس کی شخصیت میں ایک دلکش ٹھہراؤ تھا۔ ناز جب اس کے پاس ہوتی تو زندگی جیسے رقص کیا کرتی تھی ورنہ تو بس سکوت تھا۔۔۔ اور اک مہیب سناٹا بھی۔

جو گیتی کی ذات کے اندر، باہر اور ہر طرف گونجتا تھا۔

کبھی کبھی ہم بالکل نہیں سمجھ پاتے کہ زندگی ساکن ہے یا متحرک۔۔۔

اگر ساکن ہے تو کیوں ہے؟؟

اگر متحرک ہے تو کیونکر ہے؟؟

ہم زندگی میں در آئے کسی بھی سکوت کی وجہ کھوجنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

یوں لگتا ہے کہ گویا ہم کسی "اوجِ خلاء" میں ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارے جیون کے ہر رخ کی پوری کروٹیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ اڑتے وقت کے رواں کناروں کا ہر سوگوار دھارا ہمیں اپنے "دوش" پر بہائے لے جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زیست کے کسی موڑ پر ہوا ہمارا کوئی "قیام" بھی، ہمارا "اختیاری" نہیں ہوتا۔

ہم رک جاتے ہیں کیونکہ ہمیں رکنا "پڑتا" ہے۔۔۔

ہم مڑ جاتے ہیں کیونکہ ہمیں مڑنا "پڑتا" ہے۔۔۔

کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہمارا "مستقبل" ہمارے "حالات" طے کرتے ہیں۔

یہ اس کے جیون میں در آئے انہی "لمحات" کا ذکر ہے۔اس روز بھی وہ بے سبب اور دیر تلک اپنے گھر کے مختلف گوشوں میں "بھٹکتی" رہی تھی۔اونچی اونچی منقش چھتیں، لمبے چوڑے سفید کالمز، سجی سجائی رنگ دار دیواریں، ان پر آراستہ قابلِ دیدو داد مختلف فنی شاہ پارے، طویل راہداریاں، کھڑکیوں کی تراشیدہ سلیں، ان کے دیدہ زیب بیرونی چھجے، دبیز پردے، کثیف جالیاں اور وسیع بنگلے کے خوبصورت لاؤنج سے اوپری منزل کو جاتی گولائی دار سیڑھیاں۔۔۔اس کا سارا وقت مختلف "مادی مشاہدات" میں گزرا تھا۔یہ سب کا سب تعیّش اور آسائش، اس کی ذات میں بسی سادگی کے لیے "بے معنی" تھا۔

وہ ایک بالکونی کی اونچی ریلنگ سے ٹیک لگائے گھر کے داخلی گیٹ سے پار شفاف سڑک پر لگے "پام" کے اونچے لمبے درخت دیکھ رہی تھی۔ان درختوں کے گرد کئی پرندے لمبی لمبی اڑانیں بھر رہے تھے۔اس نے دیکھا کہ دانہ چوگا لائی ہوئی چڑیاں اپنے بچے "پال" رہی ہیں۔ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ گیتی کے گلے میں پڑا رنگ برنگا دوپٹہ مسلسل لہرا رہا تھا اور لمبے بال جا بجا چہرے، گردن وشانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔دلکش ہونٹوں کے ملائم کناروں پر ٹکی ایک کالی سیاہ لٹ ہواؤں سے الجھ کر گویا اپنے "مقام" سے ہٹنے میں مزاحم ہو رہی تھی۔ہوا کی تمام "چھیڑ خانیوں" سے ہٹ کر اس کی آنکھیں "خالی" تھیں۔ان میں کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

اس کی پشت پر موجود ٹیرس کا دروازہ کھول کر ناز وہاں داخل ہوئی اور اسے دیکھ کر اس نے ایک لمبا سانس خارج کیا۔پھر کچھ سوچتی ہوئی کیفیت میں، نرمی سے دروازے کا ہینڈل چھوڑ کر، آہستگی سے چلتی ہوئی وہ اس کے ساتھ جا رکی۔

"تم یہاں ہوا ئے حسین "آتما"۔۔۔اور میں نے پورا گھر تاک لیا تمہارے کارن۔۔۔کیا کر رہی ہو؟؟"

اس کے شوخ لہجے میں "ارادیت" کی جھلک تھی۔یوں گویا اس کی طبیعت کا بوجھل پن بھانپ کر جان بوجھ کر یہ لہجہ اپنایا گیا ہو۔

اس نے اپنا رخ ناز کی جانب موڑا۔

"ہاں ابھی ابھی آئی ہوں یہاں۔۔۔اور کرنا کیا ہے؟؟ کچھ بھی تو نہیں ہے کرنے کو۔"

یاسیت زدہ لہجے میں کہہ کر وہ نرمی سے مسکرائی۔

"اور میں تم سے ملنے گئی تھی انیکسی میں لیکن تم سو رہی تھیں۔ میں پھر بیلا آنٹی کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر اوپر آ گئی۔۔۔"

پھر اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"صحیح۔۔۔ کنتو اگر تم گئی تھیں تو مجھے جگا لیتیں۔۔۔ بھئی اتنی اجازت تو میں نے تمہیں دے ہی رکھی ہے۔ سمجھو کہ تم پر خاص ادھارتا اور کرپیا ہے میری۔"

وہ شریر لہجے میں خوشگواریت سے بولی تو گیتی بے ساختہ ہنس دی۔

مدھر سروں کا دلنشین ہنسی۔۔۔

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔ دھنے واد جی۔ واستو دان شیلتا ہے آپ کی میں ناچیز پر۔۔۔"

جواباً وہ بھی شوخ ہوئی تو ناز کھلکھلا کر ہنسی۔

اسے بچپن سے اب تک اپنا "مان" رکھا جانا بہت مسرور کرتا تھا۔ ان دونوں کے مابین مالک اور ملازم کی بجائے ہمیشہ دوستی جیسا پرخلوص تعلق پروان چڑھتا رہا تھا۔

"واستو یار گیتی۔۔۔ اوکاش (فرصت) سے اب تو میں بھی اوب گئی ہوں۔ کوئی کام ہی نہیں۔۔۔ سارا سمے پڑے رہو بس چپ چاپ۔۔۔"

ہنسی روک کر اس نے گیتی کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے کر اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کیا جائے پھر؟؟ بھئی جو کہتی ہو کر لیتے ہیں۔۔۔ ماما کا بوتیک جوائین کر لیں کیا؟ دلچسپ فیلڈ ہے۔ کیوں نا ہو کہ اسی کو کیریئر بنایا جائے؟؟"

اس کی ہمراہی میں چلتی وہ خوش دلی سے بولی تو ناز ایک دم رک کر چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس دوران وہ دونوں ٹیرس سے داخل ہو کر اوپری منزل کے لاؤنج میں پہنچ چکی تھیں۔

"ارے۔۔۔ گڈ آئیڈیا گیت۔۔۔ اوشیہ یہی کرنا چاہیئے ہمیں۔ واستو میں یہی کرتی ہیں یار۔ اس سے بہتر کیا ہوگا بھلا ہمارے لیے۔ ہمیں تو شیتل آنٹی دنوں میں سکھا دیں گی سب۔ ویسے بھی میرا ڈریس ڈیزائننگ سینس تو یوں بھی غضب ہے۔ پر اپر سیکھ لوں تو سمجھو دھوم مچ جائے گی۔ ہاں تمہارا یہ سینس بس سو۔سو ہے۔ پرنتو

کوئی نہیں۔۔۔میں ہوں نا۔۔۔سب سنبھال لوں گی میں۔تم چنتا نہیں کرنا۔"

اس کے لہجے میں شرارت کی نمایاں جھلک تھی۔گیتی نے یکا یک اسے مصنوعی خفگی سے گھورا اور پھر دونوں ایک ساتھ ہنسنے لگیں۔

"تمہاری خوش فہمیوں کا کوئی حل نہیں میرے پاس ناز۔اوشیہ تمہارا یہ مرض اسادھیہ (لا علاج) ہے۔۔۔ ہاہاہا۔"

دورانِ ہنسی اس نے ناز کے کاندھے پر چٹکی بھری اور پھر یکا یک سنجیدگی اختیار کر کے پر سوچ زاویے سے بولی۔

"مجاک سے ہٹ کر میں بات کروں گی رات کو ماما سے۔بلکہ تم بھی ہونا وہیں تو دونوں مل کر کریں گی بات۔ وہ انیوار خوش ہوں گی ہمارے اس وچار سے۔۔۔بہت زیادہ خوش۔"

اس نے پر یقین لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر آلتی پالتی مارتی ہوئی وسطی صوفے پر بیٹھ گئی۔ناز اس کے سامنے والے صوفے پر نیم دراز ہوئی تھی۔

"واؤ یار۔۔۔یہ بہت کالپنک ہے کہ ہم دونوں کا نام ڈیزائینرز کے طور پر ایک ساتھ آئے گا۔"ناز گیت" یا پھر" گیت ناز"۔۔۔بھلے جو بھی ہو۔یہ پشچات دیکھیں گے۔پراتھم آنٹی سے بات تو کر لیں۔"

اس کہ طرف دیکھتی وہ مشتاق لہجے میں بولی تو اس کا اشتیاق محسوس کر کے وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

پھر بہت دیر تک وہ دونوں اسی موضوع پر گفتگو کرتی رہیں۔

تقدیر اور اس کا مالک رب اگر مہربان ہو جائیں تو انسان کے لیے اس کے خواب وخیال سے کہیں بلند محل تعمیر کر کے رکھتے ہیں لیکن ان کی موجودگی کے "ادراک" سے بے خبر انسان اس سے کہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوتا رہتا ہے۔

وہ دونوں بھی اپنی اپنی تقدیروں کی اس" مہربانی" سے فی الوقت انجان تھیں۔

☆......☆......☆

صبح صبح ایمان اور خالہ کنیز کا باہم ہوتا جھگڑا چھڑوا کر وہ بہت خوش تھا۔مختلف طنزیہ جملوں کی مار سے ایمان کی

"عزت افزائی" کر کے اسے جو سکون ملا تھا وہ بیان سے باہر تھا۔ کیونکہ ایسا موقع اسے کم کم ہی میسر آتا تھا۔ ورنہ ہر بات میں، زیادہ تر وہی اس کے لتے لیا کرتی تھی۔ وہ اس کی باتوں سے خوب چلتا تھا۔ وہ اپنے سامنے کسی اور کی چلنے بھی کہاں دیتی تھی۔ باتوں میں اس سے کوئی نہیں جیت سکتا تھا۔

آج اسے بے لاگ اور بے نقط سنا کر اسے ایک کمینی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی مسرور کن کیفیت میں وہ گھر سے یونیورسٹی کے لیے نکل آیا۔ ابھی کچھ فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ شدید بارش برسنے لگی۔

میٹرو بس کی کھڑکی سے باہر جھانک کر اس نے ہواؤں کے سنگ لہراتے بادلوں کا "رقص" دیکھا اور پھر۔۔۔ وہ گنگنانے لگا۔

آسمان کے ساکت سینے پر ناچتے ان کالے بادلوں نے آج اسے "سوگوار" نہیں کیا تھا۔

وہ اس کے دل میں بھی ناچے تھے۔۔۔

اس کے صحنِ دل میں رک کر کمال تر دھمال کیا۔۔۔

سچ کہتے ہیں کہ سارے موسم۔۔۔ "دل" کے موسم ہوتے ہیں۔

دل سمندر ہو تو باہر دریا بہتے ہیں۔۔۔

دل ساکن ہو تو باہر سوکھی، خشک اور ویران نہریں۔۔۔

وہ بے سبب اداس شخص آج بلا وجہ مسرور تھا۔

کھڑکی کے شفاف شیشوں پر پھسلتے بارش کے سنہرے قطرات اس کی توجہ کا محور و مرکز تھے۔ اپنی انگلیوں کی پوروں میں ان قطرات کی ٹھنڈک جذب کرتا وہ عجب، عجب سرشار ہوا۔۔۔

مناظر میں اس کی "محویت" بارش کے تھم جانے سے ٹوٹی تھی۔

اس نے چونک کر پہلے آسمان کو دیکھا اور پھر اپنے اردگرد۔۔۔

وہ یونیورسٹی کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

نشست چھوڑ کر وہ بس کے دروازے میں آ رکا۔

"لالے۔۔۔ یونیورسٹی اتار دینا۔۔۔"

اس نے کنڈکٹر کو مخاطب کیا اور ہونٹ سکیڑتے ہوئے جھک کر باہر جھانکا۔

"اتار دے بھائی۔۔۔نکل گیا اسٹاپ تو۔۔۔ہیلو۔۔۔"

اسٹاپ گزرتا دیکھ کر اس نے ڈرائیور کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی اور دوبارہ جھک کر باہر جھانکا۔ ڈرائیور نے فوراً ہی بریک لگا دی۔

وہ بس کنڈیکٹر اور ڈرائیور دونوں کو باری باری گھورتا ہوا بس سے اتر گیا۔

آگے لے آنے پر اسے ان پر وقتی اشتعال آیا تھا۔

پھر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر، بیگ کاندھے پر لٹکائے، اس نے فٹ پاتھ پر واپس یونیورسٹی کی طرف پیدل چلنا شروع کیا اور راستے میں پڑے ایک چھوٹے سے پتھر کو پاؤں کی زوردار ٹھوکر ماری۔

وہ اڑ کر سڑک کے پار جا گرا۔

اپنی اس بے معنی حرکت پر اس کے لب چٹکے۔

یونیورسٹی کے مرکزی گیٹ سے داخل ہو کر وہ رکا اور ہر طرف نگاہ کی۔ بارش کے باعث اس نے طلباء کی تعداد میں نمایاں کمی محسوس کی تھی۔

ایک پختہ روش پر آہستگی سے چل کر وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگا اور پھر کسی کو دیکھ کر بے ساختہ وہیں ٹھہر گیا۔

ایک احاطے میں سفید گلاب کی کیاریوں کے پاس رک کر، چہرہ اٹھائے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے دیکھتا وہ یقیناً سفیر تھا۔

مصطفین نہیں جانتا تھا کہ سفیر پرندے نہیں دیکھتا۔۔۔ وہ ان کے "شور" سنتا ہے۔۔۔

وہ اگر اس کے دل کے عالم سے مکمل طور پر ناواقف تھا تو سفیر بھی اس کے حالِ دل سے یکسر بے خبر تھا۔

وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ ان کا اندرون کس قدر "یکساں" ہے۔

کل ثومیہ سے ہوئی ملاقات اور پھر دوستی کا اثر تھا یا کہ آج اپنے مزاج میں در آئی اس خوشگواریت کا کمال۔۔۔ سفیر کو دیکھ کر، کل اس کے رویے کی بدولت اس پر آیا، اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا تھا۔

دل میں موجود ساری ناراضی بھول کر اس نے ابھی اس سے بات کرنے کا قصد کیا اور دھیرے دھیرے اس کی سمت بڑھنے لگا۔

وہ زیادہ دیر کسی سے بھی خفا نہیں رہ سکتا تھا۔

اپنی پشت پر اس کے "ہونے" سے بے خبر سفیرا اپنے ہی کسی دھیان میں تھا۔

☆......☆......☆

اسے صحن میں سفیر کے نزدیک رکتے دیکھ کر وہ کھڑکی سے ہٹی اور تیزی سے مریم کے پاس آئی۔

"یہ پکڑو اور بیٹھو تم لوگ۔۔۔ میں بس ابھی آئی۔۔۔"

اپنا بیگ اس نے مریم کی گود میں رکھا اور جواب سنے بغیر راہداری کے داخلی سرے کی جانب بھاگ گئی۔ اس کی اچانک آمد پر کوئی بات کرتی کرتی مریم ہڑبڑا کر رک گئی۔ اس نے تحیّر سے پہلے اسے راہداری میں بھاگتے دیکھا اور پھر ساتھی لڑکیوں کی جانب نگاہ کی۔ وہ بھی رخ موڑے اسے راہداری کی سیڑھیاں اترتے دیکھ رہی تھیں۔

مریم نے ان دونوں کے متجسس تاثرات جانچے اور جلدی سے اپنی حیرت پر قابو پا کر بولی۔

"اوہو۔۔۔ یہ بھی پوری آفت کی پرکالا ہے۔۔۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی تھی۔ ایک دن کینٹین میں بھی یوں ہی بھاگم بھاگ ملی تھی۔ خیر چھوڑو اسے۔ یقیناً وہ سفیر کے پاس گئی ہے۔ اس کا دوست ہے بھئی۔ وہ جا سکتی ہے۔" لب ولہجہ متوازن رکھ کر اس نے ان کا دھیان بٹانا چاہا۔

"ہاں جا سکتی ہے لیکن یوں......؟؟ عجیب نہیں لگا کچھ؟؟"

ان میں سے ایک نے اس کی طرف دیکھ کر ابرو اچکائے۔

"چھوڑو بھی یار۔۔۔ جیسے بھی جائے۔۔۔ ہمیں اس سے کیا۔۔۔؟؟"

اس نے گویا چڑ کر کہا اور پھر ہاتھ جھلا کر دوبارہ بولی۔

"تم سنو وہ جو لمبو ہے نا شوکت علی۔۔۔ ارے وہی چغد سا۔۔۔ وہ پرسوں سے بڑی لائین مار رہا ہے مجھے۔۔۔ بے چارہ جانتا نہیں شاید کہ کسے چھیڑ رہا ہے۔"

"ہیں۔۔۔؟؟ سچی؟؟؟"

یک زبان ہو کر وہ حیرت سے چلائی تھیں۔

"ہاں یار بالکل سچ۔۔۔دراصل اس دن جب ہم لائبریری گئی تھیں نا۔۔۔"

اب وہ انہیں کسی نئے قصے کی جانب راغب کر چکی تھی۔

اس نے فقط ان کی توجہ مبذول کرنی چاہی تھی اور وہ اس مقصد میں کامیاب رہی تھی۔وہ ثومیہ کو زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن جس قدر جانتی تھی اسی سے اس نے جانچ لیا تھا کہ وہ بہت اچھی اور پرخلوص لڑکی ہے۔

لہٰذا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے متعلق، سفیر کے حوالے سے کوئی بھی منفی بات، کلاس یا یونیورسٹی میں گردش کرے۔جبکہ اپنے متعلق اسے یقین تھا کہ اس کے مزاحیہ مزاج کے پیشِ نظر جلد وہ شوکت علی کی بات مکمل طور پر بھول جائیں گی۔

ادھر ادھر کی باتوں سے گھما کر جب اسے یقین ہو گیا کہ ان کا دھیان بٹ چکا ہے وہ غیر محسوس انداز میں اٹھی اور اسی کھڑکی میں جا رکی۔

باہر کا منظر اسے بہت کچھ سجھا رہا تھا۔

بغور اس منظر کو دیکھتے، اس کی کشادہ پیشانی پر ان گنت تفکرات کا گھیر تھا۔

☆......☆......☆

وہیں لاؤنج کے صوفوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے ان دونوں کو کافی وقت گزر گیا تھا۔اپنے ممکنہ کیرئیر کے انتخاب سے لے کر انہوں نے دیگر بہت سے موضوعات پر بھی سیر حاصل گفتگو کی تھی۔ٹیرس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور سرد ہوائیں پورے میں جھوم رہی تھیں۔ان کی پشت پر موجود دو بڑی بڑی کھڑکیوں کے جالی دار پردے مسلسل لہرا رہے تھے اور ان کھڑکیوں سے پار، صحن میں لگے اونچے درختوں کی بلند چوٹیاں صاف نظر آتی تھیں۔

گیتی نے شفاف کھڑکی سے باہر دیکھا۔شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور پرندے آشیانوں کو لوٹ کر شاخوں پر بیٹھے مختلف بولیاں بول رہے تھے۔

وہ خوشگواریت سے مسکرائی۔

اسے کسی کا لوٹ کر اپنے دیس آنا بڑا سرشار کرتا تھا۔

"سمے کافی بیت گیا ناز۔آؤ سارے گھر کی روشنیاں جلاتی ہیں۔۔۔"

شام کے قریب گھر کی ساری بتیاں جلانے کی عادت اسے بچپن سے تھی۔

یہ کہتی ہوئی وہ اٹھ کر اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی۔اس کا چہرہ پرندوں کو دیکھ کر دمک اٹھا تھا۔

ناز نے بے ساختہ اس کی نگاہ کے تعاقب میں باہر جھانکا تھا۔

رنگین پرندوں کی سریلی چہکار نے اس پر گیتی کی مسرت کا بھید کھول دیا۔

"ہاں چلو۔۔۔"

وہ مسکرتی ہوئی اٹھ کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔گیتی نے ایک آخری نگاہ ان چہچہاتے پرندوں پر دوڑائی اور خوش کن تاثرات لیے اس کے پیچھے ہولی۔

لاؤنج کا آبنوسی دروازہ ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا جس کے دونوں اطراف میں ترتیب وار کمروں کے دیو قامت دروازے لگے تھے۔

وہ دونوں بھاگ بھاگ کر مختلف دروازے کھولتی ہوئی بنگلے کی ساری روشنیاں جلانے لگیں۔پورا بنگلہ رنگا رنگ روشنیوں سے نہا کر کسی دیومالائی کہانیوں کے سفال گر محل سا منظر پیش کرنے لگا۔

نچلے پورشن کے وسط میں لٹکتا بڑا فانوس جلا کر وہ دونوں لاؤنج میں اترتی گولائی دار سیڑھیوں پر آ بیٹھیں۔

اس وقت یہاں فانوس سے پھوٹ کر دیواروں پر منعکس ہوتی ان روشنیوں کو دیکھنا،اور ٹانگیں جھلا جھلا کر باہم راز و نیاز و گفتگو کرنا ان کا معمول تھا۔

"تم روشنیوں سے بڑا پریم کرتی ہو نا گیت۔۔۔؟؟"

بیٹھتے ہی ایک طویل سانس بھر کر ناز نے سوال کیا تو وہ کسی قدر چونک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایسا پراشن جاننے کا وچار کیسے آیا آج۔۔۔؟ کیا گیتی کو اب ناز کو بھی بتانا پڑے گا کہ اسے کیا اچھا لگتا ہے اور کیا نہیں؟اور کیوں اچھا لگتا ہے یا کیونکر نہیں؟؟"

دائیں ابرو کی دلکش تان اٹھا کر اس نے جوابی سوال کیا تو ناز جلدی سے بولی۔

"اوہو یار۔۔۔تم ٹھیک کہتی ہو پرنتو میرا وہ مطلب نہیں۔۔۔ایسا انیواری مت لیا کرو ہر شے کو۔ کچھ باتیں اور کئی پراشن بس یوں بھی ہوتے ہیں۔ بلا وجہ۔۔۔ یا بنا کارن کے، ہلکے پھلکے۔۔۔ اور ہانی رہت (بے ضرر)۔۔۔"

اس کی بات سن کر فانوس کے سارے رنگ ایک دم جیسے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں آن ساکت ہوئے۔ اس نے یک ٹک ناز کو دیکھا تھا۔ جو کہ اس کی آنکھیں پڑھتی ہوئی اس کے جواب کی بھی منتظر تھی۔

صرف چند لمحات تھے جو خامشی کے دامن میں ملفوف رہے اور پھر گیتی کے نرم ہونٹوں کے دلآویز خم نے کپکپاتے ہوئے حرکت کی۔

"میں روشنیاں اس لیے نہیں جلاتی ناز کہ مجھے ان سے کچھ پریم ہے۔۔۔ میں روشنیاں اس لیے جلاتی ہوں کہ مجھے اندھیروں سے بہت ڈر لگتا ہے۔۔۔ میں کالپنک اجالوں سے چونک جاتی ہوں پیاری۔۔۔ اور رات کے اندھیروں سے مجھے ڈھیروں خوف آتا ہے۔۔۔"

اس کے سنسناتے لہجے میں "تقسیم" کی سیاہ راتوں نے گویا بہت سی کالک انڈیل دی تھی۔ وہ کبھی بھی دادی کے سنائے ہوئے 1947 کے قصوں سے باہر نہیں آتی تھی۔

دیس سے دوری، قافلے لٹنا، پامال عصمت، کنوؤں میں مرنا، برچھیاں بھالے، بھاگتی لڑکیاں، دوڑتے بچے، زخمی بوڑھے، اجڑی گودیں، سہمی عورتیں، تھکے مسافر، دور مسافت، چور لٹیرے، اور اندھیرا۔۔۔ طویل راتیں، پھر نیا سویرا۔۔۔

جونہی رات کی کالی چادر ہر ذرہ وکل پر کامل تاب سے لپٹ جاتی تو اس کی آنکھوں میں یہ سارے منظر پھر سے جاگ اٹھتے تھے۔

وہ موجود اندھیروں اور آئندہ اجالوں۔۔۔ "دونوں" سے خوفزدہ تھی۔

نئی صبحیں ہمیشہ اسے "بے قرار" کرتی تھیں۔

وہ جان گئی تھی کہ ان اجالوں کی قیمت مستقل ٹھہر جانے والی ایک بھیانک رات ہوتی ہے۔۔۔

انہی کہانیوں میں جی جی کر وہ صدیوں پرانی ہوگئی تھی۔

وہ کہانیاں کہ جو بہر طور صرف "کہانیاں" نہیں تھیں۔

اس کی بات میں مذکور "اجالوں" کا ہر "مفہوم" جانچ کر ناز نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"یہ بھی اچھی کہی ہے تم نے ناز کہ کچھ باتیں اور کئی پراشن ہانی رہت ہوتے ہیں...... ہلکے پھلکے اور ہاں بنا کارن بھی۔۔۔ ہنہہ۔۔"

یہاں ایک ہنکارا بھر کر وہ اذیت سے مسکرائی تھی۔

اس کا گم سم لہجہ اور بے خود کیفیت دیکھ کر ناز کو لگا تھا کہ وہ "بہک" رہی ہے۔

اور اسے بالکل ٹھیک لگا تھا۔

وہ واقعی بہک رہی تھی۔۔۔

"سدیو یاد رکھنا تم کہ ساری باتیں۔۔۔ اور ہر پراشن۔۔۔ بامعنی و مقصد ہوتے ہیں۔۔۔ اپنے سامنے کھڑے کسی پراشن، یا کسی بھی بات کو ہم کبھی بھی "ہانی رہت" نہیں کہہ سکتے۔ ہم پر اٹھے سب پرشن اپنی ذات میں اویشیک کوئی نہ کوئی "بوجھ" اٹھا کر اٹھتے ہیں۔۔۔ بنا کسی کارن کے یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔۔۔ کچھ۔۔ بھی۔۔ نہیں۔"

اب اس نے پریقین نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر آخری الفاظ بذور دہرائے تھے۔

وہ حیرت در حیرت اس کی بہکی ہوئی ذہنی کیفیت جانچ کر بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس وقت بھی جذبات کے کسی انتہائی ریلے میں بہہ جائے گی۔

"نہیں نہیں ناز۔۔۔ تم یوں حیران مت ہو۔۔۔ یہ سب گیان تمہارے اس پرشن سے ہٹ کر ہے۔ یہ تو سمجھو کہ بدھی میں آیا تو بس یونہی بانٹا ہے۔۔۔ مفت۔ واستو میں۔"

اس کے تاثرات سے گیتی نے جان لیا کہ وہ پریشان ہو رہی ہے۔

وہ خفیف سا مسکرائی کر اس کے قریب ہو بیٹھی۔

دونوں نے اپنی کہنیاں گھٹنوں پر رکھ کر ہاتھوں کی انگلیاں باہم ملا رکھی تھیں۔اور گاہے بگاہے وجود کو جھومنے کے انداز میں حرکت دے رہی تھیں۔

" جانے تم کن وچاروں میں رہتی ہو گیت۔۔۔ یہ کون سے وچار ہیں کہ میری سمجھ میں تو یہ بالکل نہیں آتے۔۔۔اور اگر کبھی آئیں بھی تو میرے جیون میں ان سب بھاوناؤں کے واسطے کوئی جگہ نہیں ہے۔بھگوان کے لیے یار۔۔۔ مجھ سے آسان باتیں کیا کرو۔ یہ سب بہت گنجلک ہیں۔بہت زیادہ گنجلک۔۔۔ ہاں میں پھر کہوں گی کہ ان ساری باتوں کا کارن اور معنی کوئی نہیں۔ بے کار ہیں۔۔۔ یہ اچ وچار صرف تمہارے ہیں۔اس سنسار میں ان کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔"

ناز نے پورے اعتماد سے دوٹوک لہجے میں کہا۔وہ اس کی "حساسیت" پر کسی قدر چڑ گئی تھی۔

ایک ساتھ پرورش پا کر بھی زندگی سے متعلق ان کے نظریات الگ الگ تھے۔

اسی وقت انہوں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو چونک کر نچلے لاؤنج کے مرکزی دروازے کی طرف دیکھا۔ جدید تراش کے عمدہ ملبوس میں، شانے پر بیگ لٹکائے وہاں شیتل داخل ہوئیں۔اپنے پیشے کے اعتبار سے وہ ہر وقت نک سک سی تیار رہتی تھیں اور اپنی عمر سے کافی کم دکھائی دیتی تھیں۔ان کا سراپا کسی بھی طور کسی حسین دوشیزہ سے کم نہیں تھا۔

انہیں دیکھ کر گیتی سیڑھیوں سے اٹھ بیٹھی۔

شیتل کی آمد سے ان کی " گفتگو "یقیناً ادھوری رہ گئی تھی۔

"اچھا اب شانت رہنا پلیز۔۔۔ماما کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں ہو۔"

اس نے سر جھکا وہیں بیٹھی ناز کو دیکھا اور تنبیہاً بولی۔

" ہاں سمجھ گئی یار۔ڈونٹ وری۔۔۔ میں پاگل ہوں کیا؟ کیول یہ تو کرپا ہوئی کہ آنٹی آئی ہیں اور میرا سر چھوٹ گیا۔۔۔"

ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کر ناز برجستگی سے بولی اور پھر شریر نظروں سے اس کی آنکھیں تاک کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

"اوہ۔۔۔تم سے تو میں نمٹ لوں گی ناز۔۔۔"

گیتی نے اس کی پشت کو گھور کر مدھم آواز میں دھمکی دی اور پھر اس کے پیچھے پیچھے نزاکت سے ریلنگ تھامے سہج سہج کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

شیتل نے نچلے پورشن کے لاؤنج میں ایک گول دائرے میں سجے صوفوں پر بیٹھتے ہوئے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو رک گئی تھیں۔

" آؤ آؤ میری بچیو۔۔۔اچھا ہوا تم دونوں ایک ساتھ مل گئیں مجھے ایک امپورٹنٹ بات کرنی ہے تم دونوں سے۔"

انہوں نے باری باری پہلے ناز اور پھر گیتی کو اپنے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

"ارے۔۔۔بات تو ہمیں بھی کرنی ہے آپ سے ایک۔اینڈ دیٹس موسٹ امپورٹنٹ آلسو۔۔۔"

خوشگوار لہجے میں کہتی ہوئی ناز نے مسکرا کر گیتی پر نگاہ کی تھی۔

اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر اس نے اپنی ماں شیتل کی طرف دیکھا۔

اسی دوران ایک ملازمہ نمودار ہوئی اور دونوں ہاتھ باہم ملا کر ان کے پاس مودب انداز میں کھڑی ہوگئی۔وہ بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

" نمستے میڈم۔۔۔کافی لاؤں یا چائے آپ کے لیے؟؟"

وہ شیتل سے مخاطب تھی۔

" نمستے۔اور یوں کرو گل۔۔۔کہ ہم سب کے لیے چائے ہی بنالاؤ۔"

اس کا نام لے کر، ہاتھ جوڑتے ہوئے انہوں نے جواباً تعظیم کی تھی۔

"جی اچھا۔۔۔"

وہ واپس پلٹ گئی تو شیتل نے دوبارہ ان کی طرف دھیان کرلیا۔

" پدھارو تم لوگ۔۔۔اور کیا بات کرنی ہے بھئی مجھ سے جو بہت اہم بھی ہے؟؟"

نشست سنبھال کر انہوں نے انہیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر متجسس لہجے میں سوال کیا۔

نازنے بے ساختہ گیتی کی طرف دیکھ کر بھنویں اچکاتے ہوئے اسے بات کرنے کا کہا۔

"ماما۔۔۔آپ جو کہنا چاہتی ہیں وہ بتائیں۔ ہماری بات اتنی اوپشیک نہیں ہے۔ہم پھر کسی خالی سمے کر لیں گی۔کسی اور اوکاش۔"

نرم لہجے میں کہہ کر وہ اپنی گلابی انگلیاں مروڑنے لگی۔یوں انگلیاں مروڑنا اس کی پرانی عادت تھی۔

"نہیں گیت۔۔۔ پراتھم تم بولو۔۔۔ مجھے بتاؤ جو بھی بات ہے۔میں اپنی بات کرنے سے پہلے تم دونوں کی بات سننا چاہتی ہوں۔کیونکہ میں جو بات کرنے والی ہوں اس کے پشچات، مجھے وشواس ہے کہ تمہارے پاس سوچنے کو صرف وہی بات رہ جائے گی۔تو بہتر ہوگا اس سے پہلے تم لوگوں کا مائینڈ کلئیر اینڈ فریش ہو۔۔۔"

ان کے بااعتماد لہجے میں ایسا کوئی راز تھا کہ جوان کی آنکھوں میں بھی سرسرانے لگا۔

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اوکے۔۔۔ آنٹی اصل میں ہم دونوں اپنے کیرئیر کے لیے آپ سے بات کرنے والی تھیں۔ہم چاہتی ہیں کہ ہم دونوں آپ کے بوتیک جایا کریں۔ڈیزائننگ کو پراپر فیلڈ کے طور پر چن لیں۔آپ کیا کہتی ہیں اس کے بارے میں؟؟"

نازنین نے مزید دیری کی بجائے سب کہہ دیا۔

وہ سارے فیصلے یونہی جھٹ پٹ کرتی تھی۔

گیتی بس مسکرادی۔

وہ زیادہ باتیں اپنی دلکش مسکراہٹ کے سہارے کرتی تھی۔

یہ ناز ہی تھی جو کہ اس کے خیالات کی بھی "زبان دان" تھی۔

"اوہ تو ایسی بات ہے۔۔۔ ناٹ بیڈ۔۔۔ پرنتو میرے پاس اس سے ہٹ کر، اس سے بہتر کچھ ہے۔اس سے کہیں اچھوتا۔۔۔ ہمم۔۔۔"

ایک لمبا ہنکارا بھر کر انہوں نے کچھ دیر بغور انہیں دیکھا تو ان کے کانوں کی لوئیں تن گئیں۔

یقیناً ان کا انداز تجسس سے بھرپور تھا۔

پھر انہوں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"خواب دیکھو گیت۔۔۔اور ناز آف کورس تم بھی۔ پرنتو اس سے بہت اونچے۔۔۔"

ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں پڑھ کر وہ ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

"تمہیں گگن کو چھونا ہے۔ بہت ہی دور جانا ہے۔۔۔سنو میری بات۔۔۔دھن راج ورما کو اپنی اگلی فلم کے لیے کسی نئے چہرے کی تلاش ہے۔اور تمہارا چہرہ اسے بھا گیا ہے۔اس نے تمہیں "شیتلز" کے سیزنل ایونٹ میں دیکھا تھا۔آج میرے بوتیک میں آ کر اس نے مجھ سے تمہاری سائننگ کے حوالے سے بات کی ہے۔میں نے اسے ہاں کہہ دیا ہے۔اور مجھے وشواس ہے کہ تم منع نہیں کرو گی۔"

یہ انکشاف کر کے انہوں نے گویا کوئی بم پھوڑا تھا۔

"واٹ......رئیلی۔۔۔؟؟؟ کانٹ بیلیو دس۔۔۔"

وہ دونوں یکبارگی ساکت ہوئی تھیں۔

ایک دوسرے کو دیکھتی ان کی نگاہیں بالکل جامد تھیں۔

شیتل نے چند لمحات خاموش رہ کر ان کا تحیّر دیکھا اور پھر مزید بولیں۔

"ہاں بابا۔۔۔واستو میں۔ دھن راج ورما کا کہنا ہے کہ ایک ماہ کے شارٹ ٹائم میں تمہیں اس فلم کے لیے تیار کیا جائے گا اور پھر وہ فلم آن فلور جائے گی۔ میں نے طے کیا ہے کہ تم انڈسٹری جوائین کر رہی ہو اور نازنین تمہاری سیکرٹری رہے گی۔ تم کسی سے معاملہ کرنے یا لنکس بڑھانے میں کوری ہو۔ یہ سب ناز دیکھے گی۔ تمہارا اکاؤنٹس بھی سارا ناز ہی مین ٹین کرے گی سدا۔ ویل تو کیا کہتی ہو تم دونوں......؟؟"

ساری تفصیلات سے آگاہ کر کے انہوں نے ان سے رائے طلب کی۔ جبکہ ان کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سب کچھ پہلے سے طے کر چکی ہیں۔

"ہم کیا کہیں گی آنٹی۔۔۔؟ انکار ممکن ہی نہیں۔ یہ سب تو بڑا۔۔۔رومانچک ہے۔"

ناز کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں اب تک بے یقینی ناچ رہی تھی۔ گیتی کے دلآویز لبوں کے فسوں خیز دھاروں پر ایک دلنشین مسکان کا رقص طاری ہوا۔

اسے لگا کہ بچپن میں سنی تمام کہانیوں کا ہر کردار اس کے اندر پوری شدت سے جاگ اٹھا ہے۔

کہ جیسے ساری سسیاں، ہیریں اور لیلائیں بھی۔۔۔اس میں لوٹ آئی ہوں۔

کچھ دیر پہلے ڈیزائینر بننے کا خواب سجانے والی گیتی کو اس پل اپنا وہ خواب بہت چھوٹا لگا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقدیر میں درج "حقائق" کے سامنے ہمارے سارے "خواب" چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔

کبھی کبھی ہم اپنے مقدر سے بہت تھوڑا مانگ کر بھی اس پر بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ تقدیر اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ ہم پر پوری شدت سے آشکار ہو جاتی ہے۔ کچھ بھی نہاں باقی نہیں رہتا۔ دینے والا ہمیں ہمارے افکار سے کہیں بلند شے سے نواز دیتا ہے۔ تب ہم اس قدر حیران ہوتے ہیں کہ اپنا آپ بھولنے لگتے ہیں۔ ہم مدہوش ہوئے جاتے ہیں۔

وہ دونوں بھی انہی احساسات میں گھل رہی تھیں۔

اسی دوران وہاں ملازمہ چائے کی ٹرالی لیے حاضر ہوئی۔

"یہیں چھوڑ دو میرے پاس گل۔۔۔اور تم جاؤ۔"

شیتل کا حکم پا کر گردن کو تعمیل کا خم دیتے ہوئے اس نے ٹرالی چھوڑی اور واپس چلی گئی۔

شیتل نے چائے بنانے کو ہاتھ بڑھایا تھا کہ گیتی کو سرشار ہوتا دیکھتی ہوئی ناز فوراً اٹھی۔

"میں بناتی ہوں آنٹی۔۔۔لیو اٹ۔"

اس نے کہا اور نیچے قالین پر دوزانو بیٹھ گئی۔

ٹرالی سے سرو کرتے وقت وہ عموماً ایسے ہی بیٹھتی تھی۔

"کچھ بولو بھی گیت۔۔۔آنٹی ویٹ کر رہی ہیں۔"

اس نے کپ تیار کر کے شیتل کو پکڑاتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ بھی اپنے "کرداروں" سے باہر آ گئی۔

"ایم ٹوٹلی بلینک۔۔۔اینڈ شاکڈ ٹو۔۔۔کیا کہوں۔۔۔؟؟ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ بس یہ کہ میں شاید بہت۔۔۔خوش ہوں۔نہیں نہیں۔۔۔میں اوشیہ بہت خوش ہوں۔ یہ سچ میں کسی حسین خواب سے بھی پرے کی

بات ہے۔تھینک یو سو مچ ماما۔۔۔آئی وڈ لو ٹو ایکٹ ایور۔۔۔ایز آئی لو۔اٹس آسم رئیلی۔۔۔بی یونڈ مائی تھاٹس۔۔۔اٹس سپرب۔۔۔یہ واستو میں بڑا کالپنک ہے۔"

جو بھی اس کے منہ میں آیا بے ربط الفاظ میں وہ بولتی چلی گئی۔

اس کا چہرہ "ہزار رنگ" ہو گیا۔

کب سے اس کے جواب کی منتظر شیتل نے ایک طویل سانس خارج کیا اور جوش کے ساتھ دائیں انگوٹھے کو " گڈ" کا نشان بنا کر اسے وش کیا۔

"واؤ۔۔۔یو آر گریٹ پیاری گیتی۔۔۔آئی لو یو سو مچ۔۔۔"

ناز نے اس کو دینے کے لیے تیار کیا گیا کپ وہیں ٹرالی میں رکھا اور اٹھ کر بھاگتی ہوئی اس کے گلے آ لگی۔

"افففف ناز۔۔۔پگلا گئی ہو کیا۔۔۔جن ہو پوری۔۔۔واستو میں۔۔۔اینڈ آئی لو یو ٹو۔۔۔"

اس اچانک "افتاد" پر گیتی نے مصنوعی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا اور ہنستے ہوئے اسے اپنے ساتھ بھینچ کر بولی۔

ان دونوں کی باہم لگاوٹیں دیکھتی شیتل مسرور اور مطمئن ہو کر بس مسکرائے جا رہی تھیں۔

پھر چائے پینے کے دوران اور بعد بھی انہوں نے اسی موضوع کی جزئیات و تفصیلات کو بڑی دیر تلک اور بار بار ڈسکس کیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ چند قدم ہی سفیر کی طرف بڑھا ہو گا کہ اپنے نام کی پکار سن کر یکا یک رک گیا اور آواز کی سمت دیکھا۔

ڈیپارٹمنٹ کی داخلی سیڑھیاں اتر کر، ہاتھ ہلاتی ہوئی ثومیہ اسی جانب آ رہی تھی۔اس نے دیکھا کہ سفیر بھی ادھر متوجہ ہوا اور پھر باری باری ان دونوں کو دیکھ کر اس نے رخ پھیر لیا تھا۔

"اکڑ نہیں گئی جناب کی اب تک۔۔۔جانے کس مٹی سے بنا ہے یہ نمونہ۔۔۔"

خود کلام ہو کر ثومیہ کو آتے دیکھتا، وہ اس کا منتظر ہوا۔

"السلام علیکم۔۔۔کیسے ہو مصطفین؟؟"

قریب پہنچ کر وہ خوشدلی سے بولی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔میں ٹھیک ہوں بالکل۔۔۔شکریہ۔تم کیسی ہو؟؟دوڑ کر آئی ہو کیا؟؟"

اس کے ہانپنے سے وہ جان گیا تھا کہ وہ بھاگ کر آئی ہے۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔۔۔اور ہاں۔۔۔بھاگ کر آئی ہوں۔"

کمر کی اطراف کو ہاتھوں سے دباتی وہ اثبات میں سر ہلانے لگی تو وہ حیرت سے بولا۔

"لیکن کیوں۔۔۔؟؟کیا ضرورت درپیش تھی؟"

یہاں رک کر اس نے سوالیہ نظروں سے پہلے اسے اور پھر اپنی بائیں جانب، کچھ فاصلے پر موجود سفیر کو دیکھا۔

وسیع صحن کی طویل کیاریوں میں سے ایک پر جھکا وہ "سفید گلاب" کے پودوں سے کچھ "چھیڑ چھاڑ" کر رہا تھا۔اس جانب پشت ہونے کے باعث وہ سمجھ نہیں سکا کہ وہاں جھکا وہ کیا کر رہا ہے؟؟

"اوہ۔۔۔تو تم اس لیے آئی ہو کہ کہیں "میں" اس ٹارزن سے لڑنے نہ لگوں۔۔۔؟؟اب سمجھا۔۔۔"

اس کا شریر لہجہ، اسرار بھانپ کر کوئی راز پا لینے جیسا تھا۔

ثومیہ کے تاثرات دیکھ کر وہ ساری صورتحال سمجھ گیا تھا۔

اس کی بات سن کر وہ نرمی سے مسکرائی۔مصطفین کو لگا کہ آس پاس موجود سارے سفید گلابوں پر کسی نے "سرخیاں" چھڑک دی ہیں۔

اس کی مسکراہٹ بڑی فسوں خیز تھی۔

"نہیں۔۔۔میں اس لیے آئی ہوں کہ کہیں تم "دونوں" ہی "سپر مین وِل" کا مظاہرہ نہ کرنے لگو۔تم دونوں کی گزشتہ "ملاقات" کا سارا منظر مجھے "ازبر" ہے۔"

اس کا لہجہ شوخ تھا۔

"اچھا۔۔۔تو کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں؟؟"

وہ جرح کرنے لگا۔

"ہاں۔۔۔یا شاید نہیں۔۔۔دراصل پتا نہیں۔۔۔میں نے بس وہاں کھڑکی سے تمہیں یہاں رکتے دیکھا تو

اسی ڈر سے دوڑی چلی آئی۔"

اس کا لہجہ "دورائے" کا شکار ہونے جیسا تھا۔

ہاتھ جھلا کر دور راہداری کی کھڑکیوں کی جانب اشارہ کر کے وہ پوری بات بول گئی۔

"ویل۔۔۔تو تمہارے یہاں آنے تک میں اگر اس ہیرو کے دانت وانت توڑ چکا ہوتا تو پھر۔۔۔؟ کیا کرتیں تم؟؟؟"

زیرِ لب مسکراتا وہ اس کی حالت کا حظ اٹھانے لگا۔

اس کی شرارت بھانپ کر وہ دوبارہ مسکرائی۔

"تو یہ بتیسی جو تم نکال رہے ہونا۔ سلامت یہ بھی کوئی نہیں رہنی تھی۔ وہ بھاری بھاری مسلز دیکھ رہے ہونا اس کے؟ ایسے مواقع پر کام تو آتے ہی ہوں گے۔"

اس نے دوبدو لہجے میں اسے یوں دھمکانا چاہا گویا وہ واقعی اس سے لڑنے کے لیے رکا ہو۔

"اوہ۔۔۔ میں تو سچی بہت ڈر گیا ہوں۔ چلو اب اس سے نہیں لڑوں گا۔ لہٰذا تم فکر نہیں کرو اور جاؤ۔ میں اس سے مل کر آتا ہوں۔"

وہ خوش دلی سے ہنستے ہوئے بولا تو ثومیہ نے بغور اس کے لبوں پر تھرکتی ان "شوخیوں" کو جانچا۔ اس نے مصنوعی ڈر کا مظاہرہ کیا تھا۔

کل کی طرح آج وہ اسے "اداس، اداس" نہیں لگا۔

یقیناً اس پر دونوں روپ خوب، خوب جچتے تھے۔

خوشگوار بھی۔۔۔ اور سوگوار بھی۔۔۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی کہ جن پر ان کے مزاج کا ہر موسم۔۔۔ واقعی اچھا لگتا ہے۔

"نہیں تم رکو۔ میں پہلے تمہارے متعلق اس سے بات کر لوں۔ جب بلاؤں تب آجانا۔ پلیز۔۔۔ وہ ویسے ہی بڑا گرم دماغ ہے۔ کسی بات پر غصہ کر گیا تو پھر تمہارے ہر "مثبت" پہلو کو بھی "منفی" ہی لے گا۔"

بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھنے لگا تھا کہ اچانک اس نے بازو سے تھام کر اسے روک لیا۔ اس کے لہجے میں

عجب سی کوئی التجاء بھی تھی۔

گو کہ وہ سفیر سے ناراض تھی لیکن فی الوقت اسے سمجھا بجھا کر مزید کسی بھی قسم کی بدمزگی سے روکنا چاہتی تھی۔

سفیر کی گرم مزاجی سے متعلق لگائے گئے اس کے ہر "اندازے" میں کس قدر "صداقت" ہے۔؟ ان دونوں کو اس کا "ادراک" بالکل نہیں تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بھی شخصیت کے ظاہری تاثر کو ہم اس کی ذات کا "کل" جان لیتے ہیں۔ یہ ہماری سمجھ کا پھیر ہوتا ہے اور بس۔۔۔ ورنہ شخصیتوں کے حقائق تو ہمیشہ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کسی کی ذات کا "ظاہر"۔۔۔کبھی بھی "کل" نہیں ہوتا۔

اپنی کلائی پر اس کے نرم ہاتھ کی گرفت دیکھ کر مصطفین۔۔۔وہیں "جم" گیا تھا۔

اس کی دنیا ساکن تھی۔۔۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ جو کسی کے وقت کی "نبضیں" روک سکتے ہیں۔

"اوکے۔۔۔تم جاؤ پہلے۔"

اس کی بات مان کر وہ رک گیا تو "تھینکس" کہہ کر اس کے اطراف سے نکلتی وہ سفیر کے پاس جا رکی۔

"سفیر۔۔۔بات سنو۔۔۔"

اس کے بلانے پر، سفید گلاب کی ٹہنیاں پکڑے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی کی جھلک تھی۔ پھر ایک گلاب کی خوشبو سونگھ کر اس نے آہستگی سے اسے چھوڑ دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو آخر تمہیں خیال آ ہی گیا کہ تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیئے؟؟ پورے راستے میں تو تم یوں تھیں گویا چہرے پر پتھر توڑ رکھے ہوں۔"

مصافحہ کو ہاتھ بڑھا کر اس نے طنزاً کہا تو ثومیہ کی پیشانی پر بھی بے شمار بل ابھرے۔

"سارے راستے کی بات مت کرنا۔۔۔ سمجھے۔ بس میں کنڈیکٹر کی بات پر بڑی مسکراہٹیں جاگی تھیں تمہاری اس بری سی شکل پر۔ دل کر رہا تھا اس بدتمیز کی بجائے تمہارا منہ توڑ دوں۔"

دوبدو لہجے میں کہہ کر اس نے الٹے ہاتھ سے تھپڑ کا اشارہ کیا اور پھر مصافحے کو بڑھا اس کا ہاتھ تھام لیا۔

دوستوں میں اکثر ایسا ہوتا کہ سارے شکوؤں کے پورے اظہار ہو کر بھی "دوستی" باقی رہتی ہے۔ گلے اگر دوستوں سے ہوں تو۔۔۔دور ہو ہی جاتے ہیں۔

ان دونوں میں ہوئے اس تھوڑے اظہار سے ہی باہم در آیا سارا غبار چھٹ گیا تھا۔

اس کی بات اور تھپڑ کے اشارے پر بے ساختہ اس کے لب چٹکے۔ثومیہ کے انداز میں بے ساختگی تو تھی ہی عجب سا اک "استحقاق" بھی تھا۔

"اچھا۔۔۔چلو غصہ نہیں کرو۔یوں کرتے ہیں کہ پرانی ہر بات کو جانے دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔" اس کے ہاتھ پر نرم گرفت رکھ کر اس نے شائستگی سے اوپر نیچے جھلایا۔یہ عمل تعلق میں در آئی کسی گرمجوشی کا اظہار تھا۔

سفیر کو اس کا خود تک آنا بہت اچھا لگا تھا۔۔۔

بڑا من بھایا تھا۔۔۔

وہ ہمیشہ سے سب کی توجہ کا محور رہا تھا۔کل سے ثومیہ کی ہر بے رخی کہیں نہ کہیں اسے بہت کھل رہی تھی۔

"اوکے۔۔۔لیکن آئندہ ایسا کوئی واقعہ ہو کہ کوئی ہم پر طنز کرے تو تم پر واجب ہوگا کہ اس کے سارے دانت توڑ پھوڑ دو۔"

اس کے دوستانہ رویے پر وہ بھی خوش دلی سے مسکرائی۔

"ہاہاہا۔۔۔اوکے ظالم لڑکی۔ایسا ہی ہوگا۔بھئی میرے ان بھاری مسلز کی دھمکیاں تم لوگوں کو بھی دو اور میں ان کا استعمال ہی نہیں کروں۔یہ تو بہت غلط ہوگا نا۔۔۔"

تبھی اس کے شانوں سے اچک کر، کچھ فاصلے کھڑے مصطفین کو دیکھتا ہوا وہ اپنا کالر جھٹک کر بولا۔اس کی بات پر ثومیہ کی آنکھیں تحیّر سے پھیل گئیں۔یقیناً وہ ان کی ساری گفتگو سنتا رہا تھا۔

"اللہ۔۔۔تمہیں شرم نہیں آتی سفیر یوں کان لگا کر لڑکیوں کی طرح کسی کی گفتگو سنتے ہوئے؟؟ افففف کس قدر گھنے ہو تم۔اور میسنے بھی۔"

منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اسے شرم دلانا چاہی۔ وہ واقعی بڑی حیران ہوئی تھی۔

"چلو جی۔۔۔اب مجھ سے بمشکل پچاس قدم کی دوری پر رہ کر تم لوگ جو" گوہر افشانیاں" کر رہے تھے اس کا کچھ حصہ بھی میں نہیں سنتا۔۔۔یہ تو ناممکن سی بات ہے۔ویسے زیادہ پریشان مت ہو۔سب کچھ نہیں سنا میں نے۔ہاں مگر جہاں جہاں تمہارا اسپیکر لاؤڈ ہوا بس وہ۔۔۔تو کیا کہہ رہا تھا تمہارا نیا دوست؟؟"

اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے اپنے شانوں پر لٹکا یونیورسٹی بیگ دوبارہ سیٹ کیا اور حسین آنکھوں کے دلکش گوشوں میں شرارت بھر کر بغور اسے دیکھا۔

"اچھا جی۔۔۔اب اپنی صفائی میں تم کچھ بھی کہو میں تو فقط یہی کہوں گی کہ یہ عادت اچھی نہیں ہے۔اور ہاں میں جیسے بڑے راز برت رہی تھی اس سے جو تمہارے سن لینے سے بہت سی فکریں پال لوں گی۔ہونہہ۔۔۔"

اسے مزید چھیڑتے ہوئے اس نے آخر پر ناک سے گویا مکھی اڑائی تھی۔اس کے انداز پر وہ بے طرح ہنسا۔ ان کے تعلق میں در آیا سارا جمود بہہ گیا تھا۔

بے شک دنیا میں ایسے ہی تعلقات کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں جن کے حاملین باہم در آئے سرد رویہ جات سے چاہت کی گرمجوشی کشید کرنا جانتے ہوں۔انہیں اغلاط کی معافیوں کا ہنر آتا ہو۔

ان دونوں نے بھی اپنے سرد ہوتے تعلق میں ڈھکے "نرم احساسات" کو ہاتھ بڑھا کر چھو لیا تھا۔یقیناً اب ان کے تعلق کی زیست بڑھنے والی تھی۔

"وہ کل تم دونوں کے مابین ہوئی ساری بحث بھول کر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ابھی اسی وجہ سے وہ تمہارے پاس آنے والا تھا۔میں نے اسے روک لیا تاکہ پہلے تمہیں سمجھا سکوں۔اور اب میں اسے بلا رہی ہوں۔خیال رہے سفیر کہ یہاں اب مزید کوئی بھی۔۔۔تماشا نہیں ہو۔سمجھ گئے۔؟؟"

مصطفین کی یہاں موجودگی کا سبب بتا کر اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے تنبیہ کی تو اس نے کسی قدر چونک کر اسے دیکھا۔

وہ سمجھ نہیں سکا کہ اسے اس سے کسی "تماشے" کی امید کیونکر ہے؟؟

بہرحال خاموش رہ کر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دور کھڑے مصطفین کو بغور دیکھا۔

کل ذکیہ خاتون نے بھی اسے یہی سمجھایا تھا کہ اس کا رویہ زیادہ غلط تھا۔ وہ ان دونوں کی بات پر عمل کر کے "نتائج" دیکھنا چاہتا تھا۔ ہاں مصطفین کے لیے اس کا دل اب بھی لیکن "مطمئن" نہیں ہوا۔

ثومیہ نے بے یقین نظروں سے بظاہر اس کا "سرِ تسلیم خم" سا انداز جانچا اور پھر مڑ کر مصطفین کو آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بااعتماد چال چلتا ان کی جانب بڑھنے لگا تو وہ دل ہی دل میں "سب عافیت ہو" کی دعائیں مانگنے لگی۔

☆......☆......☆

ہم میں سے ہر ایک اپنی ذات سے وابستہ کسی نہ کسی "عجیب تر" پہلو میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری ذات سے وابستہ انہی "عجائبات" میں ڈھل کر ہم وہ کرنے لگتے ہیں جو ہم نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ ہم وہ بولتے ہیں جو ہم نہیں بولنا چاہتے۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن ہمارے تاثرات وعوامل پر ہمارا اختیار نہیں رہتا۔ ہمارے اندر غیر محسوس انداز میں پنپتی "انا" کی دیواریں بلند ہو کر "خود پرستی" کا ایک مضبوط ترین قلعہ بنا دیتی ہیں۔ اور اپنی خود پرستی کو "خودشناسی وخوداعتمادی" کا نام دے کر خود کو مطمئن کرتے ہوئے ہمیں ادراک بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے "اخلاق وکردار" کی دھجیاں بکھر چکی ہیں۔

وہاں بھی یہی ہوا کہ مصطفین کو آتے دیکھ کر سفیر نے دور سے ہی اسے اپنی بھرپور نظروں کے حصار میں لے لیا۔ ان دونوں سے چار قدم کے فاصلے پر پہنچ کر وہ رک گیا تھا۔ خود پر مرکوز اس کی بھرپور نظروں کے "اوزان" ماپنے کے لیے مصطفین نے بھی اس کے گرد اپنی عمیق تر نگاہوں کا "گھیر" پھیلایا۔ پھر یوں ہوا کہ "بلاارادہ" وہ ایک دوسرے کی نظروں کے "زاویے" پڑھنے لگے۔ "ناچاہ کر" بھی ایک دوسرے کا تفصیلی وتنقیدی جائزہ لینے لگے۔ باہم رو دونوں کا یہ انداز بہت پراسرار تھا۔

کبھی کبھی ہم اپنے مقابل کی شخصیت کو "تسلیم" تو کرتے ہیں لیکن اس کا "اعتراف" نہیں کرتے۔ اس کو اہمیت دینے سے خواہ مخواہ کترانے لگتے ہیں۔ ہمیں اس کی خصوصیات، حسن، یا صلاحیتوں کا اقرار کرنے میں بہت سا تامل ہوتا ہے۔ آسان زندگی گزارنے کے لیے ہمیں چاہیئے کہ اپنی خوبیوں پر کامل "یقین" رکھنے کے ساتھ ساتھ مقابل کی تمام صفات پر بھی مکمل "بھروسہ" کرلیں۔

ہم الگ ڈھنگ سے جینے لگیں گے۔۔۔

ہم نئے طور سے ابھریں گے۔۔۔

ان دونوں کا۔۔۔ یا ان میں سے کسی ایک کا مسئلہ یہی تھا کہ وہ اپنے مقابل کی خوبیوں کا اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دونوں کی شخصیت اس قدر شاندار تھی کہ ان کے "وجود" کا احساس اور اثر پورے ماحول پر طاری ہو گیا۔ ان کی دلنشین آنکھوں کے فسوں خیز کناروں سے نکلتی چاشنی کی لپٹوں سے سارا منظر "بھیگ" رہا تھا۔ ایک دوسرے کو مسلسل اور بڑے اعتماد سے وہ یوں تاک رہے تھے کہ گویا نظریں جھکا لینا کسی شکست کا اعلان ہو گا۔ انہیں یوں جامد دیکھ کر، محویت سے ان کی آنکھیں پڑھتی ثومیہ کو لگا کہ یونانی ماورائی قصوں کے دو حسین تر دیوتا، ساری کہانیوں کی ہر حد پھلانگ کر، ایک دوسرے کے مدمقابل آن ٹھہرے ہیں۔

اس نے دیکھا کہ کامل حسن کی پوری تاب کے ساتھ، وہ کردار "حقیقت" ہو گئے ہیں۔۔۔

اور وہ داسی نہ ہو کر بھی۔۔۔ فی الوقت "داسی" ہے۔۔۔

"السلام علیکم۔۔۔ کیسے ہو سفیر؟؟"

بالآخر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر مصطفین نے گفتگو میں پہل کی تو ایک آہ بھر کر، ثومیہ نے کب سے اپنے سینے میں "دھرا" طویل سانس خارج کیا۔

انہوں نے بات تو شروع کر لی تھی لیکن۔۔۔ "نگاہیں" اب تک ناں جھکی تھیں۔

مصطفین کی جانب سے ہوئے گفتگو کے آغاز پر، ایک پل کے لیے سفیر کے چہرے پر فاتحانہ تاثر جاگا اور پھر فوری معدوم ہو گیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور ٹھیک یقیناً تم بھی ہو۔ ہٹے کٹے اور فٹ فاٹ۔۔۔ دکھ تو یہی رہا ہے۔ ہاں۔۔۔؟"

اس کے ہاتھ پر مضبوط گرفت کر کے اس نے نہایت سختی سے دبایا اور پھر تمسخرانہ لہجے میں یہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتا مصطفین مبہم سا ہنس دیا۔ اپنے سادہ سے سوال کا ٹیڑھا میڑھا جواب پا کر اس نے ایک بار

پھراس کادماغ درست کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"ہاں۔۔۔میں سچ میں ہٹا کٹا ہوں۔اور سنو۔۔۔یہ "اپنی" طاقت کے "اظہار" کی کوئی کوشش تھی یا "میری" طاقت کی "جانچ" کے لیے کوئی کاوش؟؟ اسے بھلا میں کیا سمجھوں؟؟ میرے خیال سے یہ احساس کمتری کی ایک قسم ہے۔"

اپنا حال بتا کر جواباً اس نے، ہو بہو انداز میں اس کے ہاتھ پر اسی قدر "گرفت" کی تھی۔

اس کے چبھتے ہوئے الفاظ۔۔۔اور خنجر، نشتر لہجہ۔۔۔

یکا یک سفیر کی آنکھیں جلنے لگیں۔اب تک خاموش کھڑی ثومیہ کو لگا کہ وہ پھر سے لڑنے لگیں گے۔اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ ان کی ملاقات اور گفتگو اس نہج پر چلنے لگے گی۔

"گائیز میری بات......۔"

اس نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا تھا کہ دونوں نے بیک وقت ایک ایک بازو اس کی طرف پھیلایا اور ہاتھ کا پورا پنجہ کھولتے ہوئے اسے اپنے درمیان ہونے سے منع کر دیا۔انہوں نے اب تک ایک لمحے کو بھی ایک دوسرے کی آنکھوں سے۔۔۔"نظریں" نہیں ہٹائی تھیں۔

متحیر سی رک کر وہ ان دونوں، بظاہر "مخالفین" کے مابین پائی جانے والی باطنی "مماثلت" دیکھنے لگی۔۔۔ اسے روکنے کا ان کا انداز "ایک جیسا" تھا۔

"تمہارا ہاتھ تو میں نے بس یونہی دبایا تھا۔لیکن اگر تمہارے دل میں ایسی کوئی بات ہے تو جان لو کہ یہ صرف تمہاری ہی طاقت پر کھنے کی ایک کوشش ہو سکتی تھی۔۔۔کیونکہ اپنی طاقت کا اظہار میں ہمیشہ عین موقعے پر کرتا ہوں۔"

سفیر کا مضبوط لہجہ اکسانے والا تھا۔

"اچھا۔۔۔عجیب بات ہے پھر کہ اس کام میں ماہر ہو کر بھی تم یہ نہیں جانتے کہ مقابل کی حقیقی طاقت بھی ہمیشہ "موقعے" پر ہی عیاں ہوتی ہے۔کوئی پہلوان اکھاڑے سے باہر اپنی اصلیت کے بھید نہیں دیتا۔۔۔لہٰذا جب "موقعہ" آیا اس موضوع پر تبھی بات ہو گی۔۔۔فی الوقت بس یہ بتا دو کہ کیا تم سب کو اسی "لگاوٹ" سے

دیکھتے ہو یا مجھ میں کوئی "خاص" بات ہے۔؟؟"

اس کا ہاتھ جھنجھوڑ کر مصطفین اسی اعتماد سے بولتا چلا گیا۔اس سے بالکل خائف نہ ہو کر وہ باقاعدہ اسے چھیڑ رہا تھا۔اس کے حسین چہرے پر بلا کا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔

اس کی بات سنتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس نے نگاہ بھی پھیر لی۔

اس کی اضطراری حرکت پر اب تک فکر سے انگلیاں چٹخاتی ثومیہ کے لب پہلی بار چٹکے تھے۔

اور اس کے "یوں" نظر ہٹانے پر مصطفین پورے بدن سے ہنس دیا۔

سفیر دو قدم پیچھے ہٹ کر مڑا اور انہی کیاریوں کے پاس جا ٹھہرا۔

"چلو دکھاؤں گا تمہیں اپنی طاقت بھی میں۔اور اب کسی موقعے پر نہیں۔۔۔بلکہ کسی "اکھاڑے" میں۔اور ایک بات مجھے تم بھی بتاؤ کہ کیا تم سب سے یونہی بدتمیزی کرتے ہو کہ مجھ میں کوئی "خاص" بات ہے۔؟؟"

اسے گھور کر دھمکی آمیز لہجے میں کہتا وہ جھکا اور سفید گلاب کے گرد اگے کانٹے "چننے" لگا تھا۔

اس کی "بات" پر ہنستے مصطفین کی نگاہ اس کی "مصروفیت" میں الجھنے لگی تھی۔

بے تحاشا۔۔۔اور شدت سے۔۔۔

بالآخر اس نے جان لیا تھا کہ کب سے "سفید گلابوں" پر جھکا وہ "کیا" کر رہا تھا۔

اس کی زبان سے جاری گرم اذکار سے ہٹ کر اس کا عمل بڑا "حساس تر" تھا۔

"گلاب شاخوں سے ان کے "عذاب" چنتا شخص۔۔۔"

بے ساختہ اس کے دل نے اس کے لیے "عنوان" طے کیا۔

"ایک زمیندار کو "اکھاڑوں" سے نہیں ڈراؤ تم بھائی۔۔۔یہ گفتگو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔فی الوقت تم، مجھے بس یہ بتادو کہ تمہاری شکل ہی ایسی "جلی، کڑھی" ہے یا مجھے دیکھ کر کوئی خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔؟ مجھے ویسے یہی لگتا ہے کہ جان بوجھ کر بنا لیتے ہو۔۔۔"

جیسے تیسے کر کے اس کے ہاتھوں کی "حرکت" سے نگاہ "چرا" کر وہ اسے لاجواب کرنے لگا۔

ہاں اب کی بار اس کا لہجہ "برجستہ" تو تھا مگر پہلے کی طرح "دوٹوک" نہیں رہا۔وہ "سفید گلابوں" کے گرد

" بکھرے " کانٹوں میں اٹک گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ان کی " گفتگو " مزید طوالت اختیار کرتی، ان کے مباحثے سے اکتا کر ثومیہ بول پڑی۔

" اے اے رکو یار۔۔۔ کیا شے ہو تم دونوں۔۔۔ دماغ خراب کر لیتے ہو ایک دوسرے کا ایک منٹ میں۔ حد ہے بچپنے کی۔۔۔ کب سے دیکھ رہی ہوں کہ کر کیا رہے ہو؟ یہ ہو کیا رہا ہے؟ کوئی " دنگل " ہوا چاہتا ہے کیا؟؟ اور مصطفین یہ پہلوان، اکھاڑے کا یہاں کیسا ذکر؟؟ "

دونوں کو باری باری دیکھتی وہ ملامتی لہجے میں بولی۔ سفیر سیدھا ہو کر خاموشی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی کسی انگلی پر کانٹا چبھ گیا تھا اور ساری پوریں خون آلود ہو گئی تھیں۔ زخم شاید گہرا تھا۔

اس کی " لال پوریں " دیکھتا مصطفین شائستگی سے بولا۔

" مجھے اس کا افسوس ہے ثومیہ۔ اور میں معذرت خواہ بھی ہوں۔ لیکن میرے حال پوچھنے پر اس کے الٹے جواب نے مجھے مجبور کیا کہ میں ایسا رویہ اپناؤں۔ ورنہ تم جانتی ہو میں کس نیت سے آیا تھا۔ "

اس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو متوازن رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے " عوامل " دیکھ کر اس کا لب و لہجہ بتدریج نرمی میں ڈھلا تھا۔

لیکن سفیر جو کہ اب تک بہت زچ ہو چکا تھا تیزی سے بولا۔

" کیا چیز ہے یار یہ۔۔۔؟؟ کہاں سے آیا ہے۔۔؟؟ کیوں لائی ہو اسے میرے پاس؟؟ بحث۔۔۔ در بحث۔۔۔ در بحث۔۔۔ کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور تم کہہ رہی تھیں کہ یہ صلح کرنے آیا ہے۔ ایسے ہوتی ہیں صلحیں؟؟ یہ مجھے پاگل کر دے گا۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔ بلکہ تم دونوں رکو میں ہی چلا جاتا ہوں۔ "

اس کا نرم لہجہ مکمل طور پر نظر انداز کر کے وہ قنوطیت سے بولا اور پھر کسی کے بھی بولنے سے پیشتر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

اس کا رخ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف تھا۔

مصطفین نے دور تلک بے بس نظروں سے اس کی چوڑی پشت کو دیکھا اور پھر بغور خود کو دیکھتی ثومیہ کو دیکھ کر شانے اچکا دیے۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو " سمجھ " نہیں سکے۔

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر ثومیہ نے اپنا سر تھام لیا۔ان دونوں کے مابین صلح کی اس کی پہلی کوشش بری طرح ناکام رہی تھی۔

☆......☆......☆

سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ انہیں اس پر زیادہ سوچنے کا موقع نہیں مل سکا۔دھن راج ورما سے اس سلسلے میں ہوئی پہلی باقاعدہ ملاقات میں وہ اس کو اور اچھی لگی تھی۔اسے اپنی نئی فلم "رنگ راس" میں خوبصورت "گائیکہ" کا طرح دار" کردار" نبھانے کے لیے جس طرح کی ہیروئین درکار تھی گیتی اپنے قدرتی انداز و اطوار و رویہ جات میں ہی اس کے قریب تر تھی۔دھن راج ورما بہت خوش تھا کہ اسے اس پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

اور وہ بس حیران تھی کہ کس قدر آسانی سے اسے یہ فلم مل گئی۔بنا کسی کاوش یا کوشش کے۔

زندگی بالکل ایک نئے طور سے شروع ہوئی تھی اور اس کا ہر انگ گیتی کے لیے بے حد انوکھا تھا۔اس کے شب و روز باہم یوں ملے کہ وقت برابر ہو گیا تھا۔کب دن چڑھا، کب رات ہوئی۔۔۔؟؟ اسے کچھ خبر نہ رہی تھی۔

صبح سویرے یوگا اور جم، پھر ڈائیٹ پلان کے مطابق ناشتہ، پھر پارلر، اس کے بعد اسٹوڈیو جانا، ریہرسلز، ڈانس کلاس، گائیکی کلاس، شام میں کردار کی مطابقت سے مختلف فلموں کے کلپس دیکھنا، گھر میں پریکٹس کرنا، اور کئی دیگر متعلقہ مصروفیات۔۔۔اسے کسی شے کا ہوش نہیں رہا۔

جوں جوں شوٹنگ کا وقت نزدیک آ رہا تھا توں توں اس کی جان فشانی بڑھ رہی تھی۔گیتی کی کاسٹنگ کا باقاعدہ اعلان اب تک نہیں کیا گیا تھا اور اسے بھی ہدایت تھی کہ کسی بھی فلم ریلیٹڈ پرسن سے اپنی سائننگ کا ذکر مت کرے۔چونکہ فلم انتہائی قلیل وقت میں آن شوٹنگ فلور جا رہی تھی لہٰذا ورما ایسا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا کہ گیتی کا دھیان بٹ جائے۔فلم کی پہلی شوٹنگ کے بعد ہی فلم کی مین لیڈ ہیروئین کے طور پر میڈیا سے اس کے باقاعدہ تعارف کا پلان بنایا گیا تھا۔

دھن راج ورما جیسا غیر معمولی ڈائریکٹر کسی نئی اداکارہ کو لانچ کرنا چاہے اور انڈسٹری میں ہلچل نہ ہو۔۔۔ایسا

ممکن ہی نہیں تھا۔ انڈسٹری پیپل، میڈیا کنسرنز، صحافی اور سب سے بڑھ کر ساری ادا کارائیں۔۔۔ ہر کوئی اس کے متعلق متجسس تھا۔ ہر کوئی جاننا چاہتا تھا کہ آخر کون ہے؟ جو دھن راج ورما کی منظورِ نظرِ کرم ہوئی ہے۔

ورما کو فلم انڈسٹری میں سب "سر" کہہ کر بلاتے تھے۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کا ذکر اسی لفظ سے ہوتا تھا۔ اور اس کے بارے مشہور تھا کہ وہ جس بھی نئی ہیروئین یا نئے ہیرو پر چھایا کر دے اس کی شہرت یقینی ہو جاتی ہے۔ ورما کی ایک خاص بات یہ بھی تھی اسے جس کردار میں جو فرد چاہیئے ہوتا تھا وہ کئی سالوں تک اس کا انتظار کر کے بھی فلم صرف اسی کے ساتھ بناتا تھا۔ ایسی کئی مثالیں تھیں اس کے متعلق کہ جب اس نے من پسند اداکار یا اداکارہ کے لیے دو دو سال بھی۔۔۔ لیکن انتظار کیا تھا۔

انڈسٹری کی معروف اور بہترین کلاسیکل فلمیں اس کے کریڈٹ پر تھیں۔ ایک زمانہ اس کی ڈائریکشن سکلز کا معترف و قائل تھا۔

اب بھی ہر طرف بس اسی کی آنے والی فلم اور ممکنہ نئی ہیروئین کی دھوم تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے اندازے لگا رہا تھا۔

بھانت بھانت کی خبریں تھیں۔۔۔

اور کئی طرح کی بولیاں۔۔۔

گیتی سامنے نہ آ کر بھی مشہور ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بھی خبروں میں روز یہ سب کچھ دیکھتی اور پڑھتی تھیں۔ ان کے لیے یہ سب انتہائی خوش کن تھا۔

شوٹنگ کی شروعات سے دس دن پہلے ایک صحافی کو جانے کیسے گیتی کی سیلیکشن کی بھنک پڑی اور اس نے اپنے چینل سے یہ نیوز بریک کر دی کہ۔۔۔

"جانے مانے نیتا وجے کمار اور بالی وڈ ڈریس ڈیزائنر شیتل کی اکلوتی بیٹی" گائیتری دیوی" دھن راج ورما کی اگلی فلم کی متوقع لیڈنگ لیڈی ہو سکتی ہے۔۔۔"

اس خبر کا چلنا تھا کہ گیتی کا جینا دوبھر ہو گیا۔ میڈیا ہاؤسز، نیوز چینلز کے نمائندگان اور دیگر انڈسٹری ریلیٹڈ پرسنز۔۔۔ ہر کوئی اس کی مصروفیات اور شیڈول کی کھوج میں لگ گیا۔ یہ بات بذاتِ خود سب کے لیے اہم تر تھی

کہ وجے کمار اور شیتل کی بیٹی فلم انڈسٹری جوائین کر رہی ہے۔ وہ ایک مشہور گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

اب عالم کچھ یوں تھا کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی صحافی اس تک رسائی حاصل کر کے اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ دھن راج ورما نے اسے اپنے گھر تک محدود رہنے کا کہہ دیا تھا۔ اس کے لیے تمام تر ٹریننگز اور جم کا بندوبست اس کے گھر میں ہی کر دیا گیا۔ گیتی ایک بار تو اپنا آپ بھول کر دل جمعی سے بس اسی کام کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے آس پاس، ارد گرد اور سارے میں کیا کیا کچھ ہو رہا ہے اسے اس پر سوچنے کے لیے ذرا بھر فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔

زندگی نے اسے اس کے خوابوں سے کہیں زیادہ عطا کیا تھا۔

وہ بے انتہا مسرور تھی۔۔۔

اس کا اندرون پل پل۔۔۔ ہر پل سرشار در سرشار ہوا جاتا تھا۔

خیر باقی ماندہ ایام بھی گذر گئے اور فلم کی شوٹنگ کا پہلا دن آن پہنچا۔ میڈیا پیپل کو پہلے سے خبر تھی کہ "رنگ راس" کا باقاعدہ آغاز ہو رہا ہے اور فلم میں گیتی کے ہیروئین ہونے کا بھی خوب چرچا تھا لہٰذا تمام انٹرٹینمنٹ چینلز کی خواہش تھی کہ اس کے ہیروئین ہونے یا نہ ہونے کی مصدقہ اطلاعات وہی جاری کرے۔ صبح ہی صبح ان کے بنگلے کے باہر اور شوٹنگ اسپاٹ پر مختلف چینلز کی وینز اور کئی صحافی آدھمکے۔۔۔ ان سے بچنے کے لیے اس نے بنگلے کا عقبی خفیہ دروازہ استعمال کیا تھا اور شوٹنگ اسپاٹ پر بھی اسے کسی خاص راستے سے لایا گیا تھا تاکہ شوٹنگ مکمل ہونے سے پہلے سیٹ پر اس کی موجودگی یا غیر موجودگی سے متعلق پیدا ہوئے تجسس کو مزید ہوا ملے۔ فلم کے سیٹ پر کسی غیر متعلقہ فرد کو داخلے کی اجازت نہیں تھی اور جنہیں اجازت تھی انہیں بھی اس بات کا سختی سے پابند کیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی قسم کا کوئی بھی کیمرہ یا سیل فون ساتھ نہیں لا سکتے۔ ہیروئین کو یوں آخری لمحوں تک چھپا چھپا کر رکھنا دھن راج ورما کا ایک پبلسٹی سٹنٹ تھا۔ اس کی سلیکشن سے لے کر ٹریننگ تک کے ہر ہر مرحلہ و موقع پر ناز اس کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ وہ اس سب صورتحال سے گیتی سے زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔

وہ دونوں سیٹ پر پہنچیں تو دھن راج ورما خود انہیں ریسیو کرنے آگے تک آیا۔ ہیروئین کی آمد پر مٹھائی بانٹی گئی اور ناریل توڑ کر اس نے سیٹ پر پہلا قدم رکھا۔ فلم کے ہیرو سے اس کا تعارف ہوا تو اس نے بھی اسے خلوصِ

دل سے خوش آمدید کہا تھا۔ ہیرو کی اس سے پہلے بس تین فلمیں ریلیز ہوئی تھیں اور تینوں سپر ہٹ تھیں۔ گیتی کو ہنس مکھ سا وہ لڑکا اچھا لگا تھا۔ جلد وہ باہم گھل مل گئے۔ ڈائریکٹر نے دونوں کو ایک بار پھر اپنے اپنے کردار کی جزئیات وتفصیلات بتائیں اور کرداروں کے آپسی رویہ جات وانداز واطوار کی "حدود وقیود" سمجھائیں۔

پورا مہینہ فلم اسکرپٹ کو بار بار پڑھنے کی وجہ سے اسے اپنے کردار کی ساری جزئیات زبانی یاد تھیں۔ ریہرسل کے دوران بارہا اس کردار کو اس نے اپنے اندر بچپن سے بسی ایک اداکارہ کے حوالے کیا تھا۔ اب اس کی ذات میں پوشیدہ وہی اداکارہ اس کردار کو سب کے سامنے ادا کرنے کے لیے شدید بے چین تھی لیکن ورما نے اپنے طور پر سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے دن صرف ایک گانے کا کچھ حصہ شوٹ کرنے کا پلان بنایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کرداروں کے باہم مکالمے تب شوٹ کیے جائیں جب دو تین شوٹنگز کے بعد گیتی کیمرے سے مانوس ہو جائے۔ یہ سیٹ کسی قدیم عمارت کا تھا اور سین کچھ یوں تھا گیتی کو مختلف شکستہ دیواروں سے لگ کر چہرے پر غمگین تاثرات سجائے ہیرو کے فراق میں ایک اداس گانا گانا تھا۔ جبکہ ہیرو کو اس گانے میں گیتی کے آس پاس بس ایک "یاد" کی مانند موجود رہنا تھا۔ گیتی کو یہ بہت آسان لگا۔

شوٹنگ کے لیے باقاعدہ تیار ہو کر وہ وینٹی وین سے باہر آئی تو ہر کوئی اس کی پروقار جھلک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجب سا اور بلا کا یقین بھرا تھا تو چال بے حد پراعتماد تھی۔

شوٹنگ شروع ہوئی تو ڈائریکٹر کی ساری ہدایات کو اس نے مکمل بیان ہونے سے پہلے سمجھا اور پھر تیزی سے ان پر عمل بھی کیا۔ اس کا پہلا سین پہلے ہی شاٹ میں اوکے ہو گیا تھا لیکن ورما نے کاملیت کے لیے تین سے چار بار اسے ری ٹیک کیا۔ ہر بار گیتی کی اداکاری عروج پر رہی۔ اس کا اعتماد قابلِ دید تھا۔ ورما نے بڑے فخر سے اپنی اس دریافت کو دیکھا کہ اس کا انتخاب کسی طور بھی غلط نہیں تھا۔ اس نے اسے سراہنے کے لیے پورے یونٹ کریو سے تالیاں بھی بجوائیں۔ وہ ایک سخت گیر ڈائریکٹر کے طور پر مشہور تھا اور لوگ کہتے تھے غصے میں آ کر وہ اداکاروں پر بہت چیختا چنگھاڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تو وہ بالکل نارمل تھا اب تک۔ وہ بہت کمفرٹیبل تھی۔ فلم کا ہیرو بھی اس کی اداکارانہ صلاحیتوں سے ازحد متاثر ہوا تھا اور اس نے کھل کر گیتی سے اس کا اظہار بھی کیا۔ گیتی کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نازاسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس کے اعتماد کا کمال تھا کہ دھن راج نے اس

کی فرمائش پر اسی سیٹ پر دو سین ڈائیلاگز کے بھی شوٹ کیے۔ان میں بھی اس نے کسی منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح بالکل حقیقت کے رنگ بھرے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے اداکاری کرتے ہوئے وہ بھول ہی جاتی ہے کہ کیمرے کے سامنے کھڑی ہے۔اس کی ڈائیلاگ ڈیلیوری کمال تر تھی۔بالکل رواں اور سہل۔۔۔زبان و بیان و انداز پر تو گویا اسے مکمل عبور حاصل تھا۔

تین ڈریسز اور میک اپ بدل کر بالآخر پہلے دن کی شوٹنگ مکمل ہوگئی۔تب تک وہ بہت تھک چکی تھی۔

سہ پہر چار بجے تک جاری رہنے والی اس شوٹنگ میں دو دفعہ آدھے آدھے گھنٹے کا بریک لیا گیا تھا۔دورانِ وقفہ ناز نے اسے سیٹ پر موجود افراد کے اس کی ایکٹنگ سے متعلقہ حوصلہ افزا تاثرات بتائے۔سب اس سے متاثر ہوئے تھے۔بے شک وہ بنی بنائی اور پیدائشی اداکارہ ثابت ہوئی تھی۔۔۔

اس دن کی شوٹنگ مکمل ہوئی تو کچھ دیر آرام کرنے کے بعد،فلم کی ہیروئین کے طور پر اسے اپنے پہلے میڈیا انٹروڈکٹو سیشن کے لیے نئے سرے سے تیار کیا گیا۔اس تیاری میں اس کے فلمی کردار کی ادا و نزاکت کا خصوصی دھیان رکھا گیا تھا۔خوبصورت وہ پہلے بھی بہت تھی لیکن دورانِ تربیت اس کے حسن کی مسلسل حفاظت نے بلاشبہ اسے چار چاند لگا دیے تھے۔اس پر اس کے دلکش انداز و اطوار ایسے نمکین تھے کہ جو جو بھی دیکھتا تھا بس "مبہوت" ہوا جاتا تھا۔

شوٹنگ اسپاٹ سے لگ بھگ پندرہ میٹر کے فاصلے عارضی طور پر تیار کیا گیا،سجا سجایا ایک تعارفی اسٹیج ان کا منتظر تھا۔

کامل حسن کی پوری تاب کے ساتھ اسے میڈیا نمائندگان کے روبرو لایا گیا۔

نرمی سے پاؤں رکھتی وہ گویا بادلوں پر چل کر اس اسٹیج پر جلوہ نما ہوئی تو آس پاس رقصاں سارے "لمحات"۔۔۔ایک پل کے لیے بالکل "تھم" گئے تھے۔اس کے دلپذیر سراپے کا فسوں ہر کسی پر طاری ہو گیا۔

ورما نے اس کا تعارف کروا کر مائیک اس کے حوالے کیا تو اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔وہ خوشدلی سے مسکرا مسکرا کر سب کو جوابات دیتی رہی۔کئی لوگوں نے اسے کنفیوژ کرنے کی کوشش بھی کی۔یہ صحافیوں کی عادت ہوتی ہے کہ نئے اداکاروں کا حوصلہ آزماتے ہیں۔کئی سوالات پر تو دھن راج ورما کو بھی لگا کہ وہ گھبرا

جائے گی لیکن اس نے ہر کسی کو عمدگی سے ڈیل کیا۔اس نے بڑے سکون سے سب کی سب باتوں کا تسلی بخش جواب دیا تھا۔وہ کسی کو بھی کسی بھی طرح ایک "نوآموز" اداکارہ نہیں لگی تھی۔

اس کا ہر انداز منجھے ہوئے اداکاروں سا تھا۔

ہاں وہ منجھی ہوئی اداکارہ ہی تو تھی۔

وہ سب کی باتیں بغور سن کر چہرے کے کئی دلکش زاویے بناتی تھی۔۔۔

وہ سوال در سوال اٹھاتی تھی۔۔۔

وہ ہموار لہجے میں متوازن باتیں کرتی تھی۔۔۔

وہ باری باری لیکن وہاں موجود ہر ایک سے نظر ملاتی تھی۔۔۔

اس کی ساحر آنکھوں پر تنی کالے ابروؤں کی دلنشین تان بلا کی جاذب تھی۔

اس کا لہجہ بے مثال تھا تو برجستگی قابلِ دید۔۔۔

اس کے لفظ باکمال تھے تو ادائیگی قابلِ داد۔۔۔

اسے چھانا ہی تھا۔۔۔

اور وہ چھا گئی تھی۔۔۔

پہلے ہی میڈیا سیشن میں اس نے انڈسٹری کے "بڑے بڑوں" کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

کسی کی نیند اگر اس نے فقط "چرائی" تھی تو کئی ایک کی "اڑا" بھی دی تھی۔

ورما بہت خوش تھا۔اس کی سٹریٹیجی کامیاب رہی تھی۔ہر طرف بس انہی کا شور تھا۔

"دھن راج ورما کی آنے والی فلم "رنگ راس" کے لیے متعارف ہوئی بالکل نئی اداکارہ "گائیتری"۔۔۔ حقیقی طور پر "دیوی" ہے۔"اس دن کے الیکٹرانک اور اگلے دن کے پرنٹ۔۔۔تمام اقسام کے انٹرٹینمنٹ میڈیا کی یہ شہہ سرخی تھی۔پھر یوں ہوا کہ اس میڈیا ٹالک کے بعد وہ اس ہفتے کی سب سے زیادہ گوگل سرچ کی جانے والی ہستی بن گئی۔

☆......☆......☆

پرسوچ انداز میں راہداری کی دیوقامت کھڑکی سے لگ کر کھڑی مریم ان تینوں کی ساری حرکات وسکنات کا گویا لفظ لفظ "پڑھ "رہی تھی۔اس نے بغور ثومیہ کے پہلے مصطفین اور پھر سفیر کے پاس جانے کو "جانچا" تھا۔ پھراس نے ثومیہ کے بلانے پران دونوں کا" آمنے سامنے "ہونا بھی اچھی طرح "پرکھا" تھا۔

گوکہ وہ ان کی آوازیں نہیں سن سکتی تھی۔لیکن ان کے تاثرات نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

ان کا ہر ہر انداز اور سارے اطوار، وہ "دیکھ "تو رہی ہی تھی۔۔۔"بھال" بھی رہی تھی۔

بینچ پر بیٹھی گپ شپ کرتی اس کی ساتھی لڑکیوں نے کافی دیر بعد اس کی طرف دھیان کیا۔

محویت سے اسے باہر دیکھتا پا کر انہوں نے ایک دوسرے کو اس کی "عدم موجودگی" کا اشارہ کیا اور پھر ان میں سے ایک اٹھ کر اس کے ساتھ جا رکی۔

مریم نے ایک پل کے لیے رخ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر باہر دیکھنے لگی تھی۔

باہر ان تینوں کی ملاقات کا"سلسلہ "اب بہت دلچسپ "مرحلے "میں داخل ہو رہا تھا۔

ایک دوسرے کو مسلسل" گھورتے "مصطفین اور سفیر نے ہاتھ پھیلا کر اپنے درمیان ہوتی ثومیہ کو ابھی ابھی روکا تھا۔

اس کے پاس آن کھڑی ہوئی اس کی ساتھی لڑکی نے پہلے یہ "منظر "اور پھر مریم کے ماتھے پر درج "لکیرِ فکر" کو دیکھا۔

"ایک نئی کہانی کی "شروعات "دیکھ رہی ہو کیا؟؟"

اس کا مشتاق لہجہ بہت متجسس بھی تھا۔

اس کی بات پر ساکت کھڑی مریم کے لب چٹکے۔

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے سفیر کے مصطفین کے سامنے سے ہٹ کر کیاریوں تک جانے کا منظر دیکھا اور پھر وہیں کھڑکی سے پشت ٹکا کر اپنا رخ اس کی جانب پھیر لیا۔

باہر کا سارا منظر اس لڑکی کی سوالیہ نظروں میں "تیر "تو رہا ہی تھا۔۔"ناچ" بھی رہا تھا۔

اسے لگا کہ اب "اور" چھپانے کا مطلب اس قصے کو "مزید" ہوا دینے جیسا ہے۔

قصوں کی یہ اولین خاصیت ہوتی ہے کہ یہ سارے "پردے" خود بخود پھلانگ لیتے ہیں۔۔۔

"ملفوف" لہجوں سے بھی عیاں ہو کر "واشگاف" ہونے لگتے ہیں۔

اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر وہ بھیدوں بھرے لہجے میں بولی۔

"اس" کہانی" کی شروعات تو میں کب سے دیکھ چکی ہوں چندا۔اب تو میں اس کا انجام "بھانپ" رہی ہوں۔تم بھی میری طرح بس دیکھتی رہو۔خاموش اور بالکل چپ رہ کر۔۔۔اس کہانی میں آگے بہت سے موڑ آنے والے ہیں۔"

بات مکمل کر کے اس نے اس کی کلائی پر ہاتھ دھرا تھا۔اس کے فسوں خیز انداز میں بندھ کر وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

باہر کھڑے وہ تینوں قطعاً بے خبر تھے کہ وہ تینوں کسی" کہانی" کے مرکزی" کردار" ہو گئے ہیں۔وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کی کہانی" زدِعام" ہو بھی گئی۔

اسے جواب دے کر مریم نے دوبارہ باہر جھانکا تو چونک گئی۔

سفیر اندر ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھ رہا تھا اور وہ دونوں وہیں رک گئے تھے۔

" آؤ یار وہیں بیٹھتی ہیں۔آج کلاس تو کوئی ہونی نہیں۔کچھ دیر تک ہاسٹل کے لیے نکلیں گی۔"

اس لڑکی کا بازو تھام کر وہ بھی واپس اس بینچ کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

راہداری کی داخلی سیڑھیاں پھلانگ کر وہ اندر آیا اور تیز قدموں سے چل کر اپنی کلاس کی جانب بڑھنے لگا۔

ابھی ابھی مصطفین سے ہوئے لمبے مباحثے کی وجہ سے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔اسے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ آج صبح ہی صبح اس سے دوبدو ہونے لگے گا۔اس ساری صورتحال کے اصل "موجب" ہونے کے اپنے" کردار" سے وہ سراسر بے خبر تھا۔

طویل راہداری میں لگے مختلف اونچے دروازوں میں سے ایک کے سامنے سے گزرتا،بالکل اچانک وہ رک گیا تھا۔راہداری کے غیر معمولی طور پر ویران ہونے کا"احساس وادارک" اسے بہت دیر سے ہوا۔اس نے

چونک کر یہاں وہاں مختلف اساتذہ کے کمروں کو لگے بڑے بڑے تالے دیکھے اور پھر اساتذہ کے کمروں کی قطار سے آگے، قفل بند لیکچر رومز پر نگاہ دوڑائی۔

"اوہ شٹ۔۔۔اتنی بارش میں کون "بیوقوف" آئے گا۔۔۔"

ہونٹ سکیڑتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کا مکا بنا کر اپنے دائیں ہاتھ پر مارا اور پھر فوراً سے پیشتر اپنے "جملے" میں موجود اپنی "حیثیت" کا احساس کر کے، کسی کے سن لینے کے ڈر سے اپنے آس پاس دیکھا۔وہاں کوئی نہیں تھا۔

کوئی سن لیتا تو یقیناً اس کا مذاق اڑاتا۔

پھر اس نے دور بینچ پر بیٹھ کر گپ شپ کرتی تین لڑکیوں کے گروپ پر سرسری نگاہ دوڑائی۔ان سے آگے راہداری کے آخری سرے پر وہاں دو لڑکے بھی موجود تھے۔وہ جانتا تھا کہ وہ سب اس کے کلاس فیلوز ہیں۔

لڑکیاں اسی کی طرف متوجہ تھیں جبکہ اس کی آمد سے بے خبر وہ دونوں لڑکے باہم "محوِ گفتگو" تھے۔

سفیر نے محسوس کیا کہ اسے دیکھ کر لڑکیوں نے آپس میں کوئی بات کی ہے۔اور پھر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر وہ بے تحاشا ہنسنے لگی تھیں۔

اس کی پیشانی پر بے شمار بل ابھرے۔

انہیں یکسر نظر انداز کر کے، وہ دور کھڑے لڑکوں سے کلاس کے متعلق پوچھنے کے لیے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔

"ساکت" آنکھیں۔۔۔"جامد" چہرہ۔۔۔وہ مکمل "پتھر" تھا۔

☆......☆......☆

"آہ۔۔۔جانے تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے اسے۔؟ سچی یہ ہرگز بھی ایسا نہیں ہے۔میں پہلے دن سے جانتی ہوں اسے۔یہ بہت اچھا لڑکا ہے۔بڑا اخلاق والا ہے۔میں اس کا یہ رویہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔"

بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں ترتیب دیتی ثومیہ نے سر اٹھایا اور متفکر لہجے میں گویا ہوئی۔

اسے بار دگر ہوئی ان کی تکرار کا بڑا قلق ہوا تھا۔

"میں خود تم سے شرمندہ ہوں ثومیہ۔ اب مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے تھوڑا برداشت کرنا چاہئیے تھا۔ لیکن اس وقت اس کا طنز سن کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ایم ریئلی سوری۔ بہت معذرت۔۔۔"

اسے پریشان دیکھ کر وہ متاسف لہجے میں بولا۔

اس بحث اور جھگڑے پر وہ واقعی بہت شرمسار تھا۔

"اٹس اوکے۔۔۔ جو بی ہیو کر کے جیسا آنسر اس نے تمہیں دیا۔ کوئی بھی ہوتا تو لازم ہے کہ یہی ری ایکٹ کرتا جو تم نے کیا ہے۔"

خفیف مسکراہٹ کے درمیان وہ سادگی سے بولی اور یونیورسٹی کے داخلی دروازے کی سمت دیکھا۔ لب بھینچ کر مصطفین نے بھی اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔

بارش رکنے کی وجہ سے دیر سے ہی سہی لیکن اب آہستہ آہستہ یونیورسٹی میں طلباء کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ گیٹ کے پار وسیع سڑک پر اور گیٹ کے اندر واقع پہلے احاطے میں بھی اب وہ کافی تعداد جمع تھے۔

ان دونوں نے مابین کچھ دیر خامشی نے رقص کیا۔

"کلاس کا وقت تو کب کا ہو چکا ہے۔ چلو۔۔۔ جانا نہیں کیا؟"

اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف قدم بڑھا کر اس نے ثومیہ کو مخاطب کیا۔

"آں۔۔۔ ہاں کیا کہا؟؟"

وہ چونک کر بولی تو وہ اس کی عدم توجہی اور اس کی "وجہ" بھی سمجھ گیا۔ بغور اس کا پریشان چہرہ پڑھ کر وہ واپس اس کے قریب آیا۔

"میں نے کہا ہے کہ چلو کلاس میں چلتے ہیں۔ اس بات پر بات اب پھر کبھی ہوگی۔ وقت دیکھو ذرا۔۔۔"

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی اس کے آگے کر دی۔

"ارے نہیں۔۔۔ آج کلاسز نہیں ہوں گی شاید۔ اب تک تو پروفیسرز بھی نہیں آئے ہیں۔ ہم "تینوں" کو ملا کر کل آٹھ افراد حاضر ہیں۔ اور پورے ڈیپارٹمنٹ میں صرف ہماری کلاس کے فقط یہ آٹھ ہی طلباء حاضر ہیں۔ اور کوئی بھی نہیں آیا۔"

وقت دیکھے بغیر اس کی کلائی تھام کر اس نے نیچے کر دی اور دور اپنے ڈیپارٹمنٹ کی انہی کھڑکیوں کو دیکھا۔

اس کی "متلاشی" نظریں کسی کو "ڈھونڈ" رہی تھیں۔ اور مسلسل اس کی آنکھیں پڑھتے مصطفین کا ذہن "ہم تینوں" سے گونج اٹھا۔

اپنے جملے میں اس نے انہیں "الگ" نہیں کیا تھا۔

"ایک" ساتھ رکھا تھا۔۔۔اور "اپنے" ساتھ رکھا۔۔۔

"ارے یہ واپس جا رہا ہے۔۔۔؟؟"

ڈیپارٹمنٹ کی طرف دیکھتی یکا یک وہ حیرت سے چلائی تو مصطفین نے بے ساختہ ادھر دیکھا۔ چہرے پر آئے بال ہٹاتا سفیر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر پختہ روش پر چلنے لگا۔ وہ مرکزی گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔

"تم یہیں رکو یا اندر چلو میں آتی ہوں۔ مجھے اس سے بات کرنا ہو گی۔"

اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کرتی وہ تیزی سے بولی اور پھر جواب سنے بغیر سفیر کی طرف چلی گئی۔

وہ حیرت سے وہیں رک کر اسے اس کے "راستوں" میں جاتے دیکھتا رہا۔

"اے رکو۔۔۔سفیر۔۔۔"

ثومیہ نے دور سے اسے پکارا تو ادھر دیکھ کر بھی وہ اسے نظر انداز کر گیا۔ وہ بھاگ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

"ارے۔۔۔میری بات تو سنو یار۔ ہوا کیا ہے؟؟ کچھ بتاؤ تو۔۔۔"

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے پکڑے اور سرعت سے اس کا سارا وجود اپنی جانب پھیر کر یکدم رک گئی۔ اس کوشش میں اس کے سارے بال بکھر گئے تھے۔ اپنی دھن میں آگے بڑھتا وہ اس سے بمشکل رک سکا تھا۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں؟؟ یوں۔۔۔ایک دم کہاں جا رہے ہو؟؟ کلاس نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم گھر جاؤ گے۔ چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔۔۔کسی موضوع پر باتیں کرتے ہیں۔ ہم پہلے بھی تو یہی کرتے ہیں یار۔

کیا ہو گیا ہے تمہیں؟؟"

چہرے پر جھولتی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑس کر، ہانپتی ہوئی وہ اسے ڈانٹ کر بولی۔ اسے روکنے کی "جدوجہد" میں اس کا سانس بھی پھول گیا تھا۔ سفیر نے لب بھینچ کر اس کی پوری بات سنی اور پھر جذباتی لہجے میں بولا۔

" کوئی ضرورت نہیں مجھے تم سے بات کرنے کی۔ تمہارے پاس تمہارا وہ "نیا نویلا" دوست ہے نا۔۔۔ وہی تم سے باتیں کرے گا اب۔ ہمیشہ۔۔۔ بڑے قصے سنائے گا۔ باتوں کا تو وہ یوں بھی بہت ماہر ہے۔ "جیتنے" نہیں دیتا کسی کو۔ یقیناً بور نہیں ہونے دے گا تمہیں۔ جاؤ ثومیہ۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہو بھی اگر تو، تمہیں اب میری ایسی "ضرورت" نہیں رہی۔۔۔"

اس کے ٹوٹے لہجے میں بہت سارا "کانچ" تھا۔

اور سفال گر آنکھیں تھیں کہ بے پناہ شکوہ کناں۔۔۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے، اپنی صحیح یا غلط "ذات" کے متعلق سچی یا جھوٹی گواہیاں "بھر بھر" کر اندر سے بہت "خالی" ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہمارے "لفظ" ٹھکرا دے تو "لہجے" خود بخود "ٹوٹ" جاتے ہیں۔

اس کی "جذباتیت" بھی انہی "کیفیات" میں ڈھل رہی تھی۔۔۔

اس کا لہجہ بھی یونہی ٹوٹ گیا تھا۔۔۔

اس کی بات سن کر ثومیہ کے دل کو کچھ ہوا۔ تمام تفرقات سے ہٹ کر باہم ان کا "تعلق" اور "دوستی"۔۔۔ دونوں بالکل خالص تھے۔

"میری بات سنو سفیر۔۔۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ہم اچھے دوست ہیں۔ اور دوست کبھی بھی "ضرورت" نہیں ہوتے۔ دوست تو صرف "بھروسہ" ہوتے ہیں یا ہماری ذات کا "یقین"۔۔۔ پلیز رکو سفیر۔۔۔ دھیان سے میری بات سنو۔ کیا ضروری ہے کہ اس جھگڑے اور انا کو طول دیا جائے؟؟ کڑوی کسیلی باتیں اور دو بدو لب و لہجہ۔۔۔ ان کے علاوہ بات چیت کرنا ممکن نہیں ہے کیا؟"

اس کی ساحر نظریں پڑھتی، نرم لہجے میں کہہ کر یہاں وہ رکی اور دور کھڑے مصطفین کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

"وہ۔۔۔ مصطفین۔۔۔ اچھا لڑکا ہے۔ نازک جذبوں اور گہرے احساسات کا حامل۔۔۔ اور مجھے یقین ہے سفیر کہ اس سے دوستی کر کے تمہیں اچھا لگے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ دراصل تمہیں ایسے ہی کسی دوست کی "ضرورت" ہے۔ وہی ضرورت کہ ابھی جس کا حوالہ تم مجھے دے رہے تھے۔ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ میرا یقین کرو۔"

ہاتھ نیچے گرا کر پھر سے اس کی آنکھوں میں جھانکتی وہ اسی حلاوت سے بولی تھی۔ اس کے دلپذیر لہجے اور پراثر باتوں نے اس کا دل "باندھ" لیا۔

اس کے اشارہ کرنے پر اس نے بے ساختہ دور کھڑے مصطفین کو دیکھا۔ وہ انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً رخ پھیر لیا۔

"پتا نہیں کون کہاں اور کتنا غلط ہے؟؟ فی الوقت یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ جانے اپنے رویے میں وہ "غلط" ہے یا اخلاقی طور پر میں ہی "چوک" رہا ہوں؟ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ شاید تم ٹھیک کہتی ہوں گی۔ لیکن ابھی مجھے گھر جانا ہے۔ ابھی میرا غصہ مجھے پھر سے "پاگل" کر دے گا۔ رات کو اس موضوع یا پہلو پر تفصیلاً غور کروں گا۔ پھر ہی فیصلہ ممکن ہے۔ ابھی تم مجھے پھر سے مت روکنا۔۔۔ پلیز زززز۔ کل یقیناً ملتے ہیں۔ ان شاءاللہ اور خدا حافظ۔۔۔"

اس سے نظریں چرا کر یہاں وہاں دیکھتا وہ دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولا اور اس کا جواب سنے بغیر پلٹ گیا۔

اسے روکنے کو ہلے اس کے لب بس تھرا کر رہ گئے۔

اسے جاتا دیکھتی، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کچھ دیر وہیں ساکت کھڑی رہی۔

وہ چلا گیا تو بغور ان کی "ملاقات" دیکھتا مصطفین دھیرے دھیرے چل کر ثومیہ کے پاس آ رکا۔ اور پھر اس کے کانوں کے قریب ہو کر وہ مدھم لہجے میں بولا۔

" لگتا ہے بات "بنی" نہیں ہے۔ یا پھر "منزل" راستوں میں ہی کہیں "ڈھول ڈھول" ہو گئی ہے۔"

اس کا رازدان لہجہ اور لپٹے لپٹے لفظ۔۔۔

وہ چونک کر پلٹی تھی۔

کبھی کبھی ظاہر کا "چونکنا" دراصل باطن میں "تڑپنا" ہوتا ہے۔

ہاں وہ تڑپ کر پلٹی تھی۔

اس سے دو قدم پیچھے وہ اس پر سوالیہ نظریں جمائے کھڑا تھا۔

" آں ہاں۔۔۔ وہ نہیں رکا۔ ڈسٹرب تھا بہت۔ کہہ رہا تھا کل آئے گا تو بات کرے گا تم سے۔ تھوڑا تم بھی دیکھنا ہاں۔۔۔ صرف میرے کہنے پر۔۔۔ پلیززززز۔۔۔ یوں سمجھو بس کہ اپنے "ساحر" لفظوں کا پورا "بھید بھاؤ" تمہیں اس پر "تول" دینا ہے۔ وہ اپنی ذات میں گرفتار ہے مصطفین۔۔۔ ایک دوست ہونے کے ناطے اسے "اس" سے "باہر" نکالنے کے لیے مجھے تمہارے "لہجوں" کی ڈھارس چاہیئے۔ دیکھو اسطرح سے وہ بالکل اکیلا رہ جائے گا۔ ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیئے۔ وہ دوست ہے میرا۔ اور میں اسے یوں نہیں چھوڑ سکتی۔ پلیززز۔۔۔"

اس کے جملوں کے "حصار" سے "نکل" کر اس نے وہ سب لفظ "مانگ" لیے تھے۔

پوری شدت سے۔۔۔

تمام تر لہجوں سمیت۔۔۔

اس کی حساس تر باتیں۔۔۔ اور ان پر اس کا "بلکتا" لہجہ۔۔۔

مصطفین کی آنکھوں میں تیرتے سب سوال یکبارگی "ڈوب" گئے تھے۔

ان دونوں کی باہمی گفتگو سے متعلق اس کا سارا تجسس اس کے اندر ہی کہیں "بہہ" گیا تھا۔

سارے جذبے "پگھل" گئے تھے۔

مصطفین نے بغور اس کا الجھا الجھا انداز پرکھا۔

اس پل وہ اسے بہت "خالص" لگی تھی۔۔۔ اور انتہائی "خاص" بھی۔

ہاں "خلوص" کہیں بھی ہوتا۔۔۔ اسے روک سکتا تھا۔

"اوہ۔۔۔ تم بالکل فکر نہیں کرو یار۔ میں کوئی بہت خاص باتیں نہیں کرتا۔ جانے کیسے تم کو اچھی لگ جاتی

ہیں؟ بہر حال جیسا بھی ہو۔کسی بھی حال میں ۔۔۔میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔کل میں خود اس سے بات کر کے سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔ابھی مزید سوچ سوچ کر اور دل جلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

پر خلوص لہجے میں اس نے بہت پیار سے کہا اور پھر مسکرا دیا۔

"ہمم بہت شکریہ۔۔۔تم بہت اچھے ہو۔"

پہلی سی کیفیت میں رہ کر وہ جیسے صرف بڑبڑائی تھی۔جانے تب وہ" کن "سوچوں میں رہی۔۔۔؟

پھر یوں ہوا کہ اس کے چہرے پر رقم دلگداز تاثرات دیکھ کر اس نے اسے ہنسانا چاہا۔

"ابھی تم رونا مت پلیز۔مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم رونے والی ہو۔۔؟؟"

اس کی شریر لہجے اور دلنشین باتوں پر ایک پل کے لیے چونک کر اس نے بغور اسے دیکھا اور پھر بڑے زور سے ہنس پڑی۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔اچھا۔۔۔ایسے عام نہیں ہیں نیر میرے کہ بے وجہ ہی بہنے دوں۔رونے کی بھی کوئی مضبوط وجہ ہونی چاہیئے جی۔"

شوخ و شنگ لہجے میں وہ بڑی خاص بات کہہ گئی۔اسے خوش دیکھ کر مصطفین کے گرد جیسے کوئی" ساز "چھڑا تھا۔وہ آس پاس گونجتی اس کی" مدھر "ہنسی سننے لگا۔

"اب چلو۔۔۔میرا بیگ وہاں راہداری میں مریم کے پاس ہے۔کچھ دیر بعد واپسی کے لیے نکلیں گے۔اس بارش نے تو آج سب کچھ ہی" تہہ و بالا "کر دیا ہے۔

کلاس کی جانب قدم بڑھاتی وہ کھنکتے ہوئے لہجے میں بولی تو اس کی بات سن کر اس کے ہم قدم چلتے مصطفین نے اس کے آخری جملے پر" گرفت "کر لی۔

"بارشیں کچھ بھی" تہہ "نہیں کرتیں ثومیہ۔۔۔بہت کچھ قریب لا کر یہ تو صرف" بالا "کرتی ہیں۔ سارے جذبے،پوری حسیں،نرم اذکار۔۔۔اور سردرتیں۔۔۔بارشیں تو بڑی" معجزنما "ہوتی ہیں۔"

اس کے بات سن کر بمشکل چند قدم آگے بڑھی ثومیہ وہیں" تھم "گئی تھی تو وہ بھی فوراً رک گیا۔دونوں نے ایک دوسرے پر عمیق تر نگاہ ڈالی اور پھر وہ دھیرے دھیرے بولی۔

"ٹھیک کہتے ہو تم۔۔۔ بارشیں بڑی "معجز نما" ہوتی ہیں۔ان کی پہلی آہٹ پر ہی بہت کچھ لوٹ آتا ہے۔ سارا ماضی، جل تھل یادیں، فسوں گر لمحے۔۔۔ اور پورا کرب۔۔۔ باقی کچھ بھی نہیں رہتا۔سب کچھ "بالا" ہوتا ہے، ہاں سچ لیکن "تہہ در تہہ"۔۔۔ بارشیں جھولیاں "بھرتی" ہیں۔گرم رتوں کی تپتی آنکھیں۔۔۔ ساری "خالی" کرتی ہیں۔تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔"بارشیں" ان سب "معجزوں" کی اول و آخر "مرشد" ہیں۔"

اس کے "زخم زخم" لفظوں میں ایسے "مرہموں" کی چاہ تھی کہ سارا لہجہ "اکھڑ" گیا تھا۔

اس کا پر درد بیان سن کر وہ بہت دیر تلک اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا۔

پھر اس گفت و شنید میں وہاں ان دونوں کے مابین، صرف اور صرف "بارشوں کے رنج" ناچے۔۔۔

قطرہ قطرہ۔۔۔

پگھل پگھل کر۔۔۔

دل جو درد سے "اوب" گیا تھا۔

سارا منظر "ڈوب" گیا تھا۔

☆......☆......☆

"رنگ راس" کی عکس بندی کے دوران ہی گیتی کی شہرت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔پہلی فلم کی نمائش سے قبل ہی دو معروف ڈائریکٹرز نے اسے اپنے اگلے پروجیکٹس کے لیے بہترین معاوضہ پر سائن کر لیا۔ان سائیننگز سے متعلقہ خبروں کی ملک کے مختلف نامور اخبارات و رسائل میں ہوئی اشاعتِ خاص کی بدولت گیتی اور "رنگ راس" دونوں کی ہائیپ ایک ساتھ بڑھتی رہی۔چار ماہ کے "اسٹارٹ ٹو فنش" شیڈول کے تحت فلمائی گئی یہ فلم دو ماہ کے پوسٹ پروڈکشن ورک کے بعد بھارت کے ساتھ ساتھ کینیڈا، انگلینڈ، ترکی، مصر اور پاکستان میں بھی بیک وقت ریلیز کی گئی۔فلم نے پہلے ہی دن ملکی سطح پر چھتیس کروڑ کا ریکارڈ توڑ بزنس کیا۔

گیتی نے گویا راتوں رات شہرت کا آسمان چھو لیا تھا۔کئی اداکاراؤں نے اس کی قسمت پر رشک کیا تھا تو کئی ایک اس کے حسد میں مبتلا ہوئی تھیں۔اس کی کمال تر اداکاری کو تمام معتبر و مستند ناقدینِ فلم نے پورے مارکس دیئے۔سب نے رائے و تبصرہ کے طور پر یہی لکھا کہ بہترین موسیقی اور نئی اداکارہ کی لازوال اداکاری اس فلم کی

جان ہیں۔ کہانی کے مطابق ایک دکھی اور ملول " گائیکہ " کے روپ میں اس کے دلکش چہرے پر سجے سوگوار و مغموم تاثرات نے فلم بینوں کو اپنا گرویدہ تو کیا ہی۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسیر بھی کرلیا۔

اسے " دیوی " لکھا گیا۔۔۔

اسے " پری " بلایا گیا۔۔۔

ہر طرف گیتی کے نام کی پکاریں تھیں۔

پوری فلم میں جہاں جہاں وہ سکرین پر نمودار ہوئی سارا منظر سج گیا تھا۔ اس ہیرو کے ساتھ اس کی جوڑی کو خوب سراہا گیا۔ ان دونوں کی باہم " کیمسٹری " کو بھی خوب پذیرائی ملی۔ حتٰی کہ پہلے پہل دبے الفاظ میں اور پھر کھل کر ان کا معاشقہ مشہور کیا گیا۔ وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر بس طرح طرح کے " کردار " نبھاتی رہی۔ اپنے باپ وجے کمار اور ماں شیتل کو بھی اس نے ان سب بکواس خبروں پر، دھیان دینے سے منع کر دیا۔ انہیں یقین دلایا کہ ان باتوں میں رتی بھر بھی " سچائی " نہیں ہے اور اس کی توجہ صرف اور صرف انڈسٹری میں اپنا مستقبل سنوارنے پر ہے۔ وہ مطمئن ہو گئے۔

پھر یوں ہوا کہ وقت نے سارے فیصلے اس کے حق میں کیے۔ بڑے بڑے ڈائریکٹرز نے اسے ترجیحی بنیادوں پر کاسٹ کیا۔ اس کے لیے خصوصی کردار لکھے جانے لگے۔ تمام نامور ہیروز اس کے اپسرائی حسن میں بندھ بندھ کر اس کی اپنے ساتھ کاسٹنگ کی سفارش و فرمائش کرنے لگے۔ اس کا ستارہ بہت جلدی عروج پر آیا تھا۔ اس کی ہر آنے والی فلم پہلی سے زیادہ بزنس کر رہی تھی۔ معروف برانڈز نے اسے اپنا ایمبیسڈر مقرر کیا۔ اس کی ڈیٹ ڈائری اگلے دو تین سالوں کے لیے بک ہو چکی تھی۔

ناز نے ہر جگہ اس کی سیکرٹری ہونے کے فرائض نہایت عمدگی سے ادا کیے۔ وہ اس کی بڑھتی ہوئی شہرت کے مطابق اس کا معاوضہ طلب اور طے کرنے سے متعلقہ تمام معاملات کمال مہارت و خوش اسلوبی سے نبھاتی تھی۔ اس نے بھی بہت جلد انڈسٹری میں اپنے ذاتی تعلقات بنا لیے تھے جن سے وہ وقتاً فوقتاً گیتی کے لیے بہترین کام حاصل کرنے میں کئی طرح کی مدد حاصل کرتی تھی۔ وہ فلم کے انتخاب یا رد کرنے سے متعلقہ تمام تر فیصلہ جات میں گیتی کے ساتھ پیش پیش رہتی تھی۔ فلم اسکرپٹس کی " صحت " کے بارے لگایا گیا اس کا ہر اندازہ درست ثابت

ہوتا تھا۔ گیتی کا کردار مضبوط ہوگا یا نہیں۔۔۔؟ اس کی حدود کیا ہوں گی؟؟ کرداروں کے جملہ لوازمات کو بھانپ پرکھ کر وہ اسے ہر شے سے متعلقہ قیمتی مشورہ جات سے نوازتی تھی۔ گیتی بھی ہر کام، ہر معاملے میں پہلے ناز کی رائے طلب کرتی اور پھر اس رائے کی روشنی میں ہی اس بات کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرتی تھی۔

انڈسٹری میں جہاں بہت سے لوگ گیتی کے حق میں تھے وہیں کئی ایک تھے جو درِ اندرون اس کے مخالف تھے لیکن اس کی اچھی پوزیشن دیکھ کر اور اس کے باپ کے مضبوط سیاسی اثر ورسوخ کی بدولت اس کے خلاف کسی سازش کے ارتکاب کی جرات نہیں کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بس گیتی کی کسی بھی ایک "حقیقی" غلطی کے منتظر تھے۔ وہ غلطی کہ جس کے تحت وہ اس پر مکمل گرفت کر سکیں۔ کوئی ایسی لغزش کہ جس کی مدد سے وہ اسے اس کے "مقام" سے گرا سکیں۔ انہیں اس کی کامیابی کسی بھی طور گوارا نہیں تھی۔ بظاہر مسکرا کر، بہت محبت سے گلے ملتے وہ لوگ دل میں اس کے لیے بہت سی پرخاش رکھتے تھے۔ ناز اکثر گیتی کو ان سے دوری اختیار کرنے کا کہتی تھی۔ لیکن وہ اپنی ازلی اچھائی وسادگی کی وجہ سے ہمیشہ ناز کی باتوں یا تنبیہوں کو نظرانداز کر جاتی تھی۔

اور پھر بالآخران سب مخالفین کو وہ موقع مل ہی گیا وہ اس کے خلاف سازشیں کر سکیں۔ ان میں سے کئی کھل کر تو کئی ایک ملفوف وملفوظ لہجے میں گیتی پر شدید طنز وتنقید کرنے لگے۔

قصہ کچھ یوں رہا کہ ان دنوں اچانک پاک وہند مشترکہ فلمسازی کی بات شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تحریک نے زور پکڑ لیا۔ دونوں طرف سے کچھ نرم دل افراد نے اس خیالی تجویز اور سلسلے کو عملی جامہ پہنانے میں کافی زیادہ محنت کی لیکن اس کے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ تبھی ایک مشہور اور قابل پاکستانی ڈائریکٹر رفیق نواز نے اپنی فلم میں ایک ہندو لڑکی جو کہ بعد میں مسلمان ہو جاتی ہے کے مرکزی کردار کے لیے گیتی کو اپروچ کیا۔ یہ پیشکش اس نے ایک بھارتی سینئیر اداکار کے ذریعے اپنی فلم کے مکمل اسکرپٹ کے ساتھ اس تک پہنچائی تھی۔ اس پیشکش کو پا کر بچپن سے اس کے دل میں دبی پاکستان کی محبت عود کر واپس آئی۔ ناز نے اس پیشکش کے بارے میں سنا تو سختی سے منع کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گیتی ایسا کوئی کردار نبھائے جو ایک "ہندو" لڑکی کے "اسلام" قبول کرنے متعلق ہو۔ اس سے اس کے لیے اپنے ہی ملک میں کئی طرح کے مسائل کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کی شہرت کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ جبکہ گیتی تو پاکستان کا نام سنتے ہی تیار ہو گئی تھی۔ اور ناز

اس بات سے بھی بخوبی آگاہ وواقف تھی کہ پاکستان کے نام پر تو وہ دل وجان سے راضی ہے۔

گیتی نے اسکرپٹ پڑھا تو اپنا کردار اسے انتہائی مضبوط لگا۔ بطورِ ایک فنکارہ بھی اسے نبھانے کے لیے وہ بے تاب ہو گئی۔ کردار خود میں کئی طرح کے تغیرات و تبدلات لیے ہوئے تھا۔ اس کے لیے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مزید لوہا منوانے کا خوب تر موقع تھا۔

اس نے ناز سے اسکرپٹ سے متعلق مخلصانہ رائے طلب کی تو کردار کے بہت جاندار ہونے کی حقیقت سے انکار وہ بھی نہیں کر سکی۔ گیتی ویسے بھی تیار تھی اب تو اقرار کی وجہ بھی بڑی "شاندار" تھی۔

پہلی بار اس نے ناز کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے پاکستانی ڈائریکٹر کو خود کال کی اور اس کی فلم میں کام کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

رفیق نواز دم بخود رہ گیا۔ اسے اس کے مان جانے کی کچھ خاص امید نہیں تھی۔ اس کے لیے ایک حیران کن بات یہ بھی تھی کہ گیتی نے اپنے آپ اس کے ساتھ اپنے معاوضے کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی حالانکہ وہ اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھا۔ پھر اس سینئر اداکار کے ذریعے گیتی سے استفسار کرنے پر بھی اس نے جو معاوضہ طلب کیا، رفیق نواز بخوبی جانتا تھا کہ وہ اس کی مارکیٹ پرائس سے بہت کم ہے۔

وہ گیتی کی اس "شاہ دلی" کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

خیر ساری سوچیں بالائے طاق رکھ کر اس نے ایک ہنگامی پریس کانفرنس بلائی اور نامور بھارتی اداکارہ گیتی کے اپنی فلم میں شمولیت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔

اس خبر کو پاکستان میں بریکنگ نیوز کے طور پر چلایا گیا کہ "معروف بھارتی اداکارہ "گائیتری دیوی" عرف "گیتی" نے ڈائریکٹر رفیق نواز کی جلد شروع ہونے والی فلم "خدا کے بھگت" میں کام کرنے کی حامی بھر لی ہے۔۔۔اور جلد ہی وہ اس فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں پاکستان تشریف لائیں گی۔"

فلم کے لیے اس کے اقرار کرنے کی دیر تھی کہ سرحد کے دونوں جوانب گویا ایک طوفانِ حشر بپاء ہو گیا۔

یہاں اور وہاں بھی۔۔۔سب کو پہلا اعتراض اس فلم کے نام "خدا کے بھگت" پر تھا۔

یہاں یہ شور تھا کہ "خدا" کے ساتھ "بھگت" کیوں ہے اور وہاں یہ واویلا کہ "بھگت" کے ساتھ "خدا"

کیوں ہے؟؟؟؟یوں بھی رفیق نواز کی زیادہ تر فلمز کنٹرو۔ورشل موضوعات پر ہی ہوتی تھیں۔ان میں کوئی نہ کوئی ایسی بات یا پہلو ضرور ہوتا تھا کہ جس سے کوئی ایک مخصوص معاشرتی طبقہ اس پر لازمی معترض ہو۔

انتہا پسند ہندو تو گیتی کے ایک "دشمن دیش" کی "خدا" کے نام والی فلم میں کام کرنے پر "بھی" بھڑک اٹھے تھے۔حاسدین نے اس چنگاری کو مختلف طریقوں سے مزید ہوا دی۔لیکن ہر طرف سے شروع ہونے والی تمام تر مخالفتوں کو اس نے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔شیتل،وجے کمار،بیلا،اور ناز۔۔۔سب کا باری باری اسے سمجھانا بھی رائگاں ہوا۔

سب سے بے نیاز وہ اپنے ہی کسی "خیال" میں تھی۔

"خدا کے بھگت" کے لیے اس نے ترجیحی بنیادوں پر تاریخیں دیں۔اس مقصد کے لیے اسے اپنی ڈیٹ ڈائری اور شیڈول میں کافی ردوبدل کر کے انہیں دوبارہ ترتیب دینا پڑا تھا۔

وہ بہت خوش تھی کہ وہ پاکستان جا رہی ہے۔۔۔

وہ مسرور تھی کہ بالآخر "جمنا" اپنے دیس "لوٹ" رہی ہے۔۔۔

"تب" گیتی۔۔۔کسی بھی طور "گیتی" نہیں تھی۔۔۔

یہ گیتی کا بھیس دھارے کوئی "جمنا" تھی۔۔۔

جس کی رگ رگ کے ہر کنارے پر "پاکستان" بہتا تھا۔۔۔

ناز چپ چاپ ایک پاکستانی فلم کے لیے اس کا شوق اور دلچسپی دیکھ تو رہی ہی تھی۔۔۔"بھانپ" بھی رہی تھی۔

اس سے غیر متفق ہو کر بھی وہ اس "غلط فیصلے" میں خلوصِ نیت سے اس کے ساتھ کھڑی تھی۔وہ بہر طور اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

اردگرد سر اٹھاتی اندھا دھند مخالفت کا احساس کر کے اس نے بارہا گیتی کی توجہ اس طرف دلانی چاہی لیکن وہ بے پرواہی سے ہر بار اسے ٹال گئی۔

خیر وقت گزرتا گیا اور سارے معاملات خودبخود طے ہوتے گئے۔وہ دن بھی آیا کہ گیتی ناز کو لے کر پاکستان

آ گئی۔ان دونوں کا انتہائی پرتپاک استقبال کیا گیا۔۔

انہیں بے پناہ عزت وتکریم سے نوازا گیا۔

پاکستانیوں کا مثبت رویہ، اور بے پناہ اخلاص ومحبت دیکھ کر بھی ناز کا دل ان سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی بہت زیادہ محتاط رہتی تھی۔اسے یہاں سب پر بس ایک حد تک اعتماد ہوسکا تھا۔وہ ان پر مکمل بھروسہ نہیں کرتی تھی۔یہاں آ کر وہ ہر ہر آہٹ پر چونک چونک جاتی تھی۔

اس کے برعکس گیتی بالکل آرام وسکون میں تھی۔اسے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ کسی غیر ملک میں ہے۔پاکستان پہنچ کر اس نے اپنے ڈائریکٹر رفیق نواز سے جو پہلی فرمائش کی تھی اسے سن کر وہ خاصا متحیر ہوا۔وہ گوجرانوالہ شہر کے مضافات میں واقع ایک چھوٹے قصبے رسولنگر جانے کی خواہاں تھی۔اس کا کہنا تھا کہ وہاں اس کی دادی جمنا کا آبائی گھر ہے۔لیکن باوجود کوشش کے، بہت سے سیکیورٹی خدشات کے پیشِ نظر گیتی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں مل سکی۔ایک سیلیبریٹی ہونے کی وجہ سے اس کا ویزا مشروط ویزا تھا اور شوٹنگ اسپاٹس کے علاوہ بغیر حکومتی اجازت کے وہ کہیں آجا نہیں سکتی تھی۔وہ بہت دلگرفتہ ہوئی لیکن رفیق نواز نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگلے اسپیل کے لیے وہ اس قصبے میں فلم کے چند مناظر کی شوٹنگ کا انتظام واہتمام کرلے گا اور اس کی آمد سے قبل اس کے لیے باقاعدہ اجازت نامہ بھی حاصل کرلیا جائے گا۔یوں اپنی دادی کا آبائی گاؤں دیکھنا اس کے لیے آسانی سے ممکن ہو سکے گا۔

گیتی مطمئن ہوگئی۔رفیق نواز سے ملے اس خصوصی تعاون پر وہ بہت خوش تھی۔اسے پاکستان بہت اچھا لگا تھا۔یہاں کے لوگ اس کے خیالات کے عین مطابق بہت پیار کرنے والے تھے۔کئی نامور پاکستانی اداکاروں نے اس کے اعزاز میں باقاعدہ تقاریب واشائیات کا انعقاد کیا۔اخبارات میں اس کے لیے لکھے گئے کالمز میں خوبصورت تعریفی الفاظ وکلمات استعمال کیے گئے۔اس نے ایک ایسے وقت میں پاکستان فلم انڈسٹری کا ساتھ دیا تھا جب وہ تباہی کے دہانے سے بمشکل واپس لوٹ کر اپنی استقامت کے لیے تگ ودو کررہی تھی۔یہاں ملی اس عزت وتوقیر کو دیکھ کر اکثر اسے لگتا کہ گویا سارا پاکستان اس پر فریفتہ ہے۔۔۔

کیا لڑکے اور کیا ہی لڑکیاں۔۔۔بنا کسی تخصیص وتفریق کے ہر کوئی اس پر پوری جان سے فدا ہو رہا تھا۔۔۔

ان سب چاہتوں کی بارش میں بھیگتے ہوئے رک کر وہ کبھی اپنے اندرون میں بسی "جمنا" کو دیکھتی تو وہ اسے بڑی مسرور دکھائی دیتی تھی۔ گیتی کو جب بھی موقع ملتا شوٹنگ کے بعد آس پاس ہجوم کی مانند جمع ہوئے افراد سے خود آگے بڑھ کر علیک سلیک کرتی تھی۔

دونوں طرف کا میڈیا گیتی کی ہر ہر مصروفیت و طرز و عمل پر گہری و عمیق نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی ہر ہر حرکت کا خوب خوب چرچا تھا۔

پی۔ سی بھوربن کے خوبصورت ٹیرس میں رک کر اپسرائی حسن کی مالک گیتی، اس رات دیر تلک اپنا ماضی کھنگالتی رہی تھی۔

اور اگلے روز لاہور ریلوے اسٹیشن پر "خدا کے بھگت" کے پہلے اسپیل کا آخری سین فلمایا جانا تھا۔ اس کے بعد اس فلم کا دوسرا اسپیل پچیس دن بعد آغاز ہونا تھا۔ رفیق نواز کی کوشش تھی کہ اس دوسرے اسپیل میں "خدا کے بھگت" کی عکسبندی مکمل کر لی جائے۔

دونوں اسپیلز کے اس پچیس روزہ "دورانیے" کی یہ تاریخیں گیتی نے اپنے گرو دھن راج ورما کی اگلی فلم کو دے رکھی تھیں۔ اور اسی مقصد کے تحت اسے یہاں سے "ترکی" اور وہاں سے پھر "کپادوکیہ" پہنچنا تھا۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی سے گھر واپس پہنچنے تک مصطفین بہت تھک چکا تھا۔ گو کہ آج انہوں نے کچھ بھی نہیں پڑھا تھا لیکن وہاں سفیر سے ہوئے مباحثے کی بدولت اس نے بہت ساری "ذہنی کوفت" جھیلی تھی۔ سست روی سے چل کر ڈھلکے ہوئے شانوں کے ساتھ وہ گھر داخل ہوا تو خالہ کنیز کو اپنے شوہر کے ہمراہ لاؤنج کے صوفوں پر براجمان پایا۔ وہاں بیٹھ کر چائے پینے کے ساتھ ساتھ وہ کسی عام موضوع پر عمومی گفتگو کر رہے تھے۔ وہ سیدھا ان کے پاس چلا آیا۔

"السلام علیکم۔۔۔ کیا ہو رہا ہے خالہ؟؟ اور بھئی واہ۔۔۔ آج یہ خالو کیسے گھر پر پائے جا رہے ہیں؟؟"

ان دونوں کے بالکل سامنے رک کر اس نے انہیں سلام کیا اور معمول سے ہٹ کر خالو کی وہاں موجودگی کے متعلق پوچھا۔ پھر ان کے کسی بھی جواب سے پیشتر ان کے سامنے دھری چائے کی پیالیوں اور لوازمات سے بھری

ٹرے پر نگاہ کر کے وہ مسکرایا اور برجستگی سے بولا۔

"ارے۔۔۔ یہاں تو باقاعدہ "ڈیٹ" چل رہی ہے جی۔ صدقے۔۔۔ سب سمجھ گیا میں۔۔۔ جاری رکھیں بھئی۔ میں تو چلا اپنے کمرے میں۔۔۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔"

شرارت سے انہیں چھیڑتا وہ پہلی منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا کہ خالو نے خوشگوار لہجے میں پکارا۔

"وعلیکم السلام۔ اوئے آ جا پتر۔۔۔ رک ذرا چائے پیتے ہیں ایک ساتھ۔ بس مک گئی "ڈیٹ" ہم بڈھا بڈھی کی۔ اب اس عمر میں کیا کرنا ہے یہ سب کر کے یار۔ ہاں کبھی تھا وقت ہم پر بھی۔۔۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

ان کی بات پر وہ جاتا جاتا رک گیا تھا اور کنیز بیگم منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر شرمانے لگی تھیں۔

"نا خالو۔۔۔ یہ نہیں کہنے دینا میں نے اب۔ آپ خود کو بڈھا بھلے کہہ لو لیکن میری خالہ تو اب بھی جوان جہان ہیں۔ ہاں جی۔ ارے دیکھو تو کیسے لجا رہی ہیں۔۔۔"

واپس ہو کر اس نے دوبارہ جملہ کسا اور جھک کر شرماتی لجاتی کنیز بیگم کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے ابرو اچکائے۔ انہیں ستاتے ہوئے وہ ساری تھکاوٹ بھول چکا تھا۔ اس کی بات اور حرکت پر خالو نے ایک بلند قہقہہ لگایا تھا جبکہ کنیز بیگم مسکراہٹ دبا کر مصنوعی خفگی سے بولیں۔

"میں کہتی ہوں بس کر دے مصطفین۔۔۔ میراثی نہ بن۔ ورنہ ابھی ساری اٹھکیلیوں کے ساتھ نکال باہر کروں گی۔ ہر وقت بکواس کرتا رہتا ہے۔ اور یہ آپ کیا ہو جی۔۔۔؟ بات بات پر ٹھٹھے لگانے لگتے ہو اس کے ساتھ؟؟ یہ تو ایک منٹ میں ہتھے سے اکھڑتا ہے۔ اسے تو موقع چاہئے بس ایسے لطیفے گھڑنے کا۔ اور آپ ہو کہ بجائے اسے روکنے کے خود بھی ساتھ دیتے ہو۔"

باری باری ان دونوں کو دیکھ کر انہوں نے تندی سے کہا تو ان کا ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

"اوہو۔۔۔ یار خالو آج یہ قضیہ بھی نمٹا ہی دو۔ یہ خالہ بات بات پر مجھے یہاں سے نکال باہر کیوں کرتی ہیں؟؟ انہیں بتاؤ ذرا کہ میں کتنا بیبا بچہ ہوں۔ وقت پر ماہانہ کرایہ ادا کرتا ہوں۔ ویسے بھی عام کرائے داروں کی طرح کبھی تنگ بھی نہیں کیا۔"

ہنسی روک کر یہ کہتے ہوئے وہ صوفے کے گرد گھوما اور خالو کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"ہاں "ویسے" بالکل تنگ نہیں کرتا اور "ایسے" کبھی سانس نہیں آنے دیتا۔۔۔توبہ توبہ نری سر پیڑ۔ یہ تو روز دکان پر ہوتے ہیں انہیں کیا پتا تمہارے کرتوتوں کا۔ بھگتنا تو مجھے ہوتا ہے تم کو اس ماہانہ کرائے کے عوض۔ زیادہ حساب کتاب نہ کھولیں یہاں میرے سامنے۔۔۔ایویں جھوٹا پڑ جائے گا۔ اور بیٹھ یہیں چپ چاپ۔ میں چائے لاتی ہوں تیرے لیے۔ بڑا آیا تو بیبا۔۔۔رہندائیں۔"

برجستہ لہجے میں اس سے دوبدو ہو کر اسے مزید کسی بھی بات کا موقع دیے بنا وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان سب کا باہم تعلق ان کرائے کے حساب کتاب والی باتوں سے بہت ماوراء تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ خالہ اور مصطفین کی ہر آپسی بحث میں، چاہے وہ مزاحیہ ہو یا سنجیدہ، یہ کرائے دار و مالک مکان ہونے کی بات لازمی ڈسکس ہوتی تھی۔

اب بھی ان کی باتوں پر خالو اور مصطفین بس ہنس دیے تھے۔ موضوع سے جب مرضی ہٹ جانا اس گھر کے باسیوں کا عام وطیرہ تھا۔ آپس کا یہ لب ولہجہ اور ہر انداز وہ سب بخوبی سمجھتے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ کچن کی طرف بڑھتی کنیز بیگم اچانک مڑ کر بولی تھیں۔

"اور یہ بتا کہ آج اتنی جلدی کا ہے آیا تو؟؟ کیا بارش کی وجہ سے؟ چل کوئی نہیں خالو بھی تیرے اسی وجہ سے آ گئے تھے۔ کہہ رہے تھے بارش میں دکان پر بیٹھنے کا دل نہیں کرتا۔ گاہک تو آتا کوئی نہیں۔ فضول بیٹھے مکھیاں نہیں ماری جاتیں۔ اب اللہ جانے بھئی حقیقت کیا ہے۔۔۔؟؟ میں نمانی گھر کی عورت کیا جانوں یہ دکانوں کے معاملے سارے۔"

انہوں نے بے تکان ہو کر معصومانہ انداز میں اپنی بات مکمل کی اور دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو باری باری موڑ کر ہوا میں اچھالتے ہوئے، مخصوص انداز میں "اللہ جانے" کا اشارہ بھی کیا۔

ان کے اپنے آپ سے ہی سوال جواب کرنے پر مصطفین اور خالو نے بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جیسے انہیں ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"اے لو۔۔۔اب کیا ہوا ان دونوں کو۔ خیر۔۔۔ایک وہ ایمان ہے کہ صبح دوبارہ سو کر بھی اب تک مری پڑی

ہے۔نیند ہی پوری نہیں ہوتی مہارانی کی۔کب سے آوازیں دے رہی ہوں کہ اٹھ کر سبزی بنا لے۔پر مجال ہے جو اس کی جوؤں نے بھی حرکت کی ہو میری پکار سے۔۔۔ابھی ذرا فارغ ہولوں تو اس کی بھی طبیعت بحال کرتی ہوں۔"

انہیں ہنستے دیکھ کر وہ حیرت سے بولیں اور پھر ایمان کو کوستے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔خالہ نے خودی ایمان کے متعلق "بڑبڑا" دیا تھا ورنہ وہ پوچھنے ہی والا تھا کہ آج اس گھر کی "شامت" کدھر ہے۔اس کی پیٹھ پیچھے وہ اسے آفت اور شامت جیسے "القاب" سے یاد کیا کرتا تھا۔کیونکہ اس کے سامنے تو اس کی "جرات" ہی نہیں تھی کہ اس کا ایسا کوئی نام لے۔

"افففف خالو۔۔۔یہ کس قدر بولتی ہیں میں بتا نہیں سکتا۔سچی بڑا مظلوم ہوں میں۔جانے آپ نے کیسے عمر کاٹ دی۔آہ۔۔۔"

ہنسی کے دوران اس نے چہرے پر مصنوعی معصومیت طاری کر کے کہا تو وہ کھل کر ہنسے اور پھر ہنسی روک کر اس کے شانوں پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"بس کر پتر۔۔۔خوب جانتا ہوں میں تیری معصومیت اور مظلومیت کو بھی۔بس یہ کہ تو اچھا ہے۔عزت کا پاس رکھنے والا ہے۔شریف ہے۔اچھے برے کی پہچان رکھتا ہے۔تو ہمیشہ ایسا ہی رہنا۔بڑا سجیلا لگتا ہے۔بہت ہی بیبا لگتا۔۔۔زندگی کہیں بھی لے جائے پتر تو بس خود کو بدلنا مت۔"

ان کا پیار بھرا لہجہ بتدریج سنجیدگی میں ڈھلا تھا۔ساری لطافت بھول کر مصطفین بھی بالکل سنجیدہ ہو گیا۔وہ اٹوٹ تعلقات کو بہت جلد بھانپ لینے والا شخص تھا۔

"تو بڑا چھوٹا تھا پتر جب ہم تیرے گاؤں جایا کرتے تھے۔تیرے بچپن سے تجھے دیکھا ہے۔ہمارے سامنے پلا بڑھا ہے تو۔یہ جو تیری خالہ کنیز ہے نا یہ اوپر سے کچھ بھی کہے۔اندر سے ایک دن بھی نہیں رہ سکتی تیرے بغیر۔میں سب جانتا ہوں۔اس کی باتوں کا غصہ تو نہیں کرتا جھلیا؟؟ یہ تو بالکل ماں ہے تیری۔۔۔کئی بار راتوں کو مجھے کہتی ہے مصطفین میرا اپنا پتر ہے۔"

ان کی اس قدر محبت میں بھیگ کر اس کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔

تھراتے ہوئے لبوں سے اس نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا گلا رندھ گیا۔

سارے لفظ " کانپ " کر رہ گئے تھے۔۔۔

کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔۔۔

انہیں بھی فوراً اس کی " حالت " کا احساس ہو گیا تو اس کے چوڑے شانوں پر دونوں ہاتھوں سے دباؤ بڑھا کر وہ محبت سے بولے۔

" اوہ ناں پتر ناں۔۔۔ یہ باتیں تجھے جذباتی کرنے کے لیے نہیں کیں۔ اوئے کملیا یہ تو بس منہ میں آیا تو سب بول دیا۔۔۔ وہ کیا ہے نا پتر کہ پیار آ جائے تو کر لینا چاہیئے۔ محبت کوئی بھی ہو اس میں " کنجوسی " نہیں کرتے۔ اوئے چل اب ہنس بھی دے یار۔ ورنہ میں بھی رو دوں گا پتری اوئے۔۔۔ "

بات مکمل کر کے انہوں نے اس کے کاندھے جھنجھوڑے تھے۔

اپنی حالت اور جذبات پر قابو پا کر اس نے پانیوں سے چمکتی آنکھیں صاف کیں اور پھر ان کی طرف دیکھ کر وہ یاسیت سے مسکرایا۔

" میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں خالو جی آپ سب کے لیے۔ میں بھی بس بیتے " رشتے " بھلانے کے لیے نئے " تعلق " نبھائے چلا جاتا ہوں۔ جو کچھ میری زندگی سے گذر گیا ہے اسے بھولنا آسان نہیں ہرگز۔۔۔ لیکن زندہ ہیں نا تو سانس لینا پڑتا ہے۔ بس اور کیا کہوں؟؟۔۔۔ ہاں آپ دونوں کا شکریہ تو ادا ہو سکتا ہی نہیں۔ گرے ہوئے پرندے واپس گھونسلوں میں رکھ دینا آسان نہیں ہوتا۔۔۔ کمال ظرف ہے آپ دونوں کا۔ میں آپ کی باتوں کے غصے نہیں کرتا خالو جی۔ میرا کرنا بنتا ہی نہیں۔۔۔ "

وہ شاید کچھ مزید بولتا لیکن اسے خاموش ہونا پڑا تھا۔ اسی وقت کنیز بیگم چائے لیے چلی آئی تھیں۔ وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

" لے چائے پکڑ مصطفین۔۔۔ اور یہ آپ لوگ سر جھکا کر اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہو؟؟ "

اس کے آگے چائے کا کپ بڑھا کر انہوں نے خاموشی کی وجہ پوچھی۔ جونہی اس نے سر اٹھا کر کپ پکڑا اس کی لال آنکھیں دیکھ کر وہ بے ساختہ بولیں۔

" آئے ہائے کیا ہوا ہے؟ آنکھیں کیوں سرخ ہیں اتنی تیری؟ رویا ہے کیا؟ پر تو کیوں روئے گا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا پتر؟ بتا مجھے۔ جلدی بول۔ کسی سے لڑ کر آیا ہے؟؟"

دوسری جانب اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ایک ہی سانس میں انہوں نے کئی سوال پوچھے اور ایک ماں کی طرح اس کے ماتھے پر آئے بال سنوارنے لگیں۔ خالو نے اپنی نصف بہتر کو اشارے سے کچھ سمجھا کر روکنا چاہا لیکن تب تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ ان کے اخلاص کی حرارت سے اس کا دل " مچل " چکا تھا۔

شدتِ ضبط سے کی ہر حد پھلانگ کر بے اختیار ہوئے آنسوؤں کو بمشکل روکتا وہ اٹھا اور یہ کہتے ہوئے صوفوں کی حدود سے باہر آ گیا۔

" میری طبیعت خراب ہے خالہ۔۔۔ چائے بھی نہیں پیئوں گا میں۔ بہت معذرت۔ میں سونے لگا ہوں۔ پچھلے پہر جگا دینا۔"

انہوں نے حیرت در حیرت پہلے سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر چڑھتے مصطفین کو اور پھر اپنے مجازی خدا کو دیکھا۔

" اسے ہوا کیا ہے؟؟ مجھے بتائیں کہ یہ رو رہا تھا نا؟؟"

انہوں نے اضطراری انداز میں ان کا بازو ہلا کر پوچھا۔

انہوں نے دھیرے دھیرے ابھی ابھی کا سارا احوال کہہ سنایا۔

دورانِ گفتگو ان دونوں کی پیشانیوں پر عمیق تر سوچوں کا جال تھا۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو حسب عادت وہ کچھ دیر یونہی بستر پر دراز رہا۔ کھڑکی سے چھن چھن کر سامنے دیوار پر برستی روشنی کی سرخ لکیروں نے اسے خبردار کیا کہ شام بہت نزدیک ہے۔ آنکھیں مسل کر اس نے دیوار گیر گھڑی سے وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ اٹھا اور سیدھے ہو کر پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یوں بیٹھنے سے اس کے سینے پر الٹی دھری ایک نیلی ڈائری اس کی گود میں گر گئی تھی۔ فوراً اسے اٹھا کر اس نے جمائی لیتے

ہوئے پورا منہ کھولا اور ڈائری منہ کے آگے رکھ کر ایک زوردار انگڑائی لی۔ پھر ڈائری کے ورق پلٹتا وہ کوئی مخصوص صفحہ تلاش کرنے لگا۔ بچپن سے اس کی عادت تھی کہ خوبصورت لفظوں کے پیراہن میں ڈھکے نرم و گرم محسوسات کو پوری شدت سے اپنے دل پر جھیلتا تھا۔ اس نے کئی شعراء وادباء کی مختلف غزلوں اور چھوٹے چھوٹے نثری قطعات سے کئی ڈائریاں بھر رکھی تھیں جنہیں اس نے کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ فرصت کے لمحات میں ان ڈائریوں میں درج، کئی عمیق تر بیانات سے زندگی کے متعلق تلخ حقیقتیں کشید کرتا تھا۔ وہ ان ڈائریوں کا عادی تھا۔ آج بھی وہ یادِ ماضی سے وابستہ کئی عذاب تر سوچوں سے بہت گھبرا گیا تو ان دلپذیر فقرات کی نرم نوکیلی دھاروں سے دل کی بنجران زمین پر اگی اداس جھاڑیوں کے سر کاٹنے لگا۔ ان خوبصورت لفظوں سے اس نے جینے کا ہنر سیکھا تھا

ہوتے ہیں کچھ "لفظ" جو کہ "حیات گر" بھی ہوتے ہیں۔۔۔

عرقِ اخلاص میں لتھڑے ہوئے لفظ۔۔۔

عطرِ کرب سے نچڑے ہوئے لفظ۔۔۔

آج بھی اس ڈائری سے وہی "ڈھارسیں" پڑھتا، انہی لفظوں کی لوری سن سن کر وہ سو گیا تھا۔ اب جاگا تو وہی ڈائری اس کی منتظر بھی تھی۔

کافی دیر مختلف صفحات پر طائرانہ نگاہ ڈال کر وہ انہیں الٹتا پلٹتا رہا اور بالآخر ایک صفحے پر وہ رک گیا تھا۔

پھر اس صفحے کے مندرجات کو بغور پڑھتے وہ قدرے چونک گیا۔ ذہانت سے پر اس کی حسین تر آنکھوں میں کوئی "فکر" ہلکورے لینے لگی۔ ایک جملے پر بہت پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے باقاعدہ اس کی قرت کی۔ فی الوقت وہ جملہ اس کی شکستہ کیفیات کا بہترین زبان دان تھا۔

"زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ ہمارے اندرون کے "زخموں" سے رس رس کر پورا "مرہم" بہہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بہت مضبوط لہجے بھی ہماری ذات میں لگے ادھ کھلے "ٹانکوں" کا بھید دینے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمارے سارے گھاؤ عیاں تو ہوتے ہی ہیں۔۔۔ ادھڑنے بھی لگتے ہیں۔ پھر ہم "چھپ" نہیں سکتے۔۔۔"

اس پردرد بیان سے اس کے چہرے پر ایک مجروح مسکان طاری ہوئی۔ اسے ایسے فقرات سے اذیتیں پینے کی لت لگنے لگی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ، ڈائری ایک طرف رکھ کر، خود سے گرم کمبل ہٹا تا وہ سرعت سے اٹھا اور چپل اڑس کر تیزی سے رائیٹنگ ٹیبل پر آیا۔ کرسی گھسیٹ کر وہ جلدی جلدی بیٹھا گیا۔ پھر ٹیبل پر دھرا کاغذ قلم کھینچ کر اس نے اپنے نزدیک کیا اور لکھنا شروع کر دیا۔

یقیناً ان لفظوں نے اسے خود سے کچھ لکھنے کی تحریک دی تھی۔

لفظ "حرف گر" ہوتے ہیں۔۔۔

"تیرے لفظوں میں خوشیوں کا بیاں کامل ہے پر جاناں،

تیری خاموش آنکھوں میں کسی کا غم تو بستا ہے،

تیرے زخموں کی مرہم میں تیرا لہجہ ہے اب قاصر،

کوئی تو تجھ میں روتا ہے تو جب شدت سے ہنستا ہے،

تیرے صحن تخیل کی رہِ یاراں نہیں ساکن،

تو اب بھی جس پر چلتا ہے تیرے گاؤں کا رستہ ہے۔"

ساتھ ساتھ گنگناتے اس نے اپنی زندگی کے "پہلے اشعار" لکھے تھے۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ سالوں سے بکھرے اپنے نازک احساسات کو لفظوں میں سمیٹ کر وہ مکمل "شانت" ہو گیا تھا۔

اسے لگا کہ اس نے اشعار نہیں لکھے۔۔۔ اس اپنا نے "درد" پرویا ہے۔

پھر قلم کو اپنی اس نئی نئی "تخلیق" پر چھوڑتے ہوئے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور دونوں بازو پھیلا کر لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔

اندر کا حبس چھٹنے لگے تو سانس نکھر ہی جاتے ہیں۔

"آپ کے بولنے سے لگتا ہے۔۔۔ آپ لکھ بھی سکتے ہیں۔۔۔"

اپنے لیے کہا گیا "عشناء کوثر سردار" کا یہ جملہ یاد کر کے وہ پوری جان سے مسکرایا۔

نہیں۔۔۔ وہ روح سے مسکرایا تھا۔

"ٹھیک کہتی تھیں آپ۔۔۔لفظ" کرامت" کرتے ہیں۔۔۔ہاں یہ میں نے دیکھا ہے۔"

پھر یونہی بازو پھیلا کر آنکھیں موندے وہ دل ہی دل میں "عشناء کوثر سردار" سے مخاطب ہوا۔

اسی حالت میں کسی کی بہت مترنم گنگناہٹ سن کر اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"میں تجھ سے ہی چھپ چھپ کر۔۔۔ تیری آنکھیں پڑھتی ہوں۔۔۔کون تجھے یوں پیار کرے گا۔۔۔ جیسے میں کرتی ہوں۔۔۔آ۔۔۔آ۔۔آ۔۔آ۔۔۔آ۔۔۔"

میٹھے سروں سے بھیگی یہ آواز اس کے کمرے کے باہر موجود راہداری سے ابھر رہی تھی۔ یکدم اس کے چہرے پر آیا حیرت کا وہ ہلکا سا تاثر بہت بھلا لگا تھا تو حسین آنکھوں کی چاشنی میں گھلا وہ شرارت آمیز تجسس ان کی دلکشی بڑھا گیا۔

"لو جی۔۔۔آ گئی آفت۔آج اس کی تو خبر لیتا ہوں۔"

ایمان کی آواز پہچان کر خود کلامی کرتے ہوئے وہ اٹھا اور ایک ارادی کیفیت سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اسے تنگ کرنے کے خیال سے ہی وہ ساری کلفت بھول گیا تھا۔

باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ راہداری کی بیرونی کھڑکیوں میں سے ایک پر کھڑی وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے۔اس کے بالوں کی لمبی چوٹی حسب معمول اس کی نازک کمر پر جھول رہی تھی اور زرد رنگ ریشمی دوپٹہ ہواؤں کے دوش پر تھا۔اس کے وجود سے اٹھتی خوشبوؤں نے پورے ماحول کو مہکار بخشی تھی۔۔راہداری میں جا بجا لگے مختلف رنگدار آئینوں کا عکس پورے ماحول میں " جھلملا" رہا تھا اور دونوں ہاتھ کھڑکی کی جالیوں پر ٹکائے ،آہستگی سے دائیں بائیں جھولتی وہ اب بھی مسلسل گنگنا رہی تھی۔دور کہیں خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اردگرد سے بے نیاز ہو کر اس کی " محویت" قابلِ دید تھی۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر،متوجہ کرنے کے لیے کھنکارا۔

اس کے کھنکارنے پر اس نے تراشیدہ ابروؤں کی دلکش تان اٹھا کر فقط ایک نظر اسے " گھورا" اور واپس " مصروف" ہو گئی۔

اس کی گنگناہٹ بھی جاری رہی تھی۔

اس کا ردعمل دیکھ کر بے ساختہ مصطفین کے لب چٹکے۔ اسے ستانے کے لیے تھوڑا آگے ہو کر وہ جھکا اور اس کے گانے کی نقل اتارتے ہوئے اس کی نظروں کے کونے "پڑھنے" لگا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے اس کی نظروں کے "ہدف" پر نگاہ کی۔

آسمان کی ساری وسعتوں میں بہت دور اڑتے سفید بگلوں کے ایک خوبصورت غول اور بادل کے چند ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر ان بگلوں کو قطار در قطار محوِ سفر دیکھتا رہا۔

سارا آسمان جھانک کر اس نے دوبارہ ایمان کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی شانِ بے نیازی سے آسمان کی نیلاہٹوں میں گم سم رہی۔ اسے لگا وہ جان بوجھ کر اس کے ساتھ ایسا "سلوک" کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کی موجودگی کے باوجود اس نے گانا بند نہیں کیا تھا۔ غور سے اس کا چہرہ اور آنکھیں کھوج کر اس نے محسوس کیا کہ اس کی حسین تر آنکھوں کے فسوں گر کناروں میں کوئی گہری سوچ ساکن ہے۔

"شکر ہے تم ریڈیو پر نہیں گاتیں۔ اس صورت میں پورا ملک یقیناً بہرہ ہونا پسند کرتا۔۔۔"

اس کے اندازِ غفلت سے چڑ کر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے بلانے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

اور اس کا داؤ چل گیا تھا۔ بے ساختہ وہ خاموش ہو گئی اور اس کی طرف رخ پھیر کر اسے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"میں جہاں بھی گانا چاہوں کم از کم "گا" تو سکتی ہوں۔ خیر ایسا کرو کہ یہ سب فضول باتیں چھوڑ کر تمہیں مجھ سے جو کام ہے تم مجھے وہ بتاؤ اور پھوٹتے بنو یہاں سے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے بالکل۔۔۔"

اس کے دوٹوک انداز میں ڈھکی اس کی "فکروں" کے "اسرار" بھانپ کر وہ ان کے متعلق انتہائی متجسس ہو گیا جبکہ بات مکمل کر کے وہ پھر سے خلائیں ناپنے لگی تھی۔

"آئے ہائے۔۔۔ آج تو اطوار ہی نرالے ہیں۔۔۔ کبھی کسی سے چھپ چھپ کر اس کے نینوں کی "پڑھائی" ہو رہی ہے اور کبھی فضاؤں کے حصار گھیرے جا رہے ہیں۔ بات کیا ہے بھئی؟؟ سچ سچ کہنا۔۔۔ ورنہ خالہ کو خبر کر دوں گا تمہاری ان سب کیفیات کی۔ پھر نہ کہنا کہ پہلے خبردار بھی نہیں کیا۔۔۔"

اس کے قریب ہو کر وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔اس کے شریر لہجے پر وہ دلکشی سے ہنسی۔

"تو تم یوں نہیں جاؤ گے یہاں سے۔یعنی مجھے اپنی جون میں آنا ہی پڑے گا۔۔۔رہی بات گانے کی تو وہ صرف گانا ہی ہے۔میری ذاتی " کہانی" نہیں۔اور چلو پہنچو پھر شاباش اپنی خالہ کے پاس۔سب بتا دو۔میں نہیں ڈرتی۔"

پھر جان چھڑوانے والے انداز میں وہ بے پرواہی سے بولی اور ہاتھ جھلا کر اسے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

اس کی بات سن کر وہ بے تحاشا ہنسنے لگا تو وہ خاموش رہ کر اسے گھورتی ہوئی اس کی ہنسی رکنے کی منتظر ہوئی۔

" آ۔۔۔ہاہا۔۔۔بڑی آئیں تم نہ ڈرنے والی۔میں جیسے جانتا نہیں تمہیں۔ہاں تم ڈرتیں نہیں بس کبھی کبھی شوقیہ کسی بیلن کے آگے آگے اندھا دھند بھاگتی ہو۔اور تب تمہیں اپنا ہوش بھی نہیں ہوتا۔جی۔۔۔"

ہنسی کے دوران ہی وہ اس کا مذاق اڑاتے ہوئے آج صبح کے واقعے کا حوالہ دے کر بولا تو اس کی خوبصورت پیشانی پر بے شمار بل ابھرے۔

"بس ہو گیا تمہارا۔۔۔؟؟ ویسے یہ لڑکیوں کی طرح طعنے دینے چھوڑ نہیں سکتے کیا تم۔؟ دراصل زہر تو تم مجھے پہلے بھی لگتے ہو لیکن وہ کیا ہے نا کہ اسطرح سے "مزید" لگتے ہو۔۔۔اور اگر ساری بکواس کر لی ہو تو اب تم جا سکتے ہو۔پلیز زز۔کر لی ہے نا سب۔۔۔؟؟"

اس کی باتوں سے چڑ کر وہ بہت کاٹ دار لہجے میں بولی اور مسلسل ہنستے مصطفین کی آنکھوں میں جھانک کر طنزیہ طور پر ایک "یقین دہانی" بھی چاہی۔اس کے جلے بھنے انداز ولب ولہجہ پر اس نے ایک اور قہقہہ لگایا تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔سچی مجھے نہیں پتا تھا کہ میں تمہیں اتنا زہر لگتا ہوں۔پر چلو کوئی نہیں۔خود تم کون سا کوئی شہد کی ڈلی ہو۔۔۔بلکہ مجھے تو تم شہد کا "چھتہ" لگتی ہو۔جس کے چھڑنے سے ہر کوئی "سوج ووج" جاتا ہے۔۔۔"

برجستگی سے بات مکمل کر کے بے ساختہ وہ اس سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"افففف۔۔۔چلے جاؤ مصطفین ورنہ میں اسے تمہارے سر پر توڑ دوں گی۔زچ کر دیا ہے قسم سے۔"

اس نے کھڑکی کی سل پر دھرا شیشے کا ایک گلدان اٹھا کر اس پر تان لیا تھا اور پھر اسے ہوا میں جھلاتے ہوئے دھمکی دینے لگی۔

"ہاہاہا۔۔۔اسے تو نیچے رکھو یار۔ میں مذاق کر رہا تھا۔ پلیز۔۔۔منہ سے بات چیت کرتے ہیں نا۔ دیکھو یہ منفی عزائم اچھے نہیں ہیں۔ تمہیں ایسی کسی بھی حرکت کی پاداش میں جیل بھی ہو سکتی ہے۔"

دفاعی انداز میں دونوں ہاتھوں کو اس کے سامنے ڈھال کرتے ہوئے اس نے مصنوعی خوف کا مظاہرہ کیا تو اس کے انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر ہنستے ہنستے اس نے گلدان واپس رکھ دیا۔

"تم بات کو کہیں کا کہیں لے جاتے ہو سچ میں۔ سیدھی سادھی باتوں کو بھی پر پیچ بنانا خوب آتا ہے تمہیں۔"

شانے سے لہر کی مانند پھسل کر سینے پر آئے اپنے ریشمی بال سمیٹ کر وہ کمر پر جھٹکتے ہوئے بولی اور اپنے لفظوں کا خراج وصولتا وہ شدت سے ہنس دیا۔

"بس "ایسا" ہی ہوں میں۔۔۔اب "جیسا" بھی ہوں۔ خیر چھوڑو یہ سب کچھ۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا دیکھ رہی تھیں تم وہاں۔۔۔؟؟ تم شاید کچھ سوچ رہی تھیں۔۔۔"

گردن ہلا کر کھلے آسمان کی طرف اشارہ کر کے اس نے خلوص بھرے لہجے میں پوچھا تو اسے لہجہ و موضوع بدلتے دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرائی۔

لہجوں میں خلوص کی مشک در آئے تو اس کا ادراک پا کر سارے بوجھل رشتے پھر سے جاگ اٹھتے ہیں۔ پیار رویوں سے جھلکتا ہو تو لازم ہے کہ مقابل کی ذات باندھ لیتا ہے۔

وہاں بھی اتنی لمبی نوک جھونک کے بعد ایک دوسرے کے لیے ان کا اخلاص سارا گریز بہا لے گیا تھا۔ اب قدرے سنجیدگی سے اس کے پاس کھڑا وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

طویل سانس بھر کر خود کو نارمل کرتی وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور لکڑی کے ایک چھوٹے ستون سے جا لگی۔ پھر وہاں رک کر اس نے دوبارہ باہر خلاؤں میں نگاہ دوڑائی۔ سفید بگلوں کا وہ غول اور بھٹکتے ہوئے اکا دکا بادل۔۔۔سارا منظر جوں کا توں تھا۔

"مجھے آسمان کے پورے گھیر میں تیرتے ہجرتی پرندوں کے سارے غول بہت اچھے لگتے ہیں مصطفین۔۔۔میں ان کے ساتھ ساتھ اڑنا چاہتی ہوں۔"

اس منظر پر نظریں گاڑے وہ پہلی بار بولی تو وہ مسکرا دیا۔

" تو یعنی آسمان کے سینے پر ان پرندوں کی مانند پھڑ پھڑانے کی وہی عام سی خواہش ہے تمہاری جو عموماً ہر شخص کرتا ہے۔"

اس کا لہجہ عام لیکن انداز جرح کا سا تھا۔ستون سے سر کی پشت ٹکائے کھڑی ایمان نے ایک پل کے لیے نظروں کا زاویہ پھیر کر بغور اسے دیکھا اور وہیں وسعتوں کو کھوجتی وہ مزید گویا ہوئی۔

" آگے سنو۔۔۔شاید تمہیں عجیب لگے لیکن میں ساتوں آسمان چھو کر ان کا سارا " نیل " اپنے اندر نچوڑ لینا چاہتی ہوں۔۔۔"

اب کی بار اس نے قدرے چونک کر اسے دیکھا تھا لیکن پھر ماتھے پر فکر کی شکنیں ڈالے وہ عام لہجے میں بس یہی بولا۔

" تو اس کا مطلب ہے کہ خواہشیں۔۔۔" آسمانی " ہو گئی ہیں۔تم اب آسمان چھونا چاہتی ہو۔۔۔؟؟"

اس کا نرم لہجے میں ان دیکھا اسرار آن ڈھکا تھا۔کہیں دور دور تکتی اس کی شفاف آنکھیں جم کر پتھر ہو گئی تھیں۔

" آسمان چھونا اگر کوئی خواہش ہے تو مجھے آسمان کے پار جانا ہے۔میں خواہشیں نہیں مصطفین۔۔۔" خواب " چھونا چاہتی ہوں۔"

یہاں ٹھہر کر وہ اس کے قریب آئی اور اسے بازو سے تھام کر کھڑکی کے عین وسط میں لے آئی۔

" وہ دیکھو۔۔۔رقصاں پرندے۔۔۔"

ہاتھ بڑھا کر اس نے گویا سفید بگلوں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔وہ متحیر ہوا چپ چاپ اس کے اشاروں کے " تعاقب " میں نکل گیا۔

" کبھی کبھی میں سوچتی ہوں یہ پرندے پاگل ہوتے ہیں کہ آسمان سے " لوٹ " آتے ہیں۔ان کی جگہ اگر میں ہوتی تو شاید کبھی واپس نہیں آتی اور واپسی اگر بہت ضروری بھی ہوتی نا تو اللہ کی قسم مصطفین۔۔۔اڑتے پھرتے ان بادلوں کے ارغوانی کناروں پر پاؤں رکھ کر۔۔۔میں پورا آسمان اپنے ساتھ " کھینچ " لاتی......"

فسوں خیز لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر وہ یوں بولی کہ مصطفین کو لگا کہ اس نے واقعی آسمان کھینچ کر اس کے سر پر الٹ

دیا ہے۔
اس کا لہجہ "مدھم" تھا۔۔۔اور سراب میں "مدغم" تھا۔
اس کی ہر ہر بات پر اس کی فکر بڑھا رہی تھی۔
وہ جانتا تھا خواب راستوں پر شفاف آنکھیں کرچنے سی لگتی ہیں۔ یہ وہ راہِ خارزار ہے کہ جس پر چل کر چھوٹی جانوں کو بھاری غم جھیلنے پڑتے ہیں۔
بہت اذیت۔۔۔کرب و بلا۔۔۔اور درد کی قیدیں۔۔۔آہ و بکا۔۔۔یہی ان راستوں کی، کل کی کل "کمائی" ہے۔
وہ بہت ڈر گیا۔فٹافٹ ایمان کو بازو سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی جانب کرتے ہوئے اس نے "سمجھانا" شروع کیا۔
"خواہشیں رکھنا۔۔۔خواب دیکھنا۔ یہ سب بہت اچھا ہوتا ہے ایمان۔لیکن جن خوابوں کی تعبیریں ناممکن ہوں نا۔۔۔انہیں "دیکھنا" ہی نہیں چاہیئے۔ جینا آسان ہو جاتا ہے۔"
اس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ جواباً وہ مبہم سا مسکرائی اور اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا بازو چھڑواتے ہوئے کچھ کہے بنا اس نے رخ موڑ لیا۔
اپنے ریشمی دوپٹے کا پلو مٹھی میں بھر کر وہ کھڑکیوں کے پار جھانکنے لگی۔اس کی پشت پر خاموش کھڑا وہ اس کے انداز پڑھنے لگا۔
چند لمحات یونہی بیت گئے۔ دونوں اپنے اپنے نظریات کی وضاحت کے لیے لفظوں کی ڈھارسیں جمع کرتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ اس کی جانب مڑ کر اس کی آنکھوں میں باوثوق لہجوں سا اثر پھونکتی وہ اپنے ازلی مخصوص انداز میں گویا ہوئی۔
"یہ سب ہمارے تابع ہوتا ہے مصطفین۔۔۔ کم از کم مجھے تو یہی لگتا ہے۔زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ خواب صرف دیکھو مت۔۔ان پر بھروسہ بھی کرو۔ وہ لازمی طور پر "بار آور" ہوں گے۔خوابوں پر اگر بھروسہ کر لیا جائے تو بدلے میں وہ بھی اس یقین کا "بھرم" رکھنا جانتے ہیں۔ ہمارا ان پر یوں یقین کرنا۔۔۔

ہماری خواہشات کی تکمیل کے لیے کئی طرح کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ خود بخود اور اپنے آپ۔۔۔ تم دیکھنا کہ ایک دن یہ میرے سب "خیالات"۔۔۔ میری زیست کا حاصل ہوں گے۔ مجھے ان پر مکمل، کامل اور پورا بھروسہ ہے۔"

لفظوں کے حسین امتزاج کر کے اس نے عمیق تر جملوں کو خاص ردھم سے ترتیب دیا تھا۔ بغور اسے سنتے مصطفین کو لگا کہ فی الوقت اسے سمجھانا بے کار جائے گا۔

ہوتے ہیں کچھ ایسے بھی لمحات کہ جن کے سحر میں گھر کر لوگ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

کچھ بھی کہے بنا، اس کے سامنے سے ہٹ کر وہ بڑھا اور سل پر لگی جالیاں تھام کر، تا حد نگاہ ادھر ادھر نظریں پھراتا سارے آسمان کا" گھیر " ناپنے لگا۔ پھر ان وسعتوں میں رک کر اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کئی طویل سانس بھرے۔ اس کے سرخ وسفید گلے کی ہلتی نیلی رگوں نے بتایا کہ اس نے منہ میں آئی رطوبتوں کے کئی گھونٹ بھرے ہیں۔ اس کی حرکت اور ہر کیفیت کے ساتھ ساتھ، مسلسل اسے دیکھتی ایمان وہیں جم کر اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ اور درِ اندرون آسمان کا سارا نیل غٹ غٹ اپنے اندر اتار کر وہ مڑا تو اس کے چہرے پر ڈھیروں اطمینان درج تھا۔ وہ حیرت سے اس کا سکون پرکھنے لگی۔ کمال اطمینان سے وہ واپس اس کے سامنے آیا اور اس کے چہرے کو گہری نظروں کے حصار میں رکھ کر دھیرے دھیرے بولا۔

" کئی لوگوں کی خواہشات بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں ایمان۔۔۔ کسی کو سارا آسمان چاہیئے تو کسی کو پوری زمین۔۔۔ لیکن خواہشات کے مارے لوگ اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بعض دفعہ پورا آسمان چھونے کی کوشش میں پیروں تلے موجود وہ تھوڑی سی زمین بھی "سرک" جاتی ہے۔ ایسی صورت میں منہ کے بل گرے ان لوگوں کے حصے میں فقط ایک گہرا پاتال آتا ہے۔ جس میں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا پڑتا ہے۔ پھر کبھی وہ لوگ پورا آسمان تو کیا اس کا کوئی ایک کونا بھی چھونے کی خواہش نہیں کرتے۔ تب انہیں صرف اک زمین کی "طلب" رہتی ہے۔"

اس کا نرم لہجہ بہت اثر انگیز تھا۔ اس نے بات پوری کر دی تو بھی وہ ساکت کھڑی چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ ملفوف لفظوں میں کی گئی اس کی واشگاف باتوں سے اس کا دل دہل گیا تھا۔ اس کی حالت بھانپ کر وہ مزید

بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ ابھی شاید تم میری باتیں نہیں سمجھ سکو گی۔ ہو سکتا ہے یہ تمہیں بری بھی لگیں۔لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ان پر غور کر کے تم کوئی نصیحت حاصل کرو۔ بہرحال بہت لمبی بحث ہے یہ۔ پھر کبھی کریں گے۔اب چلو نیچے مجھے چائے بنا دو۔سر میں درد لگا دیا ہے۔"

بات کے اختتام پر ایک طرف ہوتے ہوئے اس نے راستہ فراہم کیا اور ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

کھوئی کھوئی سی اثبات میں سر ہلاتی وہ بڑھی اور طویل راہداری عبور کرتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگی۔اس سے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے مصطفین کے چہرے پر ہزار ہا فکریں تیر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

مغلیہ یادگار شاہی قلعے کی "ہاتھی پیر" نامی ان شکستہ سیڑھیوں پر آمنے سامنے کھڑے وہ دونوں کردار ایک پل کے لیے بالکل جامد ہو گئے تھے۔لڑکی کے سخت الفاظ اور غلط لہجے نے گویا سارا منظر بگاڑ دیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ دیوتاؤں سے سخت وجود کے حامل اس حسین تر لڑکے کے منہ سے "پتھر" لڑھکے تھے۔

" کیا آپ کو لگتا ہے کہ اپنے کسی بھی عمل کے لیے میں آپ کے سامنے جوابدہ ہوں؟؟ یا کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کو "ان لفظوں" میں مجھ سے ایسا "سوال" کرنے کا اختیار حاصل ہے؟؟ اگر ایسا ہے تو بہت معذرت کے ساتھ کہوں گا محترمہ کہ آپ پھر کسی خوش فہمی کا شکار ہیں یا کسی غلط فہمی کا۔۔۔میں جہاں بھی جس حال میں بھی ہوں۔آئندہ میرے قریب مت آیئے گا۔ چلتا ہوں۔خدا حافظ۔۔۔"

انگلی اٹھا کر اسے سخت تنبیہہ کرتا وہ جاتے جاتے رکا اور اوپر سیڑھیوں پر کھڑے اس کے باقی ساتھیوں پر نگاہِ غلط ڈالتا تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔اس کے بھاری قدموں کی دھمک سے پیدا ہوتی آہٹوں کو اس نے اپنے دل پہ سنا۔اس کے گرم لفظوں کی حرارت پا کر لڑکی کا دل "پگھل" گیا تھا۔بہت بااعتماد ہو کر بھی وہ بڑا "ستایا" ہوا سا لگتا تھا۔اسے اپنے طنزیہ لب ولہجہ کا بہت افسوس ہوا۔کبھی اپنے ساتھیوں کو اور کبھی اسے جاتے دیکھتی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔

وہ بہت ستائے ہوؤں کو اور نہیں ستاتی تھی۔

بالآخراس نے اس پراسرار لڑکے سے مزید "گفت وشنید" کا فیصلہ کیا۔

"اے۔۔۔تم سب لوگ شیش محل پہنچو میں پندرہ منٹ تک وہیں آکر ملوں گی۔پھر بات کرتے ہیں۔ اوکے۔۔۔"اس لڑکے کو ہاتھی پیر کے وسطی موڑ سے مڑتے دیکھ کر اس نے اونچی آواز میں اپنے ساتھیوں کو پکارا اوران کا جواب سنے بغیر، آس پاس موجود دیگر سیاحوں کے لیے مزید "تماشے" کا سامان کرتی ہوئی فوراً اس کے پیچھے سیڑھیوں پر "بھاگنے" لگی۔

یونانی دیوتا کی "خودساختہ سزاؤں" سے اس نے اپنا حصہ "چن" لیا تھا۔

اس کے ساتھیوں نے حیران ہوکر اسے یوں سیڑھیاں اترتے دیکھا اور باہم گفتگو کرتے شیش محل کی جانب پلٹ گئے۔

اس روز کئی کہانیوں کے انجام پر گواہ ہونے والی "ہاتھی پیر" کی ان شکستہ حال دیواروں نے ایک اور کہانی کا آغاز دیکھا تھا۔ان کے سخت دہانوں میں دبے کئی "عشقیہ" مناظر پھر سے پھوٹ پڑے تو صدیوں پر محیط ان قصوں میں دفن سب کردار ایک زوردار انگڑائی لے کر "بیدار" ہو گئے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ وہ سب کردار ایک دوسرے سے گلے ملتے ملاتے سانجھے دکھوں پر رونے لگے۔

محبت گزیدہ ان کرداروں کے زخمی سینوں میں جبر کی بے شمار انیاں گڑی تھیں تو ان کے رستے ماتھوں پر ظلم کی کالی دھاروں کے نشان تھے۔

آگے پیچھے "ہاتھی پیر" کے چوڑے چوڑے زینے پھلانگتے "وہ دونوں" بھی انہی کرداروں میں شامل ہو گئے تھے۔

صدیوں کے سلاسل میں گرفتار ایسی ہر "محبت" کی ساری سانسیں۔۔۔ہاں آج بھی "ساکن" ہیں۔

آہ وبکا، پردرد بیان، اشکوں میں ڈھکا اور رنجیدہ۔۔۔

"عشق" اگر ہوتا ہے تو۔۔۔پھر "نیر سلاسل" ہوتا ہے۔

ہاتھی پیر کے سارے زینے اتر کر وہ تارکول کی بنی اس پختہ شاہراہ پر آرکی جو ایک ذیلی گیٹ سے شروع ہو کر قلعے کے مرکزی عجائب گھر کو جاتی تھی۔ اس حسین "دیوتا" کی تلاش میں اس نے دائیں بائیں دونوں جانب نظریں دوڑائیں۔ شفاف تر طویل شاہراہ، اپنی شکستگی پر نوحہ کناں قلعے کی بلند و بالا دیواریں، ان کے کناروں میں اگیں پیپل کی سبز شاخیں، چھوٹی پارک کی سوکھی گھاس اور مہیب ویرانہ۔۔۔ وہاں سب کچھ تھا لیکن "وہ" نہیں تھا۔ اس کی "یہاں" آمد سے پہلے وہ "اس" منظر سے ہٹ چکا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ اتنی جلدی کدھر گیا۔۔۔"

خود کلام ہو کر وہ پھر سے بھاگی اور شاہراہ عبور کرتی ہوئی قلعے کے اس ذیلی گیٹ پر جارکی جو سکھوں کے "تاریخی گردوارے" کے عین سامنے واقع ہے۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر قطار میں کھڑے لوگوں نے متجسس نظروں سے اسے حواس باختہ انداز میں اس شاہراہ پر بھاگتے دیکھا۔ اس کی متلاشی نگاہوں میں عجب سی بے چینیاں محوِ رقص تھیں۔

"یا اللہ اسے ایک بار ملوا دے۔۔۔"

اس کے دلکش لبوں کے فسوں خیز دھاروں نے کانپتے ہوئے دعائیں مانگیں اور واپس پلٹ کر وہ اسی شاہراہ پر بھاگنے لگی۔ عجائب گھر کی جانب جاتے ہوئے اس کا لال رنگ دوپٹہ ہواؤں کے دوش پر اس کے پیچھے پیچھے دور تلک لہرا رہا تھا۔ تیز ہوائیں، دوپٹے کی پھڑ پھڑاہٹ میں شامل اس کے بھاگتے قدموں کی آواز اور مضطرب حالت۔۔۔ پورا منظر "تڑپ" گیا تھا۔

ڈھلوانی شاہراہ کا پہلا موڑ کاٹ کر وہ عجائب گھر کی جانب مڑی تو دور آخری کنارے پر باوقار انداز میں چلتے اس "دیوتا" کو دیکھ کر اس کی آنکھیں "ٹھہر" گئی تھیں۔

یکا یک وہ رکی اور اپنی دائیں جانب موجود ایک دیو قامت دیوار سے اپنا وجود ٹیک کر ہانپنے لگی۔ یقیناً وہ بہت تھک گئی تھی۔ اس کا لمبا دوپٹہ وہیں اس کے پیروں میں سڑک پر جا بجا بکھر گیا۔ چند لمبی لمبی سانسیں بھر کر اس نے تنفس ہموار کیا اور دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلانے لگی۔

"آہ۔۔۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ آخرکار یہ مل ہی گیا۔"

ڈھلوانی شاہراہ اترتے، کالج کی وردی میں ملبوس دونوجوان لڑکوں نے اسے دیکھ کر ایک دوسرے کو "دعوت نظارہ" دی تو انہیں گھورتے ہوئے دیوار کی ٹیک چھوڑ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

اس کی گہری نگاہ کا عمیق تر حصار اسی دیوتا کے "گرد" تھا۔

اردگرد، آس پاس اور سب سے بے نیاز ہو کر وہ تیز رفتار قدموں سے عجائب گھر کی جانب گامزن تھا۔

وہ قلعے کی داخلی پارک میں نصب پہلی تاریخی "توپ" تک پہنچا تھا کہ اس لڑکی نے اسے جا لیا۔

"ایکسکیوز می۔۔۔ ایک منٹ رکیں۔ میری بات سنیں پلیز۔۔۔"

اس کے آگے ہو کر دونوں ہاتھوں سے اسے رکنے کا اشارہ کرتی ہوئی وہ الٹے قدموں سے اس کے آگے آگے چلنے لگی۔ اسے یوں اچانک سامنے پا کر اس کی پیشانی پر بے شمار بل ابھرے لیکن وہ رکا نہیں ہاں رفتار لازمی کم کر لی۔

"مجھے آپ کی مزید کوئی بات نہیں سننی۔۔۔ ہٹیئے میرے آگے سے۔"

ادھر ادھر دیکھ کر اس سے نظریں ملانے سے گریز کرتا وہ سختی سے بولا۔

"لیکن مجھے آپ سے مزید بات کرنی ہے اور ضرور کرنی ہے۔ آپ کو سننی ہوگی۔۔۔"

اسی رفتار سے الٹے قدموں چلتی، اپنے پیچھے "راستہ" دیکھتی ہوئی وہ دوٹوک انداز میں بولی تو یکایک وہ رک گیا۔ اسے اس کے گرنے کا خدشہ تھا۔ وہ چہرے پر مسلسل آتے بال بھی بار بار ہٹا رہی تھی۔

"اوہو یوں آپ گر جائیں گی۔ دِکھ نہیں رہا کیا؟؟"

لب بھینچ کر وہ اسی سخت لہجے میں بولا۔ پھر وہ مڑا اور تین چار قدم واپسی کی جانب چل کر دوبارہ اس کے سامنے آ رکا۔ اس کا یہ انداز عجب سی ایک بے بسی کے اظہار جیسا تھا۔ وہ حیرت در حیرت اس کی "حالت" جانچ رہی تھی۔

"کیا چاہتی ہیں آپ مجھ سے؟؟ کیوں بار بار مجھے مخاطب کرتی ہیں؟؟ آپ کو یہ سب نہیں سمجھ آئے گا۔۔۔ آپ سمجھ سکتی ہی نہیں۔ پلیز جائیں یہاں سے۔ یوں میرے راستوں میں مت آئیں۔"

یہاں وہاں دیکھتا وہ التجائیہ لہجے میں بولا اور دائیں جانب جا کر رخ پھیرے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے لہجے سے پہلی سی وہ "سختیاں" مفقود تھیں۔ اس کے پیچھے چلے آنے سے اس کی ساری سختی ڈھل گئی تھی۔ وہ اس کی جانب دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

اور وہ صرف اسی کو دیکھ رہی تھی۔

آس پاس، اردگرد اور سارے میں۔۔۔ صرف اور صرف "وہی" تھا۔ باقی اگر کچھ تھا بھی تو سب کچھ فضول تھا۔

اس کے چوڑے شانوں سے عیاں مضبوطی سے متاثر ہوتی وہ آہستگی سے چل کر اس کے ساتھ جا رکی۔ اس پل اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ اسے ان "ناموں" میں سے ایک سے "آگاہ" کر دے۔ وہی تین نام کہ جن سے "لگ کر" وہ بادشاہی مسجد کی راہداریوں میں "اکثر" روتا ہے۔

اس "اکثر" پر اسے اپنے تئیں مکمل یقین تھا۔ ورنہ اسے تو اس نے فقط ایک بار وہاں دیکھا تھا۔

زندگی میں کچھ یقین ہم بے وجہ بھی پال لیتے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ سب "یقین" دراصل ہمارا "گمان" ہو کر بھی یا تو بالکل "حقیقت" ہوتے ہیں یا پھر اس کے قریب تر۔۔۔

"کیوں نہیں سمجھ سکتی میں؟ ایسا کون سا دکھ ہے آپ کو جو صرف آپ "جان" سکتے ہیں؟؟ یا ایسا کون سا راز ہے آپ کا جس میں کوئی دوسرا نہیں "شریک" ہو سکتا؟؟ پلیز مجھے بتائیں کہ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔۔۔ آپ کی کہانی کیا ہے؟ اس کے دوسرے "کردار" کدھر ہیں؟؟"

نرم لہجے میں دھیرے دھیرے بولتی وہ بمشکل خود کو "ایک نام" لینے سے روک سکی تھی۔ وہ متجسس تھی کہ وہ کیا بتاتا ہے؟ ورنہ اس کی کہانی کے ایک کردار سے وہ خوب خوب واقف تھی۔ اس کی بات سن کر وہ مڑا اور پہلی بار بھرپور نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ان سفال گر آنکھوں کی سحر گری سے مسحور ہونے لگی۔ وہ باندھ لینے والی تھیں۔

"زندگیوں میں دکھ جان لینے یا رازوں میں شراکت پانے سے بھی بڑے پہلو موجود ہوتے ہیں۔ سوال یوں ہو کہ ایسی کیسی "اذیت" ہے جو صرف کوئی ایک "جھیل" سکتا ہے۔۔۔؟؟ تب کہیں بات کسی بات کے

قریب قریب ہوتی ہے۔ اور آپ نہیں سمجھ سکتیں کیونکہ سر میں درد کو سمجھنے کے لیے سر میں درد ہونا ضروری ہوتا ہے۔"

ملفوف لہجے میں وہ عمیق تر اذ کار چھیڑ رہا تھا اور وہ اس کے لفظوں کی تہہ میں ڈھکے مفاہیم اخذ کرنے لگی۔

"اور ابھی وہاں سیڑھیوں پر آپ کا سوال انتہائی غلط تھا۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھیئے گا کہ روتے ہوؤں کے ساتھ رو نہ سکیں تو ان پر ہنسنا بھی نہیں چاہئیے۔ کسی کی آنکھوں سے بہتا کوئی ایک بھی "نیر" بہر حال "تماشا" نہیں ہوتا......"

اس کی نظروں کی چاشنیاں ماند پڑ کر وہاں پھر سے درد جل اٹھا تھا۔ وہ بے ساختہ نظر چرا گئی۔ وہ سب سچ کہہ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اسے اپنے پہلے رویے کی باقاعدہ معذرت بھی کرنی ہے۔

"دیکھیں باتیں تو بہت سی کر سکتی ہوں میں اور وضاحتیں بھی بہت سی ہیں میرے پاس۔ لیکن میں فقط یہی کہوں گی کہ میرے سوال سے زیادہ غلط شاید میرا "لہجہ" تھا۔ پوچھنا میں نے وہاں بھی یہی چاہا تھا جو کہ اب پوچھا ہے۔ بس جانے کیسے میرا لہجہ منفی ہو گیا۔"

اسے نظریں چراتا دیکھ کر وہ جو جانے کے لیے اپنی جگہ سے ہلا تھا اس کی بات سن کر یکدم رک گیا۔

حسین آنکھوں میں جلتی دلکش قندیلیں عجب عجب سی لوئیں دینے لگیں۔

"دار پر کھینچ لینا چاہئیے ایسے لہجوں کو جو سوالات کی روح کچل دیں۔۔۔ "بات" نہیں ہوتی۔۔۔ یہ "اندازِ بیان" ہوتا ہے جو "مفاہیم" بدل دیتا ہے۔ لہجوں کو کبھی بھی اتنا "دوٹوک" اور "برجستہ" نہیں ہونا چاہئیے کہ کسی کی "ذات" بکھر جائے۔ اور میری کہانی کی کھوج سے آئندہ اجتناب کیجیئے گا۔ کچھ نہیں رکھا اس میں۔ بس یوں سمجھئے کہ اس کے سب حقیقی کردار واقعی "کہانی" ہو گئے ہیں۔ اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔۔"

زخم زخم لہجے میں اس کے "لہجے" پر پکڑ کرتا وہ بھرپور کرب سے بولا اور بات کے اختتام پر اچانک ماتھے پر ہاتھ رکھ کر الوداع کہتا ہوا اس کی ایک جانب سے نکلتا چلا گیا۔

اس کے سفید ہاتھ پر جھلکتی نیلی رگیں دیکھ کر وہ بالکل جامد ہو گئی تھی۔

"لفظوں" کے بھید بھاؤ میں الجھ کر "لہجوں" کے اندرون کا درس دیتا یہ شخص کون تھا آخر......؟؟؟

گردن موڑ کر اس نے دور تلک۔۔۔ اس کا کرب جانچا۔

☆......☆......☆

پاکستان کے لوگوں سے اپنائے گئے گیتی کے مثبت رویے سے متعلق ناز کے خدشے بے جا نہیں تھے۔ یہاں اس کی تمام تر "حرکات وسکنات" پر کئی بھارتی انتہا پسند تنظیموں کی گہری نگاہ تھی۔ سوشل میڈیا، اینٹرٹینمنٹ چینلز، نیوز چینلز، اور نامور صحافیوں سمیت کئی لوگ پاکستانیوں سے روا اس کے اچھے رویہ وسلوک کی مسلسل تشہیر کر رہے تھے۔ وہاں بھارت میں اس کی ساتھی اداکارئیں اور دیگر حاسدین ان سب "اطلاعات" کا اندر ہی اندر منفی پرچار کر رہے تھے۔ اس کے باپ کے سیاسی اثر ورسوخ کی بدولت اب تک کوئی بھی کھلم کھلا اس کے خلاف بیان بازی نہیں کر سکا تھا لیکن من ہی من میں ہر ایک شخص اس کی بھرپور مخالفت کو بالکل تیار بیٹھا تھا۔ ایک "دشمن دیش" سے اس کی ہمدردیاں اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی تھیں۔ اس کا ہر "طرز و عمل و طور اطوار" اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ اسے پاکستان سے خصوصی اور خاص لگاوٹ ہے۔ درِ اندرون حالات تیزی سے اس کے مخالف ہو رہے تھے۔ اپنی دھن میں مگن وہ بے خبر تھی کہ اس کے دوست بھی اس کے مخالف ہوئے جاتے ہیں۔ اس کے سارے مخالفین اب بس اس کی کسی ایک واشگاف غلطی کے منتظر تھے کہ جس کے سبب اور باعث وہ اس کے خلاف پکا سارا لاوا باہر انڈیل سکیں۔

وقت کی ساری پہریں ہر ہر کروٹ پر اس کا "مستقبل" "بدل" رہی تھیں۔

انسان نے حالات کے پاٹ میں پسنا ہو تو وقت چاک سا گھومتا ہوا اس کی تقدیروں کے صفحے الٹ جاتا ہے۔ تدبیر کر کے بھی تقدیر کے آگے سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔

اس روز، دن کا اجالا شب کی سیاہی کے اثرات کو پوری طرح پاٹ بھی نہیں سکا تھا کہ ان کا قافلہ پی۔سی بھوربن سے لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ دو لینڈ کروزرز پر مشتمل اس قافلے میں اگلی گاڑی پر، ڈرائیور اور ایک پرائیویٹ گارڈ کے ہمراہ گیتی اور ناز سوار تھیں اور پچھلی گاڑی میں پاکستانی سرکار کی جانب سے ان کی حفاظت پر تعینات چار پولیس اہلکار تھے۔ معروف اداکارہ ہونے کی وجہ سے گیتی کو پاکستان آمد کے فوری بعد یہ سیکیورٹی پروٹوکول مہیا کر دیا گیا تھا۔

گیتی کی خواہش تھی اسلام آباد سے لاہور کے راستے میں آنے والے تمام شہروں کو دیکھتے ہوئے جائیں لہٰذا پلین یا موٹروے کی بجائے انہوں نے جی ٹی روڈ کا سفر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اونچی خم دار سڑکوں پر سفر کرتے وہ لوگ بتدریج نشیب کی جانب گامزن تھے۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھی گیتی اور نازنین خوبصورت مناظر کی تصاویر بنا کر ساتھ ساتھ تبصرے بھی کر رہی تھیں جبکہ فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ہمراہ بیٹھا سیکیورٹی اہلکار بالکل خاموش اور مستعد تھا۔ وہ نزدیک آتی ہر گاڑی یا ہیوی بائیک پر شاطر نگاہ رکھتا اور پھر اس کے گزر جانے پر مطمئن ہو کر ایک نظر ان دونوں کی باہم "مصروفیت" پر بھی ڈال لیتا۔

مری شہر عبور کر کے وہ لوگ بر لب سڑک واقع ایک گاؤں میں پہنچے تو سڑک پر رش زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں رکنا پڑا۔

اگلی نشستوں کی پشت پر ہاتھ رکھ کر وہ دونوں جھکیں اور دیکھا کہ کالج کی وردی میں ملبوس کئی لڑکے وہاں کھڑی ایک بس سے نکل کر قطار در قطار اوپر پہاڑی پر چڑھ رہے ہیں۔

"اففففف۔۔۔ اب یہ کیا رکاوٹ ہے یار۔ وقت کا ضیاع۔۔۔ میری بڑی جان جاتی ہے یوں بار بار رکنے سے۔"

نازنین نے جھلا کر خالص اردو لہجے میں کہا۔ گیتی کے کردار کا لب ولہجہ متاثر نہ ہو اس وجہ سے اس نے بھی اس کے ساتھ ساتھ اردو بولنا سیکھ لی تھی۔ اس کی بات پر گیتی نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر خاموش رہ کر اپنی جانب کے شیشے سے پار پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں دیکھنے لگی۔

"ارے۔۔۔ کہیں یہ گیتی کے لیے مذہبی انتہا پسندوں کا کوئی ٹریپ تو نہیں۔۔۔؟؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ بھائی دھیان کرنا پلیز۔"

یکا یک ماتھے پر بل ڈالے وہ فکر مند لہجے میں گارڈ سے مخاطب ہوئی اور پھر مڑ کر متوحش نظروں سے اپنے پیچھے آنے والے پولیس اہلکاروں کو دیکھا۔

وہ اسلحہ تھامے لینڈ کروزر سے اتر کر ان کی گاڑی کے نزدیک انتہائی مستعد کھڑے تھے۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

اس کی بات پر گیتی، ڈرائیور اور سیکورٹی اہلکار نے بیک وقت چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں میڈم جی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ طلباء کون ہیں۔؟ دراصل یہ "نمبل" گاؤں ہے۔ اور وہاں اوپر پہاڑی پر سکاؤٹس ٹریننگ کیمپ لگتا ہے ہر سال۔ مختلف کالجز سے یہ طلباء اسی ٹریننگ کے سلسلے میں آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو پاکستان میں کسی قسم کی مذہبی انتہا پسندی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پلیز ٹرائی ٹو فیل لائک ہوم۔۔۔"

گارڈ نے اس کا ڈرا سہا انداز پرکھ کر، باری باری ان دونوں کو دیکھتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا تو یہ تفصیل سن کر اس کی متغیر رنگت بتدریج معتدل ہو گئی۔

"اٹس کوائیٹ نارمل ڈیئر۔۔۔ انڈیا میں بھی تو سڑکوں پر رکنا پڑتا ہے۔ اکثر۔۔۔ یونہی۔۔۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے۔۔۔ اور پھر سیکیورٹی بھی تو ہے ساتھ۔ اپنے اس بے وجہ خوف پر قابو پاؤ ناز۔۔۔ ہمارے میزبان ہیں وہ۔ عدم اعتماد سے انہیں برا لگ سکتا ہے۔"

گیتی نے بھی اس کا گھٹنا تھپتھپا کر کہا۔ آخری بات اس نے سرگوشی میں کی تھی۔ اثبات میں سر ہلا کر ناز نے سیٹ کی پشت پر ٹیک دیا۔

گیتی نے مسکرا کر گارڈ اور ڈرائیور کی طرف نگاہ کی۔ وہ دونوں باہر متوجہ تھے۔

اسی دوران اس کا موبائل بجنے لگا تو ناز گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"رامیش ہے۔۔۔ کیا دوکیہ کے لیے پوچھے گا۔ کہنا کل سویرے نکل کر ہم پہنچ جائیں گی وہاں اور پرسوں سیٹ پر ملیں گی۔ میں آج نکلنے کا پلان کینسل کر چکی ہوں۔"

سکرین سے نام پڑھ کر اس نے موبائل ناز کی طرف بڑھا دیا۔ گھر والوں کے علاوہ اس کی تمام پروفیشنل کالز وہ ہی ریسیو کیا کرتی تھی۔

"ہیلو۔۔۔ یس رامیش۔۔۔ ناز ہیئر۔۔۔"

موبائل تھام کر اس نے کان سے لگایا اور عادتاً یہ تعارفی جملہ ادا کیا ورنہ ان کے سارے کانٹیکٹس کو بخوبی علم تھا کہ گیتی کی کالز وہ ہی ریسیو کرتی ہے۔

"ہوٹل کانز بیپٹ۔۔۔ صحیح۔۔۔ جی بالکل گیتی کو اس بات کا علم ہے۔"

یہاں اس نے رک کر رامیش کی اگلی بات سنی اور مزید بولی۔

"نہیں آج نکلنے کا ارادہ تھا لیکن اب کسی وجہ سے کل سویرے نکلنا ہے۔"

اس مختصر بات کے بعد اس نے دوبارہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے رامیش کی بات سنی اور پھر کسی قدر تیز لہجے سے بولی۔

"ارے۔۔۔ تم بے فکری سے اڑان بھرو یار۔ ہم لازمی پہنچ جائیں گی۔ میں کہہ رہی ہوں نا۔"

یہ جملہ ادا کر کے وہ اپنی طرف متوجہ گیتی کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔ شاید وہ اس سے کسی قسم کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

اسی دوران ٹریفک رواں ہوئی تو ان کی گاڑی نے بھی آگے رینگنا شروع کیا۔اس نے مڑ کر دیکھا کہ پولیس اہلکار بھی چاروں طرف عقابی نگاہ دوڑا کر اب واپس گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔

"رامیش ایک ہی بات بار بار کرو گے تو لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ میں فون بند کر دوں گی۔ جب میں کہہ رہی ہوں تو اسی کو کافی اور بہت سمجھو۔ اسے اتنی فرصت نہیں کہ تمہاری ہر کال خود ریسیو کرے۔"

دوسری جانب سے کیے گئے کسی اصرار پر اس نے دوٹوک لہجے میں کہا تو گیتی نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ ناز ہر بار یونہی رامیش سے دوبدو ہوتی تھی۔ ان دونوں کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔

"اچھا ضرور۔۔۔ بائے۔۔۔"

اس نے کال کاٹ کر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا اور باہر جھانک کر رفتار پکڑتی گاڑی کا "بہاؤ" جانچا۔

اردگرد مناظر تیزی سے پیچھے گزر رہے تھے۔ ان کا سفر پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

موبائل پکڑ کر گیتی چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ باہم مزاج آشنائی کی بدولت وہ جانتی تھی کہ وہ خود ہی فون کال کی تفصیلات سے آگاہ کر دے گی۔

"یہ رامیش آدھا کھسکا ہوا لگتا ہے مجھے۔ ضد کر رہا تھا کہ تم سے بات کرواؤں اس کی تاکہ تم اسے اپنی کپادوکیہ آمد پر یقین دہانی کروا سکو۔ حد ہے۔"

وہی ہوا کہ ایک نظر ادھر ادھر دیکھ کر وہ اب گیتی کو تفصیلات بتا رہی تھی۔

"ہاں وہ آدھا کھسکا ہوا ہے اور تم پوری کہ ہر بار اس سے لڑ پڑتی ہو۔ یہ بھی تو "حد" ہی ہے چندا۔۔۔"
اس نے جواباً شرارت سے کہا تو اسے گھورتے ہوئے وہ تیز لہجے میں بولی۔
"بس کرو گیتو۔۔۔ تمہارا خیال کر کے چپ کر جاتی ہوں ورنہ اس کا دماغ میں دو منٹ میں درست کر سکتی ہوں۔"
اس کی بات سن کر گیتی کی آنکھوں سے جھلکتی شرارت کی چمک گہری ہو گئی۔
"وہ تو تم کسی کا بھی کر سکتی ہو دو منٹ میں ہی واقعی لیکن درست نہیں۔۔۔ صرف خراب۔۔۔"
برجستہ لہجے میں کہہ کر وہ کھلکھلائی تو ناز نے ایک پل کو تھم کر، خفگی سے اسے گھورا اور پھر خود بھی ہنس دی۔
گارڈ اور ڈرائیور نے بیک وقت گردن موڑ کر ان کی باہمی نوک جھونک دیکھی اور پھر مسکراتے ہوئے آگے دھیان کر لیا۔
"اچھا سن تو لو کہ کیا کہہ رہا تھا۔۔۔"
اس نے ہنسی روک کر کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"ہوٹل کا نزپٹ کپادوکیہ کا فرسٹ فلور بک ہو چکا ہے سارے کریو کے لیے۔ اور تمہیں پرسوں شام میں وہاں موجود ہونے کا حکم ہے ورما سر کی طرف سے۔ شوٹنگ کے لیے اجازت نامہ بھی مل چکا ہے اور باقی سب انتظامات بھی ہمارے پہنچنے سے پہلے مکمل ہوں گے۔ رامیش کا کہنا ہے ورما سر رات کو خود بھی تم سے بات کریں گے۔"
تفصیل سن کر گیتی نے سر کو خفیف جنبش دے کر اثبات کا اشارہ کیا اور پھر اس کے ماتھے پر لکیرِ فکر ابھری۔
"او کے۔۔۔ رفیق صاحب کو انفارم کر دو کہ کل صبح کی سیٹ بک کروا دیں ہماری اور لازمی طور پر کروا دیں۔ ورما سر کا کہا حرف آخر ہے۔ ہمیں وقت سے پہلے وہاں موجود ہونا چاہیئے۔"
ایک لمحاتی توقف کے بعد اس نے سنجیدگی سے کہا تو ناز موبائل نکال کر رفیق صاحب کا نمبر ملانے لگی۔ پھر کال اٹھائے جانے پر اس نے ان کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا، ایک دو متعلقہ جزئیات بتائیں اور ان کا مثبت جواب پا کر کال کاٹ دی۔ گیتی مسلسل اسے دیکھتی گویا کسی "سوال" کی منتظر تھی۔

"رفیق صاحب بھی یہی پوچھ رہے تھے اور مجھے بھی یہ بتاؤ کہ آج روانگی کیوں کینسل کی تم نے؟ مجھے بتایا بھی نہیں پہلے۔ رامیش کی کال اگر تم سے الگ میرے نمبر پر آتی تو میں یہی کہنے والی تھی کہ ہم شوٹنگ کے بعد آج ہی نکلیں گی ترکی کے لیے لاہور سے۔"

موبائل واپس پکڑاتے ہوئے ناز نے اس کا متوقع سوال کیا تو وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

"شکریہ۔۔۔"

موبائل تھام کر اس نے ایک نظر گارڈ اور ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اپنے اپنے "دھیان" میں گم تھے۔

"یار پہلے کہہ دوں کہ جو بھی وجہ بتاؤں گی تم خفا نہیں ہو گی ہاں۔۔۔"

اس نے انگلی اٹھا کر جیسے کوئی وعدہ چاہا۔

"اوہ اچھا یار۔ بولو تم۔ تجسس مت پھیلاؤ خوامخواہ۔ جو کچھ تم یہاں کر رہی ہو اس سے راضی میں پہلے بھی کوئی نہیں۔ اب مزید کیا نیا ہے وہ بھی بتا دو۔۔۔؟؟"

وہ بھی اسی کی دوست تھی فوراً سمجھ گئی کہ کوئی خاص بات ہے۔ اس کے جھنجھلائے ہوئے لہجے پر پہلے وہ بے طرح ہنسی اور پھر کچھ دیر بعد سنجیدگی اختیار کر لی۔

"اچھا سنو۔۔۔ وہ صحافی اور اینکر "ممتاز محمود" مجھ سے بہت دنوں سے انٹرویو کا وقت مانگ رہا تھا لیکن میں چونکہ بہت مصروف رہی تو اس سے معذرت کرتی رہی ہوں۔ ٹال مٹول بھی کی کافی۔ اب اسے جیسے ہی خبر ہوئی کہ "خدا کے بھگت" کے اس پہلے شیڈول کی آخری شوٹنگ آج ہے تو بضد تھا کہ لازمی وقت دوں۔ اس نے سروے کروایا ہے اور میرے پاکستانی فینز کسی بھی پاکستانی نیوز یا انٹرٹینمنٹ چینل پر مجھے لائیو دیکھنے، یا سننے کو بے تاب ہیں۔ سمجھو مر رہے ہیں۔ تو تھوڑا سوچنے پر مجھے بھی یہی مناسب لگا کہ واپسی سے پیشتر میرا ایک دھواں دار قسم کا انٹرویو لازمی ہونا چاہیئے یہاں۔۔۔ لہٰذا اسے ہاں کہہ دی اور اب آج رات 9 سے 10 بجے تک میں اس کے ساتھ سٹوڈیو سے لائیو ہوں گی۔۔۔ اور اب تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہیں کیوں نہیں بتایا۔۔۔ وہ "ممتاز محمود" ہے ناز۔ ممتاز محمود۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے تفصیلاً بات مکمل کی اور آخر پر صحافی کا نام دہراتے ہوئے ایک لمبا سانس خارج کیا۔ یوں جیسے کوئی بوجھ اتارا ہو۔ جبکہ ناز بالکل ساکت تھی۔ وہ تحیر آمیز نگاہوں سے لگاتار اسے بس "دیکھ" رہی تھی۔ یوں جیسے کچھ کہنے کو لفظ جوڑ رہی ہو۔ چند ساعتیں اسی طرح صرف ہوگئیں۔

"اے رام۔۔۔ پگلا گئی ہو کیا گیت؟؟ ممتاز محمود کو ہاں کر دی انٹرویو کے لیے۔ اور کوئی چینل یا کوئی صحافی نہیں تھا؟؟ بس ایک یہی رہ گیا تھا کیا؟؟ پتا ہے نا کہ وہ بال کی بھی کھال "اتارتا" نہیں بلکہ "ادھیڑتا" ہے۔ کیسے کیسے اوٹ پٹانگ سوالات کرتا ہے اپنے مہمانوں سے۔ اندازہ بھی ہے کیا تمھیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے؟ مکمل پاگل ہو تم یار۔ ارے وہ تو اس کی بھی کنٹرو۔ورسیز پیدا کر لیتا ہے جس کی سرے سے نہیں ہوتیں۔ اور تم تو اس معاملے میں بھاگیہ شالی ہو۔ "خدا کے بھگت" کم تھی کیا جواب ممتاز محمود کو انٹرویو دینے چلی ہو؟؟"

اس نے جو بولنا شروع کیا تو بے تکان بولتی چلی گئی۔ اس کی ہر بات کے ساتھ ساتھ تفہیمی انداز میں سر ہلاتی وہ اس کے "بول لینے" کی منتظر رہی اور جب اتنا بول کر یہاں شاید وہ سانس لینے کو رکی تھی کہ اس کے مزید کچھ بھی بولنے سے پیشتر گیتی جلدی سے بولی۔

"اے اے بس یار۔۔۔ پلیز کالم ڈاؤن۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کیا "چیز" ہے۔ کئی پاکستانی اداکاروں و دیگر شخصیات کے انٹرویوز دیکھ چکی ہوں اس کے ساتھ۔ مجھے اس کے ہر سوال کا پہلے سے اندازہ ہے۔ فکر کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا سب بھول کر صرف یہ سوچو کہ اس سے مجھے پبلسٹی کتنی ملے گی۔ اس کے شو کی ریٹنگ، ٹی آر پی سب اے کلاس ہے۔ سو لیٹ اٹ گو آن ودمی یار۔۔۔ مجھے یقین ہے میں اس کا سامنا کر سکتی ہوں۔ میں مکمل پر اعتماد ہوں کہ اس کے ہر لاجیکل اینڈ ایون الاجیکل بھی۔۔۔ تمام سوالات کے جوابات ہیں میرے پاس۔۔۔"

اس کے گھٹنے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اس نے دھیرے دھیرے بات مکمل کی۔ اس آنکھوں سے جھلکتے یقین کی لپٹوں نے ناز پر گہرا اثر کیا۔ اس کی فکریں شانت ہوئیں یا نہیں لیکن اس کے تاثرات بتدریج نارمل ہو گئے تھے۔ اس نے عجب سی ایک بے بسی سے گیتی پر نگاہ کی اور کچھ کہتے کہتے رک کر مڑی اور اپنی جانب کے شیشے سے پار سڑک کنارے لگے بڑے سے نیلے بورڈ کو دیکھا۔ وہ لوگ اسلام آباد سے صرف سات کلومیٹر کی مسافت پر

تھے۔ پھراس نے واپس منتظر نگاہوں سے خود کو دیکھتی گیتی کی طرف رخ کیا۔

"دیکھو گیت۔۔۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں کہ تم پر اعتماد ہو یا تمہیں خود پر بہت یقین ہے۔ لیکن میں نے اپنی زندگی سے ایک بات یہ بھی سیکھی ہے کہ اپنے "اعتماد و یقین" کو کسی دوسرے کے "یقین و اعتماد" کے مقابل آزمانا نہیں چاہیئے۔ ایسی ہر آزمائش سراسر بے وقوفی ہوتی ہے۔ اور معاف کرنا گیت مجھے لگتا ہے تم اس وقت یہی کر رہی ہو۔"

اس نے دوٹوک لہجے میں بہت خاص بات کہی تھی اور گیتی کو اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔

"ہمم۔۔۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔ اور میں اب بھی یہی کہوں گی کہ میں یہ سب آسانی سے دیکھ سکتی ہوں۔ سو پلیز ڈونٹ وری یار۔"

سیٹ پر دھرا ناز کا ہاتھ دباتے ہوئے اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور گویا بات ختم کرتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

اس کے ہاتھ کی نرم گرفت سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے ناز نے ہونٹ بھینچ کر بے بسی سے اسے دیکھا اور رخ پھیر لیا۔ وہ بے خبر تھی کہ تھراتے ہونٹوں سے آہیں روکتی گیتی کی بند آنکھوں میں ہلتے پپوٹوں کے پیچھے وہی "تقسیم" زندہ ہے۔

کبھی کبھی "روح شناس" ہو کر بھی ہم اپنے دوستوں کے "رخ شناس" نہیں ہوتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم جو اپنے دوستوں کے اندرون کھنگال لیتے ہیں ان کا چہرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ان دونوں کا تعلق بھی باہم دور ہوئے افکار و نظریات کی اسی نہج پر رواں دواں تھا۔

تعلق ایسے بھی ہوتے ہیں۔۔۔

بدل رہے سے۔۔۔ پگھل رہے سے۔۔۔

سکڑے سمٹے۔۔۔ ہموار بہت۔۔۔

☆......☆......☆

ثومیہ نے گو کہ بھرپور کوشش کی تھی کہ لیکچرز کینسل ہو جانے کے باوجود زیادہ سے زیادہ وقت یونیورسٹی میں گذار کر واپس آئے لیکن جب سب کلاس فیلوز ہی نکل آئے تو اس کا وہاں اکیلے رکنا نامناسب تھا۔ یوں بلاوجہ اور تادیر وہاں رکنے کا سبب اس کے والد شاہجہان عادل کا رویہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وقت سے پہلے گھر واپس پہنچی اور انہیں پتا چلا تو وہ غصہ ہوں گے کہ گئی ہی کیوں تھیں تم؟ اور اس کا خدشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ وہ واپس گھر پہنچی تو سب سے پہلے اس کا سامنا شاہجہان عادل سے ہی ہوا تھا۔ وہ کوئی اہم دفتری دستاویزات کی فائیل لینے گھر آئے تھے اور ابھی واپس نکل رہے تھے کہ گھر کی دہلیز پر ثومیہ سے ملاقات ہوگئی۔

"السلام علیکم بابا جان۔۔۔"

اس نے کسی قدر جھجک کر سلام کیا۔ انہیں یوں اچانک سامنے پا کر گویا اس کا بس نہیں چلا تھا کہ یہاں سے غیاب ممکن ہو۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ اور تم اس قدر جلدی کیسے آگئیں؟؟ ابھی تو وقت ہی کچھ نہیں گذرا؟ ہاں؟۔۔۔"

فائیل کو کور میں ڈالتے وہ اسے دیکھ کر کافی حیران ہوئے لیکن ان کے لہجے میں حیرانی کی بجائے جرح کا عنصر غالب تھا۔

"جی بابا۔۔۔ آج طلباء بہت کم آئے تھے اور صرف دو لیکچرز ہوئے۔ باقی کلاسز کینسل ہوگئیں تو اسی وجہ سے میں جلدی واپس آئی ہوں۔ دراصل سویرے جب میں گھر سے نکلی تو موسم اتنا خراب نہیں تھا جبکہ راستے میں بارش شروع ہوگئی۔ لیکچرز بھی اہم تر تھے ورنہ میں موسم کے پیشِ نظر چھٹی ہی کر لیتی۔"

ان کے ماتھے کی شکنوں سے نظر چراتی وہ ایک قدم گیٹ کی جانب بڑھ کر وضاحتی لہجے میں بولی۔ ان کے لہجے کی وجہ سے اسے جھوٹ بھی بولنا پڑا کہ آج دو کلاسز ہوئی ہیں۔ اس کا دفاعی انداز اور لب ولہجہ بھانپ کر وہ کسی قدر مطمئن دکھائی دیے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ آئندہ مزید احتیاط کرنا کہ خراب موسم میں گھر سے نہ نکلو۔ نمرہ کو بھی کہہ دینا میری طرف سے۔ مجھے بالکل نہیں پسند کہ تم لوگ بلاوجہ لور لور کرتی پھرو لوکل بسوں میں۔ اسی وجہ سے وین لگوائی تھی جسے تم اپنی مرضی سے منع کر چکی ہو۔ خیر اب جاؤ اندر۔ خدا حافظ۔"

انگلی اٹھا کر اسے کئی طرح کی تنبیہیں کرتے وہ اپنے ازلی و مخصوص طنزیہ انداز میں بولے اور اس کا کوئی بھی جواب سنے بغیر نکلتے چلے گئے۔ ان کی بات میں موجود "لور لور" پر جلتی بھنتی وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ اپنی طرف سے کچھ نہ کہہ کر بھی وہ بہت کچھ کہہ گئے تھے اور ہمیشہ ان کا یہی انداز ثومیہ کو آمادہ بر بغاوت کرتا تھا۔

اب بھی یہی ہوا کہ غصے میں تنی وہ پاؤں پٹختے ہوئے گھر داخل ہوئی اور تیز رفتاری سے چلتے ہوئے لاؤنج کا داخلی دروازہ پورا کھول کر کے اندر آ گئی۔ دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے بند کر کے اس نے بیگ کو صوفوں پر پٹخا اور دھپ کی آواز سے خود بھی صوفے پر گر کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے سر تھام لیا۔ غصے کی شدت اور ضبط کی کوشش میں اس کی آنکھیں دہک اٹھی تھیں۔ دروازے کی آواز پر راشدہ بیگم تیزی سے اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں اور بھاگ کر ہانپتی ہوئی راہداری عبور کر کے لاؤنج میں آ رکیں۔

" آئے ہائے کون ہے وہاں؟ کیا ہوا ہے؟؟"

لاؤنج کے اب تک اندر باہر ہلتے دروازے کو دیکھ کر انہوں نے دہل کر کہا اور پھر بے ساختہ ان کی نگاہ سر جھکائے بیٹھی ثومیہ پر آن رکی۔

"اوہو یہ تم ہو ثومیہ؟؟ کیا ہوا ہے؟ اور یہ کیا طریقہ ہے گھر داخل ہونے کا؟ ایسے بند کرتے ہیں دروازہ؟ حد کرتی ہو تم بھی۔۔۔ کیا ہوا ہے؟"

نفی میں سر ہلا کر وہ اس کے پاس آ رکیں اور سرزنش کرتے ہوئے اس کا شانہ ہلا کر اس سب کی وجہ دریافت کی۔ وہ تو جو پہلے سے تپی بیٹھی تھی ان کے سرزنش کرنے پر مزید تپ گئی۔

"حد میں کرتی ہوں؟ نہیں ماما۔۔۔ حد تو بابا کرتے ہیں۔ جنہیں بولتے ہوئے یہ بھی سمجھ نہیں آتی کہ سامنے بیٹی کھڑی ہے بیٹا نہیں کہ جسے وہ جو مرضی لفظ بول سکتے ہیں۔ اور اب مجھ سے کسی نے ایسے بات کی تو میں صرف دروازہ نہیں سب کچھ توڑ دوں گی۔ ہر شے تباہ کر دوں گی۔۔۔ بتائے دیتی ہوں۔"

ان کے آگے ہاتھ جھلا جھلا کر وہ باغیانہ لہجے میں بولی۔ اس کا آگ آگ لہجہ اور چٹانی انداز جانچ کر راشدہ بیگم کی جیسے جان نکل گئی۔ وہ سمجھ گئیں کہ ابھی ابھی گھر سے نکلے شاہجہان عادل سے ہوئے اس کے سامنے کا ردعمل ہے یہ سب۔

"دھیرج میری بچی۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔ مجھے بتاؤ شاباش۔ کیوں اتنے غصے میں ہو؟ کیا کہا انہوں نے تمہیں؟ میرا دل مت ہولاؤ ثومیہ۔ میں نے ورنہ یونہی مر جانا ہے۔"

اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹتی، ایک ہاتھ سے اس کا شانہ مسلتی وہ پیار سے بولیں۔ ان کے نرم لہجے میں انتہا کی فکریں موجزن تھیں۔ جوان بیٹی کی ایسی حالت کوئی ماں نہیں سہہ سکتی۔ ان کا دل بھی کسی نے مٹھی میں بھینچ ڈالا تھا۔

" کچھ نہیں ہوا ماما۔ ہونا کیا ہے؟ وہی جو ہمیشہ ہوتا ہے۔اب اگر یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس آئیں گے ہی نہیں تو میں نے وہاں رک کر کیا کرنا تھا؟ حالانکہ بہت سا وقت گذارا میں نے۔ مجھے پہلے سے شک تھا کہ بابا غصہ ہوں گے۔ لیکن انہوں نے جو کہنا ہوتا ہے اگلے کی کوشش جانے بغیر لازمی کہتے ہیں۔ اب بھی کہہ گئے ہیں کہ "لور لور" نہ کیا کرو فضول۔ اب بتائیں کہ ہم آوارہ ہیں کیا؟ کہہ رہے تھے نمرہ کو بھی کہہ دینا یہ سب۔۔۔"

اس نے بے ربط جملوں میں ساری بات بتا دی۔ غصے کی شدت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کی آدھی ادھوری بات سے ہی انہوں نے پورا مفہوم جان لیا تھا۔ ساری بات سمجھ کر ان کے ماتھے پر بے شار بل ابھرے۔ وہ شوہر کی ایسی باتوں سے عمریں گزریں نالاں ہی رہیں لیکن انہیں کسی کی پرواہ ہی کب تھی۔

اسے مزید خود سے بھینچتے وہ نرم لہجے میں بولیں۔

"ان کی ایسی ہر بات کو نظر انداز کیا کرو میرے بچے۔ تم بخوبی جانتی ہو کہ وہ کسی کو بھی، کہیں بھی، اور کچھ بھی بول جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میری بیٹیاں قابلِ فخر ہیں۔ مجھے تم دونوں پر مکمل بھروسہ ہے۔ یوں کڑھنے سے حاصل حصول کچھ بھی نہیں سوائے اپنی جان جلانے کے۔ خود کو متوازن کرو شاباش۔ یہ غصہ شیطانی وسوسے لاتا ہے۔ خود پر اس کا اختیار نہیں ہونے دو۔ اپنے "رہن" کو منوانے کے لیے لڑکیوں کو اس معاشرے میں بہت کچھ "سہن" کرنا ہوتا ہے۔ ہمیشہ صبر کو ہی اپنی ذات کی دلیل بناتے ہیں۔ سدا تحمل اپناؤ تا کہ عزت پا سکو۔ مجھے دیکھو کیسے چپ سے بندھ کر عمر کاٹ دی ہے۔ آج اسی لگی ہوئی چپ کا کمال ہے کہ پورا خاندان عزت کرتا ہے میری۔ سب معتبر گردانتے ہیں۔ چلو شاباش اب مزید کچھ نہیں کہنا۔۔۔"

لہجے کے اثر انگیز زیر و بم میں وہ گویا اسے کوئی راز دان کرنے لگیں۔ ان کے لفظوں سے صدیوں کی

مسافتوں سی گرد اٹھتی تھی۔ ان کی پر تکان گفتگو نا قابلِ رد دلیل تھی۔ ان کی زندگی واقعی صبر سے کمائی عزت سے عبارت تھی۔

ثومیہ کو ان کے نم لفظوں سے اپنے بے لگام ہونے کا احساس ہوا تو ان سے الگ ہو کر بکھرے بال ترتیب دیتے ہوئے کسی قدر شرمسار لہجے میں بولی۔

" آئم سوری ماما۔۔۔ مجھے یوں ری ایکٹ نہیں کرنا چاہئیے تھا۔ مجھے اس سب کا شدت سے احساس ہے جو بھی آپ کہہ رہی ہیں لیکن بابا کی ہر منفی بات یا رویے سے میرا صبر چھوٹ جاتا ہے۔ بہر حال میں آئندہ بھر پور کوشش کروں گی کہ ایسا نہیں ہو۔"

بات کے اختتام پر اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

انسان کا اندر زخمی ہو تو ہونٹوں پر ہنسی نہیں سجتی ہاں لہجوں میں شکستگی ضرور در آتی ہے۔

اپنی ماں کی قربانیوں سے خوب واقفیت ہونے کی وجہ سے اسے اس وقت ان پر بہت پیار آیا۔ وہ ان کا کرب جانتی تھی۔ پہلے بھی اس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی جگہ ضبط کھو کر وہ اپنی صابر ماں کی بہترین تربیت پر حرف لانے کی باعث نہ بنے۔

"شاباش میری بچی۔۔۔ میں ہمیشہ اسی سمجھداری کی توقع کرتی ہوں تم سے۔ کل بھی جب تم نے وین والی بات بے دھڑک کہہ دی تو مجھے بہت فکر رہی اس کی۔ تم کبھی بھی اپنے باپ سے دوبدو نہ ہو جاؤ تمہارے اس غصے کی بدولت مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ دیکھو بیٹا خاموش رہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے فائدے بہت ہیں۔ انسان کا اندر گہرا ہوتا جاتا ہے۔ چپ آپ کا ظرف وسیع کرتی۔۔۔ میں یہ سب یونہی یا بلاوجہ نہیں کہتی۔ اس سب کو ہی برتا ہے ساری عمر میں نے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹیوں کا حوالہ میری ذات سے ہٹ کر کچھ ہو۔ سمجھ رہی ہو نا ثومیہ؟؟"

اس کا چہرہ ہاتھوں کی پیالی میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ التجا و نصوح کے ملے جلے لہجے میں بولیں۔

ثومیہ کو لگا وہ اس کے بغاوتوں کے گرد مضبوط بند باندھ رہی ہیں۔ ان کی باتوں میں چھپے مفاہیم اخذ کر کے

وہ سادگی سے مسکرائی اوران کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں کی نرم وگداز گرفت میں رکھ لیے۔

"جی ماما۔۔۔ سب سمجھتی ہوں میں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں سب۔ اور بالکل فکر نہ کریں میں کبھی ان سے دو بدو نہیں ہوں گی۔ اب بھی اگر ان کی بات بری لگی تو فطری غصہ آ جانے کے باوجود ان کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا میں نے۔ باقی ان سے لوکل کے لیے اجازت طلب کرنے کی بات ہے تو میرا نظریہ بس یہ ہے ماما کہ بہت ضروری باتوں کے لیے بھی اکثر ہم بے وجہ ڈرتے رہتے ہیں بابا سے۔ اب اگر میں دیر سے آتی روز تو بھی انہیں برا لگنا تھا لہٰذا بہتر لگا مجھے کہ ان سے براہ راست بات کر کے اصل مسئلے سے آگاہ کر دوں۔ پلیز اپنی جائز بات یا مطالبات بھی ان کے سامنے رکھنے سے مت روکیئے مجھے۔ وہ میں لازمی کہوں گی ان سے کیونکہ مجھے لگتا ہے بعض ڈرا تنے بڑے ہوتے نہیں جتنے ہم انہیں بنا لیتے ہیں۔ اب دیکھیں کہ اگر میں نے انہیں وین سے متعلق اصل مسئلے سے آگاہ کیا تھا تو انہیں بھی اجازت دینا ہی پڑی۔ گو کہ ابھی وہ اس کا بھی ذکر کر کے گئے ہیں لیکن منع تو نہیں کر سکے مجھے تب۔ روک تو نہیں سکے نا۔۔۔ میرا نکتہ نگاہ بھی سمجھئے ماما۔ بے وجہ گھٹ گھٹ کر جینا اب اور نہیں آئے گا مجھے۔"

ان کے ہاتھوں کو گاہے بگاہے دباتے ہوئے اس نے انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ اب اس کے لہجے میں غصے کی لہروں کی بجائے اعتماد کی شورش تھی اور آنکھوں میں آگ سی جلن کی بجائے عجب سا ایک یقین ہلکورے لے رہا تھا۔ بغور اس کے انداز واطوار جانچ کر اس کا ہر لب ولہجہ پڑھتی راشدہ بیگم کو لگا کہ فی الوقت اسے اس موضوع پر مزید سمجھانا بے کار ہوگا۔ اپنے غصے پر قابو پانے کے اس کے وعدے کو کافی سمجھتے ہوئے انہوں نے گفتگو کو سمیٹنا مناسب سمجھا۔

"اچھی بات ہے میری بچی کہ تم میرا مقصد سمجھ گئی ہو۔ اس موضوع پر پھر کسی وقت بات کریں گے اب۔ فی الحال تم اٹھو شاباش کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا لگاتی ہوں نمرہ کے آنے میں بہت وقت ہے ابھی تم کھا لو۔ صبح ناشتے میں بھی جلدی جلدی دو چار نوالہ لے کر بھاگ گئی تھیں۔ اور کپڑے بدل لینا لازمی۔ صاف ہیں بالکل۔۔۔ کل یہی پہن کر جانا یونیورسٹی۔ ماشاء اللہ میری بیٹی بہت خوبصورت لگتی ہے لال رنگ میں۔ چلو اب اٹھ بھی جاؤ تو میہ۔۔۔"

اس سے ہاتھ چھڑوا کر اس کے گال پچکارتے ہوئے وہ اٹھیں پھر دوسرے صوفے پر آڑھا ترچھا پڑا اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے کمال مہارت سے موضوع بدلا اور لا کر اسے پکڑاتے ہوئے اسے شانے سے کھینچ کر پیار سے اٹھانے لگیں۔ سمجھدار مائیں جوان بیٹیوں سے لاحاصل مباحثے سے یونہی گریز کرتی ہیں۔

ثومیہ کو اس پل ان پر بہت پیار آیا۔ اس نے ساری عمر انہیں یونہی مباحثوں سے اجتناب کرتے دیکھا تھا۔

"اس تعریف کا شکریہ ماما۔ سب کہتے ہیں میں آپ جیسی ہوں شکل وصورت میں۔ جیسے آپ پر سارے رنگ بھلے لگتے ہیں یونہی مجھ پر بھی لگتے ہیں۔ اٹس آل بی کاز آف یوڈیئریسٹ مام۔۔۔ آئی لو یو سو مچ۔۔۔"

اٹھ کر ان کے گلے لگتی وہ ان کا گال چوم کر بولی تو ساری فکریں بھول کر وہ خوشدلی سے مسکرا دیں۔

"جھلی ہے ثومیہ تو۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ نہ ہوا کر۔ چل جا شاباش۔ اور جلدی آنا۔ میں کھانا گرم کرنے لگی ہوں۔ تمہارے آنے تک میز پر لگا دوں گی۔"

اسے جواباً چوم کر انہوں نے ایک نصیحت مزید کی اور پھر اسے کسی بھی بات کا موقع دیے بنا الگ ہو کر صوفوں کی حدود سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ان کا رخ باورچی خانے کی طرف تھا۔

ان کو پشت سے پیار بھری نظروں کے حصار میں لیے وہ بیگ کاندھے پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

زندگی نرم وگرم لہجوں میں لپٹ کر ایسے ایسے مفاہیم عیاں کرتی ہے کہ انسان ان کے معانی وراہ میں کھو کر اپنی ذات تک بھول جاتا ہے۔ ثومیہ کے تندوتیز وشوریدہ جذبات کے گرد بھی راشدہ بیگم کے نرم لفظوں کا مضبوط ترین حصار واقع تھا۔

☆......☆......☆

ذکیہ بیگم رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں باورچی خانے میں مصروف تھیں جب لاؤنج کا آبنوسی دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور ڈاکٹر منصور عالم لاؤنج میں داخل ہوئے۔ دروازے کی آہٹ پر چاولوں کو دم لگا کر سلیب سے چیزیں سمیٹتی وہ جلدی سے باورچی خانے کی کھڑکی میں آئیں اور جھانک کر ان کو دیکھتی ہوئی فوراً مڑیں اور گلاس میں پانی بھرنے لگیں۔

منصور عالم نے حسب معمول گھر آمد پر بلند آواز میں سلام کیا اور صوفوں پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولنے لگے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر بنی خوبصورت شکنیں تھکاوٹ کی غماز تھیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ آ گئے آپ۔ وقت سے کچھ پہلے نہیں آ گئے؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟؟"

ایک چھوٹی ٹرے میں قرینے سے پانی کا گلاس لیے وہ باورچی خانے سے برآمد ہوئیں اور ان کے نزدیک جھک کر پانی پکڑاتے ہوئے ان کا چہرہ دیکھ کر فکرمندی سے بولیں۔ انہوں نے خفیف مسکراہٹ دے کر پانی کا گلاس اٹھایا اور خاموشی سے پانی پینے لگے۔

وہ سامنے دھری میز پر ٹرے رکھ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"ٹھیک ہوں جناب۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آج مریض کم تھے تو جلدی فراغت پالی۔ اسی لیے جلدی چلا آیا۔"

آگے ہو کر گلاس میز پر رکھتے انہوں نے تسلی بخش لہجے میں کہا تو مطمئن ہو کر اثبات میں سر ہلاتی وہ فوراً اٹھیں اور گلاس کو ٹرے میں رکھ کر واپس باورچی خانے کی جانب بڑھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ شوز اتار دیں میں آ کر چپل دیتی ہوں آپ کو۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو لیں۔"

ان کی تیزیوں پر زیرِلب مسکراتے وہ جھکے اور پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کر کے مسلا پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں آگے پھیلاتے ہوئے زوردار انگڑائی لی۔ ان کی جسامت کسی جوان لڑکے سے کسی طور کم نہ تھی۔ عمرِ رواں نے ان پر بہت کم اثرات مرتب کیے تھے۔

ذکیہ بیگم نے باورچی خانے میں گلاس سلیب پر رکھ کر دیگچی سے تھوڑا سا ڈھکن سرکا چمچ کی مدد سے دم پر لگے چاول چکھے اور پھر چولہا بند کر کے پورا ڈھکن ہٹا کر سارے چاولوں کو چمچ سے دیگچی میں الٹ پلٹ کرتے ہوئے ان کی تہہ اکھاڑ دی۔ یقیناً چاول اب پک چکے تھے۔ شیلف سے برتن نکال کر انہوں سلیب پر ترتیب سے رکھے اور ایک نظر چولہے پر دھرے تیار سالن، چالوں کی دیگچی اور ان برتنوں کو دیکھ کر مطمئن ہوتے ہوئے باہر نکل آئیں۔ رات کے کھانے کی تیاری پایہ تکمیل تک پہنچ چکی تھی۔ اب بس انہیں کھانے کے وقت اس سب کو ڈائننگ ٹیبل پر منتقل کرنا تھا۔ اسی ترتیب سے کام کرنے کا یہ ان کا معمول تھا۔

"کلینک کی رینویشن کا کہہ رہے تھے آپ۔ اس کا کیا سوچا ہے؟ کب کروانی ہے؟؟"

منصور عالم کے قدموں میں پڑے شوز اٹھاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تو بے ساختہ ٹانگیں سمیٹ کر وہ سیدھے ہوئے تھے۔

وہ بڑھیں اور شوز ریک میں رکھتے ہوئے چپل لا کر ان کے پیروں میں رکھی۔ ان کے صوفے پر بیٹھنے تک وہ ان کی فرصت کے منتظر رہے اور پھر بشاشت سے بولے۔

"ہاں رینویشن بھی کرنی ہے لیکن فی الحال نزدیک کوئی دوسری جگہ نہیں مل رہی عارضی کلینک کے لیے۔ خیر جلد ڈھونڈ لیں گے۔ ہوتا رہے گا یہ کام بھی۔ آپ یہ بتائیں کہ سفیر کدھر ہے؟ تین دن سے ملے بھی نہیں سفیر بہادر مجھ سے تو۔ کہاں ہوتے ہیں وہ جناب؟؟"

ان کی بات پر مبہم انداز میں سر ہلاتے آخر پر وہ مسکرائیں اور عام لہجے میں بولیں۔

"چلیں اللہ مالک۔۔۔ اور سفیر نے کہاں ہونا ہے اپنے کمرے کے سوا۔ دوست تو اس کا کوئی ہے نہیں کہ جس کے ساتھ باہر کہیں نکل جائے۔ سو رہا ہے اب بھی اوپر۔ بارش کی وجہ سے سارے لیکچرز کینسل ہو گئے تو آج یونیورسٹی سے بھی بہت جلدی واپس آ گیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ مجھے آج ہی بائیک لے کر دیں بہت تھک جاتا ہوں۔" انہوں نے تفصیلاً کہہ کر سفیر کا مدعا بھی گوش گذار کیا۔

"ہوں۔۔۔ صحیح ہے۔ اور اس کے دوست تو واقعی کوئی نہیں ورنہ اس عمر کے لڑکے تو بہت آوارگی کرتے ہیں۔ ہمارے برعکس باقیوں کے والدین کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہمارے بچے کے دوست آوارہ ہیں۔ اور ہم ہیں کہ فقط اس فکر میں گھلتے ہیں کہ یہ کسی کو دوست بناتا ہی نہیں۔ عجیب بات ہے یہ بھی۔ خیر بنا لے گا دوست بھی جب اس کا دل ہوا۔ اور بائیک کا بھی کرتے ہیں کچھ۔ اسے بلائیں تو۔ پونے پانچ ہو رہے ہیں۔ کب کا سویا ہوا ہے وہ؟؟

ہشاش و عام لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے بات کے اختتام پر کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت دیکھا اور پھر یہ گھڑی اتار کر درمیانی میز پر رکھ دی۔ ذکیہ بیگم ان کی بات پر بس مسکرا دیں۔

"ایک بجے کے لگ بھگ سویا تھا۔ کافی وقت ہو گیا ہے واقعی۔ اچھا آپ فریش ہو لیں میں بلاتی ہوں

اس کو۔"

پھر موضوع کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہہ کر وہ اٹھیں اور اوپری منزل کو جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

منصور عالم بھی فوراً اٹھے اور چپل پہن کر لاؤنج سے ملحقہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔

غسل خانے کے دروازے کے بند ہونے کی آواز سنتی ذکیہ خاتون نے ابھی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ ایک ہاتھ سے ریلنگ تھام کر دوسرا منہ پر رکھے جمائیاں روکتا سفیر سیڑھیوں کے وسطی موڑ پر نمودار ہوا۔ گھریلو عام استعمال کے کالے ٹراؤزر شرٹ میں بھی وہ بہت دلکش لگ رہا تھا۔ اس کی کسرتی جسامت اور مضبوط ڈیل ڈول تنگ ملبوس سے نکھر کر مزید عیاں ہو رہا تھا۔

"السلام علیکم ماما۔۔۔"

طویل جمائی روک کر انہیں سلام کرتا وہ آنکھیں مسلتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ میں تمہیں ہی بلانے جا رہی تھی۔ اچھا ہوا کہ جاگ گئے خودی۔ آجاؤ۔"

واپس مڑ کر وہ صوفوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں تو سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے چلتا وہ صوفوں کی پشت پر آرکا۔

"بس نیند بہت آئی تھی ماما۔ جیسے ہی جاگا نیچے آ گیا ہوں۔"

انہیں بیٹھتا دیکھ کر وہ سادگی سے بولا اور پھر اس کی نگاہ ریک میں رکھے اپنے باپ کے جوتوں پر پڑی۔

"اوہ۔۔۔ تو بابا بھی آج جلدی آ گئے۔ دیٹس گڈ۔ ابھی آئے ہیں کیا؟؟"

ان کے جوتوں کی طرف اشارہ کر کے اس نے بے ساختہ واش روم کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے اشارے اور نگاہ کا تعاقب کرتی وہ مبہم انداز میں مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر بولیں۔

"ہاں ابھی آئے۔ بس کچھ دیر پہلے۔ انہی کے کہنے پر تمہیں بلانے جا رہی تھی۔ اور آؤ نا تم۔۔۔ بیٹھو یہاں۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟؟"

بشاشت سے بتا کر انہوں نے صوفے کی گدی تھپتھپاتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"جی ایک منٹ بس۔۔۔ میں آتا ہوں پانی پی کر۔ آپ بیٹھیں۔"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا اور وہ جو اس کی بات سن کر خود پانی لانے کے ارادے سے اٹھنے والی تھیں بس اپنی جگہ پر ہل کر رہ گئیں۔

ان کی کوشش ہوتی تھی کہ شوہر اور بیٹے کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی خود کریں۔

کچھ دیر بعد پانی پی کر اپنے نرم، گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ باہر آیا تو منصور عالم بھی اسٹینڈ کے پاس کھڑے تولیے سے منہ پونچھ رہے تھے۔ ایک لمحے کو تھم کر اس نے مسکراتے ہوئے ان کی مصروفیت دیکھی اور ان کی طرف بڑھتے ہوئے شریر لہجے میں بولا۔

" آ گئے ینگ مین۔۔۔ کیا غضب لگ رہے ہیں بابا قسم سے۔۔۔ کہاں ہوتے ہیں آپ جوان آدمی۔ میری ماما آپ کے فراق میں سارا دن بولائے بوکھلائے پھرتی ہیں۔ سچی۔۔۔"

اس کی بات سن کر انہوں نے تولیہ منہ سے ہٹاتے ہوئے بازو پھیلائے۔

"اوئے آ جا یار سینے سے لگ میرے۔ کافی دن سے نہیں ملا تجھے تو اداس ہے تجھ سے میرا سینہ۔"

وہ ان کے سینے سے جا لگا تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ کر مزید کہا۔

"اور ذکیہ بیگم کے فراق میں بے تاب ہو کر ہی تو میں بھی جلدی جلدی کلینک بند کر کے بھاگم بھاگ گھر پہنچتا ہوں یار۔ وہ نظر نہیں آتا تمہیں؟ شرارتی بچے۔۔۔"

ان کی بات پر سفیر نے ان سے الگ ہوتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگا کر اپنی ماں کو دیکھا جو چادر منہ پر رکھ کر باقاعدہ شرما گئی تھیں۔

" آئے ہائے۔۔۔ ہنسوں کی جوڑی۔۔۔ دیکھو تو ماما کیسے شرما رہی ہیں۔ نظرِ بدور۔۔۔"

ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ انہیں صوفوں تک لے آیا اور دوبارہ شرارت کی تو وہ ہنستے صوفوں کے گرد گھوم کر ذکیہ بیگم کے بالکل سامنے جا بیٹھے۔ وہ بھی بڑھا اور منصور عالم کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔

"منصور آپ بھی اس کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ حد کرتے ہیں۔ اسے تو بالکل شرم نہیں آتی۔ آپ کے بعد بھی جانے کیا کیا کہتا رہتا ہے۔ پرسوں کہہ رہا تھا کہ آپ پر چیک رکھا کروں کہیں باہر کوئی " معاملہ " نہ ہو آپ کا۔ لیں بتائیں ذرا۔ اور آپ اسے ڈانٹا کریں۔ مزید شہہ دینے لگتے ہیں۔" ہنسی دبا کر ذکیہ خاتون

نے مصنوعی خفگی سے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا تو سفیر برجستہ لہجے میں بولا۔

"تو غلط تو کچھ نہیں کہا میں نے۔ چیک کریں ان کی یہ گلوئنگ سکن۔ کوئی بھی آنٹی فدا ہو سکتی ہیں۔ بلکہ لڑکی بھی۔"

منصور عالم کے پر گوشت گالوں پر چٹکیاں بھر کر وہ پیار سے جیسے انہیں پچکارنے لگا تو انہوں نے بے طرح مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے گالوں سے ہٹا کر ہاتھوں میں تھام لیے۔ ان کے سفید گال سرخ ہو کر چمکنے لگے تھے۔

"اب بتائیں بیگم کہ بھلا اسے کیا کہوں میں۔ مجھ سے بھی نکلتا ہوا سا قد کاٹھ ہے اس کا۔ پھر اس کا یہ لاڈ پیار۔ بھئی میں تو بہت مجبور ہو جاتا ہوں ہنسنے پر۔ آپ بھی غصہ نہ کیا کریں۔ بچہ ہے ابھی۔ سدھر جائے گا خودی۔" پیار سے اس کے ہاتھ دباتے ہوئے انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ان کی باتوں میں بیٹے کی جوانی کا فخر بسا تھا۔

ان کے لہجے میں ڈھکا مان جانچ کر ذکیہ بیگم بھی تفاخر بھری نظروں سے جوان بیٹے کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ پورے منظر میں عجب سی محبت در آئی تھی۔ سب کی نظروں میں سارے جہان کا پیار سمٹ آیا تھا۔ وہاں اس پل فقط خوشگواریت کا رقص تھا۔

"اچھا بھئی سفیر۔۔۔ مذاق سب ایک طرف۔ اب بتاؤ کہ بائیک کون سی لو گے؟ اور اس سے پہلے اپنی ماما کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی وعدہ کرنا ہو گا تمہیں کہ حد رفتار سے تجاوز نہیں کرو گے۔"

یک لمحاتی توقف سے قدرے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے منصور عالم نے اسے مخاطب کیا تو اس کے ساتھ ذکیہ خاتون بھی سنجیدہ ہو گئیں۔

"بابا میں وعدہ کر چکا ہوں ماما سے۔ میں موسٹ کیئرفل رہوں گا۔ پلیز مجھے بار بار وارن کرنا ہے تو نہیں لے کر دیں اب بھی بائیک۔ میں لوکل ہی آیا جایا کروں گا۔ اٹس اوکے۔"

ان کی بات پر وہ کسی قدر چڑ گیا تھا۔ کسی بھی بات کو دہرائے جانے پر اسے واپس اپنے "ازلی واصلی" مزاج میں آتے یوں بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے اس کا انداز بھانپ کر بے چینی سے پہلو

بدلتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ذکیہ خاتون نے کچھ کہنا چاہا لیکن انگلی کے اشارے سے انہیں روکتے منصور عالم تیزی سے بولے۔

"اچھا ٹھیک ہے یار۔ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنی جگہ مجبور ہو کر تمہیں کہتے ہیں۔ بائیک چلاتے وقت بس یہ خیال کرنا ہمیشہ کہ ہم "دو" افراد کی جان "ایک" تم میں بسی ہے۔ اور جاؤ تبدیل کر کے آؤ ابھی چلتے ہیں بائیک لینے کے لیے۔"

عام لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے نرمی سے اس کا کاندھا دبایا۔ ان کے انداز و گفتگو پر اسے بے ساختہ اپنی قنوطیت کا احساس ہوا۔

"افوہ۔۔۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا بابا۔ میں بخوبی جانتا ہوں یہ بات جو بھی آپ کہہ رہے ہیں۔ پہلے جانے کیا کہہ دیا میں نے۔ آئی ایم سوری۔" فوراً ان کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا حصار بناتا وہ شرمسار لہجے میں بولا تو وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھتے مسکرانے لگے۔ کب اسے کیسے متوازن رکھنا ہے وہ دونوں اس بات سے خوب واقف تھے۔

"اچھا یار یہ جن جپھے ڈالنا چھوڑو اور جاؤ بھی۔ تیار ہو کر آؤ۔ کھانا ہم واپسی پر ہی کھائیں گے بیگم۔۔۔" بمشکل خود کو اس کے گھیر سے چھڑواتے وہ خوش دلی سے بولے اور آخر پر ذکیہ خاتون کو مخاطب کیا۔ وہ ہنستے ہوئے ان سے الگ ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے منصور۔ کھانا تیار ہے۔ میں تب تک دوبارہ گرم کرلوں گی۔ آپ لوگ ہو آؤ۔" سفیر کی خوش رنگ مسکراہٹ پر نثار ہوتی وہ خوشگواریت سے بولیں۔

"نہیں بابا۔۔۔ ابھی بس باتیں کرتے ہیں سب ڈھیر ساری۔ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا اس وقت ہنڈا سینٹر جانے کا۔ کل چلیں گے۔ موسم بھی خراب ہے آج۔ بارش ہوئی تو ہم بھیگ جائیں گے۔ کیا خیال ہے؟؟" صوفے کی دوسری جانب لمبا لیٹتے ہوئے اس نے جانے کا پروگرام منسوخ کیا اور بھنویں اچکا کر ان کی رائے طلب کی۔

اسے لیٹتے دیکھ کر انہوں نے ایک طویل سانس بھر کر خارج کیا اور خاموشی سے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔ کل ہی لے آنا۔"

ذکیہ خاتون نے اسے دیکھتے ہوئے سادگی سے کہا اور پھر شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"آپ کوشش کر کے کل تین بجے تک کلینک سے واپس آجانا۔ تب تک یہ بھی پہنچ جاتا ہے گھر۔ پھر وقت سے خرید لانا بائیک۔"

ان کی بات پر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"صحیح ہے۔ میں آجاؤں گا۔ یہی پروگرام مناسب ہے۔"

ہنکارا بھر کر انہوں نے فقط یہی کہا۔

"تو پھر آپ دونوں گپ شپ کرو میں چائے بنالاؤں۔ اب "خشک" گفتگو ہی نہ کریں نا ہم۔ چائے پر بات ہوتی ہے۔ میں آتی ہوں۔"

ان کے کسی بھی جواب سے پیشتر وہ اٹھیں اور باورچی خانے کی جانب بڑھ گئیں۔

"ہاں بھئی سفیر۔۔۔ سناؤ یونیورسٹی کیسی چل رہی؟ کیسا گزرا لاسٹ ویک۔۔۔؟ کوئی دوست بنایا تمہارا ریکارڈ قائم ہے اب تک؟" انہیں باورچی خانے میں جاتے دیکھ کر منصور عالم نے بشاشت سے اسے مخاطب کیا۔ ان کا مقصد نیا موضوع چھیڑنا تھا۔

ان کی بات پر ایک پل کے لیے اس کے ذہن میں ثومیہ اور پھر مصطفین سے ہوئی اب تک کی ساری ملاقاتوں کے پورے منظر جاگے اور پھر فوراً ان مناظر کو جھٹک کر یہ سب قصہ گول کرتے ہوئے وہ مسکرا مسکرا کر انہیں یونیورسٹی سے متعلقہ دیگر تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ذکیہ بیگم نے بھی انہیں اس قصے سے آگاہ نہیں کیا ہوگا۔ وہ ماں بیٹے کے باہمی "راز و نیاز" میں انہیں کبھی بھی شریک نہیں کرتی تھیں۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کمرے میں گونجتے ایک نامانوس شور سے کھلی تھی۔ خود سے کمبل ہٹا کر وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ پھر ایک زوردار انگڑائی لے کر اس نے جمائی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھا اور ایک جانب رکھا دوپٹہ اٹھا کر گلے میں لٹکاتے ہوئے، اپنے عین سامنے، کھڑکی کھول کر باہر صحن میں جھانکتی نمرہ پر نگاہ کی۔

"ان لبوں پہ جو ہنسی ہے اس کی تو ہی ہے وجہ،
بن تیرے میں کچھ نہیں ہوں میرا ہونا بے وجہ،
میں آس پاس تیرے اور میرے پاس،
تو ہے کہ نہیں۔۔۔ تو ہے کہ نہیں۔۔۔"

ہاتھ میں پکڑے موبائل پر لگا گانا وہ خود بھی ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی۔ ثومیہ کو فوراً اپنی آنکھ کھلنے کا سبب سمجھ آ گیا۔ بیڈ سے نیچے اتر کر چپل پہنتے وہ کافی حیران دکھائی دی۔

"ارے رے رے۔۔۔ کن لبوں ہر کون سی ہنسی آ گئی ہے؟ پگلا گئی ہو کیا نمرہ؟ اور گانا کیوں لگا رکھا اس قدر اونچی آواز میں؟ بابا نے سن لیا تو دونوں کی خیر نہیں۔ بند کرواسے۔ جلدی۔۔۔"

تیزی سے اس کے قریب آتی وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی تو بے ساختہ پلٹتے ہوئے نمرہ نے گویا کسی خیال سے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"اوہو۔۔۔ ایک تو تم ڈرا دیتی ہو۔ ابھی دیکھا میں نے کہ سوئی پڑی تھیں اور اب مجھ پر چڑھ بھی دوڑی ہو۔ اور دھیرج رہو۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ بابا کسی کام سے باہر گئے ہوئے ہیں اور میں گیٹ کو اچھے سے کنڈی کر کے آئی ہوں۔ جب ناک ہوا مجھے آواز آ جائے گی۔ کیسا؟؟؟"

اس کے سینے پر ہاتھ دھر کر اسے خود سے دو قدم دور ہٹاتی وہ مصنوعی ڈر کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی اور پھر شاہجہان عادل کی غیر موجودگی کے بارے میں بتا کر اس کے منہ کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے اپنی چالاکی پر اس سے داد طلب کی۔ گانا اس نے لیکن اب بھی بند نہیں کیا تھا۔ اس کے انداز پر وہ سادگی سے مسکرائی۔

"بہت تیز ہو نمرہ تم۔ اللہ پوچھے تم سے۔ اور پلیز یہ راگ سر تو بند کر و یار۔ اتنے تلخ و سخت ماحول میں بھی تم یہ رومانی گیت نا جانے کیسے سن لیتی ہو۔ مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے تمہاری بشاشت پر۔ سچی۔۔۔ بلاوجہ اتنا خوش کیسے رہ لیتی ہو تم؟"

وہ بڑھی اور کھڑکی سے پار اترتی شام دیکھ کر کھڑکی کی سل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عام لہجے میں بولی۔ اس کی بات سن کر اس کی ایک جانب کھڑی نمرہ نے ذرا جھک کر اس کی آنکھوں کے کنارے پڑھنا چاہے۔ اسے لگا

کہ باہر چھائی پوری شام کی ساری سرخی ثومیہ کی حسین آنکھوں کے نرم گوشوں میں آن ڈھکی ہے۔ فوری طور پر آڈیو پلئیر کھول کر اس نے گانا بند کر دیا اور آہستگی سے اس کے ساتھ جا رکی۔

" کبھی کبھی خوشیاں "ملتی" نہیں ہیں ثومیہ۔۔۔ انہیں تلخیوں سے "کشید" کرنا پڑتا ہے۔ زندگی "پورا" کچھ نہ دے تو "ادھورے" پر قناعت کر لینے کا نام "خوشی" رکھ لو کیونکہ "زندہ" تو بہر طور رہنا ہے نا؟ اور جب یہ طے ہو کہ زندہ رہنا لازم ہے تو ساکن، منجمد۔۔۔ اور جامد کیوں رہیں؟؟ زندگی نے ہمیں نہیں چھوا تو کیا ہے؟ آؤ ہاتھ بڑھا کر ہم اسے چھو لیتے ہیں۔ آؤ خود کو سکھا دیں ہم کہ جینا یوں بھی ممکن ہے۔"

اس کی طرف دیکھتی وہ بھید بھرے، نرم تر لہجے میں بولتی چلی گئی۔ راشدہ بیگم اسے آج کے واقعے کی ساری تفصیل سے آگاہ کر چکی تھیں۔ اب اس کا دل تھا کہ وہ اپنے دل کا بوجھ اس سے ہلکا کر لے۔ وہ اسے اداس نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی باتیں سن کر اس کے دلکش لبوں کے حسین تر کٹاؤ پر عجب سا کرب بکھرا اور وہ اذیت سے مسکرانے لگی۔

" تلخیاں جھیل کر خوشیاں کشید کرنے جیسی باتیں قصے کہانیوں یا پھر ان گانوں میں ہوتی ہیں نمرہ جو تم سنتی ہو۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقت کبھی بھی حالات سے ہٹ کر نہیں ہوتی۔ دل پر کچھ بوجھ ہو تو خیالی دنیائیں اور سارے نظریات۔۔۔ سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ خوشی زیست میں شامل ہو تو پھر ہی "ہوتی" ہے۔ اس کے لیے نام بدل بدل کر نہیں رکھے جاتے۔ زندہ رہنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا جتنا تم نے کہہ دیا ہے۔ کئی بار بہت رنجیدہ ہو کر بھی ہم جینا تو چاہتے ہیں لیکن جی نہیں سکتے اور اکثر ہمارے بس میں نہیں ہوتا کہ ہم پورا کرب جھیلیں اور مر جائیں۔ ہمارے اختیار سے باہر ہوتا ہے کہ سارا سکوت بہہ جانے دیں۔ "

اس کی جانب رخ کر کے اس کی آنکھوں میں کئی شعلے انڈیلتی وہ اسے بھی اسی اذیت سے دوچار کرنے لگی جس میں وہ خود مبتلا تھی۔

نمرہ کے چہرے پر یکایک کئی رنگ آ کر گذر گئے۔ وہ سمجھ نہیں پائی کہ اب اسے کیا کہے؟

" مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے بچپن سے آج تک دوہری زندگی جیتی آئی ہوں یار۔ سکول اور پھر کالج میں ہشاش بشاش اور گھر آ کر سہم سہم کر۔ اور ایسا ہی عالم اب یونیورسٹی میں بھی ہے۔ وہاں میں پر سکون ہوتی ہوں

اور گھر آتے ہی یہ فکریں لاحق ہو جاتی ہیں کہ یہ نہیں کرنا بابا کو برا لگ سکتا ہے۔ وہ نہیں کرنا بابا غصے ہوں گے۔ اونچا ہنسنا نہیں ہے۔ زیادہ بولنا نہیں ہے۔ کھانا خاموشی سے کھانا ہے۔ ٹی وی پر صرف خبریں سننی ہیں۔ چھت پر بالکل نہیں جانا ہے۔ کیوں یار کیوں؟؟ ہم عام انسانوں کی طرح کیوں نہیں رہتے۔ ہم کچھ بھی کھل کر کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں گانے سنتے ہوئے دیکھ کر مجھے ٹوکنا کیوں پڑتا ہے؟ تم نے گانے سننا ہوں تو باہر کا دروازہ کنڈی کیوں کرتی ہو؟؟ کوئی جواب ہے کیا؟ کیوں ہے ایسا ہماری زندگی میں؟ اب بتاؤ اس سب میں کوئی بھی زندہ کیونکر رہ پائے گا؟؟۔۔۔"

نمرہ کو خاموش پا کر اس نے اس کے گرد کئی سوالات اٹھا دیے۔ بات کے اختتام تک جذبات کی شدت سے اس کا لہجہ بھیگ گیا اور وہ باقاعدہ ہانپنے لگی۔

اس پل اسے ہاتھ جھلا جھلا کر بے نقط و تکان بولتے دیکھ کر نمرہ کو لگا کہ وہ پاگل ہو رہی ہے۔

اور اسے بالکل ٹھیک لگا تھا۔۔۔ وہ واقعی پاگل ہو رہی تھی۔

اس کے سوالات سے گھبرا کر، لاجواب ہو کر بے ساختہ وہ بڑھی اور اسے گلے لگا کر خود سے بھینچ لیا۔

"اے پلیز کالم ڈاؤن یار۔۔۔ آئم سوری کہ مجھے ابھی تم سے ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہیئے تھی۔ مجھے ماما نے بتایا ہے سب۔ میں بس تمہیں تسلی دینا چاہتی تھی۔ میرا خیال تھا تمہارا غصہ اب تک اتر گیا ہوگا۔ پلیز خود کو نارمل کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی بات نہیں کرنا اب۔ بالکل خاموش رہو۔ ورنہ میں بھی رو دوں گی۔ کیا تم چاہو گی کہ میں روؤں؟؟ ہاں؟؟۔۔۔"

اس کے بالوں پر نرمی سے بوسے دیتی وہ مسلسل اس کی کمر بھی تھپک رہی تھی۔ یہ اس کا پیار کرنے کا ازلی انداز تھا۔ عمروں میں تفاوت کے باوجود وہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کو یونہی تسلی دیتی آئی تھیں۔ ایسے موقعوں پر ان میں بڑے چھوٹے کی تخصیص نہیں رہتی تھی۔ ایک جذباتی ہوتی تو دوسری اس کو سہارا دیتی تھی۔ اب بھی یہ اس کے لہجے کا اثر تھا کہ اس کے سوال پر اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا دیا۔

اس نے آہستگی سے اسے خود سے الگ کر کے بغور اس کا چہرہ پڑھا۔ وہ روئی نہیں لیکن اس کی آنکھیں گیلی تھیں۔

"چلو مسکراؤ شاباش۔۔۔ مجھے پریشان کر دیا اتنا۔ میں سچ مچ رو دوں گی اگر اب کوئی ایسی بات کی تو۔ متوازن کرو خود کو۔ اور انتہائی مضبوط بھی۔ تمہیں تو میری ڈھال ہونا ہوتا ہے۔ تم بڑی ہو مجھ سے یار۔ تم یوں کمزور پڑو گی تو سوچو میرے دل کا کیا حال ہوگا؟۔۔۔"

اس کے گال چھوتے ہوئے اسے دوبارہ خود سے لگا کر اس نے مزید سمجھایا۔ وہ خاموشی سے کچھ دیر اس کے ساتھ لگی رہی اور پھر اس سے الگ ہو کر اپنے بال سمیٹنے کے بعد نم آنکھیں پونچھنے لگی۔ نمرہ بغور اس کے "عوامل و انداز" دیکھ رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو یار۔۔۔ ماما بھی بالکل ٹھیک سمجھاتی ہیں سب کچھ۔۔۔ بس میں ہی پاگل ہوں جو خواہ مخواہ اور بار بار کڑھنے لگتی ہوں۔ مجھے واقعی سمجھنا چاہئیے کہ بابا تو بدلیں گے نہیں لہٰذا بہتر ہوگا کہ میں ہی خود پر قابو پاؤں۔ بہت معذرت نمرہ۔ تمہیں بھی پریشان کیا بلاوجہ۔۔۔"

شرمسار لہجے میں کہتے ہوئے یہاں وہ نرمی سے مسکرائی۔

"لیکن تم پریشان مت ہو۔ آج بس یہ آخری دفعہ تھا۔ میں آئندہ بابا کی کسی بھی منفی بات یا طنز کو سر پر سوار نہیں کروں گی۔ ان شاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا کہ میں ضبط کھو دوں۔ ایک بار پھر معذرت۔۔۔"

اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے دباتے ہوئے وہ پریقین لہجے میں بولی تو نمرہ کھل کر مسکرائی۔ اسے اس کا اس قدر جلدی سنبھل جانا بہت اچھا لگا تھا۔ یقیناً یہ دن میں راشدہ بیگم کے سمجھانے کا بھی اثر تھا کہ وہ خود کو فوری متوازن کر سکی تھی۔ درحقیقت نمرہ یہ موضوع پھر سے نہ چھیڑتی تو وہ کافی حد تک اسے نظرانداز کر چکی تھی۔

"دیٹس لائک آ بریو گرل۔۔۔ یہ ہے ہماری رئیل ثومیہ۔ چلو اب شاباش مجھے اس سوہنے منڈے کی باتیں سناؤ۔ اس کا غرور کچھ کم ہوا کہ نہیں؟ تمہارے ساتھ بیٹھنے کی ضد اب بھی کرتا ہے کیا؟ یا باقی سب اب عادی ہو گئے اس کے تمہارے ساتھ بیٹھنے کے؟؟ تفصیلات بتاؤ بھئی۔ کافی روز ہوئے تم نے کچھ بتایا ہی نہیں اس کا۔ خیر تو ہے نا کڑیئے؟؟ ہاں؟؟۔۔۔ کوئی دل ول تو نہیں آ گیا اس کا تم پر؟ یا تمہیں پیار شیار ہو گیا ہو تو بھی بتا سکتی ہو مجھے؟۔۔۔"

انتہائی شرارت سے کہتے ہوئے اس نے دلکشی سے یوں موضوع بدلا کہ وہ اس ارادی کوشش کو نہیں بھانپ

سکی۔ بات کے دوران اس نے اپنا کاندھا اس کے کاندھے سے ٹکرا کر باقاعدہ جرح کی تھی۔ اس کے منفرد لب ولہجہ اور خوبصورت انداز پر بے ساختہ اس کے لب چٹکے۔ اسے اس کی شرارت بے وجہ بھانے لگی۔ ایک پل کو تھم کر ان دونوں نے ایک دوسرے کی چمکتی آنکھوں میں جھانکا اور پھر بے ساختگی میں بلند تر قہقہہ لگایا۔ اس خوشگوار ہنسی کی کھنک کا اثر تھا کہ کب سے ان دونوں کے مابین طاری سارا جمود بہہ گیا تھا۔

"اوہو کوئی دل ول پیار شیار والا معاملہ نہیں ہے چندا۔۔۔ اس کہانی میں محبت نہیں بس دوستی کا پہلو ہے۔ اور سنو یار۔۔۔ دو دن سے بتایا ہی نہیں تمہیں کچھ بھی اس فضول بحث میں لگ کر کہ دوستی کی اس کہانی میں بھی اب ایک شاندار قسم کا "ٹوسٹ" ہے۔۔۔ آؤ یہاں بیٹھو سب سناتی ہوں آج۔ بہت پر لطف کہانی ہے۔۔۔"

اس کی جرح کی رد میں اس کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ نفی میں ہلاتی وہ خوشدلی سے بولی اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے بیڈ پر لا بٹھایا۔

"ارے۔۔۔ واہ۔۔۔ ٹوسٹ بھی اور شاندار بھی۔۔۔ ایسا کیا ہے بھئی؟؟"

اپنے چہرے پر جھولتی بالوں کی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑس کر اس نے سوالیہ نظریں ثومیہ پر گاڑ دیں۔ اس کا لہجہ انتہائی متجسس تھا تو چہرہ پر شوق رنگوں سے سجا ہوا۔

"بتاتی ہوں یار......"

وہ جلد جلدی جوتا اتار کر اس کے ساتھ بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھ گئی تو اس نے رخ اس کی جانب کر لیا۔

"ایک نیا لڑکا آیا ہے یونیورسٹی میں مصطفین شجاع۔ بہت اچھا ہے اور پیارا بھی لیکن سفیر سے زیادہ نہیں کہہ سکتے۔ ہوا یوں کہ جب وہ آیا تو بہت ہڑبونگ مچی کلاس میں۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ سب ایک دم متوجہ ہوئے......" پھر اس نے اسے مصطفین کی آمد سے لے کر سفیر سے ہوئے اس کے پہلے مباحثے اور آج کے دوسرے "ٹاکرے" تک کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔ اس نے ان دونوں کے مابین اپنا کردار بھی نہایت تفصیل سے بیان کیا تھا۔ نمرہ کبھی شوق سے تو کبھی تجسس اور فکرمندی کے تاثرات کے ساتھ یہ ساری داستان سنتی رہی۔ اس دوران اس کا چہرہ کئی سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اس روز گیتی کی آمد سے قبل لاہور ریلوے اسٹیشن پر بے تحاشا عوامی ہجوم امڈ آیا۔ انتارش تھا کہ لوگ قابو سے باہر ہو گئے۔ اہلیانِ لاہور بھارتی سپر اسٹار گیتی کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہوئے جاتے تھے۔ رفیق نواز نے جب یہ صورتحال دیکھی تو از حد پریشان ہو کر پولیس کی نفری طلب کر لی۔ حکومت پاکستان نے بھی بھارتی اداکارہ کی حفاظت کے لیے ہنگامی بنیادوں پر وافر سیکیورٹی مہیا کی۔ رفیق نواز گیتی کے قافلے سے مسلسل رابطے میں تھا۔ جونہی قافلہ شوٹنگ اسپاٹ کے نزدیک پہنچا اس نے پولیس کو مطلع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہاں ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ گیتی کے چاہنے والوں کو حفاظتی حصار متعین کرنے کے لیے لگائے گئے بیریئرز کے پار روکنے کے لیے پولیس کو باقاعدہ لاٹھی چارج کرنا پڑا تھا۔ دھکم پیل میں لوگ ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگے۔ خوب شوروغل اور چیخ و پکار برپا رہی۔ اس کے علاوہ مختلف ٹی وی چینلز کے نمائندے اس کی کوریج کرنے کے لیے وہاں بالکل مستعد کھڑے تھے۔ ان سب کو شوٹنگ اسپاٹ پر گیتی کی آمد سے متعلقہ خبر کی بریکنگ نیوز کے طور پر کوریج کرنا تھی اور اگر اجازت ملتی تو چند سوالات پر مشتمل ایک چھوٹی سی گفتگو یا انٹرویو بھی کرنا تھا۔ ان سب کو بھی ایک مخصوص مقام سے آگے آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ گیتی سے براہ راست بات چیت کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر طرف پولیس اہلکار، پرائیویٹ گارڈز اور رفیق نواز کا ذاتی عملہ چوکس کھڑے تھے۔ اس کی گاڑی جونہی ریلوے اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی لوگ پاگلوں کی طرح اس کا نام پکارنے لگے۔ چہار عالم گیتی۔گیتی کا شور تھا۔ گاڑی ریلوے اسٹیشن کے مرکزی اور داخلی احاطے میں یادگار کے طور پر نصب کیے گئے ایک تاریخی "ریل انجن" کے پاس کھڑی کی گئی۔

وہ لوگوں کا اپنے لیے جوش و خروش دیکھ کر بے طرح سرشار ہوئی۔ اس نے مسرت آمیز نظروں سے سیٹ سے موبائل، پرس اور دیگر اشیاء اٹھاتی ناز کو دیکھا اور خوشگواریت سے بولی۔

"دیکھو ناز۔۔۔ یہ پاکستانی ہیں۔ کہیں سے بھی ہمارے بھارتیوں سے کم استقبال ہے کیا یہ میرا؟ تم بے وجہ پریشان تھیں کہ پبلک پلیس پر مشکل ہو گی۔ سنو تو۔۔۔سب مجھے پکار رہے ہیں۔"

اس کی بات سن کر ناز گویا طوعاً کرہاً مسکرائی اور پھر کچھ کہے بنا بیک سکرین سے باہر جھانکا۔ لوگ مسلسل ہاتھ اٹھا اٹھا کر گیتی کا نام لے رہے تھے۔ اسے لگا واقعی یہ بھی بھارتی عوام ہے۔ اس نے گیتی کے لیے ایسا ہی

عوامی پاگل پن وہاں بھی دیکھا تھا۔

وہ باہر آنے کے لیے گارڈز کے پوزیشن سنبھال کر انہیں کلیئرنس دینے کی منتظر تھیں۔ اس سے پہلے انہیں گاڑی میں ہی رہنے کا حکم تھا۔

"بالکل سچ کہتی ہو۔۔۔ یہ سب بھی واقعی پاگل ہو رہے ہے۔ مجھے لگ رہا کہ یہ پٹنہ ہے۔ یاد کرو وہاں بھی ایک اسٹیشن پر شوٹنگ کروا چکی ہو تم۔۔۔"

سیدھے ہو کر وہ خوشدلی سے بولی تو گیتی کے ساتھ ساتھ ان کے ڈرائیور اور گارڈ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ناز کے پاکستان سے متعلق اصل نظریات سے انہیں کسی قدر آگاہی تھی۔ ان کا مسکرانا ناز نے واضح طور پر محسوس کیا لیکن نظر انداز کر گئی۔

"ہاں نا یار۔۔۔ یہی تو۔ بہت مزہ آنے والا ہے ناز۔۔۔ 'خدا کے بھگت" یقیناً ہٹ ہوگی۔ دیکھنا تم۔"

اس کا ہاتھ تھام کر وہ جوش سے بولی تو ناز کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی بھی فلم کی ریلیز سے قبل ایسی پیشین گوئی کرے۔ گو کہ اس کی کوئی بھی فلم آج تک فلاپ نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ فلم کی کامیابی سے متعلق اس کی ریلیز سے قبل ایک لفظ بھی نہیں کہتی تھی۔ کوئی پوچھتا تو بھی یہ کہہ کر ٹال جاتی تھی کہ "فلم میں کام میں نے پوری نیت سے کیا ہے بلکہ کیریئر کا سب سے اہم کردار نبھایا ہے لیکن اپنا بیسٹ دے کر بھی فلم کی کامیابی سے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار صرف سنے گورز کو دیتی ہوں۔ انہی کی رائے طے کرے گی کہ ایک ٹیم ورک کے طور پر فلم کے ٹوٹل ورک میں ہم کتنے اچھے رہے ہیں یا کس قدر برے رہے ہیں۔۔۔"

یہ جملہ یا اس سے ملتی جلتی بات وہ ضرور کرتی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتی تھی۔ آج پہلی بار یوں ہوا کہ وہ اتنے یقین سے بات کر رہی تھی۔

" گیت ایسا ہی ہوگا۔ یہ فلم لازمی ہٹ ہوگی۔ ہٹ تو اسے ہونا ہی ہے مجھے بھی یقین ہے۔ لیکن تم ایسے دعوے کب سے کرنے لگیں؟ ہر بھارتی فلم کی ریلیز سے پہلے اکثر و بیشتر بولے گئے اپنے ہی جملے یاد ہیں نا؟؟ تو پھر یہاں ایسا یقین کیوں ہے گیت؟ کیسے؟۔۔۔"

اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے خلوص سے کہا اور پھر اس فلم پر اس کا یقین کھوجنا چاہا۔

اس کی بات سن کر اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور اپنی جانب کے شیشے سے پار اس ہجوم کو دیکھ کر پوزیشنز سنبھالتے گارڈز پر نگاہ کی۔

"اس یقین کی کوئی وجہ نہیں ہے ناز۔ میں خود حیران ہوں۔ یقین مجھے اپنی ہر فلم کی کامیابی کا ہوتا ہے۔ میں بس وقت سے پہلے اس کا اظہار نہیں کرتی۔ اب یہاں پاکستانیوں کی خود سے عقیدت اور ان کا اخلاص دیکھ کر میں مجبور ہو گئی ہوں یہ کہنے پر۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ ساری توجہ میرے لیے کوئی نئی شے ہے۔ مجھے ہر جگہ یونہی بھاؤ ملتا رہا ہے ہمیشہ۔ ہاں پاکستانیوں کا یہ پیار بہت ہٹ کر ہے۔ بڑا معنی خیز ہے۔ ہمارا دین الگ، سوچ الگ، بولیاں الگ اور دیش بھی الگ لیکن ان کا میرے لیے یوں دیوانہ پن مجھے فخر کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس سائننگ کا میرا فیصلہ بالکل درست تھا۔ بس انہی کے بھروسے پر یہ بات پورے یقین سے کہہ رہی ہوں کہ "خدا کے بھگت" لازمی ہٹ ہوگی۔ اور کچھ نہیں۔۔۔"

واپس اس کی جانب مڑتے ہوئے وہ مسرت سے بھرپور لہجے میں بولی اور اپنا بیگ گلے کے گرد ڈال کر ایک جانب لٹکا لیا۔ وہ بیگ کو شانے کی بجائے ہمیشہ گلے میں پہنتی تھی۔

اس سے پہلے کہ اثبات میں سر ہلاتی ناز جواباً کچھ بھی کہتی باہر اگلی نشست پر بیٹھا سیکیورٹی گارڈ مودب لب و لہجہ میں بھرپور اعتماد سے بولا۔

"ایکسکیوزمی میم۔۔۔ باہر سے کلیئرنس کال آ گئی۔ آپ دونوں اتر سکتی ہیں۔ وہ سامنے رفیق نواز صاحب بھی آپ کو ریسیو کرنے آ رہے ہیں۔ میں آپ دونوں کے لیے دروازہ کھول رہا ہوں۔"

پیغام دے کر اس نے ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ اچھالی اور نیچے اتر کر پہلے ناز کی جانب سے دروازہ کھولا۔

"بہت شکریہ۔۔۔"

اس کے اخلاق سے متاثر ہوتی وہ خوش دلی سے کہہ کر گاڑی سے اتر گئی تو دروازہ بند کر کے وہ گاڑی کے گرد گھوما اور گیتی کی جانب سے دروازہ کھول کر سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے وقار سے باہر نکلی اور حسب عادت و معمول مسکراتے ہوئے اپنے مداحوں کی جانب دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلایا۔

"شکریہ جناب۔۔۔"

پھر اپنے لیے دروازہ کھولے کھڑے اس گارڈ سے کہہ کر وہ تیزی سے اپنی جانب آتے رفیق نواز کی طرف بڑھی۔ ناز اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ تمام چینلز کے نمائندگان اپنے اپنے کیمرے تب سے آن کیے رپورٹنگ کر رہے تھے جب سے اس کی گاڑی یہاں پہنچی تھی۔ اس وقت بھی اس کی ہر ہر حرکت کو زوم کر کے کئی چینلز پر لائیو دکھایا جا رہا تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب عوام حفاظتی حصار بنائے کھڑی پولیس سے دھکم پیل کرنے لگی۔ اس کے نام کی پکاروں میں اب " گیتی جی " کی پکار نمایاں تھی۔ لوگ اس کو بہت عزت سے مخاطب کر رہے تھے۔ اس کا سر فخر سے مزید بلند ہوا اور دوبارہ ان سب کی طرف ہاتھ ہلاتی وہ رفیق نواز کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ وہ چالیس سے پینتالیس سال کے درمیان قدرے فربہی مائل ایک خوش شکل شخص تھا۔

" السلام علیکم سر۔۔۔" خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پاکستان میں وہ ہر کسی کو " سلام " ہی کرتی تھی۔

" وعلیکم السلام۔ خوش آمدید گیتی جی۔ سفر کیسا گذرا آپ کا؟؟ یہ لاہوری ہیں جو آپ کی محبت میں پاگل ہو رہے ہیں بڑی دیر سے۔۔۔ اور آپ کیسی ہیں ناز؟؟ خوش آمدید۔۔۔"

اس کا ہاتھ تھام کر احوال دریافت کرنے کے بعد لوگوں کی طرف اشارہ کر کے وہ بشاشت سے بولا اور پھر فوراً اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی ناز سے مخاطب ہو کر اس سے بھی ہاتھ ملایا۔ ناز نے مسکراتے ہوئے مختصراً بس " فائین اینڈ تھینکس۔۔۔ سفر اچھا گذرا۔" کہا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ شوٹنگز پر یا کسی کے بھی سامنے گیتی کی موجودگی میں کم از کم بولتی تھی۔

" ہم ٹھیک ہیں رفیق صاحب۔ سفر بھی بالکل اچھا گذرا۔ ایک دم کلاسی۔۔۔ جی ٹی روڈ پر واقع پاکستان کے کافی شہر دیکھے ہم نے۔ بہت خوبصورت ہیں۔ اور یہ سب رونق تو آپ کی لگائی ہوئی ہے۔ پاک بھارت مشترکہ فلمسازی میں سب سے اہم کردار پاکستان سے آپ اور بھارت سے رمیش صاحب ادا کر رہے ہیں۔ اب دیکھیئے نا لوگ کس قدر خوش ہیں۔ ان کا یوں پاگل ہونا بتاتا ہے کہ آپ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں یعنی دونوں طرف کے لوگ چاہتے ہیں کہ ثقافتی سطح پر دونوں ممالک کے مابین روابط بڑھیں اور مضبوط ہوں۔"

نازکی بات کے فوری بعد گیتی نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے نا صرف تفصیلی جواب دیا بلکہ ان کی کاوشوں پر خراج بھی پیش کیا۔ اس کی باتوں پر وہ سادگی سے ہنسا۔

"اور ہماری یہ کوششیں کبھی کامیاب نہ ہوتیں اگر آپ جیسی معروف لیڈنگ ہیروئین ہمیں مثبت جواب نہیں دیتی۔ بہر حال یہ ایک لمبا موضوع ہے جسے صحافیوں کے کالمز کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ ابھی یہ بتائیں کہ وہ سب رپورٹرز آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی ملیں گی یا شوٹنگ کے بعد دو گھڑی کی ملاقات رکھ لیں۔ فلم کا پروموشن بھی ہو جائے گا اور پبلک بھی خوش باش رہے گی۔ کیا کہتی ہیں؟۔۔۔"

میڈیا رپورٹرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے گیتی سے ان سے ملنے کی بابت رائے طلب کی۔ اس کی بات پر اب تک مسکراتی ناز کے ماتھے پر یکا یک لکیرِ فکر ابھری۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گیتی اتنے ہجوم میں پاکستانی میڈیا پیپل کا سامنا کرے۔ اسے خدشہ لاحق تھا کوئی رپورٹر کسی بھی قسم کا غلط سوال کر سکتا ہے یا منفی رویہ اپنا سکتا ہے۔

"شوٹنگ کے بعد ملتے ہیں ان سے رفیق صاحب۔ فی الوقت مجھے صرف کام سے جلدی فراغت پانے کی فکر ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے آج ممتاز محمود کے لائیو ٹیلی کاسٹ شو میں شریک ہونا ہے اور اس کے لیے میں شوٹنگ کے بعد سیدھا اسٹوڈیو ہی جاؤں گی۔ وہاں بھی اسی فلم سے متعلقہ گفتگو ہو گی لہٰذا ابھی کے لیے ان سب سے معذرت کیجئے گا۔ میری واپسی تک اگر یہ موجود ہوئے تو لازمی بات کروں گی اور کھل کر کروں گی۔"

اس نے عام لب و لہجہ میں اپنی بات مکمل کی اور پر اعتماد نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے رفیق نواز کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ ہر پہلو میں اس کی رائے کو اہمیت دے کر مقدم رکھتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا کہ اس کا خیال جان کر وہ فوراً سے پیشتر بولا۔

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ گیتی۔۔۔ ہاں شوکا مجھے علم ہے تبھی تو سیٹ آگے کروائی ہے آپ نے۔ اور آجائیں اندر۔ آپ کے تیار ہونے تک میں شاٹ کی تیاری دیکھ لوں ایک آخری بار۔ آئیں۔۔۔"

ایک طرف ہٹ کر انہیں ریلوے اسٹیشن کے اندر کی جانب بڑھنے کا اشارہ کرتا وہ خود بھی ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ناز کے لبوں پر ایک پر مطمئن سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے شکر کیا تھا کہ گیتی نے صحافیوں سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ شوٹنگ کے اختتام تک وہ موجود بھی ہوتے تو توقع تھی کہ مداحوں کا یہ ہجوم لازمی چھٹ چکا ہوگا۔

"اوئے راشد۔۔۔ میڈم کو وینٹی وین تک لے جاؤ اور ری فریشمنٹ بھی پہنچا دینا۔ میں ذرا ان صحافیوں سے مل آؤں۔ پھر ان کی تیاری تک وہ اوپر شیڈ والی مرکزی لائیٹ بھی بدلوا دو۔ اسپارک کر رہی ہے۔ شوٹنگ کے دوران مسئلہ کیا تو ایویں میرا بی پی ہائی ہوگا۔۔۔"

اسٹیشن کے مرکزی ہال میں داخل ہو کر رفیق نواز نے اپنے اسسٹنٹ کو آواز دی تو وہ دوڑتا ہوا ان کی جانب چلا آیا۔

" آئیں میم۔۔۔ موسٹ ویلکم۔۔۔ اس طرف ہے وین۔"

ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتا وہ مودب لہجے میں بولا تو ان کے جواب سے پیشتر رفیق نواز نے مزید کہا۔

"جایئے گیتی جی۔۔۔ کم از کم پینتالیس منٹ بعد پہلا شاٹ ریڈی ہوگا اور ناز کا بھی خصوصی خیال رکھنا راشد۔۔۔ میں آتا ہوں۔"

باری باری انہیں دیکھتے ہوئے ان کا مثبت جواب پا کر وہ تیزی سے میڈیا نمائندگان تک چلا گیا۔ پاکستان فلم انڈسٹری کا ایک بڑا نام ہونے کے باوجود وہ اپنے شوٹنگ اسپاٹس پر آنے والے تمام میڈیا کنسرنز کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا اور انہیں بھرپور عزت سے نوازتا تھا۔ یوں اہمیت پا کر وہ اس کی ہر فلم کی مثبت اور زیادہ سے زیادہ تشہیر کرتے تھے۔ اب بھی وہ انہیں بڑے طریقے سے شوٹنگ کے اختتام پر گیتی سے ملوانے کا لالچ دینے والا تھا۔ ادھر ناز کے ساتھ اردگرد ماحول اور افراد پر مختلف تبصرے و گفتگو کرتی گیتی دھیرے دھیرے وینٹی وین کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ہر طرف عجب افراتفری کا عالم تھا۔ کوئی سن اینڈ لائیٹ ریفلیکٹنگ مررز اٹھائے بھاگ رہا تھا تو کسی کے ہاتھوں میں کیمروں کے پوڈز تھے جنہیں جابجا رکھ کر فکس کیا جا رہا تھا۔ کوئی روشنیوں کے نہ جلنے کی آواز لگا رہا تھا تو کوئی بازوؤں کے گرد گول گول لپٹے لمبی تاروں کے گچھے پورے فرش پر بچھاتے ہوئے روٹنگ کرنے میں مصروف تھا۔ وہاں مختلف چہرے، طرح طرح کی بولیاں، اور رنگارنگ آوازیں تھیں۔۔۔ کہ جن میں ایک ہائی کے۔وی۔اے ہیوی جنریٹر کا شور بھی شامل تھا۔

وہ دونوں شوٹنگ اسپاٹس پر ایسی ہی بھاگم بھاگ دیکھنے کی عادی تھیں۔

☆......☆......☆

کافی دیر نیچے خالہ خالو اور ایمان کے ساتھ وقت گذار کر وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کچھ دیر اس نے کسی کتاب کا مطالعہ کیا لیکن جلد ہی ارتکاز نہ بننے کے سبب اوب کر کتاب بند کر دی۔ پلنگ سے اٹھ کر وہ کھڑکی میں جا رکا اور بازار میں دور تلک نگاہ دوڑائی۔ وہاں سب کچھ حسب سابق تھا۔ وہی ریڑھیاں گھسیٹتے دو تین پھیریوں والے، دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے محلے دار دنیا جہان کے فارغ لونڈے، بیکری کی دکان پر گاہکوں کا ہجوم اور دودھ دہی کی دکان کے باہر ٹھٹھے لگاتے کئی بزرگوار۔۔۔ سارا منظر "پورا" تھا۔ آسمان پر بادلوں کے چند ٹکڑے محوِ پرواز تھے اور نچلی فضا میں چھوٹے پرندوں کے غول چہچہاتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ دور ایک گھر کی اونچی دیوار میں اگا پیپل کا پیڑ بارشوں سے دھل کر نکھر گیا تھا۔

"بارشیں ساری گرد نتھار لیتی ہیں۔۔۔"

بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنے بالوں میں دونوں اطراف سے ہاتھ ڈال کر انگلیاں چلائیں اور ایک آخری نظر پورے میں گھما کر مڑ گیا۔

"باغِ جناح جایا جائے یار۔۔۔ ابھی بہت سا وقت ہے مکمل رات ہونے میں۔۔۔"

خود کلام ہو کر وہ الماری کر جانب بڑھا۔ موسم، پرندوں اور پیپل کے سبز پیڑ کا حال جان کر اس کا دل پارک جانے کو مچل گیا تھا۔

یہ قریب مغرب کا وقت ہو گا کہ وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلا اور طویل راہداری تیزی سے عبور کرتا ہوا عجلت میں سیڑھیاں اترنے لگا۔

وہ سیڑھیاں کے وسط میں تھا کہ جب اس کے قدموں سے ابھرتی دھپ دھپ کی آواز سن کر استری اسٹینڈ پر کپڑے استری کرتی ایمان بھاگ کر سیڑھیوں کے سامنے آ رکی۔

"او ہیلو۔۔۔ آرام سے اترا کرو زینے۔ کہیں گر گرا گئے تو دانت سارے ٹوٹ جانے ہیں۔ یا اللہ خیر میں سمجھی جانے کیا ہو گیا ہے؟ کن تیزیوں میں ہو؟ اور یہ بڑے تیار شیار ہوئے ہوئے ہو کدھر کا ارادہ ہے

بھئی؟؟۔۔۔"
ریشمی دوپٹے کا پلو ہاتھ میں جھلاتی وہ دوسرا ہاتھ کمر پر رکھ کر آخری زینے پر تن گئی تو وہ یکا یک وہیں رک گیا۔ اسے سر سے پاؤں تک تنقیدی نگاہ سے دیکھتی وہ سوال کرنے لگی۔ اس کے یوں جرح کرنے والے انداز پر مصطفین کے لب چٹکے لیکن پھر فوراً مسکراہٹ دبا کر وہ پیشانی پر مصنوعی بل ڈال کر بولا۔
"دانت ٹوٹیں یا جوڑ۔۔۔ میرے ہی ہوں گے نا؟ تمہیں کیا تکلیف ہے اس سے؟ اور میں تیار شیار ہو کر جدھر بھی جاؤں تم یہ پوچھ تاچھ کس خوشی میں کر رہی ہو؟ مکان مالکن ہو تو بس مکان مالکن ہی رہو۔ بے بے نہ بنو میری۔ ہٹو ایک طرف۔۔۔"
آہستگی سے چار سیڑھیاں اتر کر وہ اس سے دو زینے اوپر رک گیا۔ لہجے میں موجود ایک نمایاں شرارت بتاتی تھی کہ وہ اسے چھیڑ رہا ہے۔ اور اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب رہا تھا۔ وہ واقعی "چھڑ" گئی تھی۔
"اوئے جا۔۔۔ بڑا آیا نواب۔۔۔ ایٹی ٹیوڈ دکھانے کی کوشش نہ کرنا آئندہ مجھے اور نہ ہی یوں فضول سے لہجے میں "مکان مالکن" کہنے کی جرات ہو۔ سمجھے؟؟ تم گرو یا مرو میری بلا سے۔ مجھے تو بس اپنے زینوں پر لگی ان نئی نئی ٹائلز کی فکر ہے کہ کہیں اس جناتی "اٹھک پٹخ" میں یہ نہ ٹوٹ جائیں۔ خبردار مجھ سے ایسے بات کی تو۔ آج اوپر راہداری میں دو گھڑی تم سے سیدھے منہ بات کیا کر لی تم تو سر پہ چڑھنے لگے۔۔۔" تنک کر کہتے ہوئے اس نے تنبیہی انداز میں انگلی اٹھائی تو اس کے غصے سے حظ اٹھاتا وہ پوری شدت سے ہنسا۔
"ہاہاہا۔۔۔ سر پر چڑھنے لگا ہوں۔۔۔ ہوں نا پھر نشے سا؟؟ ہاں یہ مکان مالکن تو تمہارا ہی "پسندیدہ" مرتبہ اور لفظ ہے نا۔ اکثر تو اس کی دہرائی اور گردان کرتی ہو میرے سامنے۔۔۔"
ہنسی کے دوران اس نے مزید کہا اور ریلنگ سے ٹیک لگا کر گویا بہت فرصت سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز سے وہ بھی سمجھ گئی کہ وہ صرف اسے تنگ کر رہا ہے۔ اس کی حسین آنکھوں کے دلکش کناروں پر نرم عکوس آن ٹھہرے اور چہرے کے تاثرات بھی بتدریج متوازن ہوئے تھے۔
"بکواس نہ کیا کرو مصطفین۔۔۔ اتنے تم رہتے نہیں نشے سے چڑھنے والے۔ کبھی شکل دیکھی ہے بغور اپنی؟ دیکھنا ضرور۔ لومڑ لگتے ہو۔ قسم سے۔۔۔ چلو پھوٹو شاباش۔ جہاں مرضی گھومو پھرو۔ آوارہ گرد۔۔

۔ اور مکان مالکن تو پھر میں ہوں نا۔۔۔ اس میں کوئی شک ہے کیا؟ ابھی اٹھا کر باہر پھینکا نا سارا سامان تمہارا تو پتا چلے گا اس مکان مالکن کے سارے وکلی اختیارات کا تمہیں۔"

مصنوعی غصے سے کہتے ہوئے اس کے چہرے کے گرد ہوا میں گول گول انگلی گھما کر وہ ایک طرف ہوگئی تو اس کی بات پر اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

"ہاہاہا۔۔۔ آوارہ گرد نہیں بنجارہ کہہ لو۔ پیارا لفظ ہے۔ اس میں بے عزتی بھی کم محسوس ہوتی ہے کسی کو۔ اور بہت خوب پتا ہے مجھے اپنی شکل وصورت کا لہٰذا تمہیں اس کے متعلق کچھ بتانے کی ضرورت نہ ہے۔ میں تو بس تمہاری بات سے بات کر رہا تھا۔۔۔"

اس نے ایک بار پھر اس کا بھرپور مذاق اڑایا اور جیسے ہی اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کر کے یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر اس کے مقابل آ رکا۔

"اچھا مکان مالکن صاحبہ مذاق سے ہٹ کر اپنے کلی اختیارات کا احساس وادراک مجھے پھر کبھی دان کرنا فی الوقت یہ بتاؤ کہ یہ خالہ خالو کدھر گئے ہیں؟ نظر نہیں آ رہے؟؟"

کسی قدر سنجیدگی اختیار کرتا وہ موضوع بدل کر اس کے والدین کی بابت پوچھنے لگا تو اس کے اندازِ تغافل پر زچ ہوتی وہ گویا احسان کرتے ہوئے بولی۔

"امی خالہ کے گھر گئی ہیں مغلپورہ اور ابو بازار سے راشن لینے گئے ہیں۔ آتے ہوں گے اب تو۔۔۔ جاؤ تم بھی اب۔ سر درد ہو نری۔ بات کی لسی بنا دیتے ہو۔۔۔ خبردار آئندہ مجھ سے ایسے مذاق کیا تو پھر۔۔۔"

اسے امی ابو کی بابت بتا کر واپس استری اسٹینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے گویا اسے شکل گم کرنے کا کہا اور اس کی بات ابھی نامکمل تھی کہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے درمیان سے اچک لی۔

"ہاں ہاں جانتا ہوں۔۔۔ تو پھر تم میرا سارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دو گی کیونکہ تم مکان مالکن ہو اور سارے وکلی اختیارات ہیں تمہیں وغیرہ وغیرہ اور وغیرہ۔۔۔"

ساتھ ہی اس نے ایک زوردار قہقہہ بھی لگایا تھا۔ اس کی بات سن کر ایک آرائشی گلدان کے پاس پہنچی وہ

یکا یک رکی اور مڑ کر اسے یوں مضحکہ اڑاتے دیکھا۔ لب بھینچ کر اس نے کچھ بھی اور کہنے سے خود کو بمشکل روکا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر وہی گلدان اٹھا کر یہ کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

"رکو ذرا۔ آج تمہارا تو سر پھاڑوں میں۔۔۔ ہر وقت اپنی حد سے باہر ہی رہتے ہو۔"

اور اسے یوں غصے میں بھر کر اپنی جانب آتا دیکھ کر وہ یہ کہتے ہوئے لاؤنج کے مرکزی دروازے سے باہر بھاگ گیا تھا۔ "اوئے اوئے رکو۔۔۔ میں مذاق کر رہا تھا۔۔۔ اچھا سوری۔۔۔"

باہر نکل کر وہ لاؤنج کے دروازے کی باہر سے کنڈی لگانا نہیں بھولا تھا۔ پھر وہیں رک کر ہنستے ہوئے وہ اپنا سانس ہموار کرنے لگا۔ اسے لگا کہ آج ایمان کو ستا کر اس نے کافی سارا قرض اتار دیا ہے یا پچھلا حساب تقریباً بیباق ہو گیا۔

اور اندر غصے سے جلتی بھنتی وہ گلدان واپس رکھ کر استری کا پلگ نکالتے ہوئے صوفے پر ڈھے سی گئی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنا انتقام نہیں لے سکی۔

☆......☆......☆

ممتاز محمود ایک نجی ٹی وی چینل سے وابستہ سینئیر صحافی اور معروف اینکر پرسن تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور دراز قد شخص تھا جس کی عمر لگ بھگ بتیس سے پینتیس سال رہی ہو گی۔ اپنے چینل سے اس کا ایک پروگرام "درحقیقت یوں۔۔۔" کے نام سے ہر روز رات 9 سے 10 بجے کے دورانیے میں براہ راست نشر ہوتا تھا۔ اس شو میں وہ سیاست سے لے کر شوبز تک مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ ملکی یا غیر ملکی شخصیات کو بطورِ مہمان مدعو کرتا تھا اور ان کی زندگی یا اپنے شعبوں میں ان کی خدمات سے متعلقہ مختلف سوالات کرتا تھا۔ اس کی شہرت کا سبب اس کا دو ٹوک انداز اور مدلل و پر اعتماد گفتگو تھی۔ اس کے بارے میں ایک بات کا بہت شہرہ تھا کہ وہ اپنے مہمانان سے صرف سوالات نہیں کرتا بلکہ اپنے اپنے شعبوں میں ادا کی گئی ان کی خدمات، ان کے افکار و نظریات یا ان کی نجی زندگی کے مخفی گوشوں پر بھی کئی کئی پہلوؤں سے کئی طرح کے "اعتراضات" اٹھاتا ہے۔ جن کی وجہ سے ان سب افراد کے لیے اس شو کے بعد بہت سے نئے مسائل یا نئی کنٹرو۔ورسیز جنم لیتی ہیں۔ اور یہ بات بالکل سچ اور حق تھی۔ اس کی انہی باتوں سے زچ ہو کر بڑے بڑے کامیاب و نامور لوگ بھی اس کے شو میں اس

کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے۔ اس کے کام کا اپنا ہی ایک منفرد طریقہ تھا۔ اپنے ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ کسی بھی شخصیت کو اپنے ساتھ مدعو کرنے سے پہلے اس کے متعلقہ شعبے میں اس کی خدمات اور اس کی نجی زندگی کے بارے میں بھی زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے پانچ نوجوان لڑکوں پر مشتمل ایک شاطر ٹیم تیار کر رکھی تھی جو خفیہ طریقوں سے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہوئے اس کے لیے یہ ساری معلومات جمع کرتے تھے۔ اس کی یہی ٹیم تمام تر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر اس کی مثبت و اچھی تشہیر کرنے کی بھی پابند تھی۔ اس کام کے عوض وہ انہیں باقاعدہ ماہانہ تنخواہ دیتا تھا۔ صحافت سے ہٹ کر بھی اس کی کمائی کے کئی پوشیدہ ذرائع تھے۔ شنید یہ بھی تھی کہ وہ "زرد صحافت" کرتا ہے اور پیسوں کے حصول کے لیے اپنے شعبے میں مثبت و منفی کوئی بھی طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک اہم تر بات یہ بھی تھی کہ وہ جس چینل سے وابستہ تھا اس چینل پر یہ الزام تھا کہ اس میڈیا گروپ کی ساری پالیسیاں بھارت نواز ہیں یا درِ اندرون یہ چینل مالکان بھارت کے ہمدرد اور ملک کے غدار ہیں۔ لیکن الزام تراشیوں سے ہٹ کر یہ بات دلائل و ثبوت سے واضح یا ثابت کرنے کی کوشش کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ طرح طرح کی افواہیں تھیں بس۔

اس روز وہ "لاہور پریس کلب" کے قریب ایک سات منزلہ عمارت میں واقع اپنے ذاتی دفتر میں بڑی سی میز کے پار ماتھے پر فکر کی لکیریں لیے بہت پریشان بیٹھا تھا۔ ریوالونگ چیئر پر نیم دراز ہو کر، ٹانگیں آگے پھیلائے ہوئے ایک ہاتھ میں بال پین جھلاتے وہ مسلسل آگے پیچھے ہل رہا تھا۔ اس کی عمیق نظریں اپنے عین سامنے، میز کے پار، لیپ ٹاپس پر مصروفِ عمل ان پانچ نوجوانوں پر مشتمل اسی تحقیقاتی گروپ پر جمی تھیں جو اس کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ ان کے چہرے سے تاثرات پڑھ کر ان کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات کو بغور کھوجتا وہ کسی انتظار میں تھا۔

سب کے خاموش ہونے کی وجہ سے کمرے میں صرف اور صرف کی پیڈز پر تھرکتی ان پانچوں کی انگلیوں سے پیدا ہونے والی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

سب کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ نہایت عجلت میں کوئی اہم ترین کام کر رہے ہیں۔

" کچھ ملا کیا؟؟ کوئی تو خوشخبری سنا دو یارو۔۔۔ کہ کیوں آئی ہے وہ بھارت کی نمبر ون اداکارہ پاکستان کی

ڈوبتی ہوئی فلم انڈسٹری کو سہارا دینے؟؟ کیسے قبول کر لی اس نے رفیق نواز کی آفر؟ اور وہ بھی رقم کے کسی پسندیدہ مطالبے کے بغیر؟؟ حیرت ہے۔۔۔ ایسا کیونکر ممکن ہوا۔۔۔؟ لازمی کھوجنا ہوگا۔ بات کی "اصل" اور "جڑ" تلاش کرو......"

کافی دیر بعد وہ بے چینی سے بولا اور اٹھ کر میز کے گرد گھوم کر ان سب کے سروں پر آن کھڑا ہوا۔ تھوڑا جھک کر اس نے باری باری ان سب سکرینز پر نگاہ کی۔ وہاں ٹویٹر اور فیس بک جیسی معروف سوشل میڈیا ایپس سمیت کئی انٹرٹینمنٹ ویب سائیٹس بھی کھلی ہوئی تھیں جن کی مدد سے گیتی کی پروفائل اور اکاؤنٹ سے لے کر انٹرویوز اور فیچرز تک ہر جگہ سے اس کے متعلق سارا مواد اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے فلم انڈسٹری جوائین کرنے سے لے کر اب تک کی اس کی ہر چھوٹی بڑی، اہم و غیر اہم۔۔۔ تمام تر گفتگو کھنگال ڈالی تھی لیکن کہیں سے بھی انہیں اپنی کھوج سے متعلق کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اپنے ساتھ دھرے رجسٹرز پر وہ اہم اہم نکات بھی نوٹ کرتے رہے تھے۔

ممتاز محمود یوں ان کے سروں پر سوار ہوا تو ان میں سے سب سے سینیئر لڑکے نے باقی سب کی طرف نگاہ کر کے "ہاں۔۔۔" کہتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں پورا سوال کیا۔ ان سب نے لب بھینچ کر باری باری نفی میں سر ہلا دیا۔

"سر ایک تو آپ نے بالکل اچانک بتایا کہ گیتی پروگرام میں آ رہی ہے پھر بھی اس کم وقت میں ہی ہم سب آج صبح سے اسی کاوش میں لگے ہیں کہ کسی طرح اس بات کا کوئی سرا ہاتھ آئے۔ ہم نے گیتی کے تمام تر کانٹیکٹس کی آئی ڈیز تک کھوج ڈالی ہیں۔ اس کا سکول، کالج، یونیورسٹی۔۔۔ کوئی جگہ باقی نہیں چھوڑی۔ فلم انڈسٹری میں اس کی آمد، پہلی فلم کے بعد دیگر سائیننگز، فلم سٹیٹسز، حالات و واقعات، ہر ہر موقعے پر موجود اس کی ساری کی ساری گفتگوئیں۔۔۔ سب کا سب احاطہ کیا ہے لیکن ہمیں ایسا کوئی کلیو نہیں ملا کہ جس سے یہ سمجھ سکیں کہ بھارتی فلمی نگری کی معروف و مشہور بلکہ مصروف ترین اداکارہ نے ایک ڈوبتی ہوئی پاکستان فلم انڈسٹری کی طرف سے پہلی ہی پیشکش کیسے یا کیوں قبول کر لی؟؟"

اپنے ساتھیوں کا نفی میں جواب پا کر وہ اٹھا اور ممتاز محمود کے سامنے مودب کھڑا ہو کر پر اعتماد لہجے میں

تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ تحمل سے اس کی پوری بات سن کر ایک ہنکارا بھرتے ہوئے اس نے اپنی پشت پر ہاتھ باندھے اور کچھ کہے بنا باوقار انداز میں وسیع و عریض کمرے میں یہاں سے وہاں چکرانے لگا۔

وہ لڑکا اور اس کے ساتھی خاموشی سے اس کے بولنے کے منتظر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تحقیقات کے دوران یوں سوچ بچار کر کے بولنا اس کی عادت ہے۔ بالآخر وہ کمرے کی مشرقی دیوار میں موجود بڑی سی کھڑکی پر جا رکا اور باہر جھانکتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

"اس غیر متوقع سائننگ کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہے نا یار۔ ورنہ وہ لڑکی پاگل تو نہیں ہے۔ یقیناً نہیں ہے۔ کوئی ایسا نکتہ کوئی ایک بات کہ جس سے اس پر گرفت کی جا سکے۔۔۔ کہ جس سے وہ دام میں آ جائے۔"

یہاں وہ رکا اور مڑ کر میز پر دھرے کچھ کاغذوں کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ سب اہم نکات جو تم سب نے بڑی عرق ریزی سے نکال کر مجھے دیے ہیں یہ تو اسے واقعی "دیوی" بنا رہے ہیں۔ کیا اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں کہ جس پر اس سے "میں" بات کر سکوں۔ میرے شو کی خاصیت ہے کہ مہمانوں کے پسینے ایک بار تو لازمی چھوٹتے ہیں۔۔۔ لیکن اس کے لیے یہ سب ناکافی ہے۔"

اس کا بااعتماد لہجہ بتدریج تکبر میں ڈھلا تھا۔ پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر واپس اپنی میز تک آیا اور کھڑے کھڑے ہی وہ سب کاغذ گھسیٹ کر اپنے نزدیک کر کے انہیں سرسری نظریں ڈال کر پلٹنے لگا۔ اپنی ٹیم کی کارکردگی سے وہ مکمل طور پر مطمئن تھا۔ اسے ان سب پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنے کام کے ماہر ہیں۔ لہٰذا یہ تو وہ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے سارا مواد نہیں نکالا ہوگا۔

"اپنے پہلے ہیرو سے اس کا یہ ڈیڑھ سالہ عشق، کسی فلم کی کامیابی پر دی جانے والی پارٹی میں خود سے دست درازی کی کوشش کرتے، اپنے دوسرے پیگڑ ہیرو کو غصے میں تھپڑ رسید کرنا، اور چوتھے ہدایتکار سے ہوا پیسوں کا تنازع۔۔۔ یہ سب فلمی مصالحہ انٹرویوز جیسی باتیں ہیں یار۔ یہ میری ٹائپ نہیں ہے۔ مجھے کچھ اور چاہیئے۔"

ان نکات میں سے چند کو دہرا کر کاغذوں کے اس پلندے کو اس نے یہ کہتے ہوئے یوں واپس دھکیلا گویا وہ سب فضول ہیں۔

ان پانچوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر وہی لڑکا دوبارہ بولا۔

"لیکن سر آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کے بارے میں ان سے مل کر زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ تو آپ بھی انٹرویو سے قبل آف دا ریکارڈ اس سے ذاتی طور پر پوچھ لیجیئے گا۔ یا رفیق نواز کو کال کر لیں شاید وہ کچھ معلومات دے دے۔ جو پریس کانفرنس کر کے یہ بتا سکتا ہے کہ گیتی نے معاوضے کی بات کیے بغیر فلم قبول کی ہے وہ یہ بھی بتا دے گا کہ اس کی اس "قبولیت" کی وجہ کیا ہے؟"

اس کی بات پر ممتاز نے کسی قدر گھور کر اسے دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے یہ بات صرف تم سوچ سکتے ہو؟ مجھے خود سے نہیں پتا؟ او بھائی پوچھ چکا ہوں رفیق نواز سے بھی بڑے طریقے سلیقے سے یہ بات لیکن بڑا کھوچل ہے وہ۔۔۔ گیتی کی بڑی عزت کرتا ہے اور اس کے متعلق کسی کھوج یا جرح کی وضاحت نہیں کرتا نہ ہی کوئی بھید دیتا ہے۔ خیر اب تو وقت بھی کم ہے۔ مجھے گھر سے ہوتے ہوئے اسٹوڈیو جانا ہے۔ تم لوگ بھی جاؤ اب اور میں بھی نکلتا ہوں۔ یہ معاملہ میں کسی اور طرح سے سنبھال لوں گا۔ نو وریز۔۔۔ بڑے طریقے ہیں اور بھی۔ جاؤ تم شاباش۔۔۔"

رفیق نواز کے نام پر دانت پیستا ہوا وہ بے بسی سے بولا اور پھر یک ہاتھ جھاڑ کر انہیں جانے کی اجازت دے کر اپنی کرسی کی پشت پر لٹکتا کوٹ اٹھا کر پہننے لگا۔ کوٹ پہن کر اس کی شاندار شخصیت مزید نکھر گئی تھی۔ یوں وہ زیادہ بارعب لگتا تھا۔

اس کا حکم پا کر ان سب نے فوراً اپنا اپنا لیپ ٹیپ بند کیا اور بیگ میں رکھ کر "خدا حافظ" کہتے ہوئے دفتر سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کا منتظر کھڑا وہ محتاط ہو کر دروازے تک آیا اور اسے اندر سے کنڈی کر کے اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے ای میل بار میں ایک مختصر جملہ ٹائپ کیا اور سینڈ کرنے سے پہلے بغور اسے پڑھا۔

"سفید کبوتری کی ساری نسلیں چھان ماری ہیں۔ پیغامِ محبت کے سوا اس نے اب تک کوئی اور "قاصدی" نہیں کی۔۔۔"

مطمئن ہو کر اس نے "سینڈ" دبایا اور پھر لیپ ٹاپ بند کر کے میز سے چابیاں اٹھاتا ہوا وہ دفتر سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

چڑیا گھر بس اسٹاپ پر اتر کر، مال روڈ کے کشادہ ترین فٹ پاتھ پر پیدل چلتا مصطفین دھیرے دھیرے باغِ جناح کی جانب بڑھنے لگا۔ ابر گہرا ہونے کی وجہ سے موسم مزید خوشگوار ہو گیا تھا اور سرد و تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ فضا میں گونجتی اذانِ مغرب کی پر تاثیر آوازیں سن کر وہ تاریکی کی چادر کو مناظر سے لپٹتے دیکھ رہا تھا۔ سڑک کی اطراف میں لگے اونچے لمبے پولز پر خوبصورت برقی قمقمے روشن کر دیئے گئے تھے اور آس پاس سے گذرتی ہر قسم کی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں۔ تھوڑا فاصلہ طے کر کے وہ الحمرا ہال کے سامنے واقع پہلے برقی اشارے پر پہنچا اور وہاں فٹ پاتھ کے آخری کنارے پر تازہ تازہ بنائے گئے شاہکار "مجسمہ قائد" کی آرائش کرتے دس سے بارہ افراد پر مشتمل لڑکے لڑکیوں کے ایک مخلوط گروپ کو دیکھ کر ان کے پاس رک گیا۔ وہ سب "این۔سی۔اے" (نیشنل کالج آف آرٹس) کے سٹوڈنٹس تھے جو لاہور کی مختلف سڑکوں اور خصوصاً مال روڈ پر ایسے کئی پراجیکٹس بناتے اکثر دکھائی دیتے تھے۔ ان سب کے درمیان رہ کر اس نے بغور ان کی "کاریگری" دیکھی اور پھر ہجوم کی مانند جمع ہوتے شائقین کو دیکھ کر وہ سڑک کے پار الحمرا ہال کے وسیع احاطے میں بیٹھ کر گٹار کی تاریں درست کرتے لڑکوں کو دیکھنے لگا۔ اسی مقام سے الحمراء ہال اور آواری ہوٹل کے درمیان سے ایک خوبصورت شاہراہ نکلتی ہے جو "اسٹاک ایکسچینج" اور "ایوانِ اقبال" کے عین سامنے سے گذرتی ہوئی ایبٹ روڈ پر واقع لکشمی چوک تک لے جاتی ہے جہاں گلستان، ریگل، نشاط اور دیگر معروف سینما ہاؤسز واقع ہیں۔ سینما اور دیگر فنون ادب سے وابستہ تمام تر افراد کی یہ عام گذرگاہ ہے۔ ان سب "مذکورات" سے متعلقہ تمام تر لوگ ان سب جگہوں کے مابین 500 میٹرز سے 1000 میٹرز تک کا یہ فاصلہ عموماً پیدل ہی طے کرتے ہیں۔ ان طلباء کو کام کرتے دیکھ کر برقی اشارے موجود بہت سے موٹر سائیکل سوار اور دیگر گاڑیوں والے تمام لوگ بھی خوب محظوظ ہو رہے تھے۔ لاہور فنون لطیفہ کے حوالے سے کئی اہم ترین سرگرمیوں کا مرکز جانا جاتا ہے اور یہاں کے مستقل باسیوں کی دلچسپیاں، رجحانات اور مزاج بھی ان سب فنون سے بہت زیادہ میل کھاتے ہیں۔

ان سب کے چہروں پر طاری عکوس اور درج تاثرات پڑھتا وہ کچھ دیر وہاں سرد ہواؤں میں بے سبب کھڑا رہا اور پھر سر جھکا کر دوبارہ باغِ جناح کی جانب بڑھنے لگا۔

لوگوں کے چہروں پر رقصاں دلکش "ہنسیوں" کو دیکھ کر وہ چاشنی سے مسکرایا۔

ہنستے ہوئے چہروں پر چمکتی آنکھیں دیکھنا اسے ہمیشہ یونہی سرشار کرتا اور یہی سب مناظر دیکھنے کی چاہ میں وہ اس بے سبب "آوارگی" کا عادی تھا۔

گورنر ہاؤس کی ابتدائی دیوار کے سامنے واقع مرکزی دیو قامت گیٹ سے وہ باغِ جناح میں داخل ہوا اور تند ہواؤں سے جھولتی درختوں کی شوریدہ شاخیں دیکھتا "قائدِ اعظم لائبریری" کے متوازی واقع تارکول سے بنی طویل و کشادہ شاہراہ پر چلنے لگا۔ حسب سابق زرد و سبز پتوں کی تمام تر آہٹوں پر کان دھرتا اس کا رخ لائبریری کے سامنے بنائے گئے مرکزی گولائی دار فوارے کی جانب تھا۔

آج پارک میں معمول سے کافی کم سیاح دکھائی دے رہے تھے۔ شاید خرابی موسم کے باعث یہ صورتحال تھی۔ اس کے دائیں طرف موجود کچے جاگنگ ٹریک پر لگے طویل قامت درخت گھپ تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے کیونکہ اس ٹریک پر اکا دکا جلتی روشنیاں باہم کافی فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے جھنڈ کی مانند لگے ان گھنے درختوں پر چھائی تاریکی پاٹنے سے قاصر تھیں۔ اکثر اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کئی نوسرباز قسم کے لوگ اس جاگنگ ٹریک پر بھولے اور انجان سیاحوں کو لوٹ بھی لیتے تھے۔

لائبریری کے سامنے پہنچ کر وہاں موجود اس بلند تر فوارے کے گرد گول چکر کاٹ کر وہ مشرقی سمت دھرے ایک سنگی بینچ پر بیٹھ گیا اور اردگرد کھیلتے تین چار بچوں کی اٹکھیلیوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ان کے معصوم چہروں پر درج خوشیوں کی "رموق" پڑھتا وہ بے طرح مسکرایا۔ اردگرد، آس پاس اور ہر طرف سے بے نیاز وہ اپنی ہی کسی دھن میں مگن تھے۔

"خوشیاں درحقیقت نادانیوں میں ہیں۔۔۔"

اس کے صبیح ہونٹوں نے سرد ہوا کے کانوں میں کوئی نرم سا راز پھونکا تھا۔

اس کے دلکش لبوں کے فسوں خیز خم کی حرکت سے ہوائیں گویا جھوم اٹھی تھیں۔

اس نے نگاہ اٹھا کر خلاؤں کی حدیں ماپنا چاہیں تو یکا یک آسمان پر چھائے گھرے بادلوں کے سینے میں سمٹا سارا مینہ ٹوٹ ٹوٹ کر آ برسا۔ آسمان کی جانب منہ کیے ہوئے اسی حالت میں اس نے آنکھیں موند کر گویا بارشوں کو کھل کر برسنے کی اجازت دی دے۔ عام لوگوں کی طرح وہ بارشوں سے چونکتا نہیں تھا۔

ہاں یہ کہ بارشیں اپنے برسنے سے ہوتی اس کی بے کل حالت جانچ کر خوب بے چین ہوتی تھیں۔

اب بھی پارک کے ہر کونے کھدرے میں موجود سارے لوگ اس کے آس پاس سے بھاگتے ہوئے کسی "رین بسیرے" کی تلاش میں لائبریری کے وسیع داخلی برآمدے کا رخ کر رہے تھے۔ اس سب افراتفری سے بے نیاز وہ جیسے بارشوں سے گلے مل رہا تھا۔ ان کے قطروں سے ہمکلام تھا۔ بارش سے بچاؤ کے لیے بھاگتے دوڑتے افراد میں سے کئی ایک نے تحیر سے اسے یوں ساکت اور مطمئن بیٹھے دیکھا لیکن کچھ کہے بنا اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھتے رہے۔

پہلے اس کا حسین چہرہ تر ہوا، پھر گھنے بال، پھر سامنے سے کپڑے گیلے ہوئے اور ایک وقت آیا کہ یونہی آنکھیں موندے تیز ہواؤں کی زد میں رہ کر شدید برستی بارش میں وہ پورا کا پورا بھیگ گیا لیکن آنکھیں اس نے پھر بھی نہیں کھولی تھیں۔ آنکھوں کے لرزتے پپوٹوں اور ہونٹوں کے کانپتے کناروں پر ٹکے سرد بارشی قطرات اسے بہت مسرور کر رہے تھے۔ ان کا لطف و کرم پا کر وہ گویا مدہوش ہوا جاتا تھا۔ کئی لمحات اسی کیف و سرور کے رتھ پر سوار ہو کر وقت کی دہلیز پار کر گئے۔ وہ بہت دیر تلک انہی "سرشاریوں" میں رہا۔

پھر یوں ہوا کہ اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ دھر کر کسی نے انتہائی حلاوت سے اسے پکارا۔

"ان موسموں سے یوں کیا ضد لگائے بیٹھے ہو۔۔۔؟؟"

پوچھنے والے کے لہجے میں ہزار ہا یاسیتوں کے عجب عجب رنگ چھلک رہے تھے۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول کر سامنے موجود شخصیت کو دیکھا اور پھر بارشوں سے بھی نہ چونکنے والا شخص بے تحاشا چونک گیا۔ کچھ دیر اس نے بے یقین نظروں سے انہیں یوں دیکھا کہ جیسے وہ کوئی واہمہ ہوں اور پھر یقین کا سفر طے کر کے ادراک کی منزل پر پہنچ کر فوراً سے پیشتر وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بانسری بجانے والے وہی بزرگ تھے جن کی بانسری کے ہر ایک سر میں وہ اپنی ذات تک گھول دینے کا خیال کرتا تھا۔ وہی بزرگ جو ہر بار اس کے تلاش کرنے پر نہیں ملتے تھے۔ بڑی جستجو اور کوششوں کے باوجود وہ آج تک ان سے مل نہیں سکا تھا۔

زندگی میں کچھ چیزیں اور اکثر لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو بہت مدت تک بڑا ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھی ہم تلاش یا حاصل نہیں کر پاتے وہ وقت کے جادوئی دھاروں پر بہتے ہوئے خود بخود اور اچانک ہمارے سامنے آن

کھڑے ہوتے ہیں۔ تب انہیں حیرت سے تاکتے ہم ساکت وجامد تو ہوتے ہی ہیں۔۔۔ کبھی کبھی "پتھر" بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ انہیں غیر متوقع طور پر اپنے سامنے پا کر وہ پتھر تو نہیں ہوا لیکن ساکت ضرور تھا۔

بارش میں بھیگ جانے کے سبب ان کا لباس پانی میں تر بتر تھا اور ہونٹ ٹھنڈ سے کپکپا رہے تھے۔

"سر آپ۔۔۔ یہاں۔۔ اس وقت؟ میرا مطلب ہے ایسے؟ لیکن کیسے؟ یعنی کہ کیوں؟ نہیں وہ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔"

پوری آنکھیں کھول کر بغور انہیں دیکھتے، بے یقینی کے اظہار کے طور پر اپنے بالوں میں انگلیاں پھنساتا وہ جو منہ میں آیا بے ربط جملوں سا بولتا چلا گیا۔ اس کے ان ٹوٹے پھوٹے ادھورے جملوں کو راستے میں روکتے وہ جلدی سے بول پڑے۔

"ارے بس بیٹا۔۔۔ چپ۔۔۔ بالکل چپ۔ خاموش ہو کر خود کو سنبھالو پہلے۔ کیا کہنا چاہتے ہو اور کیا کہہ رہے ہو؟ اس پر غور تو کر لو۔ چلو آؤ وہاں لائبریری کے برآمدے میں سب کے ساتھ رکتے ہیں۔ تم جوان ہو یار۔ میں یہ سب موسمی اثرات نہیں سہہ سکتا۔ آجاؤ۔۔۔"

انگلی اٹھا کر اسے خاموش کرواتے وہ دھیمے لہجے میں بولے اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے لائبریری کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ حیرت سے ان کا عمیق تر شناسائیوں کا سا انداز پڑھنے لگا۔ وہ اس سے یوں مخاطب ہوئے تھے گویا اسے پہلے سے جانتے ہوں۔ وہ لائبریری کے برآمدے میں بھی پہنچ چکے تھے جب وہ سر جھٹک کر تمام حیرتوں کو پس پشت ڈالے ان کے پیچھے آیا۔ انہوں نے ایک بار بھی مڑ کر اس کی اپنے پیچھے آمد کی یقین دہانی نہیں کی تھی گویا انہیں اس بات کا مکمل یقین تھا کہ وہ ان کے پیچھے لازمی آئے گا۔

بالوں اور چہرے سے پانی نچوڑتا وہ لائبریری کے برآمدے میں داخل ہوا۔ قائدِ اعظم لائبریری کے داخلی دروازے کے آگے چند دیو قامت اور گھیر دار ستون اٹھا کر ان پر لائبریری کی اونچی چھت کو سہارا گیا تھا جس سے تین جانب سے کھلا ایک خوبصورت برآمدہ وجود میں آیا تھا۔ برآمدے کے انہی موٹے ستونوں میں سے ایک کی سائیڈ سے ٹیک لگائے وہ بزرگ اس کی آمد کے منتظر تھے۔

"ادھر آجاؤ یار۔۔۔"

وہ بارش سے بچاؤ کے لیے باہم جڑ کر کھڑے لوگوں کے ہجوم سے انہی کو ڈھونڈ رہا تھا جب انہوں نے آواز دے کر اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بلایا۔

" آپ تو میری وجہ سے مکمل بھیگ گئے سر۔ مجھے اس کا افسوس رہے گا۔۔۔"

ان کے عین سامنے رک کر وہ ان کے کپڑوں سے ٹپکتے پانی کی دھاروں کو ان کے پیروں میں تالاب بناتے دیکھ کر بولا۔

اس کی بات سن کر وہ متانت سے مسکرائے اور ایک نظر اپنے گیلے ملبوس پر دوڑا کر معنی خیز لہجے میں بولے۔

" نہیں تم افسوس مت کرو۔ میں تمہاری وجہ سے نہیں بھیگا یار۔۔۔ مجھے بھگونے کے لیے میری ذاتی وجہیں کافی ہیں۔۔۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے بغور اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک جہانِ حیرت آن بسا تھا اور اس کے کچھ بھی کہنے سے پہلے عام لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے مزید بولے۔

"میں دراصل پٹیالہ ہاؤس گیٹ سے داخل ہو کر کرکٹ گراؤنڈ تک ہی پہنچا ہوں تو بارش شروع ہو گئی ہے۔ تمہیں وہاں یوں ساکت بیٹھے دیکھا تو پھر رکنا پڑا اور نہ یہاں تک آنے میں بھیگنا تو یوں بھی ایک لازم امر ہے۔ راستے میں اور کوئی رین بسیرا بھی تو نہیں نا۔۔۔"

بات کے اختتام پر ان کے لبوں پر وہی نرم مسکراہٹ ابھری جس کا ان کے چہرے کے عضلات میں گویا مستقل بسیرا تھا۔

ان کی مسکراہٹ بہت ہمت افزا سی تھی۔

نرم نرم۔۔۔ آس بندھاتی۔۔۔ اور کہیں نہ کہیں سے نمناک بھی۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جہان میں جو پوری جان سے بھی مسکرائیں تو دل سے لیکن۔۔۔ نہیں ہنستے۔

مصطفین کو اس پل ان کی اس دھیمی مسکراہٹ پر یہی گمان ہوا۔

"جی بہتر سر۔ بہت شکریہ۔ اور وہ وہاں میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ

بہت اچھی دھن بجاتے ہو۔ عجب سے سر بکھرتے ہیں۔۔۔ آج آپ کی بانسری کدھر ہے؟ ساتھ نہیں لائے کیا؟ میں وہ پھر سے سننا چاہتا ہوں سر۔"

ایک نظر اپنے آس پاس موجود باہم انتہائی مصروف مختلف اور رنگا رنگ افراد کو دیکھا وہ کسی قدر جھجک کر بولا تھا۔ "وہ" کی نشاندہی کے طور پر اس نے اس نشست کی جانب اشارہ کیا تھا جس سے اٹھا کر وہ اسے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کی جھجک کا سبب یہ تھا کہ وہ اس گفتگو میں کسی کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کے التجائیہ لہجے میں ملفوف سوال اور اس کی باتوں کے ادراک پا کر ان کے بوڑھے چہرے پر عجب سے عکس و رنگ نمایاں ہوئے کہ جن میں صرف و فقط "ملال رنگ" جھلکتا تھا۔۔۔ بانسریوں سے ازلاً وابستہ اس "ہیر" کا "جھنگ" ٹپکتا تھا۔

پھر آنکھوں کی ہر جوت بجھا کر باہر برستی بارشوں کو دیکھتے وہ یاسیت سے بولے۔

"تو بالآخر تم نے مجھے پا ہی لیا۔۔۔ یعنی تمہاری تلاش ختم ہوئی۔ چلو کہیں کسی کا کوئی سفر تو تمام ہوا۔۔۔"

ان کا صدیوں ساتھ کا تھکا لہجہ گویا ساری آسیں ہار چکا تھا۔ مصطفین کو لگا ساری بارشیں اپنی آنکھوں میں بھر کر انہوں نے اس کے دل پر لا نچوڑی ہیں۔ باہر تو بھیگا ہی اس کا اندرون بھی بھیگنے لگا۔

" آپ کو کیا پتا کہ میں آپ کو تلاش کرتا رہا ہوں؟ آپ کیسے جانتے ہو مجھے؟؟ میں تو آج سے پہلے آپ سے ملا بھی نہیں۔۔۔"

پیلی روشنیوں میں چھن چھن کر وسیع صحن کی حد میں گرتے بارش کے قطرات کو دیکھتا وہ بے تابی سے پوچھنے لگا۔ یاس و حیرت میں ڈھکا اس کا لہجہ انتہائی مودب تھا۔

اس سے پہلے کہ جواب میں وہ کچھ کہتے ان کی پشت پر موجود کب سے مسلسل ہنستے لڑکوں میں سے ایک اپنی کھلکھلاہٹوں میں ہی تھوڑا پیچھے ہو کر مصطفین سے ٹکرا گیا اور پھر فوراً ان کی جانب رخ کر کے اس کے پاؤں پر آیا اپنا پاؤں ہٹاتے ہوئے وہ شرمساری سے بولا۔

"اوہ۔۔۔ ایم سوری برو۔ غلطی سے لگ گیا۔ بہت معذرت۔ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی نا۔۔۔؟؟"

اسے بازو سے تھام کر گرنے سے سنبھالتا وہ خوب شرمندہ دکھائی دیا۔ مجبوراً اپنی گفتگو ادھوری چھوڑ کر انہیں

اس غیر متوقع خلل کی جانب توجہ کرنا پڑی۔ اس لڑکے کے باقی ساتھی بھی اسی طرف متوجہ تھے۔

"اٹس اوکے برو۔۔۔ ایم فائین۔ ڈونٹ یو گیٹ وری۔ اور چوٹوں کا کیا ہے۔۔۔ چوٹیں تو لگتی رہتی ہیں۔ بس انسان کو برداشت کرنا آنا چاہیئے۔ ہاں لیکن سنبھال لینے کا شکریہ۔۔۔"

اس دھکے سے سنبھل کر نرمی سے اس کا بازو تھتھپاتے ہوئے وہ متین لہجے میں بولا اور شائستگی سے مسکرایا۔

اس کی گہری و عمیق بات سے لڑکے کی آنکھوں میں تحیر در آیا۔ شاید وہ اس سے کوئی سخت و گرم سننے کی توقع کر رہا تھا۔

"بہت شکریہ یار۔ آپ کا اخلاق اچھا لگا۔۔۔"

اپنی حیرت پر قابو پا کر جواباً اس نے بھی مسکرا کر کہا اور واپس اپنے ساتھیوں کی جانب دھیان کر لیا۔

ایک طویل سانس بھر کر وہ دوبارہ اس بزرگ کی طرف پلٹا جو چہرے پر خوش کن تاثرات سجائے اسے بہت پیار سے دیکھ رہے تھے۔

"شاباش بیٹے۔۔۔ منفی رویہ جات پہلے سے بہت ہیں۔ انسان کو حتی المقدور کوشش کرنی چاہیئے کہ صرف مثبت رویوں کا پرچار کرے۔ بہت اچھا لگا مجھے تمہارا اس سے یوں پیش آنا۔ جیتے رہو۔ آمین۔۔۔"

اس کا شانہ دبا کر انہوں نے اسے بھرپور داد دی تو وہ سادگی سے ہنس دیا۔

"بہت شکریہ سر۔۔۔ محبت ہے بس آپ کی۔ حسن نظر ہے۔ ورنہ اتنا اچھا میں ہوں نہیں شاید جتنا آپ نے پایا ہے۔ اور آپ نے بتایا نہیں مجھے کہ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟؟"

عاجزی سے کہہ کر اس نے اپنا پہلے والا سوال دہرا دیا۔ وہ متجسس تھا کہ وہ اس سے کیونکر واقف ہیں؟

پھر اس نے باہر دیکھا کہ بارش کی شدتوں میں بھی اب وہ پہلے سی تاب نہیں رہی۔

"بڑے خودشناس لگتے ہو۔ خیر اچھی بات ہے۔ انسان کو ایسا ہونا بھی چاہیئے۔۔۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں باہر جلتی پیلی روشنیوں سے چھن چھن کر برستے بارشی قطرات کا کم ہوتا زور جانچا اور پھر اس کی بھیگی آنکھوں میں جھانک کر مزید بولے۔

"اور کسی کو جاننے کے لیے اس سے ملنا ضروری تھوڑی ہے یار۔۔۔ کوئی آپ کی چاہ کرے تو اس کی

چاہتوں سے خبردار ہونا یوں بھی ممکن ہے۔ کوئی آپ کے پیچھے بھاگے تو آہٹیں پہنچ ہی جاتی ہیں۔ رابطے، وسیلے یا ذریعے بالمشافہ ملاقات سے ہٹ کر بھی۔۔۔ اور بہت سے ہوتے ہیں۔ شاید تم نہیں سمجھو گے یا کیا پتا کہ تم سمجھو بھی۔۔۔"

ٹھہر ٹھہر کر بولتے بھید بھرے لہجے میں انہوں نے بہت کچھ کہہ بھی دیا تھا اور کچھ کہا بھی نہیں۔ مصطفین کو لگا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اپنے "تعاقب" کیے جانے سے "آگاہی" کا بتا رہے ہیں۔

"تو یعنی آپ واقف تھے۔ اپنے پیچھے ہر بار۔۔۔ میری ہر ایک دوڑ سے۔ تو پھر آپ رکے کیوں نہیں؟؟ یا پھر آپ نے آج خود بخود مجھے کیوں بلا لیا؟ میں آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں سر۔۔۔ کیا مطلب ہے اس سب کا؟ مجھے سمجھائیں ضرور۔۔۔"

ملفوف وملفوظ لہجے میں دیا گیا ان کا واشگاف پیغام جان کر وہ حیرت زدہ سا یوں بولا کہ یکا یک اس کے لہجے میں دبی بہت سی بے قراریاں جھلکنے لگیں۔

اس کا بے تابانہ انداز دیکھ کر وہ دھیمی آواز میں بولنا شروع ہوئے۔

"ہاں میں ہمیشہ تمہاری اس دوڑ دھوپ سے خوب خوب واقف رہا ہوں۔۔۔ لیکن رکا اس لیے نہیں کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ بانسری کی مدھر دھنوں پر بے چین ہوتے لوگ اندر سے سکھی ہرگز نہیں ہو سکتے۔ جنہیں یہ سر اس قدر بھانے لگیں وہ کھنچے چلے آتے ہوں وہ اندر سے بہت خالی ہوتے ہیں میری جان۔ اور کسی کی بے چینی کو سوا کرنے سے بہتر ہوتا ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ کسی کا درد بڑھا کر اسے حد سے پار لے جانے سے بہتر ہوتا ہے اسے فصیلِ درد پر ہی رہنے دیا جائے۔ میں ہر بار نہیں رکا کیونکہ میں کبھی بھی نہیں رک سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے سالوں پہلے ایک جوان لڑکے کے لیے ایک بانسری بجانے والے کو رکتے دیکھا ہے۔ اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بانسری بجانے والا تو "گذر" بھی گیا لیکن وہ جوان لڑکا آج بھی اسی جگہ پر ساکت کھڑا طرح طرح کی بانسریاں بجاتا ہے۔ کئی ساز چھیڑ کر بہت سے کرب پیتا ہے۔ رنگا رنگ سروں میں پور پور بھیگ کر بہت سے سر بکھیرتا ہے۔ میں گواہ ہوں کہ یہ سر، سنگیت، نغمات سارے۔۔۔ بس دور سے ڈھول سہانے ہیں۔ اندر سارا درد ہے ان میں۔ یہ حقیقت نہیں فقط اذیت ہیں۔ میں نہیں رک سکتا تھا یار۔۔۔

کیونکہ میں یہ بھی جانتا ہوں درد و غم کی سب فصیلوں کے پار صرف وفقط بے حسی ہے۔ وہ ایسا مقام ہے جہاں حسیں گھلنے لگتی ہیں۔۔۔"

یہاں تک بولتے بولتے ان کا گلا رندھ گیا اور انہوں نے بارشوں سے گیلی ہوئی اپنی بوڑھی آنکھیں پونچھ کر ایک طویل ہنکارا ابھرا۔ مصطفین کو لگا انہوں نے بالوں سے گر کر آنکھوں میں جذب ہوتا صرف "بارشی پانی" ہی نہیں پونچھا۔ اس کے ساتھ بہت سے " آنسو" بھی تھے۔ ان کی زخم زخم گفتگو میں عجب سی بے سکونی تھی کہ انہیں روتا ہوا محسوس کر کے وہ تڑپ گیا۔ ان کے وضاحت نہ کرنے پر بھی اس نے صراحت سے جان لیا تھا کہ اس جوان لڑکے اور بانسری والے کی کہانی میں موجود وہ "جوان لڑکا" یہی بزرگ رہے ہیں۔ ان کے رنجیدہ لہجے کا درد جان کر اس نے اپنی حیرت سنبھالی اور پھر کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموشی اختیار کرنے کا کہہ کر وہ مزید بولے۔ جبکہ مصطفین کے لب بس تھرا کر رہ گئے۔

"ہاں آج تمہیں وہاں یوں ساکن بیٹھے دیکھ کر اس وجہ سے رک گیا ہوں کہ کہیں اس سرد بارش میں بھیگتے ہوئے تم بیمار ہی نہ پڑ جاؤ کیونکہ لاکھ نظر انداز کرنے کے باوجود بھی تم سے عجب سی ایک انسیت سی ہو گئی ہے۔ کئی بار یہاں آؤں تو تمہیں ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اس احساس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ یقیناً بے سبب ہے۔۔۔"

بات مکمل کر کے وہ ہلکے سے مسکرائے اور ایک لمبا سانس بھر کر یوں خارج کیا گویا صدیوں سی تھکن اتاری ہو۔ ان کی ہر بات پر وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ اسے لگا کہ اس کے سارے حروف اور پورے لفظ۔۔۔ سب کا سب کہیں کھو گیا ہے۔ ان سے اس کا یوں سامنا ہو گا یا وہ ان سے ایسے ملے گا۔۔۔ یہ تو کبھی اس کے سان و گمان تک میں نہیں تھا۔

اس کی حالت سمجھتے ہوئے وہ چپ چاپ اس کے بولنے کے منتظر رہے۔ باہر بارش اب مکمل طور پر رک گئی تھی اور ان کے آس پاس کھڑے تمام لوگ آہستہ آہستہ اور باری باری اس برآمدے سے باہر نکل کر مختلف سمتوں میں بڑھ رہے تھے۔ سب کا رخ اپنی اپنی منازل کی جانب تھا اور ان سب کو جاتا دیکھتے مصطفین کو لگا وہ کہیں بہت پیچھے ہی رہ گیا ہے۔ چند پل اسی بے معنی خاموشی کی نذر ہوئے اور پھر چہرے پر عمیق سوچوں کے عکس لیے

وہ مودب لہجے میں بولا۔

"میں آپ کی بات سمجھ سکتا ہوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پتا نہیں مجھے شاید یہ کہنا بھی چاہیئے کہ نہیں۔۔۔ کہ میں "سمجھ" سکتا ہوں۔ کیونکہ درد جس کا ہو در حقیقت صرف "اسی" کا ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کی شدتیں نہیں جان سکتا۔ بہر حال جو کچھ بھی۔۔۔ یا جو جو بھی آپ نے بیان کیا ہے وہ سب انتہائی پر درد ہے۔ یقیناً آپ کی ہر ہر بات سچی ہے۔ جس طرح سے آپ نے بیان کیا ہے۔ سب کا سب ویسا ہی ہے۔ اور رہی بات "میرے" درد کی یا میرے اندر سے خالی ہونے کی تو مجھے کیا دکھ ہے یا کتنا ہے؟؟ اس پر مدت ہوئی سوچا ہی نہیں میں نے۔ بہت مصروف ہوتا نہیں "رہتا" ہوں۔ فرصت ملے بھی تو "ایسی" فراغت نہیں دیتا خود کو۔ ہاں بس یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ کی بانسری سے نکلی ساری دھنیں مجھے بڑا بے قرار کرتی ہیں۔ یہاں پارک میں کئی ایک سے سنا ہے میں نے کہ اس بانسری سے انہیں سکون ملتا ہے۔ یہ ان کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ اس سے کچھ بڑھ کر معاملہ ہوتا ہے۔ ان سروں سے میرے کانوں میں رس گھلنے کے ساتھ ساتھ صحنِ دل میں ڈھیروں محشر بھی برپا ہوتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ اس کے ہر ہر سر سے میری پوری پوری جان لپٹتی جاتی ہے۔ یہ صرف چند با ترتیب آوازیں نہیں ہیں بلکہ میری روح کا سمٹا ہوا انتشار بھی ہیں۔ ان میں عجب سی فسوں گری ہے۔ باندھ لینے والی۔ ایسی سحر گری کہ جو ہلنے بھی نہیں دیتی۔ اور مجھ سے انسیت کے اس اظہار کا بہت بہت شکریہ سر۔۔۔ مجھے بہت اچھا لگا ہے آپ کا یوں کہنا۔"

آس و یاس میں بھیگے نرم نرم لہجے میں اس نے دھیرے دھیرے اپنے دل کا سارا عالم کہہ سنایا اور اس دوران اس نے ان کے احساسات کا بھی بھرپور احترام کیا تھا۔ بات مکمل کر کے انہی کی طرح ایک طویل تر سانس بھر کر صدیوں کی تھکن اتارتے ہوئے اس نے پورے برآمدے میں نگاہ گھمائی اور کسی قدر چونک گیا۔ اپنے دھیان میں رہ کر اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہاں اب ان کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ سب واپس جا چکے تھے۔ پھر اس نے باہر نگاہ کی تو پیلی روشنی کی آخری حد کے پاس مدھم اندھیرے میں انہی لڑکوں کا گروپ نظر آیا جو کچھ دیر پہلے ان کی پشت پر کھڑے تھے۔ بارش رکنے کے باوجود فضا میں وقفے وقفے سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ کا ہیبت ناک شور سنائی دیتا تھا۔

اس دوران لب بھینچ کر بغور اس کی ہر بات سنتے ہوئے اس بزرگ کے چہرے کے رنگ و تاثرات مسلسل بدلتے رہے۔ کچھ توقف کے بعد ستون کی ٹیک چھوڑ کر انہوں نے اچانک اسے شانوں سے پکڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پراسرار لہجے میں بولے۔

"واپس لوٹ جاؤ میرے بچے۔ محسوسات کی یہ راہیں جن پر تم چل نکلے ہو بڑی خاردار ہیں۔ سوائے اندرون کے زخموں کو جھیلنے سے۔۔۔ ان پر اور کچھ نہیں ملنے والا۔ یہ باتیں۔۔۔ یہ لب ولہجہ تمہارا۔۔۔ اس دور میں ملنا مشکل ہے۔ اپنی قدر کرو۔ بانسریوں کی دھن کے پیچھے خود کو ضائع مت کرو۔ تمہاری عمران ناہموار جذبوں کو جھیل لینے جتنی نہیں ہے۔ تمہاری یہ کانچ سی بھوری آنکھیں بہت گہری، بہت ہی خوبصورت ہیں۔ جاؤ اور کسی سے "عشق" کرو۔۔۔ چلتا ہوں اب۔ خدا حافظ۔۔۔"

بات کے اختتام پر اس کے شانے کو نرمی سے دباتے ہوئے، انہوں نے ترغیب دینے والے انداز میں باقاعدہ اسے چلے جانے کے لیے دھکیلا۔

ان کی باتیں سن کر ان کی آنکھیں میں درج عمیق تر رازوں کے گہرے گہرے بیان پڑھتے مصطفین کو لگا کہ وہ سچ مچ خالی ہو گیا ہے۔ ان کے ہلکا سا دھکیلنے پر بھی وہ اپنی جگہ سے یوں پورا کا پورا ہل گیا تھا کہ گویا کوئی خالی پتلا ہو اور بات مکمل کر کے ایک لحظے کو رکے بغیر وہ واپسی کے لیے مڑ گئے۔

کچھ دیر بعد ان کی باتوں کے اثر میں رہ کر اپنی جگہ ساکت کھڑے مصطفین نے بمشکل سنبھل کر ان کے پیچھے جا کر انہیں روکنا چاہا اور پھر دو تین قدم برآمدے سے باہر اٹھا کر وہ یکا یک رک گیا۔ تیز تیز قدموں سے چل کر دور روشنیوں کی حد سے پار اندھیرے میں ڈوبتا ان کا وجود دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ وہ اب رکنے والے ہرگز بھی نہیں ہیں۔

اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس نے اوپر آسمان کو دیکھنا چاہا تو اندھیرے کی سیاہ و عمیق چادر میں الجھ کر اس کی نظروں نے زیادہ مسافت طے کرنے سے انکار کر دیا۔

"میں ان کا نام تک نہیں جان سکا ہوں۔ آہ۔۔۔"

کف افسوس مل کر اس نے ہواؤں میں ٹھوکر ماری اور پھر ایک نظر دوبارہ ان کے جانے کی "سمت" دیکھ کر

وہ بھی واپس پلٹ گیا۔ اب اسے گھر جانا تھا۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری توقعات کے برخلاف ملتی چیزیں یونہی غیر متوقع طور پر کہیں کھو بھی جاتی ہیں اور ان کے یکا یک ملنے سے ہوئی حیرت مبتلا ہوئے ہم ان کے اچانک کھو جانے پر بلبلا اٹھتے ہیں۔ جبکہ زندگی اس وقت ہمیں یہ درس دے رہی ہوتی ہے کہ توقع سے ہٹ کر ملتی چیزوں کے اچانک غیاب کے لیے بھی ہمیں ہمیشہ تیار رہنا چاہئیے۔ مستقل خوشیاں۔۔۔ ناممکن ہیں۔

☆......☆......☆

شدید بارش میں "میٹرو ٹریک" کے ساتھ ساتھ واقع سڑک پر بنے طویل اور کشادہ فٹ پاتھ پر سفیر انتہائی تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس کا رخ "یادگار چوک" سے "راوی پل" کی جانب تھا۔ اذانِ مغرب کے تھوڑی دیر بعد، حسب معمول ایک آرام دہ ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس ہو کر وہ گھر سے چہل قدمی کے ارادے سے نکلا اور مین جی ٹی روڈ پر پیدل چلتے ہوئے "مینارِ پاکستان" تک آ گیا۔ اب واپسی کے اس سفر میں زرد موسم کی یہ سرد بارشیں رم جھم رم جھم اس کے ساتھ ہو گئیں۔ چونکہ اس کے پاس ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی جس کے گیلا ہو کر خراب ہونے کا خدشہ ہو لہذا بارش کے پانی سے مکمل طور بھیگ جانے کے باوجود اس نے کسی شیلٹر تلے رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

چست اور گیلے لباس کے جسم سے چپکنے کی وجہ سے اس کی ساری کسرتی ڈھال مکمل نمایاں ہو کر بھرپور چھب دکھا رہی تھی۔ کالے کپڑوں سے جھلکتی اس کی سرخ وسفید رنگت خوب چمک رہی تھی تو ماتھے اور گردن پر جمے گیلے بال بہت خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ اس کے اٹھتے ہوئے ہر ہر قدم پر، سڑک پر رواں گاڑیوں کی روشن ہیڈ لائٹس میں، اس کے چوڑے وجود کی دونوں جوانب بنی مختلف تہہ دار جسمانی سطحیں کسی سمندری شوریدہ لہر کی مانند ابھرا ابھر کر ڈوب رہی تھیں۔ اس کے قدموں کی دھمک سے فٹ پاتھ پر جمع ہوا پانی چھپ چھپ چھپ کی آواز پیدا کرتا ہوا چھینٹوں کی مانند اڑ کر ارد گرد بکھر رہا تھا۔ سڑک سے ہارنز کی مختلف آوازیں اور گاڑیوں کے زن زن سے گذرنے کا شور سنتا وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں عجب سا ایک اضطراب بسا تھا۔ وہ یوں بے مہار ہو کر بھاگ رہا تھا جیسے اندرونی خلفشار میں مبتلا کوئی بھی شخص "اپنے آپ" سے بھاگتا ہے۔ وہ

ایسے بے تحاشا بھاگ رہا تھا گویا خود کا ستایا ہوا کوئی شخص "خودی" سے فرار چاہے۔ اس کے ذہن و دل کے ہر صحن و جاء میں مصطفین اور ثومیہ سے ہوئے مباحثوں کا اثر تھا۔ اس کا پورا وجود جل رہا تھا۔ اس کی متحرّک سوچیں ان جذبات میں لپٹتی رہیں جو بارشوں سے بھی جل، جل اٹھتے ہوں۔ اپنی زیست میں اس نے کبھی "نظر اندازی" نہیں سہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ "عام ہونا" کیا ہوتا ہے۔ ساری زندگی بھرپور "اہمیتوں" کا حامل وہ شخص اب کسی کا "تغافل" برداشت کرنے سے قاصر تھا۔

"وہ ہر بار مجھ سے جان بوجھ کر ایسی باتیں کیوں کرتا ہے کہ مجھے شدید غصہ آئے۔۔۔؟"

یہ سوال اس کی اگن بڑھا رہا تھا۔

"ثومیہ کو مجھ سے زیادہ اس "غیر یا اجنبی" کی فکر کیوں رہتی ہے۔۔۔؟"

ساری حرارتیں دو چند ہوئی جاتی تھیں۔

"میری دوست ہو کر وہ کسی بھی اور کی طرفدار کیونکر ہے۔۔۔؟"

اپنی ازلی عادت سے مجبور ہو کر، دل ہی دل میں وہ اس پر کئی طرح کے "حقوق" جمانے لگا۔

کئی طرح کی باتیں تھیں اور بے شمار سوچیں۔۔۔ اپنے منتشر اندرون کو طرح طرح کی ڈھارسیں دے دے کر بھی وہ ان سے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

سارا دن انہی "محسوسات" میں جلتا کڑھتا آج وہ ذکیہ خاتون سے بھی یہ سب احساسات چھپا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ پھر انہی کو ٹھیک سمجھیں گی۔۔۔

اور وہ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں صرف انہی کو ٹھیک سمجھیں گی۔۔۔؟

کئی پہلوؤں پر اس کا دھیان ابھی تک نہیں گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ "یادگار" سے تھوڑا آگے واقع ایک تاریخی دربار "سرکار گلاب شاہ" کے بالکل سامنے وہ یکا یک رک گیا۔ فٹ پاتھ کی دائیں جانب قطار در قطار پیوست کیے گئے برقی کھمبوں میں سے ایک سے اپنی پشت ٹکا کر وہ جھکا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر لمبے لمبے سانس بھرتے ہوئے خود کو متوازن کرنے لگا۔ اس کی حسین تر آنکھوں کے فسوں خیز دھارے اور دلکش لبوں کے خم دار کنارے اس پول پر روشن برقی قمقموں کی زد میں آ کر مزید

نکھر گئے۔ ان کی سرخی و گلال روشنی پا کر سوا ہونے لگا۔ اس کے گالوں کی انتہائی سفید رنگت بھاگنے کے سبب تپ کر لال ہوگئی تو اس کی چمکدار جلد آبشار کے میٹھے پانیوں میں دھلے کسی تازہ پھل کی چاشنیوں کو تصویر کرنے لگی۔ بارشوں سے دھلتا اس کا صبیح و حسین تر چہرہ گویا اس وقت پورے منظروں کی جان تھا۔ یونہی جھکے جھکے تھوڑا سا چہرہ اٹھا کر اس نے کالی طویل سڑک پر گرتی سفید و شفاف بارشوں کو دیکھا اور پھر گاڑیوں کی جلتی ہوئی روشنیوں سے چندھیائی آنکھیں میچ کر وہ سیدھا ہو کر سست روی سے آگے بڑھنے لگا۔

"وہ کل تم دونوں کے مابین ہوئی ساری بحث بھول کر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ابھی اسی وجہ سے وہ تمہارے پاس آنے والا تھا۔ میں نے اسے روک لیا تا کہ پہلے تمہیں سمجھا سکوں اور اب میں اسے بلا رہی ہوں۔ خیال رہے سفیر کہ یہاں اب مزید کوئی بھی۔۔۔ تماشا نہیں ہو۔ سمجھ گئے؟؟"

تھوڑا آگے جا کر ثومیہ سے آج یونیورسٹی میں ہوئی ملاقات کا یہ ادھورا منظر پوری جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جاگ اٹھا تو انتہائی جھلا کر اس نے سامنے دھرے چھوٹے سے ایک پتھر کو ٹھوکر مار کر بہت دور تک اچھالا اور پھر سے بھاگنے لگا۔ اسے کسی طور قرار نہیں تھا۔ اس ایک بات پر اس کا اندرون گویا پھر سے جل اٹھا۔

اور یونہی اندھا دھند بھاگتے ہوئے اس نے "اسلحہ خانہ" نامی مشہورِ زمانہ پلازہ عبور کیا اور تھوڑا آگے جا کر ایک برقی کھمبے سے پہلے کی طرح ٹیک لگا کر دوبارہ رک گیا۔ تیز تیز چلتی اتھل پتھل سانسوں کی بدولت اس کا کشادہ سینہ، چوڑے شانے، اور خوبصورت جسامت کی ہر نقش و ڈھال بھرپور نمایاں ہو رہی تھی۔ یونانی دیوتاؤں سا تنا ہوا اس کا سخت وجود کسی چٹان کی مانند مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ سڑک کے پار ایک شیڈ کے نیچے کھڑے عام مسافر اور بھیگنے سے بچاؤ کے لیے رکے موٹر سائیکل سوار اسے حیرت و شوق و دلچسپی سے یوں بارشوں میں بھیگ کر مسلسل ہانپتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس کا دلکش وجود ان سب میں سے کئی ایک کی توجہ کا مرکز بنا۔ سانس ہموار کرنے کے دوران ان سب کو قطعاً نظر انداز کرتا وہ دھیرے دھیرے اپنی "منزل" کی سمت چلنے لگا۔ یوں بے شمار بھاگ کر ایک پل کے لیے اسے لگا کہ اس کا اندرون بجھنے لگا ہے۔۔ اس نے محسوس کیا گویا یوں خود اذیتی کی سی کیفیت میں رہ کر اس کا سارا غبار چھٹ گیا ہو۔ اس نے خود میں ایک واضح "نتھار و نکھار" محسوس کیا۔ پھر مختلف سوچوں میں گھر کر "امامیہ کالونی" پہنچنے تک تیز ہواؤں کی زد میں دھرے اس کے فسوں گر وجود

سے پوری قنوطیت بہہ گئی تھی۔

انسان اگر چاہے تو اپنی ہستی کی پہچان کا سفر بہت تیزی سے مکمل کر سکتا ہے۔ شعور کے جاگنے سے کل مدارج و مراحل با آسانی طے ہونے لگتے ہیں۔ فہم اگر ہو تو سب ممکن بناتا ہے۔

اپنی جائے رہائش "امامیہ کالونی" میں داخل ہونے تک مختلف کیفیات و افکار میں ڈھلتے ہوئے وہ بتدریج متوازن ہوتا چلا گیا۔

"ایک بار... صرف ایک بار... اور صرف ثومیہ کے کہنے پر مجھے اس کی طنزیہ باتوں کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ پھر اس طرزِ عمل کے نتائج دیکھنا ہوں گے۔ ماما اور وہ دونوں کہتی ہیں کہ میں ہی اپنا رویہ بدلوں۔ تو چلو یوں کر کے بھی دیکھ لیتا ہوں۔"

بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ کر ایک ویران موڑ پر رک کے سفیر نے یہ سوچتے ہوئے آنکھیں موندیں اور کچھ دیر بارش کے قطرات کا اپنے چہرے پر گرنا محسوس کر کے وہ گویا بارش کی شدتوں کو چومنے لگا۔ پھر ہونٹوں کے دلکش کناروں پر ٹکے چند سرد قطرات کو، دونوں ہونٹ باہم بھینچتے ہوئے اس نے نرمی سے پیا اور دلکش لبوں کی حسین تر کروٹیں بدل کر شدید بارشوں کا پورا رقص اپنے اندر چھان لیا۔

ان قطروں کی ٹھنڈک سے اس کے لال ہونٹوں کے فسوں خیز دھارے گویا اور "سلگ" اٹھے۔

ان کا "گلال" مزید بڑھ گیا تھا۔

اور کچھ دیر یونہی ساکت و ساکن رہنے کے بعد، اپنے بالوں میں ہاتھ ڈال کر "بارشیں نچوڑتا" وہ اپنے گھر کی گلی میں داخل ہو گیا۔

اس کا گلال رنگ چہرہ اطمینان کی تمازتوں سے جگمگا اٹھا اور سرد بارشوں کی بہتی ہر ہر آہٹ... وہ مدھر سروں سی سننے لگا۔

اپنی اپنی ذات کے اندرونی خلفشار سے نجات حاصل کر کے پورے دل سے مسکرا دینا... ہاں "زندگی" اکثر یوں بھی سکھاتی ہے۔

☆......☆......☆

اگلے روز صبح سویرے جاگ کر مصطفین نے منہ ہاتھ دھویا اور الماری سے تہہ لگے کپڑے نکال کر بغل میں دباتا ہوا انہیں نیچے لے جا کر استری کرنے کے ارادے سے باہر راہداری میں نکل آیا۔ راہداری کے وسط میں پہنچ کر اس نے ایک بیرونی کھڑکی میں رک کر باہر آسمان کی طرف دیکھ کر موسم کا حال جانچا۔ ساری رات گرجتا برستا بادل اب فقط چند چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں نیلے آسمان پر سفید روئی کی مانند تیر رہا تھا۔ ہوائیں فی الوقت ساکن تھیں اور دور مشرق کی جانب پرندوں کے چار غول طویل تر قطاریں بنا کر محوِ پرواز تھے۔

ایک ثانیے کو مزید رک کر اس نے بارشوں سے دھل کر صاف وشفاف دکھتے نیلی مسجد کے بڑے بڑے گنبد و مینار دیکھے اور پھر مسجد کے صحن میں ہل ہل کر سپارہ پڑھتے بچوں کو دیکھ کر "اللہ اکبر۔۔۔" کہتا ہوا واپس مڑ گیا۔

سیڑھیاں اتر کر اس نے باورچی خانے سے آتی کھٹ پٹ کی آوازوں پر کان دھرتے ہوئے اونچی آواز میں "السلام علیکم خالہ۔۔۔" کہا اور "خالہ" کے جواب کا منتظر رہ کر نشست گاہ عبور کرتا ہوا نچلی راہداری میں دھرے استری اسٹینڈ پر جا رکا۔ کپڑے ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے جھک کر پلگ لگایا اور پھر شرٹ کھول کر اپنے سامنے اسٹینڈ پر پھیلانا شروع کر دی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ اور دیکھ بھی لیا کرو پہلے کہ "ماسی" ہے بھی کہ نہیں تمہاری وہاں۔۔۔ ویسے تو بڑے تیز۔۔۔ بلکہ چالاک بنتے ہو تم۔"

شرٹ استری کرنے کے لیے اس نے جیسے ہی استری اٹھائی ایمان ہاتھ میں بڑا چمچہ لیے باورچی خانے کے دروازے سے برآمد ہو کر طنزیہ لہجے میں بولی۔ یقیناً وہ مصطفین کی باورچی خانے میں آمد کا انتظار کر کے اس کی "مصروفیت" جاننے کو باہر نکلی تھی۔

"چلو جی۔۔۔ تم سویرے سویرے ہی لگ گئیں متھے آج پھر؟؟ جاگیں کیسے اتنی جلدی؟ سارے "گھوڑے، گدھے" بک بھی گئے کیا؟ اتنی جلدی؟ حیرت ہے۔۔۔ نئیں اگر میں نے دیکھے بغیر خالہ کہہ بھی دیا ہے تو کون سی یا کیا قیامت ٹوٹ پڑی؟ ویسے بھی "ماسی" تو تم ہوناں۔۔۔ وہی ماسی جسے سب "مصیبتے" کہتے ہیں۔۔۔ اور تمہیں پہلے بھی کتنی بار سمجھایا ہے کہ میں چالاک صرف بنتا نہیں ہوں۔ میں چالاک "ہوں" بھی۔۔۔"

اسے دیکھ کر کسی قدر حیران ہوئے مصطفین نے خود کو سنبھال کر فوراً سے پیشتر جوابی وار کیا اور ایک نظرِ تغافل اس پر ڈال کر زیرِلب مسکراتا، اس کی حالت کا حظ اٹھاتا وہ شرٹ استری کرنے لگا۔ ایمان کے طنزیہ لب ولہجہ پر اس کی رگِ شرارت ہر بار یونہی پھڑک جایا کرتی تھی۔

اس کی بات سن کر ماتھے پر بل ڈالے وہ دوبدو لہجے میں بولی۔

"ہاں گھوڑے تو بک گئے سارے پر ایک " گدھا" ابھی باقی ہے۔ جسے " بیچ کھانے" کے لیے جاگنا بہت ضروری تھا۔ اور خبردار جو مجھ سے ٹھٹھے لگانے کی ناحق کوشش کی تو۔ کل تو آسانی سے بچ کر بھاگ گئے تھے کیونکہ دروازے کی جانب تھے لیکن ابھی یہی چمچہ مار کر یہ کھلکھلاتی ہوئی بتیسی توڑ دوں گی تمہاری۔ پہلے سے بتائے دیتی ہوں ہاں۔۔۔"

" گدھے" کے طور پر اس کی جانب اشارہ کر کے بات کے اختتام پر اس نے چمچہ ہوا میں لہراتے ہوئے باقاعدہ اسے دھمکایا تو کل کا منظر یاد کرتے ہوئے اس نے ایک بلند تر قہقہہ لگایا۔

"اوہ۔۔۔ ویری فنی۔ دیکھو تو کہہ کون رہا ہے؟ جسے خالہ کے بیلنوں سے بچانے کے لیے میں ہر بار اپنی اس معصوم جان پر کھیل جایا کرتا ہوں۔ ہاہاہا۔ غصہ کر رہی ہو؟ اچھا سوری میڈم۔۔۔ جانے دو یہ سب باتیں۔ ابھی کے لیے باہم معافی تلافی کرتے ہیں۔ ویسے کل ہوئی اخیر تھی تمہارے ساتھ۔ یاد کرو ذرا۔ اور یہ تو بتاؤ کہ خالہ کنیز کدھر ہیں؟ خالو تو یقیناً جا چکے ہوں گے دکان پر۔"

اس کے بھینچے لب اور ماتھے کی تیوریاں دیکھ کر، بمشکل ہنسی روکتا ہوا وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا اور آخر پر اسے پھر سے چھیڑ دیا۔ اس کی بات سن کر اس کے ماتھے پر موجود بلوں میں بے تحاشا اضافہ ہوا اور اس سے پیشتر کہ چہرے کے تنے ہوئے عضلات سے وہ مزید کچھ بھی کہتی۔۔۔ یوں ہوا کہ یکا یک ہاتھ اٹھا کر اسے "رکنے" کا اشارہ کرتی وہ اپنی ناک سکیڑ کر فضا سے کچھ سونگھنے لگی۔ اس کے اس انداز پر حیران ہوتا، ناسمجھی کے عالم میں وہ اس کا سبب پوچھنے ہی لگا تھا کہ اپنا "پوز" توڑ کر وہ یہ کہتی ہوئی باورچی خانے میں بھاگ گئی۔

"ہائے بیڑا ہی غرق ہو تمہارا۔ منحوس نے باتوں میں لگا لگا کر میری ہانڈی جلا دی ہے۔ اب امی سے میری خیر کوئی نہیں۔۔۔"

اور اس کے ان" کوسنوں" پر بے تحاشا ہنستا ہوا وہ استری اسٹینڈ کی حد سے نکل کر بولا۔

"ارے یہ تو بتاتی جاؤ کہ خالہ کدھر ہیں؟؟؟"

اس کے اس سوال کا مقصد بھی اسے مزید چھیڑنا ہی تھا ورنہ اسے اندازہ تھا کہ وہ حسب معمول سامنے موجود دودھ دہی کی دکان سے دہی لانے گئی ہوں گی اور اس کا اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوا کیونکہ اسی وقت ہاتھ میں دہی والا پلاسٹک کا برتن پکڑے کنیز بیگم لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔

"سلام خالہ۔۔۔ میں ابھی آپ کا ہی پوچھ رہا تھا ایمان سے کہ میری خالہ کدھر ہیں۔ صبح سویرے آپ کو نہ دیکھوں ناں تو مزہ ہی نہیں آتا مجھے۔۔۔"

انہیں دیکھ کر سلام کے بعد اس نے شرارتی لہجے میں کہا اور واپس جا کر کپڑے استری کرنے لگا جبکہ اس کی بات سن کر دروازہ بند کر کے باورچی خانے کی طرف بڑھتی وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ بڑا آیا تو خالہ کی زیارت کرنے والا۔ میں جیسے جانتی نہیں ہوں تجھے۔ ساری خبر ہے۔ تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ یوں کیوں نہیں کہتا کہ صبح سویرے خالہ کو ستاؤں نہ تو مزہ نہیں آتا۔۔۔"

ان کی بات پر اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور تیزی سے بولا۔

"آپ کی سب سے اچھی بات ہی مجھے یہ لگتی ہے خالہ کہ آپ سب کچھ سمجھ جاتی ہو۔۔۔ ہاہاہا۔ سچی ایسا ہی ہے۔ روز صبح آپ سے کوئی دو چار سن سنا نہیں لوں تو زندہ ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

اس کے لہجے میں عجب سی مان بھری چاہت تھی۔ کل اس کے نشست گاہ سے اچانک اٹھ کر جانے سے پریشان ہوئی وہ اب اس کا یہ استحقاق بھرا اعتراف سن کر انتہائی نرمی سے مسکرائیں اور باورچی خانے کے دروازے میں رک کر دہی کا برتن آگے بڑھاتے ہوئے ایمان کو پکارا۔

"لے پکڑ ایمانے۔۔۔ اور شہد بھی نکال لینا فریج سے۔"

یہاں سالن جلنے کی مشک پا کر کچھ اور بھی کہتے کہتے یکا یک وہ رکیں اور پھر فکرمندی سے بولیں۔

"سالن جلا دیا ہے نا؟ کیسے؟ ہانڈی رکھ کر کدھر غائب تھیں؟ کتنی بار کہا ہے کہ دھیان سے کیا کر ہر کام۔ کچھ بچا بھی ہے کہ سارا ناس مار دیا ہے؟؟ تمہیں کوئی کام کہنے سے بہتر ہے بندہ خود کر لے۔ حد ہوتی ہے

لاپرواہی کی۔ پھر کہتی ہو ہر وقت جھڑکتی رہتی ہوں تجھے۔ ناں جھڑکوں نہیں تو اور کیا ہو۔ اب دیکھ ایک ہانڈی صرف گرم کرنے میں ہی جلا دی تم نے۔ کیا کروں تمہارا میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔"

اس کے خوب لتے لے کر انہوں نے ایک ہاتھ سے باقاعدہ اپنا ماتھا پیٹا اور پھر مسلسل کھلکھلاتے مصطفین کو گھور کر اسے بھی کچھ کہنے لگی تھیں کہ ان کی باتوں سے تپ کر غصے سے چولہا بند کرتی ایمان یہ کہتے ہوئے رعب سے اٹھلاتی، تیزی سے ان کی جانب آئی۔

"اوہو بس بھی کریں امی۔ اتنی بات نہیں ہوتی جتنا آپ واویلا مچا لیتی ہیں۔ ایک ہانڈی نہ جل گئی جیسے پتا نہیں کیا انہونا ہو گیا ہے۔ اوپر سے آپ کو یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ کس کے سامنے کون سی بات کرنی ہے اور کون سی نہیں کرنی۔ وہ اس کے دانت نکلتے ہوئے دیکھ رہی ہیں نا۔۔۔ بند کروا لیں ورنہ توڑ دوں گی سچ مچ آج۔ اور ہانڈی بھی اسی نے جلوائی ہے مجھ سے عورتوں کی طرح "طعنے معنے" بھڑ بھڑ کر۔۔۔ بڑا نواب رکھا ہوا ہے آپ نے جسے شہد، ملائی مکھن، اور دہی ایک ساتھ چاہیئے ہوتا ہے ناشتے میں۔ مرنے نہیں لگا اگر آج اس سب کے ساتھ سالن نہ ملا تو۔۔۔ خیر ہے جل گئی اگر ہانڈی تو کیا ہوا۔۔۔؟؟"

ان کے ہاتھ سے دہی کا برتن لے کر بلکہ چھین کر اس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی اور وہیں باورچی خانے کی دہلیز پر رک کر مصطفین کی جانب اشارہ کر کے دانت پیسنے لگی۔ جبکہ شرٹ کی سائیڈ پلٹ کر دامن پر استری پھیرتا مصطفین اس کی تمام باتوں کا برا منانے کی بجائے، الٹا ان سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اور زور سے ہنسنے لگا۔ ہاں کنیز بیگم کا منہ لیکن کھلا کا کھلا رہ گیا۔ انہیں ایمان سے قطعاً توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے یوں بنا جھجکے یہ سب کہہ دے گی۔ ان دونوں میں اکثر ہوتی نوک جھونک کا ان دونوں میاں بیوی کو بخوبی علم تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ بس اسے ستاتا ہے ورنہ اس کی بھی بہت عزت کرتا ہے۔ اور ابھی ایمان نے اس کے متعلق حد سے زیادہ واشگاف لفظ استعمال کیے تھے۔ پھر بیٹی کی باتوں سے ہوئی ان کی شرمسار حالت و کیفیت دیکھتا اور بخوبی سمجھتا مصطفین انہیں نارمل کرنے کے لیے اور بات کی "شدت و منفیت" کو کم کرنے کے لیے استری والا ہاتھ روک کر دوبدو لہجے میں بڑی فرصت سے گویا ہوا۔

"چلو جی۔ اب میں اپنی مرضی سے یا آزادانہ ہنسوں بھی نہیں۔ کیوں بھئی؟؟ اب کیا میرا خود پر اتنا سا

بھی "ادیکار" نہیں رہا؟؟ خیر آئندہ ہنسنے سے پہلے دیکھ لیا کروں گا کہ ارد گرد کوئی جلنے والا تو نہیں ہے نا۔ اور یہ عورتوں کی طرح طعنوں والے جملے پر میں شدید معترض ہوں کیونکہ میرے "خالہ" سمجھ کر تمہیں سلام کرنے پر وہ "تم" تھیں جو میری "ماسی" نہ ہونے کا "اعلان" کرنے اور مجھے "خبردار" کرنے ہاتھ میں چمچہ لہراتی بلکہ اس چمچے سے مجھے "دھمکاتی" ہوئی باہر آئی تھیں۔ کوئی نائی بھیج کر نہیں بلوایا تھا میں نے کہ آؤ اور مجھ سے فضول بحثوں میں لگ کر ہانڈی جلا لو۔ تمہارا کام تھا تمہیں دھیان رکھنا چاہیئے تھا۔ میری کوئی غلطی نہیں اس میں۔ سراسر تمہارا قصور ہے۔ رہی بات میرے ناشتے پانی کی تو یہ میرا اور میری خالہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے نوالے گنو یا دخل دو۔ سمجھیں۔ اور خبردار جو آئندہ......۔"

بے تکان بولتا یہاں تک پہنچ کر بے ساختہ وہ رکا اور ایمان کی طرح ہی ناک سکیڑ کر ہوا میں کچھ سونگھنے لگا۔ ان دونوں کو یوں لڑتے دیکھ کر باری باری پریشانی سے انہیں دیکھتی کنیز بیگم نے بھی چونک کر اس کی بے نقط "گفتگو" میں در آیا یہ سکوت جانچا۔ ایمان کے چہرے پر بھی اس کے بے وقت سکتے سے تجسس ابھرا۔ اور اگلے ہی لمحے اس نے تیزی سے اپنے سامنے پھیلی شرٹ کے دامن سے استری ہٹائی اور ایک جھٹکے سے شرٹ اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے کرتا ہوا وہ ان کی جانب رخ کر کے بے یقینی سے اسے گھورنے لگا۔ اس میں استری کی شکل کا بڑا سا ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔ ایمان کو "بے دھیانی" میں ہانڈی جلانے پر سنانے کے چکروں میں مگن ہوا وہ اسی "بے دھیانی" میں اپنی شرٹ جلا بیٹھا تھا۔

اور استری جیسے تکونی سوراخ کے اس پار سے جھانکتے اس کے حسین چہرے کو دیکھ اور اس پر بجتے "بارہ" پڑھ کر ایمان، باورچی خانے کے دروازے سے لگ کر پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوہری ہو ہو کر ہنسنے لگی۔ حیرت سے ان دونوں کی باہم نوک جھونک اور اس کے "نتائج" دیکھتے ہوئے ایک لحظے کو ٹھہر کر کنیز بیگم بھی ہنس دیں۔ اس وقت صورتحال ایسی بن گئی تھی کہ ساری سنجیدگی بے معنی ہو گئی۔ ایک طرح سے بات کی نوعیت اور موضوع ہی بدل گیا۔

"شاباش۔۔۔ کوئی حال نہیں تم دونوں کا اور نہ ہی کوئی حل ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے چکر میں بھلے ہی اپنا نقصان کر لو۔ نہیں میں کہتی ہوں مصطفین تجھے ذرا بھی عقل نہیں آئی اسے ڈانٹتے ہوئے کہ خود تو

دھیان کر لیتا۔۔۔"

بالآخر ہنسی دبا کر کسی قدر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے انہوں نے ان دونوں کو گھر کا اور مصطفین کو ڈپٹ کر دروازے سے لگ کر لوٹ پوٹ ہوتی ایمان کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا۔

"اور تو بھی پرے ہٹ نی۔۔۔ نرے ٹھٹھے لگانے آتے ہیں اور کچھ نہیں۔ خبردار جو آئندہ اتنی زبان درازی کی تو۔ گدی سے کھینچ لوں گی اسے۔ چل اب جا۔ بنالوں گی میں خود ہی ناشتہ اس کا۔۔۔"

ان کے کھینچنے سے لگے دھکے سے سنبھلتی وہ مصطفین کو اب تک یونہی کھڑے دیکھ کر پھر سے ہنسنے لگی۔ اور اس کی ہنسی کا "تعاقب" کر کے باورچی خانے میں جاتی جاتی وہ رک گئیں۔

"اوئے بس کر دے اب کیا نکالنا تو نے اس جلی سڑی شرٹ سے۔ جا دوسرے کپڑے لا کر دے اسے یہ استری کر دیتی ہے اور تو آ کر ناشتہ کر لے۔ اور تو یہ جناتی ہنسی روک کر ادھر جا ایمان اس کے واپس آنے تک استری صاف کر دے۔۔۔ بس بند کرو اب دونوں یہ "روز" صبح کا تماشا۔ چلو جاؤ۔۔۔"

اسے اب تک بے یقین وساکت کھڑے دیکھ کر کنیز بیگم نے حکمیہ لہجے میں اسے دوسرے کپڑے لانے کا کہا اور پھر نشست گاہ کے صوفوں پر ابھی ابھی ہنستے ہوئے ٹکتی ایمان کو گھرک کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

انہیں جاتا دیکھ کر اس نے تعمیل کے طور پر آہستگی سے شرٹ نیچے کی اور پھر یونہی دونوں ہاتھوں میں تھامے رکھ کر ابرو اچکا اچکا اپنی حالت پوچھتی ایمان کو گھورا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے ماسی مصیبتے۔ جہاں تمہارا پیر ہو وہاں خیر کیسے ممکن ہے؟؟ مجھے اتنی پسند تھی اپنی یہ شرٹ۔ سب کہتے تھے شہزادہ لگتا ہوں اس میں۔۔۔"

شرٹ کو استری اسٹینڈ پر پٹخ کر، انگلی اٹھا کر اسے موردالزام ٹھہراتے ہوئے اس نے اداسی سے کہا اور پھر ان کپڑوں کو دوبارہ لپیٹ کر بغل میں دباتا ہوا زینوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے مدھم لہجے اور صلح جویانہ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس واقعے سے شرمندہ بھی ہوا ہے۔

"کوئی نہیں دل پر نہ لو۔ کل پرسوں سے میری انسلٹس ہوتی دیکھ کر یوں بھی تم بہت اڑے اڑے پھر رہے تھے۔ وہ کیا ہے نا کہ اب تمہاری یہ خفت تھوڑا اندرونی مرہم کر دے گی میرا۔ یوں سمجھو کہ بچی کا دل خوش

ہو جائے گا۔ اور ہاں سچ تمہارا کام تھا تمہیں دھیان رکھنا چاہیئے تھا۔ میری کوئی غلطی نہیں اس میں۔ سراسر تمہارا قصور ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ اور وغیرہ۔۔۔ یہ ابھی تم ہی کہہ رہے تھے نا "شہزادہ" صاحب؟؟ ہونہہ۔ شہزادہ لگتا ہوں۔۔۔ اندھے ہوں گے وہ لازم جنہیں "تم" بھی شہزادے لگتے ہو۔ جا رہی ہوں میں اپنے کمرے میں۔ آ کر خود ہی کپڑے استری کر لینا۔ مجھ سے نہیں ہوتے بالکل۔ اچھا۔۔۔"

وہ پہلے زینے پر پہنچا تھا جب اس کی آواز سن کر ریلنگ تھامے مڑا اور تحمل سے اس کی بات مکمل ہونے کا منتظر رہا۔ وہ کبھی دوپٹے کا کونا مروڑتی تو کبھی چہرے پر آئی ایک لٹ کو بل دیتی ہوئی عین اس کے سامنے آن رکی تھی۔ اس کے لہجے میں موجود طنز و شوق کی شورش سے وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس واقعے سے وہ بہت زیادہ خوش ہے۔ اور پھر بغور اس کے انداز و اطوار جانچتا وہ تیز لہجے بولا۔

"بس ہو گیا تمہارا۔۔۔ یا ابھی مزید یوں یوں کرنا باقی ہے۔۔۔"

اس کے غرور سے اٹھلانے کی نقل میں دائیں بائیں ہلتا ہوا وہ مزید بولا۔

"کوئی اور طنز رہتا ہو تو وہ بھی کر لو۔ یا پھر کوئی بھی ایسی بات جو میرے جانے کے بعد یاد آئے اور اسے نہ کرنے کا افسوس رہے تمہیں۔ یاد کر کے وہ بھی کہہ سکتی ہو۔ لیکن ایک بات یاد رکھو بس کہ زبان "تمہاری" بھی بڑی پھسلتی ہے اور ہاتھ "خالہ" کا بھی خوب چلتا ہے۔ ابھی بتائے دیتا ہوں تمہیں کہ اب خالہ کے بیلن کے آگے لگ کر کبھی تم بھاگیں نا تو اپنے پیچھے "پناہ" دینے کی بجائے کھینچ کر خالہ کے سامنے ہی کرنا ہے میں نے۔ یاد رکھنا۔ چلو شکل گم کرو اب اپنی۔۔۔"

دائیں ہاتھ کی انگلی اٹھا کر تنبیہاً ہوا میں جھلاتا وہ بات مکمل کر کے اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر زینے چڑھنے لگا۔ اس کے یوں کڑھنے اور باقاعدہ "پرفارم" کرنے پر بمشکل اپنی مسکراہٹ دباتی ایمان نے اسے پھر سے پکارا۔

"ایک منٹ بات سنو۔۔۔"

وہ مڑے بغیر رکا اور اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

"اب کپڑے استری کرنے ہوئے یا نہیں تم نے۔۔۔ لیکن "ہماری" استری ضرور صاف کر دینا جس کا

ستیاناس کیا ہے۔۔۔ پلیز اینڈ تھینک یو۔"

زینوں کی ایک طرف ہو کر مصطفین کے بائیں جانب آتے ہوئے اس نے جھک کر اس کی آنکھیں میں جھانکنے کی کوشش کی اور مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اسے پھر سے چھیڑا۔ اس کی شرارت پر اس نے گھور کر ہاتھ میں پکڑے کپڑے مارنے کا اشارہ کیا تو ڈر کے مارے وہ اپنے کمرے کی جانب بھاگ گئی۔ "بظاہر وہ جتنا زچ لگ رہا تھا اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ مار بھی دے۔

اسے یوں بھاگتے دیکھ کر ایک پل کو رک کر کچھ سوچتے ہوئے اس نے سر جھٹکا اور پھر اس کی ہر شرارت و کھلکھلاہٹ پر پورے دل سے مسکراتا وہ باقی زینے پھلانگنے لگا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ بظاہر اس طنز و مزاح سے جلتا وہ شخص باطنی طور پر فی الوقت اسی سے زندگی کی نوید پاتا ہے اور آس پاس بکھرے بوجھل لمحوں سے خوشیوں کے پل کشید کرتا ہے۔

☆......☆......☆

آسان زندگی گذارنے کے لیے ہمیں چاہئیے کہ کسی کی صلاحیتوں کو سچے دل سے تسلیم کرتے ہوئے ان پر مکمل بھروسہ کر لیں۔ اس سے دوسرے کی نگاہ میں آپ کی قدر و توقیر بڑھتی ہے اور وہ آپ کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کل کا سارا دن اسی غور و خوض میں گذار کر سفیر نے بھی مصطفین کے معاملے میں یہی طریقہ کار اپنانے کا سوچ تھا۔ وہ "لال پلی" بس اسٹاپ پر اسی شیڈ کے نیچے کھڑا تھا جہاں برستی بارش میں اس نے کل بھی پناہ لی تھی۔اور آج بھی وہ اچھرہ نہر کے پل سے سڑک کے ساتھ ساتھ، نہر کنارے بنے وسیع فٹ پاتھ پر پیدل چلتے ہوئے یہاں تک آیا تھا۔

جدید تراش کے خوبصورت ملبوس میں، اسی مخصوص انداز سے یونیورسٹی بیگ کاندھے پر لٹکائے، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے کھڑا وہ حسب معمول بہت دلکش اور بڑا حسین لگ رہا تھا۔ مثبت سوچوں نے اس کے دلپذیر چہرے کے دلآویز نقوش کی کشش بڑھا دی تھی۔ بس اسٹاپ کے اندر یہاں سے وہاں آہستگی سے ٹہلتے ہوئے اس کا مسکان آمیز چہرہ ایسے نرم تاثرات میں کبھی نہیں ڈھلا تھا جیسا آج سج رہا تھا۔

بیگ کاندھے سے اتار کر ایک نشست پر رکھتے ہوئے اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑے لیکن بجائی نہیں۔۔۔ اور شیڈ سے باہر سڑک پر نکل آیا۔ پریسٹن یونیورسٹی کے عین سامنے واقع ہونے کے باوجود یہ ایک ویران اسٹاپ تھا اور شاذ و نادر ہی کوئی اکا دکا مسافر یہاں کھڑا دکھائی دیتا۔ کلائی سے بندھی گھڑی سے وقت دیکھ کر یہ کہتے ہوئے اس نے آسمان کی وسعتوں میں نگاہ جمائی۔

"آج تو بارش بھی نہیں تو بس کیوں لیٹ ہو رہی ہے یار۔۔۔؟"

نکھرا نکھرا آسمان دیکھتا کافی دیر وہ بے وجہ مسکراتا رہا اور پھر ایک خوش کن خیال کے تحت اس کی سجری مسکان اور گہری ہونے لگی۔

"ارے۔۔۔ کیا پتا ثومیہ آج بھی آئے۔ کل بھی تو اسی وقت آئی تھی۔"

ایک بار پھر گھڑی سے وقت دیکھتا وہ گویا "لمحات" گننے لگا۔ مصطفین کے لیے اپنے انتہائی متحمل اور بدلے ہوئے رویے سے وہ آج ثومیہ کو سرپرائز دینے والا تھا۔

کچھ دیر انہی خیالات میں کھویا وہ اپنے آپ سے ہنستا رہا اور پھر دور برقی اشارے کے پار سے سنائی دیتے بس کے تیز ہارن کی آواز پر چونک کر بس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا بیگ لینے کے لیے شیڈ تلے داخل ہوا اور نشست پر دھرا بیگ تقریباً جھپٹتے ہوئے سرعت سے واپس پلٹا۔

بس نہر کا پل عبور کر چکی تو وہ زور زور سے ہاتھ ہلا کر ڈرائیور کو متوجہ کرنے لگا اور پھر ایک طرف ہو کر اس کے رکنے کا منتظر ہو گیا۔

چند ثانیے بعد خود سے چند قدم آگے رکتی بس کے ساتھ ساتھ بھاگتا وہ اس پل کسی قدر حیران ہوا جب اسی کل والے کنڈیکٹر کو دروازے سے سر نکالتے دیکھا۔ اکثر کنڈیکٹرز کی عادت ہوتی ہے کہ مسافر ان چاہے ان سے زیادہ جلدی میں ہوں لیکن وہ بس کے دروازے سے نکل کر انہیں پکارتے ضرور ہیں۔

"جلدی آؤ یار۔۔۔ یو۔سی۔پی جانا ہے نا؟"

یقیناً وہ بھی اسے پہچان گیا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے سوار ہونے کا کہتا اس کی یونیورسٹی کا نام لینے لگا۔

"ہاں یار۔ وہیں جانا ہے۔ تمہیں تو یاد بھی ہو گیا۔ واہ۔ اور راستے سے پیچھے تو ہو تم۔۔۔ چلو اندر۔"

دونوں ہاتھوں سے دروازے کا ہینگر تھام کر اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا تو یہ کہتا ہوا راستے سے ہٹ کر وہ بھی اوپر ہو گیا۔

" آؤ بادشاہو آؤ۔ روز کا کام ہے میرا۔ فوراً پہچان جاتا ہوں روٹین مسافروں کو۔۔۔"

اس نے جواباً صرف خوشدلی سے مسکرانے پر اکتفا کیا اور پائیدان پر دونوں قدم مضبوطی جما کر بس میں سوار ہوا۔ جونہی بس نے رینگنا شروع کیا بس کے قدمچے چڑھتا چڑھتا وہ اچانک رکا اور ہینگر کی گرفت پر اپنا وزن متوازن کرتے ہوئے سر باہر نکال کر پل کی طرف جھانکا۔ پھر اسی لمحے وہاں رکتے ایک آٹو رکشہ کو دیکھ کر، اس میں سے کسی بھی مسافر کے اترنے سے پیشتر اسے ثومیہ کی آمد کا " گمان " ہوا اور بس کے اندر منہ کر کے وہ اضطراری انداز میں چلایا۔

" صرف ایک منٹ رکنا یار پلیز۔ ایک لڑکی آرہی ہے پیچھے۔"

اس کی پکار پر ڈرائیور نے اطرافی شیشوں سے پیچھے سڑک پر جھانکتے ہوئے فوری طور پر بریک لگا لی تو دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ دوبارہ باہر جھانکنے لگا۔ اور اس کا " گمان " اس پل میں " یقین " ہو گیا۔ ہاں دائیں کاندھے پر جھولتا اپنا بیگ اور ہوا کے دوش پر لہراتا دوپٹہ سنبھالتی، تیزی سے بھاگ کر اس جانب آتی وہ ثومیہ ہی تھی۔ اس حسین ترخیال کے حقیقت ہونے سے وہ جھوم جھوم گیا اور بے طرح سرشار ہوا۔ ہینگر سے گرفت ہٹا کر وہ پائیدان پر مضبوطی سے جم کر کھڑا ہوا اور بے ساختہ اس کی طرف ہاتھ ہلانے لگا۔ ادھر ثومیہ نے بھی دور سے ہی اسے دیکھ لیا اور اسی رفتار سے بھاگتے ہوئے ہاتھ ہلا کر دروازے میں آن رکی۔

" ارے۔۔۔ تم آج بھی ہو۔ بھئی واہ۔ اور مسکرا بھی رہے ہو۔ کیا کہنے یار۔ اچھا لگا تمہیں دیکھ کر۔ لگتا ہے روز یہیں ملا کرو گے۔"

کچھ توقف سے کی گئی اس کی بات سے ظاہر ہوا کہ اسے مسکراتے دیکھ کر وہ ایک خوشگوار سی حیرت میں مبتلا ہوئی ہے اور اس کا یہ " توقف " سمجھتا، کھلکھلا کر ہنستا ہوا وہ جواباً بولا۔

" ہاہاہا۔۔۔ اچھا لگا تمہیں " مسکراتا " دیکھ کر۔ دراصل یوں کہنا چاہتی تھیں نا۔۔۔ خیر جانے دو۔ مجھے بھی اچھا لگا تمہیں دیکھ کر۔ شاید ہمارے وقت " باہم " مل رہے ہیں۔۔۔"

دائیں ابرو کے دلکش تان اچک کر اس نے ثومیہ کی حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہاں رقصاں ہر گھر کی حد ماپنا چاہی تو وہ نگاہیں پھیر گئی۔ بظاہر عام سی بات کو اس کا لب و لہجہ و انداز بہت "خاص" کر گیا تھا۔ پھر اس کا گریز جانچ کر اپنی اس بے خودی پر وہ خوب شرمندہ ہوا اور ایک طرف ہٹ کر اسے بس میں سوار ہونے کے لیے راستہ فراہم کرتا بات بدل گیا۔

"لیکن تم لوکل روٹ پر کیسے ہو؟ تم تو وین سے آتی جاتی تھیں نا؟"

اب کی بار اس نے اپنا لہجہ سادہ و عام رکھا تھا جس نے واقعی ثومیہ کو گفتگو میں آسانی فراہم کی۔

"ہاں وین ہٹا دی ہے۔ بہت دیر ہو جاتی تھی گھر آنے جانے میں۔ سمجھو کہ وین کے مرتب کردہ روٹ پر صبح سب سے پہلا اور واپسی پر سب سے آخری گھر میرا ہی ہوتا تھا۔ بہت برداشت کرنا پڑتا تھا یونیورسٹی تک آنے اور پھر واپس گھر جانے تک بھی۔ لڑکیوں کے دروازوں کے آگے بار بار ہارن بجا کر انہیں بلانے سے لگنے والا سر درد الگ۔ یوں لوکل ہی ٹھیک ہے۔ اپنی مرضی سے آؤ جاؤ۔۔۔"

اس کے حصار سے گذر کر، دو قدم چڑھ کر وہ ایک طرف رکی اور پراعتماد انداز سے اس کی بات کا تفصیلی جواب دیا۔ کچھ دیر پہلے اپنے اندر تک اترتی اس کی عمیق تر نگاہوں کو اپنا وہم جان کر فراموش کرتے ہوئے اس نے دوستانہ لہجہ اپنایا تھا۔ اس سے پہلے کہ جواباً وہ کچھ بھی کہتا بس کو رفتار پکڑتے دیکھ کر کنڈیکٹر نے اسے گیٹ سے ہٹ جانے کے لیے کہا۔ اسے ہاتھ کے اشارے سے "اوکے" کہہ کر، ثومیہ کی باتوں پر تفہیمی انداز میں سر ہلاتا وہ اس کے ساتھ جا رکا۔

"صحیح ہے۔ یہی مناسب ہے یقیناً۔۔۔"

اس کی تفصیلاً وضاحت کے جواب میں وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس سے زیادہ کیا کہے؟ اور یہ کہہ کر ایک متلاشی نگاہ پوری بس میں دوڑا کر اس نے ثومیہ کے بیٹھنے کے لیے نشست ڈھونڈنا چاہی۔ بغور اسے دیکھتی ثومیہ اس کا "مقصود" سمجھ گئی اور نرمی سے اس کا شانہ تھپتھپا کر اطلاعاً بولی۔

"میں دیکھ چکی ہوں سفیر۔ کوئی ایک بھی سیٹ خالی نہیں ہے۔ رہنے دو۔ ہم یونہی ٹھیک ہیں۔۔۔"

بات مکمل کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ دلکشی سے مسکرائی۔ اس کا اپنے لیے یوں فکرمند ہونا اسے

بہت اچھا لگا۔

"ہاں واقعی نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں کیمپس ایریا گذر رہے ہیں۔ جلد پہنچ جائیں گے۔۔۔"

اس کی مسکراہٹوں سے الجھتا وہ دوبارہ باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔۔ ان شاء اللہ۔ اچھا سنو تم روز اسی روٹ سے آتے ہو کیا؟"

تائید کے بعد اس نے سوال کیا اور اردگرد بصد شوق ان دونوں کی طرف ہی متوجہ مسافران کی نظریں "پڑھ" کر سر پہ دوپٹہ جمانے لگی۔

"ہاں میرا ابھی یہی روٹ ہے۔ لیکن آج بائیک لے رہا ہوں میں۔ کل سے اسی پر آیا جایا کروں گا۔ سمجھو آج لوکل سے یہ میرا آخری دن ہے۔ ویسے لفٹ مل سکتی ہے تمہیں۔ اگر تم چاہو تو۔۔۔"

واپس اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے خوشدلی سے کہا اور اسے شوخ نظروں کے حصار میں رکھ کر جواب کا منتظر ہو گیا۔

"واؤ دیٹس گڈ۔۔۔ چلو لوکل کی مصیبت سے تو بچو گے۔ پیشگی مبارکباد۔ اور آفر کا شکریہ۔ اس پر غور کروں گی۔۔۔"

اظہارِ مسرت کرتے ہوئے اس نے ٹالنے والے انداز میں اظہارِ تشکر کیا تو اس کا انداز پرکھتا وہ شائستگی سے مزید بولا۔

"شکریہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہاری مرضی پر رکھ کر بات اس لیے کی ہے کہ ان معاملات میں لڑکیوں کے سو تحفظات ہوتے ہیں۔ ورنہ میں تو پورے دل سے کہہ رہا ہوں۔۔۔ مروت سے نہیں۔"

اس کا اخلاص میں بھیگا لہجہ اور انتہائی سمجھداری کی بات۔۔۔ وہ بہت حیران ہوئی۔ سفیر کی ظاہری شخصیت اور تاثر اس کی ایسی باتوں سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس نے مثبت یا منفی کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اس کا ازسرِنو جائزہ لینے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو میڈم؟ میں آج زیادہ پیارا لگ رہا ہوں کیا؟"

اسے گوناگوں کیفیت میں اپنا جائزہ لیتے پا کر وہ شرارت سے بولا تو اس کا مذاق سمجھ کر بے ساختہ اس کے

لب چٹکے۔ پھر اسے آنکھیں دکھاتی وہ مصنوعی غصے سے بولی۔

"ویری فنی۔۔۔ بکواس نہ کیا کرو۔ اتنے حور پرے نہیں ہو تم۔ میں تو بس دیکھ رہی تھی کہ کبھی کبھی تم اپنی شخصیت و تاثر سے بہت ہٹ کر باتیں کرتے ہو۔"

اس کی بات سن کر اس نے جانے "کیا کیا" محسوس کیا کہ سچ مچ سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے یکا یک بدلتے "رنگ و عکس" دیکھتی ثومیہ کے لب بھی سمٹ گئے۔ اور کچھ توقف کے بعد اس کی آنکھیں تکتا وہ شکوہ کناں لہجے میں بولا۔

"میں اب بھی ویسا ہی ہوں جیسا پہلے دن تھا۔ جیسا اول روز تمہیں ملا تھا۔ ہاں بس یہ کہ تم نے مجھ پر غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تمہارا دھیان اب کہیں "اور" ہے......"

اتنا کہہ کر وہ رکا اور لب بھینچ کر پھر سے کھڑکیوں کے پار تیزی سے گذرتے منظر دیکھنے لگا۔ اور "اداس لہجوں" کی شدید محبت میں مبتلا ہو جانے والی وہ نازک سی لڑکی اس کی بات کے اثر میں رہ کر ایک پل کو ہل بھی نہیں سکی۔ اسے لگا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کا ایک شکستہ لہجہ اسے دوستی میں در آئے سارے الزام اپنے سر لینے پر مجبور کر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کھڑکیوں سے پار دھڑا دھڑ گذرتے "مناظر" کو دیکھتا سفیر بھی ان کا حصہ ہو رہا ہے۔ اس پل وہ اسے بڑا "اجنبی" لگا۔

بغور اس کی گہری آنکھوں کے خوبصورت خم و کنارے پڑھتے ہوئے اس نے سوچا کہ اسے اس شخص کو ایک بار "پھر" سے "جاننا" ہو گا۔

اور پھر باقی کی گفتگو یونیورسٹی کے لیے رکھ چھوڑنے کا فیصلہ کر کے، اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے اس فیصلے سے "آگاہ و خبردار" کرتی وہ رخ بدل گئی۔

جانے نمکین پانیوں سا کیا تھا جو اس کی حسین آنکھوں میں چھلکنے لگا تھا۔۔۔؟؟

☆......☆......☆

وہ یونیورسٹی پہنچا تو پہلی کلاس شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھتا وہ آج یونیورسٹی میں جا بجا رنگا رنگ ملبوس میں سج دھج کر، ٹولیوں کی مانند کھڑے مختلف طلباء و طالبات کی تعداد

جانچنے لگا۔ اس کے اردگرد اتنی خوشبوئیں، بولیاں، قہقہے اور کھلکھلاہٹیں تھیں کہ اسے لگا وہ یونیورسٹی نہیں کسی موسمی "میلے" یا پھر "فیشن ویک" میں آیا ہے۔ یہ سارے طلباء دوسرے ڈیپارٹمنٹس کے تھے کیونکہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والا صحن بالکل خالی تھا۔ کسی کی جانب سرسری اور کسی کو بغور دیکھتا وہ "سفید گلاب" کی انہی کیاریوں کے پاس جا رکا جہاں کل سفیر سے "ملاقات" ہوئی تھی۔ بائیں کاندھے پر جھولتا یونیورسٹی بیگ اتار کر اس نے نزدیک دھرے ایک بڑے سے سجاوٹی پتھر پر رکھا اور خود بھی ٹانگیں آگے کی جانب پھیلا کر اسی پتھر کی ہلکی سی ٹیک لے کر کھڑا ہوگا۔ ٹانگیں دائیں جھلاتے ہوئے اس نے کیاریوں میں اگے سفید گلابوں کی طرف نگاہ کی اور پھر اس کے ذہن میں، سفیر کے ان کی ٹہنیوں کے گرد سے "کانٹے چننے" کا منظر ابھرا۔ اسے یاد آیا کہ کیسے اس کام میں لگ کر اس نے اپنی پوریں تک زخمی کر لی تھیں۔ اور اس خیال سے اس کے چہرے پر عمیق تر سوچوں کا عکس نمایاں ہوا۔ پتھر کی ٹیک چھوڑتے ہوئے ان گلابوں کے پاس جا کر اس نے نرمی سے ان پر ہاتھ پھیرا اور ان کی کلیوں اور پتیوں سے نرمی محسوس کرتا وہ اس لمحے سے خوشی کشید کرنے لگا۔ بالآخر ایک پھول کے سامنے بیٹھ کر اس نے بھی سفیر کی طرح اس کی ٹہنی کے گرد اگے کانٹے چننا شروع کیے اور آہستگی سے خود کلام ہوا۔

"اس کا یہ "عمل" بتاتا ہے کہ بندہ وہ "حساس" ہے۔۔۔"

یہاں رک کر اس نے گلاب کے گال چومے اور نرمی سے مسکرا کر مزید بولا۔ "ثومیہ بھی یہی کہتی ہے کہ وہ ہم جیسا ہے۔ یہ سب ٹھیک۔۔۔ لیکن پھر مجھ سے اسے کیا تکلیف ہے؟ مجھے کیوں گھورتا ہے خواہ مخواہ۔ عجیب تر ہے۔"

وہ اٹھ کر دوبارہ اسی پتھر پر آ بیٹھا۔ اس کے پاس اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"خیر اب ثومیہ سے وعدہ کیا ہے اسے اس کی ذات سے باہر لانے کا تو نبھانا تو پڑے گا۔"

اس نے یہ عزم کیا اور گردن موڑ کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف نگاہ کی۔ وہاں کشادہ کھڑکیوں میں بیٹھے کئی طلباء اسے باہم گفت و شنید میں مصروف نظر آئے۔ اور پھر وقت گزاری کے لیے وہ ایسے ہی مختلف مشاہدے کرنے لگا۔

ادھر یونیورسٹی کے بالکل سامنے بس سے اتر کر وہ دونوں ایک ساتھ مرکزی گیٹ کی جانب چلنے لگے۔ ان

دونوں میں در آیا وقتی سکوت راستے میں کئی طرح کی مثبت سوچوں سے خود کو ذہنی "تقویت" دے دے کر مکمل طور پر بہہ چکا تھا۔ ثومیہ اس کے ملفوف و ملفوظ شکوے کے بعد اس سے بہت خلوص اور نرمی سے پیش آتی رہی۔ اس کے تمام تر رویہ جات پر غور کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے نظر اندازی سے نہیں بلکہ توجہ اور دوستی سے ڈیل کیا جانا چاہیئے۔ کلاسز کے شیڈول کے متعلق ہلکی پھلکی عمومی گفتگو کرتے وہ یونیورسٹی داخل ہوئے اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ ثومیہ نے واضح طور پر محسوس کیا کہ سفیر کو سامنے پا کر سبھی اس کا حسین تر چہرہ اور شاندار شخصیت دیکھنے میں لگے ہیں۔ لڑکیوں کا اس پر مسلسل اور خصوصی دھیان تھا۔ جبکہ سفیر شان بے نیازی سے یوں آگے بڑھ رہا تھا گویا اس ساری "توجہ" سے قطعاً "لاعلم" ہو۔

"ویسے خوب انجوائے کرتے ہوں گے تم یوں سب کا تمہیں "تاڑنا"۔۔۔ ہاں؟؟"

اس کے ہمقدم چلتی ثومیہ نے شرارت سے کہا تو بے ساختہ سب کی طرف دیکھ کر کسی قدر جھینپتا ہوا وہ خوشدلی سے بولا۔

"عادت ہوتی ہے لوگوں کی یار۔ یہ سب کو یونہی دیکھتے ہیں۔ میں سر پر سوار نہیں کر سکتا اس بات کو۔۔۔"

جواباً ثومیہ نے تحیر سے آنکھیں پھیلا کر ابرو اچکاتے ہوئے معنی خیز انداز میں "اچھا۔۔۔" کہا اور چلتے چلتے یکا یک رک گئی۔ اس کے یقین نہ کرنے والے انداز سے لطف اندوز ہوتا، بے طرح ہنس کر وہ مزید بولا۔

"اوہو سچی یار۔ اب تم غور کرو تو پتا چلے گا کہ سب لڑکے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ تو بتاؤ کہ اس بات کو کوئی بھی کتنا انجوائے کر سکتا؟ میں ہوں یا تم ہو؟ بات تو ایک جیسی ہے۔"

ایک لحظے کو رک کر اس کی آنکھوں میں تیرتی بے یقینی دیکھ کر اس نے اعتماد سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے کھینچتا ہوا پھر سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کے انداز پر وہ بڑی شدت سے ہنسی۔ اسے سفیر کا صفائی دینے کا سا انداز بہت اچھا لگا۔

"ارے بابا گھسیٹو تو مت۔ چھوڑو ہاتھ میں چل رہی ہوں۔۔۔"

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے کھینچ کر اپنا ہاتھ چھڑوانا چاہا تو اس نے بھی فوراً اپنی گرفت ہٹالی۔

"سفیر یوں ہی رہا کرو۔ ہنستے مسکراتے۔ ایٹی ٹیوڈ نہیں دکھایا کرو۔ یوں زیادہ اچھے لگتے ہو۔"

کچھ توقف سے اس نے سادہ وامید افزا لہجے میں کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔ انہیں ایک دوسرے کو اس معاملے میں اپنا اپنا مطمع نظر سمجھاتے ہوئے تین روز گذر چکے تھے اور اس موضوع پر اب مزید کوئی بھی بات یا بحث سفیر کو لایعنی لگنے لگی۔

اسی اثناء میں اس نے ڈیپارٹمنٹ کے صحن میں پتھر سے ٹیک لگائے کھڑے مصطفین کو دیکھا اور غیر محسوس انداز میں رک گیا۔ اس کے مبہم "اثبات" کو سمجھنے کی کوشش کرتی ثومیہ اس کے رکنے پر ٹھٹک گئی۔ پھر اس کی نظروں کا تعاقب کر کے اس نے یوں ٹھہرنے کا سبب جانا تو اس کے دلکش ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکان طاری ہوئی۔ ان دونوں کی آمد اور یہاں موجودگی سے یکسر بے خبر مصطفین کا دھیان ڈیپارٹمنٹ کی داخلی راہداری کی طرف رہا تھا وہاں سیڑھیوں پر سٹوڈنٹس میں گھرے کھڑے سر علی عبداللہ مسکراتے ہوئے انہیں کچھ سمجھا رہے تھے

"چلو تمہارے دوست سے ملتے ہیں۔ آج میں پہل کرتا ہوں۔ بھئی تمہاری اس کے متعلق اتنی مثبت رائے کم از کم ایک بار آزمانا تو بنتی ہے۔۔۔"

کچھ توقف سے اس کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے سفیر نے اسے مخاطب کیا تو اس کے صلح جویانہ لہجے میں موجود شوخیوں کی جھلک پا کر وہ خوشدلی سے مسکرائی۔

"اوہ تھینکس گاڈ یار۔۔۔ اونٹ بالآخر کسی کروٹ تو بیٹھا۔۔۔ ویسے یہاں اونٹ تمہیں ہی کہا ہے۔"

اس کے ہمراہ چلتی وہ اسے ستانے کے لیے بولی تو کچھ کہے بنا اس نے بس مکا مارنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہنستے ہوئے مصنوعی ڈر کا مظاہرہ کرتی بھاگ کر مصطفین کے پاس جا رکی۔

"السلام علیکم۔۔۔ کہاں گم ہو اداسیوں کے بادشاہ لڑکے؟ کبھی تو مسکراتے ہوئے بھی دکھا کرو یار۔"

اس کے اچانک آپہنچنے پر وہ چونک گیا اور پھر اس کا شریر لہجہ ومسکراتے لب دیکھ کر ہنس پڑا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیا ہی جناتی اینٹری ماری ہے اے شوخیوں کی ملکہ تم نے۔ بالکل اچانک۔ ہلہ بول قسم کی۔ اور میں کیا پاگل ہوں جو بلا وجہ ہنستا مسکراتا رہوں؟؟"

باری باری ان دونوں کو دیکھتے جواباً اس نے بھی اسے ایک خطاب سے نوازا اور پھر سفیر سے مخاطب ہوا۔

"کیسے ہو پرنس؟ آج تو بڑے ہپی موڈ میں لگ رہے ہو؟ وہ غصہ وصہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔۔۔ اچھی بات

ہے۔"

اس کے شائستہ لہجہ و انداز سے ظاہر تھا کہ اسے دیکھ کر وہ ایک خوشگوار سی حیرت میں مبتلا ہوا ہے۔ اس کی بات پر سفیر مسکرایا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر بولا۔

" ٹھیک ہوں بالکل۔ شکریہ جناب۔ اور میری طرف سے ہوئی ہر غلطی پر سوری کرتا ہوں۔ اب اگر چاہو تو تم بھی معافی مانگ سکتے ہو۔ اس وقت اچھے موڈ میں ہوں مل جائے گی۔"

اس کا بااعتماد لہجہ شوخ رنگ تھا۔ اور اس کے اس خوبصورت انداز پر ایک پل کو رک کر اس نے تحیر بھری نظروں سے ثومیہ کی طرف دیکھا۔ وہ انتہائی مسرت آمیز تاثرات کے ساتھ سفیر کا یہ بدلا بدلا عکس و رنگ دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اس کا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے اپنے بازو وا کیے اور پیار سے بولا۔

" اگر سوری کرنی ہے تو گلے سے لگنا پڑے گا یارم۔ اس قدر غلطیوں کی " معافیاں " اتنی آسانی سے نہیں ملیں گی۔۔۔" اور اس کی بات پر خوش کن تاثرات کے ساتھ وہ تیزی سے بڑھا اور اس کے کھلے بازوؤں میں سما کر اسے خود سے بھینچ لیا۔

" مجھے بھی معاف کر دو یار۔ خواہ مخواہ کی ضد لگی تم سے۔ ورنہ میرا دل صاف ہے تمہاری طرف سے۔۔۔"

اسے بازوؤں سے تھام کر نرمی سے خود سے الگ کر کے مصطفین نے خلوص بھرے لہجے میں کہا اور گرمجوشی کے ساتھ دوبارہ گلے لگا کر پشت سے اس کے شانے تھپتھپائے۔

" کوئی بات نہیں یار۔ میں بھی تو یہی کر رہا تھا۔ اور شاید غلطی بھی میری طرف سے ہے زیادہ۔۔۔"

جواباً وہ اعلیٰ ظرفی کا کمال تر مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غلطی تسلیم کرنے لگا۔

اب تک شوق و دلچسپی سے ان دونوں کی اس غیر متوقع اور بہترین صلح کو دیکھتی ثومیہ نے بھی دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

" اے گائیز۔۔۔ انڈین فلموں میں تو ایسے موقعے پر تینوں دوست گلے ملتے ہیں لیکن چونکہ یہ انڈین فلم نہیں پاکستان کی یونیورسٹی آف سینٹرل پنجاب کا ایک منظر ہے لہٰذا میں شامل نہیں ہونے والی۔ اور چلو اب تم دونوں بھی بس کرو شاباش۔ بڑی لگ گئیں جپھیاں باہم۔ اتنی صلح کافی ہے۔ اب ہمارے کلاس فیلوز بھی متوجہ

ہونے لگے ہیں۔"

اس کے شریر لہجے کے برعکس اس کی آنکھوں میں اپنی "دوستی" کے لیے فخر وانبساط تھا۔ ان دونوں کی صلح سے وہ خوب سرشار ہوئی۔ اس کے ذہن و دل سے جیسے کوئی بوجھ چھٹ گیا۔

اوراس کی بات پر زوردار قہقہہ لگاتے وہ الگ ہوئے تو سفیر جلدی سے بولا۔

"ہاں چلو یار۔ وقت ہو گیا ہے کافی۔ تفصیلی باتیں اب بعد میں ہوں گی۔ دوسرے لیکچر کے فوراً بعد کینٹین چلیں گے۔ اس نئی دوستی کی ٹریٹ میری طرف سے۔ اوکے؟؟"

اس نے باری باری ان دونوں سے تائید چاہی تو چاہتوں کے بے شمار عکوس میں بھیگے لہجے میں وہ یک زبان ہو کر بولے۔

"اوکے یار... ڈن ہو گیا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ..."

اور پھر سارا ماحول ان تینوں کی خوشگوار ہنسیوں سے گونجنے لگا۔

زندگی میں اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی بھی پہلو پر ہمارے احساسات بدلنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ رنجشیں دوستی میں ڈھلنے لگیں تو انوکھے محسوسات سے دوچار کرتی ہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ جن سے ہم بہت چڑتے ہوں ایک وقت میں انہی کا ساتھ ہمیں سرشار بھی کرتا جائے۔

ادھر کب سے راہداری کی ایک کشادہ کھڑکی سے لگ کر، اس منظر کی ساری جزئیات کو عین عین سمجھتی مریم کو لگا کہ وہ ایک نئی طرز کی "داستانِ آب وجِ عشق" پر گواہ ہو رہی ہے اور اسے اس منفرد کہانی میں ہوئے ہر "مشاہدہ" کو بہت سنبھال کر رکھنا ہوگا۔

معاشرے میں نئے تعلقات استوار کرنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کو اپنی تمام توانائیں ایک جانب رکھنا آتی ہوں۔ کسی کے قریب ہونا ہو تو لہجے نرم کرنا ضروری ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنا کرنا ہو تو اس کا ہونا پڑتا ہے۔ کسی کو اپنا بنانا ہو تو اس کا بننا بھی پڑتا ہے۔ یہ ایک ہاتھ دو اور دوسرے سے لو جیسا اصول ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی ایک مسکراہٹ وہ کام کر سکتی ہے جو ساری رعونت بھی نہیں کر سکتی لیکن انسان کو اس بات کا ادراک نہیں ہوتا۔ با کمال ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنے تعلقات بنانے کے لیے اپنی ضدیں ہار جانے کا ہنر رکھتے ہوں۔ قابلِ رشک ہوتی ہیں وہ شخصیات جن میں اپنی اغلاط کے اعتراف واصلاح کا ظرف ہوتا ہے۔

ان دونوں نے بھی کمال ظرف سے باہم در آئی غیر محسوس قسم کی انا کو تھپک کر ایک دوسرے کی طرف دوستی کو ہاتھ بڑھایا تھا۔

پہلے لیکچر کے لیے وہ تینوں ہنستے مسکراتے کلاس میں داخل ہوئے تو پہلے سے موجود طلباء نے ان کی کھلکھلاتی ہنسیوں کا واضح طور پر نوٹس لیا۔

مصطفین سے مسکراتے ہوئے بات کرتی ثومیہ کی نظریں جب سفیر کی طرف اٹھیں تو ان میں دوستی کے کئی رنگ نمایاں ہوئے۔ آج اسے سفیر پر بہت فخر ہوا تھا کہ وہ اس کی اس قدر مانتا ہے۔ اس نے اس کا کہا مانتے ہوئے دھیرج رہ کر گویا اس کے ان تمام تر دعوؤں کی لاج رکھ لی جو وہ اس کے متعلق مصطفین سے کرتی رہی تھی۔

الگ الگ بیٹھنے کی بجائے آج کلاس میں وہ ساتھ ساتھ بیٹھے۔ پہلا لیکچر سر علی عبداللہ کا ہی تھا آج بھی اور ابھی لیکچر شروع ہونے تھوڑا وقت باقی تھا۔ اردگرد مختلف طلباء کی چھوٹی موٹی سرگرمیاں وعوامل دیکھتے وہ تینوں بھی بیگز اپنی اپنی اطراف میں رکھ کر، کتابیں اور رجسٹر سامنے کھولے سر کی آمد کے منتظر ہو گئے۔

"سفیر یار ایک بات تو بتاؤ۔۔۔"

کچھ توقف سے مصطفین نے با اعتماد لہجے میں اسے مخاطب کیا تو اس کے ساتھ ساتھ ثومیہ نے بھی چونک کر، سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یار یہ اتنے لوگ تم پر توجہ دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہیں۔۔۔ ظالما کبھی تو بھی ہنس بھی دیا کر کسی کو دیکھ

کر۔ ہروقت تیوریاں کیوں چڑھی رہتی ہیں تمہاری؟ دوبارہ غصہ نہ کرنا بات کا اب۔ پیار سے پوچھا ہے۔ سچی۔۔۔"

اردگرد نظر دوڑا کر وہ رازدارانہ لہجے میں بولا تو اس کے انداز پر ثومیہ کی ہنسی چھوٹ گئی جبکہ وہ بھی بے ساختہ مسکرایا۔ پھر اس نے گردن پھیر کر اپنے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا اور خوشدلی سے بولا۔

" کہاں ہے یار کوئی بھی جو میری طرف متوجہ ہو؟ سب مصروف تو ہیں آپس میں۔ ویسے بھی کسی کے کن انکھیوں سے دیکھنے کا میں کیا جواب دوں؟ لطف تو یہ ہے کہ کوئی مجھے ایسے دیکھے جیسے میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے دیکھے۔ یوں چھپن چھپائی کا کیا مزہ ہے یار؟"

اس کا شریر لہجہ عجب سنجیدگیوں کا حامل لگا اور اس کی حسین تر آنکھوں میں خود پر یقین کی بے پناہ چمک ظاہر ہوئی۔ اس کی بات سن کر ثومیہ نے ایک قہقہہ لگایا تو اس کی گود میں دھرا رجسٹر پیروں میں جا گرا۔ وہ فوراً جھکی اور رجسٹر اٹھاتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"بس کرو مصطفین۔۔۔ کیا پوچھ لیا ہے؟ یہ ویسے بھی سفیر کا پسندیدہ موضوع ہے۔ بے چارے کو بے نیازی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔"

اس نے گویا سفیر کو چھیڑا اور اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی رہی۔ وہ واقعی "چھڑ" گیا اور اسے گھورتے ہوئے دوبدو لہجے میں بولا۔

"واٹ آ جوک کہ یہ میرا فیورٹ ٹاپک ہے۔ جب کہ مجھے پرواہ بھی نہیں ہوتی اس کے متعلق۔ اور تمہیں تو بس موقع مل گیا ہے جیسے اس کی بات سے مجھے بات لگانے کا۔۔۔"

اسے اتنا کہہ کر وہ رکا اور مصطفین کی طرف دیکھ کر مزید بولا۔

"اس کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لینا یار۔ یہ اپنی طرز کی واحد ہے۔ شوق ہے اسے تجزیہ کار بننے کا۔ اول روز سے یہی کرتی آئی میرے ساتھ۔۔۔"

بات کے اختتام پر وہ ہولے سے مسکرایا اور دوبارہ پوری کلاس میں نگاہ گھمائی۔ سارے طلبا نوٹس اور کتابوں کے باہمی تبادل سے لے کر خوش گپیوں تک کی مختلف سرگرمیوں میں مصروفِ عمل تھے۔ اس کی بات پر

ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کی اور مصطفین دوبارہ بولا۔

"او کے یار۔۔۔ میں اس کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا کہہ رہے تھے؟ کیا چاہتے ہو تم کہ کوئی تمہیں کیسے دیکھے؟"

ثومیہ کی بات کو رد کرتا اس کا متوازن لہجہ انتہائی دوستانہ تھا۔ ثومیہ نے ایک بار پھر مسرت آمیز تاثرات کے ساتھ ان دونوں کو باہم ہنستے ہوئے سوال جواب کرتے اور ایک دوسرے کو جاننے کی کاوشیں کرتے دیکھا۔

اس کے سوال پر سفیر نے ایک پل کے لیے کچھ سوچنے کے انداز میں آنکھیں اٹھائیں تو ان کے دلکش کنارے، طرح طرح کے فسوں باندھنے لگے۔ پھر خم دار ہونٹوں کو باہم بھینچ کر اس نے ادائے قاتلانہ سے ان دونوں کو باری باری دیکھا اور دبیز ابروؤں کی سحر گر تانیں اچک کر شریر لہجے میں پوچھنے لگا۔

"بتادوں۔۔۔؟"

اس کا خوبصورت انداز پڑھ کر ہنستے ہوئے وہ دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

"ہاں یار ہاں۔۔۔ تجسس کیوں پھیلا رہے ہو؟ بتا بھی چکو۔"

اور ان دونوں کی مسکراہٹوں کو عمیق تر نظروں کے حصار میں رکھتے ہوئے اس نے دھیرے دھیرے، پراسرار لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"جیسے سب لوگ مجھے دیکھتے ہیں یوں دیکھنا بھی کوئی "دیکھنا" ہے بھلا؟ جیسے کوئی چوری کر رہا ہو۔۔۔ یا کوئی پردے کی بات ہو۔ میں چاہتا ہوں کوئی مجھے دیکھے تو یوں کہ مجھے پتا بھی چلے کہ کسی نے مجھے دیکھا ہے۔ نظر بھر کر، پورے دل سے، سارے کا سارا اور واشگاف۔۔۔ کوئی یوں دیکھے کہ اس کے دیکھنے پر میں چونک جاؤں۔ اس کی نگاہ اس قدر عمیق ہو کہ میرا اندر کھنگال لے، مجھ پر اثر کرے، مجھے باندھ لے۔۔۔ میری ذات شخصیت کا ہر راز پا لینے والی نگاہ ہو۔ یا میرا اندرون کھوجنے والی۔۔۔ جس طرح سے یہ سب لوگ مجھے دیکھتے ہیں نا یار---اس سے میری خواہشیں ادھوری رہتی ہیں۔ اس میں کچھ خاص یا انوکھا نہیں ہے۔ تو جس نظر میں کوئی انفرادیت نہ ہو وہ "عام" ہوتی ہے۔ اور عمومیت مجھے متاثر نہیں کرتی۔"

اس نے بات مکمل کی اور ان دونوں کے ہونٹوں سے بتدریج سمٹتی مسکان جانچنے لگا۔ ایک لحظے کو وہ

دونوں ساکت ہوئے، ایک دوسرے کو یوں دیکھا گویا پوچھ رہے ہوں کہ اب کون بولے گا؟ اور پھر ثومیہ نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ مصطفین نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر سفیر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"بڑی دلچسپ خواہشیں ہیں تیری۔ جان کر اچھی لگیں۔ لیکن صرف ایک بات یار م۔۔۔ کہ نظر واشگاف ہونے لگے تو دیکھنے میں پاکیزگی نہیں رہتی۔ یہ جو پردے کی ڈھکی چھپی نگاہ ہوتی ہے نا۔۔۔ سارا لطف اسی کا ہے۔ یہ بڑا مسرور کرتی ہے۔ کہ دیکھنے کا حقیقی مزہ تو بس نینوں کی ان "چوریوں" میں ہی ہے...... باقی سب بے معنی ہے۔ اور ہاں---اندر چھان لانے کے لیے نظر بھر کر دیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ انسان کے اخلاق وظرف سے اس کا اندرون ہی جھلکتا ہے۔ نظر کا حسن تو بس جھکنے میں ہی ہے۔ خواہشوں کے بندھن کو تم آنکھوں سے مت باندھو یار۔ ورنہ ایک وقت آتا ہے کہ خواہشیں تھک بھی جائیں تو آنکھیں بجھ نہیں سکتیں۔ یہ پھر جلتی، جلتی، جلتی اور۔۔۔ صرف جلتی رہتی ہیں۔"

اس کا یاسیت زدہ لہجہ، عجب عمیقیت کا حامل ہو گیا کہ گویا اس میں کئی طرح کے راز مخفی ہوں۔ اس کی بات پر سفیر نے یہ بات جان لی کہ واقعی اس کے نظریات بڑے منفرد سے ہیں۔ اپنی رائے سے مختلف ہونے کے باوجود اسے اس کی فکر و سوچ بہت پسند آئی۔

دونوں کو بغور سنتی ثومیہ اب اس کے جواب کی منتظر تھی کہ وہ اسے کیا کہتا ہے؟ اس کے لیے بات اب بڑے دلچسپ موڑ پر آن رکی۔ سفیر نے ایک پل کے لیے ٹھہر کر ان دونوں کے تاثرات دیکھے اور پھر کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت دیکھتے ہوئے بولا۔

"وقت بہت کم ہے اور بات بڑی طویل۔ مجھے لگتا ہے ہمیں اس موضوع کو پھر کسی وقت پر اٹھا رکھنا چاہیئے۔ فی الحال بس یہ کہنا چاہوں گا کہ تمہارے افکار و نظریات سے مجھے انکار نہیں ہے۔ بلکہ مجھے بہت اچھا لگا ہے تمہارا نکتہ نظر۔ یقیناً یہ سب بڑے حسین پہلو ہیں لیکن میرے کہنے کا وہ مطلب تھا ہی نہیں جو تم نے لیا ہے۔ گفتگو خواہشوں یا آنکھوں کے باہمی تال میل سے ہٹ کر بس لوگوں کے "عمومی" دیکھنے پر ہے۔ میرے نظریات بہت سادہ ہیں۔ جن کی وضاحت وہ نہیں ہے ہرگز بھی جو تم نے کی ابھی۔ میرے افکار اس سے ہٹ کر ہیں

کچھ۔" بااعتماد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور بات مکمل کر کے نرمی سے مسکرایا۔ اس کی بات میں اپنی رائے کا احترام دیکھ کر مصطفین بھی مسکرا دیا۔ اسے لگا وہ ٹھیک کہتا ہے کہ اس موضوع کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھنا چاہیئے۔ ایک ثانیے کو کچھ سوچ کر اس نے ایک طویل ہنکارا بھرا اور شوخ لہجے میں بولا۔

" بھئی آج سے پہلے تو اسے جانا ہی نہیں تھا۔ میں اسے بڑا اکڑو اور مغرور سمجھتا رہا۔۔۔ لیکن اب اس سے گفتگو کے بعد اس کی سوچیں جان کر صاف لگا ہے کہ بہت مزہ آنے والا ہے آگے۔۔۔"

ثومیہ کو مخاطب کر کے اس نے اتنا کہا اور پھر اس کے چہرے پر جاگ اٹھے دھنک رنگوں سے نگاہ چراتا سفیر کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور یار م باتیں تو بڑی لیول کی اور حساس قسم کی کرتا ہے۔ تھوڑی سی۔۔۔ بس تھوڑی سی لچک اپنے رویے اور تاثرات میں بھی پیدا کر تو شاید تجھ جیسا کوئی بھی نہیں۔ کیا سمجھا؟"

دوستانہ لہجے میں خلوص سے کہتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دبایا اور بات کے آخر پر سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔ بغور اس کا ہر انداز پڑھتا سفیر کھل کر ہنسنے لگا اور پھر اسی خلوص سے بولا۔

" چلو تم دونوں جیسا کہو گے ویسا رویہ اپنانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے تو اپنا ہر رویہ ابھی بھی ٹھیک لگتا ہے لیکن اب تم دونوں کو دوست بنایا ہے تو حق رکھتے ہو تم لوگ کہ کہیں غلط ہوں اگر میں تو میری اصلاح کر دو۔"

یہاں ایک پل کو وہ رکا اور ان دونوں کے خوشی سے دمکتے چہرے دیکھتا، اردگرد ساتھی طلباء پر ایک طائرانہ سی نگاہ دوڑا کر مزید بولا۔

" ویسے مجھ جیسا تو یہاں ابھی بھی کوئی نہیں۔۔۔ کیا خیال ہے؟؟"

اس کے حسین لبوں پر مسکراہٹ کی جگہ شرارت رینگنے لگی اور آنکھوں کی دلآویز چمک بڑھ گئی۔ اس کی پہلی بات پر ایک دوسرے کو شاباشی نگاہوں سے دیکھتے وہ دونوں اس کی دوسری بات پر چونک کر ایک جھٹکے سے اس کی طرف مڑے اور پھر دونوں نے ہی اظہارِ بے بسی کے طور پر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

" افففف۔۔۔ اب تم مار کھاؤ گے سفیر۔ قسم سے بتا رہی ہوں پہلے۔ پاگل کر دیتے ہو گول گول گھوم کر

بات پھر وہیں۔۔۔ افففف۔"

سر اٹھا کر ثومیہ نے اس کا گلا دبانے اور مکا مارنے کا ہوائی اشارہ کیا تو اسے اس قدر چڑتے دیکھ کر سفیر کے ساتھ ساتھ مصطفین کا بھی قہقہہ بلند ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ فی الوقت سفیر بس اسے ستا رہا ہے۔

پوری کلاس نے پلٹ پلٹ کر بصد شوق ان کی خوشگوار ہنسیاں دیکھیں اور پھر انہیں بے طرح ہنستے دیکھ کر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے کندھے اچکاتے ہوئے باہم "مصروف" ہو گئے۔

جبکہ تب سے کچھ دور بیٹھ کر ان کی ہر ایک سرگرمی کو بغور دیکھتی مریم کے چہرے پر یکا یک گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اس کی عمیق تر نظروں میں کئی خدشات کے عکوس رقصاں ہوئے۔ اس منظر کی کل کی کل جزئیات کو اس نے نا صرف "جانچا"۔۔۔ بلکہ "پرکھا" بھی خوب تھا۔

☆......☆......☆

اسی طرح باہم ہلکی پھلکی نوک جھونک کرتے ہوئے انہوں نے لگا تار دو لیکچرز اٹینڈ کیے اور اس دوران خوب گھل مل گئے۔ وہ یوں ہنسی مذاق کر رہے تھے کہ انہیں دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ ان کی دوستی کا آج پہلا دن ہے۔ یا دوستی سے پہلے ان میں کچھ تناؤ بھی رہا ہے۔ ایک بار انہوں نے اپنی اپنی رٹ سے ہٹ کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی تو وہ ایک دوسرے کو اچھے لگنے لگے تھے۔ ثومیہ کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ انہیں باہم ہنستے مسکراتے باتیں کرتے دیکھتی وہ مسلسل سرشار ہوتی رہی۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی ضدیں زائل کر دی جائیں تو تعلقات بنانے آسان ہو جاتے ہیں۔

دوسرا لیکچر تمام ہوا تو سارے طلباء ٹولیوں کی صورت میں کلاس سے باہر جانے لگے۔ وہ تینوں بھی اٹھ کر کلاس سے باہر نکلے اور راہداری میں تھوڑا چل کر چوتھی کھڑکی پر جا کھڑے ہوئے۔ تیسری کلاس اب ایک گھنٹے بعد تھی۔

"شکر ہے آج موسم ٹھیک ہے۔ دو دن مسلسل بارش برسی ہے اور ہمارے اندرون لاہور کی گلیاں۔۔۔ افففف۔۔۔ پوچھو مت یار کہ کیچڑ کا کیا عالم ہوتا ہے بارشوں میں وہاں۔"

کھڑکی کی سل پر دایاں ہاتھ ٹکا کر مصطفین نے باہر احاطے میں لگے درختوں اور سبزے کو دیکھا اور پھر

آسمان پر ٹکڑیوں کی مانند تیرتے بادلوں کا حال جانچ کر تبصرہ کیا۔ اس کی بات پر وہ دونوں خوشدلی سے مسکرائے۔

"ڈونٹ وری ہم بالکل نہیں پوچھتے تم سے کہ تمہاری گلیوں کا حال کیسا ہے؟ مجھے بس یہ پتا کہ اندرون لاہور ڈراموں، فلموں میں تو بہت خوبصورت دکھاتے ہیں۔ حقیقت میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

سفیر نے خوشدلی سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اسے چھیڑا اور پھر ثومیہ سے سوال کیا۔

"تم نے دیکھا ہے کیا کبھی؟"

مصطفین بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں کبھی نہیں۔۔۔"

اس نے دوٹوک انداز میں انکار کیا اور پھر فوراً مزید بولی۔

"بلکہ ہاں۔۔۔ میں گئی ہوں ایک بار۔ دراصل جب میں کالج میں پڑھتی تھی تو میری دوستیں ایک بار مجھے زبردستی لے گئی تھیں۔ وہاں "مائی عیدن کے امام بارگاہ" کے عقب میں ایک فوڈ سٹریٹ ہے چھوٹی سی۔ ہم وہاں کھانا کھانے گئی تھیں۔ بہت مزہ آیا۔ گو کہ ہم نے زیادہ گھوما پھرا نہیں تب لیکن مجھے تو وہ ایریا بہت خوبصورت لگا۔"

بات مکمل کر کے وہ پلٹی اور اپنا بیگ ایک نزدیکی نشست پر رکھ دیا۔ مصطفین نے اس کے بیگ رکھ کر مڑنے کا انتظار کیا اور پھر مسرت آمیز لہجے میں بولا۔

"واؤ۔۔۔ دیٹس گریٹ۔ تو یعنی تم نے وہ فوڈ سٹریٹ دیکھ رکھی ہے۔ وہ واقعی بہت خوبصورت ایریا ہے۔ کھلا کھلا۔ فٹ پاتھس اور روڈز پر ٹف ٹائلز لگی ہیں ایک سی۔ روڈ کی دونوں جوانب برقی مشعلیں سجائی گئی ہیں اور دیگر بہت سی روشنیاں بھی۔ وہاں رات کا منظر دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک وہی جگہ ہے جہاں بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کے "وسطی مشترکہ احاطہ" کا دوسرا گیٹ کھلتا ہے اندرون لاہور کی جانب۔ یہاں کئی چھوٹے چھوٹے ریستوران ہیں جن کے باہر، کشادہ وصاف ستھرے فٹ پاتھس پر، سجی سجائی میزیں اور کرسیاں سرِ شام ہی گاہکوں کی منتظر ہوتی ہیں۔ دیٹس ون آف مائی فیورٹ پلیس ان لاہور۔۔۔ بہت اچھا لگا جان کر کہ

تم نے دیکھ رکھی ہے وہ جگہ۔"

اس نے تفصیلی انداز میں اس جگہ کا کچھ یوں نقشہ کھینچا کہ وہ دونوں از حد متاثر ہوئے۔

"بالکل ایسی ہی دلکش ہے وہ جگہ۔ مجھے بھی اتنی ہی پسند آئی تھی۔ واقعی لاجواب۔"

ثومیہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا تو ان دونوں کو بغور سنتا سفیر جلدی سے بولا۔

"بھئی واہ۔۔۔ کیا کہنے۔ بہت عمدہ منظر کشی کی ہے تم نے اس جگہ کی۔ یوں کہ دیکھنے کا اشتیاق ہو رہا ہے اور ساتھ افسوس بھی کہ اتنا قریب رہ کر بھی میں نے اب تک وہ خوبصورت جگہ دیکھی کیوں نہیں؟۔۔۔ تو کیا خیال ہے گائیز۔۔۔ ہو جائے آج دوستی کی ٹریٹ وہیں؟ اسی جگہ؟؟ میری طرف سے۔۔۔"

اس کے خوشگوار لہجے پر وہ دونوں کھلکھلائے۔

"لو جی۔۔۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔ سمجھو ڈن ہو گیا۔ یونیورسٹی کے بعد سیدھے وہیں چلتے ہیں۔ وہ مارکیٹ دن میں بھی کھلی ہوتی ہے۔ ہر وقت رش ہوتا وہاں۔ کیوں ثومیہ کیا کہتی ہو؟"

مصطفین نے فوراً سے پیشتر پروگرام ترتیب دیا اور پھر اس کی رائے چاہی۔

ان دونوں کے یکدم یہ پلان ترتیب دے لینے پر اس کے مسکراتے لب بتدریج سمٹ گئے۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں اپنے سخت گیر باپ شاہجہان عادل کا غصہ ور چہرہ گھوما اور پھر کچھ کہے بنا پلٹ کر وہ اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

"چلو کینٹین چلتے ہیں۔ وہیں اس سے پارٹی شارٹی یا ٹریٹ وریٹ لیتے ہیں۔ میں فوڈ سٹریٹ تک نہیں جا سکوں گی تم دونوں کے ساتھ۔"

بیگ کاندے پر ڈالتے ہوئے اس نے عام لہجے میں کہا تو وہ دونوں حیرانی سے اس کا بدلا بدلا انداز دیکھنے لگے۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر تھوڑا گھومی اور انہیں بے یقین و پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے دیکھ کر وضاحتی لہجے میں بولی۔

"افوہ چلو یار۔ یوں گھور مت ایک دوسرے کو۔ اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ بھئی میں گھر سے پوچھ کر نہیں آئی۔ اب دیر ہوئی تو صاف ظاہر ہے کہ وہ پریشان ہوں گے۔ لہٰذا کینٹین والا خیال سب سے

بہتر ہے۔ اب چلو۔۔۔"
اس نے بمشکل خود کو اصل بات کہنے سے روک کر بہانہ بنایا اور ان کے کچھ بھی مزید کہنے سے پیشتر آگے بڑھنے لگی۔ اس کے انداز سے مصطفین فوراً سمجھ گیا کہ اس کے گریز کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ہے جو اس کی اس "وضاحت" سے ہٹ کر ہے اور وہ ان کو بتانا نہیں چاہتی جبکہ سفیر کے خاک بھی پلے نہ پڑا۔
"لو جی۔ یہ کیا بات ہوئی کہ پروگرام ہی بدل دیا جبکہ اس کی بات کے تو کئی حل ہو سکتے ہیں یار۔۔۔ ایک منٹ میں بات کرتا ہوں۔"
ایک پل کو رک کر اس نے حیرت سے کہا اور پھر تیزی سے بھاگ کر اس کے پیچھے گیا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مصطفین بھی سر جھٹک کر اس کے پیچھے ہو لیا۔
"یار تم کال کر کے بتا دو نا گھر ان کو۔ یوں اب بنا بنایا پلان مت بگاڑو پلیز۔ ایک تو تم لڑکیوں کو اپنی اہمیت جتانے کا بڑا شوق ہوتا ہر جگہ۔ دوستی برابری کی بنیاد پر ہوتی ہے اس میں کوئی لڑکا لڑکی نہیں ہوتا۔ چلو کرو شاباش ایک کال گھر کہ تم آج لیٹ آؤ گی۔ پلیز۔۔۔"
یکا یک وہ رکی اور سنجیدگی سے ایک نظر اسے بچوں کی طرح بضد ہوتے دیکھا، پھر ایک بے بس سی نگاہ مصطفین پر ڈال کر کچھ کہتے کہتے وہ رکی اور دوبارہ آگے بڑھنے لگی۔
"کیا مسئلہ ہے یار۔ کرو نا کال پلیز۔ چلو نا سب ساتھ چلتے ہیں۔ مزہ آئے گا۔"
اسی طرح اس ہے ہمراہ چلتا وہ پھر سے اس کے سر ہوا تو ان سے دو قدم پیچھے چلتا مصطفین تیزی سے ان کے قریب گیا۔
"سفیر یار آج کا پلان کینسل کرنا ہی بہتر ہے۔ پھر کبھی کا رکھ لیتے ہیں۔ دراصل مجھے یاد آیا کہ آج مجھے بھی کہیں کسی ذاتی کام سے جانا ہے۔ میں بھی وقت نہیں دے سکوں گا۔ یوں کرتے ہیں کہ آج کینٹین میں تم ٹریٹ دو۔ پھر کسی روز جب سب راضی اور فارغ ہوئے ہم وہاں چلیں گے اور وہ ٹریٹ میری طرف سے ہو گی۔ او کے؟؟۔۔۔"
اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے ہمراہ چلتے ہوئے اس نے نرم و عام لہجے میں ایک من گھڑت عذر

پیش کیا۔ ثومیہ کا گریز جانچ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وجہ جو بھی ہو لیکن وہ ان کے ساتھ جانے پر یقیناً راضی نہیں ہے۔

اس کی بات سن کر سفیر کا منہ بن گیا اور اس نے شانے جھٹک کر بس یہ کہا۔

"اوکے یار۔۔۔ میں اسے منا رہا تھا اور یہاں تمہیں بھی کوئی کام یاد آ گیا۔ عجیب بات ہوئی۔ خیر۔۔۔ جیسا تم دونوں مناسب سمجھو یا جیسے تم لوگوں کو آسانی ہو، تبھی کا پلان رکھیں گے۔ لیکن جانا ضرور ہے۔ ٹالنا نہیں ہے۔"

اس کا لہجہ کسی قدر شکوہ کناں ہوا اور پھر ان دونوں کے کچھ بھی بولنے سے پیشتر وہ ٹھٹک کر رک گیا اور اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر اپنا بیگ اسے پکڑاتے ہوئے بولا۔

"یہ بیگ پکڑو میرا۔ میں اپنا رجسٹر کلاس ڈائس پر بھول آیا ہوں وہ لے آؤں۔ تم دونوں کینٹین تک پہنچو۔ میں بھی آتا ہوں۔"

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بیگ پکڑا تو وہ تیزی سے واپس مڑ گیا۔ مصطفین کے عذر تراشنے پر کب سے تولتی نگاہوں سے بغور اسے دیکھتی ثومیہ نے دور جاتے سفیر کی چوڑی پشت کو دیکھا اور پھر خفیف سا مسکرا کر قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"شکریہ مصطفین۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں آج کوئی ذاتی کام نہیں ہے۔ تم نے صرف میری وجہ سے انکار کیا ہے۔"

اس کے حقیقت جان لینے پر وہ بس مسکرا کر رہ گیا جبکہ اس کی معنی خیز چپ میں لپٹا اثبات پڑھ کر وہ متشکر نظروں سے اس کی خوش رنگ مسکراہٹ دیکھنے لگی۔ اسی وقت راہداری کی داخلی سیڑھیاں اتر کر وہ صحن کے وسیع احاطے میں داخل ہو گئے۔

حساس دوستوں کی سب سے اچھی بات یہی ہوتی ہے کہ وہ بنا کہے سب کچھ جان جاتے ہیں۔

ثومیہ کو اس کا بنا بتائے اپنا گریز سمجھ جانا بہت پسند آیا۔ اسے حساس و ان کہی باتوں کو از خود جان لینے والے اس شخص کی ہر ایک عادت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی مزاج کے حامل، کسی تخیلاتی فرد کا دھندلا عکس، جانے کب سے اس کے لاشعور کی ہر ایک گہر میں بہتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "خیالوں" میں رہنے والے لوگ چپکے چپکے

ہمارے "خوابوں" میں بھی آن بستے ہیں لیکن ہمیں اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ جن کی "عادت" ہونے لگے، ہمیں ان سے ہی۔۔۔ "محبت" بھی ہونے لگتی ہے۔ یونہی اور اسی طرح غیر محسوس انداز میں وہ بھی، سفیر کی دوستی سے بالا ہی بالا، مصطفین کے زیادہ قریب ہو رہی تھی۔

"اچھا لڑکا ہے سفیر۔ تم ٹھیک کہتی تھیں کہ وہ ہمارے جیسا ہے۔ بس اس کا کوئی ایک آدھ پرزہ اندر سے کہیں ڈھیلا ہے جو وقت بے وقت اٹک جاتا ہے کہیں بھی۔ باقی سب ٹھیک ہے۔ اور رکو اس کا انتظار کر لیں۔ اکٹھے چلتے ہیں۔"

وہ صحن کے وسط میں سفید گلاب کی انہی کیاریوں کے پاس پہنچے تھے کہ اس نے رک کر سفیر کے متعلق رائے دی جسے جان کر وہ خوشگواریت سے مسکرائی۔

"ہاں ناں۔۔۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ میں پہلے دن سے سمجھ گئی تھی کہ یہ بس باہر سے مغرور لگتا ہے۔ بات چیت اول روز سے ٹھیک کر رہا ہے۔ بس کبھی کبھی کسی غلط بات پر خود سے بھی ضد لگا لیتا ہے اور باقی سب سے بھی۔ تھوڑا سا کھسکا ہوا ہے۔ شاید زیادہ توجہ پانے کا عادی ہو کر ایسا ہو گیا ہے۔"

اس نے دوستانہ استحقاق سے بھرپور لہجے میں اس کا تجزیہ کیا اور پھر اسے زیرِ لب مسکراتے دیکھ کر مزید بولی۔

"مجھے بہت اچھا لگا آج جب تم نے اسے گلے لگانے کے لیے بازو کھولے۔ وہ بھی بہت خوش ہوا ہے اس بات سے میں جانتی ہوں۔ اس کا رویہ کتنا بدلا بدلا ہے آج۔ تب سے اب تک مسلسل چہک رہا ہے وہ۔ آج سے پہلے اسے اتنے خوشگوار موڈ میں کبھی نہیں دیکھا میں نے۔ پوری کلاس حیران ہوئی ہے اس کے بار بار ہنسنے سے۔ وہ یوں نہیں کرتا پہلے۔ یہ سب صرف تمہاری وجہ سے ہے۔ تھینک یو مصطفین۔ یو آر رئیلی نائس پرسن۔"

مسرت آمیز لہجے میں اس کی ذات میں در آئی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کو گنتی وہ بہت خوش دکھائی دی۔ مصطفین نے حیرانی سے اس کا یہ پیار بھرا روپ دیکھا اور ایک طویل ہنکارا بھر کر بولا۔

"ہمم۔۔۔ یقیناً وہ اچھا لڑکا ہے۔ اور اس کے لیے بازو یہی سوچ کر پھیلائے کہ کوئی "ٹھیک" شخص کسی "غلط" بات پر ضد لگا بیٹھے تو "بات" کو بھول کر یا نظر انداز کر کے اس "شخص" کو گلے لگا لینا چاہیئے۔ یوں

زندگی۔۔۔ دونوں طرف آسان ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس کی اچھائی ہی ہے کہ وہ مجھے واقعی اچھا لگا ہے۔ باہر سے جیسا بھی مغرور لگے اندر سے عام شخص ہے۔ کم از کم فی الوقت وہ مجھے مغرور نہیں لگا۔ ہاں وہ ضدی ضرور ہے۔ اور اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے ہم مل کر۔ ان شاءاللہ۔۔۔"

عام لفظوں میں گہری بات کرتے ہوئے اس نے نرمی سے مسکرا کر سفیر کی ذات کا وقتی تجزیہ بھی پیش کیا۔

اس کی بات سے ازحد متاثر ہوتی وہ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولی۔

"ان شآءاللہ۔۔۔ اور بہت شکریہ کہ تم نے میرے کہنے پر اسے دوست بنایا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔۔۔"

اتنا کہہ کر کھلے کھلے چہرے سے چھیڑ خانی کرتی ایک شریر لٹ کو ہٹاتی وہ جھکی اور تازہ سفید گلاب کی خوشبو سونگھتے ہوئے ایک لمبا سانس بھرا۔ اس کے مسرور لہجے سے مصطفین کے گرد چاہتوں کا نادیدہ حصار بندھنے لگا۔ اس پل خوشبوؤں کی محبت میں مبتلاء ہوتی یہ کامنی سی لڑکی اسے بڑی منفرد لگی۔

بے شک اس کا وجود سراپا محبت تھا۔

"شکریہ کی ضرورت اس لیے نہیں کہ وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے دوست بنایا جائے۔ کچھ غلط فہمیاں تھیں جو دور ہوئیں تو سب واضح ہو گیا ہے۔ خیر چھوڑو یہ موضوع اب۔"

کچھ توقف سے اس کی مصروفیت سے نگاہ چراتا وہ عام لہجے میں بولا اور پھر اس کے سیدھے ہو کر کچھ بھی بولنے سے پیشتر ڈیپارٹمنٹ کی جانب نگاہ کر کے بولا۔

"لو جی آ گیا ہے وہ ہمارا پرنس چارمنگ۔۔۔ اور چال دیکھو ذرا اس کی گویا ایک دنیا فتح کر کے آیا ہے۔ نواب کہیں کا۔"

اس نے ہنستے ہوئے اس کی آمد کی اطلاع دی تو وہ خاموشی سے اسے ہاتھ میں رجسٹر تھامے اپنی جانب آتے دیکھنے لگی۔

اس کی باوقار چال دیکھ کر اسے مصطفین کی بات بالکل ٹھیک لگی۔ واقعی وہ یونہی چلتا تھا گویا ایک عالم کا فاتح وہی ہو۔

ایک خاص ردھم سے اٹھتے اس کے بھاری قدموں کی ہر ہر آہٹ سے پورے منظر و ماحول پر فقط اسی کا رعب طاری ہوا۔

اس کے حسین و دلکش سراپے اور خوبصورت جسامت کی دلآویز ڈھال اس کے چلنے سے نمایاں ہو ہو کر چھپ رہی تھی۔

ایک بار وہ گویا پورے منظر پر چھا گیا۔

"یہاں کھڑے ہو؟ کینٹین نہیں گئے اب تک؟ لاؤ بیگ دو میرا۔ شکریہ یار۔"

ان کے قریب رک کر اس نے بیگ لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوال کیا تو مصطفین نے بیگ اسے تھماتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

"بس یونہی رک گئے۔ تمہارا انتظار کیا کہ رجسٹر لے آؤ تو ایک ساتھ چلتے ہیں۔"

اس کی بات پر رجسٹر بیگ میں منتقل کر کے اس کی زپ بند کرتا وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں شکر ہے کہ مل گیا رجسٹر۔ کوئی اٹھا لیتا تو میرا کام بڑھ جانا تھا۔ دوبارہ نوٹ کرنا پڑتا سب۔ خیر چلو۔"

پھر کینٹین کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اس نے ثومیہ کی طرف دیکھا۔

"تم بڑی چپ ہو۔ خیر ہے نا؟؟ کیا باتیں ہو رہی تھیں بھئی؟ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ میرے ہی گلے ہو رہے تھے تم دونوں کے درمیان۔ سچ سچ بتانا۔"

شریر لہجے میں کہتے ہوئے اس نے آخر پر مصطفین کی طرف شکی نظروں سے دیکھا تو اس کے محتاط انداز پر وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"ہاہاہا۔۔۔ ویری فنی سفیر۔ اتنے بھی ضروری نہیں ہو تم کہ ہر وقت تمہارا ہی ذکر کیا جائے۔ باتیں اور بھی بہت سی ہیں۔ ویسے فی الوقت ہم یہی ڈسکس کر رہے تھے کہ اس ٹریٹ میں تمہارا زیادہ سے زیادہ خرچہ کیسے کروایا جائے گا؟ یعنی سمجھو کہ "موضوعِ گفتگو" تم ہی رہے ہو۔"

ہنسی روک کر وہ برجستگی سے بولی تو فضا میں ان سب کا ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

آس پاس سرسراتی سرد ہوائیں ان کی ہنسی سمیٹ کر پورے جذبوں کی امین ہوگئیں۔ اس منظر کو اب صدیوں تلک ان ہنسیوں کی بازگشت سننا تھی۔

☆......☆......☆

حسب عادت بیگ جھلاتی وہ گھر داخل ہوئی تو نمرہ اسے صحن میں ٹہلتی ہوئی نظر آئی۔ اسے اتنی جلدی گھر پا کر وہ کافی حیران ہوئی۔ عموماً وہ اس کے بعد گھر آتی تھی۔ نمرہ نے جونہی اسے مرکزی گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تو دوڑ کر اس کے قریب آئی۔

" آپی آگئیں تم۔ چلو اچھا ہوا کہ وقت پر آئیں۔ سنو۔ پھوپھو شہوار آرہی ہیں اپنے اس چپکو سپوت فواد کے ساتھ۔ بابا بھی جلدی آگئے ہیں اور مجھے بھی کالج سے لیتے ہوئے آئے ہیں۔ پھوپھو نے ان کو کال کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی ہے اور اب بابا اندر ہی ہیں۔ یہ بیگ جھلانا بند کرو اور آرام سے اندر چلو۔ ماما کچن میں ہیں۔"

اس نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل کہہ سنائی اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر اندر کا رخ کیا۔ ثومیہ نے حیرت سے اس کا عجلت بھرا انداز دیکھا اور اپنا ہاتھ کھینچ کر وہیں رکتے ہوئے بولی۔

"اوہو دم تو لو نمرہ۔ کیا ہو گیا ہے؟ پھوپھو یوں اچانک کیوں آرہی ہیں؟ خیریت؟ اور دھیرج رہ کر مجھے یہ بھی بتاؤ کہ یہ اطلاع پکی ہے کیا کہ وہ "ڈنٹونک" بھی ساتھ آرہا ہے؟ چھٹی کیسے مل گئی اسے "ماشاءاللہ سرکاری نوکری ہے" سے۔ ماں قسم اس بار ایک حد سے زیادہ مسکرایا تو اس کے دانت توڑ دوں گی میں۔ گدھا کہیں کا۔ زہر لگتا ہے مجھے وہ ایڈیٹ۔ بچپن میں بابا سے ہماری الٹی سیدھی شکایتیں کرتا رہا ہے اور اب نواب صاحب کو عشق بھی ہمی سے فرمانا یاد آتا ہے۔"

دھیمی آواز میں فواد کے ذکر پر دانت پیستے ہوئے اس نے جزئیات پوچھیں اور اس دوران ہو بہو پھوپھو کی طرح، اپنے بیٹے کی سرکاری نوکری کے بار بار دہرائے جانے کی نقل بھی اتاری۔ شہوار بیگم ان کی اکلوتی پھوپھو تھیں جوان کے باپ شاہجہان کا اس دنیا میں واحد خونی رشتہ تھیں۔ ان کی شادی منڈی بہاؤالدین کے ایک نواحی قصبے میں ہوئی تھی اور ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اپنے تین عدد بچوں، دو لڑکے اور ایک لڑکی سمیت

ان کے گھر رہنے آتی تھیں۔ وہ پھوپھو کی لگائی بجھائی کی منفی عادات سے شروع سے بہت تنگ تھیں کیونکہ ان کی شکایات کی بدولت اکثر ان کے گھر میں جھگڑا رہتا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا فواد عادات میں اپنی ماں کا پرتو تھا۔ کوئی بھی ایسا موقع کہ جس سے ان کے گھر میں فساد پڑے وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ان دونوں بہنوں کو بچپن سے ہی اس سے خصوصی چڑ بلکہ نفرت تھی۔

اب بھی ثومیہ نے اسی اکتاہٹ کا اظہار کیا تو اس کے انداز پر نمرہ نے دوپٹہ منہ پر رکھتے ہوئے بمشکل اپنی ہنسی دبائی اور پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"آہستہ بولو آپی۔ پاگل ہوئی ہو؟ بابا نے سن لیا تو پھوپھو کی آمد سے پہلے اک "طوفان" آئے گا۔ مجھے نہیں معلوم ابھی کہ کیونکر یوں بھاگم بھاگ آرہی ہیں وہ بے موسمی برسات کی مانند۔ اور فواد کے لیے تو میرا بھی یہی دل کرتا کہ اس کی بتیسی نکال کر پھوپھو کے ہاتھ پر رکھ دوں۔ اول نمبر کا ڈھیٹ ہے۔ اور واقعی گدھا بھی۔۔۔ اب چلو۔ اس سے کیسے نمٹنا ہے رات میں سوچیں گی۔"

اس کی تائید میں اظہارِ رائے کرتے ہوئے اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ تھاما اور اندر کی جانب بڑھ گئی جبکہ ثومیہ نے فقط پرسوچ انداز میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئیں تو شاہجہان عادل صوفوں پر براجمان اخبار پڑھنے میں مگن نظر آئے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے بھی سر اٹھا کر عینک کے عدسوں کے پیچھے سے بغور انہیں دیکھا۔

"السلام علیکم بابا۔۔۔"

صوفوں کی حدود سے پرے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اس نے مودب انداز میں سلام کیا اور پھر انہیں متوجہ پا کر رک گئی۔ جبکہ نمرہ خاموشی سے باورچی خانے میں کھسک گئی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ آگئی ہو واپس۔ چلو اچھا ہے۔"

انہوں نے اخبار تہہ کر میز پر "اچھالتے" ہوئے کہا اور پھر عینک اتار کر ایک طرف رکھ کر مزید بولے۔

"تمہاری پھوپھو آرہی ہیں آج۔۔۔ فواد کے ساتھ۔ بتایا ہی ہو گا تمہیں نمرہ نے بھی۔ کب سے صحن میں یہی اطلاع دینے کے لیے گھوم رہی تھی میں جانتا ہوں۔ خیر بات کا مقصد یہ ہے کہ ان کے سامنے ذرا تمیز

اخلاق سے رہنا دونوں۔ بے مقصد ٹھٹھے نہ لگانا آپس میں پہلے کی طرح۔ او کے؟؟؟"
سخت لہجے میں تنبیہہ کرتے ہوئے انہوں نے آخر پر اس کی "آمادگی" بھی چاہی تو ان کے طنزیہ انداز پر وہ بمشکل ضبط کر سکی۔ سر پر دوپٹہ جما کر، مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا اور تپتی ہوئی نظریں جھکا کر بولی۔
"جی بہتر۔۔۔ ہم خیال کریں گی کہ آپ کو شکایت نہیں ہو۔"
لہجے کو حتی الامکان مضبوط رکھنے کے باوجود اس کے لفظ کانپ گئے۔
"چلو جاؤ اب۔ بیگ رکھ کر باورچی خانے میں دیکھو۔ کوئی کام رہ گیا ہو تو اپنی ماما کا ہاتھ بٹاؤ۔"
بغور اس کا لب و لہجہ جانچتے ہوئے انہوں نے اسی سختی سے کہا اور عینک لگا کر دوبارہ اخبار اٹھا لیا۔ ان کے انداز سے یوں ظاہر ہوا گویا انہوں نے یہ "جز وقتی فراغت" فقط اسے سمجھانے کو حاصل کی تھی۔
انہیں مصروف ہوتا دیکھ کر اس نے ایک طویل سانس خارج کیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔
کمرے میں پہنچ کر اس نے بیگ الماری میں رکھا اور تیز تیز قدموں سے چل کر بیڈ کی ایک جانب رکھے صوفے پر جا بیٹھی۔ جوتا اتار کر اس نے پاؤں مسلے اور پھر سیدھی ہو کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر سر تھام لیا۔ باپ پر آئے شدید غصے کو متوازن کرنے کے لیے وہ کچھ دیر یونہی سر تھامے بیٹھی رہی اور پھر چہرہ تھپتھپا کر گویا اپنے "تاثرات" مٹائے۔
"ٹھیک کہتی ہے نمرہ کہ کوئی فائدہ نہیں غصے کا۔ اپنا آپ جلانا ہے بس۔ بابا کبھی نہیں سمجھنے والے۔ ان سے اب انہی کے انداز میں نمٹوں گی لیکن غصہ کیے بغیر۔"
اسی حالت میں وہ بڑبڑائی اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کر چپل پہنتے ہوئے کمرے سے ملحقہ واش روم میں گھس گئی۔ کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھو کر وہ واش روم سے برآمد ہوئی اور دوپٹے کے پلو سے ہی چہرہ پونچھتی ہوئی بڑے پرسکون انداز میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ باورچی خانے کی جانب تھا۔
"السلام وعلیکم ماما۔۔۔"
اس کی آواز سن کر کچن سلیب پر اپنے اپنے کام میں مصروف، راشدہ بیگم اور نمرہ نے بیک وقت گردن موڑ کر

اسے دروازے پر کھڑے دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ تم آرام کرلیتیں کچھ دیر۔ ابھی آئی ہو۔ تھکی ہوئی ہوں گی۔ کھانا تو بن گیا تقریباً۔ بس یہ پھیلاوا سمیٹ کر سلیب صاف کرنی ہے اور برتن نکالنے ہیں مہمانوں کے لیے وہ نمرہ کرلیتی۔"

سلام کا جواب دینے کے بعد انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے باقی ماندہ کام کی تفصیل سے آگاہ کیا اور چولہے پر دم لگے چاولوں کا دم کھول کر چمچہ ہلاتے ہوئے ان کی تہیں کھولنے لگیں۔ نمرہ بھی مڑ کر سلیب پر بکھری سبزیوں کی باقیات، چھلکے اور دورانِ تیاری استعمال ہوئے اضافی برتن سمیٹنے لگی۔ ان دونوں کا مصروف انداز دیکھ کر اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"بڑی جلدی تیار ہوا کھانا۔ لگتا ہے کافی دیر سے لگی ہوئی تھیں آپ؟"

اتنا کہہ کر وہ بڑھی اور سلیب کے اوپر، دیوار میں پیوست، لکڑی سے بنے خانے کھول کر نئے برتن نکال نکال کر سلیب پر رکھنے لگی۔ راشدہ بیگم نے پلٹ کر اسے برتن نکالتے دیکھا اور دھیمی آواز میں بولیں۔

"ہاں کافی دیر سے بن رہا کھانا۔ تمہارے بابا نمرہ کو بھی جلدی واپس لے آئے اسی وجہ سے کہ میری مدد کرے۔ دونوں نے مل کر ہی تیار کیا ہے کھانا۔ اور میں نے اسے پرندوں کو دانہ چوگا اور پانی ڈالنے کے بہانے سے صحن میں بھیجا تھا تاکہ تمہیں ان کی موجودگی سے آگاہ کرسکے۔"

یہاں وہ رکیں اور آہستگی سے چل کر اس کے قریب آئیں۔ نمرہ نے ہاتھ روک کر حیرت سے ان کا یہ رازدارانہ انداز دیکھا۔

"بات سنو میری۔ یہ شہوار ضرور کسی خاص مقصد سے آرہی ہے ورنہ یوں وہ کبھی نہیں آتی خصوصی اطلاعات کے ساتھ۔ تمہارے بابا کو یقیناً اصل بات کا پتا ہے ان کا انداز بتاتا ہے۔ لیکن بات جو بھی ہو تم دونوں زبانیں بند ہی رکھو گی۔ سمجھ گئیں؟"

اس کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر، انہوں نے باری باری ان دونوں کو دیکھتے ہوئے تنبیہہ کی تو وہ تحیر آمیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر نا سمجھی میں سر ہلانے لگیں۔ ایک پل کو تھم کر نمرہ نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی اور پھر مٹھی میں دبا صفائی کا کپڑا وہیں چھوڑ کر ان کے پاس چلی آئی۔

"اس بات کا کیا مطلب ہے ماما؟ کھل کر بتائیں نا۔ ہم نہیں سمجھیں کہ پھوپھو کس خاص مقصد سے آ رہی ہیں؟ آپ کہیں کیا بات ہے؟"

اس کے لہجے میں ملفوف خدشات نے بتایا کہ وہ کسی حد تک بات سمجھ گئی ہے۔ ان سے سوال کرنے کے دوران اس نے مسلسل ثومیہ کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے بے یقین تاثر سے عیاں تھا کہ وہ بھی ساری بات سمجھ چکی ہے۔

"اوہو ہر بات وقت سے پہلے کھولنی ضروری نہیں ہوتی۔ میں نے بس حفظ ماتقدم کے طور پر سمجھایا ہے کہ اگر کوئی بات ہو بھی تو لب دبائے رکھنا تم دونوں۔ اور خاص کر تم ثومیہ۔ تمہاری طرف سے آج کل مجھے دھڑکا ہی لگا رہتا ہے کہ کب کہیں کچھ بھی بول دو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری تربیت گنی جائے خاندان میں۔ ایک منٹ لگتا لوگوں کو منہ سے بات نکالتے ہوئے اور اس زبان کے بل پر ہی لڑکیوں کا کردار اچھل جاتا ہے۔"

نمرہ کی طرف رخ کر کے انہوں نے انہی ڈھکے چھپے لفظوں میں پھر سے وہی سب کہا اور پھر ثومیہ کو مخاطب کر کے کسی قدر سختی سے بات مکمل کی۔

ان کی بات سن کر کب سے لب بھینچے کھڑی ثومیہ کو جیسے یکا یک ہوش آ گیا اور اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"جو میں سمجھ رہی ہوں اگر تو یہ وہی بات ہے ماما تو آپ بھی جان لیں اور بابا کو بھی بتا دیجئیے گا کہ یہ بات حشر تلک بھی ناممکنات میں سے ہے۔ جس کی مجھے شکل نہیں پسند۔۔ یا جس کو میں چند دن بطورِ مہمان جانے کیسے برداشت کرتی ہوں؟ اس کے لیے میرے متعلق کوئی فیصلہ اگر کرنا ہے تو وہ صرف میں کر سکتی ہوں۔ اب کریں بات یا سو سال بعد۔ میری رائے یہی ہے اور اٹل ہے۔"

ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص باغی لہجے میں کہا۔ وہ جو انہیں شاہجہان عادل کی ابھی ابھی کی گئی طنزیہ باتیں بتانے والی تھی یہ سب سن کر وہ سب بھول گئی۔ اس کی بات سن کر نمرہ نے ایک لمبا ہوکا بھر کر طویل سانس خارج کیا۔

"تو یعنی تم بھی وہی سمجھیں آپی جو میں سمجھی ہوں۔ پھوپھو اس منحوس کے رشتے کی بات کرنے آ رہی ہیں۔

حد ہے ویسے۔ شکل نہیں دیکھتیں اس کی۔ کوئی جوڑ بھی تو ہو۔ ماما یہ تو ناممکن ہے۔ بالکل نہیں ہو سکتا۔ میں ثومیہ کے ساتھ ہوں۔"

دوٹوک لہجے میں کہتے ہوئے اس نے تاسف سے سر ہلایا اور ثومیہ کا ہاتھ تھام کر بولی۔ اس نے بے ساختہ شکر گذار نگاہوں سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا۔ راشدہ بیگم نے ان دونوں کا "اکٹھ" ہوتے دیکھا تو دھیمی آواز میں ڈپٹتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں۔

"بس ہو جاؤ تم دونوں پہلے سے شروع۔ میں بکواس کر رہی ہوں کہ ابھی پکی بات نہیں ہے۔ میں اپنے اندازے سے، اپنے طور پر سمجھا رہی ہوں تم دونوں کو کہ جو بھی بات ہو تم دونوں نے نہیں بولنا۔ میں خود بات کر لوں گی سب سے۔ سب کو پتا ہے کہ یہ بے جوڑ رشتہ ہے۔ میں خود بھی اس کے حق میں نہیں۔ لیکن اگر کوئی بات ہو تو تم دونوں نے زبانوں کو قفل بند رکھنا ہے اس دوران اور بس۔"

بات کے اختتام پر انہوں نے اپنی بیٹیوں کو پھر سے گھورا۔ ان کے انداز میں ایک ماں کا پیار اور اپنی تربیت پر حرف آنے کے اندیشے ایک ساتھ سرسرا رہے تھے۔

ان کی بات سن کر نمرہ نے مزید کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے کہ ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموشی اختیار کرنے کا کہتی ثومیہ جلدی سے بولی۔

"اوکے ماما۔ جیسا آپ کہیں گی ہم ویسا کریں گی۔ لیکن کسی کو بھی ہم سے۔۔۔ اور خاص کر مجھ سے "روبرو" ہونے کا موقع نہیں دیجیئے گا۔ ورنہ اس معاملے میں کسی سے بھی۔۔۔ یعنی بابا سے بھی "دوبدو" ہونے میں مجھے قطعاً کوئی تامل نہیں ہوگا۔ میری زندگی کے متعلق یہ اہم تر فیصلہ میری مرضی کے بغیر ہونا ناممکن ہے۔ دیٹس آل۔"

اس کا تپتا ہوا چہرہ اور چٹانی لہجہ بھانپ کر راشدہ بیگم کو صاف لگا کہ آنے والا وقت اپنے دامن وگھیر میں ان کے لیے بہت سے نئے امتحانات لا رہا ہے۔ بغور اس کا یہ مضبوط انداز پرکھتی نمرہ کا نازک دل بھی کانپ کانپ گیا۔ اسے لگتا تھا کہ بابا کے فیصلوں سے اندرونی مخالفت وانحراف کرنا الگ بات ہے لیکن وہ کبھی بھی کسی بھی فیصلے پر، ان کے سامنے یوں واشگاف ہوتے ہوئے ڈٹ نہیں سکتی۔

ایک پل کے لیے وہ تینوں بالکل خاموش ہوئیں اور پھر گفتگو سمیٹتے ہوئے راشدہ بیگم نے باری باری ان دونوں کو مخاطب کیا۔

"اوہو میں کہہ رہی ہوں نا وقت آنے دو۔ ان شاءاللہ سب ٹھیک ہی ہوگا۔ اب چلو دونوں اپنا اپنا کام ختم کرو۔ تم سلیب صاف کر کے کپڑے بدلو جا کر اور تم ثومیہ۔۔۔ برتنوں میں کپڑا مار کر انہیں ڈائننگ ٹیبل پر لگاؤ۔ چلو شاباش۔ کام ختم کرو۔ وہ لوگ اب پہنچنے ہی والے ہیں۔"

بات کے اختتام پر انہوں نے ان دونوں کو اپنے "مقابل" سے ہٹا کر باقاعدہ جانے کو دھکیلا۔ پھر ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی پیغام لیتی دیتی وہ دونوں ہٹ کر اپنا کام کرنے لگیں تو راشدہ بیگم نے گویا تھک کر شانے جھٹکے اور چولہے کی طرف مڑ گئیں۔

☆......☆......☆

ذکیہ خاتون باورچی خانے کے دروازے سے سبزی کی ٹوکری لیے نکل رہی تھیں جب ہنستا مسکراتا سفیر لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"السلام وعلیکم ماما جان۔۔۔ بابا نہیں آئے اب تک؟"

انہیں دیکھ کر اس نے خوشدلی سے سلام کیا اور بنا توقف کے جہانگیر عالم کی بابت دریافت کرتا ہوا بڑھا اور بیگ ایک صوفے پر رکھ کر دوسرے پر دھم سے بیٹھتے ہوئے جھک کر شوز اتارنے لگا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ ابھی تک تو نہیں آئے لیکن آنے والے ہوں گے۔ تم بڑے خوش لگ رہے ہو؟ خیریت؟؟"

اس کا مسرت آمیز لیکن عجلت بھرا انداز دیکھ کر، مسکراتی ہوئی وہ آگے بڑھیں اور سبزی کی ٹوکری درمیانی میز پر رکھ کر سوال کیا۔ اس نے جھکے جھکے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور چمکتی آنکھوں میں حیرت بھر کر بولا۔

"نہیں تو۔ خوشی کی ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔"

یہاں وہ ہنسا اور مزید بولا۔

"ویسے میں واقعی اتنا خوش لگ رہا ہوں آج کہ آپ نے باقاعدہ محسوس کیا ہے؟ اچھا۔۔۔ حیرت ہے۔

چلیں آپ کا یہ شکوہ تو دور ہوا کہ منہ پر بارہ بجائے رکھتا ہوں۔ اور معذرت۔۔۔ میں مذاق کر رہا ہوں مام۔"

بات کے اختتام پر اس نے انہیں آنکھ ماری اور ہاتھ اٹھا کر معذرت کرتے ہوئے وہ دوبارہ جھکا اور شوز اتار کر ایک طرف کر دیے۔

اس کے شوخ لہجہ و انداز پر وہ بے طرح خوش ہوئیں اور ہنستے ہوئے بولیں۔

"رکو میں پانی لاؤں تمہارے لیے پھر تمہاری خبر لیتی ہوں۔ اور صحیح کہتے ہو کہ بنا بارہ بجتے منہ کے زیادہ اچھے لگتے ہو۔ آتی ہوں۔"

انگلی اٹھا کر اسے "پوچھتی ہوں" کا اشارہ کرتی ہوئی وہ باورچی خانے کی جانب بڑھ گئیں تو کھلکھلاتا ہوا وہ اٹھا اور شوز، جوتوں کے لیے مقررہ ریک میں رکھ کر وہاں سے چپل لے کر پہن لی۔ پھر اس نے واش روم جا کر منہ ہاتھ دھویا اور نکل کر تولیے سے منہ پوچھتا ہوا واپس صوفے پر آ بیٹھا۔ تولیہ اس نے دونوں کہنیوں تلے دبا کر گود میں رکھ لیا۔

اسی وقت ذکیہ خاتون ایک ٹرے میں ڈھکا ہوا جگ گلاس لیے باورچی خانے سے نکلیں اور لا کر اس کے سامنے درمیانی میز پر رکھ دیا۔

"ہاتھ منہ دھو آئے ہو؟ چلو اچھا کیا۔ لو جوس پیو۔ اور لاؤ یہ تولیہ مجھے دو سفیر۔ کتنی بار کہا ہے چیزوں کو ان کی جگہ پر واپس رکھا کرو۔ میرا کام بڑھا دیتے ہو اس طرح۔"

گلاس میں جوس ڈال کر اسے پکڑاتے ہوئے انہوں نے ڈپٹ کر کہا اور تولیہ لینے کے لیے ہاتھ اس کے سامنے تانے کھڑی رہیں۔ جواباً گلاس پکڑ کر تیزی سے ایک گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے "اوہ سوری" کہا اور تولیہ انہیں پکڑا کر دوبارہ جوس پینے لگا۔ اسے پیار بھری گھوری ڈال کر وہ پلٹیں اور واش روم کے باہر دھرے اسٹینڈ پر تولیہ لٹکا کر واپس اس کے ساتھ آ بیٹھیں۔ اس دوران ایک بار جوس ختم کر کے اس نے مزید جوس لیا اور گلاس تھامے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہو گیا۔

"اب بتاؤ کہ کیا سبب ہے تمہاری ان شوخیوں کا؟ لگتا ہے سچ مچ کوئی خاص بات ہے۔"

اس کے گھٹنے کو چھو کر انہوں نے پیار بھرے لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو گردن ان کی جانب موڑ کر وہ

خوشدلی سے ہنسا۔

" کوئی خاص بات نہیں ہے ماما۔ بس یونہی خوش ہوں۔ ایسا ہی تو ہوتا ہوں ہر روز۔ آج شاید بائیک لانی ہے تو اس وجہ سے تھوڑا زیادہ خوش ہوں۔ اور کوئی بات نہیں۔ "

جوس کا گھونٹ بھر کر اس نے سرسری لہجے میں کہا تو انہوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

" اچھا ٹھیک ہے۔ شاید یہی وجہ ہو۔ تمہارے بابا آنے والے ہیں اور بائیک تو پھر آج تم لینے ہی والے ہو۔ چلو یہ بتاؤ کھانا ابھی کھاؤ گے یا ان کے ساتھ ہی؟"

اصرار کیے بغیر انہوں نے بات بدلنا مناسب سمجھا۔ وہ بخوبی جانتی تھیں کوئی نہ کوئی بات ہے جو وہ اس قدر شوخ دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے انتظار کرنا بہتر سمجھا کہ وہ خود ہی انہیں آگاہ کرے۔ کیونکہ ابھی شاید اسے اس کی وجہ کا خود بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔ ان کے سوال پر اس نے جوس کے آخری دو گھونٹ ایک ساتھ بھرے اور سیدھے ہو کر گلاس میز پر رکھ کر ان کی جانب رخ کیا۔

" کھانا میں ان کے ساتھ ہی کھاؤں گا ماما۔ ابھی ایک اہم بات سنیں کہ آج اس کلاس فیلو سے میری صلح ہو گئی ہے۔" اس نے متجسس لہجہ اپنا کر اطلاعی انداز میں کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

" کس سے؟؟"

وقتی طور پر وہ سمجھ ہی نہیں سکیں کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے۔

"مصطفین سے ماما۔ آپ کو بتایا تو تھا پرسوں کہ اس سے بحث ہوئی تھی بے وجہ۔"

اس نے گویا ان کی یادداشت پر افسوس کیا۔

" اوہ ہاں۔۔۔ دراصل کل تم نے کوئی ذکر نہیں کیا اس بات کا تو اپنی مصروفیات میں لگ کر میں بھی بالکل بھول گئی۔ خیر اچھا ہوا بیٹا کہ صلح صفائی ہو گئی۔ بے مقصد ضد لگانے کا فائدہ بھی کیا ہے کسی سے؟ اور اس لڑکی کا بھی تو بتاؤ؟ وہی جو تم دونوں کے درمیان ثالثی کر رہی تھی۔ ثومیہ نام بتایا تھا ناں تم نے اس کا؟"

دل ہی دل میں ان کی صلح ہونے پر شکر ادا کرتے ہوئے انہوں نے مزید سمجھایا اور پھر ثومیہ کی بابت دریافت کیا۔ ان کی بات پر وہ نرمی سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگا اور پھر ثومیہ کے نام پر اس کے لبوں پر

ایک الوہی مسکان طاری ہوئی۔ انہوں نے حیرت سے اس کے چہرے اور مزاج کے بدلے بدلے رنگ دیکھے۔

"جی ماما۔۔۔ ثومیہ ہی ہے اس کا نام اور وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ جو بھی غلط فہمی تھی دونوں طرف اس نے احسن طریقے سے ختم کی۔ وہ سب سے الگ ہے ماما۔ سب سے منفرد۔ آپ کو بتاؤں کہ وہ پہلی لڑکی ہے جو مجھ سے فضول میں مرعوب نہیں ہوتی۔ مطلب وہ دوستوں کی طرح میری کھل کر بے عزتی کرتی ہے۔ یعنی جس بات پر بھی بات کرنی ہو کھل کر کرتی ہے۔ کوئی بے جاء پروٹوکول نہیں۔ کوئی خواہ مخواہ کا متاثر نہیں ہوتی۔ مجھے اس کی یہ بات بہت پسند ہے۔ بڑی خوداعتماد ہے وہ۔ سچ میں بہت اچھی ہے۔"

جواباً اس نے جو ثومیہ کی تعریف شروع کی تو زمین آسمان کا ہر قلابہ باہم ملا دیا۔ ذکیہ خاتون نے حیرت در حیرت اپنے وجیہہ بیٹے کا کسی اور سے متاثر ہونا دیکھا۔ ایک پل کو تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ سفیر ہی بول رہا ہے۔ وہ کبھی بھی کسی سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو بہت زیادہ تھا وہ تو رتی بھر بھی نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ اس کی "انجان" خوشی کی وجہ بھی جان گئیں کہ یقیناً وہ ان دونوں سے دوستی کے آغاز کی بدولت خوش ہے لیکن اسے خود اب بھی اس بات کا ادراک نہیں ہے۔

" بھئی واہ۔۔۔ پھر تو بڑی باکمال لڑکی ہے وہ کہ جو میرے بیٹے کو بھی اتنی پسند آئی ہے۔ اب تو اس سے ملنے کا دل کر پڑا ہے۔"

وہ اتنی حیران ہوئیں کہ اس حیرانی کا اظہار بھی کر دیا۔ ان کی "خواہش" سن کر اس کے فسوں گر چہرے پر پھر سے وہی دھنک رنگ جاگے اور حسین آنکھوں کے دیدہ زیب کناروں پر کوئی خوش کن خیال ٹکائے وہ پرسوچ انداز میں بولا۔

" بالکل ملواؤں گا آپ کو اس سے ماما۔ آپ کو بھی وہ سب سے الگ لگے گی۔ وہ ہے ہی الگ ماما۔ وہ کسی سے نہیں ملتی۔ اس جیسا کوئی بھی نہیں ہے مام۔ سچ کہا آپ نے کہ وہ باکمال ہے۔"

ان کا ہاتھ تھام کر ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ یوں جذب کے عالم میں بولا کہ بغور اس کی ہر کیفیت پڑھتی ذکیہ بیگم چونک گئیں۔ اس کے لہجے میں دبی بے پناہ عقیدت بھانپ کر انہیں لگا کہ بات صرف دوستی یا

پسند تک نہیں رہی۔ کم از کم سفیر کی طرف سے یہ معاملہ اس سے کہیں پار کا ہے۔ اس کی دلچسپی واضح طور پر دوستی سے کچھ بڑھ کر تھی۔ بے ساختہ ان کے ماتھے پر لکیرِ فکر ابھری اور غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ چھڑوا کر، ایک مبہم ہنکارا بھرتے ہوئے وہ سرسری لہجے میں بولیں۔

"اوکے انشاءاللہ ملوں گی اس سے ضرور کبھی۔ یہ تو بتاؤ کہ وہ جو لڑکا ہے۔۔۔ مصطفین۔۔۔ وہ کیسا ہے؟ دوستی ہو گئی کیا اس سے تمہاری یا بس صلح ہی ہوئی ہے؟؟"

ان کے سوال میں کسی "کھوج" کا ایک نادیدہ عنصر شامل تھا۔ دراصل ان دو لڑکوں کے مابین، ایک لڑکی کے طور پر وہ ثومیہ کا کردار جانچنا چاہتی تھیں۔

مصطفین بھی اچھا لڑکا ہے ماما۔ اس سے بھی دوستی ہو گئی ہے۔ چھیڑتا رہتا ہے بات بے بات مجھے۔ بلکہ ثومیہ کو بھی۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے۔ پہلے دن چونکہ میں ناواقف تھا اس سے تو مجھے غصہ آ گیا۔ اب جب جان لیا ہے تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب اس کی باتوں کا مزہ آتا ہے۔ ایک دوسرے کو ستانے کا لطف آتا ہے۔ میرے تو یہ پہلے پہلے دوست ہیں زندگی میں۔ اس سے پہلے کسی سے علیک سلیک سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا کبھی۔ اچھی لگتی ہے ان دونوں کی ہر ایک بات۔ بس یوں سمجھیں کہ ہم تینوں میں سے کوئی سے بھی دو فرد، جب مرضی، کسی بھی ایک تیسرے کی بینڈ بجاتے رہتے ہیں۔ خوب ہلا گلا رہا آج۔"

مسرت سے بھرپور لہجے میں بچوں کی طرح چہکتے ہوئے اس نے پہلے انہیں مصطفین کے مزاج سے آگاہ کیا اور پھر لاشعوری طور پر اپنی دوستی کی "نوعیت" بتانے لگا۔ انہیں اس پل سفیر بہت معصوم، سادہ اور بے ضرر لگا۔ وہ واقعی بچوں جیسا تھا۔

اس کی باتیں سن کر انہوں نے پرسوچ انداز میں سر کو اوپر نیچے تفہیمی جنبش دی اور ثومیہ کے متعلق کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہو کر بات کو سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"ہمم۔۔۔ چلو شکر ہے کہ بالآخر میرے بیٹے کے بھی دوست تو بنے۔ جو تمہیں اتنے اچھے لگے ہیں یقیناً وہ بہت اچھے ہوں گے۔ یہی بات ہے بیٹا کہ زندگی میں آنے والے لوگ ضروری نہیں کہ اپنے پہلے "تاثر" جیسے ہوں۔ لوگ اپنے پہلے تاثر سے ہٹ کر بھی ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی ایک اصول یہ بھی ہے کہ جو "بہت

اچھے" ہوں وہ "صرف اچھے" نہیں ہوتے اور جو "بہت برے" ہوتے ہیں وہ بھی "صرف برے" نہیں ہوتے۔ کچھ برائی اچھوں میں تو کچھ اچھائی بروں۔۔۔ بہر طور موجود ہوتی ہے۔ ہمیں ان سب کلیات کو سمجھتے ہوئے ہی کسی سے اپنا ختمی رویہ طے کرنا چاہئیے۔"

نرم لہجے میں دھیرے دھیرے انہوں نے اپنی بات مکمل کی اور آخر پر اپنی ہر بات پر سمجھداری سے سر ہلاتے سفیر کی خوش رنگ آنکھوں میں جھانکا۔

"جی ماما بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ واقعی لوگ اپنے پہلے تاثر سے ہٹ کر بھی برے یا اچھے ہو سکتے ہیں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے ان کی تائید کی تو اس کا بازو تھام کر، محبت بھرے لہجے میں انہوں نے مزید کہا۔

"مجھے بہت فخر ہے اپنے بیٹے پر کہ یہ اچھے برے کی پہچان رکھتا ہے۔ تمہارے بابا کو آج تمہاری اس نئی نویلی دوستی کا بتاؤں گی۔ دیکھنا کتنے خوش ہوتے وہ بھی۔ اور چلو اب جاؤ اوپر کمرے میں تھوڑا آرام کر لو ان کے آنے تک۔ تب تک میں رات کے لیے سبزی بنا لوں پھر وہ آتے ہیں تو سب ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک۔۔۔؟ اٹھو شاباش۔"

اسے پچکارتے ہوئے انہوں نے تفاخر بھرا لہجہ اپنایا اور مڑ کر سبزی والی ٹوکری نزدیک کر لی۔ یہ گویا گفتگو ختم کرنے کا اعلان بھی تھا۔

"ٹھیک ہے ماما۔ اگر میں سو گیا تو جونہی بابا آئے مجھے جگا لیجیئے گا۔ بائے۔"

فرمانبردار لہجے میں کہتا وہ اٹھا اور یونیورسٹی بیگ تھام کر لاؤنج کے وسطی زینے چڑھنے لگا۔ انہوں نے گردن موڑ کر تفکر آمیز نظروں سے اس کے چوڑے شانے اور پشت دیکھی۔ گو کہ وہ ثومیہ کے متعلق کوئی بھی ختمی رائے قائم نہیں کر سکی تھیں لیکن سفیر کی دلچسپیاں بھانپ کر انہیں اس بات کی بڑی فکر ہوئی۔ ان کی باہمی "دوستی" میں ایک تیسرے فرد کی موجودگی کی وجہ سے انہیں سفیر کا اس لڑکی میں اس قدر "شامل" ہونا بہت خطرناک لگا۔

☆......☆......☆

"اوئے کیسا ہے باؤ مصطفین؟ کہاں جاتا ہے روز سویرے سویرے یوں تیار شیار ہو کر؟ کوئی نوکری کر لی

کیا؟ یا پھر سے پڑھ رہا ہے؟"

یونیورسٹی سے واپسی پر، تیزی سے اپنی گلی میں داخل ہوا وہ گھر کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا جب سامنے بیکری سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے اسے پکارا۔ وہ فوراً رکا اور مسکراتے ہوئے ان کی جانب پلٹا۔

" ٹھیک ہوں رشید چاچا۔ نوکری و وکری کوئی نہیں ابھی تو بس پڑھ ہی رہا ہوں۔ اور آپ سناؤ کیسے ہو؟ دکان کیسی چل رہی ہے؟"

لاشعوری طور پر کاندھے پر لٹکتا بیگ اتار کر ان کے سامنے جھلاتے ہوئے اس نے جواب دیا اور دہلیز کی سیڑھی اتر کر گلی میں رک گیا۔

"اوہ اچھا اچھا۔۔۔ چل چنگا پتر۔ تعلیم بھی بہت ضروری ہے اس دور میں۔ ہمارے تو بڑے سادے ویلے تھے۔ پڑھائی لکھائی کا اتنا خاص جھنجھٹ نہیں تھا۔ خیر یہ بتا صحت طبیعت ٹھیک ہے ناں؟ اور دکان اچھی چل رہی ہے میری۔ شکر الحمدللہ۔۔۔ بس کبھی کبھی لمبی ادھاری سے پریشانی ہونے لگتی ہے۔"

منکسر مزاجی سے انہوں نے یہاں تک کہا اور پھر دکان کے تھڑے سے نیچے اتر کر، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے، اس کے عین سامنے لیکن دوسری طرف آن رکے۔

اور "جی الحمدللہ میں بھی ٹھیک ہوں بالکل۔" کہہ کر ان کا رازدارانہ انداز بھانپتے ہوئے وہ کسی قدر چونک گیا۔

"اچھا پتر تیرے خالو ظفر کا کھاتہ بھی پچھلے دو ماہ سے جوں کا توں رکھا ہے۔ جب پوچھوں کہتے ہیں چند روز نکالو یار۔ اس طرف سے بھی تھوڑی فکرمندی ہے۔ تم کہنا ذرا ان کو یار لیکن اپنے طور پر۔ میرا نام ناں لینا۔ وہ کیا ہے نا کہ یوں مناسب نہیں لگتا۔ وہ کہیں گے شاید میں نے ان کی کوئی شکایت کی ہے۔ جبکہ میں تو بیٹا سمجھ کر اپنا دل ہلکا کر رہا ہوں۔ اب محلے داری ہے ایک دوسرے پر اتنا حق تو بنتا ہے ہم سب کا۔ سمجھ گئے ناں؟؟"

اسی لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر انہوں نے اگلی بات کی تو مصطفین کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ ان کے خود کو روکنے کا اصل مقصد سمجھ گیا۔ وہ روبرو بھی نہیں ہونا چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کا کام ہو جائے۔ اور ان کی

یہ مروت بھی اسے بھلی لگی۔ ورنہ آج کل کے دور میں کوئی کسی کا اتنا خیال بھی کہاں کرتا ہے؟ ایک لحظے کو رک کر ان کی باتوں پر تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ مبہم سا مسکرایا اور پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں سمجھ گیا چاچا جی۔ پریشان نہ ہوں ذرا بھی۔ میں بات کرلوں گا ان سے اور اپنے طور پر ہی کروں گا۔ آپ کا شکریہ کہ مجھ پر بھروسہ کر کے اپنا سمجھتے ہوئے اپنے دل کی بات کرلی۔ فکر نہیں کریں یہ راز ہی رہے گا۔"

اس کی یقین دہانی پر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے۔

"شاباش میرا پتر۔۔۔ بڑا ایبا منڈا ہے تو۔ نیک والدین کی اولاد ہے۔ چل جا اب تو تھکا ہوگا۔ اتنا وقت لیا تیرا میں نے۔" اس کے اخلاق کو سراہتے ہوئے انہوں نے اسے جانے کی اجازت دی تو جواباً اس نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں رشید چاچا۔ بہت شکریہ۔ خدا حافظ"

اور پھر ماتھے پر بے شمار تفکراتی لکیریں لیے وہ گھر داخل ہوگیا۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ وہ خالہ خالو کے اندرونی معاشی معاملات سے انجان رہا ہے۔ دو ماہ کا راشن کا بل ادا نہ ہونے کا مطلب سراسر یہی بنتا تھا کہ وہ معاشی طور پر پریشان ہیں۔ اس نے خود بھی ابھی تک دو ماہ کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ گو کہ اس کے پیسے اس کے اکاؤنٹ میں پہنچ چکے تھے لیکن یونیورسٹی کی مصروفیت میں وہ کرایہ ادا کرنا ہر روز ہی بھولتا رہا۔

"سلام خالہ۔۔۔ کیا حال ہے؟؟"

مختلف سوچوں کے تانے بانے بنتا وہ لاؤنج میں داخل ہوا تو خالہ استری اسٹینڈ پر کپڑے استری کرتی ملیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ لے مجھے کیا ہونا تھا ان پانچ چھ گھنٹوں میں جو تو یونیورسٹی گذار کر آیا ہے؟ خیر سے بھلی چنگی ہوں۔"

اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے انہوں نے اپنے "مخصوص انداز" میں جواب دیا اور استری کھڑی کر کے، قمیض کا رخ بدلنے لگیں۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

"چلو شکر ہے کہ بھلی چنگی ہیں آپ۔ اور خالو نہیں آئے آج دوپہر میں گھر؟"

کوئی اور وقت ہوتا تو ان کے جواب پر وہ خوب ستاتا ان کو لیکن دکان کے کھاتے کا سن کر فی الوقت اس کا

ایسا موڈ نہیں بنا تو سیدھے سادے طریقے سے اگلا سوال کرتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیگ اس نے ایک جانب رکھ دیا۔

" نہیں کل تو بارش کی وجہ سے آئے ورنہ روز کہاں آتے ہیں وہ دوپہر میں؟ تجھے پتا تو ہے کہ نہیں آتے۔ پھر کیوں پوچھ رہا ہے؟؟"

استری کا پلگ اتار کر قمیض ادھوری چھوڑتے ہوئے وہ اس کے سر کے پاس سے گھومیں اور باورچی خانے کی جانب بڑھتے ہوئے قدرے تعجب سے بولیں۔ اس نے خاموش رہ کر "ہوں" کرتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلایا اور پھر نیم دراز ہو کر سر صوفے کی پشت سے ٹیک دیا۔ کچھ دیر بعد، ایک چھوٹی ٹرے میں جگ گلاس لیے وہ باورچی خانے سے برآمد ہوئیں اور درمیانی میز پر رکھ کر پانی کا گلاس بھر کر اس کے سامنے کیا۔

" لو پانی پیو۔۔۔ اور میری سمجھ سے باہر ہو تم کہ جن باتوں کا پہلے سے پتا ہوتا ہے اکثر ان پر بھی سوال کرنے لگتے ہو۔ ویسے یہ اتنے چپ چپ کیوں ہو آج؟ ورنہ تو دو گز لمبی زبان ہے ماشاءاللہ تمہاری۔ لو بھلا اب اس پر بھی کیا ماشاءاللہ کہنا جو میں کہہ رہی ہوں۔ خیر۔۔۔ کیا ہوا؟؟"

ان کے خوشگوار لہجے کے برعکس ان کی "جانچتی" ہوئی نظریں "پرکھ" کر اس نے اسی خاموشی سے گلاس تھاما اور غٹاغٹ پی گیا۔ موسم سرد ہونے کے باوجود اسے پیاس لگی تھی۔

کنیز بیگم اس دوران اس کے سامنے والے صوفے پر جا بیٹھیں۔ اس نے خالی گلاس میز پر دھرا اور اپنے بازو سے منہ پونچھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

" قسم سے آپ بھی بڑی عجیب ہو خالہ۔۔۔ میں بولوں تو بھی مسئلہ ہوتا ہے آپ کو اور میں چپ رہوں تو بھی پریشانی رہتی ہے۔ جیسے میں آپ کی سمجھ سے باہر ہوں ایسے ہی میری سمجھ سے بھی کہیں دور ہو آپ۔ سچی۔۔۔ اور ہونا کیا ہے؟ کچھ نہیں ہوا ہے۔ چپ میں صرف اس وجہ سے ہوں کہ یونیورسٹی سے تھکا آیا ہوں۔ اور کوئی بات نہیں۔"

اس کی بات سن کر وہ نرمی سے مسکرائیں۔ اس کے شگفتہ لہجے سے انہیں تسلی ہوئی کہ کوئی "مسئلہ" نہیں ہے۔

" لے ہاں تجھ سے تو بندہ اب بھول چوک سے خیر خیریت بھی نہ پوچھے۔ الٹا ہی مطلب لیتا ہے۔ عجیب بندہ ہے۔ اور تھکاوٹ ہے تو ٹھہر جا میں چائے بناتی ہوں تیرے لیے۔"

مصنوعی خفگی سے اسے دیکھ کر وہ اٹھنے لگی تھیں کہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتا وہ سرعت سے بولا۔

" نہیں نہیں خالہ چائے نہیں پینی میں نے۔ دل نہیں کر رہا بالکل بھی۔ اور الٹا مطلب صرف میں لیتا ہوں؟ ابھی جب حال پوچھا میں نے تو خود کیا جواب دیا تھا یہ بھی یاد کرلیں ذرا۔"

اس کی بات پر کچھ کہے بنا وہ ہنسنے لگیں تو ان کی " بے فکریوں " کو بھانپتا وہ رشید چاچا کے الفاظ یاد کرنے لگا۔ اس کے دل میں ان کا احترام اور بڑھ گیا کہ انہوں نے اس سے اپنی پریشانی چھپائے رکھی لیکن کرایہ طلب نہیں کیا۔

خالہ ہنس کر چپ ہوئیں تو کچھ توقف سے اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

" اچھا خالہ چھوڑو یہ سب۔ یہ بتاؤ کہ ہم سب کی شامت کدھر ہے؟ سوئی پڑی ہے کیا؟ بڑا سکون ہے ناں گھر میں۔ وہ جاگ رہی ہو تو کہاں ہوتا ہے؟؟"

مخصوص القابات سے نوازتے ہوئے اس نے ایمان کی بابت پوچھا تو خالہ کو جیسے موقع مل گیا دل کی بھڑاس نکالنے کا۔

" ہونا کہاں ہے اس نے؟ اوپر راہداری میں پھیرے لگا رہی ہے۔ اپنے من پسند خیالوں میں رہتی ہے بس ہر وقت۔ کوئی فکر نہیں کہ ماں نیچے اکیلی کھپتی رہتی ہے سارا دن۔ دل کرے تو کسی کام کو ہاتھ لگاتی ہے نہیں تو نہیں۔ مجال ہے کوئی بھی اس سے کوئی بات منوا سکے۔ من مرضی کی مالک ہے۔ میں تو بڑی فکر مند ہوں اس کی طرف سے۔ مزاج ہی نہیں ملتے مہارانی کے۔۔۔"

اور ان کی اس قدر لمبی گردان پر اس نے حیرت در حیرت، بار بار سیڑھیوں کی طرف نگاہ کر کے اوپر کی جانب دیکھا۔ پھر خالہ کو تسلی دینے کے لیے اس نے مناسب لفظ ترتیب دیئے اور ہموار لہجے میں بولا۔

" آپ تو بہت بھری بیٹھی ہو خالہ لیکن میرے خیال سے وہ صرف بظاہر ایسی لگتی ہے۔ اندر سے ساری سمجھ ہے اس کو۔ بہر حال میں سنجیدگی سے اس سے بات کروں گا اس موضوع پر۔ مذاق کے علاوہ۔ آپ بالکل

پریشان مت ہوں۔ اس کی فطرت ہی ایسی لا ابالی ہے ورنہ بہت اچھی ہے وہ۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا دل صاف ہے۔"

ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ اس کی بے سبب تعریف کرنے لگا۔ ایمان سن لیتی تو یقیناً اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں ہوتا کہ مصطفین اس کی تعریف کر رہا ہے۔ خیر اس کے تسلی دینے کا یہ اثر ہوا کہ ان کا جلال سچ مچ اتر گیا۔ اور وہ دوبارہ بولیں تو ان کے لہجے میں ماں تا کا پیار بسا تھا۔

"یہ تو ٹھیک کہتا ہے تو۔ بس لگتی بے حس ہے ورنہ وہ ہے نہیں ایسی۔ ماں ہوں اس کی میں۔ خوب جانتی ہوں کہ روز راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہم بوڑھا بوڑھی کا کمرہ جھانکتی ہے۔ ہماری خبر رکھتی ہے۔ بڑی فکر رہتی ہے اسے ہم دونوں کی۔ ایک بات کہوں مصطفین۔۔۔ تو اس کی بری بھلی کسی بھی بات کا برا نہ منایا کر۔ وہ جو بھی کہے دل سے نہیں کہتی۔ سب اوپرا اوپر سے کہتی ہے۔ اچھا؟؟؟۔۔۔"

بات مکمل کرنے تک ان کا لہجہ مختلف کیفیات میں ڈھل کر بتدریج جذباتی ہو گیا اور آخر پر وہ اسے اس کی طرف سے مطمئن کرنے لگیں۔ ان کے چہرے پر بکھرے مشفق رنگ دیکھتا وہ سادگی سے مسکرایا اور پھر گفتگو سمیٹتے ہوئے بولا۔

"بالکل خالہ میں سب جانتا ہوں کہ وہ ایسی ہی ہے۔ فکر نہیں کریں میں نے کبھی اس کی باتوں کا برا نہیں منایا۔ مجھے پتا ہے کہ وہ جو بھی کہہ دے دل سے نہیں کہتی۔ بس منہ میں آئی ہر بات بول دینے کی عادی ہے۔ سیکھ جائے گا دھیرے دھیرے "منہ رکھنی" اور "دینا داری" بھی۔۔۔ اور سچ کہوں تو وہ یونہی اچھی لگتی ہے۔ اس پر جچتا ہے مزاج اس کا۔"

ان کی آنکھوں میں جھانک کر پر یقین لہجے میں اس نے ایمان کی ذات کا تجزیہ پیش کیا تو وہ خوش ہو گئیں۔ اور پھر ان کی فخریہ نظریں خود پر مرکوز پا کر، ان کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب میں چلتا ہوں خالہ۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گا۔ مجھے چھ بجے جگا دیجیئے گا۔ اور ایمان کو نیچے بھیجتا ہوں جا کر۔ اچھا۔"

اس کا مودب انداز دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر انہوں نے گویا اسے جانے کی اجازت دی۔

دائیں ہاتھ میں بیگ تھامے وہ صوفوں کی حدود سے باہر نکلا اور آہستگی سے زینے چڑھنے لگا۔ کنیز بیگم کی پرسوچ نظروں نے زینوں کے آخری دہانے تک اس کی چوڑی پشت کا تعاقب کیا۔

☆......☆......☆

دروازے پر بیل ہوئی تو لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ہوئے شاہجہان عادل اٹھے اور باورچی خانے کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی۔

"آجاؤ بھئی راشدہ۔۔۔ بچیوں کو بھی لیتی آؤ۔ شہوار لوگ پہنچ گئے ہیں ریسیو کریں ان کو۔"

اور ان کی پکار سن کر ثومیہ اور راشدہ بیگم بوتل کے جن کی طرح باورچی خانے سے برآمد ہوئیں۔ نمرہ کو غیر موجود پا کر ان کی پیشانی شکن آلود ہوئی اور انہوں نے بے ساختہ ان کے پیچھے نگاہ کی کہ شاید وہ پیچھے آرہی ہو۔

"نمرہ کپڑے تبدیل کر کے آتی ہے۔ بہت گندے ہو رہے تھے۔ چلیں ہم سب چلتے ہیں۔"

دوپٹے سے گیلے ہاتھ خشک کرتے ہوئے انہوں نے شوہر کی سوالیہ نظروں کا مفہوم سمجھ کر وضاحت کی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

"اچھا چلو۔ یہ کام پہلے کرنے کے ہوتے ہیں جو ان کو عین مہمانوں کی آمد پر یاد آتے ہیں۔ اور تم دوپٹہ ٹھیک سے لو۔ یوں لینے کا کیا فائدہ؟"

اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں انہوں نے نمرہ کے کپڑے بدلنے پر تبصرہ کیا اور پھر ثومیہ کو گھور کر کہا۔ وہ تحیر آمیز نظروں سے ماں کی طرف دیکھتی ہوئی پہلے سے بالکل ٹھیک اوڑھا گیا دوپٹہ مزید اچھی طرح سر پر جمانے لگی۔ راشدہ بیگم نے جواباً تسلی بخش انداز میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور اسے ساتھ لیے شاہجہان عادل سے پہلے لاؤنج سے باہر نکل گئیں۔

"جاؤ تمہی کھولو دروازہ۔ اور سنو۔۔۔ ادب سے سلام کرنا دھیرج رہ کر۔"

صحن میں رک کر انہوں نے اسے آگے کرتے ہوئے نصیحت کی تو ایک پل کو رک کر وہ متاسف نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ماما کیا مجھے نہیں پتا اس بات کا؟ کبھی کبھی آپ بھی ناں۔۔۔"

پھر بات ادھوری چھوڑ کر اس نے لب بھینچے اور دروازے پر جا کر کنڈی کھول دی۔ تب تک شاہجہان عادل بھی ان کے پیچھے آن رکے۔ دروازہ کھلنے پر جو پہلا چہرہ نمودار ہوا اسے دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالے وہ بے ساختہ پیچھے ہوئی۔ فواد بے طرح باچھیں کھلائے قدم اٹھائے بنا ہی اندر جھانکنے لگا۔ وہ عام سے بھی عام شکل و صورت کا مالک اور درمیانے قد کا حامل ایک جواں سال لڑکا تھا جس کے چہرے پر دوسروں کے لیے عجب تمسخرانہ اور کم تر سا تاثر ثبت رہتا تھا۔

"السلام وعلیکم فواد بھائی۔ آیئے۔"

سنبھل کر اس نے سلام کیا تو ہنستا ہوا وہ اندر داخل ہو گیا۔

"وعلیکم السلام۔ اتنی دیر کر دی؟ کب سے کھڑے تھے ہم باہر؟"

وہ آتے ساتھ ہی اعتراضات کرنے لگا۔ ثومیہ اسے نظر انداز کر کے بڑھی اور اس کے پیچھے اندر آتی شہوار بیگم کے گلے لگ کر رسمی استقبالیہ جملے ادا کیے۔

"السلام وعلیکم پھوپھو۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟ سفر کیسا گزرا؟"

اس کا مودب انداز دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرائیں تو اسے کافی حیرت ہوئی۔ وہ ان ماں بیٹیوں کے ساتھ کم کم ہی مسکراتی تھیں۔

"اے وعلیکم السلام۔۔۔ اب اپنی دھی رانی کو دیکھا ہے تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں اور سفر کی تھکان بھی تمہارا خوبصورت مکھڑا دیکھ کر اتر گئی ہے میری بچی۔ صدقے جاؤں کتنی سوہنی لگ رہی ہو۔"

اسے خود سے بھینچتے ہوئے انہوں نے جب جواباً "پیار لٹایا" تو اس کی تو حیرت بھی گم ہونے لگی۔

"یا اللہ خیر۔۔۔ ماما کے خدشے سچے لگتے ہیں۔ الٰہی بچانا مجھے۔ تو بہتر جانتا ہے کہ میں ان محبتوں کو "جھیلن جوگی" کوئی نہیں۔۔۔" بظاہر مسکراتے ہوئے "شکریہ پھوپھو" کہہ کر وہ ان سے الگ ہوئی اور ان کا ہاتھ تھامے یہ سوچتی ہوئی ان کو اپنے والدین تک لے آئی۔ وہ دونوں باری باری فواد سے مل رہے تھے۔

"آؤ شہوار آؤ۔۔۔ ہم کب سے انتظار کر رہے تھے۔ خوش آمدید۔"

شاہجہان عادل دونوں بازو پھیلائے والہانہ انداز میں ان کی جانب بڑھے تو فواد ان کے ساتھ کھڑی ثومیہ

کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ یوں رخ پھیر گئی گویا دیکھا ہی نہ ہو۔

" کیسی ہو شہوار؟ اس بار تو کافی عرصے بعد آئیں۔ چلو شکر ہے کہ تمہیں بھی ہماری یاد تو آئی۔"

دونوں بہن بھائی مل کر الگ ہوئے تو راشدہ بیگم نے بھی بھابھی ہونے کا فرض نبھاتے ہوئے اپنائیت بھرے لہجے میں کہہ کر ان کو گلے لگایا۔

"ہائے میرا تو اپنا بڑا دل اداس تھا پر تم جانتی ہو کہ فواد کی ماشاءاللہ سرکاری نوکری ہے اور اسے چھٹی مشکل سے ملتی ہے۔ بڑا ذمہ دار لڑکا ہے میرا پتر۔ اس وجہ سے دیر ہوئی اس بار۔ چھوٹے تو ابھی پڑھ رہے ہیں ان کے ساتھ میں کہیں آتی جاتی ہی نہیں۔"

جواباً پھوپھو نے ان کو خود سے بھینچتے ہوئے خوش اخلاقی کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے اور لحظہ لحظہ ان کا یہ " محبتیں نچھاور " کرتا انداز پڑھتی ثومیہ کا گلا خشک ہونے لگا۔

"اچھا اندر تو چلو سب۔ ساری گفتگو یہیں کرنی ہے کیا؟ چلو بھئی۔"

شاہجہان عادل کی آواز پر راشدہ بیگم متانت سے مسکراتی ہوئی ان سے الگ ہوئیں اور انہیں ساتھ لیے اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

ثومیہ بھاگ کر اپنے بابا کے ساتھ ساتھ چلنے لگی کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ فواد اس کے ہمراہ چل کر اس سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔

وہ سب آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے تو اپنے کمرے سے نکل کر نمرہ بھی اسی وقت وہاں آئی۔

"ارے واہ۔۔۔ پھوپھو آ گئیں۔ السلام وعلیکم پھوپھو۔۔۔ السلام وعلیکم فواد بھائی۔۔۔"

انہیں دیکھ کر دور سے چہکتی ہوئی وہ صوفوں کے گرد گھومی اور آ کر ان کے گلے لگ گئی۔ اس کی اس قدر "وارفتگیوں" پر ایک پل کے لیے پھوپھو بھی چونک گئیں۔ یقیناً وہ بھی اس سے ایسی " محبت " کی توقع نہیں کرتی تھیں۔ اس کے خوشگوار رویے پر ثومیہ نے نا سمجھنے والے انداز میں راشدہ بیگم کو دیکھا تو انہوں نے شوہر اور باقی سب سے چوری ٹھوڑی اچکاتے ہوئے اپنی "لاعلمی" کا اظہار کر دیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ وعلیکم السلام۔۔۔ کیسی ہے میری گڑیا؟ ماشاءاللہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

اسے گلے لگائے لگائے، اس کے ایک سلام کا انہوں نے دو بار جواب دیا اور پھر خود سے الگ کر کے اس کے گال پچکار کر تعریف کی۔ شاہجہان عادل "تفاخر" سے اپنی بہن کو دیکھ رہے تھے جبکہ وہ ماں بیٹیاں "تحیر" سے۔ ان کا ہر ہر انداز آج پہلے سے جدا تھا۔ فواد اس دوران بس ہنس ہنس کر باری باری سب کو دیکھتا رہا۔

"شکریہ پھوپھو۔۔۔ آپ پر گئی ہوں ناں۔۔۔ اس لیے اچھی لگ رہی ہوں۔ سب کہتے ہیں میں آپ جیسی لگتی ہوں۔ اور آپ کیسے ہیں فواد بھائی؟"

اس نے خوشدلی سے کہہ کر آخر پر فواد کو مخاطب کیا اور اس کی یہ " گوہر افشانی" سن کر ثومیہ پر تو گویا حیرتوں کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔ پھوپھو تو پھوپھو رہ گئیں اسے لگا اسے نمرہ ہی مار ڈالے گی۔ وہ اس کی ان "بے وقت لگاوٹوں" سے از حد پریشان ہوئی۔ جبکہ پھوپھو اس "پروٹوکول" سے فل ٹائم مسکرائیں۔

"میں تو ہٹا کٹا ہوں۔ تم کیسی ہو کزن؟ اور دروازے تک ریسیو کرنے بھی نہیں آئیں؟ بڑی نواب ہو گئی ہو بھئی۔ یہ دن بھی آنے تھے۔"

اس کی ہر لگاوٹ کا کمال ترانداز میں ستیاناس کرتے ہوئے فواد نے اپنے مخصوص طریقے سے طنز کیا تو سب کے مسکراتے لب یکدم سمٹ گئے۔ نمرہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

"ہٹے کٹے تو آپ دکھ رہے ہیں فواد بھائی ماشاءاللہ۔۔۔ اور وہ ایک پرسنل کام میں بزی تھی اس وجہ سے دروازے تک نہیں جا سکی۔ ابھی آئی تو ہے خوش آمدید کہنے۔ اچھا نہیں لگا کیا آپ کو؟"

کچھ توقف سے فواد اور شاہجہان عادل کو باری باری دیکھتے ہوئے اس کی جگہ ثومیہ نے جواب دیا تو اس کے اعتماد کے سامنے وہ گڑبڑا گیا۔

"ارے نہیں۔۔۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ سیریس مت ہو۔ اب سب کا آنا ضروری تھوڑی ہے۔ اور ابھی مل بھی تو لیا۔"

اس نے دوبارہ باچھیں کھلائیں تو پہلی بار ثومیہ کے لب چٹکے۔ جبکہ شاہجہان عادل نے پہلے اسے اور پھر راشدہ بیگم کو گھورا۔ وہ دونوں نظر چرا گئیں۔ پھوپھو نے بغور ماحول کا جائزہ لیا اور پھر اس کی بات کی "شدت" کم کرنے کے لیے بروقت مداخلت کی۔

"اوہو بھئی ہر وقت مذاق نہ کیا کرو فواد۔ فرصت سے بیٹھ کر شکوے شکایتیں کرنا تم بچہ پارٹی آپس میں۔ ایک جتنے ہو جو مرضی گپ شپ کرنا۔ ہمیں کیوں روک رکھا ہے۔ چلو شاباش۔"

سرسری لہجے میں بیٹے کو ڈپٹ کر، نمرہ کا ہاتھ تھامے وہ آگے بڑھ گئیں تو ان سب نے بھی خاموشی سے ان کی تقلید کی۔

"آپ سب بیٹھیں ماما۔ ہم دونوں ریفریشمنٹ لاتی ہیں۔ آؤ نمرہ۔۔۔"

سب آمنے سامنے مختلف صوفوں پر بیٹھنے لگے تو باورچی خانے کی جانب بڑھتی ہوئی ثومیہ نے آخری صوفے کے پار رک کر راشدہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے نمرہ کو بلایا۔

اثبات میں سر ہلاتی وہ اٹھی اور اس کے ساتھ چلی گئی۔

"افف۔۔۔ تم پاگل ہوئی ہو کیا؟ بڑی خوش اخلاقیاں سوجھ رہی ہیں تمہیں پھوپھو کے ساتھ۔ وہ بھی بابا کے سامنے اتنی فرینک نیس۔۔۔ جانتی بھی ہو کہ دونوں طرف سے اس کا منفی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ مجھے تو ہارٹ اٹیک ہو جانا تھا اگر دو چار باتیں تم اور کرتیں تو۔ اللہ تمہیں پھوپھو سے اتنی محبت کب سے ہونے لگی؟؟؟"

جیسے ہی وہ باورچی خانے میں داخل ہوئیں، یکا یک ثومیہ نے پلٹ کر اسے دونوں شانوں سے پکڑا بلکہ دبوچا اور سلیب کے ساتھ لگا کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بے یقین لہجے میں بولتی چلی گئی۔

اس اچانک "افتاد" سے گھبرا کر بتدریج سنبھلتی وہ شرارت سے مسکرائی اور شانے جھٹک کر خود کو آزاد کرواتی ہوئی پراسرار لہجے میں بولی۔

"اوہو آپی ڈرا دیا مجھے ایک دم تھام کر۔ اور سنو۔۔۔ پھوپھو سے لگاوٹ و محبت کے یہ "مظاہرے" میں کچھ سوچ سمجھ کے ہی کر رہی ہوں۔ بلاوجہ نہیں ہیں۔۔۔ وہ کیا ہے ناں کہ دائمی نفرت یقینی ہو تو وقتی محبت سے ہر ممکن حد تک کام چلانا چاہیئے۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ کچھ دن سکون سے گذر جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے ہمیں اس "خطرے" کی مخالفت "ڈٹ" کر نہیں بلکہ اس سے "بچ" کر کرنی چاہیئے۔ کیا سمجھیں؟؟؟"

بات کے اختتام پر اس نے بائیں آنکھ دبائی تو غصے سے تھپڑ مارنے کا اشارہ کرتی ثومیہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ "خاک سمجھی ہوں میں تمہاری یہ "گوڑھیاں باتاں"۔۔۔ ایک تھپڑ ماروں ناں تو عقل ٹھکانے آ جائے

تمہاری جو یقیناً گھاس چرنے گئی ہوئی ہے فی الوقت۔ اری بیوقوف "چوکٹھا" دیکھا اس منحوس فواد کا تم نے؟ وہ اس قابل ہے کہ اس سے مصلحت کے تحت بھی بات کی جائے؟ یہ تو بلی کو دیکھ کر کبوتر ہونے والی بات کر رہی ہو تم۔ حقائق سے منہ موڑنے سے وہ بدل نہیں جاتے۔ حقائق کا سامنا کرنے سے پہلے ان کو "تسلیم" کرنا پڑتا ہے۔ چشم پوشی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا ہی ان کا "پہلا اور آخری" حل ہوتا ہے۔ ویسے بھی پھوپھو اس محبت کے مظاہروں سے ٹلنے کی بجائے اور شہہ پائیں گی۔ لہٰذا خدارا۔۔۔ اب ذرا قابو رکھنا خود پر۔ خبردار جو فضول پیار بگارا تو۔ اور الٹا پڑے گا یہ پیار ہمیں۔ یاد رکھنا۔ پاگل۔ بس نارمل بی ہیو کرو۔ ادب سے رہو اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ بھی کرنے کی ضرورت ہرگز نہ ہے۔"

اس کی آنکھوں میں جھانک کر حرف حرف پھونکتے اس کا لہجہ بتدریج نرمی میں ڈھلا تو بغور اسے سنتی نمرہ اس کے غصے میں ملفوف ساری "التجائیں" پڑھتی ہوئی چپ چاپ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ اس کی مدلل گفتگو کے سامنے اپنی ہر بات اسے واقعی بے تکی ہی لگی۔ اس کی پیشانی پر فکر کی کئی لکیریں ابھر آئیں۔

ثومیہ نے اس کا تفہیمی انداز دیکھا تو سر جھٹک کر، ایک طویل سانس بھرتی ہوئی خود کو متوازن کرنے لگی اور پھر پیار سے اس کا کاندھا تھام کر بات سمیٹتے ہوئے بولی۔

"چلو اب جو ہوا سو ہوا۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آگے محتاط رہنا بس۔ آؤ اب ریفریشمنٹ لے جائیں دیر ہو رہی بہت۔ یہ نہ ہو بابا یہاں بھی آن دھمکیں۔"

بات کے اختتام پر اس نے اس کا گال پچکارا اور اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر پلٹ کر ایک بڑی ٹرے میں مہمان نوازی کا سامان ترتیب دینے لگی۔ اس کی پشت کو فکر و یاس سے دیکھتی نمرہ نے اس وقت اس کی "اندرونی حالت" جانچنی چاہی اور پھر تھکے تھکے انداز میں شانے جھٹک کر وہ بڑھی اور اس کے ساتھ ہو کر اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ ہمارے پاس یاسیت سے شانے جھٹکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ حالات سے فرار کی ہر راہ مسدود ہونے لگے تو دعاؤں پر بھروسہ کر کے خود کو حالات کے سنگین دھاروں پر بہنے دینا چاہیئے۔ اسطرح وقتی مشکلات درپیش ہونے کے باوجود بالآخر تمام تر راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

زندگی سہل کرنا ہو تو دشواریوں سے لڑائی مول لینے کا ہنر سیکھ لو۔

☆......☆......☆

اس نے ارادہ کیا کہ رات میں خالو ظفر کو پچھلے دو ماہ کے کرائے کے ساتھ ساتھ اگلے چار ماہ کا کرایہ بھی پیشگی ادا کر دے گا۔ تا کہ ان کے مسائل حل ہو سکیں۔ اس نے اس سلسلے میں ان سے براہ راست بات کرنے کی بجائے ذاتی طور پر اس بات کی کھوج کرنے کا سوچا کہ وہ راشن کا بل چکتا کیوں نہیں کر پائے؟ کیا خالو کی شاہ عالمی والی دکان ٹھیک سے نہیں چل رہی؟ یا کوئی اور وجہ ہے کہ وہ معاشی گرفت میں ہیں آج کل؟ کئی طرح کی سوچیں سوچتا خالہ کے پاس سے اٹھ کر وہ اوپر آیا تو ایمان حسب معمول، راہداری کی ایک کھڑکی سے ٹیک لگائے ہوئے آسمان کی نیلاہٹیں کھوجتی نظر آئی۔ اس نے سیڑھیوں کے داخلی سرے پر رک کر بغور اس کا جائزہ لیا۔

جدید تراش کے پیلے گھیر دار فراک میں تن کر کھڑی ایمان دلنشین چہرے پر اندرونی خوابوں کے حسین عکوس سجائے کوئی ملکوتی شہزادی لگ رہی تھی جو صدیوں کی مسافتوں سے بھٹک کر بادشاہوں کے تاریخی اور وسیع و عریض محلوں کی بجائے اندرون لاہور کے اس دو منزلہ مکان میں آن بسی ہو جو اس کے شایانِ شان ہرگز نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کے خوش رنگ کناروں پر ٹکے فسوں گر خیال صاف صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ لہراتے ہوئے، لمبے لمبے جالی دار پردوں کے مابین، عجب عجب کیفیتوں میں ڈھلتی وہ ہولے ہولے دائیں بائیں یوں جھول رہی تھی گویا چلتی ہوئی نرمیلی ہواؤں کے رتھ پر رہ کر، لہک لہک کر پورے میں گھوم رہی ہو۔ وہ سچ مچ کسی دیومالائی قصے کا ایک اپسرائی کردار لگتی تھی جو وقت کی ہلتی شاخوں سے جھڑ کر اپنی کہانی سے بچھڑ گیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا تو حسب عادت اس کی موجودگی کا احساس ہو جانے کے باوجود اس نے اپنی "مصروفیت" ترک نہیں کی۔ وہ بھی کھڑکی کی شفاف سل پر ہاتھ رکھے تھوڑا سا جھکا اور اس کی نگاہوں کے تعاقب کرنے لگا۔ سفید فاختاؤں کے چار با ترتیب غول نیلے آسمان پر طویل اڑانیں بھر رہے تھے اور وہ ایمان کا "جھومتا" ہوا وجود گویا انہی کی ہمراہی میں تھا۔

"سنو ایمان... اس سے پہلے کہ تھکنے لگو... ان بے نام مسافتوں سے لوٹ آنا۔"

رخ پھیر کر کھڑکی کی سل سے پیٹھ ٹکاتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں کی مسلسل ہلتی پتلیوں میں جھانکنے لگا تو اس

کے پراسرار لہجے میں دبے اسرار بھانپنے کی کوشش میں وہ بے ساختہ اپنی "محویت" توڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟؟؟ میں سمجھی نہیں ہوں۔"

اس کی خواب رنگ آنکھیں سراپا سوال ہونے لگیں۔ جنہیں بغور پڑھتا وہ "پورا جواب" ہو گیا۔

"مطلب یہی ہے کہ ان پرندوں کے سنگ سنگ اور کتنا اڑنا ہے؟؟ زمین کے باسیوں کے خواب آسمانی ہونے لگیں ناں۔۔۔ تو ایک وقت آتا ہے کہ خواہشوں کی روحیں بھی دھاڑیں مار کے روتی ہیں۔ اس وقت کی آہٹیں سنو ایمان۔ بلندیوں کی محبتوں میں اس قدر مبتلاء ہو جانے والوں پر وہ ضرور آتا ہے۔"

صریح پہلوؤں کی نشاندہی کرتا اس کا دوٹوک لہجہ کسی قدر ناصحانہ ہو گیا تو ہونٹوں کو سیٹی کے انداز میں سکیڑتے ہوئے وہ اس کے "روبرو" ہونے کے لیے، اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے عین سامنے آن رکی۔

"اوہ۔۔۔ اب سمجھی۔ تو یہ بات ہے۔"

ایک پل کو اس نے کچھ کہنا چاہا اور پھر ہنکارا کر کچھ سوچتے ہوئے لفظ ترتیب دیئے۔ وہ چپ چاپ منتظر رہا۔

"وقت کی گرفت سے مجھے مت ڈراؤ مصطفین۔۔۔ کیونکہ میں ان "لمحات" پر یقین رکھتی ہوں جو "صدیوں" پر محیط ہو جائیں۔ رہی بات ان بلندیوں کو تاکنے کی تو میرا یقین ہے کہ "دنیا کی اصلیت" دیکھنی یا جانچنی ہو تو دنیا سے "باہر" ہو کر دیکھو۔ اب تم مانو یا نہیں الگ بات ہے۔ لیکن دنیا کو دیکھنے کا اصلی مزہ تو "بلندی" سے ہی آتا ہے۔"

اپنے مخصوص بااعتماد لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی یہاں وہ رکی اور اسے بازو سے تھامتے ہوئے اس کا رخ پھیر کر آسمان کی جانب کر دیا۔

"ان پرندوں کو غور سے دیکھو مصطفین۔۔۔ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ہماری دنیا ان کی "اڑان" اور بے انت "اختیار" کے آگے بڑی بے بس ہے۔ کوئی حد، کوئی سرحد، کوئی بندش یا رکاوٹ۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں ان کے لیے۔ یہ کس قدر آزاد ہیں اور ہم کتنے قید۔۔۔ تو کبھی کبھی ان کے ساتھ ہونے کی خواہش کرنے پر اتنا ڈر کس لیے؟ کیا فرق پڑتا ہے اگر "خواہشیں آسمانی" ہونے بھی لگیں تو؟ میں جو بھی سوچتی ہوں تم مجھے سوچنے دیا کرو۔

پلیز۔۔۔"

لہجے کے زیر و بم میں طرح طرح کی خواب بنتی وہ آخر پر گویا اس کی منت کرنے لگی اور اس کی ہر ہر بات پر حیرت در حیرت اس کا چہرہ تاکتے مصطفین نے ایک طویل سانس بھرا اور اسے متاسف نظروں کے گھیر میں رکھتے ہوئے دوبارہ رخ بدل کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی جانب مڑتی وہ بھی گویا آسمان سے لوٹ کر آئی تھی۔

"چھوڑو یہ سب تم نہیں سمجھو گی اور سمجھوں گا میں بھی نہیں۔۔۔ ہم انسان بڑے ضدی ہوتے ہیں ایمان۔۔۔ ایک بار جن پہلوؤں پر "ایمان" لے آئیں ناں۔۔۔ پھر ان میں کسی دوسرے کے افکار کی شراکت کر کے کبھی "کفر" نہیں کرتے۔ ہماری سوچیں اور ہمارے تمام تر نظریات۔۔۔ ہمارا کل کا کل "دین" بھی ہوتے ہیں۔ خیر بات لمبی ہو جائے گی۔ یہ موضوع پھر کبھی سہی۔ ابھی فقط یہی کہوں گا کہ زندگی اک کہانی ہے اور شیکسپیئر کہتا ہے کہ درحقیقت ہم سب اس کہانی میں، دنیا کے اسٹیج پر رہ کر، بس اپنا اپنا کردار نبھانے کے لیے آتے ہیں۔ تو میں یہی کہوں گا کہ کہانی میں اپنا کردار سمجھ کر صرف اس پر ایکٹ کرو۔ باقی سب بے معنی ہے۔ اپنی سوچوں کو اپنے ممکنات تک محدود رکھنا چاہیئے۔ جینا سہل ہو جاتا ہے۔"

نرم لہجے میں دھیرے دھیرے بولتے ہوئے اس نے گویا گفتگو کا "حاصل" بیان کیا اور بات کے اختتام تک اس کی آنکھوں میں در آیا تاسف کا تاثر بھی بتدریج زائل ہوتا چلا گیا۔

اور لفظ لفظ اس کی "حکایت و حکمت" کو سمجھتی ایمان کے چہرے پر عجب اسرار آن ٹھہرے۔ ایک پل کے لیے مصطفین کی گہری و ساکن آنکھوں سے نظریں ہٹا کر وہ مڑی اور سل پر دونوں ہاتھ ٹکا کر اپنا آدھا وجود کھڑکی سے باہر، سرسراتی ہوئی ہواؤں کے "سپرد" کر کے چند طویل سانس بھرے۔ پھر یوں ہوا کہ سر اٹھا کر آسمان کی وسعتوں میں جھانکتی ہوئی وہ بھید بھرے لہجے میں بولی۔

"ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے مصطفین کہ جس کہانی میں اپنا کردار پسند نہیں آئے اسے اپنے طور پر، پھر سے لکھنا چاہیئے یعنی نئے سرے سے۔ زندگی کی کہانی کا آغاز جیسے بھی ہوا کوئی بات نہیں لیکن اس کا انجام ہماری مرضی سے طے ہو تو لطف ہے۔ وہ کیا ہے ناں کہ تب جینا۔۔۔ حقیقی سہل ہوتا ہے۔"

بات مکمل کر کے، اپنے مخصوص انداز میں دائیں ابرو کی دلکش تان اٹھاتے ہوئے اس نے سوالیہ نظریں اس پر گاڑ دیں تو بغور اس کی حالت وکیفیت پر کھتے مصطفین نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے صاف صاف لگا کہ فی الوقت ایمان کو سمجھانا کارِ دارد ہے۔

کچھ کہتے کہتے چپ ہو کر، ایک سے دوسرے کاندھے پر یونیورسٹی بیگ منتقل کرتا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا اور پھر اس سے سات قدم کی دوری پر یکا یک رک گیا۔ یوں جیسے کوئی اہم بات یاد آئی ہو کہ جسے کہنے پر وہ خود کو مجبور پائے۔ جواب کی منتظر ایمان نے حیرت سے مڑ کر اسے تیزی سے جاتے دیکھا اور پھر اس کی پشت کو گھورتی اس کے رکنے پر وہ چونک گئی۔

"جن کہانیوں کے آغاز ہمارے اختیار میں نہیں ہوں ناں۔۔۔ ان کے انجام بھی ہم سے پوچھ کر طے نہیں ہونے والے۔ یہ جو اپنی کہانی خود سے لکھنے والی باتیں ہیں ناں تمہاری۔۔۔ یہ تمہارے باقی خیالات کی مانند ایک اور حسین "خیال" ہیں یا پھر کوئی "خواب" اور بس۔۔۔ سوا اس کے کچھ بھی نہیں۔ سنگین حقیقتوں سے ڈرو ایمان ورنہ یہ خوابوں کو صرف توڑتی نہیں ہیں۔۔۔ اکثر انہیں "ادھیڑ" بھی دیتی ہیں۔ چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔۔۔"

شفاف فرش پر ایڑھیوں کے بل، اس کی جانب گھوم کر وہ متوازن لہجے میں بولا اور اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر دوبارہ آگے بڑھ گیا تو اس کی بات سن کر، ماتھے پر لکیرِ فکر لیے ایک پل کو وہ ہل بھی نہ سکی۔

لیکن وہ صرف ایک پل کی بات تھی۔ اس پر یہ گپ چپ کیفیت فقط ایک ثانیے کے لیے طاری ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اپنے کمرے کا دروازہ کھول اندر داخل ہونے سے پہلے اپنی طرف دیکھتے مصطفین کو دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی اور وہ جیسے اس کی ہنسی سے چڑ کر اندر داخل ہوا۔

"پرندے پاگل ہوتے ہیں جو آسمان سے لوٹ آتے ہیں۔ میں ہوتی تو کبھی واپس نہیں آتی۔ اور اگر واپسی بہت ضروری ہوتی ناں تو اللہ کی قسم۔۔۔ ان بادلوں کے ارغوانی کناروں پر پاؤں رکھ کر میں سارا آسمان کھینچ لاتی۔"

پھر پلٹ کر اسی طرح آسمان "میں" جھانکتی وہ زیرِ لب اپنے پرانے "فرامین" دہرانے لگی۔

اس پر کسی بات کو کوئی اثر نہیں تھا۔

ہم زندگی میں اکثر ایسے مقامات سے بھی گذرتے ہیں جہاں نصیحتوں کا ہر اثر پورا پورا زائل ہونے لگتا ہے۔ ہم کسی کی نہیں سنتے ناں ہی مانتے ہیں۔ اپنی "دھنوں" پر مستی سے تھرکتا کوئی بھی گائیک...... کسی غیر کے بول گنگنانا پسند نہیں کرتا۔ کون کہاں کتنا سچا ہوتا ہے؟؟ یا کس کی بات کہاں کتنی وزن دار تھی؟؟ یہ صرف وقت ثابت کرسکتا ہے اور وہ "خوب خوب" کرتا ہے۔

☆......☆......☆

کھانے کی میز پر "ساری" خیریت گذری۔ پھوپھو نے کوئی ذکر چھیڑا نہ فواد نے کوئی بے تکی بات کی۔ اور نمرہ کو یقین تھا کہ پھوپھو نے کسی مصلحت کے تحت اسے خاموشی اختیار کیے رکھنے کا حکم دیا ہے ورنہ وہ کوئی بات کیے بنا نہیں رہ سکتا۔ کھانے کے بعد ان سب کی ایک چھوٹی سی نشست ہوئی جس میں وہ ماں بیٹیاں بہت کم بولیں جبکہ شہوار بیگم اور ان کے سپوت نے پوری خاندان کا کوئی بخیہ ادھیڑے بنا نہیں چھوڑا۔ ان کے پاس ہر کسی کے متعلق طرح طرح کی "اندر کی باتیں" تھیں جنہیں سن سن کر وہ تینوں جہانِ تحیر میں ڈوبتی رہیں جبکہ شاہجہان عادل کہیں کہیں کوئی ایک آدھ "ٹکڑا" لگا کر اس "گفتگو" میں باقاعدہ "شریک" ہوتے رہے۔

پھر مہمانوں کے سفر کی تھکان کا خیال کرتے ہوئے انہیں تھوڑی دیر آرام کا مشورہ دے کر یہ نشست برخاست کر دی گئی۔ من ہی من اندر صد شکر بجا لاتیں وہ دونوں خاموشی سے آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آئیں اور کمرے میں داخل ہو کر نمرہ نے دروازہ کو کنڈی کر کے بیڈ کے پائے سے لگی کھڑی ثومیہ کو دیکھا۔ ایک پل کے لیے دونوں کی نظریں ملیں اور پھر ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ نمرہ تیزی سے اس کے قریب آئی اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے دوران ہنسی بولی۔

"یار میں لاہور میں رہ کر یہاں کے رشتہ داروں کے متعلق اتنا علم نہیں رکھتی جتنا یہ پھوپھو لوگ دور رہ کر ان سے واقف ہیں۔ کون سی ایسی بات ہے کسی کے متعلق جو ان کو نہیں پتا؟؟ اللہ میں تو بڑی حیران ہوں۔"

"ہاہاہا۔۔۔ یہی تو۔۔۔ یہی تو میں بھی حیران ہوں یار۔ اور وہ فواد صاحب کی گوہر افشانیاں بھی سنی ہیں ناں سب کے بارے میں؟ قسم سے جانے کس زعم میں مبتلاء ہے یہ بندہ۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ گردانتا ہی

نہیں۔ اسے سرکاری نوکری کیا ملی ہے باقی سارے کزنز نکمے، ویلے اور مسٹنڈے ہو گئے ہیں۔"

ثومیہ نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کے ساتھ جھولتے ہوئے تبصرہ کیا تو نمرہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی تائید کرنے لگی۔

"اور ہنستا کتنا فضول اور بے موقع و محل ہے۔ بے وجہ چڑا دیتا ہے اگلے بندے کو۔ اب اس نے خواہ مخواہ دانت دیکھائے ناں تو قسم سے میں اس کی بتیسی نکال کر پھوپھو کے ہاتھ پر دھر دوں گی۔۔۔"

اس کی اگلی بات سن کر نمرہ لوٹ پوٹ ہوئی اور پھر آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کمال معصومیت سے سوال کیا۔

"وہ تمہیں "اتنا" برا لگتا ہے آپی؟؟"

اور اس کی شرارت کو سمجھتے ہوئے ایک پل کو تھم کر اسے دیکھتی وہ یہ کہتے ہوئے دھم سے بیڈ پر گری۔

"اس سے کہیں زیادہ برا لگتا ہے یار۔۔۔ بیان سے باہر کی بات ہے۔ بس سمجھو کہ ناپسندیدگی کی اگر کوئی حد ہے تو اس سے پار کا قصہ ہو گا یہ۔۔۔"

بات کے اختتام پر بیڈ کے سیدھی طرف سے تکیہ اٹھا وہ الٹی جانب سر کے نیچے رکھتے ہوئے لیٹ گئی۔ ہنسی روک کر وہ بتدریج سنجیدہ ہو گئی۔

"اففف۔۔۔ قسم سے آپی ایسا ہی عالم ادھر بھی ہے۔"

نمرہ گھوم کر دوسری طرف سے آئی اور اسی کے انداز میں اس کے ساتھ لیٹ کر اس کی جانب کروٹ لی۔

ثومیہ نے چھت کے پنکھے سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف گردن موڑی اور سنجیدگی سے بولی۔

"مذاق سب ایک طرف نمرہ۔۔۔ دعا کرو پھوپھو ٹل جائیں کسی طرح۔ ان کی "خوش اخلاقی" دیکھ رہی ہو ناں؟؟ وہ کب تھیں ایسی یار؟؟ ان کا یہ "بے پناہ پیار" ان کے "خطرناک ارادوں" پر دلالت کرتا ہے میری جان۔ یہ جانور ذبح کرنے سے پہلے قصائی کے جانور کو پانی پلانے جیسی لگاوٹ لگتی ہے مجھے۔ اس سے زیادہ اس محبت پر بھروسہ نہیں کر سکتی میں۔"

اس کے متفکر لہجے میں طرح طرح کے اندیشے کلبلا رہے تھے۔

نمرہ جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہمم۔۔۔ بالکل صحیح کہتی ہو تم۔ یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے کہ پھوپھو ضرورت سے زیادہ اچھی "ہو" رہی ہیں۔ وگرنہ پہلے تو ہرگز ایسی شفقت نہیں جاگی کبھی ہمارے لیے۔ آج تو کوئی طنز تضحیک بھی نہیں کی۔ نہ ہی بابا کے سامنے کوئی شکایتی انداز اپنایا ہے۔ یوں بی ہیو کر رہی ہیں جیسے ان سب کا پتا ہی نہ ہو کہ یہ سب کیا ہوتا ہے؟ فواد گو کہ زیادہ نہیں بدلا لیکن فرق بہرحال ہے۔ یا اللہ۔۔۔ تو مدد کر۔ نجات دینا ہمیں ان بے وقت لگاوٹوں سے۔۔۔ آمین۔"

اس کی تائید میں اس نے کئی "ٹکڑے" جوڑے اور آخر پر ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ دعا کی تو اس کی ہر بات پر تفہیمی انداز میں سر ہلاتی ثومیہ نے بے ساختہ اور با آواز بلند "ثمہ آمین" کہا۔ لیکن وہ مزید کچھ بھی نہیں بولی تو اس کی کشادہ پیشانی پر ابھری فکر کی لکیریں اور شفاف آنکھوں میں در آیا نا معلوم رنج پڑھتی نمرہ چپ چاپ اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ فی الوقت ان دونوں کے پاس، دل میں ابھرتے اور خیالوں میں سرسراتے ہوئے اندیشوں کے سوا نہیں بچا۔

زندگی اکثر اس مقام پر لے آتی ہے کہ ہمیں گفتگو کا ہر پہلو ادھورا اور تمام تر باتیں بے معنی لگنے لگتی ہیں۔ پھر خامشی کو حرف گر مان کر ہم دل ہی دل میں خود سے وہ وہ باتیں کرتے ہیں کہ بالآخر تھکنے لگتے ہیں۔

ان دونوں کے مابین رقصاں خاموشی بھی بہت "معنی خیز" تھی۔۔۔

بڑی "گفتگوئیں" تھیں اس میں۔۔۔

اور بلا کی "حرف گری" بھی۔۔۔

☆......☆......☆

اس روز لاہور ریلوے اسٹیشن پر گیتی کا فلم شوٹ تقریباً رات سات بجے تمام ہوا۔ وسیع آسمان کے لامحدود سینے پر پوری تاب سے سجے چودھویں کے چاند اور اس کے گرد اگرد ٹمٹماتے ان گنت ستاروں نے مکمل اندھیرا نہیں ہونے دیا۔ ان کی نرم چاندنی میں بھیگتا ہر ہر منظر نکھر نکھر کر واضح ہونے لگا۔ گیتی کے لیے مخصوص کردہ وینٹی وین میں ان دونوں نے اپنا لباس تبدیل کیا اور شوٹنگ سے سیدھا اس نجی ٹی وی چینل کے ہیڈ آفس جانے کے لیے تیار ہوئیں جہاں ممتاز محمود کے شو کا سیٹ اپ تھا۔ روانگی سے قبل گیتی نے کچھ دیر یہاں اپنے فینز اور

میڈیا کے روبرو ہو کر تھوڑی چٹ چیٹ بھی کرنا تھی کیونکہ یہ ایک فلم پبلسٹی سیشن بھی تھا اور اس کے فینز نے اس کا طویل ترانتظار بھی کیا تھا تو وہ اخلاقی طور پر اپنا فرض سمجھتی تھی کہ اب ان سے براہ راست ملا جائے۔ طے یہ پایا کہ سیکیورٹی کے سخت ترین حصار میں اسے ریلوے اسٹیشن کے وسیع احاطے میں عارضی طور پر تیار کیے گئے ایک خوبصورت اسٹیج پر لایا جائے گا جہاں وہ پبلک سے مناسب فاصلے پر رہ کر میڈیا پیپل کے "خدا کے بھگت" سے متعلقہ سوالات کے جوابات دے گی اور یوں اس کے فینز اس کو اپنے بالکل سامنے دیکھ سکیں گے۔ وہ تیار ہو کر وینٹی وین سے باہر آئیں تو رفیق نواز سمیت اس کی سیکیورٹی پر معمور سارے پولیس اہلکار اس کا حسن نوخیز دیکھ کر ایک پل کو ساکت ہو گئے۔ اس نے لال رنگ کی خوبصورت بنارسی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس سے جھلکتی اس کی نازک گلال رنگ کمر نرالی چھب سے لچک رہی تھی۔ اس کے حسین و دلنشین چہرے پر عجب چاشنیوں کا عکس ہلکورے لے رہا تھا تو اس کی چمکتی ہوئی کانچ سی آنکھوں میں ایسی شافیت اور ایسا سکون موجزن تھا کہ گویا اس نے صدیوں کسی مسرور کن کیفیت میں رہنے کے بعد صرف اس منظر میں آنکھیں کھولی ہوں۔ اس کے شانوں پر ڈھلکتا ساڑھی کا پلو اس کے سرخ و سفید بازوؤں کو چھو کر ہواؤں میں اس کا عطر پھونک رہا تھا تو ہوائیں بھی کسی مشاطہ کی مانند اس کے ریشمی بالوں سے خوشبوئیں چرا چرا کر پورے میں پھیلا رہی تھیں۔ وہ یوں اعتماد سے قدم اٹھا رہی تھی گویا کسی نرمیلے رتھ پر رہ کر قریہ قریہ گھوم رہی ہو۔ اس کے جلوے سے ساکت ہوئے سارے اہلکار اس کی خوشبوؤں کا ادراک پا کر چونکے اور پھر جیسے ہوش میں آتے ہوئے تیزی سے اس کے قریب آ گئے۔ رفیق نواز بھی آہستہ آہستہ چل کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ کیونکہ سارا شیڈول طے شدہ تھا لہٰذا کسی قسم کی گفتگو کے بنا وہ لوگ ایک چھوٹے سے قافلے کی مانند اسٹیشن کے ریل ٹریک ایریا سے نکل کر بیرونی داخلی احاطے کی جانب بڑھنے لگے۔

" گیت میں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ زیادہ لمبی بات نہ کرنا۔ بس تھوڑی بہت جو ضروری ہو صرف وہی کرنا۔ اوکے؟؟"

وہ کھلے برآمدے (جسے مسافر خانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا) میں داخل ہوئیں تو ناز نے اس کا بازو تھام کر تنبیہی لہجے میں کہا۔

"اچھا۔۔۔ فکرمت کرو۔ میں خیال کروں گی۔"

اس نے "اچھا" پرزور دے کر مسکراتے ہوئے تسلی دی تو مطمئن ہو کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسی وقت ان سے چند قدم پیچھے چلتا رفیق نواز تیز قدموں سے چل کر ان کی ہمراہی میں آیا۔

"گیتی میڈم ایک خصوصی عرض ہے جو پہلے مجھے یاد نہیں رہا کہنا کہ فلم کی سائننگ اماؤنٹ کے متعلق کوئی سوال ہو تو اس کا ابہامی جواب دیجیئے گا۔اس سے ہماری باؤنڈنگ اینڈ ہیلتھی ریلیشن شپ کا تاثر مضبوط ہوگا۔"

دھیمی آواز میں اس نے مدعا بیان کیا تو وہ فرمانبرداری سے بولی۔

"جی بہتر سر۔ میں سمجھتی ہوں یہ بات کہ اس میڈیا ٹاک سے ہمیں اپنی فلم کی تشہیر کرنی ہے۔۔۔اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ سسپنس پھیلانا ہے اور بس۔ ڈونٹ وری۔ میں ہینڈل کرلوں گی۔"

اس کا بااعتماد لہجہ اور دلکش انداز دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرایا اور پھر "بالکل یہی۔۔۔ ویری گڈ۔" کہتا ہوا ان سے آگے جا کر اسٹیج پر موجود سپاٹ بوائز کو جگہ خالی کرنے کا کہنے لگا۔

اس دوران وہ لوگ اسٹیج کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ گیتی کو دیکھ کر مداحوں نے چیخیں اور سیٹیاں مار مار کر گویا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ احاطے میں پہلا قدم دھرتے ہی وہ کیمروں کی تیز روشنیوں اور فلیشز کی زد میں آ گئی تھی۔ دو زینے چڑھ کر اس نے سٹیج پر پہلا قدم دھرا اور مسکراتے ہوئے سب کی جانب جوش سے ہاتھ ہلانے لگی۔ چونکہ انہیں یہاں انتہائی مختصر گفتگو کرنا تھا لہٰذا اس میڈیا پریزینٹیشن میں سٹیج پر بیٹھنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ انہیں کھڑے رہ کر بات چیت کرنا تھی۔

رفیق نواز نے ان دونوں کو سٹیج کے درمیان میں آنے کا کہا اور آگے بڑھ کر ایک سٹیج آرگنائزر لڑکے سے وائرلیس مائیک لیتے ہوئے اسے نیچے جانے کو کہا۔ وہ لڑکا سٹیج سے اترا تو وقت ضائع کیے بنا، سب رپورٹرز کو مخاطب کر کے اس نے اس میڈیا سیشن کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔

"السلام وعلیکم۔۔۔ ودان سیکنڈز میں گیتی میڈم کو مائیک دے رہا ہوں۔ اس سے پہلے بس ایک گزارش ہے۔ جیسا کہ آپ سب کو علم ہے کہ یہ میڈیا ٹاک صرف "خدا کے بھگت" سے متعلق ہے لہٰذا کوشش کیجیئے گا کہ میڈم سے کوئی ذاتی سوال نہیں ہو یعنی پرسنل انٹرویو قسم کا۔ ویسے بھی آج کچھ دیر بعد "ممتاز محمود" کے ساتھ لائیو

پروگرام میں ان کا "exclusive" انٹرویو ہو رہا ہے۔ وہاں ایسے بہت سے سوالات ہوں گے جن سے آپ کو بھی تسلی بخش اور تفصیلی جوابات ملیں گے میڈم کے بارے میں۔ فی الوقت سارے سوالات صرف فلم اور اس کی شوٹنگ سے متعلقہ امور پر ہونے چاہئیں۔ یعنی آپ پاکستان میں ان کے قیام اور عکسبندی کے دوران ہوئے ان کے مختلف تجربات کا پوچھ سکتے ہیں۔ اور ہاں۔۔۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہماری اس بات کا احترام کیا جائے گا۔ شکریہ۔ اب آپ لوگ باری باری سوال کر سکتے ہیں۔"

اس نے میڈیا کنسرنز کے لیے مخصوص ٹون میں دوٹوک انداز اپناتے ہوئے بات مکمل کی اور بنا تاخیر کے مائیک گیتی کی جانب بڑھا دیا۔ رپورٹرز نے "جی بہتر" کہہ کر اور بعض نے فقط اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی بات کو سمجھنے کا اشارہ دیا اور خوشدلی سے مسکراتے ہوئے گیتی کی جانب متوجہ ہوئے جس نے دونوں ہاتھوں کے مابین مائیک تھام کر، بھارتی انداز میں "نمستے" کہتے ہوئے انہیں جھک کر تعظیم دی تھی۔

اس کے یہ انداز اپنانے کی دیر تھی کہ تھوڑے فاصلے پر سیکیورٹی حصار کے دوسری جانب موجود اس کے مداح ایک بار پھر سے چیخ چیخ کر پاگل ہونے لگے۔ گیتی نے ایک دلآویز مسکراہٹ اچھال کر سر اچک کر قدرے اندھیرے میں کھڑے اس ہجوم کو دیکھنے کی کوشش کی اور پھر واپس فوٹو گرافرز اور رپورٹرز کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں بہت بھاگیہ شالی ہوں کہ آپ سب کا پیار ملا۔ میں اپنے بھگوان اور آپ کے خدا کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہوگا کہ اس نے مجھے اتنی محبتوں سے نوازا ہے۔ آپ سب کا بہت شکریہ۔ بہت دھنے واد۔ یہ پیار کسی بھینٹ یا اپکار کے اوتار سے کم نہیں ہے میرے لیے۔"

ہجوم کے شور کا جواب اس نے آن کیمرہ دیا اور پھر میڈیا کے سوالات کی منتظر ہوئی۔ اس کی بات پر ناز اور رفیق نواز مسرت و حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بغور اسے دیکھتے رہے۔ پاکستان آمد کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے ہندی الفاظ بولے یا بھارتی انداز اپنایا تھا۔ یقیناً وہ اس وقت اپنے دیش، اپنی ثقافت اور زبان کی نمائندگی کر رہی تھی۔ ناز کو اس کی سمجھداری پر بے پناہ پیار آیا۔

ادھر اس کے "میں اپنے بھگوان اور آپ کے خدا" کہنے پر ماحول میں چند ثانیے کے لیے چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور پھر ایک صحافی نے ہاتھ اٹھا کر سوال کرنے کی اجازت پائی اور شائستہ لہجے میں بولا۔

"سب سے پہلے تو پاکستان میں خوش آمدید میم۔ یہ بتایئے گا پلیز کہ کسی پاکستانی فلم میں کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟ کیا اور کتنا فرق پایا آپ نے لالی وڈ اور بالی وڈ کے ماحول میں؟؟"

گیتی کے لیے یہ عام سا سوال تھا جو ایک سے دوسری فلم کی سائننگ اینڈ شوٹنگ سٹارٹ ہونے پر اور اکثر ڈائریکٹرز کے بدلنے پر بھی کیا جاتا تھا۔

"شکریہ محترم۔۔۔ پاکستان میں کام کا تجربہ بہت خوشگوار رہا ہے۔ مجھے بہت لطف آیا یہاں کام کر کے۔ اور بالی وڈ ہو یا لالی وڈ۔۔۔ کام کا پیٹرن، شوٹنگ اسپاٹس، ساتھیوں کا میزازم، سیٹس کی رونق یا ھوھا کار۔۔۔ سب ایک سا ہوتا ہے۔ مجھے سچ میں کوئی فرق نہیں لگا دونوں انڈسٹریز میں۔ زبان و بیاں کا فرق ہے صرف ورنہ دونوں جگہیں ایک جیسی ہیں۔"

اس نے مخصوص پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے اعتماد سے کہا۔ تبھی بنا کسی توقف کے دوسرے صحافی نے سوال داغا۔

"تو گویا آپ پاکستان فلم انڈسٹری کو بھارتی فلم انڈسٹری کے لیول کی قرار دیتی ہیں؟؟"

اس سوال پر ناز نے چونک کر گیتی کی طرف دیکھا۔ اسے اس صحافی کے لہجہ کچھ اکساتا ہوا سا لگا لیکن گیتی کے لیے یہ بھی کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ عموماً ہر صحافی اسی لب ولہجہ کا مالک ہوتا ہے۔

گیتی نے ایک ادا سے شانوں پر جھولتے اپنے لمبے بالوں کو پکڑ کر پیچھے کمر پر جھٹکا اور دو ریشمی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑس کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ میرے خیال سے دونوں انڈسٹریز کا تقابل نہیں بنتا۔ کیونکہ بالی وڈ میں فلم میکنگ کی اتنی باؤنڈنگز نہیں ہیں جتنا ایک اسلامی ملک ہونے کے ناطے لالی وڈ پر ہیں۔ پھر بھی اگر آپ پوچھیں تو میرے خیال سے پاکستان فلم انڈسٹری کا اب تک کا بنیادی موضوع صرف معاشرت رہا ہے جبکہ بھارتی انڈسٹری سائنسی تحقیقات تک کو چھو رہی ہے۔ ہماری بھارتی فلم سینما مارکیٹ یہاں کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔ فلم میکرز، ڈسٹری بیوٹرز اور دیگر فلمی شعبوں سے جڑے لوگ زیادہ تجربہ کار اور شارپ ہیں۔ ایک سال میں ریلیز ہونے والی فلموں کی تعداد زیادہ ہے۔ ہماری انڈسٹری زیادہ لوگوں کو روزگار مہیا کر رہی ہے۔ پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز، اور ان کے

اسسٹنٹس سے لے کر کیمرا مین، لائٹ مین، الیکٹریشنز، ٹیکنیشنز، حتیٰ کہ سپاٹ بوائز اور دیگر لیبر تک کے مسائل سے متعلقہ ایسوسی ایشنز موجود ہیں جو کہ پراپر ورکنگ کنڈیشن میں ہیں۔ یعنی ان تک کوئی اپنے مسائل لے کر جائے تو اس کی شنید ہو کر باقاعدہ دادرسی کی جاتی ہے۔ یہاں ایسی ایسوسی ایشنز اول تو کوئی ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں بھی تو فعال نہیں ہیں۔ ان سب فیکٹس کو مدنظر رکھا جائے تو بالی وڈ یہاں سے کہیں آگے ہے۔"

نہایت اعتماد سے کیا گیا اس کا مدلل اور تفصیلی تجزیہ سن کر وہاں موجود ہر شخص اس کی گہری نگاہ اور تجربہ کاری کا قائل ہوا اور اس دوران ناز فخر وانبساط کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ لگاتار اسے دیکھتی رہی۔ اس نے شکر کیا تھا کہ گیتی نے حقائق بیان کیے ورنہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ پاکستان سے اپنی اندھی عقیدت کی بدولت دونوں انڈسٹریز کو ایک لیول کا قرار دے دیتی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ ناز کو اس سے یہی توقع تھی۔

" گیتی جی خدا کے بھگت میں اپنے کردار کے حوالے سے بتائیں کہ اس کردار میں ایسا کیا تھا کہ آپ نے بالی وڈ کی ساری مصروفیت ترک کر کے اپنا شیڈول تک دوبارہ مرتب کیا اور اس فلم کو ترجیحی بنیادوں پر وقت دیا؟؟"

کسی صحافی کے اگلے سوال پر باوقار انداز میں چلتی وہ سٹیج کے بالکل آخری سرے پر جا رکی اور پہلی بار کچھ سوچ کر تھوڑا توقف سے گویا ہوئی۔

"ویل۔۔۔ خدا کے بھگت کی سائننگ کی سب سے مضبوط وجہ اس کی بہترین کہانی تھی۔ ول یو بیلیو دیٹ اس کا اسکرپٹ اس قدر شاندار اور جاندار ہے کہ میں نے ایک ہی رات میں سارا پڑھ لیا تھا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کہانی "خدا" اور اس کے اس "بندے" کے درمیان تعلق کی کہانی ہے جس کو "ہندو" ہونے کی وجہ سے "بھگت" کا نام دیا گیا ہے۔ رفیق سر نے پہلی ترجیح مجھے رکھ کر خاص میرے لیے یہ کردار لکھوایا اور اس کے میز ازم اور اسکوپ نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں انہیں انکار نہیں کر سکی۔ ابھی کہانی کو کھولا نہیں جا سکتا لیکن میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ منفرد فلم اور اس کی اچھوتی کہانی ہر کسی کو بے تحاشا پسند آنے والی ہے۔ صرف لفاظی نہیں کر رہی بلکہ مجھے واقعی لگتا ہے کہ میری زندگی کا اب تک کا سب سے بہترین کردار نبھایا ہے میں نے "خدا کے بھگت" میں۔۔۔"

ٹھہر ٹھہر کر، باری باری سب کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے تفصیلی جواب دیا اور اپنے بیان سے فلم کے متعلق سسپنس بڑھا کر واپس اپنی پہلی جگہ پر آن کھڑی ہوئی۔ اس کے جواب پر فضا بے شمار تالیوں کے شور سے گونج اٹھی اور ہجوم نے سیٹیاں مار مار کر گیتی کے لیے اپنے جوش و ولولہ کا اظہار کیا۔

اس کے بعد اگلے سارے سوالات میں اس نے عام میڈیا ٹاکس کی مانند فلم کی خوبصورتی سے تشہیر کی اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں پاکستانیوں کے لیے بے پناہ محبتوں کا اظہار کیا۔ تقریباً چالیس منٹ کے دورانیے پر محیط اس میڈیا سیشن میں گیتی کے بعد کچھ دیر رفیق نواز نے بھی فلم سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی اور آخر پر میڈیا کے سامنے ایک بار پھر گیتی کا اس فلم کو قبول کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ پھر گیتی کی سیکرٹری اور دوست کے طور پر ناز کا تعارف کرواتے ہوئے اسے عزت دی گئی اور سب کو الوداع کہہ دیا گیا۔

گیتی نے اپنے بہترین اسلوبِ بیان، توبہ شکن اداؤں، نرم رویے اور دلکش ہنسی سے ایک بار پھر کئی دلوں کو جکڑ لیا تھا۔

وہ تینوں ایک ایک کر کے آگے پیچھے سٹیج سے اتر ہی رہے تھے کہ حفاظتی حصار کے پار کھڑے ہجوم میں بے پناہ ہلچل ہوئی۔ یوں شور بلند ہوا جیسے کئی لوگ مسلسل ایک دوسرے سے بحث کر رہے ہوں۔ میڈیا کنسرنز کے ساتھ ساتھ وہ تینوں بھی چونک کر بے ساختہ رکے اور قدرے اندھیرے میں کھڑے باہم اونچا اونچا بولتے افراد کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن کیمروں کے تیز فلیشز سے پھوٹتی روشنیوں کی چکا چوند سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور انہیں وہ منظر ٹھیک سے نظر نہیں آیا۔

سیٹس پر ایسا ماحول بننا کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن پاکستان میں ہونے کی وجہ سے گیتی یہاں کے چھوٹے سے چھوٹے واقعے پر بھی خصوصی دھیان دیتی تھی۔ اسے تجسس ہوتا تھا کہ لوگ اس کے رویے سے اس کے بارے میں کیسی رائے قائم کرتے ہیں؟

اسی دوران ایک پولیس اہلکار بھاگتا ہوا سٹیج کی طرف آیا تو اس کے کچھ کہنے سے پیشتر رفیق نواز نے سوال کیا۔

"یہ شور کیسا ہے؟ کیا ہوا؟ اینی سیریس پرابلم؟؟"

اس کا لہجہ انتہائی متفکر تھا۔

"جی سر خیریت ہے۔ تین لڑکیاں ہیں اور بضد ہیں کہ گیتی میڈم کو پیغام دیا جائے کہ وہ ان سے ملنا چاہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے میڈم ان کو ذاتی طور پر جانتی ہیں۔"

"کیا؟؟ لیکن گیتی تو یہاں کسی کو نہیں جانتیں۔ یہ کون ہیں بھئی؟؟"

اس نے ہانپتے ہوئے بات پوری کی تھی کہ رفیق نواز اچھنبے سے بول اٹھا۔ ناز اور گیت نے بھی تحیر آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور پھر نا سمجھی کے عالم میں شانے جھٹک دیئے۔

اس دوران دو تین رپورٹرز بھی ان لڑکیوں تک جا پہنچے تو رفیق نواز نے گیتی کی طرف دیکھا۔

"کیا کہتی ہیں گیتی جی؟ ملنا ہے؟؟"

اس نے بنا توقف کے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "جی بلایئے ان کو یہیں سب کے سامنے ملتی ہوں۔ اسی بہانے فلم کا تھوڑا سا پروموشن اور سہی۔"

ناز نے اب کی بار کچھ کہنا چاہا لیکن گیتی نے اس کی کلائی دبا کر روک دیا اور واپس سٹیج کے وسط میں جا رکی۔ رپورٹرز نے بند ہوتے کیمرے پھر سے آن کر لیے۔

وہ پولیس اہلکار بھاگا بھاگا گیا اور ان تینوں لڑکیوں کو ساتھ لے آیا۔ جونہی وہ کیمروں کی روشنی کی زد میں آئیں ایک پل کو تھم کر انہیں پہچاننے کی کوشش کرتی گیتی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ وہ انہیں پہچان گئی تھی۔ وہ مری جی-پی-او کے داخلی چبوترے پر ملنے والی وہی لڑکیاں تھیں جنہیں گیت نے گلے لگایا تھا اور اپنے ہاں انڈیا آنے کی باقاعدہ دعوت بھی دی تھی۔ اب انہیں یہاں دیکھ کر وہ واقعی بہت خوش ہوئی۔ ان مداح لڑکیوں سے دوبارہ ملنا اس کے لیے یہ ایک حسین اتفاق سے کم نہیں تھا۔ وہ تیزی سے نیچے اتری اور جا کر باری باری انہیں گلے لگانے لگی۔

"ارے واہ۔۔۔ بھئی آپ لوگ یہاں؟؟ واؤ۔۔۔ فیلنگ ریئلی گڈ ٹو سی یو پیپل اگین۔۔۔ آ جاؤ، آ جاؤ اوپر سب سے ملواتی ہوں۔"

اسی لڑکی کو بازو کو کھینچتے ہوئے اس نے اوپر سٹیج پر لے جانا چاہا جو اس دن اس سے گفتگو کرنے میں پیش پیش

رہی تھی۔ وہ سب پہچان لیے جانے پر اور اتنی بڑی اسٹار سے اتنا زیادہ پروٹوکول پانے پر بہت زیادہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قدر حیران بھی دکھائی دیں۔

"نہیں۔۔۔ رکیں گیتی پلیز۔۔۔ اس سب کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے بس سنا کہ آپ ہمارے شہر آ رہی ہیں تو یونہی ملنے چلی آئیں کہ شاید آپ کو ہم اب بھی یاد ہوں۔"

نفی میں سر ہلاتی وہ سٹیج پر جانے سے گریزاں ہوئی تو اس نے پلٹ کر نہایت محبت سے اس کے گال چھوئے۔

"یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں آپ سب کو گلے لگا کر بھی بھول جاتی۔ بھئی میں تو آپ کی خوشبوئیں سانسوں میں بسا لائی تھی۔ پلیز کم۔۔۔ اٹس مائی پلیئر۔"

اس کی کانچ سی آنکھوں میں جھانک کر چاہتوں کے حصار پھونکتی وہ سحر گر لہجے میں بولی تو اس کی باتوں سے مسرور ہوئی وہ گویا ان کے حصار میں بندھ کر چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگی۔

تمام میڈیا نمائندگان نے اس سارے واقعے کی بھرپور کوریج کی تھی۔ سارے انٹرٹینمنٹ چینلز پر یہ خبر بریکنگ نیوز کے طور پر لائیو وڈیو کے ساتھ نشر ہو رہی تھی کہ "بھارتی سپر اسٹار گیتی پریس میٹنگ کے دوران خود سے ملنے پر مصر ہوئی اپنی تین مداحوں سے ملاقات کر رہی ہیں۔"

انہیں سٹیج پر لا کر اس نے مائیک تھاما اور خوشگواریت سے سب کو مخاطب کیا۔

"میں آپ سب سے ایک بات شیئر کرنا چاہوں گی کہ پاکستان میں مجھے بے تحاشا عزت سے نوازا گیا ہے۔ یہ تینوں میری مداح نہیں بہت اچھی دوستیں ہیں۔ انہیں جب بھی ملی ہوں بہت پیار ملا ان سے۔ میں آپ سب کی ذریعے اس دیس کے ہر باسی کی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ چاہتیں لٹائیں مجھ پر۔۔۔"

اب دھیرے دھیرے بولتی وہ پاکستانی عوام پر محبتیں نچھاور کر رہی تھی اور اس کی ہر ہر بات پر بے چینی سے پہلو بدلتی ناز کا دل طرح طرح کے اندیشوں سے لرزنے لگا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بھارتی انتہا پسند تنظیمیں اس کے ان "بیانات" پر گرفت کرسکتی ہیں۔ اسے لگا اب تک بالکل ٹھیک چلنے والی یہ پبلسٹی مہم اپنے اختتام پر بالکل خراب ہو رہی ہے۔ جبکہ گیتی کی ہر بات پر رفیق نواز کا چہرہ خوشی سے کھلتا چلا جا رہا تھا۔ عوام کی سیٹیوں، تالیوں

اور گیتی کے نام کی مسلسل پکاروں کو سنتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ گیتی کا یہ انتہائی مثبت اور پیار بھرا رویہ اس کی فلم کے بہت حق میں جائے گا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ فلم کے حق میں جاتا یہ رویہ بذات خود گیتی کے کس قدر خلاف جا رہا ہے۔ وہ انجانے میں ہی سہی لیکن کئی دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے رہی تھی۔

کسی آگ کی بے شمار لپٹیں تھیں جو تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

پاکستانی میڈیا اس سے بہت خوش تھا اور ٹی وی چینلز پر اس کے بارے میں کئی تحسین آمیز شہہ سرخیاں چلائی جا رہی تھیں جن میں۔۔۔

"بھارتی اداکارہ گیتی نے دوسری بار خود سے ملنے والی تین پاکستانی مداحوں کو اپنی "دوست" بنا لیا۔۔۔"

اور "بھارتی سپر اسٹار گیتی کی عام پاکستانیوں سے بے پناہ لگاوٹیں پاکستانی مغرور اداکاراؤں کے لیے ایک مثال ہیں۔۔۔" وغیرہ وغیرہ سرفہرست تھیں۔

دوسری طرف لاہور ریلوے اسٹیشن سے دور، سٹوڈیو سے منسلک ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنے "خصوصی شو" کے لیے گیتی کی آمد کے منتظر "ممتاز محمود" نے بھی اس کی اس پریس میٹنگ کا اک ایک جز بغور دیکھا۔ گاہے بگاہے دیوار گیر ایل-ای-ڈی سکرین سے نگاہ ہٹا کر وہ سامنے دھرے کاغذ پر مختلف نکات بھی لکھتا رہا۔ پھر اس میڈیا سیشن کے اختتام پر اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر سکرین آف کی اور پیشانی پر فکر کی لکیریں لیے، اس کاغذ پر درج شدہ نکات کو بغور پڑھتا کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ یکا یک اس کے لبوں پر پھیلتی ایک پراسرار مسکراہٹ نے اس کے چہرے کی سنجیدگی کو پاٹ دیا۔

اسے گیتی کو "دام" میں لانے کا سرا مل رہا تھا۔

وہ صوفے سے اٹھ کر شو کی تیاریاں چیک کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلنے لگا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ جھک کر میز سے موبائل اٹھاتا وہ بے ساختہ چونک گیا۔ یہ ایک "انٹرنیٹ کال" تھی۔ سکرین پر آٹھ ہندسوں پر مشتمل "بظاہر" کوئی انجان نمبر جگمگا رہا تھا جو اس کے لیے بہرحال انجان نہیں تھا۔ کچھ نمبرز کو وہ "save" نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ کچھ نمبرز کو وہ "save" نہیں کر سکتا تھا۔

"ہوں۔۔۔"

موبائل کان سے لگا کر اس نے بس ہنکارا ابھرا۔ یہ کوئی مخصوص اشارہ تھا۔

"پیامِ محبت کی قاصدی کرتی اس سفید کبوتری کے سارے پر زخمی کر دو۔ اسے اب اور نہیں اڑنے دینا۔"

دوسری طرف سے حکمیہ لہجے میں زہر خند پیغام دیا گیا تو اس نے دوبارہ "ہوں۔۔۔" کہہ کر فون کاٹ دیا۔اور پھر اس کے خوبصورت چہرے پر بے پناہ شیطانیت کا عکس نمودار ہوا۔

☆......☆......☆

وہ سب رات کے کھانے پر ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے "خوش گپیوں" میں مگن تھے۔ ان خوش گپیوں میں شہوار پھوپھو، ان کے بیٹے فواد، اور شاہجہان عادل کے مابین ہوتا خاندان کے مختلف افراد کا "ذکرِ خیر" شامل تھا۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں کبھی ایک دوسرے کی اور کبھی ان سب کی شکلیں دیکھتی ہوئی چپ چاپ کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کے پاس ہمیشہ سے ایسے "موضوعات" پر خاموشی اختیار کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں فواد گاہے بگاہے ثومیہ کی طرف دیکھ کر ایک "چغدسی" اور انتہائی "غیر ضروری" مسکراہٹ ضرور اچھال دیتا تھا جبکہ اس نے ہر گز اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ پھوپھو نے اب تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ جس سے ان کی اس "غیر معمولی" اور "غیر متوقع" خوش اخلاقی کا بھید کھلے۔ اور اسی بات نے بے چینی سے پہلو بدلتی ان دونوں بہنوں کو کب سے سولی پر "ٹانگ" رکھا تھا کہ اس معاملے میں وہ اب تک خاموش کیوں ہیں؟؟؟ وہ چاہتی تھیں کہ جو بھی بات ہونی ہے وہ جلد از جلد ہوتا کہ اس بات کے نتیجے میں پیدا ہوئے حالات کے مطابق اپنا ردعمل اور رویہ طے کیا جا سکے۔

کافی طویل "گفتگو" کے بعد جب کھانا اختتام کے قریب پہنچا تو راشدہ بیگم یہ کہتی ہوئی اٹھنے لگیں۔

"آپ سب کھانا ختم کریں۔ میں تب تک چائے بنا لاتی ہوں۔ تم برتن سمیٹ لانا بچیو کچن میں۔ اوکے؟"

ان دونوں نے فرمانبرداری سے "جی اچھا" کہنا چاہا کہ اسی وقت شاہجہان عادل سے کچھ کہتی کہتی شہوار بیگم نے رک کر، جلدی سے راشدہ بیگم کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کا کہا۔

"نہیں بھابھی کچھ دیر رکیں۔۔۔ چائے بعد میں بنا لینا آپ۔ ابھی چونکہ سب یہیں پر ہیں تو میں سب کی موجودگی میں ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔۔۔"

ان کے پراسرار لہجے میں دبا دبا سا اک جوش بھی تھا۔

"تو بالآخر بلی تھیلے سے باہر آنے والی ہے۔۔۔"

راشدہ بیگم سوالیہ نظریں ان پر گاڑے یہ سوچتی ہوئی واپس بیٹھ گئیں جبکہ ثومیہ اور نمرہ کے دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگے۔ انہوں نے گھبرا کر پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر بے ساختہ فواد کی اسی "بے تکی" مسکراہٹ پر نگاہ ڈالی۔ اس پل وہ انہیں پہلے سے کہیں زیادہ بری لگی۔ گو کہ یہ بات ان کے لیے متوقع تھی بلکہ وہ اس کی منتظر بھی تھیں لیکن اب وقت آنے پر اس بات کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی ان کا سانس اکھڑنے لگا۔

" کہو شہوار کیا کہنا چاہتی ہو؟؟"

ان کا سکوت بھانپ کر شاہجہان عادل نے پیار بھرے لہجے میں بہن کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا تو سب کے چہرے پڑھتی وہ دھیرے دھیرے بولنا شروع ہوئیں۔

"دیکھیں جیسا کہ سب کو علم ہے کہ آج کل "نوکری والے" لڑکوں کے پیچھے ایک دنیا مرتی ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی کو اچھا "بر" ملے۔ لڑکا خوش شکل اور کماؤ ہو تو لڑکیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ تو بات یوں ہے کہ میرے فواد کی چونکہ "ماشاء اللہ سے سرکاری نوکری ہے" تو اس کے لیے آج کل بہت سے رشتے آ رہے ہیں۔ سمجھیں ہر روز کسی نہ کسی نے آ کر ہماری دہلیز پکڑی ہوتی ہے کہ رشتہ کر لو بیٹے کا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ فواد پر سب سے پہلا حق میرے بھائی بھابھی کا ہے۔ میں اپنے گھر کی بچیاں چھوڑ کر باہر نہیں بیاہ سکتی اسے۔۔۔"

ان کی ساری نسلوں پر کمال تر احسان کرنے والے انداز میں اتنا کہہ کر وہ رکیں اور اپنی فراخ دلی کے اس انمول مظاہرے پر داد طلب نظروں سے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ وہاں شاہجہان عادل کے سوا سب مکمل ساکت بیٹھے تھے۔ اور یہاں تک بغور انہیں سنتی ثومیہ یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ اس وقت پھوپھو کا "لب و لہجہ" زیادہ غلط ہے یا "انداز و بیان"۔۔۔؟؟

کیونکہ وہ دونوں غلط تھے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر غلط تھے۔

کوئی آگ تھی جو اس کے سر سے لگی تو ضرور لیکن پاؤں تک جاتے جاتے بھی وہ بجھ نہیں سکی۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا سارا اندرون جلنے لگا۔

سب کی سنجیدگی جانچ کر ایک پل کو رکی شہوار بیگم لہجہ بدل کر مزید بولیں۔

"تو بھائی اور بھابھی میں" بنا تمہید" آپ دونوں سے سیدھی بات کرتی ہوں کہ مجھے فواد کے لیے میری دھی ثومیہ کا رشتہ دے دیں۔ دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگتے ہیں۔ ان کی جوڑی خوب سجے گی۔ سارا خاندان دیکھتا رہ جائے گا۔ دیکھنا آپ۔۔۔"

بات مکمل کر کے انہوں نے ایک بار پھر سب کے تاثرات پڑھے اور سوالیہ نظریں ان دونوں میاں بیوی پر گاڑ دیں۔ فواد اس دوران نہایت فرمانبرداری سے یا شاید مشرقیت کے مظاہرے کے طور پر شرماتے ہوئے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ادھر انتہائی "فضول تمہید" باندھنے کے بعد کیا گیا شہوار پھوپھو کا یہ "بنا تمہید" کا مطالبہ سن کر ثومیہ اور نمرہ کی حالت گویا" کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" جیسی ہوگئی۔ پھوپھو نے ثومیہ کو یوں دیدے پھاڑے خود کو دیکھتے۔۔ ۔ نہیں بلکہ " گھورتے " پایا تو کافی حیران ہوئیں کہ وہ شرمانا بھول گئی ہے۔ ان کے خیال سے اسے شرما جانا چاہیئے تھا اور یہی خیال فواد کا بھی تھا۔ وہ دونوں اگر جان جاتے کہ اس کے اندر دراصل کیا" پک " رہا ہے تو ان کے یہ نادر خیالات اسی وقت ہوا ہو جاتے۔

پھر انہوں نے خالی خالی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھتی راشدہ بیگم کو مخاطب کر کے مزید گوہر افشانیاں کیں۔

"دیکھیں بھابھی میں جانتی ہوں کہ میں نے اچانک رشتہ مانگ لیا ہے تو آپ سب خوش سے زیادہ حیران دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر آپ سب غور کریں تو ثومیہ کے لیے میرے فواد سے اچھا رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دونوں کزنز ہیں۔۔۔ بچپن سے ایک دوسرے کے دیکھے بھالے ہیں۔ ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں۔۔ ۔ ایک دوسرے کے مزاج آشنا ہیں۔ دونوں کی زندگی اچھی گذرے گی ان شاء اللہ۔۔۔ کیا خیال ہے بھابھی؟؟ اور آپ کیا کہتے ہیں بھائی؟؟"

اپنے تئیں اپنی بات کے حق میں ناقابلِ تردید "دلائل" دے کر انہوں ان کی رائے جاننا چاہی تو شوہر کے کسی بھی جواب سے پیشتر راشدہ بیگم جیسے کوئی "سکتہ" توڑ کر بولیں۔

"دیکھو شہوار وہ سب ٹھیک ہے کہ فواد گھر کا بچہ ہے۔۔۔ یہ لوگ ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں لیکن ایسے کیسے ایک دم فیصلہ کر دیں ہم؟؟ ہمیں وقت دو تھوڑا سوچنے کے لیے۔ اچھی طرح سے سوچ کر اور بچیوں کی رائے جان کر اس کے مطابق ہی کوئی جواب دے سکیں گے۔ یوں ہتھیلی پر سرسوں تو نہ جماؤ۔ رشتے یوں بچوں کو آمنے سامنے بٹھا کر تھوڑی ناں لیے دیے جاتے ہیں۔ ہوں؟؟؟۔۔"

دوٹوک انداز میں دی گئی ان کی رائے سے وہ کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئیں۔ انہوں نے نہایت "ملفوف و ملفوظ" لہجے میں ان کے بچوں کے سامنے بات کھولنے پر ایک "واشگاف" طنز کیا تھا اور "بچیوں" کی اڑی ہوئی رنگت ان کے جواب سے تھوڑی معتدل ہوئی۔ اب اس سے پہلے کہ کوئی بھی مزید کچھ بھی بولتا ثومیہ کرسی پیچھے کی جانب دھکیلتے ہوئے اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی اور قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"آپ لوگ بیٹھیں۔۔۔ آؤ نمرہ ہم چائے بناتی ہیں۔ اور بس ایک بات ماما کہ۔۔۔ میری رائے جانے بغیر میرے متعلق ایسا کوئی بھی فیصلہ یا وعدہ نہیں کیجیئے گا کہ جسے نبھانے کے لیے میں، اپنی مرضی نہ شامل ہونے کی صورت میں، آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں۔ شکریہ۔۔۔"

نہایت اعتماد سے ایک ہی سانس میں بات مکمل کر کے وہ وہاں سے نکلتی چلی گئی تو ایک پل کے لیے گویا پورے ماحول کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر اس کی بات پر بابا کے ماتھے پر ابھرتے بے شمار بلوں کو گنتی نمرہ بھی ہڑبڑا کر اٹھی اور کرسی سے ٹھیڈا کھا کر سنبھلتی، اپنا دوپٹہ مٹھی میں دبوچے اس کے پیچھے چلی گئی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد شاہجہان عادل نے سر پکڑے بیٹھی اپنی بیگم کو دیکھا اور پھر کسی مصلحت کے تحت لب بھینچ کر رہ گئے۔ ان کی خاموشی سے راشدہ بیگم کافی حیران ہوئیں کیونکہ آج زندگی میں پہلی بار انہوں نے شوہر کو کسی بات پر "چپ" رہتے دیکھا تھا۔ ادھر ثومیہ کے خطرناک تیور بھانپ کر فواد بے طرح گھبرا گیا اور گلاس میں پانی بھر کر پینے لگا۔

شہوار بیگم نے جب ماحول کو اس قدر کشیدہ ہوتے دیکھا تو کمال لجاجت سے پینترا بدل کر بولیں۔

"یہ تو بچے ہیں بھابھی۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ بات بے بات جذباتی ہو جاتے ہیں لیکن فیصلہ تو بڑوں کو ہی کرنا ہوگا۔ اگر آپ اور بھائی راضی ہوں تو بچیوں کا زیادہ مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو ناسمجھ ہیں ابھی اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے سمجھانے سے مان جائیں گی۔"

بال ان کی کورٹ میں رکھتے ہوئے وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ راشدہ بیگم کے لیے آج "حیرانیوں" کا دن تھا کیونکہ انہوں نے نند کو بھی زندگی میں پہلی بار ہی اس قدر "معاملہ فہمی" سے کام لیتے ہوئے دھیرج رہ کر بات کرتے دیکھا۔

دوسری طرف ثومیہ تلملاتی ہوئی ڈائننگ روم سے نکلی اور راہداری میں تھوڑا اچل کر کچن میں جانے کی بجائے وہاں کھلتی ڈائننگ روم کی ایک کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ ان کی باقی گفتگو سننا چاہتی تھی۔ اسی وقت اس کے پیچھے پیچھے نمرہ بھی وہاں پہنچی۔ اسے کھڑکی سے لگے پا کر متحیر نظروں سے اسے دیکھتی وہ قریب آئی اور پھر ملامتی اور سرگوشیانہ لہجے میں اس کی سرزنش کرنے لگی۔

"اب یہاں کیوں کھڑی ہو آپی؟؟ کتنی بری بات ہے یوں چھپ چھپ کر کسی کہ باتیں سننا۔۔۔ اور جانتی ہو کتنا غلط ری ایکٹ کیا تم نے وہاں سب کے سامنے؟؟ ذرا سا بھی احساس ہے کیا تمہیں کہ اس سے ماما کی مشکل کتنی بڑھا دی تم نے؟؟ اور بابا کیا سوچیں گے بھلا کہ......"

"ششش۔۔۔ چپ کرو یار۔ میں پہلے سے بہت غصے میں ہوں زیادہ بھاشن جھاڑا ناں تو دو لگا دوں گی تمہارے بھی۔ سوچتا رہے جس نے جو سوچنا ہے۔ میں اپنے حق میں خود لڑوں گی اب۔"

اس نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کروایا اور پھر ہوا میں ہاتھ اٹھا کر تھپڑ مارنے کا اشارہ کرتے ہوئے خشمگیں نظروں سے گھورا بھی۔

"سننا ہے تو رکو۔۔۔ نہیں تو چپ چاپ جا کر چائے بناؤ۔ زیادہ اخلاقیات سکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تمہیں "درس و تدریس" سوجھ رہی ہے۔۔۔"

پھر دانت پیستے ہوئے اسے مزید ڈپٹ کر وہ "اندر" متوجہ ہوگئی تو تفہیمی انداز میں سر ہلاتی نمرہ ایک منٹ سے بھی پہلے اپنے تیور بدل کر شرمسار لہجے میں بولی۔

"اچھا سوری آپی۔۔۔ چلو پیچھے ہٹو تھوڑی سی جگہ مجھے بھی دو۔ بنتی رہی گی چائے بھی۔۔۔"

اور اس کے یوں جگہ مانگنے پر انہی ملامتی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی وہ ایک طرف ہو گئی جن سے چند لمحے پہلے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ نمرہ نے اس کی نظروں کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے کمال بے نیازی سے ایک درز سے جھانک کر اندر کا منظر دیکھا اور پھر اب تک خود کو گھورتی ثومیہ کا منہ دبوچ کر اندر کی طرف موڑ دیا۔ اس دوران اس نے دوبارہ ثومیہ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کے اس انداز پر ایک پل کے لیے ثومیہ کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکان طاری ہوئی اور پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس نے جھانک کر بابا اور ماما کے جواب کی منتظر پھوپھو کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر بے تحاشا فکروں کے طوفان موجزن ہونے لگے۔

اندر گفتگو بڑے نازک اور اہم موڑ پر آن رکی تھی۔ شہوار بیگم کے دھیمے و مفاہمتی لب ولہجہ نے راشدہ بیگم کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب وہ انہیں ایسا کیا جواب دیں جوان کی تسلی کے ساتھ ساتھ شاہجہاں عادل کی تشفی کا باعث بھی ہو۔ اپنے شوہر کی اب تک کی معنی خیز خاموشی سے قطع نظر، ان کے کچھ بھی بولنے سے پیشتر، وہ اپنا مطمع نظر پوری صراحت سے بیان کر دینا چاہتی تھیں۔

" بھئی میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ ہمیں سوچنے کا کچھ وقت دو۔ یوں بیٹھے بٹھائے ہم اس رشتے کے لیے اقرار نہیں کر سکتے۔ کئی پہلو ہوتے ہیں۔۔۔ سو باتیں ہوتی ہیں جن پر غور کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی تو دیکھو شہوار کہ وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ بالکل ابھی تو یونیورسٹی اسٹارٹ ہوئی ہے اس کی۔ اب کم از کم اتنا وقت تو ہو کہ وہ تعلیم مکمل کر سکے۔ اس کی پڑھائی مکمل ہونے سے پہلے میں اس کی شادی کے حق میں ہرگز نہیں ہوں۔"

قدرے توقف سے نند کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے مدلل لہجے میں کہا اور بات کے اختتام پر شوہر کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کی بات سن کر کرسی پر پہلو بدلتی ہوئی شہوار بیگم اب اپنے بھائی سے مخاطب ہوئیں۔

" بھائی آپ بھی تو بولیں ناں کچھ؟ آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟؟ کیا میں اپنے بھائی کے گھر سے خالی جھولی لوٹ جاؤں گی؟؟"

ان کا لہجہ اب کسی قدر بھرایا ہوا سا تھا جسے سن کر باہر کھڑکی سے لگی ثومیہ نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔

" افففف۔۔۔ ڈرامے بازیاں دیکھو ان کی۔ سلطان راہی کی فلم کا سین بنا دیا ہے۔ بھائی کے گھر سے خالی جھولی لوٹ جاؤں گی۔ ہونہہ۔۔۔"

اور اس کی اس " کڑواہٹ " پر انتہائی فکرمندی سے بغور اسے دیکھتی نمرہ نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

بالآخر ایک طویل ہنکارا بھر کر اب تک خاموش بیٹھے شاہجہاں عادل نے بہن کی " فریاد " پر لب کشائی کی۔

" ہمم۔۔۔ پہلی بات تو یہ ہے شہوار کہ " کوئی " تمہیں انکار نہیں کر رہا اس رشتے سے نہ ہی ذاتی طور پر مجھے کوئی اعتراض ہے اس پر۔ فواد گھر کا بچہ ہے۔ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ اور ثومیہ کے لیے بہترین انتخاب ہو سکتا ہے۔ لیکن ابھی راشدہ نے جو بھی باتیں کہیں وہ سب بھی انتہائی اہم، قابلِ غور اور فکر طلب ہیں۔ چنانچہ تم ہمیں

سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو تا کہ ہم سب آپس میں بیٹھ کر اس سے متعلقہ امور پر گفتگو کر سکیں۔ اور جب تک ہمارا کوئی ختمی جواب نہیں آئے تم خاندان برادری میں اس کی بھنک بھی مت نکالنا کہ ہمارے درمیان رشتے کی کوئی بات ہوئی ہے۔ وہ کیا ہے کہ اس سے طرح طرح کی باتیں اور کئی نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟؟" ٹھہر ٹھہر کر لیکن دوٹوک لہجے میں دیا گیا ان کا یہ جواب سن کر وہاں سب کا الگ الگ ردعمل ظاہر ہوا۔

اب کی بار کرسی پر پہلو بدلنے کی باری راشدہ بیگم کی تھی تو کسی حد تک اثبات میں جواب پا کر ان کی نند کا چہرہ کھل سا گیا۔ فواد نے پوری بتیسی کھول کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر پہلے کی طرح سعادت مندی کے مظاہرے کے طور پر سر جھکائے مسکراتا رہا۔

جبکہ باہر کھڑکی سے لگ کر کھڑی ثومیہ کو لگا کہ وہ پتھر کی ہو گئی ہے۔ بابا کے الفاظ میں موجود پسندیدگی و قبولیت کی جھلک نے ایک پل کے لیے اسے بالکل گنگ کر دیا۔ ہاں سب سے بری حالت شاید نمرہ کی ہوئی جسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ بس خالی پن سا تھا کچھ۔۔۔ جو بھی تھا۔

" شکریہ بھائی صاحب۔۔۔ بہت بہت مہربانی۔ مجھے یقین تھا آپ کو اعتراض نہیں ہو گا۔ فواد کا پیار بھی تو بڑا ہے آپ کے ساتھ۔ بڑا احترام کرتا ہے آپ کا۔ باقی آپ لوگ اب تسلی سے بات چیت کر لیں آپس میں۔ مجھے بس یہی کافی ہے کہ مجھے مثبت امید دلائی گئی ہے۔"

لجاجت بھرے لہجے میں شہوار بیگم نے بے تکان جو بھی منہ میں بول دیا اور پھر ناصحانہ لہجے میں راشدہ بیگم کو مخاطب کیا۔

"اور بھابھی جب آپ کہیں گی تب کر لیں گے شادی۔ بس یہ کہ پہلے " آپ " دل سے راضی ہوں۔ بچوں کا کیا ہے۔۔۔ انہیں بڑوں کی بات ماننے میں وقتی طور پر کوئی تامل ہو بھی تو بعد میں ان کے فیصلوں کو سراہتے ہوئے ملتے ہیں کہ ان کے حق میں یہی بہتر تھا۔ مجھے یقین ہے اگر کوئی مسئلہ ہے بھی تو آپ حل کر لیں گی۔"

کمال مہارت سے بال ان کی کورٹ میں رکھ کر بات کے اختتام پر وہ پر سکون انداز میں مسکرائیں۔ ادھر پھوپھو کی تشکراتی گردان سنتی ثومیہ ایک جھٹکے سے مڑی اور آنکھوں میں اُمڈ آیا بے تحاشا پانی صاف کرتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بھاگ گئی۔ نمرہ نے اس کے پیچھے جانا چاہا پھر دو قدم چل کر کچھ سوچتی ہوئی رکی اور ارادہ بدل کر

دوبارہ اندر جھانکنے لگی۔

"اوہو شہوار کہا ناں تم سے کہ فکر مت کرو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا بس وقت دو تھوڑا۔ سب معاملات سنبھالنے کے لیے وقت چاہیئے ہوتا ہے۔"

ان کی بات کا جواب انہیں اب بھی بھائی کی طرف سے ہی موصول ہوا تو ایک پل کو تھم کر انہوں نے نہایت سنجیدہ بیٹھی اپنی بھاوج کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر فواد کے گال چھوتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے بھائی صاحب۔۔۔ جیسے آپ کہیں میں راضی ہوں۔ چونکہ فواد کی چھٹی بس دو دن کی ہے تو کل صبح صبح ہم واپس چلے جائیں گے۔ پھر بس آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ جو بھی فیصلہ کرنا ہے وہ جلد از جلد کر دیں گے تو مہربانی ہوگی۔"

اور ان کے شہد آگیں لہجے پر "بھائی صاحب" احسان مندی سے مسکرا دیے تو راشدہ بیگم چپ چاپ اٹھیں اور میز سے برتن سمیٹنے لگیں۔ ان کے لیے فی الوقت یہی غنیمت تھا کہ شوہر نے زندگی میں پہلی بار تحمل سے کام لے کر ان سے دوبدو ہونے کی بجائے ان کی بات مانتے ہوئے حتمی جواب دینے کے لیے کچھ وقت مانگ لیا ہے۔

دل ہی دل میں وہ دعائیں مانگ رہی تھیں کہ اگلا مسئلہ گفتگو سے حل ہو جائے۔

"اچھا۔۔۔ اور تم دو چار روز تو رکتیں ناں۔ یوں بھاگم بھاگ آئی ہو اس بار تو۔ باقی رشتہ داروں کے گھر نہیں جانا کیا؟ سب پوچھتے ہیں تمہارا ہر بار۔"

پھر برتن لے کر وہ میز سے ہٹ رہی تھیں جب انہوں نے شاہجہاں عادل کو موضوع بدلتے ہوئے سنا۔ بے ساختہ ایک طویل سانس خارج کر کے انہوں نے سر جھٹک دیا۔

ادھر ماں کو آتے دیکھ کر راہداری میں کھڑکی سے لگ کر کھڑی نمرہ بھاگتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی اور چائے کا پانی دم پر چڑھانے لگی۔

ثومیہ کے مستقبل کو لے کر اس کے ذہن و دل کے ہر گوشے میں بے پناہ افکار کی شورش تھی۔

☆......☆......☆

پریس میٹنگ کے اختتام پر ناز کی "ناصحانہ گھوریوں" کو نظر انداز کرتے ہوئے گیتی نے ان مداح لڑکیوں

کو اپنا ذاتی موبائل نمبر دیا اور پھر ان سے فراغت پانے کے بعد رفیق نواز سے اپنے آج رات کے قیام سے متعلقہ تفصیلات پوچھ کر جانے کی اجازت چاہی۔ جواباً وہ ان کے کپادوکیہ میں قیام کی حتمی مدت دریافت کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ گیتی فلم کے اگلے اسپیل کے لیے وقتِ مقررہ پر حاضر ہو جو کہ صرف پندرہ دن کے وقفے سے شروع ہونے والا تھا۔ وہ خوشدلی سے اپنی بروقت واپسی کی یقین دہانی کرواتے ہوئے وہاں سے "اسٹوڈیو" کے لیے روانہ ہوگئی جہاں اسے ممتاز محمود کو لائیو انٹرویو دینا تھا۔ اس کے لیے مختص سیکیورٹی اب بھی ایک قافلے کی مانند اس کے ہمراہ تھی۔ شو کا وقت بالکل قریب ہونے کی وجہ سے اس دوران ممتاز محمود اسے دوبار کالز کر چکا تھا جنہیں وہ مسلسل نظرانداز کرتی رہی تھی۔ دو لینڈ کروزرز پر مشتمل ان کا قافلہ تیزی سے منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ ان کی گاڑی میں غیر معمولی خاموشی طاری تھی اور وہ دونوں اپنی اپنی طرف کے شیشوں سے پار تاریکی میں ڈوبے مختلف مناظر " کھوجنے " میں مگن تھیں۔ نہر کا ایک پل عبور کر کے ان کی گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ واقع ایک خوبصورت اور کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی تو کب سے خاموش بیٹھی ناز نے اس کی طرف منہ کر کے دھیمے لہجے میں کہا۔

" تمہیں ان لڑکیوں سے اتنا فرینک ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ گیتی پلیز یار۔۔۔ بے وجہ کی یہ محبتیں اب مت بھگارنا۔ تمہیں ابھی اندازہ ہی نہیں کہ تمہاری ان عجیب تر لگاوٹوں کو ہندوستانی میڈیا کس حد تک اچھال سکتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو گیت۔ مانا کہ یہ سب اچھے لوگ ہیں لیکن اس قدر فدا ہونے والی بھی کوئی بات نہیں۔ تم ایک اسٹار ہو اور اپنا اسٹاری ایٹی ٹیوڈ قائم رکھو۔ پلیز۔۔۔"

اور اس کے مخاطب کرنے پر بغور اس کا قطعی انداز دیکھتی وہ ہولے سے یوں مسکرائی گویا کوئی سمجھدار بوڑھا کسی نادان کی بات سن کر شفقت سے مسکراتا ہے۔ پھر کچھ کہتے کہتے وہ رکی، ایک بار تھوڑا سا آگے ہو کر فرنٹ گلاس کے پار سڑک پر دور تلک پھسلتی روشنیاں دیکھیں اور طویل سانس بھر کر گویا کوئی بات بدلتے ہوئے بولی۔

"او کے ناز۔۔۔ میں جانتی ہوں تمہاری فکر درست ہے۔ ڈونٹ وری۔ میں اب احتیاط کروں گی۔ شکریہ۔۔۔"

اور آخر پر اس نے بڑے خلوص و محبت سے بھیگ کر ناز کا ہاتھ تھام لیا تو اس کے اتنی آسانی سے مان جانے پر

وہ شانے جھٹک کر رہ گئی۔ وہ جان گئی کہ وہ صرف اسے دلاسہ دے رہی ہے ورنہ وہ اس کی بات سے متفق نہیں۔ لب بھینچ کر تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے ناز نے جواباً خاموش رہنا مناسب جانا اور نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑوا کر ایک مصنوعی مسکراہٹ اچھالتی وہ پھر سے باہر دیکھنے لگی۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جیسے افکار و نظریات کے حاملین افراد بھی کسی ایک بات پر ایک دوسرے سے یکسر مختلف سوچنے لگتے ہیں۔ یوں کہ وقتی طور پر ایک دوسرے کے متضاد افکار کو عین عین سمجھنا ان کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ تب وقتی خاموشی اختیار کر لینا ان کے لیے باہمی معاملہ فہمی کی راہیں ہموار کر دیتا ہے جو دیرپا اور دائمی ہوتی ہیں۔

اس کے بعد اسی خاموشی سے طرح طرح کی "گفتگوئیں" کشید کرتیں وہ اس نجی ٹی وی چینل کے ہیڈ آفس پہنچ گئیں جہاں شو کا اسٹوڈیو واقع تھا۔

ان کے گاڑی سے اترتے ہی چینل کی سرکردہ شخصیات نے انتہائی تکریم سے نوازتے ہوئے ان کا بھرپور استقبال کیا اور پھر خوبصورتی سے سجائی گئی ایک طویل راہداری سے گذار کر انہیں ریکارڈنگ اسٹوڈیو سے ملحقہ اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں ان کی ریفریشمنٹ کا سامان بڑی نفاست کے ساتھ پہلے سے ترتیب شدہ رکھا تھا۔

چینل کے دو ڈیپارٹمنٹ ہیڈز ان کے ساتھ ساتھ بطورِ میزبان موجود تھے لیکن ان کے حقیقی میزبان ممتاز محمود کا اب تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ان دونوں نے ہی فقط جوسز لینے پر اکتفا کیا اور دیوار گیر گھڑیال کی سوئیاں دیکھتی وہ جوس کے آخری گھونٹ بھر رہی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھول کر ہنستا مسکراتا ممتاز محمود وہاں داخل ہوا۔

"السلام علیکم گیتی جی اور ناز میم۔۔۔ کیسی ہیں آپ دونوں؟؟ معذرت خواہ ہوں کہ سیٹ پر مصروفیت کہ بدولت "ریسیپشن" پر نہیں آسکا۔ دھنے واد کہ آپ تشریف لائیں۔ نوازشات بہت۔۔۔"

خوشدلی سے نرم مسکراہٹیں اچھالتا، والہانہ لہجے میں بولتا وہ گویا ماحول پر چھاتا چلا گیا۔ وہ اپنے مہمانوں کو ہمیشہ اسی انداز و اطوار میں ملتا تھا تاکہ وہ اس کے اندرون کی حقیقت سے لاعلم رہیں۔ وہ چاہتوں سے لبریز اور محبتوں میں بھیگے ہوئے لہجوں میں گفتگو کا عادی تھا۔ اس کا انتہائی مودب انداز دیکھ کر وہ دونوں بیک وقت

مسکرائیں۔

"وعلیکم السلام ممتاز صاحب۔۔۔ ماشاءاللہ کافی ممتاز شخصیت ہیں آپ۔ اچھا لگا آپ سے مل کر۔اور کوئی بات نہیں ہم سمجھتی ہیں یہ بات کہ پیک ٹائم میں کوئی نہ کوئی مصروفیت نکل ہی آتی ہے۔نو وریز......"

اسے گہری نظروں کے حصار میں رکھ کر گیتی نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا تو کمال متانت سے مسکراتا وہ مزید بولا۔

"جی یہی تو خوبی آپ کی بھاگئی ہمیں کہ آپ سب کی عزت کرتی ہیں وگرنہ بندہ تو کسی قابل نہیں اور آپ کو اک عالم جانتا ہے۔"

یہاں وہ رکا اور گھڑی پر نگاہ ڈالتا مزید بولا۔

"خیر یہ باتیں بعد میں سہی۔ابھی وقت بالکل ہوا چاہتا ہے۔کمرشل بریک ہے چینل پر سات منٹ کا۔اس کے فوراً بعد ہمیں لائیو ہونا ہے۔تھوڑا سا سناریو آف لائن بتانا چاہوں گا کہ نارمل گفت وشنید کے علاوہ ایک فاسٹ راؤنڈ ہوتا ہے سوالات کا۔جس میں کو آپ بنا تاخیر کے ہراول سوچ ڈسکس کرنا ہوتی ہے۔اگر آپ کو اس پر کچھ اعتراض ہو تو میں فارمیٹ بدل لیتا ہوں اس بار۔۔۔"

نرم لہجہ اپنا کر اس نے کمال تعظیم سے کہا تو اپنے مخصوص انداز میں گیتی شائستگی سے بولی۔" کوئی مسئلہ نہیں ممتاز صاحب۔۔۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔شوبز انٹرویوز کا موسٹلی یہی فارمیٹ ہوتا ہے ہر کہیں۔آپ کو جو پوچھنا ہوا بے دھڑک پوچھ سکتے ہیں۔میری زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں کہ جس کی پردہ داری ہو۔"

اور اس کے انداز سے "بظاہر" متاثر ہوتا وہ عقیدت مندی سے راستہ چھوڑتے ہوئے بولا۔

"دین پلیز کم میم۔۔۔ پاکستانی آپ کی ایک جھلک تک دیکھنے کو شدت سے منتظر ہیں۔اور بہت شکریہ۔مجھے یقین تھا آپ انکار نہیں کریں گی۔"

اس کی بات سن کر وہ دونوں اٹھیں تو ان کے ساتھ باقی ڈیپارٹمنٹ ہیڈز بھی احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے جو کہ ممتاز محمود کی آمد سے اب تک بالکل خاموش بیٹھے تھے۔

☆......☆......☆

اپنے باپ منصور عالم کے ساتھ جا کر چھ بجے کے اریب قریب وہ بائیک لے آیا اور پھر نیچے ذکیہ بیگم کے ساتھ لاؤنج میں کچھ وقت گذار کر اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اپنے بیڈ پر لیٹا مسلسل مسرور کن کروٹیں بدلتا وہ بے انتہا خوش تھا۔ اس کے ہونٹ بے وجہ اور بے طرح کھلتے رہے۔ یہ خوشی صرف بائیک لینے کی نہیں تھی۔ اس سرور کا منبع اس کی ذات میں در آیا وہ اطمینان تھا جو مصطفین اور ثومیہ سے دوستی کے اک نئے آغاز کے باعث پیدا ہوا تھا۔ کل یونیورسٹی ان سے دوبارہ ملاقات ہونے کا سوچ سوچ کر وہ گویا بہاروں کے سنگ "محوِ پرواز" ہو گیا۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نئے نئے بنتے تعلقات ہمیں انوکھے احساسات سے دوچار کرنے لگتے ہیں۔ ان کے خیالات میں ڈوب کر ہم اپنا آپ بھولنے لگتے ہیں۔ وہ بھی انہی کیفیات میں ڈھل رہا تھا۔

بالآخر بستر پر ان کی یاد سے وابستہ کئی سلوٹیں چھوڑ کر وہ اٹھا اور پاؤں میں سلیپر اڑس کر اپنی آڑھی ترچھی ہو چکی قمیض سیدھی کرتا ہوا ٹیرس میں جا رکا۔ باہر اندھیرے کی گھپ چادر مناظر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ٹیرس کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر تھوڑا سا جھکتے ہوئے اس نے سیاہیوں میں ڈوبی کالونی میں جگہ جگہ جلتی روشنیاں دیکھیں اور پھر کئی گھروں کی ہموار چھتوں سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ دور عقبی گلی کے آخری کنارے پر لاٹھی کے سہارے چلتے ایک بوڑھے شخص پر جا رکی۔ رات کی مسافتوں پر نکل کر سوگوار چال چلتا یہ تن تنہا بوڑھا اسے کسی نمناک کہانی سے بچھڑا کوئی اہم تر کردار لگا۔ ایک پل کے لیے اس کے دل کو کچھ ہوا اور پھر ایک طویل سانس بھر کر اس نے رخ موڑا اور ریلنگ سے پیٹھ ٹکاتے ہوئے تیز ہواؤں سے بگڑ جانے والے اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

"ثومیہ یہاں ہوتی تو اس بوڑھے کی "انجان کہانی" کو جان لینے میں بے انتہا دلچسپی لیتی۔۔۔"

نجانے کیوں بوڑھے کے اس "اداس منظر" میں اسے ثومیہ یاد آنے لگی۔ اس سے ہوئی اب تک کی مزاج آشنائی کی بدولت اس نے یہ بات اچھے سے جان لی تھی کہ وہ حساس تر پہلوؤں پر عمیق تر سوچیں رکھنے والی ایک انمول لڑکی ہے۔ یکا یک اس کی ذہنی روئی "سمت" میں سفر کرنے لگی۔

"وہ بڑی خاص ہے۔۔۔ سب سے منفرد لڑکی۔ کوئی اتنا اچھا کیسے ہو سکتا ہے؟ کوئی اتنا پیارا کیسے سوچتا ہو گا؟"

سوچوں کا ہر دھارا اسی پر مرکوز ہوا تو اس کی بڑبڑاہٹوں میں عجب سی "لوچ" شامل ہونے لگی۔ان لمحات کے فسوں سے بندھ کر اسے لگا کہ وہ بے پناہ "لگاوٹوں" کی زد میں آنے لگا ہے۔اس کے وجود کیا روح تلک کے ہر ایک کونے میں کئی چاہتوں کی شورش ہوئی۔یہی وہ پل تھا کہ جب لہلہاتی ہوئی پاکیزہ ہوائیں اس کا معطر وجود چھو چھو کر کوئی اہم تر راز اسے "دان" کرنے لگیں۔اسے لگا اس کے اردگرد ہواؤں کی ان سرد سرسراہٹوں میں فقط ایک نام شامل ہے اور وہ ہے ثومیہ شاہجہان۔۔۔

سحر زدہ سا ہو کر اپنے ذہن و دل میں گونجتے اس نام کی بازگشت سنتا وہ کمال تر تراوٹوں سے مسکرانے لگا۔غیر محسوس طور پر اس کی خوش رنگ آنکھوں کے دلپذیر کناروں پر بے شمار پیار در آیا اور ان کی چمک جگنوؤں سی لو دینے لگی۔اس کا چہرہ عجب عجب سا گلنار ہو گیا۔

"ثومیہ شاہجہاں۔۔۔"

اس کے دلکش لبوں نے منظر پر گویا کوئی "اسم" پھونکا تھا کہ وہ سوگوار بوڑھا اور اس کی تمام تر اداسیاں اس "ذکر" سے ماند پڑ گئیں۔دوبارہ مڑ کر دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلاتے ہوئے وہ گویا وسیع آسمان سے تارے توڑ کر لانے لگا اور پھر مسرت سے بھرپور ہو کر وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔اپنی لگاوٹ آمیز ہنسی کی گونج سن سن کر اس نے جانا کہ یہ لمحہ محبتوں کے ادراک پا لینے کا سا ہے۔۔۔

یہ وقت اپنا اندرون چھان لینے کا سا ہے۔۔۔

اس نے جان لیا کہ اسے عام لہجوں کی حامل اس خاص تر لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

ادراکِ محبت کیا ہوا اسے لگا کہ اس کے محسوسات میں "وسعت" آ گئی ہے۔وہ یوں جھومنے لگا گویا بحر و بر کا کل اختیار اسے مل گیا ہو۔ ہواؤں کے سنگ وہ یوں رقصاں ہوا کہ گویا ارض و سماں اس کے حکم کے تابع ہوں۔

اس وقت اس کے آس پاس اردگرد اور سارے میں۔۔۔صرف اور فقط "عشق" تھا۔

تو لوگوں کے نزدیک صرف خود سے محبت کرنے والے کو آخر کار کسی اور سے پیار ہو ہی گیا۔وہ حسن کا مرقع و مجسمہ کسی کی سادگی پر مر مٹا تھا۔

اور پھر وہیں اپنے ٹیرس میں رک کر آسمانی تارے کھوجتے ہوئے اس نے جلد از جلد لیکن کسی مناسب موقعے

پرثومیہ سے اپنے ان ماورائی احساسات کے اظہار کا فیصلہ کیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی زندگی کیا کیا اور کون کون سی۔۔۔کروٹیں بدلنے والی ہے۔

☆......☆......☆

اس کے بعد چائے بن کر پیش ہونے سے لے کر چائے پینے کے بعد برتن سمیٹنے تک بھی ثومیہ اس نشست میں شریک نہیں ہوئی۔شاہجہاں عادل اپنی بہن اور بھانجے سے من پسند موضوعات پر گفتگو کرتے رہے جس میں وقتاً فوقتاً چپ چاپ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتی نمرہ اور راشدہ بیگم کو بھی زبردستی گھسیٹا گیا۔ایسی گفتگوؤں میں ان کے پاس سوائے ہوں ہاں کرنے کے اور کوئی جملہ، تاثر یا ردعمل نہیں ہوتا تھا۔نمرہ دل ہی دل میں شکر کر رہی تھی کہ ثومیہ کے یوں سب کے سامنے بول کر جانے پر بابا کی طرف سے فی الوقت صرف خاموشی کا دور دورہ ہے۔اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ یہ مصلحت بھری خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔راشدہ بیگم نے جب دیکھا کہ یہ نشست کافی طویل رہے گی تو آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے نمرہ کو بہن کی خبر گیری کا کہا جو تب سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ان کی نظروں کا پیغام سمجھ کر اثبات میں سر ہلاتی وہ اٹھی اور راہداری کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ شاہجہان عادل کی آواز پر اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔

" کہاں جارہی ہو۔۔۔؟"

ان کا لہجہ متوازن لیکن رعب دار تھا۔بے ساختہ ماں پر نگاہ کر کے وہ پھر اٹکتے ہوئے بولی۔

"مم۔۔۔میں کمرے میں جارہی ہوں بابا۔سوچا کل کے لیے کالج بیگ ریڈی کر آؤں۔۔۔"

اسے جو سوجھا وہ بول گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔اور واپسی پر ثومیہ کو بھی لانا ساتھ۔شہوار تم لوگوں سے ملنے آئی ہے۔اسے کمپنی دو۔کوئی دو گھڑی اس کے پاس بیٹھو۔ہنسو کھیلو۔اور جاؤ اب۔۔۔جلدی آنا۔۔۔"

سرسری طور پر اس کا جواب سن کر انہوں نے تیز لہجے میں اپنا فرمان جاری کیا اور دوبارہ سر جھکا کر پھوپھو کے قصائص سننے لگے۔اس نے بے بس نظروں سے ایک بار پھر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور لمبا سانس خارج کر کے، صوفوں کے گرد گھومتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔فواد نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے اسے

راہداری میں جاتے دیکھا جبکہ راشدہ بیگم ماتھے پر لکیرِ فکر لیے اپنے مجازی خدا کا "مزاج" جانچنے لگیں۔ وہ بھی بہت حیران تھیں کہ ثومیہ کے سب کے سامنے بدتمیزی کرنے پر بھی وہ خلافِ توقع اتنا دھیرج کیسے ہیں؟؟ کوئی اور موقع ہوتا تو اب تک کیا کچھ نہ ہو گیا ہوتا۔

" حق ہاہ۔۔۔چلو دیکھتے ہیں اونٹ کس سمت میں کتنی کروٹیں لیتا ہے۔۔۔۔۔۔"

بالآخر کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہو کر، یہ سوچتے ہوئے انہوں نے شانے جھٹک دیے۔

ادھر نمرہ نے کمرے کا آدھا دروازہ کھول کر چوری کے سے انداز میں اندر جھانکا اور ثومیہ کو اپنی مخالف سمت کروٹ لیے لیٹے دیکھ کر دبے پاؤں اندر داخل ہو گئی۔ اس کے انداز سے یوں ظاہر ہو رہا تھا کہ گویا وہ سو رہی ہے۔ اندر آ کر نمرہ نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور تھوڑا سا چل کر اس کی پشت پر بیڈ کے ایک پائے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی پشت دیکھنے کے بعد اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے وہ کھنکاری اور بیڈ کے پائے سے لپٹے جالی دار کپڑے کو اور اچھی طرح لپیٹنے لگی۔ اس بے وجہ مصروفیت سے فارغ ہو کر اس نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہیں ہوئی۔ نمرہ کو اس پل سب سے منہ پھیر کر چپ چاپ انہیں اپنی تقدیر سے کھیلتا ہوا دیکھتی اپنی یہ مضبوط اور بااعتماد سی بہن بڑی کمزور اور شکست خوردہ سی لگی۔ سچ کہتے ہیں کہ مشرقی لڑکیاں خود کو جتنا مرضی مضبوط ظاہر کر لیں۔ اپنے متعلق دنیا کے منفی رویہ جات سہہ سہہ کر اندر سے ہر وقت اک غیر محسوس سی شکست و ریخت کا شکار رہتی ہیں۔

" کس کافر کو نیند آئے گی آج کی رات۔۔۔ میں جانتی ہوں آپی تم سو نہیں رہیں۔ ادھر دیکھو میری طرف پلیززز۔۔۔"

بیڈ پر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کا شانہ کھینچ کر اس نے اس کا رخ اپنی جانب موڑنا چاہا تو ثومیہ نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نمرہ نے ٹھیک کہا تھا۔ کم از کم آج کی رات اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔

" کیوں کر رہی ہو ایسا یار۔ نہ پریشان ہونا تم پلیز۔ ماما نے کہا تو ہے کہ وہ بات کریں گی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ادھر تو دیکھو۔۔۔"

اس کے انداز سے گھبرا کر تسلی دینے کی کوشش میں اس نے دوبارہ اسی طرح اس کا شانہ پکڑا تو وہ اور آگے

کھسک گئی۔ وہ گویا پوری دنیا سے ناراض۔۔۔ بلکہ بے زار ہو گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا اور اپنی جانب اتر کر بیڈ کے گرد گھومتی ہوئی وہ اس کے سامنے قالین پر جا بیٹھی۔ اس نے ایک بازو سے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اسے لگا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس نے زور لگا کر سرعت سے اس کا بازو اس کے چہرے سے ہٹایا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے جبکہ اس کا نچلا شانہ اور تکیے کا ایک کونا بھی گیلا ہو چکا تھا۔ وہ جانے کب سے رو رہی تھی۔

"اے۔۔۔ کیا ہو گیا ہے یار۔۔۔ کیوں رو رہی ہو بے وجہ؟ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے والا۔ دیکھو یوں رومت تم۔ ورنہ میں بھی رو دوں گی سچی۔ پلیز آپی۔۔۔!!"

جلدی جلدی اس کے آنسو پونچھ کر اسے ساتھ لگاتی وہ جذباتی لہجے میں بولی اور پھر اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلاتے سچ مچ اس کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

"ماما کی کون سنے گا یار؟ اس گھر میں صرف بابا کی مرضی چلتی ہے۔ پھوپھو کا انداز دیکھا تم نے؟ کس قدر انسلٹنگ تھا۔ اس طرح سے رشتہ مانگا جاتا ہیں کسی کی بیٹی کا؟ اور بابا کا جواب سنا تم نے؟ کیسی کیسی امیدیں دلا رہے تھے وہ پھوپھو کو۔۔۔ وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں یار میرے ساتھ۔ مجھے فواد بالکل اچھا نہیں لگتا نمرہ۔ اگر ایسا ہوا تو میں مر جاؤں گی اور میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں یار۔۔۔ میں سچ مچ مر جاؤں گی۔"

اس کا پیار کرنا تھا کہ اس کے ساتھ لپٹ کر سسکتے ہوئے وہ اور شدت سے رونے لگی۔ کب سے اوپر بالکل اکیلی، جانے کیا کیا سوچ کر وہ اس قدر ٹوٹتی رہی تھی کہ اب ذرا سی جذباتی ڈھارس پا کر بکھر بھی گئی۔ اس کی حساس ترکیفیت بھانپ کر نمرہ نے فٹافٹ اپنی آنکھیں خشک کیں اور اس سے تھوڑا الگ ہو کر وہیں بیٹھے بیٹھے پیار سے اس کا شانہ سہلاتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

"او ہو ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے یار۔۔۔ یہ رشتہ ماما کی اور خصوصاً تمہاری مرضی کے بغیر بالکل نہیں ہو سکتا۔ ہرگز بھی نہیں۔ کسی طور بھی نہیں۔ لہٰذا خدارا۔۔۔ تم خود کو کمزور نہیں پڑنے دو۔ تم تو مجھے سمجھاتی ہو یار اور اب خود یوں۔۔۔"

یہاں اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی لال آنکھوں سے دھاروں کی

مانند بہتا پانی ہٹایا اور اس کے گیلے گال تھپتھپاتے ہوئے مزید بولی۔

"چلو اٹھو شاباش۔۔۔ یہ تو بات ہی کوئی نہیں ابھی سے اتنا رونے والی۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہم انسان ہیں کوئی بھیڑیں نہیں کہ جدھر جس کا دل کرے اپنی مرضی سے ہانک دے۔ پھوپھو نے اپنی کہی ہے اور بابا نے اپنی۔۔۔ تو اب ہم بھی اپنی ہی کہیں گی۔ اتنی بھی کوئی لوٹ نہیں مچی کہ جس کا دل کرے منہ اٹھا کر احسان جتاتے ہوئے رشتہ لینے آجائے۔ ایسی بھی بے مول نہیں ہوتیں ہم بیٹیاں۔ کوئی سمجھے یا نہیں سمجھے۔۔۔ سب سے پہلے اپنی "اہمیت" کو ہمیں خود سمجھنا ہوگا۔ سو پلیز یار۔۔۔ یوں آسانی سے ہار مت مانو۔ وہی پہلے سی مضبوط ثومیہ شاہجہاں بنو۔ بلند و بانگ دعوے کرنے والی۔۔۔ کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔۔۔ ہر بات مقابل کے منہ پر دے مارنے والی۔۔۔ ہمم۔۔۔"

اس کے ارادوں کو مہمیز لگاتے ہوئے اس نے پر جوش "خطاب" کیا اور فرش سے اٹھ کر اس کا بازو سے کھینچتے ہوئے اسے بھی بیڈ سے اٹھانے لگی۔ اس کے مدلل لہجے میں اپنی ذات کے لیے مضبوطی کے گمان پڑھ کر اسے فوراً اپنی بے طرح جذباتیت کا ادراک ہوا اور پھر اس کی ہمت افزا باتوں سے طرح طرح کی جراتیں کشید کرتی وہ بھی گویا ایک نئے عزم سے اٹھی۔

"ایم سو سوری یار۔۔۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوگئی تھی تو اس پریشانی میں بالکل سمجھ نہیں آیا کہ کیا کروں اب۔ اپنی بے بسی کا احساس کر کے بس رونا ہی آخری حل نظر آیا تو۔۔۔"

شرمسار لہجے میں کہہ کر یہاں وہاں دیکھتے ہوئے اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ نمرہ کو لگا کہ وہ اس سے نظریں ملانے سے بھی اجتناب کر رہی ہے۔ وہ ہمیشہ سے سب کے سامنے بہت مضبوط "بنتی" آئی تھی اور اب یکدم اس کے سامنے اپنے کمزور پڑنے کا احساس اسے شرمندہ کر گیا تھا۔ پھر نمرہ کے مزید کچھ بھی کہنے سے پیشتر دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھتی وہ اس کے ایک طرف سے نکل کر کھڑکی میں جا رکی۔ یہ بھی اپنا آپ چھپانے کی ایک اور کوشش تھی۔

"تم کیوں آگئیں محفل چھوڑ کر؟ باقی سب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے ہیں کیا؟ اتنی جلدی؟؟؟"

کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر گھپ تاریکی میں ڈوبا کھڑکی کے پار کا منظر دیکھنے کی کوشش کرتی وہ مغموم

لہجے میں پوچھنے لگی تو اس کی پشت پر رک کر حیرانی سے اس کے یکا یک بدلتے انداز و اطوار پڑھتی نمرہ بھی نرم قدموں سے چلتی ہوئی اس کے بالکل ساتھ آن رکی۔ پھر آسمان پر چمکتے تاروں کی تعداد گنتی اس کی لال آنکھوں کو اپنی عمیق تر نظروں کے حصار میں رکھ کر اس نے لفظ ترتیب دیے اور ہاتھ بڑھا کر اسے شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ لیا۔ اس نے تحیّر سے اس کا یہ انداز پڑھا اور پھر کچھ کہے بنا کھڑکی کے پار آسمان کے سینے پر روشن ستاروں کو یوں دیکھا گویا ان سے اپنا "رابطہ" ٹوٹ جانے کا دکھ ہوا ہو۔ پھر یوں ہوا کہ اس کی تمام تر کیفیات کو بمشکل نظر انداز کر کے، لہجے کو حتی الامکان متوازن رکھنے کی کوشش کرتی نمرہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"بابا تمہیں نیچے بلا رہے ہیں ثومیہ۔۔۔ ان کا کہنا ہے کہ آ کر پھوپھو کو کمپنی دو کیونکہ وہ ہم سے ملنے آئی ہیں۔ اور یہ بات انہوں نے پھوپھو اور اس منحوس فواد کے سامنے ہی کہی ہے۔ ہاں یہ کہ اس کے بعد رشتے سے متعلق مزید کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ پھوپھو بھی بالکل نارمل انداز میں بات چیت کر رہی ہیں اور بابا بھی بالکل خاموش ہیں اس معاملے میں۔ یعنی کوئی خاص تبدیلی یا کشیدگی نہیں ہے ماحول میں۔ میرے خیال سے تمہیں ساتھ چلنا چاہیئے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ عام سی فیملی سٹنگ جیسا ہے اور سب انتظار کر رہے ہیں۔ پلیز ززز۔۔۔"

اپنی آمد کا مقصد بتا کر اس نے جلدی جلدی سارے منظر نامے کا تجزیہ بھی پیش کر دیا مبادا کہ وہ پھر سے غصہ کر جاتی۔ بات کے اختتام پر اس کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔ حیرت انگیز طور پر غصہ کیے بنا بغور اس کی بات کا اک ایک جزو سمجھتی ثومیہ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنے ازلی اعتماد سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ لیکن میں یہیں بتا دوں کہ اب اگر پھوپھو نے میرے سامنے کوئی بات کی اس موضوع پر تو میں کھری کھری سنا دوں گی۔ اور فواد کی واہیات ہنسی تو کیا۔۔۔ میں اس کی مسکراہٹ بھی برداشت نہیں کروں گی۔ دیکھ لو۔۔۔ نتائج کی ذمہ دار تم ہوں گی کیونکہ صرف تمہارے کہنے پر جا رہی ہوں میں۔۔۔"

اس کا لہجہ اس قدر دوٹوک اور ترش تھا کہ ایک پل کو وہ ہل بھی نہیں سکی۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ بات سنبھلنے کی بجائے کہیں سچ مچ اور ہی نہ بگڑ جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے جواب کی منتظر اپنی بڑی بہن کو تسلی کے کچھ

بھی حروف بول کر اس کی جذباتیت کے آگے کوئی بند باندھتی۔۔۔کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر شاہجہان عادل اندر داخل ہوئے۔آہٹ سن کر وہ دونوں بیک وقت پلٹیں اور انہیں دیکھ کر گویا پتھر کی ہو گئیں۔

"بب۔۔بابا آپ۔۔۔آیئے ناں۔۔۔ہم بس آ ہی رہی تھیں باہر۔"

نمرہ نے اٹکتے ہوئے کہا اور دوپٹے کا پلو اٹھا کر سر پر جماتے ہوئے بت بنی کھڑی ثومیہ کو کہنی ماری۔

"جی بابا۔۔۔ہم آ ہی رہی تھیں بس۔"

اس کے ٹھوکے سے وہ گویا کسی خیال سے چونکی اور پھر متوازن لہجے میں کہہ کر اس کی پیروی میں سر پر دوپٹہ جمانے لگی۔ایک دم انہیں سامنے پا کر، لگنے والے جھٹکے سے وہ دونوں اب سنبھل گئی تھیں۔شاہجہان عادل بہت کم ان دونوں کے کمرے میں آتے تھے۔وہ انگلی پر گن سکتی تھیں کہ جب جب وہ ان کے کمرے میں آئے ہوں۔ایک ہی گھر کے باسی وہ سب بہت دور دور رہتے تھے۔پھر یوں ہوا کہ بغور ان دونوں کا مفاہمتی انداز پرکھ کر بہت کچھ کہنے کے ارادے سے یہاں آئے شاہجہاں عادل اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیز لہجے میں فقط یہی بولے۔

"پتا نہیں کب آ رہی تھیں پھر تم دونوں باہر۔کب سے تو بھیجا ہوا تھا تمہیں کہ بلا کر لاؤ اسے۔اور تم ہو کہ خود بھی یہیں کی ہو رہیں۔خیر اب چلو۔۔۔سب انتظار کر رہے ہیں۔"

کمال ضبط سے صرف اتنا کہہ کر وہ واپسی کے ارادے سے مڑنے لگے تھے کہ یکا یک ان کی نگاہ ان کی پشت پر موجود کھڑکی پر جا پڑی۔یکا یک وہ رکے اور ان کی ایک طرف سے ہو کر کھڑکی تک چلے گئے۔پھر کھڑکی کے دونوں پٹ باہم ملا کر کنڈی کرتے ہوئے وہ مزید بولے۔

"اور یہ کھڑکی کیوں کھول رکھی ہے اس وقت؟؟ کتنی بار منع کیا ہے بند رکھا کرو اسے۔۔۔اثر ہی نہیں کرتیں تم دونوں کسی بات کا۔۔۔جانے کس خیال میں رہتی ہو؟"

ان کے سخت لہجے کا برا منائے بغیر وہ دونوں صرف یہ سوچ رہی تھیں کہ وہ پھوپھو اور فواد کے سامنے اس کے باغیانہ روش اپنانے پر کوئی باز پرس کیوں نہیں کر رہے؟ کیا ان کی خاموشی کسی خصوصی مصلحت کے تحت ہے؟ یا پھر اندر ہی اندر وہ کوئی فیصلہ کیے بیٹھے ہیں؟ اس پل آنکھوں ہی آنکھوں میں ان دونوں نے ایک دوسرے سے کئی

طرح کے سوالات کیے۔انہوں نے پوری زندگی میں اپنے باپ کو کبھی بھی اتنا "چپ" نہیں پایا تھا۔ان کی بھید بھری خاموشی بڑی معنی خیزاور خطرناک قسم کی تھی۔

"اب چلو کہ ابھی بھی کوئی ارادہ نہیں؟"

کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے انہوں نے گھر کا تو مودب انداز میں سر کو اثباتی جنبش دے کر وہ چپ چاپ ان کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

ممتاز محمود ان دونوں کو لیے شو کے سیٹ پر آیا اور انہیں آمنے سامنے نفاست وقرینے سے دھرے صوفوں پر بیٹھنے کا کہتا ہوا خود بھی اپنی مقررہ جگہ پر جا بیٹھا۔اس کے نشست سنبھالنے کے بعد ہی گیتی اور ناز بیٹھی تھیں۔سیٹ پر آمد سے قبل، دروازے پر روک کر ان دونوں کے شانوں پر ایک ایک " کالر مائیک " بھی فکس کیا گیا تھا۔

"ایک منٹ باقی ہے کمرشل ختم ہونے میں اس کے بعد شو اسٹارٹ ہوگا اور میں تھوڑی سی تمہید میں آپ کا تعارف پیش کروں گا اور اس دوران کیمرہ صرف مجھ پر رہے گا۔آپ دونوں کے تعارف کے بعد ہی کیمرہ آپ پر فوکس ہوگا۔اوکے؟؟"

اپنے کالر سے لگا مائیک درست کرتے ہوئے اس نے جلدی جلدی میں گیتی سے کہا اور پھر کیمرہ مین کو " گیٹ ریڈی" کہتے ہوئے اس کی طرف رخ کر کے سیدھا بیٹھ گیا۔اس کا عجلت آمیز انداز دیکھتی گیتی نے بس "اوکے" کہنے پر اکتفا کیا اور ارد گرد نظر دوڑا کر سیٹ کا سرسری سا جائزہ لینے لگی۔وہ بخوبی جانتی تھی کہ زیادہ تر شوز اسی طرز وطور پر شروع ہوتے ہیں۔اس کے لیے یہ عام سی بات تھی جس کی وضاحت وہ نہیں بھی کرتا تو اسے پہلے سے علم تھا۔ناز بھی نظریں گھما گھما کر سیٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔وہی مخصوص گولائی دار طرز پر بنا عام سا سیٹ تھا جسے رنگا رنگ روشنیوں سے منور کرتے ہوئے مختلف کرسٹل پیسز سے سجایا گیا تھا۔ان کی پشت پر لگے کانچ سے پھسلتے پانی میں یقیناً نیل اور لال رنگ شامل تھا کیونکہ سفید شیشوں پر دھاریوں کی مانند پھسلتا پانی یہی دو رنگ منعکس کر رہا تھا۔سیٹ کے سٹنگ ایریا میں صوفوں کے بالکل ساتھ، لکڑی سے بنی ایک خوبصورت اور نفیس سی الماری تھی جس میں وقتاً فوقتاً اس شو پر آنے والے مختلف اداکاروں، سیاستدانوں اور دیگر کئی شخصیات کے دستخط

شدہ فوٹو فریمز سجائے گئے تھے۔ گولائی دار مرکزی فلور کے اردگرد، ریلوالونگ پیڈز یا شٹلز پر دو کیمرہ مین مختلف پوزیشنز سنبھالے یوں مستعد تھے کہ ایک دوسرے کو لینز کی حدود میں لائے بغیر سٹنگ ایریا کی ہر زاویے سے کوریج کر سکیں۔ ان تینوں کے بالکل سامنے ایک مخصوص زاویے پر بڑی سی ایل ای ڈی اسکرین نصب کی گئی تھی جسے بے آواز کر کے انہی کا چینل ٹیون ان کیا گیا تھا تا کہ اپنی آن اسکرین موجودگی وہ خود بھی دیکھ سکیں۔ ادھر پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں گیتی کے مداح۔۔۔ اور مخالفین بھی ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بے تابی سے "درحقیقت یوں۔۔۔" کی شروعات کے منتظر تھے۔ دونوں طرف کے "عوام وخواص" کا جوش دیدنی تھا۔ کئی اپنی پسندیدہ تو کئی اپنی ناپسندیدہ ترین اداکارہ کو پاکستان کے سب سے بہترین شو میں "دا موسٹ کنٹرو-ورشل ہوسٹ" کے مدمقابل اس کے تیکھے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے دیکھنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔

بالآخر جب ٹی وی اسکرین پر شو کا ابتدائی سلوگن نمودار ہوا تو سب کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں کا شوق بھی دیدنی ہونے لگا۔ جونہی ممتاز محمود کا چہرہ اسکرین پر ظاہر ہوا اس نے چمکتی ہوئی نگاہوں میں بے پناہ اعتماد بھر کر اپنے ازلی انداز میں بولنا شروع کیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔۔۔ السلام علیکم ناظرین۔۔۔ میں ہوں آپ کا ہوسٹ ممتاز محمود اور حاظر ہوں ایک اور دھماکے دار شو کے ساتھ کہ جسے آپ یقیناً کئی مدتوں تک فراموش نہیں کر پائیں گے۔ اور بھئی یہ دعوٰی بے جا اور ہوائی یوں نہیں ہے ہرگز کہ اس میں آج ہمارے ساتھ ہماری مہمان ہیں میری۔۔۔ بلکہ ہم سب کی موسٹ فیورٹ، ون اینڈ اینلی گائیتری دیوی۔۔۔ اور ان کے ساتھ ہیں ان کی سیکریٹری نازنین صاحبہ۔۔۔ جو ایک سیکریٹری سے زیادہ ان کی بہترین دوست کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ گیتی جی کو پورا عالم جانتا ہے۔ ان کے مداحین وقدردان دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ بھارتی فلم انڈسٹری کی نمبرون اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک اچھی انسان بھی ہیں جو انسانی ہمدردی کی مختلف این جی اوز سے رضا کارانہ طور پر وابستہ ہیں اور ذاتی طور پر بھی کئی چیریٹی اور سوشل ورک پراجیکٹس ان کے زیرِ نگرانی نہایت خوش اسلوبی سے رواں ہیں۔۔۔"

ہاتھوں کی معنی خیز حرکات سے طرح طرح کے اشارات کرتا یہاں وہ رکا اور ان دونوں کی جانب اشارہ کر کے آن اسکرین ہوتا ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جونہی کیمرہ ان دونوں پر گیا گیتی اور ناز نے زور زور سے ہاتھ جھلا کر

ناظرین کو "ہائے" بولا اور پھر دونوں نے بیک وقت مخصوص ہندی انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے سب کو نمستے کہا۔

"نمستے پاکستان۔۔۔اور دھنے واد آپ سب کا کہ ہمیں اتنی محبت سے بلایا۔"

گیتی کے دلکش انداز وادا پر ناظرین بے طرح فدا ہوئے۔اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی ابھی اسے باقاعدہ بولنے کی دعوت نہیں دی گئی۔یہاں بنا توقف کے ممتاز محمود نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اسکرین پر دوبارہ اس کے چہرے کو فوکس کیا گیا۔

"تو ناظرین یہ بتانے کے بعد میں بلا تاخیر میڈم سے گفتگو کی جانب بڑھ رہا ہوں کہ گیتی جی نے حال ہی میں پاکستان فلم انڈسٹری یعنی لالی ووڈ کی ایک اہم ترلیکن متنازعہ فلم "خدا کے بھگت" میں بہت کم معاوضہ پر کام کرنے کی حامی بھری ہے اور اسی کی شوٹنگز کے سلسلے میں ان کی پاکستان میں موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ان سے بڑی گزارش کر کے وقت لیا تاکہ ان کے مداح ان سے ہوئی میری کھلم کھلا گپ شپ سے لطف اندوز ہوسکیں۔اور انہیں مزید جان سکیں۔میری کوشش ہوگی میں ان سے ہر وہ سوال کروں جس سے ہر اس کھوج اور تجسس کو تقویت ملے جو آپ سب کے دلوں میں گیتی جی کی ذات سے متعلق ہے۔تو بڑھتے ہیں گیتی جی کی جانب۔۔۔"

اب اسکرین پر گولائی دار پورا سیٹ دکھانے کے بعد گیتی اور ناز کو بھی فوکس کیا گیا۔

"السلام علیکم گیتی جی۔۔۔سب سے پہلے تو یہ بتایئے گا کہ پاکستانی فلم کرنے کا سوچا بھی کیسے؟ ایک ہائی لیول انڈسٹری کو چھوڑ کر اس کے مقابل بہت چھوٹی انڈسٹری کی فلم سائن کرنے کا خیال کیونکر آیا؟ کیا اس کے پیچھے کوئی خاص وجوہات رہیں یا جو بھی اس کا بیک ڈراپ ہے پلیز کھل کر بتایئے۔۔۔؟"

اس نے بڑے طریقے سے پہلا ہی سوال اپنے مطلب کا کیا تھا اور اس سوال کا جواب اگلوانے کے متعلق اسے کہیں سے خصوصی ہدایات بلکہ احکامات بھی تھے۔اس کے سوال سے زیادہ اس کے کھوجیلے انداز پر وہ دونوں چونک گئیں۔بارہا ان سے یہ سوال ہونے کے باوجود انہیں صاف صاف لگا کہ ممتاز محمود کا پوچھنا اور ہے باقیوں کا پوچھنا اور۔۔۔

ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی جو غیر محسوس انداز میں، اندر ہی اندر ہمیں آنے والے وقت کی ہر ایک منفی و مخفی جنبش سے آگاہ کرنے لگتے ہیں۔

ناز نے "خدا کے بھگت" کو متنازعہ کہے جانے پر بغور گیتی کا چہرہ پڑھا۔ وہاں سحر گر مسکانوں میں کمال تر اطمینان رقصاں تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا گویا اس نے یہ لفظ سنا ہی نہ ہو۔ پھر ممتاز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ نہایت اعتماد سے گویا ہوئی۔

"وعلیکم السلام ممتاز صاحب۔۔۔ اور یہ وہ سوال ہے جو دونوں ممالک کے میڈیا نمائندگان کی جانب سے مجھ سے بارہا کیا گیا ہے۔ خیر ایک بار پھر سے بتائے دیتی ہوں کہ میرے نزدیک انڈسٹری سے زیادہ اہمیت میرے رول کی ہوتی ہے۔ اور اگر پاکستانی فلم میں بھی مجھے ایک مضبوط، منفرد اور اہم تر کردار نبھانے کو ملے تو میں نہیں سمجھتی اس میں کوئی حرج کی بات ہے۔ جملہ وہی گھسا پٹا ہے شاید یہ کہ فن اور فنکار کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن اس جملے میں مخفی معنویت بڑی با کمال ہے۔ یہی بات قوی و اٹل ہے کہ فن و فنکار دراصل زبان و بیاں سے لے کر حدو سرحد تک سے ماوراء ہوتے ہیں۔ مجھے کردار پسند آیا تو میں نے فلم قبول کر لی۔ سیدھی سی بات ہے جس میں اور کوئی علت شامل نہیں۔۔۔"

خود کو انتہائی متوازن رکھتے ہوئے خالص اردو لب و لہجہ میں جب اس نے جب تفصیلی وضاحت کی تو اس کا دوٹوک جواب پسند آنے کے باوجود ناز نے بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے دیش کی نمائندگی کرتے ہوئے یہی جواب اسے "شدھ ہندی" میں دینا چاہیئے تھا۔

اس کا جواب سن کر ممتاز محمود کے لبوں پر ایک پراسرار مسکان طاری ہوئی اور اپنی طے شدہ سٹریٹجی کے تحت نہایت احترام سے وہ بنا توقف کے مزید بولا۔

"دیٹس گڈ میڈم۔۔۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو یہ بتائیے گا پلیز کہ آپ نے اس فلم کے لیے معاوضہ کتنا وصول کیا ہے۔۔۔؟ شنید یہ ہے کہ آپ نے فلم اپنی مارکیٹ پرائس سے بھی بہت کم میں سائن کی ہے جبکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ایک غیر ملکی فلم کے لیے آپ اپنی پرائس سے زیادہ بلکہ دوگنا وصولتیں۔۔۔"

اس سوال پر گیتی نے ایک شفاف قہقہہ لگایا تھا اور اس کی سفید موتیوں سی کھلکھلاہٹ سے گویا سارے

ناظرین کا دل منور ہونے لگا۔اس کی ہنسی میں عجب سروں سا ردھم تھا۔

بناریا کے قدرتی ہنسی۔۔۔

اور پھر اپنا قہقہہ روک کر پہلے ناز اور پھر ممتاز کو دیکھتی وہ بڑی عقیدت سے بولی۔

"دیکھیئے ممتاز صاحب میرا رفیق صاحب سے تعلق اس قسم کا ہے کہ ان سے اس موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی۔پھر یہ فلم اسکرپٹ مجھے اس قدر پسند آیا کہ مجھے اگر یہ فلم بنا معاوضے کے پھوکھٹ میں ہی سائن کرنا پڑتی تو بھی میں ضرور کرتی۔۔۔جبکہ اب تو میں نے اس کا معاوضہ بھی وصولا ہے۔خیر بات کا مقصد یہ ہے کہ میرے معاوضے سے کہیں قیمتی پیام و مقصد تھا اس فلم کا۔۔۔اور بس "انسانیت" کے اسی پہلو کو معاشرے تک لانے کے لیے اپنی خصوصی خدمات پیش کی ہیں۔ایگزیکٹ پرائس تو نہیں بتا سکتی کیونکہ ناز غصہ کر جائے گی۔لیکن یہ فلم بہر حال اچھا خاصہ معاوضہ لے کر سائن کی گئی ہے۔۔۔باقی ان باتوں پر میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ یوں ہونا چاہیئے تھا یا ووں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ میرا دل مجھے ان پہلوؤں پر سوچنے ہی نہیں دیتا۔۔۔یعنی یوں سمجھیں کہ میں "دل والی" ہوں بس۔۔۔ہاہاہا۔۔۔!!"

کمال ترادائیں بکھیر کر اپنا مطمع نظر سمجھاتے ہوئے اس نے بات کے اختتام پر ایک اور قہقہہ لگایا۔وہ اب اس شو اور اس کے سوالات سے حقیقتاً لطف اٹھا رہی تھی۔ممتاز محمود نے بغور اس کی "شفافیت" پرکھی اور اگلا داؤ کھیلنے کو نئی تمہید باندھنے لگا۔وہ اسے اب تک کہیں سے بھی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں لگی۔

"چلیں اچھا لگا سن کر کہ آپ کے رفیق صاحب سے اچھے واسطے ہیں اور پرائس فگرز بھی آپ نہیں بتانا چاہتیں تو میں زور نہیں دوں گا۔بلکہ میں آپ کے خیالات سے متاثر ہوا ہوں۔بہت کم لوگ ایسے "دل والے" ہوتے ہیں جی۔اور اگلا سوال ناز میڈم سے کروں گا کہ میڈم آپ بتائیں کیسا پایا پاکستان کو؟ لوگ کیسے لگے؟ شوٹنگز کیسی رہیں۔۔۔؟"

ناز سے یہ سوال صرف اسے عزت دینے کو اور گپ شپ کا ماحول بنانے کو کیا گیا تھا ورنہ اسے صرف گیتی سے سوالات کرنے میں دلچسپی تھی۔اس کی عادت تھی کہ مہمانوں کو بڑی سہولت سے اور دوستانہ انداز میں بہت گھیر گھار کر من پسند مدعے پر لایا کرتا تھا۔

"دھنے واد بھیا جی۔۔۔ پاکستان اچھا دیش ہے۔ لوگ بھی دھیان کرنے والے ہیں۔ بہت پریم ملا یہاں سب سے ہمیں۔ بڑا مان سمان دیا گیا ہر جگہ ہم کو۔ شوٹنگز کا ماحول ہر کہیں ایک سا ہوتا ہے۔ وہ فرق نہیں لگا ہمیں۔ اچھا لگتا تھا جب بہت سے لوگ بڑی محبت سے اپکار اور بھینٹ لاتے تھے ہمارے واسطے۔ میں سب کو دھنے واد کہنا چاہوں گی اس شو میں جنہوں نے ہمیں اتنا قیمتی سمجھا۔ شکریہ۔۔۔ تھینکس۔۔۔"

ان سوالات کا چھوٹے چھوٹے جملوں میں آسان ہندی کا استعمال کرتے ہوئے اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ اس دوران اس کے چہرے پر لوگوں سے ملی محبتوں کے مناظر جمع تھے اور بار بار گیتی کو دیکھتے ہوئے وہ گویا اسے بھی ہندی میں بات کرنا باور کروا رہی تھی۔ جو گیتی سمجھ کر بھی نہیں سمجھی۔

"بہت خوب ناز جی۔۔۔ بہت اچھا لگا یہ بھی جان کر کہ آپ کو پاکستان اور پاکستانی۔۔۔ دونوں پسند آئے ہیں۔ اور اب ایک چھوٹے سے کمرشل بریک پر جانے سے پہلے میں گیتی جی سے اگلا سوال یہ کرنا چاہوں گا کہ ابھی ابھی آپ نے ذکر کیا ہے "لفظِ انسانیت" کا۔۔۔ کہ اس فلم "خدا کے بھگت" میں انسانیت کا پیغام و پیام پوشیدہ ہے۔ گیتی جی فلم کو ایک طرف کر کے کیا آپ اپنے لفظوں میں بتا سکتی ہیں کہ "انسانیت" کی تعریف کیا ہے؟؟ پلیز۔۔۔"

ناز کے جوابات پر خوشدلی سے مسکراتے ہوئے اس نے نہایت شیریں لہجے میں پھر سے گیتی کے گرد جال بننا شروع کیا۔ اس کے سوال پر اسے عمیق تر نظروں کے حصار میں رکھ کر ایک لمحے کے لیے گیتی نے کچھ سوچا اور پھر لہجے میں ہزاروں نرمیاں سموئے اس نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

"میرے خیال سے کسی بھی "انسان" میں پائی گئی کوئی بھی۔۔۔ "مثبت نیت" ہی دراصل "انسانیت" ہے۔ اور ہمارا عمومی معاشرتی رویہ اب اس قدر گراوٹ کا شکار ہے کہ ہمارے اردگرد، آس پاس اور جا بجا۔۔۔ انسان تو بہت سے پر ان کی وہ "نیت" نہیں رہی۔ یعنی کہ اب کہیں بھی "انسانیت" نہیں رہی۔۔۔"

بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک سے کئی کانچ جلنے لگے تو اس نے انگلی کی نازک پوروں سے ان قطرات کو بڑی ادا سے جھٹکا۔ ادھر اسکرین پر اس کا شو دیکھتا ہر ایک فرد اس کے اس خوبصورت ترین جواب اور جذباتی کیفیت سے بندھ کر اس کے سحر میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے دلکش لہجے میں ایسا کوئی طلسم تھا کہ

ایک پل کے لیے ممتاز محمود بھی اپنے "مقصد" سے ڈگمگانے لگا۔ اور اپنی اس ہڑبڑاہٹ کو چھپانے کے لیے تیزی سے اس نے کمرشل بریک کا اعلان شروع کیا۔

"جی تو ناظرین کہیں مت جایئے گا۔ گیتی میڈم اور ناز جی سے ہماری یہ گفتگو اب حساس تر مراحل میں داخل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ ابھی آپ نے ان کا خوبصورت جواب سنا۔۔۔ تو ساتھ رہیئے گا۔۔۔ ملتے ہیں ایک چھوٹے سے بریک کے بعد۔۔۔"

اور اس کے اعلان کے ساتھ ہی ناز اور گیت نے سامنے لگی خاموش سکرین پر "شو سلوگن" کے بعد "کوکنگ آئل" کا ایڈ چلتے دیکھا۔

جونہی وہ سب "بی ہائینڈ دا سین" ہوئے اور ان کا رابطہ "سکرین" سے منقطع ہوا تو ناز نے متحمل لہجے میں گیتی کو مخاطب کرتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔

"گیت تم ہندی میں بات کرو یار۔ سارا پاکستان ہی نہیں پورا بھارت بھی دیکھ رہا ہوگا۔"

اس کے ملتجی انداز پر وہ نرمی سے مسکرائی۔

"کچھ نہیں ہوتا یار۔ بھارتیوں کا دل میں کب سے جیت چکی۔ اب پاکستانیوں کی باری ہے اور یوں بھی یہ "خدا کے بھگت" سے متعلقہ انٹرویو ہے۔ اس کے لیے اردو ہی مناسب ہے۔ تم فکر مت کرو کچھ نہیں ہوتا۔ سوچنے دو جسے جو بھی سوچتا ہے کوئی۔"

اس نے بھی متوازن لیکن دوٹوک بات کہی تو ناز نے گویا ہار مانتے ہوئے لب بھینچ لیے۔ پھر اس نے ممتاز محمود کی طرف دیکھا جو اب پانی پی رہا تھا۔

"ممتاز صاحب ایک بنتی کروں گی کہ کوئی ایسا سوال مت کیجیئے گا جس سے بعد میں گیتی کے لیے مشکلات پیدا ہوں۔ جیسا کہ شروعات میں آپ نے "متنازعہ" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ تو اس قسم کے الفاظ سے گیتی کے لیے مخالفت سر اٹھا سکتی ہے۔ سو پلیز۔۔۔"

اس نے سنجیدگی سے یہاں تک کہا اور رک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب کی منتظر ہوئی۔ جواباً اس نے کسی قدر اچنبھے سے اسے دیکھا اور سوال کی روح سمجھ کر اس کے چہرے پر تحیر ابھرا۔ لیکن اس سے

پیشتر کہ وہ کچھ بھی کہتا گیتی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک کر نہایت نرمی سے ناز کے گھٹنے کو چھوا۔

"ارے۔۔۔کچھ نہیں ہوتا ناز۔انہوں نے اب تک کوئی ایسی بات نہیں کی۔متنازعہ اگر کہا فلم کو تو یہ حقیقت بھی تو ہے۔تم جانتی ہو کہ یہ فلم شروع سے ہی متنازعہ رہی ہے۔خیر۔۔۔جانے دو یار۔پوچھنے دو ان کو جو بھی یہ پوچھنا چاہتے ہیں۔۔۔"

اس نے سلیقے سے ناز کو دھیرج کرنے کی کوشش کی تو مطمئن نہ ہو کر بھی اس نے خاموش ہونا مناسب سمجھا۔ وہ جان گئی تھی کہ آج ایک بار پھر گیتی سمجھنے کی "کیفیت" میں نہیں ہے۔ادھر کب سے چپ رہ کر ان کی یہ "راس لیلا" سنتا ممتاز محمود خوشدلی سے مسکرایا اور باری باری ان دونوں کو مخاطب کر کے اپنے ازلی شاطر لہجے میں بولا۔

"بہت شکریہ گیتی جی۔۔۔بریک کے بعد میں فلم کے نام سے متعلق یہی سوال کرنے والا تھا۔اور آپ بالکل فکر مت کریں ناز میڈم۔۔۔ویسا کچھ نہیں ہوگا جو بھی آپ کو خدشات لاحق ہیں۔سب جانتے ہیں کہ یہ فلم کے بارے میں عمومی بات چیت ہے اور اس میں ہر پہلو ڈسکس ہو سکتا ہے۔پلیز آپ پریشان نہیں ہوں ورنہ میں آسانی محسوس نہیں کروں گا۔۔۔لوگ گیتی میڈم کو سننا چاہتے ہیں ہر طرح سے اور بس۔۔۔"

اس نے مودب انداز اختیار کرتے ہوئے ملفوف لفظوں میں ناز کے سب اعتراضات کو کمال مہارت سے رد کر دیا تو بے بسی سے گیتی کی جانب دیکھتی وہ جواباً مسکرا بھی نہیں سکی۔اور اسی وقت کان میں لگی "بلیوٹوتھ ڈیوائس" میں سے بریک ختم ہونے کی اطلاع سن کر، ان دونوں کی باہمی "معنی خیز نگاہیں" پڑھتا ہوا، دل ہی دل میں شیطانیت سے ہنستا وہ دوبارہ شو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ویلکم بیک ناظرین۔۔۔ہماری معزز مہمان پورے دل سے ہمارے ساتھ ہیں اور ہمارے ہر طرح کے سوالوں کا سامنا کرنے پر مکمل راضی بھی۔۔۔تو بنا تاخیر بڑھتے ہیں اگلے سوال کی جانب۔۔۔"

یہاں یک لمحاتی توقف سے اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو "باہمی مصروفیت" چھوڑ کر ناز اور گیتی بھی اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"تو گیتی جی جیسا کہ آپ نے کہا اس فلم "خدا کے بھگت" میں عام لوگوں کے لیے پیامِ انسانیت ہے۔۔۔درسِ محبت ہے۔۔۔سندیسہ لگاوٹ ہے۔۔۔تو میرا سوال یہ ہے کہ فلم کے نام یعنی ٹائیٹل پر آپ کو کس قدر یقین

ہے۔۔۔؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ خدا کے بھگت سچ مچ "ورک" کرے گا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو پچھتانا پڑ جائے اور خدانخواستہ فلم فلاپ ہو جائے۔اس کا پیغام پہنچ ہی نہ سکے؟ کیا کہیں گی اس پر۔۔۔؟؟"

اب کی بار اس کا لہجہ کسی قدر تیز اور چبھتا ہوا سا تھا۔گیتی کو پہلی بار لگا کہ یہ لہجہ کچھ کچھ اکسانے جیسا ہے۔ سوال کے ہر جز کو حرف حرف سمجھتی وہ متانت سے مسکرائی اور پھر اس کی آنکھوں میں وہی یقین ابھر آیا جو اس کی "پہچان" بن گیا تھا۔

"ممتاز صاحب فلم کی ریلیز ابھی دور ہے بہت۔۔۔ابھی تو اس کی شوٹنگز بھی مکمل نہیں ہوئیں۔اور سب جانتے ہیں کہ فلم کی ریلیز سے پہلے میں کوئی دعوٰی یا حتمی بات نہیں کرتی لیکن اس فلم کے لیے آپ کے شو میں آن دا ریکارڈ کہتی ہوں کہ یہ فلم نا صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں ریلیز ہو گی سپر ڈپر ہٹ رہے گی۔اس کے منفرد نام اور جاندار اسکرپٹ پر بھروسہ کرتے ہوئے مجھے پورا یقین ہے کہ اسے بے تحاشا ویورشپ ملنے والی ہے۔رہی بات اس کے متضاد خدشات کی جن کا آپ نے ذکر کیا ہے تو اس پر فقط یہی کہوں گی کہ وقت کو آنے تو دیں۔پھر سارا کچھ سامنے آ ہی جائے گا۔پچھتانا پڑتا ہے کہ فخر کرتی ہوں اس فیصلے پر۔۔۔اس کا اختیار صرف وقت کے حوالے ہے۔"

پھر گداز لہجے میں دلکش لبوں سے،طرح طرح کے خوش رنگ زاویے بناتی یہاں وہ رکی اور بغور اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی فسوں گر لہجے میں مزید بولی۔

"وقت کے دامن کی ایک اہم خاصیت ہوتی ہے ممتاز صاحب کہ اس میں "چھید" ہوتے ہیں۔یہ کچھ بھی خود میں ڈھانپ کر نہیں رکھتا۔ایک نہ ایک دن لمحات کی گرفت سے پھسل کر سارے نتائج اور کل حقائق عیاں ہونا ہی ہوتے ہیں۔تو بس پھر ہمارے ساتھ ساتھ آپ بھی منتظر ہو جائیے کہ وقت ہمارے حق میں فیصلے کرتا ہے یا ہمارے خلاف۔۔۔؟؟"

کامل جواب دے کر بھی وہ گفتگو کو ایک لاحاصل دوراہے تک لے آئی تو وہ اس کی ذہانت کا معترف ہوا۔ پھر یکایک لفظوں کی کانٹ چھانٹ کر کے گیتی سے ہوتی اس دلچسپ گفتگو کو اس نے اک نئے دور میں داخل کرنا چاہا۔

" گیتی جی اس فلم کے نام کو لے کر پاکستان اور بھارت یعنی دونوں طرف کی مذہبی جماعتیں کئی طرح کے "تحفظات" کا شکار ہیں۔ بلکہ شنید یہ ہے کہ صرف آپ کے والد کے سیاسی اثر ورسوخ کی بدولت لوگ چپ ہیں ورنہ درِ اندرون آپ کی مخالفت اور حق میں کھڑے ہونے والے دونوں حلقوں کے مابین بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ تو اس پر آپ کا کوئی واضح موقف سامنے نہیں آیا۔۔۔؟؟ اس موضوع پر کیا کہنا چاہیں گی آپ۔۔؟؟"

اس کے صریحاً مباحثے کو ہوا دیتے سوال پر ناز کی پیشانی بے ساختہ شکن آلود ہوئی۔ اور قریب تھا کہ اس کے اس شاطرانہ پینترے پر وہ اسے ٹوک بھی دیتی لیکن گیتی نے ایک بار پھر اس کا گھٹنا دبا کر اسے "شانت" رہنے کا اشارہ دیا۔ اس سے اتنے واشگاف سوال کی امید خود اسے بھی نہیں تھی لیکن جب ڈھول گلے پڑ ہی گیا تھا تو وہ اب اسے سلیقے سے بجانا چاہتی تھی۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے لفظ ترتیب دیے اور پھر حسین آنکھوں کے تراوٹی کناروں پر، مثبت خیالات کے خوش رنگ عکوس ٹکا کر وہ دھیرے دھیرے بولنے لگی۔

" ممتاز صاحب ایسی کسی بھی مخالفت سے میں قطعاً لاعلم ہوں اب تک۔ اور یہ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ میرے فادر کا سیاسی کیرئیر اپنی جگہ ہے اور میرا فلمی کیرئیر اپنی جگہ۔ میرے کیرئیر سے متعلقہ کسی بھی معاملے یا فیصلے میں انہوں نے پہلے بھی کبھی دخل اندازی نہیں کی اور میرا خیال ہے ناں ہی آئندہ کبھی کریں گے۔ سب جانتے ہیں کہ میں نے اپنے بل بوتے پر اپنا کیرئیر بلڈ کیا ہے۔ خیر۔۔۔ بات کو بے جا طول دینے سے بہتر ہے کہ صرف فلم پر ڈسکشن ہو۔ اور اس حوالے سے صرف یہ کہنا چاہوں گی کہ میں جانتی ہوں دونوں طرف سے کچھ لوگ، جماعتیں یا گروہ شروع سے ہی اس فلم کے نام "خدا کے بھگت" پر معترض ہیں۔ ادھر والوں کا کہنا ہے کہ "خدا" کے ساتھ "بھگت" کیوں لکھا ہے اور ادھر والوں کا کہنا ہے کہ "بھگت" کے ساتھ "خدا" نہیں بھایا ان کو۔ یعنی کسی کو "خدا" کے ساتھ "عبد" چاہیئے تھا تو کسی کو "بھگت" کے ساتھ "بھگوان"۔۔۔ اور یہ تو عام اعتراضات ہیں جو جانے کب تک ہوتے رہیں گے۔ شاید فلم کی ریلیز تک یا شاید اس کے بعد بھی۔۔۔ ان پر کیا سوچنا یا موقف دینا ہے میں نے۔ بس یہی کہنا بہتر سمجھتی ہوں کہ فلم آنے دیں دیکھ کر فیصلہ کیجیئے گا کہ اس کا نام اس کی کہانی کے عین مطابق تھا کہ نہیں؟؟ یوں وقت سے پہلے ڈھنڈورے پیٹنے سے سوائے نفرت کے حاصل حصول کچھ نہیں ہونا۔ شکریہ۔۔۔"

لہجے کے دلنشیں اتار چڑھاؤ میں اس نے بات مکمل کی اور آخر پر خوشدلی سے مسکراتے ہوئے اپنے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔اس کا یہ انداز لاپرواہی کے کسی اظہار کا سا تھا۔دیکھنے والوں کو بھی اس پل وہ کسی قدر مغرور لگی۔

اس دوران مسلسل اپنی انگلیاں مسلتی ناز کا گویا بس نہیں چلا کہ گیتی کو اس قدر "برجستہ، نڈر اور دوٹوک" گفتگو سے روکنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔اس نے لاشعوری طور پر بے چینی کے عالم میں اپنی نشست پر کئی پہلو بدلے۔جبکہ اس کی یہ ساری گفتگو اور لب ولہجہ اب ممتاز محمود کی من پسند نہج پر رواں ہونے لگا۔اس نے کن انکھیوں سے دیوار گیر گھڑیال دیکھتے ہوئے اگلے کمرشل بریک تک کا وقت جانچا اور اس طرف سے مطمئن ہوکر بڑی خوش اخلاقی سے اجازت طلب لہجے میں بولا۔

" گیتی جی اس پر تو اپنی رائے یا موقف کی بڑی عمدگی سے وضاحت کی ہے آپ نے جو یقیناً اس قدر مدلل ہے کہ چاہ کر بھی اس کی تردید ممکن نہیں۔اب اگر اجازت ہو تو ایک ذاتی بلکہ غیر متعلقہ سوال کی جسارت کر سکتا ہوں؟؟"

نہایت شائستہ انداز میں اس کے یکا یک موضوع بدلنے پر ناز نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔اس کا خیال تھا کہ وہ اس بات کو مزید رگڑے گا ابھی۔وہ بے خبر تھی کہ دراصل وہ کس بات کو رگڑنا چاہتا ہے؟

یہاں گیتی نے تولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور کسی نادیدہ "شر" کی مشک پا کر متوازن لہجے میں قطعیت سے بولی۔

"جی جناب آپ پوچھ سکتے ہیں لیکن یہ اجازت مشروط یوں ہے کہ سوال اگر انتہائی نجی یا کسی بھی زاویے سے نامناسب ہوا تو شاید میں جواب نہیں دے سکوں گی۔اور میں امید کرتی ہوں کہ آپ اور ناظرین اس بات کا برا نہیں منائیں گے۔۔۔"

اس کے دفاعی انداز پر وہ کھل کر ہنسا۔

" نہیں گیتی جی سوال اتنا بھی ذاتی اور غیر متعلقہ نہیں کہ آپ جواب ہی نہیں دے سکو۔خیر سوال کی طرف آتے ہیں۔۔۔میڈم آج اپنی میڈیا ٹالک کے دوران آپ نے ایک جملہ ادا کیا ہے کہ " میں اپنے بھگوان اور

آپ کے خدا کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہوگا کہ اس نے مجھے اتنی محبتوں سے نوازا ہے۔۔۔" اور آپ یقیناً ناواقف ہیں ابھی کہ آپ کے اس بیان کا اس وقت سوشل میڈیا پر خوب چرچا ہو رہا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے یہ بیان کس تناظر میں دیا ہے؟؟ کیا آپ بھگوان اور خدا کو (معاذ اللہ) ایک ہی سمجھتی ہیں۔۔۔؟؟"

یہ سوال نہیں گویا ایک دھماکہ تھا جس نے گیتی اور ناز دونوں کے آس پاس موجود ہر ایک شے کو ایک پل کے لیے بالکل منتشر کر دیا۔ وہ واقعی نہیں جانتی تھی کہ اس کے بیان کو لے کر سوشل میڈیا پر اسی وقت سے بحث جاری ہے اور وہ اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ اس بحث کو ہوا و طول دینے میں صرف اور صرف، خفیہ ہاتھوں کے آلہ کار ممتاز محمود اور اس کے سوشل میڈیا سیل کا اپنا ہاتھ ہے۔ اس کے اس عام سے بیان کو جان بوجھ کر متنازعہ بنا کر اس کی شخصیت کو مسخ کرنے کی باقاعدہ ایک کمپین شروع ہو چکی تھی جس میں انہیں فی الوقت کوئی خاص کامیابی تو نہیں مل سکی لیکن کوشش بہرحال جاری تھی۔

شروع سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی گیت پہلی بار کچھ پریشان دکھائی دی۔ اس سوال پر ان کے ساتھ ساتھ وہاں موجود کیمرہ مینز، لائٹ اینڈ ساؤنڈ کنٹرولر مین، اور سارے ناظرین۔۔۔ غرض ہر فرد کی سانسیں ساکن ہوئیں۔ ہر کوئی جاننا چاہتا تھا ایک "ہندو" اداکارہ اب "خدا" کے بارے میں کیا استدلال کرتی ہے۔ اور گیتی کی پریشانی کا سبب یہ تھا کہ اس سوال کا کسی بھی زاویے سے دیا گیا کوئی بھی جواب اس کے لیے سراسر نقصان دہ ہوتا۔ وہ سچ مچ بری پھنسی تھی۔

بالآخر تفہیم کی کوشش میں سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے گیتی نے خود کو سنبھالا اور آنکھوں سے ماند پڑتے اپنے ازلی یقین کو ایک "نئی نئی" جوت سے دوچند کرتی وہ مسکرا کر بولی۔

"ممتاز صاحب میں اتنی عالم فاضل نہیں ہوں شاید کہ خدا اور بھگوان میں فرق کر سکوں۔ میں یہ بھی نہیں جانتی یہ "ایک" ہیں کہ نہیں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ کسی کے "بھگوان" کو بھی برا مت کہے کوئی۔۔۔ کیونکہ اس کے دل میں تو وہی اس کا "خدا" ہوتا ہے۔۔۔"

دوٹوک جواب دے کر اس نے تسلی بخش نظروں سے کب سے خود کو گھورتی ناز کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں یہ تحریر واضح پڑھی جا سکتی تھی کہ "میں نہ کہتی تھی اس شخص سے دور ہی رہنا۔۔۔"

اور اس کے جواب پر بنا توقف کے وہ جرح کے سے انداز میں مزید بولا۔

"لیکن گیتی جی "خدا" معاذ اللہ کسی بھی طور "بھگوان" نہیں ہوتا۔۔۔"

جواباً تیز لہجے میں کیے گئے اس کے اعتراض پر وہ بھی دوبدو ہو کر بولی۔

"تو پھر آپ صرف یوں کہیں کہ "بھگوان" کسی بھی طور پر "خدا" نہیں ہوتا۔ کیونکہ "خدا" کب، کہاں اور کس کے لیے "کیا، کیا" ہو سکتا ہے یہ میں، آپ اور ہم میں سے کوئی بھی طے نہیں کر سکتا۔۔۔"

اب کی بار گیتی کی آنکھوں میں عجب سی لو جلنے لگی۔ آگ سا کچھ تھا جو اس کے انداز تک سے جھلکنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر ناز کو صاف صاف لگا کہ وہ خود پر اختیار کھو "رہی" ہے اور اسے بالکل ٹھیک لگا۔۔۔ وہ واقعی خود پر اختیار کھو "چکی" تھی۔ ہاں فی الوقت اسے اپنی بے اختیاری کا ادراک نہیں تھا۔ اس نے بالکل ویسے "جملے" ادا کیے تھے جیسے ممتاز محمود چاہتا تھا کہ وہ ادا کرے۔ یہاں اپنے آقاؤں سے ملا ایک اور ہدف اس نے بڑی "خوش اسلوبی" سے حاصل کر لیا۔ اور یہی وہ پل تھا جب کمال مہارت سے بنا کسی مزید جرح کے اپنے لہجے کو واپس شائستگی میں ڈھالتے ہوئے وہ دوسرے اور آخری کمرشل بریک کا اعلان کرنے لگا۔

"جی تو ناظرین مجھے یقین ہے کہ آپ اب تک کی ہوئی ہماری اس کھلم کھلا "گپ شپ" سے خوب لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ میں جانتا ہوں کہ اپنی پسندیدہ اور نمبر ون ادا کارہ کے اچھے اور مثبت خیالات جان کر بہت مسرور ہیں آپ۔۔۔ تو کہیں مت جائیے گا۔۔۔ ہمارے ساتھ رہیئے گا۔۔۔ ملتے ہیں ایک چھوٹے سے کمرشل بریک کے بعد اور واپس آ کر ہم جانیں گے گیتی جی کی سپر ہٹ فلموں سے وابستہ ان کی یادوں کے بارے میں۔۔۔ سوال کریں گے ان کے بچپن، لڑکپن اور ہاں۔۔۔ قیامت خیز جوانی پر بھی۔ تو بس تھوڑا سا انتظار دوستو۔۔۔ سٹے ٹیونڈ۔۔۔"

لہجے کے دلکش زیرو بم میں طرح طرح کی بولیاں بولتے ہوئے اس نے یوں ماحول بدلا کہ کچھ دیر پہلے کی ساری "کشیدگی و سنگینی" کہیں بہہ سی گئی۔

پھر "آف اسکرین" ہو کر بھی اس نے ان دونوں سے کسی بھی بات کا برا لگنے پر "تہہ دل" سے معذرت کی جسے گیتی نے خوشدلی سے "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔" کہہ کر رد کیا جبکہ ناز نے بحالت مجبوری گویا دل پر

پتھر رکھتے ہوئے نظر انداز کیا تھا۔ ورنہ جس طرح سے اس نے ماحول کو بے وجہ " گرمایا" تھا ناز کا دل کیا کہ بنا لاگ ولپیٹ اسے کھری کھری سنائے۔

اور بریک کے بعد حسب وعدہ اور طے شدہ شیڈول کے تحت اس نے کوئی بھی " غیر متعلقہ یا ذو معنی" سوال نہیں کیا اور عام وخوشگوار لہجے میں گیتی کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بے ضرر قسم کے سوالات کرتے ہوئے شو تمام کر دیا۔ اختتام پر گیتی اور ناز سے ان کی فریم شدہ تصویروں پر دستخط کروا کر اس نے انہیں شو کی " سٹارز گیلری" میں سجایا اور پھر چینل کے ایک ہال نما کمرے میں اس چینل کے مختلف شعبوں سے وابستہ نمایاں شخصیات کے ساتھ ایک طویل فوٹو سیشن کروا کر انہوں نے واپسی کی اجازت طلب کی۔ جواباً نہایت خلوصِ دل سے انہیں رات کے کھانے کی دعوت دی گئی جسے انہوں نے اسی خلوص سے یہ کہتے ہوئے لوٹایا کہ " کھانا فریش ہونے کے بعد ہم ہوٹل میں ہی کھائیں گی۔۔۔" کیونکہ سارے دن کی شوٹنگ اور اب اس شو کے بعد وہ ذہنی وجسمانی طور پر بہت تھک چکی تھیں۔

ممتاز محمود انہیں پوری عزت سے رخصت کرنے کے لیے کار پارکنگ تک ان کے ساتھ آیا اور جب تک ان کا قافلہ مرکزی احاطے سے باہر نہیں نکلا تب تک زیرِلب بڑی پراسراریت سے مسکراتا وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر شیطانیت کا رقص تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن مصطفین کی آنکھ الارم کی سماعت شکن آواز پر کھلی۔ وہ پہلی ہی گھنٹی پر جاگ گیا اور ہاتھ بڑھا کر پلنگ کی دائیں جانب موجود سائیڈ ٹیبل کو ٹٹولتے ہوئے اس پر دھرے الارم پر ہاتھ مار کر اسے بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد دائیں بائیں کروٹیں لے لے کر دو تین لمبی لمبی انگڑائیاں لیتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائیاں لینے لگا۔ کمرے میں جلتی سفید روشنی میں اس کی حسین آنکھیں نیند کے باعث سوجن کا شکار ہو کر اور خوبصورت لگ رہی تھیں تو گلال رنگ گالوں کی چمکدار جلد بھی روشن روشن ہو رہی تھی۔ ٹانگوں سے کمبل ہٹاتا وہ بیڈ سے اترا اور پاجامے کا کھنچاؤ درست کرتے ہوئے پاؤں میں چپل اڑس کر حسب عادت عقبی گلی میں کھلتی کھڑکی پر جا رکا۔ سونے کے لیے پہنے گئے ڈھیلے ڈھالے آرام دہ لباس میں بھی اس کی وجیہہ جسامت نکھر نکھر کر عیاں ہو

رہی تھی۔ باہر اندھیرے کے اثرات ابھی باقی تھے اور مکانوں کی چھتوں پر دھرے کبوتروں کے اونچے اونچے جالی دار چھجوں سے لے کر نیلی مسجد کے اطرافی گنبد پہ لہراتے "سبز مدنی پرچم" تک۔۔۔ ہر منظر اس ملگجے اندھیرے کی لپیٹ میں تھا۔ مسجد کے صحن سے اٹھتی ہل ہل کر سپارہ پڑھتے بچوں کی وہی مخصوص آوازیں اور فضا میں قطار در قطار رزق کی تلاش میں سرگرداں چہچہاتے ہوئے پرندوں کا وہی روز کا شور۔۔۔ صبح کی ہر ہر آہٹ کو بغور سنتا وہ بے طرح مسرور ہوتا رہا۔ پھر جھک کر اس نے گلی میں جھانکا تو نمازیوں کو مسجد سے لوٹتے دیکھ کر دل ہی دل میں نماز نہ پڑھنے پر شرمندہ ہو گیا۔

"یا اللہ ہر کوتاہی معاف کرنا۔۔۔ بے شک تو خطائیں معاف کرنے والا ہے۔"

پورے جذب سے بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے ہٹ کر وہ واش روم چلا گیا اور کچھ دیر بعد گیلے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے باہر نکل کر دوبارہ کھڑکی پر آرکا۔ سل پر تولیہ پھیلاتے ہوئے اس نے ایک جانچتی ہوئی سی نگاہ باہر پھیلتے اجالوں پر ڈالی اور طمانیت سے مسکرا دیا۔ وہ نہا کر فریش ہو گیا تھا۔ پھر الماری سے تہہ شدہ کپڑے نکال کر انہیں بغل میں دبائے وہ کمرے میں دھری واحد میز تک آیا اور اس کے دراز کا لاک کھولتے ہوئے اپنے بٹوے سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر گننے لگا۔ پھر انہیں پاجامے کی جیب میں منتقل کرتا ہوا دراز اسی طرح بند کر کے کمرے سے باہر راہداری میں نکل آیا۔ یہ پیسے اس نے خالو ظفر کو کرائے کی مد میں دینے کے لیے رات کو اے۔ٹی۔ایم سے نکلوائے تھے اور اسی وجہ سے وہ آج اپنے مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی جاگ گیا تھا تا کہ خالو کے دکان پر جانے سے قبل ان سے مل کر انہیں پچھلے دو ماہ کے کرائے کے ساتھ ساتھ اگلے چار ماہ کا کرایہ بھی پیشگی ادا کر سکے۔ رات اس نے شاہ عالمی بازار میں خالو کی دکان کا چکر لگایا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ دکان میں سامان پہلے کی نسبت بہت کم ہے۔ ایک دو اور دکانداروں سے سرسری لہجے میں کی گئی پوچھ گچھ میں اس پر آشکار ہوا کہ خالو کو ایک سودے میں کچھ نقصان ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے حالات تھوڑے دگرگوں ہیں۔ دراصل ایک جانی مانی برانڈڈ کاسمیٹکس کمپنی کا مال ناقص نکلنے پر حکومت کی طرف سے کمپنی بند کرتے ہوئے کمپنی کے گوداموں سے لے کر پوری مارکیٹ تک سے وہ مال ضبط کر لیا گیا تھا اور ساتھ وارننگ بھی جاری کی گئی تھی کہ ان کاسمیٹکس کی سیل کا ذمہ دار کوئی بھی دکاندار خود ہو گا۔ خالو ظفر کے ساتھ زیادہ برا یوں ہوا کہ ابھی چند روز قبل ہی انہوں نے اس

مال کی پوری پیمنٹ بھی کر دی تھی۔قصہ مختصر اب ان کی خودداری کا بھرم رکھتے ہوئے اس نے وقتی طور یوں پیشگی کرایہ دے کر ان کی مدد کرنا چاہی تھی اور اس مسئلے پر ان کی دیرپا مدد کا اس نے ایک اور حل بھی سوچا تھا۔اس کا ارادہ تھا کہ مشترکہ بزنس کا بہانہ کر کے خالو کی دکان میں انویسٹ منٹ کرے۔جس مارکیٹ میں وہ بیٹھے تھے وہاں مقابلہ اس قدر سخت تھا کہ اگر وہ جلد اپنی پہلی سی مستحکم حالت میں نہیں آتے تو انہیں جلد وہاں سے اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑتا۔اب ناشتے کے دوران وہ ان سے اس موضوع پر بھی تفصیلی بات کرنا چاہتا تھا۔

لاؤنج کی سیڑھیاں اتر کر اس نے کچن سے آتی کھٹر پٹر کی آوازیں سنیں تو حسبِ معمول اونچی آواز میں "السلام علیکم خالہ۔۔۔" کہتا ہوا استری اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا۔پھر اسے اسی "سلام" پر کل ایمان سے ہوئی جھڑپ یاد آئی تو کپڑے سٹینڈ پر تقریباً پھینکتا ہوا یکا یک مڑ کر وہ صوفوں تک چلا آیا۔

"خالہ۔۔۔کچن میں آپ ہی ہوناں؟؟"

فکرمند لہجے میں دی گئی اس کی پکار کے جواب میں ایمان ہنستی ہوئی باورچی خانے سے برآمد ہوئی اور دروازے سے کمر ٹکا کر تمسخر اڑاتے ہوئے بولی۔

"ہاہاہا۔۔۔وعلیکم السلام۔ڈر گئے ناں پھر ایمان راجپوت سے۔۔۔بس۔۔۔اتنی جلدی پتا پانی ہو گیا تمہارا۔ویسے تو بڑے مرد بنتے ہو۔باتیں بنوا لو بس تم سے۔۔۔حالت دیکھو اپنی۔پسینے چھوٹنے باقی ہیں بس۔"

بات کے اختتام پر ہاتھ کے اشارے سے اس کے پورے قد پر اوپر سے نیچے تک اشارہ کرتی ہوئی وہ پھر سے ہنسنے لگی تو وہ بری طرح خجل ہوا۔صورتحال ایسی بن گئی کہ ایمان کو اس پر چوٹ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔اسے اپنی تیزیوں پر غصہ آیا کہ خالہ کی موجودگی کی "تصدیق" کرنے کے لیے واپس کیوں آیا ہے۔

"اوہ شٹ۔۔۔تم آج پھر یہاں ہی ہو۔یا اللہ خیر۔۔۔یقیناً میرے گناہوں کی سزا مجھے اسی دنیا میں دی جا رہی ہے۔اور یہ پچ پچ بند کرو گی پلیز۔صبح ہی صبح متھے لگ گئی ہو آج بھی۔اور مجھے "مرد" بننے" کی کیا ضرورت ہے؟ میں پہلے سے ہی مرد ہوں الحمدللہ۔خیر میں تم سے فضول بحث نہیں کرنا چاہتا یہ بتاؤ خالہ کدھر ہیں؟ اور خالو؟؟"

بے ساختگی میں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی باتوں سے چڑتے ہوئے وہ دانت پیس کر بولا اور بات کے

اختتام پر بھرپور قطعیت سے خالہ، خالو کے متعلق سوال کر کے پلٹتے ہوئے استری اسٹینڈ پر جا کر استری کا پلگ لگانے لگا۔

اس کی حالت کا حظ اٹھاتی، دروازے سے ہٹ کر لہراتی بل کھاتی وہ اس کے دائیں جانب موجود ایک صوفے کی پشت پر آ بیٹھی اور کچھ بھی کہے بنا زیرِ لب مسکراتی، بڑی فرصت سے اس کے حسین چہرے پر طاری جھنجلاہٹ تاکنے لگی۔ اس کی "موجودگی و خاموشی" سے بھرپور خبردار رہ کر مصطفین نے شرٹ اپنے سامنے پھیلائی اور اس کی آستین سیدھی کرتا ہوا ایمان کو یکسر نظر انداز کرنے لگا۔ اس کے ہر انداز کا لطف اٹھاتی جب وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہٹی تو اسے نظر انداز کرنے میں ناکام ہوتا وہ استری قمیض پر ہی چھوڑ کر اس کی طرف مڑا۔

"کیا تکلیف ہے؟ یہاں میرے سر پر کیوں سوار ہو؟ جاؤ کام کرو اپنا جا کر۔ اور بتایا نہیں کہ خالہ، خالو کدھر ہیں؟"

ضبط کی کوشش میں سلگتے لہجے سے اس نے اسے جھڑکا اور پھر اپنا سوال دہرایا۔ جواباً بے طرح ہنستے ہوئے وہ پیٹ پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔

"اففف۔۔۔ اپنا منہ دیکھو ذرا تم اس وقت۔ قسم سے بالکل سائیں لگ رہے ہو۔ اور ایک صائب مشورہ دوں گی کہ خالہ خالو کی بابت پوچھنے سے پیشتر ذرا وہ استری اٹھا دو قمیض کے دامن سے۔۔۔ ورنہ پھر کہو گے کہ ہاہ۔۔۔ میں اس میں شہزادہ لگتا تھا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔"

گردن اچک کر اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے انگلی سے اشارہ کر کے جو اس نے اگلی بات کہی تو اس کے نقل اتارنے والے مضحکانہ انداز پر غصہ کرنے کی بجائے سٹپٹا کر وہ پلٹا اور جلدی جلدی استری اٹھا کر قمیض دیکھنے لگا۔

"شکر ہے بچ گئی یہ۔۔۔ میں سچ مچ شہزادہ لگتا ہوں اس میں۔"

قمیض کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر اس کی گویا جان میں جان آئی۔ پھر ایمان کی کھلکھلاتی ہوئی ہنسیوں پر اسے بے طرح گھورتا ایک پل کو تھم کر وہ خود بھی مسکرانے لگا۔ اس کی شوخیوں سے اس کا غصہ ہوا ہو گیا تھا۔

"وِیری فنی مصطفین۔۔۔ تم پہلے لڑکے ہو جو اتنے خوش فہم ہو۔ کس پاگل نے تمہیں کہہ دیا کہ تم بھی شہزادے لگ "سکتے" ہو۔۔۔"

اسے مسکراتے دیکھا تو مزید ستانے کا ارادہ منسوخ کرتی، ہاتھ جھلا کر یہ کہتی ہوئی وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی اور پھر صوفوں کی حدود کے پار رک کر اسے استری کی جانب متوجہ ہوتے دیکھ کر دوبارہ بولی۔

"ابو دکان پر جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں اور امی ابھی بالکل انہیں کپڑے دینے گئی ہیں اندر۔ آ جاتے ہیں ابھی دونوں۔ تم جلدی جلدی استری کر کے چینج کر آؤ تمہارا ناشتہ بھی ابو کے ساتھ ہی بنا دیتی ہوں۔۔۔"

اور اس کی بات سن کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے صرف انگوٹھے سے اوکے کا اشارہ کیا اور چپ چاپ کپڑے استری کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا اس سے گفتگو کو اور طول دینا مزید مصیبت مول لینے جیسا ہوگا۔ اور اس کے اس مفاہمتی انداز میں پنہاں "اغراض و مقاصد" کو سمجھتی وہ مسکراتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔

پھر برتنوں کی مختلف آوازوں اور اس کے قدموں کی چاپ سے اس کی حرکات و سکنات سمجھتے ہوئے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کھانے کی میز پر ناشتہ لگا رہی ہے۔ اس نے تیزی سے ہاتھ چلانے شروع کیے تاکہ خالو کی آمد سے پہلے فراغت پا سکے۔

"جاگ گیا تو مصطفین۔ چل اچھا ہوا۔ لا میں کرتی ہوں استری۔۔۔"

اسی وقت خالہ کنیز نے کمرے سے نکل کر اسے استری اسٹینڈ پر کھڑے پایا تو اس کے قریب آتے ہوئے پیار سے کہا۔

"نہیں خالہ۔۔۔ ہو گئے بس۔ اور الارم لگا کر سویا تھا اس لیے جلدی جاگ گیا۔ سوچا آپ کو بھی بے وجہ زحمت دیتا ہوں۔ آپ بھی تھک جاتی ہوں گی صبح صبح اوپر نیچے کے پھیروں میں۔۔۔"

عام لہجے میں وضاحت کرتا ہوا ان کی طرف دیکھ کر وہ قمیض کا رخ پلٹنے لگا۔ اس کی بات پر وہ خوشدلی سے مسکرائیں۔

"لے زحمت کیسی؟ اچھا ہے ناں اسی بہانے میری بوڑھی ہڈیوں کی بھی ورزش ہو جاتی ہے۔ میں اب تجھے ہی جگانے جانے لگی تھی۔ چلو بہتر ہے تم آ گئے خود ہی۔۔۔"

سادگی سے کہتی یہاں وہ رکیں اور اس کے گیلے بالوں کو دیکھ کر مزید بولیں۔

"اور نہا بھی لیے ہو خیر سے۔ چلو یہ بھی اچھا ہو گیا کہ آج اپنے خالو کے ساتھ ہی ناشتہ کرنا۔ روز کہتے ہیں

مصطفین سے جی بھر کر بات ہی نہیں ہوتی۔ خیر۔۔۔ کپڑے استری کر کے میز پر آ جاؤ۔ وہ بھی بس آنے لگے ہیں۔ میں ذرا ایمان کی خبر لوں کہ نیاں پار لگائی کہ ڈبو دی ہے۔ یقین اس پر کوئی نہیں ویسے مجھے۔ اللہ جانے یہ دو تین دن سے اتنی پرواہ کیوں کرنے لگی ہے۔ ایسی تو نہ تھی پہلے۔ سارے کام خود بخود کرنے لگی ہے۔ حق ہاہ۔۔۔"

سادہ لہجے میں اس سے پیار جتا کر آخر پر ایمان کی غیر متوقع "فرمانبرداری" پر حیرانی کا اظہار کرتی وہ فکرمندی سے یوں بولیں کہ وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔

"افففف۔۔۔ آپ بھی حد کرتی ہو خالہ۔ وہ کام نہ کرے تو بھی پریشانی رہتی ہے آپ کو اور اب اگر وہ کر رہی ہے تو بھی فکریں پالے بیٹھی ہیں آپ۔ بھئی اگر وہ کام کر رہی ہے تو مسئلہ کیا ہے؟؟ یہ تو اچھی بات ہے کہ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو رہا ہے۔ کیوں سیدھی سی بات کو جان بوجھ کر گنجلک کر رہی ہیں؟ اور آپ کی باتوں سے مجھے تو صاف صاف یہی لگا ہے کہ آگے آپ یہی کہنے والی تھیں کہ میری معصوم بچی کو نظر لگ گئی ہے کسی کی۔ یا پھر یہ کہ تعویز نہ کروا دیے ہوں کسی نے اس پر۔ کون لوگ ہو تسی خالہ؟ کسی حال میں خوش بھی ہو کہ نہیں؟؟"

طویل ہنسی کے بعد جب اس نے بولنا شروع کیا تو بولتے بولتے کنیز بیگم کے ساتھ روا اپنی پرانی روش پر لوٹ آیا۔ انہوں نے ماتھے پر بل ڈالے اسے اپنے "دکھڑوں" کا مذاق اڑاتے دیکھا اور پھر ہاتھ کا مکا بنا کر ہوا میں بلند کرتی تیز لہجے میں بولیں۔

"بس کر وے۔۔۔ دانت توڑ دینے میں نے تمہارے اگر ہور مخول کیا میرے ساتھ تو۔ تمہیں تو ٹھٹھے لگانے کے سوا آتا ہی کچھ نہیں۔ میں بھی کس "سیانے" سے سر پھوڑ رہی ہوں۔ دفع ہو۔۔۔"

مخصوص انداز میں دوبدو ہوتے ہوئے انہوں نے اسے "مکا مار کر دانت توڑنے" کا باقاعدہ اشارہ کیا اور آخر پر خود کو کوستی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

ان کی پشت پر کھڑے مصطفین نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور بے طرح مسرور ہو کر کپڑے استری کرنے لگا۔ ایمان سے ہوئی بے عزتی کے بعد خالہ کو ستا کر اسے بڑا لطف آیا۔

اور پھر خالو کی آمد سے قبل ہی جلدی جلدی استری سے فراغت پا کر وہ کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔ کنیز بیگم اور

ایمان نے بیک وقت اسے خاموشی سے بیٹھ کر کچھ سوچتے دیکھا اور پھر ایک نا سمجھنے والی نگاہ ایک دوسرے پر ڈال کر واپس اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ ان کی حیرت کا سبب اس کے چہرے پر ثبت غیر معمولی سنجیدگی کا تاثر تھا۔ کنیز بیگم سالن اور دہی کا ڈونگہ لا کر میز پر رکھ رہی تھیں جب ہنستے مسکراتے خالو ظفر وہاں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم۔۔۔ بھئی آج تم کیسے اتنی صبح صبح جاگ گئے پتری اوئے؟؟ چلو اچھا ہے آج بڑی مدت بعد ایک ساتھ ناشتہ کریں گے۔"

مصطفین کو دیکھ کر وہ بشاشت سے کہتے ہوئے ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گئے۔

"وعلیکم السلام خالو جی۔۔۔ بس میں بھی آج اسی بدولت جلدی جاگ گیا ہوں۔"

جواباً وہ بھی خوشدلی سے مسکرایا اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالنے لگا۔ وہ بلا تاخیر مدعے پر آنا چاہتا تھا۔ خالہ نے ہاتھ روک کر بغور اس کی مصروفیت دیکھی اور پھر تفہیمی نظروں سے خالو کو دیکھتی ہوئی باورچی خانے سے انڈے اور پراٹھے لینے چلی گئیں۔

"خالو جی یہ میرے پچھلے دو ماہ کا کرایہ ہے۔ ایک تو گاؤں نہیں جانا ہوا میرا پھر راجو کے دیر سے پیسے بھیجنے کی وجہ سے مجھے بھی کرایہ ادا کرنے میں دیر ہو گئی۔"

پیسے ان کی جانب بڑھا کر اپنے دوست راجو کا نام لیتے ہوئے اس نے دیری کا عذر پیش کیا تو اس کے معذرت خواہانہ انداز پر نرمی سے مسکراتے ہوئے انہوں نے پیسے تھام لیے۔

"او کوئی گل نئیں یار۔ کیوں تاویلیں پیش کر رہا ہے؟؟ تیرا ساڈا تعلق کب سے ایسے جھمیلوں میں آن پڑا ہے کہ تجھے کوئی وضاحت کرنی پڑے۔۔۔"

پھر پیار بھرے لہجے میں اتنا کہہ کر یکایک وہ رک گئے۔ بنا گنے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے انہیں ان کے زیادہ ہونے کا ادراک ہوا تو ہاتھ روک کر وہ پیسے گننے لگے۔

"پر یہ تو بہت زیادہ ہیں یار۔ کرایہ اتنا تو نہیں بنتا۔ دیکھ تو ذرا۔۔۔"

پیسے واپس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ متعجب لہجے میں بولے تو وہ مسکرا کر اپنی طرف بڑھا ان کا ہاتھ نہایت نرمی سے واپس دھکیلنے لگا۔

"میں یہی بتانے لگا تھا خالو جی کہ پچھلے دو ماہ کے کرائے کے ساتھ ساتھ یہ اگلے چار ماہ کا پیشگی کرایہ بھی ہے۔ پہلے ادا کر رہا ہوں تاکہ ایسی تاخیر دوبارہ نہیں ہو۔ لہٰذا آپ رکھ لیں پلیز۔۔۔"

سادہ و نرم لہجے میں کی گئی اس کی اگلی وضاحت پر خالو نے بے ساختہ پراٹھے لا کر میز پر رکھتی اپنی نصف بہتر کو دیکھا۔ باورچی خانے میں وہ اور ایمان بھی ان دونوں کی گفتگو کا ایک ایک جز و سنتی رہی تھیں۔

"لیکن مصطفین تو نے ابھی یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔ سو خرچ ہوئے ہیں بلکہ ہو رہے ہیں۔ روز کا آنا جانا، کپڑا جوتی، اور بھی کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ تجھے خود ضرورت ہوگی۔ ناں میرا پتر تو رکھ یہ پیسے باقی کے اور اگلا کرایہ ساتھ ساتھ وقت کے وقت دینا۔ دیں جی اسے واپس باقی کے پیسے۔۔۔"

اب کی بار خالو کی بجائے کنیز بیگم نے جواب دیا اور اس کے بالکل ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پہلے سے ان کے خلوص کا معترف وہ اور بھی قدردان ہوا۔ اس مطلب پرست دنیا میں جہاں ہر طرف افراتفری کا عالم ہے اسے ان کا اپنے خراب حالات کے باوجود اس کی پرواہ کرنا بہت اچھا لگا۔ اپنوں کا ستایا وہ شخص بیگانوں سے لطف و کرم پا کر دل کی ہر گہر تلک سرشار ہوتا گیا۔

خالہ کی بات پر خالو ظفر نے فوراً اسے پیسے لوٹانے چاہے تو وہ تیزی سے بولا۔

"اوہو پلیز رہنے دیں میں اپنی آسانی دیکھ کر ہی کہہ رہا ہوں۔ میرے لیے یوں زیادہ بہتر رہے گا۔ اور میرے خرچوں کے لیے پیسے ہیں میرے پاس لہٰذا اس حوالے سے آپ لوگ بالکل فکر نہ کریں۔"

قطعیت سے کہی گئی اس کی بات پر ان دونوں میاں بیوی نے بغور ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر خالو نے جیسے بے بسی سے کہا۔

"دیکھ لے پتری۔۔۔ تیرے بڑا مجبور کرنے پر رکھ رہا ہوں میں یہ پیشگی کرایہ ورنہ میرا دل اب بھی نہیں مان رہا۔ خیر۔۔۔ چلو ناشتہ شروع کرو یار۔ ٹھنڈا ہو جائے گا سب۔"

اور ان کے لہجے سے اخلاص کی چاشنی کشید کر کے سر کو ایک تفہیمی جنبش دیتے ہوئے اس نے ناشتے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ خالہ اور خالو بھی سر جھکا کر مزید کچھ کہے بنا ناشتہ کرنے لگے۔ اپنے اپنے دل وہ دونوں یہی سوچ رہے تھے کہ کیا اس کو ہمارے معاشی حالات کی خرابی کی کوئی بھنک لگی ہے کہیں سے یا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ وہ

پیشگی کرایہ دینا چاہ رہا ہے؟

اور اسی وقت ایک ٹرے میں دو تازہ پراٹھے لیے ایمان وہاں آئی اور پراٹھوں کو پہلے والے ٹفن میں منتقل کرتی پراعتماد انداز میں بولی۔

"ایک تو آپ سب کے ان خلوص بھرے ڈراموں سے بڑی تنگ ہوں میں۔ چند ہزار کے لیے ستی سویرے وہ رولا ڈالا ہے کہ ناشتہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ میرا تو سر درد کرنے لگا ہے یہ" آپ رکھ لو۔۔۔نہیں تم رکھ لو" کی گردان سن سن کر۔ حد ہے بھئی۔ پیسے نہ ہوئے اہرام مصر کی رجسٹری ہوگئی جس پر اتنی لے دے ہو رہی ہے۔ ابو آپ کو کوئی تامل ہو رہا ہے رکھنے میں تو لائیں میں رکھ لیتی ہوں۔ بھئی ان لاٹ صاحب کو کیا فرق پڑتا ہے اتنے سے پیسوں سے بھلا؟ ایویں صبح صبح سین بنا دیا میرے بھولے والدین نے۔۔۔ہووو۔۔۔"

باری باری ان سب کو دیکھ کر بات مکمل کرتے ہوئے وہ میز کے گرد گھومی اور خالو ظفر کے ساتھ جا بیٹھی۔ بات کے اختتام پر اس نے ایک طویل تر سانس خارج کیا۔ اس کی بات اپنے ازلی و مخصوص افکار کے عین مطابق تھی۔ وہ جو کچھ بھی سوچتی اس کا کہیں بھی اظہار کر دینے میں اسے قطعاً کوئی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ ہاں اس کا انداز ہمیشہ ایسا ہوتا تھا کہ مقابل کو برا نہیں لگتا تھا۔ اس کے مستقل لہجے میں عجب سی اک سچائی اور برجستگی کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ اس کی بات پر خالو اور مصطفین خوشگواریت سے مسکرا دیے جبکہ خالہ اسے اکھڑے ہوئے کلہاڑے کی طرح پڑیں۔

"ہوگئی تمہاری بکواس شروع۔ مل گیا موقع۔ بلکہ یہ تو کوئی موقع بھی نہیں۔ تیرا اللہ ہی حافظ ہے ایمان۔ تجھے ناں عقل آئی ساری زندگی۔ میں تو ہار مان چکی تجھ سے تجھے سمجھا سمجھا کر۔ تو نہیں سدھر سکتی۔"

تیز لہجے میں یہاں تک کہہ کر وہ رکیں اور ایمان کو اپنی بات نظر انداز کر کے خالو کی جانب مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتا پا کر تیروں کا رخ ادھر موڑ دیا۔

"اور آپ کیا ہو جی؟؟ ایسی باتوں پر بجائے اسے ڈانٹنے کے اس کے ساتھ ہو کر ہنسنے لگتے ہو۔ یہ آپ کی شہہ ہے ساری کہ وہ سارا دید لحاظ بھول کر بے باک ہوئی جاتی ہے۔ جہاں جو دل میں آئے بک دیتی ہے۔ پورے ٹبر میں اتنی سر چڑھی دھی کسی کی نہیں ہونی جتنی آپ کی ہے۔ مجال ہے ذرا بھی ڈر ہو اسے آپ کا۔ اور آپ

ہیں کہ ابھی بھی ہنس رہے ہیں۔ دونوں کا ہی کوئی حال نہیں۔"

ان کی جلی کٹی باتوں پر کب سے خود پر ضبط کیے بیٹھے مصطفین کا قہقہہ بلند ہوا تو ایمان اور خالو کی ہنسی بھی اسی گونج میں شامل ہوگئی۔ خالہ بس خشمگیں نظروں سے باری باری ان سب کو دیکھتی رہیں۔ پھر اس سے پہلے کہ جواباً خالو بھی کچھ کہتے ہنسی روک کر ایمان دوٹوک لہجے میں بولی۔

"اففف بس کریں امی۔ کتنا بولتی ہیں آپ۔۔۔ لڑکی ہوں تو پھر گلا گھونٹ دیں میرا۔ ورنہ میں تو بس ایسی ہی ہوں جیسی حقیقت میں ہوں۔ یہ دنیا داری اور منہ رکھنی کے لیے مجھ سے منافقت نہیں ہوتی۔ انسان کو ہمیشہ دل کی بات کرنی چاہیئے اور بس۔۔۔ ویسے بھی میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ چھوٹی سی بات کو گھسیٹ گھسیٹ کر آپ سب نے اتنا لمبا کر دیا۔ کب تک چپ رہتی میں بھی؟ بس بول دیا۔"

اس کی باتیں اور لب ولہجہ سن کر خالہ نے ایک بے بس سی نگاہ سب پر اور خصوصاً خالو پر ڈالی اور پھر اپنا سر تھام کر چپ چاپ ناشتہ کرنے لگیں۔ ان کا انداز "تمہارا کوئی حل نہیں" کہہ کر جان چھڑانے والا تھا۔ اور ایمان کی بے طرح ہنسیوں کو سنتے مصطفین کو لگا کہ ان کے اس "فیملی ڈرامے" میں کم از کم آج وہ خالو کے ساتھ بزنس سے متعلقہ کسی بھی قسم کی کوئی گفتگو نہیں کر سکے گا۔ اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس نے چپ چاپ ناشتے کی طرف دھیان مرکوز کیا۔ اس کے خوش رنگ لبوں پر دلفریب مسکراہٹوں کا عکس تھا۔

☆......☆......☆

وہ بائیک لے کر بڑا خوش خوش گھر سے نکلا اور گویا ہواؤں کے دوش پر رہ کر تیز رفتاری سے یونیورسٹی کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے سر پر خوبصورت طرز پر بنا ایک نفیس سا ہیلمٹ تھا جس کی بدولت اس کا چہرہ اور تاثرات چھپ گئے ورنہ کوئی دیکھ سکتا اگر تو اس کے گلال رنگ چہرے کو من چاہے محسوسات میں بھیگا ہوا دیکھتا۔ رات ثومیہ سے ہوئے پیار کا احساس اسے بے طرح سرشار کیے ہوئے تھا۔ فیروز پور روڈ نمبر 1 کا انڈر پاس عبور کر کے جونہی وہ لال پلی کے قریب پہنچا ہر روز اس اسٹاپ پر ملتی ثومیہ کے خیال سے اس کے لب چٹکے۔ بائیک کی رفتار کم کر کے وہ سڑک کی انڈر پاس والی لین سے نکل کر نہر کے پل پر لے جانے والی لین میں آیا اور پھر اسی خیال میں مسرور رہ کر اس نے نہر کا پل عبور کرتے ہوئے لال پلی کے اسی بس اسٹاپ پر بائیک روک دی جس

کے شیڈ کے نیچے وہ بارشوں میں پناہ لیتا رہا تھا۔ثومیہ کو لفٹ دینے کا سوچ کر وہ گذرتے گذرتے اچانک یہاں رک گیا۔

ادھر ثومیہ گھر سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنی رہائشی کالونی کی دو گلیاں پار کر کے سڑک پر آئی اور ایک آٹو رکشہ روک کر، اس سے "لال پلی" جانے تک کا کرایہ طے کر کے سوار ہو گئی۔گھڑی سے وقت دیکھتے ہوئے تھوڑا جھک کر وہ آس پاس سے گذرتی ٹریفک کا بہاؤ دیکھنے لگی۔گو کہ یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے قبل پھوپھو سے ملنے ملانے میں کافی وقت ضائع ہوا لیکن پھر بھی جلدی جاگنے کی وجہ سے اور ناشتہ گول کرنے کے سبب وہ معمول کے مطابق پورے وقت پر گھر سے نکل آئی۔وہ شکر کر رہی تھی کہ رات کو پھوپھو کے ساتھ ہوئی "دوسری نشست" میں مزید کوئی بدمزگی نہیں ہوئی اور اب بھی پھوپھو نے اسے خوشدلی سے خدا حافظ کہا۔ہاں البتہ بابا کی خاموشی سے اسے بہت ڈر لگ رہا تھا اور نمرہ نے تو ان کی خاموشی کو صرف مہمانوں کی موجودگی پر محمول کیا تھا۔اس کے خیال سے پھوپھو کے جانے کے بعد وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کہیں گے۔اب بھی لاشعوری طور پر ہی سہی وہ اس پہلو سے جڑے انہی سب "امکانات" پر غور کر رہی تھی۔

"دیکھا جائے گا جو بھی ہوا یار۔۔۔اب تو دماغ بھی پلپلا ہو گیا ہے یہ سب سوچ سوچ کر۔بس میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکی ہوں اس معاملے میں اور اب وہ ایک بار تو ضرور سوچیں گے اس پر۔فی الحال یہی کافی ہے۔باقی سوچیں وقت آنے پر۔۔۔"

سر جھٹک کر بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنے خیالات سے باہر آئی تو دیکھا کہ لال پلی کے نزدیک آ چکی ہے۔وہ بیگ کھول کر پیسے نکال رہی تھی جب آٹو والے کی آواز پر چونک گئی۔

"مجھے کچھ کہا ہے بیٹا؟؟"

یقیناً وہ اس کی "بڑبڑاہٹیں" سن کر کسی کنفیوژن کا شکار ہوا تھا۔

"ارے نہیں نہیں انکل۔۔۔سوری۔آپ سے کچھ نہیں کہا۔"

ڈرائیور کی عمر کا خیال کر کے وہ نہایت شائستگی سے معذرت خواہ ہوئی۔اسے اپنی بے دھیانی پر غصہ آیا کہ اس کی آواز اتنی اونچی کیونکر ہوئی۔

" کوئی بات نہیں بیٹا۔لیں آپ کا اسٹاپ بھی آ گیا۔۔"

آٹو ایک طرف روکتے ہوئے جواباً اس نے نرمی سے کہا تو پیسے نکال کر وہ بیگ واپس کاندھے پر پہننے لگی۔ پھر " بہت شکریہ " کہتے ہوئے نیچے اتر کر اس نے کرایہ ادا کیا اور باقی پیسے مٹھی میں دبا کر بس اسٹاپ کی جانب بڑھنے لگی۔یہی وہ وقت تھا جب برقی اشارے کے پار سے بس کا ہارن سنائی دیا تو اس طرف دیکھتے ہوئے اس نے تیز تیز چلنا شروع کیا۔لیکن بس اپنی تیز رفتاری کے باعث اس سے پہلے ہی اسٹاپ کی جانب بڑھ گئی۔

ہارن کی آواز سن کر وقت گذاری کے لیے نہر کنارے فٹ پاتھ پر ورزش کرتے مختلف بزرگوں کو دیکھتا سفیر بھی اس طرف متوجہ ہوا اور پھر ثومیہ کو آتے دیکھ کر ہیلمٹ کا فرنٹ گلاس اٹھا کر وہ پورے دل سے مسکرایا۔

بس ایک طرف رکی تو وہی روز والے کنڈیکٹر نے دروازے سر نکال کو ثومیہ کو پکارا۔

" جلدی آئیں باجی۔۔۔دیر ہو رہی ہے۔"

پھر بغور دیکھتے ہوئے وہ جیسے ثومیہ کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا جو کہ اب تقریباً بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔

سفیر نے ایڑھی کی نوک سے بائیک ایک جھٹکے سے سنگل سٹینڈ پر لگائی اور اتر کر تیزی سے بس کے دروازے پر آیا۔

" تم جاؤ یار۔۔۔اس نے بس میں نہیں جانا۔"

اس کے مخاطب کرنے پر کنڈیکٹر نے سرتاپا اسے گھورا۔پھر اسے بھی پہچان کر اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔وہ دونوں سوئے اتفاق پچھلے دو روز سے اسی بس میں سفر کر رہے تھے۔لیکن اس سے پہلے کہ جواباً کنڈیکٹر بھی اسے کچھ کہتا ہانپتی ہوئی ثومیہ ادھر پہنچ گئی۔

" جانا ہے کہ نہیں باجی؟"

اس کے رکنے سے پہلے ہی کنڈیکٹر نے حتمی لہجے میں پوچھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔وہ یہاں کی صورتحال سے بے خبر تھی۔

" ارے۔۔۔آف کورس جانا ہے۔"

اس نے تعجب سے کہتے ہوئے بس کا بیرونی ہینگر تھام کر پائدان پر سوار ہونا چاہا تو سفیر کو طنزیہ نظروں سے

دیکھتا کنڈیکٹر ایک طرف ہوگیا۔ یہی وہ پل تھا جب سفیر نے لپک کر بس میں سوار ہوتی ثومیہ کا ہاتھ تھام کر اپنی جانب کھینچ لیا اور وہ ایڑھیوں کے بل نصف دائرے میں گھوم گئی تھی۔

"تمہیں نظر نہیں آ رہا کیا کہ میں بھی کھڑا ہوں یہاں؟ چلو بائیک پر چلتے ہیں۔ میں کب سے ویٹ کر رہا ہوں تمہارا۔"

اسے کھینچ کر اپنے سامنے روکتے وہ کسی قدر درشتی سے بولا تو اس کے یوں ایک دم کھینچنے سے اپنی فنا ہوتی روح کو ڈھارس دیتی وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اچھنبے سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرتوں کا رقص تھا۔ پھر ایک طویل سانس خارج کر کے خود کو متوازن کرتی وہ بھی اسی درشتگی سے بولی۔

"ہووو۔۔۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے سفیر؟ یہ کیا بدتمیزی، کیا طریقہ تھا؟ یوں کرتے ہیں؟ حد ہے ویسے۔ میری جان نکال دی۔ اور میرا جانے اللہ کہ یہ "ہیلمٹ پوش" شخصیت تم ہو۔ میں کیوں اتنا غور کرنے لگی کسی بھی ایرے غیرے پر؟"

ان کا مکالمہ سن کر کنڈیکٹر اب بڑی فرصت اور دلچسپی سے انہیں ایک دوسرے کے "دوبدو" دیکھنے لگا۔

"اوہ سوری۔۔۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ میں نے ہیلمٹ پہن رکھا ہے۔"

اس نے فوراً سے پیشتر اپنی غلطی تسلیم کی اور پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بصد شوق مسکراتے کنڈیکٹر کو گھور کر بولا۔

"آپ تشریف لے جائیں صاحب۔ آپ کو یاد ہو اگر کہ آپ کو دیر ہو رہی تھی۔"

اس کی بات پر یکدم اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی لیکن وہ ابھی جانے کے لیے ہلا بھی نہیں تھا کہ ثومیہ بول اٹھی۔

"ایک منٹ بھائی۔ مجھے بھی جانا ہے۔ یونیورسٹی میں ملتے ہیں سفیر۔ پہنچو شاباش۔۔۔"

سرسری لہجے میں کہتی وہ دوبارہ بس میں سوار ہونے لگی تو کنڈکٹر نے پھر سے سفیر کو بتیسی دکھائی اور اس کی بتیسی سے ہی چڑ کر اس نے ثومیہ کو دوبارہ کھینچ لیا۔

"لیکن کیوں؟ جب بائیک موجود ہے تو تم لوکل کیوں جاؤ گی یار؟ پاگل ہوئی ہو کیا؟"

وہ اپنے مخصوص ضدی لہجے میں بولا تو ثومیہ نے گھبرا کر پہلے بس کی کھڑکیوں سے جھانکتے مسافران اور پھر

ہنستے ہوئے کنڈکٹر کو دیکھا۔

" کیا بچپنا ہے سفیر۔ تمہاری عقل نہیں کام کرتی کیا کہ میں کیوں نہیں جا رہی تمہارے ساتھ؟ ہر بات تمہیں اتنی صراحت سے کیوں سمجھانی پڑتی ہے؟"

غصیلی نظروں سے اسے گھور کر وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولی تو اسے کوئی جواب دینے کی بجائے وہ جھلائے ہوئے لہجے میں کنڈکٹر سے مخاطب ہوا۔

" اوہ بھائی تم تو جاؤ یار۔ تم کیا چسکے لے رہے ہو؟؟"

اور اسی وقت بس ڈرائیور بھی ہارن پر ہارن بجاتا ہوا بس کو سست روی سے آگے بڑھانے لگا تو تیزی سے پائدان پر چڑھ کر کنڈکٹر نے ایک بار پھر ثومیہ کو مخاطب کیا۔

" جانا ہے کہ نہیں باجی؟؟ بتا دیں آخری بار۔۔۔"

ثومیہ نے بے بسی سے مٹھیاں بھینچ کر ایک نظر بضد کھڑے سفیر کو دیکھا اور پھر بس کے دروازے سے جھانکتے کنڈیکٹر سے مخاطب ہوئی۔

" سوری بھائی آپ چلے جائیں۔۔۔"

یہ چند الفاظ بھی اس نے نہایت شرمسار لہجے میں ادا کیے۔

" جان دیو استاد جی۔۔۔"

اس نے اندر منہ کر کے ہانک لگائی اور پھر بس کے رفتار پکڑنے تک ان دونوں کو ایک دوسرے کے "مقابل" دیکھتا رہا۔

" اففف۔۔۔ کیا چیز ہو تم سفیر؟ یوں بیچ سڑک پر، صبح صبح کیا تماشا تھا یہ؟ ہاں؟؟ تمہیں اندازہ بھی ہے کیا کہ بس میں موجود ہر فرد نے ہمارے اور خصوصاً میرے بارے میں کیا گمان کیا ہوگا؟ آہ۔۔۔ کیا کہوں اب تمہیں؟ جاؤ تم آجاؤں گی خودی میں پچھلی بس میں۔"

بس کے جاتے ہی واپس اس کی طرف متوجہ ہو کر اس نے دکھ اور تاسف کے ملے جلے لہجے میں کہا اور اس کے کچھ بھی بولنے سے پیشتر بڑھ کر شیڈ کے نیچے ایک بینچ پر جا بیٹھی۔ وہ ایسے ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے

خیال سے یہ ایک سیدھا سادہ معاملہ تھا جسے وہ بے وجہ گنجلک بنا رہی تھی۔ سر سے ہیلمٹ اتارتا وہ اس کے ساتھ جا بیٹھا۔

" کیا ہو گیا ہے یار؟ میں نے صرف یہ چاہا کہ ہم روز ایک ساتھ جاتے ہیں تو آج بھی ایک ساتھ چلتے ہیں۔ کسی بھی بات کے اتنے باریک پہلوؤں پر میں کبھی نہیں سوچتا کہ جن میں یہ پہلو بھی شامل ہو جائے کہ دنیا کیا سوچے گی؟ یہ دنیا ہے یار۔۔۔ ہم اسے پابند نہیں کر سکتے کہ ہمارے متعلق ہر پل، یہ صرف ہماری مرضی کا سوچے۔ تم اور میں دو دن سے اسی بس میں ایک ساتھ جا رہے ہیں۔ تو ہمارے متعلق نیک یا بدگمان تو تب بھی کئی ایک نے کیا ہو گا۔ ہم کس کس کا گریبان پکڑ لیں کہ ہمیں منفی کیوں سوچا ہے؟ فارگاڈ سیک یار۔۔۔ میرے یہاں تمہارے لیے رکنے کا بس وہی مطلب لو جس مطلب سے میں یہاں رکا ہوں۔ اس سے زیادہ ادھر ادھر کا مت سوچو۔۔۔ پلیز ززز۔"

اسے مخاطب کر کے بھرپور قطعیت سے کہتا وہ اپنے حق میں دلائل دینے لگا اور بات کے اختتام تک اس کا لہجہ بتدریج لجاجت میں ڈھل گیا۔ اس کی اتنی لمبی وضاحت پر اس نے فقط ایک بار شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے لہجے سے سچائی کی مشک پا کر اس کے چہرے پر نرم تاثر ابھرا۔

" پلیز ثومیہ۔۔۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کبھی نہیں چاہ سکتا کہ بیچ سڑک پر تماشا ہو۔ بس یہ کہ اتنی گہرائی سے نہیں سوچا میں اور نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ یوں مباحثہ ہونے لگے گا ہمارا۔ میرا خیال تھا میں کہوں گا اور تم سمپلی چل دو گی۔ میرا یقین کرو یار میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

اسے نرم پڑتا دیکھ کر اس نے مزید صفائی پیش کی تو کچھ کہے بنا ایک طویل سانس بھر کر وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔ وہ گویا کسی تذبذب کا شکار تھی۔ سفیر حیرت سے اس کی کیفیت دیکھنے لگا۔ پھر اسے مزید حیران کرتی وہ یکدم اٹھی اور منہ پھلا کر بولی۔

" چلو اب۔۔۔ دیر ہو رہی ہے ہمیں۔ اور خدارا اب بڑے ہو جاؤ۔ اب تم بچے نہیں رہے کہ ایسی باتوں پر غور نہ کر سکو۔ نان سینس۔۔۔"

اور اتنا کہہ کر اس نے سفیر سے پہلے ہی بائیک کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس کے اس عمل سے ہڑبڑا کر وہ

اپنی جگہ سے اٹھا اور بھاگ کر بائیک پر جا بیٹھا۔

"تم سچ مچ بالکل نہیں سوچتے کہ لوگ کیا سوچیں گے؟؟"

وہ دوبارہ ہیلمٹ پہن رہا تھا جب اس نے ثومیہ کی ناراض ناراض سی آواز سنی۔

"نہیں۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔"

بائیک کو کک لگا کر وہ اس کے بیٹھنے کا منتظر ہوا۔

"تو پھر تم پاگل ہو سفیر۔۔۔ دنیا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔"

اس کے پیچھے سمٹ کر بیٹھتی وہ اطلاعی لہجے میں بولی تو وہ دلکشی سے ہنسا۔

"بتانے کا شکریہ کہ میں پاگل ہوں۔"

اور اپنے اسی "پاگل پن" پر مسرور ہوتے ہوئے اس نے بائیک چلا دی لیکن رفتار بہت کم رکھی۔ اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ ثومیہ کو پیچھے بٹھا کر اس مسافت کو بہت طویل کر دیتا۔ وہ بے خبر تھا کہ کچھ مسافتیں اتنی طویل ہو جاتی ہیں کہ لاحاصل رہ جائیں۔

☆......☆......☆

ممتاز محمود کا فکر سے برا حال تھا۔ اسے ملتی مصدقہ اطلاعات کے مطابق گیتی اور ناز صبح سویرے ہوٹل سے نکل کر علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ چلی گئی تھیں جہاں سے انہیں براستہ دبئی کپادوکیہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اس کی پریشانی کا سبب یہ تھا کہ اس کی سوشل میڈیا ٹیم گیتی کے خلاف مہم چلانے میں کامیاب تو رہی تھی لیکن اس حد تک نہیں جس قدر وہ چاہتا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ ساری خفیہ روابط سے موصول ہوا اپنے نادیدہ آقاؤں کا ہر پیغام مسلسل نظر انداز کرتا رہا تھا کیونکہ اپنے اہداف کی تکمیل تک وہ ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی کارکردگی پر آتا حرف اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ گیتی کے خلاف دونوں طرف کی عوام کو طیش دلانا اب گویا اس کی ضد بھی بن گیا۔ اس کی ٹیم کئی معروف فیس بک پیجز کے ایڈمنز اور آن لائن سوشل میڈیا چینل کے مالکان سے رابطہ کر کے انہیں بے دریغ پیسا آفر کر رہی تھی۔ انہی مقاصد کی تکمیل کو جانچنے کے لیے وہ صبح ہی صبح اپنے دفتر والی عمارت کی سیڑھیاں پھلانگ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کشادہ راہداری میں داخل ہوا اور جیب سے چابی نکال کر دفتر کی طرف

بڑھنے لگا۔ یکا یک اس کا موبائل بجنے لگا تو دفتر سے تھوڑا پیچھے رک کر اس نے موبائل سکرین پر جگمگاتا نمبر دیکھا اور پر فکر تاثرات کے ساتھ بڑھ کر دروازے کے " کی ہول " میں چابی گھمانے لگا۔

" ہیلو۔۔۔"

کال ریسیو کر کے وہ دوسری طرف سے بات کا منتظر ہوا۔

" سر فائنلی کام ہوگیا ہے۔ یو کین چیک۔۔۔"

یہ اس کی سوشل میڈیا ٹیم کا سب سے ہونہار اور قابلِ بھروسہ لڑکا تھا جس نے صرف اتنا سا پیغام دے کر فون بند کر دیا تو اس کے لبوں پر ایک مکروہ سی مسکراہٹ جاگ اٹھی۔ کمرے میں داخل ہو کر، چابی میز پر اچھالتا وہ تیزی سے لیپ ٹاپ آن کرنے لگا۔ میز پر جھک کر دبے دبے جوش کے ساتھ یہ کام کرتے ہوئے اسے بیٹھنا بھی یاد نہیں رہا۔ پھر مختلف فورمز پر گیتی کے متعلق اک طوفانِ بدتمیزی مچا ہوا دیکھ کر اس کے چہرے پر شیطانیت نے رقص کیا۔ ہر معروف فیسبک گروپ اور پیج گیتی کی مخالفت میں کئی کئی پوسٹس لگا چکا تھا۔ ان پوسٹس میں انٹرویو کے دوران ادا ہوئے گیتی کے مختلف جملوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہوئے ان پر ہر دو طرح سے گرفت کی گئی تھی۔ کسی نے ان بیانات کو مسلمانوں کی طرف سے توحید کی گستاخی کی مد میں اچھالا تو کسی نے اسے بھگوان کے مقابل خدا کی شان کو بڑھانے کا کہہ کر ہندوؤں کو طیش دلانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب " پتلی تماشا " دیکھ کر بے تحاشا ہنستا ہوا وہ لیپ ٹاپ اٹھا کر میز کے گرد گھوما اور اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ پھر ایک " سپیشل کوڈڈ " ای میل اکاؤنٹ کھول کر اس نے باری باری موصول ہوئے سارے پیغامات پڑھے اور ایک طنزیہ مسکراہٹ سے ان سب کو نظر انداز کرتا ای میل بار میں ایک پیغام ٹائپ کرنے لگا۔ اور کچھ ہی دیر بعد پر یقین آنکھوں میں مخصوص طراری کی چمک لیے وہ زیرِ لب اپنے لفظوں کی دہرائی کر رہا تھا۔

" سفید کبوتری شکاری پرندوں کے ساتھ مل کر اڑانیں بھرنے لگے تو اس کے باقی قبیلے کا اس پر نکتہ چیں ہونا جائز ہوتا ہے۔ پھر جب یہی کبوتری مخالف چڑیوں کے ساتھ مل کر مندر کی چھت سے اڑتی ہوئی مسجد کے گنبد پر جا بیٹھے تو قبیلے والوں کو تو اسے مار ہی ڈالنا چاہیئے۔۔۔"

سینڈ کا بٹن دباتے ہوئے اسے ایک یقین اور بھی تھا کہ اس کا یہ پیغام بہم پہنچا ہے۔

کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں آگے کی طرف پھیلاتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لے کر اس نے گویا سر سے کوئی بوجھ اتار پھینکا۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی پہنچنے تک اس کی ہلکی پھلکی گفتگو سے ثومیہ کا غصہ بالکل ڈھل گیا۔سارے راستے وہ اس سے اپنے والدین کی باتیں کرتا رہا جبکہ وہ صرف ہوں ہاں، بہتر، اور اچھا سے کام چلاتی رہی تھی۔سچ تو یہ تھا کہ اس کا دھیان سفیر کی گفتگو سے زیادہ لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن اپنے "مسائل" پر رہا۔بار بار ذہن سے جھٹکنے کے باوجود وہ فواد کے رشتے والی بات مکمل طور پر نظرانداز نہیں کر سکی اور اندر ہی اندر اس پر کئی پہلوؤں سے سوچتی مسلسل گھلتی رہی۔ہاں اپنی باتوں میں مگن سفیر اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس نہیں کر پایا۔

"وہ پرنس بھی جانے پہنچا کہ نہیں اب تک؟ پہلا یعنی ہسٹری کا لیکچر تو شروع ہونے والا ہے۔"

یونیورسٹی احاطے کی پختہ روش عبور کرتے ہوئے سفیر نے کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت دیکھ کر کہا تو ساری سوچیں جھٹک کر وہ بے ساختہ ہی صحن کے وسط میں دھرے اس پتھر کو دیکھنے لگی جس پر عموماً وہ اور سفیر دونوں وقت سے پہلے آ کر بیٹھ جاتے تھے۔

"پہنچ گیا ہوگا۔وقت کا پابند بچہ ہے۔تمہاری طرح سست تھوڑی ہے۔"

اسے غیر موجود پا کر بھی اس نے سفیر کو چھیڑتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔وہ جانتی تھی وہ کسی سے اپنا تقابل پسند نہیں کرتا۔

"ہاہاہا۔۔۔بات کرو کوئی کرنے والی۔۔۔وہ تو اس قدر سست ہے کہ پہلی ہی کلاس میں ایک ہفتے کی تاخیر سے آتا ہے۔"

راہداری کی داخلی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی تو اس کے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

"جانے کیوں مجھے لگتا ہے تم اس سے جلتے ہو؟"

کلاس کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے دوبارہ وار کیا۔

"واٹ۔۔۔میں جلتا ہوں؟؟"

ایک جھٹکے سے رک کر اسے گھورتا ہوا وہ متعجب لہجے میں بولا تو کھلکھلاتی ہوئی اس سے دو قدم آگے بڑھ چکی وہ تیزی سے اس کی طرف پلٹی۔

"ہاں تو اور کیا؟ اس کے ساتھ رویہ تو ایسا ہی ہوتا ہے تمہارا۔"

وہ اب اس کی حالت کا حظ اٹھانے لگی۔

"شکل ہے اس کی کہ اس سے جلا جائے۔ اور وہ بھی میں جلوں گا یعنی سفیر احمد۔ یقین کرو یہ یونیورسٹی آف سینٹرل پنجاب کا ایک ہسٹوریکل جوک ہے جو تم نے کیا۔ خیر تمہاری اس فضول بات سے قطع نظر وہ اب میرا دوست ہے اور میں جانتا ہوں وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ تمہیں ہماری دوستی میں "کیدو" بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لڑکیاں ساری ایسی کیوں ہوتی ہو؟ کسی مکار پھوپھو جیسی ازلی طبیعت لیے پیدا ہوتی ہو۔ اچھے خاصے تعلقات میں "پواڑا" ڈلوانے کو ہمہ وقت تیار۔۔۔"

اس کی بات کا اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتے ہوئے اس کی بے ساختہ ہنسی سے وہ فوری اس کا ستانا بھانپ گیا اور پھر بات بدل کر اسے سخت سناتا ہوا بڑے وقار سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی پھوپھو والی بات پر اس کے پیچھے ایک پل کو وہ ساکت ہوئی اور پھر بھاگ کر اس کے ہمراہ ہوتی دوبارہ شوخ ہوئی۔

"لیکن یہ کیدو تو محبت کی کہانیوں میں ہوتے ہیں ناں۔ دوستی میں یہ کہاں سے آن ٹپکے بھلا؟ تمہاری تمثیل ہی غلط ہے۔ لہٰذا تمہاری دلیل رد کی جاتی ہے۔"

اور اس کی بات سن کر اس کے دلفریب ہونٹوں پر یکایک بڑی جاذب سی مسکان طاری ہوئی۔ پھر کلاس کے نزدیک راہداری کی ایک کھڑکی پر رکتا ہوا وہ عمیق تر لہجے میں بولا۔

"دوستی کی ہر داستان محبت کے قصائص سے کہیں اعلیٰ و افضل ہے ثومیہ شاہجہاں۔۔۔ یقین کرو کہ صدیوں کے سلاسل میں گرفتار محبت کی ہر لازوال کہانی کو کسی نہ کسی باکمال دوستی کی ڈھارس ہے۔"

اس کے عقیدت مندانہ لب ولہجہ و انداز پر وہ قدرے چونک سی گئی۔ وہ اس سے اس قدر گہری باتوں کی توقع نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس سے قبل کہ جواباً وہ کچھ بھی کہتی ان کی پشت پر کھڑے طلباء کے ہجوم سے نکل کر مصطفین

ان کے پاس آرکا۔ وہ کب سے انہی کے انتظار میں کھڑا باقی کلاس فیلوز سے گپ شپ لڑا رہا تھا۔

" کیا بات ہے سفیر۔۔۔ بڑی " گوڑھیاں گلاں " کرنے لگے ہو۔ بھئی کیا خوب کہا ہے دوستی کی فضیلت میں۔ ہر بات سے متفق بلکہ شدید متفق۔۔۔ "

اسے داد دیتے ہوئے اس نے باری باری ان دونوں سے ہاتھ ملایا اور پھر ان کا حال چال پوچھتے ہوئے ان کے چہروں پر درج عکوس پڑھنے لگا۔ سفیر بڑا ہشاش بشاش جبکہ ثومیہ اسے کسی قدر ملول سی لگی۔ اس نے دل ہی دل میں تنہائی میسر آنے پر اس کے ملال کی وجہ جاننے کا قصد کیا۔ ان تعریفی کلمات سے ظاہر ہوا کہ وہ سفیر کی بات سن چکا ہے۔

" ہم ٹھیک ہیں بالکل۔ تم کیسے ہو پرنس؟ اور پسندیدگی کا شکریہ جناب۔ عام سی بات تھی۔ "

دونوں کی طرف سے مشترکہ جواب دیتے ہوئے سفیر خوشدلی سے بولا اور پھر مسکرا کر ثومیہ کی نظروں کا تعاقب کرنے لگا جو ان دونوں کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اب راہداری کے ابتدائی سرے سے اس طرف آتی مریم کو دیکھ رہی تھی۔

" ہاں بات تو عام سی ہے لیکن اس میں دبا احساس بڑا خاص ہے کہ محبت کی ہر تاریخی داستان پر دوستی کا کوئی نہ کوئی انمول قصہ سایہ فگن رہا ہے۔ محبت جب جب اور جہاں بھی پلی دوستی کے زیرِ سایہ پنپتی رہی ہے۔ دلی معترف ہوں۔۔۔ "

اس کی باتوں کی مزید وضاحت کرتا وہ بڑے جذب سے بولا تو سفیر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا جھکتے ہوئے اسے تعظیم دی۔ یہ ایک دوسرے کی دوستی کو ان کا خراج بھی تھا گویا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس پل وہ کسی اٹوٹ بندھن میں بندھ رہے ہیں۔ کوئی بے نام سا وعدہ ہے جو وہ ایک دوسرے سے کر چکے ہیں۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ بظاہر عام سی گفتگو کا یہ عام سا لمحہ ان کے لیے صدیوں پر محیط ہونے والا ہے۔

اسی وقت مریم ان کے بالکل قریب آئی تو ثومیہ نے زور زور سے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف بلاتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

" السلام علیکم۔ کیسی ہو ثومی۔۔۔؟ اور آپ دونوں کیسے ہیں؟ "

ان کے پاس رک کر صرف ثومیہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے بااعتماد انداز میں باری باری سب کا حال پوچھا اور پھر کچھ تناؤ کے بعد صلح کر کے دوست بنے سفیر اور مصطفین کا باہمی تعلق جانچنے لگی۔ کیونکہ ان کی لڑائی اور صلح اس کے مشاہدات میں شامل تھے۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ ہم سب ٹھیک ہیں یار۔ بہت شکریہ۔ اور گائیز۔۔۔ یہ میری دوست مریم ہے۔ اور مریم یہ سفیر ہے اور یہ مصطفین۔ سوچا آپ سب کو آپس میں بھی متعارف کروادوں۔"

سب کی طرف سے جواب دیتی ثومیہ نے اخلاقی طور پر ان سب کا باہمی تعارف کروایا اور پھر انہیں مریم کو یہاں بلانے کی وجہ سے آگاہ کیا۔

"بہت شکریہ ثومیہ۔ اور بہت اچھا لگا آپ سے مل کر مریم۔ کلاس میں ایک دوبار سوالات کرتے سنا ہے میں نے آپ کو۔۔۔ اچھا بولتی ہیں آپ اور ذہین بھی ہیں۔"

تعارف ہونے پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سفیر نے خوشدلی سے کہا تو وہ بشاشت سے مسکرائی۔ اپنے دل میں اسے اس "اپالو" سے اتنی خوش اخلاقی کی توقع نہیں تھی۔

"آپ کا بھی شکریہ جناب۔ مجھے بھی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

اس نے خلوص سے کہا اور پھر مصطفین کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مصطفین صاحب آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔ یقین کیجئے کلاس میں آپ جب بھی بولیں یوں لگتا ہے گویا منظر نامہ بدل کر ہم یکا یک لکھنو میں پہنچ گئے ہوں۔"

اور اس کی بات پر ان سب کا ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔ ثومیہ کو بہت اچھا لگا کہ مریم ان دونوں کو بڑے طریقے سلیقے سے ملی ہے۔ اس روز کی اپنی مزاحیہ گفتگو کے برعکس اس وقت اس کا انداز بڑا سوبر قسم کا تھا۔ پھر کچھ دیر وہیں رک کر باہم ہنسی مذاق کرتے وہ سب لیکچر شروع ہونے پر خوشگوار موڈ میں ہال کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ بات بے بات کھلکھلاتی لیکن انتہائی بااعتماد سی مریم ان سب کو بہت پسند آئی اگر تو بظاہر ایک دوسرے میں مگن ان تینوں کا شریر اور دراندرون ہر طرف سے پوری طرح باخبر ٹولہ مریم کو بھی خوب خوب بھایا۔ سفیر سے مل کر زیادہ حیرت اسے یوں ہوئی کہ حسین تر چہرے مہرے پر سجے سپاٹ تاثرات کے ساتھ وہ پوری کلاس کو بہت

مغرور لگتا تھا جبکہ حقیقت میں وہ اسے اپنے ظاہری تشخص سے بالکل الٹ ایک ہنس مکھ سا لڑکا لگا۔ جو عام ہو کر بھی بڑا خاص۔۔۔ بڑا منفرد سا تھا۔

☆......☆......☆

بادشاہی مسجد کے وسیع صحن میں متلاشی نظروں سے یہاں وہاں دیکھ کر حواس باختہ سی چلتی وہ لڑکی بڑی بے قرار دکھائی دے رہی تھی۔ صحن میں جا بجا گھومتے اور ٹولیوں کی مانند کھڑے سیاحوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے، کسی مخصوص چہرے کی تلاش میں سرگرداں وہ اداس اداس تھی۔ آج مسلسل تیسرا روز تھا کہ وہ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے میں مختلف مقامات پر یونانی دیوتاؤں سے حسن کے حامل اس حسین تر لڑکے کو ڈھونڈ رہی تھی جو ہاتھی پیر کی سیڑھیوں پر اس سے گویا "بچھڑ" گیا تھا۔ جانے کیوں وہ بار بار اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل زمین پر بسنے والے اس "آسماں سے "لڑکے سے الجھ گیا ہے اور اس کی مضطرب حالتوں سے بندھ بندھ کر وہ خود بھی مضطرب ہو گئی ہے۔ پہلے اسے اس کی کہانی جاننے میں دلچسپی تھی اور اب اس کی ذات کھوجنے کی لگن۔۔۔ وہ بہت مجبور ہو رہی تھی۔ کافی دیر بعد اسے تلاشنے کی سعی میں ناکام ہو کر وہ صحنِ مسجد کے عین وسط میں بنے گولائی دار حوض کے گرداگرد بنی پتھریلی نشست پر جا بیٹھی اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے ایڑھی کی نوک کو اضطراری حرکت دیتی وہ مضطرب سی ہو کر جھولنے لگی۔ پھر نگاہ اٹھا کر آسمان کے سینے پر رقصاں سرمئی بادلوں کو دیکھتی وہ یاسیت سے مسکرائی اور ان کی "دربدری" کا اپنی "جستجو" سے تقابل کرتے ہوئے رنجیدہ سی ہو کر پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ننگے پیروں پر "پتھریلے فرش" کی تمام تر سنگینی جھیلتے ہوئے وہ بے تحاشا بھاگی اور طویل صحن عبور کر کے انہی راہداریوں کے چوڑے زینوں پر جا گری جن میں کسی کہانی کے "کردار" کندہ تھے۔ اسے لگا کہ اگر وہ دوبارہ اسے نہیں ملا تو وہ بھی صدیوں تلک شاہی مسجد کی ان سنگیں دیواروں سے کسی راز کی مانند لپٹی رہ جائے گی۔ ہاں اس پل بے طرح مچلتی وہ بھی گویا انہی کرداروں میں شامل ہو گئی۔ اردگرد موجود سیاحوں نے بال بکھیرے عجب بے کلی سے بھاگتی اس حسین اپسرا کو دیکھا اور اس کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اس کے دائیں بائیں اور آس پاس سے تماشائی بن کر گذرتے رہے۔ اسی متحرک دنیا کے ساکت غموں کو سہہ سہہ کر وہ بالکل تنہا ہو گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے گلے کی رگیں دباتے ہوئے اسے لگا کہ یہی "اکیلا پن"

اسے مار ڈالے گا۔ کسی کو عوامی مقامات پر ایسے تماشوں سے روکتی وہ آج خود بھی انہی مقامات پر ایک تماشا ہو گئی تھی۔ وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے باغی لڑکی۔۔۔ کسی اداس لہجے کے بھید بھاؤ میں الجھی رہ گئی۔

پھر یوں ہوا کہ معجزنما اور بزرگ و برتر خدا کی اس عظیم بارگاہ میں اس نے ایک معجزہ رونما ہوتے دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ بادشاہی مسجد کے داخلی چوڑے دہانے سے وہ حسین تر "دیوتا" اپنی پوری تاب کے ساتھ داخل ہو کر باوقار انداز میں بڑی متوازن سی چال چلتا مسجد کے مرکزی گنبد کی طرف بڑھنے لگا ہے۔ وہ انہی پتھروں پر بڑے اطمینان سے چل رہا تھا جن پر کچھ دیر قبل اس کی تلاش میں وہ بڑی بے قراری سے بھاگتی رہی تھی۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اس بات کا ادراک بھی نہیں ہوتا کہ کوئی ہمیں کس قدر شدت سے ڈھونڈ رہا ہے۔

ایک پل کو اسے اپنی بصارت پر شبہ ہوا۔ اسے دیکھ کر اسے لگا کہ وہ صرف اس کا خیال ہے۔ لیکن جونہی اس خیال نے یقین کی منزلت کو چھوا اس کے پورے وجود کو اپنی سوگوار آنکھوں کے گھیر میں رکھ کر وہ سرعت سے اٹھی اور سیڑھیوں پر جا بجا بکھرا اپنا زرد رنگ دوپٹہ گھسیٹ کر سر پر اوڑھتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف بھاگی۔ اسے گویا کوئی گوہرِ نایاب ملا تھا۔

" کہاں تھے آپ؟ کتنے روز سے آپ کو یہاں وہاں ڈھونڈ رہی ہوں میں۔ مجھے لگا اب شاید آپ نہیں آئیں گے۔ میں اب ہارنے لگی تھی۔"

یکایک اس کے سامنے رک کر وہ اس قدر بے تابی سے بولی کہ اسے یوں اچانک سامنے پا کر ٹھٹک کر رکتا وہ اس کا انداز پڑھ کر بے طرح چونک بھی گیا۔

اس کے چونکنے کا سبب اس کی روشن آنکھوں میں جلتی عجب سی کوئی آنچ اور جاذب تر نظروں کی معنی خیز عمیقیت تھی۔

یہ آنکھیں۔۔۔ یہ نظریں۔۔۔ اسے اپنی ہی کسی گم گمشتہ خواہش کے در پر لے جا کر پوری شدت سے باندھنے لگیں۔

اندر کے سارے راز بوجھ لانے جیسی نظریں۔۔۔

ذات کا ہر ایک پہلو کھوج لانے جیسی نظریں۔۔۔

اور اس کی آنکھوں میں جلتا طرح طرح کی عشقیہ داستانوں کا سا کرب۔۔۔ایک پل کو اسے لگا وہ اپنا کرب بھول جائے گا۔

"میں نے آپ سے التماس کی تھی کہ آئندہ میرے راستوں میں مت آنا۔۔۔تو خدارا آپ نہیں آئو۔"

بمشکل اس سے نظریں چراتا وہ پہلے کی سی التجائیں کرنے لگا اور اس کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر مزید بولا۔

"اس دشت کی خاک چھان چھان کر میں تھک چکا ہوں جس دشت کی مسافتوں پر آپ اب نکلی ہیں۔ آنکھوں کی یہ اداسی کسی ورثے کی دین نہیں ہوتی۔ہم محبت گزیدہ لوگ اسی کائنات میں کسی جگہ سے یہ آبلہ پائی سمیٹ لاتے ہیں۔"

اس کے ہارے ہوئے لہجے میں اپنے لیے "ہمدردی" کا لمس پا کر وہ شکستگی سے ہنس دی۔تو گویا اسے اس کی تڑپ کا ادراک ہو بھی گیا لیکن یوں۔۔۔کہ بس آہ۔

ہاں وہ جان گیا تھا کہ وہ اپنے آپ میں پوری لڑکی آج ادھوری کیسے ہے؟ آج اس کا رنگ اور ڈھنگ۔۔۔ سب کا سب نرالا کیوں ہے؟

اس کی مجروح مسکراہٹ دیکھ کر وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا تو اس نے پھر سے اسے پکار دی۔

"بات سنیں۔۔۔کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ مجھ سے نظریں کیوں چراتے ہیں؟؟"

سوال کرنے کے بعد اسے روکنے کے ارادے سے اس نے بے ساختگی میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھونے کی کوشش کی۔۔۔لیکن چھوا نہیں۔وہ خود بخود رک گیا تھا۔پھر ایک پل کو رخ موڑے ٹھہر کر لفظ ترتیب دیتا وہ جونہی اس کی طرف پلٹا تو اس نے آہستگی سے اپنا معلق ہاتھ نیچے کر لیا۔پھر اس کی فسوں گر آنکھوں میں جھانکتی متاسف لہجے میں وہ مزید بولی۔

" کیا آپ کسی کی آنکھوں سے جھلکتے تمناؤں کے رقص کو کوئی کھیل سمجھتے ہیں؟؟ یا آپ کے خیال سے جذبے مذاق ہوتے ہیں کہ ان سے صرفِ نظر کیا جائے؟؟"

اس کا انداز کسی جرح کا سا ہو گیا تو اس کے لفظوں میں دبے محسوسات کا قاری ہو کر وہ عجب عجب سا گھلنے لگا۔ ملفوف وملفوظ لہجے میں وہ جیسے کوئی فریاد کرنے لگی۔

بالآخر اس کا حرف حرف سنتے اس حسین دیوتا نے اپنے سر کو یوں جھٹکا کہ گویا پہلے سے ترتیب دیا ہوا ہر اک لفظ ہوا میں اچھال دیا ہو۔ پھر اس کے قریب رک کر اپنی دلنشیں آنکھوں کی ساری چاشنیاں اس کی گھنیری پلکوں پر ٹانکتا وہ سحر گر لہجے میں بولا۔

"میں جذبوں کو مذاق نہیں سمجھتا محترمہ۔ ناں ہی میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں جذبات کی لپیٹ میں آکر ادھڑا ہوا اک بے قرار شخص ہوں۔۔۔ ہاں بس یہ کہ میں تمناؤں کو اور پنپنے نہیں دینا چاہتا۔ کسی کے جذبے یا تمنائیں نہیں یہ آنکھوں کی آرزوئیں ہیں۔۔۔ جو سراسر کھیل ہوتی ہیں۔ اور یقین کیجیئے آنکھوں کے اس کھیل میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ہماری آرزوئیں بدلنے لگتی ہیں۔ تمناؤں کے دھوکے کھا کھا کر ہم بلبلا اٹھتے ہیں کہ کاش کوئی آئے اور۔۔۔ یہ آنکھیں "نچوڑ" لے۔۔۔"

کوئی پر درد سا "راز" تھا جو اس نے مدھم مدھم بول کر اس کو "دان" کر دیا اور اس کے خوش رنگ لبوں کی دلکش جنبشوں سے پھوٹنے والی اک ایک چاپ کو بغور سنتی اس اپسرا کو لگا کہ اس کے سب جذبے "فضول" ہو گئے ہیں۔ اسے لگا وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گا کہ اس کے دل میں کیا کیا ہے؟؟ چند لحظے کو تھم کر اس کا وجیہہ چہرہ پڑھتے ہوئے اس نے اس کا ہر ایک نقش۔۔۔ اپنے دل پر چھاپ لیا اور پھر بالکل چپ رہ کر خیالات میں بلند ہوا اپنے جذبات کے بے مول ہونے کا نالہ سننے لگی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔ کیا سوچ رہی ہیں اب آپ؟ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

اس کی باتیں سن کر پتھر ہوئی کھڑی وہ اس کے پکارنے پر گویا کسی اور جہاں سے واپس لوٹی۔

"ہاں۔۔۔ آپ جا سکتے ہیں۔ بس جاتے جاتے آنکھوں کو کھیل کہتے اسی سنگلاخ لہجے میں کچھ حروف کسی بے قرار دل پر بھی پھونک دیں۔ شاید کہ جلتے ہوئے ان لفظوں سے آگ تاپ کر سرد ہوا پڑا وہ پھر سے کہیں دھڑک اٹھے۔"

انتہائی سوگواریت سے اسے جانے کی اجازت دے کر اس نے ملال زدہ نظروں سے اسے ایک " آخری

نگاہ" دیکھا اور پھر دائیں بائیں نفی میں سر ہلا کر ماتمِ عشق کرتی ہوئی خود ہی اس کے مقابل سے ہٹ گئی۔ اس کے روکنے سے قبل اپنے گھیر دار لمبے فراک کو دونوں طرف سے مٹھیوں میں بھر کر وہ گویا اپنا آپ سمیٹ کر مسجد سے باہر کی جانب بھاگ گئی اور اس کے بے بس لہجے سے گھٹے ہوئے جذبوں کا پر درد بیاں پڑھتا وہ۔۔۔ پتھر کا ہو گیا۔ وہ اس کے سامنے سے یوں ہٹی تھی جیسے دوبارہ کبھی نہیں ملے گی یا پھر ملے گی بھی تو صدیوں بعد کہیں۔۔۔ کسی اذیت ناک قصے کے کسی ساکتی کردار میں۔ پتھر رہ کر اس نے دور تلک پوری شدت سے بھاگتی ہوئی اس "انجان" لڑکی کو "جاننے" کی کوشش کی۔ وقفے وقفے سے اٹھتے اس کے سفید پیروں کی لال تلیوں نے اسے خبردار کیا کہ پتھروں پر بھاگنے کے سبب اس کے نازک پاؤں چھل چکے ہیں۔

صدیاں اس پر شاہد ہیں اور داستانیں گواہ۔۔۔ کہ عشق کہیں بھی ہو اگر۔۔۔ لال رنگ سا ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

ہسٹری کے پروفیسر راؤ ضیا الرحمٰن نے پوری کلاس کے طلباء کے چار چار افراد پر مشتمل کئی گروہ ترتیب دیے اور انہیں مختلف تاریخی مقامات کی سیر کر کے ان مقامات پر ہوئے اپنے مشاہدات کو ایک مقالے کی صورت میں لکھ کر لانے کا حکم دیا۔ اسی سلسلے میں ان تینوں کے ساتھ مریم کو بھی شامل کر کے ان کا بھی باقاعدہ ایک گروپ تشکیل پایا۔ پہلے دو لیکچرز کے بعد وہ سیدھے لائبریری میں چلے گئے جہاں ان کا ارادہ اس رپورٹ سے متعلقہ امور پر تفصیلی گفتگو کا تھا۔ اس وقت مریم بھی ان کے ہمراہ تھی جس سے اب تک وہ لوگ کافی بے تکلف ہو چکے تھے اور پورے انہماک سے مسلسل بولتی وہ اس حوالے سے طرح طرح کے مشوروں سے نواز رہی تھی۔

"میرے خیال سے یہ ایک بہترین موقع ہو گا کہ ہم ان شاہکار مقامات و تعمیرات سے بھرپور آگاہی حاصل کریں اور تاریخ کے ان ابواب کی کھوج اور مطالعہ کریں جو شاید اب تک ہماری سمجھ بوجھ سے بالا و اوجھل تھے۔ تو کیا خیال ہے کہاں سے ابتدا کی جائے؟" میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر ان تینوں کی جانب جھکتی وہ جوش و خروش سے بولی تو ثومیہ نے فوراً اس کی تائید کی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی پہلی بار اتنی تفصیل سے دیکھوں گی۔ ورنہ صورتحال یوں ہے کہ لاہور سے تعلق نہ ہونے کے باوجود میرے کزنز کے پاس مجھ سے کہیں زیادہ معلومات ہوتی ہیں لاہور کے

حوالے سے۔"

وہ گویا اپنی کم علمی پر شرمسار ہوئی تو ان دونوں کی باتوں پر کسی قدر حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے مصطفین اور سفیر زیرِلب مسکرانے لگے۔

" کیا مسئلہ ہے بوائیز؟ بڑی مسکانیں جاری ہیں۔کوئی غلط بات کردی کیا ہم نے؟؟"

ان کی مسکراہٹوں میں پنہاں معنی خیزی بھانپ کر مریم نے کسی قدر تیز لہجے میں پوچھا تو ثومیہ نے بھی سوالیہ نظریں ان دونوں پر گاڑ دیں۔

" بھئی تم دونوں یوں بات چیت کر رہی ہو گویا شاہی قلعے اور مسجد پر دشمنانِ ملک وملت کی طرف سے کوئی حملہ ہونے والا ہے اور ہمیں اس کا تفصیلی سروے کرنے کے بعد کوئی ناقابلِ تسخیر قسم کا حفاظتی پلان مرتب کرنے کا ٹاسک دیا گیا ہے۔ٹیک اٹ ایزی گرلز۔۔۔ایسا کچھ نہیں ہے قسم سے۔سیدھا سا کام ہے جسے بے تحاشا سر پر سوار کیے ہوئے ہو تم دونوں۔"

ان کو چھیڑتے ہوئے سفیر نے خوشگوار لہجے میں کہا تو اپنے بے جا انہماک کا احساس کر کے وہ واقعی جھینپ گئیں۔

" ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ہم شاید اس معاملے کو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ لے گئی ہیں۔اچھا خیر دیکھی جائے گی جو ہوا۔جلدی سے یہ بتاؤ کہ ادھر جانے کی ترتیب کیا بنائیں؟؟ پھر مجھے اپنی دوستوں کے پاس جانا ہے۔وہ صبح سے میری شکل دیکھ رہی ہیں بھئی۔میں ان سے آج ٹھیک طرح ملی بھی نہیں۔"

فوراً سے پیشتر گفتگو سمیٹتے ہوئے مریم اصلی مدعے پر آئی اور بات مکمل کر کے باری باری سب کے چہرے پڑھے۔وہ یونہی بنا برا منائے بااعتماد انداز میں بات کرنے کی عادی تھی۔اس کی بات سن کر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے سفیر دوبارہ بولا۔

"اس رپورٹ کو جمع کروانے کے لیے سر ضیا کی طرف سے ایک ہفتے کا وقت ملا ہے جو میرا ذاتی خیال ہے کہ مزید بڑھا دیا جائے گا۔تو اس حساب سے کافی وقت ہو گا ہمارے پاس۔میرے خیال سے ہم ایک دن چھوڑ کر ایک دن بھی جائیں تو ہمارا کام ہو جائے گا۔اور جانے کے لیے میرے خیال سے ہمیں یونیورسٹی کے کسی فری لیکچر

کا انتخاب کرنا ہوگا یا پھر چھٹی کے بعد کا وقت رکھ لیں؟ تم دونوں لڑکیاں اپنی آسانی کے لحاظ سے بتا دو ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔ کیا خیال ہے؟"

تفصیلاً کہہ کر اس نے سب کی رائے جاننا چاہی تو اس کے یونیورسٹی کے بعد وقت نکالنے والی بات پر ثومیہ کچھ متفکر سی دکھائی دینے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یونیورسٹی کے بعد تو وہ کسی صورت بھی وقت نہیں دے پائے گی۔

" گو کہ اتنی دور سے واپس ہاسٹل آنا آسان ہرگز نہیں میرے لیے لیکن میں ہر دو طرح سے ریڈی ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ لوگ ثومیہ سے پوچھ لو جیسے اسے آسانی ہو۔ مجھے مطلع کر دینا بس۔ اور اب مجھے اجازت کیونکہ میری دوستیں منتظر ہیں میرے لیے۔ اگلی کلاس میں ملتے ہیں۔ بائے۔۔۔"

ایک پل کو ٹھہر کر مریم نے ثومیہ کے کچھ بولنے کا انتظار کیا اور پھر اسے کسی تذبذب کا شکار پا کر اپنی طرف سے وضاحت دیتی ہوئی فوراً اٹھ کر چلی بھی گئی۔ مصطفین جو صبح سے ثومیہ کے انداز و اطوار جانچ رہا تھا اسے یقین ہونے لگا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ اسے بڑی پریشان سی لگی۔ خلافِ معمول آج وہ بڑی بڑی چپ چپ سی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کی خاموشی کی وجہ پوچھتا سفیر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

" تم لوگ بیٹھو یار۔ میں ذرا کینٹین سے ہو کر آتا ہوں۔ ہلکا پھلکا کچھ کھانے کو لے آؤں پھر صحن میں گھاس پر بیٹھ کر پلان کرتے ہیں سب۔ جسٹ ویٹ۔۔۔"

سرسری لہجے میں بول کر وہ تیزی سے نکلتا چلا گیا تو ایک طویل سانس بھر مصطفین اس کی طرف متوجہ ہوا جو اب تک کسی خیال میں تھی۔

" اے۔۔۔ کہاں گم ہو ثومیہ؟ سب خیریت ہے آج؟ بڑی بڑی کھوئی کھوئی سی ہو؟ آج تو موسم پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔۔۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر وہ شوخ لہجے میں بولا تو وہ کسی قدر چونک گئی۔

" تو گویا اس نے آج بھی میری خامشی کو بھانپ لیا۔"

وہ سوچ کر رہ گئی اور پھر سر جھٹک کر مسکرانے کی کوشش کی۔

" سر جھٹکنے سے اگر بوجھ اتار پھینکے جائیں ناں تو کوئی مرنے کی آرزو نہ کرے۔۔۔"

اس سے پیشتر کہ وہ کچھ بھی کہتی وہ اس کے عمل پر رائے دینے لگا۔اس کے لفظوں کا یہی سحر تھا جس کی وہ اول روز سے معترف تھی اور انہی محسوسات سے لپٹ کر، سفیر کی دوستی سے بالا ہی بالا ان کا ایک غیر محسوس سا تعلق بن چکا تھا۔

"میں جانتی ہوں تم کمال کے "حرف گر" ہو۔لیکن ہر بات میں لفاظی کرنے سے اس میں شدت نہیں آ سکتی۔حقائق اسی قدر رہیں گے جس قدر وہ ہوں۔کوئی موت کی آرزو کرے نہ کرے ہر کسی کو مرنا ہی پڑتا ہے اور اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ موت سے کہیں تلخ پہلو۔۔۔"زیست" میں شامل ہوتے ہیں۔"

یاسیت سے کہہ کر جواباً وہ بھی اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی تو وہ دلکشی سے مسکرایا۔

"اوہ۔۔۔تو یہ بات ہے کہ میری "حرف گری" سے تم نالاں بھی ہو۔میں سمجھتا رہا کہ تم اسے پسند کرتی ہو۔ اور بالکل درست کہا کہ موت برحق ہے اور اس سے تلخ حقائق بھی زندگی میں شامل ہیں۔پر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیا ضروری ہے کہ تلخیوں کو خود پر اتنا حاوی کر لیا جائے کہ وہ روح تک کو جامد کر دیں؟ لیکن بس کبھی کبھی سوچتا ہوں۔اکثر میں خود بھی یہی کرتا ہوں جو۔۔۔"

اس کی باتوں کی تائید کر کے یہاں بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس نے کچھ توقف کیا اور لہجہ بدل کر مزید بولا۔

"خیر۔۔۔چھوڑو یہ ساری باتیں۔میں شاید موضوع سے ہٹ رہا ہوں۔تم بتاؤ پلیز کہ بجھی بجھی سی کیوں ہو آج؟"

اور اپنے نرم لفظوں کے جواب میں اس کی آنکھوں کو یکبارگی "جھیل" ہوتا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔اس کے ہمدردانہ لہجے میں یہ سب پوچھنے پر ذرا سی جذباتی ڈھارس کیا ملی اس کے نین ہی بھر آئے۔ادھر مصطفین کا بس نہیں چلا کہ ہتھیلی پر کائنات دھر کر اس اداس لڑکی کے سامنے لا سجائے کہ لو اپنی مرضی کی چیزیں، لوگ، اور کچھ فیصلے بھی چن لو اور خدارا رونا بند کر دو۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی کہ جن کی آنکھوں میں آنسو ہم نہیں دیکھ سکتے۔

"ایم سوری مصطفین۔۔۔آنکھ میں شاید کچھ چلا گیا ہے۔میں آنکھیں دھو کر آتی ہوں۔"

آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر، اس کی متفکر نگاہوں کے حصار سے باہر نکلتی وہ تیزی سے لائبریری سے متصلہ زنانہ واش روم میں بھاگ گئی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکنے کی خواہش دباتا ہوا وہ اپنی بے بسی پر گویا تڑپ سا گیا۔اس کا شدت سے دل چاہا کہ اسے روک کر کہے۔۔۔" مجھ سے آنسو مت چھپاؤ پاگل لڑکی۔ کھارے پانیوں سا ہو کر بھی میں ان کو میٹھا کر دوں گا۔"

اور یہی وہ پل تھا جب اس کے لیے اپنی بے اختیاریوں کو محسوس کرتے ہوئے اسے ایک احساس اور ہوا کہ وہ سرد ہواؤں اور اداس لہجوں کی محبت میں مبتلا اس حساس ترلڑکی کے لیے خاص جذبات رکھتا ہے۔ہاں یہ چاہت کی شورشوں کا لمحہ تھا۔

ادھر واش رومز کے باہر لگے قد آور آئینہ کے سامنے رک کر اپنے چہرے پر پھسلتے پانیوں کے سنگ اپنے آنسو نتھارتی اس حساس ترلڑکی کو لگا کہ من ہی من اندر وہ کسی کی گہری نظروں اور سلجھے خیالات سے الجھ رہی ہے۔ہاں اسے اپنی خاموشی پر اس کا یوں پرواہ کرنا۔۔۔مسرور کر گیا۔ضبط کھونے پر افسوس ہونے کے باوجود ایک انجانی سی کوئی خوشی بھی تھی جو اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔

معاشرے کا ایک اہم تر پہلو یہ بھی ہے کہ جن لڑکیوں کو سخت گھریلو ماحول میں پروان چڑھایا جائے وہ باہر کسی بھی مرد کا ذرا بھر التفات پا کر بھی پگھل سی جاتی ہیں۔وہ بھی مصطفین کی متفکر اور پر خلوص نظروں کا تقابل براہ راست اپنے باپ شاہجہاں عادل کی شرربار نظروں سے کر رہی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ اسی کیفیت میں سرشار رہتے ہوئے اسے لگا کہ اس کے آنسو میٹھے ہو گئے ہیں۔کچھ دیر اس کے خیال میں کھوئی کھوئی وہ بے طرح مسکراتی رہی اور اس دوران وہ گویا ساری فکریں بھول گئی۔پھر منہ پر پانی کے دو تین چھینٹے اور مار کر خود کو متوازن کرتے ہوئے اس نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ادھر سفیر کینٹین سے واپس آیا تو اسے میز کے آس پاس بے تابی سے ٹہلتے ہوئے دیکھا جبکہ ثومیہ غائب تھی اور اردگرد میزوں پر بیٹھے سب طلبا اپنے اپنے دھیان میں پڑھ رہے تھے۔

" تم کیوں جلے پیر کی بلی بنے ہوئے ہو بھائی؟ اور ثومیہ کدھر ہے؟"

کینٹین سے لائی گئی چیزوں کا شاپر میز پر رکھتے ہوئے اس نے پہلے مذاق کیا اور پھر ثومیہ کی بابت دریافت

کیا۔اس کے پوچھنے پر ایک پل کو رک کر وہ دورائے کا شکار ہوا کہ اسے اصل بات بتائے یا کہ نہیں؟ اور پھر ثومیہ کے خود سے نہ بتانے کا سوچ کر اس نے بھی نامناسب جانا کہ اسے کچھ بتایا جائے۔

"واش روم گئی ہے یار۔ابھی آتی ہی ہو گی۔اور میں بیٹھا بیٹھا بور ہو گیا تو ٹہلنے لگا۔چلو باہر چلتے ہیں۔سامان اٹھاؤ۔وہ بھی آجاتی ہے۔"

ہاتھ جھاڑ کر سرسری لہجے میں کہتا وہ بڑھا اور اس سے پہلے ہی میز پر بکھری کتابیں رجسٹر اور دیگر اشیا سمیٹنے لگا۔

"اوکے۔چلو۔۔۔ویسے بھی ایک بات ہے جو فی الوقت میں صرف تم سے شئیر کرنا چاہتا ہوں۔"

دبے دبے جوش سے کہہ کر بیگ کاندھے پر لٹکاتا وہ بھی جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگا تو اس کے لہجے سے رازداری کی مشک پا کر ایک پل کو میز پر سے چیزیں چنتے مصطفین کے ہاتھ سست پڑے۔یکایک اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

"ایسی کیا بات کرنی ہے بھئی جو صرف مجھ سے کرنی ہے؟"

اس نے اپنا لہجہ متوازن رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔جواباً اس نے اپنے یاقوتی لبوں پر بے شمار تراوٹیں سجا کر اس کی سوالیہ نظروں میں جھانکا اور نہایت پراسراریت سے بولا۔

"سنو۔۔۔مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے اور یہ تم بوجھو کہ کس سے بھلا؟"

اور اس کی بات سن کر اس کے مسکراتے ہوئے لب یکایک سمٹ گئے۔بے ساختہ اس نے دعا کی کہ اس کے اندازے غلط ثابت ہوں۔

"بتا دو خود ہی یار م۔۔۔کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟"

پورے بدن سے "گوش" ہوا وہ اس کا جواب سننے کے لیے مچل سا گیا۔

"ثومیہ شاہجہاں سے یار۔۔۔اور کس سے؟؟ سچ مصطفین۔۔۔مجھے رات کو ہی ادراک ہوا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔شدید محبت۔خدا جانے یہ صرف محبت ہے یا کہ میرا عشق۔بہر حال جو بھی ہے۔۔۔شدید ہے بہت۔"

پورے جذب سے ڈوب کر وہ اپنی دھن میں کہتا رہا اور بغور اس کے دلنشیں تاثرات دیکھتا مصطفین جیسے

پتھر کا ہوگیا۔اس نے پوچھنا چاہا کہ کیا وہ جانتی ہے اس کی محبت کے بارے میں؟ لیکن وہ نہیں پوچھ سکا۔اسے لگا کہ تیز ہواؤں کے کوئی جھکڑ ہیں جو نازک احساسات کی حامل اس منفرد سی لڑکی کو اس سے بہت دور لے جا رہے ہیں۔سرد ہواؤں کی محبت میں مبتلا وہ کامنی سی لڑکی کہیں دھندلکوں میں کھو رہی ہے۔دل میں اتر کر اس کی آنکھوں تک سے۔۔۔او جھل ہو رہی ہے۔

"ارے۔۔۔تجھے کیا ہوا یار؟ لگا ناں زوروں کا جھٹکا۔بس یہی وجہ ہے کہ فی الحال میں اسے کہنے سے کترا رہا ہوں۔مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے اظہار سے یہی حالت اس کی بھی نہ ہو جائے جو تمہاری ہوئی ہے۔میں چاہتا ہوں وہ کوئی خاص لمحہ ہو جب میں اس سے اظہارِ محبت کر سکوں۔"

اس کی حالت سے یکسر بے خبر وہ اپنی ہی کسی لے میں بولتا چلا گیا۔بمشکل نفی میں سر ہلا کر مصطفین کو لگا کہ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکے گا۔ایک لفظ کیا کوئی حرف بھی نہیں۔زبان کے ساتھ ساتھ اس کے لفظ بھی گنگ ہو گئے۔

اور یہی وہ پل تھا جب چہرہ پونچھتی ہوئی ثومیہ بھی اس منظر میں لوٹ آئی۔اسے دیکھ کر سفیر نے اپنے گلال رنگ ہونٹوں کے دلکش کٹاؤ پر نرمی سے ایک انگلی رکھی اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی چپ ہو گیا۔

"اے گائیز۔۔۔کھڑے کیوں ہو؟ وہ دیکھو لائبریرین اشارے کر رہا ہے کہ یا تو بیٹھو یا باہر تشریف لے جاؤ۔۔۔"

ان کے قریب آ کر وہ بشاشت سے بولی اور پھر بڑھ کر ٹیبل پر دھرا شاپر کھنگالنے لگی۔

"کیا لائے ہو بوس؟؟ سچ مچ بڑی بھوک لگی ہے مجھے۔صبح ناشتہ بھی نہیں کر کے آئی۔چلو باہر صحن میں چلتے ہیں۔"

پھر شاپر اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر کی جانب بڑھتی وہ خوشدلی سے بولی تو مصطفین کو واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ اپنی پہلی جذباتی کیفیت سے باہر آ چکی ہے۔۔جبکہ ان سے دو قدم آگے بڑھ کر ان دونوں کے مابین کچھ عجیب سا محسوس کرتی وہ ایکدم رکی اور واپس ان تک آتے ہوئے انگلی اٹھا کر متجسس انداز میں بولی۔

"سب خیریت تو ہے ناں؟؟ تم لوگ یوں کیوں کھڑے ہو؟ میرا مطلب ہے ایک دوسرے کو اتنا غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ مجھے کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔بتاؤ مجھے کیا بات ہے؟؟"

اوراس کے تفتیشی انداز پر اپنا آپ سنبھال کر مصطفین نے چمکتی ہوئی نظروں سے سفیر کی طرف دیکھا اور پھران دونوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

" تم پاگل ہو ثومیہ۔ تمہیں تاریخ پر نہیں جاسوسی پر مقالہ لکھنا چاہیئے۔سی۔جی۔پی۔اے 3۔99 ہوگا پھر تمہارا۔افففف۔۔۔اپنی آنکھیں دیکھو۔کتنی شاکی ہورہی ہیں۔"

ہنسی کے دوران سفیر نے باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا تو مطمئن سی ہو کر وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اوپر اوپر سے ہنستے مصطفین کو دیکھنے لگی۔اس کی ہنسی میں در آئی شکستگی کو بھی اس نے اپنی فکر پر محمول کیا۔پھر سفیر کی ایسی ہی مزید شرارتوں پر کھلکھلاتی وہ لاشعوری طور پر ان دونوں کا تقابل کرنے لگی۔

وہ صبح سے سفیر کے ساتھ تھی لیکن اپنے لاابالی پن میں وہ ایک بار بھی اس کی خاموشی محسوس نہیں کر سکا جبکہ مصطفین نے تنہائی میسر آتے ہی اس کی ساری فکریں جان لیں۔

لمحات کے رتھ پر رہ دوستی سے چاشنیاں کشید کرتے اکثر لوگ واقعی لاعلم ہوتے ہیں کہ وقت کے دامن نے ان کے لیے اسی دوستی میں پھوٹتی محبتوں کا کتنا کرب سمیٹ رکھا ہے؟؟

یونیورسٹی سے واپسی پر ثومیہ لوکل روٹ سے ہی گھر کے لیے نکلی جبکہ اسے سفیر نے روک لیا کہ ایک ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں کا روٹ بھی ایک ہی تھا لہٰذا مصطفین کو بھی کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟ بائیک نکال کر روڈ پر ڈالتے ہوئے سفیر نے اپنا ہیلمٹ اتار کر آگے گود میں رکھا اور اس کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوگیا۔ اس کی گفتگو کا محور ثومیہ شاہجہان تھی۔ طرح طرح کے لہجے بدلتا وہ بس اسی کے "ذکراذکار" میں تھا۔ جونہی وہ لوگ کینال روڈ پر داخل ہوئے تو کب سے اپنی ہی دھن میں مگن سفیر نے محسوس کیا کہ وہ قدرے چپ چپ ہے۔

" کیا سوچ رہا ہے یار؟ میں تجھ سے بات کر رہا ہوں اور تیرا دھیان ہی نہیں۔ عجیب بات ہے۔"

اردگرد ٹریفک کا خیال کرتے ہوئے اس نے چہرہ موڑ کر کہا تو مختلف سوچوں کو توازن کی راہ پر لاتا وہ قدرے چونک گیا۔

" نہیں یار۔ میں سن رہا ہوں۔ تم کہہ رہے تھے کہ اسے دیکھ کر بے اختیار ہونے لگتے ہو۔ اور اتنا بے اختیار کہ اپنے مرتب کردہ اصول وقواعد تک بھول جاتے ہو۔ ہاں؟ یہی تو کہہ رہے تھے تم؟"

ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے دیکھنے کا کہتے ہوئے اس نے نرمی سے اس کے الفاظ دہرائے تو وہ بے طرح سرشار ہوا۔ اس دوران وہ لوگ کیمپس انڈر پاس عبور کر کے فیروز پور روڈ نمبر 2 کی طرف بڑھنے لگے۔

"ہاں۔۔۔ یہی بات۔ سچی یار اسے دیکھ لوں تو گویا میرے سارے نظریات ہوا ہونے لگتے ہیں۔ وہ میرے خیالوں جیسی نہ ہو کر بھی میرے خیالوں میں پوری شدت سے آن بسی ہے۔ تم جانتے ہو کیا کہ آج صبح ہم اکٹھے یونیورسٹی آئے تھے؟ میں نے اسے یہیں "لال پلی" سے پک کیا تھا۔ بڑی ضد لگا کر۔ بڑا مچل کر۔"

بشاشت سے کہتا یکایک وہ خاموش ہوا تو مصطفین حیرت سے اس کی کیفیت پڑھنے لگا۔ اور پھر کچھ توقف سے وہ دوبارہ بولا۔

"یار جانے میں صبح اس قدر بضد کیوں ہوا کہ وہ میرے ساتھ ہی جائے؟ حالانکہ کل میں ہی اسے کہہ رہا تھا کہ لڑکیوں کے سو تحفظات ہوتے ہیں ان معاملات میں۔ تم اگر چاہو گی تو میں لفٹ دے دیا کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ دراصل اسے بتایا تھا میں نے کہ میں بائیک لینے والا ہوں۔ یہ سب بہت عجیب ہے ناں؟؟ ورنہ میں اپنی

ہی باتوں سے یوں نہیں پھرتا۔ جانے میں ایسا بے تاب کیونکر ہو گیا اس کے لیے؟ میں سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں۔"

خود سے ہی سوال جواب والی کیفیت میں رہ کر اس نے بات مکمل کی اور دوبارہ اسے دیکھنے کی کوشش کر کے سڑک پر توجہ مرکوز کر لی۔ ادھر بغور اس کی الجھی الجھی باتیں سن کر مصطفین نے اس کی گفتگو سے کوئی آدھی ادھوری کہانی سمجھنے کی کوشش کی اور پھر کچھ نہ کچھ سمجھ کر فقط مسکرا دیا۔ اس کے پاس جیسے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کسی اندھے کو بھی دکھ جاتا کہ وہ اوائل محبت کے خمار میں مبتلا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جس سے وہ اپنی کیفیات بیان کر رہا ہے، وہ اس کی باتیں سن سن کر اپنے انہی جذبات و محسوسات پر بمشکل بند باندھ رہا ہے۔

جب کافی دیر گذرنے کے باوجود وہ کچھ بھی نہیں بولا تو سفیر بھی خاموش رہ کر اپنی کیفیت سمجھنے لگا۔ پھر ارد گرد موجود ٹریفک کو ہارن بجا بجا کر کراس کرتے، جانے پہچانے مناظر کو سرعت سے پیچھے گذارتے وہ لوگ تیزی سے کینال روڈ چھوڑ کر مال روڈ پر داخل ہوئے اور اس پر واقع کلب چوک کا پہلا برقی اشارہ عبور کر کے پرل کانٹینینل ہوٹل کی طرف بڑھنے لگے۔

"یار بالکل چپ ہی ہو گیا ہے۔ خیریت تو ہے ناں؟ بتا تا کیوں نہیں؟"

وہ لوگ پی سی ہوٹل کے بالکل سامنے سے گذر رہے تھے جب سفیر نے تھوڑا سا پیچھے ہو کر اپنی پوری کمر اس سے ٹکاتے ہوئے دوبارہ سوال کیا اور اس کی بات سن کر ایک بار پھر سے اپنے سارے خیالات جھٹک کر وہ حقیقتوں میں لوٹ آیا۔

ہوتی ہیں کچھ راہیں ایسی بھی کہ جن پر ہم خیالوں میں بھی نہیں چل سکتے۔

"تم آگے ہو کر بیٹھو یار۔ پورے دیو ہو قسم سے۔ اتنا وزن ہے تمہارا۔ اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہونا کیا ہے؟؟ میں بس ہمارے "ہسٹورک پراجیکٹ" کے متعلق سوچ رہا تھا کہ واقعی بقول مریم ہمیں تفصیلی اور اچھوتی معلومات جمع کرنی ہوں گی تا کہ ہم اپنے مشاہدات سے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈال سکیں کہ جواب تک کسی نے اخذ نہیں کیے ہوں وہاں سے۔ کیا خیال ہے؟؟"

اس کے دوستانہ لہجے میں دیو کہنے پر لہرا کر آگے ہوتا وہ کھل کر ہنسا اور پھر اسی بشاش لہجے میں بولا۔

"یارا خیال کوئی خاک ہونا ہے میرا۔ میں تم سے اپنی باتیں ڈسکس کر رہا ہوں اور تمہیں ان پتھریلی دیواروں سے نئے نئے قصائص کھنگالنے کی پڑی ہے۔ او بھائی دیکھا جائے گا وقت آیا تو۔ پہلے سے کیوں ہلکان ہوتے ہو؟ ویسے بڑے غیر رومانی شخص ہو یار م۔ میرے جذبوں کا احساس ہی نہیں۔ سچی۔"

یہاں رک کر اس نے چڑیا گھر کے برقی اشارے پر بائیک لگائی اور ایک نظر لال بتی کو دیکھ کر اس کی طرف رخ پھیرا جو زیرِ لب یاسیت سے مسکراتا اپنے لفظ سنبھالنے کی فکر میں تھا کہ اس کے سامنے کچھ ایسا ویسا بول ہی نہ دے۔ اس کی "چاہتوں" سے آگاہ ہونے کے بعد اپنی "لگاوٹوں" کا اظہار کر کے وہ کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

"ویسے ایک بات ہے مصطفین کہ تم میرے زندگی بھر کے پہلے دوست ہو۔ تم سے ملنے سے قبل میں نے دوستی کو صرف ایک لفظ کے طور پر پڑھا تھا۔ تم سے مل کر میں ان حروف کے "احساسات" سے بھی آشنا ہو گیا ہوں۔ مجھے ان نئے نئے محسوسات سے دوچار کرنے کا شکریہ یار م۔ تم نے مجھے اک منفرد تعلق پر بھروسہ کرنا سکھایا ہے۔۔۔"

اور اس کے خوش رنگ لبوں سے پھوٹتی نرم تر آوازیں سنتے مصطفین کو لگا کہ انجانے میں ہی سہی لیکن وہ اس سے کوئی عہد باندھ رہا ہے۔۔۔ کئی وعدے لے رہا ہے۔ اسی پل اسے ادراک ہوا کہ گویا وہ ہمیشہ کے لیے دوستی کے کمال تر اظہارِ عقیدت سے وابستہ ان فسوں گر لمحات کی گرفت میں آ گیا ہے۔ اسے کسی بھی صورت، دوستی پر ہوئے سفیر کے اس بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دینا تھا۔

"بہت شکریہ سفیر۔ مجھے بھی بہت اچھا لگا تم سے دوستی کر کے۔ گو کہ تم میرے پہلے دوست نہیں ہو لیکن میرے لیے تم بہت خاص ہو۔"

اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے دباتے ہوئے اس نے اپنی دوستی کا باور کروانا چاہا تو یکا یک اس کی دلنشیں آنکھوں میں کوئی شرارت جھلکنے لگی۔ پھر اشارہ کھلنے پر ارد گرد موجود گاڑیوں کو بڑھتا دیکھ کر اس نے بھی بائیک کو دوبارہ کک لگائی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"آئے ہائے۔۔۔ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے اظہارِ محبت بھی کرنے لگے ہو۔۔۔"

اور اس کی بات پر ان دونوں کا ایک قہقہہ بلند ہوا۔ وہ قہقہہ کہ جس کی گونج سمیٹ کر لاہور کی سرد ہوائیں ان کی دوستی پر گواہ ہو گئیں۔

اگلا سارا راستہ وہ دونوں یونہی ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے اور انہی کھلکھلاہٹوں میں ایک دوسرے سے کئی غیر محسوس قسم کے پیمان باندھتے ہوئے وہ لوگ بھاٹی دروازے پہنچ گئے۔

" مجھے داتا دربار کے گیٹ سے ذرا آگے اتار دو یار۔ میں یہاں سے اندر پیدل جاؤں گا۔ ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ میں بھی بائیک خرید لوں آج۔ لوکل کی ذلالت ضرور لینی ہے کیا ہر روز؟"

اس کی کمر تھپتھپا کر رکنے کا عندیہ دیتے ہوئے اس نے اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو بائیک ایک طرف لگاتے ہوئے وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔

" بائیک لے لے یار واقعی۔ بہت مزہ آئے گا۔ ریسنگ کیا کریں گے ایک ساتھ۔ اور میں چھوڑ آتا ہوں ناں گھر تک۔ کیوں؟؟"

جواباً بائیک سے اتر کر اس کے مقابل رکتے ہوئے اس کی سوالیہ نظریں پڑھتا وہ نرمی سے مسکرایا۔

" یار اندرون لاہور میں بڑا رش ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہیں سے چلے جاؤ تم کیونکہ بائیک کی نسبت میں پیدل جلدی گھر پہنچ جاؤں گا۔ اور یہ ریسنگ ویسنگ میں نہیں کرتا بھائی۔ معافی دو۔ مجھے کوئی شوق نہیں اپنی ہڈیاں تڑوانے کا......"

اس کے جواب پر سفیر نے ایک اور قہقہہ لگایا اور اس کے سینے پر مکا مارتے ہوئے بولا۔

" بڑا ڈرپوک ہے تو۔ رنگ دیکھ ابھی سے اڑ گیا ریس کے نام پر ہی۔ اور چل ٹھیک ہے جا اب۔ شکل گم کر اپنی۔ بائے۔۔۔" اور پھر اس کے کچھ بھی مزید کہنے سے پیشتر وہ بائیک بھگا لے گیا۔

" پاگل ہے یہ۔ بس اپنی دھن میں مست آدمی۔۔۔"

اسے دور تلک جاتا دیکھتے مصطفین نے اس کے پیچھے سرگوشی کی اور پھر سر جھٹک کر درمیانی سڑک عبور کرتے ہوئے بھاٹی گیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

تیز تیز قدموں سے چل کر وہ دونوں دبئی ایئرپورٹ کے وی-آئی-پی لاؤنج میں داخل ہوئیں اور ایک طائرانہ نگاہ سے وہاں موجود اخبار پڑھتے بزرگوں، بیگز گھسیٹتے شرارتی بچوں اور انہیں سنبھالنے میں ہلکان ہوتی ان کی ماؤں کو دیکھتی آخری کنارے پر دھرے دو آرام دہ صوفوں پر براجمان ہو گئیں۔ دنیا کے پہلے پانچ خوبصورت ترین ایئرپورٹس میں سے ایک دبئی ایئرپورٹ کو دنیا میں چھٹے نمبر پر مصروف ترین ایئرپورٹ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اور اسی لحاظ سے اس کا وی-آئی-پی لاؤنج مختلف ممالک کی اہم شخصیات سے ہمہ وقت پر رہتا ہے۔

موبائل سکرین پر نظریں جمائے انگلی کی نرم لیکن اضطراری حرکت سے مختلف "سکرولنگ" کرتی گیتی کے چہرے پر برہمی و فکرمندی کے ملے جلے تاثرات تھے جبکہ دائیں دیوار میں موجود دیوقامت کھڑکی کے شفاف شیشوں سے پار پارکنگ لاٹ میں جھانکتی گیتی کا چہرہ پرسکون اور شانت تھا۔ کچھ دیر بعد اپنی مصروفیت ترک کرتے ہوئے ناز نے سر اٹھا کر ایک نظر اسے گھورا اور موبائل سکرین اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے لہراتی متاسف لہجے میں بولی۔

"دیکھو تو گیت۔۔۔کیا کر بیٹھی ہو یار؟ ہوائیں بہت تیزی سے تمہاری مخالفت میں چلنے لگی ہیں اور تم ہو کہ اب تک غیر سنجیدہ ہو۔ سوشل میڈیا، اخبارات، صحافی، غرض تمام ذرائع ابلاغ تمہاری تردید کر رہے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں طرح طرح کے اندیشے کلبلانے لگے تو سکرین پر نگاہ کیے بنا گائیتری نے اس کا فق رنگ چہرہ دیکھا اور موبائل آہستگی سے نیچے کی جانب دھکیلتی نرم لہجے میں بولی۔

"چھوڑو یار کن باتوں سے پریشان ہو رہی ہو تم؟ تم جانتی ہو یہ سب وقتی ابال ہے۔ ایک دو دن میرے خلاف لکھ کر کل کلاں یہی لوگ، یہی صحافی، سوشل میڈیا اور اخبارات الغرض تمام ذرائع ابلاغ پھر سے میرے حق میں لکھنے لگیں گے۔"

یہاں اس نے ایک سانس بھرا اور آنکھوں میں عجب جوت جگائے مزید بولی۔

"ہم کسی کی زبان نہیں روک سکتے ناز۔ کہنے دو جسے جو جو بھی کہنا ہے۔ گائیتری کو کسی سے فرق نہیں پڑتا۔ میں بخوبی جانتی ہوں ہواؤں کے رخ پھرتے دیر نہیں لگتی۔ آج مخالف ہیں تو کل حق میں ہوں گی۔۔۔اور اگلے کسی روز پھر سے وہی مخالف بھی۔۔۔یہ دنیا ہے میری جان۔ یہاں کسی بھی بات پر حیرت کیسی؟؟؟ کچھ بھی ہونا ممکن

ہے لہٰذا خاموشی اختیار کرنا سب سے بہتر ہے۔"

اور اس کے ان خیالات پر موبائل اپنی گود میں گراتی وہ بے طرح چڑ گئی۔

"او بس کرو گیت۔۔۔ اپنے ان "اچ وچاروں" کا پرچار اب تو تم رہنے ہی دو۔ پہلے یہ انہی کا بھگتان ہے سب۔ کوئی ایسے لوگ نہیں اس دنیا میں جو تمہاری اس خاموشی سے کوئی مثبت معنی نکالیں گے۔ تمہیں اپنے دفاع میں اب بولنا ہوگا اور بس۔ ترکی پہنچ کر سب سے پہلا کام تم یہ کرو گی کہ اپنے موقف پر ایک تفصیلی بیان جاری کرو گی تاکہ ابہام واضح ہوں۔"

دوٹوک لہجے میں بات مکمل کر کے اس نے انگلی اٹھا کر باقاعدہ تنبیہہ کی تو اس کا انداز پڑھتی وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

"اف۔۔۔ اپنا چہرہ دیکھو ناز۔ یوں لگ رہا ہے کہ بس مار ہی ڈالو گی مجھے۔"

دورانِ ہنسی اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور بااعتماد چال چلتی کھڑکی پر جا رکی۔ پیچھے ناز نے تحیر و رنج کی ملی جلی کیفیت میں رہ کر اسے گفتگو سے ہٹتے دیکھا اور پھر گود سے موبائل اٹھاتی، ہینڈ بیگ ایک طرف رکھتی ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ بھی اس کے ساتھ جا رکی۔ وہ ماتھے پر ہلکی سی لکیرِ فکر لیے شفاف آئینوں سے پار بڑے بڑے حروف میں لکھا "ڈی-ایکس-بی" کا بل بورڈ تاک رہی تھی جو کہ دبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا مخفف ہے۔

"پچھلے تین ماہ سے جس شدت سے تم میری باتیں رد کر رہی ہو ناں۔۔۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے تمہیں ایک زوردار تھپڑ رسید کروں۔ اور میں سچ کہہ رہی ہوں گیت کہ اگر مزید تم نے مجھے نظرانداز کیا تو میں یہ کر بھی دوں گی۔ حد کرتی ہو یار۔ میری کسی بھی بات کا تمہیں اثر ہی نہیں۔"

یکایک دونوں شانوں سے تھام کر اسے اپنی جانب موڑتی وہ جھنجھوڑ کر بولی تو اس اچانک آئی "افتاد" پر ایک پل کو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے اسے یوں شدت سے ہلایا تھا کہ گیت کو لگا وہ بالکل خالی ہوگئی ہے۔ اس کے یوں موڑنے پر اس کے کھلے بال نصف دائروی گردش بھر کر کسی سمندری شوریدہ لہر کی مانند اس کے سینے پر آن گرے۔ پھر بغور اس کا غصہ ور انداز جھیلتی وہ عجب کرب سے مسکرائی اور نرمی سے اپنے کاندھے جھٹک کر خود کو آزاد کرواتی واپس باہر جھانکنے لگی۔ ناز نے دیکھا کہ طویل سانسیں بھرتی وہ کچھ لفظ ترتیب دے رہی ہے۔ وہ چپ چاپ اس

کے بولنے کی منتظر ہوئی۔

"پوری کائنات میں اگر کسی کو گیتی کی جان تک لینے کا حق ہے تو وہ تم ہو ناز۔۔۔سوگند کھا کر کہتی ہوں تم مارو تھپڑ۔گیتی اف تک نہ کرے گی۔"

کھوئے کھوئے انداز میں بالآخر اس نے بولنا شروع کیا اور مڑ کر اس کا ہاتھ تھامے اظہارِ لگاوٹ کرنے لگی۔ اس کی باتوں پر سرشار و ساکن ہوئی ناز کا غصہ ڈھلنے لگا۔اس کی طرف سے اپنا مان رکھا جانا اسے ہمیشہ یونہی من بھاتا تھا۔اس نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ موقع دیئے بنا گیتی مزید بولی۔

"لیکن میری جان لینے پر اختیار رکھ کر بھی تم مجھے وہ کام کرنے پر مجبور مت کرو جو میرے اصولوں کے برخلاف ہو۔میں کس بات کی وضاحت دوں ناز؟؟ میں نے کہا کیا ہے؟؟ کیا کیا ہے؟؟ یہاں ہر کوئی لفظوں کی توڑ پھوڑ کا ماہر ہے یار۔کیا گارنٹی ہے کہ میں کچھ بھی اور بولوں گی تو اسے صرف مثبت ہی لیا جائے گا؟منفی نہیں لیا جائے گا۔۔۔پلیز ناز میری حالت، بات اور میرا نقطہ نظر سمجھنے کی کوشش کرو۔میں ایسا کوئی سٹیٹمنٹ نہیں دے رہی جو اس فضول ترین مباحثے کو مزید ہوا دے۔"

اس کا ہاتھ ہلا ہلا کر اس نے قطعیت سے بات مکمل کی اور اس کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر دوبارہ انہی صوفوں پر جا بیٹھی۔اس کا انداز گفتگو سے فرار کا سا تھا۔لیکن ناز اسے اس حساس تر پہلو سے یوں صرفِ نظر نہیں کرنے دے سکتی تھی۔تیزی سے چل کر وہ بھی اس کے پیچھے گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے میں مان لیتی ہوں کہ تم کوئی بھی بے جا وضاحت یا صفائی نہیں دو۔لیکن اپنے ٹویٹر اکاؤنٹ سے ایک دفاعی نوٹ لازمی تحریر کرو اس پر۔۔۔تاکہ بوقت ضرورت وہ حوالے یا سند کے طور پر کام آسکے۔پلیز گیت اب ضدمت کرنا اور انکار تو میں سنوں گی ہی نہیں۔جلدی کرو شاباش۔بلکہ لو موبائل اور ابھی کرو۔"

اب کی بار نرم لہجے میں اس نے بھرپور استحقاق جماتے ہوئے کہا اور آخر پر اپنا موبائل بھی اس کی طرف بڑھایا تو وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ایک پل کو اس کے چہرے پر کسی تذبذب میں مبتلا ہونے کے سے تاثرات نمودار ہوئے اور پھر اس کا ہاتھ پیچھے کرتی وہ گویا ہار مان کر بولی۔

"اوکے یار۔۔۔لیکن میرے اکاؤنٹ سے یہ بیان تم خود جاری کرو کیونکہ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔اور بیان بس

اسی قدر ہو کہ میرے لفظوں کو سیاق و سباق سے ہٹ کر انتہائی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے جس کے لیے میں ذمہ دار نہیں۔۔۔کیونکہ میں صرف اپنے کہے کی ذمہ دار ہوں کسی کے سمجھے کی نہیں اور میرے لفظوں میں کسی بھی قسم کی توہین کا کوئی پہلو شامل نہیں تھا وغیرہ۔۔۔"

اور بات کے اختتام تک اس کے لہجے میں وہی اعتماد در آیا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

اس بات پر کہ اس نے اتنا بھی لکھنے کی اجازت دی ہے، دل ہی دل میں شکر ادا کرتی ناز کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اس کا فون بجنے لگا۔

" شیتل آنٹی۔۔۔اوشیہ اسی کارن فون آیا ان کا بھی۔۔۔اب؟؟"

سکرین پر نمبر دیکھتے ہوئے وہ بے ساختگی میں ہندی بولنے لگی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں اسی بدولت ہوگا۔تم کہہ دو میں موجود نہیں ہوں۔وہ بہت لمبی بات کریں گی یار۔خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔تسلی دو بس لیکن میں موجود نہیں یہ بتا دو۔"

اضطراری انداز میں ہاتھ جھلاتے ہوئے اس نے جلدی جلدی کہا تو ناز گھور کر بولی۔

"اوہو لیکن کیا کہوں کہ دبئی ائیر پورٹ پر تم کہاں مصروف ہو؟؟ ایسا کیا کام ہوسکتا ہے بھئی؟؟ کہاں ہو تم؟؟"

اسے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔۔۔وہ گویا کسی مشکل میں گرفتار ہوئی۔

"یار کچھ بھی کہہ دو۔۔۔کہو وی-آئی-پی لاؤنج میں کوئی ہالی وڈ ڈائیکٹر مل گیا ہے تو اس کے ساتھ بزی ہوں۔یا یہی کہہ دو یار کہ واش روم میں ہوں بس۔اٹھاؤ کال۔۔۔"

اس پل جلدی جلدی بہانے گھڑ کر ماں کی پر فکر نصیحتوں سے کتراتی وہ خاص ترلڑکی بہت عام سی لگی۔اس کے انداز سے بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہ بالی وڈ جیسی نامور فلمی صنعت کی نمبر ون ہیروئین ہے۔

اس کی بات پر تاسف سے سر جھٹکتے ہوئے ناز نے فون اٹھایا اور انتہائی اعتماد سے فر فر "جھوٹ" بولنے لگی۔

بلاشبہ ان دونوں کا تعلق کمال تر محسوسات کا حامل تھا۔

☆......☆......☆

مرکزی بازار سے ہٹ کر اندرون لاہور کی گلیاں بہت تنگ ہیں جو مکانات کی چھتیں اور بیرونی کنارے باہم ملے ہونے کی بدولت جا بجا تاریک بھی ہو جاتی ہیں۔ یہاں کی رہائش گاہیں زیادہ تر مغلیہ دور حکومت میں تعمیر کردہ بڑی بڑی حویلیوں پر مشتمل ہیں جن کے بیرونی اطراف پر لکڑی سے بنی شکستہ حال راہداریاں اور بوسیدہ بالکونیاں اب بھی موجود ہیں اور ان بالکونیوں، راہداریوں کی تاروں پر دھوپ میں سوکھنے کی مد میں پھیلائے گئے کئی رنگین آنچل ان کا جلو بڑھاتے ہوئے انہیں کسی خوابناک ماحول سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں گلیوں کی نکڑ سے لے کر پان فروشوں کی دکانوں تک اور چائے والے کھوکھوں پر بھی آوارہ گرد لونڈوں کا ہجوم جمع رہتا ہے۔ نوجوانانِ لاہور جدید تراش کے حامل آدھے ادھورے ٹراؤزر شرٹس میں ملبوس ہو کر بازار کی مختلف تھڑیوں پر بیٹھے ایک دوسرے سے اپنی بیروگاری کا رونا روتے ہیں اور آتی جاتی دوشیزاؤں کے جسمانی عروض ناپ ناپ کر، ان پر تیز جملے کستے ہوئے اپنا مستقبل طے کرنے کی فکروں میں گھلتے رہتے ہیں۔ ان لڑکوں کے رنگ برنگ قہقہوں سے یہ گلیاں، بازار ہر پل گونجتے رہتے ہیں تو کئی لڑکیوں کی زیرِ لب شرمیلی مسکانیں اور کئی ایک کی طرح دار گھوریاں بھی ان مناظر کی جان ہیں گویا۔ یہ اندرون لاہور کا وہ ماحول ہے جو سالوں گذرے یونہی چلا آرہا ہے۔

انہی اونچی نیچی، تنگ و تاریک گلیوں میں چل کر یہی سب مشاہدات کرتا مصطفین نیلی مسجد کی ذیلی گلی میں داخل ہوا اور گھر کی دہلیز پر رک کر پاؤں پٹختے ہوئے جوتوں سے گرد جھاڑتا اندر داخل ہو گیا۔

چھوٹا سا صحن عبور کر کے وہ لاؤنج کے داخلی دروازے پر آیا تو اندر سے مختلف خواتین کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔

" لگتا ہے کوئی مہمان آیا ہے۔"

اس نے دل میں خیال کیا اور بیگ کاندھے سے اتار کر ایک ہاتھ میں تھامے، دوسرے ہاتھ سے بال سنوارتا لاؤنج میں آ گیا۔ اندر خالہ کنیز، ایمان اور ایمان کی مغلپورہ والی خالہ رضیہ آمنے سامنے صوفوں پر براجمان خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی سنجیدگی کا سبب رضیہ بیگم کی آنکھوں میں ہمیشہ سے اس کے لیے جھلکتا ناپسندیدگی کا ایک غیر محسوس سا عنصر تھا۔ گو کہ انہوں نے اس کے سامنے کبھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن کچھ جذبے اظہار مانگتے ہی کب ہیں؟ وہ تو بس ہمارے طرز و طور سے یونہی

جھلک جاتے ہیں۔

"السلام علیکم۔۔۔کیا حال ہے خالہ جی؟؟"

مودب انداز میں سب کو مشترکہ سلام کرتا وہ قریب چلا آیا اور پھر رضیہ بیگم سے خیر خیریت دریافت کرتا ایک صوفے کی پشت پر رک گیا۔مجبوراً اسے مخاطب کرنا پڑا کیونکہ یوں سرے سے نظر انداز کر کے اوپر چلے جانا بھی خلافِ ادب ہوتا۔

"وعلیکم السلام۔آ گیا تو خیر سے۔چل بیٹھ۔۔۔میں پانی لاتی ہوں۔"

کنیز بیگم نے مسکراتے ہوئے گردن موڑ کر اسے بیٹھنے کا کہا اور پھر اٹھ کر پانی لانے باورچی خانے کی جانب بھی چلی گئیں۔انہیں روکنے کو کھلے لب بھینچ کر بے بسی سے ان کی پشت دیکھتا وہ صوفے کے گرد گھوما اور ان دونوں کے مقابل بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام۔ہم تو ٹھیک ہیں۔تم سناؤ کہ تم کیسے ہو؟"

اس کے بیٹھتے ہی رضیہ بیگم نے اسے کٹیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ان کے چہرے پر اس کے لیے ہر وقت عجب سی اک کھوج کا تاثر ہوتا تھا۔

"ٹھیک ٹھاک ہے یہ خالہ جان۔ہٹا کٹا ہے بالکل۔اسے کیا ہونا ہے بھلا؟"

ان کے جواب میں ایمان نے چہکتے ہوئے کہا تو وہ بس اسے گھور کر رہ گیا۔یقیناً اپنے تئیں وہ اسے ستا رہی تھی۔

"ہاں وہ تو دکھائی دیتا ہے ماشاء اللہ۔۔۔لیکن تو کیوں ٹھٹھے لگا رہی ہے اتنے اس کے سنگ؟ ذرا خیال سے رہا کر۔یہ کون سا دور ہے کسی غیر سے بے جا ٹھٹھول کرنے کا؟ رنگ برنگی دنیا ہے۔"

ایمان کی بات پر طنزاً ماشاءاللہ کہہ کر انہوں نے جو اگلی بات کہی تو بے پناہ سبکی محسوس کر کے وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔جبکہ ایمان اپنے مخصوص لاپرواہ انداز میں تنک کر بولی۔

"آئے ہائے۔۔۔کس کی جرات ہے خالہ کہ ایمان راجپوت سے ہاتھ کر جائے؟؟ دنیا جتنی بھی رنگ برنگ ہو خالہ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ارے میں تو اس دنیا کا ہر رنگ بیچ کھاؤں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو۔اور

ابو کہتے ہیں مصطفین تو بہت بیبا بچہ ہے۔ یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا خالہ۔ہمیں پورا یقین ہے۔"

اپنے مخصوص بلند و بانگ دعوے کرتے ہوئے بات کے اختتام پر اس نے اس قدر خلوص سے مصطفین کے متعلق رائے دی کہ اس کا جلتا اندرون یکا یک بجھنے لگا۔ بے ساختگی میں ہی سہی لیکن اس کے بارے میں وہ پہلی بات اپنی اصل سوچ کا اظہار کر رہی تھی۔اس پل اسے اپنا آپ بڑا معتبر لگا۔

اخلاص کی قدر دانی کا ادراک پا کر انسان یونہی سرشار ہوتا ہے۔

اور اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی بھی مزید کچھ بھی بولتا کنیز بیگم پانی لیے چلی آئیں۔

"لے مصطفین پانی پی لے۔اور آج تو خیر سے تیرے خالو بھی جلدی آ گئے ہیں۔اندر کپڑے بدل رہے ہیں۔بس ابھی۔۔۔تیرے آگے آگے پہنچے وہ بھی۔"

اسے گلاس تھما کر ایک طرف بیٹھتی وہ اطلاعاً بولیں تو گلاس لبوں سے لگا تا لمبا سارا "اچھا۔۔۔" کہتا وہ سچ مچ حیران ہوا۔دل ہی دل میں اس نے یہ شکر بھی ادا کیا کہ موضوع بدل گیا ہے۔پھر پانی پی کر گلاس ایک طرف رکھتا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریہ خالہ۔۔۔آپ سب بیٹھیں میں خالو سے مل لوں۔مجھے ان سے ایک ذاتی کام ہے۔"

پھر یہ کہتا ان کے کسی بھی جواب سے قبل وہ خالو ظفر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔اپنا بیگ اس نے وہیں صوفے پر چھوڑ دیا تھا۔

"اللہ تیرا بھلا کرے کنیز اب بہت ہو گئی خدا ترسی۔جوان جہان لڑکا ہے۔سارے خاندان میں باتیں ہوتی ہیں اس کی۔کب تک رکھنا تو نے اسے اپنے گھر؟ میں تو کہتی ہوں بس کر دے اب۔کسی روز پیار سے بٹھا کر اس سے بات کر اور اسے عزت سے رخصت کر اب یہاں سے۔جوان بیٹی ہے گھر میں کچھ تو خیال کر و تم اور بھائی ظفر بھی۔ایسے کب تک رہے گا وہ یہاں؟؟"

اس کے نکلتے ہی رضیہ بیگم نے اپنی بہن کو مخاطب کر کے جو سمجھانا شروع کیا تو ان کے مدھم بولنے کے اشاروں کو نظر انداز کرتی بولتی ہی چلی گئیں۔وہ کیونکر آواز نیچی کرتیں جبکہ انہوں نے جان بوجھ کر آواز اونچی رکھی تھی تا کہ وہ ضرور سن لے۔رد عمل کے طور پر ایمان نے گھبرا کر پہلے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور پھر اس کا ہونا یا نہ

ہونا دیکھنے کی غرض سے تیزی سے اٹھ کر کمرے کی طرف جاتی راہداری کے سامنے آرکی۔ادھر راہداری میں چل کر خالو کے کمرے کی جانب بڑھتے مصطفین کے قدم ان کی باتوں پر سچ مچ سست پڑ گئے۔جانے کیوں اس کے دل میں کنیز بیگم کا جواب سننے کی شدید خواہش جاگی۔

" آئے ہائے کہہ بھی رہی ہوں کہ ہولی بول رضیہ۔وہ سن لے گا تو دل آزار ہوگا۔اور کوئی اللہ واسطے نہیں رہ رہا وہ یہاں بلکہ میرا کرائے دار ہے۔کسی کو بھی تو میں نے مکان دینا ہی ہے ناں کرائے پر تو اگر وہ رہ لے تو کسی کو کیا تکلیف ہے؟ اس کی ماں بڑی گوڑھی سہیلی تھی میری۔اب اس کا بیٹا مجھے اپنے بیٹے جیسا لگتا ہے۔بلکہ بیٹے جیسا کیا میں نے اسے بیٹا بنا کر ہی رکھا ہوا ہے۔رہی بات خاندان کی تو جو اعتراض کرے گا اسے میں خود جواب دے لوں گی۔تم ایویں نہ گھلو اس فکر میں کہ کوئی کیا کہے گا؟ کسی کے کہنے کی پرواہ ہوتی مجھے تو میں اسے رکھتی ہی نہیں۔اور جب میرے خصم کو اعتراض نہیں اس کے یہاں رہنے پر تو کسی اور کو اعتراض میں کرنے بھی نہیں دوں گی۔"

جواباً کنیز بیگم نے بھی جو بولنا شروع کیا تو بھرپور قطعیت سے اگلی پچھلی ساری کسریں نکال دیں۔ایک پل کو ٹھہر کر ان کا جواب سنتا وہ پیچھے کھڑی ایمان کو دیکھے بنا کمرے میں چلا گیا تو وہ بھی ہارے ہارے قدموں سے واپس لوٹ آئی۔ایمان کو بھی اپنی خالہ کے بے نقط بولنے کا بہت افسوس ہوا۔

" لے ہاں۔۔۔تو تو الٹا مجھ پر ہی غصہ کر گئی ہے۔میں تو تیرے ہی بھلے کو سمجھا رہی تھی۔نئیں تے ناں سہی۔کل کو برا بھلا جو بھی ہو خود ہی دیکھنا۔"

رضیہ بیگم بھی بہن کی ان وارفتگیوں سے بے طرح چڑ کر مزید بولیں تو اپنے لہجے کی تیزی کا احساس کر کے انہوں نے اب اپنی بڑی بہن سے پیار جتلایا۔

" اوہو میں کب تمہیں کہہ رہی ہوں کچھ۔مجھے پتا ہے تم میرے فائدے کے لیے کہتی ہو سب۔میں تو باقی خاندان کی بات کر رہی تھی۔"

نرم لہجے میں اتنا کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے ساتھ جا بیٹھیں تو خلوص و محبت سے بھرپور ان دونوں بہنوں کے اس " فیملی ڈرامے " کو بغور دیکھتی ایمان نے سر کو تاسف سے دائیں بائیں جنبش دی اور اندر کمرے

کی جانب بڑھ گئی۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ مصطفین کو اس کے باپ سے ایسا کون سا "ضروری اور ذاتی کام" پڑ گیا ہے؟

☆......☆......☆

آج یونیورسٹی میں اپنائے گئے سفیر کے فریفتہ رویے کے متعلق مختلف سوچوں کے تانے بانے بنتی وہ گھر واپسی تک ازحد پریشان رہی۔ اس کی چھٹی حس اسے بہت کچھ ایسا سمجھا رہی تھی جسے وہ کسی طور نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔ اپنے دل میں مصطفین کی خاطر موجود نرم گوشے کا ادراک رکھ کر وہ سفیر کی وارفتگیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتی تھی۔ طرح طرح کے افکار کو مختلف خیالات سے تقویت دیتی جونہی وہ گھر داخل ہوئی تو نمرہ خلاف توقع اسے صحن کے عین وسط میں ٹہلتی دکھائی دی۔ دوپٹے کا کونا ایک ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے اسے اضطراری انداز میں جھلاتی وہ یقیناً اسی کی منتظر تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا تو کھٹکا سن کر نمرہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بے تابی سے بھاگتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

"شش۔۔۔ آہستہ بولنا۔۔۔ اور سنو اندر اپنے کمرے میں ماما بابا کی دھواں دار بحث چل رہی ہے تمہارے اور فواد کے رشتے کو لے کر۔ میں بھی بس ابھی ابھی پہنچی ہوں واپس اور میری آمد سے قبل یہ معرکہ جاری تھا۔ پھوپھو نے شاید واپس گھر پہنچ کر فون کیا ہے بابا کو اور کچھ اور باتیں کی ہیں۔ یہ آخری والا میرا ذاتی خیال ہے پکا پتا نہیں مجھے۔"

نہایت افراتفری سے اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات اس کے گوش گذار کر دی تو اس کا عجلت بھرا انداز دیکھ کر پہلے اس کی آنکھوں میں تحیر ابھرا اور پھر اس کی خوبصورت پیشانی پر بے شمار بل نمودار ہوئے۔

"ہٹو تم۔۔۔ میں خود بات کرتی ہوں بابا سے۔ اگر نہیں کی تو یہاں ہر روز یہی تماشا ہو گا۔"

اپنا بیگ کاندھے سے اتار کر اسے تھماتی وہ تنک کر بولی اور پھر اس کی ایک طرف سے نکل کر اندر کی جانب بڑھی ہی تھی کہ ہڑبڑا کر نمرہ اس کے پیچھے بھاگی اور اس کے آگے ہو کر اس کا بیگ اس کے سینے پر رکھتے ہوئے اسے پوری قوت سے روکا۔

"ارے ارے ارے رکو یار۔۔۔ خدارا بات سنو آپی۔ یوں مسئلہ بڑھ جائے گا بجائے مشکل حل ہونے

کے۔ ماما بہت اچھے سے بات کر رہی ہیں اور بابا کوئی جبر نہیں کر سکتے تم پر یہ انہیں بھی پتا چل چکا ہے۔ تمہیں یہاں روکنے کا مقصد ہی یہ تھا میرا کہ تم چپ چاپ ہمارے کمرے میں جاؤ گی سیدھی۔ پلیز۔۔۔ یوں بات خواہ مخواہ بڑھ جائے گی۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔"

کبھی اندر کی طرف اور کبھی اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ ملتجی لہجے میں بولی تو وہ جیسے بہت بے بس ہو کر دو قدم پیچھے ہوئی۔

"لیکن نمرہ یوں روز روز ایسے مباحثوں سے بہتر ہے کہ بات ایک ہی دفعہ آر یا پار ہو جائے۔ ذہنی اذیت سے تو نجات ملے ناں۔"

اس کے لہجے میں اب بھی کوئی عزم بولنے لگا تو مزید گھبرا کر نمرہ دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔

" کچھ نہیں ہو گا یار۔ بس اب یہی حتمی بات سمجھو جو ماما کر رہی ہیں۔ میں ان کی گفتگو سن کر آئی ہوں اور مجھے صاف لگا کہ ماما کے دلائل کے سامنے بابا بے بس ہو رہے ہیں۔ لہٰذا تم فکر نہیں کرو اور بس خاموشی سے اپنے کمرے میں چلو۔ میں کھانا گرم کر کے وہیں لاتی ہوں۔ اکٹھے کھاتی ہیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے اور یقیناً تمہیں بھی لگی ہو گی۔"

بات کے اختتام پر اس نے موضوع بدلنا چاہا تو سر جھٹکتے ہوئے یہ کہہ کر وہ گویا بہت چڑ کر اندر کی جانب بڑھی۔ "ہونہہ۔۔۔ یہ بات سن کر ہی رج گئی ہوں میں۔ اور کسی شے کی طلب نہیں رہی۔ میں سونے لگی ہوں لہٰذا مجھے تنگ مت کرنا۔"

اور اس کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے اس نے شکر ادا کیا کہ وہ "ٹل" گئی ہے۔ اسے اس کی جذباتیت کسی مصیبت سے کم نہیں لگتی تھی۔

لیکن اندر داخل ہو کر ثومیہ نے اپنے والدین کے کمرے سے آتی مختلف آوازیں سنیں تو لب بھینچ کر کمرے کی جانب بڑھتی وہ نشست گاہ کی حدود کے پار رک گئی۔ گو کہ یہاں واضح سنائی نہیں دیتا تھا کہ کیا بحث ہو رہی ہے لیکن اپنا مستقبل طے کرتی ان آوازوں کو ان سنا کرنا اس کے اختیار سے باہر ہو رہا تھا۔ بے ساختگی میں اس کے قدم ان کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے تو نمرہ نے ایک بار پھر بھاگ کر سرعت سے اس کا بازو کھینچا۔

"جانے دو یار پلیز۔منع کر رہی ہوں ناں میں۔۔۔تو لازمی کوئی وجہ ہے اس کی۔کچھ سوچ کر ہی روک رہی ہوں۔"

اس نے نیچی آواز میں اپنی بات دہرائی تو اس کے لجاجت آمیز لہجہ و انداز پر وہ بھی پھر سے چڑ گئی۔

"اوہو کوئی دخل اندازی نہیں کر رہی ہوں میں۔بس باہر سے سنوں گی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔چھوڑو مجھے۔"

اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ راہداری میں داخل ہوئی اور تین چار قدم چل کر یکا یک رک گئی۔اس کی پشت پر متحیر کھڑی نمرہ نے مزید حیرانی سے اسے رکتے ہوئے دیکھا اور پھر اس کا اگلا عمل دیکھ کر اس پریشانی کے عالم میں بھی اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔وہ اب جھک کر اپنا جوتا اتار رہی تھی۔یقیناً اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ بابا اس کے قدموں کی چاپ سن لیں گے۔جوتا اتار کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر جو اسے شرارت سے مسکراتے ہوئے دیکھا تو وہی جوتا اسے مارنے کا اشارہ کرتی ہوئی ان کے دروازے پر جا رکی۔یہاں آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔

"تم نے ان دونوں کو سراسر بگاڑ رکھا ہے یہ میں شروع سے کہہ رہا ہوں۔اور رات اس ڈھیل کا نتیجہ تو تم نے بھی دیکھ ہی لیا ہے۔کس قدر بدتمیزی سے بات کر کے اٹھی تھی وہ یاد کرو۔نہ شہوار کا لحاظ کیا، نہ فواد کا اور نہ ہی میرا یا تمہارا۔یہی تو میں کہتا ہوں کہ اتنی چھوٹ دو گی بچیوں کو تو یہی کچھ ہوگا جو رات کو ہوا۔"

اپنے باپ شاہجہان عادل کی آواز پر اس کی ساری حسیات گویا نئے سرے سے بیدار ہوئیں۔غصے سے بھرپور ہو کر وہ راشدہ بیگم کو "بچیوں" سے پیار کے منفی نتائج سے آگاہ کر رہے تھے۔

"تو شہوار کو بھی تو کچھ سمجھ داری سے کام لینا چاہیئے تھا کہ نہیں؟؟ یوں بچوں کو آمنے سامنے بٹھا کر رشتوں کی بات کون کرتا ہے؟ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ سب کے سامنے یوں پیش آ کر ثومیہ نے کوئی اچھا عمل کیا ہے لیکن میرے خیال سے عمل سے زیادہ یہ ایک ردعمل تھا۔اور معاف کیجیئے گا کہ شہوار کا انداز بھی قطعاً پسند نہیں آیا مجھے یوں احسان کرتے ہوئے رشتے مانگنے کا۔یہ لمبی سی تو گردان کی اس نے پہلے کہ نوکری والے لڑکوں کو رشتوں کی کمی نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔"

جواباً انہوں نے بھی بنا لاگ ولپیٹ انہیں بات کا دوسرا رخ دکھانا چاہا تو ہمیشہ کی طرح وہ بے تحاشا تپ گئے۔

"بس یہی کرنا تم ہمیشہ اور یہی تم کرتی آئی ہو۔ میری بہن کی غلطیاں گننے لگو تم جبکہ اپنی بیٹیوں کی دیدہ ہوائی دکھائی نہیں دیتی تمہیں۔ ایک بات کان کھول کر سن لو راشدہ کہ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں معترض ہونے دوں گا۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ تم اسے سمجھا لو خود ہی کہ دماغ ٹھنڈا رکھے اپنا اور اسے اس رشتے پر راضی کرنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ اپنے طریقے سے بات منوا لو اس سے ورنہ پھر میں اپنے طریقے سے منواؤں گا۔ آئی سمجھ۔۔۔"

اختتام پر انہیں دھمکاتے وہ غصے کی شدت سے ہانپنے لگے تو ان کی جارحیت دیکھ کر راشدہ بیگم ایک پل کو بالکل خاموش ہو گئیں۔

ادھر کان لگائے کھڑی ثومیہ کو لگا کہ وہ ایک دم باہر آ جائیں گے تو احتیاطاً خاموش قدموں سے بھاگ کر اس سے اگلے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ دہلیز پر رک گئی۔ اپنے باپ کے عزائم جان کر اس کا پورا وجود گویا زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ ان کی گرج دار آواز سن کر اس کی ساری بہادری ہوا ہو گئی اور وہ کمزور پڑنے لگی تھی۔ اسی وقت اس نے راہداری کے داخلی سرے سے نمرہ کو اس جانب آتے دیکھا۔ بغور اس کے چہرے پڑھتے وہ اس کے ساتھ آن رکی اور ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ "کیا ہوا ہے؟؟"

وہ بمشکل نفی میں سر ہلا سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید جرح کرتی اندر سے آتی اپنی ماں کی آواز پر انہیں اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"دیکھیں شاہجہاں بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس بات پر میں خود رضا مند نہیں ہوں وہ میں اس سے کیسے منواؤں؟ اور میری رضا مندی سے بھی اہم فواد کے لیے اس کی ناپسندیدگی ہے۔ جس شخص کو وہ پسند ہی نہیں کرتی اس کے ساتھ زندگی کیسے گذارے گی؟ آپ صرف بہن کا دل دیکھ رہے ہیں۔۔۔ کچھ خیال بیٹی کے دل کا بھی تو کیجئیے۔ کیسے کر سکتے ہیں آپ اس کے ساتھ یہ زبردستی؟"

اب کی بار انہوں نے آواز دھیمی رکھی کہ جس میں مفاہمت شامل ہو لیکن لہجہ دوٹوک اور قطعی اپنایا۔

"خوب پتا ہے مجھے کہ کس طرف دھیان کرنا ہے اور کس طرف نہیں۔ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم

نے اس کی تعلیم مکمل ہونے تک کا وقت مانگا ہے تو بس سمجھو وہی ہے تمہارے پاس۔۔۔تب تک میں بھی شادی کے خرچ اخراجات کا بندوبست کرلوں گا اور تم بھی اسے منا چکی ہوں گی۔اور اگر وہ نہیں مانی تو پھر مجھے اس کے ساتھ زبردستی بھی کرنی پڑی تو میں کروں گا۔ بتا دینا اسے کہ دماغ درست رکھے اپنا اور یہ بھی کوشش کرنا اس دوران کہ کوئی ایسی بات نہیں ہو جس سے مجھے اس کے مقابل یا دوبدو ہونا پڑے۔میں چپ ہوں تو میری چپ کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھائے وہ۔"

جواباً فیصلہ کن لہجے میں انہوں نے ان سے بھی زیادہ قطعیت سے کہا تو باہر کھڑی ثومیہ نے بے ساختہ طاق تھام لیا۔وہ صدمے سے گرنے لگی تھی۔نمرہ نے فوراً اس کا شانہ مسلتے ہوئے تسلی دینے کا فرض نبھایا۔

"عجیب بات کرتے ہیں آپ کہ بیٹی کی زبردستی شادی کریں گے۔بھئی وہ مانے ہی نہیں تو ایسے کیسے کریں گے آپ؟؟؟اور خدارا شہوار کو کوئی بھی مثبت یا حتمی جواب نہیں دیجیئے ابھی کہ جب تک آپ کی وہ دختر نیک اختر کے مزاج نہیں ملتے۔میں نصیبوں جلی تو قابو آ گئی ہوں اس شاہی مزاج ٹبر میں دونوں طرف سے۔باپ بیٹی سے بڑھ کر ہے تو بیٹی باپ سے بڑھ کر ہے۔"

اب کی بار زچ ہو کر انہوں نے باقاعدہ ہاتھ باندھ دیے اور اپنے نصیبوں کو کوستے ہوئے اپنی مشکل بیان کی۔نمرہ کو اس پل اپنی ماں پر بے تحاشا ترس آیا۔ساری زندگی اپنی ماں کو اس نے ایسی ہی مصلحتوں سے کام لیتے دیکھا تھا کہ جس سے تعلق بھی بچ جائے اور بات بھی بن جائے۔

"اسے جو بھی جواب دینا تھا دے چکا ہوں تمہارے سامنے ہی۔یہی کہا ہے فی الحال اسے کہ ابھی صبر کرو اور بات خاندان میں مت نکالنا۔تم بس یہ نصیبوں کو کوسنا چھوڑ کر اپنی ذمہ داری کی طرف دھیان دو۔وہ تو اب ہونا تھا جو ہو چکا۔اور چلتا ہوں اب میں دفتر۔دوپہر کا کھانا تو اسی بحث کی نذر کر دیا تم نے۔خدا حافظ۔۔۔"

بالآخر ہمیشہ کی طرح صرف اپنے فیصلے مسلط کرتے ہوئے بنا کسی حتمی نتیجے کے انہوں نے گفتگو سمیٹ دی اور اپنے جانے کا عندیہ دیا تو ان کے باہر نکلنے سے قبل، ان سے اوجھل رہنے کے لیے وہ دونوں بہنیں اس ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں۔ آہستگی سے دروازہ بند کرتی ثومیہ، راہداری میں اٹھتے اپنے باپ کے بھاری قدموں کی چاپ سنتے ہوئے دروازے سے پشت ٹکا کر دھیرے دھیرے فرش پر بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں سے مسلسل کوئی سیل رواں ہوتا رہا۔۔۔اور اس سے کچھ فاصلے پر کمرے میں بچھے پلنگ کی الٹی جانب ٹک کر بغور اس کی آنکھیں پڑھتی نمرہ کو لگا کہ وہ کوئی "ساکتی مجسمہ" ہے۔

☆......☆......☆

وہ کمرے میں آیا تو ظفر صاحب پلنگ پر بیٹھ کر ایک رجسٹر کھولے کوئی حساب کتاب کرنے میں مگن دکھائی دیے۔

"السلام علیکم خالو جی۔۔۔"

اس کے مخاطب کرنے پر انہوں نے سر اٹھایا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔اوئے آپتر بیٹھ۔"

ایک طرف دھری کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اسے بیٹھنے کا کہا اور بڑے مصروف انداز میں واپس رجسٹر کے صفحات پلٹنے لگے۔

"کیا حال ہے آپ کا خالو جی؟؟اور بڑی جلدی واپسی ہوئی آج؟؟خیریت؟؟"

کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں سوال کیا تا کہ وہ اس کے لہجے سے کسی "کھوج" کی بھنک نہ پا سکیں۔وہ جانتا تھا کہ وہ دکان کے حوالے سے پریشان ہیں اور کوئی بات نہیں۔

"ہاں یار بس یونہی تھک گیا آج تو دکان سے جلدی اٹھ آیا۔اور بھلا چنگا ہوں میں۔مالک کا احسان ہے۔تو بتا پتر کیسا ہے اور تمہاری تعلیم کیسی چل رہی ہے؟؟"

بالآخر رجسٹر ایک طرف کرتے ہوئے وہ بھرپور فرصت سے اس کی طرف متوجہ ہوئے اور بشاش لہجے میں اس کے متعلق تفصیلات دریافت کیں۔یہی وہ پل تھا جب ایمان راہداری میں رک کر ایک درز سے اندر جھانکتی ان کی "باہمی گفتگو" سننے لگی۔

"جی خالو سب خیریت ہے۔میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں اور تعلیم بھی اچھی چل رہی ہے۔بس ایک سی روٹین سے دل اوب گیا ہے۔سوچ رہا ہوں تعلیم کے علاوہ بھی کوئی مصروفیت ڈھونڈوں۔"

جواباً اسی بشاش لہجے میں کہتے ہوئے وہ بلا تاخیر گفتگو کو اپنے مدعے پر لے آیا۔جبکہ اس کی بات پر اس کے

ارادوں سے بے خبر خالو ظفر سادگی سے مسکرائے۔

"اچھا۔۔۔چلو یہ تو اچھی بات ہے مصطفین کہ تم تعلیمی سلسلے کے علاوہ بھی کوئی مصروفیت رکھنا چاہتے ہو۔ اس سے تمہاری صلاحیت بڑھے گی۔یوں کرو کہ کسی کال سینٹر پر جز وقتی ملازمت کرلو۔وہ میرے دوست صادق کا بیٹا یہی نوکری کرتا ہے دو وقت میں۔اچھے خاصے پیسے کماتا ہے۔چلو تمہارا مقصد پیسوں کا حصول بھلے نہیں ہو لیکن وقت بہت بہترین گذر سکتا ہے۔کیا خیال ہے؟؟"

دھیمے لہجے میں انہوں نے انتہائی خلوص سے مشورہ دیا تو ان کی شفاف تر آنکھوں میں جھانکتا وہ نرمی سے مسکرا دیا اور پھر کرسی سے اٹھ کر پلنگ کے الٹی جانب ان کے سامنے بیٹھتا ہوا عام سے لہجے میں خاص تر اذکار چھیڑنے لگا۔

"خالو جی ملازمت نہیں میں بزنس کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں نے کچھ سوچ بھی رکھا ہے۔ابھی آپ کے پاس بھی اسی سلسلے میں بات کرنے حاضر ہوا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایک طویل ہنکارا بھرا اور ان کی آنکھوں میں ابھرتا حیرت کا مدھم سا تاثر پڑھتے ہوئے مزید بولا۔

"دراصل میں چاہتا ہوں خالو جی کہ آپ کے ساتھ مل کر کاروبار کروں۔آپ کی دکان میں انویسٹ منٹ کروں اور منافع آدھا آدھا کی بنیاد پر تقسیم ہو۔میں نا تجربہ کار ہوں اور اکیلے کام کرنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اس صورت میں یہ ہوگا کہ تجربہ آپ کا اور پیسہ میرا لگے گا۔نفع نقصان کے بھی ہم ساجھے حق دار ہوں گے۔کسی لڑائی جھگڑا کا احتمال بھی نہیں خالو جی کیونکہ ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ ہے۔کیا خیال ہے آپ کا؟؟ آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟؟"

رازدان لہجے میں اس نے دھیرے دھیرے اپنی بات مکمل کی تو بغور اس کا حرف حرف سمجھتے ظفر صاحب کے تاثرات بتدریج ڈھلتے گئے۔تحیر سمٹ کر اب ان کی آنکھوں تجسس جھلکنے لگا اور اس کی بات سن کر ماتھے پر لکیرِ فکر لیے وہ بالکل خاموش ہو گئے۔وہ ہمہ تن گوش ہوا ان کے جواب کا منتظر ہوا جبکہ درز سے جھانکتی ایمان نے بھی شوق دلچسپی میں بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے ایڑھیاں اٹھائیں۔اس کے لیے مصطفین کا اس کے ابو کے بزنس

میں دلچسپی لینا انتہائی حیران کن تھا۔وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اسے بیٹھے بٹھائے کیا شوق چرایا ہے؟؟

"ایک بات سچ سچ بتا پتر۔۔۔اس دن تو جب دکان پر گیا تو تجھے کسی نے کوئی بات بتائی تھی ناں میری دکان کے بارے میں؟؟ تجھے کسی نے کہا ہے ناں کہ میرے معاشی حالات نہیں اچھے؟؟ تبھی تو نے صبح کرایہ بھی اگلے چار ماہ کا ایڈوانس دیا ہے اور اب یہ کاروبار میں شراکت کا بھی اسی وجہ سے کہہ رہے ہو۔ جھوٹ مت بولنا یار۔۔۔"

کافی دیر سوچ بچار کے بعد جوانہوں نے بولنا شروع کیا تو باہر کھڑی ایمان دنگ رہ گئی۔دکان کے معاملات اس قدر بگاڑ کا شکار ہیں اس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا۔

"ارے نہیں خالو جی۔ایسی کوئی بات نہیں ہے اور میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔آپ کے معاشی حالات اگر درِاندرون خراب ہیں بھی تو میں اس سے قطعاً لاعلم ہوں۔میں تو بس کوئی اور مصروفیت ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔یقین کریں میں نے ایڈوانس کرایہ بھی بس اپنی سہولت کے لیے دیا ہے کہ چار ماہ کی فکر ختم ہو۔"

جواباً ان کی آنکھوں میں دیکھتا پورے اعتماد سے وہ سفید جھوٹ بولنے لگا تو اس کے انداز سے انہیں لگا کہ شاید وہی عجلت میں اپنا راز کھول بیٹھے ہیں اور اسے پہلے سے کچھ خبر نہ ہے۔کچھ لمحوں کے توقف میں انہوں نے جانچتی ہوئی عمیق تر نظروں سے اس کا اندرون کھوجنے کی کاوش کی اور پھر ناکام ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"لیکن پتر یہ کاروبار میں شراکت بڑی کتی چیز ہوتی ہے۔یہ خلوص کی ڈوروں سے ہر ایک دھاگہ کھینچ لیتی ہے۔یہ سچ ہے کہ آج کل دکان کے حالات بڑے مندے ہیں اور کسی بھی طرح میں انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔لیکن دکان میں تم سے پیسہ لگوا کر میں خودغرض نہیں بننا چاہتا۔تم سے بڑا احترام کا رشتہ ہے میرا۔اور یہ ساجھے کاروبار ایک دوسرے کا احترام بھلا دیتے ہیں۔ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہونا۔۔۔لڑائی جھگڑا نہ ہونا اور بات ہے لیکن کاروبار میں اس سے ہٹ کر بھی سو معاملات ہوتے ہیں۔میں کسی بھی طرح کل کو تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے عزت کم ہوتے نہیں دیکھ سکوں گا۔لہٰذا تم اس بات کو رہنے دو یار۔یہ مناسب نہیں ہے۔"

کمرے میں حالت اضطراب میں یہاں وہاں ٹہلتے انہوں نے اسے تفصیلاً سمجھا کر انکار کیا تو وہ بھی اٹھا اور

کرسی کی ٹیک تھامے ان کے مقابل آن رکا۔

"لیکن خالو جی ایسا کچھ نہیں ہوگا مجھے اس کا یقین ہے۔آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ویسے بھی پہلے تو مجھے علم ہی نہیں تھا کہ آپ کے حالات خراب ہیں اور میں اپنی طرف سے ہی کاروبار میں شراکت کرنا چاہتا تھا لیکن اب آپ کے معاشی حالات کی خرابی کا جاننے کے بعد تو ناممکن ہے کہ میں پیچھے ہٹوں۔اب تو مجھے ضرور انویسٹ کرنا ہے۔پلیز آپ مجھے روکیں مت۔میرا بھی کام بن جائے گا اور آپ کو بھی وقتی ڈھارس مل جائے گی۔رہی بات خودغرض کہلانے کی تو یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ میں تو آپ کے روکنے کے باوجود خودی ضد لگائے بیٹھا ہوں۔اور خالو جی میری آنکھوں سے آپ کا احترام بروز محشر بھی نہیں اٹھ سکتا کیونکہ میری نظر میں آپ سے بڑھ کر عزت دار کوئی ہے ہی نہیں۔آپ کی ایسی بے یقین باتوں سے میرا دل دکھتا ہے لہٰذا یہ تو آپ کرو ہی مت۔پلیز۔۔۔" نہایت شائستہ لہجے میں اپنا مطمع نظر بتاتا وہ اصرار کرنے لگا تو اس کی باتوں سے وہ گویا بے بس ہونے لگے۔

"او پتر تو نہیں ناں سمجھ رہا بات۔تجھے ابھی ان باریکیوں کا علم نہیں ہے۔انسان نا چاہتے ہوئے بھی منفی گمان کرنے لگتا ہے۔سوسو سے پیدا ہوتے ہیں دلوں میں۔مان جا بات پتری۔ضد نہیں کرتے۔"

ملتجی لہجے میں انہوں نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا تو بنا کسی توقف کے اس نے گویا ان کی بات اچک لی۔

"بس کریں خالو جی پلیز۔دنیا کے اس سب جمع توڑ سے بہت ہٹ کر ہے ہمارا تعلق۔آپ اگر مجھے بیٹا سمجھتے ہیں اور میں بھی آپ کو بزرگوں جیسی عزت دیتا ہوں تو پھر ایک ساتھ کاروبار میں کیا قباحت ہے؟؟ ہمارے تعلق کو یوں دنیا کی کسوٹی پر پرکھ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔لوگ اور طرح کے ہوتے ہیں۔۔۔ہم اور طرح کے لوگ ہیں۔ہمارا کسی سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔آپ بسم اللہ کر کے حامی بھریں ان شاءاللہ میں یہ بات ثابت کر دوں گا۔۔۔"

انتہائی مودب لہجے میں سحر گر حرف پھونکتا وہ بڑھا اور انہیں کاندھوں سے تھام کر واپس پلنگ پر بٹھاتے ہوئے پہلے کی طرح ان کے الٹی جانب ٹک گیا۔اس کے پیار بھرے انداز کے سامنے اپنے دلائل کو انہوں نے ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔کچھ لوگ ہماری زندگیوں سے اس قدر خوبصورتی سے وابستہ ہوتے ہیں کہ

تمام تر دنیاوی قاعدے ان کے اخلاص کے آگے ماند پڑنے لگتے ہیں اور ساری رسوم ہیچ ہونے لگتی ہیں۔ان کا تعلق بھی انہی محسوسات کا حامل تھا۔

"دیکھ لے یار اب تو بہت مجبور کر رہا ہے مجھے۔اور پھر تیری خالہ کو بھی اس پر اعتراض ہوگا۔اسے کیا جواب دوں گا میں؟؟"

ایک ہاتھ سے اس کے شانے پر دباؤ دے کر انہوں نے گویا آخری عذر پیش کیا تو ان کے لہجے سے ان کا قائل ہو جانا بھانپ کر وہ بشاشت سے بولا۔

"ان کی فکر آپ بالکل نہ کریں۔وہ جب معترض ہوئیں میں خود انہیں سمجھا لوں گا۔آپ بس مجھے تفصیلات سے آگاہ کیجیے کہ دکان کی کیا صورتحال ہے حقیقی اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟"

اس نے کمال تر مہارت سے ان کے ہر عذر کو تھپک دیا تو متفکر انداز میں سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے انہوں نے رجسٹر کھول کر اس کے سامنے کیا اور سنجیدگی سے کاروبار کی موجودہ حالت سے آگاہ کرنے لگے۔

اور ادھر مصطفین کے چہرے پر بکھرے طرح طرح کے خالص رنگ پڑھتی ایمان بھی کھوئی کھوئی کیفیت میں اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ماتھے پر تفکرات کا جال لیے وہ اس کی شخصیت پر از سرِ نو غور کرنے لگی۔

اس کے ذہن و دل میں اس کے متعلق بے شمار سوالات تھے۔

سر جھٹکتے ہوئے وہ واپس لاؤنج میں پہنچی تو اس کی خالہ رضیہ بیگم واپسی کے لیے بالکل تیار کھڑی تھیں۔انہیں خوش دلی سے الوداع کہہ کر اس نے بھی فوراً اوپری سیڑھیوں کی جانب رخ کیا کہ طویل راہداریوں میں بھٹکتے ہوئے مختلف خیالات کے تانے بانے بننا اس کا پسندیدہ فعل تھا۔

☆......☆......☆

مناظر پر شام اترنے سے کچھ دیر قبل کپادوکیہ پہنچ کر انہیں حیرت کا پہلا جھٹکا تب لگا جب "ہوٹل کانزیپٹ" کی مرکزی لابی میں اپنے شوٹنگ کریو سے مل کر انہوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ سب کا رویہ ان سے کچھ کھنچا کھنچا سا ہے۔باقی پورا فلم یونٹ انڈیا سے ایک ہی فلائٹ سے ترکی پہنچا تھا اور اب ہوٹل انتظامیہ کی طرف سے اپنے لیے مقررہ کمروں میں اپنا اپنا سامان منتقل کرنے کے بعد سب باہم گپ شپ کرنے کے لیے یہاں جمع

تھے۔چند انتہائی قریبی افراد کے سوا سب ان سے فاصلے پر ہی رہے اور گیتی کو دیکھ کر پہلے کی طرح خوشامدانہ لب و لہجہ بھی کسی نے نہیں اپنایا۔انہیں کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا جس سے وقتی طور پر سنبھل کر انہوں نے ڈائریکٹر دھنراج ورما کی بابت دریافت کیا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ کل سے یہاں پہنچ چکے ہیں اور اب رامیش کے ساتھ ایک لوکیشن دیکھنے گئے ہیں جس پر کل سے فلم شوٹ کا باقاعدہ آغاز کیا جائے گا۔کچھ دیر ماحول کا "اسرار و تبدل" جانچ کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ یہ پتھریلی ترتیب وار چنائی سے اٹھائی گئی چوڑی دیواروں پر مشتمل نہایت نفاست و قرینے سے سجا ایک خوبصورت اور کشادہ کمرہ تھا۔جس کی سجاوٹ میں تراشیدہ پتھروں اور دیواروں پر پھیلی سبز بیلوں کی شمولیت کی بدولت اس کا اندرونی ماحول بھی "قدرتی" سا محسوس ہوتا تھا۔کمرہ ہوٹل کی پہلی منزل پر واقع تھا اور اس کی بیرونی جانب دو گولائی دار ڈاٹوں کے آگے ایک مشترکہ بالکونی تھی۔پتھریلی ڈاٹیں بیرونی جانب سے انتہائی دیدہ زیب خم لیے ہوئے تھیں اور ان ڈاٹوں کے پار چمنیوں کی سی چٹانوں کے اوپر اڑتے رنگ برنگے "ہاٹ ایئر بالونز" ماحول و منظر کو افسانوی اور فسوں گر بنا رہے تھے۔یہ مشہورِ زمانہ "مونکس ویلی" تھی جو کہ چند خصوصیات کی بنا پر کپادوکیہ کے سیاحوں (سینٹرل ترکی وزٹرز) کی اول ترجیح ہوتی ہے۔اس وادی کی "کون شپ" ڈھلوانی چٹانیں اس کی پہلی شناخت ہیں کہ جن سے پتھروں کے دہانے تراش تراش کر نہایت مہارت اور کاریگری سے غار نما گھر بنائے گئے ہیں۔یہ چٹانیں اس قسم کی ہیں کہ بلندی سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا ہے گویا کئی چمنیاں اور کلیسائی مینار ایک ساتھ اٹھائے گئے ہوں۔ابتدائی دور میں یہاں کے زیادہ تر باسیوں کا مذہب عیسائیت ہونے کی بنا پر یہاں کلیساؤں کی تعمیریں بھی زیادہ تعداد میں کی گئی۔یہاں کے غار اور بند دہانے تاریخی جنگوں کے دوران عیسائی "ریفیوجیز" کی محفوظ ترین پناہ گاہ رہے ہیں۔یہاں کے مناظر میں نمایاں و غالب رنگ بھورا اور گہرا بھورا ہیں اور بھورے رنگ کی یہ فراوانی و کثرت بھی ان چٹانوں کی خشکی کی بدولت ہی ہے کہ یہاں سبزہ نہ ہونے کے برابر ہے۔"مونکس ویلی" کی گلیاں انتہائی تنگ، ڈھلوانی، اور اکثر تو غار جیسی ہیں۔ان گلیوں کے فرش کہیں پتھریلے، کہیں بھربھرے اور کہیں تو ریت جیسے ہیں اور اسی خاصیت کی بنا پر سیاحوں نے انہیں "ڈسٹی سٹریٹس" کا نام دیا ہے۔

کمرے میں آکر گیتی نے اپنا ہینڈ بیگ ڈاٹ کے سامنے دھرے سفید صوفے پر اچھالا اور پاؤں سے جوتا

اتار کر سیدھی بالکونی میں آن رکی۔ ہوا نے جھوم جھوم کر گویا اس کا استقبال کیا کہ اس کا طویل دوپٹہ اور گھیر دار فراک باقاعدہ پھڑ پھڑانے لگے۔ دور تلک نگاہ دوڑا کر اس نے چٹانوں کے اونچے دہانوں سے کھلتے تنگ دروازے، کئی کھڑکیاں، کہیں کہیں کسی نیم ڈھلوانی چھت پر سہاری ہوئی پانی کی ٹنکیاں اور ان کے آس پاس، اردگرد اڑتے رنگ برنگے "ہاٹ ائیر بالونز" دیکھے۔ پھر دونوں بازو کھول کر طویل انگڑائی لیتے ہوئے، سر کو دائیں بائیں جھلا کر وہ اپنے لمبے بال بھی ہواؤں کے دوش پر لہرانے لگی۔

"پتھریلی چمنیوں اور اونچے کلیساؤں کے شہر میرا اسلام۔۔۔"

عقیدت بھرے لفظوں میں اس نے ہواؤں کے رتھ پر کوئی اسم محبت دھرا اور پورے شہر پر پھونک دیا۔

اس کی پشت پر کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی ناز نے تحیر در تحیر اس کی یہ بے خودی جانچی اور پھر غصے میں بھر کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کے ساتھ آن رکی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے گیت؟ یہاں فضائیں تمہارے خلاف ہوئی جاتی ہے اور تم ہو کہ مدہوشی میں ہواؤں سے گفتگو کر رہی ہو۔ نیچے دیکھیں ناں سب کے ماتھوں پر سلوٹیں؟ نہیں دیکھیں تو میں بتائے دیتی ہوں کہ میں سب کی پیشانیوں سے اک ایک بل پورا گن کر آئی ہوں۔"

دونوں شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی جانب موڑتی، ہوا میں ہاتھ نچاتی وہ گویا ہواؤں سے لڑ پڑی تو اس کے انداز پر حسب سابق گیتی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"مجھے ہواؤں کے رخ بدلنے سے مت ڈراؤ یار۔۔۔ میں شورشوں میں سانس لینے سے خوب واقف ہوں۔ مجھے زہر نچوڑ کر ہوا میں رنگ اچھالنے آتے ہیں ناز۔ یقین کرو تمہاری سب فکریں بے معنی ہیں۔ کہ لوگ بس وقتی دھاروں پر بہتے ہوئے سرسری طور پر رخ بدلتے ہیں۔ دیکھنا تم۔۔۔ وقت کا چاک بس ایک پھیرا اور گھومے گا تو کل کو یہی سب ہمارے ساتھ ہوں گے جو آج نہیں ہیں۔"

اسی کھنکتی ہوئی ہنسی میں اس نے عمیق تر اذکار چھیڑے اور اتنا کہہ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی اسے کچھ بھی بولنے کا موقع دیے بغیر مزید بولی۔

"پلیز اور کچھ مت کہنا سہیلی کہ فی الوقت مجھے کچھ سمجھ نہیں آئے گا۔ یہ اڑتے ہوئے بالونز دیکھ رہی ہو

ناں؟؟۔۔۔"

یہاں اس نے ہاتھ بڑھا کر سامنے جا بجا اڑتے "ہاٹ ائیر بالونز" کو چھونے کی کوشش کی۔

"میرا دل، دماغ، رگ وجاں۔۔۔سب کچھ یہیں کہیں ان کے ساتھ ساتھ منتشر ہوا سا ہے۔یقین کرو میں کچھ نہیں سمجھ سکوں گی۔اور میں بس سونے لگی ہوں اب۔ورما سر آئے تو مجھے جگا دینا۔ان سے کئی اہم تر راز کرنے ہیں اگر تو کئی" حالات" بھی جاننے ہیں۔ٹیک کئیر چندا۔۔۔"

پراسرار لہجے میں بات مکمل کر کے پیار سے اس کے گال چھوتے ہوئے وہ تیزی سے اندر بھی چلی گئی تو پیچھے مٹھّیاں بھینچ کرنا زلب کچلنے لگی۔ایک بار پھر سے وہ اس کی "من رقصم" جیسی کیفیات کے آگے بے بس ہوگئی۔ پھر دور چٹانوں کی اوٹ میں آخری جھلک دکھلاتے سورج کو دیکھتے ہوئے اپنی طرح طرح کی سوچوں کو مختلف دلاسے دیتی وہ واپس کمرے میں آئی تو گیتی گہری نیند میں تھی۔اس کی حسین آنکھوں پر دلکش پپوٹوں کی دبیز تر تہہ تھی تو ہونٹوں کا سحر گر خم بھی گلال تر تراوٹوں کا حامل دکھائی دیا۔اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور بانکپن تھا۔ اسے پیار بھری نظروں کے حصار میں رکھ کر، تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گرتے ہوئے اس نے بھی آنکھیں موند لیں۔طویل سفر نے انہیں بے تحاشا تھکان عطا کی تھی اور اب نئی مسافتوں پر نکلنے سے قبل انہیں کچھ آرام کی اشد ضرورت تھی۔

☆......☆......☆

سفیر کسی عالم دیوانگی میں تھا۔محبت کا ادراک کیا ہوا اسے گویا اپنے آپ سے فرصت ہی میسر نہیں آرہی تھی۔ والدین کے ساتھ رات کا کھانا کھا کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا اور آج حسب سابق و معمول اس نے ان کے ساتھ نشست بھی نہیں کی۔اس وقت کشادہ ٹیرس میں بیرونی ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے جھکا وہ ثومیہ سے متعلق مسرور کن خیالات میں گم تھا۔شب کی نیم تاریک چادر میں لپٹے کالونی کے خوبصورت گھر اور ان میں جا بجا جلتی مدھم روشنیوں کو دیکھتا وہ بے خودی کی سی کیفیت میں رہ کر ہولے ہولے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ٹیرس میں لگے ایک سفید رنگ بلب سے پھوٹتی نرم روشنی اس کے دلنشیں چہرے پر منعکس ہو کر وہاں حلاوت سے بھرپور کئی چاشنیاں جگا رہی تھی اور اس کے فسوں گر ہونٹوں پر سرشار کن مسکراہٹوں کا رقص تھا۔مدھر مسکانیں گلال رنگ

گالوں میں جذب ہوکر ماحول میں طرح طرح کے رنگ نچھاور کر رہی تھیں تو آنکھوں میں اڑتے جگنو بے انتہا چمکنے لگے۔ بلاشبہ وہ اس قدر کامل، مکمل اور بھرپور مرد تھا کہ گویا منظروں کی جان ہو۔ یکا یک جانے کس خیال میں گھر کر غزال تر آنکھیں اس نے نرمی سے موند لیں اور ایک طویل سانس لے کر سرگوشیاں کرنے لگا۔

"سانس بھرنے سے سینے میں آ دھڑکتی ہو۔۔۔ اور ایسا کر کے بھی کتنی بے خبر ہو تم۔ سنو۔۔۔ یہ تم اچھا نہیں کرتیں۔۔۔"

زیرِلب ہواؤں سے مخاطب ہو کر وہ ان کے سپرد اپنے خیال کرنے لگا تو آس پاس تیزی سے سرسراتی ہوا نے اس کے گرد جھوم کر گویا مہر و وفا کا عہد لیا۔

"ثومیہ شاہجہان۔۔۔ عام سی لڑکی ہو کر بھی۔۔۔ تم اتنی خاص کیسے ہو؟ تم دل کو چھو گئیں یار۔۔۔ تم جان لے گئیں۔۔۔"

وہی عام سے اذکار اس کے خصوصی جذبات کا بیان ہونے لگے تو اسم محبت کی چاپ سنتا، وہاں موجود ہر ذرہ و کل۔۔۔ پورا پورا مہک گیا۔

محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔

عطر سی۔۔۔ وتر سی۔۔۔ اور ذکر سی۔۔۔

اسی پل ذکیہ خاتون کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں اور اسے سامنے سے غیر موجود پا کر اسے پکارا۔ "سفیر۔۔۔ کہاں ہو؟"

بے ساختہ انہوں نے پہلے واش روم اور پھر کھلے ہوئے ٹیرس کے لہراتے پردوں کی طرف دیکھا اور اسی جانب چلی آئیں۔

"جی ماما۔۔۔ آیئے۔۔۔ آپ سونے نہیں گئیں؟"

آنکھوں میں وہی "تیرگی" لیے وہ ان کے پہنچنے سے قبل ریلنگ سے ہٹتا ہوا اندر چلا آیا۔

"اتنی جلدی کب سوتے ہیں سفیر؟؟ کہاں دھیان ہے تمہارا؟؟"

اس کے سوال پر ان کی آنکھوں میں تحیر سرسرایا۔

"اور یہ کیا مجنوؤں سی حالت ہے؟ آنکھیں دیکھو اپنی۔۔۔لال ڈورے ہیں۔آج تم کن خیالات میں ہو جاناں؟؟؟"

اس کے گال چھو کر انہوں نے اسے کھوجتی ہوئی نگاہوں کے حصار میں رکھ کر پوچھا۔آج بہت عرصے بعد انہوں نے اسے اس کے انتہائی پیار بھرے نام "جاناں" سے پکارا تھا۔ان کی بات پر وہ ہولے سے مسکرایا۔

"اوہ۔۔۔سوری ماما مجھے وقت کا احساس نہیں ہوسکا۔میں سمجھا بہت رات ہوچکی جبکہ ابھی تو صرف آٹھ بجے ہیں۔" بے ساختہ کلائی اٹھا کر گھڑی پر نگاہ ڈالتا وہ کسی قدر خجل ہوا اور پھر ان کا ہاتھ تھام کر واپس ٹیرس میں بڑھتے ہوئے بولا۔

"آئیں آپ ہم یہاں رک کر گپ شپ کرتے ہیں۔بابا کیا کر رہے ہیں؟؟"

ان کی "کھوجتی نگاہیں" نظر انداز کرتا وہ منصور عالم کی بابت دریافت کرنے لگا تو ریلنگ پر اسی جگہ اس کے ساتھ رکتے ہوئے انہوں نے بغور اس کا انداز جانچا۔

"تمہارے بابا کی طبیعت نہیں ٹھیک وہ آرام کر رہے ہیں۔"

ان کے جواب پر وہ چونکا اور پھر فکرمندی سے بولا۔

"اوہ تو ایسا کیا۔۔۔مجھے پتا ہی نہیں چلا۔میں مل کر آتا ہوں۔بس ایک منٹ ماما پلیز۔۔۔"

اس نے دروازے کی سمت بڑھنا چاہا کہ انہوں نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔

"نہیں تم رکو۔۔۔انہیں آرام کرنے دو۔بس کھانے کے بعد ہی پیٹ میں تھوڑا سا درد محسوس ہوا ہے۔تم نہ جاؤ کیونکہ انہوں نے ڈسٹرب کرنے سے منع کیا ہے۔۔۔"

"لیکن ماما مجھے پتا تو کرنا چاہیئے۔ملوں تو سہی ان سے۔بس دوا دے کر آجاتا ہوں۔"

اپنی تمام تر "سوچیں" بھول کر اب اس کے چہرے پر فقط باپ سے متعلق فکریں تھیں۔دل ہی دل میں انہوں نے بے ساختہ اس کی بلائیں لیں اور نظر اتاری۔

"اوہو میں کہہ رہی ہوں ناں کہ کچھ نہیں ہوا ان کو تم پریشان مت ہو۔بھئی ڈاکٹر ہیں وہ اپنا خیال خود بھی رکھ سکتے ہیں۔دوا لے کر ہی لیٹے ہیں۔"

اسے واپس کھینچ کر ریلنگ پر اس کا ہاتھ ٹکاتے ہوئے انہوں نے بشاشت سے کہا تو ان کے لہجے سے بے فکری کشید کرتا وہ رک بھی گیا۔

"ویسے اچھا لگتا ہے جب تم ہم دونوں کی ایسی پرواہ کرتے ہو۔کل کلاں بھولاؤں تو بدل نہ جانا سفیر۔۔۔ بہت ماروں گی اس کے سامنے تمہیں۔پھر نہ کہنا بتایا نہیں۔"

اس کے بھرپور سراپے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی وہ مان سے بولیں تو بے ساختگی میں اس کی زبان پھسل گئی۔

"آپ کی بہو تو مجھ سے کہیں اچھی ہے ماما۔دیکھنا وہ مجھ سے زیادہ خیال رکھے گی آپ دونوں کا۔پکا۔۔۔"

اور بات کے اختتام پر اسے اپنے بے لگام بولنے کا احساس ہوا تو زبان دانتوں تلے دبا کر جھینپ مٹانے کی کوشش میں رخ ہی بدل گیا۔انہوں نے حیرت ومسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کی برجستگی دیکھی اور پھر ایک لمحے بعد گھوم کر اس کے سامنے آن رکیں۔وہ جھک کر بلاوجہ ہی نیچے گلی میں جھانکنے لگا۔

"ابھی کیا کہا تم نے سفیر؟؟ ذرا پھر سے کہنا پلیز۔۔۔"

اس کے چوڑے شانے پکڑ کر انہوں نے باقاعدہ اسے سیدھا کرتے ہوئے سوال کیا اور اس کی ساحر آنکھوں میں جھانکا جہاں محبت ناچ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ماما۔۔۔یونہی منہ سے پھسل گیا۔میرا مطلب تھا کہ وہ۔۔۔"

ٹالنے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ پھر سے نظر چرا کر یہاں وہاں جھانکنے لگا تو اس کے شرمسار انداز پر وہ فدا ہونے لگیں۔

"بھئی کون ہے وہ؟ بتاؤ تو؟ کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں؟ ثومیہ شاہجہان۔۔۔"

شوقین لہجے میں اصرار کرتے ہوئے انہوں نے جان بوجھ کر ثومیہ کا نام بولا تو یہ سن کر وہ حیران رہ گئیں کہ اس نے بھی ان کے بالکل ساتھ ساتھ گویا ان کی بات اچک کر "ثومیہ شاہجہان" دہرایا۔

اور پھر فوری خود کو سنبھال کر اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ وہ ان کی آنکھوں میں بھی دیکھنے لگا۔

"جی ماما۔۔۔یہ وہی لڑکی ہے اور وہ بہت اچھی ہے۔یقین کریں وہ آپ کو بہت پسند آئے گی۔اس کا ہر

رنگ نرالا ہے۔ بڑی سمجھ داری کی باتیں کرتی ہے۔ سب کا احترام کرتی ہے۔ اور وہ بہت اچھا ہنستی ہے ماما۔ اس کی ہنسی کمال تر ہے۔ کھلکھلاتی ہوئی سی خالص ہنسی۔۔۔"

مزید اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کا ہر قلابہ ملاتے ہوئے جو اس نے ان کا ہاتھ تھام کر جوش سے دبایا تو اس کی بے تابیوں کو دیکھتی وہ بے طرح چونک گئیں۔ باقی خصوصیات کے ساتھ اس کی ہنسی کا ذکر اس نے یوں کیا کہ گویا وہ کوئی اضافی خوبی ہو جو کائنات کے کسی اور فرد میں نہیں ہو سکتی۔ انہیں خوشی بھی بہت ہوئی لیکن اس سے زیادہ انہیں فکر نے آن گھیرا۔ پھر کچھ توقف سے انہوں نے دل میں جاگتے خدشات کو زبان دی۔

" لیکن بیٹا ابھی چند روز قبل تمہاری اس سے دوستی ہوئی ہے۔ تو اتنا بڑا فیصلہ تم بنا سوچ سمجھے کیسے کر سکتے ہو؟؟ میں نہیں کہتی کہ مجھے یا تمہارے بابا کو بھی کوئی اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یوں عجلت سے کام لینا نا مناسب ہے سفیر۔ اس پر بہت سارا سوچو قبل اس کے کہ اس تعلق کو سنجیدگی سے یہاں تک خیال کرو۔ اور...... بس سوچو اس پر۔" ناصحانہ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے بات کے اختتام پر "اور" کے بعد یوں توقف کیا گویا کوئی بات بدلی ہو۔ اور یہ بالکل سچ تھا کہ وہ اس سے ثومیہ اور مصطفین کے باہمی تعلق کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں جسے اس کی کیفیت کے مدنظر فی الوقت وہ پس پشت ڈال گئیں۔

بغور ان کا چہرہ پڑھتا سفیر بھی بتدریج سنجیدہ ہو گیا اور ایک ثانیے کو تاریک کالونی پر نگاہیں سر سرا تا واپس ان کی جانب مڑا۔

" آپ کی سب باتیں بجا ہیں ماما۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں ایسے بھی جہاں میں کہ جنہیں دیکھ کر بے ساختہ ہی آپ کا یقین بندھنے لگتا ہے۔ کہ جن کی سنگت میں ہر ہر قدم بھروسہ کی جانب اٹھتا ہے۔ یقین کیجیئے وہ ایسی ہی ہے۔ سبھی کا دل جیت لینے والی۔ اسے کچھ زیادہ سمجھنا نہیں پڑتا ماما۔۔۔ وہ اپنے آپ دل میں آتی ہے۔ بہت " آسان فہم " ہے وہ۔۔۔ گنجلک تو ذرا بھی نہیں۔"

دوبارہ اس کی تعریفات کے پل باندھتا یہاں وہ رکا اور کسی ضد پر اڑے ہوئے بچے کی مانند لجاجت سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ حیرت در حیرت اس کی فریفتگی ناپنے لگی کہ ایسی گفتگوئیں تو وہ کرتا ہی نہیں تھا۔

" صرف ایک بار آپ اس سے ملیں گی ناں ماما۔۔۔ تو ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ وہ سچ مچ اس قابل ہے کہ اسے

بے شمار چاہا جائے۔۔۔"

عمیق تر لہجے میں وہ انجانے اذکار کرنے لگا تو زندگی میں پہلی بار ذکیہ خاتون کو لگا کہ ان کا بیٹا واقعی جوان ہو گیا ہے۔اس کے چہرے پر بکھرا ایسا رنگ و نور تو انہوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

"یہ کسی کی ایسی خواہش کیسے کر سکتا ہے؟؟"وہ بس سوچ کر رہ گئیں۔انہیں یقین ہونے لگا کہ ثومیہ شاہجہان ایسی ہی ہے جیسا اس نے کہا ہے۔انہیں اس پر بے حد پیار آیا لیکن اسے سوچنے کا وقت دیتے ہوئے انہوں نے گفتگو سمیٹنا مناسب سمجھا۔

"تم پاگل ہو رہے ہو بیٹا اور پاگلوں کے پاس زیادہ دیر نہیں رکتے۔ہٹو مجھے نیچے جانا ہے۔"

اس کے بال بگاڑ کر اس کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر وہ ٹیرس سے نکل کر دروازے کی جانب بھی بڑھ گئیں تو وہ تیزی سے ان کے پیچھے آیا۔

"لیکن ماما یوں ایک دم کیسے جا رہی ہیں آپ؟ میں اتنی اہم بات کر رہا ہوں کوئی جواب تو دیں ناں؟؟"

اور اس کی بات پر بنا مڑے، بنا رکے وہ جواباً بولیں۔

"ہو گئی بات بیٹا۔اب پڑھو بیٹھ کر۔ابھی بہت سا وقت پڑا ہے اس موضوع پر مزید گفتگو کے لیے۔۔۔میں بس یونہی دیکھنے آئی تھی تمہیں۔"

ان کی بات پر اس کا چہرہ کسی قدر بجھ سا گیا اور مزید کچھ کہتے کہتے لب بھینچ کر وہ واپس ٹیرس کی جانب رخ کرنے لگا۔

"اور سنو جاناں۔۔۔"

اسی پل دروازہ نیم وا کر کے اس کا ہینڈل تھامے وہ دوبارہ اس کی طرف مڑیں اور انتہائی پیار سے اسے پکارا۔وہ گویا ہڑبڑا کر متوجہ ہوا۔

"ثومیہ یقیناً اچھی لڑکی ہے۔میرے بیٹے کو عام شخصیات بھا سکتیں ہی نہیں۔میں اس سے جلد از جلد ملنا چاہوں گی لیکن اس سے پہلے میری بات پر کم از کم ایک بار ہی سہی۔۔۔تم غور ضرور کرنا۔اور ہاں تھوڑے دنوں تک میں تمہارے بابا سے بھی بات کر لوں گی۔شب بخیر۔"

اور ہواؤں میں رس گھولتی ہوئی وہ دروازہ بند کر کے چلی بھی گئیں۔

ادھر اس کی حالت ایسی تھی کہ ہلکا سا مسکرانے کے سوا وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ کیا ردعمل ظاہر کرے۔ پھر بے پناہ حیرتوں سے سنبھلتا وہ خوشی سے باقاعدہ ناچنے لگا اور یہ رقص چرا کر سرسراتی ہوئی ہوائیں گویا پورے ماحول میں "خمارِ عشق" پھونکنے لگیں۔

☆......☆......☆

شاہجہان عادل کے منہ سے اپنے اور فواد کے رشتے سے متعلق ہاں سننے کے بعد وہ دیر تلک روتی رہی۔ نمرہ نے اسے بہت سمجھایا کہ یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، فیصلہ بدل بھی سکتا ہے لیکن کوئی بھی تسلی اسے کسی بھی طور دل میں اترتی محسوس نہیں ہوئی۔ راشدہ بیگم کو بھی علم تھا کہ وہ ساری گفتگو سن چکی ہے لیکن اس کے سب کے سامنے بول پڑنے پر آئے غصے کی بدولت انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ہاں البتہ وہ نمرہ سے اس کی حالت و کیفیت کے بارے میں گاہے بگاہے پوچھتی ضرور رہی تھیں۔ اپنے اسی خلفشار میں ثومیہ نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور سر درد کا بہانہ کر کے سر لپیٹے کمرے میں ہی پڑی رہی۔ حسب عادت اندر ہی اندر کڑھتی وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے سمجھانے میں ناکام ہو کر باہر گئی نمرہ جب کھانا کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر واپس آئی تو ایک ٹرے میں اس کے لیے بھی کھانا لے کر آئی۔ احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ بیڈ سے اٹھ کر اپنی من پسند جگہ یعنی کھڑکی سے لگی کھڑی ہے۔ ایک پٹ سے سر ٹکائے، تاریک آسمان پر ٹمٹماتے روشن ستارے دیکھتے ہوئے وہ کسی اور جہاں میں تھی۔

"ستاروں سے گفتگو روک کر تھوڑا سا کھا لو یار۔۔۔ یوں بھوک ہڑتال کا کیا مطلب؟ کیوں مجھے ہلکان کر رہی ہو اپنی سوگواریت سے؟؟"

ٹرے چھوٹی میز پر رکھ کر متوازن لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کے قریب چلی آئی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے نمرہ۔ میں کہہ چکی ہوں تمہیں۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا۔

"آپی یار حد کرتی ہو۔ میری فکروں کی کوئی فکر ہی نہیں تمہیں؟ ایسے ایک دو گھنٹے اور رہیں میرے سامنے تو میں بس مر ہی جاؤں گی۔ پلیز بس تھوڑا سا کھا لو ناں۔۔۔ صرف میری خاطر۔۔۔" درشتی سے اسے ٹوک کر

بات کے اختتام میں اس کا لہجہ پھر سے ملتجی ہو گیا تو اس نے صرف ایک نظر اسے دیکھا۔

"اس گھر میں اگر موت آنی ہو تو دعا کرو وہ مجھے آئے نمرہ۔۔۔ کہ جس کے دم سے عذاب ہیں سارے۔ سچ۔۔۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے میں خودکشی کرلوں۔ تمہاری کوئی مرنے کی عمر تھوڑی ہے؟"

جواباً کانچ لہجے میں اس نے بھرپور جذبات سے کہا تو دونوں بازو کھولے وہ دہل کر اس سے لپٹ گئی۔

"ہائے اللہ نہ کرے ثومیہ کہ تمہیں کچھ ہو۔ میں تو بس یونہی کہہ گئی یار۔ بہت سارا جیو آپی۔۔۔ جیو کہ جب تک جی چاہے۔ آمین ثم آمین۔"

اس کے ساتھ لگے لگے اس نے پورے جذب سے دعا دی تو شکستہ ہنسی ہنس کر اس نے بھی اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"بس یہ جی ہی تو نہیں چاہتا اب کہ یوں جیا جائے۔۔۔ جینا اتنا آسان تھوڑی ہے کہ کسی کی دعا لگ جائے۔ یہ زندگی ہے میری جان۔ یہاں دعائیں نہیں۔۔۔ صرف نظریں لگتی ہیں۔ اور سمجھو کہ تمہاری آپی کو وہ لگ چکی ہیں۔ بابا کا فیصلہ سنا ناں تم نے۔۔۔"

وہی شکستہ ہنسی اس کے لہجے میں بھی در آئی تو اس نے سر اٹھا کر اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بچپن سے فواد کو ناپسند کرتی ہے بلکہ اس سے نفرت کرتی آئی ہے۔

"ایسی باتیں نہیں کرو یار۔ میرا دل درد سے بھر جاتا ہے۔ پلیز یہ سارے خیالات جھٹک کر آؤ اور کھانا کھا لو۔ اللہ پاک بہتر کرے گا۔ کوئی نہ کوئی حل لازمی نکل آئے گا۔"

کب سے دی جانے والی وہی تسلیاں دوبارہ دیتی وہ اس سے الگ ہوئی اور اس کے کسی بھی جواب سے قبل اس کا ہاتھ تھام کر تقریباً کھینچتے ہوئے میز کے سامنے دھرے صوفے پر لا بٹھایا۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں شانے ڈھلکائے اس کے ساتھ ساتھ چلی آئی تھی۔

"لو کھانا شروع کرو۔۔۔"

اس نے پہلے سے اس کے سامنے دھرا ٹرے کھینچ کر مزید قریب کیا تو اس نے جیسے بے بسی سے ہاتھ بڑھایا۔ پہلا نوالہ توڑ کر اس نے منہ میں رکھا اور زور لگا کر اسے نگلتے ہوئے دوسرا نوالہ بنانے لگی۔ پھر جانے کیا

ہوا کہ پہلا نوالہ حلق میں روکتی، دوسرا ٹرے میں واپس چھوڑتی دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مجھ سے نہیں کھایا جاتا نمرہ خدارا لے جاؤ واپس۔ مجھے مجبور مت کرو یوں۔۔۔"

ہچکیوں میں روتے ہوئے جو اس نے ٹرے پرے دھکیلی تو پہلی بار نمرہ کو محسوس ہوا کہ بات کوئی اور بھی ہے۔ اس کے رونے میں بے بسی تو تھی ہی۔۔۔ عجیب سا کچھ اور بھی تھا۔

کوئی خیال۔۔۔ کوئی ملال۔۔۔ یا کوئی بھی اور پہلو بہر طور تھا۔

" کیا بات ہے ثومیہ۔۔۔ اب کس بات پر رونا آیا؟ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ اب تم کسی اور بات پر رو رہی ہو؟؟"

اس نے اپنے محسوسات کو زبان دی تو آنسوؤں سے لبالب آنکھیں لیے وہ چونک سی گئی۔ یوں گویا اسے بھی بالکل ابھی کوئی ادراک ہوا ہو۔ اس کے لاشعور میں آج مصطفین کے لیے اپنے دل میں امڈتے جذبات کا عکس تھا۔ سارا دن رشتے پر ہاں ہونے کے لیے رونے کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پر ہی وہ اپنی تازہ تازہ ہوئی چاہت کا غم بھی مناتی رہی تھی۔ ابھی اس کے پوچھنے پر کسی برق کی مانند یہ خیال اس کے ذہن میں کوندا تو فوراً خود کو سنبھال کر آنسو پونچھتی وہ سسکیاں بھی روکنے لگی۔ فی الوقت وہ نمرہ سے بھی یہ "احساس" چھپا لینا چاہتی تھی۔

" کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ اور کیا بات ہونی ہے؟ میرے رونے کی یہ وجہ کوئی کم ہے کیا نمرہ؟ بابا میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں یار؟ مجھے اس کی شکل تک سے نفرت ہے۔ بچپن سے آج تک پل پل ہر پل۔۔۔ میں نے بس اس سے نفرت کی ہے۔ میں وہ زندگی نہیں جی سکوں گی نمرہ جو اس کے نام لگ جائے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں کہ میں مر جاؤں گی۔"

نمناک لفظوں میں اس نے وہی باتیں پھر سے دہرائیں جو وہ مسلسل کرتی آ رہی تھی تو اس کی جذباتیت سے قطع نظر اس کی باتوں جھلکتے اعتماد سے وہ کسی قدر مطمئن ہو گئی کہ اور کوئی بات نہیں ہے۔ اب اس سے پہلے کہ وہ اسے مزید کچھ بھی کہتی ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر راشدہ بیگم وہاں داخل ہوئیں اور اسے آنسو اور ناک پونچھتے دیکھ کر، ماتھے پر بل ڈالے تیزی سے ان کے قریب آئیں۔

"ہٹو تم نمرہ۔۔۔"

ان کے کہنے پر ڈھارسی انداز میں اس کے شانے مسلتی وہ تیزی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

"اب بس کرو ثومیہ۔۔۔ بہت ہوگیا۔ جب تمہاری تعلیم مکمل ہونے تک یہ بات دب گئی ہے تو اسے دبی ہی رہنے دو۔ یوں رونا دھونا مچا کر کیا کرلوگی تم؟ اور تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ باپ کے سامنے زبان درازی مت کیا کرو۔ آج سن چکی ہوناں جو جو بھی انہوں نے کہا مجھ سے؟ اس میں غلطی تمہاری بھی ہے۔"

اسے بازو سے تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے انہوں نے اسی سخت لہجے میں کہا جس طرح وہ دن میں شاہجہاں عادل کے سامنے چڑ گئی تھیں۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے بس انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"لیکن ماما ایسے کیسے چپ کروں میں؟ بابا فواد کے رشتے۔۔۔"

اور یہاں اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ مزید بولیں۔

"یہ رشتہ وشتہ سب بھول کر تم صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دو اور اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خود ہی حل کرلوں گی یہ مسئلہ۔ تمہیں بس زبان بندی کا کہا ہے تو زبان بند ہی رہے تمہاری۔ مزید کوئی باغیانہ روش اپناؤ گی تو ہم سب کا نقصان ہوگا۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو ثومیہ۔ تمہارے اس رویے سے میری تربیت پر حرف آرہا ہے۔" اس کی آنکھوں میں جھانک کر پورے یقین اور قطعیت سے کہتے ہوئے آخر پر ان کا لہجہ نرم ہوگیا تو ان کے سخت انداز میں چھپا پیار سمجھتے ہوئے وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ وہ واقعی شرمندہ بھی تھی دل میں کہ اس کی وجہ سے انہیں بابا سے باتیں سننی پڑی ہیں۔

"جی ماما۔۔۔ میں کوشش کروں گی لیکن پلیز آپ سنبھال لینا۔ ہاں۔۔۔؟؟"

بالآخر خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے کچھ توقف سے کہا تو اس کی بات میں چھپے طرح طرح کے خدشات بھانپ کر وہ ان کا غصہ ڈھل گیا۔ وہ اب دوپٹے کا پلو اٹھا کر چہرہ صاف کر رہی تھی۔

"ان شاء اللہ بیٹا۔۔۔ بس اب پریشان مت ہو۔ ابھی بہت سا وقت پڑا ہے۔ یونیورسٹی سے فراغت پالو اس کے بعد دیکھا جائے گا جو ہوگا۔ سب بہترین ہوگا اور تمہاری مرضی کے خلاف تو کچھ بھی نہیں۔ ان شاء اللہ۔۔۔"

اسے ساتھ لپٹاتے آج صبح سے پہلی بار انہوں نے اس سے پیار کیا تو اس کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

"ان شاءاللہ ماما۔۔۔ان شاءاللہ۔بہت شکریہ۔"

ان میں سماتی وہ پورے جذب سے بولی تو وہ اس کا سر چومنے لگیں اور تب سے ایک طرف کھڑی نمرہ بھی دوسری طرف بیٹھ کر ان سے چمٹ گئی۔

زندگی ہمیں اکثر ایسے مقامات پر لے آتی ہے کہ بند دوراہوں پر رک کر بھی ہمیں طویل مسافتیں بھرنا پڑتی ہیں۔ثومیہ کی زندگی بھی ایسے ہی کسی خاموش دوراہے پر آن رکی تھی کہ جہاں مسافت تو تھی مگر منزل کا نشاں نہیں۔۔۔

☆......☆......☆

صوفے پر سوئے سوئے کسلمندی سے پہلو بدلتے ہوئے ناز کو لگا کہ اس کا فون بج رہا ہے۔اس نے ہاتھ بڑھا کر درمیانی میز پر دھرا موبائل اٹھایا اور مندی مندی آنکھوں سے سکرین پر نگاہ کی۔وہاں "رامیش کالنگ" جگمگا رہا تھا۔منہ بسورتے ہوئے اس نے موبائل تقریباً واپس پٹخا اور ایک نظر بے سدھ پڑی گیتی پر ڈال کر بازو یونہی فرش پر لٹکائے پھر سے آنکھیں موندلیں۔رامیش کے نام پر وہ ہمیشہ ایسے ہی بدمزہ ہوتی تھی۔ہلکورے لیتی وہ ابھی نیند نگر کی دہلیز پر بھی نہیں پہنچی ہوگی کہ ہوٹل روم کا دروازہ پوری شدت سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔وہ گویا چین کے کسی رتھ پر سے نیچے آن گری۔پوری آنکھیں کھول کر اس نے ماحول میں بکھرتے ارتعاش کا منبع سمجھنے کی کوشش کی اور پھر دروازہ بجنے کا ادراک کر کے ہڑبڑا کر اٹھی۔

"اے بھگوان۔۔۔اب یہ کیسا پاکھنڈ ہے؟؟"

ٹیرس سے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھتی الجھے بکھرے حلیے میں وہ بھاگ کر دروازے تک آئی اور کنڈی ہٹا کر ایک بار پھر دنیا ومافیہا سے بے خبر گیتی کی طرف دیکھا۔

"نمستے ناز۔۔۔یہ گیت کہاں ہے؟؟"

اس کے ہٹنے سے قبل دروازہ تقریباً دھکیلتے ہوئے دھنراج ورما اندر داخل ہوا اور گیتی کو سامنے سوتے ہوئے

دیکھ کر بھی اپنی دھن میں سوال کرنے لگا۔ اس کا گھبرایا ہوا انداز دیکھ کر اس نے حیرت سے اس کے پیچھے اندر داخل ہوتے رامیش کی طرف سوالیہ نگاہ کی اور اسے خاموشی سے اندر بڑھتا دیکھ کر دروازہ بند کرنے لگی۔ پریشانی میں وہ دھنراج ورما کو جواب تک دینا بھول گئی۔

"جگاؤ اسے ناز اور اس سے پہلے خود بھی جاگو۔۔۔جلدی پلیز۔ بڑا کانڈ ہو گیا ہے۔"

تیزی سے گیتی کی طرف بڑھتا وہ بیڈ کے پار رکا اور تحیر سے کبھی خود کو اور کبھی رامیش کو دیکھتی ناز کو مخاطب کیا۔

"کیا ہوا سر؟؟ کچھ بتائیے تو۔۔۔"

حواس پر قابو پاتی وہ دوڑ کر بیڈ پر چڑھی اور اس کے سرہانے دوزانو بیٹھ گئی۔

"اٹھو گیت۔۔۔ورما سر آئے ہیں۔ جلدی کرو۔"

اس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"بتاتا ہوں ابھی۔ پہلے اسے جاگنے دو۔ اور وہ دیکھو بس۔"

ہنکارا بھر کر تشویشناک انداز میں کہتے ہوئے اس نے رامیش کی طرف اشارہ کیا جو سوئچ میں تار لگاتا ٹی۔وی آن کرنے کی کوششوں میں تھا۔ یکایک ناز کو محسوس ہوا کہ کچھ انتہائی غلط ہو گیا ہے۔

"ہے بھگوان۔۔۔پگلا گئی ہو ناز؟؟ اری جاگ گئی ہوں میں۔ پیچھے تو ہٹو۔ کیا ہوا ہے؟ رنگ کس بات سے اڑا ہوا تمہارا؟؟"

یہی وہ پل تھا جب گہری نیند سوئی گیت ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور ایک طرف گرا اپنا ریشمی دوپٹہ اٹھا کر گلے میں پھیلاتی ہوئی ماحول جانچنے لگی۔

"ارے۔۔۔آپ کب آئے؟؟ پرنام سر۔۔۔"

اور دھنراج ورما پر نگاہ پڑتے ہی یونہی بیٹھے بیٹھے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر اس نے مخصوص انداز میں سلام کیا اور فوراً سے پیشتر بیڈ سے اتر کر اس کے گرد گھومتی اس تک چلی آئی۔

"نمستے سر۔۔۔کیا ہوا ہے؟ شما کریں میں گھنی نیند میں تھی۔"

ہندی انداز میں ہاتھ باندھے ہوئے، جھک کر تعظیم کرتی وہ معذرت خواہ ہوئی تو بغور اس کا اک ایک طور

جانچتا وہ خفیف سا مسکرایا۔

"پدھارو گیت۔۔۔کنتو اس سے پراتھم نندیا سے جاگن کرو۔اتہاس گواہ ہے کہ سمے سے پار سونے والوں کو پنے شما نہیں کرتے۔"

(بیٹھو گیت۔۔۔لیکن اس سے پہلے نیند سے جاگ جاؤ۔تاریخ گواہ ہے کہ وقت سے پار سونے والوں کو "صفحات" معاف نہیں کرتے۔)

اس سے ہاتھ ملا کر ورما نے عمیق تر لہجے میں کہا تو صوفے پر بیٹھتی وہ بے طرح چونک گئی۔یہ ورما کے بات کرنے کا انداز نہیں تھا۔

اسی وقت ٹی-وی آن کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا رامیش ٹی-وی کے آگے سے ہٹ کر ان کے ساتھ آ بیٹھا تو اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ورما نے مزید کہا۔

"ادھر دیکھو۔۔۔اور پورے دھیان سے۔"

اور اسکرین پر رواں مناظر پر ایک پل کو نظر جماتی وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ اسمبھاؤ ہے۔۔۔"

کسی سکتے کے سے انداز میں اس کے لب سرسرائے اور پھر اظہارِ بے یقینی کے طور پر منہ پر الٹے ہاتھ کی پوریں جماتے ہوئے اس نے بیڈ پر بیٹھے پتھرائی ہوئی نظروں سے ٹی-وی کو گھورتی ناز کی طرف دیکھا۔

"کنتو یہ سب ہوا کیا ہے؟؟"

اسکرین پر ممبئی میں اپنے گھر کے باہر جمع ہوئے بے قابو ہجوم کو دیکھتی وہ چلا کر بولی تو ناز تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

ٹی-وی پر لگتے "گیتی دیش دروہی ہے۔۔۔گیتی کو دیش سے چلتا کرو۔" قسم کے نعروں کی گونج سے وہ سارا معاملہ جان گئی تھی۔

"ایک منٹ گیت۔دھیان سے دیکھو پھر بات کرتے ہیں۔"

اسے بازو سے تھام کر واپس صوفے پر بٹھاتی وہ نرمی سے بولی اور دوبارہ سکرین دیکھنے لگی۔

یہ کسی دیسی چینل پر جاری خبرنامے میں "بریکنگ نیوز" کے طور پر چلائے جانے والے مناظر تھے اوران میں نیوز کاسٹر انتہائی سنسنی خیز لہجے میں بتا رہی تھی کہ معروف بھارتی اداکارہ گائیتری دیوی کی دشمن دیش پاکستان میں جاری "پریم بھری" سرگرمیوں سے مشتعل ہو کر انتہا پسند ہندو تنظیم "ہندسینا" کے بپھرے ہوئے کارکنان نے ان کے گھر کا محاصرہ وگھیراؤ کرلیا ہے اور گیتی پر دیش دروہی ہونے کا الزام دھرتے ہوئے انہیں دیش سے چلتا کرنے کے نعرے لگا رہے ہیں۔خبر کی تفصیلات یہ بتائی جارہی تھیں کہ کم از کم تین گھنٹے قبل شروع ہوا یہ احتجاج گیتی کے گھر کے گھیراؤ کے علاوہ شہر کے کونے کونے تک پھیل رہا ہے اور حالات بتاتے ہیں کہ فی الوقت چھوٹی چھوٹی ریلیوں کی مانند ابتدا ہوئے یہ مظاہرے آنے والے کل تک مزید بڑھیں گے۔ساتھ یہ امکان بھی ظاہر کیا جارہا تھا کہ مذہبی آہنگ کی شمولیت کی بنا پر گیتی مخالف یہ تحریک ملک گیر پذیرائی حاصل کرسکتی ہے۔

"پاپا۔۔۔پاپا کو فون لگاؤ ناز۔جلدی۔۔۔ماما اور بیلا آنی، راموانکل سب کا پتا کرو۔پلیز۔مجھے گھنی چنتا ہو رہی ہے۔"

بالآخر دو مشتعل افراد کو دروازے کی گھنٹی اور گیٹ کالمز پر لگے سفید گلوب توڑتے دیکھ کر وہ کپکپاتے لبوں سے بولی اور انگلیاں چٹخاتی ہوئی دوبارہ اٹھ کر اضطراری انداز میں یہاں وہاں ٹہلنے لگی۔اس کے کہنے پر ناز کو خود پر غصہ آیا کہ یہ خیال اسے خود سے کیوں نہیں سوجھا؟؟

ہڑبڑا کر ماتھے پر ہاتھ مارتی وہ میز پر دھرا موبائل اٹھانے کو جھکی ہی تھی کہ دھنراج ورما بول پڑا۔

"ایک منٹ رکو ناز۔۔۔وہ سب ٹھیک ہیں۔شیتل سے میری بات ہو چکی ہے۔لوگ بپھرے ہوئے پرنتو وہ سب سرکھشت ہیں۔سیکیورٹی ہے ان کے پاس۔"

اور اس کے ٹوکنے پر وہ رک بھی گئی کیونکہ ان کا تعلق فیملی فرینڈز کا سا تھا اور انہیں یقین تھا وہ جیسا کہہ رہا ہے ویسا ہی ہے۔پھر ورما نے رامیش کو مخاطب کیا۔

"یہ سین اب بند کرو یار اور تم نیچے لابی میں جاؤ۔سب کھانے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں تو دھیان کرنا کہ سب کی خاطر ہو۔"

حکم کی تعمیل میں "او کے سر" کہتا ہوا وہ چلا گیا تو وہ واپس ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"شانتی سے پدھار کر میری بات سنو گیت۔۔۔ یہ سب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔تمہارا دوش یہ ہے کہ تم ضدی بہت ہو۔ یہ فلم سائن کرنے سے پراتھم گیان دیا تھا تمہیں کہ وہاں سنبھل کر رہنا۔۔۔ بڑا دیکھ بھال کر اور اپنی ریکھا میں۔لوگوں سے زیادہ میل جول نہ کرنا۔ یہ سوشل میڈیا کا دور ہے اور یہاں بات اپنے اصل سے ہٹ کر راتوں رات قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔"

تنبیہی لہجے میں کہتا وہ ابھی یہاں تک پہنچا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھتی وہ باغیانہ روش سے بولی۔

" کنتو میں نے کہا کیا ہے؟؟ یہ سب تو بکواس ہے نری۔ جرور یہ کوئی ساجش (سازش) ہے میرے خلاف۔ایسی تو کوئی بات ہی نہیں کری میں نے کہ اتنا ڈھنڈورا کیا جائے۔ بتائیں آپ کیا کیا میں نے؟؟"

اور اس کی بات پر انتہائی بری طرح تپ کر اس نے اسے جھڑک دیا۔

"بس یہ جو ابھی کر رہی ہو یہی کیا ہے۔تھم کے رہو گیت۔۔۔نہیں تو بات اور بگڑ جائے گی۔اب بھی یہی چلن، یہی انحقار اچھا نہیں ہو گا۔اتنی بھی بدھی نہیں ہے کیا؟"

اس کے قطعی اور دو ٹوک لہجے پر وہ قدرے ماند پڑ گئی کیونکہ اپنے گرو(گاڈ فادر) سے دو بدو ہونے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"پانی دو اسے ناز۔۔۔کچھ گرہ ٹھکانے ہو اس کی۔پھر یہ بات پہتر (بہتر) سمجھ سکے گی۔"

اسے خاموشی اختیار کر کے پہلو بدلتے دیکھ کر اس نے ناز سے کہا تو وہ اٹھ کر واٹر ڈسپنسر سے پانی بھرنے لگی۔ لہجہ ڈھال کر وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"دیکھو گیت۔۔۔سوشل میڈیا پر کل رات یہ سب ڈرامہ شروع ہوتے ہی میں نے اس معاملے کی کھوج کی۔اور اب تک جو جانا میں نے وہ بہت ڈرنے لائق ہے۔یہ اتنا بڑا کھیل ہے کہ اس کے آنکڑے فلم انڈسٹری سے لے کر راج نیتی تک مل رہے ہیں۔اس سازش میں سب شریک ہیں۔سنو ذرا۔۔۔"

اور اس کے بعد لہجے کے زیر و بم میں، نہایت راز داری سے اس نے جو اگلی باتیں کیں ان کا لب لباب یہ تھا کہ اس کے خلاف ہوئی اس سازش میں فلم انڈسٹری کے لوگ بس ابتدائی طور پر شریک رہے۔اس آگ کو اصل ہوا وجے کمار یعنی گیتی کے والد کے سیاسی حریفوں نے دی ہے۔یعنی وہ لوگ جو اس کے پتا کی نیک نامی اور

مضبوط سیاسی ساکھ سے حسد کرتے ہیں۔ اس میں سب سے حیران کن پہلو یہ شاملِ حال رہا کہ اسے زیرِ دام لانے کے لیے پاکستانی متنازعہ صحافی ممتاز محمود کی خدمات خصوصی طور پر حاصل کی گئیں۔ ناز کو یہ بات کوئی اچھنبے کی باعث نہیں لگی کیونکہ وہ اس سے کچھ بھی توقع کرسکتی تھی لیکن محبتوں کی پیامبر گیتی کے لیے یہ بات کسی انکشاف سے کم نہیں تھی۔ وہ حیرت در حیرت فلمی صنعت اور راج نیتی سے وابستہ وہ سب نام سن رہی تھی جو ان دونوں باپ بیٹی کے خلاف درِ اندرون متحد ہوئے کھڑے تھے۔ کیونکہ بظاہر ان کے ساتھ ان سب کا رویہ و انداز ہمیشہ سے انتہائی دوستانہ اور اپنائیت بھرا رہا تھا۔ دھنراج ورمانے پوری جزئیات کے ساتھ ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہوئے اسے مکمل تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اور اب اسے بھی سمجھ آنے لگی کہ حالات اس قدر تیزی سے اس کے اتنے مخالف کیسے ہوئے ہیں؟ اس دوران ناز بھی اسے پانی پلا کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھی ماتھے پر لکیرِ فکر لیے سب سنتی رہی تھی۔

"مجھے نہیں لگتا یہ سب آسانی سے ٹھیک ہوگا۔ اس سے تو اس سمسیا کا کوئی اپائے بھی دکھائی نہیں دیتا۔"
بات مکمل کر کے جونہی اس نے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھا ناز فکرمندی سے بولی۔ جبکہ گیتی بالکل یوں گنگ بیٹھی رہی گویا کہنے کو کچھ بچا ہی نہ ہو۔

بیگانوں کی بھی محبتوں کا دم بھرتی وہ کامنی سی لڑکی اپنوں کی بے اعتنائیوں کی زد میں آکر ادھڑنے لگی تھی۔

"مسئلہ تو گھمبیر ہے ناز۔۔۔ معاملہ اس سے زیادہ اس کے پتا اور راج نیتی سے جڑا ہے۔ اس کی باتوں کو توڑ موڑ کر تو بس بہانہ گھڑا گیا ہے انہیں دام میں لانے کے لیے۔ اور مجھے وشواس ہے کہ یہ بات اس سے صرف بڑھے گی۔۔۔ کم نہیں ہوگی۔"
سرسری سا تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہاں رک کر اس نے ان کے تاثرات جانچے تو وہ خالی خالی نظروں سے بس اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا مزید بولا۔

"خیر۔۔۔ آج کی رات اور کل کا دن دیکھو کہ حالات کس اور بڑھتے ہیں۔ اس کے پشچات ہی ہم کوئی فیصلہ لینے کی کوشش کریں گے۔ اچھا اب میں نیچے جا رہا ہوں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم دونوں کا کھانا کمرے میں ہی بھیج دیا جائے گا تاکہ فضول پوچھ گچھ سے بچ سکو۔"

ہمت افزا لب ولہجہ میں بات مکمل کر کے گیتی کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتا وہ دروازے کی سمت بڑھا اور دروازے کے قریب جا کر کسی خیال سے واپس پلٹا۔

"ہاں ایک بات اور کہ اب نو ٹویٹر، نو فیس بک اینڈ ناٹ اینی ادر کائینڈ آف سوشل میڈیا۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں گیتی کا نیگیٹو یا پازیٹو کوئی بھی آفیشل سٹیٹمنٹ جاری نہیں ہونا چاہئیے۔ گیتی کی کل کی شوٹنگ میں آلریڈی کینسل کر چکا ہوں تو کل تم لوگ بس آرام کرنا۔ سی یو۔ بائے۔"

اس کی بات پر کچھ کہے بنا انہوں نے فقط تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا تو وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

"یہ اسمبھاؤ ہے۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے ناز؟؟ کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

کمرہ بند ہونے کی آواز سنتی گیتی کے لب گویا کسی خیال میں رہ کر سرسرائے تو اسے بہت کچھ سنانے کی خواہش دل میں دباتی وہ ہونٹ کچل کر رہ گئی۔ فی الوقت اسے گیت پر صرف اور صرف ترس آیا۔ زندگی بھر انتہائی مضبوط رہتی اس لڑکی کو آج پہلی بار اس نے کچھ بکھرا بکھرا دیکھا تھا۔

"جانے دو یار۔۔۔ سب سدھر جائے گا۔ تھوڑی دیر تک گھر بات کرتی ہیں۔ اور اٹھو تم۔۔۔ ہم وہاں ٹیرس میں رکتی ہیں۔ دیکھو تو کپادوکیہ پر شام اتری ہے۔"

اس کے چہرے پر جھولتی ایک لٹ کو نہایت محبت سے اس کے کانوں کے پیچھے اڑستی وہ نرم لہجے میں بولی تو اس نے بنجران آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ نگاہیں پھیر گئی۔

"شام صرف کپادوکیہ پر کب اتری ہے ناز۔۔؟؟"

سرگوشیانہ لہجے میں کہتی وہ اٹھی اور کھوئے کھوئے انداز میں اس سے پہلے ہی کشادہ ٹیرس میں نکل کر، تیز ہواؤں کے مقابل رکتے ہوئے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ پیچھے ساکت کھڑی ناز نے تحیر سے اس کا بے خودی کا سا انداز دیکھا اور ایک خاص ردھم سے قدم اٹھاتی اس کی طرف بڑھی۔ ادھر یونہی بازو پھیلائے ہوائیں جذب کرتی وہ ٹیرس کی بیرونی ریلنگ تک گئی اور تاریکی میں ڈوبے پتھریلے شہر کے تنگ اور اونچے دہانوں سے جا بجا پھوٹتی زرد یلی روشنیاں دیکھنے لگی۔

"بلند کلیساؤں کے شہر میرا اسلام۔۔۔ گواہ رہنا کہ گائیتری پر یہ شام تمہارے ساتھ ساتھ اتری ہے۔"

نرم ہونٹوں سے مدھم سرگوشیاں کرتے ہوئے اس نے "ڈسٹی سٹریٹس" میں سرسراتی ہواؤں پر کوئی پیغام دھرا اور آنکھیں موندے اپنا آپ ڈھارسی خیالات کی نہج پر بہنے دیا۔ یہ اذیت ناک سوچوں سے کسی بھی طور چھٹکارے کی ایک کاوش تھی اور بس۔۔۔

"اے رام۔۔۔کرپیا کرنا۔۔۔"

اس سے چند قدم پیچھے رک کر اس کی خود کلامیاں سنتی ناز نے دونوں ہاتھ باندھ کر اوپر آسمان کی طرف نگاہ کر کے اپنے کسی "رام" کو مخاطب کیا اور اس سے مزید گفتگو کا ارادہ ترک کرتی ہوئی اسے ہواؤں کے سنگ اکیلے چھوڑ کر واپس کمرے میں بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

کہانیوں کی ایک خاصیت ہوتی ہے کہ یہ اپنا انجام خود طے کرتی ہیں۔ ان میں سانس لیتا ہر کردار لاعلم ہوتا ہے کہ کس پل اس کی زندگی کون سی کروٹ لینے والی ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے انسان کب ایک دوسرے سے جدا بھی ہونے لگیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ ہر کہانی میں سنگ سنگ جیتا ہر کردار۔۔۔ انجام تلک کہاں کہاں جا بسے گا کوئی نہیں جانتا؟؟ داستانیں، قصائص اور ان سے وابستہ عمیق تر راز بھی پل پل۔۔۔ ہر پل۔۔۔ سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہیں۔ یعنی "کہانی" ہو چکے کسی بھی انسان پر پورے راز ایک ہی وقت میں کہاں منکشف ہوتے ہیں؟؟ حالات بنتے ہیں۔۔۔ واقعات رونما ہوتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے سب عیاں ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ بھرم سارے ٹوٹ جاتے ہیں۔

ان سب کی "داستانِ آب وجوِ عشق" بھی رفتہ رفتہ انجام کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن وہ بے خبر تھے۔ اور باخبر تو شاید وہ اس کی شروعات سے بھی نہیں تھے۔ ہاں۔۔۔ ہوتی ہیں کچھ کہانیاں ایسی بھی جو بنا کسی باقاعدہ آغاز کے انجام پذیر ہونے لگتی ہیں۔ اگلے روز کہیں بھی "راستوں میں" ملے بغیر وہ سب باری باری یونیورسٹی پہنچے اور پہلی دو کلاسز پڑھنے کے بعد اپنے مقالے کی تیاری کی غرض سے بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے جانے کا قصد کیا۔ سفیر کی توقع کے عین مطابق طلباء کے بے حد اصرار پر مقالہ جمع کروانے کے لیے مقررہ وقت کا دورانیہ ایک ہفتہ سے بڑھا کر دو ہفتے کر دیا گیا۔ تاریخی مقامات پر پہنچنے کے لیے تھوڑی بحث و تکرار کے بعد سواری کے متعلق

یہ طے پایا کہ دونوں لڑکیوں میں سے ایک سفیر کے ساتھ بائیک پر اور ایک مصطفین کے ساتھ آٹو رکشہ پر جائے گی۔ خالو کی دکان سے متعلقہ مسائل میں الجھ کر وہ کل شام میں ارادہ ہونے کے باوجود بائیک نہیں خرید سکا تھا۔ قصہ المختصر تھوڑے پس وپیش اور گریز کے بعد ثومیہ کو سفیر کے ساتھ بائیک پر جانا پڑا کیونکہ مریم کی نسبت وہی اس کے قریب تھی اور مریم نے بھی اسے ہی بھیجنے پر اصرار کیا۔ طے یہ پایا کہ پہلے پہنچ کر وہ دونوں بادشاہی مسجد میں وضوخانہ یا" تبرکات مقدسہ" کے پاس رک کر ان کا انتظار کریں گے۔ انہیں جلد از جلد پہنچنے کی تاکید کرتا وہ ثومیہ کو پیچھے بٹھائے بہت سرشار سا یونیورسٹی سے نکلا اور سبک رفتاری سے مختلف سرسبز وشاداب شاہراہوں سے ہوتا ہوا تاریخی مقامات پر پہنچ گیا۔ وہ سارے راستے خاموش رہ کر اپنی گھریلو پریشان کن فکروں کو سر سے اتار پھینکتی رہی۔ اس نے مصمم ارادہ کیا کہ اب کسی بھی منفی گمان پر اپنی ڈھارسیں نہیں کھونی اور خاطر جمع رکھنی ہے۔ نمرہ اور ماما کے بارہا سمجھانے پر اس نے بھی اب خود کو حالات و اوقات کے دھارے پر چھوڑنے فیصلہ کیا۔

پارکنگ میں بائیک لگانے کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے واقع بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کو جاتی مشترکہ سڑک پر چلنے لگے۔ یہ وہی سڑک ہے جو ان تاریخی مقامات کو یادگارِ پاکستان سے بھی ملاتی ہے یعنی مینارِ پاکستان کا ایک ذیلی گیٹ اسی شاہراہ پر کھلتا ہے۔ کشادہ سڑک کی دائیں طرف جابجا سجائے گئے مختلف اسٹالز نے ثومیہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تو جگہ جگہ رک کر چیزوں کا الٹ پلٹ کر جائزہ لیتی وہ بچوں کی طرح خوش ہونے لگی اور اس کے چہرے پر پھیلتے والہانہ پن کو وفورِ شوق سے اپنے دل میں جذب کرتا سفیر اپنے آپ میں ہی بے طرح بہلتا رہا۔ یہ اسٹالز ثقافتی جیولری سے لے کر مختلف فن پاروں اور گھریلو آرائشی اشیاء پر مشتمل تھے اور ثقافتی ورثہ کی چھاپ کے بطور مہنگے داموں فروخت بھی ہورہے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کے داخلی مشترکہ احاطے سے باہر مینارِ پاکستان کی جانب واقع سکھوں کے تاریخی گوردوارے کے سامنے وہ اچانک رک گئی۔ گوردوارے کے گیٹ پر رنگ برنگ پگڑیاں پہنے کھڑے خوش لباس سکھ یاتری اس کی دلچسپی و توجہ کے باعث و مرکز تھے۔

" کیا ہوا؟؟ رک کیوں گئیں؟؟"

اس سے دوقدم آگے چلتا سفیر اپنا یونیورسٹی بیگ ایک سے دوسرے کاندھے پر منتقل کرتا تیزی سے پلٹا۔

"یہ سکھ کتنے اچھے لگتے ہیں ناں۔۔۔اوران کی بولی بھی کتنی میٹھی ہوتی ہے۔ہماری کالونی میں ایک باریہ کرائے دار کے طور پر آئے، تب سنی تھی میں نے۔"

اس کی بات پر وہ دلکشی سے ہنسا۔

"میٹھی بولیاں سمجھ آتی ہیں تمہیں؟ جان کر اچھا لگا۔"

بے ساختگی میں اس کا لہجہ معنی خیز ہوا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں سمجھ نہیں سکی۔" استفسار کرتی وہ آگے بڑھ گئی تو وہ بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔سنبھلنے کی کاوشوں کے باوجود وہ بے اختیار ہو رہا تھا۔

"کچھ کہنا تو چاہتا ہوں لیکن لفظ نہیں جڑتے مجھ سے۔"

اسی لہجے میں وہ پھر سے گویا ہوا تو اب کی باراس نے اپنا چونکنا بھی ظاہر نہیں کیا لیکن اسے شدت سے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔اسی دوران احاطے میں داخل ہو کر وہ بادشاہی مسجد کی طرف لے جاتی پختہ روش پر چلنے لگے۔

"جن خیالات کے اظہار کو لفظ نہ جڑیں ان سے چشم پوشی کرنا افضل ہوتا ہے سفیر۔کچھ باتیں ان کہی ہی رہنی چاہئیں۔"

اب کی بار وہی معنی خیزی اس کے لہجے میں بھی در آئی تو شاہی مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے سفیر کی بے اختیاریوں کو گویا شہہ مل گئی۔

"گفتگو خیالات سے ہٹ کر اگر جذبات سے متعلق ہو تو۔۔۔؟؟"

اس کے سوال پر اس کے پیچھے اولین سیڑھیوں پر خاص ردھم سے اٹھتے ثومیہ کے قدم کچھ ڈگمگا سے گئے۔

"تو یوں کہہ لو کہ جن جذبات کو اظہار کی راہ نہ ملے ان کا دم اپنے ہاتھوں سے ہی گھونٹ دینا چاہئیے۔"

خود کو متوازن کرتے ہوئے اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تو جواباً خاموش رہ کر سب سے اوپری سیڑھی پر رک کے سفیر نے ہاتھ بڑھا کر اسے اوپر آنے میں مدد دینا چاہی۔ایک پل کو رک کر اس نے آس پاس بے توجہی سے سیڑھیاں چڑھتے اترتے سیاحوں کو دیکھا اور پھر اسے گہری نظروں کے حصار میں رکھتی پورے اعتماد

سے اس کا ہاتھ تھام کر ایک جھٹکے سے مرکزی تھڑے پر چڑھ گئی۔اس کے وزن کو جھیلتا وہ اپنی جگہ سے آدھا انچ بھی نہیں ہلا تو دل ہی دل میں وہ اس کی مضبوطی سے متاثر ہوئی۔

"جذبات کے گلے نہیں دبائے جاتے ثومیہ۔۔۔اکثر تو ان کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ایسی لفاظی مت کرو کہ جسے کوئی نبھا نہ سکے۔"

ایک سیڑھی چڑھ کر اس کی ہمراہی میں آتا وہ بے بسی سے بولا تو وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ثومیہ کو اس کے پل پل بدلتے لب ولہجہ و انداز سے خوف آیا۔اس کی وارفتگیاں جو کچھ اسے سمجھانا چاہ رہی تھیں وہ سب وہ کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔اس کا بدلا بدلا یہ فدویانہ انداز اس نے کل بھی ایک دو بار محسوس کیا تھا لیکن نظرانداز کر گئی۔

زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ من پسند لوگوں کی دلآویز گفتگوئیں بھی ہمیں دل آزار کرنے لگتی ہیں۔

بنا کچھ کہے وہ اس کے مقابل سے ہٹی اور بائیں طرف چند قدم بھاگ کر کشادہ تھڑے کے آخری کنارے پر جا رکی۔اس نے جذبات و محسوسات سے متعلقہ اس حساس تر گفتگو سے گویا کوئی فرار چاہا۔اس جانب احاطے میں واقع "مزارِ اقبال" سے نکلتے زائرین کو دیکھ کر اس نے دوپٹے کا پلو دو انگلیوں میں داب کر سر پر جمایا اور وہیں کھڑے کھڑے دستِ دعا بلند کر دیئے۔

اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے سفیر نے پوری شدت سے اس کا یوں "ہٹ جانا" محسوس کیا اور آس پاس اپنے حسین سراپے کو بے پناہ چاہتوں سے تاکتے لوگوں کو نظرانداز کرتا ہوا نہایت دل شکستگی سے چلتا اس کے ساتھ آن رکا۔پھر اس کی بند آنکھوں اور ہلتے لبوں کو دیکھتے ہوئے اس نے نظروں ہی نظروں میں اس کی نظر اتاری اور اسی کی مانند ہاتھ اٹھا کر یونہی آنکھیں موند لیں۔اس پل مغلیہ سلطنت کی عظیم باقیات پر پوری تاب سے کھڑے وہ دونوں کردار یوں ساکن ہو گئے کہ گویا صدیوں تلک یہیں مجسمہ ہو جائیں گے۔

بالآخر فاتحہ خوانی کر کے ان کے ہاتھ پہلو بہ پہلو نیچے آ گئے۔

"سفیر وہ دونوں جانے کب تک پہنچیں گے؟ خیر چلو اندر تو چلیں۔اور بتاؤ کہ فاتحہ کے علاوہ بھی کوئی دعا مانگی ہے کیا؟؟"

عام سے لہجے میں کہہ کر موضوع بدلتی ہوئی وہ بڑھی اور مسجد میں داخل ہونے سے قبل "شوا سٹینڈ" پر جوتا جمع کروانے لگی۔

"پہنچنے ہی والے ہوں گے اب تو۔ فکر نہیں کرو ابھی آ جائیں گے۔ اور ہاں فاتحہ کے علاوہ بھی کچھ مانگا تو ہے۔"

جھک کر شوز اتارتا وہ متجسس لہجے میں بولا تو اس سے پہلے جوتا جمع کروا کر ایک طرف ہوتی وہ اس کے بھی جمع کروا لینے کی منتظر ہوئی۔

"اور کیا دعا مانگی؟؟"

جونہی وہ پلٹا وہ سوالیہ نظریں گاڑے جواب طلب ہوئی۔ اس کے انداز پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"مجھے حرف گری نہیں آتی ثومیہ۔ تو بس کچھ لفظ مانگے ہیں۔"

اندر کی طرف قدم بڑھانے کی بجائے بادشاہی مسجد کے اونچے میناروں کو دیکھتا وہ ایک طرف جا رکا تو آنکھوں میں جہانِ حیرت لیے وہ اس کے سامنے آئی۔

"لفظ؟؟ کیسے لفظ سفیر؟؟"

کچھ دیر پہلے کی گفتگو بھلائے وہ سراپا سوال ہوئی تو اس کی روشن آنکھیں پڑھتا وہ پورا جواب ہونے لگا۔

"وہی لفظ کہ جن سے ڈھارسیں پا کر میرے بے کراں جذبات ظاہر ہو سکیں۔ میں جذبات کے گلے نہیں دبا سکتا ثومیہ۔۔۔ میں اتنا صابر ہوں ہی نہیں۔"

یہ درِ اندرون اترتی بے پناہ شورشوں کا لمحہ تھا۔ اس کی غزال تر آنکھوں سے نکلتی چاہتیں پڑھ کر وہ ساکن و ساکت ہونے لگی۔

"بادشاہی مسجد کے ان بلند تر میناروں کو گواہ کر کے کہوں گا۔۔۔ کہ تم سے انہی کے جیسی لازوال محبت کرتا ہوں۔"

اس کے ہونٹوں سے پھوٹتی محبت کی چاپ سن سن کر وہ سچ مچ پتھر ہو گئی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتے

ہوئے اسے لگا اس کے کانوں میں کوئی کرب سرسرانے لگا ہے۔ تعلق کی اس نہج پر تو وہ جا سکتی ہی نہیں تھی۔ اور اسمِ محبت پھونک کر اپنے تئیں شرماتا وہ اس سے رخ پھیر گیا۔ تھڑے سے نیچے گھاس پر بیٹھے گٹارسٹ کی دھن سنتا وہ اس کے جواب کا منتظر ہوا۔

"سفیر۔۔۔"

بالآخر اس نے کپکپاتے لبوں سے اس کا نام پکارا۔

"تم مذاق کر رہے ہو ناں۔۔۔؟"

اس کے اپنی جانب مڑنے سے قبل وہ مزید بولی تو وہی جہانِ حیرت آنکھوں میں بھر کر وہ اسے دیکھنے لگا جو کچھ دیر پہلے ثومیہ کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔

"جذبے مذاق نہیں ہوتے ثومیہ۔ مجھے واقعی تم بہت اچھی لگتی ہو۔ ہاں سچ مچ تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

اور یہاں یقین دہانی کی کوشش میں اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ تھامنا چاہا کہ قمیض کے دامن تک جھولتے اپنے بیگ پر ہاتھ دباتی وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"یہ واقعی اچھی لگتی ہو۔۔۔ یہ سچ مچ محبت ہو گئی ہے۔۔۔ یہ سب کیا ہے کیا سفیر؟؟"

وہ چیختے ہوئے بولی تو اس کی آنکھیں میں کانچ چلنے لگا۔

"اچھے تو تم بھی بہت لگتے ہو مجھے۔۔۔ لیکن ہر کہیں اچھا لگنے کا مطلب صرف محبت نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں اچھا لگنے کا مطلب بہترین دوست ہونا بھی ہوتا ہے اور تم بھی صرف دوست ہو میرے اور بس۔۔۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے یہ بات نہ سنوں۔"

ملے جلے نرم و سخت لہجے میں بھرپور قطعیت سے کہتے ہوئے اس نے بات مکمل کی اور اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر اپنا بیگ سنبھال کر بھاگتی ہوئی شاہی مسجد کا داخلی دہانہ عبور کر کے وسیع صحن بھی پار کرنے لگی۔

ادھر اظہارِ بے بسی کے طور پر ایک ہاتھ کا مکا بنا کر دوسرے کی ہتھیلی پر مارتے سفیر نے اسے کسی اضطراب سے لپٹ کر دور تلک بھاگتے دیکھا اور پھر اسی بے تابی سے نہایت تیزی سے بھاگ کر وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اردگرد گذرتے سیاحوں نے معنی خیز نظروں سے ان دونوں کو آگے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا اور شش و پنج میں مبتلا

ہوئے کئی لوگ تو باقاعدہ رک بھی گئے۔

"رکو ٹو میہ پلیز۔۔۔کہاں جارہی ہو۔۔۔؟"

اسے روکنے کی کوشش میں لاشعوری طور پر ہاتھ بڑھا کر اس نے کچھ فاصلے سے پکارا تو صحن کے عین وسط میں واقع گولائی دار حوض کے پاس پہنچی وہ ایک جھٹکے سے رک بھی گئی۔اس کے پکارنے پر یکا یک اسے احساس ہوا کہ وہ بے نام مسافت بھر رہی ہے۔وہ دھیرے دھیرے اس کی سمت مڑی۔

" کہیں نہیں جارہی۔۔۔بس وہاں تمہارے سامنے ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تو یہاں آ گئی۔"

کمر پر ہاتھ رکھ کر اس نے سانس ہموار کرتے ہوئے کہا تو بھاگنے کے سبب ہوئی اس کی حالت دیکھتا وہ تڑپ سا گیا۔بنا کوئی جواب دیئے دائیں بائیں، آگے پیچھے مضطرسی نگاہ دوڑاتا وہ پانی تلاشنے لگا اور پھر دور اک دیوار کے ساتھ رکھے واٹر کولر کو دیکھ کر کاندھے سے بیگ اتارتا ہوا اس سے خالی بوتل نکال کر بولا۔

"تم یہیں رکو۔۔۔میں پانی بھر کر لاتا ہوں۔اور یہ بیگ پکڑو میرا۔"

میکانکی انداز میں اس نے بیگ تھاما تو وہ سرعت سے اس کولر طرف بڑھ گیا۔اس کے یوں "احساس" کرنے کو اس نے پوری شدت سے اپنے دل پر "محسوس" کیا اور پھر اس پر آئے غصہ سے قطع نظر اسے اس پر پیار بھی آیا۔

" گدھا ہے یہ۔۔۔بالکل پاگل۔۔۔بھلا اس سے پیار اس کا کوئی اور روپ ہوسکتا ہے میرے لیے؟ ہرگز نہیں۔۔۔"

ایک مختصر خط (لکیر) پر یہاں سے وہاں تک چلتی وہ خود کلامی ہوئی۔

"خیر۔۔۔میں جلد اسے "اچھا لگنے" اور "محبت ہونے" کا باہمی فرق سمجھا لوں گی۔"

دور جاتے سفیر کی چوڑی پشت کو گھورتی ہوئی وہ اس کی "محبت" سے بے خبر رہ کر اپنے "خیال" کو تقویت دینے لگی۔

پھر یوں ہوا انہی افکار کے مختلف تانے بانوں میں ڈھل ڈھل کر اس کی کیفیات بدلنے لگیں۔کچھ دیر پہلے کی ساری تندی و ترشی گویا کہیں بہہ سی گئی تو تھوڑے فاصلے پر مسجد کے صحن میں ایک مخصوص جگہ دانہ دنکا چگتے جنگلی

کبوتروں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ جانے کن آزاد خیالوں میں کھو کر، دونوں بیگز وہیں فرش پر رکھتی وہ پھر سے بھاگی اور ان چگتے ہوئے کبوتروں کے بالکل درمیان رک کر، دونوں بازو کھولے، آسمان کی طرف منہ کر کے گول گول گھومنے لگی۔ اپنے دھیان میں چگتے کبوتر اس "ناگہانی آفت" کو پا کر ایک ساتھ اڑنے لگے تو ماحول ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے بے تحاشا گونج اٹھا۔ کبوتروں کے نیم سرمئی اور سفید پر ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں لہراتے ہوئے اس کے آس پاس بکھرنے لگے۔

ادھر پانی بھر کر واپس لاتے سفیر نے ایک لحظہ کو رک کر حیرت در حیرت اس کی غیر متوقع ادا جانچی اور پھر تیز تیز قدموں سے چل کر دونوں بیگ اٹھاتا ہوا وہ بھی اس کے ساتھ آن رکا۔ ابھی تک مسلسل گھومتی ثومیہ کے چہرے پر بکھرے دھنک رنگ دیکھتے ہوئے اسے لگا کہ وہ سچ میں کوئی مغلیہ شہزادی ہے جو تاریخ کے ورق الٹ کر اس دور میں پلٹ آئی ہے۔

"میں نہ کہتا تھا بنتِ شاہجہان کہ تم کوئی شہزادی ہو۔ ابھی دیکھو تو اپنی حالت کہ ان مغلیہ باقیات پر پورے استحقاق سے" گھوم" رہی ہو۔"

بہت پہلے کا ایک ورد وہ پھر سے پھونکنے لگا تو اس کے لہجے کا جادو کچلتی وہ ایک دم رکی۔

"بس کرو سفیر۔۔۔ میں شہزادی ہو بھی جاؤں تو میرا اگلفام وہیں صدیوں پار بیٹھا ہے۔ اور تاریخی داستانوں سے اپنا تقابل کبھی نہیں کرتے۔۔۔ ورنہ انجام بھی انہی سا کربناک ہوتا ہے۔"

عمیق تر لہجے میں بہت خاص گفتگو کر کے، قریبی ہوا میں جابجا اڑتے کبوتروں کو تاکتی ہوئی وہ ان کی حدود سے باہر نکل گئی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہوا۔

پھر اس نے بیگ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بیگ اور پانی ایک ساتھ پکڑتی ہوئی انہیں ایک طرف پتھریلے فرش پر رکھ کر نیچے بیٹھ گئی۔ سفیر نے دیکھا کہ وہ ہاتھ مار کر اپنی تلیوں میں کھبے باجرے کے دانے صاف کر رہی ہے۔

"اور اگر کوئی اب بھی تمہاری چاہ کسی مغلیہ شہزادے کی مانند کرے تو۔۔۔؟"

وہ بیگ اور بوتل سمیٹ کر فرش سے اٹھ رہی تھی جب وہ بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ بے بسی سے اسے

دیکھتی وہ ایک طویل سانس بھر کر رہ گئی۔وہ باز نہیں آ رہا تھا۔۔۔اور اسے کوئی سخت اب وہ سنانا نہیں چاہتی تھی۔

ہوتا ہے یوں بھی اکثر کہ دوستوں کی بے جا ضدوں سے ہم ایسے لاچار ہونے لگتے ہیں۔

"بتاؤ ناں ثومیہ۔۔۔کہ اگر کوئی اب بھی تمہیں کسی مغلیہ شہزادے کی طرح چاہے تو؟؟"

وہ بنا جواب دیئے آگے بڑھ گئی تو وہیں رک کر اس نے کسی قدر پراسرار لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

اس کی طرف مڑے بغیر ایک لحظے میں ہی اس نے مصطفین سے لے کر اپنے باپ شاجہان عادل تک کے سخت گیر چہرے کو سوچا اور پھر رخ پھیر کر اس کی آنکھوں میں جھانکتی دو بدو لہجے میں بولی۔

"تو کیا ضروری ہے کہ میں بھی اس سے محبت کروں اور پھر اس محبت کی پاداش میں کہیں کسی دیوار میں چنوا دی جاؤں؟؟ سمجھنے کی کوشش کرو سفیر۔۔۔ماضی کی یہ عشقیہ داستانیں صرف عبرت کے لیے ہوتی ہیں۔ان سے محبت کشید نہیں کرتے۔"بات کے اختتام پر اس کے لفظوں میں ایسا کانچ در آیا کہ روبرو اک دوجے کو تاکتی ان کی آنکھیں جل اٹھیں۔

اسی پل مسجد کے داخلی دہانے سے ابھی ابھی اندر آئے مصطفین اور مریم نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر پکارا تو انہیں ادھر متوجہ ہونا پڑا۔اس کی ہمراہی میں تیز قدموں سے ان دونوں کی طرف بڑھتی ثومیہ نے شکر ادا کیا کہ ان کے آنے سے یہ گفتگو رک گئی ہے۔

☆......☆......☆

دھنراج ورما کے خدشات و توقعات کے عین مطابق اگلے روز گیتی مخالف مہم جوئی کو فروغ ملا اور ان کے شہر میں چھوٹی چھوٹی ریلیوں کی مانند ہوا شروع ہوا یہ احتجاج بڑے بڑے جلوسوں کی شکل میں ملک گیر سطح پر پھیلتا چلا گیا۔جگہ جگہ ٹریفک بلاک کر کے گیتی مخالف نعرے بازی کی گئی اور کئی جگہ تو باقاعدہ اس کے پتلے بنا کر نذرِ آتش کیے گئے۔کپادوکیہ ہوٹل میں ٹی-وی کے مختلف چینلز بدلتی وہ انتہائی تشویش سے یہ سب واقعات رونما ہوتے دیکھ رہی تھی۔ممبئی میں اس کے گھر کے باہر سیکیورٹی بھی بڑھا دی گئی تا کہ مشتعل مظاہرین دھاوا نہ بول دیں اور اس کے والدین شیتل اور وجے کمار ایک طرح سے اپنے ہی گھر میں محصور ہو کر رہ گئے۔وہ جلد از جلد اس کے پاس کپادوکیہ پہنچنا چاہتے تھے لیکن اس قدر مخالف ریلیوں سے بچ کر نکلنا ناممکن تھا۔ہاں وہ فون پر مسلسل ایک

دوسرے سے رابطے میں تھے اور حتی المقدور ایک دوسرے کو ڈھارس بھی دے رہے تھے۔ سیاسی محاذ پر اس کے والد کو بھی کافی کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ پارٹی میں اس کی مضبوط ساکھ کی بدولت اس کے حسد میں مبتلا دیگر سیاست دانوں نے ممتاز محمود کی خدمات لے کر گیتی کے مخالفت میں جو کھیل رچایا تھا اس سے اس کے مقام کو واقعی دھچکا لگا۔ اس کی بیٹی کو مشہورِ زمانہ، انتہا پسند تنظیم "ہند سینا" کی جانب سے دیش دروہی جیسے القابات سے نوازا جانا کوئی عام بات نہیں تھی۔ ایسے عالم میں کہ جب ہر طرف سے یہی صدا بلند ہو رہی تھی پارٹی کے اندرونی معاملات سے اس کی مکمل آگاہی ہونا کئی "ساتھیوں" کو خطرے والی بات لگ رہی تھی۔ ان کے زور دینے پر بالآخر پارٹی قیادت نے خصوصی فون کر کے فی الوقت اسے بس اپنے معاملات پر دھیان دینے کا کہا اور اس سارے معاملے کا کوئی بھی حتمی نتیجہ برآمد ہونے تک اسے پارٹی معاملات سے دفتری طور پر برطرف کر دیا گیا۔ اس سیاسی منظرنامے کے متعلق یہ سب خبریں بھی شہہ سرخیوں کا حصہ تھیں۔ دھنراج ورما صبح گیتی کو تسلی دلاسہ دے کر شوٹنگ کریو کو بسوں میں بھر کر آج کی شوٹنگ کے لیے نکل گیا تھا اور اس وقت صرف ناز اس کے ساتھ تھی۔

"چھوڑو گیت۔۔۔ بند کرو یہ سب دیکھنا۔ ہر جگہ سے ایک سی خبریں ہیں۔"

بالآخر مختلف چینلز پر یہ سب پریشان کن صورتحال دیکھتی ناز اٹھی اور چڑ کر ٹی۔وی کا پلگ کھینچ دیا۔

"ہم۔۔۔ کیا سے کیا ہو گیا ہے یار۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میڈیا اور قریبی لوگ ہی میری باتوں کو یوں غلط رنگ میں اچھالیں گے۔"

اس کی تائید میں یہ سب کہتے ہوئے، گھٹنوں پر ہاتھ دھر کر زور لگاتی وہ اٹھی اور ٹیرس میں نکل گئی۔ اس کا انداز اس سے نگاہ چرانے کا سا تھا۔

"کئی بار تو میں نے تمہیں سمجھایا یار۔۔۔ میں اسی سب سے ڈرتی تھی۔ یہ دنیا ہے گیت۔۔۔ یہاں ہر کوئی دلوں میں ایسا، تم سا پریم لیے نہیں پھرتا۔ سنسار کسی کی بات کو، کسی بھی طرح کر کے اپنی اِچھا سے موڑ ہی لیتا ہے۔"

اس کی حالت پر ترس کھا کر نرمی سے کہتی وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی۔

"واستو یار۔۔۔ من مرضی کی بھاشائیں ہیں سب کی۔۔۔ کون کسی کو روک سکے ہے۔۔؟؟"

آسمان کی وسعت میں تیرتے رنگ برنگے "ہاٹ ائیر بالونز" کو دیکھتی گیت نے یاسیت سے کہا اور واپس اس کی طرف مڑ کر مزید بولی۔

"چنتا نہیں کرو ناز۔۔۔وے ینگ (مذاق) بن کر بھی میں ٹھیک ہوں بالکل۔کیول میرے دل پر کوئی بوجھ تو نہ ہے۔"

پھر وہ انتہائی شکستگی سے مسکرائی تو ناز کے دل کو کچھ ہوا۔رویوں سے ٹوٹتی گائیتری دیوی کا یہ روپ اسے دل آزار کرنے کے لیے کافی تھا۔

"ایک بات کہوں گیت۔۔۔اس سمسیا کا اپائے یہی ہے کہ تم سیدھے سبھاؤ معافی مانگ لو۔دیکھو۔۔۔دور تک جانا ہو تو ایک بار پیچھے ہٹنے میں برا کیا ہے؟؟"

بہت رنجور لہجے میں نا چاہتے ہوئے بھی وہ ایسا مشورہ دینے لگی تو اس کی بات سن کر آنکھوں میں بے پناہ نمی لیے گیت نے پھر سے کلیساؤں کی شہر کی جانب رخ کر لیا۔اسے لگا تکونی سنگلاخ چٹانوں کی گہری بھوری رنگت سب کی سب اچھل کر اس کے دل پر آن بچھی ہے۔

" کس بات کی معافی یار؟ جو کام میں نے کیا ہی نہیں اس پر خود کو دوشی کیسے مان لوں میں؟ میں نے کہا نا کہ اس سب معاملے میں میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔"

شہر کے پتھریلے بلند دہانوں سے کھلتی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کو دیکھتی وہ مضبوط لہجے میں بولی تو ناز کو لگا اس کی آنکھوں سے "نیر" بھی جاری ہیں۔کہیں نہ کہیں اس کے باتوں میں آزردگی کی جھلک تھی۔

" دور جانا ہو تو پیچھے ہٹنا انیواری نہیں ہوتا ناز۔راستے بدل کر بھی گگن کو چھوا جا سکتا ہے۔پاکستان اسے محبت کرنے پر میں بھارت سے معافی نہیں مانگ سکتی۔۔۔یہ مجھ سے ہوگا ہی نہیں۔"

خوابناک لہجے میں کہتی گیت کے اندر گویا کوئی "جمنا" بولنے لگی۔

تقسیم کے قصوں میں پاکستان سے بچھڑ کر کہانی ہو چکی جمنا......

اس کی بات سن کر ناز کو صاف لگا کہ اس کی ضدیں زائل ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔پھر چار قدم بھر کر اس کے ساتھ رکتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بنا ناز نے دور تلک مناظر پر نگاہ دوڑائی اور پتھریلے شہر کے پار

اٹھتے گرد کے بے شمار جھکڑ دیکھ کر معنی خیز لہجے میں بولی۔

"چلو جیسا تم چاہو۔۔۔ پرنتو کالپنک وچاروں سے جلدی لوٹ آنا گیت۔ سنگلاخ شہر کے پار ریتلی گلیوں میں جابجا اڑتی دھول تمہاری راہیں تکتی ہے۔ آؤ سب بھلا کر ان سے ہو کر آتی ہیں۔"

اور اتنا کہہ کر اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ادھر موضوع بدل کر ملفوف وملفوظ لہجے میں دی گئی اس کی شہر گھومنے کی دعوت پر گیت نے ایک طویل سانس بھرا اور شانے جھٹک کر خود پر ضبط کرنے لگی۔

زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ "اندرون" کے بوجھل افکار سے "وقتی" چھٹکارہ پانے کے لیے ہم "بیرون" کی رنگا رنگ دنیا میں "ہمیشہ ہمیشہ" کے لیے کھو جانے کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔

☆......☆......☆

اس کے بعد وہ لوگ بادشاہی مسجد کے مختلف متبرکات گھومتے ہوئے اپنے اپنے رجسٹرز پر نوٹس کی شکل میں مختلف مشاہدات لکھتے رہے اور مقالے سے متعلقہ ابتدائی معلومات جمع کر کے کچھ دیر آرام کی غرض سے مسجد کے مرکزی ہال میں آ بیٹھے۔

"سنا ہے اس مسجد کا محراب درست سمت میں نہیں ہے۔ یعنی مقامِ کعبہ سے ہٹ کر ہے؟؟"

اپنا رجسٹر کھول کر وہاں درج معلومات پڑھ کر مریم نے کسی قدر حیرت سے کہا تو وہ سب بھی اچنبھے سے اسے دیکھنے لگے۔

"اچھا۔۔۔ بڑی حیران کن بات ہے۔ کس سے سنا تم نے؟؟"

ثومیہ نے متجسس لہجے میں سوال کیا۔

"سننا کس سے تھا؟ ظاہر ہے یہیں لوگوں سے معلومات لی ہیں۔ ادھر تبرکات دیکھتے ہوئے ایک جوڑے سے گپ شپ ہوئی تو انہوں نے بتایا۔"

وہ کسی قدر برا مناتے ہوئے بولی تو ثومیہ ہنس دی۔

"اچھا بابا یونہی پوچھ بیٹھی غصہ تو نہیں کرو۔ اور یہ سب افواہیں ہوتی ہیں یار۔ ابھی ڈیجیٹل کمپاس ہو کسی کے

موبائل میں تو محراب سے تقابل کرتے ہوئے 270 ڈگری چیک کرلو کہ کس سمت میں ہے۔ پاکستان میں ہر کہیں نماز 270 ڈگری پر پڑھی جاتی ہے۔ یہ درجہ کعبے کی درست ترین سمت بتاتا ہے۔"

اس نے بھر پور اعتماد سے کہا تو اس کی معلومات سے متاثر ہو کر اب تک خاموشی سے ایک دوسرے اور ان کی بھی شکلیں دیکھتے لڑکوں میں سے مصطفین بول اٹھا۔

"واؤ۔۔۔ دیٹس گریٹ ثومیہ۔ یقیناً تم ہر دور میں ایک ذہین سٹوڈنٹ رہی ہو۔"

اور اس کی بات اچک کر سب کو باری باری دیکھتا سفیر تیزی سے بولا۔

"لیکن ایک دوسرے کو ذہانت کی یہ داد بعد میں دیں گے دوستو۔۔۔ پہلے کچھ کھانے کا پلان کرو۔ اتنا گھوم گھوم کر میری تو اب بھوک بھی ناچنے لگی ہے۔ پلیز۔۔۔"

اس نے پیٹ پر یوں ہاتھ رکھا کہ اس کے چہرے پر طاری مظلومیت دیکھتی مریم نے دھپ سے رجسٹر بند کیا اور اسے گھور کر بولی۔

"لو جی۔۔۔ لگ گئی لاٹری۔ ایسے کمزور معدہ لوگ سر کو میرے گروپ میں ہی رکھنے تھے۔ ایسے تو بن چکا مقالہ۔ خیر۔۔۔ کیا کھانا ہے حضور۔ ارشاد کیجئیے۔"

اس کے جھنجلائے ہوئے لہجے پر ثومیہ اور مصطفین نے ایک بلند تر قہقہہ لگایا جبکہ وہ بھر پور ڈھٹائی سے دوبارہ بولا۔

"یعنی اب اس گروپ میں شمولیت کا مقصد یہ ہے کہ بھوک لگے تو بھی چپ رہا جائے؟ سوری گائیز۔۔۔ یہ قربانی مجھ سے تو نہیں دی جائے گی۔ اور اٹھو سب باہر کینٹین سے کچھ کھاتے ہیں۔ اس کے بعد آ کر مجھے اسی مرکزی ہال کی اونچی چھتوں کی بناوٹ نوٹ کرنی ہے۔ آپ لوگ بھی آج کا کام ختم کرنا فٹافٹ اس کے بعد واپسی ہوگی۔"

بیگ اٹھاتا وہ کھڑا ہو کر مصطفین کو بھی کھینچنے لگا تو ان سب کو بھی اٹھنا ہی پڑا۔

پھر باہم نوک جھونک کرتے ہوئے انہوں نے مسجد سے باہر نکل کر ایک کینٹین میں کھانا کھایا اور وہیں بیٹھ کر اب تک جمع شدہ مختلف معلومات پر ایک دوسرے سے صحت مندانہ مباحثہ کرتے رہے۔ وہ سب خوب گھل مل

چکے تھے۔ایک دوسرے کی ہمراہی کے لطف وکرم سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سب ایک خاص پہلو سے اپنے اپنے خیالات کو تھپکیاں بھی دے رہے تھے۔ سفیر کی شوخ نظروں سے گریز برتتی ثومیہ درِاندرون ہی کہیں مصطفین کی چاشن گر نگاہوں کی طالب تھی اور سفیر مسلسل اس کا خود سے اجتناب جانچ رہا تھا۔جبکہ مریم نہایت غیر جانبداری سے ان سب کے باہمی رویہ جات پر غور کر رہی تھی۔ بنا بتائے ہی اسے ان کی کہانی کا اک ایک جزو بخوبی سمجھ آ رہا تھا۔

کہانیوں کی ایک خاصیت ہوتی ہے کہ یہ خود میں در آئی خاموشیوں سے بھی چھن چھن کر پورے ماحول میں بہنے لگتی ہیں۔

بالآخر کافی دیر بعد وہ لوگ وہاں سے اٹھ کر واپس مسجد میں آ گئے اور طویل صحن عبور کر کے مرکزی ہال میں داخل ہوئے جہاں باقاعدہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہاں قارئین کو بتاتا چلوں کہ بادشاہی مسجد فی الوقت مسجد سے زیادہ ایک تاریخی مقام اور سیر گاہ کی سی اہمیت رکھتی ہے اور یہاں مرکزی ہال کے علاوہ کسی بھی جگہ مسجد کے تقدس کا باقاعدہ خیال نہیں کیا جاتا۔لوگ اس مسجد کی طویل راہداریوں میں بھاگتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں اور ایک دوسرے سے بھرپور ہنسی مزاح کرتے ہیں جو کہ عام مساجد کے آداب کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں مانع بھی ہوتا ہے۔

وہ لوگ بھی ہال کے مرمریں فرش پر نہایت ادب سے چلتے ہوئے اس کے در و دیوار پر لگی مختلف تختیوں سے اس کی تاریخ وارتقا سے متعلقہ اہم معلومات جمع کر رہے تھے۔ سفیر کو ان بلند تر چھتوں کی منفرد طرزِ تعمیر اور ان پر بنے خوبصورت نقش و نگار کے بارے جاننے میں دلچسپی تھی۔اسی حوالے سے ان تینوں کو مسجد کی بنیاد اور ارتقائی عوامل پر گفتگو کرتے چھوڑ کر غیر محسوس طریقے سے وہ ان سے الگ ہوا اور مرکزی ہال میں گھومتے گھماتے ایک گائیڈ کو لے کر اس سے مختلف سوال کرتا طویل راہداریوں میں داخل ہو گیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ڈگ بھر کر راہداریوں کے آخری اور گیٹ کی طرف سے داخل ہونے پر پہلے سرے تک جانے میں اس نے اس گائیڈ سے کئی اہم تر معلومات حاصل کیں اور اسے کچھ پیسے دے کر الوداع کہتا اسی لکیر پر واپس چلنے لگا۔

"وہ مجھے نظر انداز کیوں کر رہی ہے یار۔۔؟ کیا اظہارِ محبت کر کے میں نے اسے خود سے دور کر دیا

ہے؟؟"

ثومیہ کے رویے سے متعلق اس کی ذہنی رو بھٹکی تو اس کے قدم سست پڑنے لگے۔کوئی ساتویں یا شاید آٹھویں راہداری میں رک کر اس نے دور دور کھڑے دو تین رومانی جوڑوں کی طرف دیکھا اور ایک منقش کالم کی تراشیدہ سطح پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کی تمام تر سختیاں اپنی نرم پوروں میں جذب کرنے لگا۔ پھر صحن کی طرف کھلتی سیڑھیوں پر رک کر اس نے دور مرکزی ہال کی طرف نگاہ کی اور وہاں داخلی دہانے پر دونوں جانب لگ کر الگ الگ کھڑے مصطفین ،مریم اور ثومیہ کو دیکھتا وہ پھر سے بے قرار ہونے لگا۔کسی بات پر بے ساختگی میں ہنستی ثومیہ مسجد کی دیوار سے لپٹ رہی تھی۔

"تمہاری اسی ہنسی نے مجھے باندھ لیا ہے ثومیہ۔۔۔خدارا میری محبت پر یقین کرلو۔"

سرگوشیوں کی مانند ہواؤں کے رتھ پر اپنی چاہتیں دھر کر وہ تیزی سے پلٹا اور راہداری میں چند قدم چل کر مینارِ پاکستان کی جانب کھلتے دہانے پر آن رکا۔یہاں کسی بھی قسم کی گراوٹ سے بچنے کی خاطر لگائی گئی سنگِ مرمر کی جالیوں میں ہاتھ پھنسا کر اس نے اس قدر زور سے بھینچا کہ گویا دل میں جاگزیں ہوا ہر ایک جذبہ نچوڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"یا خدا مجھے پتھر کر دے۔۔۔"

سلگتی جاں پر رحم کھا کر اس نے پورے دل سے دعا مانگی اور مینارِ پاکستان کی اونچی چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔وہ سکون محسوس کرنا چاہتا تھا۔

ادھر باہم مصروف ان تینوں کو ذرا دیر بعد اس کی غیر موجودگی کا ادراک ہو سکا۔

"ارے۔۔۔سفیر کدھر گیا؟"

کسی بات پر بے طرح ہنستی ثومیہ نے ہنسی روک کر ارد گرد دیکھتے ہوئے اچانک پوچھا تو وہ دونوں بھی حیران ہوئے۔

"یہیں کہیں ہوگا۔جائے گا بھلا کہاں؟ رکو میں دیکھتی ہوں۔"

مریم داخلی دہانے کی دیوار سے ہٹ کر مرکزی ہال میں داخل ہوئی اور سامنے سامنے ہی گھوم پھر کر اسی پل

واپس بھی آ گئی۔

"اندر ہال میں تو وہ کہیں نہیں ہے۔"

اس نے کسی قدر پریشانی سے کہا تو مصطفین ہنس دیا۔

"اچھا کوئی بات نہیں ابھی آ جاتا ہے۔ بچہ تو ہے نہیں وہ کہ گم ہو جائے گا۔"

اس نے بے پرواہی سے کہا اور یک لخطی توقف سے ان دونوں کے بولنے سے قبل مزید بولا۔

"یا ایسا کرو تم دونوں وہاں تبرکات کے سامنے رکو میں اسے ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔"

جواباً صرف "اوکے" کہہ کر اپنے اپنے بیگ اٹھاتی وہ دونوں مرکزی ہال سے نکل کر داخلی دروازے کے ساتھ واقع تبرکات کی جانب بڑھیں تو راہداریوں کی طرف رخ کرتے مصطفین نے دوبارہ پکارا۔

"اور سنو۔۔۔اب تم دونوں نہ کھو جانا کہیں پلیز۔ یہ نہ ہو اسے ڈھونڈ کر پھر ہم دونوں کو تمہیں بھی ڈھونڈنا پڑے۔"

اس پر وہ دونوں کھلکھلائیں اور مریم خوشدلی سے بولی۔

"سچی جتنا تم بولتے ہوناں۔۔۔اس سے آدھا چپ بھی رہو تو بات بن سکتی ہے۔ارے جاؤ بابا وہیں ملیں گی ہم۔"

مزید ایک قہقہہ لگا کر وہ پلٹ گئیں تو اس کی بات سے حظ اٹھا کر وہ شائستگی سے مسکرا دیا۔ پھر سفیر کی تلاش میں دائیں بائیں دور تلک نگاہ دوڑا کر وہ راہداریوں میں داخل ہو گیا۔

یہاں کا کونہ کونہ چھانتا وہ دل ہی دل میں حیران ہوا کہ سفیر گیا کدھر ہے؟ ان دونوں کے باہم رویے سے یہ بات اس نے بھی محسوس کی تھی کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیونکہ ثومیہ اسے کافی محتاط لگی تھی۔ سفیر کی اس کے لیے محبت جاننے کے بعد اپنے جذبات کو تو اس نے کچل ہی دیا تھا۔ وہ اس کے دوستی پر بھروسے کے دعوؤں کی لاج رکھنا چاہتا تھا۔

"تاریخ گواہ ہے کہ محبت کی ہر لازوال کہانی کو کسی نہ کسی عظیم تر دوستی کی ڈھارس ہے۔۔۔"

"تم میرے زندگی بھر کے پہلے دوست ہو مصطفین۔ تم سے ملنے سے قبل میں نے دوستی کو صرف ایک لفظ

کے طور پر پڑھا تھا۔ تم سے مل کر میں ان حروف کے "احساسات" سے بھی آشنا ہو گیا ہوں۔۔۔"

اس کے منہ سے نکلے ایسے جملوں نے اسے کسی عہد سے باندھ رکھا تھا جسے وہ بہر طور اور بہر صورت نبھانا چاہتا تھا۔ وہ اس شخص کا یقین نہیں توڑ سکتا تھا کہ جس نے ابھی ابھی اپنے خول سے باہر آ کر دوسروں پر یقین کرنا سیکھا تھا۔

انہی سب خیالات سے الجھتا وہ اس راہداری میں پہنچا تو سفیر کو جالیوں پر گرفت کر کے آنکھیں موندے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کے انداز سے عجب سا کوئی اضطراب جھلکتا تھا۔ گویا کوئی کسی سکون کا طالب ہو۔ اس کی کیفیت ڈھالنے کے لیے آہستگی سے چل کر وہ اس کے بالکل قریب آیا اور یکدم دونوں بازو پیچھے سے اس کے سینے پر لپیٹ کر اسے بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے دائیں کان میں سرگوشی کی۔

" کہاں گم ہو شہزادے۔۔۔؟ یوں لگتا ہے کہیں راستہ بھٹک گئے ہو۔"

اور اس کے یوں اچانک آ لپٹنے پر بے تحاشا چونکا وہ اس کی آواز سن کر بے ساختہ مسکرا بھی دیا۔ پھر اپنی سوچیں جھٹک کر اسے نرمی سے ہٹاتا وہ اس کی جانب پلٹا۔

" آ گئے تم؟ وہ دونوں کدھر ہیں؟ اور منزل کی جستجو اس قدر ہے یار کہ راستوں کی خبر ہی نہیں رہی۔ مجھے لگتا ہے میں سچ مچ راستہ بھٹک گیا ہوں۔ اب جانے منزل ملے کہ نہیں؟؟"

سرسری طور پر ان کے متعلق پوچھتا وہ کسی قدر اداسی سے بولا تو خاص اذکار کا ماہر مصطفین اس کے لفظوں سے کہانی اخذ کرنے لگا۔

" وہ تبرکات کے سامنے انتظار کر رہی ہیں ہمارا اور میں تمہیں تلاشنے آیا ہوں۔"

کچھ توقف سے اس نے ان دونوں کی بابت بتایا اور پھر نہایت فرصت سے بڑھ کر اسی کی طرح جالیوں سے لگتا مینارِ پاکستان کی طرف دیکھنے لگا۔

" منزلیں اگر دور بھی ہوں تو شفاف راستوں کی موجودگی تقویت کی باعث ہوتی ہے سفیر۔۔۔ کوشش کرنا منزل کہیں بھی ہو لیکن راستوں کا انتخاب عمدہ ہو سکے۔"

اس کی بات پر وہ شکستگی سے ہنس دیا تو مڑ کر اس کا ہاتھ تھامے وہ راہداریوں میں چلتا ہوا باہر کی سمت بڑھا۔

" کیا بات ہے سفیر؟ بڑے دل گرفتہ سے لگتے ہو؟ ثومیہ سے کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

چلتے چلتے اس نے رازدارانہ لہجے میں سوال کیا تو اپنا ہاتھ چھڑواتا وہ یکا یک پھر سے رک گیا۔

"ہاں یار۔۔۔ میں نے اس سے بہت طریقے سے بات کی ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔لیکن اس نے مجھے ڈپٹ دیا اور کہا کہ میں صرف اس کا دوست ہوں اور بس۔۔۔ اور اس کے بعد سے اس کا رویہ تو شاید وہی ہے میرے ساتھ لیکن لہجہ ضرور بدل گیا ہے۔"

دھیمے لہجے میں اس نے پوری بات بتائی تو سب جانتے ہوئے بھی مصطفین کو حیرت کا جھٹکا لگا۔سرد ہواؤں سی اس لڑکی کے ساتھ گذرا اک ایک پل ایک لمحے میں اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

" کیا پتا یہ صرف تمہارا وہم ہو اور وہ بالکل نہ بدلی ہو؟ وہ ایسا کچھ بھی نہ سوچ رہی ہو جیسا تم سمجھ رہے ہو کہ وہ گریزاں ہے تم سے۔لڑکیوں کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے بھرپور وقت درکار ہوتا ہے میرے دوست۔وہ ہماری طرح جلد باز نہیں ہوتیں۔"

بالآخر اپنا آپ سمیٹ کر فرضِ دوستی ادا کرتے ہوئے اس نے اسے تسلی دی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتا اپنی بات کے اثرات ناپنے لگا۔اس کی بات پر ساتھ ساتھ نفی میں سر ہلاتا وہ بنا توقف کے بولا۔

" لیکن یار لوگوں کے لہجے ان کے بدلنے کا پتا دیتے ہیں۔ہاں یہ لفظ ہی تو ہوتے ہیں جو کسی کی ذات میں در آیا تبدل عیاں کر دیں۔تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟؟"

اس کے لہجے میں ہزار ہا بے تابیوں کی جھلک تھی۔یوں گویا رویوں سے پگھلتا کوئی فرد کسی کے بھی حرفوں سے سکوں چاہے۔اس پل محبت کے لیے بلکتا یہ بھرپور مرد پورے منظر میں ادھورا تھا۔

" لوگوں نے اگر بدلنا ہو تو لفظ یا لہجہ نہیں۔۔۔ سب سے پہلے وہ "صورتیں" بدلتے ہیں۔اجنبیت کا غلاف پہن کر۔۔۔ غیریت کا لحاف اوڑھ کر۔۔۔ لہٰذا تم کسی کے لفظ یا لہجہ مت پرکھو۔تم سب کی صورتیں پڑھنا سیکھ جاؤ بس۔تمہیں لوگوں کی پہچان ہو جائے گی۔۔۔ ارے یہ لہجوں اور لفظوں کا ہنر تو صرف اپنوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔جن سے بدل کر انہیں "غیر" کرنا ہو ان سے بس "رخ" بدلتے ہیں۔۔۔"

جواباً نرم لہجے میں بھرپور قطعیت سے یہاں تک کہتے مصطفین نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے کی طرف

قدم بڑھائے۔

"ساری فکریں بھول کر تم چلو یار م۔۔۔ میرے خیال سے تم بے وجہ پریشان ہو رہے ہو۔ وہ شاید تھوڑی جھجک کی شکار ہے تم سے۔ اپنے پیار سے اسے متوازن کر لینا اور بس۔۔۔ اس کے چہرے سے مجھے بالکل نہیں لگا کہ وہ تم سے بدل گئی ہے۔ ہمم۔۔۔"

تیز تیز چلتے ہوئے تسلی بخش انداز میں اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا تو وہ ایک طویل سانس بھر کر رہ گیا۔ پھر میکانکی انداز میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا وہ پورے جذب سے بولا۔

"تو بہت اچھا ہے یار۔۔۔ مجھے تجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ بالکل سچ۔۔۔"

اور اس کی بات پر ایک پل کو رک کر اسے دیکھتا یہ کہتا ہوا وہ پھر سے چلنے لگا۔

"ایک تو تم اور تمہاری یہ محبت۔۔۔ سرِ عام ہوئے پھرتے ہو قسم سے۔ کبھی اس سے ہو رہی ہے تو کبھی مجھ سے۔ الٰہی بچانا تو ہی۔۔۔"

اس کا شریر لہجہ بلا کا شوخ ہوا تو ساری کلفت بھول کر سفیر نے ایک بلند تر قہقہہ لگایا۔ پھر یونہی ہنستے مسکراتے راہداری کی داخلی سیڑھیاں اترتے وہ دور کھڑی مریم اور ثومیہ کی جانب بڑھنے لگے۔

اور ان کے چہروں پر پھیلے دوستی کے رنگ پڑھتی مریم مستقبل کی آہٹیں سن سن کر بے طرح پریشان ہوئی۔

بلند و بالا چٹانوں پر مشتمل وادی مونکس کی اونچی نیچی اور ڈھلوانی گلیوں میں جابجا غار جیسے گھروں کے دہانہ نما دروازے کھلتے ہیں۔ یہاں کا موسم زیادہ تر معتدل رہتا ہے لیکن موسم گرما میں اکثر یہی معتدل درجہ حرارت بڑھ کر 38 سینٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے۔ اس قصبے کی غالب بھوری رنگت کی حامل گلیوں میں خوبصورت جسامت کے مالک وجیہہ و دراز قد لڑکے اونٹوں کی مہاریں تھامے ادھر ادھر گشت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ترکش جوان سیاحوں کو ان اونٹوں پر سوار کر کے یہاں کا تہذیب و ورثہ گھماتے ہیں اور یہ کام ان کی کمائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ پچھلے ایک گھنٹے سے انہی پتھریلی اور تنگ گلیوں مسلسل چکراتے ہوئے اپنے افکار میں گم رہ کر ان دونوں نے بہت کم ایک دوسرے سے گفتگو کی تھی۔ ناز اسے شوبز کے متعلق بہت کچھ کہنا بلکہ سمجھانا چاہتی تھی لیکن ہوٹل سے نکلتے ہی گیتی نے اسے پیدا ہوئے پریشان کن حالات کے بارے میں مزید بات کرنے سے روک دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس پر خود سے سوچنا چاہتی ہے۔ ادھر ناز کے پاس بھی سوچنے کو بہت کچھ تھا لہٰذا اس دوران ان کے مابین زیادہ تر خامشی نے رقص کیا۔ بالآخر ایک چرچ سے نکل کر اس کے اونچے اونچے کلیسائی میناروں کی طرف دیکھتی وہ لوگ قصبے کے مرکزی بازار کی جانب بڑھنے لگیں تو ایک پتھریلی دیوار کے آخری کنارے سے ٹکتی ناز نے تھکے تھکے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"اور کتنا چلو گی گیت۔۔۔؟؟ میں تھک گئی ہوں۔ کہیں تو رک جاؤ پلیز۔۔۔"

اس کی آواز پر دوسری گلی کا موڑ مڑتی ہوئی گیت بے ساختہ رک گئی اور جواباً عجب یاسیت سے شانے جھٹکتے ہوئے اس کا انداز شاید اس سے بھی کہیں زیادہ تھکان لیے ہوئے تھا۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم دل کے خاص تر خانوں میں نہاں دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتے اور ہم سے بہت پیار ہونے کے باوجود۔۔۔ وہ بھی ہماری ان تھکانوں سے بے خبر و انجان رہتے ہیں۔

"ہاں سچ کہتی ہو۔ اب کہیں تو رکنا ہوگا۔۔۔ کہ تھکنے تو میں بھی لگی ہوں۔"

کچھ توقف سے اس کے قریب آ کر اس نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے چلتے ہوئے گلی کا موڑ پار کر گئی۔

" آخر تم سوچ کیا رہی ہو یار؟ کب سے چپ چپ ہو۔۔۔"

اس کا شکستہ انداز پڑھ کر اس کی ہمراہی میں چلتی ناز نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

" یہی سوچ رہی ہوں کہ "نیا" کیا سوچوں؟؟ ایک سی سوچوں سے اب فرار چاہتی ہوں۔"

جواباً اس کی طرف رخ کر کے اسے اپنی آنکھیں پڑھنے کی اجازت دیتے ہوئے اس نے انتہائی یاسیت سے کہا اور پھر دور اس گلی کے ابتدائی سرے سے ایک اونٹ بردار لڑکے کو داخل ہوتے دیکھتی مبہم ہنکارا بھر کر مزید بولی۔

" آؤ اس ترک سے ملتی ہیں۔ اور دیکھو تو یہ کتنا حسین ہے۔ ترک مرد واقعی بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔"

بات مکمل کر کے اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی وہ تیزی سے اسی سمت بڑھی تو واضح طور پر اس کا موضوع بدلنا محسوس کر کے وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

" اب بس بھی کرو گیت۔۔۔ "اور" کتنی گفتگوئیں بدلو گی؟؟ تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ سوچوں سے فرار ممکن نہیں ہوتا۔ ہم سے وابستہ کوئی بھی پہلو اس قدر عام نہیں ہوتا کہ اس سے پہلو تہی کی جائے۔ کوئی ایک بھی نہیں۔ میرے خیال سے تمہیں کھل کر بول لینا چاہیئے۔ من ہلکا ہو جائے گا۔"

اسے واپس کھینچ کر اپنے مقابل ٹھہراتی وہ بھرپور ہمدردی سے بولی اور پھر اس کی آنکھوں میں یکا یک جل اٹھا درد چھان کر نگاہیں چراتی ہوئی کپادوکیہ کی فضاؤں میں جا بجا رقصاں رنگ برنگ "غبارے" دیکھنے لگی۔

ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی کہ دوستوں کو ڈھارس دیتے ہوئے ان کا بے پناہ کرب جانچ کر ہمارے مضبوط لہجے بھی کھوکھلے سے ہونے لگتے ہیں۔

اب اسے نگاہیں پھیرتے دیکھ کر اسے عمیق تر نظروں کے حصار میں رکھتی، دو قدم بڑھ کر وہ اس کے انتہائی قریب ہوئی۔

" من کا ہلکا ہونا ہمیشہ "بول لینے" سے مشروط نہیں ہوتا سہیلی۔۔۔ زندگی اکثر اس مقام پر لے آتی ہے کہ چپ رہ کر سب کچھ رونما ہوتے۔۔۔ ہمیں بس "دیکھنا" ہی ہوتا ہے۔ اور اس خاموشی یا صبر کو جھیل کر جو اطمینان

ہمارے اندر اترتا ہے اس پل وہی ہمارا کل کا کل حاصل ہوتا ہے۔ یقین کرو خاموش رہ کر ہی ہم اندر سے مضبوط ہوتے ہیں۔"

جواباً نرم لہجے کے مدھم زیر و بم میں اس نے ایسے ایسے راز کہے کہ ناز کو لگا آس پاس موجود سنگلاخ چٹانوں کی تمام تر سختی و مضبوطی اس کی ذات میں در آئی ہے۔ اس دوران اونٹ بردار وہ ترک لڑکا ان کے بہت نزدیک آ گیا تو گلی تنگ ہونے کی بدولت انہیں تقریباً دیوار سے لگ کر اسے راستہ فراہم کرنا پڑا۔ ان کے پاس سے گذرتا وہ پیشہ ورانہ انداز میں مسکرایا تو سر کو تھوڑا سا خم دے کر انہوں نے بھی جواباً تعظیم کی اور اس کے گذرتے ہی آگے بڑھنے لگیں۔ ناز کو خود اذیتی کی سی حالت و کیفیت میں مبتلاء ▯ گیتی کے چور لہجے نے بہت رنجور کیا۔ وہ اسے ملال زدہ اور مغموم نہیں دیکھ سکتی تھی۔

" کبھی کبھی میں سوچتی ہوں زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ جہاں سے چاہے مڑ جاتی ہے۔۔۔ جو مرضی کروٹیں بدلتی ہے۔ کہیں کے انسان کو اٹھا کر کہیں پہ لا پٹختی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان ترکوں کے درمیان ہم اتنی فرصت سے گھومیں گی۔ یوں ہے ناں گیت۔۔۔؟ کہ گویا کرنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔"

ایک ڈھلوانی دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلتی کچھ دیر بعد وہ مزید تو گیت بے کلی سے ہنس دی۔ پھر وہ بڑھی اور دوسری جانب موجود دیوار پر اسی کے انداز میں ہاتھ پھیرتی، یہ کہتی ہوئی آگے چلنے لگی۔

"بس کرو یار۔ ایک ہی بات کو اور کتنا سوچو گی؟؟ اب جانے بھی دوناں۔۔۔ کہ ایک ہی تو زندگی ہے۔ ایسا بھی کیا "ملال" کہ اس کے لیے دل ہی بنجر کر دو۔ ساری فکریں بھول کر بس کپادوکیہ کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے تمہیں یہ سب فرصتیں عطا کی ہیں۔"

اور یہاں ایک دوسرے کے ساتھ لیکن مخالف و متوازی سمتوں میں چلتی ان گہری سہیلیوں نے ایک دوسرے کو عمیق تر نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ ایک دوسرے کی گفتگو کے اوزان ماپ رہی تھیں۔ چند لمحات وہی پہلے کی سی خاموشی طاری رہی اور اسی "چپ زدہ" سی حالت میں گھری وہ دونوں تنگ گلیوں سے نکل کر ایک وسیع بازار میں داخل ہوئیں جس میں گلی کے بالکل سامنے "خیابانِ اصفحان" کا بورڈ آویزاں تھا۔ بازار کا فرش پتھر کی بجائے ٹف ٹائلز کی عمدہ ترتیب سے بنا ہوا تھا اور یہاں بھوری گلیوں کی خشکی و ویرانے کی نسبت رنگ برنگ

سیاحوں کا ہجوم جلوہ افروز تھا۔ یک لخت ماحول میں در آئی یہ تبدیلی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"چلو چھوڑو یار سب کچھ۔۔۔ آؤ جوس پیتی ہیں۔ میرا گلا خشک ہو گیا ہے ان پتھروں میں چل چل کر۔"

بازار کی رونق دیکھتی ناز نے خوشدلی سے موضوع بدلا اور لپکنے کے سے انداز میں ایک جوس کارنر کی طرف بڑھی۔ شا نے جھٹک کر آہستگی سے قدم اٹھاتی وہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔ جوس کارنر کے باہر عام ایشیائی ممالک کی طرح فٹ پاتھ پر نہایت قرینے سے سجائے گئے میزوں کے گرد مختلف النسل سیاح باہم خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ان کے خوش رنگ چہروں سے جھلکتی طمانیت اس بات کی غماز و عکاس تھی کہ سیاحت کے لیے بلند کلیساؤں کے اس پتھریلے شہر کا انتخاب کر کے وہ انتہائی مسرور ہیں۔ وہ جہاں بیٹھیں ان سے تقریباً بیس سے پچیس میٹرز کے فاصلے پر ایک خوبرو ترکش لڑکا شرٹ اتارے اپنے خوبصورت کسرتی بدن کی بھرپور نمائش کرتے ہوئے گٹار بجا رہا تھا اور اس کا ساز سچ مچ راس رسیلا تھا۔

آرڈر ٹیکر آیا تو ایک اچٹتی ہوئی نظر اس کا لوفرانہ حلیہ و انداز دیکھ کر گیت اسی گٹار بجاتے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی جو کہ اسے بالیاں پہنے، بازوؤں اور گردن پر بے شمار ٹیٹوز کھدوائے ہوئے اس آرڈر ٹیکر لڑکے کی نسبت بہتر نظارہ لگا۔

وہ آنکھیں موندے پورے جذب سے گٹار بجا رہا تھا اور ایک ردھم سے آگے پیچھے ہلتے ہوئے اس کی گلابی انگلیاں بڑی ترتیب سے گٹار کے تاروں پر تھرک رہی تھیں۔ ماحول میں بکھرتی اس کی مدھر دھنیں گویا کوئی فسوں طاری کر رہی تھیں اور ان کے سحر سے بندھ بندھ کر آتے جاتے سیاح فٹ پاتھ پر اس کے سامنے دھرے "کاؤ بوائے ہیٹ" میں پیسے اور سکے اچھالتے جا رہے تھے۔ اسے بے تحاشا مگن دیکھ کر پہلے گیت کے شنگرفی لبوں پر بے طرح مسکان جاگی اور پھر جانے کیا ہوا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تم کیوں ہنس رہی ہو جی؟؟ اور وہ بھی یوں کہ گویا ساری فکروں سے واقعی امان مل گئی ہو۔۔۔"

آرڈر کر کے ابھی ابھی اس متوجہ ہوئی ناز نے اسے یوں شدت سے ہنستے دیکھا تو کسی قدر حیرت سے سوال کرنے لگی۔

"یونہی ناز۔۔۔ اچھا لگتا ہے آج کل "زندگی" پر پورے دل سے بس ہنستے رہنا۔"

جواباً یہ کہہ کر ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے کہنی میز پر ٹکائی اور دوسرے ہاتھ سے اس گٹارسٹ کی جانب اشارہ کرتی ہوئی مزید بولی۔

"وہ دیکھو۔۔۔کتنی بے فکری ہے ناں اس کے چہرے پر۔لیکن اس کے ساز سنو۔۔۔کس قدر مضطرب سے ہیں۔ایسا ہی ہوتا ہے ناز کہ چہرے ساکن بھی ہوں تو اندر طوفان پلتے ہیں۔"

اس کے بھیدوں بھرے لہجے پر وہ بے ساختہ اس کے اشاروں کے تعاقب میں نکل گئی اور پھر اس گٹارسٹ کے خوبصورت چہرے پر پھیلا سکون پڑھتی دھیمے لہجے میں بولی۔

"زندگی پر پورے دل سے ہنستے ہوئے کیا سچ مچ تمہیں لگتا ہے کہ یوں تم جی رہی ہو؟ ایسا نہیں ہوتا ہے گیت۔ساکن چہروں پر اتنا اضطراب مت کھوجو کہ سارے طوفان تمہارے اندر آن بسیں۔جینے کے لیے اکثر بے حس بھی ہونا پڑتا ہے۔"

بات مکمل کر کے اس کا چہرہ چھو کر اس نے اپنی طرف موڑ لیا تو اس کی بات نے اس پر گویا کوئی طلسم ہی پھونک دیا۔اس کی شفاف تر آنکھوں میں یکا یک کوئی کانچ بکھر گیا جسے چھپانے کی کوشش میں اس نے گردن اچک کر اس کے ہاتھ سے اپنا چہرہ آزاد کروایا اور نظریں جھکا کر مغموم لہجے میں بولی۔

"یہ بھی خوب کہی کہ جینے کے لیے اکثر بے حسی ضروری ہے۔لیکن یہ "جینا" بھی بڑا عمیق لفظ ہے ناز۔۔۔اس کے مفاہیم کبھی کوئی سمجھا ہی نہیں شاید۔۔۔سچ بات تو یہ ہے کہ ہم کبھی بھی جی نہیں رہے ہوتے۔ہم تو بس مر رہے ہوتے ہیں۔دھیرے دھیرے۔۔۔ذرا ذرا کر کے۔"

اس پل بغور اس کا اداس تر لب و لہجہ سنتی ناز کو لگا کہ گیتی سچ مچ مر رہی ہے اور یونہی کہ جیسے وہ کہہ رہی ہے۔دھیرے دھیرے۔۔۔ذرا ذرا کر کے۔

کچھ کہنے کو کھلے ناز کے لب بس تھرا کر رہ گئے اور اس سے قبل وہ کچھ بھی کہتی گیتی نے سر اٹھا کر اس کے ماتھے پر بکھری فکر کی لکیریں دیکھیں اور اس کا ہاتھ دباتی ہوئی انتہائی نرمی سے بولی۔

"فکر مت کرو سہیلی میں ٹھیک ہوں بالکل۔جانے کیوں آج ایسی جذباتیت سے لپٹ رہی ہوں کہ تمہیں بھی پریشان کر دیا۔لیکن یقین کرو یہ

سب شکستگی صرف آج کے لیے ہے۔آج کے بعد تمہیں ویسی ہی گیت ملے گی جیسی تم ہمیشہ سے دیکھتی آئی ہو۔چلوشاباش اب جوس پیو۔"

پرعزم لہجے میں کہہ کراس نے جوس کا گلاس لبوں سے لگایااور واپس اس گٹارسٹ کی طرف دیکھنے لگی جواب گٹارایک طرف رکھے اپنی" کمائی" گن رہا تھا۔ادھر بغوراس کی مصروفیات ودلچسپیاں دیکھتی ناز کولگا کہ واقعی اسے سنبھلنے میں کچھ وقت درکار ہے۔

☆......☆......☆

واپس گھر پہنچ کرایک طویل نشست میں اچھی خاصی بحث کے بعدوہ خالہ کنیزکوبھی اس بات پرقائل کرنے میں کامیاب رہا کہ وہ خالوظفر کے کاروبار میں شراکت کی بنیاد پررقم لگائے گا۔تین بجے کے قریب وہ شاہ عالم مارکیٹ میں واقع خالو کی دکان پرچلا گیا جہاں اس نے ان کے کاروبار میں اپنی انویسٹمنٹ سے متعلقہ ضروری امور طے کیےاوراللہ کا نام لے کرایک مناسب وخطیررقم خالو کے حوالے کرکے مطمئن ہوگیا۔وہ دل سے خوش تھا کہ اس کی ترکیب کامیاب رہی اوروہ ان کے کام آسکا ہے۔دکان سے واپسی پراپنے دوسرے ارادے کی تکمیل میں اس نے ایک عدد بائیک خریدی اور گورمے سے مٹھائی پیک کرواتا ہوا گھر آ گیا۔وہ دروازہ کھول کر بائیک اندر گذارر ہا تھاجب لاؤنج کا دروازہ کھول کرخالہ اورایمان ایک ساتھ صحن میں آئیں۔کنیزبیگم نے اسے بائیک کے ساتھ دیکھاتو بے ساختہ حیرت ومسرت کااظہارکیا۔

"ماشاءاللہ۔لگتا ہے نئی موٹرسائیکل لایا ہے مصطفین۔چل آ دیکھتی ہیں۔"

ایمان کوبازو سے کھینچتے وہ تیزی سے اس کی طرف آئیں جوانہیں دیکھتا مسکراتے ہوئے بائیک اسٹینڈ پرلگا رہا تھا۔

"جی خالہ۔نئی لایا ہوں۔یونیورسٹی بہت دور پڑتی ہے ناں۔تولوکل تھک جاتا ہوں آنے جانے میں۔سوچا یوں آسانی رہے گی۔اور یہ لیں مٹھائی۔میری بائیک کی خوشی میں۔"

جواباً خوشدلی سے کہہ کرمٹھائی کا ڈبہ ان کہ طرف بڑھاتے ہوئے وہ پیار لینے کے لیے جھکا توانہوں نے مٹھائی تھام کراس کے شانوں پرشفقت بھراہاتھ پھیرا۔

"جیوندارہ میرا پتر۔شالا نصیب ہووی۔"

اسے دعائیں دیتی وہ بڑھیں اور بائیک کی گدی پر ہاتھ رکھ کر دور کھڑی ایمان کو مخاطب کیا۔

"نی تو کیوں بت بنی کھڑی ہے۔مبارک باد دے اس کو۔تجھے خوشی نہیں ہوئی؟؟"

اوران کے یوں مخاطب کرنے پر وہ گویا چڑ کر بولی۔

"اب اپنی ضرورت کے تحت اس کے موٹر سائیکل خریدنے پر میں کتنا خوش ہوسکتی ہوں امی؟؟ بس ٹھیک ہے۔اچھی بات ہے کہ اس نے خرید لی ہے۔"

پھر ایک نظر سرتاپا اسے دیکھتی وہ بڑھی اور خالہ کے ہاتھ سے مٹھائی کا شاپر پکڑ کر وہیں کھولنے لگی۔اس کے ردعمل پر مصطفین بس مسکرا کر رہ گیا۔وہ جانتا تھا کہ اکثر وہ جان بوجھ کر اس سے ایسا روکھا رویہ اپناتی ہے۔کبھی کبھی اسے "مکان مالکن" ہونے کا دورہ پڑتا تھا۔

"ہمم۔۔۔مٹھائی تو اچھی لائے ہو۔لیں امی آپ بھی کھائیں۔"

برفی کا ایک ٹکڑا منہ رکھ کر گھولتی وہ اسے نگلتے ہوئے بولی اور پھر ڈبہ واپس کنیز بیگم کو تھما کر اندر کی جانب بڑھی۔خالہ حق دق سی ہو کر جبکہ مصطفین شوق ودلچسپی سے اس کا اندازِ تغافل دیکھتا رہا۔اس کے پاس سے گذرتی یکا یک وہ رکی اور تھوڑا سا رخ موڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"مبارک باد جناب۔۔۔اچھی ہے بائیک۔مجھے اس پر گھمانے کے لیے لے کر جاؤ گے ناں؟؟"

اوراس کی بات پر پورے دل سے مسکراتا وہ اثبات میں سر ہلانے ہی لگا تھا کہ انگلی سے اسے ٹوکتی وہ مزید بولی۔

"آں ہاں۔۔۔رہنے دو۔میں بھلا اپنے کرائے دار کے ساتھ کہیں گھومنے جاؤں گی؟؟ ناممکن ہے۔"

عجب شان بے نیازی سے کہتی وہ چلی بھی گئی تو اس کی بات پر سٹپٹا کر وہ خالہ کو دیکھنے لگا۔وہ ہمیشہ یونہی اپنے آپ میں سوال جواب کرنے کی عادی تھی۔

"چل دل پر نہ لینا۔اس کا تجھے پتا ہی ہے کہ من موجی قسم کی ہے۔پل میں تولہ تو پل میں ہی ماشہ ہوتی ہے۔مٹھائی کھا کر گئی ہے مطلب بتائے نہ بتائے لیکن اندر سے خوش ہے۔چل آ تو بھی۔اندر چلیں۔تھک گیا ہوگا۔

چائے پلاتی ہوں۔"

اور اس کی خجالت مٹانے کے لیے خالہ نے عام لہجے میں ایمان کے مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے تسلی دی اور واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

" بہت اچھی طرح جانتا ہوں خالہ۔اپنی طرز کی یہ واحد ہے آپ کی بیٹی۔ ماشاء اللہ بڑا اپتا ہے اس کو کہ کب، کسے اور کتنا بے عزت کرنا ہے۔خیر اس سے تو نمٹ لوں گا میں۔"

ان کے پیچھے پیچھے آتا وہ اب اپنے دل کا غبار نکال رہا تھا۔ان دونوں کی یہ عادت ایک جیسی تھی کہ ایک دوسرے سے بے عزت ہونے کے بعد فوراً ایک دوسرے سے انتقام لینے کی ترکیبات سوچنے لگتے تھے۔

" چلو اب تم دونوں کوئی نئی بحث نہ شروع کر دینا۔کام ہی کوئی نہیں تم دونوں کو سوائے اک دوجے کو نیچا دکھانے کے۔اور تو بیٹھ میں چائے بناتی ہوں۔"

ادھر لاؤنج میں داخل ہوتی خالہ نے اس کی بڑبڑاہٹ نما گفتگو پر قدرے خفگی سے کہا تو پہلے وہ شدت سے ہنسا اور پھر انہیں باورچی خانے کی سمت بڑھتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روکتا ہوا بولا۔

" چائے مت بنایئے گا خالہ۔ مجھے بالکل بھی طلب نہیں اس کی۔ میں بس اوپر جا رہا ہوں۔سبق تیار کرنا ہے۔رات کے کھانے پر ملتے ہیں پھر۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایمان کی تلاش میں نگاہ دوڑائی جو سامنے کہیں نہیں تھی اور پھر اسے غیر موجود پا کر مزید بولا۔

" اور ایمان کو کہیئے گا اوپر راہداری میں سر و تال بکھیر کر مجھے تنگ نہیں کرے۔میں نے پچھلے پورے ہفتے کے لیکچرز دہرانے ہیں۔"

قدرے مدھم لہجے میں اس نے بات مکمل کی اور ان کی مزید کسی بھی بات سے قبل دائیں طرف جا کر دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

" کوئی حال نہیں۔بڑی تیزی ہے اس لڑکے میں بھی۔اللہ نگہبان۔۔۔"

اس کے بعد اس کی چوڑی پشت کو پیار سے دیکھتی کنیز بیگم نے سرگوشیانہ انداز میں کہا اور ایک صوفے پر بیٹھ

کر ہاتھ میں پکڑا مٹھائی کا ڈبہ درمیانی میز پر رکھ دیا۔

"نی کدھر چلی گئی ہے ایمانے۔۔۔ یہ ڈبہ اٹھا کر فریج میں رکھ دے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے چند گھروں میں بھی بھیجوں گی۔ خیر سے میرے مصطفین کی خوشی ہے۔"

ایک طویل سانس خارج کر کے انہوں نے اندر کی جانب منہ کرتے ہوئے ہانک لگائی تو ایمان سچ مچ کسی بوتل کے جن کی طرح نمودار ہوئی۔

"ناں امی ایک بات تو بتائیں۔۔۔ یہ مٹھائی محلے میں نہ بٹی تو کون سا قہر برسنے والا ہے؟؟ وہ ہمارے لیے لایا ہے تو ہم کھائیں گے ناں۔ بس کافی ہے۔"

ہاتھ جھلا جھلا کر اس نے دوٹوک انداز میں کہا اور ان کی گھوریوں کو نظر انداز کرتی ڈبہ اٹھا کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

"تو نہیں سمجھ سکتی کہ خوشی بانٹنے سے بڑھتی ہے۔ تیرے اپنے خیال۔۔۔ اپنی دنیا ہے ایمانے۔ کبھی ان سے باہر جھانک تو تجھے دکھائی دے کہ حقیقی دنیا کس قدر سمیٹ کر رکھنا پڑتی ہے۔ بڑے سانجھ سلیقے۔۔۔ بڑی محبت سے۔"

اس کے پیچھے اونچی آواز میں وہ اس کے باورچی خانے میں داخل ہونے کے بعد بھی اسے سمجھاتی رہیں تو اندر فریج کھول کر مٹھائی رکھتی وہ سر جھٹکنے لگی۔

"میرے خیال۔۔۔ میری دنیا۔۔۔ حق ہاہ۔ کاش امی آپ ان خیالوں کا کوئی ایک ٹکڑا بھی سمجھ سکتیں۔ کاش مری دنیا کا کوئی ایک حصہ بھی آپ جان سکتیں۔ وہ سب کچھ سچ مچ کسی "خیال" جیسا ہے۔"

خود سے سرگوشیاں کرتی وہ چند لمحات کے لیے کہیں کھو سی گئی۔ سارے خوش کن خیالوں کا عکس اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگا تو پورے خواب اس کے گلاب چہرے پر بکھر گئے تھے۔

ادھر کنیز بیگم نے جواباً اسے بالکل خاموش پایا تو کچھ توقف سے پکارا۔

"اب کہاں کھپ گئی ہو؟ چوری چوری مٹھائی پر تو نہیں ہاتھ صاف کر رہیں؟"

اوران کی پکار پر ہڑبڑا کر وہ بمشکل "حقیقت" میں لوٹ سکی۔

"ہائے امی الزام تو نہ دھریں مجھ معصوم پر۔ پہلے کب اور کتنا کو میں چوری چھپے کھاتی ہوں۔ شکر ہے یہاں آپ کا وہ چہیتا نہیں ہے۔ ورنہ خوب مسرور ہوتا وہ آپ کی ان غلط بیانیوں پر۔"

جلدی سے سنبھل کر بے تحاشا بولتی وہ باورچی خانے کے دروازے سے نمودار ہوئی اور پھر اٹھلا کر چلتی ان کے نزدیک آتی ہوئی گویا اپنی ہی بات سے ٹھٹک کر رک گئی۔

"ویسے میرے کمرے سے ہو کر آنے تک یہ گیا کدھر ہے؟؟ میرے "ہیئر کلپ" لانے کی دیری میں ہی یہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہے۔ اتنی جلدی ٹلنے والا ہے تو نہیں۔ ہاں؟؟"

مصطفین کی بابت دریافت کرتے اس کا لہجہ متجسس ہوا تو اس کی باتوں اور انداز پر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتی جواباً وہ کڑھ کر بولیں۔

"بس کر معصوم بی بی۔۔۔ زیادہ تاؤ نہ دلا مجھے۔ خوب جانتی ہوں میں کہ میرے سوتے ہوئے انڈوں کے حلوے کون بناتا ہے۔ اس موضوع کو تو جانے ہی دے۔ اور تیری طرح ویلا نہیں ہے وہ کہ بے وجہ، بے پر کی ہانکتا پھرے۔ اوپر کمرے میں گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ پڑھائی کرنی ہے اور کوئی مجھے تنگ نہ کرے۔ کوئی مطلب تم۔ جو ہر وقت وہاں راہداری میں بے سرے راگ الاپتی ہو۔"

انتہائی قطعیت سے کہتے ہوئے انہوں نے بات مکمل کی تو ان کے آئینہ دکھانے پر نظر چراتی وہ ان کی آخری بات پر پھر سے اپنی جون میں لوٹ آئی۔

"ہیں ہیں۔۔۔ یہ سب اس نے کہا آپ سے؟ اس کی یہ ہمت۔۔۔ ایسی مجال۔۔۔"

اس نے بات شروع کی ہی تھی کہ ان کی آنکھوں میں سوال تیرنے لگا جسے پوچھنے کا موقع دیئے بنا وہ وضاحت کرنے لگی۔

"یہی کہ میں بے سرے راگ الاپتی ہوں اس کے کمرے کے باہر۔ اففف امی۔۔۔ آپ نے سن کیسی لی اپنی بیٹی کی برائی؟ زمین کیوں نہیں پھٹی اس وقت؟ آسمان کیسے نہیں گرا۔۔۔؟؟ اللہ اللہ۔۔۔ مجھے واقعی صدمہ لگا ہے اور۔۔۔"

بھرپور جوش سے کہتی ابھی وہ یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ بے ساختہ چڑ کر انہوں نے اسے ٹوک دیا۔

"نی بس کرنی۔۔۔ یہ ڈراموں والے جملے میرے سامنے نہ بولیں ہور۔ایک چماٹ لگایا ناں میں نے تو تیرے اندر کی وہ جمیمہ ملک ادھر ہی مر جانی ہے۔چل کوئی کم کر جا کے۔میرا سر نہ کھا۔"

ہاتھ کے اشارے سے اسے تقریباً دفع کرتے ہوئے انہوں نے بات پوری کی تو ایک پل کو تھم کر وہ خفگی بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔پھر سر کو انتقامی جنبش دیتی، یہ کہتی ہوئی وہ زینوں کی طرف لپکی۔

" آپ کو کیا کہنا ہے امی۔۔۔ بات تو اب اس کرائے دار سے ہو گی اور وہ بھی روبرو بلکہ دوبدو۔پوچھوں تو سہی کب اس کے آرام میں مخل ہوئی ہوں میں؟؟ شوخا۔"

اوران کے روکنے سے پیشتر وہ تیزی سے زینے پھلانگنے لگی تو نہایت بے بسی سے اس کے پیچھے پیچھے فرش و زینے پر گھسٹتے اس کے لمبے دوپٹے کو دیکھتی وہ دھپ سے واپس صوفے کی پشت سے ٹک گئیں۔

یقیناً اب ان دونوں کا اک معرکہ ہونے والا تھا کیونکہ ایمان کے ارادے خطرناک تھے۔

☆......☆......☆

زندگی میں موضوعات کی اہمیت بس تب تک ہوتی ہے جب تک ہم ان پر گفتگو کر رہے ہوں۔اسی طرح زیست کا کوئی بھی پہلو فقط تب تک اہم ہوتا ہے جب تک وہ پہلو ہمارے "مقابل" ہوتا ہے۔نظروں سے ہٹ جانے پر تو بڑے بڑے مسائل پس پشت چلے جاتے ہیں۔۔۔ بڑی بڑی چیزیں بھی اپنی حیثیت کھو دیتی ہیں۔

ثومیہ کی زندگی بھی انہی کیفیات میں گھل رہی تھی۔تاریخی مقامات سے واپسی پر اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ راشدہ بیگم کا مزاج ورویہ بالکل متوازن اور عام سا ہے یعنی اس سے کوئی ایسی بات نہیں جھلک رہی تھی جس سے یہ لگے کہ ہاں اس بات پر پریشان ہونا ہے۔نمرہ اس سے کچھ دیر بعد گھر پہنچی تھی اور وہ بھی پھوپھو کے موضوع پر اس سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔اس کے پاس بات کرنے کے لیے اپنے کالج میں جلد متوقع ایک اہم ترسیمینار سے متعلقہ تفصیلات تھیں اور وہ بس اسی پر گفتگو کرتی رہی تھی۔بالآخر اپنے عام لب ولہجہ و انداز سے وہ دونوں اسے یہ باور کروانے میں کامیاب رہیں کہ فواد کے رشتے کا یہ تازہ بہ تازہ "قصہ" اب بہتر ہو گا کہ "پارینہ" کر دیا جائے۔دوپہر کے کھانے کے بعد شام چار بجے تک لاؤنج میں ہوئی اس طویل ترنشست سے اٹھ کر جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو سچ مچ ہلکی پھلکی ہو چکی تھی اور پچھلے دو روز سے اس کے ذہن پر چھایا سارا

غبار چھٹ گیا تھا۔

کبھی کبھی سخت و مخالف حالات سے وقتی طور پر چشم پوشی کرنا بھی ہمیں بے تحاشا سکون فراہم کرتا ہے۔ اس کی زندگی سے بھی "فواد نامی باب" اس کی تعلیم مکمل ہونے تک بند ہو گیا تھا اور فی الوقت وہ اسی سے تقویت کشید کر رہی تھی کہ بلا ٹل رہی ہے۔

کمرے میں پہنچ کر وہ سیدھا کھڑکی میں چلی آئی اور دونوں پٹ کھول کر، آدھی باہر نکلتے ہوئے سرسبز و شاداب صحن میں جھانکنے لگی۔ پھر یونہی پورے کے پورے بازو کھول کر اطراف میں پھیلاتے ہوئے اس نے ایک طویل تر سانس بھرا اور آنکھیں موند کر ذرا ذرا سا مسکرائی۔ اپنے وجود سے ٹکراتی نرم ہواؤں کی ہر ایک سرسراہٹ سے آسودگی حاصل کرتے ہوئے اس نے گویا ساری فکریں وہیں باہر اتار پھینکیں اور آخرش سیدھے ہو کر ہوا کے دوش پر باہر کی جانب لہراتا کھڑکی کا جالی دار پردہ سمیٹنے لگی۔ پھر پردے کو کھڑکی کے ایک پٹ پر پھینکتی ہوئی وہ دور آسمان تاکنے لگی۔ ذہن کو سکون میسر آیا تو اس کی سوچوں کا رخ اپنے آپ سفیر کی جانب مڑ گیا۔ وہ آج اس کے طرز و طور پر کافی حیران ہوئی تھی۔ اسے اس سے ان سب لگاوٹوں کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ جن حالات کا شکار تھی ان میں تو وہ مصطفین کے دل میں بھی اپنا قدر و مقام جاننے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی کجا کہ اب سفیر کے اظہارِ محبت پر غور کرتی۔ یقیناً وہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان سب افکار سے بالا ہی بالا وہ کہیں نہ کہیں اسے سفیر کی غلط فہمی بھی سمجھ رہی تھی کہ جو بے پناہ دوستی اور صرف اچھا لگنے کو "محبت" سمجھ بیٹھا ہے۔

"پاگل ہے وہ۔۔۔ پورا پاگل۔ بھلا اس کا اور میرا ایسا بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ بچوں والی بات۔۔۔ ہاں سچ مچ بچہ ہی تو ہے وہ۔ جو بھی بات جب بھی دل میں آئے بس بول دینا ہوتی ہے اس نے۔ گدھا۔۔۔"

یونہی کھڑکی سے سر ٹکائے کھوئی کھوئی کیفیت میں ڈھل کر وہ ماحول میں اس کے متعلق مختلف سرگوشیاں شامل کرنے لگی۔

"لیکن میں جلد اس کا دماغ درست کر لوں گی۔ کتنا سویٹ بھی تو ہے وہ۔ میں اس سے ناراض نہیں ہو سکتی۔ ہاں وہ سمجھ جائے گا میری بات۔"

اپنے آپ میں مسکراتے ہوئے اس پر استحقاق جماتی وہ اب پہلے سے کیے عہد پھر سے باندھ رہی تھی۔ اسے

اس کے "بچپنے" پر پیار آ رہا تھا۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جانے انجانے میں سہی لیکن ہم ان باتوں کو بھی سرسری لینے لگتے ہیں جن پر ہمیں پوری شدت سے چونک جانا چاہیئے۔ بہت ماہر ہونے کے باوجود بھی کئی بار ہمیں تعلقات کو سنبھالنا نہیں آتا اور ہم چوک جاتے ہیں۔

وہ بھی اپنے تعلقات میں در آتے آئندہ حالات سے بے خبر رہ کر وقت کی مہاریں اپنی مرضی سے موڑنے کا تہیہ کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وقت کا چابک حالات کے بدن پر صرف اپنی مرضی کے نشان چھوڑتا ہے۔

بالآخر کافی دیر انہیں خیالات کو بن بن کر جب وہ تھک گئی تو پردوں کو دوبارہ ہواؤں کے مقابل کر کے دھیرے دھیرے چلتی بیڈ پر ایک جانب آن بیٹھی۔ اس کا چہرہ اندرونی مسرور کن خیالات کا غماز و عکاس ہونے لگا۔ اسی وقت نرمی سے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکنے کے سے انداز میں نمرہ اندر داخل ہوئی اور اسے سامنے بیڈ پر "محوِ گم" پا کر کھنکارتی ہوئی اس کی طرف آنے لگی۔

"آہم۔۔۔آہم۔۔۔کیا بات ہے آپی؟؟ بڑا نکھر رہی ہو اپنے آپ میں ہی؟ ارے دیکھو تو چہرے کا یہ گلال اور آنکھوں کی شوخیاں۔۔۔یا اللہ خیر۔۔۔سب ٹھیک تو ہے ناں؟ ہاں؟"

اور اس کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر قدرے جھک کر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی شریر لہجے میں بولی تو تاثرات چھپانے کی کوشش میں ناکام ہوتی وہ بے تحاشا جھینپ گئی۔

"ایویں بکواس مت کرو اور بیٹھو وہاں سامنے۔"

پھر ہاتھ جھلا کر اسے ڈپٹتے ہوئے اس نے بیٹھنے کا کہا اور اس کی کھوجی نظروں کو تاکتی بے ساختہ ہنس دی۔

"اللہ اللہ۔۔۔ایسی شگفتہ ہنسی ثومیہ۔ افففف۔۔۔واللہ کمال ہے۔ کوئی تو بات ضرور ہے۔ سچ سچ بتاؤ مجھے۔ چلو شاباش۔"

بھرپور شوخی سے اسی طرز پر کہتی وہ جست بھر کر اس کے مقابل بیڈ پر چڑھ بیٹھی اور اس کا گھٹنا دبا کر اصرار کرنے لگی۔

"ارے۔۔۔کیا ہو گیا ہے یار؟ کیوں شکوک کا شکار ہو رہی ہو؟ یہ سب بے وجہ شبہات ہیں تمہارے اور

بس۔ایسی یا ویسی کوئی بھی خاص بات ہر گز نہیں ہے۔ہٹو پرے۔۔۔فضول تنگ کر رہی ہو۔"

اور اس سے کوئی "راز" چھپاتی اسے گھرک کر وہ جلدی سے اٹھی اور بھاگ کر دوبارہ کھڑکی میں جا رکی جس کے پار ساکت آسمان اور ساکن زمین۔۔۔سب کچھ جوں کا توں تھا۔اس کے یوں ایک دم بھاگ جانے پر وہ بھی سرعت سے اٹھی اور تحیر بھری نظروں سے اسے دیکھتی آہستگی سے چل کر اس کے پاس چلی آئی۔

کچھ بھی مزید کہے بنا اس نے چپ چاپ اسے باہر صحن میں جا بجا لڑھکتے پتوں پر نگاہیں دوڑاتے دیکھا۔اس کی موجودگی سے "باخبر" ہو کر بھی وہ اپنے دوپٹے کا کونا اضطراری انداز میں شہادت کی انگلی پر لپیٹ لپیٹ کر اتار رہی تھی اور اس دوران سے دیکھنے سے ارادتاً گریز بھی برت رہی تھی۔چند ساعتیں یونہی بے نام توقف کی نذر کر کے اس نے اسے مسلسل یہی عمل دہراتے دیکھا اور پھر ضبط چھوڑ کر اسے دونوں شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنے عین مقابل پھیر لیا۔

"سچ سچ بتاؤ آپی کہ کس شش و پنج میں مبتلا ہو تم؟؟ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ یہ تمہارے یونیورسٹی فیلوز سے متعلق کوئی قصہ ہے جو تمہیں یوں اکیلے اکیلے سوچنے پر مجبور کر رہا ہے؟؟ ہاں؟"

محبت سے اس کے شانے تھپک کر اس نے اس کی متفکر آنکھوں میں جھانکا تو ایک پل کے لیے کچھ کہتی کہتی رک کر وہ نظریں پھیر گئی۔وہ کل بھی نمرہ سے مصطفین کے لیے اپنے دل میں پیدا ہوئے خاص جذبات چھپا گئی تھی اور آج سفیر کا اظہارِ محبت بھی چھپا جانا چاہتی تھی کہ جسے چھپانا اس وقت بالکل محال ہو رہا تھا۔اپنے شانوں پر محسوس ہوتی اس کی پیار بھری تھپکیوں سے وہ کمزور پڑنے لگی۔

ہم انسان بھی بے حد عجیب ہوتے ہیں کہ اکثر ہمارے مصمم ترین ارادے بھی پیار کی فقط چند ایک تھپکیوں سے پگھلنے لگتے ہیں۔

"دیکھو تو میہ مذاق برطرف۔۔۔تم نہیں بتانا چاہتیں تو الگ بات ہے لیکن یہ مت کہنا کہ کوئی بات نہیں ہے۔میں بالکل یقین نہیں کروں گی۔"

اسے خاموش پا کر جواب کی منتظر نمرہ نے ایک بار اور اس کے شانے تھپکے تو بے بسی سے اسے دیکھتی اس کے ہاتھ ہٹاتی وہ کسی قدر یاسیت سے مسکرائی۔

"سچ کہوں تو فی الوقت میں خود بھی نہیں سمجھ پا رہی کہ میں کسی "شش" میں مبتلاء ہوں یا "پنج" میں۔۔۔عجیب سی صورتحال ہے۔"

بالآخر اس نے بولنا شروع کیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسا کر زور سے شانے اکڑائے۔ یہ عمل کسی اندرونی خلفشار کے اظہار کا سا تھا۔ نمرہ سوالیہ نظریں لیے ہمہ تن گوش کھڑی رہی۔

"ایک دو دن سے سفیر نے پریشان کر رکھا ہے مجھے۔ بہت بدل رہا ہے وہ۔ عجب فریفتگی سی در آئی ہے اس کے انداز میں۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔"

اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یہاں تک کہہ کر اس نے جب نمرہ پر نگاہ کی تو اس کے متحیر تاثرات سے جھلکتا "فواد کا قصہ" پڑھ کر بے ساختہ چپ ہوگئی۔ اس نے اسے خاموش ہوتے دیکھا تو جلدی سے بولی۔

"ہاں بولو ناں۔۔۔پھر؟؟ درحقیقت مسئلہ کیا ہے؟ پوری بات بتاؤ مجھے۔"

سوال کرتے ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے پر رقصاں تاثرات بھی تجسس میں ڈھال لیے تو اس کی بات پر لب کچلتے ہوئے وہ گویا لفظ ترتیب دینے لگی۔

"وہ آج اس نے کہا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔ دراصل اس نے کہا کہ وہ مجھ سے۔۔۔محبت کرتا ہے۔"

دھیمے لہجے میں جھجک جھجک کر اس نے بمشکل اگلی بات کہی تو سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑتے ہوئے لمبا سا "اوہ" کہہ کر اس نے سینے پر ہاتھ باندھ کر جانچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ پھر سے باہر تاکنے لگی تھی۔

"تو یہ بات ہے۔ ہمم۔۔۔چلو یہ معاملہ تو ہوگیا اس کی طرف سے۔ اب تم اپنا بتاؤ۔۔۔بھئی تمہارے دل میں کیا ہے؟ تمہارے منہ سے اس کی وجاہت کے قصیدے سن سن کر تو مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے تو تمہارا کیا عالم ہے؟؟"

اب کی بار اس نے اپنا لہجہ کسی قدر شوخ رکھا تا کہ اسے گفتگو میں آسانی میسر آئے۔

"حد کرتی ہو یار نمرہ۔۔۔میرے دل میں اس کے لیے ایسا کچھ بھی نہیں۔ میں اسے ایک اچھے دوست کے طور پر بہت زیادہ پسند کرتی ہوں اور بس۔ اور آج اس کے جواب میں اسے بھی یہی کہہ کر آئی ہوں کہ بس اتنی سی

بات کو ہی ذہن نشین رکھو اس سے آگے رتی بھر بھی نہیں۔ ایک ذرہ بھی نہیں۔"

جواباً کسی قدر چڑ کر اس نے کم لفظوں میں جلدی جلدی پوری تفصیل بتائی تو اس کے دوٹوک اور قطعی انداز پر وہ کسی قدر حیران ہوئی کہ پھر کچھ دیر قبل وہ اپنے آپ میں مسکرا کس پہلو یا زاویے سے رہی تھی۔

"اچھا بابا مان لیا کہ تمہارے دل میں وہ صرف تمہارا دوست ہے اور بس۔ لیکن پھر تم اکیلے اکیلے کن خیالات میں گم تھیں کہ جن میں تفکر کی بجائے بےخودی سی شامل تھی؟؟ اور یہ بھی بتانا کہ تمہارے انکار کے جواب میں اس نے پھر کیا کہا ہے؟"

دونوں ہاتھوں سے دفاعی انداز میں اسے دھیرج رہنے کا اشارہ کرتی وہ ابرو تان کر اگلے سوالات کرنے لگی تو ایک پل کو کسی غیر مرئی منظر میں ڈوب کر اس کے چہرے پر پھر سے وہی قندیلیں جل اٹھیں جن سے لوپا کر ان کی گفتگو اس نہج پر رواں ہوئی تھی۔ وہ پھر سے کسی خوش کن خیال میں گم ہو گئی۔

" کچھ نہیں کہا اس نے۔ اسے موقع ہی نہیں ملا مزید بات چیت کا۔ مصطفین اور مریم آ گئے تھے تو موضوع بدل گیا۔ اور ابھی میں بس یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا اور میرا ایسا ناطہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ بالکل ضدی سے بچوں کی طرح ہے۔ میرے خیال سے اسے احساس ہی نہیں کہ وہ "دوستی" کو غلط فہمی کی بنیاد پر "محبت" سمجھ رہا ہے۔ مجھے بس اسے یہ سمجھانے کی دیر ہے کہ محبت یوں نہیں ہوتی۔ دیکھنا تم وہ سمجھ جائے گا۔"

اور اپنے خیال سے لوٹ کر نرم لہجے میں دھیرے دھیرے اس نے اپنی بات مکمل کی تو اس کے چہرے پر بکھرتا اک ایک عکس و رنگ دیکھتی نمرہ مبہوت ہونے لگی۔ وہ بڑے یقین سے بول رہی تھی۔ زندگی میں اتنا پر یقین تو اس نے کبھی اسے اپنی ذات کے لیے بھی نہیں دیکھا تھا جتنا اس پل وہ اپنے اس "دوست" کے لیے دکھائی دی۔

"لیکن تمہیں کیا معلوم ثومیہ کہ محبت کیسے ہوتی ہے؟؟ تم اتنے یقین سے کیونکر کہہ سکتی ہو کہ اسے تم سے محبت نہیں ہوئی؟؟"

بےساختگی میں ہی اس کے لبوں سے سرگوشیوں کی مانند یہ لفظ پھسلے اور اسے جامد کر گئے۔ بےطرح چٹکتے اس کے یاقوتی لب یکایک سمٹ گئے تو بغور اسے دیکھتی نمرہ نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کچھ اور بھی ہے جسے وہ

چھپا رہی ہے۔

"اے لو یہ بھی خوب کہی تم نے کہ مجھے کیسے معلوم ہے کہ محبت کیسی ہوتی ہے؟ بھئی بچپن سے آج تک بابا سے چوری چھپے دیکھی گئی فلمیں اور ڈرامے کب کام آئیں گے؟ خوب پتا ہے مجھے کہ محبت یوں نہیں ہوتی۔تم اب جیمز بانڈ نہیں بنو اور ہٹو اب تھوڑا آرام کرنے دو۔بہت سر کھا لیا ہے۔جتنی بات تھی بتا دی سب۔"

اور اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے اس نے لہجہ بدل کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر بے پرواہی کے اظہار کے طور پر دایاں ہاتھ ہوا میں جھلاتی ہوئی اس کے مقابل سے ہٹ کر بیڈ کی جانب بڑھ گئی۔اس کی پشت پر کھڑے رہ کر اس نے عمیق تر نظروں سے اس کا" گفتگو سے فرار" جانچا اور پھر آہستگی سے چل کر سوچتی ہوئی نظروں سے اسے بیڈ پر لیٹتے دیکھ کر اس کی الٹی جانب آن رکی۔

"میں باہر ماما کے پاس جا رہی ہوں۔سبزی چھیل کر واپس آتی ہوں۔"

اسے مخاطب کر کے اس نے "بظاہر" موضوع بدلا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے "ہاں ہاں جاؤ" کہہ کر وہ رخ بدل گئی۔

"اور ہاں سنو۔۔۔"

لیکن اگلے ہی پل اس کی پکار پر اسے پھر سے واپس دیکھنا پڑا۔

"فلمی محبت کا حقیقی محبت سے تال میل بناتے ہوئے بے حد احتیاط کرنا میری جان۔یہ جو محبت ہوتی ہے ناں۔۔۔یہ ہر کہیں ایک سی نہیں ہوتی لیکن کہیں کہیں ایک سی بھی ہوتی ہے۔محبت کو عام مت سمجھنا۔ورنہ یہ اپنی توہین کا نسلوں تک انتقام لیتی ہے۔"

مدھم لہجے میں خاص تراز کار پھونکتی یہاں وہ ایک لحظے کو رکی تو اس کی متفکر نظروں میں کوئی سوال تیرنے لگا۔

"وہ کیا ہے ناں کہ فلمیں اور ڈرامے میں نے تمہاری نسبت کچھ زیادہ ہی دیکھ رکھے ہیں۔بس وہیں سے سیکھا ہے یہ سب کچھ۔بائے۔"

اور اس کی سوالیہ نظروں میں جھانک کر معنی خیز لہجے میں اپنی بات مکمل کرتی وہ تیز تیز چل کر کمرے سے نکل بھی گئی تو ٹکر ٹکر اس کی پشت کو گھورتی ثومیہ گویا سچ مچ پتھر کی ہو گئی۔

زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ ہماری سوچیں کسی مخصوص حد میں متعین ہونے لگتی ہیں۔کوئی خاص ڈگر ہوتی ہے جس پر ہم چند مقررہ قدموں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ایسے عالم میں ہم اپنی ہی ذات سے متعلق کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے پاس شاید خود کے لیے فیصلوں کا اختیار ہی نہیں ہوتا۔ہم بس حالات کی سلوٹوں اور وقت کی کروٹوں کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

تیزی سے زینے چڑھ کر راہداری کے ہلتے لہراتے پردوں کے درمیان سرعت سے بھاگتی ہوئی وہ اس کے کمرے تک پہنچی اور پورے زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر صرف ایک پل کو رک کر اندر داخل ہوگئی۔ادھر میز پر کتاب کھولے پورے انہماک سے پڑھتا مصطفین اس کی اچانک آمد پر ہڑبڑا کر اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے یوں داخل ہونے پر سٹپٹا بھی گیا۔وہ اس کے کمرے میں اکیلی کبھی نہیں آتی تھی۔کم از کم اس کی موجودگی میں تو بالکل بھی نہیں۔

"باہر آ کر میری بات سنو۔فوراً۔۔۔"

انگلی کے اشارے سے حکم صادر کرتی وہ اسے خشمگیں نظروں سے گھورنے لگی۔

"ابھی۔۔۔؟؟"

وہ واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ شامتِ اعمال اس کے منہ سے پھسل گیا۔

"فوراً کا مطلب ابھی ہی ہوتا ہے مسٹر۔۔۔کون سے سکول،کالج اور پھر اب یونیورسٹی بھی جاتے ہو تم جہاں ان موٹی موٹی کتابوں میں تمہیں اب تک یہ بھی نہیں پڑھایا جا سکا کہ ہم معنی الفاظ ہیں یہ؟؟ بیوقوف۔۔۔"

اس کے سامنے کھلی کتاب کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہہ کر اس نے اس کی ہونق شکل دیکھی اور اس کا جواب سنے بغیر باہر نکل گئی۔

"اوئے اسے کیا ہوا آج؟ چل مصطفین پتر آثار اچھے نہیں ہیں۔بستی کے لیے تیار ہو جا۔"

کرسی گھسیٹ کر پیچھے کرتے ہوئے وہ دروازے تک آیا اور نکلنے سے قبل یونہی جھانک کر دیکھا۔باہر ایک کھڑکی کی جالیوں سے ٹیک لگائے ٹانگیں جھلاتی،پورے کروفر سے گردن اکڑائے اسی جانب دیکھتی وہ اس کی

منتظر تھی۔ وہ فوراً اندر ہو گیا اور پھر مضبوطی سے دروازے کا ہینڈل تھامتے ہوئے عزم کرنے لگا۔

"اتنی آسانی سے اسے اپنی بے عزتی نہیں کرنے دوں گا میں۔ ہووو۔ اعتماد۔۔۔ آ جا میرے اعتماد۔۔۔ کہاں مر گیا ہے؟"

چہرے پر ہاتھ پھیرتا خود کو سنبھال کر اب وہ اپنی ڈھارس بندھا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے سامنے وہ اسی طرح حواس باختہ ہو جایا کرتا تھا اور اس کی ایسی حالت کا وہ بھرپور حظ اٹھاتی تھی۔ بالآخر پورا تن کر وہ کمرے سے نکلا اور اسے گھورتا ہوا اس کے عین مقابل جا رکا جو کسی قدر حیرت سے اس کا "لوٹ آیا" اعتماد جانچ رہی تھی۔

"میری تعلیم کو تو بڑی باتیں سنا کر آئی ہو خود کبھی سکول کی کسی دیوار کے پاس سے بھی گذری ہو کیا؟؟ یقیناً نہیں۔ تبھی تو اتنی تمیز بھی نہیں ہے کہ کسی کے کمرے میں بنا اجازت داخل نہیں ہوتے۔"

تند لہجے میں اس نے جوابی طنز کیا تو ایمان کے گویا سر سے لگ کر پیروں پر بجھی۔

"او ہیلو۔۔۔ کس دنیا میں رہتے ہو؟؟ کون سا کسی کا کمرہ؟؟ او ئے ہیں؟؟ یہ ایمان راجپوت کا گھر ہے تم شاید بھول رہے ہو۔ اور اپنی جاگیر میں جب مرضی جہاں مرضی داخل ہوں میں تم کون ہوتے ہو کوئی ٹوک لگانے والے؟؟ اخلاقاً دستک دی تھی ناں؟؟ تمہیں خبردار کرنے کے لیے وہی کافی تھا۔"

دوبدو لہجے میں کہتی یہاں وہ رکی اور جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں گھور کر مزید بولی۔

"اور یہ تم نئی نئی بحثیں مت چھیڑو مجھ سے۔ میں تم سے پہلی پوچھ گچھ تو مکمل کر لوں پھر اگلے چن چڑھانا۔"

اس کے لب و لہجہ پر غور کرتا اس کی اگلی بات پر وہ بے طرح چونک گیا۔

"کیا مطلب؟؟ کیسی پوچھ گچھ؟؟"

ساری بحث بھول کر وہ سچ مچ متجسس ہوا۔

"ابھی امی سے کیا کہہ کر آئے ہو نیچے؟؟ کہ میں یہاں باہر راہداری میں رک کر، ہر روز بے سرے راگ الاپتی ہوں اور تمہیں بے وجہ تنگ کرتی ہوں؟ تم پڑھ نہیں پاتے میری وجہ سے؟ اتنے بے چارے اور وہ بھی تم؟ بتاؤ ناں ذرا کب ایسا ہوا ہے کہ میری وجہ سے تمہاری پڑھائی میں خلل آیا ہو؟ ہاں۔۔۔؟؟"

اس کے سامنے ہوا میں ہاتھ جھلا جھلا کر اس نے جرح کے سے انداز میں پوچھا تو اس کا لڑاکا انداز دیکھ کر

نہایت سنجیدہ ہوا کھڑا وہ ایک پل کو رک کر پوری شدت سے ہنسنے لگا اور پھر اس کے سامنے سے ہٹ کر پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے راہداری میں اس کے متوازی دیوار سے لگ کر دوہرا ہونے لگا۔

"ہاہاہا۔۔۔ ذرا اپنا چہرہ دیکھو ایمان راجپوت۔ کس قدر جنونِ جنگ وجدل رقم ہے اس پر۔۔۔ افففف۔۔۔ سچ مچ اتنا ہی شوق ہے تمہیں لڑائی کا؟؟ میرے نیچے آنے کا تو انتظار کر لیتیں۔ ارے کچھ دیر تو ٹلتیں یار۔۔۔"

اور یونہی مسلسل ہنستے ہوئے اس کے چہرے پر بکھرے "مشاق تاثرات" دیکھتا اتنا کہہ کر وہ بے ساختہ چپ ہوا کیونکہ ماتھے پر بل ڈالے تب سے اب تک سنجیدگی سے اسے دیکھتی وہ اب غیر متوقع طور پر اسے گھورنا ترک کر کے دائیں بائیں متلاشی نگاہیں دوڑانے لگی تھی۔ پھر راہداری میں اور کچھ بھی نہ پا کر اچانک وہ بڑھی اور ساتھ والی کھڑکی کی سل پر دھرا گلدان اٹھا کر یہ کہتے ہوئے اسے مارنے کو لپکی۔

"رکو ذرا پہلے میں تمہاری اس جناتی ہنسی کا قلع قمع کر لوں اگلی گفتگو اس کے بعد ہوگی۔۔۔"

اس نے دیکھا کہ بے تحاشا چڑ کر وہ باقاعدہ دانت پیس رہی ہے تو دونوں ہاتھ دفاعی انداز میں آگے کرتا یکبارگی اپنے کمرے کی جانب بھاگا اور پھر سات آٹھ قدموں کی مسافت بھر کر یہ کہتے ہوئے رک گیا۔

"ارے ارے ارے رکو ایمان پلیز۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بہت معذرت۔۔۔ پلیز جانے دوناں بات کو۔ تمہیں پتا تو ہے میرا کہ بس تمہیں ستانے کے لیے ایسا کہتا ہوں۔ ورنہ تمہارے سر و تال تو باکمال ہیں۔ سچی۔۔۔"

اس کے مفاہمتی لب ولہجہ پر وہ وہیں رک گئی۔

"اور جو ابھی کہہ رہے تھے سب کہ میں لڑنے کی شوقین ہوں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ وہ؟ اس کا کیا؟؟"

عجب نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ مزید شکوہ کناں ہوئی تو بغور اسے دیکھتا وہ کھلکھلایا۔

"وہ سب بھی بکواس ہے سراسر۔۔۔ میں جانتا ہوں تم ایسی نہیں ہو۔ بس کبھی کبھی تمہیں شوق چراتا ہے خود کو جھگڑالو ظاہر کرنے کا۔"

آہستگی سے کہتا وہ اس کی طرف آنے لگا تو وہ گلدان واپس اپنی جگہ پر سجانے لگی۔

"بس یہی "ضروری باتیں" کرنے آئی تھیں؟؟ اب میں جاؤں کیا؟ شاید کہ اس بار پڑھنے سے مجھے یہ

بھی سمجھ آجائے کہ "ابھی" اور "فوراً" ہم معنی الفاظ ہیں۔"

دوسری کھڑکی کی سل پکڑ کر اس نے دور افق پر دیکھتے ہوئے شرارت سے اگلی بات کہی تو ایک پل کو تھم کر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"ویسے خود کو خودی چوٹیں کرنا بھی باقاعدہ ایک فن ہے۔ جیسا کہ ابھی تم نے کی۔ کبھی کبھی تم بے وجہ اچھے لگتے ہو۔"

مدھم لہجوں سے لپٹ کر اس کے لبوں سے پھوٹتے یہ سب حروف سن کر اس نے مسکراتے ہوئے گردن موڑی اور دل ہی دل میں اس کی ہنسی کو عنوان دیا۔

"ریا سے قطعاً پاک بالکل شفاف ہنسی۔۔۔"

اور پھر واپس آسمان تاکتے ہوئے وہ مزید بولا۔

"بے وجہ اچھا لگنا بھی تو ایک فن ہے محترمہ۔۔۔ ہر کسی کو یہ بھی کہاں آتا ہوگا؟؟"

اس کا لہجہ کسی قدر اداس ہو گیا تو بغور اس کی پشت کو دیکھتی وہ کسی خیال میں الجھنے لگی۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خیالات کو گھلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ کبھی کبھی انتہائی جارحانہ ہو کر بھی ہماری کیفیات یکا یک بدلنے لگتی ہیں اور سرد لہجوں کی بجائے ہم برف لفظوں میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ کرخت لمحوں میں مقید ہمارے رویہ جات کب نرم ساعتوں میں آن رکیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کے لہجے کی ہلکی سی اداسی سن کر وہ بھی انہی سب محسوسات میں بہنے لگی اور پھر کچھ توقف سے نپے تلے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ جا رکی۔

" آسمان کو زیادہ مت دیکھنا مصطفین۔۔۔ سمجھو یہ بھی پورے کا پورا ایمان راجپوت کے حصے میں آیا ہے۔"

پھر اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے افق کے گھیر ماپتی، اس کی آنکھوں کے کنارے پڑھ کر فسوں گر لہجے میں وہ پرانا ذکر چھیڑنے لگی تو واضح طور پر اس کا موضوع بدلنا محسوس کرتے مصطفین نے اس کی طرف رخ کیا۔

" آسمان پر اتنا استحقاق اچھا نہیں ہوتا ایمان۔۔۔ اسے سبھی کا رہنے دے کر تم خدارا اپنے حصے کی خوشیاں کہیں اور تلاشو۔ وگرنہ عین ممکن ہے کہ اک روز آ کر ہر کوئی تم سے اپنے حصے کا آسمان مانگے۔"

اس کی آنکھوں سے جھلکتی معنویت سے قائل ہوتی وہ نظر چرا گئی تو گفتگو کو حدود میں رکھتا وہ اسے سمیٹنے بھی لگا۔

"میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ ان بے وجہ اذکار سے ہٹ کر اپنا دل کہیں آس پاس باندھو ایمان۔۔۔ زندگی مذاق نہیں ہوتی کہ اسے کہانی کیا جائے۔ یہ سب افسانوی باتیں ہوتی ہیں جو بھی تم کرتی ہو۔"

اس کی بات پر اس نے واپس اس کی روشن آنکھیں دیکھیں تو وہ نرمی سے مسکرایا۔

"اور رات کے کھانے پر نیچے آتا ہوں تو پھر ملاقات ہوتی ہے۔ ابھی مجھے پڑھنا ہے۔ بائے۔"

اس کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تو کچھ کہنے کو کھلے اس کے لب کانپ کر رہ گئے۔ پھر پلٹ کر اسے متوازن چال چلتے ہوئے کمرے میں جاتا دیکھتی یکا یک کسی خیال سے وہ تذبذب کا شکار ہوئی اور تھوڑا اس کی جانب چل کر دوبارہ اسے پکارا۔

"بات سنو مصطفین۔۔۔"

اور اس کے پکارنے پر بنا رخ موڑے، بنا کچھ بولے، رک کر وہ اس کی بات کا منتظر ہوا۔

"وہ کل خالہ جان کی کسی بات کا برا لگا ہو تو بہت معذرت۔ تمہیں تو پتا ہے ہم سب کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی کیا کہتا ہے تمہارے بارے میں۔"

قدرے جھجک جھجک کر اس کے منہ سے یہ جملے نکلے تو یونہی رخ پھیرے آنکھیں موند کر ایک پل کو وہ مسکرایا اور پھر آہستگی سے اس کی جانب مڑا۔ وہ حیران بھی ہوا کہ وہ جانتی ہے کہ وہ ان کا اعتراض سن چکا ہے۔

"ہاں میں جانتا ہوں سب۔ اس کے متعلق پریشان نہیں ہو۔ میں نے ذرہ بھر بھی غصہ نہیں کیا مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا۔ بلکہ غور کروں تو وہ حق بجانب ہیں۔ لہٰذا اس بات کو یہیں جانے دیتے ہیں۔ اب جاؤ تم بھی۔"

دھیرے دھیرے شائستگی سے اسے تسلی دیتا یہاں تک کہہ کر اس کا جواب سنے بنا وہ پھر سے مڑنے لگا اور پھر مڑتے مڑتے رک کر مزید بولا۔

"اور ہاں سنو۔۔۔ مجھے تمہارا یوں کہنا بہت اچھا لگا ہے۔ کبھی کبھی تم بھی بے وجہ اچھی لگتی ہو۔"

بات مکمل کر کے ایک پل بھی ٹھہرے بنا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تو خالہ کے حوالے سے صفائی کی مد میں بہت کچھ مزید کہنے کی خواہش دل میں دباتی وہ بازو ہوا میں جھٹک کر رہ گئی۔

"یہ سچ مچ اچھا لڑکا ہے۔ زندگی بھر میں نے اس سے مثبت سوچ کسی اور میں نہیں پائی۔ خوش رہو مصطفین ۔۔۔ آمین ثم آمین ۔"

اس کے پیچھے اس کے متعلق انتہائی نیک گمان کرتے ہوئے اس کے لبوں سے سرگوشیوں کی مانند یہ دعا پھسلی اور پھر پورے دل سے مسکراتی وہ "اپنے آسمان" کی جانب لوٹ آئی۔

"پرندے پاگل ہوتے ہیں جو آسمان سے لوٹ آتے ہیں۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ اور واپسی اگر بہت ضروری بھی ہوتی ناں مصطفین تو اللہ کی قسم ۔۔۔ اڑتے پھرتے ان بادلوں کے ارغوانی کناروں پر پاؤں رکھ کر میں پورا آسمان اپنے ساتھ کھینچ لاتی ۔۔۔"

زیرِ لب وہی مخصوص اور اپنے من پسند جملے دہراتے ہوئے اس کی مسکان گہری ہونے لگی تو راہداری میں گردشیں بھرتی ہوا نے مسرور ہو کر اس کے آس پاس رقص کیا۔

وقت ان لمحات پر گواہ ہوتا رہا کہ آسمانی عشق کے خمار میں مبتلا یہ لڑکی مصطفین کی کوئی بھی بات سمجھنے کو ہر گز تیار نہیں ہے۔

☆......☆......☆

حسب معمول رات کے کھانے کے بعد آرام دہ لباس میں ملبوس ہو کر سفیر چہل قدمی کے ارادے سے اپنے کمرے سے نکلا اور لاؤنج کی سیڑھیاں اتر کر ایک نگاہ خالی لاؤنج میں دوڑاتا ہوا بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

"رکو یار ۔۔۔ آج میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ آج کل کلینک پر زیادہ وقت بیٹھ بیٹھ کر میرا ابھی پیٹ نکل رہا ہے۔"

ڈاکٹر منصور عالم کی آواز پر دروازے کا ہینڈل تھام کر وہ فوراً رک گیا اور بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔ ابھی ابھی اپنے کمرے کی راہداری سے نکل کر اس کی طرف آتے وہ مسکرا رہے تھے۔ وہ بالکل اسی کے جیسے ٹراؤزر شرٹ میں تھے اور یہ کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ ایسے آرام دہ لباس وہ باپ بیٹا خریدتے ہی ایک جیسے تھے۔ اس لباس میں سفیر کی طرح ان کی مضبوط جسامت بھی بھرپور چھب دکھا رہی تھی۔

"مسٹ کم بابا۔۔۔اسی بہانے آپ سے گپ شپ بھی رہے گی وگرنہ تو آج کل آپ سچ مچ ہاتھ نہیں آتے۔"

خوشدلی سے کہتے ہوئے اس نے ان کے سامنے ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر وہ کھلکھلا کر ہنسے۔اس سے پہلے وہ دونوں باہر نکلتے ایک رومال سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی زکیہ بیگم باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوئیں اور شوہر کو مخاطب کیا۔

"ضرور جائیں آپ بھی لیکن واپس جلدی آجائیے گا دونوں۔یہ تو بہت دور تک دوڑ لگاتا ہے لیکن آپ نہیں لگا سکیں گے۔اور ویسے بھی چائے پیئے بغیر جا رہے ہیں تو دیر سے آکر پینے کی بدولت رات کو نیند بھی نہیں آنی۔"

باری باری ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اتنا کہہ کر وہ رکیں اور پھر سفیر کو مخاطب کیا۔

"اور تم بھی خیال کرنا تھوڑا۔۔۔اپنے بابا کو زیادہ مت دوڑانا۔چلو جاؤ اب۔میں تب تک یہیں ٹی-وی دیکھتی ہوں۔"

ان کے فکرمند لہجے پر منصور عالم جواباً انہیں پیار سے دیکھتے رہے جبکہ وہ شوخی سے بولا۔

"جی بالکل فکر نہیں کریں ماما۔۔۔آپ کے مجازی خدا کو پوری ذمہ داری سے لے جا رہا ہوں لہٰذا بحفاظت واپس لاؤں گا۔"

گردن کو تعظیماً خم دے کر اس نے اتنے پیارے انداز میں کہا کہ وہ جھینپ گئیں۔

"یونہی کہہ رہی ہوں بدتمیز۔۔۔کچھ بھی بول دیتے ہو۔"

اور ایک قہقہہ لگا کر وہ دونوں باہر نکل گئے۔گھر سے نکل کر ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے وہ دونوں مخصوص راستے سے ہو کر مین جی-ٹی روڈ پر نکل آئے اور سڑک پر ایک طرف چلتے راوی پل کی جانب بڑھنے لگے۔وہ لوگ شاہدرہ کا داخلی چوراہا عبور کر کے "میٹرو سروس" کے اول پلیٹ فارم پر پہنچے تھے جب ڈاکٹر منصور عالم فٹ پاتھ پر ایک طرف رک گئے اور جھک کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اپنا سانس ہموار کرنے لگے۔

"بس بابا؟؟ تھک بھی گئے؟ جوان آدمی ہیں یار۔اتنی جلدی ہمت نہیں ہاریں۔"

انہیں ہانپتے دیکھ کر ان سے چند قدم آگے بڑھ چکے سفیر نے ان کے پاس آتے ہوئے کہا اور ان کی کمر تھپتھپا

کر ہمت بندھانے لگا۔

"بس کریار۔اب کہاں جوانی ہے؟؟اب تو بس گذرراہ ہے۔ماشاءاللہ اب تو بھی میرے جتنا ہوگیا ہے۔" سیدھے ہو کر انہوں نے محبت سے اس کے شانوں کے گرد ہاتھ پھیلایا اور آگے بڑھتے ہوئے اسے تفاخر بھری نظروں سے دیکھتے مزید بولے۔

"مجھے تو بس تمہاری ڈھارس ہے یار۔۔۔کہ بیٹا جوان ہو کر باپ کے کاندھوں سے آن ملے تو باپ بوڑھا ہو کر بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔جوان رہتا ہے۔"

جواباً ان کے لہجے سے بے پناہ محبتیں کشید کرتا وہ بس مسکرا کر رہ گیا۔پھر ارد گرد ٹریفک کے اژدھام میں مختلف مشاہدات کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی کر کے وہ لوگ راوی پل کے عین وسط میں پہنچے اور یہاں پل کی اطرافی ریلنگ تھامے رک کر دریائے راوی میں واقع تاریخی مقام "بارہ دری" کی سمت دیکھنے لگے۔دور جابجا جلتی قندیلوں میں بارہ دری پر چھائی تاریکی بہت خوابناک لگ رہی تھی۔آس پاس سے گذرتی گاڑیوں کی تیز روشنیوں میں ان کا وجود گاہے بگاہے گویا نور میں نہا جاتا اور ہوائیں ان کے اجسام سے اٹھتی بھینی بھینی مہک چرا کر پورے منظر پر پھونکتی رہیں۔کافی دیر کہنیاں اسی ریلنگ پر ٹکائے سانس لینے کی غرض سے وہ لوگ یونہی چپ چاپ کھڑے رہے اور پھر سفیر انہیں واپسی کا کہنے ہی لگا تھا کہ ان کی آواز پر ٹھٹک گیا۔

"سنا ہے تمہیں عشق ہو رہا ہے۔۔۔بھئی دیکھ بھال کر ذرا۔یہ بڑا عجیب سلسلہ ہوتا ہے۔دل تو دل یہاں جاں بھی جاں نہیں رہتی۔"

سرسری و عام لہجے میں کیے گئے ان کے خاص تر سوال اور اس میں پنہاں عمیقیت جانچ کر وہ ازحد حیران ہوا۔وہ فوراً سمجھ گیا کہ ماما ان کو ثومیہ کے متعلق اس کے محسوسات سے آگاہ کر چکی ہیں۔

"جی بابا۔۔۔ایسا ہے تو سہی لیکن یہ عشق کافی بھاری بھرکم سا لفظ ہے۔میں بس اسے پسند کرتا ہوں یعنی صرف محبت۔۔۔"

اپنی حیرت سنبھال کر اس نے مضبوط و متوازن لہجے میں جواب دیا اور "بارہ دری" کی جانب پشت کر کے پل پر رواں گاڑیوں کی قطاریں دیکھنے لگا۔جبکہ سوال کر کے اسے دیکھے بنا وہ اب بھی راوی کے سینے پر جلتی

قندیلیں اوران سے بندھتا فسوں تاکتے رہے۔

"ہمم۔۔۔صحیح۔۔۔"

مبہم لہجے میں انہوں نے فقط یہی کہا تو وہ چونک سا گیا۔اسے لگا جیسے وہ سنجیدہ ہیں اور کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔

" کیا بات ہے بابا جان؟؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟ آپ کو کوئی۔۔۔اعتراض ہے؟؟ آپ چپ چپ کیوں ہیں؟"

انتہائی محتاط لہجے میں اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا اوران کی جانب رخ کر کے ان کا چہرہ پڑھنا چاہا۔اس کے انداز پرانہیں بھی فوراً اپنی بے طرح سنجیدگی کا احساس ہوا۔

"ہوں۔۔۔نہیں ایسی کوئی بات نہیں یار۔مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟لیکن۔۔۔"

قدرے مسکرا کر در آئی سنجیدگی کو پاٹتے ہوئے انہوں نے بھی اس کی طرف گردن موڑی اورایک طویل ہنکارا بھر کر بات ادھوری چھوڑتے ہوئے مزید لفظ جمع کرنے لگے۔جبکہ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اگلی بات اخذ کرنے کی کوشش کرتا وہ سوالیہ نظریں لیے منتظر رہا۔

"یار تمہاری ماما نے مجھے اس کے متعلق وہ سب کچھ بتایا ہے جو وہ جانتی ہیں۔اور میں چاہوں گا کہ تم جلداز جلد اسے ہم سے ملواؤ سفیر۔تا کہ ہم بھی جان سکیں کہ ہماری متوقع بہو کیسی ہے؟"

نرم لہجے میں کہہ کرانہوں نے ریلنگ پر جمے اس کے ہاتھ پر ہاتھ دھرا تو اسے صاف لگا کہ وہ کسی کشمکش میں ہیں اور فی الوقت بات بدل رہے ہیں۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے بابا کہ آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں،اسے جاننا چاہتے ہیں۔بلکہ میں خود بھی جلداز جلد اسے آپ سے ملوانا چاہتا ہوں۔لیکن ابھی آپ کے بھی اور ماما کے انداز سے بھی مجھے واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ آپ دونوں اس حوالے سے کسی ابہام یا اوہام کا شکار ہیں۔پلیز ٹیل کہ بات کیا ہے؟ آپ دونوں کو کس بات کی فکر ہے؟؟"

انتہائی بے تابی سے جرح کے سے انداز میں سوال کرتا وہ لپک کر پورا ان کی جانب مڑا تو اس کے حسین

چہرے پر رقصاں تفکر کے رنگ ملاحظہ کرتے وہ پدرانہ شفقت سے ہنس دیئے۔

"ارے یار۔۔۔ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے کہ تم یوں پریشان ہونے لگو۔دراصل بچپن سے آج تک تم نے کبھی کوئی دوست نہیں بنایا اور ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہے ہو۔تمہاری دلچسپیاں اور مشاغل بھی بس تم سے تم تک ہی محدود رہے ہیں۔تو اب یک لخت تمہارا کسی سے یوں لگاؤ ہونا کہ تم اسے اپنی زیست میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لو ہمیں ثومیہ کے بارے میں متجسس کر رہا ہے۔ہمارے اذہان میں فقط یہ ہے کہ ایسا کیا ہے اس لڑکی میں کہ وہ ہمارے بیٹے کو بھا گئی؟ بھئی کچھ تو خاص ہے ناں۔۔۔بس وہی دیکھنے کی چاہ ہے ہمیں۔"

کچھ توقف سے لہجے کو متوازن رکھتے ہوئے انہوں نے تفصیلاً سمجھایا تو آنکھوں میں حیرت و بے یقینی بھر کر ایک پل کو تھم کر وہ چاپ چاپ انہیں بس دیکھتا رہا۔وہ سچ مچ حیران ہوا کہ وہ ثومیہ کے متعلق اتنے متجسس صرف اس وجہ سے ہیں کہ وہ "اسے" پسند آئی ہے۔پھر ریلنگ کی ٹیک چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہوتا وہ پلٹا اور ان کی مشفق آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"اوہ کم آن بابا۔۔۔اب ایسی اونچی پسند بھی میری کبھی نہیں رہی کہ اس پر اتنا حیران و متجسس ہوا جائے۔ہاں یہ کہ مجھے خاص لوگ اور خصوصی رویے پسند آتے ہیں اور وہ انہی کے جیسی ہے۔۔۔اور بس۔سوا اس کے بات کچھ بھی نہیں۔"

اور اس کے وضاحتی لب ولہجہ میں بسی قطعیت بھانپ کر جواباً وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"اچھا یار اچھا۔۔۔یوں چڑ کیوں رہے ہو؟؟ ایسا ہی ہوگا جیسا تم کہہ رہے ہو۔تم بس ہمیں اس سے ملوا کر ہماری "کھوج" کو بھی تقویت دے دو۔کہ بھئی اس سے ہمارے دل میں جو تھوڑی سی فکر وہ بھی ختم ہو جائے گی۔اور اب واپس چلیں کیا؟؟ تمہاری ماما ہمارے انتظار میں ہوں گی۔"

پھر گفتگو سمیٹتے ہوئے انہوں نے خوشدلی سے کہا اور اس کے کچھ بھی مزید کہنے سے پیشتر اس کا ہاتھ تھام کر راوی سے پلٹنے لگے۔ان کے ساتھ چلتے ہوئے ایک آخری نگاہ دور بارہ دری کی جلتی ہوئی قندیلوں پر ڈالتا وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

بہت کچھ کہنے کی خواہشوں کو روکتا وہ آج اپنے اظہارِ محبت کرنے پر ثومیہ کے ردعمل کو سوچنے لگا۔

"پوری پاگل ہے وہ۔ چاہتوں سے انجان لڑکی۔ میں جلد اسے اپنی محبت کا یقین دلالوں گا کہ میں سچ مچ اس پر مرنے لگا ہوں۔۔۔ کہ مجھے اس کے خیال تک سے محبت ہوگئی ہے۔ بے تحاشا اور بے پناہ محبت۔"

اسی خاموشی سے راوی پل عبور کرتا وہ دل ہی دل میں نئے نئے عزم باندھنے لگا۔ ثومیہ کے خیالات میں گم ہوکر واپسی کا سفر بہت قلیل ہونے لگا تھا۔

محبت بھی عجب ہے کہ انسان کو افکار کی ایسی ایسی نہج پر رواں کرتی ہے کہ اسے آس پاس تو کیا سامنے کی شے بھی دکھائی نہیں دیتی۔ محبت میں صریح وروشن اور واضح تر باتیں بھی دھندلا کاسی لگتی ہیں۔ کوئی دلیل، حوالہ یا مستند واسطہ۔۔۔ یہ کسی سے قائل نہیں ہوتی، کسی کی حد میں نہیں آتی۔ محبت ضد نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن "ضدی" ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

ہوٹل کانز پپٹ کے اسی کمرے میں گیتی اور ناز کے ساتھ اس وقت دھنراج ورما اور رامیش بھی موجود تھے۔ گفتگو کا موضوع ان کے حالات میں در آیا تازہ ترین اور انتہائی غیر متوقع موڑ تھا۔ انتہا پسند تنظیم "ہندسینا" کی طرف سے گیتی پر طرح طرح کی الزام تراشیوں اور اس کی مخالفت میں کئی جلوس وریلیاں نکالنے کے بعد اب اس کا کیرئیر ختم کرنے کے لیے بھی خصوصی کوششیں کی جارہی تھیں۔ ہندسینا کی طرف سے دھنراج ورما کے ساتھ ساتھ دیگر کئی ہدایت کاروں سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ گائیتری دیوی کو اپنی فلم سے "کٹ" کر کے کسی دوسری اداکارہ کو "کاسٹ" کیا جائے جو کہ "دیش دروہی" ہونے کی بجائے "دیش بھگت" ہو اور اس سلسلے میں بھی زیادہ دباؤ دھنراج ورما پر تھا کیونکہ فلم انڈسٹری میں وہی اس کے "گاڈ فادر" اور سب سے بڑے ہمدرد کے طور پر جانے جاتے تھے۔ اب صورتحال یوں رہی کہ ایک ہی دن میں باقی تمام ہدایت کاروں اور پروڈیوسرز نے کہ جن کی فلمیں گیتی نے ماضی قریب میں سائن کی تھیں گیتی کو ان سے الگ کرنے کا اعلان کر دیا۔ کوئی بھی "ہندسینا" کے مقابل ڈٹنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی وجہ ہندسینا کا وہ داغ دار ماضی تھا کہ جس میں سینما گھروں کی توڑ پھوڑ سے لے کر کسی کے بھی گھر کے جلاؤ گھیراؤ اور تشدد یا قتل وغارت تک کی مثالیں شامل تھیں۔ ہواؤں کو تیزی سے رخ بدلتے دیکھتی گیتی کی پریشانی کا سبب فی الوقت باقی فلموں سے آؤٹ ہونا نہیں بلکہ

دھنراج ورما کی فلم میں موجود ہونا تھا۔ وہ اس لیے کہ باقی سب کے اسے فلموں سے کٹ کرنے کے باوجود دھنراج ورما نے اسے اپنی فلم سے باہر کرنے سے قطعاً انکار کر دیا تھا اور ہند سینا کے مطالبے کو بالکل خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کی موجودگی کے یقینی ہونے کا بیان بھی جاری کیا۔ اب ہند سینا کے ماضی کو مدنظر رکھتے ہوئے گیتی کو یقین تھا کہ پہلے انہیں دھمکیاں دی جائیں گی اور پھر مختلف پہلوؤں سے کئی نقصانات بھی پہنچائے جا سکتے ہیں۔ اسے کسی بھی طور یہ سب گوارا نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی "اپنے" کو اس کی بدولت کسی بھی قسم کا کوئی گزند پہنچے۔

"سر آپ میری بات پر دھیان تو کریں۔ اس فلم کے لیے میں انیواری (لازمی) نہیں۔ وہ آتنک واد سے جڑے لوگ ہیں تو میرے کارن آپ سے بھی دشمنی کرنے لگیں گے۔ مان جائیں بات۔ مجھے اس فلم سے الگ کر دیں۔ ابھی تو کوئی ایک منظر بھی نہیں فلمایا گیا مجھ پر۔ پلیز۔۔۔"

مختلف حیلوں سے انہیں ان کا مطالبہ مان لینے پر قائل کرتی وہ ملتجی لہجے میں بولی تو غصے سے سرخ آنکھیں لیے وہ تیزی سے بولے۔

"میں بتا چکا ہوں گیت کہ ان کی بات مان کر تمہیں اس فلم سے نکالنا اسمبھاؤ ہے۔ یہ بات تمہارے اہم ہونے کے ساتھ ساتھ میرے اصولوں کی بھی ہے۔ اپنی فلم کی کاسٹ پر میں کسی سے "ڈکٹیشن" نہیں لے سکتا۔ مجھے خوب پتا ہے کہ مجھے کس کے ساتھ فلم بنانی ہے یا کس کے ساتھ نہیں۔ تم بیچ میں نہیں بولو اب۔ مجھے اسے اپنے طریقے سے ڈیل کرنے دو۔ ان کے کہنے پر آج تمہیں الگ کروں گا تو کل یہ کسی اور کو الگ یا کاسٹ کرنے پر زور دیں گے۔ کیا ہر بار ان کی بات مانی جائے گی؟ کیا ہر بار میں اپنی مرضی ان کے ضد کے آگے بیچ کر دوں گا؟؟ نہیں ہو سکتا گیت۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

ان کے لہجے کی قطعیت پر وہ لب بھینچ کر باری باری ناز اور رامیش کی طرف دیکھنے لگی جو کہ دھنراج ورما کے ہی ہم خیال تھے۔

"سر ٹھیک کہہ رہے ہیں گیت۔ چپ رہ کر انہیں خود ہی اس سب کو حل کرنے دو۔ تمہارا بیچ میں بولنا معاملے کو جلدی سلجھنے نہیں دے گا۔ اور پھر ساری فلمز سے تو کٹ ہو چکی ہو تم۔۔۔ اس وقت اس فلم کے سوا تمہارے ہاتھ میں بالی وڈ کی اور کوئی فلم نہیں۔ اور پھر۔۔۔"

اس کی خاموش نظروں کے جواب میں، حقیقت پسندی سے کام لے کر ناز نے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے یہاں تک ہی کہا تھا کہ اس نے اس کی بات اچک لی۔

"میرے لیے یہ بات بالکل بھی اہم نہیں ہے ناز کہ میرے ہاتھ میں اس وقت کتنی فلمیں باقی ہیں اور کتنی نہیں۔ میرے کیریئر کو یونہی تمام ہونا ہے تو چلو یونہی سہی۔ کوئی بھی شے ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے بھلا؟؟ نہیں ناں؟؟ تو اس وقت میرے لیے سب سے اہم بس یہ ہے کہ ورما سر کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔۔۔ کوئی تکلیف نہیں ہو۔ اور مجھے فلم سے کٹ کر کے سر اگر پوری فلم انڈسٹری کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں تو یہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اس وقت ہر کوئی یہی چاہتا ہے شاید۔"

دوٹوک لہجے میں بات مکمل کرتے ہوئے اس کا لہجہ بتدریج یاسیت میں ڈھلا تو احترامی نگاہوں سے دھنراج ورما کو دیکھتی، گفتگو ادھوری چھوڑ کر وہ جھٹکے سے اٹھی اور اپنے جالی دار دوپٹے کا ایک کونا مٹھی میں دباتی ہوئی صوفوں کے گرد گھوم کر سرعت سے ٹیرس کی جانب بھاگ گئی۔

اس کا انداز عجب بے بسی کا مسکن تھا۔ سب کی گردنیں اس کے ساتھ ساتھ مڑیں اور اسے روکنے کو اٹھایا گیا ناز کو ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔

"چھوڑ دو ناز۔ اسے سوچنے کو وقت دو۔ خود ہی سمجھ جائے گی۔ کل سویرے شیتل اور وجے بھی کپاڈو کیہ پہنچ جائیں گے تو اسے سمجھانا آسان رہے گا۔"

دھنراج ورما کی فیصلہ کن آواز پر اس نے ایک نظر رامیش کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ مبہم مسکرائے۔ وہ ہمیشہ ان سے بحث کرنے کی بجائے یونہی فرمانبرداری سے سر ہلا دیتی تھی اور اس کی اس ادا پر اکثر وہ خواہش کرتے کہ کاش گیتی بھی جوابی دلائل دینے کی بجائے ان کی بات یونہی بنا حیل وحجت کے مان جایا کرے۔

"بس اب اٹھو یار۔۔۔ اس کا اگلے پورے ہفتے کا شیڈول کینسل کر کے باقی اداکاروں کے اہم سینز ترتیب دو اور رات تک سارے پیپرز مجھے میری میز پر چاہئیں۔ اس سمسیا سے نکلنے تک اب کام تو نہیں روک سکتے۔"

اور پھر رامیش کو مخاطب کر کے گفتگو سمیٹتے ہوئے وہ بھی اٹھے، مڑ کر ایک نظر ٹیرس کی ریلنگ تھامے کھڑی گیتی

کو دیکھا اور تیز تیز قدموں سے چل کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ رامیش بھی فوراً سے پیشتر ان کے پیچھے ہولیا تو وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے ایک طویل سانس بھر کر ناز نے اسے دور تاریک آسماں میں جھانکتے دیکھا۔

کپادوکیہ پر اتری شب کی تمام تر سیاہیاں اسے گیتی کے ارد گرد محوِ رقص دکھائی دیں اور اس سے مزید گفتگو کا ارادہ موخر کرتے ہوئے سر جھکائے وہ تادیر وہیں چپ چاپ بیٹھی رہی۔

☆......☆......☆

یہ اس سے اگلے روز کا ذکر ہے کہ یونیورسٹی میں پہلی دو کلاسز لینے کے بعد وہ چاروں بائکس پر سوار ہو کر تاریخی مقامات کی جانب روانہ ہوئے۔ ثومیہ آج مصطفین کے ساتھ بیٹھی تھی جبکہ مریم اور سفیر اکٹھے جا رہے تھے۔ ایک ساتھ وہاں پہنچ کر پارکنگ میں بائکس لگانے کے بعد وہ لوگ باہم گفتگو کرتے آگے پیچھے چلتے ہوئے بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کی جانب بڑھنے لگے۔ ان سب کے چہرے مختلف جذبات کی شورشوں سے مزین تھے اور عجب لے پر دھڑکتے ان کے دل ایک دوسرے کی حالت سے یکسر بے خبر وانجان تھے۔ تاریخی مقامات کے مشترکہ احاطے سے ان سب نے شاہی قلعے کے مرکزی دروازے کی جانب قدم بڑھائے تو مریم بے ساختہ رک گئی اور عجلت آمیز لہجے میں بولی۔

"اے گائیز ایک منٹ رکو سب پلیز۔۔۔ مجھے شاہی مسجد کے "تبرکاتِ مقدسہ" سے کچھ تاریخیں اور حوالہ جات نوٹ کرنے ہیں۔ آپ میں سے کوئی ایک میرے ساتھ چلے پھر قلعے کے عجائب گھر کے باہر اکٹھے ہوتے ہیں۔"

اس کی بات پر وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور پھر سفیر اور ثومیہ بیک وقت بول پڑے۔

"تم سفیر کو ساتھ لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے مصطفین جاتا ہے تمہارے ساتھ۔"

ثومیہ نے سفیر جبکہ سفیر نے مصطفین کا نام لیا تو مریم بے طرح چونک گئی۔ وہ کل سے محسوس کر رہی تھی کہ سفیر کے والہانہ پن کے جواب میں ثومیہ اسے نظر انداز کر رہی ہے اور اگر نظر انداز نہیں کر رہی تو اس سے اجتناب ضرور برت رہی ہے۔

" کوئی بات نہیں مریم۔۔۔ایسا کرتے ہیں کہ شاہی قلعے کی غلام گردشیں، تہہ خانہ، اور عجائب گھر گھوم کر ان کے متعلق ابتدائی معلومات لے کر پھر سبھی بادشاہی مسجد چلیں گے۔ جگہ بدلے گی تو دلچسپی کا عنصر بھی بڑھے گا۔ کیا خیال ہے؟؟"

بات بدلنے کی کوشش میں درمیان کی راہ سجھاتے ہوئے مصطفین نے باری باری آمنے سامنے واقع بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کی جانب اشارہ کر کے کہا تو جواباً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مریم نے چپ چاپ قلعے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ وہ بھی بات کو بے وجہ طول نہیں دینا چاہتی تھی۔

" نہیں مریم رکو۔۔۔مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ چلو ہم دونوں پہلے مسجد سے ہو آئیں۔ دراصل مجھے بھی مرکزی محراب کے متعلق ایک دو باتیں نوٹ کرنی ہیں۔ ویسے بھی یوں آگے دوڑ پیچھے چوڑ جیسی صورتحال ہو جائے گی اور بعد میں مواد یکجا کرنا بھی مشکل ہوگا۔ رجسٹرز پر ادھر ادھر کی متفرق معلومات کا گندمچ جائے گا۔ مجھ سے تو گڈ مڈ ہو جانا سب۔"

سرعت سے اسے روکتا سفیر کچھ جتاتی ہوئی نظروں سے ثومیہ کو دیکھ کر فوراً پلٹ بھی گیا تو ایک پل کو رک کر ناسمجھی کے عالم میں سب کو باری باری دیکھتی وہ دوڑ کر اس کے پیچھے ہو لی۔

" آؤ چلیں مصطفین۔۔۔کہ یہیں رکنے کا ارادہ ہے؟"

کچھ توقف سے انہیں بادشاہی مسجد کی طرف جاتی روش پر چلتے دیکھ کر ثومیہ نے اسے مخاطب کیا تو شانے اچکا کر یہ کہتے ہوئے وہ قلعے کے مرکزی دیو ہیکل دروازے کی سمت بڑھا۔

" ہاں چلو جناب۔۔۔ایک ہی جگہ کوئی کب تک ٹھہر سکتا ہے بھلا؟"

اور اس کے عمیق تر لہجے سے مفاہیم اخذ کرتی وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ ٹکٹ گھر کے قریب پہنچے تو کھڑکی پر قطار اندر قطار کھڑے بے تحاشا سیاح دیکھ کر وہ "اوہ شٹ۔۔۔" کہہ کر رہ گیا اور پھر ماتھے پر لکیرِ فکر لیے اس کی جانب مڑا۔

" مردانہ قطار بہت طویل ہے یار۔ تم خواتین کی طرف سے دو ٹکٹ پکڑ لو جلدی مل جائیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

جیب سے بٹوا نکال کر اسے کچھ پیسے تھماتے ہوئے وہ پوچھنے کے سے انداز میں بولا تو ایک نظر عوامی ہجوم پر ڈالتی "یس شیور" کہہ کر، اس کے ہاتھ سے پیسے لیے بنا وہ خواتین کی قطار کی طرف بڑھنے لگی۔

"پیسے تو لیتی جاؤ۔۔۔"

اس کی پکار پر وہ دو قدم کی دوری سے پلٹی۔

"میرے پاس ہیں مصطفین۔۔۔تم ٹکٹ لیتے تو یقیناً تمہارے پیسے لگتے۔اب میں لے رہی ہوں تو تم سے لے کر نہیں لے سکتی۔شکریہ۔"

عام سے لہجے میں کی گئی اس کی وضاحت پر وہ کھل کر ہنسا۔

"بڑی خوددار ہو۔۔۔ویسے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں بھی صرف اس لیے دے رہا تھا کہ شاید تمہارے پاس ٹوٹے ہوئے نہ ہوں۔"

اسے ہنستے دیکھ کر اس کے لب بھی بے طرح چٹکے۔

"شاید ہم دوستی میں تکلفات کا شکار ہو رہے ہیں۔یہ اچھی بات نہیں۔خیر۔۔۔تم رکو میں ٹکٹ لے کر آتی ہوں۔"

دوستی میں در آئے محسوسات کا تجزیہ کر کے، ہاتھ کے اشارے سے اسے یہیں رکنے کا کہتی وہ خواتین کی قطار میں جا لگی تو اس کے شوخ لہجے پر اس کے لبوں پر طاری مسکان گہری ہونے لگی۔ایک پل کو تھم کر اس کا لہراتا ہوا آنچل دیکھتا وہ مڑا اور آتے جاتے، رنگ برنگ سیاحوں کے درمیان ایک مخصوص خط پر یہاں سے وہاں چلتے ہوئے سفیر اور ثومیہ کے آپسی رویے کے متعلق سوچنے لگا۔وہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ بہترین دوست ہو کر بھی ان میں ایک غیر محسوس سا کھنچاؤ کیوں کر ہے؟ وہ جانتا تھا کہ ثومیہ اس سے بے انتہا مخلص ہے اور وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ سفیر اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔پھر ایسا کیا تھا کہ وہ اس کی لگاوٹوں سے گریزاں تھی؟ پھر ایسا کیوں تھا کہ وہ اس کے اظہارِ محبت پر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھی؟ کئی سوال تھے جن کے جوابات وہ چاہتا تو ثومیہ سے براہ راست بھی پوچھ لیتا لیکن وہ نہیں پوچھ رہا تھا۔اندر کہیں اس کے دل میں یہ خواہش دبی تھی کہ ثومیہ اسے خود سے یہ سب کچھ بتائے۔

سفیر کا اظہارِ محبت۔۔۔اس کا گریزاں ہونا اور اس گریز کے اسباب۔۔۔سب کا سب۔

انہی سب باتوں کے عواقب و عواطف اور متعلقات سوچتے سوچتے جانے کتنا وقت بیتا اسے کچھ خبر نہیں ہو سکی۔اپنے خیالات سے وہ ثومیہ کی آواز سن کر لوٹا۔

"اے مسٹر۔۔۔کتنی آوازیں دی ہیں کہاں گم ہو کہ سنیں ہی نہیں؟؟ سچ سچ بتاؤ کس کے متعلق اور کیا سوچ رہے تھے؟؟"

اس کے قریب آتی وہ ہاتھ ہلا کر استفسار کر رہی تھی۔

"اوہ۔۔۔سوری یار۔کسی کے بارے میں نہیں بس اپنے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔اور ٹکٹس مل گئے کیا؟؟"

اسے اپنے عین مقابل رکتے دیکھ کر وہ شائستگی سے بولا اور پھر جھوٹ بولنے کے سبب نگاہیں پھیر گیا۔جواباً اس نے دو انگلیوں کے مابین دبے ٹکٹس اس کے سامنے لہرائے۔

"ہاں مل گئے ہیں لیکن بہت مشکل سے ملے۔"

اس کی بات پر اس کے ہاتھ سے اپنے حصے کا ٹکٹ تھام کر وہ گہری نظروں سے اس کی شفاف تر آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"مقصود مشکلوں سے بھی ملیں پر ملیں تو سہی۔۔۔اس جہاں میں ضروریات کا حصول بھی کار دارد ہے ثومیہ۔جی جلانا پڑتا ہے ان کے لیے اور اکثر تو جاں بھی لگانی پڑ جاتی ہے۔"

اور فقرہ اچھال کر اس کے کسی بھی جواب سے پیشتر وہ قلعے کے داخلی "سیکیورٹی چیک گیٹ" کی جانب بڑھ گیا تو آنکھیں جھپک جھپک کر وہ اس کی چوڑی پشت کو تاکنے لگی۔

"عجیب ہے یہ شخص بھی۔۔۔ہر بات میں فلسفہ جھاڑتا ہے۔مجھے اسے مزید جاننا ہوگا۔"

اس کے پیچھے آتے ہوئے وہ خود کلام ہوئی اور پھر قلعے کا پہلا حفاظتی حصار عبور کر کے تیزی سے دوڑ کر اس کی ہمراہی میں چلنے لگی۔اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور کچھ بھی کہے بنا پاس سے گذرتے ایک فرنگی ادھیڑ عمر جوڑے کی طرف دھیان کر لیا۔وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی اور یونہی ایک دوسرے کے بارے میں

مختلف گمان کرتے وہ لوگ قلعے کے مرکزی و داخلی احاطے میں پہنچ گئے۔

"ایک بات کہوں مصطفین۔۔۔؟" اس کے بھاری پپوٹوں کی دلکش اٹھان دیکھتی وہ سوالیہ انداز میں بولی تو اس کے محتاط لہجے پر وہ کسی قدر چونک گیا۔

" کہو بابا۔۔۔ یوں تجسس کیوں پھیلا رہی ہو؟"

جواباً اس نے سرسری لہجہ اپنا کر کہا اور اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل مزید بولا۔

"ان دونوں کے آنے تک چلو شیش محل سے ہو کر آتے ہیں۔ مختلف رنگین شیشوں سے بنا یہ محل بڑا قابلِ دید ہے۔ سنا ہے لوگ دور دور سے صرف شیش محل دیکھنے یہاں آتے ہیں۔"

بات کے اختتام پر اس کے قدم "شیش محل" کی جانب اٹھے تو اثبات میں سر ہلاتی جواباً وہ صرف یہی بولی۔

"چلو دیکھتے ہیں جی کہ شیش محل کے متعلق تمہارا دعویٰ اور لوگوں کا خیال کس حد تک درست ہیں؟"

اس کی بات پر وہ نرمی سے مسکرا دیا۔ پھر وہ لوگ قلعے کی کینٹین سے گذر کر "ہاتھی پیر" کی جانب نکلے اور "قید خانے" کا داخلی احاطہ عبور کر کے اس کے آگے واقع شیش محل کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ اس دوران اس سے بات چیت کے لیے کچھ لفظ ترتیب دیتی رہی۔

"تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ ناں مصطفین۔۔۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تم کون ہو میرا مطلب ہے کہاں سے ہو؟ تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ کتنے بھائی بہن ہو؟ مجھے کچھ بھی تو نہیں پتا تمہارے بارے میں۔"

وہ لوگ محل کی داخلی ڈھلوانی سطح چڑھ رہے تھے جب لہجے کے زیر و بم میں دھیرے دھیرے اس نے کب سے دل میں جاگتے سوال پوچھے تو اس کے قدم بے ساختہ سست پڑ گئے۔ ثومیہ نے واضح طور پر محسوس کیا کہ یکا یک اس کی آنکھیں بھی جلنے لگی ہیں۔

" کیا سوچنے لگے ہو؟؟ میں نے کچھ غلط پوچھ لیا کیا؟"

اس کی حالت دیکھ کر وہ دو قدم گھوم کر اس کے عین مقابل رکی اور اس کا بازو تھام کر اس کی آنکھیں پڑھتے ہوئے بولی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے بارے میں ایسا کچھ خاص نہیں ہے کہ بتایا جائے۔ تم آؤ ہمیں شیش

محل دیکھ کران کی آمد سے قبل واپس عجائب گھر کے باہر پہنچنا ہے۔"
جواباً اس سے نگاہ چرا کر دائیں بائیں دیکھتا وہ ٹالنے کے سے انداز و لہجے میں بولا اور اپنا بازو چھڑوا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے آگے بھی بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تقریباً کھنچتے ہوئے چلتی وہ تحیر سے اس کا بات بدلنا "محسوس" کرتی رہی۔ اپنے سوال کے جواب میں اس کا یہ ردعمل اس کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا پورا کا پورا وجود کسی ان دیکھے اضطراب کہ زد میں آ گیا ہے۔
"دیکھو ثومیہ یہ محل کتنا خوبصورت ہے ناں۔۔۔ مکمل آئینوں سے ڈھکا۔۔۔ قلعے کا سحر گر حصہ۔ اس کی جزئیات و معلومات نوٹ کرنا بھی تمہارے حوالے ہے۔ پھر نہ کہنا بتایا نہیں میں نے کہ تم نے نوٹ کرنا تھیں۔ اپنا رجسٹر نکال لو بھئی۔۔۔"
محل کا طویل احاطہ اور اس کے سامنے واقع قد آور فواروں کی اطرافی روش پار کرتا وہ مسلسل "بات بدلتا" رہا تو اس کے پیچھے کسی داسی کی مانند سر جھکائے چلتی ثومیہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر شیش محل کی جانب دیکھا۔
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔۔۔
شیش محل سچ مچ باندھ لینے والا تھا۔ مسجد کے کسی محراب سے ملتا جلتا یہ طویل القامت نصف گولائی دار محل لاتعداد آئینوں کو حسین تر کاریگری سے باہم جڑ کر انتہائی دلکشی سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اس شاہکار تعمیر پر جا بجا پڑتی سورج کی کرنیں اتنے رنگوں میں منعکس ہو رہی تھیں کہ گویا یہ کوئی "نور محل" ہو۔ ایک پل کو سب کچھ بھول کر اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ آئینوں کا حسن اسے مبہوت کرنے لگا۔
"ارے۔۔۔ یہ سچ میں کتنا خوبصورت ہے مصطفین۔ اللہ اللہ۔۔۔ جلدی آؤ اندر چلیں۔"
بے ساختہ اس سے ہاتھ چھڑوا کر یہ کہتی ہوئی وہ بھاگی اور اس سے بہت پہلے شیش محل میں داخل ہوتی گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کچھ فاصلے سے اسے اتنا مسرور ہوتے دیکھتا ایک پل کو وہ اپنا "اضطراب" بھول گیا اور دھیمی مسکان لبوں پر سجائے محل کے داخلی مرمریں زینوں پر آن رکا۔ وہ بغور اسے خوشی سے جھومتے اور مسلسل گھومتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
"یہاں ہر طرف میں ہوں مصطفین۔ دائیں بائیں، یہاں وہاں، اور دیکھو تو اوپر بھی۔۔۔ چاروں طرف

بس میں ہی میں ہوں۔"

بڑھ چڑھ کر مختلف آئینوں کو چھوتی، منعکس ہوتے رنگ ونور میں نہاتی وہ کھنکتی ہوئی آواز میں اس کے آس پاس گونجنے لگی اور پھر یہاں وہاں اپنی موجودگی کے اشارے کرتی، بھاگ کر دوزینے اترتی اس کے پاس آرکی۔

"مجھے یہاں لانے کا شکریہ دوست۔خود کو جابجا دیکھ کر بہت اچھا لگا مجھے۔"

اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھ میں دباتی وہ اس قدر جوش سے بولی کہ وہ روح تلک سرشار ہوا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ "آئینہ گھر" اسے اتنا پسند آجائے گا۔

"تمہیں اتنا اچھا لگا ہے جان کر اچھا لگا۔آؤ اب اس کی تاریخِ تعمیر پڑھیں۔وہ ادھر مفصل تختی لگی ہے۔"

آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑواتا وہ محل کی ایک دیوار پر لگی نیلی تختی کی طرف اشارہ کر کے بولا تو تفہیمی انداز میں سر ہلاتی وہ اس جانب چل دی۔جبکہ ایک طائرانہ نگاہ چاروں طرف گھماتا وہ وسیع صحن اور محل کی بالکونیوں میں جگہ جگہ کھڑے مختلف النسل سیاحوں کو دیکھنے لگا۔پھر اسے بیگ سے رجسٹر اور قلم نکال کر ان پر وہ معلومات درج کرتے دیکھ کر وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے ساتھ جا رکا۔

"حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس محل کو قلعے میں ایسی جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں سورج کے طلوع ہونے سے لے کر غروب ہونے تک ہمہ وقت دھوپ پڑتی ہے۔کتنی سمجھ بوجھ کی بات ہے ناں؟ تبھی تو لوگ خصوصاً شیش محل دیکھنے یہاں آتے ہیں۔"

مسلسل لکھتی ایک نظر اسے دیکھ کر،اس کی معلومات کے لیے وہ بات برائے بات بولی تو وہ مسکرا دیا۔

"ہاں واقعی۔۔۔یہاں ایسے ایسے عجائبات ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔اور ان آئینوں کی تو ترتیب و تزئین ہی اس قدر باکمال ہے کہ فی زمانہ "موسٹ ماڈرن" ہونے کے باوجود ایسی کاریگری کا حصول ناممکن ہے۔"

اس کے جواب پر ابرو اچکاتے ہوئے شانے جھٹک کر اس نے "سپیچ لیس" کہا اور تیزی سے آخری چند حروف لکھ کر رجسٹر بند کر دیا۔پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ رجسٹر بیگ میں منتقل کر کے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے وہ جانچتی ہوئی نظروں سے مصطفین کا چہرہ اور آنکھیں پڑھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ چلو دوبارہ محل دیکھیں۔"

اس کی نظروں میں تیرتے انہی سب "سوالوں" سے گڑبڑاتا وہ محل کے داخلی زینوں کی جانب پلٹ گیا تو مبہم مسکراتی وہ چپ چاپ اس کے پیچھے ہولی۔محل میں داخل ہو کر وہ اب اسی کی مانند یہاں وہاں اپنے "عکوس" دیکھ رہا تھا۔جبکہ عجب وقار سے چلتی وہ اس کے پاس آئی اور پورے حق سے اسے دونوں شانوں سے تھام کر اپنے مقابل ٹھہرا لیا۔

"کس سے بھاگ رہے ہو مصطفین؟؟ مجھ سے یا اپنے آپ سے؟؟ بتاتے کیوں نہیں ہو اپنے بارے میں؟ چپ کیوں ہو؟ اس طرح تو تم مجھے بہت پراسرار لگ رہے ہو۔"

اس کے یوں ایک دم موڑ لینے پر وہ جو چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا اس کی کھوجی نظروں سے دوبارہ مضطرب ہونے لگا۔ایک پل کو اسے لگا کہ وہ آس پاس موجود ہر ایک آئینہ لیے پورے قد سے اس کے سامنے آن جمی ہے اور یوں کہ فرار کی ہر اک راہ مسدود ہونے لگے۔۔۔یا یوں کہ دامن چھڑانا ناممکنات میں سے ہو۔ اس کی نظروں کا شفاف تر شیشہ اس کی ذات کا ہر پہلو عیاں کرنے لگا تو بمشکل خود کو سنبھالتا وہ عمیق تر لہجے میں بولا۔

"ہر خاموشی کا مطلب پراسرایت نہیں ہوتا ثومیہ۔کبھی کبھی اندر سے بہت خالی ہو کر ہم بے تحاشا چپ ہو جاتے ہیں۔ذات میں لگی گرہیں گنجلک ہونے لگیں تو شور و فغاں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔"

اور اتنا کہہ کر دائیں بائیں دیکھتا ایک طرف رکھی سنگی نشست کی جانب اشارہ کرتا وہ مزید بولا۔

"آؤ وہاں بیٹھ کر مجھے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔کہ تمہارے بہانے اک مدت بعد میں بھی خود سے مل لوں گا۔"

اس کے سرگوشیانہ لہجے میں ایسا کوئی کرب و ملال تھا کہ کچھ بھی کہے بنا وہ میکانکی انداز میں اس کی ہمراہی میں چل کر وہاں جا بیٹھی۔

شیش محل میں پھیلی رنگ برنگی کرنوں میں بیٹھ کر وہ دور افق کے پار کچھ کھوجنے لگا تو اس کی مغموم آنکھوں کا ہر سوگوار دھارا پڑھتی وہ بے طرح اداس ہونے لگی۔

وقت کی ساری پہریں مل کر ان کے آس پاس بکھری صدیاں سمیٹ رہی تھیں تو ساکن ہوائیں اس کے لبوں

کی جنبش پا کر جھومنے کو مضطر تھیں۔ جبکہ "یاد" کے کسی ماورائی رتھ پر رہ کر وہ صحنِ تخیل گھوم رہا تھا۔

☆......☆......☆

گو کہ مریم سے ان کا باقاعدہ تعارف و واقفیت ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور وہ اپنے مخصوص "فرینڈ سرکل" سے نکل کر ان کے ساتھ آتی بھی بہت محدود وقت کے لیے تھی لیکن بطورِ دوست وہ ان سے بھی کافی گھل مل چکی تھی۔ اس کی فطرت کا لاابالی پن اور گفتگو کی برجستگی تھی کہ جو بہت جلد اسے ان سب کے قریب لے آئی۔

بادشاہی مسجد آ کر ان دونوں نے پہلے تبرکات مقدسہ کا دورہ کیا اور وہاں سے ضروری معلومات کے حصول کے بعد مرکزی ہال کی جانب چل دیئے۔ اس دوران اپنے مقالے کے متعلق تفصیلی بات چیت سے لے کر وہ یونیورسٹی کے تھکا دینے شیڈول اور پروفیسرز کے رویہ جات تک پر ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ محراب و گنبد کی "تاریخ وطرزِ تعمیر" کے بارے میں مختلف جزئیات نوٹ کرتے ہوئے مریم مسلسل یہی مشاہدہ کرتی رہی کہ درِ اندرون ہی کہیں سفیر بہت سی متضاد کیفیات کا شکار ہے۔ اس کا چہرہ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یقیناً وہ ثومیہ کے حوالے سے پریشان تھا۔ تقریباً آدھ پون گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد وہ لوگ واپسی کے سفر پر ہوئے تو صحن کے وسطی گولائی دار حوض کے پاس مریم کا پاؤں ایک پتھر کی اونچ نیچ سے رپٹ گیا۔ خود کو بمشکل سنبھالتی وہ ایک جھٹکے سے نیچے بیٹھ گئی اور اپنا پیر مسلنے لگی۔

"کیا ہوا ہے؟ چوٹ تو نہیں لگی؟ دکھاؤ ذرا۔۔۔"

اس سے چند قدم پیچھے چلتے ہوئے گردن موڑ کر مسجد کے اونچی چھتیں دیکھتا سفیر اس کی "آؤچ۔۔۔" کی آواز سن کر تیزی سے اس کے قریب آیا اور اس کے سامنے بیٹھ کر بڑی فکر سے کہتا ہوا اس کا پاؤں ٹٹولنے لگا۔

کسی کو خاطر میں نہ لاتا بظاہر بے حد خاص اور گنجلک سا یہ شخص اس پل مریم کو بہت سادہ و عام لگا۔

"ارے نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں بالکل۔ بس یہاں پاؤں الجھ گیا تھا۔"

سرعت سے اپنا پاؤں واپس کھینچتی، نشاندہی کے طور پر وہ اس پتھر کو باقاعدہ چھو کر بولی تو اسے ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر اٹھاتا ہوا وہ تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

"اوشکر ہے۔ میں پریشان ہو گیا تھا کہ کہیں موچ ووچ نہ آئی ہو۔ خیر۔۔۔ آؤ چلیں اب۔ وہ دونوں منتظر

ہوں گے اور ثومیہ کا تو پتا ہے تمہیں کہ ذرا سی دیری پر بھی بے نقط سنانے لگے گی۔"
اور اس کے متوازن ہونے پر اس کا ہاتھ چھوڑتا وہ آگے بڑھ گیا تو ایک پل کو ٹھہر کر اس کی پشت کو تفکر سے دیکھتی وہ آہستگی سے قدم اٹھاتی اس کے ہمراہ چلنے لگی۔
"مصطفین کا ذکر تو چلو جانے دو سفیر۔۔۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ ثومیہ وہاں منتظر ہو گی؟"
گردن پھیرے اس کی ساحر آنکھوں کے فسوں گر کنارے دیکھنے کی جستجو کرتی وہ سراپا سوال ہوئی تو اس کے لہجے سے جھلکتی کھوج سے بچتا وہ سرسری لہجے میں بولا۔
"بالکل یار۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انتظار کر رہی ہو گی۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو اور وہ بھی یوں کہ جیسے یہ کوئی انہونی بات ہو یا جیسے کہ یہ ناممکن ہے؟"
فی الوقت وہ اسے اپنے راز میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا تو ٹالنے کی خاطر سوال در سوال کرنے لگا۔ جبکہ وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ اس کے محتاط لب و لہجہ پر زیرِ لب مسکراتی، اس کا سوال یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے اور واشگاف لفظوں میں بولی۔
"مجھے ٹالو مت سفیر۔۔۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم دونوں کے مابین کیا چل رہا ہے؟ میں کل سے غور کر رہی ہوں کہ تم دونوں میں کچھ تناؤ سا ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟؟ تم چاہو تو میں کوئی مدد کر سکتی ہوں۔"
اس دوران مسجد کے داخلی دہانے سے باہر نکل کر "شوز اسٹینڈ" پر رکتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی تو شو کیپر کو "ٹیگ کارڈ" تھماتا وہ دلکشی سے ہنس دیا کہ رازلبِ بام ہو رہا ہے۔۔۔ تو قصہ زدِ عام ہو رہا ہے۔
"ہم دونوں کے باہمی رویہ جات پر اتنا غور کرنے کی بجائے اس سے آدھا بھی غور تم مقالے کی تیاری پر کرو تو یقین کرو بنا کسی اضافی کاوش کے ہم بہترین مارکس پا سکتے ہیں۔ اور یہ سب بے جا اندازے ہیں تمہارے۔۔۔ ایسا یا ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ جو بھی اور جتنا بھی چل رہا ہے ہمارے درمیان وہ سب کے سامنے ہے۔ مخفی یا پوشیدہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اب چلیں۔۔۔؟؟"
جوتے پکڑتے ہوئے اس کی سوالیہ نظروں میں جھانکتا وہ انتہائی اعتماد سے جھوٹ در جھوٹ بولتا چلا گیا اور

بات مکمل کر کے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا ہوا تعظیمی انداز میں جھکا۔ مریم کو صاف لگا کہ وہ اب بھی ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔

" چلو جیسی تمہاری مرضی لیکن واضح کر دوں کہ میری یہ آفر بھی صرف محدود مدت کے لیے تھی۔ اس کے بعد اگر کبھی تم مدد مانگنے میرے در پر آئے بھی تو یہ در تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ملے گا۔"

جواباً انگشتِ شہادت کو اس کے سامنے تنبیہی انداز میں جھلاتی، بلند و بانگ دعوے کرتی وہ بڑھی اور اونچے تھڑے سے اترنے والے زینوں پر رک کر ایک نظر اسے ہنستے ہوئے اپنے پیچھے آتے دیکھتی دھپ دھپ زینے پھلانگنے لگی۔ اس کے دعوؤں سے حظ اٹھاتا وہ بھی دوڑ کر اس کے ساتھ ساتھ اترا۔

" یہ تم لڑکیاں اتنے بڑے بڑے بول کیسے بول لیتی ہو؟ نہیں مطلب یہ " در پر آنا " اور پھر اس در کا " ہمیشہ کے لیے بند ملنا۔۔۔" یہ سب کیسے کر لیتی ہو؟؟"

شوخ لہجے میں اسے چھیڑتا وہ درمیانی احاطہ پار کرتے ہوئے شاہی قلعے کی جانب بڑھنے لگا تو اس کے لہجے سے اس کا مقصود بھانپ کر وہ بھی خوشدلی سے ہنس دی۔

" اور کسی کا تو نہیں پتا لیکن میں ضرور کر لیتی ہوں اور کیسے؟؟ بس یونہی۔۔۔ زیادہ مت سوچو اس پر۔ تمہارے سوچنے کو یہی کافی ہے کہ وہ تمہیں گھاس کیوں نہیں ڈال رہی؟ بھلے تم بتاؤ یا نہیں لیکن کچھ تو میں نے دیکھا ہے۔ اور اپنے دیکھے پر مجھے کامل یقین ہے۔"

دوبدو لہجے میں سارا حساب چکتا کرتے ہوئے اس نے گویا ناک سے مکھی اڑائی تو ایک پل کو وہ سچ مچ سنجیدہ ہو گیا۔ بے ساختہ اس کے قدم سست پڑنے لگے۔

" کیا ہوا سفیر؟ اب تمہارے بارہ کیوں بج گئے؟؟ میں مذاق کر رہی تھی یار۔۔۔"

ایکا ایکی اسے سنجیدگی اختیار کرتے دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔ اسے لگا کہ شاید اس کی باتوں سے اس کا دل دکھا ہے۔

زندگی میں یوں ہی ہوتا ہے کہ ہمیں مزاج کے بے ربط موسموں سے آشنا دوست ملیں تو گفتگوئیں جب مرضی نئی روش پر بہنے لگتی ہیں۔

"کچھ نہیں۔۔۔چلو تم۔۔۔"

خفیف سا مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تو ایک لمحے کو ٹھہر کر لبوں کو بھینچتے ہوئے طویل سانس بھرتی وہ بھی اس کے پیچھے ہو لی۔وہ دیکھ سکتی تھی کہ ثومیہ کے ردعمل پر وہ کسی اندرونی "کرب" میں مبتلا ہے۔

☆......☆......☆

شیش محل کے رنگین آئینوں سے پھوٹتی رنگ برنگ روشنی میں بیٹھ کر چپ چاپ دور خلاؤں میں تاکتے ہوئے اسے کافی وقت بیت گیا تو اس کے بولنے کی منتظر ثومیہ نے آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ دھرا۔

"کہاں کھو گئے ہو مصطفین؟؟ تم اپنے بارے میں بتانے لگے تھے۔۔۔"

نرمی سے پلکیں جھپکتی وہ اس کی شفاف تر آنکھوں میں جھانکنے لگی جہاں بے تحاشا یادیں ساکن تھیں۔

"ہاں۔۔۔بتا رہا ہوں۔بس سوچ رہا تھا کہاں سے شروع کروں؟"

خیالات سے چونکے بنا وہیں تاکتا وہ بڑے کرب سے مسکرایا اور پھر کسی "یاد" سے نچڑی ساکت آنکھیں اس کی متجسس نظروں پر جما دیں۔

"کچھ کہانیوں کی کوئی ابتدا نہیں ہوتی ثومیہ۔۔۔میری زندگی بھی ایسی ہی اک کہانی ہے۔سننے والوں کو شاید یہ روایات وامثال سے جڑی وہی عام سی داستان لگے کہ جس میں مرکزی کردار ہمیشہ دھن دولت کا رہا ہے لیکن مجھ سے جینے کی ہر وجہ چھین لینے کے لیے یہ کہانی کافی ہے۔"

یاسیت زدہ لہجے میں اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے انداز سے کوئی غیر معمولی پن بھانپ کر وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔اسے واضح طور پر لگا کہ بہت خاص سے دکھتے اس شخص کا تعارف بھی کوئی "عام" نہیں ہے کہ اس کا لب و لہجہ عجب "راز آشکاری" تھا۔

"میں سن رہی ہوں مصطفین۔۔۔بس بولتے جاؤ۔"

ایک طویل تر ہنکارا بھر کر وہ نئے لفظ جوڑنے لگا کہ اس کے لب سرگوشیوں کی مانند سرسرائے۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ سوائے مصطفین کی صوت کے ماحول میں کوئی اور ہلچل ہو۔

"میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک مضافاتی شہر "رسولنگر" کا باسی ہوں۔ہم دو بھائی بہن تھے۔سکینہ مجھ سے چھوٹی تھی۔میرے بابا" شجاع عباس "انگلینڈ سے واپس لوٹے اور ہمارے آبائی شہر میں بہت سی جاگیر خریدی۔ جس میں دو مکانات، کچھ دکانیں اور پچیس ایکڑ اراضی شامل ہے۔میرے بابا لوگ صرف دو بھائی تھے۔میرے چچا" وجیہہ عباس "میرے بابا کے بہترین دوست بھی تھے۔دونوں بھائی ہمہ وقت ایک ساتھ رہتے۔وجیہہ چچا ہر کام میں بابا کے ساتھ پیش پیش ہوتے تھے۔وہ ہمارے جتنے امیر تو نہیں تھے لیکن چھ سات ایکڑ آبائی زمین پر کھیتی باڑی کی بدولت بہترین گذر بسر تھی۔گوکہ آبائی زمین میں میرے بابا کا حصہ بھی شامل تھا لیکن انہوں نے ساری زمین چچا کے نام کردی۔پورے علاقے میں ان دونوں بھائیوں کے باہمی سلوک اتفاق اور پیار و محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔چچا کی اولاد میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں جو کہ عمر میں ہم دونوں بھائی بہن سے بہت چھوٹے تھے۔ہماری زندگی بہت ہنسی خوشی گذر رہی تھی کیونکہ انگلینڈ سے مستقل طور پر واپس آکر بابا اب پاکستان میں ہی جائیداد کی خرید و فروخت اور دیگر لین دین سے متعلقہ کاروبار شروع کر چکے تھے اور بابا کا یہ کاروبار بھرپور منافع بخش بھی تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں تیرہ اور سکینہ لگ بھگ سات برس کی تھی۔۔۔"

لہجے کے زیر و بم میں یہاں تک کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا تو سنگی نشست پر اپنی اطراف میں ہاتھ جما تا وہ کمر اکڑا کر گردن موڑ گیا۔

زندگی میں بارہا ایسے لمحات آتے ہیں کہ جن سے بندھ کر ہمیں اشک چھپانے کے لیے دنیا سے رخ پھیرنا پڑتا ہے اور اکثر تو ایسا جبر کرنا ہوتا ہے کہ آنسو اندر اتارنے پڑ جاتے ہیں۔

وہ بھی آنسو چھپا رہا تھا۔۔۔اور خدا جانے چھپا رہا تھا کہ اندر اتار رہا تھا۔

"پھر۔۔۔پھر کیا ہوا مصطفین ؟؟"

اسے خاموش پا کر وہ خدشات سے پر لہجے میں سوال کرنے لگی اور سنگی نشست پر سختی سے جمے اس کے دائیں ہاتھ پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھا۔اسے یقین ہونے لگا کہ وہ کچھ "انہونا" سننے والی ہے۔اس کے دلجویانہ انداز پر گلے سے رطوبتیں نگلتا، خالی خالی نظروں سے وہ اس کی طرف دیکھنے لگا تو اس کے گلے کی ڈوبتی ابھرتی رگوں سے اس نے جانا کہ وہ ضبط کی کسی انتہا پر ہے۔

"پھر سب ختم ہو گیا ثومیہ۔۔۔کچھ بچا ہی نہیں۔میری ماما، میرے بابا۔۔۔اور سکینہ۔۔۔سب ایک ساتھ چلے گئے۔سب کچھ تباہ ہو گیا۔"

انتہائی رنجیدہ خاطر ہو کر اس نے اگلی بات کہی تو اس کے بلکتے ہوئے لہجے میں ایسا کوئی کرب تھا کہ ثومیہ کو لگا کہ اس "آئینہ گھر" کا سارا کانچ ٹوٹ ٹوٹ کر ان پر برسنے لگا ہے۔

"اللہ اکبر۔۔۔کیا ہوا تھا مصطفین۔۔۔؟؟ پلیز مجھے بتاؤ۔"

بے تابی سے کہتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں داب لیا تو اس نے بھی لاشعوری طور پر ہی ان کی مٹھی پر گرفت کر لی۔

اس پل بے قرار لمحات میں گھرا وہ ادھڑے ہوئے جذبات کا حامل شخص اس کے ہاتھوں کی نرماہٹ سے ڈھارسی تقویتیں کشید کر رہا تھا۔

"وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ تھا۔بابا، ماما اور سکینہ ایک گاڑی میں میرے ننھیال سے لوٹ رہے تھے کہ ایک بے قابو ٹریکٹر ٹرالی کی زد میں آ کر ان کی کار پچک گئی۔سب موقع پر جاں بحق ہوئے تھے۔ننھیال میں نانو کے پاس رکنے کی بدولت میں بچ گیا تھا ثومیہ۔۔۔اور پھر تا عمر یہی سوچتا رہا کہ میں وہاں کیوں رکا؟؟"

آنکھوں سے رواں سیل پونچھتا، تیز تیز سانسوں میں یہاں تک کہتے وہ باقاعدہ ہانپنے لگا تو اس کے زخم زخم لہجے میں دبے بین سنتی ثومیہ کو لگا کہ اب سارا کانچ اس کے حلق میں آن چبھا ہے۔

"اف۔۔۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مج۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے مصطفین۔ باری تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔"

کچھ توقف سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے وہ فقط یہی کہہ سکی اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے بے ساختہ اپنا ریشمی دوپٹہ تھام کر سر پر جمانے لگی۔

زندگی میں کچھ حادثات و واقعات ایسے بھی رونما ہوتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر ہم سمجھنے سے بالکل قاصر ہوتے ہیں کہ اتنے بڑے صدمات جھیلتے کسی بھی شخص کے لیے تسلی کے کون سے حروف جڑیں کہ جنہیں پا کر اسے کچھ قرار آئے؟

"آمین۔۔۔ثم آمین۔"

خود کو بمشکل جمع کرتے ہوئے اس نے پورے جذب سے کہا اور پھر آنکھوں سے اشک جھٹک کر مزید بھی کچھ کہنے لگا تھا کہ وہ سرعت سے بول پڑی۔

"یوں ایک بار تو پوری کائنات ہل جاتی ہے۔تم پر تو گویا آسماں ٹوٹ پڑا تھا۔۔۔مجھے بہت زیادہ افسوس ہے مصطفین۔"

اور بات مکمل کر کے وہ بھی آنکھوں میں یکبارگی امڈ آئے آنسو پونچھنے لگی۔اس کی بات پر وہ عجب مجروح سی ہنسی ہنس دیا۔

"ہاں سر کا آسماں تیرہ برس کی عمر میں ٹوٹ پڑا اور پیروں کی زمین اٹھارہ برس پر آکر تب سر کی جب بستر مرگ پر ایڑھیاں رگڑتے وجیہہ چچا نے معافی طلب کرتے ہوئے بتایا کہ میرے والدین اور بہن سکینہ حادثے کا شکار نہیں ہوئے بلکہ انہیں باقاعدہ منصوبہ بندی سے قتل کیا گیا اور ان کے قاتل وہی ہیں۔"

اس کے اگلے جملوں پر ایک پل کے لیے اسے اپنی سماعت پر شبہ ہوا۔اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ انگلی کے اشارے سے اسے روکتا وہ مزید بولا۔

"اس حادثے کے بعد مجھے چچا چچی نے ہی سنبھالا۔بابا کا سارا کاروبار بیچ کر دکانیں، اراضی اور مکانات کرائے پر اٹھا دیئے گئے اور میں چچا کے گھر منتقل ہو گیا۔ننھیال میں بس سمجھو کہ نانو ہی تھیں جو وقتاً فوقتاً میری خبر گیری کیا کرتیں اور ان کے انتقال کے بعد اکلوتے ماموں کو اپنی فوت شدہ بہن کے اس یتیم و یسیر بیٹے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کی جائیداد پر اس کا چچا نگران کے طور پر مقرر ہو۔لہٰذا خونی رشتوں کے نام پر میرے حصے میں فقط ایک چچا کی ذات آئی۔قصہ المختصر وقت گذرا اور میں سترہ برس کا تھا جب وجیہہ چچا کو اچانک کینسر تشخیص ہوا۔اہم تر بات یہ رہی کہ مرض نے انہیں اندر ہی اندر ختم کر دیا تھا اور وہ بالکل آخری مراحل و مندارج زیست طے کر رہے تھے۔ڈاکٹرز کے بقول ان کے پاس بمشکل نو سے بارہ ماہ یعنی ایک سال تک کا وقت تھا جو کہ ممکنہ علاج کی شروعات سے کسی قدر سہل ہو جاتا اور بس۔انجام بہر طور موت تھی۔اپنی زندگی کے آخری دس ماہ انہوں نے نہایت اذیت میں گذارے۔اپنی رحلت کی شب بھی وہ بہت تکلیف تھے لیکن جاں گسل لمحات میں بھی جان تھی

کہ کہیں اٹکی ہوئی سی تھی۔ بالآخر انہوں نے مجھے بلایا اور اپنی حالت پر رحم کھانے کا کہہ کر معافی طلب کرتے ہوئے بتایا کہ بابا کی کلی جائیداد کے حصول کے لیے انہوں نے ہماری پوری فیملی کو اس حادثے میں مار دینا چاہا تھا لیکن میں نانو کے گھر قیام کی بدولت بچ گیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ سازش سراسر ان کی رچی ہوئی تھی اور اس میں چچی سمیت خاندان برادری کا دوسرا کوئی بھی فرد شریک نہیں رہا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ بعد میں کبھی وہ مجھے بھی مارنے کی کوشش ضرور کرتے لیکن بابا کے ایک دوست وکیل نے بابا کی وصیت پیش کی تو انہیں معلوم پڑا کہ کسی بھی ناگہانی کی صورت میں بابا کی کل جائیداد بالغ ہونے کے بعد میری اور سکینہ کی ہو جاتی اور سن بلوغت سے قبل اگر مجھے یا سکینہ کو بھی کچھ ہو جاتا تو یہ جائیداد خاندان کے نزدیکی افراد میں تقسیم ہونے کی بجائے ایک معروف ٹرسٹی ادارے کی ملکیت میں چلی جاتی لہٰذا انہیں اپنے مذموم عزائم سے باز رہنا پڑا۔ اب چونکہ سکینہ بھی اس حادثے میں جہانِ فانی سے گذر گئی تھی تو بابا کی ساری جائیداد کا میں اکیلا وارث قرار پایا۔"

لہجے کے زیروبم میں انتہائی شکست خوردہ انداز میں یہاں تک کہہ کر اس نے ایک طویل سانس بھرا تو وہ اس کے اجڑے ہوئے چہرے سے نگاہ چرا کر شیش محل کی چھت کے آس پاس اڑ اڑ کر شور مچاتی چڑیوں کی جانب دیکھنے لگی۔ اسے لگا کہ وہ اس کے غم میں اس کے ساتھ نوحہ کناں ہیں۔ آسمان کی وسعت میں جھومتی ہوا بھی اس کے دکھوں پر گویا اس " آئینہ گھر " کے بام و در سے سر پٹخنے لگی تھی۔

کچھ توقف سے اس نے دوبارہ مصطفین کے کپکپاتے ہاتھ کو چھوا تو اندر ہی اندر گھلتا وہ مدھم لہجے میں پھر سے بولنے لگا۔

" وجیہہ چچا کا بابا سے اتنا پیار تھا کہ کسی کو ان پر شک نہیں ہوا۔ کچھ وہ حادثہ ہوا بھی ہمارے ننھیال کی علاقائی حدود میں تھا تو کسی کا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ یہ حادثہ کوئی سوچی سمجھی سازش بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کے سان و گماں تک میں نہیں ہو سکتا تھا کہ چچا ان سب کے قاتل ہیں۔ خیر۔۔۔ دمِ آخر خود سے معافی طلب کرتے چچا کے آس پاس ان کی جوان سال بیٹیوں کو دیکھ کر میں نے ان کو معاف کر دیا۔ کیسے نہ کرتا کہ جو میرے ہاتھوں میں کھیل کر ہر پل مجھے بھائی بھائی کہتی بڑی ہوئی تھیں آج میرے سامنے ہاتھ باندھے اپنے مرتے ہوئے باپ کی گذرتی سانسیں آسان کرنے کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ میں چچا جیسا سنگدل نہیں ہو سکا۔ بچپن سے اپنے

والدین اور لاڈلی بہن کو کھونے کے بعد لوگوں کے مختلف رویہ جات سہہ سہہ کر میں عمیق تر جذبات ومحسوسات سے بندھ چکا تھا۔تو بس میں نے انہیں معاف کر دیا اور خدا سے ان کی سختیاں دور کرنے کی دعا کر دی۔ چچا کی تجہیز وتدفین کے بعد میں وہاں نہیں رکا اور ان کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ میں انتقام لیتا بھی تو کس سے کہ اس جرم کا واحد مجرم اپنے قدرتی انجام کو پہنچ چکا تھا۔ چچا کے بچے جو کہ مجھ سے بھی بہت چھوٹے تھے اور اس جرم میں شامل بھی نہیں تھے تو ان پر کیا مقدمہ کرتا یا ان سے کیا انتقام لیتا۔۔۔؟؟ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔کبھی بھی نہیں۔اور یہی میرا تعارف۔۔۔میرا کل ماضی اور میرا ہر حوالہ ہے ثومیہ کہ میں ساری زندگی اپنوں کا متلاشی رہا ہوں۔میں رویوں سے بہت جلد پگھل جانے والا انتہائی جذباتی شخص ہوں جو اس بھری کائنات میں کچھ پرخلوص رشتوں کا متمنی ہے۔اس سے زیادہ میری "کہانی" یا حقیقت کچھ بھی نہیں۔آج تم نے پوچھا تو اپنی زیست سے وابستہ ان نمناک اوراق کو بڑی مدت کے بعد پلٹا ہے۔"

مغموم لہجے میں بات مکمل کرتے ہوئے اس کا لہجہ بتدریج متحمل ہوتا گیا اور آخر پر خاموشی اختیار کر کے وہ ساکتی نظروں سے اس کی رنجور آنکھوں میں جھانکنے لگا۔اس کے حسین تر چہرے پر بے تحاشا اداسیوں کا رقص دیکھتی وہ اندر سے خالی ہونے لگی۔

"سگے رشتوں سے "تعلق" مفقود ہوتے دیکھ کر جینا کتنا مشکل ہو جاتا ہے ناں؟؟ میں اکثر سوچتی تھی کہ تم اتنے حساس کیونکر ہو؟؟ آج سمجھ آ گیا ہے سب۔ مجھے بہت افسوس ہے یار۔یقیناً تمہارا درد میرے لفظوں کی ہر حد سے ماوراء ہے لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گی مصطفین کہ ماضی کی گرم ریت مسلسل چھانیں تو حال کے ٹھنڈے ذرے بھی ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔ پھر پورے وجود میں خاک اڑاتا مستقبل صاف دکھائی دیتا ہے۔اب یہ ہم پر ہے کہ ہم ماضی میں رہ کر اپنا حال بھی گذار دیتے ہیں یا حال میں رہ کر اپنا مستقبل سنوار لیتے ہیں۔تو بس یہی ہے کہ خود کو کسی نہ کسی طرح مصروف رکھو۔ ماضی میں کم از کم جایا کرو۔ دیکھو تو دنیا میں کئی لوگ ہوں گے جنھیں تمہارے جیسے حساس دل سہارا دے سکتے ہیں۔لوگوں کے غم بانٹ کر اپنا "غم غلط" کر لو۔نمرہ میری چھوٹی بہن "ایک ولن۔۔۔" نامی کسی بھارتی فلم کا ایک مشہور ڈائیلاگ اکثر دہراتی ہے کہ "جب تک ہم کسی کے ہمدرد نہیں بنتے، ہم درد سے اور درد ہم سے جدا نہیں ہوتا۔" اور یہ بالکل سچ ہے یار۔درد سے جدا ہونے

کے لیے اکثر درد میں رچنا پڑتا ہے۔ خود اذیتی سے قطع نظر کئی بار اذیت ہی اذیت سے رہائی ہوتی ہے۔ یہ دنیا ہے دوست۔۔۔ یہاں تو بس یہی کچھ ہے۔"

کچھ توقف سے ایک ہنکارا بھر کر نہایت پراثر لہجے میں اس نے دھیرے دھیرے بات مکمل کی اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے آہستگی سے چھوڑ دیا۔

بغور اس کا حرف حرف سنتا، جواباً وہ کھوکھلی ہنسی ہنس دیا اور اسی اداس لہجے میں بولا۔

"ہاں۔۔۔ میں تب سے یہی سب کر رہا ہوں یار۔ بالکل ٹھیک کہتی ہو تم بھی اور تمہاری بہن نمرہ بھی۔"

یہاں سکوت بھر کر ایک پل کو اس نے کچھ سوچا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں مزید کہا۔

"مجھے سوتے سے جگاتے ہوئے میرے بال سنوارتی میری ماما اکثر ایک جملہ کہا کرتی تھیں کہ "زندگی راستوں میں رہ جائے تو تم منزلوں کو پالینا۔۔۔ وہاں راستوں میں رہ جانے والی یہی زندگی تمہیں والہانہ گلے لگا لے گی۔ کبھی نہ دور جانے کے لیے۔۔۔" اور یہ فقرہ تب مجھے بے وجہ لگتا تھا اور شاید ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن وقت گذرتا گیا اور یہ جملہ اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ میری زیست میں پورے قد سے آن رکا۔ اب عالم یوں ہے کہ سویرے جاگتے وقت ماما کے یہ الفاظ مجھے ہر روز یاد آتے ہیں اور سمجھو کہ انہی سے جینے کا سلیقہ سیکھ کر آگے بڑھنے کی کاوشوں میں ہوں۔"

اس گفتگو کے آخر پر نرمی سے مسکراتا وہ یکدم اٹھا اور اس کے سامنے ہاتھ بڑھا کر سر کی ہلکی جنبش سے اسے اپنا ہاتھ دینے کو کہا۔ جواباً آنکھوں میں تحیر کی ہلکی سی لہر بھر کر اس نے کھوئے کھوئے انداز میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا گلابی ہاتھ دھرا تو شائستگی سے اس پر گرفت کرتا، اسے کھینچ کر اٹھاتا وہ سرسری لہجے میں بولا۔

"اب چلیں ثومیہ۔۔۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ دونوں عجائب گھر کے باہر آنے والے ہوں گے اور کیا خبر آ بھی چکے ہوں۔"

اور اٹھ کر چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ثومیہ کو لگا جیسے وہ کسی اور جہاں سے لوٹی ہے۔ اس کا ماضی کھوجتے ہوئے وہ سچ مچ بھول چکی تھی کہ تاریخی مقامات پر ان کے ہمراہ سفیر اور مریم بھی آئے ہیں۔ موضوع کیا بدلا ان کا تو جہان بھی بدل گیا تھا۔

"تمہاری ماما کی بات کس قدر خوبصورت اور زندگی سے قریب تر ہے مصطفین۔۔۔اس سے کوئی بھی جینے کا طریقہ کشید کر سکتا ہے۔یہ تو گویا ہر کسی کے لیے ہے۔"

رخ پھیر کر اپنی پشت پر دور ہوتے شیش محل کو دیکھتی وہ اس سے منعکس ہوتے رنگ و نور کو گویا اپنے لہجے میں بھر بھر بولی اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے لہراتے ہوئے بالوں کو موڑ موڑ کر چوٹی بنانے لگی۔

"یہ بھی بالکل صحیح کہا تم نے۔واقعی یہ لفظ ہر کسی کے لیے ہیں۔"

جواباً اس نے خوشدلی سے کہا تو اسے لگا وہ اب خود کو سنبھال چکا ہے۔اور اسے بالکل ٹھیک لگا تھا۔اسے اپنے دکھ سنا کر اس کا دل کسی قدر شانت ہو گیا تھا۔

"اچھا یہ تو بتایا ہی نہیں تم نے کہ آج کل کدھر قیام ہے تمہارا؟ بھئی یہاں اندرون لاہور کہاں میرا مطلب ہے کس کے پاس رہتے ہو؟؟"

وہ لوگ شیش محل کی داخلی و خارجی ڈھلوان (واحد راستہ) اتر رہے تھے جب اس نے اگلا سوال کرتے ہوئے اس کا چہرہ پڑھا جہاں یکا یک گویا کئی دیپ جل اٹھے۔وہ بے طرح چونک گئی کہ وہ ہولے ہولے مسکرا بھی رہا تھا۔

"خالہ کنیز میری ماما کی بہت گہری سہیلی تھیں۔ماما اور ان میں سگی بہنوں کا سا پیار تھا بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر۔ہمارے ساتھ پیش آئے اس حادثے سے قبل ہی ان کا سارا خاندان فکرِ معاش میں رسولنگر سے مستقل طور پر لاہور آ گیا تھا لیکن وہ وقتاً فوقتاً رسولنگر آتی رہیں اور چچا کے گھر اکثر مجھے ملنے بھی گئیں۔خیر مختصراً یہ کہ جب میں نے چچا کا گھر چھوڑا تو لاہور آنے کا فیصلہ کیا اور یہاں آ کر کوئی تین سال اچھرہ مرکزی بازار میں واقع ایک ہوسٹل میں گذارے۔پھر بیٹھے بیٹھے ایک روز خالہ کا خیال آیا تو اپنے بچپن کے دوست راجو سے مشورہ کر خالہ سے ملنے کا پروگرام بنایا۔اور جب ملا تو ان میں ماما کی جھلک پا کر سب حالات وواقعات ان کے سامنے عین عین رکھ دیئے۔تسلی دلاسہ دے کر سب سے پہلے تو انہوں نے مجھے ہاسٹل چھوڑ کر اپنے گھر رہنے کا کہا اور میرے مسلسل انکار پر بضد ہوئیں کہ چلو ہاسٹل کا کرایہ تم مجھے ہی دیتے رہنا یعنی بطورِ کرایہ دار آ جاؤ۔تو بس وہ دن اور آج کا دن میں انہی کے گھر رہتا ہوں۔وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔"

اپنے قیام کی تفصیلات بتاتے ہوئے عقیدتوں سے بھرپور لہجے میں اس نے خالہ کا بھی تعارف کروایا تو وہ ان کے اخلاص کی دل سے قائل ہوئی کہ بیگانی ہو کر وہ اپنوں کے ستائے اس شخص کی ڈھارس بنتی رہی ہیں۔

"ان کے شوہر خالو ظفر بھی بہترین انسان ہیں۔ مجھ سے خالہ کی طرح ہی سچا پیار کرتے ہیں۔ اور ان کی ایک بیٹی بھی ہے ایمان راجپوت۔ افف۔۔۔ پوری آفت ہے۔ خالہ خالو سے میرا جتنا پیار ہے اس کا اسی قدر بیر ہے مجھ سے۔ ہر وقت لڑنے مرنے کو تیار۔ مانو جانی دشمن۔ لیکن یہ سب لڑائی جھگڑا مصنوعی ہے۔ درحقیقت وہ بہت اچھی ہے۔ اور اس کے خواب۔۔۔ یقین کرو بہت اونچے اونچے خواب رکھتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس کے بلند افکار سے مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے وہ بہت بڑی ہے جبکہ میرے خیال سے وہ کبھی بڑی نہیں ہوگی۔۔۔"

شیش محل سے انتہائی قریبی مقام "ہاتھی پیر" گذر کر وہ لوگ اس کی عقبی کینٹین کی جانب بڑھ رہے تھے جب وہ خالو اور ایمان کے بارے میں بتانے لگا تو ایمان کے متعلق دلچسپی سے سنتی وہ بے طرح مسکراتی رہی۔ وہ اسے بہت منفرد کردار لگی تھی۔ اس دوران اس کے لبوں پر مسلسل طاری ایک دھیمی سی مسکان دیکھ کر وہ مطمئن ہوگئی کہ کربناک ماضی کھنگالتا یہ شخص حال میں لوٹ آیا ہے۔ ہاں وہ اب بالکل متوازن لہجے میں عمومی طرز پر گفتگو کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

"یہ دونوں کہاں ہیں؟ کہیں دکھائی نہیں دے رہے؟"

عجائب گھر کے باہر واقع مرکزی احاطے میں داخل ہوتے وقت مریم نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور انہیں غیر موجود پا کر سفیر کو مخاطب کیا۔

"ہوں گے یہیں کہیں۔۔۔ شاید عجائب گھر میں ہوں یا وہاں اس سے پچھلے فواروں کے پاس۔"

جواباً سرسری لہجے میں کہہ کر اس نے بے پرواہی سے اس طرف اشارہ کیا جہاں عجائب گھر کے پیچھے تاریخی ہتھیاروں کی نمائش گاہ اور اس کے آگے بلند فواروں سے سجا ایک خوبصورت دالان واقع ہے۔

"ہاں شاید۔۔۔ چلو پہلے فواروں کے پاس دیکھتے ہیں پھر عجائب گھر جائیں گے۔"

اثبات میں سر ہلا کر تائید کرتے ہوئے وہ اسی جانب بڑھی اور پھر تھوڑا فاصلہ طے کر کے کینٹین کے نچلے

احاطے کا چوڑا زینہ چڑھ کر عجائب گھر کے باہر والے اونچے تھڑے پر داخل ہوتے مصطفین اور ثومیہ کو دیکھ کر یکا یک رک گئی۔

اسے رکتے دیکھا تو اپنے دھیان میں چلتا سفیر بھی ٹھٹک کر رکا اور سوالیہ نظریں لیے اس کی نظروں کے تعاقب میں نکل گیا۔

"وہ آرہے ہیں۔ شاید کینٹین گئے تھے۔ ایک تو یہاں سب کو وقت بے وقت بھوک بہت لگتی ہے۔"

انہیں دیکھتے ہوئے مریم ازراہِ مذاق بولی تو وہ چونکا کہ یقیناً وہ گزشتہ کل میں اسے بھوک لگنے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

"بھئی بھوک پر کوئی اختیار تھوڑی ہے؟ مجھے تو خود بہت لگتی ہے بلکہ لگی ہوئی ہے۔"

پیٹ پر ہاتھ رکھتا وہ کچھ دفاعی اور کچھ شرمسار سے انداز میں بولا تو اس کے چہرے پر چھائی بے چارگی دیکھتی وہ شدت سے ہنس دی۔

"ہاہاہا۔۔۔ دیکھو تو ذرا خود کو۔ یوں لگ رہا ہے گویا ابھی رو دو گے۔"

منہ پر ہاتھ رکھتی وہ جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تو رخ پھیر کر بے طرح مسکراتا وہ نزدیک آ چکے مصطفین اور ثومیہ کی جانب بڑھ گیا۔

"کیسا رہا وزٹ؟ کام ہو گیا پورا؟ کوئی گنبد یا مینار چھوٹا تو نہیں کہ جس کا گھیر تم نے نہیں ماپا ہو؟ اب ایسی بھی کیا باریک بینی سفیر؟ بقول تمہارے ہی کوئی حفاظتی حصار تھوڑی باندھنا ہے ہم نے۔ اک مقالہ ہی تو لکھنا ہے۔"

ادھر اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کے سامنے آن رکی ثومیہ نے دھڑا دھڑ سوال کیے تو اس کے والہانہ انداز پر وہ دل سے سرشار ہوا۔ اس کی ہر توجہ اسے آج کل یونہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جبکہ مصطفین انہیں ایک ساتھ رکتے دیکھ کر مبہم مسکراتا چپ چاپ چند قدم پیچھے کھڑی مریم کے پاس چلا گیا۔

"ہاں تقریباً ہو گیا کام۔ الحمدللہ۔۔۔ اور یہ تو جب مقالہ پیش ہو گا یا جب اس کے بارے میں سوالات ہوں گے تو ان اضافی معلومات کا کمال دیکھنا تم۔ میں آگ لگا دوں۔ بالکل سچ۔۔۔"

جواباً مصطفین کو آگے بڑھتے دیکھتا، حسین آنکھوں میں کئی شوخیاں بھر کر وہ اپنے مخصوص اعتماد سے کہنے لگا

اور پھر اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل مزید بولا۔

"خیر چھوڑو یہ سب تو بعد میں۔ پہلے یہ بتاؤ کیا کھایا پیا ہے؟ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔"

اور پھر ایڑھیاں اٹھا کر وہ تھڑے کے پار کینٹین کے وسیع احاطے میں جھانکنے لگا جہاں رنگین چھتریوں تلے جا بجا کھانے کے میز سجائے گئے تھے۔

"ارے۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں کھایا۔ ہم کینٹین سے نہیں شیش محل سے واپس آ رہے ہیں۔ اس کی تاریخ وتعمیر اور دیگر تفصیلات ومشاہدات لکھ لیے ہیں۔ تم بھی ندیدوں کی طرح بھوک بھوک کی رٹ چھوڑو اور پہلے کچھ کھانے کے قابل ہونے جوگا کام تو کر لو۔ چلو شاباش۔ کسی بھی اضافی سرگرمی یعنی کھانے یا پینے سے قبل ہمیں عجائب گھر دیکھنا ہے۔"

اس کی بات پر ایک پل کو مڑ کر واپس کینٹین کی طرف دیکھتی، تحیر سے آنکھیں پھیلاتی وہ اسے گھور کر بولی اور پھر دھونس جماتے ہوئے سختی سے اس کا بازو تھام کر کھینچتی ہوئی ان دونوں کی طرف لے جانے لگی۔

"یہ دونوں ایک ساتھ کتنے اچھے لگتے ہیں ناں۔۔۔؟"

بغور ان کی "اٹکھیلیاں" دیکھتے مصطفین نے یہ سرگوشیانہ آواز سنی تو چونک گیا اور پھر مریم کو کھوجی نظروں سے اپنا چہرہ پڑھتے پا کر نرمی سے مسکرا دیا۔

"ہاں۔۔۔ بہت اچھے اور بے حد خوبصورت۔"

اس کے جواب پر اس کی آنکھوں کی "معنی خیزی" بڑھنے لگی تو وہ بہت محبت سے انہیں اپنی سمت آتا دیکھنے لگا۔

"یار یہ بڑی ظالم لڑکی ہے۔ اچھا خاصا پلان بن رہا تھا میرا کہ سب کینٹین چلتے ہیں لیکن محترمہ کا کہنا ہے پہلے مواد جمع کرو پھر پیٹ پوجا ہو گی۔ اب یوں کام تھوڑی ہوتا ہے کہ جب پیٹ کے چوہے دھمالوں میں مگن ہوں؟"

دہائیاں دیتا وہ ان کے سامنے آیا تو اس کے دلنشیں لب ولہجہ پر سب ہنس پڑے۔ ہنستے ہوئے بھی مصطفین باری باری ان دونوں کے چہروں پر بکھری دھنک دیکھتا رہا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو بھائی؟ اتنا حسین لگ رہا ہوں کیا؟؟"

اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے سفیر نے شریر لہجے میں پوچھا تو اس کے ابروؤں کی دلکش تان دیکھتا وہ بھی نہایت برجستگی سے بولا۔

"ہاں بہت حسین۔۔۔سوچ رہا ہوں تم اب تک زندہ کیسے ہو؟ بھئی ہمارے ہاں تو اتنے پیارے بچے اپنے بچپن میں نظر لگ کر ہی مرجایا کرتے ہیں۔"

اور اس کے دوبدو انداز پر ان سب کا ایک مشترکہ قہقہہ گونجا۔

اب اس سے قبل کہ ان سب میں سے کوئی بھی مزید کچھ بھی کہتا یا پوچھتا ایک وجیہہ و دراز قد لڑکا ان سے کچھ قدموں کی دوری پر آن رکا اور نہایت شائستگی سے گویا ہوا۔

"ایکسکیوز می آل۔۔۔کیا میں کچھ بات کرسکتا ہوں؟؟"

اور اس کی پکار پر ان سب نے بیک وقت مڑ کر اسے دیکھا۔ گلے میں "نائیکون" کا کوئی بہت جدید کیمرا لٹکائے بڑے اعتماد سے ان کے مقابل کھڑا، باری باری ان سب کو بغور دیکھتا وہ یقیناً کوئی فوٹوگرافر تھا۔

"جی برادر ضرور۔۔۔آپ کو جو بھی کہنا ہے آپ بے جھجک کہیں۔"

چار قدم آگے بڑھ کر سب سے پہلے سفیر نے اسے جواباً کہا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے بعد مصطفین نے بھی صرف مسکرانے پر اکتفا کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا جبکہ ثومیہ اور مریم چپ چاپ ایک طرف کھڑی رہیں۔ وہ بھی متجسس و حیران تھیں کہ اسے ان سے کیا کام ہوسکتا ہے؟

"دراصل مجھے آپ سے ہی بات کرنی تھی۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

تعظیماً جھک کر مصطفین سے ہاتھ ملاتا، اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتا وہ پلٹا اور سفیر کو مخاطب کر کے بولا تو اسے عمیق تر نظروں کے حصار میں رکھتے ہوئے سفیر نے بھی فوراً جواب دیا۔

"جی ضرور کیجیے جناب۔۔۔میرا نام سفیر احمد ہے۔ اینڈ یور گڈ نیم پلیز۔۔۔؟"

اب سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے اس نے اپنی پینٹ کی پچھلی جیب سے بٹوا نکالا اور اسے کھول کر ایک "وزیٹنگ کارڈ" اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں علی مصطفیٰ ہوں سفیر۔ ایک شوبز فوٹوگرامر۔۔۔اور یہ میرا کارڈ ہے۔"

اس کے تعارف کروانے پر اس نے اخلاقاً کارڈ تھام لیا لیکن اس پر ایک بھی نگاہ ڈالے بنا چپ چاپ سوالیہ نظریں لیے اس کی آمد کا مقصد جاننے کا منتظر رہا۔

"میں کل سے بادشاہی مسجد اور یہاں شاہی قلعہ میں ایک کلاسیک شوٹ کے لیے آ رہا ہوں اور آپ کو کئی بار دیکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ میرے لیے کپڑے کے ایک برانڈ کی ماڈلنگ کریں۔ آپ بنے بنائے ماڈل ہو یار۔ اس برانڈ کی ڈیمانڈ ہے کہ کوئی نیا چہرہ ڈھونڈ کر لایا جائے۔ تو اس حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے؟؟"

انکشاف آمیز لہجے میں کہی گئی اس کی اگلی بات پر وہ سب بے ساختہ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے کہ گویا ناسمجھی کی سی کیفیت میں مبتلاء ہو گئے ہوں۔ اس وقت ان سب کے مابین فقط یہی سوال تیر رہا تھا کہ "یوں بھی ہوتا ہے بھلا؟؟"

زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ اپنی راہیں خود متعین کرتی ہے۔ اکثر من پسند مقامات و منازل کی متواتر چاہ رکھ کر بھی ہم انہی راستوں کے پابند ہونے لگتے ہیں کہ جن پر چلنا ہماری زیست میں بنا کسی اضافی کاوش کے اچانک سے در آئے۔

سفیر کو ماڈلنگ کی آفر کر کے وہ فوٹو گرافر انہیں ایک دوسرے کا منہ تاکتے دیکھتا چپ چاپ جواب کا منتظر کھڑا رہا۔

" تمہاری پسندیدگی کا شکریہ برادر۔۔۔لیکن میں کوئی ماڈل نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے شوق ہے کہ میں ماڈلنگ کروں۔اور پھر ابھی تو یونیورسٹی کا بھی پہلا سمسٹر ہے میرا۔ان چکروں میں پڑ کر تعلیم کا حرج ہو گا لہٰذا معذرت کہ میں ماڈلنگ نہیں کر سکوں گا۔"

بالآخر کچھ توقف سے سفیر نے اسی کے انداز میں بنا رکے ایک ہی جملے میں اپنا عذر بیان کیا اور معذرت خواہانہ انداز میں وزیٹنگ کارڈ واپس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ہاتھ آگے کیا۔اس کے انکار پر مریم اور ثومیہ نے لاتعلقی سے شانے اچکا دیئے جبکہ اس فوٹو گرافر کا منہ اتر گیا۔اب اس سے قبل کہ وہ کارڈ واپس تھامتا یا کچھ بھی مزید بولتا، مصطفین سرعت سے بڑھا اور سفیر کے ہاتھ سے کارڈ جھپٹ لیا۔

" ارے رکو یار۔۔۔اتنی جلدی کاہے کی ہے؟؟ بات کرتے ہیں ناں اس پر۔مزید سوچتے ہیں کچھ۔۔۔میرا تو بچپن سے خواب تھا کہ میرا بہترین دوست کوئی ماڈل واڈل ہو۔اور تم پر تو اداکاری بھی چلے گی۔ٹھیک ہی تو کہتا ہے بھائی کہ بنے بنائے ماڈل ہو تم۔سچی برو۔۔۔بڑے دلکش ہو۔"

اور ایک آنکھ مارتے ہوئے یہاں اسے حیران چھوڑ کر وہ کارڈ پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتا اس فوٹو گرافر سے مخاطب ہوا۔

" کیا نام بتایا تھا بھائی نے......؟ ہاں علی مصطفٰی۔۔۔تو علی بھائی بات یوں ہے کہ ماڈلنگ یہ ضرور کرے گا آپ کے لیے لیکن کوئی درمیان کی راہ نکالو یار۔جس سے اس کی تعلیم کا حرج بھی نہ ہو اور آپ کا کام بھی چل جائے۔کیا ایسا کچھ بھی ممکن ہے؟؟؟"

ابرو اچکاتے ہوئے انتہائی بااعتماد انداز میں اس سے پوچھتا اس پل وہ سفیر کو خود سے کہیں بڑا اور سمجھدار لگا۔

" لیکن یار وہ ہماری یونیورسٹی اور شیڈول۔۔۔تم جانتے تو ہو کتنا سخت ہے سب؟ پھر ایسے کیسے ہو......"

اس نے دوبارہ تردد کیا تو اب کی بار مصطفین کو آگے بڑھتا دیکھ کر مریم بھی تیزی سے اندر آئی اور اس کی

بات درمیان سے ہی اچک لی۔

"ایسے یا ویسے کچھ بھی نہیں سفیر۔ بس طے ہو گیا کہ تم ماڈلنگ کرو گے اور ضرور کرو گے۔ بھئی آج کل تو لوگ شوقین ہوتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں کہ ایسے مواقع میسر آئیں۔ جبکہ تم ہو کہ نخرے کیے جا رہے ہو۔ یعنی کہ حد ہی ہو گئی خود پسندی یا اپنے آپ میں رہنے کی۔"

اس کے شانے پر دھموکا جڑتی وہ بھرپور استحقاق سے بولی تو سب کو چھوڑ کر وہ بے بسی سے ثومیہ کی جانب دیکھنے لگا۔ جانے کیوں لیکن اس پل اس کے اندر ہی کہیں یہ خواہش سر اٹھانے لگی کہ وہ بھی اسے یوں ہی دھونس سے کہے کہ "ہاں" کر دو۔ لیکن اس کے دیکھنے پر اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کرتے ہوئے بس سر جھکا کر مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"بتاؤ یار۔۔۔ اب تو میرے ووٹس بڑھ گئے ہیں۔"

اسے مسلسل خاموش پا کر علی مصطفٰی نے دوبارہ کہا اور پھر مریم اور مصطفین کو باری باری دیکھتے ہوئے بولا۔

"تھینکس ٹو بوتھ آف یو۔۔۔ میرے لیے شاید یہ بہت ضروری تھا۔ کیونکہ میں ایک عرصے سے ایسے ہی کسی لڑکے کی تلاش میں ہوں۔"

اس کی بات پر مریم نے مسکراتے ہوئے "ویلکم اینڈ اٹس اوکے" کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن میرے حصے کا کام اب پھر تم پورا کرو گی میڈم۔ یا تم کرو گے کہ جس کا "بچپن سے خواب" تھا کہ اس کا "کوئی دوست" ماڈل ہو۔ لوگ خواب صرف اپنے بارے میں دیکھتے ہیں بھائی۔ تم دوستوں کو پھنساتے ہو اپنے اوٹ پٹانگ خوابوں میں۔ حد ہے یہ بھی۔"

آخر کار اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے باری باری ان دونوں کو گھورا اور مبہم مسکرا کر علی مصطفٰی سے "ڈن" کے طور پر ہاتھ ملایا۔ اس کی بات پر وہ سب شائستگی سے ہنس دیئے تو ان کے چہروں پر بکھرا گلال دیکھتا علی مصطفٰی ان کی سچی دوستی کا دل سے قائل ہوا۔ گو کہ وہ ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت سے بے خبر تھا لیکن کچھ تعلقات اپنے ہونے کا یوں بھی بنا اظہار پتا دیتے ہیں۔

"تھینکس سفیر۔۔۔ اب صورتحال یوں ہے کہ تمہیں سٹوڈیو آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم پرفیکٹ ہو۔

اور مجھے نہیں علم کہ آپ لوگ یہاں کیوں آتے ہو روز؟ لیکن اگر کل بھی آنا ہے آپ لوگوں نے تو میں کچھ ملبوسات لیتا آؤں گا کیونکہ کلاسک طرز کا وہ فوٹو شوٹ مجھے یہیں ان غلام گردشوں اور بارہ دری میں کرنا ہے۔ اس طرح تمہارا بھی وقت بچے گا اور میرا بھی۔ پہلا اور ٹیسٹ فوٹو شوٹ ہو گا یہ۔اس کا پورٹ فولیو اس برانڈ کو بھیجوں گا اور ان سے اجازت پا کر مزید کام ہو گا اس پر۔کیا کہتے ہو تم؟؟ یوں آسان رہے گا؟؟"

مکمل جزئیات سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے مسلسل اس کی ساحر آنکھوں میں جھانکا اور ان سے چھلکتی بے پناہ چاشنی سے لبریز ہو کر دل ہی دل میں خود کو اس انتخاب کی داد بھی دیتا رہا۔

"ہاں یہ مناسب ہے بالکل۔دراصل ہم لوگ یونیورسٹی سے ملے ایک مقالے کی تیاری کے سلسلے میں ہر روز یہاں آتے ہیں اور امید واثق ہے کہ اگلے کئی روز تک آتے رہیں گے۔تم لے آنا بھائی کل جو بھی لانا ہوا۔۔اور اگلے مراحل بھی تم ہی جانو کہ کیا کیا ہیں؟ میں صرف یہ چاہتا ہوں اس سے میری تعلیم متاثر نہ ہو۔"

جواباً وہ قدرے سرسری اور بے پرواہ لہجے میں بولا تو ایک نظر ان سب کو دیکھتے علی مصطفٰی نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"او کے ہو گیا جناب۔مجھے اپنا نمبر لکھوا دو تا کہ میں رابطہ کر سکوں۔اور میرا کارڈ تو ہے ہی تمہارے پاس۔ اس پر میرا موبائل نمبر، ایڈریس اینڈ سٹوڈیو ز نیم سب درج ہے۔"

اور پھر جیب سے موبائل نکال کر وہ اس کے نمبر بولنے کا منتظر ہوا تو سفیر نے ٹھہر ٹھہر کر اسے ہندسے لکھوا دیئے۔

"اچھا دوستو۔۔۔ملتے ہیں کل ان شاءاللہ۔خدا حافظ۔"

نمبر لکھتے ساتھ ہی بنا کسی توقف کے اس نے ان دونوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور مریم اور ثومیہ کی طرف سر کی مدھم جنبش سے تعظیمی خم دیتا پلٹ بھی گیا۔اسے دور تلک جاتا دیکھتے سفیر نے ایک طویل سانس خارج کی اور دمکتا ہوا چہرہ لیے مسلسل مسکراتے مصطفین کی جانب مڑا۔

"دیکھ لے جگر۔۔۔تیرے خوابوں کی زد میں آ گیا ہوں میں۔دیکھتے تم ہو خواب اور پورے مجھے کرنے پڑتے ہیں۔عجیب تر ہے۔"

اور اس کی بات پر اسے عمیق تر نظروں کے حصار میں رکھتے ہوئے اس نے بھی دوبدو لہجے میں کہا۔

" کوئی کسی کے خوابوں میں نہیں ٹکتا میرے دوست۔ یہ تعبیروں کی مہربانی ہے کہ وہ کہیں اور آن رکتی ہیں۔ رہی بات اس ماڈلنگ کی تو جسٹ چل یار۔ بس شغل ہی لو اس کو۔ تم نے کون سا" کیریئر" بنانا ہے اس میں۔"

اس کی بات سن کر دھیرے سے چلتی ثومیہ پہلی بار ان تینوں کے مابین آئی اور سفیر کے مقابل رک کر ایک بھرپور نظر اسے دیکھا۔

" جب سب کہہ رہے ہیں تو پورے دل سے ہاں کرو سفیر۔ کچھ کام ہمیں دوستوں کے لیے بھی کر لینے چاہئیں۔ دیکھو تو کتنے خوش ہیں یہ دونوں۔۔۔"

نرم لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ان دونوں کی طرف اشارہ کیا تو اشارے کو اٹھا اس کا وہی ہاتھ تھام کر وہ بھرپور فریفتگی سے بولا۔

" ہاں وہ خوش ہیں ثومیہ۔۔۔ لیکن تم؟؟ کیا تم خوش نہیں ہو؟؟"

اس کا مخمور لب و لہجہ عجب سی بے تابیوں کا حامل تھا۔

" میں بھی خوش ہوں پاگل لیکن ہاتھ تو چھوڑو۔ اتنے زور سے دبا دیا ہے۔"

اپنا ہاتھ واپس کھینچ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے سینے پر مکا جڑتی وہ اپنا ہاتھ مسلنے لگی تو ان دونوں کو یوں "باہم مصروف" ہوتا دیکھ کر مصطفین اور مریم خاموشی سے عجائب گھر کی جانب چلنے لگے۔ اپنے اپنے طور پر ان دونوں کی کہانی سے مکمل آگاہی رکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اس کہانی کی سمتیں بھانپ رہے تھے۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا کہ لمحات کے فسوں گر ساحلوں پر سر پٹختی کئی کہانیاں سمندری شوریدہ لہروں کی مانند ایک مخصوص جگہ پر آ کر اپنا زور کھونے لگتی ہیں۔

☆......☆......☆

شیتل اور وجے کمار گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کانزپیٹ پہنچ گئے تھے۔ تب تک دھن راج ورما فلم یونٹ کے ساتھ شوٹنگ اسپاٹ پر جا چکا تھا لیکن گیتی اور ناز ہوٹل میں ہی ان کی منتظر رہیں۔ ان کی آمد کی بدولت انہوں نے بھی باہر "سیر سپاٹے" سے گریز کیا تھا۔ والدین کو سامنے پایا تو ایک پل کو سب کچھ بھول کر گیتی دیر تلک چپ

چاپ ان کے گلے لگی رہی۔ بہت کھوجنے پر بھی انہیں گیتی کے چہرے پر وہ حزن وملال نہیں ملا جو ان حالات کا شکار کسی بھی اور فرد و شخص کے چہرے پر ضرور ہوتا۔ بلکہ کسی بھی پریشانی کی بجائے اس کے چہرے پر عجب سا کوئی عزم رقم تھا۔ یقیناً وہ اب تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ ہاں وہ ان دونوں اور ناز کے ماتا پتا کے متعلق خوب فکر مند تھی کہ کہیں مشتعل مظاہرین کی طرف سے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا گیا۔ وہ بار بار ان سب کی خیریت دریافت کر رہی تھی۔

"میرے کارن آپ کو پارٹی کے اندر بھی سہن کرنا پڑا۔ ایم سوری پاپا۔"

بالآخر مل ملا کر کچھ دیر بعد جب وہ سکون سے بیٹھے تو گیتی نے وجے کمار کو مخاطب کرتے ہوئے شرمسار لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں گیت۔ وہ سب میں دیکھ لوں گا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ کنتو اب ہمیں چنتا ہے کہ جلدی سے اس سمسیا کا اپلن کیا جائے۔"

جواباً نرمی سے کہہ کر انہوں نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا تو وہ ان کی پناہ میں سمٹ سی گئی۔

وہ ان سے یوں چمٹ رہی تھی گویا دنیا سے چھپ جانا چاہتی ہو۔ شیتل اور ناز بھی بغور اس کی اک ایک ادا جانچ رہی تھیں۔

پھر دیر تلک ان سب نے مل کر گیتی کو اس بات کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک پریس ریلیز کے ذریعے اپنا مطمع نظر واضح کرتے ہوئے "ہندسینا" سے معافی مانگ لے۔ بلکہ وجے کمار نے یہاں تک کہا کہ ہو سکے تو ایک آدھ بیان پاکستان کے خلاف بھی دے دے تاکہ جنتا میں بن چکا اس کا تاثر ماند پڑے۔ لیکن نہ تو گیتی نے یہ بات ماننی تھی اور نہ ہی وہ مانی۔ اس کی یہی رٹ تھی کہ میں نردوش ہوں اور اس طرح جھک کر "ہندسینا" سے معافی طلب کرنا اپنی عزتِ نفس کو مارنے جیسا ہو گا جو مجھے کسی بھی طور گوارا نہیں ہے۔

بالآخر طویل مباحثے کے بعد جب ان کی گفتگو اس نہج پر پہنچی کہ اس کی ضد اور ڈھٹائی کے سامنے وہ تینوں تمام تر دلائل سمیت ہارنے لگے تو یہ کہتے ہوئے اٹھتی وہ ٹیرس میں نکل گئی۔

"آپ سب میں سے جو بھی جتنا مرضی سمجھا لے میں اپنے فیصلوں پر قائم رہوں گی۔ کیونکہ میرا جیون مجھے

صرف اپنی شرطوں پر جینا ہے۔میں کسی کی باندی نہیں ہوں کہ جس کا دل کرے منہ اٹھا کر میرے خلاف بولے اور پھر میں اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں۔ایسا بار بار ہو۔۔۔اس سے بہتر ہے بس میں اپنی دھن سے ہٹوں ہی نہیں۔اور میرا وشواس کیجیئے۔۔۔میں نہیں ہٹ رہی۔"

اور اس کے پیچھے اس کے دوٹوک لہجے میں بسی چٹانوں کی سی مضبوطی سے وہ سب سر پٹخ کر رہ گئے۔

گیتی کسی کو بھی کیسے سمجھاتی کہ وہ ان کی بات نہیں مان سکتی۔۔۔؟؟

کیسے بتاتی سب کو کہ وہ خود مان بھی جائے تو اس کی رگ رگ میں بہتی کوئی "جمنا" نہیں مانتی۔۔۔

صرف پاکستان سے محبت کی پاداش میں ملی ہر تکلیف اسے جان سے عزیز تر تھی۔

پھر یوں ہوا کہ دوپہر کے کھانے پر نیچے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جانے کے لیے بھی وہ ٹیرس سے اندر نہیں آئی۔نازا سے بلانے کے لیے لہراتے ہوئے پردوں کے درمیان ٹیرس کی داخلی دہلیز پر آن رکی تو کھٹکا سن کر فضا میں رقصاں پرندوں اور بڑے بڑے رنگین غباروں سے نگاہ ہٹا کر اس نے بس گردن کو ذرا سا موڑ کر اس طرف دیکھا۔

"چلو کھانا تو کھائیں۔آنٹی انکل کھڑے ہیں تمہارے واسطے۔"

اس نے نرمی سے کہا تو گویا ساری دنیا سے خفا کھڑی وہ روٹھی روٹھی سی بولی۔

"میرا من نہیں ہے یار۔آپ لوگ جاؤ۔مجھے بھوک لگی جب تو یہیں منگوالوں گی کچھ بھی۔"

اور بغور اس کے انداز واطوار پرکھتی مبہم ہنکارا بھر کر "اوکے ویل۔۔۔" کہتی ہوئی وہ واپس پلٹ گئی۔اس پل اسے یہی بہتر لگا کہ اس کے اندر جاری جنگ کو جاری ہی رہنے دیا جائے۔شاید کہ اس کے بعد وہ کچھ بہتر فیصلے کر سکے۔اور ناز کے یہ سب گمان وخیالات کسی نہ حد تک تو درست ہی تھے کہ اس دوران اس نے سچ مچ کچھ فیصلے کر لیے تھے۔اب اچھے تھے یا برے؟؟یہ تو وقت بتانے والا تھا۔

اس کے بعد اسی مسئلے کی مختلف جزئیات وتفصیلات پر گفتگو کرتے ہوئے ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے کے بعد وجے، شیتل اور ناز تینوں اسی ہوٹل کا زیرِ زمین واقع شاپنگ مال میں چلے آئے۔بھارت سے ایمرجنسی طور پر نکلنے کے باعث شیتل ٹھیک سے پیکنگ نہیں کر سکی تھیں اور اب انہیں ضرورت کا کچھ سامان درکار تھا۔

شاپنگ مال میں ہم وطن ہونے کی بدولت وہ لوگ ایک بھارتی شخص کی دکان میں داخل ہوئے اور گھوم پھر کر مختلف چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ یہ عین اس وقت کی بات ہے کہ جب ایک زنانہ قمیض اسے پکڑاتے ہوئے شیتل اس پر ناز کی رائے طلب کر رہی تھیں۔ اس پل شرٹ کو اپنے سینے سے لگا کر سامنے لگے قد آور آئینے میں دیکھتے ہوئے ناز کی نگاہ اسی دیوار سے ٹنگی ایل۔ای۔ڈی سکرین پر ٹھہر گئی۔ وہاں کسی بھارتی چینل پر "بریکنگ نیوز" کے طور پر چلتی خبر کی شہہ سرخی اس کے حواس معطل کرنے کو کافی تھی۔

"معروف اداکارہ گائتری دیوی نے ہدایتکار اور پروڈیوسر دھن راج ورما کی زیرِ تکمیل فلم میں کام کرنے سے معذرت کر لی ہے۔"

اور اس کی پتھرائی ہوئی نظروں کے تعاقب میں شیتل اور وجے کمار نے بھی ٹکر ٹکر سکرین کو گھورا کہ جہاں اب اس خبر کی تفصیلات بتائی جا رہی تھیں۔

"آپ کو بتاتے چلیں کہ ابھی ابھی گائتری دیوی کے آفیشل پیج پر اپلوڈ ہوئی ایک وڈیو میں انہوں نے خود یہ پیغام جاری کیا ہے کہ پاکستانی فلم "خدا کے بھگت" کی تاریخیں اپنے گرو دھن راج ورما کی اس زیرِ تکمیل فلم سے کلیش ہونے کی وجہ سے وہ اب اس فلم میں کام نہیں کر سکیں گی۔ آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ دھن راج ورما کی یہ فلم شوٹنگ فلور پر جا چکی ہے اور کپادوکیہ میں اس فلم کا پہلا شیڈول تیزی سے فلمایا جا رہا ہے۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ گائتری دیوی بھی کچھ دن پہلے یونٹ کو جوائن کر چکی ہیں اور اس وقت وہیں ان کے ساتھ موجود ہیں۔ اب فلمی پنڈتوں کا کہنا ہے کہ فلم سیٹس پر موجود ہو کر دیوی جی کا فلم میں کام سے انکار کرنا دھن راج ورما کو بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے......اور......"

خبر دے کر نیوز کاسٹر نے اس پر باقاعدہ تبصرہ و تجزیہ پیش کرنا شروع کر دیا تو اس کے منہ سے نکلتے اک ایک جملے نے ان پر گویا حیرتوں کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ وہ مخصوص چٹ پٹے انداز میں اس خبر کو خوب اچھال رہا تھا۔

بالآخر سب سے پہلے ادھر سے دھیان ہٹا کر خود کو سنبھالتے ہوئے ناز نے ہاتھ میں تھامی قمیض نزدیکی اسٹینڈ پر پھینکی اور شیتل اور وجے کمار کے مقابل رک کر "ہمیں کمرے میں جانا ہوگا۔۔" کہتی ہوئی دکان سے باہر بھاگ گئی۔

پھر لفٹ ڈور کے سامنے رک کر اضطراری انداز میں انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے لفٹ کا انتظار کیا اور بمشکل آدھا منٹ ٹھہر کر اپنے پیچھے ہانپتے کانپتے ہوئے آتی ہوئی شیتل کی جانب بڑھی۔

"آپ اور انکل لفٹ سے آنا پلیز۔میں سیڑھیوں سے جا رہی ہوں۔"

لفٹ کی جانب اشارہ کرتے وہ بے قراری سے بھاگی اور دھپ دھپ سیڑھیوں پر جست بھرتی اوپری منزلوں کو جانے لگی۔ کچھ ہی دیر میں ایک کشادہ راہداری میں بھاگتی وہ اپنے کمرے کے دروازے پر رکی اور ہینڈل تھام کر اندر داخل ہونے سے قبل ایک طویل تر سانس لیتے ہوئے تنفس بحال کیا۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر جونہی وہ اندر داخل ہوئی اطمینان سے صوفے پر بیٹھی گیت اس کے کچھ بھی بولنے سے قبل بول پڑی۔

"کچھ مت کہنا ناز۔۔میں نے جو کیا ہے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

اس کے انداز سے ظاہر ہوا کہ اس کے لیے ناز کا یوں آنا متوقع بات تھی۔

"اوہ۔۔۔اور اتنا سوچ سمجھ کر بھی اگر صرف یہی کرنا تھا تو بہتر تھا کہ تم سوچتی ہی نہیں۔"

دو بدو لہجے میں کہہ کر تیزی سے اس کے قریب آتی وہ اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر مزید بولی۔

"یہاں ہم سب کتنی مشکل، کتنی تدبیروں سے وقت کو پورا اپنے ہاتھوں میں کرنے کا سوچ رہے ہیں اور تم ہو کہ نادانیوں پر نادانیاں کیے چلی جا رہی ہو۔تمہیں اس بات کی تھوڑی سی بھی پرواہ ہے کیا گیت کہ تمہاری وجہ سے ہم سب کس قدر پریشان ہیں؟؟"

آخر پر اس نے اسے دونوں طرف سے باقاعدہ جھنجھوڑ ڈالا تو اس کی غصہ ور آنکھوں سے نظریں ہٹاتی وہ نہایت دل شکستگی سے خود کو اس کی مضبوط گرفت سے آزاد کروانے لگی۔

"تدبیروں سے وقت پورا اپنے ہاتھ میں کرتے لوگ اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں ناز کہ "تقدیروں" کے کچھ نہ کچھ لمحے تو بہر طور ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔میرے پاس اس کے سوا کوئی حل نہیں تھا۔ہند سینا کے روش و کردار سے میں بھی آگاہ ہوں اور تم بھی انہیں جانتی ہو کہ ورما سر جس طرح مجھے اس فلم میں رکھنے پر بضد تھے وہ انہیں کوئی بھاری نقصان ضرور پہنچاتے۔اور میری وجہ سے انہیں مزید کوئی جوکھم اٹھانا پڑے یہ اب مجھے گوارا نہیں

تھا۔"

اپنے "عمل" کے حق میں عذر و تاویل پیش کرتی وہ خود کو چھڑوا کر صوفے پر دوسری جانب جا بیٹھی تو اسی شدت سے تپی ناز دوبارہ جرح کرنے لگی۔

"چلو مان لیا یہ تمہاری مجبوری تھی کہ اگر تم خود سے انکار نہ کرتیں تو وہ ورما سر کو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے۔لیکن اس فیصلے سے پہلے تم مجھ سے یا ہم میں سے کسی سے بھی ایک بار مشورہ تو کر سکتی تھیں نا؟؟ تمہیں تو شاید یہ بھی گوارا نہیں تھا۔"

بات کے اختتام پر اس کا لہجہ شکوہ کناں سا ہوا تو اس کا پھولا پھولا منہ دیکھتی وہ نرمی سے بولی۔

"میں جانتی تھی یار کہ تم یا کوئی بھی۔۔۔ مجھے اس کی اجازت نہیں دے گا۔اسی لیے تمہیں بھی بے خبر رکھ کر صرف خود سے یوں کرنا پڑا۔"

جواباً اس کے لہجے میں دبے پیار سے پگھلتی بھرپور فکر سے یہ کہتی وہ اس کے ساتھ جا بیٹھی۔

"پر تم دیکھو گیت کہ اس طرح تمہاری ذات پر تنقید بڑھ گئی ہے۔انڈسٹری میں تمہاری ساکھ پہلے بھی مضبوط نہیں رہی۔جنتا اور تمہارے ناطے کا عالم یوں ہے کہ وہ تمہارے پتلے جلاتی پھرتی ہے۔پورے ملک میں جگہ جگہ تمہارے خلاف احتجاج ہو رہے ہیں۔اور ایسے میں یہ آخری فلم بھی خود سے چھوڑنے کا فیصلہ " آتما ہتھیا" ثابت ہوگا۔تمہارا کیریئر سمجھو تم خود لپیٹ دو گی۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے۔ٹھنڈے دماغ سے ایک بار پھر سے سوچو گیت۔میرے خیال سے تمہیں اپنا فیصلہ بدل لینا چاہیئے۔"

اور بات کے دوران اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر مسلسل اسے دباتی وہ گویا اپنے لفظوں پر زور بھی دیتی رہی۔ادھر اس کی آخری بات پر نفی میں سر ہلاتی وہ تیزی سے بولی۔

"کچھ لوگوں کو نا تنقید کے ضمن میں صرف ہذیان ہوتا ہے یار۔رائے دیتے ہوئے بالکل نہیں سوچتے کہ مقابل کی ذات ادھڑ سکتی ہے۔خیر انہیں تیر آزمانے دو میں جگر آزماتی ہوں۔اور رہی بات اس فیصلے کی تو پلیز ناز ابھی تو مجھے باقی سب سے بھی بحث کرنی ہے لہٰذا تم اب بات کو جانے دو۔کم از کم تم تو میرے ساتھ ہو لو۔"

آخر پر اس نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا تو اس کی ملتجی آنکھیں پڑھتی ہوئی جواباً اس کے ہاتھ پر محبت

بھری گرفت کرتی وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"آنٹی اور انکل جانے کہاں رہ گئے؟ حالانکہ لفٹ سے آ رہے تھے۔ خیر وہ آ رہے ہیں تو نئے سرے سے اسی موضوع پر ایک لمبی سی بحث کے لیے تیار رہو جاؤ۔ اینڈ مائنڈ اٹ کہ میں اول تو بالکل خاموش رہوں گی لیکن اگر بولنا پڑا تو میں ان کی طرفداری کروں گی۔"

اور اس کی بات پر ہنستے ہوئے وہ جلدی سے بول اٹھی۔

"تو پلیز پھر تم خاموش ہی رہنا یار۔ فار گاڈ سیک۔۔۔"

پھر اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑتی وہ دروازے کی سمت دیکھنے لگی جدھر سے اس کے والدین کی آمد متوقع تھی۔

زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ دوستوں کے مثبت و منفی عوامل سے قائل و معترف نہ ہو کر بھی ہمیں ان کے سامنے خاموش ہونا پڑتا ہے۔

اس پل بغور اسے دیکھتی ناز کے چہرے پر فقط یہی محسوسات رقم تھے۔

☆......☆......☆

عجائب گھر میں بھی سفیر مسلسل اسی کاوش میں رہا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پل ثومیہ کے انتہائی قرب میں گذارے۔ اس کی سنگت میں بسر ہوتا اک ایک لمحہ وہ اپنے ذہن و دل پر چھاپتا رہا۔ اس کی اٹھتی، جھکتی، لرزتی اور کانپتی پلکوں کو مسلسل تاکتے ہوئے، اس کے مسحور کن وجود کے اِرد گرد منڈلاتا وہ گویا اسی کو اپنا محور و مرکز مان چکا تھا۔ اس دوران اس کے سفید گالوں پر ٹوٹتا بے پناہ گلال اس کے سرشار و مسرور اندرون کا غماز و عکاس تھا۔ مصطفین تب سے چپ چاپ اس کی یہ سب لگاوٹیں، بے تابیاں اور وارفتگیاں جانچ رہا تھا جبکہ مریم خاموشی سے اس کی "توجہ" کے جواب میں ثومیہ کا گریز، اجتناب اور جھجک بھانپ رہی تھی۔ ان دونوں کے باہمی تعلق پر ان دونوں کے اپنے اپنے مشاہدات تھے۔

عجائب گھر سے نکل کر انہوں نے واپس شاہ برج محل (شیش محل کا دوسرا نام) جانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں مرکزی احاطہ گذر کر اس سے متصلہ غلام گردشوں میں داخل ہو گئے۔ یہ غلام گردشیں شاہی پائیں باغ کے ساتھ

ساتھ واقع ہیں اور پتھریلی دیواروں پر کچی مٹی کی لیپائی کی بدولت ان میں گردشیں بھرتی ہوا گرمیوں میں بھی ٹھنڈک کشید کرتی ہوئی گھومتی ہے۔ صدیوں سے یہیں کے بام ودر سے لگاتار سر پٹختی ان بزرگ تر ہواؤں سے گلے ملتے ہوئے جانے کیونکر۔۔۔لیکن مصطفین کے قدم سست پڑنے لگے۔ ایسے شکستہ مقامات پر آ کر وہ عجیب محسوسات میں گھلنے لگتا تھا۔ تھوڑا سا چل کر سفیر کو اس کے پیچھے رہ جانے کا احساس ہوا تو دونوں لڑکیوں کو باہم ہلکی پھلکی نوک جھونک کرتا چھوڑ کر وہ بھی مدھم قدموں سے چلنے لگا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے جلدی آنے کو کہا۔

"اتنا آہستہ آہستہ کیوں چل رہا ہے بھائی؟؟ یہیں کہیں گم ہو گیا ناں تو کوئی ڈھونڈنے نہیں آئے گا......"

وہ بالکل پاس آ چکا تو اس نے قدرے لطافت سے کہا۔

"ارے واہ۔ بڑی حرف گری کرنے لگا ہے تو بھی۔ چلو اچھی بات ہے کہ آنی چاہیئے یہ بھی۔۔۔اور مجھے یقین ہے کہ میں یہیں کہیں رہ گیا تو تم سب میں سے کوئی نہ کوئی تو مجھے ڈھونڈنے ضرور آئے گا۔ اب اپنی دوستی پر اس قدر یقین تو میں بہر طور کرتا ہوں۔"

جواباً ایک پل کو وہیں رک کر اس کی شفاف و شریر آنکھیں پڑھتا وہ خاص تر لہجے میں بولا اور اس کے جواب سے قبل اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتا ہوا مزید بولا۔

"میرے گم ہو جانے کا قصہ چھوڑ کر تو بتا تیری" کہانی" کہاں تک پہنچی ہے؟ دوبارہ بات کی اس سے؟؟ کیا کہتی ہے وہ؟؟"

اور اس کی بات پر خود سے چند قدم کے فاصلے پر چلتی ثومیہ کو دیکھتا وہ لب بھینچ کر بس مسکرا دیا۔ اس کی نظروں سے بے خبر وہ انہی کے انداز میں مریم کا ہاتھ تھامے اس کی کسی بات پر بے تحاشا ہنستے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گیا ہے؟؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

اسے خاموش پا کر مصطفین نے تھاما ہوا اس کا ہاتھ ہلا کر پوچھا تو وہ جیسے کسی خیال سے باہر آیا۔ پھر غلام گردش کے ایک شکستہ در سے ٹیک لگاتا وہ رک گیا تو مصطفین نے بھی اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے مقابل دیوار سے اپنا وجود ٹکا دیا۔

"نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دراصل دوبارہ بات تو نہیں کر سکا میں اس سے لیکن۔۔۔"

یہاں اس نے ایک مبہم ہنکارا ابھرا اور اس سے نگاہیں ہٹا کر ثومیہ کی طرف دیکھتا ہوا دوبارہ بولا۔

"لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے دل کی بات نہیں سمجھے گی۔ وہ کبھی نہیں جان سکے گی شاید کہ میرے اندرون کا کیا عالم ہے؟ میں ایک قدم آگے بڑھتا ہوں تو وہ دو قدم پیچھے ہٹتی ہے۔ میں دو قدم پیچھے ہوتا ہوں تو وہ بھاگ بھاگ جاتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں مصطفین کہ مجھ سے اس کا رویہ و انداز تبدیل اگر نہیں ہوا تو محتاط ضرور ہو گیا ہے۔ کہا ناں یار م کہ وہ نہیں جان سکے گی کہ مجھے اس سے محبت تو کیا سمجھو عشق ہو رہا ہے۔۔۔ اور مسلسل ہو رہا ہے۔"

انتہائی یاسیت سے جو ٹھہر ٹھہر کر اس نے بات مکمل کی تو اس کے ملال زدہ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے اپنے اندرون کے خدشات کھول رہا ہے۔ اس پل اس کے لہجے کی رنجیدگی سے جھلکتی سچائی اور اس سچائی سے بہتا کرب مصطفین نے اپنے دل پر عین عین محسوس کیا۔

کچھ توقف سے شانے جھٹک کر اس نے ایک طویل تر سانس بھرا اور ایک نظر مریم کے ساتھ خود سے دور جاتی ثومیہ کی طرف دیکھا۔ وہ دائیں جانب سے چہرے پر لہراتے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں پشت پر پھینکتی کمال تر اداؤں سے لپٹ رہی تھی۔

بالآخر اس سے نگاہ چراتا وہ سفیر سے مخاطب ہوا۔

"یہ محبت بڑی عجیب شے ہوتی ہے دوست کہ اس میں سینے میں دل سے زیادہ تو خدشات دھڑکتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ تمہاری صورتِ حال ہے۔ تم کہتے ہو تمہارے دل میں پلتی ہوئی محبت سے پھوٹتا عشق تمہیں بے قرار کیے دیتا ہے جبکہ اسے خبر بھی نہیں لیکن۔۔۔"

اس کی سحر گر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہرے و عمیق لہجے میں کہتا یہاں یکبارگی وہ رکا اور پھر اپنے آپ ہی میں کوئی فیصلہ کر کے گفتگو ادھوری چھوڑتے ہوئے مریم کو پکارنے لگا۔

"اے مریم۔۔۔ یہاں آنا ذرا۔ ان دونوں کو شاہ برج کی طرف جانے دو۔ آؤ ہم دونوں "قید خانوں" کی تاریخ لکھ لائیں۔ وہ اس طرف ہیں۔"

آخر پر اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

اور اس کی پکار پر چونک کر اس طرف دیکھتی مریم ناسمجھی کے عالم میں کبھی ان دونوں کو اور کبھی ثومیہ کو دیکھتی، اثبات میں سر ہلاتی "او کے" کہہ کر اس طرف آنے لگی تو وہ واپس حیران و پریشان کھڑے سفیر کی جانب متوجہ ہوا۔

"ہاں تو بات یہاں تھی کہ وہ تمہارے دل کی بات سے بے خبر ہے۔ ہاں؟؟"

اس کے سوالیہ انداز پر لاشعوری طور پر اس کا سر اثبات میں ہل گیا تو مبہم مسکراتا وہ پرعزم لہجے میں مزید بولا۔

"دراصل ہر کہیں ہر بات دل کی بات نہیں ہوتی۔۔۔ کچھ باتوں کے لیے جاں سے بھی گذر جانا پڑتا ہے۔ اب ان عشقیہ رموز میں صرف جیامت جلاؤ یارم۔ بڑھو چپ چاپ اور جان تک سے بھی گذرتے چلے جاؤ۔"

بات مکمل کر کے اسے ثومیہ کی جانب دھکیلتا وہ قریب آتی مریم کی طرف دیکھنے لگا تو اس کی باتوں سے اصل مفاہیم اخذ کرتا وہ کھوئے کھوئے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

"ایسی بھی کیا آفت آن پڑی ہے کہ پروگرام بدل دیا؟ یہاں کی معلومات کل بھی لی جاسکتی ہیں۔ بھئی مجھے بھی شوق ہے "شیش محل" دیکھنے کا۔۔۔"

تیز تیز بولتی مریم اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ جھلا جھلا کر پوچھ رہی تھی جب وہ کسی چور کے سے انداز میں اس کی ایک طرف سے نکل گیا تو وہ رک کر بے حد حیرانی سے اس کی چوڑی پشت کو گھورنے لگی۔

"اے لو۔۔۔ اب اسے کیا ہوا ہے؟؟ کیوں پراسراری حرکتیں کر رہے ہو تم دونوں؟؟"

اسے چپ چاپ جاتے دیکھتی ماتھے پر بل لیے وہ مصطفین کی طرف مڑی تو اس کی مشکوک و متجسس نگاہوں سے لطف لیتا وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے محلے کی ماسی خیراں۔۔۔ یہ میرا خیال ہے کہ گذرتے گذرتے قید خانوں کی تاریخ و تعمیر سے متعلقہ معلومات بھی لیتے چلے جائیں۔ پھر وہیں "ہاتھی پیر" سے اتر کر قلعے کے "شاہ برج دروازے" سے باہر نکل جائیں گے۔ کیا کہتی ہو؟؟"

اور اس کے کامیابی سے عذر تراشنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے شبہات نہیں ہٹے تو قید خانوں کی طرف بڑھتی وہ جواباً بولی۔

"خبردار جو مجھے ماسی واسی کہا تو۔کس زاویے سے ماسی لگتی ہوں میں تمہیں؟؟ اور بات تو ٹھیک ہے تمہاری لیکن مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم نے بطورِ اہتمام ان دونوں کو فرصت و موقع عطا کیا ہے؟؟ کیا چکر ہے باس؟؟ سچ سچ بتادو مجھے خودی۔ وگرنہ کھوج تو میں لگا ہی لوں گی۔"

اس کا لب ولہجہ اس قدر خوب تر تھا کہ دل ہی دل میں اس کی ذہانت کا قائل ہوتے ہوئے مصطفین نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

"ہاہاہا۔۔اور کوئی بات نہیں ہے محترمہ۔ جو اور جتنی کہی ہے بس وہی اور اتنی ہی ہے۔ ویسے اسی" کھوج پنے" کی وجہ سے ماسی خیراں کہا میں نے تمہیں کہ ایسی ماسیوں کو محلے کی ساری خبریں ہوتی ہیں۔"

اس کی باتوں سے حظ اٹھاتا وہ مزید ستانے لگا تو اس کا مقصود بھانپ کر وہ بھی خوش دلی سے ہنس دی۔ اس دوران دو وسیع و عریض احاطوں اور سرسبز و شاداب پائیں باغ سے گذر کر وہ لوگ زیرِ زمین واقع قید خانے کے سرنگ نما دروازے پر پہنچ چکے تھے۔

"فضولیات سے گریز کرتے ہوئے چلو اور کام کرو شاباش۔ بتاتی چلوں کہ ان تختیوں کے مندرجات تم ہی نوٹ کرنے والے ہو۔ نکالو رجسٹر اور لکھنا شروع کرو۔ میں ذرا ان بیرونی اونچی فصیلوں کے پار واقع "لاہور" جھانک لوں۔ دیکھوں تو کہاں کھڑے ہیں ہم قلعے میں؟ اوکے؟"

دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں ہدایات دیتی وہ اس کا جواب سنے بنا بیرونی دیوار کی جانب بھاگ گئی تو اس کی ادا پر زیرِ لب مسکراتا وہ شانے پر لٹکا بیگ اتار کر رجسٹر نکالنے لگا۔

" گھر میں ایمان اور یہاں مریم۔۔۔ دو دو استانیاں پائی ہیں تقدیر سے میں نے۔ واہ او ربا۔۔۔ تیریاں شاناں۔۔۔"

پھر ایک خالی صفحہ کھول کر اس پر قلم سیدھا کرتا اور قید خانے کے در پہ لگی اس کی تاریخ سے متعلقہ تختی پڑھتا وہ بڑبڑانے لگا تھا۔

☆......☆......☆

ادھر وہ ثومیہ کے پاس پہنچا تو خوشدلی سے مسکراتی وہ خاموشی سے اس کی ہمراہی میں قدم بڑھانے لگی۔ وہ

بھی بنا کچھ کہے کوئی بات شروع کرنے کے لیے لفظ جوڑنے لگا اور یوں غلام گردشوں میں سرسراتا ہولناک سناٹا ایک پل کو گویا ان دونوں کے مابین بھی در آیا۔

"تو پھر تم نے ماڈلنگ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ہاں؟؟"

کچھ توقف سے ثومیہ نے عمومی لہجے میں بات برائے بات کہا تو اس کی طرف دیکھتا وہ مبہم انداز میں مسکرا دیا۔

"ہاں۔۔۔حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ان دونوں کے اصرار پر ماننا پڑا۔اور پھر تم نے بھی تو کہا ہے کہ مجھے ان کی بات مان لینی چاہئیے۔"

اسی عام سے لہجے میں وہ دھیمے پن سے بولا اور غلام گردشوں کے آخری بوسیدہ وشکستہ در پر رک کر ہاتھ کے اشارے سے اسے شاہ برج محل کو لے جاتی پائیں باغ کی پختہ روش پر اترنے کو کہا۔

"ہمم۔۔۔کہا تو ہے میں نے۔۔۔"

صرف اتنا کہہ کر دو پتھریلے زینے اترتی ہوئی، پختہ روش پر رکتی وہ اس کی جانب مڑی اور اسی کی طرح ہاتھ کے اشارے سے اسے روش پر آگے بڑھنے کو کہا۔اس کے ہو بہو انداز پر اس کے شنگرفی لب کھلے اور تعمیل کے طور پر دو زینے اترتا وہ اس سے پہلے آگے بڑھ گیا۔

"کوئی بات کرو ناں۔اتنے چپ چپ کیوں ہو؟"

اب تین چار قدم تیزی سے چل کر اس کے ساتھ ہوتی اس کے سامنے جھک کر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تو سفیر کو احساس ہوا کہ واقعی ان دونوں کے پاس جیسے گفتگو کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں بچا۔وہ اس سے اپنے اظہارِ محبت کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا۔

"جو باتیں میں کرنا چاہتا ہوں وہ تم سننے کی خواہاں نہیں ہو شاید۔۔۔"

معنی خیز لہجے میں اس نے فقط یہی کہا تو کسی قدر اچھنبے سے اسے دیکھتی ایک پل کو وہ سچ مچ نہیں سمجھ سکی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟

"کیا مطلب؟ بھئی ایسی کون سی باتیں ہیں جو میں نہیں سننا چاہتی؟"

بے ساختہ اس کے لب کھلے تو اس کے نرم لہجے سے ہمتیں کشید کرتا وہ پہلے بغور اسے دیکھنے لگا اور پھر یکا یک اسے بازو سے تھام کر اپنے مقابل روکتا فدائی لہجے میں بولا۔

"تم سچ میں اتنی بے خبر ہو یا بس مجھے چڑانے پر تلی ہو؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں ثومیہ اور۔۔۔ تمہارے جواب کا منتظر بھی ہوں۔"

وہ جو یوں روک لیے جانے پر حیران ہو گئی تھی اس کی بات سن کر اسے کچھ سخت سناتی لب بھینچ کر رہ گئی۔ پھر اپنے بازو سے اس کا ہاتھ جھٹکتی یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"تمہارا شکریہ سفیر کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ لیکن مجھ سے جواباً اس کی توقع نہیں رکھو پلیز۔"

اس کا شکستہ لہجہ عجب بے بسی کا حامل تھا۔

اور اس کے یوں بڑھ جانے پر پتھر ہوا کھڑا وہ ایک پل کو گرد و نواح سب کچھ بھول گیا۔ چند لمحات اسی "خلاء ؟ وسکوت" میں رہ کر اس نے خود کو متوازن کیا اور دھیرے دھیرے چلتا اب روش کے آخری کنارے پر اس کا انتظار کرتی ثومیہ کے ساتھ آن رکا۔

"محبت کا شکریہ مت کہو یار۔ محبت کا کوئی شکریہ نہیں ہوتا۔ محبت ہے یہ۔۔۔ کوئی "احسان" تھوڑی ہے۔"

گہری و عمیق تر نظروں سے اسے دیکھتا وہ اسی لگاوٹ و عقیدت سے بولا تو دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچتی وہ ضبط کی کسی انتہا تک چلی آئی۔

"بس کر دو سفیر۔۔۔ خدارا بس کر دو۔ تم میرے اچھے دوست ہو اور ہمیشہ رہو گے ان شاء ؟ اللہ۔ کیوں ایسی باتیں چھیڑ کر مجھ سے میرا دوست دور کر رہے ہو؟؟ پلیز اب ایسا کچھ مت کہنا۔ میں بالکل نہیں سنوں گی۔"

دوٹوک انداز میں یہ سب کہتی وہ پھر سے آگے بڑھنے لگی تھی کہ سرعت سے اس کا بازو تھام کر اس نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے عین مقابل روک لیا۔

"تم مان کیوں نہیں لیتیں میری بات؟ کیا برائی ہے کہ اگر اسی دوست سے تم محبت بھی کر لو تو؟ بتاؤ ناں مجھے کہ ایسا کیوں نہیں ممکن؟؟ کیا برائی، کیا وجہ یا رکاوٹ کیا ہے؟؟؟ کوئی ایک تو بتاؤ ثومیہ۔۔۔ کیوں کر رہی ہو مسلسل ایسا؟؟"

انتہائی سختی سے اس کے بازو پر گرفت رکھتے ہوئے وہ درشت لہجے میں سوال در سوال کرتا چلا گیا تو اس کی حسین تر آنکھوں میں جل اٹھی آگ سے نظریں پھیرتی وہ بس خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم مجھے تکلیف دے رہے ہو سفیر۔ چھوڑو مجھے۔۔۔ پلیز۔"

اور اس کے چہرے پر نمودار ہوتا کرب جان کر اس نے بھی فوراً سے پیشتر اپنا ہاتھ ہٹایا اور لہجہ بدل کر ملتجی انداز میں بولا۔

"ایم سوری ثومیہ۔۔۔ جانے کیسے میں یوں جارحانہ ہو گیا؟ میرا مقصد تمہیں تکلیف دینا نہیں تھا۔ بہت معذرت یار۔ پلیز معاف کر دو۔"

بات کے اختتام پر اس نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ باندھ دیئے تو ارد گرد جمع ہوتے سیاحوں کو دیکھ کر اپنے غصے پر قابو پاتی وہ فقط یہی بولی۔

"چلو سفیر۔۔۔ مجمع لگ رہا ہے یہاں۔ حد کرتے ہو تم بھی۔ مجھے ڈرا دیا تھا۔"

اور اپنے سامنے بندھے اس کے ہاتھ کھول کر وہ اسے لیے شیش محل کی جانب چلنے لگی۔ اب اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلتا وہ دل ہی دل میں اپنے رویے سے شدید پشیمان ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے غلط ہوا ہے اور انتہائی غلط ہوا ہے۔ اس سے آگے چلتی ثومیہ بھی اسی کے رویہ و انداز پر غور کر رہی تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ غصے کا تیز اور کسی قدر انا پرست بھی ہے۔ چونکہ اس کی ان دونوں خامیوں سمیت اس نے اسے پورے دل سے دوست بنایا تھا لہٰذا وقتی غصہ بجا لیکن اب وہ خود کو متوازن کر چکی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اس سے مزید بات کرے۔

بالآخر جب وہ شیش محل کے داخلی ڈھلوانی راستے کے بالکل سامنے پہنچے تو رک کر اسے بازو سے کھینچتی ہوئی سیاحوں کی قطار سے ایک طرف ہٹاتی وہ وسیع صحن میں لے آئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا جھکا ہوا سر اٹھاتی ڈپٹ کر بولی۔

"میرے سامنے یوں مت کھڑے ہو۔ مجھے پتا ہے تم اتنے فرمانبردار نہیں ہو۔ سمجھے؟ اور اب بتاؤ مجھے کہ تمہیں میری بات سمجھ کیوں نہیں آتی؟ بالکل صاف صاف تو کہہ چکی ہوں تمہیں کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ پھر یوں بضد کیونکر ہو سفیر؟؟ جواب دو۔"

ہوا میں دائیں بائیں ہاتھ جھلاتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بول دیا تو یاسیت بھرے انداز میں مسکراتا وہ چہرہ اٹھا کر دور افق پر تاکنے لگا۔اور پھر کچھ توقف سے اس کی سوالیہ نظروں میں جھانکتا ہارے ہوئے لہجے میں حرف حرف بولنے لگا۔

"محبت بھی عجب ہے کہ انسان کو افکار کی ایسی ایسی نہج پر رواں کرتی ہے کہ اسے آس پاس تو کیا سامنے کی شے بھی دکھائی نہیں دیتی۔محبت میں صریح و روشن اور واضح تر باتیں بھی دھندلا کاسی لگتی ہیں۔کوئی دلیل، حوالہ یا مستند واسطہ۔۔۔ یہ کسی سے قائل نہیں ہوتی، کسی کی حد میں نہیں آتی۔محبت ضد نہیں ہوتی ثومیہ۔۔۔لیکن "ضدی" ضرور ہوتی ہے۔اب اسی محبت کے ہاتھوں بہت مجبور ہو کر اگر میں کچھ غلط بھی کر جاؤں تو تم معافی کا ظرف بنائے رکھنا پلیز۔میں کسی بھی طور تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

بات مکمل کر کے اس سے نظریں چراتا وہ پھر سے آسمان پر رقصاں بادلوں کے گھیر دیکھنے لگا تو اس کے لفظوں سے تپش پا کر وہ دل تو کیا پوری جاں سے پگھلنے لگی۔اسے پہلی بار لگا کہ اس کے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔وہ بالکل نہیں کہہ سکی کہ محبت "یہ" نہیں ہوتی سفیر۔۔۔

اسے لگا اس گفتگو سے فرار کی ہر راہ اب مسدود ہونے لگی ہے۔

اور یہی وہ پل تھا جب صحن کے داخلی دہانے سے اندر آتے مصطفین اور مریم میں سے مریم نے انہیں نام لے لے کر پکارا۔

"ثومیہ۔۔۔سفیر۔۔۔یہاں دیکھو بھئی۔ادھر۔۔۔"

اور اس پل ان کی آمد پر پورے دل سے شکر بجالاتی وہ اسے جواباً ہاتھ ہلانے لگی تو گفتگو کے ادھورا چھوٹ جانے پر سفیر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔وہ شدت سے خواہاں تھا کہ اس بات پر اس کا جواب سنے۔

زندگی میں کچھ جوابوں کی شنید پر وقت ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔

اور اس کی زندگی میں بھی یہ ایسا ہی ایک لمحہ تھا شاید جو اس کی زیست سے وابستہ اہم تر جواب کھا گیا۔

☆......☆......☆

شاہی قلعے سے واپسی پر اپنے مقالے پر مختلف حوالوں سے گفتگو کرتے ہوئے وہ لوگ ہاتھی پیر کے کشادہ

زینے اتر رہے تھے جب سب کو روکتی ہوئی مریم اچانک بول اٹھی۔

"اے رکو یار ایک منٹ۔۔۔ یہ سب تو یونیورسٹی میں بھی ڈسکس ہو جائے گا ابھی کے لیے مجھے بتاؤ کہ ہاسٹل چھوڑنے کون جا رہا آج؟ میری روم میٹس کے ساتھ میرا کوئی آؤٹنگ کا پلان ہے اور لوکل جانے سے میں بہت لیٹ ہو جاؤں گی۔"

اس کی بات پر بنا کسی توقف کے مصطفین ازحد خلوص سے بولا۔

"میں چھوڑ آتا ہوں یار۔ بلکہ روز چھوڑ کر آنے سے بھی انکار نہیں ہے۔"

اور اس کی بات پر شائستگی سے مسکراتے ہوئے اس نے بھی اسی خلوص سے کہا۔

"ابھی کے لیے بہت شکریہ مصطفین۔ کبھی یہاں سے ہم سب کو واپس یونیورسٹی جانا ہو تو ٹھیک وگرنہ روز روز کا جوکھم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ کیونکہ تمہارا گھر تو بہت نزدیک ہے ادھر سے۔۔۔ اور میں جانتی ہوں کہ سفیر کی رہائشی کالونی بھی اسی طرف ہے کہیں۔ یعنی اس لحاظ سے تم لوگوں کو تو دوگنا سفر پڑتا ہے یہ۔ خیر۔۔۔ چلو ابھی۔"

اس کے یوں تجزیہ کرنے پر جواباً وہ بھی کچھ کہنے لگا تھا کہ سفیر بول پڑا۔

"سفر تو دوگنا پڑتا ہے مریم کوئی شک نہیں۔ لیکن پلیز صرف یہ سوچ کر تکلف مت کرو۔ تمہیں اگر لوکل سے دقت ہے تو میری خدمات حاضر ہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ تمہیں ہاسٹل پہنچایا جائے۔ تو بس طے ہو گیا کہ آج مصطفین تو کل میں۔۔۔ اور پھر یونہی کبھی میں تو کبھی یہ تمہیں واپس ہاسٹل چھوڑ کر آیا کریں گے۔ اچھا ہوا کہ آج یہ ذکر بھی ہو گیا ہے۔"

یہاں اس کی بات مکمل ہونے پر تفاخر سے اسے دیکھتی ثومیہ نے بھی ٹکڑا دیا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں مریم۔ اتنی دور لوکل جانے کی بجائے ان دونوں کے ساتھ باری باری جانا مناسب ہو گا۔ یوں بھی مقالہ سب کا ہے تو تم یہ اضافی کرائے کس مد میں بھرو گی بھئی؟ اچھا ہے کہ آفر سے فائدہ اٹھایا جائے۔"

ان دونوں کے اصرار سے وہ جو تردید ونفی کے لیے لفظ جوڑ رہی تھی ثومیہ کے ہلکے پھلکے انداز پر ہنستے ہوئے

خوشدلی سے بولی۔

"اففف۔۔۔میرا واپس جانا تو مسئلہ کشمیر بنا دیا تم سب نے۔اچھا ٹھیک ہے بھئی چھوڑ آیا کرنا باری باری۔ شکریہ کے سوا کیا کہہ سکتی ہوں؟ اب چلو پلیز۔مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھتے ہوئے اس نے انہیں زینے اترنے کو کہا تو اس کے انداز پر بے طرح ہنستے وہ بھاگم بھاگ زینے پھلانگنے لگے۔

"تم کیسے جاتی ہو یہاں سے ثومیہ؟"

ہاتھی پیر سے اتر کر شفاف شاہراہ پر اس کے نزدیکی شاہ برج دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے مصطفین نے اسے مخاطب کیا تو مریم اور سفیر بھی سوالیہ نظروں سے اسی کی جانب تاکنے لگے۔

"میں آٹو سے جاتی ہوں۔میرا کوئی پرابلم نہیں ہے۔ڈونٹ وری۔کیونکہ فتح گڑھ کوئی بہت دور نہیں ہے یہاں سے۔"

اور اس کا جواب سنتے مصطفین کو اس کا انداز عجب دفاع کا سا لگا۔یوں گویا وہ کہنا چاہتی ہو کہ مجھے ہر روز چھوڑ کر آنے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔

"ہمم۔۔۔صحیح۔"

مبہم ہنکارا بھر کر اس نے جواباً فقط یہی کہا تو بغور ان کی باتیں سنتے سفیر کے ماتھے پر لکیرِ فکر ابھری۔

"چلو ثومیہ آج تمہیں میں چھوڑ آتا ہوں۔"

کچھ توقف سے اس نے یہ سوچتے ہوئے کہا کہ آج کے اپنے جارحانہ رویے کی تلافی یوں کی جائے۔

"ارے نہیں یار۔۔۔کہا تو ہے مجھے کوئی پریشانی نہیں یوں جانے میں۔لہٰذا تم زحمت نہیں کرو۔شکریہ"

بے ساختہ اس نے انکار کیا تو اس کے ہر عذر کو رد کرتا وہ دھونس جماتے ہوئے بولا۔

"میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ تمہیں کوئی مسئلہ درپیش ہے۔میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ میری چاہت ہے۔ تم بس چلو چپ چاپ۔"

اور اس کے یوں مصر ہونے پر ایک نظر سب کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے شانے جھٹک کر اس نے بس اثبات

میں سر ہلا دیا۔ سب کے سامنے بات کو طول دینا کسی نئے مباحثے کو دعوت دینے جیسا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ پارکنگ میں پہنچ کر رخصت لیتے ہوئے ایک دوسرے کو الوداع کہہ کر وہ لوگ اپنی اپنی منازل کو چل پڑے۔ واپسی کے اس سفر میں سارے راستے سفیر نے بہت سست روی سے بائیک دوڑائی اور اس کی موجودگی و سنگت کے ہر لمحہ و احساس کو اپنے دل میں بنی خوش گمان جگہوں پر سجاتا رہا۔ ادھر اس کے لپکتے ہوئے وجود سے اٹھتی مہکار سے بے نیاز وہ بس اسی فکر میں تھی کہ اب اسے گھر تک کیسے لے جائے گی؟ اگر شاہجہان عادل بھی اسی وقت کہیں سے پہنچ جاتے جیسا کہ وہ اکثر وقت بے وقت گھر آ جاتے تھے تو اس کا یونیورسٹی جانا یقیناً بند ہو جاتا۔ تمام راہ مختلف سوچوں کے تانے بانے بنتی وہ اس کی آواز پر چونکی۔

"ہم فتح گڑھ پل پر پہنچ رہے ہیں ثومیہ آگے کس طرف جانا ہے؟"

انتہائی نرم لہجے میں وہ پل سے آگے گھر کا راستہ پوچھ رہا تھا۔

"وہ۔۔۔ بب۔۔۔ بس یہیں اتار دینا۔ آگے میں چلی جاؤں گی۔"

اٹک اٹک کر اس کے منہ سے بمشکل نکل سکا تو عین اسی لمحے پل پر ایک طرف بائیک روکتا وہ حیرانی سے بولا۔

"ارے۔۔۔ ایسے کیسے چلی جاؤ گی؟ میں چھوڑ کر آتا ہوں ناں۔ بتاؤ کس طرف ہے گھر؟"

اور کوئی جائے فرار نہ پا کر اس نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے "دائیں جانب ذیلی سڑک پر جانے دو۔" کہہ دیا۔

"او کے باس۔۔۔"

گردن کو مدھم سا خم دیتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے بائیک اس طرف موڑی تو اس نے بے ساختہ اس کے شانوں پر ہاتھ جمایا۔

" آہستہ سفیر۔۔۔ گرا مت دینا۔"

اب اس کے ڈپٹنے پر اپنی "مستی" بھول کر وہ فوراً متوازن ہوا تو اس کی اس فرمانبرداری پر وہ پریشانی میں بھی مسکرا دی۔ پھر ذیلی سڑک پر آ کر اس کی رہنمائی میں گھر کی کالونی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دو مرکزی

چوراہوں سے بائیک گذاری اور بالآخر اس کے گھر والی گلی میں داخل ہو گیا۔

"بس یہیں روک دو۔ یہ میرا گھر ہے۔"

ہراساں نظروں سے گلی میں دور تلک دیکھتے ہوئے اس نے گھر کے عین سامنے رکنے کا کہا تو بائیک روک کر ہیلمٹ اتارتا وہ پہلے چوڑا گیٹ اور پھر گھر کی دو منزلہ عمارت دیکھنے لگا۔

"واؤ۔۔۔ بہت خوبصورت گھر ہے ماشاءاللہ۔"

سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑتے ہوئے اس نے تعریف کی تو وہ بمشکل مسکرا سکی۔

"بہت شکریہ سفیر۔ آؤ نا اندر تم بھی۔ چائے پی کر جانا۔"

اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے آخر اس نے اخلاق نبھایا۔

"نہیں یار پھر سہی۔ دراصل کبھی ماما بابا کے ساتھ آؤں گا۔ ابھی اجازت دو پلیز۔"

بنا کسی توقف معنی خیز لہجے میں انکار کرتے ہوئے اس نے بائیک کو دوبارہ کک لگائی تو دل ہی دل میں اس کے نہ ماننے پر شکر ادا کرتی وہ اس کے جملے میں پنہاں اصل مفاہیم نہیں کھوج سکی۔ مبہم مسکراتی وہ گیٹ کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ بائیک گھماتا وہ مزید بولا۔

"ویسے امامیہ کالونی سے فتح گڑھ کا فاصلہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہے۔ ملنا چاہیں تو ہم آسانی سے مل سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟؟"

اور اب کی بار اس کے عمیق تر لہجے میں بسی شدتوں سے وہ اپنی جگہ جم سی گئی۔ اس کی سحر گر آنکھوں میں جلتا اک ایک دیپ اس سے اپنے جذبوں کا جواب چاہتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ دو قدم واپس اس کے مقابل پورے قد سے کھڑے ہو کر اس کی ساحر آنکھوں کا ریشہ ریشہ پڑھتی وہ بھرپور اعتماد سے بولی۔

"ہم امامیہ کالونی سے فتح گڑھ تک کے فاصلوں پر نہیں رہتے سفیر۔۔۔ ہم کسی کہانی کے وہ کردار ہیں جو صدیوں پار رہتے ہیں۔ بہتر ہوگا تم جلد از جلد یہ بات سمجھ جاؤ کہ یوں تو ہم کبھی نہیں مل سکتے۔ خدا حافظ۔"

اور بات مکمل کر کے ہاتھ سے "آداب" کہتی اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل نہایت سرعت سے وہ اپنے گھر کی دہلیز بھی پار کر گئی تو کچھ کہنے کی خواہش میں اسے روکنے کو اٹھا اس کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔

کچھ دیر بعد ایک پرعزم نظر سے اس کے گھر کی عمارت کو دوبارہ تاکتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے بائیک بڑھائی اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

ناز کے بعد شیتل اور وجے ہوتے یا ان کے بعد دھن راج ورما اور رامیش۔۔۔گیتی کو نہ کسی کی بات سمجھنی تھی اور نہ ہی وہ سمجھی۔ ان سب کے تمام تر دلائل و براہین کے جواب میں بھی اس کی فقط یہی رٹ رہی کہ میرا فیصلہ اٹل ہے اور میں اس پر بہر صورت قائم رہوں گی۔ بالآخر اسے سمجھانے میں ناکام ہو کر دھن راج ورما نے ہنگامی بنیادوں پر اپنی فلم کے لیے بھارت سے کسی اور ہیروئین کو بلا بھیجا جو گیتی کے بعد اس کی دوسری منظورِ نظر تھی۔ اس کے بعد اس نے انڈسٹری کنسرنز اور میڈیا پیپل کے لیے گیتی کے ساتھ ایک مشترکہ وڈیو بیان جاری کیا جس میں باری باری دونوں کی طرف سے بتایا گیا کہ صرف وفقط اس فلم کی تاریخیں گیتی کی پاکستانی فلم سے کلیش ہو جانے کے باعث اب گیتی اس فلم کا حصہ نہیں۔ دھن ورما نے مزید اعلان کیا کہ پاکستانی فلم "خدا کے بھگت" کی تکمیل کے بعد وہ گائتری دیوی کے ساتھ ایک اور کلاسک فلم پلان کرے گا جس میں گیتی لازمی طور پر مرکزی کردار نبھائے گی۔

ادھر پاکستانی ہدایت کار رفیق نواز جو کہ گیتی کے بدلتے ہوئے حالات وواقعات سے لمحہ بہ لمحہ واقف رہا تھا اس سے بھی گیتی نے یہی استدعا کی کہ ان دونوں وڈیو پیغامات کے ضمن میں وہ بھی یہی بیان جاری کرے کہ "خدا کے بھگت" کی بدولت گیتی نے اہم تر ہندوستانی فلم سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

قصہ المختصر۔۔۔اپنے اس سفید جھوٹ کو پورا نبھانے اور مکمل سچ ثابت کرنے کے لیے اپنے ماتا پتا کے ساتھ کپادوکیہ میں صرف دو دن مزید گذار کر وہ ناز کو لیے اپنے مقررہ وقت سے کہیں پہلے واپس پاکستان چلی آئی اور اس سلسلے میں رفیق نواز نے بھی اس سے پورا پورا تعاون یوں کیا کہ اس نے "خدا کے بھگت" کا دوسرا اور آخری شیڈول مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ قبل مرتب کر لیا۔ ان کی پرواز لاہور کے ہوائی اڈے پر ہی اتری تھی اور انہیں لے جانے رفیق نواز خود آیا تھا۔ وہ ان سے پہلے سے بھی زیادہ خلوص ومحبت سے ملا اور ہوٹل پہنچنے تک اس نے گیتی کے حالات میں در آئے تناؤ سے متعلقہ جزئیات پر پوری دلچسپی سے بھرپور گفتگو کی تھی۔

ناز نے محسوس کیا کہ گیتی کچھ چپ چپ ہے۔اس احساس سے اس کا ماتھا ٹھنکا کیونکہ گیتی کی ایسی چپ کا مطلب یہ تھا کہ من ہی من اندر وہ کسی خاص پہلو پر سوچ رہی ہے۔کوئی ایسا پہلو جو سب کو چونکا کر رکھ دے۔اور وہ کیا ہوسکتا تھا؟ بہت کوشش کر کے بھی وہ کوئی اندازہ لگانے میں ناکام رہی کیونکہ اس کے خیال میں مزید "چونکنے" کے لیے اب بچا ہی کیا تھا؟؟ ہر شے تو تہس نہس ہو چکی تھی۔باقی تو کچھ تھا ہی نہیں۔لیکن وہ بھول رہی تھی کہ حالات کیسے بھی ہوں۔۔۔گیتی دنیا کو چونکانے کا ہنر بہر طور رکھتی ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوا۔

پرل کانٹینینٹل ہوٹل کی داخلی راہداری سے گذر کر وہ لوگ مرکزی ہال میں داخل ہو رہے تھے جب تیز تیز قدموں سے بااعتماد انداز میں چلتی گیت نے سرسری سے لہجے میں رفیق نواز کو مخاطب کیا تھا۔

"رفیق صاحب" خدا کے بھگت" کے بعد میرے ساتھ ایک اور فلم بنانے کے متعلق کیا خیال ہے؟"

اور اس کی بات پر "سوئٹ" کی چابیاں اٹھانے "استقبالیہ" کی جانب بڑھتا رفیق نواز ٹھٹک کر رکتا حیرانی سے اس کی نئے نئے عزم سے چمکتی آنکھیں تاکنے لگا۔

" کیا مطلب گیتی جی؟"

ایک پل کو ناسمجھی کے عالم میں ٹھہرا وہ فقط یہی کہہ سکا۔

"ارے بھئی۔۔۔سیدھی سی بات ہے سر کہ میں آپ کے ساتھ دوبارہ کام کرنا چاہتی ہوں اور یقین کیجئے اگر آپ راضی ہوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔"

نہایت سنجیدگی سے کہتی وہ مدھم سا مسکرائی تو اس پل وہ اس کے ماتھے پر درج تمام تر یقین سے جھلکتی "عاجزی" پڑھنے لگا۔وہ بخوبی جانتا تھا کہ تمام تر مشکلات میں گھرا ہونے کے باوجود بھی بھارتی سپر اسٹار گائتری دیوی کو پاکستانی ہدایت کار رفیق نواز کی ضرورت ہرگز نہیں ہوسکتی۔وہ ایک بین الاقوامی ستارہ تھی جبکہ پاکستانی فلم سرکٹ (ان دنوں) بہت محدود تھا۔

اب اس سے قبل کہ جواباً وہ کچھ بھی کہتا ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھتی ناز بول اٹھی۔

"تم کرنا کیا چاہتی ہو گیت؟ تم جانتی بھی ہو کہ ایک ہندوستانی فلم اپنی مرضی سے مسترد کر کے ایک اور پاکستانی فلم میں کام کرنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ کیوں پاگل کر رہی ہو مجھے؟"

اور یہاں ٹھہر کر اس کا جواب سنے بنا وہ رفیق نواز سے مخاطب ہوئی۔

"آپ چابی لے آئیں سر۔ہم وہاں لفٹ کے پاس رکتی ہیں"

اس کی بات سن کر ایک پل کوشش و پنج میں رکتا وہ استقبالیہ کلرک کی جانب بڑھا تو گیتی کا ہاتھ دبوچتی وہ اسے لفٹ کی جانب کھینچ لے گئی۔

"اب اور کوئی "عقل مندی" نہیں کرو یار۔بھگوان کے لیے سوچو اس پر۔تم کلپنا بھی نہیں کر سکتیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔"

لفٹ سے چند قدم پہلے ایک جھٹکے سے اسے اپنے مقابل روکتی وہ بھرپور درشتی سے بولی تو اس کی غصیلی نظروں میں بسی اپنی بے پناہ فکروں کو جانچتی گیت مدھر سی ہنسی ہنس دی۔

"تمہیں کس نے کہہ دیا ناز کہ تم غصے میں اور حسین لگتی ہو؟؟ اس پل تمہاری آنکھیں۔۔۔افف یار افف۔۔۔وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔؟ہاں۔۔۔واللہ مجھے تم سے محبت ہو رہی ہے۔"

پر مزاح انداز میں اس سے لپٹتی وہ اس کے شانوں پر دباؤ بنا کر بولی تو اسے اپنی باتوں کو یوں ٹالتے دیکھ کر ناز لب بھینچ کر رہ گئی۔

"جو مرضی کرو۔۔۔لیکن مجھ سے اب بات مت کرنا۔"

پھر رفیق نواز کو اپنے قریب آتے دیکھ کر تنبیہی انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے اس نے بھرپور زچ ہو کر کہا اور ان دونوں سے پہلے ہی اسی پل کھلتے لفٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے لفٹ میں آئے اور دروازہ بند کرتے ہوئے "سیکنڈ فلور" کا بٹن پش کر کے خاموشی سے انتظار کیا۔ان دونوں کے باہمی برہم انداز سے رفیق نواز سمجھ گیا کہ ان میں اس بات پر بحث ہوئی ہے جو اس کی آمد کے سبب فی الوقت لاحاصل رہی ہے۔خیر "سوئٹ" میں آ کر ایک نشست سنبھالتے ہوئے گیتی نے سلسلہ کلام پھر سے آگے بڑھایا۔

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا رفیق صاحب؟ کیا "خدا کے بھگت" سے فراغت پا کر آپ میرے ساتھ ایک اور فلم بنا سکتے ہیں؟"

اس سوال پر جھجکتے ہوئے وہ ناز کا برہم چہرہ دیکھنے لگا جو ایک جھٹکے سے اٹھ کر گیتی کو گھورتی ہوئی متصلہ ٹیرس کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ اس نے اسے بھی روک لیا۔

"یہیں رکو ناز۔۔۔پلیز۔تمہارا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔"

اور اس کی بات پر وہ اگر اپنی جگہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھی تو واپس بیٹھی بھی نہیں۔ یہاں ان دونوں کی باہمی کشیدگی کو نظر انداز کرتا وہ دھیرے دھیرے گویا ہوا۔

"درحقیقت اسے میں اپنی خوش بختی کہوں گا گیتی جی کہ اگر آپ کے ساتھ دوبارہ کام کرسکوں۔لیکن آپ جانتی ہیں کہ "خدا کے بھگت" کا ہٹ یا خدانخواستہ فلاپ سٹیٹس بھی اس بات پر دلالت کرے گا کہ لوگ بطورِ ایک ہدایت کار اور ایک اداکارہ ہماری کیمسٹری کو بھاؤ دیتے بھی ہیں یا نہیں؟ پھر ایک پاکستانی فلم میں کام کرنے کی پاداش میں پہلے ہی نا صرف آپ کو بلکہ آپ کی فیملی کو بھی بہت کچھ سہنا پڑ رہا ہے۔مجھے آپ کے ساتھ کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میرے خیال سے اس سے آپ کی ساکھ کو مزید نقصان پہنچ سکتا ہے۔اب آپ سوچ لیں کہ کیا کرنا ہے؟"

فکر سے پر لہجے میں پیش کیے گئے اس کے صریح و واضح تر تجزیے پر ناز کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

"تھینک یو سر۔یہی میں بھی اسے سمجھانا چاہتی تھی لیکن یہ ماننے کو تیار نہیں۔پہلے ہی ان گھٹیا لوگوں سے ضد لگا کر یہ اپنا بہت سا نقصان کر چکی ہے۔صرف ان کی دھمکیوں کی وجہ سے ورما سر کی فلم بھی چھوڑنی پڑی ہے اسے۔اور یہ ہے کہ اب بھی سمجھنے کو تیار نہیں کہ یہ ڈٹ جانے کا نہیں۔۔۔تھوڑا سا ہٹ جانے کا وقت ہے۔"

جواباً گیتی کے کچھ بھی مزید کہنے سے پیشتر رفیق نواز کی تائید میں کہتی ہوئی وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی تو باری باری ان دونوں کو دیکھتے ہوئے گیتی بنا توقف کے بولی۔

"آپ دونوں کی ہر بات بجا اور درست ہے۔مجھے اس سے مفر نہیں کہ میری ساکھ اور متاثر ہوگی۔لیکن مجھے کسی کے سامنے جھک کر اپنا کیریئر نہیں بچانا۔یہ میرا حتمی اور آخری فیصلہ ہے جس پر اس قدر تفصیلی اور بارہا بات کر چکی ہوں کہ اب تو یہ موضوع فضول لگنے لگا ہے۔اب آپ بتائیں سر کہ "خدا کے بھگت" کے فائنل سٹیٹس اور میری بنتی بگڑتی ساکھ سے قطع نظر آپ میرے ساتھ دوبارہ کام کریں گے یا نہیں؟"

دوٹوک انداز میں پوچھتے ہوئے اس کا لہجہ بہت سے عزائم کا حامل تھا۔اس کی بات پر ایک پل کو وہ دونوں بالکل خاموش ہو گئے۔رفیق نواز کے ماتھے پر ایک گہری لکیرِ فکر ابھری اور کچھ لمحات کے توقف سے وہ امید افزا لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے گیتی جی۔میں راضی ہوں۔خدا کے بھگت کی شوٹنگز کے دوران ہی میں اگلی فلم کا سکرپٹ لکھ لوں گا اور اس کا "اسٹارٹ ٹو فنش شیڈول" بھی مرتب کر لوں گا۔رہی بات پروڈیوسر ڈھونڈنے کی تو اس کے لیے آپ کا نام ہی کافی ہے۔ہیروئین کیطور پر آپ کی موجودگی کا سن کر بڑے سے بڑا پروڈیوسر اس فلم پر سرمایہ کاری کے لیے تیار ہو جائے۔یعنی اس بار مجھے پروڈیوسر کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہو گی۔"

اس کے جواب پر بغور اس کا حرف حرف سنتی گیت کے لبوں پر انتہائی دلنشیں مسکان طاری ہوئی۔اس کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا گویا اسے اپنی بات مان لیے جانے کا کامل یقین تھا۔اور یہیں ان دونوں کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتی وہ انکشاف آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں آپ کی شاکر و ممنون ہوں رفیق صاحب کہ آپ نے میری بات رد نہیں کی۔بس ایک بات سر۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ اس فلم میں مرکزی کردار نبھانے کے ساتھ ساتھ میں اسے پروڈیوس بھی خود کروں۔تجرباتی طور پر ہی سہی سر لیکن میں اس پر سرمایہ لگانا چاہتی ہوں۔اور بطورِ ہدایت کار آپ چاہیں تو مجھ سے اس کا معاوضہ بھی لے سکتے ہیں اور چاہیں تو فیصدی حساب سے نفع و نقصان کے حصہ دار بھی ہو سکتے ہیں۔جیسے آپ کی مرضی۔ کیا کہتے ہیں؟"

اور اس کی باتوں سے اس دفعہ ناز کو اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا۔جبکہ قدرے چونک کر فوری طور پر سنبھلتا رفیق نواز ایک بار پھر کسی استغراق میں چلا گیا۔

"تم سچ مچ اپنا "مانسک سنتولن" کھو چکی ہو گیت۔مجھے پورا وشواس ہونے لگا ہے۔تم ایسی انڈسٹری میں پیسا "لگانے" چلی ہو سہیلی جہاں سے "کمانے" پر بھی تمہیں کئی حساب چکانے پڑے ہیں۔کچھ تو اپنے حال پر رحم کرو یار۔کہاں پہ رکو گی آخر؟؟"

پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی تو اسے پیار سے دیکھتے ہوئے، دلآویز

لہجے میں اس نے جواباً کہا۔

"نراش مت ہو یار۔ میں پشچات تمہیں اچھے سے سمجھاتی ہوں۔ پرا تھم سر سے بات کرنے دو۔ پلیز۔" ہندی بول کر اس نے گویا اسے ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔

" گھنی خطا پر ہو گیت۔ دیکھنا تم کہ اب بات اور بڑھے گی۔"

جواباً انتہائی بے بسی سے وہ فقط یہی کہہ سکی کہ وہ کچھ بھی سننے یا سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ وہ چپ ہوئی تو گیت نے سوالیہ نظروں سے سوچ میں گم رفیق نواز کی طرف دیکھا۔

" آپ دیکھ لیں گیتی جی۔ مجھے تو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح سے آسانی ہے کہ آپ سے انڈراسٹینڈنگ پہلے ہی بہت ہے۔ مجھے اپنی ڈیمانڈز سمجھانے کے لیے زیادہ کھپنا نہیں پڑے گا۔ لیکن یاد رکھیں کہ پروڈیوسر ہو کر آپ اپنی سر دردی پہلے سے کہیں بڑھا لیں گی۔ آپ کو تو سب پتا ہے کہ بہت بڑی ذمہ داری ہے یہ۔ ہاں رہی بات بطورِ ہدایت کار میری خدمات کی تو آپ کے لیے تو میں بالکل مفت بھی حاضر ہوں۔ جیسا کہ آپ نے "خدا کے بھگت" کے لیے بنا کسی پیشگی مطالبے کے ہاں کہہ دی تھی تو اب میں بھی لگا بندھا کوئی معاوضہ طلب نہیں کر سکتا۔ جیسے آپ چاہیں گی ویسے ہوگا۔"

بالآخر بھرپور سنجیدگی سے رائے دیتے ہوئے اس نے مثبت جواب دیا تو اس نے اسے اپنی ازلی بااعتماد مسکراہٹ سے نوازا۔

" بہت شکریہ سر۔ مجھے آپ سے اسی تعاون کی امید تھی۔ آپ نے جس جرات مندانہ انداز میں مجھے ہر بات پر ہاں کی ہے میرا حوصلہ و مان بڑھ گیا ہے۔ یقیناً ہمارا یہ نیا پراجیکٹ بہترین کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔"

اور یہاں اس کی بات پر شائستگی سے مسکراتے ہوئے اس نے بے ساختہ "ان شاء اللہ۔۔۔" کہا تھا۔

" اور سر ایک بات اور ہے۔ میں چاہوں گی اس فلم کا ہیرو جو کہ آف کورس پاکستان سے ہوگا۔۔۔ وہ بالکل نیا لڑکا ہو۔ اس فلم کے لیے مجھے اپنے مقابل کوئی نیا چہرہ چاہیئے۔ کیا خیال ہے؟"

بات مکمل کرتے ہوئے اس نے ایک اور خواہش ظاہر کی تو ایک پل کو ٹھہر وہ کسی قدر تردد سے بولا۔

" لیکن گیتی جی بڑے پردے پر ایک دم نیا ہیرو اور وہ بھی ایک سپر اسٹار کے مقابل؟؟ کیا کوئی بھی ٹک پائے

گا؟؟ آپ کے سامنے تو کوئی "چلتا پرزہ" بھی بمشکل ٹھہر سکے گا۔ جیسے ابھی "خدا کے بھگت" کے کاشان کو ہی دیکھ لیجیئے کہ وہ بار بار مکالمے بھول جاتا ہے۔ تو کوئی نیا لڑکا کیسے چلے گا؟ پیسا ڈبونے والی بات ہے۔"

اور اس کی بات پر ناز نے جو کہ ان کی گفتگو سنتی مسلسل بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی سکھ کا سانس لیا کہ اس بار اس نے گیتی کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔

"سر یہی تو لالی وڈ اور سنے گورز کو چونکانا ہے ہم نے کہ میرے مقابل کوئی نو آموز کیسے ٹھہر گیا ہے؟ یعنی بھرپور تشہیر کے ذریعے اسی بات کو "کیش" کرایا جائے گا۔ پھر نیا ہیرو ہم کوئی عام سا نہیں دیکھیں گے۔ کوئی ایسا ڈھونڈنا ہوگا جو کم از کم بھی۔۔۔ "دیوتا" تو لگے۔ جس کے ہر ہر منظر پر سکرین سج سج جائے۔ جسے ایک نظر دیکھیں تو پہروں تاکنے کی ہوک اٹھے۔ جو دلآویز، دلنشیں، اور سحر گر سا ہو۔"

مدلل انداز میں بھرپور جوش سے کہتی وہ اس قدر خوش تھی کہ اس کے لہجے میں بسے یقین پر ایمان لاتے ہوئے وہ بے ساختہ قائل ہونے لگا۔

"صحیح ہے گیتی جی۔۔۔ آپ کی فلم ہے۔ جیسا آپ چاہیں گی ہوتا جائے گا۔ اور اس شوٹنگ شیڈول کی شروعات میں ابھی چونکہ تین سے چار روز ہیں تو آپ تب تک ریسٹ کریں۔ لاہور گھومیں پھریں۔ اور اس پر مزید سوچ بچار کر لیں۔ ہاں پرسوں میں آپ کو آپ کی دادی اماں کے شہر "رسول نگر" بھی لے جاؤں گا۔ ان شاء اللہ۔ اس کے لیے بھی اجازت حاصل کر لی گئی ہے۔"

انتہائی خلوص سے کہہ کر وہ اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوا تو "واؤ۔۔۔" کہہ کر منہ پر ہاتھ رکھتی وہ بھی ساتھ ساتھ اٹھی۔

"دھنے واد رفیق صاحب۔ بہت شکریہ آپ کا کہ میری خاطر یہ سب جوکھم اٹھایا ہے۔ آہ۔۔۔ ایم سو ایکسائیٹڈ ناز۔۔۔"

اور تقریباً چیختے ہوئے اتنا کہہ کر خوشی کے اظہار کے طور پر وہ بھاگ کر ناز کے گلے جا لگی۔

"مینشن ناٹ میڈم۔ اب مجھے اجازت دیں۔۔۔ کہ بھئی آپ کے اسکرپٹ پر آج سے ہی کام شروع کرنا ہے ان شاء اللہ۔ تو جلدی جلدی آج کے کام نمٹا کر وقت پر گھر پہنچنا ہوگا۔"

اسے بے تحاشا خوش ہوتے دیکھ کر نرم خوئی سے ہنستے رفیق نواز نے اجازت طلب لہجے میں پوچھا تو اب تک منہ پھلائے بیٹھی ناز سے الگ ہوتی وہ اس کی طرف مڑی۔

"ارے واہ سر۔ سچ مچ آج سے ہی اسکرپٹ لکھنا شروع کریں گے؟؟ بڑی بات ہے۔ اس پر الگ سے شکریہ۔ اور جلدی جائیے پلیز۔ اس حوالے سے تو پھر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونا چاہئیے۔"

خوشدلی سے ہنستے ہوئے اس نے الوداعی ہاتھ لہرا دیا تو اس کا مسرت سے بھرپور انداز دیکھتا یہ کہتا ہوا وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔

"جی بالکل آج سے ہی۔ اور پرسوں کا یاد رکھیئے گا کہ رسولنگر جانا ہے۔ خدا حافظ۔۔۔"

ادھر اس کے نکل جانے پر یہاں وہاں جھومتی وہ مسلسل بول رہی تھی۔

" کتنا مزہ آئے گا یار۔۔۔ میں رسول نگر جا رہی ہوں۔ اپنی دادو کے گاؤں۔ وہاں ایک دربار بھی ہے۔ دادو نے بتایا تھا اس پر ہندو، سکھ اور مسلمان سب منتیں مانتے ہیں۔ میں وہاں ضرور جاؤں گی ناز۔ ایم سو ہیپی۔۔۔" اور اپنی نشست پر بیٹھی ٹکر ٹکر اسے گھومتے دیکھتی ناز کو لگا کہ یا تو وہ پاگل ہو رہی ہے یا پھر اسے پاگل کرنے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہے۔

وہ یوں چہک رہی تھی گویا ہر فکر سے آزاد ہوگئی ہو۔

وہ یوں ناچ رہی تھی جیسے کوئی اپنا آپ بھول بیٹھے ہے۔

کئی بار حالات ہمیں اس مقام پر لے آتے ہیں کہ زیست بھی ہم پر تنگ پڑنے لگے۔ اکثر ہم اس قدر مجبور کردیئے جاتے ہیں کہ آسانی کے لیے کوئی یارا نہیں ہوتا۔۔۔ کوئی چارہ نہیں چلتا۔ حالات کے چابک سہہ سہہ کر آخرش یہ وقت آتا ہے کہ تمام تر ہمتیں۔۔۔ ہم بس ہارنے سے لگتے ہیں۔ لیکن ایسے سخت ترین حالات سے بھی فرار کا کوئی نہ کوئی روزن تو قدرت ضرور رکھتی ہے۔ کوئی ایسا روزن جو اس پل نڈھال ہوئے پڑے ہمارے شکستہ وجود سے صرف بالشت بھر کی دوری پر ہوتا ہے۔ ہاں یہ بھی سراسر ہم پر ہوتا ہے کہ ہم وقت کی پاٹوں میں چپ چاپ پستے جاتے ہیں یا ان سے کھسکنے کی کوئی تدبیر بھی کرتے ہیں؟

☆......☆......☆

واپس گھر پہنچ کر مصطفین نے بائیک صحن میں اسٹینڈ پر لگائی، بیرونی دروازہ کنڈی کرتے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھا اور ابھی چند قدم کی مسافت پر تھا کہ اندر سے آتی ایمان کی خالہ رضیہ بیگم کی آواز سن کر بے طرح چونک گیا۔

" میری بات سمجھنے کی کوشش کر کنیز۔ میں یوں ہی نہیں کہتی۔ پورا خاندان باتیں کرتا ہے۔ سارے رشتہ دار اعتراض کرتے ہیں کہ تم نے جوان جہان لڑکے کو گھر میں رکھا ہوا ہے کہ جس کا کوئی آگا پیچھا ہی نہیں۔ ڈرو اس وقت سے جب دبی دبی یہ آوازیں اس گھر کے در و دیوار پر بھی گونجنے لگیں گی۔ میری مانو تو بس اس سے معذرت طلب کر کے رخصت کرو اسے۔ میں جانتی ہوں وہ سمجھ جائے گا تمہاری بات۔"

ان کے الفاظ سے وہیں کا وہیں تھا وہ گویا پتھر کا ہو گیا۔ یقیناً اپنی باتوں میں گم ہو کر اندر وہ اس کی آمد اور بائیک کے کھٹکے سے بھی بے خبر رہی تھیں۔

" آئے ہائے رضیہ تمہاری تان تو بس اس نمانے پر ہی آن ٹوٹتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس نے کسی کو کیا تکلیف دی ہے خاندان بھر میں سے کہ جو سب کو صرف اسی کے مروڑ اٹھتے ہیں۔ اپنے گھر کا برا بھلا میں خود سمجھ سکتی ہوں تم بتاؤ مجھے جسے زیادہ تکلیف ہے اس کی تو میں دور کر کے آؤں۔ غضب خدا کا۔۔۔ دہائی نام کی۔۔۔ لوگوں کو تو جیسے کوئی کام ہی نہیں میرے گھر کی سن گھن لینے کے سوا۔"

اور جواباً انتہائی درشتی سے انہیں ٹوکتے ہوئے خالہ کنیز نے اس کے دفاع میں جو بولنا شروع کیا تو مصطفین کی آنکھوں میں کوئی سیال امڈ آیا۔ ان کی محبت سے زیر بار ہوتا وہ دل ہی دل میں خود سے عہد باندھنے لگا کہ اب جس قدر جلدی ممکن ہو وہ ان کے گھر سے چلا جائے گا تاکہ اپنے رشتہ داروں کے سامنے ان کی یہ بے وجہ جوابدہی اور امتحان تو ختم ہو۔ اس سے پہلے کہ کچھ سنبھل کر وہ قدم آگے بڑھاتا تا جھلائے ہوئے لہجے انتہائی برا مناتی رضیہ بیگم دوبارہ بول اٹھیں۔

" تم بس آگے سے ہر بار یونہی شروع ہو جایا کرو۔ کوئی تمہارے بھلے کی بات بھی کرے تو اسے سمجھنے کی کوشش مت کرنا۔ تو بس پھر لگی رہو میری بلا سے۔ بھئی میری توبہ جو آئندہ تمہیں کوئی نصیحت کروں یا ایسا کچھ بھی کہوں۔"

اوران کی بات پر بنا کسی توقف کے جواباً ایمان کی مفاہمتی آواز سنائی دی۔

"اف خالہ اور امی۔۔۔جانے بھی دیں بات کو یار۔ان نام نہاد رشتہ داروں کے نام پر آپ دونوں بہنیں آپس میں پھوٹ ڈالنے کیوں بیٹھی ہیں؟؟"

مشترکہ طور پر ان دونوں کو یہ سمجھاتی اب وہ صرف رضیہ بیگم سے مخاطب ہوئی۔

"اور خالہ جان ان رشتہ داروں کی بات کو اتنا سر پر سوار مت کیا کریں۔پلیز۔۔۔یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کا رویہ مرنے سے پہلے ایسا ہوتا ہے کہ "جینے" نہیں دیں گے تمہیں اور مرنے کے بعد یہی سب "منجی" ہلا ہلا کر کہنے لگتے ہیں کہ "جانے" نہیں دیں گے تمہیں۔۔۔تو یعنی ان کی کسی بات پر بھی یقین و بھروسہ یوں نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی کوئی بھی کل سیدھی ہوتی ہی نہیں۔"

ہلکے پھلکے انداز میں کہتی وہ یقیناً ان دونوں کے مابین در آئی کشیدگی کو کم کرنا چاہتی تھی۔اور یہ اس کے دخل دینے کا اثر ہی تھا کہ فقط ایک پل کے توقف سے خالہ کنیز گفتگو سمیٹتے ہوئے یا شاید موضوع بدلتے ہوئے بولیں۔

"نی بس کرنی۔۔۔تو بھی جانے کب سنجیدہ ہوگی؟ ہم دونوں بہنیں کسی کی بات میں آکر کیوں پھوٹ پڑیں گی بھلا؟ ناممکن ہے۔چل تو اپنی خالہ کے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کر۔کب سے یونہی بیٹھی ہیں ہم۔اب تک بھوک لگ چکی ہوگی۔"

اب کی باران کا لہجہ متوازن، ہموار اور بہن کی فکر و چاہ میں بھیگا ہوا سا تھا۔عجب کرب سے مسکرا کر مصطفین نے چند قدم اٹھائے اور چہرے پر درج تاثرات مٹاتا ہوا لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"السلام علیکم۔۔۔السلام علیکم خالہ جی۔کیسی ہیں آپ؟"

مودب انداز میں پہلے خالہ کنیز اور پھر رضیہ بیگم کو سلام کرتا وہ شائستگی سے ان کا حال پوچھنے لگا تو جواب دینے کی بجائے ان دونوں نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔جبکہ صوفوں کی حدود سے نکل کر باورچی خانے کی جانب بڑھتی ایمان بھی چونک گئی۔ایک ساتھ ان سب کو یہی خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اپنے متعلق ان کی گفتگو سن نہ چکا ہو۔

"وعلیکم السلام۔۔۔بیٹھو مصطفین۔آج دیر سے کیوں آئے ہو؟؟"

بالآخر ایمان نے سب سے پہلے سنبھل کر معمول کے سے انداز میں پوچھا اور صوفوں کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بس ایک نظر اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تو اس سے نگاہ چراتی وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

"اے وعلیکم السلام۔ آ جاؤ نا؟ بیٹھو بھی۔ کھڑے کیوں ہو؟"

ایمان کے جاتے ہی جانچتی ہوئی نظروں سے بغور اسے دیکھتی کنیز بیگم ہاتھ سے اس کے لیے نشست جھاڑتی ہوئی بولیں تو مبہم ہنکارا ابھرتا وہ اثبات میں سر ہلا کر ان کے ساتھ جا بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی انہوں نے ملتجی نظروں سے اپنی بہن کی جانب دیکھا تھا کہ خدارا اب اس کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کر دینا۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ احسان ہے مالک کا۔ شکرن اللہ۔ اور تم سناؤ ہاں۔۔۔ کیسے ہو؟"

ان کی نظروں کا پیغام سمجھتی رضیہ بیگم نے گویا کمال تر احسان کرتے ہوئے اسے اپنے حال سے آگاہ کیا اور حیرت انگیز طور پر بدلے میں اس کا پوچھا بھی۔

"ماشاءاللہ۔ خدا آپ کا شکر بحال رکھے ہر پل۔ آمین ثم آمین۔ اور میں بھی ٹھیک ہوں بالکل الحمدللہ۔ وہی احسان ادھر بھی جاری ہے مالک کا خالہ جی۔ ثم الحمدللہ۔ شکریہ۔"

عام لہجے میں انہیں معنی خیز جواب دیتا وہ فوراً سے پیشتر کنیز بیگم کی جانب مڑا۔

"خالہ جی ابھی خالو نہیں آئے کیا؟ آج کل تو کھانا کھانے گھر ہی آ جاتے ہیں ناں؟"

اور اس کی بات پر پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتی وہ مسکرا کر بولیں۔

"ہاں لیکن اب نہیں آیا کریں گے۔ صبح بتا رہے تھے کہ اب کام پھر سے چل پڑا ماشاءاللہ اور دکان سے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے اب پھر وہیں کھا لیا کریں گے۔ شکر ہے اللہ کا "مندا" نہیں رہا اب۔ بہت سخت دن تھے بھئی۔ توبہ توبہ۔"

آخر پر کانوں کو ہاتھ لگا کر اوپر کی جانب دیکھتی وہ باقاعدہ شکر بجا لائیں تو نرمی سے مسکراتا وہ فقط یہی بولا۔

"جی خالہ شکر ہے اللہ پاک کا۔ وہ مسبب الاسباب ہے جو کرتا ہے بہترین کرتا ہے۔"

عجز سے بھیگا اس کا لہجہ انتہائی "عرفان" کا حامل تھا۔ اور یہی وہ پل تھا جب ان دونوں کی باہمی مشاورت و گفتگو کو بغور دیکھتی رضیہ بیگم ایک طرف رکھا ہینڈ بیگ تھامتی اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

" ٹھیک ہے کنیز میں اب نکلتی ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تم مغلپورہ آنا ایمان کو لے کر کسی روز۔ تم تو کبھی آئیں ہی نہیں۔ "

کھنکارتے ہوئے انہیں متوجہ کرتی یہ کہتی ہوئی وہ صوفوں کی حدود سے باہر بھی نکل آئیں تو انہیں یوں اچانک واپسی کے لیے پر تولتے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئیں۔

" اے بیٹھو تو سہی رضیہ۔ کھانا تو کھاتی جاؤ۔ ایسے کیسے جا رہی ہو؟؟؟ "

تیزی سے بڑھ کر انہیں کلائی سے تھام کر روکتے ہوئے انہوں نے فکرمندی سے کہا تو ایک نظر مصطفین کو دیکھ کر آہستگی سے ان کا ہاتھ اپنی کلائی سے ہٹاتی وہ عذر پیش کرنے لگیں۔

" نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ ہوتی تو ضرور کھا کر جاتی۔ خیر۔۔۔ پھر آؤں گی کبھی۔ مگر اب پہلے تم آنا اور ایمان کو بھی لازمی لانا ساتھ۔ "

ان کی بات پر بغور ان کا چہرہ پڑھتی خالہ کنیز بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں اور اس سے قبل کہ آمنے سامنے کھڑی ان دونوں بہنوں میں سے کوئی بھی مزید کچھ بھی بولتی ایک ٹرے میں جوس سے بھرا جگ اور گلاس لیے ایمان باورچی خانے سے برآمد ہوئی۔

" ہائے خالہ تسی چلے او؟؟ اینی چھیتی؟؟ ناں جاؤ نا۔۔۔ پلیز۔ "

بھرپور دلار سے وہیں سے انہیں پکارتی وہ آنکھوں میں تحیر بھر کر انہیں دیکھنے لگی تو اس کے دلفریب انداز پر زیرِ لب مسکراتا مصطفین سر جھکا گیا۔

" ہاں بس جا رہی ہوں۔ وقت بہت ہو گیا ہے۔ جا کر کوئی ہانڈی روٹی کا بھی کرنا ہے اس لیے۔ کہا تو ہے پھر آؤں گی اور تم بھی اب ضرور آنا اپنی امی کو ساتھ لے کر۔ خدا حافظ۔ "

اب کی بار مسکرا کر انہوں نے کنیز بیگم کے شانے پر جواباً تسلی کا ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے دبایا اور ایمان کو آنے کی تاکید کرتی ہوئی لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر بھی نکل گئیں۔ پیچھے ان کے انداز سے ان کا مزاج و رنگ پرکھنے کی کوشش کرتی وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو بس دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اپنی بات کے رد کیے جانے پر وہ دل میں ان سے خفا ہوں گی۔ پھر یوں ہوا کہ سر جھٹک کر خالہ سے دھیان ہٹاتے ہوئے گلاس میں

جوس بھر کر اسے پیش کرتی وہ سوالیہ انداز میں بولی۔
"تم نے بتایا نہیں مسٹر کہ آج تم قدرے دیر سے کیوں آئے ہو؟"
اس کی تیکھی چتون سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اس نے "تھینک یو۔۔۔" کہہ کر گلاس تھام لیا اور سرسری لہجے میں جواب دیا۔
"بس یونیورسٹی میں دیر ہو گئی سمجھو۔ اور پھر ہمارے اندرون لاہور کی گلیوں کا بھی پتا ہی ہے تمہیں۔ جگہ جگہ راستہ بند۔ پیدل چلنا دوبھر ہوتا ہے اور میرے پاس تو بائیک بھی تھی۔ خیر۔۔۔ تمہاری یہ پوچھ تاچھ پوری ہو گئی ہو تو اب جوس پینے دو پلیز۔ سر پر سوار نہیں ہو۔ چلو وہاں دور جا کر بیٹھو شاباش۔"
بات کے اختتام پر انہیں صرف یہ باور کروانے کی خاطر کہ اس نے خالہ رضیہ کے ساتھ ہوئی ان کی گفتگو نہیں سنی وہ ہمیشہ کی طرح اسے چھیڑنے لگا۔
"بکواس مت کرو ورنہ ابھی یہ جوس چھین لوں گی تم سے جو بڑے خلوص سے بنا کر لائی ہوں۔ عزت راس نہیں ویسے تمہیں بالکل بھی۔"
اور اس کی بات پر حسبِ معمول ایک ہی پل میں سب کچھ بھول بھال کر بے طرح چڑتی وہ جوس چھیننے کو باقاعدہ بڑھی تو ابھی ابھی نزدیک آ کر بیٹھی کنیز بیگم کی جانب جھکتا وہ دفاعی انداز میں بولا۔
"اے۔۔۔ اے۔۔۔ اے۔۔۔ رکو یار پلیز۔ ایم سوری ایمان۔ سچی میں مذاق کر رہا تھا۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ کہاں منہ لگاتی ہو تم مجھے؟"
پھر اس نے گلاس میں موجود باقی ماندہ جوس بھی جلدی جلدی پی کر گلاس خالی کر دیا تو سیدھی ہو کر یہ کہتی ہوئی وہ دوسرے صوفے کی جانب ہو لی۔
"دفع ہو۔۔۔ نرے مراثی ہو تم۔"
اور اس کے پیچھے ایک بلند تر قہقہہ لگاتے ہوئے جگ تھام کر وہ مزید جوس بھرنے لگا تو اب تک خاموشی سے یہ سب نوک جھونک دیکھتے ہوئے مصطفین کے ہر اک رویہ و انداز پر غور کرتی خالہ کنیز انہیں ڈپٹ کر بولیں۔
"تم دونوں کو تو بس موقع چاہئیے اس "تو تکار" کا۔ بات بے بات یوں جھگڑنے لگتے ہو جیسے کوئی جائیداد

بانٹتی ہو آپس میں۔ حد ہے بچپنے کی۔"

لیکن ان کے لب ولہجہ سے ظاہر تھا کہ وہ مصطفین کی جانب سے مطمئن ہو گئی ہیں کہ وہ رضیہ بیگم کی باتیں نہیں سن سکا۔

ادھر خالہ کی بات پر دلکشی سے مسکراتے ہوئے دوبارہ معذرت کرتا وہ ان کے چہرے پر پھیلتا سکون پڑھنے لگا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اس کی "اداکاری" نے کام کیا اور خالہ کی دل میں موجود ہر قسم کی شرمندگی ڈھل گئی ہے۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جہاں میں جو ہر کسی سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ کسی بھی طور خود سے وابستہ کسی بھی شخص و فرد کو اپنے سامنے شرمسار نہیں دیکھ سکتے۔ اور اکثر تو اپنے پیاروں کا سر بلند رکھنے کے لیے حقائق کو جانتے ہوئے بھی وہ طرح طرح کے حیلے ڈھونڈتے ہیں۔۔۔ کئی طرح کے بہانے کرتے ہیں۔

ہاں ایسے لوگ بے پناہ قیمتی۔۔۔ لیکن نایاب و کمیاب ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

" کس کے ساتھ آئی ہو یار؟ ابھی بائیک پر کون تھا؟؟ بتاؤ بھی۔۔۔"

بے دھیانی میں شانے پر لٹکتا بیگ ہلاتی وہ صحن کے وسط میں پہنچی تھی کہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر، دھپ دھپ تین سیڑھیاں اترتے ہوئے تیزی سے اس کے قریب آتی نمرہ اشتیاق بھرے لہجے میں سوال کرنے لگی۔

" ارے دم تو لو یار۔ اور تم نے کیسے دیکھا بھئی؟؟؟ تم تو اندر سے آ رہی ہو۔۔۔"

اس جرح پر کسی قدر چونک کر وہ بے ساختہ اندر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی اور پھر حیرانی سے ایک نظر واپس گیٹ کی جانب دوڑائی۔

" میں وہاں اوپر سامنے کمرے میں تھی کہ دروازے پر بائیک رکنے کی آواز سن کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔۔۔"

دوسری منزل کی ایک کھڑکی کی طرف انگلی اٹھاتی ہوئی وہ شوخ لہجے میں بولی تو اس کی کھوج بھول کر وہ سوال در سوال کرنے لگی۔

" لیکن وہ کمرے تو بند ہوتے ہیں۔ تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟"

اور جواباً اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ کسی قدر چڑ کر بولی۔

"جھک مار رہی تھی۔۔۔ارے یار چادریں بدلنے گئی تھی اور میرا وہاں کیا کام ہوسکتا ہے بھلا؟"

یہاں اپنی طرز و جون پر لوٹتے ہوئے اس نے پھر سے متجسس لہجہ اپنایا۔

"خیر جو میں پوچھ رہی ہوں وہ تو بتاؤ پہلے کہ وہ پرنس کون تھا؟ تم دونوں کے دروازے کی اوٹ میں ہونے کی بدولت میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی۔اور جب اس نے بائیک یوں زن سے نکالی تو تب بھی فقط اس کے وجود کی ایک جھلک دکھائی دی ہے۔ چہرہ تب بھی نہیں دیکھ سکی۔ ہاں پر کیا ہی دلکش سراپا تھا یار اس کا کہ بس اش۔۔اش۔۔اش۔۔۔"

اس کا خواب ناک لہجہ خبر دیتا تھا کہ وہ سفیر کی شخصیت کی یک ساعتی جھلک سے بھی بھرپور متاثر ہوئی ہے۔ بائیک کو "یوں زن سے" نکالنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے ہاتھ کو جہاز کے اڑان بھرنے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے "اڑایا" تھا۔

"وہ۔۔۔سفیر تھا۔"

جواباً کسی چوری کے پکڑے جانے پر شرمسار ہونے کے سے انداز میں اس کے لب سرسرائے تو منہ پر ہاتھ رکھتی نمرہ بے یقینی سے بولی۔

"ہاہ۔۔۔تم سچ مچ اس کے ساتھ آئی ہو؟ اف آپی اف۔۔۔کوئی دیکھ لیتا تو؟ میرا مطلب ہے بابا دیکھ لیتے تو؟ تمہیں ذرا ڈر نہیں لگا کیا؟"

سرگوشیوں میں پوچھتی ڈرے ہوئے انداز میں وہ اندر باہر، یہاں وہاں یوں دیکھنے لگی گویا بابا یہیں کہیں چھپے انہیں دیکھ رہے ہوں۔

"میری تو جان پر بن پڑی تھی یار۔۔۔لیکن وہ گدھا ہے پورا۔تا دیر بضد رہا کہ لازمی چھوڑنے آئے گا۔اب انکار کرتی تو وہاں الگ سے تماشا ہوتا۔اسے کوئی بات سمجھ ہی نہیں آتی نمرہ۔اب کیا کرتی پھر میں؟؟ سارے راستے بھی گویا سولی پر ٹنگی رہی ہوں سچی۔"

اس کی بات پر بے بسی سے کہتے ہوئے آخرش وہ سر جھکا گئی تو اس کے لہجے سے اس کی "ضد" کا منظر

بھانپتی وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"اچھا خیر اب جو ہوا سو ہوا۔لیکن تم نے تو اسے دروازے پر سے ہی موڑ دیا۔کوئی چائے پانی تو پوچھنا تھا نا۔ کہ چلو اسی بہانے میں بھی دیکھ لیتی اسے۔ہائے۔۔۔وہ کتنا دلکش ہے۔دھلا دھلایا۔۔۔نتھرا نتھرا۔۔۔بنا بنایا ہیرو سا۔"

بات کے اختتام پر وہ ایک بار پھر سفیر کی شخصیت کے سحر میں ڈوب کر تعریفوں کے پل باندھنے لگی تو تحیر بھری نظروں سے اس کا فدائی لب ولہجہ سنتی ثومیہ اس کے سامنے چٹکی بجا کر بولی۔

"اب بس بھی کرو نمرہ۔وہ جا چکا ہے۔ویسے اپنی اس قدر تعریفیں وہ سن لے نا۔۔۔تو خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا۔بڑا خود پسند ہے۔اپنے مقابل سوائے مصطفین کے کسی کو کچھ نہیں گردانتا وہ۔اور مصطفین کو بھی یوں کہ اب وہ دونوں دوست ہیں۔"

ادھر بصد شوق اس کی خصوصیات سنتی نمرہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی فوراً سے پیشتر بولی۔

"ہاں تو ٹھیک ہی سوچتا ہے نا وہ۔میں نے اتنا بھرپور سراپا آج تلک نہیں دیکھا کسی کا جتنا اس کا ہے۔بھئی اتنا خوبصورت ہو کر تو کسی کا بھی حق بنتا ہے کہ وہ خود پسند ہو جائے۔سچی۔۔۔"

اور اس کے یوں تائید کرنے پر ایک پل کو تھم کر وہ حیرت در حیرت اس کی شکل دیکھے گئی۔اب اس سے قبل کہ ثومیہ مزید کچھ بھی کہتی لاؤنج کا دروازہ کھول کر چادر کے پلو سے گیلے ہاتھ پونچھتی راشدہ بیگم ان کی جانب آنے لگیں۔

"آ گئی ہو ثومیہ۔ماشاءاللہ۔کب آئی ہو اور یوں بیچ صحن میں رک کر کیا راز و نیاز کر رہی ہو تم دونوں؟اسے تو میں اوپر سے آوازیں دے رہی تھی۔"

ایک ہی سانس میں سوال در سوال کرتی وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں تو ایک پل کو ساری سچائی بتاتے بتاتے اس کے لب جھٹ سے ماما کی پشت پر جا رکی نمرہ کے اشارے سے بس تھرا کر رہ گئے۔منہ پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کے ساتھ ساتھ وہ سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے یہ بھی سمجھانا چاہ رہی تھی کہ وہ بے وجہ پریشان ہو جائیں گی۔

"جی ماما میں ابھی ابھی آئی ہوں۔اور بس یونہی ادھر کھڑی ہوگئیں ہم۔کوئی خاص بات نہیں ہے۔نمرہ بھی تو بالکل ابھی باہر آئی ہے۔"

گویا پیروں پر سچائی سے مکرتے ہوئے اس نے سادہ و عام لہجے میں انہیں ٹالا اور پھر انہیں اب تک چادر کو گیلی مٹھی میں دبائے کھڑے دیکھ کر اندر کی جانب قدم بڑھاتی مزید بولی۔

"خیر آئیں چلیں اندر۔۔اور لگتا ہے آپ باورچی خانے سے سیدھی اس طرف ہی آئی ہیں؟ ویسے کیا پکایا ہے آج؟"

اب کے بھی اس کا لہجہ وہی عام اور سادہ سا تھا۔

"ہاں باورچی خانے سے ہی آئی ہوں اور دال چاول پکائے ہیں بس۔لگتا ہے بہت بھوک لگی ہے تمہیں۔ چلو تمہارے کپڑے بدلنے تک میں کھانا لگاتی ہوں۔اور تم نے چادریں بچھا دیں کیا اوپر نمرہ؟؟ یا یونہی دبے پاؤں بلیوں کی مانند پورا گھر گھوم رہی ہو کہ مجھے بھی پتا نہ چلے کہاں پائی جا رہی ہو؟"

ان کی ہمراہی میں اندر کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے باری باری ان دونوں کے لیے مخصوص لہجہ بدل کر کہا تو اثبات میں سر ہلاتی ثومیہ نے نمرہ کی میٹھی میٹھی عزت افزائی پر "جی بہتر ماما۔واقعی بہت بھوک لگی ہے۔۔" کہہ دیا اور مسکراتے ہوئے نمرہ کی جانب دیکھنے لگی۔

"اول تو آپ کو مثالیں بڑی تعداد میں یاد ہیں ماما اور دوئم وہ یاد آپ کو بڑے وقت پر آتی ہیں۔دانت دیکھیں آپی کے۔رک ہی نہیں رہے اب۔ایویں پکڑ کر میری بے عزتی کردی آپ نے۔ابھی یہیں سے گذر کر تو گئی ہوں باہر۔اور جی بچھا دی ہیں چادریں۔میری مجال تھی کہ نہیں بچھاتی میں؟؟"

لاؤنج میں داخل ہو کر ثومیہ کے مسکراتے لبوں کی جانب اشارہ کرتی وہ مصنوعی چڑاہٹ سے حقیقی صفائی دیتے ہوئے بولی تو فقط ایک لمحے کو تھم کر ان دونوں ماں بیٹیوں کا ایک قہقہہ بلند ہوا تھا۔اور یہیں انہیں بے تحاشا کھلکھلاتے دیکھ کر اندر سے سرشار ہوتی نمرہ بھی ان کے ساتھ بے طرح ہنسنے لگی۔اس پل یہ سارا منظر یوں پورا دکھائی دیا کہ اس گھر کے در و دیوار میں بہت کم ایسے قہقہوں کی گونج شامل ہوتی تھی۔

☆......☆......☆

کئی روزہ شدید موسمی بارشوں کے بعد آج موسم کسی حد تک کھلا تھا۔ گو کہ آسمان کے سینے پر اب بھی اکا دکا بدلیوں کے ٹکڑے محوِ رقص تھے لیکن گاہے بگاہے انہی بنا برسات بدلیوں کی اوٹ سے جھانکتے سورج کی سنہری سی کرنیں پورے لاہور پر جا بجا برس رہی تھیں۔ بادلوں سے منعکس ہوتے رنگین دھاروں نے ان روپہلی شعاعوں کے ساتھ مل کر دور فضا میں ایک خوبصورت دھنک تان دی تھی۔ یہ موسم اور دھنک سجا منظر۔۔۔ شاہی قلعے کی بیرونی فصیل پر بنائی گئی ایک حسین تر بالکونی میں کھڑے کسی دیوتا سے لڑکے کو بڑی شدت سے بے قرار کیے دیتا تھا۔ عجب خود اذیتی سے اس بالکونی میں ایک سے دوسرے سرے تک، یہاں وہاں ٹہلتا وہ بار بار رکتا اور بالکونی کا ایک پتھریلا ستون تھامتے ہوئے دوسرا ہاتھ اوپر آسمان کی طرف بڑھا کر گویا اس دھنک کو "چھونے" کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن نہیں۔۔۔ کیونکہ وہ تو اس دھنک کو "اتار لانا" چاہتا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اگر اس کے اختیار میں کچھ ہوتا تو وہ فضاؤں پر صدیوں سے مسلط ان سحر گر رنگوں کو بس جھپٹ ہی لیتا۔

بھلا چھیننے سے بھی رنگ ملے ہیں کبھی؟؟؟ یہ تو جس کے حصے میں جس قدر بھی آنے ہوں بس اسی قدر آتے ہیں۔ نہ ایک رنگ زیادہ۔۔۔ نہ ہی ایک کم۔ رنگوں پر اجارہ نہیں چلتا۔ رنگ کسی کے غلام تھوڑی ہیں۔

خیر اپنی "کاوشوں" میں ناکام ہوتا وہ بالکونی سے پلٹا اور پائیں باغ میں قدم قدم ٹہلتے ہوئے سوگوار نظروں سے یہاں کے بام و در پہ بکھری اپنی سوگوار کہانی کے اوراق چننے لگا۔

خود سے بارہا یہ عہد کرنے کے باوجود کہ اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔۔۔ کئی روز بعد وہ لوٹ آیا تھا۔ یہیں مختلف مقامات گھومتے اسے اک احساس یہ بھی ہوا کہ اب اپنی کہانی سے ہٹ کر وہ اس اپسرا کے متعلق بھی سوچنے لگا ہے جو ان تاریخی بھول بھلیوں میں اس کے رنج سے بندھ بندھ کر اس کا پیچھا کرتی رہی تھی۔ اس سے ہوئی اس آخری ملاقات کا اک ایک جز اس کی نگاہوں کے سامنے عین عین گھوما کہ جب اس کے لفظوں سے ہاری وہ گفتگو ادھوری چھوڑ کر دونوں مٹھیوں میں اپنا گھیر دار فراک دبائے شاہی مسجد کے طویل تر صحن سے باہر کی جانب بھاگ گئی تھی۔ چھلے ہوئے پیروں اور لال تلیوں سمیت اس کا وہ بھاگنا ہی تھا شاید جو یہاں اس دیوتا کو مسلسل اسے سوچنے پر مجبور کرنے لگا۔

اپنی کہانی۔۔۔ اور وہ اپسرا۔۔۔ بس انہی خطوط پر دھیرے دھیرے چلتا وہ شاہی قلعے کے پائیں باغ سے

گذر کر یہاں کی غلام گردشوں میں آیا اور یہاں کسی خیال سے ایک پل کو ٹھہرتا کسی اذیت سے جڑ کر پوری شدت سے بھاگا اور بوسیدہ دیواروں کے مابین اپنی موجودگی کے پل بکھیرتا تیزی سے دوسری جانب نکل گیا۔

اس طرف ایک وسیع احاطے میں فواروں کی ایک لمبی قطار کے پار ایک عجائب گھر واقع تھا جہاں کے مشمولات میں تاریخی رسم الخط سے مزین کئی شاہی خطوط، پرانے سکے، تاریخی ریزگاری، مغل بادشاہوں کی مصورانہ تصاویر، اور ہاتھی دانت سے بنی "تاج محل آف آگرہ" کی ایک شاہکار و شاندار نقل شامل ہیں۔ یہاں احاطے میں جابجا پھیلی لال اینٹوں سے بنی اس پختہ روش کا ہر آخری کنارہ احاطے کے عین وسط میں واقع ایک مربع نما بڑے فوارے سے آن ملتا ہے جس کے حوض کا پیندہ اور اطرافی دیواریں سنگِ مرمر سے بنی ہونے کے باعث نرالی چھب دکھاتی ہیں۔ اسی حوض کے دائیں جانب جنگلی کبوتروں کا ایک بڑا غول غٹرغوں، غٹرغوں کرتے ہوئے متوالی چالیں چلتا یہاں خصوصاً انہی کے لیے بکھیرا گیا دانہ دنکا چن رہا تھا۔ یہ کبوتروں کے چگنے کی مخصوص جگہ تھی۔ وہ احاطے میں لال اینٹوں سے بنی پختہ روش پر چلتے لاتعداد سیاحوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر اس روش کی اطراف میں اگائی گئی سرسبز و شاداب گھاس پر آ بیٹھا اور گھنے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے چہرہ اٹھا کر دور فضا میں اب ماند ہوتی دھنک کو دیکھنے لگا۔ یکایک اس کی اداس تر آنکھوں میں اس اپسرا کا سر کو دائیں بائیں نفی میں ہلاتے ہوئے "ماتمِ عشق" کرنا ابھر آیا تو بالوں سے ہاتھ کھینچ کر منہ پر پھیرتے ہوئے وہ گویا یہ منظر مٹانے لگا۔ اپنے کرب کے سوا وہ کسی اور کا درد نہیں جاننا چاہتا تھا۔

"کہاں گئی ہے وہ آخر؟ آج دکھائی کیوں نہیں دی۔ شاید وہ مجھ سے اکتا گئی ہے۔ کیا خبر وہ اب مجھے ڈھونڈتی بھی نہ ہو۔ لوگوں کو نئی شخصیات کھوجنے کا شوق یوں بھی فقط چند دنوں کے لیے چراتا ہے۔ چلو اچھی بات ہے۔ یہ تو بھلا ہی ہوا۔"

لاشعوری طور پر اس کے متعلق سرگوشیوں میں خود کلام ہوتا وہ گھاس پر یوں لیٹا کہ گویا کوئی تارا کسی آسمان سے ٹوٹ گرے۔

اس کے توانا وجود کا سحر اس منظر کے اک ایک جزو پر کامل تاب سے چھانے لگا کہ سبز چمکتی ہوئی گھاس پر اس کے گلال رنگ چہرے کے فسوں گر دھاروں کا امتزاج۔۔۔ حسین تر تھا۔

اسی حالت میں لیٹے ہوئے اسے کچھ وقت گذرا تھا کہ موسم کے تیور پھر سے بدل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیز تر ہوائیں چلنے لگیں جو کہ اپنے سنگ جانے کس نگر سے گھور بادل بھی کھینچ لائی تھیں۔

اس نے اپنے قرب وجوار میں ہواؤں سے بچ کر موسم سے پناہ ڈھونڈنے کو بھاگتے مختلف سیاحوں کے قدموں کی آوازیں سنیں لیکن یونہی ساکت لیٹا رہا۔ ایسے موسموں سے اسے عجب لگاؤ تھا۔ یادش کھنگالتے موسم۔۔۔

اور بھاگتے دوڑتے ان قدموں کی آواز میں انتہائی مانوس سی ایک اور چاپ سنتا وہ بے طرح چونک گیا۔ اپنی گھری بھنویں تان کر ماتھے پر خوبصورت بل ڈالتے ہوئے اس نے اس چاپ پر بھرپور ارتکاز کیا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر آواز کی سمت دیکھا۔ سامنے کا منظر اسے اپنی بصارتوں پر شکوک میں مبتلا کرنے لگا۔ اس کی نزدیکی روش چھوڑ کر اس سے اگلی لال روش پر وہی حسین تر اپسرا تیزی سے بھاگتی ہوئی مرکزی فوارے اور مرمریں حوض کی جانب بڑھ رہی تھی اور اس کے پیچھے پیچھے ہواؤں کے دوش پر لہراتا یہ اس کا طویل تر دوپٹہ تھا جو ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ہلکے جامنی رنگ کے تراشیدہ لباس میں سجا اس کا مخملیں وجود اور لہراتے آنچل کے ساتھ ساتھ بے طرح جھومتی اس کی کالی گھنی زلفیں ماحول پر سحر طاری کر رہی تھیں۔ چمکتے ہوئے اس کے ساحر چہرے پر کچھ بھلا دینے کا جنون تھا اور اسی جنون کو لیے وہ گویا یہاں کی حدود سے پار ہو جانا چاہتی تھی۔ اسے یوں مضطر ہو کر دور تلک بھاگتی ہوئی دیکھتے اس حسین تر دیوتا کے ذہن و دل میں اس سے ہوئی آخری ملاقات کے آخری جملے گونجنے لگے۔

"ہاں۔۔۔ آپ جا سکتے ہیں۔ بس جاتے جاتے آنکھوں کو کھیل کہتے اسی سنگلاخ لہجے میں کچھ حروف کسی بے قرار دل پر بھی پھونک دیں۔ شاید کہ جلتے ہوئے ان لفظوں سے آگ تاپ کر سرد ہوا پڑا وہ پھر سے کہیں دھڑک اٹھے۔"

اس کے سرخ لبوں کی دلکش جنبش سے پھوٹے وہ زخمی لفظ اسے حرف حرف یاد تھے۔ اور آج اسے یوں مضطرب سا دیکھ کر بے ساختہ اس کے دل میں اس سے بات کرنے کی خواہش جاگی۔ پھر یوں ہوا کہ اسے اپنی نظروں کے حصار میں رکھ کر دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھتا وہ ایک بار پھر سے چونک اٹھا۔ اپنی دھن میں

بھاگتی وہ پری وش حوض کے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رکی اور پھر رخ بدل کر قریب دانہ دنکا چنتے کبوتروں کے غول کے عین وسط میں جا کر گول گول گھومنے لگی۔ اس کا جامنی لباس ہوائی تھپیڑوں کے زور سے اس کے وجود سے لپٹنے لگا اور اس کے یوں اچانک یہاں گھومنے سے بدکے ہوئے کبوتر مسلسل اس کے گرداگرد اڑانیں بھرنے لگے۔ لہک لہک کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے ان کی اڑان چھونے کی کوشش کرتی وہ اردگرد سے مکمل بے خبر تھی۔ اور اس کے آس پاس ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے کبوتروں کے پر دیکھتا وہ دیوتا ایک پل کو بالکل پتھر ہو گیا۔ ماحول میں گونجتی پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز اسے کسی اور منظر میں کھینچ رہی تھی۔ جامنی لباس میں گول گول گھومتی اس حسین اپسرا کا چہرہ اک اور ماورائی چہرے سے بدلنے لگا۔ ماضی کا ایک منظر رہ رہ کر حال کے اس منظر میں رچنے لگا تھا اور باہم جڑتے اور گڈمڈ ہوتے ان دو مناظر سے اپنا حال الگ کرتا وہ کسی خوابناک کیفیت میں گھل کر اس کی جانب چلنے لگا۔

ادھر اس کی موجودگی سے بے خبر وہ کامنی سی لڑکی گھومتے گھومتے پرندے اڑاتی جب تھک سی گئی تو خود تک اس کی آمد سے قبل اپنایا یہ "عمل" ترک کرتی ہوئی بڑھی اور حوض کی منڈیر پر ٹک کر زور زور سے سانسیں بھرنے لگی۔ چلتی ہوئی تیز ہواؤں کے باوجود اس طرح گھومنے کے سبب اس کا تنفس پھول گیا تھا۔

پھر رخ اٹھا کر ایک نظر آسمان کی ہر وسعت میں جھانکتی وہ اذیت سے مسکرائی اور مڑ کر حوض میں جمع پانی کی ایک خاص ردھم سے ڈولتی سطح دیکھنے لگی۔ جانے کس خیال کے تحت ایک ہاتھ منڈیر پر ٹکا کر دوسرے ہاتھ سے پانی کا یہ ردھم توڑنے کے لیے وہ جھکی اور عین اسی پل پانی میں جھومتے اپنے رنگین عکس کے ساتھ ایک اور عکس کو آن رکتے دیکھ کر ساکت و جامد ہو گئی۔ کہ اس دلنشیں چہرے کی تلاش میں تو وہ گویا کہیں صدیوں پہلے نکلی تھی۔ اس پل پانی کی سطح پر ایک ساتھ ہلکورے لیتے ان دونوں کے چہرے باہم محوِ رقص تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنی نظر پر شبہ ہوا اور پھر مڑ کر دیکھے بنا، پانی کی سطح پر ایک زوردار ہاتھ مارتے ہوئے اس نے دونوں عکس مٹا دیئے۔

کاش کہ جذبے اور خیالات بھی پانیوں میں ٹھہرے کسی عکس کی مانند ہوتے۔۔۔ تو ہاتھ مار کر جب مرضی انہیں ہلا دیا جاتا۔

اب قبل اس کے کہ اس دیوتا کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی، اس کی

رنجیدگی وملال کا بھرپور ادراک رکھتے ہوئے، سحر گر لہجے میں وہ اس کے اس روز والے سوال کا جواب پھونکنے لگا۔

" کبھی کبھی انتہائی ملول اور رنجیدہ خاطر ہوکر ہم شدت سے ایک خواہش کرنے لگتے ہیں کہ کاش کوئی آئے اوراب۔۔۔یہ دل "سہار" دے۔"

اوراس کے ساحر لہجے سے بندھی یوں ہی رخ موڑے ہوئے ایک پل کے لیے آنکھیں موند کر وہ اس کے لفظ وحرف اپنے دل میں جذب کرنے لگی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر پورے قد سے اس کے مقابل آن رکتی بنا توقف بولی۔

"دل سہارنے کوئی آئے یا نہیں۔۔۔دل رکھنے تو آجائے۔دل جلوں کو خبر ہے فقط کہ دل کہیں رکتے ہی نہیں۔کوئی دھن ہے جو مسلسل طاری رہتی ہے۔۔۔کوئی سمت ہے کہ جس طرف جانا ضروری ہو۔۔۔کوئی روگ ہے جو لگے تو لگا ہی رہتا ہے۔۔۔کوئی ساز ہے کہ چھڑے تو چھڑا ہی رہتا ہے۔ خیر یہ دل کی باتیں ہیں صاحب۔۔۔انہیں آپ سے کیا کرنا؟؟"

اس کے سفال گر نین تاکتی، لہجے کے مدھر زیروبم میں وہ یوں اطمینان سے بول رہی تھی گویا ان کی گفتگو شاہی مسجد کے صحن میں پھر وہیں سے شروع ہوگئی ہو جہاں سے دلبرداشتہ ہوکر وہ ادھوری چھوڑتے ہوئے بھاگ گئی تھی۔اس کے جواب میں "پنہاں" آخری شکوے سے "عیاں" تھا کہ خود کو مسلسل نظرانداز کرنے پر وہ اس سے خفا ہے۔اس کی شکایات کا "مقصود" سمجھتا جواباً کچھ بھی کہے بنا وہ بس یاسیت سے مسکرادیا تو اس کی آنکھوں میں پھر سے جل اٹھا وہی مخصوص کرب پڑھتی لہجہ بدل کر وہ مزید گویا ہوئی۔

" چلیں چھوڑیں یہ سب۔۔۔آپ بتائیں آج مجھے خود سے کیسے بلالیا آپ نے؟؟ میری دانست میں تو یہ تھا کہ اگر آپ نے کبھی مجھے پہلے دیکھ لیا تو راستہ ہی بدل لیں گے۔۔۔کیونکہ آپ شاید میرا درد نہیں سمجھ سکتے۔میں سچ مچ حیران ہوئی ہوں بہت کہ آپ کا یوں چلے آنا تو بالکل۔۔۔ماوراسا ہے۔یعنی ناممکن۔۔۔"

اوراس جرح کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر پھیلتے یک گونہ حزن ورنج کو دیکھتے ہوئے ایک پل کے لیے تھم کر اس نے یوں نفی میں سرہلایا کہ گویا اس بات کا علم تو اسے خود بھی نہیں ہو کہ وہ اس کے پاس کیوں آیا ہے؟

پھر سر اٹھا کر آسمان کو تا کتے ہوئے موسم کے تیزی سے بگڑتے مزاج و تیور دیکھتا وہ نرم و ساکن لہجے میں بولنے لگا۔

"بس یونہی آپ کو دیکھ کر اس طرف چلا آیا۔ یونہی مطلب بس یونہی۔۔۔ کہ کچھ باتوں، عوامل یا چیزوں کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ باقی جہاں تک سوال ہے آپ کے باقی خیالات کا تو میرے خیال سے ہر انسان کی کہانی دوسرے سے بہت الگ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کی کہانی میں بسے درد و غم کو عین عین نہیں جان سکتا۔ یہ دنیا ایک جہانِ حیرت ہی سہی لیکن۔۔۔ اس میں اتنا جی کر اگر اب بھی آپ کو کسی بات پر "حیرت" ہوتی ہے تو درحقیقت حیرت کا "باقی ہونا" ہی مقام حیرت ہے۔ پھر تو سمجھیں کہ آپ نے دنیا کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ یہاں کچھ بھی ہونا ممکنات میں سے ہے۔۔۔ کہ ماورائی تو کچھ ہے ہی نہیں۔ میرا آپ تک خود سے چلے آنا کہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

مدھم مدھم بولتے آخرش اس کا لہجہ بالکل ہار گیا تو اس اداس تر دیوتا کی تمام تر اداسیوں سے بندھ کر اس خواب گر لڑکی کو لگا کہ اپنی "چاہت" یکسر بھول کر وہ پھر سے اس کی "کہانی" پر جاں لٹانے لگی ہے۔ اس پل مبہم ہنکارا بھر کر چند قدم دائیں جانب بڑھتے ہوئے اس نے پھر سے حوض کے گرد آن بیٹھے کبوتروں کا غول اڑایا اور وہیں رخ پھیرے پھیرے نرم لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں نہیں جانتی آپ کی کہانی کیا اور اس میں بسا درد کیسا ہے؟ اور مجھے یہ بھی نہیں خبر کہ آپ یہاں تاریخی مقامات پر ادھر ادھر کیوں گھومتے ہیں؟ میں بس یہی کہوں گی کہ آپ کا مجھ سے خود ملنا میرے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بڑی قدر و وقعت رکھتا ہے۔"

یہاں اس کی جانب مڑ کر شاہی قلعے کے داخلی راستے کی طرف جاتی روش پر اشارہ کرتی وہ بادلوں کی گرج چمک دیکھتے ہوئے مزید بولی۔

"آہستہ آہستہ واپسی کے لیے نکلیں کیا؟؟ یقیناً اب بارش ہونے والی ہے۔"

اور اس کی پشت پر کھڑا شرارت کرتے اس کے گھنیرے بالوں سے نگاہ چرا کر، اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ فقط یہی بولا۔

"ہاں شاید۔۔۔ بادلوں کی گرج سے تو یہی لگتا ہے کہ سارے محاورے الٹ کر خوب برسیں گے۔ خیر۔۔۔

جی ضرور چلیں ۔"

بات مکمل کر کے اس نے قدم بڑھا بھی دیئے تو وہ تیزی سے اس کی ہمراہی میں چلی آئی۔

"اور میرے آنے کو اس قدر اہمیت دینے کا بہت شکریہ۔ سچ کہوں تو آج مجھے بھی آپ سے مل کر بہت اچھا لگا ہے۔ بس یہ ہے کہ۔۔۔ یوں بے قرار ہو کر مت پھرا کیجیئے ۔"

کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اختتام پر اس نے ہولے سے نصیحت بھی کر دی تو اس کی لہجے سے اپنے لیے جھلکتی ایک ہلکی سی فکر پر بھی وہ بے طرح سرشار ہوئی۔

"میری فکر کرنے کا شکریہ۔ میں اس پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔"

بے ساختہ پلکیں جھپک کر سر تسلیم خم کرتے ہوئے وہ گویا یقین دہانی کروانے لگی تو اس کے فدائی انداز پر وہ پھر سے کہیں الجھنے لگا۔ کہ عشق میں اکثر سر تسلیم خم کرتے ہوئے صرف پلکیں جھپک دینا بھی۔۔۔ پورا سجدہ ہوتا ہے۔

"اچھا مجھے بتائیں نا کہ آپ یہاں کیوں آتے ہیں؟ ان بام و در سے لگ کر، لپٹ کر کسے یاد کرتے ہیں؟ کن کو تلاشتے ہیں؟؟ پلیز۔۔۔"

اور اسی پل اسے نرم پڑتا دیکھ کر نہایت دلنشیں لب ولہجہ میں وہ پھر سے اس کی کہانی کی کھوج کرنے لگی کہ جس کے اک کردار سے واقفیت کی بنا پر اسے اس میں بھرپور دلچسپی تھی۔ اس کے سوال پر اس دیوتا کے چہرے پر گویا کئی منظر ایک ساتھ آ کر گذر گئے اور وہ ساکت نگاہوں سے بس اسے دیکھتا رہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بہت کچھ کہنا چاہے لیکن کچھ بھی نہیں کہہ سکے۔

اب اس سے پہلے کہ لال روش پر بغور ایک دوسرے کو تاکتے ہوئے مسلسل آگے چلتے ان دونوں افسانوی کرداروں میں سے کوئی بھی کچھ بھی مزید بولتا، آسمان پر رقصاں بادل بڑے شور سے گرجا اور ٹوٹ ٹوٹ کر ان پر برسنے لگا۔

" آہ۔۔۔ بارش۔۔۔ جلدی چلیں ہم بھیگ جائیں گے۔"

یہ محویت توڑ کر اس اپسرا نے بے ساختہ اپنی دونوں ہتھیلیاں سامنے پھیلائیں اور ان پر گرتے بارشی قطرات

دیکھ کر یہاں وہاں کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نظر دوڑا کر بولی۔

"وہ رہی جگہ۔۔۔آئیں آپ۔۔۔ہم ان غلام گردشوں میں رکتے ہیں۔ہیلو۔۔۔کہاں گم ہیں آپ؟میں کہہ رہی ہوں ہم بھیگ جائیں گے۔"

اوراس کے مسلسل پکارنے پر وہ یوں چونکا جیسے کسی اور جہاں سے لوٹا ہو۔ان کی گفتگو بڑے نازک موڑ پہ ٹوٹ گئی تھی۔اس کے سامنے ہاتھ ہلاتی اسے پکار پکار کر وہ افراتفری کے عالم میں غلام گردشوں کی جانب چار قدم بڑھی ہی تھی کہ اس کی مغموم آواز پر پھر سے ٹھہر گئی۔

" آپ جائیں محترمہ۔۔۔میں بس اب واپسی کے لیے نکلوں گا۔مجھے ان بارشوں میں بھیگنے سے کوئی ڈر، خطر نہیں۔شکریہ اور خدا حافظ۔"

اوراس سے پہلے کہ پلٹ کر وہ اسے روکنے کی کوشش کرتی تیز تیز چلتا وہ بارشوں کے سنگ ہو گیا۔ایک پل کو جامد رہ کر تحیّر بھری نظروں سے اسے دور تک جاتا دیکھتی وہ آنکھوں میں اتر آیا پانی نچوڑنے لگی اور پھر چھم چھم برستی بارش میں بے تحاشا بھاگتی ان غلام گردشوں میں آ رکی۔

وہ پھر سے دور جا رہا تھا۔۔۔اور وہ پھر سے جلنے لگی تھی۔۔۔وہ پھر سے اوجھل ہو گیا اور وہ پھر سے مچلنے لگی تھی۔

ہوتی ہیں کچھ کہانیاں ایسی بھی کہ جن کا آغاز و انجام کچھ بھی۔۔۔طے نہیں ہوتا۔

☆......☆......☆

اگلے دن یونیورسٹی سے تاریخی مقامات پر جانے کے لیے وہ اک نئے ولولے سے نکلے تھے۔سفیر کو ماڈلنگ کرتے ہوئے دیکھنے کا سوچ سوچ کر ہی وہ بے انتہا خوش تھے اور اپنی اس خوشی پر قابو نہیں کر پا رہے تھے۔ان سب کے چہروں پر اپنے لیے درج خلوص پڑھتے سفیر کے لیے سب سے اہم پہلو اور خوش کن بات یہ تھی کہ آج تو ثومیہ بھی خوب چہک رہی تھی۔مریم کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس کی ماڈلنگ سے متعلقہ گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

خیر قصہ المختصر۔۔۔بائیکس پارکنگ میں روک کر ہنسی مذاق کرتے، باہم کھلکھلاتے وہ سب شاہی قلعے پہنچے

اور داخلی احاطے میں پہنچ کر وہاں کا منظر دیکھتے ہوئے بے طرح چونک گئے۔ فوٹو گرافر علی مصطفٰی حسبِ وعدہ ماڈلنگ کے پورے انتظامات کے ساتھ وہاں ان کا منتظر تھا۔ رسمی علیک سلیک اور ہلکی پھلکی تواضع کے بعد بڑی توقیر بخشتے ہوئے انہیں تین آرام دہ کرسیوں پر ایک طرف بٹھا دیا گیا جبکہ بنا وقت ضائع کیے سفیر کو ایک عارضی پیراشوٹ ٹینٹ میں لے جایا گیا جہاں اسے ماڈلنگ کے لیے تیار ہونا تھا۔

"میں دعوے سے کہتی ہوں کہ سفیر تھوڑی توجہ دے تو اس میدان میں بہت آگے جائے گا۔ بنا کسی اضافی تیاری کے بھی یہ کسی ماڈل سے بہرحال بہتر لگتا ہے تو تیار ہو کر تو اس کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا ہی نہیں۔ ظاہر ہے بھئی ماڈلز کا اپنا مخصوص انداز، تیاری، طریقہ کار اور طرز و طور ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے؟؟"

وہاں بیٹھے بیٹھے انہیں کچھ ہی دیر گذری ہوگی کہ مریم نے پیشگوئی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ تمہاری بات سے متفق ہوں۔ لیکن یہ بندہ مستقل ماڈلنگ نہیں کرے گا۔ میں اس کے مزاج سے واقف ہوں۔ اب بھی سمجھو صرف ہمارے اصرار پر راضی ہوا ہے۔"

جواباً اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کرتے ہوئے مصطفین نے بھی خیال آرائی کی تو مبہم انداز میں لمبا سا "ہوں۔۔۔" کہہ کر مریم اب سوالیہ نظروں سے ثومیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"میرے خیال سے مصطفین ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے بھی یہی لگا کہ وہ خود سے اس میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور کل دیکھا تو سہی تم نے کہ وہ تو وہیں کھڑے کھڑے اسے انکار بھی کر چکا تھا۔ ہوسکتا ہے کچھ سالوں بعد ہم اسے کسی ملٹی نیشنل کمپنی یا کسی فارن بنک میں بطورِ ایک اہم عہدیدار دیکھیں۔ وہ اسی قسم کا کیرئیر بنانا چاہتا ہے شاید۔"

اس کی سوالیہ نظروں کا مقصود بھانپتے ہوئے ثومیہ نے تفصیلاً اپنی رائے پیش کر دی تو مایوسی سے لب سکیڑتی وہ انتہائی بدمزہ ہوئی۔

"چلو جی مرضی ہے اس کی۔ میں ایویں اتنی خوش ہو رہی تھی۔ ابھی تو میں نے پوری کلاس کو بتانا تھا کہ تم دونوں کے ان "قیافہ جات" نے دل توڑ دیا ہے۔ شوخی بھی نہیں مارنے دی۔ چھڈو جی۔ مٹی پاؤ۔"

بات مکمل کر کے "مٹی پانے" کے لیے اس نے باقاعدہ ہاتھ جھاڑے تو اس کے انداز پر بے ساختہ ایک

دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے وہ دونوں بے تحاشا ہنس دیئے۔

"ارے۔۔۔لیکن کلاس میں تو تم اب بھی بتا سکتی ہو یار۔کوئی پابندی تھوڑی ہے۔بھئی فی الوقت کر تو رہا ہے وہ ماڈلنگ۔شوخی مارنے کو یہ بات بھی کم تو نہیں۔"

اس بار اسے دونوں شانوں سے تھام کر پیار سے دباتی ثومیہ نے گویا اسے تسلی دی تھی۔

"ہاں یار۔۔۔واقعی۔۔۔یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ابھی تو کر رہا ہے نا۔۔۔اور پھر کل کس نے دیکھی ہے بھلا؟؟؟"

فوری طور پر اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ جھلاتی وہ بچوں کی مانند خوش ہو کر بولی تو وہ دونوں بھی مسکرا دیئے۔

یہاں فقط ایک لمحے کے توقف سے کسی کے مزید کچھ بھی بولنے سے پیشتر ٹینٹ کی جانب دیکھتے مصطفین کے لب دلکشی سے سرسرائے تھے۔

"واؤ۔۔۔کمال است۔"

اور ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر وہ دونوں بھی اس جانب متوجہ ہوئیں اور پھر ابھی ابھی ٹینٹ سے باہر آ کر قدم قدم اپنی طرف بڑھتے سفیر کو دیکھتی اپنی جگہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔منفرد طرزِ بناوٹ اور خاص تر سلائی کے حامل سفید کرتہ شلوار میں ملبوس سفیر انتہائی غضب ڈھا رہا تھا۔اس کے گھنے بالوں کو سٹائلسٹ نے بڑے ہی انوکھے انداز میں سر اور گردن پر ایک طرف جمایا تھا اور چہرے پر میک اپ کی ہلکی لیکن قدرتی طرز کی تہہ کے ساتھ وہ بالکل ترکش جوان لگ رہا تھا۔کرتے کی خاص بناوٹ کی بدولت اس کا سینہ کافی حد تک عیاں ہو رہا تھا جہاں چمکتے ہوئے کالے بالوں سے جھلکتی گلال رنگ جلد اس کی کشش بڑھا رہی تھی۔وہ دونوں یک ٹک اس کی غزال تر آنکھوں میں در آیا خمار دیکھ رہی تھیں کہ وہ ان کے بالکل قریب آ رکا۔

"کیسا لگ رہا ہوں۔۔۔؟؟"

ان کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا کر وہ مصطفین کے سامنے پورے کا پورا سیدھا ہوا تو سر تا پا اسے بھرپور نظروں سے دیکھتا وہ شائستگی سے بولا۔

"دلکش و دل جانم۔۔۔دلپذیر و دلنشیں بھی یارم۔۔۔بس انت اخیر اور سب کا سب۔"

جواباً اس سے اس قدر تعریف پا کر وہ فریفتگی سے اس سے لپٹ ہی گیا۔

"تو جند جان ہے شہزادے۔۔۔ تجھے تو اچھا ہی لگوں گا۔"

اور ان دونوں کو یوں دوستی نبھاتے دیکھتی وہ دونوں بھی خود کو سنبھال کر انہیں متوجہ کرنے کے لیے گلا کھنکارنے لگیں۔

"ماشاء اللہ بہت اچھے لگ رہے ہو سفیر۔ چشم بدور۔"

ثومیہ کے ان الفاظ نے اسے گویا ہواؤں کے کسی نرمیلے رتھ پر دھر دیا۔

"ہاں سفیر۔۔۔ تم سچ مچ آگ لگا دو گے۔ کب ہے شوٹ؟؟"

بے طرح سرشار ہوا وہ مسلسل مسکرا رہا تھا کہ مریم کی آواز پر مصطفین کی کلائی تھام کر بولا۔

"شکریہ تم سب کا دوستو۔۔۔ شوٹ بس ابھی ہے۔ وہاں اس بارہ دری میں شوٹ ہوگا۔ میں بس تم لوگوں کو بتانے آیا تھا۔ تم سب بھی اس طرف ہی آجاؤ۔ اوکے؟؟"

اور جلدی جلدی تفصیلات بتا کر جواب سنے بنا وہ پلٹ بھی گیا تو اس کی تیزیوں سے بھی سرشار ہوتے وہ سب اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ بھاگتے چھوٹتے لمحوں میں بھی ہماری خوشیوں میں خوش ہونے والے۔

پھر یوں ہوا کہ یہاں کی مختلف عمومی جگہوں اور خصوصی مقامات پر اس برانڈ کے دس سے بارہ خوبصورت ملبوسات بدل کر سفیر نے وہ فوٹو شوٹ مکمل کروایا اور علی مصطفیٰ سے فراغت کی سند پا کر ان کے ساتھ اپنے مراسلے کے لیے مواد و معلومات جمع کرنے لگا۔

ماڈلنگ میں کافی وقت لگنے کی وجہ سے اب انہیں جلد از جلد آج کا کام مکمل کرنا تھا۔

☆......☆......☆

"آخر تم چاہتی کیا ہو یار؟ یہ سب لڑکے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ اور یہ بھی کچھ کم حسین تو نہیں ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے تمہارے واسطے ہیرو بننے کے لیے "رام شِو" کو خود سے آنا پڑے گا۔ تبھی کوئی ٹھنڈ رہے گی تمہیں۔۔۔"

ریموٹ کی مدد سے سامنے دیوار پر لگی بڑی سی سکرین پر چند بے حد حسین لڑکوں کی تصاویر کو یکے بعد دیگرے

آگے گذارتے ہوئے ناز نے انتہائی چڑ کر گیتی کو مخاطب کیا۔

وہ اس وقت پرل کانٹینینٹل ہوٹل لاہور میں اپنے لیے بک کیے گئے اسی سوئٹ میں تھیں اور شام میں رفیق نواز کی جانب سے بھجوائی گئی ایک یو-ایس-بی ڈیوائس سے مختلف نوآموز لڑکوں کی تصاویر دیکھ کر گیتی کی نئی فلم کے لیے ہیرو کا چناؤ کر رہی تھیں۔ گیتی نے بصد اصرار رفیق نواز سے یہ سب تصاویر اسی روز منگوا لیں کیونکہ وہ جلد از جلد بطورِ اداکارہ اور پروڈیوسر اپنی نئی پاکستانی فلم کے لیے حتمی طور پر کوئی ہیرو چننا چاہتی تھی تاکہ اس لڑکے کو تیاری کے مراحل سے گذارا جا سکے۔ لیکن کم از کم تیس خوبصورت ترین لڑکوں کو بھی صرف سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے وہ بری طرح مسترد کر چکی تھی کہ ان میں وہ بات نہیں۔ بالآخر اس نے ناز کو تپا دیا تھا۔

"ارے ہاں۔۔۔ یہی بات ناز۔ بالکل یہ چیز۔۔۔ یہی تو میں چاہتی ہوں سہیلی کہ کوئی ایسا لڑکا ہو جسے دیکھوں تو سرسری نگاہ بھی ٹھہر کر رہ جائے۔ کوئی ایسا ہو جو "رام شو" نہ سہی لیکن وہ دیوتاؤں جیسا ہو۔ یہ سب فارغ ہیں یار۔ ان کے چہروں سے نوآموزیت کا بچکانہ سا تاثر صاف جھلک رہا ہے۔ مجھے کوئی ایسا چاہیئے ناز جو حقیقی مرد دکھے۔ کامل، مکمل اور۔۔۔ پورا مرد۔ اور اس کی آنکھیں تو ایسی ہوں کہ بس ڈوب جائے کوئی۔ کہ جب بھی ان پر نظر کرے۔۔۔ تو کوئی دریا دریا گھوم آئے۔ کوئی ایسا ہو تو دکھانا مجھے۔ اب تک تو نہیں ہے ان میں۔" جواباً گہرے و عمیق لہجے میں اس نے کسی خیال میں رہ کر بات مکمل کی تو اس کا کھویا کھویا انداز بھانپ کر حیرت و اچھنبے سے اسے دیکھتی ناز گویا ہار مان کر پھر سے تصاویر کھنگالنے لگی۔

"تمہاری نا۔۔۔ کوئی بھی کل سیدھی نہیں ہے گیت۔ تم ہر وقت میرے ساتھ رہ کر بھی ہمیشہ میری سمجھ سے باہر رہی ہو۔ اب کہاں سے لاؤں ایسا دیوتا میں تمہارے لیے؟؟ دنیا میں دیوتا نہیں ہوتے سہیلی۔ دنیا میں بس عام لوگ بستے ہیں۔ ماورائی لوگوں کی تلاش میں بھٹکنے کی بجائے بہتر ہو گا تم کسی عام پر ہی اکتفا کر لو۔"

پھر ٹھہر ٹھہر کر تصاویر آگے پیچھے کرتی، سکرین پر نظریں جمائے وہ ناصحانہ انداز میں بولی تو مبہم مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیرس کی جانب بڑھتی گیت نے متوازن لہجے میں کہا۔

"یہ سب ٹھیک لیکن میرے خیال سے دنیا میں ہم وہی پاتے ہیں ناز جس کی ہم چاہ کریں۔ بشرطیکہ ہمیں اپنے مقصود کی چاہ رکھنا آتا ہو۔"

یہاں ٹیرس کے دروازے کا پٹ تھام کر وہ رکی اور لہجہ بدل کر مزید بولی۔

"میں کچھ دیر لاہور جھانک لوں۔ سنا ہے جس نے نہیں دیکھا وہ پیدا نہیں ہوا۔ کوئی ملا ویسا تو مجھے خبر کرنا۔"

جواباً ناز نے صرف ہاتھ سے اسے جانے کا اشارہ کر دیا تو اس کے چڑنے کا ادراک رکھ کر شرارت سے مسکراتی وہ کھلے میں نکل گئی۔ باہر تاریک آسمان پر گھور کالے بادلوں کا گھیر تھا اور اس قدر عمیق کہ ایک پل کو اسے آسمان سے خوف محسوس ہوا۔ لیکن پھر زمین پر نگاہ کی تو اونچے لمبے درختوں کے مابین واقع طویل تر مال روڈ اور اس پر رواں دواں بے مہابا گاڑیوں کی روشنی سے قرار پا کر گویا وہیں اپنا وجود سرسراتی ہوئی سرد ہواؤں کے سپرد کر دیا۔ ہوائیں اس کے آنچل سے عطر و عرق چرا کر پورے شہر پہ پھونکنے لگیں اور دور جھاڑیوں سے اٹھے اڑ اڑ کر اوپر آتے جگنو گویا اس کا طواف چاہتے تھے۔ بلندی پر رک کر بیرونی ریلنگ تھامے جھکی وہ دیر تلک انہی نرم و نازک محسوسات میں گھلتی رہی کہ اس کے دل میں بسی پاکستانیت اس پل بھرپور جوبن پر تھی۔ یہ ملک۔۔۔ یہ باشندے۔۔۔ یہاں کا اک ایک ماحول و منظر۔۔۔ اس کے اندر بسی "جمنا" کو بڑا مسرور کرتا تھا۔ لبوں پر دلکش مسکان سجائے، ہولے ہولے دائیں بائیں ہلتے اور خیالات کی کسی نہج پر چلتے جانے یہ کون سا پہر تھا کہ بادلوں نے گرج کر اسے واپس یہیں ٹیرس میں لا پٹخا۔ موسم، ہوا، اور اڑتے پھرتے تمام تر جگنوؤں کو وہیں تنہا چھوڑتی وہ تیزی سے واپس داخل ہوئی اور اندر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ نیند کے غلبے کے باعث ناز صوفے پر ہی بے سدھ سوئی پڑی تھی اور سکرین پر "سلائیڈ شو" کی بدولت ایک کے بعد ایک کر کے مختلف لڑکوں کی تصویریں چل رہی تھیں۔

مدھم مسکرا کر، آہستگی سے چلتی، صوفے کے گرد گھوم کر وہ ناز کے پاس آئی اور اس کا ترچھا پڑا ہوا بازو نہایت احتیاط سے سیدھا کرتے ہوئے اس کی ایک طرف گدیوں کی ٹیک بنا دی۔ وہ اس کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ ریموٹ تھام کر سکرین آف کرنے کے لیے جونہی اس نے ہاتھ سیدھا کیا وہاں پر اس پل رواں اک تصویر کو سرسری سا دیکھتے اس کی نظر جم سی گئی۔ سمندری لہروں سی طغیاں۔۔۔ اس لڑکے کی سحر گر آنکھوں اور چاشن گر دھاروں سے لبریز اس کے شنگرفی لبوں نے اسے باندھ لیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس قدر دلنشیں تھا کہ دلوں پہ جا لپکتا تھا۔۔۔ وہ اتنا دلآویز تھا کہ آنکھوں میں آ بسے۔ تراشیدہ ملبوس سے جھلکتے اس کے ہر

حسین انگ اور بھرپور دلکش جسامت کو دیکھتے ہوئے اسے شدت سے احساس ہوا کہ یہی وہ کامل، مکمل۔۔۔اور پورا مرد ہے جس کی اسے تلاش تھی۔ایک تواتر سے گذرتی اس کی ساتوں تصاویر پر کونہ کونہ اس کے نین نقش پڑھتی وہ تصاویر گذر جانے کے بعد ہی سنبھل سکی۔

"ناز۔۔۔اٹھو یار۔۔۔ناز پلیز۔۔۔اٹھو بھی۔"

اور پھر وہ جو اس کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی، پلٹ کر اسے بری طرح جھنجھوڑنے لگی۔

"اے بھگوان۔کاہے اودھم مچا رہی ہو گیت؟ اری ٹھیک سے سو تو لینے دیتیں یار۔۔۔"

ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی، سینے پر ہاتھ رکھتی وہ ہول کر بولی تو "سوری یار۔۔۔ارجنٹ تھا۔" کہہ کر جلدی جلدی تصاویر "ری-وائنڈ" کرتی وہ اس کا چہرہ باقاعدہ تھام کر سکرین کی طرف موڑتے ہوئے بولی۔

"وہ دیکھو۔۔۔یہی ہے وہ دیوتا۔۔۔مجھے اپنے مقابل صرف اور صرف یہی لڑکا چاہیئے۔"

اس نے گویا کوئی حتمی فیصلہ سنایا۔

"آں۔۔۔یہ تو واستو میں سندر ہے گیت۔بھلا پراتھم کہاں تھا یہ؟ مجھے کیوں نہیں دکھا؟" اور اسکرین پر اسی کے انداز میں نظریں جمائے وہ بھی یوں تصاویر تاکنے لگی گویا کبھی اس منظر سے ہٹے گی نہیں۔

"جانے کیوں نہیں ملا۔میں تو اسکرین آف کرنے لگی تھی جب اچانک دکھا یہ۔"

گیتی کا جواب سن کر اثبات میں سر ہلاتی وہ اٹھی اور سکرین کے نزدیک رک کر ایک تصویر پر نیچے بالکل ایک طرف پٹی کی صورت میں لگی وہ "تفصیلات" پڑھنے لگی جن میں سٹوڈیو، پروڈکشن ہاؤس اور ماڈل کا نام درج تھا۔

"کیا نام ہے اس لڑکے کا؟ میں ابھی رفیق سر سے پوچھتی ہوں۔"

اپنے پیچھے دبے دبے جوش سے بولتی گیتی کی آواز سن کر وہ مسکراتی ہوئی اس کی جانب مڑی۔

"سفیر ہے کوئی۔۔۔سفیر احمد۔۔۔یوں لگتا ہے نا جیسے "سمیر" ہو یہ۔۔۔ہمارے ہندوستانی ہیروز کا مشہور فلمی نام۔۔۔" اس کے شگفتہ لب ہولے سے سرسرائے تھے۔

"آج کل تم بہت الگ تھلگ رہتے ہو۔۔۔تمہارے بابا بھی کہہ رہے تھے کہ سفیر کسی حوالے سے کچھ پریشان دکھائی دیتا ہے۔کیا بات ہے جاناں؟؟"

یہ اسی روز کی بات ہے ڈنر کے بعد سفیر اپنے کشادہ ٹیرس میں نکل کر کالونی میں دور تلک پھیلے اندھیرے تاک رہا تھا کہ ذکیہ بیگم دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر آہستگی سے اس کے ساتھ آ رکیں۔پچھلے کئی دنوں سے خاموش رہ کر وہ ماحول میں ہوتے ہوئے بھی اس کی "گمشدگی" جانچ رہی تھیں اور بالآخر آج انہوں نے اس کی وجہ کھوجنے کا عزم کیا۔

"آں۔۔۔کچھ نہیں ماما۔میں ٹھیک تو ہوں بالکل۔ابھی آپ دونوں کے پاس سے ہی تو اوپر آیا ہوں۔ماڈلنگ وغیرہ کا بھی تو سب بتایا ہے۔پھر جانے کیوں ایسا لگا آپ کو؟"

ان کی مدھم آواز پر اپنے استغراق سے باہر آتا وہ ان کی کھوجی نظروں میں جھانک کر تسلی دینے لگا تو بغور اس کے انداز بھانپتی وہ نرمی سے مسکرا دیں۔

"ہاں ماڈلنگ کا تو بتایا تم نے لیکن۔۔۔"

ایک ہنکارا ابھر کر انہوں نے ریلنگ پر دھرے اس کے ہاتھ کو چھوا۔

"لیکن کوئی تو بات ہے نا سفیر کہ جو ہم دونوں کو ہی محسوس ہوئی ہے۔بتاؤ شاباش۔۔۔کیا بات ہے؟ کس فکر میں رہتے ہو؟ کیوں گم سم، گھپ چپ اور اپنے آپ میں مگن ہو آج کل؟؟ کہاں کھوئے رہتے ہو؟ بتاؤ جاناں۔۔۔"

بغور اس کا چہرہ پڑھتی متفکر لب و لہجہ میں وہ سوال در سوال کرتی چلی گئیں تو تاثرات چھپانے میں انتہائی لاچار ہوتا وہ ایک پل کو رخ بدل گیا۔

"مجھے ٹالنے کی خاطر کوئی اور جھوٹ مت گھڑنا سفیر۔میں جانتی ہوں تم پریشان ہو بہت۔مجھے صرف سچ بتاؤ۔بھلے جو بھی ہے۔"

اس رخ بدلتے دیکھ کر بے حد اعتماد سے انہوں نے مزید کہا تو شانے جھٹک کر گویا بہت ہارا ہوا سا وہ واپس

ان کی جانب مڑا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے ماما جان۔ میں جلد آپ سے شیئر کرنے والا تھا۔ بس مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے بات کروں۔ دراصل وہ۔۔۔ثومیہ کا رویہ اور انداز کسی قدر بدل گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھے نظرانداز کرتی ہے اور نظرانداز اگر نہیں کرتی تو محتاط ضرور رہتی ہے۔"

بالآخر گنے چنے مناسب لفظوں میں اس نے اپنی پریشانی بیان کی تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ان کا اندرون پہلے سے کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو بات اسی کے متعلق ہوگی اور یہی ہوا تھا۔

"ایک منٹ۔۔۔ مجھے کھل کر بتاؤ شاباش جو بھی بات ہے۔ پھر ہی میں اس پر کوئی رائے دے سکوں گی۔ اس کا رویہ یا انداز بھی یوں بے وجہ تو نہیں بدلے ہوں گے۔تم نے کوئی بات کی ہے کیا اس سے؟ میرا مطلب ہے کہ اسے بتا دیا ہے کیا کہ تم اس سے پیار کرتے ہو؟ ہاں۔۔۔؟"

اس کا ہاتھ پکڑ کر ہولے ہولے جھٹکتے ہوئے انہوں نے بھرپور جرح کی تو اتنے واشگاف سوالات سے جھجکتے ہوئے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑواتا وہ ٹیرس سے بڑھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ ذکیہ خاتون بھی قدم بہ قدم اس کے پیچھے چلی آئیں۔

"جی ماما۔۔۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ اور اس کا کہنا ہے کہ وہ مجھے صرف دوست سمجھتی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اب مجھے فکر یہ ہے کہ میں اسے اپنی محبت کا یقین کیسے دلاؤں؟ کیونکہ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ میں دوستی میں بس وقتی لگاوٹ کو محبت سمجھ بیٹھا ہوں۔"

بیڈ کے بالکل پاس رک کر رخ دوسری طرف کیے وہ اپنی پشت پر ان کی موجودگی کا ادراک رکھتے ہوئے بولا تو اسے حقیقتیں اگلتے سن کر ان کے چہرے پر بے پناہ تفکر در آیا۔ مبہم ہنکارا بھرتے ہوئے وہ بڑھیں اور اسے بازو سے تھام کر اپنے ساتھ بیڈ کی ایک طرف بٹھا لیا۔

"ہمم۔۔۔تو یہ بات تھی۔ میرا پرنس اس وجہ سے ہم سے کٹا ہوا سا تھا۔"

اس کے بال سنوارتے ہوئے انہوں نے اسے متوازن کرنے کے لیے پچکارا تو دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتا وہ سوالیہ نظریں ان پر گاڑے گویا اپنی فکر کا حل تلاشنے لگا۔

"میں سمجھ سکتی ہوں میری جان کہ تم بہت پریشان ہو۔لیکن کبھی یہ بھی سوچا ہے جاناں کہ وہ کیوں تم گریز برت رہی ہے؟ تم وہی سفیر ہو نا جسے ہمیشہ یقین رہا ہے کہ اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔۔۔اور بلاشبہ یہی حقیقت ہے۔"

قدرے ٹھہر کر انکشاف آمیز لہجے میں انہوں نے کہنا شروع کیا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"تم صرف یہ سوچو کہ جب وہ تمہاری اتنی شاندار اور اس قدر خوبصورت شخصیت کو بھی رد کر رہی ہے تو یقیناً اس کے پاس اس کے متبادل بہت مضبوط وجہ ہو گی۔کوئی تمہیں بے وجہ رد نہیں کر سکتا میری جان۔۔۔کوئی بھی نہیں۔"

اوران کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ بے تابی سے بول اٹھا۔

"لیکن ایسی کون سی وجہ ہو سکتی ہے ماما کہ وہ مجھے انکار کر دے؟ یہی سوچ سوچ کر تو میں بھی پریشان ہو رہا ہوں۔"

اس کی بات پر وہ یوں رکیں گویا بہت کچھ لبوں پہ سی لیا ہو اور پھر کچھ توقف سے کہا۔

"دیکھو سفیر میں اول روز سے تم سے یہ بات کہنا چاہتی تھی لیکن تمہاری خوشی کو دیکھتے ہوئے نہیں کہی۔میرے خیال سے اپنے اور ثومیہ کے متعلق سوچنے کے علاوہ تمہیں ثومیہ اور مصطفین کے باہمی تعلق کو بھی جانچ لینا چاہئیے۔عین ممکن ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں لیکن تم اس بارے میں لاعلم ہو۔کیا خیال ہے؟"

کسی قدر الجھے الجھے لہجے میں انہوں نے اپنے پرانے خدشات کو زبان دے دی تو ان کا محتاط سا انداز پرکھتا وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر ان کے بالکل سامنے رکا۔

"یہ ناممکن ہے ماما۔میں اچھے سے جانتا ہوں ان دونوں میں ایسا کوئی معاملہ نہیں۔ مصطفین تو بہت بعد میں آیا ہے ہمارے درمیان۔اور پھر وہ بخوبی جانتا ہے کہ میں ثومیہ سے محبت کرتا ہوں۔ بلکہ وہ تو خود مجھے زور دیتا ہے کہ میں اس سے اظہارِ محبت کروں۔کہا نا ماما یہ ہرگز نہیں ممکن۔۔۔"

اس نے بھرپور قطعیت سے یوں دلائل پیش کیے کہ اس کے حرف حرف سچے لہجے پہ وہ پورے دل سے ایمان لے آئیں۔اپنے اندازوں یا خدشات کے غلط ثابت ہونے پر انہیں ایک طرح سے خوشی بھی ہوئی۔

"اچھا۔۔۔تو پھراب سوال یہ ہے کہ جب ایسا بھی کوئی معاملہ نہیں تو وہ تمہیں انکار کیوں کر رہی ہے بھئی؟؟ اب باقی کیا بچتا ہے؟"

اس بار ہونٹ سکیڑ کر سوال اٹھاتی وہ بیٹھے بیٹھے آگے ہوئیں اور اس کا دایاں ہاتھ تھام کر واپس اپنے پاس کھینچ لیا۔وہ کسی ضد پراڑے ہوئے بچے کی مانند بس اپنی منوانا چاہتا تھا۔

"پتانہیں ماما۔۔۔اسی بات نے تو پریشان کر رکھا ہے مجھے۔"

وہ نروٹھے پن سے یوں بولا گویا سوچ سوچ ہارا ہو۔

"پھر بھی کچھ تو سمجھ آیا ہی ہوگا تمہیں کہ آخر تم اس سے روز ملتے ہو؟ اور تم تو بتا رہے تھے آج اسے گھر تک بھی چھوڑنے گئے ہو؟ بھئی میں تو بالکل نہیں سمجھ پا رہی کہ کس قسم کا بدلاؤ ہے یہ اس کا تمہارے ساتھ؟ ٹھیک ٹھاک تو ہے اس کا رویہ۔پھر مسئلہ کہاں ہے؟؟"

اس پل اکلوتے جوان بیٹے کے حسین چہرے پر جابجا بکھری سوچیں انہیں ازحد بے چین کر گئیں تو انہوں نے انتہائی چڑ کر سوال کیا۔ان کی بات پر اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا کر انگلیاں اپنے گھنیرے بالوں میں پھنسائیں اور دل ہی دل میں کچھ حروف جوڑتے ہوئے ان کی طرف مڑا۔

"مسئلہ کہیں نہیں ہے ماما۔بس اسے احساس نہیں ہو پا رہا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ورنہ میں نے اس کی آنکھوں میں بارہا اپنے لیے خاص جذبے دیکھے ہیں۔وہ پاگل جو مجھے کہتی ہے کہ میں گہری دوستی کو محبت سمجھ رہا ہوں۔۔۔نہیں جانتی کہ خود شدید محبت کو بھی صرف دوستی سمجھ رہی ہے۔لیکن میں اسے احساس دلا کر رہوں گا کہ وہ غلط ہے۔مجھے یقین ہے ماما کہ وہ مجھ پر یہ بھروسہ کرنے لگے گی۔"

اور اس کے پرعزم لب ولہجہ پر انہوں نے مسکرا کر فقط "ان شاء اللہ۔۔۔" کہہ دیا۔

وہ خوش تھیں کہ وہ اس کا اندرون جاننے میں کامیاب رہی ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ایک تقویت انہیں یہ بھی تھی کہ ان کے بیٹے کی داستان میں کوئی حریف شامل نہیں۔

☆......☆......☆

اپنی میز پر کتاب کھولے مطالعے میں غرق مصطفین نے جمائی لیتے ہوئے منہ پر ہاتھ کی پشت رکھی اور

ٹانگیں آگے پھیلا کر انگڑائی لینے کے دوران دیوار گیر گھڑی سے وقت بھی دیکھا۔

"اوہ۔۔۔سوا آٹھ بج گئے۔ نیچے خالہ لوگ لاؤنج میں ہی ہوں گے۔"

مزید ایک جمائی لے کر وہ اٹھا اور سلیپر پیروں میں اڑس کر واش روم میں چلا گیا۔ وہ کافی دیر سے بیٹھا پڑھ رہا تھا اور اب تھکاوٹ کی بعد فریش ہونے کے لیے اسے چہرے پر تازہ پانی کے چھینٹے درکار تھے۔ کچھ دیر بعد تولیے سے منہ پونچھتا ہوا وہ واش روم سے برآمد ہوا اور پلنگ کی الٹی جانب تولیہ پھیلا کر جلدی جلدی کمرے سے باہر نکل گیا۔ راہداری عبور کر کے وہ زینوں پر رکا اور تھوڑا جھک کر لاؤنج میں نگاہ دوڑائی۔ سامنے حسب توقع خالو ظفر، خالہ کنیز اور ایمان تینوں صوفوں پر براجمان ٹی-وی دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم۔۔۔تو محفل پھر خوب جمی ہوئی ہے؟؟ ہاں؟؟"

آہستگی سے زینے اتر کر لاؤنج میں صوفوں کی حد کی طرف بڑھتا وہ بشاشت سے بولا تو ان سب نے بیک وقت اسے مسکرا کر دیکھا۔

"ارے آؤ برخوردار۔۔۔وعلیکم السلام۔ میں ابھی پوچھ رہا تھا تمہاری خالہ سے کہ آج تو کھانے پر بھی نہیں آیا۔ کیوں بھئی؟؟"

خالو ظفر نے مخصوص شفقت بھرے انداز میں کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ نشست فراہم کی۔

"بس خالو جی آج بھوک نہیں تھی۔ بہت دیر سے کھانا کھایا تھا دن میں تو سوچا رات کو اب گول کیا جائے۔ آپ سنائیں دکان کیسی چل رہی ہے؟؟"

کھانے کے متعلق سرسری وضاحت کرتے ہوئے ان کے ساتھ ٹکتا وہ خوش مزاجی سے دکان کی بابت پوچھنے لگا تو پہلے انہوں نے اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلا لیا اور پھر اسی محبت سے بولے۔

"دکان بھی ٹھیک چل رہی ہے پتر اوئے۔ جب سے تو نے رقم لگائی ہے سب مسئلے حل ہو گئے ہیں۔ شکر ہے اللہ کا۔ او میں تو کہتا ہوں تو بھی دو چار گھڑی وہاں دکان پر لازمی آیا کر۔ اس سے تجھے مارکیٹ کا بھید بھاؤ معلوم پڑے گا۔ ہیں؟؟"

ان کی بات پر مبہم مسکراتے ہوئے باری باری سب کی جانب دیکھ کر اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

"نہیں خالو جی۔۔۔دکان سے مجھے تو چھٹی ہی دیں پکی۔ مجھے بالکل وقت نہیں ملتا اپنی پڑھائی سے ہی۔۔۔اور پھر میں مارکیٹ کے بھید بھاؤ جان کر کیا کروں گا؟؟ مجھے کوئی مستقل طور پر یہی کاروبار تھوڑی کرنا ہے۔ یہ تو بس عارضی جگاڑ لگایا ہے کہ تھوڑا ذمہ داری کا احساس ہو۔ یا کاروبار کہ سمجھ بوجھ پروان چڑھے۔ ورنہ میرا ارادہ فی الوقت تعلیم کے بعد کسی پرائیویٹ جاب کا ہے۔"

اور اس کی بات پر وہ تینوں فقط اس کا خلوص بھانپ کر رہ گئے۔ اتنے دنوں میں انہیں بخوبی سمجھ آنے لگا تھا کہ اس نے ان کی دکان میں اتنا پیسا صرف ان کی مدد کے لیے لگایا ہے وگرنہ اسے ذاتی طور پر اس کاروبار میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"دیکھ لے پتر۔۔۔مرضی ہے تیری۔ میں تو بس تیرا حصہ الگ سے رکھتا جاؤں گا۔ باقی میرا مشورہ اب بھی یہی ہے کہ خود دھیان دو اس طرف۔۔۔"

اب کی بار کسی قدر ممنونیت سے خالو ظفر نے یہیں تک کہا تھا کہ کب سے چپ چاپ ان دونوں کی گفتگو سنتی ایمان نے ان کی بات اچک لی۔

"ارے جانے بھی دیں نا ابو۔۔۔اب بچے کی جان لیں گے کیا؟؟ ابھی وہ کتابوں میں سر کھپا کر دو گھڑی گپ شپ کی خاطر نیچے آیا ہے اور آپ ہو کہ یہاں بھی اسے وہی کاروبار میں نفع نقصان کی بورنگ باتیں سمجھانے بیٹھ گئے ہو۔ شکل دیکھیں ذرا اس کی۔۔۔اتنی مسکینیت برس رہی کہ بس ابھی رو دے گا گویا۔"

اپنی ازلی جون میں وہ اس قدر روانی سے بولی کہ اس کے دلکش لب ولہجہ وانداز کو پرکھتا وہ کھل کر ہنس پڑا۔

خالہ کنیز اس کے یوں بے مہار بولنے پر حسب سابق اسے بے تحاشا گھورنے لگیں جبکہ خالو واقعی ایک دم چپ ہو کر مصطفین کی شکل پر طاری "کوئی مسکینیت" کھوجنے لگ گئے۔

"یہ صحیح کہہ رہی ہے خالو جی۔ واقعی کتابوں کا تھکا آیا ہوں اور ایسے میں ایسے اذکار چھیڑنا جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ جان دیو بادشاہو۔۔۔"

انہیں اپنا چہرہ کھوجتے دیکھ کر ہنسی روکتا ہوا، مصنوعی سنجیدگی طاری کرتا وہ یوں شرارت سے بولا کہ اس کی آنکھوں میں در آئے عکس وانگ پڑھتی ایمان نے بھی ایک بلند قہقہہ لگایا۔ ادھر ان کی مشترکہ ہنسی کی گونج سے چڑ

کر خالہ کنیز نے مصطفین کو بھی اپنی گھوریوں کی زد میں لیا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"بس ہو گئے شروع یہ دونوں۔ کبھی لڑائی اور کبھی مسخریاں۔۔۔ یہ اکٹھے ہوں تو اور کچھ نہیں ہوتا ان سے۔ آپ ہی یہ جناتی قہقہے سنوان کے۔۔۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں سب کے لیے۔"

ایک ہاتھ کی انگلیاں باہم ملا کر انہوں نے بیٹی کی جانب "لعنت ای۔۔۔" کا اشارہ کیا اور پھر خالو ظفر کو مخاطب کرتے ہوئے باورچی خانے کی جانب بڑھنے لگیں۔

"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ خالہ جان۔ پلیز بیٹھیں مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"

انہوں نے بمشکل دو قدم بھرے ہوں گے کہ مصطفین کی پکار پر ٹھٹک کر رک گئیں۔ یکا یک نہایت سجیدہ ہوا وہ انہیں روک کر پہلے ایمان کے ہاتھ میں دبے ریموٹ کو اور پھر ٹی-وی کو دیکھنے لگا تو اس کی نظروں کا مقصود بھانپ کر ایمان نے فوراً سے پیشتر والیم کم کر دیا۔ خالہ بھی اس کا بھیدوں بھرا انداز جانچتے ہوئے مزید کوئی جرح کیے بنا چپ چاپ بیٹھ گئیں۔

"میں کئی روز سے یہ بات کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکا۔ بس دل ہی نہیں مانتا تھا۔ لیکن اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

اس نے تمہید کے طور پر کہتے ہوئے سب کے چہروں پر نگاہ کی تو وہ سب ہمہ تن گوش ہوئے سوالیہ نظریں اسی پہ گاڑے اس کے مزید بولنے کے منتظر رہے۔ اس پل ان سب کا اندرون کہہ رہا تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔

"دراصل خالو جی میری یونیورسٹی بہت دور ہے یہاں سے۔ اور روز یوں بھاگم بھاگ وہاں پہنچنا، سارا دن پڑھنا، پراجیکٹ کی تیاری، پھر وہی لمبے سفر سے واپسی اور واپس آ کر پڑھنا بھی۔۔۔ کام بھی پورا کرنا۔۔۔ میں بہت تھک جاتا ہوں اس ساری روٹین سے۔ بلکہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں پاتا۔ تو میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔"

مختلف عذر تراشتے ہوئے اپنے اصل مدعا کے لیے راہیں ہموار کرتا یہاں وہ رکا اور یک لمحاتی توقف سے آگے کہا۔

"کہ میں یونیورسٹی کے نزدیک وہیں کسی ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لوں اب۔ اس سے میرا وقت متوازن

ہو جائے گا۔ یعنی روٹین سیٹ ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے خالہ جی؟ ٹھیک ہے ناں؟؟

اور لفظ لفظ اسے سن کر اس کا حرف حرف سمجھتی کنیز بیگم گویا سکتے میں آ گئیں۔ ایمان نے بے ساختہ ماں کے پیلے پڑتے چہرے پر نگاہ کی اور سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھتی ان کے ساتھ آ بیٹھی۔ خالو ظفر بھی بس نا سمجھی کے عالم میں کبھی اسے اور کبھی اپنی شریکِ حیات کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اگر کوئی کسی حد تک حواس میں تھا تو وہ صرف ایمان تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس روز بھی خالہ رضیہ کی باتیں بلکہ اعتراضات سن چکا تھا اور اسے یقین ہونے لگا کہ ان کی حالیہ باتیں بھی اس نے ضرور سنی ہیں۔ کسی حد تک وہ سمجھ گئی اس کے یوں شفٹ ہونے کی بات کا حقیقی پس منظر بھی وہی باتیں ہیں۔

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے مصطفین؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو سوچنا بھی مت کہ میں تجھے یہاں سے جانے دوں گی۔"

بالآخر اپنا سکوت و سکتہ توڑ کر خالہ کنیز نے کہا اور ڈھکی چھپی نگاہوں سے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں سے جھلکتے "خدشات" پر کوئی دلاسہ یا تقویت چاہی۔ یقیناً انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رضیہ بیگم کی باتیں سن چکا ہے۔

"سچ سچ بتا کیا بات ہے؟ میں سب سمجھتی ہوں کہ تو کیوں جانے کا کہہ رہا ہے۔ لیکن میں تجھے کبھی نہیں جانے دوں گی مصطفین۔ یہ بات یاد رکھنا کہ کم از کم میری زندگی میں تو تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ کوئی اعتراض کرتا ہے تو بھلے کرے۔ کسی کو تکلیف ہو تو بھلے ہو۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تو بس نہیں جائے گا۔"

دوبارہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے انہوں نے نہایت قطعیت سے کہا تو ان کے لہجے کی درشتی و تیزی سے بھی اپنے لیے جھلکتا اخلاص بھانپ کر وہ بے بسی سے یہاں وہاں دیکھ کر رہ گیا۔ وہ انہیں شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"او ہو خدا آپ کو لمبی عمر دے خالہ جی ایسی باتیں نہیں کریں پلیز۔ اور کسی کی باتیں یا اعتراضات اگر کوئی ہیں بھی تو مجھے تو کوئی خبر ہی نہیں۔ میں بس اپنی مجبوری سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے جانے دیں ہاسٹل۔ میں آتا جاتا رہوں گا نا۔۔۔ بلکہ اکثر آیا کروں گا۔ سمجھنے کی کوشش کریں پلیز۔"

بڑے طریقے سے انہیں بہلاتا وہ پھر سے مصر ہوا تو کنیز بیگم کی آنکھوں میں یکا یک آنسو امڈ آئے۔

"بس کردے مصطفین ۔ ہور امتحان نہ لے میرا۔ میں سب جانتی ہوں تجھے کہ تو مسلسل جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے۔ اب تو جو بھی مکر کر میں سمجھ گئی ہوں کہ تو رضیہ کی گفتگو سن چکا ہے۔ لیکن میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ تو نے نہیں جانا تو بس نہیں جانا۔۔۔"

جذباتی لہجے میں اتنا کہہ کر اپنے چہرے پر چادر کا پلو رکھتی وہ پھوں پھوں رونے لگیں تو وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ خالو ظفر کو ابھی ابھی ان کی باتیں سن کر ہی سارا معاملہ سمجھ آیا تھا کہ دراصل بات کیا ہے؟ اب مصطفین نے انہیں یوں روتے دیکھا تو سب کچھ بھول کر تیزی سے اٹھ کر دوسری طرف ان کے ساتھ آ بیٹھا اور اسے آتے دیکھ کر ایمان نے فوری طور پر ان کے شانوں کے گرد پھیلے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔

"اُف۔۔۔ خالہ کیا کرتی ہیں آپ یار؟؟ بے وجہ پریشان ہو رہی ہیں۔ پلیز رونا تو بند کریں نا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہا میں یہیں ہوں۔ سچی۔ اور یقین کریں میں نے کوئی باتیں نہیں سنیں خالہ رضیہ کی۔ اگر انہوں نے کوئی بات کی بھی ہے تو میں لاعلم ہوں بالکل۔ اوپر دیکھیں خالہ پلیز۔"

انہیں شانوں سے تھام کر نہایت محبت سے اٹھاتا وہ عجب بے قراری سے بولا تو ایمان سحر زدہ سی ہو کر اس کی لگاوٹیں دیکھے گئی۔ ادھر دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے وہ سب ارادے ڈھا چکا تھا۔

ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی کہ جن کے تقدس سے بندھ کر ہم بڑے سے بڑے فیصلے بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس کے بار بار ہلانے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں اور رونے پہ ہی زور بنائے رکھا تو اپنی محویت توڑ کر ایمان نے مصنوعی بیزاری سے کہا۔

"امی چھوڑ بھی دیں نا۔۔۔ وہ کہہ تو رہا ہے کہ کہیں نہیں جائے گا۔ کیوں اچھے خاصے گھریلو ماحول کو سٹار پلس کا منظر بنا رہی ہیں؟ بس کریں بہت ہو گیا یہ ڈرامائی منظر۔"

اور اس کی بات پہ انتہائی فکر سے کبھی چپ بیٹھے خالو تو کبھی روتی ہوئی خالہ کو دیکھتے مصطفین کے لب بے ساختہ چٹک گئے۔ کہ وہ ایسی ہی تھی سنجیدہ مناظر پہ رنگ پھونک دینے والی۔

"نی تجھے کیا تکلیف ہے نی۔۔۔میں روؤں یا مروں تجھے تو بس ڈرامہ ہی لگتی ہے ہر شے۔ تجھے پتا نہیں کب یہ عقل آئے گی کہ زندگی نا۔۔۔ڈرامہ نہیں ہوتی۔اس کی حقیقتیں جھیلنا ڈراموں سے کہیں سخت ہوتا ہے۔ ہر شے یوں آسانی سے بن بگڑ نہیں جاتی جیسی ڈراموں میں ہوتی ہے۔"

ایمان کا فارمولا کام کر گیا اور ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کے شانے پہ تھپڑ جڑتی خالہ اپنے مخصوص جلال میں لوٹ آئی تھیں۔ حیرت سے منہ کھولے ان کی بات سنتی ایمان بھی پھر سے دوبدو ہوئی۔

"تو یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں جب یہ ڈرامہ نہیں حقیقت ہے تو حقیقت رہنے دیں ناں۔۔۔کیوں اچھے خاصے سین کو فلمی کر رہی ہیں؟ یہ رونا ضروری تھوڑی ہے؟ جنہوں نے رکنا ہو نا امی وہ صرف کہے سے بھی رک جاتے ہیں۔ جانے والے کبھی اشکوں سے نہیں تھما کرتے۔ بس جا کے رہتے ہیں۔ کیا سمجھیں؟؟"

بات مکمل کرتے ہوئے اس کا لہجہ بتدریج گہرا ہوتا گیا تو ایک پل کو "ٹھہر" کر اسے کچھ بھی کہے بنا آنکھیں خشک کرتی وہ دوبارہ مصطفین کی جانب مڑیں۔

"چھوڑ اسے یہ تو پاگل ہے۔ پتا نہیں کیا کیا لگی رہتی ہے۔ تو بتا تو سچ مچ اب نہیں جائے گا نا؟؟ دیکھ اب صرف میری تسلی کے لیے نہ کہنا کچھ۔ میں نے واقعی نہیں جانے دینا تمہیں۔"

اس کا ہاتھ تھام کر وہ گویا کوئی وعدہ چاہنے لگیں تو ان کی آنکھوں میں تیرتے اضطراب پڑھ کر وہ بھی جذباتی ہونے لگا۔

"جی خالہ۔۔۔میں کہیں نہیں جا رہا۔ یہیں ہوں آپ کے پاس۔ پکا۔ آپ بس پریشان مت ہوں۔"

ان کا ہاتھ دباتے ہوئے اس نے عقیدت مندی سے کہا تو وہ نمناک سی مسکرا دیں۔ اب اس سے قبل کہ کوئی بھی مزید کچھ کہتا تب سے چپ چاپ ان سب کی باہمی گفت و شنید سنتے خالو ظفر بول اٹھے۔

"لو جی اب جبکہ مصطفین کا نہ جانا طے ہو گیا ہے اور مجھے اندر بولنا بھی نہیں پڑا تو اسی خوشی میں ایک ٹریٹ ہو جائے۔ کیا خیال ہے دوستو۔۔۔؟"

اور ان کی بات پہ خوشدلی سے مسکراتی ایمان نے بھی موضوع کو یکسر بدلنے کی خاطر مزید ٹکڑا دیا۔

"جی بالکل ٹریٹ ہونی چاہیے اور میرا خیال ہے مال روڈ "چمن" پر آئس کریم کھانے چلتے ہیں؟؟ پلیز امی

انکار مت کرنا یار کیونکہ آپ عین وقت پہ رنگوں میں بھنگ ملاتی ہیں۔"

تجویز پیش کرتے ہوئے آخرش اس نے ایک بار پھر سے کنیز بیگم کو چھیڑا تو بے ساختہ اسے گھور کر وہ جوتا تھامنے کو جھکیں۔

"اچھا سوری امی۔۔۔میں مذاق کر رہی تھی۔"

اور ان کے سیدھے ہونے سے قبل ان کا "مقصود" بھانپ کر وہ سرعت سے اٹھ کر بھاگی اور خالو ظفر کی پشت پر جا رکی۔

اس کی ادا پہ مصطفین اور خالو بے طرح کھلکھلانے لگے تو کنیز بیگم بھی اپنے گھر میں گونجتی ہنسی کی ان صداؤں سے درِ اندرون ہی کہیں از حد سرشار ہوئیں۔

اب ان سب کو ایک ساتھ آئس کریم پارلر جانا تھا۔

☆......☆......☆

"واؤ ثومیہ۔۔۔کتنا مزہ آئے گا نا جب وہ اپالو دنیا بھر میں مشہور ہو جائے گا۔ سچی مجھے تو سوچ کر ہی مزہ آ رہا ہے کہ ایک بیسٹ ماڈل تمہارا بیسٹ فرینڈ ہو گا۔ان شاءاللہ۔"

یہ نمرہ تھی جو ثومیہ کے یہ بتانے پر کہ آج سفیر نے بطورِ ماڈل پہلا فوٹو شوٹ کروایا ہے اپنے کمرے میں باؤلی ہو کر یہاں وہاں پھرتی تھی۔

"اُفف۔۔۔بس کرو نمرہ۔ ایسی بھی کوئی ایکسائٹ منٹ نہیں رکھی اس میں کہ تم یوں خوش ہو رہی ہو۔ بس ٹھیک ہے۔ سو سو۔۔۔اور ویسے بھی مجھے نہیں لگتا وہ جاری رکھ سکے کیونکہ اسے بذات خود کوئی دلچسپی نہیں اس کام میں۔ یہ تو بس مصطفین اور مریم بضد ہوئے ورنہ وہ کبھی نہیں کرتا۔"

ادھر بیڈ کی الٹی جانب بیٹھ کر اسے بے طرح چکراتے دیکھتی ثومیہ نے اسے ٹوکتے ہوئے تفصیلات بتائیں تو فی الفور اپنے چکر ترک کرتی وہ بیڈ پہ اس کے مقابل آن ٹکی۔

"لیکن کیوں آپی؟؟ ایسے کیسے نہیں ہے اسے کوئی دلچسپی اس میں؟؟ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ بھئی لوگ تو ترستے ہیں اب کہ ایسے مواقع میسر آئیں ہمیں۔ ہائے۔۔۔کتنا سجے گا اس پہ سب کچھ۔ وہ کتنا خوبصورت

ہے۔" دھونس بھرے لب ولہجہ میں کہتی وہ آخر پر پھر سے اس کی دیکھی گئی واحد "جھلک" میں کھونے لگی تو تحیر سے اس کا انداز بھانپتی ثومیہ نے جھٹ اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔

"ہوش میں آجاؤ بچو۔۔۔بابا نے سن لیا نا تو اخیرای چھتر پڑنے ہیں با جماعت ہمیں۔"

بند دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے ڈرانا چاہا تو اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ شدت سے ہنس دی۔اب اس کی ہنسی کے ڈر سے وہ پھر سے دروازے کی سمت مڑی تو ہنسی روک کر نمرہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بس تم نا کبھی کوئی حسین خیال نہ کرنے دیا کرو آپی۔ ہمیشہ حقائق میں کھینچ لاتی ہو۔ویسے میں اک بات کہوں؟؟"

عمیق تر لہجے میں انتہائی نرمی سے کہہ کر وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اجازت طلب کرنے لگی تو اس کی نظروں میں تیرتا کوئی راز کھوجتی وہ بے ساختہ سر کو اثبات میں ہلا گئی۔

"جب سے اسے دیکھا ہے ناں۔۔۔ میرا دل کرتا ہے کاش فواد کا قصہ نہ ہوتا درمیان اور۔۔۔اور تم اسے ہاں کہہ دیتیں۔تم واقعی اس قابل ہو آپی کہ تمہیں کوئی ایسا ہی لڑکا چاہیے۔کتنا پیارا کپل لگے گا تم دونوں کا۔ سچ۔۔۔"

دھیمے لہجے میں جب اس نے بات مکمل کی تو اس کی آنکھوں میں کئی دیپ ایک ساتھ جل اٹھے۔خواہشوں، جگنوؤں،اور آتشوں سے دیپ۔۔۔ جلتے بجھتے،لو دیتے اور مدھم مدھم دیپ۔۔۔پھر یوں ہوا کہ فقط ایک پل کو ساکت رہ کر اس کے ذہن و دل اور نگاہ میں بھی باری باری مصطفین اور سفیر کے چہرے گھومنے لگے۔آہستگی سے اپنا نرم ہاتھ اس کی گداز گرفت سے چھڑواتی کچھ بھی کہے بنا وہ اٹھی اور آنکھوں میں جلتے سارے دیپ پلکوں تلے موند کر کھڑکی میں جا رکی۔اس کے پیچھے حیرت در حیرت اسے تاکتی نمرہ بے وجہ شرمسار ہوگئی۔

"فواد کا ذکر نہیں کرنا چاہئیے تھا مجھے۔۔۔"

سرگوشیوں میں کہہ کر اپنے سر پہ چپت لگاتی وہ اٹھی اور اسی کی طرح ہولے ہولے چلتی اس کے ساتھ جا رکی۔کھڑکی سے بہت دور تاریک آسمان پہ مدھم مدھم ٹمٹماتے تارے عجب بے کلی سے جل رہے تھے اور ماحول میں چھائی دھند کے پار گھروں کی اونچی نیچی چھتیں اور منقش فصیلیں اداس تر منظر پیش کر رہی تھیں۔

"ایم سوری آپی۔۔۔بس میرے منہ سے نکل گیا۔"

یہ کہہ کر کھڑکی کی سل سے پشت ٹکاتی وہ ستاروں سے ہٹ کر اس کی ساکتی نظریں تاکنے لگی تو ثومیہ بے فقط ایک بار بہت بے بسی سے اسے دیکھا۔

"سچ کہوں تو اسے مسلسل انکار کرتے ہوئے مجھے بھی کہیں نہ کہیں ہلکا سا اک ملال ہوتا ہے۔میرے ہر مفر پہ جب اس کے چہرے پہ شکستگی جاگتی ہے تو میں اندر سے بہت محسوس کرتی ہوں اسے۔لیکن میں اسے مثبت جواب نہیں دے سکتی نمرہ۔دلوں کے معاملوں پہ کوئی اختیار تھوڑی ہے۔کاش وہ سمجھ سکے یہ بات۔۔۔یا کاش میں اسے سمجھا پاؤں۔وہ ایک اچھا دوست ہے۔جسے دوست کے ناطے میں پوری عمر نہیں کھونا چاہوں گی۔"

نرم وگرم لہجے میں جب اس نے اپنے دل کی کہی تو اس کی گفتگو سے نمرہ کو کہیں نہیں لگا کہ اسے فواد کا ذکر برا لگا ہے۔اس کا تو دھیان ہی کہیں اور تھا گویا۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ من موہنی ڈگر پہ رواں کوئی بھی شخص وقتی طور پر ہی سہی لیکن اپنے حقیقی مسائل سے ہٹ سا جاتا ہے۔

"بہر حال تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالا ہیں آپی۔میں بس یہ چاہتی ہوں سفیر کے ساتھ کچھ غلط یا زیادتی نہیں ہو۔اتنا دلکش بندہ ہے یار۔اس کا دل ٹوٹتا دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔کاش فواد سے جان چھوٹ جائے کسی طرح اور معجزاتی طور پر سفیر کا کوئی چانس بنے۔"

جواباً نمرہ نے لاابالی پن سے کہا تو اس کے لہجے سے جھلکتے بچکانہ اشتیاق پر اس کا دل جل اٹھا۔فقط ایک پل میں مصطفین کا مسکراتا ہوا چہرہ اور گہری آنکھیں اس کے پردہ ذہن پر نمودار ہوئیں۔لیکن مبہم نظروں سے نمرہ کو دیکھتے ہوئے بہت سارے لفظ لبوں پر دباتی وہ مڑی اور بیرونی تاریک مناظر کے ساتھ ساتھ اندرونی گھلتی ہوئی کیفیات سے بھی ہٹتی واپس بیڈ پہ جا بیٹھی۔ادھر نمرہ نے اس کے چہرے پر پھیلتے اضطراب سے یہی سمجھا کہ یہ موضوع اس کے لیے باعثِ تکلیف ہو رہا ہے تو اس نے فوراً سے پیشتر بات بدل دی۔

"اچھا یار چھوڑو یہ سب۔۔ یہ بتاؤ تمہارے مقالے کی تیاری کہاں تک پہنچی؟؟ کتنے روز مزید لگیں گے وہاں شاہی قلعے اور بادشاہی مسجد میں؟؟ سچی میرا بڑا دل کرتا ہے تمہارے ساتھ وہاں جانے کا لیکن بابا کو خبر ہونے

سے ڈر لگتا ہے۔"

انتہائی متجسس و مشتاق لہجے میں کہی گئی اس کی اس بات پر ثومیہ نے پیار بھری نظریں اس پر ٹکائیں۔

"اس کے پاس بہت سے لہجے ہوتے ہیں جب مرضی موضوعات سے ہٹ جانے کے لیے۔۔۔"

نرمی سے مسکراتے ہوئے اس نے فقط یہی سوچا اور اپنے خیالات جھٹک کر خوشدلی سے بولی۔

"ہاں وہ تو متعلقہ معلومات کا حصول بس آخری مراحل میں ہے۔ شکر ہے وقت پہ کام مکمل ہوا۔ ورنہ اس شیڈول نے ہمیں بہت تھکا دیا تھا۔ اور واقعی دل تو میرا بھی کرتا ہے کہ تمہیں ساتھ لے چلوں کسی روز لیکن مسئلہ۔۔۔ وہی بابا ہیں۔"

آخرش لبوں کو ایک بار بھینچ کر اس نے "اور اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہمارے پاس۔۔۔" کہا اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹنے لگی۔

مایوسی سے ہونٹ کچلتی نمرہ بھی دوبارہ بیڈ پہ آن بیٹھی اور پھر ان دونوں کے مابین دیر تلک تاریخی مقامات کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ وقتاً فوقتاً بغور اسے بولتے ہوئے دیکھتی نمرہ اندر سے بہت خوش تھی کہ وہ اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب رہی ہے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یوں اور ایسے اٹکے ہوئے دھیان اتنی آسانی سے نہیں بٹتے۔

عشق۔۔۔ اگر ہونے لگے تو پورا پاگل کرتا ہے۔

☆......☆......☆

صبح کے نرم اجالوں میں دو گاڑیوں پر مشتمل ان کا قافلہ گیتی کی دادی "جمنا" کے آبائی قصبے "رسول نگر" کی جانب روانہ ہو گیا۔ رفیق نواز نے گیتی کے لیے ہنگامی بنیادوں پر اس دورے کی اجازت حاصل کی تھی اور اس وقت وہ بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ رسول نگر میں ان کا جز وقتی قیام رفیق نواز کے ایک دیرینہ واقف کار کے گھر ہونے والا تھا اور وہ ان کی آمد کا شدت سے منتظر تھا۔

خیر قصہ المختصر۔۔۔ راستے میں گزرتے اک ایک منظر، گاؤں، یا شہر کے متعلق طرح طرح کی کھوج اور سوال کرتی ہوئی وہ بہت خوش خوش منزل مقصود پر پہنچی اور جونہی لینڈ کروزر ایک محل نما گھر کے کشادہ پورچ میں

داخل ہو کر رکی وہ چھلانگ لگا کر باہر نکل آئی۔
"آں۔۔۔ مجھے وشواس نہیں ہو رہا ناز کہ میں دادی کے علاقے میں سانس لے رہی ہوں۔ اففف۔۔۔ کتنی باتیں سنیں اس قصبے کی دادی کی زبانی کہ بتا نہیں سکتی۔"
ہوا میں ایک زوردار سانس بھرتے ہوئے اس نے دوسری جانب سے نکلتی ناز کو مخاطب کیا اور پھر فقط اس کا مسکرانا دیکھ کر جواب سنے بنا اس طرف بڑھی جہاں رفیق نواز اپنے میزبان سے علیک سلیک کر رہا تھا۔
"یہ گیتی میڈم ہیں طاہر بھائی۔۔۔ اور یہ ناز ہیں ان کی دوست اور بہن بھی۔ ان کی سیکرٹری کے فرائض انجام دیتی ہیں۔"
وہ دونوں آگے پیچھے ان تک پہنچیں تو رفیق نواز نے حسب محل باری باری ان دونوں کی طرف اشارہ کر کے رسم تعارف نبھائی۔
"جی جی رفیق بھائی ان سے کون واقف نہیں۔ ماشاء اللہ جانی مانی شخصیت ہیں۔ میری خوش بختی ہے کہ انہوں نے میزبانی کا شرف بخشا وگرنہ یہ تو چاند ہیں اور چاند بھلا ہر کہیں تھوڑی اترتا ہے۔"
تعظیمی طور پر گردن کو خم دیتا، اس کی شان میں رطب اللسان ہوتا وہ بڑھا اور ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے حال احوال دریافت کرنے لگا۔ اس عزت افزائی پر تشکراتی نگاہوں سے رفیق نواز کو تاکتی گیت نے بھی بہت خوش اخلاقی سے اسے جوابات دیئے اور پھر وہ لوگ "طاہر بھائی" کی معیت میں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک وسیع و عریض نشست گاہ میں آن بیٹھے۔ یہاں ان کے لیے نہایت پر تکلف طعام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جتنا وقت بھی اس نشست گاہ میں گزرا گیتی یہاں کے ماحول، لوگوں کے رویہ جات اور رہن سہن کے متعلق ہی گفتگو کرتی رہی۔
تقریباً ایک گھنٹہ بعد جب وہ لوگ شہر گھومنے کے لیے نکلنے لگے تو طاہر بھائی کے کہنے پر رفیق نواز نے گیتی سے التماس کی کہ پہچان لیے جانے اور اپنے گرد ہجوم اکٹھا ہونے سے بچنے کی خاطر بہتر ہوگا کہ وہ حجاب اوڑھ لے۔ گیتی نے بھی ایک نئے تجربے کے طور پر بنا تردد ان کی بات مان لی کہ اس نے کبھی حجاب نہیں اوڑھا تھا تو چلو اسی بہانے یہ بھی سہی۔
اسے جو حجاب مہیا کیا گیا وہ نفیس و جدید تراش کا حامل ایک سرمئی عبایا تھا۔ جسے اوڑھ کر گیتی کا دلکش سراپا

بہت حسین چھب دکھانے لگا تھا۔ وہ درس و تدریس سے وابستہ کوئی طالبہ علم دکھائی دینے لگی۔

پھر یوں ہوا کہ گیتی کی بتائی ہوئی پرانی نشانیوں کی کھوج میں وہ لوگ تقسیم سے پہلے کے قصبے اور موجودہ وقت کے اس "شہر" کی فضاؤں میں نکل آئے۔ آزادی سے اب تک کے ان اکہتر سالوں میں اس قصبے نے بہت ترقی کر لی تھی اور یہاں کی داخلی کشادہ گلیاں اب باقاعدہ ایک چوڑے بازار کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ گو کہ پرانے وقتوں کی کوئی جھلک مرکزی بازار میں دکھائی نہیں دی لیکن گیتی مایوس نہیں تھی۔ وہ خوشی و مسرت سے یہاں کے مختلف بام و در تاکتی بازار کے آخری سرے تک گئی اور وہاں سے ذیلی گلیوں میں داخل ہو کر اب وہاں موجود تاریخی حویلیاں دیکھتی بے طرح سرشار ہوئی۔

"واؤ ناز۔۔۔ کمال ہے سر۔ یہاں آئیں پلیز۔۔۔"

ایک گلی میں رک کر تیزی سے ناز اور رفیق نواز کی جانب آتی وہ خوشی سے چیخ کر بولی تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"اسی قسم کی حویلیوں کے قصے دادی سنایا کرتی تھیں۔ وہ اونچی چھتیں، لکڑی سے منقش بالکونیاں، خوبصورت چوبارے اور ایسی منڈیریں۔۔۔ یہی سب تو تھا ان کے پرانے گھروں کے ذکر میں۔ افف۔۔۔ یہ تو پورا محلّہ ایسا ہے۔"

ناز کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے ایک بلند و بالا تاریخی حویلی کے سامنے لا روکتی وہ اس حویلی کے مختلف بام و در کی جانب اشارہ کر کے بولی تو اس کے فداکن لب و لہجہ سے اس کی اندرونی سرخوشی کا راز پا کر وہ دونوں مسکرانے لگے۔ اور وہ اب ان کا جواب سنے بنا اس کا ہاتھ چھوڑ کر گلی میں اترتے تاریخی عمارات کے زینے اور لکڑی کے بھاری دروازوں کو چھو چھو کر دیکھنے لگی۔ یوں کہ گویا یہاں کسی کی ہونے کا احساس پانا چاہتی ہوں۔ یوں کہ گویا سالوں پہلے کا کوئی لمس پھر سے چھونا چاہتی ہو۔

مخصوص چیزیں، مقامات یا دیگر یادداشتیں۔۔۔ اور کسی کے لیے بھلے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہوں لیکن اپنے وابستگان کے لیے ہمیشہ ایک سی قدر کی حامل ہوتی ہیں۔ اس پل گیتی کا اس تاریخی شہر کے بام و در کو نہایت عقیدت سے چھونا بھی اسی طرز و طور اور انہی کیفیات کا غماز و عکاس تھا۔ یہاں انہیں شہر گھماتے طاہر بھائی نے بتایا کہ وہ

اپنا حوالہ دے کر ان کے لیے دو تین حویلیاں کھلوا چکے ہیں تا کہ وہ آسانی سے گھوم پھر کر یہ تہذیب و ورثہ دیکھ سکیں۔اس بات سے گیتی کی تو مانو عید ہی ہوگئی۔ان سب حویلیوں میں جابجا گھومتی وہ ان باقیات سے بہت سے یادیں سمیٹتی رہی۔یہاں کی بالکونیوں میں ستونوں سے لگ کر دور آسمان تاکتے ہوئے اس نے خوب لطف اٹھایا اور منڈیروں پر ٹک کر پورے شہر پر نظریں دوڑاتے ہوئے پرانے خیالات کو تقویت دی۔

پھر یوں ہوا کہ دیر تلک انہی گلیوں میں بھٹکتی ناز نے اپنے اندر بسی جمنا کو بھرپور شانت کیا اور آخرش بے تحاشا تھک کر فرمائش کی کہ اب یہاں کے معروف دربار "بابا گلاب شاہ سرکار" جایا جائے۔وہی دربار جس کے متعلق اس نے جمنا سے سن رکھا تھا کہ یہاں ہندو، سکھ اور مسلمان ایک ساتھ منتیں چڑھایا کرتے تھے۔

"کوئی آئیڈیا ہے یہ دربار کہاں واقع ہے؟"

رفیق نواز نے یونہی بات برائے بات سوال کیا تو اونچی حویلیوں کی شکستہ حال دیواروں کے مابین رک کر دور فضا میں تاکتے ہوئے وہ کہیں کھو سی گئی۔

"یہاں کسی بہتے دریا کے کنارے، اونچے لمبے درختوں کے نیچے وہ سبز گنبد والا دربار موجود ہوگا۔اور اس کے آس پاس انہی درختوں پر بیٹھے بے شمار پرندوں کی چہکار سنائی دے گی۔"

اس کے لب یوں دھیرے دھیرے سرسرائے کہ گویا تخیل کی آنکھ سے وہ اس منظر میں بہ نفس نفیس موجود ہو۔اس کا ہر ہر انداز عجب سرشاری لیے ہوئے تھا۔

دربار پہنچ کر ناز حیران ہوئی کہ وہ سچ مچ اس کے بیان کردہ نقشے سے میل کھاتا ہے۔یہ دربار دریائے چناب کے گرد تعمیر کردہ اونچے ڈھارسی پشتے یعنی بند کے بالکل ساتھ واقع ہے اور اس کے اردگرد ٹاہلی، شہتوت، کیکر اور دیگر سایہ دار درختوں کی بہتات ہے جن کی چوٹیوں پر بیٹھے پرندوں کی رنگارنگ بولیاں ہر وقت فضا میں گونجتی رہتی ہیں۔ایک اداکارہ ہونے کے ناطے گیتی کسی بھی ماحول یا منظر کو اجنبی خیال نہیں کرتی تھی۔وہ بڑے اعتماد سے دربار کے داخلی احاطے میں آئی، عین وسط میں رک کر بھرپور نظروں سے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے من ہی من اندر ابھرتے کسی خیال کا عکس چہرے پر سجائے بے طرح مسکرائی اور پھر اس نے جو کیا اس نے ان سب کو بے حد حیران کیا۔دربار کے فرش پر جابجا اڑتے سوکھے خشک پتوں کو دیکھتی وہ بڑھی اور ایک کونے میں پڑا جھاڑو اٹھا کر

پورے فرش سے خاک اور پتے صاف کرنے لگی۔

"مجھے دو گیت میں کر دیتی ہوں۔"

ناز نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو لینا چاہا تو اس نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

"نہیں۔۔۔تم نے جھاڑن کرنا ہو تو الگ سے کرو۔ وہ سامنے رکھے ہیں وہاں سے لے آؤ۔ میں اپنی خاطر کر رہی ہوں۔ مجھے دادی نے بتایا تھا کہ اس دربار پر پرارتھنا سے پہلے وہ اکثر یہاں جھاڑن کیا کرتی تھیں۔ بس مجھے بھی کرنا ہے۔"

اور اس کی بات پر خاموشی سے ایک طرف ہوئی ناز ساکت رہ کر بھارتی فلمی صنعت کی اس معروف اداکارہ کا یہ عاجز و منکسر مزاج دیکھ رہی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اجڑے اور کسی قدر ویران دربار میں یہاں آئے مریدین کے درمیان اس پل عبایا پہنے جھاڑو دیتی یہ لڑکی "گائتری دیوی" ہے۔

جھاڑو پھیر کر اس نے ایک طرف لگی ٹونٹیوں سے ہاتھ دھوئے اور مرقد مبارک پر کھڑے ہو کر تا دیر ہاتھ اٹھائے بڑے جذب سے دعائیں مانگتی رہی۔ اس حالت میں اس کے بند پپوٹوں کے پار اس کی ساحر آنکھوں میں گویا کوئی ٹھنڈک اترنے لگی تھی کہ وہ آس پاس سے یکسر بے نیاز ہو گئی۔

"چلیں گیت۔۔۔ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ اب واپسی کے لیے نکلنا ہے۔"

بالآخر کافی دیر بعد ناز نے آہستگی سے کہتے ہوئے نرمی سے اس کا شانہ ہلایا تھا۔

"آں۔۔۔ہاں چلو چلتے ہیں۔ واقعی بہت دیر ہو گئی۔"

ایک طرح سے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولتی وہ گویا کسی اور جہاں سے لوٹی لیکن پھر برا منائے بنا اک آخری نگاہ دربار پر ڈالتی اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ سارے ماحول و منظر کو یوں بے خودی سے تاک رہی تھی گویا آنکھوں میں ڈھک کر ساتھ لے جانا چاہتی ہو۔ ناز نے محویت سے اس کا کھویا کھویا انداز پرکھا۔

وقت کی پہریں سرک سرک کر اس کے اندر بسی جمنا کو پھر سے ہجرت پر مجبور کیے دیتی تھیں اور وہ تھی کہ اس کا دل ہمک ہمک کر اس دیس کے ہر ذرہ و کل سے بندھا جاتا تھا۔

اس پل اس نے شدت سے یہ راز جانا کہ اجسام کے مقام بدل بھی جائیں تو محبت گزیدہ روحیں صدیاں پار کر

کے بھی مخصوص جگہوں پر چلی آتی ہیں اور اس پار جا بجا بکھری یادیں سمیٹ کر یہیں قرار پاتی ہیں۔

واپسی کے سفر میں باہم گپ شپ کرتے، مختلف گلیوں سے گذرتے وہ سب اپنے میزبان طاہر بھائی کے گھر پہنچے اور یہاں عبایا اتارتے ہوئے گیتی نے اچانک رفیق نواز کو مخاطب کیا۔

"یاد آیا سر کہ اس ماڈل سفیر احمد سے ہوا رابطہ؟ کیا بنا اس معاملے کا؟ میرا دل ہے بس جلد از جلد سب طے ہوتا جائے۔"

اور اس کا مصروف انداز دیکھتا وہ بے طرح ہنس دیا۔

"میں کر رہا ہوں بات گیتی جی۔ لیکن اتنی جلدی کیوں ہے آپ کو؟ بھئی ابھی تو خدا کے بھگت کا بھی آخری اسپیل باقی ہے۔ خیر فکر نہیں کریں آپ۔ جلد وہ لڑکا آپ کے سامنے ہوگا۔"

شائستہ لب و لہجہ میں کہی گئی اس کی بات پر اسے واقعی اپنی بے تابی کا احساس ہوا۔

"جی بالکل آپ کی بات درست ہے کہ ابھی تو پورا اسپیل باقی ہے۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ اسے تیاری کے مراحل سے گذارا جا سکے۔ بہر حال جیسے آپ کو مناسب لگے یونہی دھیرج سے کام کیجیئے۔ شکریہ۔"

سب کچھ انہی پہ رکھتی وہ پھر بھی اپنا مقصود واضح کرنا نہیں بھولی تو انہیں شدت سے احساس ہوا کہ اس لڑکی نے اتنا مقام یونہی نہیں پایا۔ یقیناً اپنے کام سے یہ اس کی لگن اور دھیان ہی تھا جو اسے اتنی کم عمری میں اتنا مشہور کر چکا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ذہن و دل میں ہزاروں طوفان سمیٹے گیتی واپس لاہور کے سفر پر ہو لی۔ اس کے ساتھ موجود کوئی بھی شخص و فرد بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس پل گیتی کے دل میں کیا کیا ہے؟ گاڑی کے شیشوں سے باہر تاکتے ہوئے پیچھے گذرتے ہر منظر کے ساتھ اس کے من میں سلگتی آنچ دو چند ہوتی رہی کہ اس کے اندر بسی جمنا بس یہیں کی ہو کر رہ جانا چاہتی تھی۔

ہجرت کی اک ایک داستاں۔۔۔ مغموم ہے بہت۔

بچھڑن کا ہر ایک قصہ۔۔۔ نمناک ہے بڑا۔

☆......☆......☆

اگلا روز ان سب کے لیے بے حد ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ حسب معمول یونیورسٹی میں تین کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد وہ لوگ تاریخی مقامات کے لیے نکل آئے۔ معلومات کے حصول کے لیے وہ آج آخری دن کے طور پر وہاں جا رہے تھے اور اس میں بھی انہیں صرف پہلے سے جمع شدہ معلومات کی نئے سرے سے تصدیق کرنا تھی تا کہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔

پہلے انہوں نے شاہی قلعہ میں واقع ہاتھی پیر کے زینوں، ہتھیار گھر، عجائب گھر، شاہ برج محل یعنی شیش محل، پائیں باغ، نور محل، بارہ دری، قید خانوں اور غلام گردشوں کا از سر نو جائزہ لیا اور ساتھ ہی کسی کسی جگہ پر اپنی اپنی معلومات میں اکا دکا ردو بدل بھی کرتے گئے۔ آج وہ لوگ اپنے اپنے "نوٹ پیڈز" میں درج مشاہدات کا باہم اشتراک کرتے ہوئے ان پر ایک دوسرے کی رائے بھی طلب کر رہے تھے اور جہاں کسی دوسرے کا مشورہ یا بات انہیں خود سے بہتر محسوس ہوتی فوراً اسے بھی شامل کر لیا جاتا۔

بالآخر کافی سارا وقت قلعے میں گذار کر وہ لوگ بادشاہی مسجد میں چلے آئے اور یہاں کچھ دیر آرام کی غرض سے طویل راہداریوں کے ابتدائی حصے میں فرش پر گول دائرے کی مانند بیٹھ گئے۔

"اُفف۔۔۔ آج سمجھ آیا کہ تاریخ کتنا مشکل باب ہے۔ اور میرے نکات تو سب سے برے تھے۔ تم لوگوں نے پھر بھی بہترین لکھا سب۔"

یہ مریم تھی جس نے باری باری اپنے سامنے ایک ترتیب سے بیٹھے سفیر، مصطفین اور ثومیہ کی جانب دیکھ کر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمم۔۔۔ تاریخ مشکل باب ہے یا نہیں لیکن تمہارے نکات واقعی برے تھے۔ آہ۔۔۔ پکا دیا تمہارے مشاہدات نے مجھے تو۔ اس سے بہتر تھا یہ سب میں خود نوٹ کر لیتا۔"

جواباً سفیر نے صرف اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا تو وہ سچ مچ تپ گئی۔

"اوہ۔۔۔ دیکھو تو کہہ کون رہا ہے؟ جس نے محرابوں کی گولائیاں ماپنے کے سوا کوئی کام ڈھنگ سے کیا ہی نہیں۔ میرے خیال سے سب سے بہتر کام مصطفین اور پھر ثومیہ کا ہے۔ تم اور میں تقریباً برابر ہی رہے بلکہ دیکھا جائے تو تم سے قدرے بہتر ہی تھا میرا کام۔"

اوراس کی بات پر وہ سب ہنسنے لگے تو دوبدو لہجے میں وہ مزید بولا۔

"شرم تو نہیں آ رہی تم سب کو میری خدمات سے یوں مفر کرتے ہوئے؟ دراصل تم سب جلتے ہو مجھ سے کہ بھئی ایک تو میں اتنا خوبصورت شخص اور اوپر سے کام بھی سب سے بہتر کرتا ہوں۔ ہے ناں؟؟"

مزاحیہ انداز میں بات مکمل کر کے اس نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے باقاعدہ تصدیق چاہی تو ایک پل کو تھم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے وہ سب پھر سے ہنس دیئے اور اس بار یہ ہنسی پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

"تم اور تمہاری خوش فہمیاں۔۔۔ یقین کرو دونوں لاعلاج ہیں۔"

دورانِ ہنسی مریم نے ساتھ بیٹھی ثومیہ کے شانے پر جھولتے ہوئے کہا تو اس نے اپنے شانوں پر دھرے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر گویا اسے شانت کرنا چاہا۔

"بس کرو مریم۔۔۔ اب بچے کی جان لو گی کیا؟؟ تم دونوں تھکتے نہیں اس نوک جھونک سے؟ بھئی سب نے اچھا کام کیا ہے۔ بہترین۔ جو نکات سفیر نے لکھے وہ بھی سب کے سب انتہائی منفرد تھے اور جو تم نے لکھے وہ بھی اہم تر ہیں۔۔۔"

اب قبل یہ کہ وہ دونوں جواباً کچھ کہتے مصطفین نے ثومیہ کی تائید میں کہا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے ثومیہ کہ اپنی اپنی جگہ سبھی نے بہترین کام کیا ہے۔ سو پلیز یہ بچپنا اب بس کرو اور سوچو کہ آگے کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟ میرے خیال سے ہمیں کلاس میں سب پہلے اپنا مقالہ تیار کرنا چاہیئے۔ تب لطف ہے۔ کیا کہتے ہو تم سب؟"

بات پوری کر کے اس نے سب سے رائے طلب کی تو ساری لطافت بھول کر یکایک وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔

"ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ کل سے ہی سارا مواد ترتیب وار یکجا کرتے ہوئے اسے حتمی شکل دینے کی ابتدا کرتے ہیں۔ مزید تحقیق کے لیے " گوگل بابا" زندہ باد۔۔۔ لیکن کوشش کرنا ہوگی کہ مواد من و عن نقل نہیں کیا جائے۔ وگرنہ سر پکڑ لیں گے اور پھر خوب دھنائی ہوگی پوری کلاس کے سامنے۔ او کے؟؟"

اب کی بار سفیر نے بھی فوراً سے پیشتر اس سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا تو مریم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"جی اوکے جناب۔۔۔اب اٹھو تم۔آؤ ذرا مرکزی ہال گھوم کر آتے ہیں۔انہیں یہیں راہداریوں میں بھٹکنے دو اک ساتھ۔"

اس کے گہرے وعمیق لب ولہجہ پر صرف ایک نظر ان دونوں پہ ڈالتا وہ اٹھا اور چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔انہیں دور جاتے دیکھتے ہوئے وہ دونوں بھی آہستگی سے اٹھے اور دھیرے دھیرے طویل تر راہداریوں میں ایک سے دوسرے سرے کی جانب ٹہلنے لگے۔ان دونوں کے اندرونی محسوسات آج ایک جیسے تھے۔ان بلند میناروں اور اونچے بروج کے مابین آج ان کا آخری روز تھا اور وہ دونوں بے طرح اداس تھے۔یقیناً یہاں ایک ساتھ گذری پہروں کو وہ صدیوں یاد رکھنے والے تھے۔

ہاں ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی کہ جو صدیوں پہ محیط ہو جائیں۔

تھوڑا سا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اونچی فصیلوں کے مابین سر جھکائے اپنے دھیان چلتے مصطفین کو ثومیہ نے تا دیر اور بغور دیکھا۔لیکن وہ خود میں کہیں یوں گم تھا کہ ان نظروں کی اسے خبر ہی نہیں ہو سکی۔

"یہ جہاں کس قدر عجیب ہے مصطفین۔۔۔یہاں لوگ جب مرضی زندگی میں داخل ہو کر گذر بھی جاتے ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔کبھی کبھی میں سوچتی ہوں یوں جینا کتنا مشکل ہوتا ہے نا۔۔۔کہ بنا اظہار کوئی آپ سے بچھڑ بھی جائے۔"

اس کے لب ہولے سے سرسرائے تو اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔اور یہیں اس کی آنکھوں میں جلتے لال شعلہ دیپ درِ اندرون ہی کہیں اسے بہت کچھ سمجھانے لگے۔اس نے فوراً نظریں "پھیر" لیں اور قدم روک کر اپنے دائیں طرف موجود جالیوں کے پار واقع "یادگار پاکستان" کی اونچائی ماپنے لگا۔

"کوئی زیست میں داخل ہو کر گذر جانے والوں میں سے ہو جائے تو اس کے جانے کا غم نہیں کرنا۔۔۔کسی کی حیات میں شامل ہو کر تم خود ٹھہر جانے والوں میں سے ہو جانا۔زیست۔۔۔پھر سے چلنے لگے گی، حیات۔۔۔رقص کرنے لگے گی۔"

عجب شکستہ لہجے میں وہ جانے اسے کون سے درس دینے لگا کہ اس کا گلا بھی رندھ سا گیا۔اور وہ تھی کہ بالکل ساکن ہو کر اس کی گفتگو کا ربط اپنے سوال کی روح سے جوڑتی اندر سے مسمار ہونے لگی۔اگر اسے جذبوں کا اظہار

کہا جا سکتا ہے تو یہ ان دونوں کے مابین ہوا پہلا باضابطہ اظہار تھا۔
زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ ہمیں خالص اور سچے جذبات و بیان پر بھی معنی خیز لہجوں کے باندھ لگانے پڑتے ہیں۔
" آؤ چلیں آگے۔۔۔وہاں آخری زینوں پر ان کا انتظار کرتے ہیں۔ان راہداریوں کے محل وقوع، تاریخ تعمیر اور ڈیزائن سے متعلقہ تمام تر معلومات بالکل درست ہیں پہلے سے۔نظر ثانی کی ضرورت ہی نہیں۔"
قدرے توقف سے متوازن لہجے میں ثومیہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا تو رخ اسی جانب کیے ہوئے اس نے فقط گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
" ہمم۔۔۔صحیح۔اور ایسا کرو تم جاؤ میں بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"
اس کی بات پر اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے تھے کہ انگلی کے اشارے سے ٹوکتا وہ مزید بولا۔
" کوئی خاص بات نہیں ہے۔میں بس یونہی کچھ دیر یہاں رکنا چاہتا ہوں۔"
اور اس کے دوٹوک انداز پر تفکر سے اس کی جلتی آنکھیں پڑھتی وہ الٹے پیروں واپس ہولی۔اسے یوں شکستگی سے پلٹتے دیکھ کر اس کے جانے کے بعد مصطفین نے ایک زوردار مکا ان پتھریلی جالیوں پر مارا اور پھر اپنا ہاتھ مسلتے ہوئے آہستہ آہستہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔وہ اسے نہیں بتا سکتا کہ ابھی ان دونوں میں ہوئے اس " مدھم و مبہم " اظہار نے اس جگہ کو اس کے لیے بے حد خاص بنا دیا ہے اور وہ یہاں چند لمحات اور گذار کر مزید سانسیں بھرنا چاہتا ہے تاکہ من میں دہکتے انگاروں کو کچھ تو قرار آئے۔لاکھ کوششوں کے باوجود بھی آج اس کے جذبے بے اختیار ہو رہے تھے۔تادیر آنکھیں موندے وہ ثومیہ کے لبوں سے پھوٹے ان تمام تر لفظوں کے بھید کھوجتا رہا کہ انہیں سن کر یکایک اس کا اطمینان مچل گیا تھا۔یہیں کسی احساس میں ڈھل کر ان مرمریں جالیوں سے سر ٹکائے اس نے اپنے بائیں کاندھے سے یونیورسٹی بیگ اتارا اور چھوٹی زپ کھول کر اس سے ایک کالا مارکر برآمد کیا۔
پھر مارکر کو اپنے فسوں خیز لبوں سے ٹکائے وہ جیسے کچھ سوچنے لگا۔شاید اس کا ارادہ کوئی خاص تر تھا۔
مصطفین اگر بے اختیار ہو رہا تھا تو بے تاب وہ بھی تھی۔اک خاص ردھم سے چلتی وہ عنکبوت سی سوچوں کے سرے تلاشتی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔اس کے ذہن میں ان لمحوں کی بازگشت بڑی شدت اختیار کرنے لگی کہ

جب جب کبھی وہ اس کے قریب ہنسا تھا۔اس کے آس پاس اور حصارِ ذات میں بھی صرف وفقط مصطفین کے لبوں سے پھوٹتی اداس تر مسکراہٹوں کا رقص جاری تھا۔وہ قطار اندر قطار واقع راہداریوں کے آخری کنارے پر پہنچنے سے قبل ہی رکی اور اک نظر اپنے پیچھے چھوٹ جانے والے ہمراہی کی سمت دیکھا۔دور اسی راہداری کے فرش پر بیٹھا وہ بڑی تندہی اور دل جمعی سے بیرونی فصیلوں پر کچھ کندہ کر رہا تھا۔اس پل بار بار ماتھے پر آ کر کام میں خلل ڈالتے اپنے چمکتے ہوئے بالوں سے الجھتا وہ ثومیہ کو بہت معصوم دکھا۔

"کاش۔۔۔وقت سارے فیصلے،اداس تر شخص اس کے حق میں کرے۔"

بے ساختہ اس کے لب ہلے اور آنکھوں میں جانے کہاں سے در آئی نمی جھٹک کر خفیف مسکرانے کی کوشش کرتی وہ اس راہداری کے زینوں پر بیٹھ گئی۔اپنا بیگ کاندھے سے اتار کر اس نے وہیں نچلے زینے پر ایک طرف رکھ دیا تھا۔اسے اب اس "اداس تر شخص" کا انتظار کرنا تھا۔

اندرونی خلفشار میں مبتلا ہوا کوئی بھی شخص اکثر دوستوں کے ساتھ ہو کر بھی ان کے پاس نہیں ہوتا۔کبھی کبھی ہم اس شدت سے تنہا ہونا چاہتے ہیں کہ من کرتا ہے خود سے بھی کہیں چھوٹ ہی جائیں۔

ادھر سفیر اور مریم مسجد کے مرکزی ہال سے نکل کر باہم گفتگو کرتے ہوئے صحن کے وسط میں واقع گولائی دار حوض کی جانب بڑھنے لگے تھے کہ کسی بات پر رخ موڑ کر بے تحاشا ہنستی مریم کی نگاہ طویل احاطہ پار کرتے ہوئے زینوں پر کھوئی کھوئی سی کیفیت بیٹھی ثومیہ پر جا ٹکی۔

"ارے۔۔۔یہ وہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہے؟مصطفین کدھر ہے؟"

بے ساختہ سفیر کا شانہ ہلا کر اس جانب متوجہ کرتی وہ فکرمندی سے بولی تو اس کے ماتھے پر بھی تفکر ابھر آیا۔ردعمل کے طور پر پہلے اس کے قدم سست پڑے اور پھر وہ بالکل رک گیا۔

"ہوگا وہیں کہیں۔۔۔اگر نہیں ہوتا تو اتنے اطمینان سے نہیں بیٹھی ہوتی یہ۔"

دور سے ہی اسے محبت بھری نظروں کے حصار میں رکھتا وہ عمیق تر لہجے میں بولا تو اب کی بار مریم چونک پڑی۔

"اچھا۔۔۔اتنا جانتے ہو اسے کہ اس کے اطمینان کی ہر رگ سے آگاہ ہو؟؟"

کچھ جتانے کے سے انداز میں کہہ کر وہ اس کی روشن آنکھوں میں جھانکنے لگی تو ثومیہ سے نظریں ہٹا کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔اس کے لہجے سے اس نے جانا کہ وہ کچھ خاص پوچھنا چاہتی ہے۔۔۔اور آج وہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں یہ تو نہیں جانتا یار کہ اس کی رگ اطمینان کیا ہے؟ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں یہ بے قرار رہتی ہے۔گو کہ ہماری اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہو سکی لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور جو اس نے مجھے کبھی نہیں کہا۔"

مدھم مدھم بول کر وہ خاموش ہو گیا تو بنا توقف اس نے مزید پوچھا۔

"اوہ۔۔۔تو ایسی بات ہے۔لیکن اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو تم؟ ہو سکتا ہے ایسا بالکل نہیں ہو؟ عین ممکن ہے کہ تمہارے محسوسات غلط ہو؟"

اور اس کی بات پر اس نے اک نظر پھر سے دور زینوں پر بے خبر بیٹھی ثومیہ کی طرف دیکھا۔

"بہت کچھ ہے یار۔۔۔بہت کچھ۔جب کبھی اسے ہنستے دیکھتا ہوں ناں۔۔۔تو اس کی ہنسی کہیں نہ کہیں کھوکھلی سی لگتی ہے۔اور نیلے پانیوں سی اس کی جھیل آنکھیں عجب ساکن و ساکت رہتی ہیں۔میرے محسوسات غلط نہیں ہو سکتے مریم۔مجھے اس کا یقین ہے۔"

اس کا پر یقین لہجہ عجب سا بے قرار بھی تھا جسے سن کر مریم اک طویل سانس بھر کر رہ گئی۔

"تم نے کبھی اسے بتایا کیا سفیر کہ تم اس سے محبت کرتے ہو؟؟"

وہ راہداریوں کی جانب بڑھنے ہی لگا تھا کہ اس کی سرسراتی آواز پر پہلے ٹھٹک کر رکا اور پھر آہستگی سے پلٹا۔ آنکھوں میں تیرتے ہزار ہا سوالات کے ساتھ، انتہائی با اعتماد انداز میں وہ اس کے مقابل گویا اپنے لفظوں پر کامل یقین لیے کھڑی تھی۔اور یوں ایک پل کے لیے سفیر کو لگا اس کا کوئی اہم تر راز لب بام ہو گیا ہے۔۔۔زد عام ہو گیا ہے۔اسے لگا اب اس سے مزید چھپانا فضول ہوگا۔

"ہاں میں اس سے محبت کرتا ہوں۔۔۔لیکن اس محبت کے "اظہار" کی تفصیلات پھر کبھی فرصت سے بتاؤں گا تمہیں۔فی الوقت تم وہاں حوض کے پاس رکو۔میں ان دونوں کو لے کر آتا ہوں۔"

واضح اقرار کرتے ہوئے اتنا کہہ کر اس کے تاثرات دیکھے بنا وہ پلٹ بھی گیا تو اس کے آدھے ادھورے سچ سے معاملے کی گھمبیرتا کا احساس پا کر وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ دھیرے دھیرے حوض کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے دور تلک سفیر کی چوڑی پشت کو دیکھا۔ وہ کسی مہربان بادل کی طرح رواں رواں سا دھوپوں جلتی ثومیہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

" کیوں اداس بیٹھی ہو اے ماہ جبیں۔۔۔؟ آؤ تمہیں مزے کی دنیا کی سیر کو لے چلوں۔"

ادھر اس کے قریب پہنچ کر وہ سارے خیالات جھٹک کر قدرے بشاشت سے بولا تو اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"ارے۔۔۔تم۔۔۔آؤ نا۔۔۔مریم کہاں ہے؟ اور میں تو بس یونہی بیٹھی تھی۔ اداس تھوڑی ہوں۔"

پہلی حیرت سنبھال کر اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتی وہ مریم کی بابت پوچھنے لگی تو بغور اس کا انداز جانچتا وہ دلکشی سے مسکرایا۔

"ادھر......سامنے ہے وہ۔ ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ تم بتاؤ مصطفین کدھر ہے؟"

اس نے حوض کی جانب انگلی اٹھا کر کہا تو وہ بے ساختہ اس کے اشارے کے تعاقب میں نکل گئی۔ مریم جو اس حوض کے گرد بنی سنگی نشست پر بیٹھی انہیں ہی تاک رہی تھی اس نے اسے متوجہ پا کر زور زور سے ہاتھ ہلایا۔

"مصطفین وہاں دیواروں پر کچھ لکھ رہا ہے۔ اسی لیے میں اسے مصروف چھوڑ کر یہاں آن بیٹھی۔ تم آواز دو اسے کہ اب آجائے۔ تاکہ ہم چلیں واپس۔"

مریم کے لیے جواباً ہاتھ لہراتے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں اسے مصطفین کے متعلق بتایا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

" کیا مطلب؟ دیواروں پر کیا لکھ رہا ہے؟؟"

اس کی چاشن گر پیشانی شکن آلود ہوئی تھی۔

"پتا نہیں یار۔ کہا تو ہے آواز دو یا یوں کرو کہ جا کر خود ہی پوچھ لو بلکہ دیکھ بھی لو۔"

اس نے اب بھی اسی عام سے لہجے میں کہا اور اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم کچھ اکتائی ہوئی سی لگتی ہو۔۔۔سب خیر ہے ناں؟؟"

اس کی تقلید میں اٹھتا وہ اس کا چہرہ پڑھنے لگا تو یکا یک اسے احساس ہوا اس کے اندر جاری جنگ اب لہجے سے جھلکنے لگی ہے۔

"ایک تو شرلاک ہومز بننے کا بڑا شوق چراتا ہے تمہیں۔بھئی ایسا کچھ نہیں ہے۔میں بالکل ٹھیک ہوں۔تم بتاؤ تم آج بڑے کھل رہے ہو ماشاء اللہ۔سب خیر ہے ناں؟؟ آج کوئی خاص دن ہے کیا؟"

اب فوراً سے پیشتر لہجہ بدلتے ہوئے وہ پرانی ڈگر پر لوٹ آئی تو اس کے رنگ پر کھتا وہ سچ مچ کھل سا گیا۔اسی پل وہ دونوں ایک ساتھ بڑھے اور اسی راہداری میں چار سے پانچ قدم بھر کر سنگ مرمر سے بنی بیرونی جالیوں پر جا لگے۔

"بھئی خاص دن کیا ہونا ہے؟؟ میں تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہوں۔کبھی بدل نہیں سکا۔اور ویسے بھی دنوں کی وقعت صرف سنگتوں کے مرہون منت ہوتی ہے۔اور یقین کرو تمہارے سنگ گذرتا اک ایک لمحہ مجھے عید مبارک لگتا ہے۔۔۔"

اس کے انتہائی قریب رکا بھرپور فدائی لہجے میں وہ پھر سے لگاوٹ کرنے لگا تو فقط ایک پل کو نظر اٹھا کر اس نے اس کی سحر گر آنکھوں میں جھانکا۔وہاں کمال تر تراوٹوں سے لبریز اس کے خاص تر جذبے پوری شدت سے اس کی اک ایک دید کے طالب تھے۔

"اُفف۔۔۔بالکل بچے ہو تم سفیر۔۔۔اس لیے تمہارا کوئی حل نہیں ہے۔سچ مچ کہیں بھی شروع ہو جاتے ہو ایسی باتیں بگھارنے۔ذرا سی شرم لاؤ کہیں سے بھلے مستعار ہی سہی۔۔۔اور جا رہی ہوں میں مریم کے پاس۔مصطفین کو لیتے ہوئے وہیں آجاؤ تم بھی۔"

بہت بے بس ہو کر بالآخر اس نے یونہی مناسب سمجھا کہ اس کی باتوں کو بچکانہ قرار دیتے ہوئے یہاں سے فرار چاہا جائے۔اور اسے یکا یک پلٹتے دیکھ کر ایک پل کو حیران ہوئے کھڑے سفیر نے اسے راہداری کے زینوں پر پھر سے پکار لیا۔

"سنو۔۔۔تم کہیں بھی جاؤ تو لوٹ آنا۔ان راہداریوں میں بھٹکتی ہوئی میری اک "یاد" ملے گی۔"

اب کی بار اس کے لہجے میں مزاح اور سنجیدگی دونوں عنصر شامل تھے۔ ثومیہ واقعی نہیں سمجھ سکی کہ وہ مذاق کر رہا ہے یا اب سنجیدہ ہے۔ ہلکا سا مڑ کر مبہم مسکراتے ہوئے شوخ نظروں سے اسے دیکھتی وہ بھاگ بھی گئی تو وہ آنکھیں موند کر اس سے ٹکرا کر آتی ہوائیں جذب کرنے لگا۔ کچھ دیر یونہی ساکن کھڑا وہ ان نرمیلی ہواؤں سے بہلتا رہا اور پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر اس فسوں سے باہر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بہت دور جا چکی ہے۔ مریم کے بالکل پاس۔۔۔

ہولے سے سر جھٹک کر مدھم مسکراتا وہ پوری طرح ماحول میں حاضر ہو گیا۔

"اے مصطفین ......آ جا یار۔ واپسی کے لیے نکلنا ہے اب۔"

راہداری کے عین وسط میں رک کر اس نے با آواز بلند اس کی جانب دیکھتے ہوئے پکار دی تو اس کی بازگشت ان راہداریوں کے طول و عرض میں بکھر کر رہ گئی۔

"اے مصطفین ۔۔۔اے مصطفین ۔۔۔"

ہر طرف یہی لفظ سرسرانے لگے تھے۔

"تم کب آئے واپس؟ وہ دونوں کدھر ہیں؟ اور آ جا تجھے دکھاؤں ۔۔۔ میں نے کچھ لکھا ہے ہماری دوستی کے نام۔"

ادھر اپنی مصروفیت ترک کر کے بیگ شانے پر لٹکاتا وہ بھی اسی کی مانند راہداری کے عین وسط میں رک کر جوابی صدائیں دینے لگا تو صدیوں سے یہاں کے بام و در پہ ساکن و جامد خامشی بے طرح چیخنے لگی۔

"میں بس ابھی آیا ہوں اور وہ دونوں ادھر حوض کے پاس ہیں۔ تم جلدی آؤ یار ۔۔۔ ہمیں واپسی کے لیے نکلنا ہے۔ تمہاری یہ خطاطی اگلی بار دیکھوں گا کبھی کہ کیا پتا تب یہ زیادہ لطف دے۔ اس وقت ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ پلیز۔۔۔"

بڑی دلکشی سے ہنستا اسے ہاتھوں کے اشارے سے اپنی جانب بلاتا وہ واپسی کے لیے مصر ہوا تو اس کا لاابالی پن بھانپ کر بہت دور کھڑے مصطفین نے گردن پھیر کر فقط ایک نظر اپنی "خطاطی" پر ڈالی اور متوازن قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے واقعی اس کی بات میں سحر گری سی لگی کہ کیا پتا کل کبھی وہ عرصے بعد اس جگہ پھر

سے اکٹھے ہوں تو اسے دیکھ کر انہیں زیادہ خوشی ملے۔

خواہشیں کرتے، خواب بنتے ہم بالکل بھول جاتے ہیں کہ خواہشیں اور خواب ہر بار ہماری مرضی کے نتائج اور تعبیریں نہیں دیتے۔

"تو بہت ضدی ہے یار۔بس اپنی منوا کر رہتا ہے۔"

قریب آتے آتے وہیں سے پھر سے صدائیں دیتا وہ اپنی آواز کی بازگشت سننے لگا تو اس کی ادا بھانپ کر سفیر نے بھی جوابی پکار دی۔

"ہاں۔۔۔بے حد ضدی۔اب دیکھ نا اسی ضدی پن نے مجھے تم سا پیارا دوست عطا کر دیا ہے تو میری کوئی ضد بری تو نہیں۔"

اس کا لہجہ باہمی دوستی کے فخر سے بھیگا ہوا سا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔بس یہ خیال کرنا سفیر کہ اسی ضد میں آ کر مجھے کہیں کھو نہ دینا تم۔ورنہ تاریخ پر گواہ ان سب دیواروں سے پوچھ لو کہ یوں کھویا کوئی بھی شخص۔۔۔دوبارہ پھر نہیں ملتا۔"

چلتے چلتے اپنے ساتھ ساتھ موجود پتھریلی دیواروں کو چھو چھو کر، گہرے و عمیق لہجے میں کہتا وہ اس کے بالکل پاس آ گیا تو اس کی بات پر ایک پل کے لیے سفیر کے مسکراتے لب بتدریج سمٹ گئے۔ مسلسل اس کی دلنشیں آنکھیں تاکتا وہ گویا اپنے جواب کا منتظر تھا۔

"میں ایسی ہر ضد اتار پھینکوں گا جو مجھے میرے دوستوں اور خصوصاً تم سے دور لے جائے۔تم میری زندگی کے واحد دوست ہو مصطفین۔۔۔میری کوئی بھی ضد تم سے قیمتی نہیں ہو گی۔"

بالآخر اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اس نے بھرپور عزم سے کہا تو اس کے دلکش لب ولہجہ پر وہ کھلے دل سے ہنس دیا۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا پاگل۔۔۔تم تو بالکل سنجیدہ ہو گئے ہو۔ایسے تھوڑی نا ٹوٹ سکتی ہے ہماری دوستی۔۔۔ ایسے تھوڑی نا ہم ایک دوسرے کو جانے دیں گے کہیں۔۔۔ہاں۔۔۔؟"

اور جواباً اس کے شانے کے گرد ہاتھ پھیلا کر اس نے بھی اسے اپنے حصار میں لیا تو فضا میں ان کی مشترکہ

ہنسی کی گونج شامل ہونے لگی۔

"ہاں ناں۔۔۔یہی تو اصل بات ہے جگر۔کہ تو جان ہے میری۔"

اس پل اسے خود سے بھینچ کر پورے جذب سے کہتے سفیر کو بالکل علم نہیں تھا کہ لفظ نبھانے اتنے آسان نہیں ہوتے۔

لفظوں کے مقابل آئے دل بہر طور باندھنے پڑتے ہیں اور جان تو اکثر۔۔۔ہار جانا ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

ہر گذرتے دن کے ساتھ یونیورسٹی میں ان کی بے پناہ مصروفیت کا عالم یوں رہا کہ انہیں حقیقتاً سر کھجانے کی فرصت بھی میسر نہیں آئی۔مقالے کی حتمی تیاریوں میں جت کر وہ باقی ہر شے سے سچ مچ غافل ہو گئے۔انہیں بہر صورت و بہر طور پوری کلاس سے بہتر مقالہ جمع کروانا تھا اور بس۔لیکچر شروع ہونے سے قبل کلاسز میں، راہداری کی کھڑکیوں میں رک کر باہم گفتگو کرتے ہوئے، یونیورسٹی کے وسیع و عریض احاطوں میں بیٹھ کر، لائبریری اور حتی کہ کینٹین میں بھی۔۔۔الغرض ہر کہیں انہوں نے صرف مقالے کی تیاری میں ہی جان لگائی۔ بالآخر مقالہ جات کی پریزینٹیشن کا دن بھی آیا اور ان پر تفصیلی۔۔۔بلکہ جرح کے سے انداز میں سوال جواب بھی ہوئے۔مقالے کو پریزینٹیشن کی صورت میں پارٹ بائے پارٹ پیش کرتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کا اعتماد قابلِ دیدو داد تھا۔ان کی باہمی کیمسٹری نے وہ رنگ جمایا کہ پروفیسر راؤ ضیاء الرحمان سمیت ہر کوئی ان کے ہر ہر انداز پر اش۔۔۔اش۔۔۔اش کہہ اٹھا۔وہ سوالات کو بغور سنتے اور پھر تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کا نہایت مدلل جواب و جواز مہیا کرتے۔ان کی آنکھوں سے چھلکتا یقین، ان کا ناپا تلا لب ولہجہ، ان کا دوٹوک، صریح اور واضح تر انداز گفتگو۔۔۔انہیں چھانا ہی تھا اور وہ چھا گئے تھے۔انہیں سب پر بازی لے جانی تھی اور وہ لے گئے تھے۔اس سب کے دوران بھی پوری کلاس کی خصوصی توجہ کا محور و مرکز سفیر کی ذات و شخصیت ہی بنی رہی کہ اس دن وہ بھرپور تیاری سے یونیورسٹی آیا تھا۔اس سے گفت و شنید کا چارم تھا کہ کلاس نے سب سے زیادہ سوال کیے بھی اسی سے تھے۔خیر اپنا مقالہ جمع کروا کے انہوں نے باقیوں کے مقالہ جات بھی جمع ہونے کا انتظار کیا اور کم از کم تین گھنٹے کے طویل ترسیشن کے بعد کلاس سے باہر نکل آئے۔اگلا لیکچر اب ایک گھنٹے کے وقفے

سے تھا۔

"افففف یار۔۔۔مت ماردی سب نے سوال در سوال کر کر کے میری۔آہ۔۔۔تھکن سے برا حال ہو گیا ہے۔"

راہداری کے داخلی سرے کی جانب بڑھتے ہوئے سفیر نے ایک طویل سانس خارج کر کے ان سب کو مخاطب کیا اور تھکن کے اظہار کے طور پر اپنی گردن بھی دبائی۔

"واقعی یار۔اتنا تو ہم اتنے دن شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد گھوم گھوم کر نہیں تھکے جتنا باقی تیاری اور خصوصاً آج کے دن نے تھکایا ہے۔میرا اپنا یہی حال ہے۔"

جواباً اس کی تائید میں ثومیہ تیزی سے بولی تو تھکن بھول کر شرارت سے اسے دیکھتا وہ باقاعدہ گنگنانے لگا۔

"جو تیرا حال ہے، وہ میرا حال ہے، اس حال سے حال ملا۔۔۔تال سے تال ملا۔۔۔"

اور اس کے یوں گنگنانے پر ایک نظر خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے مصطفین اور مریم کو دیکھتی وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ان دونوں کے سامنے وہ اس سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"چھوڑو یار ساری تھکانیں تم لوگ۔آج کچھ ہلا گلا کرتے ہیں۔بلکہ یاد آیا۔۔۔آج تو "فرینڈز ڈے" ہے تو آؤ کینٹین میں باقاعدہ اسے مناتے ہیں۔کیا خیال ہے؟؟"

مریم نے ثومیہ کو یوں شرمساری سی ہوتے دیکھا تو سفیر کی گنگناہٹ کو یکسر ان سنا کرتی ہاتھ جھلا جھلا کر بات بدلتے ہوئے چہکی۔

"ہاں بالکل۔۔۔ضرور چلو۔"

سفیر نے فوراً اقرار کیا اور پھر اب تک خاموشی سے چلتے مصطفین کے کاندھے پر مکا جڑ کر بولا۔

"او بھائی تو بھی تو کچھ بول ناں۔یوں چپ چاپ نہ چلا کر ساتھ۔ایویں چنتا ہونے لگتی ہے مجھے۔"

اس کے انداز پر وہ تینوں ایک ساتھ ہنس پڑے اور پھر قدرے تھم کر مصطفین نے جواباً کہا۔

"بیٹا یہ ہندی شبدوں کی مت نہیں مارو۔ایویں تیرے لہجوں میں ڈوب مریں گے شرم سے۔اور تو بول رہا ہے نا کب سے۔۔۔میرے حصے کی بولیاں بھی۔تو بس کافی ہے۔"

مذاقاً کہتے ہوئے آخرش اس کا لہجہ بتدریج معنی خیز ہو گیا تو مریم نے ایک جھٹکے سے اسے دیکھا۔ سفیر سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی نظریں کہیں ثومیہ کے گرد جمی ہوئی تھیں اور ٹکر ٹکر اسے تاکتی یقیناً وہ بھی اس کے لفظوں کی معنی خیزی سے چونک گئی تھی۔ جبکہ جسے یہ سب کہا گیا تھا وہ بالکل نہیں سمجھا اور پہلے کی سی طرز پر مزید بولا۔

"اچھا چلو اب ہندی بولنے پر شما کرتے ہوئے ایسا کرو یار م کہ آج فرینڈز ڈے کے حوالے سے میرے لیے کچھ لفظ کہو۔ کیونکہ میں ہی تو بہترین دوست ہوں تمہارا۔ ہوں۔۔۔؟؟؟"

اور اس کے یوں کہنے پر اسی پل راہداری کے آخری سرے پر پہنچا وہ صحن میں اترتے زینوں کی اسٹیل ریلنگ تھام کر رک گیا۔

"تمہارے لیے کون سے لفظ کہوں جی؟؟ ایسے کون سے سہانے پل بیتے ہیں ہمارے کبھی ایک ساتھ؟ یاد نہیں پہلی بار کیسے کھڑوس بن کر ملے تھے مجھے؟ چلو بھاگو اب تمہاری خاطر کوئی لفظ نہیں ہیں میرے پاس۔"

کچھ توقف سے اس کے دلکش چہرے کا ہر فسوں گر ریشہ دیکھتے ہوئے اس نے اسے ستانے کے لیے کہا تو مریم اور ثومیہ بھرپور دلچسپی سے اس کا جواب سننے کی خواہاں ہوئیں۔ وہ جانتی تھیں ایسی باتوں سے وہ چڑ بھی سکتا ہے۔

"اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے؟؟ کہ ہمارے کوئی سہانے پل نہیں گذرے اک ساتھ؟ ہمم۔۔۔ ٹھیک ہے بھئی۔ تو نکل جاؤ میری زندگی سے اور بری بری سی اپنی سب یادیں بھی لیتے جاؤ۔۔ گندے مندے سب لمحے۔۔۔"

ان سب کے چہروں سے ان کا مقصود بھانپ کر برا منائے بغیر وہ بھی دوبدو لہجے میں بولا تو فضا میں ان سب کا ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاہاہا۔۔۔ ویسے اب تو سمجھ جاتا ہے کہ کب کب میں تمہیں چھیڑ رہا ہوتا ہوں۔ ورنہ پہلے تو سچ مچ تو چڑ ہی جاتا تھا۔"

دوران ہنسی زینے اتر کر کینٹین کی جانب بڑھتے مصطفین نے اس کے شانوں کے گرد ہاتھ پھیلاتے ہوئے پیار سے دبایا۔

"ہاں جی اب میں بڑا ہو گیا ہوں ناں۔۔۔اس لیے۔"

جواباً اس نے اسی لطافت سے پھر سے کہا اور یونہی چلتے چلتے اظہار لگاوٹ کے طور پر اسے خود سے لگا کر بھینچا۔

یونہی کینٹین پہنچ کر بھی ایک دوسرے کو چھیڑتے چھڑاتے، باہم ہنسی مذاق کرتے وہ سب اک دوجے کی سنگت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ہر روز تاریخی مقامات پر مقالے کی تیاری کے سلسلے میں چلے جانے کے باعث وسبب آج بہت دنوں بعد انہوں نے اتنا وقت یونیورسٹی میں گذارا تھا تو سب کچھ نیا نیا سا لگ رہا تھا۔

دوستوں کے ساتھ بیتا زندگی کا اک ایک لمحہ کس قدر حسین ہوتا ہے۔۔۔اس بات کا عکس ان سب کی آنکھوں سے چھلکتی بے پایاں خوشی میں دیکھا جا سکتا تھا۔انہیں یہاں بیٹھے کافی وقت گذر چکا تھا کہ اپنے سامنے میز پر دھری پلیٹس میں سے باقی ماندہ اشیاء پر ہاتھ مارتے ہوئے مریم کی نگاہ دائیں جانب موجود دیوار گیر گھڑی پہ پڑی۔

"اوئے پاگلو۔۔۔وقت دیکھا ہے؟؟ سر علی عبداللہ کا لیکچر شروع ہوئے پانچ منٹ گذر بھی چکے ہیں۔کلاس میں نہیں جانا کیا؟"

سرعت سے زمین پر دھرا اپنا بیگ پکڑ کر کاندھے پر ڈالتی وہ ثومیہ کا ہاتھ کھینچتی ہوئی اٹھی اور کسی کا جواب سنے بنا باہر کی جانب بھی بھاگ گئی۔

"اف۔۔۔وقت کا پتا ہی نہیں چلا یار۔۔۔اب بھاگو۔۔۔سر بہت برا مناتے ہیں دیر سے جانے پر۔"

اسی کے انداز میں تیزی سے اٹھ کر بھاگتی ثومیہ نے کہا تو ان دونوں کی ہڑبڑاہٹ پر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے فقط ایک پل کو تھم کر وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے شدت سے ہنس دیئے۔

"جانے دے ان کو پہلے۔بل پے کر کے سکون سے جاتے ہیں۔ہمارے جانے تک سر ان کو سنا سنا کر تھک چکے ہوں گے تو ان کے ساتھ ہم بھی سکون سے بیٹھ جائیں گے۔کیسا۔۔۔؟؟"

اپنی جگہ سے اٹھ کر بلنگ کاؤنٹر کی طرف مڑتے سفیر نے خوش دلی سے کہا اور آخرش ابرو تان کر اپنے ساتھ ساتھ کھڑے ہوتے مصطفین سے بھی رائے طلب کی۔

"ارے یار۔۔۔بالکل یہی میں بھی کہنے والا تھا۔دیکھنا اب کیسے سر ان کی پھرتیاں نکالتے ہیں۔"
اس کی شوخ اکھیوں میں جھانکتا جواباً وہ بھی شوخ ہوا تو خیالات کے یوں ملنے پر وہ دونوں بڑی دلکشی سے مسکرائے۔

"شکر ہے میرے ساتھ رہ رہ کر اب تو بھی کچھ شریر ہو رہا ہے۔ورنہ تو اتنی کم عمری میں بھی چہرے پر ایسے تاثرات سجائے پھرتا ہے جیسے دورِ حاضر کا آئن سٹائن تو ہی ہو۔"
جیب سے بٹوہ نکال کر پیسے کیشئیر کی جانب بڑھاتے سفیر نے اس کی لطافت پر تبصرہ کیا تو اس کی بات سے حظ اٹھاتا وہ تیزی سے بولا۔

"دیکھو تو کہہ کون رہا ہے۔۔۔؟ جسے خود پوری کلاس نہایت گھمنڈی، مغرور، اور خود پسند جیسے الفاظ والقاب سے یاد کرتی ہے۔تم سے تو بہت بہتر ہوں میں۔کم از کم سب آسانی سے بات تو کر لیتے ہیں مجھ سے۔"
اور اس کے آئینہ دکھانے پر بقایا پیسے پکڑتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب بڑھتا وہ اب بھرپور ڈھٹائی سے بولا۔

"کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔کون پرواہ کرتا ہے؟ بھئی لوگوں کا تو کام ہے کہنا۔۔۔اب کچھ تو لوگ کہیں گے ناں؟"
اس کے اندازِ تغافل پر اس کی ہمراہی میں چلتا مصطفین اب کی بار خاموش ہی رہا۔یہ وقت کچھ بھی جتانے، جتلانے یا سمجھانے کا نہیں تھا یقیناً۔۔۔کیونکہ وہ صرف بات برائے بات کر رہا تھا اور بس۔سوا اس کے کچھ بھی نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ ان دونوں کے کلاس میں دیر سے جانے سے پیدا ہوئے ماحول کو سوچ سوچ کر اس پر طرح طرح کی رائے دیتے وہ دونوں آگے پیچھے کلاس میں داخل ہوئے اور وہاں کا منظر دیکھ کر چونک پڑے۔خلاف معمول اور توقع سر علی عبداللہ ڈائس پر کھڑے پوری کلاس سے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ہاتھ ہلا کر انہیں اپنے ساتھ موجود خالی نشستوں کی جانب بلاتی وہ دونوں بھی از حد سرشار دکھائی دیں۔یقیناً وہ ڈانٹ ڈپٹ سے بچ گئی تھیں۔سر کو دوسرے کونے میں بیٹھے طلبا سے مصروفِ گفتگو دیکھ کر وہ دونوں کنی کتراتے ہوئے آہستگی سے

اپنی نشستوں پر چلے آئے۔

"سر بڑی جون میں ہیں آج؟ پہلے تو کبھی اتنا ہنستے نہیں دیکھا ان کو۔۔۔خیریت؟"

بیٹھتے ساتھ سفیر نے ثومیہ کی جانب جھک کر سوال کیا تو وہ تیزی سے بولی۔

"اتنا کیا؟؟ وہ ذرا بھر بھی نہیں ہنستے پاگل۔۔۔اور آج سر ہنس رہے ہیں کیونکہ......"

وہ ابھی یہیں تک بولی تھی کہ بورڈ مار کر کو زور زور سے ڈائس پر کھٹکھٹاتے ہوئے سر علی عبداللہ نے سب کو اپنی جانب متوجہ ہونے کا کہا۔ گفتگو ادھوری چھوڑ کر وہ دونوں بھی نہایت ادب سے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"میرے خیال سے کلاس اب مکمل ہو چکی ہے یعنی "لیٹ لطیف" بھی سارے پہنچ چکے ہیں۔۔۔تو بات شروع کرتے ہیں بچو۔"

کلاس میں خاموشی چھانے پر باری باری ان چاروں کو دیکھتے ہوئے انہوں بولنا شروع کیا تو سر کے ان سب کو یوں چوٹ کرنے پر پوری کلاس ایک ساتھ ہنسنے لگی۔ جبکہ وہ سب بھی ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سر جھکائے ہنسنے لگے۔

"شش۔۔۔بھئی میں بات کر رہا ہوں طنز نہیں۔۔۔تو بات یہ ہے کہ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آج فرینڈز ڈے ہے تو میں چاہتا ہوں آپ سب باری باری یہاں میرے پاس ڈائس پر آ کر پوری کلاس کے سامنے اپنے اپنے گروپ یا دوستوں کے متعلق اظہارِ خیال کریں۔ یہ ایک صحت مندانہ سرگرمی ہے جس کا مقصد صرف آپ سب میں مزید احترام و محبت اجاگر کرنا ہے۔"

لبوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش کرواتے ہوئے انہوں نے نرم و گداز لہجے میں اپنا مقصود بتایا تو خوشگوار حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پوری کلاس نے تالیاں بجائیں۔ سب کو ان کا یہ خیال بے حد پسند آیا تھا۔

"بس پھر آپ لوگ تیار ہیں تو باقاعدہ ابتدا کرتے ہیں اور سب سے پہلے میں یہاں بلاؤں گا اس سیشن میں موجود حسین ترلب ولہجہ کے مالک مصطفین شجاع کو کہ وہ یہاں آئے اور اپنے دوستوں کے متعلق اس خاص دن کے حوالے سے کچھ خصوصی کلمات کہے۔ آؤ مصطفین۔۔۔جلدی۔"

سب کے چہروں سے خوشی پڑھتے علی عبداللہ صاحب نے بھرپور جوش سے جو اگلی بات کہی اسے سن کر سب کے سب مصطفین کی جانب متوجہ ہو گئے جو یکا یک آن پڑی اس افتاد سے گھبرا کر باری باری ثومیہ، سفیر اور مریم کی جانب دیکھنے لگا تھا۔

"جاؤ بھی یار۔۔۔سر منتظر کھڑے ہیں۔"

اسے تامل کا شکار دیکھ کر ثومیہ نے بیٹھے بیٹھے ٹھوکا دے کر اسے جانے پر اصرار کیا تو سنبھل کر نشست سے اٹھتا، نہایت بااعتماد قدموں سے وہ ڈائس کی جانب چلا گیا۔ احتراماً جھک کر سر سے ہاتھ ملاتا وہ ڈائس کے عین سامنے رکا اور پوری کلاس پر اک طائرانہ نظر دوڑائی۔

"مجھے ان سے ملے کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا۔ میں یونیورسٹی سے متعلقہ ملاقاتوں سے ہٹ کر ان سے کبھی نہیں ملا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا ہماری دوستی آگے کون کون سی کروٹیں لے گی۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ میرے دوست میری ذات کا اہم ترین پہلو ہیں۔ فصیلِ قلب سے لے کر رگ و جاں اور پھر روح کی ہر سطح تک بھی، میرے اندر بھاگتے دوڑتے ہیں۔۔۔سانس لیتے ہیں۔ ہر پل، ہر گھڑی، اور ہر اک پہر بھی وہ مجھ سے بات کرتے ہیں۔۔۔وہ مجھ پہ دل چھڑکتے ہیں۔ ہمارا باہمی تعلق اس قدر عمیق ہے کہ وہ مجھ میں نہ ہوں تو۔۔۔میں خود میں نہیں ہوتا۔"

اپنے مخصوص لب و لہجہ میں کبھی سفیر تو کبھی ثومیہ اور مریم کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے بات مکمل کی اور آخرش سر کو تعظیمی خم دیتے ہوئے ڈائس چھوڑ دیا۔ اس کے دلنشیں لفظوں کا سحر تھا کہ واپس اپنی نشست تک کا سفر اس نے بھرپور تالیوں کی گونج میں طے کیا۔ سفیر یک ٹک بس اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کچھ دیر قبل اسے ستانے کی غرض سے جانے کیا کیا کہتا وہ اندر سے اس کے لیے کس قدر گہرے محسوسات رکھتا ہے۔

"ویلڈن مصطفین۔۔۔بہت خوبصورت اظہارِ عقیدت و لگاوٹ کیا تم نے۔ اب باری ہے سفیر احمد کی۔ دیکھتے ہیں جواباً وہ اپنی دوستی کے لیے کون سے لفظ چنتا ہے۔ آؤ سفیر۔۔۔فٹافٹ ذرا۔ پھر دوسرے گروپس کی باری ہے۔ میری کوشش ہے صرف لڑکوں کو بلاؤں یہاں کیونکہ لڑکیاں جھجک کا شکار ہو سکتی ہیں۔ بہر حال اپنے طور پر اگر کوئی آنا چاہے تو اسے اجازت دی جائے گی۔"

وہ واپس بیٹھا تو ان کی باہمی کسی بھی گفتگو سے قبل سر نے پہلے ان دونوں کو اور پھر پوری کلاس کو مخاطب کر کے کہا۔ ان کے بلانے پر بلاتردد سفیر اٹھا اور اپنے مخصوص انداز میں بے پناہ دلکشی سے چلتا ڈائس پر جارکا۔ اسی کی طرح علی عبداللہ صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے کلاس کی جانب رخ کیا اور کسی کی طرف دیکھے بنا صرف اور صرف اپنے گروپ پر نگاہیں جما کر خاص تر لہجے میں بولا۔

"میرے پاس مصطفین کے جیسے لفظ کبھی نہیں رہے۔ میں اس کے جیسے اظہار شاید کبھی نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کی سنگت میں رہ کر اس کے کچھ نہ کچھ لفظ تو میں نے بہر طور چرائے ہیں۔ ہاں انہی لفظوں کو جوڑ کر اپنے دوستوں کے متعلق فقط یہی کہنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ میری زندگی کے اولین دوست ہو۔ تم سے ملنے سے قبل دوستی کو میں نے صرف اک لفظ کے طور پر سنا تھا۔ تم سے مل کر میں اس کے مفاہیم سے آشنا ہو گیا ہوں۔ اور آج، ابھی۔۔۔ اس پل ان گذرتے ہوئے تیز تر لمحوں کو ٹھہرا کر میں آئندہ صدیوں کے حوالے اک سرگوشی کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دوست میری زیست کا حاصل ہیں...... میرے دوست میری ذات کا حوالہ ہیں۔ ان کی دوستی پر مجھے بے تحاشا فخر تو ہے ہی۔۔۔ کبھی کبھی غرور بھی ہونے لگتا ہے۔"

سحر گر سے لفظوں کو وہ دیوتاؤں سا لڑکا، حرف حرف یوں پھونکتا رہا کہ ان تینوں کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ہر ذرہ و کل بھی تسخیر ہونے لگا۔ وہ آج پہلی بار سب کے سامنے یوں مسکرا مسکرا کر بولا تھا۔ اور سچ تو یہ تھا کہ کسی کو بھی اس سے اس جادو بیانی کی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ سب کے خیال میں وہ اک مغرور شخص تھا جسے کسی قابلِ دید لیکن نا قابلِ رسائی شے کی مانند بس دور دور سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

"تو نے کبھی بتایا ہی نہیں تو ہم سے اتنا پیار کرتا ہے۔ اب ایک دم بولنے سے قبل کچھ تو خیال کرتا کہ کوئی خوشی سے مر ہی نہ جائے کہیں۔ ہاں۔۔۔؟"

جونہی اس نے واپس آکر نشست سنبھالی مصطفین نے بڑی لطافت سے اسے پھر سے چھیڑا۔ ثومیہ اور مریم بھی انہی کی جانب متوجہ تھیں۔

"تو تو نے کون سا بتایا کبھی کہ ہم تم میں سانس تک بھی بھرتے ہیں۔ ہاں۔۔۔؟؟"

دوبدو لہجے میں اس نے جواباً کہا تو سب شائستگی سے ہنس دیئے۔ کچھ دیر بعد جونہی مصطفین اور مریم نے

واپس سر کی جانب دھیان کیا جو کہ اب کسی اور کو ڈائس پر آنے کی دعوت دے رہے تھے تو ثومیہ کسی خیال سے اس کی طرف مڑی۔

"تمہارے تاثرات جان کر بہت اچھا لگا سفیر۔۔۔ بہت شکریہ کہ تم ہمارے متعلق ایسا سوچتے ہو۔ ہمیں بھی تمہاری دوستی پر ایسا ہی فخر و غرور ہے۔"

قدرے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس نے اس کا شانہ چھو کر کہا تو اس نے انوکھے جذبوں سے لبریز اپنی روشن تر نظریں اس پر جما دیں۔

"شکریہ مت کہا کرو۔۔۔ پہلے بھی کہا تھا کہ یہ سب لگاوٹ کوئی احسان تھوڑی ہے۔"

اور اس کی بات پر اس کی نظروں سے خائف ہوتی وہ چپ چاپ سر کو جھکا گئی۔ اس کے پاس اس کی بے جا وارفتگیوں کا کوئی حل نہیں تھا۔ چاہتیں لٹاتا وہ ہر بار اسے یونہی لاچار کر دیتا تھا۔ وہ اب اس کی ایسی باتوں سے فرار پانے کی عادی ہو چکی تھی۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پورے تعلقات کو بچانے کی خاطر ہمیں ادھوری باتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ ان دونوں کا باہمی تعلق بھی فی الوقت انہی کیفیات کا حامل تھا۔

☆......☆......☆

"وے مصطفین تو اوپر کدھر جا رہا ہے سیدھا؟ پانی شانی۔۔۔ کوئی روٹی شوٹی نہیں کھائے گا؟؟ خیر اے نا؟؟"

یونیورسٹی سے واپسی پر لاؤنج میں کسی کو نہ پایا تو وہ دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا جب اپنے کمرے سے نکل کر راہداری میں چلتے ہوئے خالہ کنیز استری سٹینڈ کے پاس آ رکیں اور حیرت سے اسے پکارا۔ ان کی آواز پر قدم روکتا، ریلنگ تھامے وہ فوری ان کی طرف مڑا۔

"السلام علیکم خالہ۔۔۔ اور کچھ نہیں کھاؤں پیوں گا کیونکہ بھوک اور پیاس دونوں نہیں ہیں مجھے۔ آپ سنائیں کیسی ہیں؟؟"

خوشدلی سے مسکراتے ہوئے وہ ان کا حال دریافت کرنے لگا۔

"لے مجھے کیا ہونا ہے؟ ہٹی کٹی ہوں۔ شکر الحمدللہ۔ اور وعلیکم السلام۔۔۔ جیتا رہ میرا پتر۔ اور کچھ نہیں کھانا پینا تو چل جا پھر آرام کر لے۔"

مخصوص انداز میں کہتی وہ صوفوں کی جانب بڑھیں اور پیار سے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے عین سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

ان کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے فقط "جی بہتر خالہ۔۔۔ اللہ آپ کو ایسا ہی رکھے ہمیشہ۔" کہا اور دو زینے چڑھ کر پھر سے مڑا۔

"اچھا خالہ یہ ایمان نظر نہیں آ رہی؟ کہاں پائی جا رہی ہے؟"

ایمان کی بابت پوچھتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ خالہ کو دعا دے کر وہ "آمین" کہنا بھول گیا ہے۔

"اندر کمرے میں ہے۔ کوئی ناول کہانی پڑھ رہی ہے۔ اور آتا ہی کیا ہے اسے بھلا۔ نہ کوئی کام نہ کوئی کاج ہے سارا دن۔ بس یہ ہے اور اس کی خیالی دنیا ہے۔ جانے کیا ہو گا اس لڑکی کا میرے بعد۔ مجھے تو یہی فکر کھائے رہتی ہے۔"

جواباً وہ جو بولنا شروع ہوئیں تو ان کی تان پھر سے اس کی ذات کے متعلق طرح طرح کے خدشات و افکار پر آن ٹوٹی۔

"اللہ بہتر کرے گا خالہ جی۔۔۔ بے وجہ پریشان نہ ہوا کریں۔ کچھ نہیں ہوتا آپ کو۔ ہمیشہ ساتھ ہیں آپ اس کے ان شاءاللہ۔"

وہیں رکے رکے ایک زینہ الٹے قدموں چڑھتے اس نے تسلی بخش انداز میں کہا تو ایک طویل سانس بھرتے ہوئے وہ عجب رنگ میں بولیں۔

"حق ہاہ۔۔۔ زندگی کا کوئی پتا تھوڑی ہے پتر۔ آج مرے کل دو جا دن۔ خیر۔۔۔ چل تو جا۔۔۔ نیچے جلدی آ جانا بس۔ شام سے پہلے۔ اوپر ہی نہ بیٹھے رہنا مغرب کے بعد بھی۔ خدا حافظ۔"

آخرش گفتگو سمیٹتے ہوئے انہوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی تو گردن کو تعظیمی خم دیتا، کچھ بھی کہے

بنا وہ باقی زینے بھی چڑھتا چلا گیا۔

اکثر اوقات انسان کتنے بے بس ہوتے ہیں کہ ان پر لمحات کے فسوں کا بھید عیاں نہیں ہوتا۔ ورنہ ہر کسی کی زندگی میں کئی لمحات ایسے ہوتے ہیں جو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس محفوظ رکھنے کی چاہ کر لے۔۔۔ کہ جن میں تاعمر ساکن ہو جانا بھی وہ بہر طور پسند کرے۔

مصطفین بھی اس پل اپنی زیست کے اک حسین تر پل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا۔

کمرے میں آ کر آج اپنا مقالہ جمع ہونے کی خوشی میں وہ اس دوران ہوئی تمام تر تھکن اتارنے کے لیے فوراً سو گیا۔ اور ایسا بے سدھ سویا کہ بس دہائی نام کی۔۔۔

سوئے ہوئے جانے کتنا وقت گزرا کہ اسے لگا دور کہیں شعور کے بند کواڑوں کے پار کوئی ہولے ہولے دستک دے رہا ہے۔ ایسی دستک جس میں اس کے نام کی پکاریں شامل ہیں۔ عجب بے چین ہو کر وہ کسمسایا اور کروٹ بدل لی۔ لیکن یہ کیا۔۔۔ یوں کروٹ بدلنے سے فہم قدرے بیدار ہوا تو اسے لگا کہ کمرے کا دروازہ پوری شدت سے دھڑ دھڑایا جا رہا ہے۔

"مصطفین۔۔۔ مصطفین۔۔۔ خدا کے لیے جاگو مصطفین۔۔۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔۔۔"

تھوڑا غور کرنے پر یہ ایمان کی آواز تھی جسے پہچان کر اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور بنا سوچے سمجھے بستر سے چھلانگ لگا کر اترا۔ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اپنے نام کی پکاروں میں شامل دہائیاں سن سن کر اسے صاف لگا کہ کوئی انہونی ہو گئی ہے۔۔۔ یا کہیں خیر نہیں ہے۔

"جلدی نیچے آؤ پلیز۔۔۔ وہ امی۔۔۔ میری امی۔۔۔"

دروازہ کھلتے ہی حواس باختہ سی ایمان نے آنسوؤں کے مابین سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا تو پوری کائنات بھلا کر وہ یوں نیچے کی جانب بھاگا گویا زمین سے پار ہو جائے گا۔ تین تین، چار چار زینے پھلانگتے ہوئے اس نے سامنے اسی صوفے پر خالہ کنیز کو سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے تکلیف سے تڑپتے دیکھا جہاں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ ایمان بھی گرتی پڑتی اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔

"خالہ جان۔۔۔ کیا ہوا ہے؟ خدارا بتائیں مجھے۔۔۔"

انہیں اس حالت میں دیکھ کر ایک پل کو وہ حواس چھوڑنے لگا اور پھر خود کو سنبھالتا خالہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے فوراً ایمان کو مخاطب کر کے بولا۔

"انہیں ہسپتال لے جانا ہوگا۔ یہ ہارٹ اٹیک ہے۔"

اس کی آواز میں کوئی چیخ شامل تھی گویا۔

"ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔جلدی پلیز۔"

بال بکھرائے مسلسل روتی ایمان کے لب بمشکل کانپے تو اس نے خالہ کے پورے وجود کے گرد دونوں بازو پھیلا کر انہیں اٹھاتے ہوئے مزید کہا۔

"دوپٹہ سر پر جماؤ ایمان اور سامنے دکان پر رشید چچا سے کہو فوراً گاڑی نکالیں۔ جلدی کرو دروازہ کھولو۔ تمہیں میرے آگے آگے چلنا ہے۔"

اس کی حواس باختگی کے پیش نظر وہ لفظ لفظ پر زور دے کر بولا تو اس کے لب ولہجہ اور انداز سے ہمت پا کر وہ بھی سرعت سے بڑھی اور لاؤنج کا دروازہ کھول کر اسے تھامے ہوئے ایک طرف رکی اسے نکلنے کو راستہ فراہم کرنے لگی۔ پھر جونہی وہ لاؤنج سے باہر نکلا تو بھاگ کر اس سے پہلے چھوٹا سا صحن پار کرتی، سر پہ دوپٹہ جماتی وہ داخلی دروازہ کھلا چھوڑ کر سامنے بیکری میں داخل ہوگئی۔ بیکری میں کوئی گاہک نہیں تھا اور رشید چاچا غلہ کھولے رقم گن رہے تھے۔ وہ اسے یوں داخل ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گئے اور اس سے پہلے ہی شیشے سے پاران کے گھر کا منظر دیکھ کر پیسے واپس غلہ میں پھینکتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چچا جی گاڑی نکالیں امی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ "یا اللہ خیر۔۔۔" کہتے ہوئے وہ کاؤنٹر کے گرد گھوم کر اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے اور شٹر ڈاؤن کر دیا۔ ایمان صرف اطلاع کر کے اس طرف بھاگ گئی جہاں ایک نکڑ پر کھڑی رشید چچا کی کار کے پاس وہ کنیز بیگم کو اٹھائے ہوئے تھا۔

"دروازہ بند کرو گھر کا ایمان۔ بس باہر سے کنڈی کر دو۔ محلے والے سب موجود ہیں یہیں سو کچھ نہیں چوری ہوتا۔ تمہیں ساتھ جانا ہے۔ اور پیسوں کی بھی فی الوقت فکر نہ کرنا میرا بٹوہ جیب میں ہی ہے۔"

خالہ کنیز کو بازوؤں پر متوازن کرتا، سنبھالتا وہ پھر سے اسے حرف حرف سمجھانے لگا تو تشکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ فوراً جا کر دروازہ بند کرنے لگی۔

اس کے آنے تک چچا اور مصطفین کنیز بیگم کو گاڑی میں منتقل کر چکے تھے جو کہ اب نیم وا آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر خالہ اس حالت میں لیٹی تھیں کہ ان کا سر مصطفین کی گود میں اور ٹانگیں ایمان کی جھولی میں تھیں جن سے وہ باقاعدہ لپٹ گئی۔

"امی پلیز آنکھیں کھولیں امی۔ ہوش کریں نا پلیز۔ مجھ سے بات کریں کوئی۔ بہت درد ہو رہا ہے کیا؟"

بیٹھتے ساتھ اس نے روتے ہوئے انہیں ہلانا شروع کر دیا تو مصطفین نے اس کے سر پہ ہاتھ دھرا۔

" کچھ نہیں ہوگا انہیں۔ بس ہم جا رہے ہیں ہاسپٹل۔۔۔"

باہر مرکزی بازار میں گاڑی کو آگے بڑھتے دیکھ کر رندھے ہوئے گلے سے اس نے حروف تسلی دینا چاہے تو یہیں تک کہہ کر وہ بے ساختہ چپ ہو گیا۔ خالہ اس کا ہاتھ دبا کر اسے مخاطب کر رہی تھیں۔

"جی خالہ۔۔۔جی امی۔۔۔"

بڑی بے قراری سے وہ دونوں بیک وقت بولے۔ درد کے ضبط کی کوشش میں خالہ کے گلے کی رگیں تن گئی تھیں اور ماتھے پر بے تحاشا پسینہ امڈ آیا تھا جسے ایمان نے اپنے دوپٹے سے ساتھ ساتھ صاف کیا۔

"اس کے اب۔۔۔ابو کو کہنا اس کا بہت خ۔۔۔خیال رکھیں۔ اور تت۔۔۔تو خوش رہنا۔ اداس نن نہیں۔ مم۔۔۔مجھے بب۔۔۔بیٹے کی کمی نن۔۔۔نہیں محسوس ہونے دی اس آخ۔۔۔آخری وقت میں۔۔۔" ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں انہوں نے یہاں تک کہا اور ٹیس برداشت کرتے ہوئے ان کے جسم کو اک جھٹکا لگا۔

"پلیز خالہ جی۔۔۔ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم بس پہنچ رہے ہیں ہاسپٹل ہمت کریں آپ۔"

بے طرح بلکتے ہوئے لہجے میں کہہ کر اس نے باہر یوں دیکھا گویا زمین کو کھینچ کر منزل قریب کر رہا ہو۔ ایمان تو بے اختیار ہو کر بس ان سے پوری کی پوری لپٹ گئی۔

"امی مر جاؤں گی میں یوں نہ کہیں۔ خدارا یوں نہیں۔ امی پلیز مجھ سے بات کریں۔"

اس نے باقاعدہ انہیں جھنجھوڑ ڈالا تو انہوں نے نقاہت سے اس کے سر پر ہاتھ دھرا۔

"نہ میری دھی۔۔۔اب بس۔۔۔آہ۔۔۔اللہ اکبر۔بب۔۔۔بس رر۔۔۔رونا مت۔ہمت کرنا۔اپنے ابو کا بھی خیال رکھنا۔یوں۔۔۔یونہی بب۔۔۔بہادر رہنا۔۔۔جج۔۔۔جیسی تم ہو۔"

اور بمشکل یہاں تک کہتے کہتے اس کے سر پر ہاتھ دھرے ہوئے انہوں نے ایک آہ مزید بھر کر آنکھیں موند لیں تو بے تحاشا روتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"امی آنکھیں کھولیں پلیز امی۔۔۔میں نہیں ہوں بہادر بس آنکھیں کھولیں۔امی میں مر جاؤں گی امی۔امی آپ کی ایمان مر جائے گی۔یا خدا۔۔۔"

بے قرار لہجے میں دہائیاں دیتی وہ آخرش منہ اٹھا کر خدا سے طلب کرنے لگی تو کنیز بیگم کے لبوں سے سرگوشیوں کی مانند کلمہ حق بلند ہوا تھا۔

"لا الہ......الا اللہ۔۔۔محمد رسول اللہ۔۔۔"

اور اس مدھم گواہی کے ساتھ ہی ان کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔درد کے باعث جاری تمام تر اکڑن اور مزاحمت ختم ہو گئی تھی۔تب سے اب تک بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے رشید چچا نے بھی انتہائی فکر سے پہلے مصطفین اور پھر ایمان کا چہرہ دیکھا۔

"انہیں دیکھو مصطفین۔۔۔خدا کے لیے۔۔۔یہ چپ کیوں ہو گئی ہیں؟؟؟خدارا دیکھو۔"

انہیں خاموش پا کر اس نے ساکت بیٹھے ہوئے ٹکر ٹکر خالہ کا چہرہ تاکتے مصطفین کو شانے سے تھام کر مسلسل ہلایا تو بہتی ہوئی آنکھوں سے اس نے پہلے ان کی ناک کے سامنے انگلیاں کر کے سانس محسوس کی اور پھر ان کی کلائی تھام کر نبض پر ہاتھ رکھا۔

"رشید چچا خالو ظفر کو کال کریں فوراً اور گاڑی واپس گھر کی طرف موڑ لیں۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔۔" ضبط کی کسی آخری حد پر رک کر رندھے ہوئے گلے سے کہتا وہ خالہ کے چہرے پر ان کی چادر کا پلو پھیلانے لگا تو اس کا مطلب سمجھتے ہوئے گویا کہیں سے ٹوٹ کر خالہ کے مردہ وجود پر گرتی ایمان نے ایک بلند تر چیخ ماری۔اس کے سر پر مسلسل ہاتھ رکھے اسے چپ کرواتے مصطفین کو بخوبی علم تھا کہ واپسی کا سفر اب اسی واویلے میں کٹنا ہے۔

☆......☆......☆

واپس پہنچ کر محلے داروں کی مدد سے خالہ کنیز کی میت اٹھا کر گھر منتقل کی گئی اور لاؤنج سے صوفے اٹھا کر دریاں بچھاتے ہوئے وہیں صف غم کا انعقاد کیا گیا۔ ایمان کا واویلا سب کی آوازوں پر بھاری تھا۔ خالو ظفر اور ایمان کی خالہ رضیہ بھی فوتگی کی اطلاع پا کر آدھے گھنٹے میں پہنچ گئے تھے۔ مصطفین خالو ظفر سے مل کر بے تحاشا رویا اور دھاڑیں مار مار کر جس قدر ممکن تھا غم کو بہنے کی راہ دے دی۔ رشتہ داروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو کمال ضبط سے خود کو سنبھالتے ہوئے مصطفین نے خالو سے دفن کی بابت پوچھا۔ خاندان کے دیگر سرکردہ افراد سے مشورے کے بعد طے پایا کہ عشا کے بعد دفن کر دیا جائے گا۔ دل ہی دل میں کاموں کی ترتیب اور لائحہ عمل طے کرتا وہ انتظامات میں جت گیا۔ گلی کو ایک طرف سے قناتیں لگا کر بند کرتے ہوئے اس نے گھر کے نزدیک مردانہ صف غم بچھائی اور رشید چچا کے لڑکے کے ساتھ مل کر کھانے کا انتظام کیا جو کہ کفن دفن کے بعد تمام مہمانان کو کھلایا جاتا ہے۔ مسجد سے میتیں نہلانے والا لکڑی کا بڑا تختہ منگوانے سے لے کر اس نے خواتین کے بیٹھنے کے لیے پیڑھوں اور موڑھوں تک کا خیال رکھا اور قبر کی تیاری سے لے کر نائی کے پاس دیگوں کے سامان کی فراہمی تک میں ہر ہر جگہ بھرپور چاک و چوبند رہا۔

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے مصطفین؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو سوچنا بھی مت کہ میں تجھے یہاں سے جانے دوں گی۔"

خالہ کی آواز اس کے آس پاس کہیں فضا میں شامل ہو گئی تھی گویا۔ وہ بار بار کہیں بھی رکتا اور آنسوؤں پر اختیار کھو کر سسکتے ہوئے رونے لگتا۔ اسے لگ رہا تھا اس کی کائنات ایک بار پھر سے الٹ گئی ہے۔ اس کا بارہا دل چاہا کہ خالہ کی میت پر جا کر ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے لیکن خواتین کے ہجوم کے باعث اس خواہش کو عملی جامہ پہنانا ناممکن تھا۔ مرد اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ مردانگی کے بھرم میں اپنے پیاروں کی میت پر کھل کر رو بھی نہیں سکتے۔ اتنی مصروفیت میں اس نے بمشکل وقت نکالا تھا کہ گلی کی نکڑ پر واقع ایک حمام میں دفن سے قبل "غسلِ مسِ میت" کر سکے۔ خیر قصہ المختصر۔۔۔ انتظام و انصرام کے دوران اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب مغرب ہوئی، کب عشا اور گھر سے خالہ کا الوداعی وقت آن پہنچا۔

"مصطفین اندر آؤ۔۔۔ میت اٹھانی ہے۔ جنازے کا وقت ہو رہا ہے۔"

خالو ظفر کی آواز پر گلی میں ایک لڑکے کو کسی معاملے پر ہدایات دیتا وہ بے طرح چونک گیا۔ کئی بار سامنے کی باتوں یا حقیقتوں پر بھی یقین کرنے کا دل نہیں کرتا۔ اس کا بھی دل چاہا کہ کاش یہ سب کچھ کوئی خواب ثابت ہو۔

"بہتر خالو جی۔ آ رہا ہوں۔"

اثبات میں سر ہلاتا، قدم قدم گھسیٹتے ہوئے وہ گھر میں چلا آیا۔ اندر میت اٹھائے جانے کے وقت کا عمومی شور و غل شروع ہو چکا تھا۔ رشتہ دار خواتین ایک دوسرے کو ڈھارسیں دیتی نوح و کناں کر رہی تھیں۔ بے ساختہ اس کی نگاہ چارپائی کا پایہ تھام کر بین کرتی ایمان پر جا رکی۔ یقیناً "غسلِ مسِ میت" کر کے اس نے بھی لباس بدل لیا تھا اور اب وہ کالے ملبوس میں تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا۔ زندگی میں جن پیاروں کو ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھا ہو انہیں ٹوٹتے ہوئے دیکھنا ہمیں عجب اذیتوں سے دوچار کرتا ہے۔ خاندان کے تین لڑکوں کے ساتھ کلمہ شہادت بلند کرتے ہوئے اس نے میت اٹھائی اور خواتین کے ہجوم سے نکال کر باہر کی جانب بڑھنے لگا۔

"یہ بات یاد رکھنا کہ کم از کم میری زندگی میں تو تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ کوئی اعتراض کرتا ہے تو بھلے کرے۔ کسی کو تکلیف ہو تو بھلے ہو۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تو بس نہیں جائے گا۔"

خالہ کی آواز کسی بازگشت کی مانند اس کے آس پاس گونج رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ صرف اسی بازگشت سے بندھا وہ سب کچھ فراموش کر گیا۔ ایمان کا خواتین سے چھوٹ چھوٹ کر میت کے پیچھے آنا، اونچی نیچی گلیوں سے گزرتے ہوئے بار بار لوگوں کا کاندھے بدلنا، نیم تاریک جنازہ گاہ تک آنا، اور دعا کے بعد خالہ کی میت کا قبر میں اتارا جانا۔۔۔ وہ یک ٹک اور محو و گم سا ہو کر ہر ہر عمل بجا لاتا رہا۔ قبر پر مٹی ہموار کرنے کے بعد حاضرین نے دعائے فاتحہ و مغفرت پڑھی اور موبائلز اور ٹارچز کی مختلف روشنیاں جلائے قبریں پھلانگتے ہوئے واپس پلٹنے لگے۔ وہ خالو کو قبر پر بیٹھے انگلیاں قبر کی مٹی میں دبائے کوئی مناجات پڑھتے دیکھتا وہیں جامد کھڑا رہا۔ ہوائیں مضطرب سی ہو کر ان دونوں کے آس پاس سرسرا رہی تھیں تو بیرون ہر طرف چھایا گھور اندھیرا تمام تر وحشتوں کے ساتھ ان کے اندرون تک میں جا بسا تھا۔ وہ دونوں رو رہے تھے۔۔۔ اور مسلسل رو رہے تھے۔ باہم چپ کروانے یا ڈھارس و تسلی دینے کی کوشش کسی نے بھی نہیں کی۔ بالآخر ایک طویل وقت کے بعد سسکتے ہوئے خالو

نے اٹھ کر واپسی کو قدم بڑھائے تو وہ بھی ایک آخری نگاہ قبر کی نم مٹی اور اس پر جا بجا بکھری گلاب کی پتیوں پر ڈال کر مڑ گیا۔ مڑنے سے قبل صرف ایک لمحے کو آنکھیں موند کر اس نے کناروں پر دھرے آنسو چھلکا دیئے تھے۔

" حق ہاہ۔۔۔ زندگی کا کوئی پتا تھوڑی ہے پتر۔ آج مرے کل دوجا دن۔ خیر۔۔۔ چل تو جا۔۔۔ نیچے جلدی آجانا بس۔ شام سے پہلے۔ اوپر ہی نہ بیٹھے رہنا مغرب کے بعد بھی۔ خدا حافظ۔ "

واپسی کے اس سفر میں سارے راہ خالہ کے یہ جملے اس کی سماعت میں اذیت گھولتے رہے۔ اسے لگا اس کی ماں آج پھر سے مر گئی ہے۔ شانے اور سر جھکائے وہ مسلسل کسی عذاب میں گھرا چلتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

قبرستان سے لوٹ کر انہوں نے مرگ پر آئے مہمانان کے کھانے کی تسلی کرنے کے بعد صف غم کے طور پر بچھائی گئی دریاں اور چادریں اٹھوا دیں۔ محلے کے نوجوان ان سب کاموں میں یوں پیش پیش رہے کہ انہیں زیادہ فکر نہیں کرنا پڑی کہ یہ چھوٹے موٹے کام کون سنبھالے گا۔ پھر باہر مردانہ حصے سے فراغت پا کر جھکے جھکے سر اور ڈھلکے ہوئے شانے لے کر غمزدہ سے وہ دونوں آگے پیچھے گھر داخل ہوئے تو دیکھا کہ خواتین کا ہجوم بھی اب چھٹ گیا ہے۔ کافی وقت ہو جانے کے سبب لوگ واپسی اپنے اپنے گھروں کو نکل لیے تھے۔ یہاں صرف قریبی رشتہ دار و احباب ہی موجود تھے یا وہ جو کسی دوسرے شہر سے تشریف لائے تھے۔ خالہ ظفر سے ملتی ہوئی تمام رشتہ دار خواتین کو خود کو مسلسل گھورتے پایا تو مصطفین نے سیدھا اوپر اپنے کمرے کی جانب رخ کیا۔ لیکن پھر سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ خالہ رضیہ اس سے چند قدم کی مسافت پر نیچے زمین پر بیٹھی ایمان کو اپنے ساتھ لپٹائے خود بھی آنسو بہاتی ہوئی تسلی دلاسہ دے رہی تھیں۔ کچھ سوچتا ہوا وہ آہستگی سے ان کے قریب چلا آیا اور زمین پر ان سے تھوڑا ہٹ کر یوں بیٹھ گیا کہ گویا کوئی اٹھنے کے ارادے سے زمین پر ہاتھ رکھتے ہوئے زمین کی ڈھارس چاہے۔ رضیہ بیگم بس خاموش اور خالی نظروں سے پہلے اسے آتے اور پھر یوں بیٹھتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ جبکہ ان کے پہلو میں سر چھپائے سسکتی ایمان اس کی آمد اور یہاں موجودگی سے اب تک بے خبر تھی۔

" مجھے بہت افسوس ہے خالہ جی۔ حکم اللہ کا بس۔ صبر کریں آپ بھی۔ اللہ پاک کی یہی مرضی تھی۔۔۔ "

مدھم آواز میں وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولا تو فقط ایک پل، ایک لمحے اور ایک ہی ثانیے کو رک کر انہوں

نے اس کے شانے پر پیار سے ہاتھ دھرا۔

"بس پتر۔۔۔اس سوہنے کی جو منشا۔کوئی زور نہیں اس پر۔کوئی بس نہیں چلتا۔جو وعدہ ہے قضا سے وہ سب نے دینا ہی دینا ہے۔تو بھی صبر کرنا۔بڑا پیار کرتی تھی وہ تجھ سے۔تیرے لیے کسی سے بھی لڑ پڑتی تھی۔"

پھر آنکھوں میں آئی پونچھتے ہوئے، اسے جواباً ڈھارس دے کر انہوں نے گویا اس کے لیے اپنے دل میں موجود سارا غبار بھی بہہ جانے دیا تھا۔بہن کے مرنے کے بعد بھی اس کا اپنے لیے یہ جھکا جھکا، فرمانبرداری کا سا انداز انہیں اندر ہی کہیں بے حد بھا گیا تھا۔ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی جن میں گھر کر انسان پرانے سے پرانی ضد اور بے جا چپقلش کو یونہی ہار جاتا ہے۔

لبوں کو بھینچ کر تفہیمی انداز میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ ان کا مکالمہ سن کر سسکتی ہوئی ایمان نے بھی سر اٹھایا۔مصطفین اس کی رونے کے باعث سوجی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر ایک پل کو الجھا۔

"یہ کہہ رہا تھا امی کو کچھ نہیں ہوگا خالہ۔۔۔اس سے پوچھو اب کہاں ہیں میری امی؟؟جب یہ کہہ رہا تھا کہ انہیں کچھ نہیں ہوگا تو دفن کیوں کر کے آیا ہے؟پلیز کوئی بھی جا کر مجھے میری امی لا دو۔۔۔پلیز۔"

یکا یک بے طرح روتے ہوئے اس کی طرف اشارے کرتی وہ بین کے سے انداز میں چیخنے لگی تو اس کی شکایتی نظروں سے نگاہ چراتی خالہ نے جلدی جلدی اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر دوبارہ سینے سے لگا لیا۔خالو ظفر نے بھی اسے یوں چلاتے دیکھا تو سب کو چھوڑ کر تیزی سے اس کی طرف چلے آئے اور ساتھ ہی بیٹھتے ہوئے اسے پکڑ کر خود سے بھینچ لیا۔دونوں باپ بیٹی کو باہم گلے لگ کر یوں روتے ہوئے دیکھتا وہ خود کے آنسوؤں پر اختیار کھونے لگا تو ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں لیے اٹھا اور نہایت تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل وہ راہداری کے عین وسط میں رکا اور جانے کن کن خیالوں سے ہار کر وہیں گرنے کے سے انداز میں گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس گھر میں خالہ کی غیر موجودگی میں ایک سانس لینا بھی سینے میں ریت بھرنے جیسا ہے۔خالہ کی شوخ آوازیں، ان کا دلنشیں اور پیارا انداز، شفیق مسکراہٹ، حلیم طبیعت، اور جانے کون کون سی یادیں۔۔۔سب کچھ اس کے جسم میں ان ریتلے ذرات کی مانند چبھنے لگا تھا جو اسے کسی طور قرار نہیں آنے دیں گے۔

"مجھے پتا ہوتا کہ آپ اتنی جلدی مرجائیں گی تو میں کبھی آپ سے محبت نہیں کرتا۔۔۔اور اس قدر تو بالکل بھی نہیں۔"

بے تحاشا روتے ہوئے اس نے کلائی سے ابھری رگوں پر یوں ہاتھ دبایا گویا خالہ کنیز سے وابستہ ہر یاد کو کھینچ باہر نکالنا چاہے۔۔۔گویا وہ پہلے کی طرح اس کے سامنے کھڑی ہوں اور وہ ان سے دوبدو ہوکر یہ الفاظ کہہ رہا ہو۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ ریت کی مانند نسوں میں پل پل سرکتے لوگ آنسوؤں میں بہہ کر باہر نہیں آیا کرتے۔

فی الوقت اسے یہ سب جھیلنا تھا۔۔۔اور پوری جان سے۔

یادیں سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔۔۔اذیتیں پالنی پڑتی ہیں۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی کے صحن میں دھرے اسی بڑے سے پتھر کے قریب سفیر اور ثومیہ یہاں وہاں گھومتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ پہلا لیکچر شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا تو وہ حسب سابق یہاں مصطفین کا انتظار کرنے لگے۔ان کا معمول تھا کہ جو بھی پہلے پہنچتا وہ یہاں رک کر باقیوں کا انتظار کرتا اور پھر وہ سب ایک ساتھ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں جاتے تھے۔

"یہ آج کدھر رہ گیا ہے ابھی تک آیا کیوں نہیں؟"

سفیر کی کسی بات خوشدلی سے ہنستے ہوئے ثومیہ نے اچانک پوچھا تو بے ساختہ وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت دیکھنے لگا۔

"ہاں یار۔وقت تو کافی ہوگیا ہے۔اچھا میں کال کرتا ہوں۔"

سرسری طور پر کہتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکالا اور اس کا نمبر ملاتے ہوئے کان سے لگا لیا۔ادھر اثبات میں سر ہلا کر کچھ بھی کہے بنا وہ منتظر نگاہیں لیے بس اس کا چہرہ تاکنے لگی کہ کب دوسری طرف سے کال اٹھائی جاتی ہے۔

"اس کا نمبر بند جا رہا ہے۔۔۔"

اس نے موبائل کان سے ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ نہ ماننے کے سے انداز میں بولی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ راستے میں ہوگا اور ظاہر ہے گھر سے چارج کر کے ہی نکلا ہوگا۔ تم دوبارہ کال ملاؤ۔"

" آفرین ہے بھئی۔ میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ لو سنو تم بھی۔"

کسی قدر برا مناتے ہوئے اس نے دوبارہ کال ملائی اور موبائل دونوں کے درمیان کر کے اسپیکر آن کر دیا۔

" آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الوقت رابطہ ممکن نہیں۔ برائے مہربانی کچھ دیر بعد کوشش کریں۔۔۔"

وہی مخصوص ریکارڈر چلنے لگا تو اس نے شانے "ہونہہ" کے انداز میں جھٹکتے ہوئے کال کاٹ دی۔

"اوہ۔۔۔ صحیح کہہ رہے تھے تم۔ پتا نہیں پھر اس کا نمبر کیوں بند ہے۔ کلاس کا وقت تو بس ہوا ہی چاہتا ہے۔ وہ کبھی مس نہیں کرتا لیکچر۔ خیر ہو سب۔"

یونیورسٹی بیگ ایک سے دوسرے شانے پر منتقل کر کے وہ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اپنا ماتھا تھامتے ہوئے بولی تو اس کے فکرمند انداز پر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"خیر ہو گی سب یار۔ پریشان مت ہو۔ انسان لیٹ ہو ہی سکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ آؤ تم ہم کلاس میں چلتے ہیں۔ آ جاتا ہے وہ بھی۔"

اندر ڈیپارٹمنٹ کی جانب اشارہ کر کے ایک طرف ہوتا وہ اسے بڑھنے کی راہ فراہم کرتے ہوئے بولا تو اس سے نظر چرا کر اس نے دل ہی دل میں "ان شاء اللہ" کہا۔

"ہاں چلو۔۔۔ ویسے مریم بھی دکھائی نہیں دی۔ جانے آئی ہو کہ نہیں وہ بھی اب تک۔۔۔؟"

دھیمے لہجے میں یہ کہہ کر روش پر پاؤں دھرتی وہ ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگی کہ تیزی سے اس کے ہمراہ ہوتا وہ جواباً بولا۔

"اُف۔۔۔ تمہیں ان سب کی کتنی فکر ہے یار جو تمہارے پاس نہیں ہیں اور جو اس پل تمہارے سامنے ہے۔۔۔ تمہیں پورا کا پورا دستیاب ہے اس کی تمہیں خبر ہی نہیں۔"

اپنا کالر تھام کر بھرپور شوخ لہجے میں وہ مخصوص اذکار پھر سے چھیڑنے لگا تو وہیں تھم کر وہ اسے بے طرح گھورنے لگی۔

"یہ اففففف درحقیقت مجھے کہنا چاہیئے سفیر کہ تم باز کیوں نہیں آتے؟؟؟ ہر وقت بس بے پر کی اڑاتے رہتے ہو۔اور یوں بھی ہر وقت دستیاب چیزوں کی وقعت کہاں ہوتی ہے بھلا۔ چیزیں تو وہی اہمیت رکھتی ہیں جو دسترس سے باہر ہوں۔"

تند لہجے میں اس نے لفظ لفظ پیس کر کہا تو یکا یک وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ہر بار کی طرح اب بھی اپنے جذبات کے یوں رد کیے جانے پر کچھ بھی کہے بنا وہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"یہ آخری بات مذاق تھی یار۔۔۔میرے لیے تم، مصطفین یا مریم بھی سب ایک جیسے ہو۔سب دوست ہو۔ اب چلو بابا۔۔۔"

ادھر ثومیہ نے اسے اترے ہوئے چہرے کے ساتھ ٹکر ٹکر خود کو دیکھتے پایا تو اس کا بازو تھام کر آگے کھینچتی ہوئی متوازن و عام لہجے میں بولی۔ یہ سچ تھا کہ بار بار اس کی ذو معنی گفتگو سے یوں ہی فرار چاہتی وہ اندر ہی کہیں عجب سے کسی ملال سے جا لپٹتی تھی۔وہ اس کا اچھا "دوست" تھا اور ہر بار اس کا دل توڑنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔وہ کسی فرمانبردار بچے کی مانند یوں اس کے ساتھ ساتھ کھنچا ہوا چل رہا تھا گویا ایسے کلائی تھام کر وہ کائنات سے پار بھی کہیں لے جانا چاہے تو وہ ضرور جائے گا۔

ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی جن کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔۔۔کہ انہیں صرف محسوس کیا جانا چاہیئے۔

"اتنے خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی بات بری لگ گئی کیا؟"

راہداری میں داخل ہو کر کمرہ جماعت کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اس کا بازو جھنجھوڑ کر پوچھا اور پھر آہستگی سے بازو چھوڑ دیا۔اس کے بازو جھنجھوڑنے پر نہیں صرف "چھوڑنے" پر وہ کسی قدر چونک گیا تھا۔

"آں۔۔۔نہیں برا کچھ نہیں لگا۔میں تو بہت خوش ہوں اس پل کہ تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ اسی طور و طرز اور اسی فریفتگی سے جواباً بولا تو اس کی ساحر آنکھیں پڑھتی ثومیہ وہاں مچلتے جذبوں سے بے بس ہو کر نظر چرا گئی۔وہ دھن کا اس قدر پکا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس کے پاس کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔

کلاس میں داخل ہو کر انہوں نے دیکھا کہ مریم ان سے پہلے وہاں موجود ہے اور انہیں دیکھ کر ہاتھ بھی ہلانے لگی ہے تو آگے پیچھے چلتے ہوئے سیدھے اس تک آ گئے۔

"السلام علیکم۔۔۔"

یک زبان ہو کر اسے سلام کرتے وہ دونوں اس کے دائیں جانب موجود خالی نشستوں پر براجمان ہو گئے تو آنکھوں میں کوئی سوال لیے وہ ان کی طرف مڑی۔

"وعلیکم السلام۔ مصطفین کدھر ہے بھئی؟ اور یہ تم دونوں کیوں منہ لٹکائے داخل ہوئے ہو؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

کسی قدر حیرت سے پوچھتے ہوئے باری باری انہیں دیکھ کر آخرش اس نے اپنی نگاہ سفیر پر ٹکا دی۔ اس کی کھوج کے مفہوم کو من وعن سمجھتے ہوئے سر کی ہلکی سی جنبش سے اس نے سارے خیالات جھٹک دیئے اور سرسری انداز میں بولا۔

"سب ٹھیک ہے یار۔ ہونا کیا ہے بھلا؟ اور مصطفین پتا نہیں کیوں نہیں آیا اب تک۔۔۔ یقیناً لیٹ ہو گیا ہے وہ آج۔ تم سناؤ کب آئیں؟ اور دبے پاؤں سیدھی کلاس میں کیوں چلی آئیں؟ ہمارا انتظار کیوں نہیں کیا؟"

مصطفین کی بابت بتا کر سوال در سوال کرتے ہوئے اس نے اسے موضوعِ گفتگو سے ہٹا دیا تو ثومیہ نے بغور اسے دیکھا۔ اس کا انداز اسے خود سے ملتا جلتا سا لگا۔ وہ بھی اس کی باتوں سے ایسے ہی فرار پاتی تھی۔

"چلو آ جائے گا خود ہی۔ اور پھر ایک جھٹکے سے کلاس میں داخل ہو کر پہلے دن کی طرح سر کو کہے گا کہ معذرت جناب۔۔۔ میرا کلاس میں یوں داخل ہونا ضروری تھا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔"

جواباً مریم نے جو آواز بدل کر مصطفین کے مخصوص مودب انداز میں نقل اتاری تو اس پرانے منظر کو سوچ کر ان دونوں کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ایسی ہی تھی کہ بدلتے ہوئے مزاجوں کو واپسی کی راہ فراہم کر دینے والی۔ بھرپور شوخ۔۔۔ لیکن عمیق تر مشاہدات کی مالکہ۔

"اور میں انتظار اس لیے نہیں کر سکی آج کہ ہاسٹل کی لڑکیوں کے ساتھ آئی ہوں۔ باتیں کرتے کرتے بس سیدھی چلی آئیں ہم۔"

کچھ توقف سے ہنسی روک کر اس نے اس کے سوال کا جواب دیا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ثومیہ نے گویا اس کی بات اچک لی۔

"اچھا کلاس میں داخلہ ان دونوں کا ہی ناقابلِ فراموش ہے۔اس کا نہیں یاد تمہیں کہ کلاس میں یوں داخل ہوا تھا اکڑا ہوا گویا ڈگری لے کر ہم پر کوئی احسان کرنے آیا ہے۔"

اور اس کی بات پر ابھی ہنسی روک کر چپ ہوئے وہ سب پھر سے ہنسنے لگے۔پھر یوں ہی ایک دوسرے کی مختلف اداؤں پر لطیف جملے کستے ہوئے انہیں وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا کہ

اس پل ان تینوں کے مابین پرانی یادیں کھنگالتے موسم رقصاں تھے۔وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کہانی میں ان کے ساتھ شامل وہ چوتھا کردار ان سے دور کہیں کسی زنگ آلودہ کھڑکی میں رکا سوگواریت سے آنسو بہا رہا ہے۔کہ یادیں کھنگالنے کا یہی موسم اس پر کسی انوکھے رنگ میں اترا ہے۔وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ جس کے انتظار میں ہیں۔۔۔وہ آج نہیں آئے گا۔

کبھی کبھی زندگی کتنی عجیب ہو جاتی ہے نا۔۔۔کہ ہم کہیں خود سے ہی لپٹ لپٹ کر بے تحاشا رو رہے ہوتے ہیں اور ہم سے پار کہیں بے طرح ہنستے ہوئے ہمارے تمام دوستوں کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔

☆......☆......☆

دور دراز سے آئے رشتہ داروں کے بصد اصرار پر خالہ کنیز کے ختم قل کا انتظام صبح دس بجے "نیلی مسجد" کے وسیع تر احاطے میں کیا گیا کیونکہ سب کو واپس اپنے گھروں کے لیے نکلنے کی جلدی تھی۔مصطفین صبح سویرے اٹھ کر پوری تندہی سے تمام تر انتظامات کرنے میں جت گیا تھا۔اس وقت گھر میں نزدیکی محلوں کی خواتین اور دیگر قریبی رشتہ داروں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اور ہر کوئی اسے ایک اجنبی مرد کے طور پر مختلف کاموں کے سلسلے میں گھر کے مختلف گوشوں میں بھاگتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔ہر بار اسے دیکھ کر لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کی رائے زنی کر رہے تھے۔کسی کا اندازہ کچھ کہتا تھا اور کسی کا کچھ۔۔۔الغرض ہمارے عمومی معاشرتی رویہ جات وکردار کے عین مطابق خالہ کنیز کی فوتگی سے زیادہ وہاں مصطفین کی موجودگی موضوع ومتنِ گفتگو تھی۔اور یہیں اپنی جانب اٹھتی طرح طرح کی انگلیوں، اپنے بارے ہوتی مختلف سرگوشیوں اور اپنی جانب ہوتے معنی خیز اشاروں کا ادراک رکھتے ہوئے مصطفین نے ایک اہم تر فیصلہ کیا۔۔۔بے حد اٹل اور پختہ فیصلہ۔اس گھر سے آج ہی آج میں چلے جانے کا فیصلہ۔۔۔لوگوں کی زبانیں روکنے کا اس کے سوا کوئی حل نہیں تھا۔اور دیکھا جائے

تو بنتا بھی یہی تھا۔خالو ظفر سے مشورہ کیے بنا بالا ہی بالا اس نے اپنے پرانے ہاسٹل میں فون کیا کہ جہاں گاؤں سے آنے کے بعد پہلی بار اس نے رہائش اختیار کی تھی اور اپنے لیے کمرہ مختص کروالیا۔

قصہ المختصر وقت گذرا، خالہ کے ختم سے فراغت پا کر اس نے سارا سامان سمیٹا اور کسی مناسب جگہ پر خالو کو گلی میں ہی ایک طرف روک کر اس نے اپنے جانے کا بتا دیا۔

" لیکن پتر ایسے کیسے تو چلا جائے گا؟ ابھی تو تیری خالہ کا دکھ ہے اور اب تو بھی جانے کی بات کر رہا ہے۔اور پھر تیرا مشترکہ کاروبار ہے میرے ساتھ۔اتنا پیسا لگایا ہے تم نے۔ابھی تو رہ پتر۔اس پر بعد میں سوچیں گے۔"

نہایت فکر و محبت سے مسلسل اس کے شانے پر ہاتھ دباتے ہوئے انہوں نے عذر پیش کیے تو ان کے محبت بھرے لہجے میں بھیگتا وہ مودب انداز میں جواباً بولا۔

" نہیں خالو جی۔اب جانا ضروری ہے۔یہاں سب میری موجودگی پر سوال اٹھا رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ لوگوں نے کسی نہ کسی بہانے اس کا اظہار و اعتراض آپ سے بھی لازمی کیا ہوگا۔رہی بات کاروبار کی تو آپ بھی یہیں ہیں اور میں بھی۔ان شاء اللہ میں ملنے آتا جاتا رہوں گا۔لیکن پلیز اب مجھے روکیئے گا مت۔میں فیصلہ کر چکا ہوں خالو جی۔اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔میں نے فون کر کے اپنے پرانے ہاسٹل میں کمرہ بھی بک کروالیا ہے اور سامان بھی اوپر پیک رکھا ہے میرا۔بس آپ مجھے دل سے اجازت دیں۔دعاؤں سے رخصت دیں۔پلیز خالو جی۔اب اصرار مت کیجئیے گا۔"

دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کرتا وہ ان کی بوڑھی آنکھیں تاکتا رہا تو اس کی تمام تر باتوں سے متفق ہوتے ہوئے انہوں نے نظریں پھیر لیں۔وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا کہ ان کے ہر رشتہ دار نے اس کے یہاں رہنے کی بابت ڈھکے چھپے لفظوں میں اعتراض ضرور کیا تھا۔

" لیکن پتر تیری خالہ کی روح راضی نہیں ہوگی ایسے مجھ سے۔وہ سوال کرے گی کہ تجھے جانے کیوں دیا میں نے۔۔۔؟"

کچھ توقف سے ہارے ہوئے لہجے میں انہوں نے فقط یہی کہا تو ان کے رندھے ہوئے لفظوں سے مصطفین کے گلے میں آنسو اٹکنے لگے۔اس نے ایک یاسیت بھرا سانس لیا اور شدت جذبات سے کپکپاتا خالو

ظفر کا ڈھلکے ہوئے گوشت والا ہاتھ تھام لیا۔
"ان کی روح لازمی آپ سے راضی ہوگی خالو جی۔آپ نے ماشاء اللہ ان کے ساتھ بہت اچھی زندگی گذاری ہے۔پریشان نہیں ہوں بالکل اور مجھے اجازت دیں۔"
اس کے نرم وگداز لب ولہجہ پر انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے صرف ایک بار نظر بھر کر دیکھا اور پھر گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
"چل پتر۔۔۔جب تو نے ٹھان ہی لی ہے تو اب میں کیا ضد کروں۔بس آتے جاتے رہنا۔تیری عادت سی ہے ہمیں۔میری دھی بھی دو گھڑی تجھے ستا کر ہنس کھیل لیتی تھی۔اور وہ جنتوں کو نکل جانے والی تو تیرے نام کا دم بھرتی تھی۔ہماری عادتیں بگاڑ دیں تم نے۔اور اب جا رہے ہو۔"
بات مکمل کر کے ایک لحظہ بھی رکے بنا وہ آگے بڑھ گئے تو اس گھر سے وابستہ پرانے منظر ایک ایک کر کے اس کے پردہ دل پر چلنے لگے۔ایک اداس تر نگاہ دور سے ہی اس مکان کے کون ومکاں میں ڈالتا وہ گویا اسے اپنے صحن دل میں اتارنے لگا اور پھر شکستگی سے قدم اٹھاتا گھر میں داخل ہوگیا۔
زندگی میں کچھ چیزوں کی اہمیت صرف کچھ لوگوں سے وابستگی کی بنا پر ہوتی ہے۔مخصوص مقامات یا جگہوں پر ہمیں صرف مخصوص لوگوں کے سنگ ہونا ہی اچھا لگتا ہے۔اور زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخصوص افراد کی عدم موجودگی یا غیر دستیابی کی صورت میں ان سے وابستہ تمام تر چیزیں ہمیں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔یوں لگتا ہے گویا ہم ان چیزوں پر تمام تر استحقاق کھو چکے ہوں۔
اس کے لیے بھی تمام تر لگاوٹوں کے باوجود خالہ کنیز کے بنا اب اس گھر میں رہنا ناممکن تھا۔
نپے تلے قدموں سے اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے باقی رہ جانے والا چھوٹا موٹا سامان بھی سمیٹا اور پھر سامان کو دروازے کے قریب رکھ کر اس کھڑکی میں جا رکا جو ایک تنگ سی گلی میں کھلتی تھی۔ایک الوداعی نگاہ دور بہت دور تک یہاں کے قرب وجوار میں جھانکتا وہ پلٹا اور یاسیت بھرے انداز سے اپنے دونوں بیگز اٹھا کر باہر نکل آیا۔ایک بیگ اس نے دائیں کاندھے پر لٹکایا جبکہ دوسرا بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔راہداری عبور کرنے کے دوران لہراتے ہوئے پردوں نے اس کے سحر گر وجود سے لپٹ لپٹ کر گویا اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی

لیکن اس گھر کی ہوا تک میں سرسراتا کرب سانسوں کے ہمراہ سینہ میں بھرتا وہ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ جونہی وہ زینوں کے ابتدائی سرے پر نمودار ہوا نیچے لاؤنج میں اب تک بچھی دریوں پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ایمان اور خالہ رضیہ کی نگاہ ایک ساتھ اس پر پڑی۔

"یہ مصطفین کدھر جا رہا ہے۔۔۔؟؟"

خالہ کے لب ہلے تو گویا کسی خیال سے چونکتی ایمان فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر مصطفین نے اوپری سے نچلے زینے تک کا سفر، اور ایمان نے خالہ سے اپنا ہاتھ چھڑواتے ہوئے خالہ سے مصطفین تک سفر، ایک ساتھ طے کیا تھا۔ وقت کی پہریں اس لہر سے سرکیں کہ ایک ہی وقت میں وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن رکے۔

"اتنے لوگوں میں مجھے تم سے افسوس کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے خالہ کے یوں ایک دم چلے جانے کا بہت دکھ ہے ایمان۔ لیکن اللہ کی یہی مرضی تھی۔ تم صبر کرنا بہت۔ یاد ہے ناں کہ خالہ نے تمہیں مضبوط رہنے کا کہا تھا۔"

بیگ نیچے زمین پر اپنے پیروں میں رکھتا وہ اس کی مغموم تر آنکھوں میں جھانک کر نرمی سے کہنے لگا کہ جہاں غم سے سوا وبالائی سوال بھی تیر رہے تھے۔ جانے کیوں وہ نظریں پھیر گیا۔

"ہاں بس جیسے اللہ کی مرضی۔۔۔"

وہ بولی تو اس کی روئی روئی آنکھوں سے قطع نظر اس کے لہجے میں اب ڈھارس تھی۔ وہ اس کے الجھے الجھے انداز میں الجھنے لگا کہ اسی پل خالہ رضیہ بھی ان دونوں کے پاس آ ٹھہریں۔

"تو تم بھی یونہی ایک دم سے جا رہے ہو مصطفین؟ بتاتے تو سہی؟ کسی سے مشورہ تو کیا ہوتا؟ اچھا چھوڑو اس بات کو۔۔۔ تم رکو گے نہیں؟؟؟"

وہ مزید بولی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے کی وہ ڈھارس بس ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی باتوں پر اس کا سر پہلے اثبات اور پھر بے ساختہ نفی میں ہلا تو اس بار اس کی آنکھیں بھر آئیں کہ وہ رکنے سے انکاری ہے۔

"میرے کہنے سے بھی نہیں؟"

وہ منت کے سے انداز میں بولی تو بے چینی سے پہلو بدلتا وہ رضیہ بیگم کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

"اپنا بہت خیال رکھنا ایمان۔۔۔ مجھے اب جانا ہوگا۔ خالہ کنیز نہیں ہوں اگر تو میں یہاں نہیں رک سکتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو پلیز۔"

اب کی بار نگاہیں اٹھا کر وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر خاموشی سے ساتھ کھڑی رضیہ بیگم سے پیار لینے کے لیے جھکا۔

"چلتا ہوں خالہ جی۔ کوئی غلطی کوتاہی ہوئی ہو تو معاف کیجیئے گا۔ کبھی میری وجہ سے دل دکھا ہو تو اپنا بیٹا سمجھ کر بس جانے دیجیئے گا۔"

اور اس کی اس فرمانبرداری پر بس ایک شرمساری نگاہ ایمان کی طرف دیکھتی خالہ نے پیار دینے کی بجائے اسے خود سے لپٹا لیا۔

"جا تجھے ساتوں خیریں ہوں پتر۔ جا رب تیرا بھلا کرے۔ بڑا اچھا وقت گذرا تیرا یہاں۔ بڑی خدمت اور محبت کی تو نے میری بہن سے۔ وہ روح تک راضی تھی تم سے۔۔۔ اور معافیاں نہ مانگ ایویں۔ تو نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا یہاں۔ ہاں۔۔۔ ہمیں بھی کہا سنا سب معاف کرنا۔"

اس کے ماتھے کے بال سنوارتی اسے محبت سے پچکارتی وہ اس سے یوں لگاوٹ کر رہی تھیں گویا ایمان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ان کی مٹی میں مل چکی بہن کی کوئی آخری نشانی ہو۔ ان کے اس انداز سے پگھلتا وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کر سکا تھا۔ وہ جان گیا کہ وہ ان کے دل میں بھی اپنے لیے محبت پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

"امی کی بڑی خواہش تھی مصطفین تم یہیں رہو۔ کیا تم ان کی خواہش کا بھی احترام نہیں کرو گے؟"

وہ دوبارہ بیگ اٹھانے جھکا تھا جب ایمان نے نہایت جذباتیت سے اسے پھر سے روکنا چاہا۔

"خالہ کی خواہشیں خالہ کے ساتھ جا بسی ہیں ایمان۔۔۔ اب ہمیں اپنی دنیا کے دل رکھنے ہوں گے بس۔ خالہ کے بنا میرا یہاں رکنا یا رہنا بے جواز ہے۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا بس۔"

اسی جذباتیت سے وہ کسی قدر دوبدو ہو کر بولا تو ایمان کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اب اس سے قبل کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی مزید کچھ بھی کہتا دور رشتہ دار خواتین سے معذرت کرتے ہوئے خالو ظفر تیزی سے ان تک چلے آئے۔ انہوں نے انہیں یہاں کھڑے اب دیکھا تھا۔

"اسے جانے دے میری دھی۔۔۔یہ اب نہیں رکے گا۔میں کوشش کر چکا ہوں۔"

ان سب کے چہروں سے یہاں کی صورتحال سمجھتے ہوئے انہوں نے ایمان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا اور پھر رضیہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔

"اسے لے جاؤ اندر رضیہ۔اسے صبر کی تلقین کرو بس۔رات سے رو رو کر مجھے تکلیف دے رہی ہے۔"

ان کا حکم پا کر ایمان کے گرد بازو ڈالتے ہوئے انہوں نے اسے واپسی کی طرف کھینچا تو الوداعی نظروں سے اسے دیکھتی وہ خالہ کے بازوؤں سے کسی قدر مزاحمت کرتے ہوئے بولی۔

"چلو جاؤ مصطفین۔۔۔اپنا بہت سارا خیال رکھنا۔اور جتنا تمہیں ستایا میں نے وہ سب میری نادانی سمجھ کر بھلا دینا۔امی ہوتیں تو تمہیں کبھی نہیں جانے دیتیں۔لکھ لو میری بات۔۔۔خدا حافظ۔"

عجب عجب کیفیات میں ڈھل کر بات مکمل کرتے ہوئے جواب سنے بنا وہ پلٹ بھی گئی تو اس کی کمر پر الجھی بکھری اس کی گھنی زلفوں کو تاکتا وہ اک طویل سانس بھر کر رہ گیا۔اس نے آج پہلی بار ایمان کے بالوں کو اتنا منتشر اور اس قدر ابتری میں دیکھا تھا۔وہ کسی کو نہیں بتا سکتا تھا اس گھر کو چھوڑتے ہوئے اس کے دل کا کیا عالم ہے۔

"آؤ تمہیں باہر سڑک تک چھوڑ آؤں۔یہ والا بیگ مجھے دے دو۔"

خالو ظفر نے اس کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا تو اس نے تیزی سے ہاتھ واپس کھینچا۔

"نہیں نہیں خالو جی۔۔۔میں اٹھا لوں گا۔آپ یونہی ساتھ آیئے۔شکریہ۔"

انہیں انکار کرتا ہوا ایک آخری نگاہ اس گھر کے طول وعرض پر ڈالتا وہ لاؤنج کے دروازے سے باہر نکل گیا تو شانے جھکائے خالو ظفر بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔مصطفین کا اس گھر سے چلے جانا ان کے لیے بھی بے حد تکلیف دہ تھا۔

"میرے ہوتے ہوئے تو اس گھر سے نہیں جا سکتا۔"

وہ گھر کی بیرونی دہلیز پار کر رہا تھا جب خالہ کی آواز بیڑیاں بن کر اس کے پیروں سے لپٹنے لگی۔ایک جھٹکے سے رک کر وہ واپس گھر کی جانب دیکھنے لگا۔

"میں تو رہنا چاہتا تھا خالہ جی۔۔۔بس آپ ہی نہیں رہیں۔"
اوپری منزل کی راہداری میں اب تک لہراتے ہوئے پردوں کو دیکھ کر اس نے گویا ہواؤں کے سپرد کوئی پیغام کیا تھا۔
زندگی کتنی عجیب ہوتی ہے نا۔۔۔جب مرضی اور یکا یک ہی من پسند جگہوں سے ہمارے ناطے توڑ دیتی ہے۔

☆......☆......☆

ایک نئی صبح پرانے معمولاتِ زیست لے کر شہرِ لاہور پر پورے جوبن سے ٹوٹ پڑی تھی۔ وہی ٹریفک کا بے ہنگم شور و غل، وہی سکول کالج جاتے طلباء کی لمبی لمبی قطاریں، وہی ہوا کی سوگوار سرسراہٹ میں شامل آسمانی پرندوں کی مدھر پھڑپھڑاہٹ اور دور افق پر تیرتی اکا دکا بدلیاں۔۔۔سب کچھ جوں کا توں تھا۔ یونیورسٹی کے گیٹ سے ابھی ابھی داخل ہوئی ثومیہ سست روی سے چلتی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے لگی تھی کہ طویل احاطہ عبور کرتے ہوئے اپنے نام کی پکار سن کر ٹھٹک کر رکی۔
"اوئے ثومیہ۔۔۔رکو تو سہی۔ کب سے آوازیں دے رہا ہوں سنائی نہیں دیتا کیا؟"
اس نے مڑ کر دیکھا تو کاندھے پر لٹکتا اپنا یونیورسٹی بیگ سنبھالتا بھاگتے ہوئے اس کے بالکل پاس آ چکا یہ سفیر تھا۔
"میں نے نہیں سنا تھا۔ اس لیے رکتی کیسے بھلا؟ اور یہ "اوئے ثومیہ۔۔۔" کیا ہوتا ہے؟؟ ہمیشہ بدتمیز ہی رہنا تم۔ سدھرنا مت کبھی۔"
خشمگیں نظروں سے اسے گھورتی وہ یوں پکارنے پر ملامت کرنے لگی تو وہ ازلی ڈھٹائی سے ہنسا۔
"وہ کیا ہے نا کہ تم اپنی اپنی سی لگتی ہو اس لیے کیسے بھی مخاطب کر لیتا ہوں۔ اور یہ عجیب کہی کہ تم نے سنا ہی نہیں۔ وہ۔۔۔ادھر بائیک پارک کرتے ساتھ تمہیں آوازیں دینا شروع کی ہیں۔ کان صاف کرواؤ اپنے۔۔۔ سچی۔"
اس کی ملامتی نظروں اور لہجے کو یکسر ہوا میں اڑاتا وہ دور پارکنگ اسٹینڈ کی طرف اشارہ کر کے بولا تو وہ ماتھے

پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔

"افف۔۔۔تم سچ مچ لاعلاج ہو یار۔تمہارا واقعی کوئی حل نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کسی روز اپنی انہی بچگانہ حرکتوں سے تم مجھے پاگل کر دو گے۔"

وہ بھرپور زچ ہو کر بولی تو اس کی حالت پر ترس کھاتا وہ فوراً معذرت کرنے لگا۔

"اچھا سوری بابا۔۔۔آئندہ یوں نہیں پکارتا میں۔اب خوش۔۔۔اب چلیں۔۔۔؟؟"

دونوں ہاتھوں سے اسے دھیرج رہنے کے اشارے کرتا وہ آگے بڑھنے کی بابت پوچھنے لگا تو اس کے اس مدافعتی انداز پر وہ لبوں سے ابھرتی بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل دبا سکی۔ وہ اس کے سامنے پل پل تولہ تو کبھی ماشے میں ڈھلتا تھا۔اسے یوں مسکراہٹ دبا کر خود کو گھورتے دیکھ کر وہ بے طرح ہنسنے لگا۔

"جب ہنسی آ ہی رہی ہے تو پورے دل سے ہنس لو ناں۔۔۔؟یوں چھپ چھپا کر ہنسنا کیا ہوا بھلا۔۔۔؟؟"

اور اس کی اگلی بات پر وہ بھی پوری شدت سے ہنس دی تو فضا میں عجب سی کوئی خوشگواریت گھلنے لگی۔ایک ساتھ ہنستے وہ دونوں بہت اچھے لگتے تھے۔

" کلاس میں نہیں وہیں سفید گلابوں کے پاس رک کر مصطفین کا انتظار کرتے ہیں۔جانے آج بھی آتا ہے یا نہیں؟ پتا نہیں وہ کل کیوں نہیں آیا تھا۔تم نے یونیورسٹی کے بعد اس کے نمبر پر بات کرنے کی کوشش کی تھی کیا؟"

یک لمحاتی توقف سے ہنسی روکتے ہوئے اس نے بڑے پتھر اور سفید گلاب کی کیاریوں کی جانب قدم بڑھائے اور مصطفین کی غیر حاضری کی بابت خدشے کا اظہار کرتے ہوئے پے در پے سوال کیے۔

"ہاں نمبر تو میں ملاتا رہا بعد میں بھی لیکن وہ بند ہی رہا۔ بلکہ میں نے تو رات دس بجے تک کوشش کی تھی۔خیر ان شاء اللہ ابھی آجائے گا وہ تو خبر لیں گے خوب کہ اچانک یوں پریشان کرنے کی وجہ کیا بنی؟ بھئی چھٹی کرنی تھی تو کم از کم ہمیں بتا کر تو کرتا۔"

اس کی ہمراہی میں چلتے ہوئے نظروں کا زاویہ اس کے ماتھے کی پر فکر لکیروں پر ٹکا تا وہ عام و سرسری لہجے میں بولا تو وہ مبہم انداز میں بس سر ہلا کر رہ گئی۔اگلے چند قدم انہوں نے ارد گرد ٹولیوں کی مانند گزرتے، ٹھہر کر باہم گفتگو کرتے اور کتابوں یا نوٹسز کی مد میں پریشان ہو کر اونچا اونچا بولتے طلبا و طالبات کا مشاہدہ کرتے ہوئے

اٹھائے۔کیاریوں کے پاس پہنچ کر سفیر نے ایک کیاری میں اگے سفید رنگ گلابوں کو نرمی سے چھوا اور پھر ٹہنی پر موجود کانٹوں کو دیکھ کر بیگ ایک طرف رکھتا گویا کسی عزم کے ساتھ ایک ٹانگ موڑتے ہوئے کیاری کے پاس بیٹھ گیا۔

"جانے یہ پھولوں کے ساتھ ببول کیوں اگ آتے ہیں؟ کاش یہ نہیں ہوا کرتے۔۔۔"

سفید گلابوں کے گرد سے کانٹے چنتا وہ مڑ کر ثومیہ سے بات برائے بات مخاطب ہوا تو الجھی الجھی نظروں سے اس کی فسوں گر آنکھوں کے لال دھارے دیکھتی وہ جواباً بولی۔

"ان کی موجودگی کی وجہ یا ہونے کے مقصد کے لیے یہی بات کافی ہے سفیر کہ یہ پھولوں کی حفاظت کرتے ہیں۔یہ نہیں ہوں تو گلاب توڑنا کتنا آسان لگنے لگے سب کو۔ابھی سب کے دل میں ان کا ڈر ہوتا ہے۔اسے کوئی آفاقی اصول سمجھو کہ نرم چیزیں سختی میں ملفوف ہو کر بہتر پروان چڑھتی ہیں۔ہر نزاکت کو ایک پردہ، ڈھال یا دفاع لازمی چاہیئے ہوتا ہے۔۔۔اور ان کے لیے یہ وہی ہے۔"

وہ یوں ٹھہر ٹھہر کر بولی کہ فقط ایک لمحے کے لیے چونکتا وہ ہتھیلی پر جمع شدہ سارے کانٹے کیاری کی مٹی میں پھینک کر، ہتھیلی جھاڑتا ہوا اٹھا اور اس کے مقابل آن رکا۔

"کبھی کبھی نا۔۔۔تم بھی مصطفین کے لب ولہجہ میں بات کرنے لگتی ہو۔کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم میں تم نہیں ہو۔۔۔وہ بولتا ہے۔"

اور اس کی اداس تر آنکھیں پڑھتے ہوئے جو اس نے اگلی بات کہی اسے سن کر ثومیہ کو لگا کہ اس کا پنجر ایک دم خالی ہو گیا ہے۔اسے لگا کہ گویا کسی نے ذات کے دونوں کناروں سے تھام کر اسے پوری شدت سے جھاڑ دیا ہے۔اسے لگا کہ اس کی روح سچ مچ دور کہیں کسی اور وجود میں جا بسی ہے۔سفیر کو بالکل نہیں پتا تھا کہ اس کے لب و لہجہ کو مزاج کے رنگ میں مصطفین سے ملاتے ہوئے اس نے اس کے دل کے کس کس کونے، گوشے یا ریشے تک کو چھیڑ دیا ہے۔اب اس سے قبل کہ خالی ذات لیے اس کے سامنے کھڑی ثومیہ جواباً کچھ بھی کہتی مرکزی دروازے کی جانب سرسری نگاہ کرتا وہ اسی جانب نظر ٹکاتا ہوا تقریباً چیخ کر بولا۔

"لو جی آ گیا مصطفین بھی۔آؤ اس کی تو خبر لیں ذرا۔اور یہ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے اس کا؟"

بات مکمل کرتے ہوئے مڑ کر کیاری کی اینٹ سے ٹکا اپنا بیگ اٹھاتا وہ تیزی سے اس کی جانب بھاگ بھی گیا تو چونک کر اس طرف دیکھتی وہ ساری سوچیں سمیٹ کر اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"اے مصطفین۔۔۔ کہاں تھا یار تو؟ کل آیا کیوں نہیں بھائی؟ نمبر بھی بند تھا۔ عجیب بندے ہو ہماری پریشانی کی تمہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ اب چپ کیوں ہے؟ بتاؤ ناں کہاں تھے۔۔۔؟"

اس تک پہنچ کر اس سے گلے ملتا، پھر اسے دونوں شانوں سے تھام کر اپنے سامنے روکتا وہ سوال در سوال کرتا چلا گیا تو جھکا ہوا سر اٹھا کر اس نے عجب کرب سے پہلے اسے اور پھر ابھی ابھی اس کے ساتھ آن رکی ثومیہ کی سوالیہ نظروں کی طرف دیکھا۔ یقیناً وہ بھی اس سے یہی سب پوچھنا چاہتی تھی۔

"میری خالہ فوت ہوگئی تھیں پرسوں۔۔۔ تب رات میں ان کو دفن کیا اور کل ان کا ختم قل تھا۔ اسی وجہ سے میں کل نہیں آیا اور میرا موبائل بھی بند رہا۔۔۔"

ضبط کی کسی انتہا پر رکا وہ مغموم تر لہجے میں بولا تو ایک پل کے لیے سفیر کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ ایسے موقع پر کیا ردعمل ظاہر کرے۔

"اوہ۔۔۔ بہت معذرت یار یوں پوچھنے کے لیے۔ ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔"

رسمی لہجے میں وہ فقط یہی کہہ سکا۔ خالہ کنیز کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں ان کا کیا کردار ہے یا ان کے رشتے کی نوعیت و اہمیت کیسی ہے؟ ایسی انتہائی ذاتی نوعیت کی گفتگو صرف ثومیہ اور اس کے مابین تھی۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہمیں بہت افسوس ہے مصطفین۔ کیا ہوا انہیں؟ بیمار تھیں کیا؟ اُفف۔۔۔ بہت افسوس ہے۔"

اب کی بار ثومیہ بڑھی اور سفیر کے ہاتھوں کی گرفت سے اس کے شانے آزاد کرواتی اظہارِ تاسف کرنے لگی اور پھر اس کے کوئی بھی جواب دینے سے قبل وہ سفیر سے مخاطب ہوئی۔

"خالہ کنیز بظاہر تو صرف اس کی مکان مالکن تھیں لیکن درحقیقت بہت قریبی ہستی تھیں۔ سمجھ لو ان کے خاندانوں کے مابین بہت دیرینہ پیار تھا۔"

اسے مختصراً اس تعلق کی حقیقت و نوعیت سمجھاتی وہ لب بھینچ کر مصطفین کو دیکھنے لگی تو سفیر بھی اثبات میں سر ہلاتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھر ثومیہ کی خاموشی کا منتظر، ہارے ہوئے لہجے میں وہ دھیرے دھیرے بولنا شروع ہوا۔

" ہاں بس جو خدا کو منظور تھا۔ حکم الٰہی ہے ناں تو روگردانی ممکن ہی نہیں۔ چاہ کر بھی موت سے کوئی مفر یا فرار تھوڑی ہے؟ جو وعدہ کیا ہے وہ دینا ہی دینا ہے۔ خالہ کو پرسوں سہ پہر میں ہارٹ اٹیک ہوا اور ہاسپٹل پہنچنے سے قبل ہی آناً فاناً وہ چل بھی بسیں۔ اور میرا موبائل اس لیے بند رہا کہ بیٹری ختم ہوگئی اور مصروفیت میں چارج کا خیال ہی نہیں رہا۔ معذرت دوستو۔ مجھے علم ہے آپ لوگوں کو پریشانی ہوئی ہوگی۔ "

بھیگے بھیگے لہجے میں بات مکمل کرتے ہوئے اس نے گویا آنسو نگلے کہ اس کے گلے کی نیلی رگیں پوری طرح ابھر کر تن سی گئیں۔ یقیناً اس کے لیے خود کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

" ہمم ۔۔۔ صبر کرو بس دوست۔ بالکل یہی بات ہے کہ موت کا وعدہ برحق ہے۔ پورا ہونا ہی ہونا ہے۔ آج نہیں تو کل ہی سہی۔ "

اب کی بار یہ کہتے ہوئے اسے خود سے لپٹا کر سفیر نے ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا تو بس ایک نظر ثومیہ کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتا وہ اس کے ہم قدم ہوتا گیا۔

ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی کہ جب سامنے ہونے کے باوجود مخصوص گفتگوؤں کے لیے ہمیں من پسند دوست میسر نہیں آتے۔

کلاس میں پہنچے تو دیکھا کہ مریم آج بھی ان سے قبل ان کی نشستیں مخصوص کر کے بیٹھی ہے۔ یعنی وہ آج بھی جلدی آ گئی تھی۔ قصہ المختصر اس نے بھی مصطفین سے کل کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی اور پھر حقیقت جان کر اظہارِ افسوس کرتی ہوئی تادیر اسے صبر کی تلقین بھی کرتی رہی۔

پھر یوں ہوا کہ لگاتار تین لیکچرز اٹینڈ کرنے کے بعد چوتھے فری لیکچر میں وہ لوگ کینٹین میں جانے کے لیے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے۔ مصطفین کی غمزدہ کیفیت کے پیشِ نظر وہ تینوں بھی زیادہ ہنس بول نہیں رہے تھے۔ سب کے مابین غیر محسوس سی ایک جھجک در آئی تھی۔

"مجھے کل کے تمام لیکچرز کے نوٹس چاہئیں۔ آؤ یار پہلے وہ کاپی کروالائیں۔"

صحن میں لائبریری کی جانب جانے والی روش پر رک کر مصطفین نے اچانک سب کو مخاطب کیا تو بنا کسی توقف کے سفیر جواباً بولا۔

"بعد میں کروالینا یار۔ اس وقت بڑی بھوک لگی ہے۔ کیا کہتے ہو؟"

اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا وہ "اوکے۔" کہنے ہی لگا تھا کہ مریم بول اٹھی۔

"ایسا کرو تم دونوں فوٹو کاپیئر سے ہو آؤ تب تک میں اور سفیر کینٹین میں کھانا آرڈر کرتے ہیں۔ دونوں کام ایک ساتھ نمٹ جائیں گے۔ کیا خیال ہے؟ اور ہاں کوشش کرنا جلدی واپس آسکو۔ میں کھانے پر انتظار نہیں کروں گی۔"

اور اس کی بات سن کر ثومیہ نے فوراً تائید کر دی۔

"ہاں یہی مناسب ہے۔ پہنچو تم دونوں۔۔۔ ہم بھی آئے بس۔"

انہیں کینٹین کی جانب بڑھنے کا اشارہ کرتی وہ لائبریری کی طرف چلی بھی گئی تو وہ دونوں چپ چاپ پلٹ گئے جبکہ نپے تلے قدم اٹھاتا مصطفین اس کے پیچھے آ گیا۔

"ایمان کا تو بہت برا حال ہوگا؟ اس نے کیسے صبر کیا ہوگا؟ مجھے بہت افسوس ہے مصطفین۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے اور تم سب کو صبر جمیل عطا ہو۔ آمین ثم آمین۔"

اسی روش پر چلتے ہوئے لائبریری سے تھوڑا پیچھے وہ رکی اور متاسف لہجے میں ایمان کی بابت پوچھتے ہوئے اس کی بھی دلجوئی کرنے لگی۔ وہ بھی اس سے دو قدم پیچھے کسی مبہوت زدہ شخص کی مانند رک گیا تھا۔

"آمین ثم آمین۔ جزاک اللہ خیر ثومیہ۔ اور ہاں بالکل۔۔۔ ایمان کا بہت برا حال تھا۔ اسے بھلا اتنی جلدی صبر آئے گا بھی؟ ناممکن ہے یار۔ وہ تو حقیقتاً اکیلی پڑ گئی ہے۔۔۔"

اداسی سے ایک نظر اسے دیکھتا وہ دور خلائیں تاکتے ہوئے بولا تو ثومیہ کو لگا کہ یوں کر کے وہ کہیں آسمان پہ بستے اپنے سب پیاروں کا وجود کھوجنے کی کوشش میں ہے۔

"ہم۔۔۔ صحیح کہتے ہو۔ صبر اتنی جلدی تھوڑی نا آیا کرتے ہیں۔ صبر آتے آتے یہاں عمریں بیت جاتی

ہیں۔کچھ لفظ بس کہنے آسان ہوتے ہیں۔۔۔نبھانے پڑ جائیں کہیں تو "جھیلنے" سے کم نہیں لگتے۔"

اثبات میں سر ہلاتی وہ گہرے راز پڑھنے لگی تو اپنی "مصروفیت" ترک کیے بناوہ یاسیت سے مسکرا دیا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تم میں بھی میں ہی بولنے لگا ہوں۔اتنی اداس۔۔۔تم مت رہا کرو۔"

وہ بولا تو ثومیہ کو لگا اس نے اسے پوری قوت سے انہی خلاؤں میں اچھال دیا ہے کہ جنہیں وہ اس پل تاک رہا ہے۔فقط ایک ثانیے،صرف ایک لمحے اور بس ایک ہی پل کے لیے آج صبح ہی صبح سفیر کے منہ سے ادا ہوئے انہی جملوں کا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

"یہی حرف۔۔۔یہی لفظ اور یہی بات تو وہ بھی کہہ رہا تھا مجھے۔۔۔کہ کبھی کبھی مجھ میں مصطفین بولتا ہے۔"

وہ دل ہی دل میں خود سے سرگوشیاں کرنے لگی۔

"آں۔۔۔تم نے کچھ کہا کیا؟؟"

وہ قدرے چونک کر بولا تو ہڑبڑا کر اسے دیکھتی وہ جیسے کسی خیال سے لوٹ آئی۔

"نہیں ہرگز نہیں۔۔۔"

دوٹوک انداز میں اس نے اتنی شدت سے نفی کی کہ وہ حیرانی سے اسے بس دیکھتا رہا۔یکا یک اس کی آنکھوں میں کئی سوال مچلنے لگے کہ جنہیں پڑھتے ہوئے وہ فوراً سے پیشتر سنبھل گئی۔

"میری اداسی کو تم چھوڑو یار۔۔۔میں نہیں ہوتی بے وجہ اداس وداس۔تم بتاؤ کہ ایمان نے پوچھا نہیں کہ آج ہی کیوں جا رہے ہو یونیورسٹی؟مطلب ابھی پرسوں تو اس کی امی فوت ہوئی ہیں تو اتنی جلدی؟وہ پوچھ سکتی تھی۔"

یہاں وہاں دیکھ کر اسے اپنی آنکھیں نہ پڑھنے کی اجازت دیتی وہ اصل موضوع پر سوال کرنے لگی تو ایک مبہم ہنکارا ابھر کر تمام خیالات جھٹکتا وہ بھی اسی موضوع پہ لوٹ آیا۔

"نہیں اس نے نہیں روکا۔دراصل ثومیہ۔۔۔میں وہ گھر کل سے چھوڑ چکا ہوں۔میں ختم قل کے بعد اپنے پرانے ہاسٹل شفٹ ہو گیا تھا۔"

اس کے جواب پر اس کی آنکھوں میں کوئی جہانِ حیرت امنڈ آیا۔

"لیکن کیوں مصطفین۔۔۔؟؟؟"

بھرپور زور دے کر پوری شد و مد سے پوچھتی وہ سراپا سوال ہوئی تو عجب بے قراری سے چار قدموں کی مسافت بھر کر وہ اس سے اگلی طرف جا رکا۔اب وہی جہانِ حیرت لیے وہ اس کے ساتھ ساتھ پلٹی تھی۔

"بس ثومیہ۔۔۔کچھ باتوں کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔خالہ تھیں وہاں تو ہر طرف بس وہی تھیں۔اب وہ نہیں ہیں تو جیسے کچھ بچا ہی نہیں۔میں اس گھر میں ان کی غیر موجودگی نہیں سہہ سکتا تھا یار۔۔۔کسی طور بھی نہیں۔مجھ سے دیکھا جانا ہی نہیں تھا۔تو بس۔۔۔پھر میں چلا آیا۔"

انتہائی جذباتیت سے کہتا وہ پھر سے خالہ کے غم میں گھلنے لگا تو وہ ایک طویل سانس بھر کر رہ گئی۔ اس کے پاس اسے تسلی دینے کے لیے جیسے کوئی لفظ بچے ہی نہیں۔یہیں کھڑے کھڑے ان دونوں کے مابین کچھ پل کے لیے ایک بے معنی سی خامشی تیرنے لگی۔شاید وہ دونوں ہی مزید گفتگو کے لیے کچھ حرف جوڑنے لگے تھے۔

"چلو آؤ فوٹو کاپی کے لیے چلیں۔۔۔ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

کچھ توقف سے وہ لائبریری کی جانب اشارہ کرتی ہوئی بولی تو اس کے لہجے سے روانی کی مشک پا کر ہمہ تن گوش ہوا وہ اسی سمت میں بڑھنے لگا۔

"اور ایک طرح سے تو یہ اچھا ہی کیا تم نے کہ ہاسٹل شفٹ ہو گئے ہو۔دراصل میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہارے وہاں رہنے سے شاید ان کے محلے داروں اور خصوصاً رشتہ داروں کو اعتراض ہوتا۔خالہ کے بعد رکنے کا واقعی کوئی جواز نہیں بچا تھا۔"

نرمی سے تجزیہ و رائے پیش کرتی وہ اپنے دھیان سے آگے بڑھتی رہی تو اس کی سوچ کی پختگی کا وہ دل سے معترف ہوا۔گو کہ یہ سامنے کی بات تھی لیکن نوجوانوں کی طرح جذباتیت سے سوچنے کی بجائے اس نے ٹھنڈے دماغ سے حقیقی پہلو پر غور کیا تھا۔

اور پھر یونہی لائبریری میں داخل ہونے اور وہاں سے واپسی کینٹین جانے تک بھی وہ اسے کرید کرید کر اس کا غم کافی حد تک بانٹ چکی تھی۔

وہ باتیں یا محسوسات جو وہ سفیر یا مریم کے سامنے زبان پر نہیں لا سکتا تھا اس کے سامنے بیان کر کے ہلکا سا ہو گیا۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جہاں میں کہ جن سے مل کر ہم جہاں بھر کی فکریں بھول جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

وہ روز گذرا اور اس سے اگلا بھی۔۔۔اور اسی طرح روز بہ روز، ہر روز بس گذرتا چلا گیا۔خالہ کے دسویں کا ختم ہوا اور پھر چالیسویں کا بھی۔۔۔اور مصطفین نے ان دونوں میں اپنی موجودگی و شرکت کو یقینی بنایا۔دونوں دفعہ وہ خالو ظفر اور رضیہ بیگم کی موجودگی میں ایمان سے ملا اور اسے ماں سے بچھڑ جانے پر بھرپور تسلی دی۔اسے پتا چلا کہ ایمان کی دلجوئی کی خاطر رضیہ بیگم بھی فی الوقت انہی کے گھر منتقل ہو گئی ہیں۔چالیسویں کے روز وہ مصطفین کو پہلے سے بہت کمزور اور تھکی تھکی سی لگی۔اس میں عجب سا اک تبدل در آیا تھا۔لاابالی پن بہت پیچھے کہیں چھوٹ گیا تھا اور اب اس کے چہرے پر تاثرات کی مد میں متانت، ٹھہراؤ اور سنجیدگی رقم تھی۔

سچ ہے کہ پل پل سرکتی وقت کی ساری پہریں انسان سے اس کا بچپنا چھین کر بدلے میں اسے سوچیں، فکریں اور کئی طرح کے خدشات فراہم کر جاتی ہیں۔

بس پھر چالیسویں کے بعد وہ کبھی ان کے گھر نہیں گیا۔خالو نے اسے بارہا فون کیا کہ دکان کا ماہانہ منافع لے جاؤ لیکن وہ ہر بار اپنی تعلیم اور یونیورسٹی سے متعلقہ دیگر مصروفیات گنوا کر انہیں خوش اسلوبی سے ٹال جاتا۔ان سے یہ منافع یا کاروبار میں لگائی ہوئی اپنی بنیادی رقم بھی واپس لینے کا اس کا سرے سے ارادہ ہی نہیں تھا۔اس کے خیال میں جتنی نیکی یا احسانات ان دونوں میاں بیوی نے اس پر کیے تھے ان کے بدلے میں اس کی طرف سے ہوئی یہ تھوڑی سی مدد بہت ہیچ اور ناقابلِ شمار تھی۔

ادھر گھر کی راہداریوں، سیڑھیوں، صحن اور دیگر گوشوں میں بولائی بولائی پھرتی ایمان اسے اکثر یاد کرتی تھی۔خصوصاً کبھی کسی خیال سے وہ اوپری منزل کی راہداریوں میں آنکلتی تو مصطفین کی نصیحت بھری آوازیں اس کے آس پاس گونجنے لگتیں۔ماں کے مرنے سے معاشرے کے بدلتے ہوئے رویوں نے اس پر اتنا گہرا اثر کیا کہ اس کے سب کے سب خیال، خواب یا خواہشیں دل میں ہی کہیں دفن ہو گئیں۔اس نے وقت گذاری کی خاطر محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔بچے آتے تو ان کی چہکاروں، آوازوں اور شرارت بھری ہنسی سے گھر کے بام و در پر چھائی موت کی سی اداسی چھٹنے لگتی تھی۔

" ٹیچر جی وہ دیکھیں کتنے پرندے ہیں آسمان پر۔ کیا ہم انسان کبھی ایسے نہیں اڑ سکتے؟"

ایک دن ایک معصوم سی بچی کی آواز نے دوسرے بچوں کی جانب بڑھتے اس کے قدموں کو روک لیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ منہ اوپر اٹھائے آسمان کی وسعتوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کی نگاہ کا تعاقب کیسے بنا، بہت سے پرانے لمحات سے بندھی وہ قدم قدم اس تک چلی آئی۔

" آسمان میں اپنے پروں پر اڑان بھرنے کا حق صرف پرندوں کا ہے میری جان۔ خواہشیں صرف اپنے حق واختیار کی حد میں رہ کر کرنی چاہئیں۔ آپ یہ دیکھو کتاب پر۔ مجھے " کینگرو" کے اسپیلنگ یاد کر کے سناؤ شاباش۔" اس کی ٹھوڑی چھو کر سہلاتے اور پچکارتے ہوئے اس نے اسے بے جا خواہشات سے دستبرداری کا درس دیا۔

ہاں ایک مدت ہوئی کہ اب وہ آسمان نہیں دیکھتی تھی اور اگر کسی وقت غلطی سے کوئی نگاہ آسماں کو اٹھ بھی جاتی تو وہ یوں زور سے آنکھیں بند کرتے ہوئے واپس پلٹتی تھی گویا کوئی باپردہ خاتون کسی نامحرم کو بلا خواہش تاک لے۔ وہ آسمان سے ہر تعلق، ہر ایک ناطہ توڑ چکی تھی۔

انہی اوپر تلے گذرتے روز وشب میں جب کبھی وہ خالہ رضیہ کی ہمراہی میں اپنی امی کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جاتی تو اکثر اسے چونکنا پڑتا۔ ہر بار تو نہیں لیکن جمعرات کو عموماً ایسا ہوتا تھا کہ اس کے جانے سے قبل اس کی امی کی قبر کے سرہانے دھرا دیا جل رہا ہوتا، لوبان سلگ رہا ہوتا اور قبر پر پھول، پتیاں کسی چادر کی مانند بکھری یا بچھی ہوئی ہوتیں۔ اوائل میں یہ بات اس کے لئے حیرانی کا باعث بنی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے جان لیا کہ ایسا کون کر سکتا ہے بھلا؟ اس کے خیال میں یقیناً یہ مصطفین ہے جو اس کی آمد سے پہلے پہلے کنیز بیگم کی قبر سے ہو کر جاتا ہے۔ ایک مدت گذری تھی کہ ایمان کی اس سے کوئی ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ ان کے گھر کبھی نہیں آتا تھا۔

یہ خالہ کنیز کے گذرنے سے کوئی دس ماہ بعد کا ذکر ہے کہ ایک روز ایمان اپنی امی کی قبر پر فاتحہ خوانی کی خاطر قبرستان پہنچی۔ حسبِ سابق ومعمول خالہ رضیہ اس کے ساتھ ہی تھیں۔ ایمان نے قبرستان کا داخلی زنگ آلودہ گیٹ گھسیٹ کر اندر قدم رکھا تو ماحول میں گیٹ کے چرچرانے کی آواز بکھر گئی۔ اس آواز نے اس قدر ہیبت و

ہولاہٹ پیدا کی کہ آس پاس درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پکھیرو اور پرندے رنگا رنگ بولیاں بولتے ہوئے درختوں کی چوٹیوں کے آس پاس منڈلانے لگے۔ قبرستان پر کہیں ازل سے طاری کسی اداسی کو اپنے دل پر جا بجا محسوس کرتے ہوئے وہ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر خالہ کے پیچھے پیچھے چلتی قبر کی جانب بڑھنے لگی۔

"ایمان دیکھو تو۔۔۔ مجھے اس طرف جاتا ہوا وہ لڑکا مصطفین لگتا ہے۔"

یہ خالہ کی آواز تھی جس پر اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر پہلے خالہ کی طرف اور پھر ان کی انگلی یا اشارے کے تعاقب میں دیکھا۔ دور اک پگڈنڈی پر قبروں کے مابین دھیرے دھیرے چلتا ان کی مخالف سمت کو جاتا وہ یقیناً مصطفین ہی تھا۔

"یہ وہی ہے خالہ۔۔۔ بالکل یہ وہی ہے۔ وہ دیکھیں امی کی قبر پر پھول بھی ہیں۔ میں بس ایک منٹ میں آئی۔" بے ساختہ بڑھ کر رضیہ بیگم کا ہاتھ تھامتی، اپنی امی کی قبر پر بکھرے پھولوں کی جانب اشارہ کرتی وہ بے تاب لہجے میں بولی اور پھر ان کا جواب سنے بنا راستے کی غیر ہمواری کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ گئی۔

"مصطفین۔۔۔ مصطفین۔۔۔ اے سنو۔۔۔ ذرا رکو...... پلیز رکو تو سہی۔"

ان سب آوازوں پر جب وہ چونک کر پلٹا تو اس کے نام پر پکاریں دیتی اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی وہ ایک قبر کا اونچا کتبہ تھام کر قبر پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کا سانس بے طرح پھول گیا تھا۔ اب اسے یوں ہانپتے ہوئے دیکھ کر اپنی حیرت سنبھالتا وہ ایک نظر دور کھڑی رضیہ بیگم پر ڈال کر تیزی سے اس کے قریب آیا۔

"ارے۔۔۔ تم کب آئیں؟ لو پانی پیو۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پانی کی چھوٹی بوتل اس کے منہ کے عین سامنے کر دی۔

"بس ابھی ابھی۔۔۔ اور تم کب آئے؟"

بوتل تھام کر ڈھکن کھولتے ہوئے پانی منہ سے لگانے سے پہلے اس نے جواباً پوچھا اور غٹا غٹ پانی پینے لگی۔ وہ ایک پل کو رک کر اسے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان پانی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"میں بھی بس ابھی آیا۔کچھ دیر قبل۔۔۔"

جونہی اس نے بوتل ہٹا کر اسے جواب طلب نظروں سے دیکھا، وہ دھیمے پن سے فقط یہی بولا۔

"بڑے بجھے بجھے سے لگتے ہو۔۔۔؟"

آدھا پانی پی کر بوتل واپس اس کی طرف بڑھاتی وہ اس کا چہرہ کھوجتے ہوئے بولی۔وہ اسے بہت کمزور لگا تھا۔اسے جواب کے لیے منتظر پا کر وہ عجب کرب سے مسکرایا۔

"بجھا بجھا سا۔۔۔؟؟نہیں تو۔۔۔اب تو بہت جلتا ہوں میں۔"

اس بار اس کا لہجہ عجب گہرائیوں کا حامل ہو گیا کہ جسے سن کر قبر پر ہاتھوں کی پشت ٹکاتے ہوئے وہ بے ساختہ اٹھی اور تین سے چار قدم بڑھ کر اس کے مقابل جا رکی۔اس کا اداس تر چہرہ اس کی عمیق تر نگاہوں کے حصار میں تھا۔

"اچھا۔۔۔کہاں "جلتے" ہو بھئی کہ کسی کو خبر بھی نہیں؟"

یہ پوچھتے ہوئے اس کا لب ولہجہ و انداز بھی کچھ اکسانے کا سا تھا۔یقیناً وہ اسے مزید بولنے دینا چاہتی تھی۔ اس کے سوال پر اس نے ایک بار ان دونوں سے بے نیاز ہو کر دور خالہ کنیز کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑی رضیہ بیگم کو دیکھا اور پھر اس کی بے تاب و بے سکون نگاہ نے اس پل قبرستان میں مختلف قبروں پر جابجا جلتے، مدھم مدھم لو دیتے دیوں کا باری باری طواف کیا۔

"سرمئی تاریکیوں میں من مندر کی دہلیز کے اس پار، دیّوں کی لو بجھنے لگے تو "میں" جلتا ہوں۔"

ہر طرف نگاہ پھیرانے کے بعد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ یوں حرف حرف پھونک گیا کہ فقط ایک لحظے کے لیے اس کی روشن تر آنکھیں پڑھتی وہ مڑ مڑ کر دائیں بائیں، یہاں وہاں جلتے ان گنت دیے تاکنے لگی۔ مصطفین کی بے طرح اداسیوں سے خوف کھا کر اسے لگا کہ ان دیوں کی مدھم ہوتی اک ایک لو کے ساتھ اس کا دل بھی جلنے لگا ہے۔ساکت ہوئی کھڑی وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔

"خالہ رضیہ کو سلام وآداب کہہ لوں۔پھر میں نکلتا ہوں۔تم اپنا خیال رکھنا۔ہمیشہ۔۔۔ہوں۔۔۔؟"

جواباً اسے بالکل خاموش پایا تو الوداعی لہجے میں یہ کہہ کر اس کی نظروں میں کوئی یقین انڈیلتا وہ رضیہ بیگم کی

طرف جانے کے لیے مڑا۔

"تم کوئی گھر کیوں نہیں بناتے مصطفین؟ اپنا کوئی ٹھکانہ تو رکھو نا کہیں۔۔۔ پلیز۔ کب تلک یوں دھول کی مانند اپنا آپ اڑاؤ گے؟"

بے ساختگی میں ہاتھ بڑھا کر اسے روکنے کی کوشش کرتی ایمان کے منہ سے یہ الفاظ بھی گویا پھسلنے کی طرح ہی نکلے تھے۔ اس کی آواز پر رکتے ہوئے وہ آہستگی سے پلٹا۔

"مجھے میری مرضی کا کوئی گھر نہیں ملتا ایمان۔۔۔ جیسا میں چاہتا ہوں شاید کبھی پا نہ سکوں۔ تو پھر دھول کیا یا خاک کیا اور کیا ہی سنگ ان کے تنہائی۔۔۔؟"

اپنے ازلی و مخصوص یاسیت بھرے انداز میں کہتا وہ اسے بڑا انجان لگا۔ آنچ میں سلگتا کوئی کانچ سا شخص۔۔۔

"تم کیسا گھر چاہتے ہو؟ ایسا کیسے ممکن ہے کہ تم روپے پیسے سے متعلقہ کسی بھی شے کا حصول چاہو اور وہ تمہیں مل نہ سکے؟؟"

وہ ناسمجھی کے عالم میں اس کی خواہش کے درپے ہوئی۔ اس کا دل چاہا اس سے اس بات کی بھرپور جرح کرے۔ جبکہ اس کے سوال پر وہ نرمی سے مسکرا دیا تھا۔ یوں کہ گویا کوئی بوڑھا کسی بچے کی نادانی پر سمجھداری سے مسکراتا ہے۔

"میں گھر بنانا چاہتا ہوں زمین و آسمان کے درمیان کہیں۔۔۔ یا کسی برفاب وادی میں اک خوش رنگ جھیل کے سرسبز کنارے۔ میں گھر بنانا چاہتا ہوں کہیں نیل پروں کے مسکن میں۔۔۔ یا میں گھر بنانا چاہتا ہوں وہ چاند کے اس پار ایمان کہ جہاں تمہاری خواہشوں کے پرندے مجھ سے کہیں پہلے سے فضا میں تیراکیاں بھرتے ہیں۔ پیسے سے ان سب کا حصول کہاں ممکن ہے بھلا؟ خواہشیں قیمت سے ماورا ہوتی ہیں۔"

وہ ہر بار اسے خواہشوں سے رکنے کا درس دینے والا آج اپنی خواہشیں بتا رہا تھا۔۔۔ اور وہ تادیر خواہشوں کے پیچھے بھاگ کر حال ہی میں واپس لوٹی یک ٹک اسے بس دیکھے جا رہی تھی۔ سراب موسم کی زد میں آیا وہ مسلسل بدل "رہا" تھا اور عذاب موسم کی زد میں آئی وہ یکسر بدل "چکی" تھی۔ پھر یوں ہوا کہ ایک ساعت کے

لیے ٹھہر کر خود کو آسمان دکھانے کی خاطر اٹھا اس کا بازو تھام کر نیچے کرتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"میں اب آسمان نہیں تاکتی مصطفین ۔۔۔ میں نے خواہشوں سے دستبردار ہونا سیکھ لیا ہے۔ ہاں لیکن تمہاری بھی کوئی خواہش ہے۔۔۔ یہ جان کر اچھا لگا۔ زمین وآسمان کے مابین کہیں، کوئی برفاب وادی، کسی جھیل کا سرسبز کنارہ، اور اس پر نیل پروں کا مسکن ۔۔۔ سب کا سب ماورائی سا ہے۔ بے حد حسین ودلکش بھی۔ بلاشبہ لاجواب خواہش ہے۔" آخرش اس کا لفظ لفظ دہراتے ہوئے اس کے لب فقط سرسرائے تھے۔ گویا اس ذکر پر وہ خود بھی کہیں کھو سی گئی۔

"زندگی اس مقام پر لے آئے کہ خواہشیں چھوٹ جانے کا بھی دکھ نہ رہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ بہت دکھ بھرا ہے یہ۔" جواباً اتنا کہہ کر اس نے دبیز پلکیں جھپکتے ہوئے دور آسمان کی وسعتیں ناپیں اور پھر ایک طویل سانس بھر کر مزید گویا ہوا۔

"تمہاری خواہشوں سے نکل کر آسمان بھی وسیع ہو گیا ہے جیسے۔ تمہاری حد میں رہ کر تو بڑا محدود لگتا تھا۔ خیر......میں خالہ سے مل لوں۔ وہ منتظر بھی ہیں شاید۔"

خاص تر لہجے میں بات مکمل کرتا اس کے جواباً کچھ بھی کہنے سے پیشتر وہ رضیہ بیگم کی جانب چلا بھی گیا تو وہ اس کے گذرنے سے سرسراتی ہوا میں سانس بھر کر رہ گئی۔

وقت کتنا عجیب ہوتا ہے کہ ہمیں کچھ خاص اور عزیز تر لوگوں پر بڑے محدود اختیارات دیتا ہے۔ مصطفین اسے اپنی امی جان کی نشانی لگتا تھا لیکن سارے واسطوں اور پورے جذبوں سے ماوراو بالاتر ہو کر وہ اس سے بہت دور جا رہا تھا۔ اور وہ تھی کہ چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکتی تھی۔

کوئی ہم سے وابستہ اپنے تمام تر جذبے اور شدتیں واپس مانگ لے تو اس واپسی کی وجہ نہیں پوچھی جاتی۔۔۔ چپ چاپ لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے دور جانا ہو وہ ایسی باتوں، سوچوں اور رکاوٹوں سے نہیں تھما کرتے۔

☆......☆......☆

بدلتی رتوں نے مصطفین کا مزاج مزید بدل دیا تھا۔ گذرتے ہوئے تمام تر موسم اسے درد ہی درد، دکھ ہی دکھ دیتے ہوئے گذرے۔ خالہ کنیز کے گذر جانے کا دکھ، ان کا گھر چھوٹ جانے کا دکھ، ان کی یادوں میں جینے کا دکھ، اس کے علاوہ اور اس سے "سوا" ثومیہ شاہجہان سے بے پناہ محبت لیکن اظہار واقرار نہ کر پانے کا دکھ۔۔۔ اس کی زندگی سہل تو پہلے بھی نہ تھی مگر اب اداسیوں کا گھر ہو گئی تھی۔ وہ بڑا محدود رہنے لگا تھا۔ صرف اپنے آپ میں۔۔۔ فقط خود کی ذات میں۔

خالہ کیا گئیں اس کے جینے کا ڈھنگ ہی بدل گیا۔ ہاں۔۔۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جہاں میں جو سنگ نہیں ہوں اگر تو ہمیں جینا نہیں آتا۔ بعد ان کے اندر ہی اندر۔۔۔ ہم روتے تو رہتے ہیں مگر ہنسنا نہیں آتا۔

اس کا بھی گویا پورا جہاں بدل گیا۔ اپنے ہاسٹل میں کمرے کی کھڑکی سے لگا وہ گھنٹوں بے مقصد کھڑا رہتا۔ مکانات کی اونچی دیواریں اور بلند تر چھتوں کو گھورتا وہ انہی کی سی سختی و سنگینی اپنے دل پر بھی طاری کرنے کی خواہش کرتا۔

کرے خدا کہ کسی کی زیست میں ایسا مقام کبھی نہیں آئے کہ وہ پتھر ہو جانے کی آرزو کرے۔ ہاں وہ پتھر ہو جانا چاہتا تھا۔

یونیورسٹی میں سفیر اور ثومیہ کے مابین بالترتیب چلتی اعترافِ محبت اور تردیدِ محبت کی کشمکش سے بھی وہ بخوبی واقف تھا۔ سفیر ہر بار دل شکستہ ہو کر اسی سے راز دل کہتا اور وہ ہر بار اسے جواباً تسلی دے کر اذیت و کرب کی تمام تر حدیں اپنے دل پر جھیلتے ہوئے دل کو بوجھل کرتا رہتا۔ اہلِ دل جانتے ہیں کہ یوں "محبت" کو صرف "دوستی" میں جانے دینا۔۔۔ بڑا دشوار ہوتا ہے۔

ثومیہ کے لیے سفیر کی لگن و لگاوٹ سے بے چین ہو کر اس نے بارہا چاہا کہ ثومیہ کو اس موضوع پر سمجھائے کہ سفیر کے اظہارِ محبت پر وہ سنجیدگی سے غور کرے لیکن پھر اس لیے چپ ہو جاتا کہ جب اس نے خود سے کبھی اسے سفیر کے اظہار و اقرار کے متعلق نہیں بتایا تو وہ کیونکر خود سے بات شروع کرے؟ شاید وہ اس سے یہ بات چھپانا چاہتی تھی۔ یا شاید وہ کسی مناسب وقت پر اس سے اس کے متعلق رائے مانگ بھی لیتی۔ بہر حال۔۔۔ وہ منتظر تھا کہ ایسا ہوگا کبھی؟ ہوگا بھی یا نہیں ہوگا؟ یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

ادھر ثومیہ اور مریم اس کی ذات میں در آیا یہ غیر محسوس سا تبدل بخوبی محسوس کرتی تھیں۔ وہ کہیں بھی بیٹھے بیٹھے کہیں کھو سا جاتا تو ان دونوں میں سے کوئی ایک اسے ٹوک دیتی۔

" کہاں گم رہتے ہو مصطفین؟ ہم میں ہو کر بھی تم ہم میں نہیں ہوتے۔۔۔"

ایک دن لائبریری کے پچھلی سیڑھیوں پر جو کہ عموماً ویران ہی رہتی تھیں ثومیہ نے اسے گم سم پایا تو آہستگی سے اس کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ وہ جو کب سے پچھلے صحن میں اونچے درختوں کی جھکی ٹہنیوں، ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں جمع شدہ کاٹھ کباڑ اور اس پر جا بجا لڑھکتے ہوئے زرد پتوں کو گھور رہا تھا اس کی آمد پر بالکل نہیں چونکا۔ گویا وہ پہلے سے اس کے ساتھ ہی ہو کہیں۔

" میں تو خود میں ہو کر بھی جانے خود میں ہوں کہ نہیں؟؟ تم سب میں اب کہاں ہوں گا؟؟"

گردن موڑ کر اس نے غمزدہ نظروں سے اس کی لانبی پلکیں تاکیں اور پھر اس کی آنکھوں کے لال ڈوروں سے مزید بے قرار ہوا۔

" تم سوئی نہیں ہو کیا رات بھر؟ تمہاری آنکھیں لال کیوں ہیں؟"

سارے خیال بھول کر یکا یک ہی وہ اس کی آنکھوں کی فکر میں لگ گیا تو ثومیہ ہولے سے مسکرائی۔

" ہائے وہ میری نیند سے نہ غافل ہونے والا شخص۔۔۔ مجھے کس قدر عزیز تھا۔۔۔ میں بتا بھی اسے نہیں سکا۔"

جواباً اس نے جو سوچا وہ کسی نظم کا ٹکڑا تھا جو اس کا حال دل کہتا۔ لیکن اس نے اس مصرعہ کو فقط سوچا تھا۔ کہا کچھ بھی نہیں اور نگاہیں پھیر لیں۔

" تم نے بتایا نہیں کہ آنکھیں کیوں لال ہیں؟"

اسے رخ بدلتے دیکھ کر وہ مصر ہوا تو اس نے وہی لال آنکھیں اس پر واپس ٹکا لیں۔

" بس ان میں بھی کہیں کا لہو اترا ہے۔ اور بتایا تو تم نے بھی نہیں کہ ہر پل کس جہاں میں رہتے ہو؟ خود میں کیوں نہیں ہوتے؟ کیا کسی درد میں بستے ہو؟"

حرف حرف پھونکتی وہ پاؤں پاؤں اس کے دل میں اترنے لگی تو بغور اسے دیکھتا ایک خاص ردھم سے اپنی

جگہ سے اٹھ کر وہ اس کے سامنے سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔

" آنکھوں میں کہیں کا لہو اترے تو دل پورا نہیں رہتا۔ کہ دل بنجران ہوتا ہے تو ہی ایسے " نیر " اترتے ہیں۔ مجھے بتاؤ ثومیہ کیا بات ہے؟ تم پریشان ہو کیا؟"

اور سحر زدہ سی ہو کر اسے اپنے پیروں کے پاس بیٹھا دیکھتی وہ خود کو کوئی دیوی خیال کرنے لگی کہ جس کا " داس " اس کی فکر میں بے پناہ گھل رہا ہے۔

" درد کو اگر منفرد لفظوں اور چاشن گر لہجوں میں ڈھال کر پیش کیا جائے تو درد میٹھا ہو جاتا ہے۔۔۔ اور تمہارا لب و لہجہ اس ہنر میں طاق ہے مصطفین۔ تم درد کو میٹھا کر جانتے ہو۔ تم اپنا آپ چھپا جانتے ہو۔" اس کی سوالیہ نظروں میں جھانکتی وہ کسی قدر اداسی سے بولی تو اسے موضوع سے ہٹتے دیکھ کر وہ گفتگو میں الجھنے لگا۔

" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی منفرد سے لفظ یا کوئی بھی چاشن گر لہجہ۔۔۔ درد کو ڈھانپ نہیں سکتا۔ کوئی درد ان سب پہلوؤں سے سوا و بالا ہوتا ہے ثومیہ۔"

یہاں ٹھہر کر اس نے ایک سانس بھرا اور مزید بولا۔

" بہر حال۔۔۔ کسی روز اپنے ہی حرفوں میں کھو کر کہیں یوں اوجھل ہونے کی خواہش ہے کہ لفظوں کی ہر ہر حد سے بھی ماورا سا ہو جاؤں۔"

نہایت ساکن لہجے میں اس نے بات مکمل کی تو بغور اسے تاکتی وہ پتھر کی ہونے لگی۔ اس کے غم کی ہر شدت کو اس نے اپنے دل پر محسوس کیا۔

" میں جانتی ہوں کہ کئی پہلوؤں سے تم انتہائی دل شکستہ رہتے ہو۔۔۔ مجھے خبر ہے کہ تمہارا من ٹوٹا ہوا سا ہے۔ دل چھوٹا نہیں کرو مصطفین سنبھالو خود کو۔ میں بس یہی کہوں گی کہ اداسیوں کے تمام تر موسم بھی اس قدر حاوی نہیں ہونے چاہئیں کہ کسی کے لبوں کی ہنسی ہی چھین لیں۔ ہنستے رہا کرو دوست۔۔۔ اچھے لگتے ہو۔"

وہ بولی تو گلو گیر لہجے میں بس بولتی ہی چلی گئی۔ اور بے انت جذبوں کی لپیٹ میں آیا وہ بلکنے لگا تو بس بلکتا ہی چلا گیا۔

دل چھوٹا نہ بھی کریں تو ٹوٹ کے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہاں سنبھالیں، کتنا رکھیں، آخر کدھر کو جوڑیں ہم؟؟؟

دوبدو لہجے میں وہ اسی تڑپ سے بولا تو وہ سچ مچ پتھر ہوگئی۔ زخم زخم لہجے میں وہ جانے کیسے کیسے درد بیان کر رہا تھا؟ وہ اسے تاک رہی تھی مسلسل اور وہ بس اسی کو دیکھتا تھا۔ وہ اس کے درد سمیٹ لینا چاہتی تھی اور وہ اس کی فکریں مانگ لینا چاہتا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور۔۔۔ دونوں بہت تھے۔ اب اس سے قبل کہ حساس تر جذبوں پر مشتمل ان کی یہ گفتگو کسی بھی نہج سے مزید آگے بڑھتی ہر بار کی طرح ان کے درمیان "کوئی" حائل ہوگیا۔

"تم دونوں یہاں بیٹھے گپیں ہانک رہے ہو اور وہاں بھوک سے پاگل ہوا سفیر صحن کی گھاس تک نوچ کھانے کو تیار ہے۔ آؤ چلیں۔۔۔ میں اسے کینٹین میں چھوڑ کر تم دونوں کو تلاشنے آئی ہوں۔"

کاندھے پر ایک طرف لٹکتا بیگ سنبھالتی، اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتی ہوئی ان کی طرف آتی یہ مریم تھی جو مسلسل ہنستی ہوئی انہیں سفیر کی حالت و کیفیت سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس کی آمد کی بدولت گفتگو کے ادھورا چھوٹ جانے پر ان دونوں نے عجب تشنگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ایک تو یہ بھوک کا بہت کچا ہے۔ گجنی ہو جاتا ہے بھوک میں تو۔ سب کو کاٹ کھانے کو دوڑے گا۔ ویسے تمہیں کیسے پتا چلا بھئی کہ ہم یہاں ہوں گے؟"

وہ بالکل قریب آن رکی تو جواباً خوشدلی سے کہتے مصطفین نے ثومیہ کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہاہاہا۔ گجنی۔۔۔ ارے یہ تو سچ کہا واقعی۔ اور میں کہوں یا نہیں لیکن مجھے بھرپور علم ہے کہ تم تینوں کی کہانی میں کون کہاں رہتا ہے؟"

تائید کرتے ہوئے اس نے بتدریج گہرا لہجہ اپنایا تو ان دونوں کے مسکراتے لب یکا یک سمٹ گئے۔

"پریشان مت ہو بھئی۔۔۔ میرا مطلب تھا مجھے پتا ہے کہ تم سب میں سے ہر ایک کب اور کہاں ہوتا ہے۔ اکثر تمہیں اس طرف آتے دیکھتی ہوں لیکن کبھی پیچھے نہیں آئی۔"

انہیں سنجیدگی اختیار کرتے دیکھ کر وہ یک لخت مصطفین سے مخاطب ہوئی تو کچھ بھی کہے بنا فقط اثبات میں سر ہلا کر وہ ایک ایک سیڑھی اترتا اسے واپسی کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے ہمراہ ہوگیا۔

"زندگی کتنی مشکل ہے اس کے لیے۔۔۔ بھلا یہ کس طرح جیتا ہوگا کسی بھی اپنے کے بنا۔ حق ہاہ۔۔۔ واہ مالک۔۔۔ شاناں تیریاں۔ تیری رمزیں تو ہی جانے۔"

واپسی پر کچے صحن میں مصطفین کے قدموں کے نشانات پر پاؤں دھرتی وہ اس کی پشت کو تاکتے ہوئے سوچنے لگی اور پھر چہرہ اٹھا کر آسمان کی ہر وسعت سے خدا کو مخاطب کیا۔

وہ دن بدن اس کے غم میں گھلنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی، وقت کہیں ٹھہرتا یا رکتا نہیں ہے۔ زندگی بھر ایسے جملے ہماری سماعت میں گونجتے رہتے ہیں۔ بارہا ہمیں یہی سب سننا پڑتا ہے۔ ساعتیں لمحات میں ڈھلتی ہیں، یہ لمحے گھنٹوں سے دنوں کی صورت اختیار کرتے ہیں اور پھر مہینوں میں بدل کر سالوں پہ محیط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی کون و مکاں میں کچھ بھی ہو رہا ہو۔۔ وقت ہر ذرہ وکل سے بے نیاز ہو کر بہر طور سرکتا رہتا ہے۔ ہاں بس یہ کہ اپنی زیست میں مست و خراماں ہوا پھرتا کوئی بھی شخص وفرد پل پل، ہر پل گذرتے اس وقت پر دھیان نہیں دے پاتا، توجہ مرکوز نہیں کرتا۔

ان سب کی کہانی بھی لمحات کے زر ملیے رتھ پر رہ کر کہیں دور نکل آئی تھی۔

پہلے فوٹوشوٹ کے بعد سفیر کو ماڈلنگ کی کئی آفرز ہوئیں جن میں سے ابتدائی چند ایک کو اس نے سائن کیا لیکن رہتی تمام کو یہ کہتے ہوئے رد کرتا رہا کہ میری تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔ فوٹوگرافر علی مصطفی کے صد اصرار کرنے پر بصد احترام اس نے معذرت کر لی کہ میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد ماڈلنگ جاری رکھ سکوں گا اس سے قبل نہیں۔ بہر حال دن گذرتے رہے اور وہ وقتاً فوقتاً اس سے رابطے میں رہا تا کہ وہ بھول نہ سکے کہ ایک اہم تر مستقبل اس کا منتظر ہے۔ ادھر ڈگری کے تمام سالوں میں وہ اسی یورش سے ثومیہ کے اردگرد منڈلاتا اظہارِ الفت کرتا رہا اور جواباً وہ اسی شدت سے اس کی ہر لگاوٹ کو مسلسل رد کرتی رہی۔ وہ محبت پر مصر رہا تو وہ فقط دوستی پر بضد رہی۔ وہ پیار الاپتا رہا تو وہ صرف عقیدت کہتی رہی۔ اس کے اپنے سر تھے اگر تو وہ اپنا راگ بجاتی تھی۔ وہ اپنی دھن بکھیرتا تھا تو وہ اپنے ساز میں رہتی تھی۔

مصطفین ان دونوں کی مابین چلتی "التفات ورد وگریز" کی اس کشمکش سے بھرپور واقف تھا لیکن اس نے کبھی اس میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ سفیر اپنے دل کی ہر بات اسی سے کرتا رہا اور وہ اسے ہمت جمع رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے مسلسل اپنا بھی دل تھپکتا رہا۔ ثومیہ سے محبت ہونے کے باوجود وہ سفیر کی خاطر اس

سے اس جذبے کا اظہار کرنے سے قاصر تھا اور وہ تھی کہ سفیر کی محبت سے بھی نالاں و خائف رہتی تھی۔ادھر مریم کی صورتحال یہ تھی کہ وہ ان تینوں کے مابین چلتی اس ساری کشمکش کا اک ایک پہلو بخوبی جانتی تھی۔ایک دوسرے کے لیے ان تینوں کے جذبات و محسوسات روز اول سے اس کے مشاہدات میں شامل تھے۔ان کی باہم گہری ترین دوستی اور اس کی نوعیت کا ادراک رکھتے ہوئے وہ سمجھتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ قصہ خوش اسلوبی سے پار لگ جائے گا۔قصہ المختصر۔۔۔باہمی مزاج آشنائی کے ہر موسم کو کاٹ کر ان کی کہانی بھی رفتہ رفتہ "انجام" چھونے لگی۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب آخری سیمسٹر کے حتمی پرچے شروع ہوئے۔یونیورسٹی میں لائبریری، راہداری، کینٹین، ڈیپارٹمنٹ کا وسیع و عریض احاطہ الغرض تمام مقامات پر طلبا و طالبات کتابیں اور نوٹس تھامے سر جھکائے فقط پڑھتے ہوئے نظر آنے لگے۔ان میں سے ہر ایک باقیوں سے آگے بڑھنا چاہتا تھا یعنی نتائج میں دوسروں پر بازی لے جانا چاہتا تھا۔سب کے ساتھ ساتھ ان کا گروپ بھی ارد گرد موجودات سے بے نیاز ہو کر دھڑا دھڑ بس تیاریوں میں جت گیا۔

اس دن ان کا آخری سے پہلا پرچہ تھا کہ صبح سویرے حسب سابق پوری دل جمعی سے تیار ہو کر سفیر اپنا یونیورسٹی بیگ تھامے ہوئے کمرے سے نکلا اور ایک خاص ردھم سے زینے اتر کر لاؤنج کے دروازے کی جانب بڑھا۔

"خدا حافظ ماما۔۔۔میں یونیورسٹی کے لیے نکل رہا ہوں بس۔"

لاؤنج کے دروازے کا ہینڈل تھام کر کھولنے سے قبل اس نے باورچی خانے کی جانب منہ کر کے صدا لگائی اور باہر نکلنے کے ارادے سے دروازہ وا شگاف کیا۔

"دو منٹ رکو تو جاناں۔کچھ کھاتے ہوئے جاؤ۔ناشتہ تیار ہے بالکل۔۔۔"

ذکیہ خاتون کسی بوتل کے جن کی مانند ہاتھوں میں توے پر روٹی پلٹنے والا چمٹا لیے باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوئیں اور اسے پکارا۔

"نہیں ماما۔ذرہ بھر بھوک نہیں ہے مجھے۔ایک نوالہ تک نہیں لے پاؤں گا۔بس خدا حافظ۔"

جاتے جاتے رک کر اسی عجلت سے کہتا وہ چلا بھی گیا تو پلٹ کر چمٹا چولہے پر رکھتی وہ تیز تیز قدموں سے چلتی اس کے پیچھے نکل آئیں۔ وہ تب تک بائیک صحن سے گذار کر گھر کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"اچھا سنو تو۔۔۔ایک اور بھی اہم اور ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"

وہ جانتی تھیں کہ یوں بار بار روکنے پر وہ چڑ جاتا ہے لہٰذا اب کی بار قدرے لجاجت سے بولیں۔

"اُفف۔۔۔اہم اور ضروری بات کرنے کے لیے یہ کون سا وقت ہے ماما؟ مجھے دیر ہو رہی ہے۔خیر۔۔۔ بتائیں اب لیکن پلیز جلدی ذرا۔"

حسبِ توقع جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہتا وہ بمشکل رکا۔

"بھئی میرے ذہن میں تو کئی مہینوں سے ہے یہ بات۔۔۔بس تمہارے بابا نے روک رکھا تھا کہ جب تک تم خود نہ کہو ہم ذکر نہیں کریں گے۔"

ان کے رازدان لہجے پر وہ متجسس نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"اچھا۔۔۔ایسی کون سی بات ہے بھئی؟؟"

خوبصورت آنکھوں میں یکا یک کوئی شہد سا گھولتا وہ بھرپور شوق سے گویا ہوا۔

"تمہارے بابا ابھی ناشتے پر کہہ رہے تھے کہ آج والا پیپر دے کر پیچھے صرف ایک پیپر بچے گا تمہارا۔۔۔پھر یونیورسٹی جانا اول تو بند ہو گا یا پھر کبھی کسی کام سے ہی جاؤ گے۔"

تمہیدی لہجہ و انداز میں کہتی وہ یہاں تک ہی پہنچی تھیں کہ بے تابی سے وہ پھر سے بول اٹھا۔

"یہ سب میں جانتا ہوں ماما۔۔۔آپ بات کریں نا جو کہنے کے لیے روکا ہے۔کبھی کبھی آپ بھی مریم بن جاتی ہیں۔وہ بھی یہ لمبی لمبی تمہیدیں باندھتی ہے بات سے پہلے۔"

بات اچکنے کے باوجود اس کا لہجہ مودب تھا اور یہ ان دونوں ماں بیٹے کا باہمی تعلق تھا کہ جس میں اتنی چھوٹ بہرحال اسے ہمیشہ سے ملتی رہی تھی کہ وہ آزادی سے اپنی بات کہہ سکے۔

"اوہو چپ کرو۔اسی طرف آ رہی ہوں۔تمہارے بابا کا کہنا ہے کہ اب ہمیں جلد از جلد ثومیہ سے ملواؤ۔اور اس جلد از جلد کا مطلب "بس آج کل میں" ہے۔بھئی دیکھنا چاہتے ہیں ہم اسے۔۔۔کب سے جاننا چاہتے

ہیں کہ جسے ہمارے بیٹے نے پسند کیا ہے وہ کیسی ہے؟ تاکہ مزید اس کے گھر والوں سے رشتے کی بات کر سکیں۔ تو کب لا رہے ہو پھر اسے گھر اپنے ساتھ؟ ہم تیار رہیں پھر۔۔۔ ہاں؟؟"

اسے ڈپٹ کر چپ کروانے کے بعد انہوں نے بتدریج ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات مکمل کی تو والہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے وہ بے طرح سرشار ہوا۔ پھر یوں ہوا کہ ثومیہ کے گریزاں انداز کو سوچتے ہوئے اس کے چہکتے لب یکبارگی سمٹ سے گئے۔

"جی بہتر ماما۔۔۔ میں بات کروں گا اس سے۔"

فقط اتنا کہہ کر اس نے ہونٹ سکیڑے تو بغور اسے دیکھتی وہ چونک گئیں۔

"کیا بات ہے سفیر۔۔۔ تم یوں ایک دم سنجیدہ کیوں ہو گئے ہو؟ کیا تم اب تک اسے اپنے جذبوں کا یقین نہیں دلا سکے؟؟"

بائیک کے ہینڈل پر جمے اس کے سرد ہاتھ پر اپنا ہاتھ ٹکاتے ہوئے انہوں نے فکرمندی سے پوچھا تو اپنے خیال جھٹکتا وہ فوراً سے پیشتر حال میں لوٹ آیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ماما۔ مصروفیت اتنی رہی ہے کہ دورانِ تعلیم ہم کبھی بہت زیادہ کھل کر اس پر بات نہیں کر سکے۔ بہرحال تفصیلات پھر کبھی۔۔۔ فی الوقت یہ کہ میں آج اسے ساتھ نہیں لا سکا تو کل چونکہ چھٹی ہے ہمیں تو آپ کو اس کے گھر لے جاؤں گا۔ وہاں آپ بھی مل لیجیئے گا اسے اور باقی بات بھی خود ہی کر لیجیئے گا اس سے۔ اوکے؟؟ اب خدا حافظ۔"

متوازن لہجے میں کہتا وہ بائیک آگے بڑھا لے گیا تو اس کے ہاتھ پر دھرا اپنا ہاتھ ہٹاتی وہ اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئیں۔ اس کے انداز سے انہیں کسی گڑبڑی کا گمان ہوا۔

گھر سے نکل کر وہ ثومیہ سے حتمی بات کرنے کا عزم کرتا ہوا، خوش کن لیکن قدرے الجھے خیالات کو باہم جوڑتا، سلجھاتا شاداں سا یونیورسٹی پہنچ گیا۔ وہ دونوں اور مریم بھی اس سے پہلے کلاس میں موجود تھے۔ اس کی ان سے علیک سلیک میں ہی وقت پورا ہوا اور پرچہ شروع ہو گیا۔ سب کے سب نہایت خاموشی سے سر جھکائے دھنا دھن پرچہ حل کرنے لگے جبکہ وہ اس دوران بھی بار بار خود سے تین نشستوں کی دوری پر دوسری قطار میں بیٹھی ثومیہ

شاہجہان کو تا کتا رہا۔شاید یونیورسٹی کا دور جلد ختم ہو جانے کا خیال تھا یا شاید کوئی اور وجہ کہ آج وہ اسے پہلے کی نسبت زیادہ اچھی اور پیاری لگ رہی تھی۔ ہر بار اسے دیکھتے ہوئے اس کے شنگرفی لبوں پر کوئی دھنک رنگ سی مسکان طاری ہوتی رہی۔اس کی فدا کن نظروں کے ارتکاز کا ادراک پا کر اس نے ایک دو بار سر اٹھا کر پہلے اسے دیکھا، پھر گھورا اور پھر اشارے سے اپنے پرچے پر نگاہ ٹکانے کا کہہ کر واپس اپنا پرچہ حل کرنے میں مگن ہو گئی۔

خیر۔۔۔اس کی بھی بھرپور تیاری تھی سو جلد از جلد پرچہ مکمل کر کے "جوابی کاپی" ڈائس پر کھڑے سر کو جمع کرواتا وہ کلاس روم سے نکل آیا اور راہداری میں یہاں سے وہاں ایک چھوٹے سے خط میں ٹہلتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کے اور خصوصاً ثومیہ کے فراغت پانے کا منتظر ہو گیا۔

"یہ آ کیوں نہیں رہی یار؟ اتنا آسان سا پیپر تھا۔اتنی دیر لگا دی ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد کلائی پر بندھی گھڑی سے وقت دیکھتا وہ بڑبڑانے لگا تھا۔

"مصطفین اور مریم بھی نہیں آئے اب تک۔کوئی ایک تو آتا بھلا۔سارے ہی بیٹھ رہے ہیں۔ افففف۔۔۔مجھے لگتا ہے میں قنوطی ہو رہا ہوں۔"

قدرے چڑ کر باقی دونوں کو بھی دل ہی دل میں سخت سنا تا وہ اپنی قنوطیت کا احساس کر کے فوراً سے پیشتر خود کو بھی ڈپٹنے لگا تو آس پاس سرسراتی ہواؤں نے اس کی بے تابی چرا کر طویل راہداری کے بلند و بالا بام و در پر جا بجا پھونک دی۔سب کچھ جھٹک کر وہ اپنی دائیں سمت بڑھا اور سات سے آٹھ قدم بھر کر ایک کھڑکی سے لگتا سرسبز احاطے میں جھانکنے لگا۔سبزے کے اردگرد ٹف ٹائلز کا فرش، بیگ تھامے ہوئے دور ونزدیک جاتے آتے طلبا، کتابیں سینے سے لگائے چلتی رنگین آنچلوں والی طالبات، اور فضا میں اڑتے بادلوں کی ٹکڑیاں۔۔۔سارا منظر عمومی سا تھا۔وقت گذاری کے لیے تا دیر وہ سب کو باری باری تا کتا رہا۔

"یہ فریضہ تم کسی اور وقت بھی انجام دے سکتے تھے۔۔۔کچھ لکھا بھی ہے پیپر میں یا صرف مجھے ہی دیکھتے رہے ہو؟"

نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کیا گیا یہ ثومیہ کا طنز تھا جس پر وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور اسے فقط چار قدم دور خود کو گھورتے پا کر پورے جذب سے مسکرایا۔

"ارے۔۔۔آ گئیں تم۔ واہ۔۔۔اور وہ کیا ہے ناں کہ وقت کی مٹھی میں بہت تھوڑے سے پل بچے ہیں اب کہ جو ہم سنگ بتا سکیں گے۔ اور وہ بھی صحرائی ریت کی مانند ذرہ ذرہ، ساعت ساعت پھسل رہے ہیں بس۔۔۔سوچا ان سب کے سرکنے سے قبل تمہیں جی بھر کر دیکھ ہی لوں۔ شاید کہ پھر کہیں ملاقات ہونا ہو۔ ہوں؟"

شائستگی سے اس کی آئینہ تر آنکھوں میں جھانکتا وہ اپنے عکوس کھوجنے کی کوشش کرتا ہوا بولا تو اس کی شدتوں سے گھبرا کر وہ آنکھیں جھکا گئی۔ وہ اک مدت سے یہی کرتی آئی تھی یا شاید اس نے صدیوں یہی کیا تھا۔ اس کے دل میں لمحات و اوقات کا حساب چھوٹنے لگا تھا یا شاید گڑبڑا گیا تھا۔

"بس اب بس کرو سفیر۔ ان سب اذکار کو یہیں تمام ہونے دو۔ مجھے فخر ہے ان سالوں پر جو میں نے تمہارے ساتھ تمہاری دوستی میں بتائے ہیں۔ مجھے غرور ہے اس پر کہ اس میں کوئی شرمسار لمحہ تک نہیں شامل۔"

کچھ توقف سے سر اٹھا کر وہ بولی تو اس کا لہجہ بدل سا گیا۔

ڈھارسی، تقویتی، تشفی آمیز اور۔۔۔سب کچھ بھول جانے، یا پھر جانے دینے کا سا لہجہ۔

ایک لحظے کو چپ رہ کر وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"ایسے کیسے تمام کر دوں بھئی؟ یہ ذکر کوئی "قصہ" تو نہیں۔ اس میں شامل تم اور میں۔۔۔سب کا سب حقیقت ہے۔"

تین قدم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بھرپور معنی خیزی سے بولا تو بے ساختگی میں اپنا ہاتھ چھڑواتی وہ کسی قدر ڈر سی گئی۔

"سفیر پلیز۔۔۔دھیان سے میری بات سنو۔ صرف پرسوں کا پیپر باقی ہے اور اس کے بعد شاید ہم کبھی نہ ملیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تم ایک اچھے لڑکے ہو جس کی شکل وصورت اور پھر اخلاق و کردار سے کوئی بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ تمہارا دل یعنی تمہارا باطن تمہارے ظاہر کی طرح بالکل خالص، شفاف اور خوبصورت ہے۔ تمہیں مجھ سے کہیں بہتر، کہیں اچھی لڑکی ملے گی۔ لیکن ہم دونوں کا تعلق، رشتہ یا واسطہ۔۔۔صرف اس دوستی تک کا ہے اور اس دوستی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا سفیر۔ خدارا یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے تم سے محبت ہے لیکن ایسی

نہیں ہرگز۔۔۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں لیکن ویسا نہیں بالکل۔ دوست ہیں ہم اور صرف دوست ہی ہیں۔ "سوا" اس کے کچھ بھی نہیں۔۔۔ "بعد" اس کے کچھ بھی نہیں۔"

دوٹوک انداز میں کہتے ہوئے آخرش سرکونفی میں ہلا کر اس نے گویا اپنی ہی بات پر اظہارِ تاسف کیا اور پلٹ کر کہیں جانے لگی کہ بغور اس کا حرف حرف سنتے پتھر ہوئے کھڑے سفیر نے اسے کلائی سے دبوچ کر ایک جھٹکے سے اپنے مقابل ٹھہرا لیا۔

"مجھے فقط چند لفظوں کی مٹھاس پر نہیں ٹرخاؤ ثومیہ۔ مجھے اس ردوانکار کی کوئی مضبوط وجہ دے دو۔ میں دوبارہ تمہارے سامنے بھی نہیں آؤں گا۔"

جارحانہ انداز میں اسے روکنے کے برعکس جلتی ہوئی نظروں سے اس کی سہمی آنکھیں پڑھتا وہ التجائیں سی کرنے لگا تو اس کی مضبوط گرفت جھٹک کر اپنی کلائی چھڑوانے کی کوشش کرتی وہ روہانسی ہوگئی۔

"میرا بازو چھوڑو یار۔۔۔ پاگل ہوئے ہو کیا؟ دنیا کو تماشے مت دکھاؤ خدارا۔ محبت کی ہے ناں۔۔۔؟؟ تو اس پر صبر بھی کرنا سیکھو۔ ہاں سفیر۔۔۔ محبت صرف محبت نہیں ہوتی۔۔۔ محبت مرگ ہوتی ہے۔"

بات مکمل کرتے ہی اس کی آنکھیں چھلک گئیں تو اس نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی پر سے گرفت ہٹالی۔ بازو چھڑوانے کی کوشش میں دونوں کاندھوں پر دائیں بائیں جھولتی اس کی گھنی زلفوں پر اسے کسی جوگن کے بکھرے ہوئے بالوں کا سا گمان ہوا۔

"محبت مرگ ہوتی ہے۔۔۔"

تاسف وہمدردی اور التجا کی ملی جلی نگاہ سے اسے دیکھتی وہ واپس پلٹ گئی تو اس کے لب ولہجہ کی بازگشت سے اس کا دل پگھلنے لگا۔ بت بنا کھڑا وہ پھر سے بھاگ کر دور جاتی ثومیہ کے پاس آیا۔

"میری بات تو سنو۔ پلیز یار۔۔۔ رکو ایک بار۔"

اس کی صداؤں پر رکے بنا وہ عام سی لڑکی مسلسل آگے بڑھتی رہی جبکہ آس پاس موجود طلبا وطالبات حیرت و استعجاب سے اس دیوتا سے لڑکے کو اس کے پیچھے بلکتے، خوار ہوتے دیکھتے رہے۔

"میں کل اپنے ماما بابا کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گا۔ وہ تمہیں ملنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں تم سے

ملنے کے بعد وہ ہمارے رشتے کے لیے بھی بات کریں۔"

اس سے دو قدم پیچھے چلتے ہوئے، اس کی ہمراہی میں ہونے کی کوششیں کرتے اس نے جو اگلی بات کہی تو تیزی سے چلتی وہ جیسے کرنٹ کھا کر رکی۔ اس طرح سے کہ اپنی دھن میں بڑھتا وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بمشکل سنبھلا۔

" کیا۔۔۔؟؟؟ دور رہو مجھ سے۔۔۔ اور خدا کے لیے یہ غضب نہ کرنا سفیر۔ گھر میں میرا سارا وقار جاتا رہے گا۔"

اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ دے کر اسے خود سے پرے دھکیلتی وہ بھرپور قطعیت سے بولی تو وہ اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ کبھی کبھی اس کے شدید ردعمل سے اسے بڑی تکلیف ملتی تھی۔

" لیکن کیوں یار۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟"

کچھ توقف سے وہ جرح کے سے انداز میں بولا تو بے بسی سے اسے دیکھتی وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔ اردگرد تماشائی بنے گزرتے طلبا کو دیکھ کر وہ اس سے بحث کو طول نہیں دینا چاہتی تھی۔

"اس میں ایسی کیا بات ہے یا کیا بات نہیں ہے۔۔۔؟؟ فی الوقت میں تم سے اس پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں جا رہی ہوں سفیر، تم مصطفین اور مریم کو بھی بتا دینا کہ میں چلی گئی ہوں۔ اور ہاں۔۔۔ اب میرے پیچھے مت آنا۔ پرسوں ان شاء اللہ ملتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

اپنے لفظوں پر زور دے کر بااعتماد نظروں سے اسے دیکھتی حرف حرف بات مکمل کرتی وہ پلٹ بھی گئی تو وہ اسے چھو کر آتی ہوا سے لپٹ سا گیا۔ ساری باتیں دھری کی دھری رہ گئی ہوں گویا۔ کاندھے پر بیگ سیٹ کرتا اپنے بالوں میں ہاتھ ڈالتا وہ انہیں نوچ کر رہ گیا اور پھر کچھ فاصلے پر راہداری کی سیڑھیاں اترتی ثومیہ کو دیکھتا طویل سانس بھر کر واپس ہولیا۔ وہ اسے سلگنے کی خاطر کچھ پل مزید دان کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

" تم کیوں منہ لٹکائے پھر رہے ہو؟ اور یہ ثومیہ کدھر گئی؟ کلاس سے تو تمہارے پیچھے بڑی عجلت میں نکلی تھی۔"

وہ ثومیہ کے یوں چلے جانے پر راہداری میں یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے بے تحاشا سلگ رہا تھا جب مصطفین کمرہ امتحان سے نکل کر بغور اسے دیکھتا اس کے قریب چلا آیا۔

"آں۔۔۔ہاں یار بس یونہی۔اور وہ گھر واپس چلی گئی ہے۔تمہارا پیپر کیسا ہوا؟"

کسی قدر چونک کر ثومیہ کی بابت کہتے ہوئے وہ گویا بات بدلتا ہوا بولا تو مصطفین نے اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا۔

"پیپر تو اچھا ہو گیا ہے الحمدللہ۔میری اچھی تیاری تھی۔لیکن تم یہ بتاؤ کہ وہ ایک دم کیونکر چلی گئی ہے؟ مجھے یا مریم کو بھی مل کر نہیں گئی؟ خیریت؟"

پرچے سے متعلق اس کے جواب پر مطمئن انداز میں سر ہلاتا وہ اس کی اگلی کھوج پر پھر سے جل اٹھا۔

"پتا نہیں یار کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔میں کبھی سمجھ نہیں سکا اسے۔جیسا کہ پرسوں یونیورسٹی میں ہمارا آخری دن ہے تو میں نے بس اپنی محبت کے لیے اس سے حتمی بات کرنی چاہی تھی۔تم جانتے ہو کہ پہلے وہ نرمی سے ٹال جاتی ہے لیکن ابھی بے طرح چڑ گئی تھی۔سختی سے انکار کر گئی ہے مجھے کہ ایسا نہیں ممکن۔"

تیز لہجے میں یہاں تک کہتے کہتے اچانک وہ رکا اور اپنے شانوں سے اس کا بازو ہٹاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"تم بتاؤ مصطفین کہ ایسا کیوں نہیں ممکن؟ کیا میں کوئی برا شخص ہوں کہ جس کی محبت سے یوں گریزاں ہے وہ کہ باقاعدہ دھتکار رہی ہے؟؟ کیا میں کوئی منفی فرد ہوں کہ جوان محسوسات کا حامل نہیں ہو سکتا؟ بتاؤ یار کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے میرے ساتھ؟"

بات مکمل کر کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر مسلسل اسے ہلاتے ہوئے اس نے گویا اپنے سوالوں پر اصرار کیا تھا۔اس کے یوں بلکنے کے سے انداز پر مصطفین بے ساختہ نظریں پھیر گیا۔وہ کیا کہتا کہ یہی عالم، یہی حالت اور یہی کیفیت اس کی بے قراریوں کی بھی تھی۔

"وہ لڑکی ہے یار۔تمہاری طرح صریح و واشگاف نہیں ہو سکتی۔یوں راہ چلتے اقرار نہیں کر سکتی۔پھر وہ بڑا منفرد سوچتی ہے۔اس کی سوچیں عام لڑکیوں سی نہیں ہیں سفیر۔وہ من مرضی کی مالک ہے۔یقین کرو اب میں بھی

اس پر رائے دینے سے قاصر ہوں کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے تمہارے ساتھ؟ مطلب تمہیں مسلسل انکار کیوں کر رہی ہے؟ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تمہاری شخصیت ہر پہلو سے لاجواب ہے۔ تم اچھا سوچتے ہو، اچھا بولتے ہو اور ہمیشہ مثبت رہتے ہو۔ تم ایک بہترین اور کامل انسان ہو یار۔ مجھے تم میں ایسی کوئی خامی نظر نہیں کہ جسے بنیاد بنا کر وہ تمہیں انکار کر سکے۔"

کچھ توقف سے جو اس نے بولنا شروع کیا تو الجھے الجھے لہجے میں اسے بھرپور تسلی دینے کی کوشش کی۔ جبکہ اپنی شخصیت کے اوصاف کا اعتراف پا کر اس کا حرف حرف سنتے سفیر کا تن من مزید سلگنے لگا۔

"تم مانتے ہو، مریم مانتی ہے اور یہی وہ خود بھی مانتی ہے کہ میں اچھا ہوں یار تو پھر برا کیا ہے؟؟ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گا یار۔ وہ کا ہر انکار مجھے کسی تازیانے کی مانند لگتا ہے۔"

کسی قدر زچ ہوا وہ گویا خود سے بھی چڑ کر بولا تو مصطفین کو اس کی تڑپ پر ترس آنے لگا۔ اس کا دو بدو لہجہ عجب مسافتوں کا غماز تھا کہ جن میں اس نے فقط دربدری کمائی ہو۔ بات مکمل کر کے اس کے مقابل سے ہٹتا وہ کھڑکی سے جا لگا تھا۔ اب اس سے قبل کہ آہستگی سے اس کی پشت پر جا رکتے ہوئے مصطفین جواباً کچھ بھی بولتا پیچھے سے مریم کی آواز سنائی دی۔

"ہو گئے پورے تم دونوں کے باہمی راز و نیاز؟؟ اب میں اندر آ سکتی ہوں؟"

اس کی بات پر وہ دونوں ایک جھٹکے سے مڑے۔ ان سے کچھ قدموں کی دوری پر رکی وہ عمیق تر نظروں سے انہیں باری باری دیکھ رہی تھی۔

"ہاہاہا۔۔۔ پہلے بڑا پوچھ کر آتی ہو تم۔ کہیں بھی گھسنے سے قبل تمہیں کسی کی اجازت درکار ہی کہاں ہوتی ہے؟؟؟ یوں بھی ہم ایسی کوئی خاص بات نہیں کر رہے تھے کہ جو تم سے چھپائی جائے۔ تشریف لاؤ۔ بیٹھو کوئی چائے پانی منگواتا ہوں۔"

اس کی جتاتی ہوئی نظروں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے مصطفین نے ہنس کر کہا تو جواباً وہ بھی ہنس دی۔

"یہ بھی صحیح کہا ویسے۔ میں واقعی پوچھے بنا کر گزرتی ہوں جو کرنا ہو۔ خیر۔۔۔ تفنن برطرف، یہ بتاؤ ثومیہ کدھر ہے؟"

اس کی تائید میں سر ہلاتی، یہاں وہاں دیکھتی وہ ثومیہ کے متعلق پوچھنے لگی تو لب بھینچ کر سفیر نے بے ساختہ مصطفین کی جانب دیکھا۔ جواباً پلکیں جھپکتے ہوئے اسے تسلی سے نوازتا وہ مریم سے مخاطب ہوا۔

"اسے کوئی ضروری کام تھا آج سو وہ جلدی گھر چلی گئی ہے۔ اور آؤ تمہیں بھی تمہارے ہاسٹل تک ڈراپ کر دیتا ہوں۔ مجھے وہیں سے گذرتے ہوئے جانا ہے۔"

سرسری و عام لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس نے باہر کی طرف قدم بڑھانے کا اشارہ کیا تو اس کے اشارے پر قدم بڑھاتی ایک نظر سفیر کو دیکھتی ہوئی وہ کسی قدر اچھنبے سے بولی۔

"اچھا۔۔۔ چلی بھی گئی۔ مل کر تو جاتی بھلا؟ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ خیر آؤ چلیں۔ اور لفٹ دینے کا شکریہ۔"

اور اس کی معیت میں راہداری میں دھیرے دھیرے چل کر باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے ان دونوں نے اب کی بار فقط خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ وہ اتنے میں ٹل رہی تھی یہی بہت تھا۔

"پیپر کیسا ہوا تمہارا؟ ویسے تمہاری ہونقوں شکل سے لگ تو نہیں رہا تھا کہ تمہیں آتا ہوگا پیپر۔"

کچھ توقف سے مصطفین موضوع بدل کر اسے نئے سرے چھیڑ رہا تھا اور اس کی بات پر بے تحاشا کھلکھلاتی وہ کوئی جوابی طنز کر رہی تھی۔ جبکہ ان سے فقط چار قدم پیچھے اپنی سوچوں میں غلطاں و پیچاں سفیر اپنی محبت کے مستقبل کے لیے نئی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ آج رات میں اپنے والدین کو ثومیہ کے گھر بھیجنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

"خدا کے بھگت" کی شوٹنگ چار دن بعد شروع ہونے والی تھی اور اس دوران گیتی لاہور میں رہ کر روز کسی نہ کسی دربار یا درگاہ پر حاضری دے رہی تھی۔ کیونکہ وہ عبایا پہن کر جاتی تھی لہٰذا پہچان لیے جانے کا کوئی ڈر خطر نہیں تھا۔ ناز کو البتہ اس پر شدید تحفظات تھے وہ بارہا اسے یہی سمجھاتی کہ یوں درگاہوں، درباروں پر جانا مناسب نہیں ہے۔

"کسی نے تمہیں پہچان لیا یا میڈیا کو کسی بہانے خبر ہوگئی کہ تم روز کسی دربار پر پائی جاتی ہو تو تمہارے حق میں

اچھا نہیں ہوگا گیت۔ یہ مسلمان لوگ اپنے مزاروں پر کسی ہندو کا وجود برداشت نہیں کرتے۔ میں نے کئی بار ان کے مولویوں سے سنا ہے کہ یہ ہمیں پلید، نجس اور خبیث خیال کرتے ہیں۔ ان کا مذہب اس حوالے سے بہت سخت ہے سہیلی۔ میرے خیال سے تمہیں احتیاط کرنی چاہئیے۔"

ایک روز جب وہ "داتا دربار" سے حاضری کے بعد واپس نکلیں تو ناز نے گاڑی میں بیٹھتے ساتھ ہی سینے میں کب سے اٹکا سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی بات سن کر گاڑی میں ہی عبایا اتارتے ہوئے گیتی نے رش میں آہستہ آہستہ سرکتی گاڑی کی حرکت نوٹ کی اور باہر گذرتے مختلف مناظر سے نگاہ ہٹا کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"محدود طبقہ اور مخصوص لوگ تو مسلمانوں میں بھی آپس میں صرف کفر کے فتوے ہی لگاتے ہیں ناز۔ ان میں بھی سنی شیعہ کا باہمی فرق ازل سے ہے۔ دونوں طرف سے علماء ایک دوسرے کی "اصلیت" کو یقینی نجس اور باطل قرار دیتے ہیں۔ بہرحال کچھ اہلِ دانش موجود ہیں بہر طور جو سمجھتے ہیں کہ کسی کا بھی مذہب اس کی "اصلیت یا حقیقت" نہیں ہوتا۔ انسان کا مثبت یا منفی کردار و اخلاق ہی اس سے تعلقات قائم رکھنے یا نہ رکھنے کی شرائط طے کرتا ہے۔ یوں کسی کا مذہب، دین یا دھرم اگر اس کی خباثت و اصلیت جانا یا سمجھا جائے تو ہم میں سے ہر کوئی دوسرے کے لیے انتہائی خبیث ہی ہے۔ ہمارا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ اتنی محنت ہم خود کو کسی بھی دین پر کاربند رکھنے میں نہیں کرتے، جتنی محنت ہم دوسروں کو اس دائرہ دین سے خارج کرنے پر کرتے ہیں۔"

جواباً اس نے جو بولنا شروع کیا تو نہایت مدلل لہجے میں اپنا عمومی مشاہدہ اور ذاتی سوچ بتاتی چلی گئی۔ اس کے تفصیلی جواب کا حرف حرف سن کر ناز نے فقط ایک پل کی خاموشی اختیار کی اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا کہ اب ان کی گاڑی "میٹرو ٹریک" کے ساتھ ساتھ چلنا چھوڑ کر "مال روڈ" پر مڑ رہی ہے۔ کچھ توقف سے اس کا ہاتھ تھام کر اس نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

"تمہاری سب باتیں بجا اور سچ ہیں گیت۔ میں اتفاق کرتی ہوں کہ کسی سے حقیقی لگاوٹ اس کے مذہبی عقائد سے ہٹ کر ہی ہوتی ہے۔ لیکن بات پھر وہی کہ میرے، تمہارے یا ہم جیسے فقط چند اور لوگوں کے ایسا سوچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ معاشرہ ہمارے افکار سے بالا کوئی شے ہے۔ ہر شخص ایسے خیالات رکھے تو زندگی

سہل نہ جائے سب کی؟ آج پھر لوگ ان پہلوؤں پر اتنے پریشان کیوں ہیں؟ یہ آئے روز مذہب کے نام پر ہونے والی قتل و غارت گری نہیں دیکھتیں کیا تم؟؟ یہ سب انہی خدشات کی عملی شکل ہے جن کے تحت میں تمہیں یوں روز روز ان صوفی درگاہوں پر حاضری سے روکتی ہوں۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو گیت۔ ہر کہیں ضد اچھی نہیں ہوتی۔"

اس کے نرم لہجے میں بلا کی فکریں موجزن تھیں۔ گیتی کا دلکش چہرہ اپنی کانچ آنکھوں میں سجائے وہ گویا اس پر جان وار رہی تھی۔ جواباً اس کی ہر لگاوٹ و محبت کا ادراک رکھتے ہوئے گیت ایک طویل تر سانس بھر کر رہ گئی۔ اس دوران ان کی گاڑی "عجائب گھر" کے عین سامنے واقع اشارے پر آن رکی۔ یہ وہی چوک ہے جہاں انار کلی بازار، این۔سی۔اے یعنی نیشنل کالج آف آرٹس اور پنجاب یونیورسٹی کا "اولڈ کیمپس" واقع ہے۔ یہیں دو طرفہ سڑک عبور کر کے دائیں جانب "جی۔پی۔او" کی عمارت بھی موجود ہے اور ان تمام تر پرشکوہ عمارات و مقامات کی بدولت یہاں اس شاہراہ کا منظر کسی یورپ ملک جیسا شفاف و حسین دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کی صفائی ستھرائی بھی قابلِ دید و داد ہے۔ مال روڈ کے اس حصے میں اطرافی پیدل گذرگاہوں یعنی فٹ پاتھ ٹریکس کی سجاوٹ و آرائش پر ہر دور میں خصوصی توجہ دی گئی ہے جو یہاں کے موجودات سے صاف جھلکتی ہے۔ ایک سرسری نظر طول و عرض میں دوڑا کر گیتی واپس ناز کی جانب متوجہ ہوئی۔

"اچھا چلو میں ہاری ناز۔ تم پریشان نہیں ہو۔ فرصت آئندہ یوں بھی نہیں ملنی اور ملی بھی اگر تو میں اجتناب کروں گی۔ یعنی عوامی و مذہبی مقامات پر یوں بے دھڑک نہیں آیا کروں گی۔ فی الوقت موضوع بدلتے ہیں یار۔ مجھے اب بتاؤ پلیز کہ رفیق سر کا رابطہ ہوا یا نہیں "سفیر احمد" سے؟ اب تو دو تین دن گذر چکے ہیں۔ اب تک تو کئی بار بھی ہو چکا ہوتا رابطہ۔ پھر کیا مسئلہ ہے؟؟"

اس کے ہاتھ پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کمال تر لہجے میں موضوع بدل دیا تو وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ پھر ایک نظر ڈرائیور کو بیک مرر سے پیچھے سڑک پر جھانکتے دیکھ کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

" کل اس موضوع پر بھی میری رفیق صاحب سے سرسری سی بات ہوئی تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ وقتی گرم جوشی دکھانے کے باوجود اس اسٹوڈیو کی طرف سے بعد میں کوئی خاص رسپانس نہیں آیا۔ وہ لڑکا شاید فلم میں کام کرنے

میں دلچسپی نہیں رکھتا۔دوایک روز تک مزید واضح ہوجائے گی بات تبھی وہ حتمی جواب یا رائے دے سکیں گے۔"

اوراس کی بات پراس پل گاڑی کی حرکت کے ساتھ ساتھ باہر گذرتے مناظر دیکھتی ہوئی گیتی نے بڑے اچھنبے سے اس کی طرف رخ کیا۔

"ارے۔۔۔کیا مطلب کہ وہ دلچسپی نہیں رکھتا؟یعنی وہ گائیتری دیوی کے ساتھ کام میں دلچسپی نہیں رکھتا؟؟ یا حیرت۔۔۔کوئی نواب ہے وہ؟"

اس کی آنکھوں میں درآئی بے پناہ حیرت سے ناز نے پہلی بار جانا کہ اسے بھی اپنے "قیمتی یا اہم تر" ہونے کا شدت سے احساس ہے۔

" لگتا تو ہے کہ نواب ہے کوئی۔۔۔ یا نواب اگر نہیں تو اسے اپنی خوبصورتی کا احساس لازمی ہے۔بھئی تمہارے مقابل کام کرنے سے تو کوئی منجھا ہوا اداکار بھی انکار نہیں کرسکتا اور کجا کہ یہ نوآموز کرے۔مجھے بھی ایسی ہی حیرت ہوئی تھی رفیق صاحب کے بتانے پر۔لیکن پھر تم سے ڈسکس اس وجہ سے نہیں کیا کہ پہلے بات واضح ہو لے۔خیر۔۔۔دیکھتے ہیں کہ اصل بات کیا ہے؟"

جواباً مبہم مسکرا کر ناز نے بھی اسی حیرت کا اظہار کیا اور آخرش اسے خاموشی سے مزید انتظار کی تلقین کرنے لگی۔

" ہمم۔۔۔چلو دیکھتے ہیں بھئی۔اس جہاں میں کچھ بھی ہونا ممکنات میں سے ہے۔اب تو کسی بات پر میرا حیران ہونا بنتا ہی نہیں۔"

اب کی بار نہایت متوازن لہجے میں اس نے کوئی عمیق تر راز کہا کہ وہ اس کی آنکھوں میں یکا یک آن ڈھکا ملال پڑھنے لگی۔اس کے یوں غور کرنے پر نگاہیں چراتی گیت فرنٹ گلاس سے پار تاکنے لگی۔اور اسی پل ان کی گاڑی "ہوٹل پرل کانٹینینٹل" کے بالکل قریب پہنچ گئی۔اس کے ایسے انداز واطوار کی بدولت بارہا ناز کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں کی بابت دریافت کرے۔۔۔اور وہ ہر بار رک جاتی تھی کہ کہیں میرا یوں پوچھنا اسے کمزور نہ کردے۔لیکن اس پل اس ڈگر سے ہٹ کر جانے کیسے اس کے لبوں سے یہ سوال پھسلنے لگے۔

"ایک بات پوچھوں گیت؟؟ اتنے لوگوں کا۔۔۔ بلکہ اپنے لوگوں کا یوں ایک دم سے بدل جانا، کیا تمہیں تکلیف نہیں دیتا؟ تم سچ میں اتنی مضبوط ہو گیا کہ سب سہہ گئی ہو؟ تمہارے وہ خواب۔۔۔ان کی وہ تعبیریں۔۔۔ سبھی کچھ تو مسمار ہو گیا۔ تمہیں ان کا دکھ نہیں ہے کیا؟"

اس کی لفظ نم ہونے لگے تو گفتگو ادھوری چھوڑ کر وہ ہوٹل کے مرکزی گیٹ پر ایستادہ سیکیورٹی اہلکاروں کو دیکھنے لگی۔ جواباً گیت نے خاموش رہ کر گاڑی کے اس حفاظتی حصار کو عبور کرنے اور پھر "دخول" کے سامنے رکنے تک کا انتظار کیا۔ جونہی گاڑی رکی اپنا بیگ اور موبائل اٹھا کر نیچے اترنے سے قبل وہ شکستہ تر لہجے میں بولی۔

"خوابوں کو زیست عطا کرنے والے ہی تعبیریں نچوڑ لینے لگیں تو بدلے میں ملے گھاؤ ذاتیں ہی کیا روحیں بھی چھلنی کر جاتے ہیں۔ میرے خوابوں کے ادھڑنے کا دکھ صرف میں سمجھ سکتی ہوں سہیلی۔۔۔ کہ جس نے رویوں کے بدلنے کا زہر جھیلا ہے۔"

اور بات مکمل کرتی وہ گاڑی سے اتر بھی گئی تو اس کے زخمائے ہوئے لفظوں کی حد میں آئی ناز کو لگا کہ وہ پتھرا گئی ہے۔

ہاں۔۔۔ ہوتے ہیں کچھ لفظ ایسے بھی جو ایک ہی جملے میں صدیاں پرو دیں۔

☆......☆......☆

اگلی بار وہ دیوتا اس اپسرا سے وہاں ملا جہاں اسے توقع بھی نہیں تھی۔ نہیں۔۔۔ وہ ہر بار اسے وہیں ملتا تھا جہاں اسے توقع نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس وقت "داتا دربار" کے مرکزی احاطے میں ایک طرف گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے بیٹھی تھی اور آس پاس موجود زائرین کو غیر دلچسپی و اکتاہٹ سے دیکھتے ہوئے گویا وقت گزاری کر رہی تھی۔ اس نے کالا لباس زیب تن کر رکھا تھا جس کا ریشمی دوپٹہ سر سے سرکتا ہوا مسلسل اس کے گلے میں آن پڑتا تھا اور جسے بار بار سر پر جماتی وہ گویا بالکل انجان تھی کہ وہ یہ عمل لگاتار دہرا رہی ہے۔ اس کی چمکدار سفید رنگت پر سرمے سے ڈھکی گہری کالی آنکھیں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھیں اور ان موٹی موٹی آنکھوں میں جما کوئی غیر محسوس سا رنگ فقط "انتظار" کا تھا۔ جانے کتنی ہی دیر یونہی بیٹھے بیٹھے گزر گئی تو وہ خود فراموشی کی سی کیفیت میں رہ کر اٹھی اور مرمریں فرش پر یوں پاؤں رکھتے ہوئے چلنے لگی گویا پاؤں تلے فرش نہیں روئی کے کچھ گالے یا کسی بادل کے

نرم ٹکڑے ہوں۔ مرقد مبارک کے دائیں جانب کچھ بزرگ زائرین چھوٹا سا اک الاؤ روشن کیے بیٹھے تھے کہ جس کی راکھ اڑ اڑ کر جا بجا صحن میں پھیل رہی تھی۔ اس الاؤ سے اٹھتے دھوئیں کے مرغولے لہک لہک کر اس اپسرا کا طواف کرنے لگے تو وہ چونک کر ان مرغولوں سے بنتے ہوئے گول ہالوں کو دیکھنے لگی۔ ان دائروی ہالوں میں کئی قسم کی شکلیں بن بن کر بگڑ رہی تھیں۔ صرف ایک لمحہ ٹھہر کر سر جھٹکتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی تو اس کا کالا دوپٹہ پھر سے سرک گیا اور اس کے گھنے کالے بال ہوا کے دوش پر بکھر سے گئے۔ کسی جوگن کی مانند سر جھکائے اپنے قدموں کو دیکھتی وہ یونہی چلتی چلی گئی اور پھر صحن اطہر میں اپنے قریب کہیں گونجتی پرندوں کی چہچہاہٹوں پر تباہ کن خیالات سے باہر آئی۔ اس کے بائیں جانب واقع ایک نسبتاً اونچے چبوترے پر جنگلی کبوتر اور چڑیاں دانہ دنکا چگ رہے تھے۔ وہ بڑھی اور ایک ایک سیڑھی چڑھتی چبوترے کی منڈیر پر رکھے پلاسٹک کے تھیلوں میں سے باجرے کے دانے نکالنے لگی۔ یہ دانے یہاں آئے زائر اپنی خوشی سے صدقہ جاریہ کے طور پر رکھ کر جاتے ہیں۔ اس نے دونوں مٹھیاں بھر لیں اور چبوترا گھوم کر دوسری جانب آ رکی کہ جہاں سے اس کی پشت مزار کی جانب ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد مدھم مدھم مسکراتی وہ مختلف قسم کے کبوتروں اور چڑیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ پرندوں میں آ کر وہ جیسے اپنی تمام سوچیں اور فکریں بھول گئی تھی اور یہاں کے پرندے بھی انسانوں کے اتنے عادی و مانوس ہیں کہ اسے بالکل پاس پا کر بھی وہ ڈرے یا اڑے نہیں۔ انہی پلوں میں سے کوئی پل تھا کہ جب نرم ہوا کے جھونکوں نے اس پر کوئی عطر پھونک دیا۔ نہیں وہ عطر نہیں۔۔۔ کوئی طلسم تھا۔ دانہ ڈالنے کو اٹھا ہاتھ ہوا میں معلق کر کے اس نے آنکھیں بند کیں اور "کسی" کی خوشبوؤں کا یقین کرتے ہوئے بڑی دلآویزی سے کھلکھلا دی۔ گویا دیکھے بنا ہی اسے یقین ہو کہ وہ جسے سوچ رہی ہے وہ لازماً یہیں کہیں ہے۔

ہاں ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی جو ہمیں بے پایاں یقین عطا کر دیں۔

پھر یوں ہوا کہ نرمی سے آنکھیں کھول کر انہی مخصوص خوشبوؤں سے بندھی، دھیرے دھیرے وہ ایک ردھم سے پلٹی اور دربار کے وسیع و عریض صحن میں جا بجا کھڑے زائرین میں سے ان خوشبوؤں کے منبع کی متلاشی ہوئی۔ جونہی اس کی نگاہ ان سب زائرین کے سروں پر سے ہوتی ہوئی مزار کی جالیوں تک پہنچی اسے گویا قرار مل گیا۔ ان جالیوں سے لپٹ کر ماتھا ٹیکتے ہوئے اس دیوتا کو اس نے پشت سے بھی پہچان لیا تھا۔ بس یہیں وہ ایک جھٹکے سے

بڑھی اور اپنے سامنے دانہ چگتے ان پرندوں کے عین وسط سے گذر کر تیزی سے چبوترے کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کے یوں ایک دم بھاگنے کے سبب سارے پرندے ایک زوردار پھڑ پھڑاہٹ سے نچلی ہوا میں رقص کرنے لگے۔ اپنے پیچھے پرندوں کی ان گولائی دار اڑانوں سے یکسر بے نیاز وہ سنگ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر بے تحاشا بھاگی اور مزار کے قریب پہنچ کر اس دیوتا سے فقط چند قدموں کی مسافت پر رکی اسے شدتوں سے تاکنے لگی۔ اس کی موجودگی سے بے خبر وہ شخص اب جیب سے کالے دھاگے نکال کر مزار کی جالیوں میں سے گذار کر انہیں زوروں سے باندھ رہا تھا۔ ایک دھاگے کو گرہ در گرہ لگاتا وہ گویا اس کے دوبارہ نہ کھلنے کا یقین چاہتا تھا۔

" کیا میں پوچھنے کی جسارت کرلوں کہ اتنی شدت ولگن سے اور منتیں بھر بھر کر کسے مانگا جا رہا ہے؟"

آہستگی سے چلتی وہ اس کی عین پشت پر آن رکی تو اس کی آواز سن کر اس دیوتا کا ہاتھ فقط ایک لحظے کو دھاگے کی گرہ پر رکا۔ وہ ہولے سے مسکرایا کیونکہ وہ بھی اسے پہچان چکا تھا۔

" آپ دعا کرو بس کہ منت کے یہ کالے دھاگے قبولیت کا نیلا آسمان چھولیں۔ میرا مقصود مجھ سے آن ملے یا میں ہی کہیں اس تک جا پہنچوں۔"

پلٹے بنا حتمی گرہ لگاتے ہوئے اس نے جواباً کہا اور پھر اسی مخصوص ردھم سے اس کی جانب مڑا۔ اس کا روشن چہرہ دیکھتی وہ دو قدم اور نزدیک ہوئی تو پہلی بار نظریں چرائے بنا وہ اس کی سحر گر آنکھیں پڑھنے لگا۔

" ایسے کیا دیکھتے ہیں آپ؟"

اس کی جاذب نظروں سے بندھتی وہ منت کے کالے دھاگوں کا نیلے آسمان سے بنا تعلق بھولنے لگی۔

" دیکھتا ہوں کہ یہ آنکھیں، یہ نظریں۔۔۔ کسی خواب نگر سے لوٹی ہوئی لگتی ہیں۔ یوں ساکن کہ جیسے کسی نے خواب دیکھنا ترک کر دیئے ہوں۔ یا جیسے کوئی تعبیریں ہتھیلی پر رکھ کر پھونک چکا ہو۔ ایسا کیوں لگتا ہے بھلا؟"

اس کے ہونٹوں سے پھسلتا سوال سن کر وہ اس کی آنکھوں کی انتہائی گہرائیوں میں جا اترا تھا۔ پورے قد سے اس کے مقابل رک کر اس کے نین کنارے پڑھتا وہ ایک بار پھر سے اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔ بے ساختہ اس کے پردہ ذہن پر اسی دیوتا کی یادوں میں ڈھل کر مچلتے کئی منظر رواں ہوئے۔ اسے یاد آیا کہ طاق راتوں میں بے کراں ہو کر وہ کیسے اس کے لیے کروٹیں بدلتی ہے۔ ہاں وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے ہجر میں گھل رہی

ہے۔

"دل کو ہجر بھا جائے تو آنکھیں بنجران ہو جاتی ہے۔ پھر خواب ہتھیلی پر رکھ کر ریت کی مانند پھونک بھی دیئے جائیں، تو بھلا آنکھوں کو اس سے کیا؟؟؟"

وہ بولی تو تمام تر شدتوں کا پورا پورا کرب اس کے لب ولہجہ میں در آیا۔ اس کی بات سن کر پلکیں جھپکے بنا اسے دیکھتا وہ رخ بدل کر دوسری طرف دیکھنے لگا تو وہی خواب نگر سے واپس لوٹی آنکھیں لیے وہ سرعت سے اپنی جگہ سے ہٹی اور اسی سمت اس کے بالکل سامنے آن رکی۔

"دعا ہے کہ میرے دل کو کسی دسترس سے باہر رہنے والے شخص کا ہجر بھا جائے اور ان آنکھوں کو بھی خواب رتوں کی تعبیریں پھونک دیئے جانے کا غم نہ رہے۔۔"

یہیں بات مکمل کر کے اس دیوتا کے فسوں گر لبوں سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھوں میں دبا ایک اضافی کالا دھاگا کھینچ لیا اور اس کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر مزید یہ کہتی ہوئی مزار کی جالیوں کی طرف بڑھی۔

"چلیں یہ منت ہم ایک ساتھ مانتے ہیں۔ آپ اپنا مقصود طلب کرو میں اپنا کرتی ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں یہ عمل مستجاب ہوتا ہے یا نہیں۔ سنا ہے دعائیں اکٹھی کر بھیجنے سے وہ لوٹ کر نہیں آتیں۔"

اور اس کے ہر ہر عمل پر حیرت در حیرت اسے تاکتا وہ شخص دعائیہ انداز میں اٹھے اس کے ہاتھوں پر نگاہیں جما کر سچ مچ کوئی "دیوتا" ہو گیا۔ ہاں اس پل وہ۔۔۔ صرف وفقط پتھر تھا۔ منجمد رہ کر پہلے اس نے اسے منت کا وہ کالا دھاگہ اپنے دھاگے کے بالکل ساتھ جوڑ کر باندھتے اور پھر آہستگی سے واپس پلٹتے ہوئے دیکھا۔

"گرہیں اتنی ہی باندھی ہیں جتنی آپ نے باندھی تھیں۔ اب امید ہے ہماری منت ایک ساتھ بر آئے گی۔"

اس کے پاس آتی وہ دوپٹہ سر پر جماتی ہوئی بولی تو وہ نظر جھکا کر سمجھداری سے مسکرایا۔ اس کے روشن چہرے کے گرد کالا دوپٹہ یوں لگتا تھا جیسے چودھویں کا چاند کالی بدلیوں کے گھیر میں آ جائے۔ اب اس سے قبل کہ سر اٹھا کر، اس کی منتظر نگاہوں میں جھانکتا وہ جواباً کچھ بھی کہتا اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔ کچھ کہنے کو کھلے اس کے شنگرفی

لب بس تھرا کر رہ گئے اور بے ساختہ گفتگو روک کر وہ جیب سے نکال کر موبائل سکرین دیکھنے لگا تھا۔

"علی مصطفیٰ کالنگ۔۔۔" وہاں جگمگاتا نام پڑھ کر اس نے جیسے بڑے ضبط سے ہونٹ بھینچے تھے۔

"بولو یار۔اب کیا ہے؟"

بٹن دبا کر فون کان سے لگاتے ہوئے اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے خود کو بمشکل یہ کال سننے کے لیے قائل کیا ہے۔ایک دو مبہم ہنکارے بھر کر وہ دوسری طرف سے ہوتی بات سنتا رہا اور اس دوران وہ اپسرا بھرپور شوق و دلچسپی سے اس کے دلکش ماتھے پر ابھرتے حسین تر بل گنتی رہی۔

"بھائی کہہ دو ان سے کہ میں راضی نہیں ہوں اور اس کی وجوہات کچھ بھی نہیں ہیں۔بس مجھے نہیں کرنا مزید کوئی بھی ایسا کام وام۔اور پلیز مجھے بار بار تنگ مت کرو۔بائے۔"

کچھ توقف سے اس نے قدرے چڑ کر جلدی جلدی بات مکمل کی اور فون کاٹتے ساتھ ہی بٹن اتنے زور سے دبایا کہ فون "آف" ہونے کی ٹیون سنائی دی۔اور اس ٹیون سے مطمئن ہو کر اس نے موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔

"میں سمجھی میں ہی کچھ خاص ہوں لیکن آپ تو سب سے یونہی اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ابھی یہ جو کوئی بھی تھا اس سے ایسے بات کر کے میرے دل سے میری "خصوصیت" تو گنوا دی آپ نے۔واللہ بڑے ظالم ہیں آپ۔" وہ ٹھیک سے اس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے یوں چڑنے پر لطیف سا طنز کرتے ہوئے بولی۔اور اسی پل اس کی بات سنتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اسے دیکھا تھا۔

"تم مجھے فی الوقت بس یہ بتا دو کہ تمہاری شکل ہی ایسی "جلی کڑھی" ہے یا مجھے دیکھ کر اس پر کوئی خصوصی اہتمام ہوتا ہے؟؟"

اسی لب ولہجہ کی حامل صدیوں پرانی ایک سرگوشی اس کے ذہن میں سرسرانے لگی تو دل کے ساتھ ساتھ یکا یک ہی اس کی آنکھیں بھی جل اٹھیں۔جانے یہ لہجہ۔۔۔یہ لفظ۔۔۔یا یہ کہاں کہاں اس کا پیچھا کرنے والا تھا؟پل ہی پل میں وہ اس قدر بے قرار ہوا کہ اس کے لیے فقط ایک منٹ بھی یہاں مزید رکنا محال ہونے لگا۔

"معاف کیجیئے گا۔۔۔میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔پھر کہیں۔۔۔پھر کبھی ملیں گے۔۔۔اب خدا

حافظ۔" ٹوٹے پھوٹے جملوں میں باقاعدہ اٹکتے ہوئے اس نے بات مکمل کی اور حسبِ سابق ماتھے پر ہاتھ لے جا کر الوداع کہتا ہوا نکلتا بھی چلا گیا تو ہاتھ بڑھا کر اسے روکنے کی جستجو کرتی وہ بس دو قدم چل کر تھم سی گئی۔ بڑی بے تاب نظروں سے اسے پشت سے تاکتے ہوئے اس نے دور تلک اسے صحن کے پار جاتے دیکھا اور ایک لاچار نگاہ واپس مزار و مرقد کی جانب دوڑاتے ہوئے گویا حالِ دل کا "حل" چاہنے لگی۔ جب وہ اس روشن الاؤ کے پاس پہنچا تو مرمریں فرش پر جا بجا بکھری راکھ پر اس کے قدموں کے پڑتے ہوئے نشانات دیکھتی وہ چونک سی گئی۔ ایک پل۔۔۔ ایک ثانیے۔۔۔ اور فقط ایک ہی لحظے کو ٹھہر کر وہ تڑپ کر بھاگی اور ایک جگہ راکھ پر بنے اس کے پاؤں کے نشان پر گرنے کے سے انداز میں جا بیٹھی۔ جانے وہ عشق و جو کی کس معراج پر تھی کہ عجب عجب کیفیتوں میں ڈھلتی وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے پیروں کی راکھ اٹھا کر ہتھیلیوں پر مسلتی اس سے اٹھتی ہلکی ہلکی حدت محسوس کرنے لگی۔

" تیرے پیروں تلے آن سلگتی راکھ اٹھا کر ماتھے پہ رکھوں، چہرے پہ ملوں یا آنکھوں میں اوڑھا کر سو جاؤں؟؟؟"

اور ہتھیلیوں پر یوں راکھ مسلتے ہوئے اس نے جو اگلا عمل کیا اس سے کرامت پا کر محبت کے قصائص کا ہر ماورائی کردار پوری تاب سے صحن دربار میں زندہ و جاوید ہوا اور محوِ حیرت ہو کر اس کے آس پاس رقص کرنے لگا۔

ہاں وہ اس راکھ کو اپنی کشادہ و شفاف پیشانی پر گڑتے ہوئے کھوئے کھوئے انداز میں یہ سب بڑبڑانے لگی تھی۔

عشق اس کے ہاتھوں تک میں چھالے ڈال گیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے کھانے سے فراغت پا کر نمرہ برتن سمیٹنے لگی اور راشدہ بیگم چائے بنانے چلی گئیں تو وہ دبے پاؤں لاؤنج میں بیٹھ کر سرسری نظروں سے اخبار کا جائزہ لیتے ہوئے شاہجہان عادل کے پاس سے گذر کر صحن میں چلی آئی۔ اس کا ارادہ کچھ دیر کھلے احاطے میں چہل قدمی کا تھا۔ صحن میں ایک سے دوسرے سرے تک ٹہلتے اور ٹھہر ٹھہر کر تاروں بھرا آسمان دیکھتے ہوئے یہ اسے کوئی چوتھا چکر ہوگا کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی سنائی دی۔ گھنٹی بڑی

تہذیب سے یعنی بہت مدھم سی بجائی گئی تھی جس سے اسے لگا کہ کوئی سمجھدار فرد ہے۔

"ہیں۔۔۔؟اس وقت کون ہو سکتا ہے بھلا؟"

خود کلام ہوتی پہلے ایک نظر بیرونی دروازے اور پھر لاؤنج کی سمت دیکھتی وہ دروازہ کھولنے کی غرض سے بڑھی۔سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے دروازے کے بالکل قریب رک کر اس نے کنڈی پر ہاتھ رکھا اور قدرے اونچی آواز میں پکار دی۔

"جی کون۔۔۔؟؟"

اور حسبِ عادت محلے کے ہی کسی فرد کا گمان کرتے ہوئے باہر سے جواب آنے سے پیشتر ہی کنڈی ہٹا کر دروازہ وا بھی کر دیا۔ایک طرف ہو کر اس نے فقط ایک لحظہ انتظار کیا اور کسی کو داخل نہ ہوتے پا کر تعجب سے باہر جھانکا۔یہی وہ پل تھا جب ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اس کا دوپٹہ سرک کر پیچھے گردن پہ جا پڑا اور پتھرائی ہوئی سی نظروں سے وہ باہر ایک ترتیب میں کھڑے سفیر اور اس کے ماما بابا کو دیکھنے لگی۔تو جو وہ صبح یونیورسٹی میں کہہ رہا وہ سچ میں کر گذرا تھا۔

"السلام علیکم میڈم۔۔۔اب پہچان بھی چکو کہ تمہیں سکتہ ہی ہو گیا ہے؟اوہیلو۔۔۔ہوش میں آؤ ثومیہ اب ایسا بھی خوبصورت نہیں ہوں میں کہ تم حواس ہی کھونے لگو۔"اسے یوں یک ٹک خود کو گھورتے پا کر سفیر آگے بڑھا اور اس کی نگاہوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے بھرپور شوخ ہوا۔

"آں۔۔۔ہاں۔پہچان چکی ہوں تمہیں لیکن سفیر یوں ایک دم۔۔۔میرا مطلب ہے یہاں۔۔۔"

اس کی آواز پر گویا سچ مچ کسی سکتے سے چھوٹتی ہی وہ آڑھا ترچھا جو منہ میں آیا بے ربط سا بولی اور پھر اس کے والدین کی طرف نگاہ کر کے "بات" ادھوری چھوڑتے ہوئے آہستگی سے دہلیز سے پار نکل آئی۔

"السلام علیکم آنٹی۔۔۔السلام علیکم انکل۔۔۔کیسے ہیں آپ؟"

باری باری ذکیہ خاتون اور ڈاکٹر منصور عالم کو آداب کہتے ہوئے اس نے پیار لینے کو سر جھکایا تو کب سے خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھتے وہ پورے دل سے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"وعلیکم السلام۔۔۔جیتی رہو بیٹا۔یقیناً تم ہی ثومیہ شاہجہان ہو۔ماشاءاللہ۔چشمِ بدور۔"

جواباً ذکیہ خاتون نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اسے بھرپور محبت سے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور نگاہوں میں معنی خیز سی اک پسندیدگی بھر کر سفیر کی جانب دیکھنے لگیں۔

"شکریہ آنٹی۔۔۔"

اب نرمی سے ان سے جدا ہوتی، اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو منہ پر رکھتی وہ بھی لاچار سی نظروں سے سفیر کو ہی دیکھنے لگی تو ایک بار پھر سے کچھ بھی نہ سمجھتا ہوا وہ بڑی دلکشی سے مسکرا دیا۔ اور اس کی مسکراہٹ میں چھپے عجب سے ایک "مان" کو پڑھتی وہ دل ہی دل میں رو دی گویا۔ اب اس سے قبل کہ ان میں سے کوئی بھی مزید کچھ بھی بولتا اندر سے اٹھ کر شاہجہان عادل بھی باہر چلے آئے۔

"کون ہے ثومیہ؟ دروازہ کھولے کیوں کھڑی ہو اس وقت؟" دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے انہوں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا اور باہر کا منظر دیکھ کر ٹھٹک کر چپ ہوئے۔

"کون ہیں یہ ثومیہ؟"

ان کے بے ساختہ استفسار پر شرمسار سی ہو کر ایک طرف کھڑی وہ بس سفیر کو دیکھ کر نظر جھکا گئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ ہاں بہت با اعتماد ہو کر بھی موجودہ صورتحال میں وہ باپ کے سامنے لفظ کھونے لگی تھی۔

"میں ڈاکٹر منصور عالم ہوں شاہجہاں صاحب۔ یہ میری بیگم ذکیہ خاتون ہیں اور یہ ہمارا بیٹا ہے سفیر احمد۔ یہ ثومیہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور ابھی ہم سب ثومیہ سے ملنے آئے ہیں۔"

ان دونوں کو بالکل گنگ پا کر منصور عالم آگے بڑھے، مصافحہ کرتے ہوئے نہایت مضبوط لہجے میں اپنا تفصیلی تعارف کروایا اور اپنی آمد کا مقصد بھی بیان کیا۔

ان کے یوں رسم تعارف نبھانے پر شاہجہان عادل نے انتہائی بے یقینی سے سر جھکائے کھڑی اپنی "دختر نیک اختر" کی طرف دیکھا تو ڈری سہمی آنکھوں سے انہیں فقط ایک نظر دیکھتی وہ پھر سے سر جھکا گئی۔

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس پل کہیں بھی غیاب ممکن ہو۔

اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ کائنات سے کہیں پار چلی جائے اور اس لمحے اپنے باپ کا سامنا نہیں کرے۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھنے کے ساتھ ساتھ یکا یک ہی اس کی پیشانی پر پسینہ بھی نمودار ہو گیا اور بنا سر اٹھائے وہ فقط زمین میں ہی دھنستی رہی۔ اسے یقین تھا کہ اب کوئی بڑا تماشا ہو گا۔

"الٰہی بچانا مجھے۔۔۔تو گواہ ہے کہ سب غلطی اس خوش شکل گدھے کی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔"

دل ہی دل میں سفیر کو کچھ سخت سناتی وہ خود کو ہر طرح کے منفی حالات کے لیے تیار کرنے لگی۔ اس وقت اس کی دعائیں اپنی خیر منانے کی سی تھیں۔ اس کی انہی فکروں میں غلطاں ہو کر جانے کتنے پل مزید سرکتے کہ یکدم اسے اپنی سماعت پر شبہ ہوا۔ اس نے جو بھی سنا وہ اس کے خیال وگمان سے کہیں بالا تھا۔ ہاں اس نے سنا کہ بس ایک وقتی حیرت سے سنبھل کر اس کے بابا نہایت خوش دلی سے منصور عالم سے مخاطب ہوئے ہیں۔

"تو جناب آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں اب تک؟ اندر تشریف لائیں نا۔۔۔ پلیز۔ ہمیں خوشی ہوگی۔"

انہیں اندر کی جانب بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف ہو کر وہ تعظیمی انداز میں جھکے تو ڈاکٹر منصور عالم یہ کہتے ہوئے دروازے کے بالکل قریب جا رکے۔

"بہت شکریہ جناب۔ ہمیں آپ سے اسی محبت کی توقع تھی۔ جذاک اللہ خیر۔"

ذکیہ خاتون بھی فوراً سے پیشتر اپنے شوہر کی تقلید میں ان کے ہمراہ جا رکیں۔ فریقین کے مابین جاری اس سب اظہارِ عقیدت ولگاوٹ پر ثومیہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ شاہجہان عادل نے فقط ایک بار اس کی آنکھوں میں موجزن کائنات بھر کی حیرت دیکھی اور رخ بدل کر سفیر سے ملنے لگے۔

"تم کیسے ہو برخوردار؟"

جانچتی ہوئی نگاہوں سے اس کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے حال پوچھا تو حسبِ عادت وہ بااعتماد نظروں سے ان کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا جواباً بولا۔

"اچھا ہوں انکل۔ شکریہ۔ آپ کیسے ہیں؟"

ان سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے ان کا ہاتھ بڑے تپاک سے دبایا تو وہ مبہم سا ہنکارا بھر کر مزید بولے۔

"ہمم۔۔۔چلو اندر تم بھی۔آ جاؤ۔"

ان کے کہنے پر جب وہ تینوں باری باری ان سے پہلے گھر کی دہلیز پار کر گئے تو شاہجہان عادل اب تک بت بنی ہوئی ثومیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"یہ تم ایسے کیوں کھڑی ہو؟؟ اندر چلو گی یا یہیں جمنے کا ارادہ ہے؟"

اور ان کی بات پر پہلے سے بہت گھبرائی ہوئی وہ مزید گڑبڑا گئی۔

"جج۔۔۔جی بابا۔۔۔میرا مطلب ہے نہیں بابا۔جج۔۔۔جا رہی ہوں بس اندر۔"

سر کو پہلے مثبت اور پھر نفی میں ہلاتے ہوئے اس نے بے ربط جملہ ادا کیا اور ان سے نگاہیں چراتی ہوئی گیٹ پار کر گئی۔

اس پر ستم تو یہ تھا کہ سفیر کا ایسے گھر آ جانا اور بالائے ستم یوں کہ شاہجہان عادل کا ایسا مثبت رویہ۔۔۔اسے لگا وہ حیرت سے مر جائے گی۔صحن میں آ کر وہاں خاموشی سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے سفیر کو گھورتے ہوئے وہ بڑھی اور ذکیہ خاتون اور ڈاکٹر منصور عالم کو لیتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہو گئی۔جبکہ سفیر وہیں رک کر دروازہ بند کر کے واپس آتے شاہجہان عادل کا منتظر ہو گیا۔

ادھر باورچی خانے سے برتن دھو کر ابھی باہر نکلتی نمرہ نے بہن کے ساتھ غیر متوقع اور قطعاً اجنبی مہمانان کو لاؤنج میں داخل ہوتے پایا تو دوپٹے کے پلو سے گیلے ہاتھ خشک کرتی وہ بے طرح ٹھٹک گئی۔اسے مجسمہ حیرت ہوئے دیکھتی ثومیہ انہیں بڑے احترام سے صوفوں پر بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔"

بالآخر آنکھوں میں کئی کئی سوال بھر کر وہ آہستگی سے ان کے قریب آئی اور دھیمی آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔آپ یقیناً ثومیہ کی چھوٹی بہن ہیں۔"

ذکیہ خاتون نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو بے ساختہ اثبات میں سر ہلا کر وہ ثومیہ کو دیکھنے لگی کہ "یہ کون ہیں یار؟؟"

لیکن اس سے قبل کہ وہ ان کا کوئی تعارف کرواتی، سفیر اور شاہجہان عادل ایک ساتھ لاؤنج میں داخل

ہوئے۔ ہنستے مسکراتے اس روشن چہرہ اپالو کو دیکھتے ہوئے اپنا سوال بھولتی نمرہ اپنی جگہ پر گویا جم سی گئی۔

"السلام علیکم۔۔۔"

اسے یک ٹک خود کو تاکتے پا کر وہ اور سرشاری سے مسکراتے ہوئے اسے سلام کرنے لگا اور پھر اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر مزید بولا۔

" آداب محترمہ۔۔۔میں آپ سے مخاطب ہوں۔"

بات مکمل کر کے اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر باقاعدہ " آداب " بھی کہا تو ثومیہ نے کہنی مار کر اسے ہوش دلایا۔وہ پوری طرح گڑبڑا گئی۔

"جی شکریہ آپ کا۔وعلیکم السلام۔"

بمشکل اس کے لبوں سے پھسلا اور پھر بے حد جھجکتے ہوئے وہ اپنے والد کی جانب دیکھنے لگی۔وہ ان دونوں کی آنکھوں سے جھلکتے ڈر کو یکسر رد کرتے ہوئے سفیر سے مخاطب ہوئے تھے۔

"بیٹھو بیٹا کھڑے کیوں ہو اب تک؟ بیٹھو شاباش۔"

اور ان کے لب ولہجہ اور انداز پر اب تک سفیر کو پہچان کر صرف حیرت میں مبتلا ہوئی نمرہ گویا غش بھی کھانے لگی۔

"یا اللہ۔۔۔یہ ماجرا کیا ہے؟"

دل ہی دل میں خدا کو پکارتی وہ اوپر منقش چھت کو گھورنے لگی اور پھر ثومیہ کا ہاتھ تھام کر باورچی خانے کی جانب بڑھی۔

" آؤ ہم ماما کو بھیجتی ہیں ادھر۔"

ذکیہ خاتون اور ان کے سپوت کی نگاہ نے دور تلک ان دونوں بہنوں کا پیچھا کیا جبکہ ان کے جانے پر ڈاکٹر منصور عالم نہایت محبت سے شاہجہان عادل سے مخاطب ہوئے۔

" آپ کو ہمارا آنا برا تو نہیں لگا جناب؟ دراصل سفیر بضد تھا کہ آج لازمی چلیں وگرنہ شاید یوں بنا بتائے، بنا پیشگی اطلاع ہم کبھی نہیں آتے۔"

اس سوال پر بنا کسی توقف کے انہوں نے نہایت شائستہ جواب دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہمیں آپ کا آنا اچھا لگا ہے۔اور جب آپ بھابھی جی کو بھی ساتھ لائے ہیں تو پھر شکایت بنتی ہی نہیں۔ خیر یہ سب شرم تکلف ایک طرف۔۔۔ آپ بتائیں کسی ہاسپٹل میں جاب کرتے ہیں یا کوئی ذاتی کلینک ہے؟"

ان کی اس خوش اخلاقی کا مظاہرہ ان تینوں ماں بیٹیوں میں سے کوئی ایک بھی دیکھ لیتی تو اس کا فرط استعجاب سے مر جانا یقینی امر تھا۔ اب کی بار کب سے خاموش بیٹھی ذکیہ خاتون نے یہ کہتے ہوئے گویا ان دونوں کی گفتگو میں وارد ہونا چاہا۔

"اس عزت افزائی کے لیے آپ کا بہت شکریہ بھائی صاحب۔ ہم بھی یہی مان اور یقین لے کر چلے آئے بس کہ ہماری آمد سے آپ کو برا نہیں لگ سکتا۔ جذاک اللہ خیر کہ ہمارا مان رکھا آپ نے۔"

انتہائی متین لہجے میں دیئے گئے اس جواب کو پا کر شاہجہان عادل مبہم مسکرا رہے تھے کہ یہیں ڈاکٹر منصور عالم نے بھی ٹکڑا دیا۔

"میں آرمی ریٹائرڈ ڈاکٹر ہوں جناب اور ریٹائرمنٹ کے بعد سے اب تک اپنا کلینک چلا رہا ہوں۔ الحمدللہ بڑی عزت بخشی ہے اس پروردگار نے کہ ہاتھوں میں شفا رکھ دی۔ مریض مطمئن رہتے ہیں۔ بھروسہ کرتے ہیں۔ شکر ہے اللہ کا۔۔۔ اچھی گذر بسر ہے۔ آپ سنائیں کیسی چل رہی ہے جاب؟ سفیر بتا رہا تھا کہ آپ واپڈا میں ملازم ہیں۔"

عاجزی سے بات مکمل کرتے ہوئے انہوں نے جب ان کی بابت دریافت کیا تو اپنی ملازمت سے متعلق سفیر کا حوالہ دیئے جانے پر انہوں نے بے ساختہ اپنی جگہ پر پہلو بدلا تھا۔

پھر ٹھہر ٹھہر کر اور نہایت دھیمے لہجے میں وہ انہیں اپنی نوکری سے متعلقہ تفصیلات سے آگاہ کرنے لگے تو ان دونوں کو باہم محو و گم پا کر سفیر نے ذکیہ خاتون کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ " کیسی لگی ثومیہ؟"

"اتاؤلے مت ہو سفیر۔ گھر جا کر بات ہوگی۔ یہاں بس خاموش رہو۔"

جواباً شاہجہان عادل کا شائستہ لیکن مبہم انداز پرکھتی ہوئی ذکیہ بیگم نے اسے مدھم آواز میں جھڑک دیا۔ وہ

جہاں دیدہ خاتون تھیں۔۔۔ اندازوں میں اتنی پھرتی کا مظاہرہ نہیں کرسکتی تھیں۔ گو کہ ثومیہ انہیں پہلی ہی نگاہ میں من بھائی تھی لیکن اس کے باپ کا انداز انہیں کسی مصلحت میں لپٹا ہوا سا لگا۔ پھر باقی گھر والوں سے باقاعدہ نشست کے بنا وہ کیسے کوئی بھی حتمی رائے قائم کرتیں؟ ناممکن تھا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر منصور عالم اور شاہجہاں عادل کے چہروں کو باری باری جانچتی ہوئی وہ ان کی "بے تکلفی" کی حقیقت کھوج رہی تھیں۔ جبکہ سفیر سر اٹھا اٹھا کر باورچی خانے کی جانب دیکھ رہا تھا جس کے دروازے کے پار وہ دونوں بہنیں "غائب" ہوئی تھیں۔

ادھر سر جھکائے ہوئے جب وہ باورچی خانے میں پہنچیں تو ان کے چہروں پر لہراتے سائے دیکھ کر راشدہ بیگم بے طرح چونک اٹھیں۔ وہ بچا ہوا کھانا ڈونگوں میں منتقل کر کے فریج میں رکھ رہی تھیں اور چولہے پر دم لگی چائے ابلنے کے بالکل قریب تھی۔ یہاں مصروفیت کے سبب وہ ابھی تک باہر کی صورتحال اور مہمانان کی آمد سے یکسر بے خبر تھیں۔ نمرہ نے انہیں ایک ڈونگا اٹھا کر فریج کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو ثومیہ کو بھول کر تیزی سے چولہے کی طرف بڑھی۔

"ارے بھئی کیا ہوا؟ رنگ کیوں اڑا ہوا تمہارا؟ انہوں نے کچھ کہا ہے کیا؟"

فریج کھول کر بڑی احتیاط سے ڈونگا رکھتے ہوئے وہ فریج کا دروازہ تھام کر ہی ثومیہ سے استفسار کرنے لگیں تو اس سے قبل چولہے کا بٹن گھماتی نمرہ بول اٹھی۔

"ابھی تو کچھ نہیں کہا لیکن کہیں گے ضرور۔"

اور باوثوق لہجے میں اتنا کہہ کر تیزی سے مڑتی وہ ثومیہ تک آئی۔

"یہ سفیر ہی ہے ناں آپی؟ اف۔۔۔ مجھے یقین ہے یہ وہی ہے۔۔۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے یار؟ ہمارے گھر۔۔۔؟؟"

اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر مسلسل ہلاتے ہوئے وہ بڑی شدت سے پوچھنے لگی تو اس کے لہجے سے جھلکتے ہزار خدشوں پر پہلے سے سہما ہوا اس کا دل مزید سہم گیا۔ اب کوئی بھی جواب دینے کی بجائے رو دینے کے سے انداز میں اس نے پہلے ایک نظر ماتھے پر فکریں لیے خود کو تاکتی اپنی بے بس ماں اور پھر سراپا سوال ہوئی گویا تن کر کھڑی چھوٹی بہن کو دیکھا اور آنکھیں جھکا لیں۔ اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے کوئی جواز تھا ہی نہیں۔

ہاں ہوتی ہیں کچھ باتیں اور کئی عوامل ایسے بھی جن کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔

"افوہ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ تم دونوں کہ ہوا کیا ہے؟ کوئی آیا ہے کیا باہر؟ کون آیا ہے؟ کون سفیر نمرہ؟ جلدی بتاؤ مجھے۔"

فریج بند کرتے ہوئے راشدہ بیگم ایک خاص ردھم سے چلتی ان دونوں کے پاس آئیں تو ان کی آنکھوں میں تفکرات کا کوئی طوفان چھلکنے لگا۔ ان دونوں کی گفتگو سے آدھا ادھورا معاملہ تو وہ سمجھ ہی گئی تھیں کہ کچھ انتہائی غلط ہوا ہے۔ سوال کر کے لاشعوری طور پر انہوں نے باورچی خانے کی جالی دار کھڑکی سے باہر لاؤنج میں جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔

" آپی کا یونیورسٹی فیلو ہے ماما جان۔۔۔ بلکہ بہت اچھا دوست ہے۔ اور اس وقت اپنے والدین کے ساتھ باہر لاؤنج میں بابا کے پاس آیا بیٹھا ہے۔ بس یہی بات ہے۔"

نمرہ کے جواب پر انہوں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ثومیہ کی طرف دیکھا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھیں سچ مچ چھلک پڑیں اور ان کی کسی بھی جرح سے پیشتر وہ خود ہی بول اٹھی۔

" مجھے نہیں پتا ماما جان کہ وہ کیوں آیا ہے؟ دراصل وہ کل یونیورسٹی میں کہہ رہا تھا وہ آج آئے گا اپنے پیرنٹس کے ساتھ۔۔۔ واللہ میں نے اسے روکا تھا۔ لیکن وہ نہیں رکا ماما۔ وہ آ گیا ہے۔ میری مرضی کے بغیر آیا ہے۔ میں نے اسے نہیں بلایا۔ سچی ماما۔۔۔ میں اسے کیسے بلا سکتی تھی بھلا؟؟"

اور اسے یوں اٹکتے ہوئے رو رو کر بات مکمل کرتے دیکھ کر وہ جلدی سے اس کے اور قریب ہوئیں۔

" لیکن وہ آیا کیوں ہے ثومیہ؟ میں یہ پوچھ رہی ہوں؟ کیا مقصد ہے ان کی یوں آمد کا؟ خدارا بتاؤ مجھے۔ اور تمہارے بابا کا کیا ردعمل ہے؟ ان کا کیا رویہ رہا ان کے ساتھ؟"

حیرت ہونا اپنی جگہ لیکن یہ پوچھتے ہوئے انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی کے انداز میں دباؤ بھی ڈالا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس پر کس قدر بھروسہ کرتی ہیں۔ گویا انہیں اس کی بات پر کامل یقین تھا۔

" ماما موصوف کو آپی سے محبت کا بھی دعوٰی ہے۔۔۔ اور یہ آمد بھی شاید اسی محبت کا شاخسانہ ہو۔ آپ پلیز باہر جائیں باقی باتیں اب بعد میں ہی ہوں گی۔ اور بابا کا رویہ بالکل متوازن بلکہ حیران کن حد تک مثبت

ہے۔ بہت اچھے سے پیش آرہے ہیں ان کے ساتھ۔ اتنے اچھے طریقے سے کہ ان کا ایسا برتاؤ دیکھ کر مجھے تو باقاعدہ غوطے آنے والے تھے۔"

اس کی بجائے اب بھی نمرہ نے جواب دیا اور جواب دے کر ساتھ ہی راشدہ بیگم کو آہستگی سے باہر کی جانب دھکیلا۔ اس کے یوں دھکیلنے کے انداز میں بدتمیزی کی بجائے صرف احترام اور ایک ماں بیٹی کی باہمی محبت کی جھلک تھی۔ اب بے یقینی سے سر کو دائیں بائیں جنبش دیتی ہوئی باہر کی جانب بڑھتی کچھ یاد آنے پر وہ پھر سے رکیں اور باری باری انہیں دیکھتے ہوئے نمرہ کو ہدایات دیں۔

"چائے تیار ہے۔ کیک فریج سے نکالو اور لوازمات کیبنٹ میں موجود ہوں گے۔ پانچ منٹ میں لے آؤ۔ اب اخلاقی فرض تو نبھانا ہے ناں۔ ہاں بعد میں ہمارے ساتھ جو ہو بھلے ہو۔۔۔"

ان کے آخری جملے کا کمال تھا شاید کہ ان کے لہجے میں پنہاں اوہام پر بھی نمرہ کے لب چٹک گئے۔ اور اس کا مسکرانا نظر انداز کر کے جاتے جاتے وہ ایک بار اور مڑیں۔

"تم چپ تو کرو ثومیہ۔ کیا بچوں کی طرح رونا دھونا شروع کر دیا ہے؟ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اس کا حل ڈھونڈو۔ یوں ہاتھ پاؤں چھوڑو گی تو عقل میں کچھ نہیں سمائے گا۔ میں باہر جا رہی ہوں۔ تم بہادر بنو شاباش۔ اور آنسو پونچھ کر منہ دھو لو ایک بار۔ تمہیں اس کے ساتھ چیزیں لے کر باہر بھی آنا ہے۔"

اسے ڈپٹنے کے بعد بھرپور تسلی سے بھی نوازتی ہوئی وہ باہر چلی گئیں تو وہ بے بسی سے نمرہ کی طرف دیکھنے لگی جو کہ اب بہت حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔

"ویسے اسے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک بار تو میری روح فنا ہو گئی ثومیہ۔ وہ تو صد شکر کہ بابا کا برتاؤ عمدہ رہا ورنہ میرا آج جان سے چلے جانا عین ممکن تھا۔"

کوئی بوجھ اتار پھینکنے کے سے انداز میں شانے جھٹک کر نمرہ بڑھی اور یہ کہتی ہوئی کچن سلیب پر چائے کے لیے ٹرے اور کپ ایک مخصوص ترتیب سے رکھنے لگی۔ پیچھے دھواں دھواں چہرہ لیے وہ اب بھی بالکل ساکت تھی۔ جواب ندارد ہوا تو کیتلی کا ڈھکن اٹھا کر چائے کی مقدار جانچتی نمرہ نے مڑ کر فقط ایک نظر اسے دیکھا۔

"آہ آپی۔۔۔ تم ٹھیک کہتی تھیں بالکل۔ یہ تو سچ مچ بڑا پیارا ہے۔ اور اس کی آنکھیں۔۔۔ اف۔۔۔

کسی کو بھی پاگل کر دیں۔"

اس کے خیالات سے بے خبر وہ اپنی کیفیات بتانے لگی تو اب بھی کچھ کہے بنا ثومیہ یک ٹک اسے بس دیکھتی رہی۔ پھر جانے کس خیال سے بندھی وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہوئی اور دیوار سے لگ کر خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوئی۔

"سب کچھ غلط ہوا نمرہ۔۔۔ سب کچھ ہی غلط۔ میرا اس سے ملنا غلط، اس سے دوستی کرنا غلط۔۔۔ ہر بار کیے گئے اس کے اظہارِ الفت کو مصلحت کے تحت ٹالنا غلط۔۔۔ اپنے دوستانہ رویے سے اس کی ہمت افزائی کرنا غلط۔۔۔ اس کے ساتھ پہلی ملاقات سے لے کر مقالے کی تیاریوں کے دوران گذرا ہوا اک ایک لمحہ غلط۔۔۔ اور میرا اس کے ساتھ بائیک پر گھر آنا تو انتہائی غلط۔۔۔ کہ اسی سے اس کی ہمت بڑھی ہے۔ میں ہر کہیں غلط تھی نمرہ۔۔۔ ہر کہیں غلط۔ یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ یہ تو طے تھا شاید کہ یہ لازمی ہوگا۔ اف۔۔۔ میں اتنی بیوقوف کیسے ہو سکتی ہوں یار۔ میں اتنی پاگل کیسے ہو سکتی ہوں۔ میں کہاں اسے سمجھنے میں چوک گئی؟ میں کیسے اسے سمجھنے میں چوک گئی؟ اس سے پہلے مجھے خود پر افسوس رہے گا۔"

عجب پچھتاوے میں گھری وہ خود کو مسلسل ملامت کرنے لگی تو اس کے لہجے سے بندھ کر حیرت در حیرت اسے تاکتی نمرہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے اس کے پاس آئی۔ اسے لگا اسے کسی جذباتی سہارے کی اشد ضرورت ہے۔

"اے آپی۔۔۔ کچھ نہیں ہوا یار۔ کچھ بھی غلط نہیں ہوا۔ جیسا ہوا جو بھی ہوا سب بہترین ہے۔ پلیز سنبھالو خود کو۔ اس نہج پر مت سوچو۔ وہ سچ مچ اچھا لڑکا ہے۔ مجھے پہلی بار مل کر بھی اس کی آنکھوں میں سچائی اور خلوص نظر آیا ہے۔ ہاں مانا کہ اس سے وقتی بھول ہوئی ہے لیکن اس کی دوستی اور اپنے بھروسے پر شک نہ کرو۔ وہ دونوں بالکل درست اور حق ہیں۔ پلیز۔۔۔ متوازن کرو خود کو اور چلو میرے ساتھ۔ باہر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔"

اس کا تر چہرہ پونچھتے ہوئے تسلی دینے کے سے انداز میں وہ سفیر کی بھی وکالت کرنے لگی تو سوں سوں کرتی ناک پونچھتے ہوئے اس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ وقت کن باتوں کا ہے اور کن باتوں کا نہیں ہے میں نہیں جانتی نمرہ۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے یار۔ بابا نے مجھے وارن کیا تھا کہ یونیورسٹی جاؤ لیکن تمہاری کوئی "ایسی ویسی" شکایت نہ آئے۔ اف۔۔۔ میں کیسے سامنا کروں ان کا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا ردعمل دوں؟ اچھا تم جاؤ باہر پلیز۔ میں نہیں جارہی۔" پھولے ہوئے ہاتھ پاؤں سے اپنی جگہ چھوڑ کر یہاں وہاں مختصر ٹہلتے ہوئے وہ اپنا سر تھام کر بولی تو نمرہ کو سچ مچ اس پر ترس آنے لگا۔ لیکن یہ وقت ترس کے کسی اظہار کا نہ تھا۔ وہ جانتی تھی اس پل اسے مضبوط کرنے کے لیے مخصوص الفاظ و بیان کا چناؤ اہم تر ہے۔

"افوہ بھئی کیا ہوگیا ہے؟؟ اب جانے بھی دو یار۔ ایسی بھی کوئی ڈرنے لائق بات نہیں ہے۔ اس فکر کو بے وجہ اور خواہ مخواہ سر پر سوار کررہی ہو تم ورنہ بابا کا سلوک و رویہ تو بالکل ٹھیک ہے باہر۔ منہ دھو لو میں لوازمات سجا لوں۔ بس یہ طے ہوا کہ ہم ایک ساتھ باہر جائیں گی اور اب نو مزید بحث پلیز۔ بعد میں جو ہوگا وہ بھی دیکھا جائے گا۔ ابھی کے لیے فٹافٹ کرلو جو کہا ہے شاباش۔"

ہاتھوں کے مختلف اشاروں سے اسے تھمنے کا کہتی وہ تسلی بخش اور ہمت افزا لہجے میں یہ سب کہتی ہوئی بڑھی اور اس کا جواب سنے بنا کیبنٹ کھول کر چائے کے ساتھ لے جانے کے لیے لوازمات نکالنے لگی۔

"اف۔۔۔ میری تو گھر میں کوئی نہیں سمجھتا میں اس "بدتمیز" پر کیا شکوہ کروں؟"

اس کے پیچھے فقط ایک پل کو تھمی، دونوں مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ بلا کی زچ ہو کر بولی تو گردن کو ذرا سا موڑتے ہوئے اس کا انداز پرکھتی نمرہ بے طرح ہنس دی۔

"او کے ضرور چلتی ہوں میں تمہارے ساتھ۔ بڑے دانت نکل رہے ہیں ناں؟؟ پھر بھگتنا اب۔"

انگلی اٹھا کر اسے تنبیہاً کہتی وہ بڑھی اور واش بیسن کی ٹونٹی کھول کر چہرے پر دھڑا دھڑ چھپاکے مارنے لگی۔ ادھر اسے یوں پرعزم ہوتے دیکھ کر نمرہ نے سینے میں کب سے اٹکا سانس نہایت طمانیت سے خارج کیا کہ وہ اس کا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

ہاں وہ جانتی تھی کہ اس پل اس کا ڈرے سہمے ہونے کی نسبت اپنی جون میں ہونا ضروری ہے۔

☆......☆......☆

ہاسٹل میں اپنے کمرے کے رنگدار فرش پر یہاں سے وہاں ٹہلتا ہوا مصطفین عجب بے کلی میں مبتلا تھا۔ کھڑکی کے ایک کنارے سے دوسری دیوار تک کے اس سفر میں وہ بارہا اپنے بالوں میں ایک ہاتھ ڈالتا اور بالوں کو جکڑ کر پیچھے کی جانب کھینچتے ہوئے گویا کسی ملال سے لپٹ جاتا۔ اس کے چہرے پر رنجیدگی وحزن کے تاثرات رقم تھے۔ گویا درِاندرون ہی کوئی کسی خلفشار سے نبرد آزما ہو۔

ہاں وہ کسی خلفشار میں ہی تو تھا۔۔۔ اس کے ذہن میں کل یونیورسٹی کے آخری دن سے متعلقہ خیالات گونج رہے تھے۔ ہاں وہ ثومیہ شاہجہان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے پر دکھی تھا۔ ڈگری کے ان تمام سالوں میں اس کے طرزِ عمل سے یہ بات تو اس نے اچھے سے سمجھ لی تھی کہ یونیورسٹی کے بعد وہ ان سے شاید کبھی نہیں ملے گی۔ اس کے دل میں رہ رہ کر اس سے اظہارِ الفت نہ کر پانے کا احساس جاگ رہا تھا اور احساس بھی اتنا شدید کہ اس کی ذات میں طرح طرح کے کچوکے لگاتے ہوئے روح تک میں گھر کرنے لگا۔

" آہ۔۔۔ میں کیسے کہوں اس سے کہ مجھے اس سے محبت ہے؟ نہیں کہہ سکتا۔۔۔ ہرگز نہیں۔" بے قراری سے سوچتے ہوئے یکا یک وہ بڑھا اور خود کو کمرے کے عین وسط میں لگے بیڈ پر اوندھے منہ گرالیا۔

" سفیر اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسے اس پر یقین کر لینا چاہیئے۔ کاش وہ اسے سمجھ سکے کہ یقیناً وہ اسے خوش رکھے گا۔ وہ کہتا ہے میں اسے بہت خوش رکھوں گا۔"

کروٹ بدلتے ہوئے تکیہ کھینچ کر نزدیک کر کے، اس تکیے میں منہ چھپاتا وہ گویا اپنے دل کو دلاسہ دینے لگا۔

دل کتنے عجیب ہوتے ہیں ناں۔۔۔؟ کہ اکثر طفل دلاسوں سے بہلانے پڑ جاتے ہیں اور عجیب تر اس میں یہ ہے کہ ہزار بہانوں سے بھی مچلتے ہوئے دلوں کو قرار نہیں ملتا۔

وہ بھی اپنے اظہارِ الفت نہ کر سکنے کے ملال کو سفیر کی دوستی کے باندھ سے بہلانے لگا تھا۔ سفیر کی سنگت میں ثومیہ کی متوقع خوشی کا خیال کر کے من کو شانت کرنے کی کوششوں میں تھا۔

" یا اللہ میرے دل کو قرار دے دے۔ یا خدا کچھ ایسا کر کہ اسے بھول سکوں میں۔ ان اخروی لمحات میں مجھے بلا کا ضبط دینا۔۔۔ کہ میرے دل کا بھید اس پر کسی طور عیاں نہ ہو۔ مجھے ایسا صبر دینا کہ کسی بھی طرح یہ محبت میری آنکھوں سے نہ جھلکے۔"

یونہی لیٹے لیٹے ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ دعائیں مانگتے ہوئے جو اس کے لہجے میں بلکنے لگی تھی وہ محبت ہی تو تھی۔ جانے کیسا تڑپ رہا تھا اس کا دل کہ آنکھوں سے "نیر" بہنے لگے۔

" آنکھوں میں آنسوؤں کو کبھی "یونہی" نہیں آنے دو۔ رونے کی بھی کوئی مضبوط وجہ ہونی چاہئیے۔"

اپنے گالوں پر بہتا سیال پونچھتے ہوئے اسے ایمان راجپوت کے یہ الفاظ یاد آئے تو وہ نمناک سا مسکرا دیا۔ ہاں اس سے وابستہ اس کی تمام تریادیں ایسی ہی تھیں۔۔۔ بے وجہ ہنسا دینے والی اور اکثر اوقات تو۔۔۔ بے سبب رلا دینے والی بھی۔

" کچھ باتوں میں کتنی سچی اور کھری تھی ایمان۔۔۔ جانے اب وہ کیسی باتیں کرتی ہوگی؟ جانے اب وہ کس سے باتیں کرتی ہوگی؟ کیا اب بھی وہ اوپر میرے کمرے سے باہر راہداریوں میں بھٹکتی ہوگی؟ بہت بدل چکی تھی وہ اس روز۔ خالہ کی قبر پر۔۔۔ مٹی جیسی ہوگئی تھی۔"

ایمان کا خیال آیا تو اس کی ذہنی رو بھٹک کر مسلسل اسی کر گرد گھومنے لگی۔

"اف۔۔۔ کچھ باتوں کے جواب کتنے گنجلک ہوتے ہیں یار۔۔۔ اپنا آپ بھلا دینے والے۔"

خودی سے سرگوشیاں کرتا جانے کتنے پل گذار کر وہ اٹھا اور پھر سے ٹہلتا ہوا کھڑکی میں جا رکا۔ کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر روشن آسمان تاکتے ہوئے اس کا چہرہ اب بھی پرسکون تو نہیں تھا لیکن اس پہ کسی قدر ٹھہراؤ ضرور ثبت ہو گیا۔

باہر ملگجے اندھیرے میں اس نے دور دراز عمارات کی اونچی فصیلوں پر جا بجا جلتی رنگین شمعیں دیکھیں اور ایک پل کے لئے ان کے فسوں سے بندھتے ہوئے ساری فکریں بھولنے لگا۔ عمارات کے دہانوں سے پھوٹتی طرح طرح کی مدھم روشنیوں سے یوں لگتا تھا کہ گویا کسی نے پورے شہر پر کئی طرح کے رنگ چھڑک دیئے ہیں۔ مہیب خاموشی کے باعث اسے کھڑکی سے پار سرسراتی سرد ہوائیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ یہیں اس کی کھڑکی کے پاس کہیں دیوار میں ہی اگے ہوئے جنگلی پیپل کے چوڑے اور مخروطی پتے ہوا کے سبب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر مدھر سی دھنیں بجا رہے تھے۔ وہ کان لگا کر ان پتوں کی باہمی جنبشیں سننے لگا۔ ہوائیں اس کے کانوں کی لوئیں چھو چھو کر مزید لہکتی ہوئی چلنے لگیں تو ان میں مچلتی کئی نادیدہ پریاں مصطفین کے گرد جھوم جھوم کر اس کا

وجود خوشگوار عطر سے مہکانے لگیں۔ کوئی سحر تھا یا کہ طلسم۔۔۔ کہ جو اس کے مضبوط سراپے سے نکل کر پورے منظر پر اور خصوصاً اس کشادہ تر کھڑکی کے آس پاس چھانے لگا۔ لیکن مناظر میں اپنی قوی موجودگی کا احساس باقی رکھ کر بھی اس کے دل کو سکون میسر نہیں آ رہا تھا۔ ہر گذرتے پل کے ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ہر گھڑی وہ کسی "عذاب رت" میں آ رہا تھا۔ اپنے اندرون سے خوف کھا کر اس نے باہر جھانکا تھا کہ کچھ رنج وغم چھٹے۔۔۔ اور اب باہر سے گھبرا کر پھر سے آنکھیں موندلیں کہ اس کے لیے باہر بھی نری اذیت تھی۔

آج بے سبب ایسا تھا کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی میں آئی وقت کی ریز گاری سے کچھ ایسے سکے کھنگالنا چاہتا تھا جو حالات کی سخت ترین کروٹوں میں بھی دونوں رخ سے ہمیشہ اس کے حق میں گرے۔ اور وہ بہت بدقسمت تھا کہ ایسے سکوں کی مد میں خالہ کنیز اور ان کے گھرانے کے سوا اس کی جھولی میں کچھ نہیں تھا۔۔۔ اور تقدیر کا ستم تھا یا وقت کا کوئی پھیر کہ یہ سکے بھی اس کے دامن سے کہیں ماضی میں سرک چکے تھے۔ سود وزیاں کے اس حساب کھاتے میں یونہی آنکھیں بند کیے اتنا وقت ضرور گذرا کہ وہ اپنے والدین، بچپن، نوجوانی اور پھر گھر چھوڑنے سے لے کر خالہ کنیز کے گھر اپنی آمد تک کے ہر دور سے ہو آیا۔

"میرے حصے میں زندگی سے کچھ نہیں آیا۔۔۔ اس دنیا سے مجھے تو کچھ ملا ہی نہیں۔ اے وقت گواہ رہنا کہ تم سے ٹوٹ کر اپنے حصے میں آئی اک ایک گھڑی کو میں نے فقط گذارا ہی نہیں۔۔۔ جھیلا بھی ہے۔"

نرمی سے آنکھیں کھول کر تھوک نگلتے ہوئے اس نے گویا آنسو بھی حلق میں اتار لیے اور کھڑکی کی سل پر دونوں ہاتھ جما کر اپنا مناسب سا وزن ان ہاتھوں پر منتقل کرتا ہوا نگاہیں اٹھا کر افق کے سینے پر چنگاریوں کی مانند جلتے ستاروں کو تاکنے لگا۔

" کبھی کبھی دل کرتا ہے خدا سے بھی کہوں۔۔۔ کہ اے زندگی کس طرح سے تو نے برتا ہے مجھے۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے تجھ سے۔۔۔ میں بھی روٹھ جاؤں اب۔"

آہ۔۔۔ کہ آج پہلی بار وہ زندگی سے شکوہ کناں تھا۔ آہ۔۔۔ کہ آج پہلی بار اس سے صبر و ضبط چھوٹ رہا تھا۔ نگاہیں وہیں تاریکی سے پار ٹمٹماتے ہوئے ان ستاروں پر جمائے، عجب کرب سے بندھا ہوا وہ اپنے گلال لبوں کو دانتوں تلے کچلنے لگا۔ آس پاس منعکس ہوتی روشنیاں اس کی آنکھوں میں جذب ہو کر وہاں

ہلکورے لیتے "نیر" مزید چمکانے لگیں۔ جبکہ آنکھوں میں در آئے ان بے تحاشا نمکین پانیوں کو یکسر فراموش کرتا، ایک پل کو بھی پلکیں جھپکے بنا وہ بس افق کے پار جھانکتا رہا۔ نیر مسلسل بڑھتے رہے اور آنکھوں سے چھلک چھلک کر اس کے سفید رنگ گالوں پر سے لکیروں کی مانند گر گر کر اس کے گلے تک پر پھسلنے لگے۔ آنسوؤں کو یوں بہنے دے کر شاید اس کے دل کو سکون مل رہا تھا کہ اس نے ایک بار بھی انہیں صاف کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہاں۔۔۔ ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی کہ جب ہم آنکھوں سے آنسوؤں تک کے بہنے کا لطف لینے لگتے ہیں۔ یہ خود اذیتی کی کوئی اخروی حد ہوتی ہے یا شاید اس خیال سے بھی آر پار کا کوئی قصہ۔۔۔ یہ وہی جانتے ہیں بس۔۔۔ کہ جو اسے جھیلتے ہیں۔ کئی لمحات یونہی نمناک کیفیت و حالت میں گذار کر بالآخر اس کا دل سنبھلا تو سب سے پہلے گیلے چہرے کو اپنے بازوؤں سے پونچھتے ہوئے اس نے بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں بھی ترتیب دیا اور آنکھیں خشک کرتا ہوا دور آسمان پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی۔

"معاف کرنا یا خدا۔۔۔ جانے کیا کچھ سوچتا آیا ہوں۔ دنیا سے لاکھ گلے سہی۔۔۔ تم سے کوئی شکایت نہیں مجھے۔ ہمیشہ اور ہر بار تم نے ہی مجھ ناتواں کو سہارا ہے۔ تو جس حال میں رکھے گا مجھے بے شک وہی بہترین ہوگا۔ بلاشبہ وہی میرے حق میں ہوگا۔"

کھڑکی سے ہٹنے سے قبل اس نے اپنی "شہہ رگ" تھام کر دل ہی دل میں خدا کو مخاطب کیا اور پردہ برابر کرتے ہوئے کھڑکی سے ہٹ گیا۔ بازو اطراف میں لٹکائے وہ میکانکی انداز میں بیڈ کے ایک کنارے پر ٹک گیا اور خدا سے شکوہ جات کی معافی طلب کرتا دنیا کی بے ثباتی کے متعلق غور کرنے لگا۔ بالآخر بہت تھک کر پیچھے کی جانب لیٹتا ہوا وہ سرگوشیانہ لہجے میں خود کلام ہوا۔

"عجب فکر و خیال اور طرز و طور کی حامل یہ دنیا میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آسکی۔ یا تو میں اس سے جڑتا نہیں ہوں یا یہ مجھ سے ملتی ہی نہیں۔۔۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں اس دنیا سے ہوں ہی نہیں۔ میری مٹی۔۔۔ میرا خمیر۔۔۔ کسی اور جگہ، کسی اور جہاں سے ہے۔ اس دنیا کی تو کوئی "کل" سیدھی ہے ہی نہیں۔۔۔ اور میرے بھی سارے "آج" بگاڑے رکھتی ہے۔"

اور یہاں تکیہ اٹھا کر سر کے نیچے رکھنے کی بجائے سینے پر سجاتا ہوا وہ کمرے کی منقش چھت کو گھورنے لگا۔

"ثومیہ شاہجہان۔۔۔"

اس کے لبوں پر پھر سے وہی "اسم" طاری ہونے لگا کہ جو اس کی جاں تک میں سلگنے لگا تھا۔

یہ تو طے تھا کہ اسے آج رات نیند نہیں آنے والی تھی۔ اسے اب تمام رات جاگنا تھا۔

یہ شب غم تھی یقیناً۔۔۔

☆......☆......☆

کسی ٹرالی میں برتن سجانے کی بجائے وہ دونوں بہنیں ہاتھوں میں ہی بڑے بڑے ٹرے تھامے ہوئے آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئیں اور نپے تلے انداز میں درمیانی میز پر رکھ کر وہیں نیچے قالین پر بیٹھتی چائے کپوں میں منتقل کرنے لگیں۔ ذکیہ خاتون جو کہ بڑی بشاشت سے راشدہ بیگم سے ان کے خاندانی پس منظر پر گفتگو کر رہی تھیں ثومیہ کو سر جھکائے یوں خاموشی سے کام کرتے دیکھ کر پورے دل سے مسکرانے لگیں۔ اپنے دل میں انہوں نے بہو کے طور پر جو شخصیت یا خاکہ تراشا تھا ثومیہ اس کے عین عین تھی یعنی ہو بہو وہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی میز گھسیٹ کر ان کے نزدیک کی اور نمرہ کے ہاتھ سے چائے کے ساتھ ساتھ دیگر لوازمات بھی پکڑ کر بڑی ترتیب سے اس پر چن دیئے۔

"آنٹی جی چائے پئیں پلیز۔"

سر پر پہلے سے جما دوپٹہ مزید سختی سے جماتے ہوئے وہ مدھم آواز میں بولی تو انہیں اس کے دھیمے لہجے پر بے طرح پیار آیا۔

"بھئی ماشاءاللہ۔۔۔ بڑی سلیقہ شعار بچیاں ہیں آپ کی۔ آؤنا بیٹی یہاں بیٹھو میرے پاس۔"

انہوں نے فوراً اپنے ساتھ جگہ بناتے ہوئے اسے بیٹھنے کا کہا تو اس نے گردن ترچھی کر کے پہلے نمرہ اور پھر بھرپور ذوق وشوق سے خود کو اور نمرہ کو باری باری تاکتے سفیر کی جانب دیکھا۔

"جی آنٹی ایک منٹ۔۔۔ میں صرف ادھر چائے پیش کرلوں۔"

نرمی سے انگلی اٹھا کر اپنے والد، ڈاکٹر منصور عالم اور سفیر کی جانب اشارہ کرتی وہ اجازت طلب لہجے میں جواباً بولی تو دل ہی دل میں اس کی نزاکت اور بھولپن پر قربان ہوتے ہوئے انہوں نے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

"شکریہ آنٹی۔۔۔"

اب ان کی شفیق مسکراہٹ سے نگاہ چراتی یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی تو انہوں نے دوپٹے کے حصار و بند سے نکل کر کمر سے نیچے تک جھولتے اس کے گھنے سیاہ بالوں کو دور تلک دیکھا۔ ادھر بھی اس نے وہی عمل دہرایا کہ ایک چھوٹی میز ان تینوں مردوں کے نزدیک کرتے ہوئے نمرہ سے تھام کر اس پر چائے اور لوازمات چن دیئے۔

"انکل۔۔۔ باباجان۔۔۔ چائے لیں پلیز۔ سفیر۔"

نہایت دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے سفیر کا نام بہت ڈر ڈر کے لیا اور اپنے باپ کی نگاہوں میں دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے فقط ایک پل کو یہاں ٹھہر کر انتہائی لاچار نظروں سے سفیر کی جانب دیکھا۔ اس کی روشن تر آنکھوں میں اس کے لیے ہزار ہا شکایات مچل رہی تھیں۔ وہ جب سے واپس لاؤنج میں آئی تھی اپنے چہرے پر اس کی چور نظروں کا ارتکاز محسوس کر رہی تھی۔ گو کہ شاہجہان عادل اور ڈاکٹر منصور عالم تب سے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی دفتری اور کلینک کی مصروفیات سے متعلقہ گفتگو کر رہے تھے لیکن ان کی شخصیت کا رعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ وہ کھل کر اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اسی روانی سے چلتی وہ نمرہ تک گئی جو اب ان دونوں کے لیے چائے ڈال رہی تھی۔

"تم اسے گھورنا بند کرو نمرہ۔ بابا سامنے بیٹھے ہیں۔ چائے لو اپنی اور چپ چاپ سر جھکا کر میرے ساتھ بیٹھنا۔ بات کرنی ہوئی تو حدماما اور آنٹی سے کرنا اور بس۔۔۔"

میز پر دھرا اپنا کپ پکڑتے ہوئے اس نے نچلی آواز میں اسے ڈپٹ کر کہا تو ایک آخری نگاہ سفیر کو مُسلسل تاکتے ہوئے اس نے میکانکی انداز میں اوپر نیچے سر ہلا دیا۔ دوبارہ اسے سامنے پا کر وہ پھر سے اس کی شخصیت کے سحر میں آ گئی تھی۔ بہرحال اس کی بات مان کر قالین سے اٹھتی ہوئی وہ راشدہ بیگم کے پاس جا کر صوفے پر ایک طرف چپکی بیٹھ رہی۔ ثومیہ بھی اس کے بالکل ساتھ جڑ کر لیکن ذکیہ خاتون کی جانب بیٹھی تھی۔ اسے بھی ان کا پیار بھرا انداز بے حد پسند آیا اور وہ ان کی خوش اخلاقی سے دلی متاثر ہوئی تھی۔ وہ ان کی ماما راشدہ بیگم سے کافی گھل مل چکی تھیں اور ان دونوں کے مابین کھانے پینے کے معاملے میں اپنے اپنے گھر کے مردوں کی پسند ناپسند کا موضوع زیرِ بحث تھا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ سمجھاتی بجھاتی چپ

چاپ سن رہی تھیں۔ راشدہ بیگم انہیں چائے کے دوران مختلف چیزیں چکھنے کا کہہ " کھانے " پر اصرار کرتی رہیں جبکہ اس جانب یہی فرائض بطورِ میزبان شاہجہان عادل نے بھی نبھائے۔ دونوں بہنیں حیرت در حیرت ان کے انداز و اطوار جانچ پر کھ رہی تھیں۔ ثومیہ کے چہرے پر آویزاں "نو لفٹ" کے سخت ترین بورڈ سے چڑ کر سفیر بھی اب سارا دھیان ساتھ بیٹھے "بزرگوں" کی باتوں پر مرکوز کیے ہوئے تھا لیکن ان کی باتوں پر بھی کسی پل ہولے سے مسکراتا ہوا وہ کن انکھیوں سے اب بھی اس کی جانب دیکھتا ضرور تھا۔

یہ محبت بڑی عجیب شے ہوتی ہے سچ مچ۔۔۔ انسان کی خوش امیدی کو کسی طور ٹوٹنے نہیں دیتی۔ ہر پل خوش گمان رہتی ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں لیکن۔۔۔ بھرپور جوان رہتی ہے۔

بالآخر یونہی مردانہ اور زنانہ حصے میں بٹ کر باہمی گفت وشنید کرتے ہوئے جانے کتنا وقت گذرا کہ شاہجہاں عادل کی آواز پر سب چونک کر ان کی جانب دیکھنے لگے۔

" آئیں ڈاکٹر صاحب۔ اندر ایک بازی شطرنج کی لگا لیں ایک ساتھ۔ وقت اچھا گذر جائے گا۔ بھئی بھابھی جی کا بھی دل لگا ہوا ہے ابھی تو۔ ورنہ حکم ملتے ہی آپ تو چل دیں گے۔"

بات مکمل کرتے ساتھ ہی وہ سامنے دھری میز ایک جانب سرکا کر باقاعدہ اٹھ بھی کھڑے ہوئے تو ان کے بشاش لہجے پر سفیر اور ذکیہ خاتون مسکرانے لگے۔

"جی بھائی صاحب۔ بے شک بہت دل لگا ہے میرا یہاں۔ ذرا بھی اجنبیت نہیں محسوس ہوئی۔ ہمیں تو آپ کا اخلاق بہت اچھا لگا ہے۔ اور بالکل لے جائیں منصور کو۔۔۔ کیونکہ میں تو ابھی گھنٹوں نہیں تھکنے والی۔"

جواباً کہتے ہوئے ذکیہ خاتون نے پورے دل سے تسلیم و اعتراف کیا تو شوہر کی اس درجہ خوش اخلاقی پر حیرت سے تقریباً فوت ہوتی راشدہ بیگم نے جلدی سے سنبھل کر ٹکڑا دیا۔

"ارے یہ تو آپ کا بڑا پن ہے بہن۔ ہم سادہ مزاج لوگ ہیں بس۔۔۔ اور آپ بھی ہمیں ایسی ہی لگیں۔ ہمیں بھی آپ سے مل کر اچھا لگا ہے۔ تشریف آوری کا بہت شکریہ۔"

اور ان کی بات پر عجز و تسلیمات کے طور پر سر کو ذرا سا خم دیتے ڈاکٹر منصور عالم اٹھے اور شاہجہاں عادل کی ہمراہی میں ان کے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے یوں جانے پر کوئی جہانِ تحیر ہوگا جسے آنکھوں میں بھر کر

ثومیہ نے پہلے نمرہ اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ وہ سفیر کو ان سب کے مابین اکیلا چھوڑ گئے تھے؟ یا حیرت۔ ۔۔ از حد حیرت۔

"آپ سنائیں بیٹا جی۔ اکتا تو نہیں رہے یہاں آ کر؟"

راشدہ بیگم نے ان کے یوں چلے جانے کو غنیمت جانتے ہوئے سفیر سے آدابِ میزبانی کے طور پر پوچھا تو وہ دلآویزی سے مسکرایا۔ سلام دعا کرنے کے بعد سے اب تک وہ پہلی بار اس سے مخاطب ہوئی تھیں لیکن یہاں بیٹھنے اور پھر گفتگو کی ترتیب بھی کچھ ایسی بنی کہ وہ یہ بات محسوس نہیں کر سکا۔

"بالکل نہیں آنٹی۔ مجھے تو بہت اچھا لگا۔ انکل اور پاپا کی گپ شپ سے کافی لطف اندوز ہوا ہوں میں۔ ہاں جانے کیوں ثومیہ مجھے کافی "ان ایزی" محسوس ہو رہی ہے؟"

اس کے شنگرفی لبوں سے پھوٹتے اس بااعتماد بلکہ واشگاف جملے پر ثومیہ نے اپنی جگہ پر پہلو بدلتے ہوئے بے ساختہ اسے گھور کر دیکھا۔ وہ ذکیہ خاتون کے سامنے اسے کچھ سخت نہیں سنانا چاہتی تھی لہٰذا کمال ضبط سے کسی قدر مصنوعی طور پر مسکراتی فقط یہی بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا ہے تمہارا آنا۔ تمہارا شکریہ کہ تم آئے اور آنٹی انکل کو بھی ساتھ لائے۔"

اور جیسے ہی وہ خاموش ہوئی نمرہ نے آہستگی سے ان کی جانب جھکتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں شکر ہے ساتھ لایا ہے۔ ورنہ اس کی جرات سے بعید نہیں کہ اکیلا بھی دندناتے ہوئے آن دھمکتا کہ ہیلو انکل۔۔۔ میں ثومیہ سے ملنے آیا ہوں۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔"

اور اس کی اس حرکت پر بے تحاشا دانت پیستے ہوئے ثومیہ نے اسے کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھنے کو کہا۔ راشدہ بیگم باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتی کچھ کہنے ہی لگی تھیں کہ سفیر دوبارہ ثومیہ سے مخاطب ہو کر بول اٹھا۔

"اپنا گھر تو دکھایا نہیں تم نے مجھے۔ ویسے یہاں سے تو کافی پیارا لگ رہا ہے۔"

پہلے اپنے دائیں بائیں اور پھر کاندھوں سمیت گردن پوری موڑ کر اپنے بالکل پیچھے دیکھتے ہوئے اس کے

لہجے سے بڑا اشتیاق جھلکتا تھا۔ اس کی بات پر ذکیہ خاتون نے اسے تیزی سے ڈانٹا۔

"کیا بچوں کی طرح شروع ہو جاتے ہو سفیر؟ یوں کرتے ہیں کہیں مہمان جائیں تو۔ چپکے بیٹھے رہو خاموشی سے شاباش۔ اور آپ تو جانتی ہو بیٹا یہ ایسے ہی جو مرضی بول دیتا ہے۔ اس کی بات پر خفامت ہونا۔"

فوراً انہوں نے ثومیہ کو بھی صفائی دینا چاہی تو اس کے کسی بھی جواب سے قبل راشدہ بیگم نے حق میزبانی ادا کیا۔

"ارے نہیں بہن۔۔۔ دیکھنے دیں اسے گھر۔ اس میں کیا ہے؟ جاؤ ثومیہ۔۔۔اسے گھر دکھالاؤ سارا۔"

اور ان کی بات پر دل ہی دل میں تنہائی میسر آنے پر صد شکر ادا کرتی اسے اٹھنے کا اشارہ کر کے وہ کھڑی ہو گئی تو تفاخر سے اپنی ماں کی جانب دیکھتا وہ تقریباً چھلانگ لگا کر اٹھا۔

"باہر صحن سے شروع کرتے ہیں۔ وہاں دیکھنے لائق زیادہ کچھ ہے۔ وہاں میرے پرندے بھی ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔"

یہ کہتے ہوئے ثومیہ نے باہر کی جانب قدم بڑھائے تو وہ سر جھکائے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا تا اس کے پیچھے ہولیا۔ انہیں منظر سے ہٹتے دیکھ کر نمرہ بھی آہستگی سے اٹھی اور بڑے سلیقہ و تہذیب سے ایک ایک کر کے چائے کے سارے برتن سمیٹنے لگی۔

"ایک بات میں لازمی کہوں گی راشدہ بہن کہ آپ سے مل کر سچ مچ مزہ آ گیا۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے بہت عرصے سے کہیں بچپن کی بچھڑی ہوئی کوئی سکھی سہیلی دوبارہ مل گئی ہو۔ آپ بڑی متین طبیعت کی مالکہ ہیں۔ ماشاءاللہ۔ اور آپ کی دونوں بچیاں بھی لاکھوں میں ایک ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ آمین۔ بہت عمدہ شخصیت میں ڈھالا ہے آپ نے ان دونوں کو۔ ان کی ہر ادا سے ایک دوسرے کے لیے بھی اور باقی سب کے لیے بھی صرف محبت و احترام جھلکتا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔"

نمرہ کو بڑی نفاست سے برتن واپس لے جاتے دیکھ کر انہوں نے راشدہ بیگم کا ہاتھ تھام کر نہایت محبت سے کہا تو ان کے رس بھرے انداز پر دل میں ان کی آمد کے حوالے سے ہزار ہا فکروں کے باوجود ان کے لبوں پر سچی مسکان جاگ اٹھی۔ انہیں لگا گویا ان کو اتنے سالوں کی ریاضت کا صلہ مل رہا ہے کہ لوگ ان سے اور ان کی

بیٹیوں سے متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ روح تلک سے مسرور ہوئی تھیں۔

"شکریہ ذکیہ بہن۔۔۔ بس اللہ پاک کا کرم ہے کہ اس نے مثبت سوچیں سوچنے کی توفیق دے رکھی ہے اور شروع سے میری کوشش رہی ہے کہ میری بیٹیاں بہت پر اعتماد لیکن سب کا احترام کرنے والی ہوں۔ ان کے بابا کو پھر بھی ان سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے پر مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ یہ واقعی بڑی فرمانبردار ہیں۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے ان کی اچھائی کو محسوس کیا اور اس کا اعتراف بھی کیا۔ ورنہ آج کل لوگ کسی میں موجود اچھائی کو جلدی تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ جلدی یا بدیر کیا لوگ سرے سے کسی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ آپ کے دل کی شفافیت اور نیک سرشت ہے جو لفظوں سے اظہار کی مانند چھلک رہی ہے۔ جزاک اللہ خیر بہن۔"

جواباً اسی لگاوٹ سے ان کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے اسی قدر محبت سے دبایا تو وہ روح تلک سے راضی ہوئیں۔ اس پل ان کا مثبت رویہ و انداز دیکھ کر انہوں نے بمشکل خود کو رشتے کی بات کرنے سے روکا تھا۔ وہ لوگ گھر سے طے کر کے آئے تھے کہ آج رشتے کی بات ہرگز نہیں کی جائے گی اور گھر واپس آ کر سب کے باہمی مشورے کر بعد ہی اس حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا یا رائے قائم کی جائے گی۔ اب بھی یوں ہوا کہ جیسے تیسے کر کے اپنے دل کو بہلاتے ہوئے انہوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

"میرے متعلق نیک اور مثبت گمان رکھنے کا شکریہ راشدہ بہن۔ مگر ہم سب انسان ہیں، لاکھ اچھے ہو کر بھی کہیں نہ کہیں چوک ہی جاتے ہیں۔ خیر یہ باتیں پھر کبھی سہی۔۔۔ ابھی یہ بتائیں کہ آپ کے اپنے کتنے بہن بھائی ہیں؟ آپ کا میکہ بھی اسی شہر میں ہے کیا؟ یا کہیں اور سے ہیں آپ؟"

اور کمال مہارت سے ان کے موضوع سے ہٹ جانے پر راشدہ بیگم ذہنی طور پر مزید الجھ گئیں۔ اپنے طور پر انہیں یقین تھا کہ وہ لوگ ان سے سفیر کے رشتے کی بات کرنے آئے ہیں اور ابھی براہ راست بھلے نہ کریں لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں بات لازمی کریں گے۔ اور وہ تھیں کہ ان کے تمام اندازوں پر پانی پھیر رہی تھیں۔ ایک پل کو ان کے من میں آیا کہ ان کا اندرون جاننے کی خاطر خود ہی کہہ دیں کہ ثومیہ کی پھوپھو اپنے "ہونہار" سپوت کے لیے اس کے رشتے کی طالب ہیں مگر پھر وہی "بیٹی والے خود سے بیٹی کے رشتے کی بات نہیں کرتے" والا جملہ انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر گیا۔ ایک غیر محسوس سا پہلو بدل کر وہ خوشدلی سے ان کے سوال کا جواب دینے

لگیں تو وہ طمانیت سے مسکرا دیں۔

ادھر آگے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلتے وہ دونوں جیسے ہی لاؤنج سے نکل کر تھوڑا سا آگے صحن میں آئے تو آگے ہی آگے بڑھتی ثومیہ نہایت غصے میں یہ کہتی ہوئی واپس مڑی۔

" تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے سفیر؟ کیا لینے آئے ہو تم یہاں بنا اجازت میرے گھر؟ میں نے روکا تھا کہ نہیں تمہیں؟ ہاں۔۔۔؟؟"

اور اس کے ہاتھ جھلا جھلا کر یوں ایک دم بولنے پر اپنی دھن میں پیچھے آتا وہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

" ارے ارے ارے۔۔۔ دم تو لو یار۔ تم خود تو رکو پہلے ذرا۔ ابھی میں ٹکرا جاتا تم سے۔" اسے دونوں بازوؤں سے تھامتے ہوئے اس نے اسے نہایت محبت سے اپنے مقابل ٹھہرایا تو وہ ایک جھٹکے سے اس سے دور ہوئی۔ اس کوشش میں اس کے سر سے دوپٹہ سرک کر پیچھے گردن پر جا پڑا اور ریشمی بال بکھر گئے۔

" ٹکرا تو میں گئی ہوں تم سے اور ٹکرانے کے بعد اب یقیناً کسی چھناکے سے ٹوٹ بھی جاؤں گی۔ تم جواب دو کہ تمہیں کل منع کیا تھا یا نہیں کہ میرے گھر مت آنا۔ اور۔۔۔ اور مجھے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کل کہ تم سنجیدہ بھی ہو اس پر کہ تم آج آؤ گے۔ تم اتنے گھامڑ کیسے ہو سکتے ہو یار؟ اف۔۔۔ بابا اور نمرہ اور ماما بھی کیا سوچیں گے میرے متعلق؟؟ میں شرم سے پانی پانی ہو رہی ہوں سب کے سامنے لیکن تمہیں اس سے کیا؟ آہ۔۔۔ میں کیوں ملی تم سے؟ کیوں کی تم سے دوستی یار؟ سب میری غلطی ہے۔"

کبھی اسے جھنجھوڑتی اور کبھی ماتھے کے راستے ایک ہاتھ اپنے بالوں میں پھنسا کر انہیں باقاعدہ نوچتی ہوئی وہ عجب عجب پچھتاوے پڑھنے لگی تو سفیر کو پہلی بار لگا کہ کچھ انتہائی غلط ہوا ہے۔ ورنہ جب سے وہ یہاں آیا تھا اس کے مبہم اور پیچیدہ رویے کے باوجود انتہائی ہشاش، خوش اور چوبند تھا کہ باقی سب خوش دکھائی دے رہے ہیں۔

" کیا ہو گیا ہے ثومیہ؟ سب نارمل تو ہیں اندر۔ تمہارے بابا تو اتنے اخلاق و پیار سے ملے اور یہی عالم نمرہ اور آنٹی کی طرف بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ پھر غلط کیا اور کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ، مجھے سمجھاؤ خدارا۔۔۔ اور یہ خوب کہی کہ تم نے تمہیں صرف " کل " یقین نہیں آیا کہ میں سچ کہہ رہا تھا کہ میں آؤں گا۔ تم تو مجھ پر " کبھی بھی " یقین نہیں کرتی ہو۔ میں جو جو بھی، جب جب بھی کہتا آیا ہوں آج تک تمہیں وہ سب بچپنا، دوستی یا بس۔۔۔

بچپنا ہی لگتا ہے۔ ہاں تم غلط ہو ثومیہ کہ تم نے کبھی مجھے سمجھا ہی نہیں۔ میں تم سے "صرف تمہارا دوست" ہونے کے علاوہ بھی بے تحاشا محبت کرتا ہوں اور اس کا ثبوت اندر آئے بیٹھے میرے وہ والدین ہیں جو میری "پسند" کے آگے ہار کر یہاں تم سے ملنے، تمہیں صرف ایک نظر دیکھنے آئے ہیں۔"

فقط ایک پل کو ٹھہر کر وقتی استعجاب سے سنبھلتا وہ بھی اس سے دوبدو ہو گیا تو اس کے لبوں سے پھوٹتے اک ایک لفظ و حرف پر ثومیہ کا دماغ مسلسل جلتا ہی چلا گیا۔

"کیا چیز ہو تم۔۔۔ کیا شے ہو سفیر۔۔۔؟ تمہیں بالکل نہیں معلوم میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟؟ رتی بھر نہیں احساس کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟؟ تم پاگل ہو سفیر اور مجھے بھی پاگل کر دو گے۔ جسے تم مُسلسل "پسند، پسند اور وہ۔۔۔ اپنی محبت" کی رٹ میں رٹ رہے ہو ناں۔۔۔ وہ محبت نہیں ضد ہے فقط۔ "خدارا" تو اب تمہیں میں کہتی ہوں سفیر کہ خدارا یہ چھوڑ دو۔ ہمارے درمیان پہلے صرف "دوستی" تھی۔۔۔ اور اب سے بس "فاصلہ" ہو گا۔ ہمارے درمیان کبھی بھی "محبت" نہیں رہی۔"

اب کی بار نہایت رنج و ملال سے کہتی ہوئی وہ روہانسی ہو کر بولی اور بات مکمل کرتے ہوئے آخرش اس کا لہجہ قطعیت میں بھی ڈھلنے لگا۔ تو اپنی محبت کو اتنی شدت سے رد ہوتے دیکھ کر ازل سے کامل، مکمل اور پورا سفیر بے طرح شکستگی سے جا لپٹا۔

"بس یہی تو رونا ہے ثومیہ کہ محبت ضد نہیں ہوتی۔ کوئی ضد ہوتی تو میں اسے کب سے ہار بھی جاتا۔"

بڑے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں وہ شہزادوں سا لڑکا گویا بلکنے لگا تو اس کا فدائی لب و لہجہ سن کر پہلے سے چڑی ہوئی ثومیہ مزید سلگ گئی۔ بے ساختہ ایک سہمی ہوئی نگاہ سے لاؤنج کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے اسی درشت لہجے میں مزید کہا۔

"بس کرو سفیر۔۔۔ خدا کے لیے بس کر دو۔ میں تمہاری اس بے محل محبت کو جھیلنے کے قابل نہیں ہوں۔ بے دلیل، بے جواز، بے حصار، اور بے سمت محبت۔۔۔ تھک چکی ہوں میں اسے سہہ سہہ کر۔ مجھے تم اس کی اخروی حد بتا دو بس۔۔۔ کہ کب تک اور کہاں تلک۔۔۔ تمام ہو گی یہ؟؟"

آخرش اس کا لہجہ پھوٹ پھوٹ کر رونے جیسا ہو گیا تو تحیر و سکوت سے اسے یک ٹک تاکتے سفیر کو اپنا دل

کسی آہنی شکنجے کی زد میں آیا ہوا محسوس ہوا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کی محبت پر بھروسہ نہیں کر رہی ہے۔۔۔ اور وہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کی محبت پر بھروسہ کیوں نہیں کر رہی ہے؟ افعال و عوامل کی وجوہات کھوجنے میں وہ ہمیشہ سے ناکام ہوتا آیا تھا۔ اب یوں ہوا کہ اس کی بات پر فقط دو گھڑی کے توقف سے اسی منت بھرے لہجے میں وہ پھر سے اپنی محبت پر ڈھال ہونے لگا۔

"محبت دلیل ہوتی تو مانگتا ہی کیوں آخر؟؟۔۔۔ محبت حاشیہ ہوتی تو کھینچتا ہی نہیں۔ محبت زاویوں میں ہوتی تو سمتیں بھلا دیتا۔۔۔ یہ قوسین میں ہوتی تو میں حد میں ہی کہیں رکھتا۔ بس یہ محبت ازل سی ہے ناں تو۔۔۔ سرِ حشر جائے گی۔"

عجب غضب لہجے میں بہت سی دلیلیں، جواز، حصار اور سمتیں اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ بھی روہانسا ہو گیا تو اس کی شاندار لفاظی کے سحر میں آئی وہ بس ٹکر ٹکر اس کی چاشن گر آنکھیں تاکتی رہی۔ اب اسے اپنے مقابل بالکل خاموش کھڑے پا کر جانے کن کن بے قراریوں سے بندھا وہ ایک جھٹکے سے بڑھا اور اسے دونوں بازوؤں سے تقریباً دبوچ کر اچھی طرح سے جھنجھوڑتے ہوئے مزید بولا۔

"تم، تم، تم اور صرف تم۔۔۔ میرے دل کو تو کسی اور سر پر دھڑکنا بھی نہیں آتا۔ اس کی پہلی، واحد اور احد لے بھی۔۔۔ تمہارے نام کی چاہ ہے۔۔۔ تمہاری ذات کی سرگم۔ تمہارے حصار سے باہر بڑا بے وقعت لگتا ہے یہ دل۔"

اور اس کے جارحانہ انداز میں بھی اتنی منت سماجت بسی تھی کہ ایک پل کے لیے ثومیہ کو بھی لگا اس کا ایسا محبت بھرا دل مسمار کر کے وہ واقعی کوئی گناہ کر لے گی۔ اس سے نہیں۔۔۔ اب کی بار اس کی شدتوں سے ڈر کر اس نے پوری قوت لگا کر خود کو اس کی مضبوط گرفت سے آزاد کروایا اور اسے ایک دھکے سے پرے کرتی واپس اندر کی جانب بڑھنے لگی۔ جبکہ لگے ہوئے زوردار دھکے سے فقط دو قدم پیچھے ہوتا وہ تیزی سے سنبھلا اور اسے ایک بار پھر سے "فرار" ہوتے دیکھا تو دوڑ کر اس کی کلائی کھینچتے ہوئے واپس اپنے پاس روک لیا۔ ادھر اس اچانک افتاد سے ثومیہ کے دل کی کتنی دھڑکنیں ردھم توڑ گئی تھیں وہ گن بھی نہیں سکی۔

"پلیز ثومیہ۔۔۔ میرے دل کو یوں بے مول نہ کرو۔ تمہاری خاطر پاگل ہے تو۔۔۔ اسے کھل کے

دھڑکنے دو۔ تمہارے بنا یہ سکون نہیں پا سکے گا۔ تم نہ ملو تو یہ نہیں رہ سکے گا۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور بے پناہ محبت کرتا ہوں۔"

بات مکمل کرتے ہوئے اس کی کلائی چھوڑ کر وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل یوں بیٹھ گیا کہ گویا کوئی داس کسی دیوی کے در پر کوئی بھینٹ چڑھانے آیا ہو۔

ہاں صدیوں کے رتھ پر دھیرے دھیرے سرکتا وقت ان لمحات پر ایک بار پھر سے گواہ ہو گیا کہ جب محبت روگ ہو جائے تو خاص تر چہروں کو اٹھا کر بہت عام سے چہروں کے در پر لا پٹختی ہے۔

ثومیہ نے اسے یوں سر جھکائے اپنے مقابل ہارتے ہوئے دیکھا تو اس کی ساری کوفت، مکمل غصہ اور شکایتیں پوری۔۔۔ سب کا سب کچھ ڈھلنے لگا۔ اس نے گھبرا کر ایک نظر اندر کی جانب دیکھا کہ اس پل وہاں سے نکل کر کوئی اس طرف نہ چلا آئے اور پھر قدرے متوازن اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

"اٹھو سفیر۔۔۔ یوں مت کرو پلیز۔ ہزار محبت ہو تب بھی میں تمہیں نہیں مل سکتی۔ تم صبر کرو پلیز۔ کوئی کسی کے لیے اتنا ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بنا جیا نہیں جا سکے۔ سر وتال، لے یا سرگم بدل کر بھی۔۔۔ دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ میری موجودگی بھی کوئی اس قدر ضروری نہیں تمہاری خاطر۔۔۔ کہ تم جی ہی نہیں سکو گے۔ صبر آتا جائے گا۔ باندھ بنتے جائیں گے۔ تم اٹھو تو سہی پلیز۔"

اور اس کی اس قدر سنگدلی پر حیرت در حیرت اسے دیکھتا وہ ایک مخصوص ردھم سے اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تو اس کی شکوہ کناں آنکھوں سے نظریں چراتی وہ گویا اپنے یوں پتھر ہو جانے کی وضاحت پیش کرنے لگی۔

"میں تمہیں کبھی ہاں نہیں کہہ سکتی سفیر۔۔۔ کیونکہ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ جو شاید میں کبھی بیان نہیں کر سکوں گی۔ اور خدارا اب تم جاؤ یہاں سے۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔ میں نے کہا ہے ناں کہ صبر کرنا تو بس صبر ہی کرنا تم۔ صبر تمہیں آ جائے گا۔ یقین کرو۔۔۔ بالآخر محبت پر بھی صبر آ ہی جاتا ہے۔"

اس کی بات سن کر دو قدم بڑھتے ہوئے ایک بار پھر اس کے مقابل پورے قد سے رکتا وہ بڑے کرب، بڑی اذیت سے مسکرا دیا تھا۔

"تمہارے نہ ہونے کا احساس میرا ضبط آزمانے لگے تو میں معیارات پر پورا نہیں اترتا۔ سارے باندھ کھو

دیتا ہوں اور میں چپکے سے بس رو دیتا ہوں۔ محبت کی ہوناں۔۔۔ تو اس پر صبر نہیں آتا ثومیہ۔ محبت ہے۔۔۔ کوئی مرگ تھوڑی ہے۔" اس کی روشن تر آنکھوں میں جھانکتا وہ یوں حرف حرف پھونکنے لگا کہ ثومیہ کو لگا کہ اس کی آنکھیں کسی گرم سیال میں گھل گھل کر پگھلنے لگی ہیں۔ ہاں اس پل اسے سچ مچ لگا کہ اس کی آنکھیں بہہ گئی ہیں۔ اسے کل صبح یونیورسٹی میں اس سے کہے گئے اپنے الفاظ یاد آئے۔

"دنیا کو تماشے مت دکھاؤ خدارا۔ محبت کی ہے ناں۔۔۔؟ تو اس پر صبر بھی کرنا سیکھو۔ ہاں سفیر۔۔۔ محبت صرف محبت نہیں ہوتی۔۔۔ محبت مرگ ہوتی ہے۔"

وہ اس کے لفظوں کو کسی قدر الٹ کر اسی پر پلٹ رہا تھا۔ تو گویا کمال تر حرف گری کا حامل، شفاف آنکھوں والا وہ اداس تر لڑکا مصطفین شجاع۔۔۔ سفیر احمد میں بھی آن بسا تھا۔

"میرے پاس تمہاری کسی بات پر بحث کے لیے وقت نہیں ہے سفیر۔ بالکل متوازن رہ کر اندر آؤ شاباش۔ بابا اور انکل بھی شاید اب تک واپس لاؤنج میں آ چکے ہوں۔ ہمیں اظہار و مفر کے اس لمحے سے اسی پل چھوٹنا ہوگا۔ ہاں سفیر۔۔۔ ہمیں اب بچھڑنا ہوگا۔ اس پل، اس لمحے اور اس گھڑی کے لیے۔۔۔ صرف اور صرف خدا حافظ۔"

بے بس و شکستہ لہجے میں دھیرے دھیرے فقط یہی کہہ کر اس نے اسے جی بھر کر ایک آخری نگاہ دیکھا اور اس کی آنکھوں سے ہٹ کر تیزی سے لاؤنج کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ پیچھے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر دباؤ بڑھاتے ہوئے اس نے سرد ہوئے پڑے گالوں کو گرم کیا اور ساکت نگاہیں اٹھا کر بڑی خاموشی سے دور آسمان کی وسعتوں میں ٹمٹماتے ستاروں کو تاکنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی خوش رنگ سمندری جزیرے پر پانیوں کے عین وسط میں بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ ایسا راہی کہ جس سے اس کا کنارہ چھوٹ گیا ہو۔

محبت کا کہیں کوئی آخری کنارہ نہیں ہوتا۔۔۔ یہ جہاں بھی چھوڑ دے وہ منجدھار ہی کہلائے گا۔ پھر بھلے اس پل آپ کائنات کی کسی آخری حد، کسی اخروی نقطے پر ہی کیوں نہ رکے ہوں۔ آپ یورشوں کے عین وسط میں ہو۔

☆......☆......☆

واپسی کے لیے اپنے گھر کے سفر میں وہ دونوں میاں بیوی از حد مسرور جبکہ سفیر دل ہی دل اندر بے طرح پریشان رہا۔ وہ دونوں خوش تھے کہ انہیں ثومیہ بے حد پسند آئی تھی۔ گو کہ شاہجہان عادل کے ملفوف رویہ و انداز پر دونوں میاں بیوی کو ہی کافی تحفظات و خدشات تھے لیکن اس کے باوجود انہیں یہ فیملی اپنے اکلوتے بیٹے کے سسرال کے طور پر بہت اچھی لگی تھی۔ سفیر اپنے والدین کے چہروں پر رقم مسرت و شوق کے یہ سب تاثرات پڑھتا ثومیہ کی جانب سے نہایت سختی سے کی گئی اپنی محبت کی تردید و سرزنش کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کے تردیدی رویے کی بدولت وہ از حد ملول ہوا۔ گھر پہنچ کر ذکیہ خاتون اور ڈاکٹر منصور عالم صحن پار کر کے اندر کی جانب بڑھ گئے اور وہ ایک پل کو ٹھہر کر دروازے کو کنڈی کرتا ہوا سست روی سے چلتا ان کے پیچھے آیا۔ اندر آ کر بھی انہیں سٹنگ کے صوفوں پر براجمان ہوتے پا کر وہ خاموشی سے اوپری منزل کو جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تو ایک زوردار انگڑائی لیتے ہوئے ڈاکٹر منصور عالم نے اسے بڑی حیرت سے پکارا۔

"تم اوپر کہاں جا رہے ہو؟ آ جاؤ ناں یار یہیں۔۔۔ تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں۔"

اور ان کی پکار پر سیڑھیوں کی ریلنگ چھوتا ہوا وہ ایک لمحے کو رکا۔

"کل میرا آخری پیپر ہے بابا۔۔۔ مجھے اس کی تیاری کرنی ہے۔ صبح ملتے ہیں ان شاء اللہ۔"

فقط یہی کہہ کر وہ پہلے قدمچے پر چڑھا کہ اس کے جواب پر ڈاکٹر منصور عالم کی آنکھوں میں یکا یک جاگ اٹھی فکر و حیرت پڑھتی ذکیہ خاتون اسے چھیڑنے کے سے انداز میں بولیں۔

"اچھا تو کیا یہ جاننے میں بھی تمہیں کوئی دلچسپی نہیں کہ ثومیہ ہمیں کیسی لگی؟ اتنا بھی نہیں پوچھو گے۔"

اب کی بار عجیب انداز میں مسکراتا وہ بڑے اسرار سے لپٹا ہوا بولا۔

"میں جانتا ہوں ماما وہ آپ دونوں کو بہت اچھی لگی ہے۔ اسے سب لوگوں کو اچھا لگنے کا ہنر آتا ہے۔"

اس کے سمجھ میں نہ آنے والے انداز پر ذکیہ خاتون پہلی بار فکر مند ہوئیں۔

"کیا بات ہے سفیر؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟ تم ایسے بجھے بجھے سے کیوں ہو؟ وہاں تو بالکل ٹھیک تھے۔ پھر راستے میں کیا ہوا؟" ان کے لہجے میں ہزاروں اندیشے کلبلانے لگے تو اسے اپنے انداز کا احساس ہوا کہ کیفیات عیاں کرنے لگا ہے۔

"افوہ۔۔۔ کوئی بات نہیں ہے ماما۔ سیکنڈز لگتے ہیں آپ کو میری اتری ہوئی شکل دیکھ کر پریشان ہونے میں۔ جبکہ مجھے بس پیپر کی فکر تھی۔ خیر۔۔۔ میں بیٹھتا ہوں کچھ دیر۔ بعد میں پڑھ لوں گا۔ سنائیں کیسا لگا وہاں جا کر؟ اور آپ کو بابا؟ کیسے لگے سب؟"

سرسری و عام لہجے میں کسی قدر بشاشت سے کہتا وہ واپس ان کے پاس آ بیٹھا اور سوالیہ نظروں سے باری باری ان کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"بھئی مجھے تو بہت اچھے لگے سب۔ لڑکیاں دونوں بہت سلجھی ہوئی ہیں۔ راشدہ بہن کا تو جواب نہیں۔۔۔ انتہائی محبت اور خلوص سے بات کرتی ہیں۔ دھیما لب ولہجہ ہے۔ مزاج میں تیزی یا کاٹ نام کو نہیں دکھائی دیتی۔ ہاں بھائی صاحب کچھ الجھے ہوئے سے لگے ہیں۔ جب ہمیں دروازے پر ملے تو ثومیہ ان سے کافی ڈری ڈری سی لگی۔ باقی دنیاداری یا برادری کا خیال کریں تو گھر بھی خوبصورت ہے۔"

اس کے یوں لوٹ آنے پر ذکیہ بیگم نے خوشی خوشی اپنی رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر منصور عالم کی طرف دیکھا تو ایک مبہم ہنکارا ابھر کر بنا کسی توقف کے وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"ہاں آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ سبھی لوگ۔۔۔ بہت اچھے ہیں۔ اور ثومیہ شاید ان سے بہت ڈر رہی تھی کہ اس کے حوالے سے یوں اجنبی مہمانان کی آمد پر وہ اسے غصہ یا خفا ہوں گے۔ لیکن میرے خیال سے ان کے رویے میں وہ الجھاؤ ہماری بنا اطلاع آمد کے سبب رہا ہوگا۔ ورنہ بعد میں تو وہ بالکل متوازن گفتگو کرتے رہے۔ ٹھیک ٹھاک ہنستے بولتے رہے۔ اب یہ بھی حقیقت ہے کہ مردوں کو عورتوں جیسا بچھ بچھ جانا نہیں آتا۔ یعنی میرے خیال سے سب کچھ ٹھیک اور مناسب ہے۔ ہاں ایک بات میں نے یہ بھی مخصوص کی ہے کہ دونوں بچیاں اپنے باپ کی نسبت ماں سے زیادہ قریب ہیں اور ایسا تو یقیناً ہر گھر میں ہوتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس پر کچھ تجسس رکھا جائے۔"

ان کے سیر حاصل تجزیے پر سفیر چپ چاپ انہیں بس دیکھتا رہا جبکہ ذکیہ خاتون نے تحمل سے ان کی بات سن کر جوابی تبصرہ کیا۔

"بات تو آپ کی درست ہے۔ ہمارے یوں اچانک جا پہنچنے پر ان کے وقتی چونک جانے یا حیرت کا شکار

ہونے پر ہمیں کسی قسم کے واہموں میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسے موقع پر یہ تو کسی کا بھی عمومی رویہ و تاثر ہو سکتا ہے۔ بہر حال۔۔۔"

قدرے سنجیدگی سے اتنا کہہ کر فقط ایک لمحے کا توقف بھرتے ہوئے وہ سفیر کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"یہ تو ماننا پڑے گا کہ ہمارے سفیر کی پسند لاجواب ہے۔ بہت سلجھی ہوئی اور بے حد اچھی لڑکی۔۔۔ سچ مچ اس کی ادائیں انتہائی سادہ اور دل موہ لینے والی ہیں۔ ٹھیک کہتے تھے تم جاناں۔۔۔ وہ سب سے الگ اور جدا سی ہے۔ اور یہ بھی کہ میں اس سے ایک بار ملوں گی تو کبھی بھول نہیں سکوں گی۔ بلاشبہ وہ ایسی ہی ہے۔"

اور ان کے یوں دل کھول کر سراہنے پر لبوں کو بھینچتا وہ مبہم سا مسکرا دیا۔

"شکریہ ماما۔۔۔"

فی الوقت اس کے پاس انہیں کہنے کے لیے اس سے زیادہ کوئی لفظ نہیں بچے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ اسے اپنے والدین کے ان تبصروں سے کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی یا اپنی محبت کی یوں صریح و واضح تر تردید سے اسے ثومیہ سے لگاوٹ نہیں رہی تھی۔۔۔ اپنے اندرون میں کہیں وہ بڑا خوش اور مطمئن تھا کہ اس کے والدین کو بھی اس کی پسند بھا چکی ہے۔ لیکن محبت کی ایما پر ثومیہ کے دوٹوک لہجوں کی زد میں آیا وہ اب تک اس کے لفظی حصار سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ اسے اس کا بنا کوئی عذر بتائے خود کو رد کرنا کسی طور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"چلو اللہ بہتر کرے گا۔ اس حوالے سے ان دونوں کے مقدر میں جو بھی لکھا ہو گا وہ اچھا ہی ہو گا۔ ان شاء اللہ۔ بس ان کے پیپرز کے بعد ہم جلد دوبارہ جائیں گے اور اب کی بار ہم ان سے رشتے کی بات بھی کریں گے۔ ہوں۔۔۔؟؟"

اسے گم سم پا کر ڈاکٹر منصور عالم نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا تو وہ چونک گیا۔ اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ ذکیہ خاتون بول اٹھیں۔

"ہاں ان شاء اللہ ضرور۔ میں تو آج بھی خود کو بمشکل روک سکی ہوں۔ راشدہ بہن کا انداز اتنا حوصلہ افزاء تھا کہ میں بس کہتے کہتے رکی ہوں۔ خیر اللہ وقت لائے ہم ان شاء اللہ جلد دوبارہ جائیں گے۔"

اور انہیں یوں بصد شوق و مسرت اس ذکر سے لپٹے دیکھ کر سفیر کے لب بس تھرا کر رہ گئے۔ تمام ارادے

موخر کرتا وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔
" آپ لوگ بیٹھیں ماما۔۔۔ میں بس اب پڑھوں گا جا کر۔ ایک دو ٹاپکس رہتے ہیں میرے ری-وائز ہونے والے۔ اور مجھے تیاری کر کے سونا ہے۔ صبح مجھے جلدی جگا دینا آپ۔ شکریہ۔ خدا حافظ۔"
بات مکمل کرتے ہوئے ایک پل بھی رکے بنا وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھتا چلا گیا تو اس کی چوڑی پشت کو تاکتے ہوئے "شب بخیر۔۔۔" کے لفظ ان کے ہونٹوں سے کسی سرسراہٹ کی مانند نکلے۔
" اسے کیا ہوا ہے منصور؟ مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ کچھ نہ کچھ ہوا ہے ضرور۔ جس کا ہمیں نہیں پتا۔"
تادیر اسے قدم قدم زینوں پر چڑھتے دیکھتی وہ اس کے نظروں سے بالکل اوجھل ہو جانے پر واپس اپنے شوہر کی طرف مڑیں اور پر فکر لہجے میں سراپا حیرت ہوتے ہوئے پوچھا۔ ان کی آنکھوں میں موجزن بے پناہ اندیشوں پر وہ فوراً سے پیشتر ہاتھ جھلاتے ہوئے بولے۔
" جانے دیں گے بیگم جان۔۔۔ وہم ہے بس آپ کا۔ میں بہت اچھے سے جانتا ہوں آپ کے پسر کو۔ اوپر اوپر سے بن رہا ہے بس۔ اندر سے بھرپور سرشار ہے یہ۔ بالکل فکر مت کریں۔ کمرے میں جا کر بھی پڑھے گا نہیں بالکل۔ بس اسی کو سوچے گا۔ بہت خوش ہے وہ۔ یقین کریں محترمہ۔۔۔ اور اسے چھوڑ کر اب کچھ توجہ و فکر ادھر کی بھی پال لیں کہ ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔"
اور بات مکمل کر کے ان کا دھیان بٹانے کی خاطر آخرش وہ انہیں چھیڑنے بھی لگے تو ان کی دلکش لفاظی و فدا کن انداز پر اپنا ہاتھ تھامنے کے لیے آگے کو بڑھا ہوا ان کا ہاتھ جھٹکتی ہوئی وہ بے طرح جھینپ کر بولیں۔
" بس بھی کریں منصور۔۔۔ قسم سے کہیں بھی شروع ہو جاتے ہیں آپ۔ بالکل پتا نہیں چلتا آپ کو کہ جوان بیٹا گھر میں ہر پل ساتھ ہوتا ہے۔ اس نے اپنے بوڑھے ماں باپ کے یہ سب لگاوٹی مظاہرے دیکھے تو کیا سوچے گا بھلا؟"
ان کے جواب پر انھوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا تو انہیں مصنوعی خفگی سے گھورتی وہ سیڑھیوں کے اوپری سرے کی جانب یوں دیکھنے لگیں گویا سفیر وہاں کھڑا انہیں خاموشی سے تاک رہا ہو۔
پھر یوں ہوا کہ شوہر کی دلکش گفتگو میں لگ کر وہ سفیر کی بے وجہ چپ اور سنجیدگی کو وقتی طور پر بالکل بھول

گئیں۔ ڈاکٹر منصور عالم اور ان کے مابین ایسی ہی لاجواب محبت تھی۔
نہایت خاموشی اور غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کی فکروں کو چن لینے والی۔

☆......☆......☆

گھر سے "مہمانان" کے نکلتے ہی وہ دونوں بہنیں شاہجہان عادل سے کنی کتراتی ہوئی چائے والے برتن دھونے کا بہانہ کر کے باورچی خانے میں پناہ گزین ہو گئیں جبکہ راشدہ بیگم وہیں لاؤنج کے صوفوں پر ان کے سامنے مجرموں کی طرح بیٹھ رہیں۔ ان کا خیال تھا سفیر کے یوں اپنے والدین کو ان کے گھر لانے پر متوقع تماشا ابھی شروع ہوا کہ بس اب۔۔۔ لیکن شاہجہان عادل فقط ایک گہری نگاہ ان پر ڈال کر خاموشی سے ایک طرف رکھا صبح کا اخبار اٹھاتے ہوئے ناک پر عینک جمانے لگے۔ یوں گویا اس موضوع پر ان کا کسی بھی قسم کی گفتگو یا جرح کا کوئی ارادہ سرے سے ہو ہی نہیں۔

"یا اللہ یہ چپ کیوں ہیں؟ کچھ تو کہیں بھلا۔"

تین چار منٹ بعد انہیں بھرپور انہماک سے اخبار کا مطالعہ کرتے دیکھ کر انہوں نے دل میں جزبز ہو کر سوچا۔ اپنے عمومی مزاج کے برعکس صرف ان کا اندر جاننے کے لیے وہ اس خوف کا سامنا کر رہی تھیں کہ آخر وہ کیا کہتے ہیں؟ ایک دو بار بے وجہ گلا کھنکارتے ہوئے انہوں نے انہیں اپنی موجودگی کا احساس بھی دلانا چاہا لیکن وہ یوں استغراق میں بیٹھے رہے جیسے اگلے ہی چند لمحات میں ان سے تمام تر صفحات کا لفظ لفظ سنا جائے گا۔ وہ بہت بدمزہ ہوئیں لیکن کمال ضبط سے ان کے بولنے کی منتظر رہیں۔ اتنے موسم اکٹھے گذار کر وہ ان کی مزاج آشنا ہو چکی تھیں لیکن آج کا ان کا رویہ ان کی سمجھ سے بھی بالاتر تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھیں ہنگامہ ہوگا۔۔۔ اور یہاں کوئی لعنت ملامت بھی نہیں تھی۔

"اف۔۔۔ اب کہہ بھی چکیں جو کہنا ہے۔ میری کمر اکڑنے لگی ہے۔"

کافی دیر بعد پوری طرح زچ ہو کر وہ دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہوئیں تو اگلے ہی پل انہیں سر اٹھا کر خود کو دیکھتے پا کر حیران رہ گئیں۔

"ہیں۔۔۔ پہلے تو کبھی ایسا "دلی تعلق" نہیں رہا ہمارا کہ یہ میرے دل کی بات سمجھ لیں۔"

بے ساختہ انہوں نے خود سے سرگوشی کی اور مفاہمتی نظروں سے ان کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

"یہاں بیٹھ بیٹھ کر پتھر ہونے کی بجائے اب سو جاؤ بیگم۔ بڑا وقت ہو گیا ہے۔ اور جانے سے پہلے مجھے ایک گلاس پانی دیتی جاؤ۔ بے وقت کی پیاس لگ گئی ہے۔"

بھاری آواز میں دیا گیا حکم پا کر انہیں اچھنبے سے دیکھتی "جی اچھا۔۔۔" کہہ کر وہ کسی روبوٹ کی مانند اٹھیں۔

"تو سچ مچ انہیں اس پر کچھ بھی نہیں کہنا؟ یا اللہ یہ معاملہ کیا ہے؟"

قدم قدم باورچی خانے کی جانب بڑھتے ہوئے وہ خدا کو پکارنے لگیں۔ ان کا اک ایک رویہ و انداز انہیں بہت حیران کیے ہوئے تھا۔

"یہ ایسے تو نہ تھے۔۔۔"

مزید یہ سوچتے ہوئے اندر داخل ہو کر انہوں نے ثومیہ اور نمرہ کو برتن دھونے کے بعد کچن سنک کے پاس نہایت متفکر انداز میں یونہی کھڑے پایا تو جلدی سے ان کے قریب آئیں۔

"وہ تو کچھ بول ہی نہیں رہے۔ بالکل خاموشی سے اخبار پڑھے جا رہے ہیں۔ اب جانے دل میں کیا ہے۔ بولیں کچھ تو سمجھ آئے ناں۔"

وہ جانتی تھیں کہ وہ دونوں انہی کی منتظر ہیں لہٰذا باری باری ان کی سوالیہ نظروں میں جھانکتی ہوئی بہت پریشانی سے بولیں۔ ان کی بات پر ان دونوں نے نا سمجھنے کے سے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ نا قابلِ یقین بات۔۔۔ میرا تو خیال تھا بس اب جو بھی ہو وہ ایک عالم دیکھے گا۔ حسبِ سابق وہ اتنا بولیں گے کہ اہلِ محلّہ بھی بخوبی و بہ احسن سن سکیں گے۔ لیکن یہ کیا؟ وہ بالکل چپ کیسے ہیں؟ ضرور کوئی بات ہے ماما۔ یہ طوفان سے پیشتر مہیب سناٹے جیسی بات ہے۔ لکھ لیجیے۔۔۔"

جواباً یہ کہتے ہوئے نمرہ نے ہوا میں ہاتھ جھلا جھلا کر پیشگوئی کی تو ثومیہ نے بے ساختہ لبوں پر انگلی رکھ کر کہا۔

"اوہو تم آہستہ تو بولو یار۔ بابا سے پہلے تم سناؤ گی محلے کو۔ آہستہ نہیں بولا جاتا تم سے؟ پاگل۔۔۔"

اور اسے گھور کر وہ فوراً راشدہ بیگم کی جانب مڑی۔

"تو اب کیا کریں ماما؟ آپ خود پوچھ لیتیں بھلا۔"

اس کے یوں کہنے پر انہوں نے اسے جوابی گھوری ڈالی تو ان کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر وہ مزید بولی۔

"میرا مطلب ہے کسی طرح، کسی بہانے ذکر شروع کر دیتیں ان کا تو یقیناً کچھ نہ کچھ تو وہ ضرور بولتے۔ آپ سفیر کی ماما کی ہی کوئی بات کر دیتیں۔ ایسے تو نمرہ کی بات بجا ہے بالکل کہ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کے مقابل آئے پہلے خیمے جیسی ہے جو کہ بظاہر پرسکون ہو کر بھی جب مرضی یا اچانک ہی اکھڑ جائے گا۔"

بات مکمل کر کے اس نے حسبِ عادت دونوں طرف سے بالوں میں ہاتھ پھنسا کر اپنا سر تھام لیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر ریک میں سے شیشے کا گلاس اور چھوٹی ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ان سب باتوں کو خود سے چھیڑنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے وہ چپ ہیں تو چپ ہی رہیں۔ جو بھی اندر وہ سوچ رہے ہیں باہر تو لازمی آئے گا۔ بہرحال میں انہیں پانی دے کر کمرے میں جا رہی ہوں۔ تم دونوں بھی اب باورچی خانے کی بتی گل کر کے اپنے کمرے میں جاؤ۔ باقی کل دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟"

حتمی انداز میں رائے دیتے ہوئے انہوں نے "ڈسپنسر" میں سے گلاس میں پانی بھرا اور ٹرے میں رکھتی ہوئی انہیں باورچی خانے سے باہر نکلنے کا اشارہ کر کے خود بھی نکل گئیں۔ پیچھے انہیں مزید کچھ کہنے کی خواہش کو دل میں دباتی ثومیہ شانے جھٹک کر نہایت بے بسی سے نمرہ کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے بھی پہلے ایک طویل سانس بھر کر خارج کیا اور پھر اپنی لاچاری کے اظہار کے طور پر اسی کے انداز میں شانے جھٹک دیئے۔

"چلو یار پھر ماما کی موجودگی میں ہی بابا کے سامنے سے گذر جائیں۔ بعد میں پوری رات بھی یہیں رکنا پڑا تو میں رکوں گی لیکن بابا کے سامنے سے گذر کر کمرے میں نہیں جاؤں گی۔"

اسے خاموش پا کر یکایک ہی اسے کلائی سے تھامے ہوئے وہ سرعت سے بڑھی اور باہر نکلنے سے قبل بورڈ پر ہاتھ مارتے ہوئے بتی بھی بجھا دی۔ یوں اچانک کھینچے جانے پر نمرہ بمشکل سنبھل سکی تھی۔

"ارے دم تو لو یار۔ آہستہ ثومیہ۔۔۔ اف۔۔۔ میرا بازو تو چھوڑو۔ میں آ رہی ہوں ساتھ ساتھ۔"

چھوٹی سی راہداری میں اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی چلتی وہ اس کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی آزاد

کروانے کی تگ ودو کرنے لگی تو اسے فوراً اپنی سختی کا احساس ہوا۔

"اوہ سوری یار۔ آجاؤ بس۔ ماما چلی ہی نہ جائیں۔"

اس کی کلائی پر جما ہاتھ ہٹا کر اس نے فقط ایک نظر مڑ کر اسے دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز میں کہتی ہوئی تیز قدموں سے لاؤنج میں داخل ہوگئی۔ وہاں ان سے بس ایک لحظہ قبل پہنچی راشدہ بیگم اپنے شوہرِ نامدار کے سامنے نہایت ادب سے پانی پیش کر رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کی پشت پر دھیرے دھیرے جم سی گئیں۔ گلاس کو ناک کے سامنے پا کر انہوں نے اخبار چھوڑتے ہوئے لال انگارہ آنکھیں پہلے راشدہ بیگم اور پھر ان دونوں پر گاڑ دیں تو ان کی روح تک فنا ہونے لگی۔ ثومیہ کو ان کی آنکھوں میں ایسا تاثر نظر آیا گویا اسے چبا جائیں گے۔

"تم دونوں سوئیں نہیں اب تک؟"

گلاس تھام کر انہوں نے براہ راست ثومیہ سے پوچھا تو اس کے لب آپسی دہانوں پر بس پھڑک کر رہ گئے۔ اسے لگا آواز کسی گولے کی مانند اس کے گلے میں ہی کہیں اٹک گئی ہے۔ ان کے رعب سے آج بہت عرصے بعد اس پر باقاعدہ لرزہ طاری ہونے لگا۔ اسے پتا تھا آج سراسر اس کا دوش ہے اور وہ غصے میں حق بجانب ہیں۔

"بس اب گونگی بن جاؤ سب۔ منہ سے کچھ پھوٹنا مت۔ میں پوچھ رہا ہوں سونے نہیں گئیں اب تک؟"

پانی کے دو گھونٹ نگلتے ہوئے انہوں نے مزید سختی سے پوچھا تو خشک گلے کو رطوبتوں سے بمشکل تر کرتی ثومیہ جلدی جلدی بول اٹھی۔

"بب۔۔۔ بس جا رہی ہیں بابا۔ وو۔۔۔ وہ ہم۔۔۔ ہم برتن دھو رہی تھیں۔"

اس کے منہ سے یہ جملہ بہت ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا اور اسے اپنی ہی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ اور رہی نمرہ تو اس پل اس کی حالت شاید سب سے بدتر تھی۔

"یوں ماما کے پیچھے پیچھے بابا کے سامنے آکر تو ہم نے آ بیل مجھے مار والا حساب کر لیا ہے۔ یہ تو اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مارنے جیسی بات ہوگئی آج۔ اف۔۔۔ یہ سارے محاورے مجھے مارنے پیٹنے سے متعلق ہی کیوں سوجھ رہے ہیں آج؟ یا اللہ سوچوں کا یہ سارا الٹ پھیر ہر غلط جگہ پر میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ خدایا مجھے غیاب کی قوت دے دے۔ آمین۔"

دل ہی دل میں طرح طرح کی سرگوشیاں کرتے ہوئے وہ خود کو بمشکل سنبھالے کھڑی تھی۔

"اچھا چلو جاؤ اب۔ یوں تن کر میرے سامنے نہ کھڑی ہو دونوں۔ میں پہلے ہی بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔ بالآخر گلاس واپس میز پر رکھنے کے لیے جھکتے ہوئے ان کی حالت پر رحم کھا کر انہوں نے انہیں جانے کی اجازت دی تو ان کے آخری جملے پر ان دونوں کے کان بیک وقت کھڑے ہوئے۔

"کک۔۔۔ کیا سوچ رہے تھے بابا؟"

جانے کو قدم بڑھاتے ہوئے بھی ثومیہ کے جسم و جاں کے ہر ایک ذرے سے یہ سوال انتہائی تجسس میں ملفوف ہو کر پھسلا تو انہوں نے اسے بری طرح گھورا۔ ان کی ان شعلہ جوالا نظروں سے ہی گھبرا کر سارا شوق و تجسس وہیں پھینکتی وہ تیزی سے کمرے کی جانب بڑھ گئی تو اس کی کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے نمرہ یوں میکانکی انداز میں اس کے پیچھے چلی گویا ریل کا کوئی ڈبہ اپنے انجن سے بندھا ہوا ہونے کے سبب اپنے آپ سرکنے لگتا ہے۔

ان کے نکلنے پر راشدہ بیگم نے میز پر دھرا گلاس اور ٹرے بھی اس نیت سے اٹھا لیے کہ کمرے میں جاتے ہوئے انہیں واپس باورچی خانے میں رکھ دیں گی۔ اور جونہی انہوں نے کمرے کی سمت قدم بڑھائے شاہجہان عادل کی رعب دار آواز پر تھم سی گئیں۔

"آج دوپہر میں شہوار کا فون آیا تھا۔ فوری منگنی کی رسم یا نکاح کا تقاضا کر رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ ثومیہ کے آج کل یونیورسٹی میں حتمی پرچے ہو رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھی کہ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔"

ان کی بات مکمل ہونے پر انہوں نے انہیں یوں دیکھا جیسے ان کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ سامنے کی بات بھی سمجھنے میں انہیں کچھ پل تو ضرور لگے تھے۔ ادھر اپنے کمرے سے فقط چند قدم کی مسافت پر موجود ان دونوں بہنوں نے بھی ان کا یہ جملہ من وعن پوری صراحت سے سنا اور اپنے پیروں پر آگے پیچھے بتدریج جمتے ہوئے ان دونوں کی حالت و کیفیت بھی ہو بہو اپنی ماں کی سی تھی۔

"لیکن ایسے کیسے کر دیں منگنی یا رسم؟ اسے ہاں کب کی ہم نے رشتے کے لیے؟"

راشدہ بیگم کی پھٹی پھٹی نگاہوں میں یکا یک غصہ عود آیا اور لہجہ بھی انتہائی سختی میں ڈھل گیا۔ اس پل بیٹی کے مستقبل کا دفاع کرتے ہوئے وہ یکسر بھول گئیں کہ ابھی کچھ دیر قبل وہ اپنے آپ میں شوہر سے باقاعدہ پناہ مانگ

رہی تھیں۔ خود ساری زندگی بھلے جتنی بھی کمزور رہی ہوں لیکن بیٹیوں کا مستقبل طے کرتے ہوئے تمام ترمائیں ایسی ہی بہادر ہو جاتی ہیں۔

"زیادہ انجان مت بنو راشدہ بیگم۔۔۔ تمہیں بخوبی علم ہے کہ مجھے اس رشتے پر اول روز سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب جب کہ اس کی تعلیم پوری ہو رہی ہے تو اسے ہاں کرنے میں تامل کیسا؟ بس میں کہہ چکا ہوں اس سے کہ جب مرضی آئے۔ ایک دو روز میں اسے حتمی طور پر بلاؤں گا۔ تم بس اسے کہہ دو کہ کل کا آخری پرچہ دے کر آئے اور رسم کے لیے ذہنی طور پر تیار رہے۔ میں اس پر مزید کوئی بھی بحث، حجت یا دلیل و جواز ہرگز نہیں سنوں گا۔"

چٹانی لہجے میں انہوں نے گویا اپنے فیصلے پر مہر یقین ثبت کی تو بات کو اس قدر بگڑتے دیکھ کر وہ گلاس، ٹرے واپس میز پر رکھتی وہیں صوفے پر ایک جانب بیٹھ رہیں۔ ادھر ثومیہ کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر نمرہ نے فٹافٹ خود کو سنبھالا اور گھوم کر اس کے بالکل سامنے رکتے ہوئے اسے شانوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

انہیں یوں سر تھامے ہوئے صوفے پر بیٹھے دیکھ کر شاہجہان عادل اپنی جگہ سے اٹھے اور طنزیہ لب ولہجہ میں مزید گویا ہوئے۔

"اور ہاں اسے یہ بھی سمجھا دینا کہ کل پرچہ نمٹانے کے ساتھ ساتھ اپنی دوستیاں بھی ساری وہیں نمٹا کر آئے۔ آج تو میں خاموش رہا ہوں کیونکہ مجھے لگ رہا تھا اس کی غلطی نہیں اتنی۔ وہ لڑکا بنا اسے بتائے آیا ہے یقیناً۔ مجھے پتا ہے کہ اس کی اتنی جرات نہیں کہ اسے گھر بلاتی۔ لیکن آئندہ میں خاموش نہیں رہوں گا۔ میں اس بات کا جواب بھی نہیں پوچھتا کہ اسے ہمارے گھر کا پتا، میری جاب کی تفصیلات اور ہمارے فیملی ممبران کے متعلق اتنی معلومات کیسے ہوئیں؟ اور بس یہی میری حتمی رائے ہے اس پر کہ آئندہ اس کی وجہ سے کوئی بھی یوں منہ اٹھا کر ہمارے گھر نہ چلا آئے۔ ہاں میری بات کو "یونہی" خیال کرنے کی غلطی مت کرنا۔ بھرپور سنجیدگی سے لینا اس کو۔"

اور بڑی درشتی سے بات مکمل کرتے ہوئے وہ نکلتے بھی چلے گئے تو ان کی تندوترش باتوں سے راشدہ بیگم کا دل خون رونے لگا۔ آنکھوں میں آئے بے تحاشا آنسوؤں کے ساتھ وہ وہیں پتھر ہو گئی تھیں۔

ادھر باپ کی جانب سے ادا کیے گئے ان نوکیلے لفظوں کا اک ایک نشتر ثومیہ کو اپنی روح تک میں اترتا ہوا سا لگا۔ اس کی ریزہ ریزہ حالت و کیفیت بھانپ کر نمرہ نے اسے پوری قوت سے تھام نہ لیا ہوتا تو یقیناً وہ اپنے پیروں میں ہی گر جاتی۔

"اندر چلو آپی۔۔۔ پلیز ہمت کرو۔"

اسے دونوں بازوؤں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے وہ بمشکل بڑھی اور پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولتے ہوئے اسے تقریباً گھسیٹ کر پلنگ پر لا بٹھایا۔

"تم بیٹھو آپی میں ماما کو دیکھ کر اور پانی لے کر آتی ہوں۔ رونا مت پلیز اس کا کوئی حل سوچتے ہیں۔"

پھولی ہوئی سانسوں میں کہہ کر، اپنا دوپٹہ درست کرتی وہ راشدہ بیگم کی فکر میں باہر کی جانب بڑھی تو بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام کر ثومیہ نے خالی خالی نگاہوں سے اسے مسلسل دیکھا۔

"وہ میرا سارا غرور توڑ گیا ہے نمرہ۔۔۔ اب اس بات کا کوئی حل نہیں ہے۔ یہاں آ کر وہ مجھے بے مول کر گیا ہے۔"

کچھ توقف سے جب وہ بولی تو یوں لگا گویا وہ اندر سے شکست تسلیم کر چکی ہے۔

"میں کس منہ سے انہیں روکوں نمرہ۔۔۔؟ کس اکڑ پہ کہوں کہ میں سچی ہوں؟ انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میری کوئی شکایت نہیں آئے۔ یہاں تو وہ خود آیا ہے۔ میرا پورا جرم بن کے۔۔۔"

سفیر کی آمد کے متعلق اس کی یہ بڑبڑاہٹیں سن کر نمرہ کو اپنا آپ بہت ارزاں، بڑا خالی محسوس ہوا۔ اس کے پاس اسے دینے کو تسلی کے دو بول تک نہ بچے تھے کہ وہ واقعی اسی بدولت ہار رہی تھیں۔ باپ کے فیصلے کے مقابل ڈٹنے کے لیے ان کا قد چھوٹا پڑنے لگا تھا۔

"میں آتی ہوں ثومیہ۔۔۔ ماما باہر اکیلی ہیں۔ میرے خیال سے بابا جا چکے ہیں۔"

اسے جواباً کچھ نہیں سوجھا تو فقط یہی حروف اس کی سراپا سوال ہوئی اٹھی آنکھوں پہ رکھتی وہ اپنا ہاتھ چھڑواتی ہوئی باہر بھی نکل گئی تو اسے لہراتے ہوئے دوپٹے کے ساتھ دروازے سے پار اوجھل ہوتے دیکھ کر اس کی ساکت آنکھوں میں عجب سا کوئی عزم جھلکنے لگا۔

"اب تم واپس مت آنا نمرہ۔۔۔ آج تم بھی کہیں اور ہی سونا۔ آج مجھے کچھ مت سمجھانا۔ آج میں کچھ نہیں سمجھوں گی۔ ہر بار سفیر کی بے جا ضدوں سے واقف ہو کر بھی اس پر اتنا اور ایسا بھروسہ کرتے ہوئے میں غلط تھی۔۔۔ میں غلط ہوں۔۔۔ اور اب مجھے اس غلطی کی سزا بھی بھگتنے دو۔ مجھے یہ رات اکیلے کاٹنی ہے۔۔۔ اور بس۔"

اس کے پیچھے کئی اذیت ناک لمحات و افکار سے بندھی وہ کسی شکست خوردہ کنیز کی مانند اٹھی اور دروازے کو اندر سے کنڈی کر لیا۔

کچھ بھی ہو جاتا وہ آج رات یہ دروازہ نہیں کھولنے والی تھی۔ آج اسے کوئی تسلی، دلاسہ یا ہمت کی تھپکی نہیں چاہیئے تھی۔

ہاں آج اسے اداس تر آنکھوں کے ساتھ ساتھ گلال رنگت کا غم بھی رونا تھا۔

ہاں آج محبت کے نوحوں کے ساتھ ساتھ اسے دوستی پر بھی اشک بہانے تھے۔

اپنے بابا۔۔۔ پھوپھو شہوار۔۔۔ یا فواد سے بھی وہ کیا لڑتی؟ رشتوں کی یہ جنگ وہ اپنی دوستی کے ہاتھوں ہاری تھی۔

اسے کسی سے کچھ نہیں کہنا تھا۔۔۔ کوئی مزاحمت، کوئی صفائی۔۔۔ کوئی وضاحت۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔

یہاں بھی آج "شبِ غم" تھی یقیناً۔۔۔

☆......☆......☆

ان تینوں کے پاس رات بھر جاگنے کے چونکہ بہت سے محرکات واسباب تھے لہٰذا یونیورسٹی پہنچے تو ہر ایک کی آنکھوں میں لال ڈورے تیر رہے تھے۔ ثومیہ ساری رات سفیر کی اپنے گھر آمد اور اس آمد کے باعث اپنے لیے پیدا ہوئی مشکل صورتحال کا غم مناتی رہی تھی۔ اسے باپ کے سامنے اپنا غرور و وقار کھو دینے کا از حد ملال تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ درِ اندرون ہی کہیں اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ وہ مصطفین کو بتا نہیں سکی کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بھی تمام رات اسی کے فکر و خیال میں گم گشتہ رہا ہے۔ اس نے بھی

شب بھراس سے اظہارِ محبت نہ کرسکنے کا درد جھیلا ہے۔ رہا سفیر تو اس کی رات ثومیہ کے سخت و تلخ لہجے اور درشت لفظوں کی نذر ہوئی۔ ہر سمت، ہر نہج اور ہر پہلو پر بے تحاشا سوچ سوچ کر بھی وہ ایسی کوئی ایک بھی وجہ کھوجنے سے قاصر تھا کہ جس سے اپنے دل کو تسلی و تقویت دے سکے کہ ہاں ثومیہ نے "اس وجہ" سے مجھے انکار کیا ہے۔

عجب اذیت میں جلتا وہ بھی پوری رات ان دونوں کا "ہمدرد" ہو کر جاگا تھا۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ صبح ان سب کی زیست میں ہمیشہ ٹھہر جانے کے لیے طلوع ہوئی ہے۔ سفیر سب سے پہلے یونیورسٹی پہنچ کر مصطفین، مریم اور خصوصاً ثومیہ کی آمد کا منتظر تھا۔ وہ بہر طور اس سے اپنی محبت کو یوں شدت سے رد کیے جانے کی کوئی مضبوط وجہ پوچھنا چاہتا تھا۔ وہیں صحن میں دھرے بڑے سجاوٹی پتھر کے پاس یہاں سے وہاں مسلسل چکراتے ہوئے وہ عجب بے قراریوں سے لپٹ رہا تھا۔ بالآخر سوئے قسمت باقی دونوں میں سے کسی کی آمد سے قبل ثومیہ ہی اسے مرکزی گیٹ عبور کرتے ہوئے اپنی جانب آتی ہوئی دکھائی دی تو دل میں لاکھ شکایات کے باوجود وہ پورے دل سے مسکرا دیا۔ لیکن یہ کیا۔۔۔؟ اسی کی طرح دور سے ہی اسے دیکھ کر بھی وہ اسے یکسر نظر انداز کرتی اندر ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتی پختہ روش پر سیدھی چلنے لگی تھی۔

"اے رکو تو ثومیہ۔۔۔ میں کب سے انتظار کر رہا ہوں یہاں۔"

بھاگ کر اس کے پیچھے آتا وہ اسے روکنے کے لیے اس کے آگے ہو گیا تو اس نے اسے بے طرح گھورا۔

"تو کیا کر سکتی ہوں؟ میں نے تمہیں فرمائش تو نہیں کی تھی کہ میرا یوں انتظار کرنا۔ میری طرف سے تو تم پر کوئی بندش نہیں تھی۔" بڑی سہولت سے کہتے ہوئے وہ ایک طرف سے آگے ہو نکلی تو اس کے لب و لہجہ اور خصوصاً انداز پر وہ چونک اٹھا۔

"یہ تم کس طرح مخاطب ہو مجھ سے؟ آج آخری روز تمہیں یہ کہنا یاد آیا ہے؟ میرے خیال سے تو یہاں رک کر ایک دوسرے کا انتظار کرنا ہم میں سے کسی پر بھی کسی کی بھی طرف سے کوئی بندش یا فرمائش نہیں ہے۔ یہ بس دوستی اور دل کی بات ہے۔ سب کا ذاتی اور غیر محسوس سا چناؤ۔۔۔"

جرح کے سے انداز میں کہتا ہوا وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تو جواباً کچھ بھی کہے بنا وہ مُسلسل آگے بڑھتی رہی۔ اور اس کا یوں نظر انداز کرنا اسے بے حد تپا گیا۔

"یہ تم ایسے اجتناب کیوں برت رہی ہو مجھ سے؟ ایک منٹ یہیں رکو اور رک کر میری بات سنو تو میہ۔۔۔"

بے ساختہ اسے بازو سے تھام کر اپنے مقابل روکتا وہ مزید بھی کچھ کہنے لگا تھا کہ اپنی گرفت کی بدولت ٹوٹتی ہوئی اس کی دو تین چوڑیوں کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اور وہ اس بار غصے سے بھری ہوئی تقریباً چیخ کر بولی۔

"دور رہو مجھ سے سفیر اور بات کرنے کی جرات تو بالکل بھی نہ کرو۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی اور بس یہ طے ہے کہ کوئی بات نہیں کرنی۔ ہٹو پرے۔ میرے پیچھے مت آؤ۔"

پوری قوت لگا کر اپنے بازو سے اس کا ہاتھ جھٹکتی ہوئی وہ ایک پل بھی رکے بنا ڈیپارٹمنٹ کی داخلی سیڑھیاں چڑھ گئی تو احساسِ تذلیل سے سفیر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا رویہ اسے دھتکارنے کا سا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس سے یوں پیش آئے گی۔ رتجگے کے باعث پہلے سے بہت لال اس کی حسین تر آنکھوں میں شدتِ ضبط سے گویا خون بھی اتر آیا۔

"ٹوہیل ود۔۔۔ پاگل لڑکی۔ میں مرے جا رہا ہوں اور اسے پرواہ بھی نہیں۔"

غصے کے اظہار کے طور پر ہوا میں مکا لہرانے کے بعد اپنے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے اس نے باقاعدہ انہیں نوچ لیا اور ایک پل کو ٹھہر کر دھیرے دھیرے نزدیک آتے طلبا کی جانب دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ ان میں سے کس کس نے ان دونوں کی یہ "جھڑپ" مشاہدہ کی ہے۔ لیکن ان کے متوازن چہروں سے اسے پتا لگ گیا کہ ان دونوں کے سوا اس واقعے پر کوئی بھی اور شخص و فرد گواہ نہیں ہوا۔ اس حوالے سے اس نے اطمینان کا سانس خارج کیا کہ آج یونیورسٹی کے آخری دن ان کا تماشا نہیں بنا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جو تماشا آج ہونے والا تھا یہ تو اس کے مقابل کچھ بھی نہیں۔ من ہی من اندر بے شمار جلتے ہوئے نہایت شکستگی سے چلتا وہ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا اور راہداری کے آخری سرے میں جا کر ایک کھڑکی کی کشادہ سل پر ٹکتے ہوئے باہر یونیورسٹی کے مرکزی گیٹ کی جانب تاکنے لگا۔

مصطفین اور مریم پرچہ شروع ہونے سے بس کچھ ہی دیر پہلے کمرہ امتحان میں پہنچے۔ ان کی آمد سے قبل وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت فاصلے رکھ کر اپنی اپنی نشست پر براجمان ہو چکے تھے۔ اور چونکہ پرچے میں بیٹھنے کی ترتیب لگنے کے دوران یوں دور دور بیٹھ جانا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہوتی کہ جس پر چونکا جائے لہٰذا

اپنی نشستیں سنبھال کر دور سے ہی انہیں باری باری ہاتھ ہلا کر وش کرتے ہوئے ان دونوں کو بھی قطعاً محسوس نہیں ہوا کہ ان کے مابین کوئی مسئلہ چل رہا ہے یا بحث ہوئی ہے۔ پرچے کے شروعاتی لمحات میں ہر جماعت میں جو افراتفری اور ہنگامہ سا جاری رہتا ہے اس میں لگ کر مریم اور مصطفین کو اس بات کا بھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت لاتعلق، کھنچے کھنچے اور کسی قدر بیزار و ناراض بھی دکھائی دے رہے ہیں۔

خیر قصہ المختصر یہ کہ پرچہ شروع ہوا تو باقی جماعت کے ساتھ سر جھکائے وہ سب بھی خاموشی سے پرچہ حل کرنے میں جت گئے۔ یہاں دور دور بیٹھا ہوا ہونے کے سبب ان چاروں نے بہت ہی کم کبھی ایک دوسرے کی جانب نگاہ کی ہوگی کہ بند مٹھی سے ذرہ ذرہ سرکتے ہوئے وقت نے پرچے کو اختتام کے بالکل قریب لا پہنچایا۔

ثومیہ نے سب سے پہلے پرچہ حل کیا اور ممتحن صاحب کو پکڑاتے ہوئے بس ایک نگاہ مریم اور مصطفین کی طرف دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کی سوجن زدہ آنکھوں میں ایسا کوئی رنگ و ملال بسا تھا کہ مصطفین کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ وہ ان سے ملے بنا یونیورسٹی سے نکل جائے گی۔

ہاں بالکل۔۔۔ عشق کامل ہو تو الہام ہوا کرتے ہیں۔

اس کے پیچھے اس نے بڑی تیزی سے قلم چلاتے ہوئے اپنے پرچے کے آخری سوال کو تمام کیا اور نشست کی پشت پر سے اپنا بیگ اتارتے ہوئے کاندھے پر منتقل کرتا بڑی عجلت میں ممتحن تک آیا۔ پرچہ ممتحن کو تھماتے ہوئے اس نے باری باری مریم اور سفیر کو جلدی باہر آنے کا اشارہ کیا اور باقی نشستوں پر بیٹھے طلبا کے گرد سے بچتا بچاتا کمرہ امتحان سے باہر نکل گیا۔

راہداری میں نکل کر اس نے پہلے دائیں اور پھر بائیں ایک متلاشی نگاہ دوڑائی تو وہ اسے دور اس راہداری کے خارجی زینوں کی جانب بڑھتی دکھائی دی۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔

"اوئے میڈم۔۔۔ کہاں جا رہی ہو؟ کم از کم آج تو "ملو" ہم سے۔ آج تو ہمارا آخری روز ہے۔"

اس سے فقط دو قدم دور رکتا وہ ذومعنی لہجے میں بولا تو لال آنکھوں میں جہاں بھر کی تشنگی لیے وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔

"میرا مطلب ہے پرسوں بھی بنا بتائے، بنا مجھ سے ملے ہی چلی گئی تھیں اور یہی کام تم آج بھی کرنے والی

ہو۔ مجھ سے کوئی گلہ ہے کیا؟ مریم کو بھی یہی فکر رہی کہ جانے کیوں تم مل کر نہیں گئیں؟"

اس کی آنکھوں میں اپنے جملے" کم از کم آج تو ملو۔۔۔" سے متعلق تیرتی ہوئی کھوج کو پڑھتا وہ اس کے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی وضاحت بھی کرنے لگا تو وہ عجب یاسیت سے مسکرائی۔

" آسان نہیں ہوتا۔۔۔ اس میں بڑا درد پوشیدہ ہے۔ کبھی بھی نہ ملنے سے زیادہ درد وقتی طور پر مل کر بچھڑ جانے میں ہے۔ اس سے بس پناہ مانگو مصطفین۔۔۔ اس کی خواہش، آرزو یا جستجو نہیں کرو۔"

جواباً اس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتی وہ واشگاف لہجے میں بولی تو اس کی اس جرات پر وہ بے ساختہ نگاہ جھکا گیا۔ اس کی ذو معنی بات کا اس نے پورا جواب دیا تھا۔

" آؤ وہاں سیڑھیوں پر بیٹھتے ہیں۔ یہاں کھڑے کھڑے ہی سب گفتگو ہوگی کیا؟"

یونہی آنکھیں جھکائے ہوئے کہہ کر اس نے گویا اس لمحے سے فرار چاہا تھا۔ اور جونہی اس نے قدم بڑھائے، قدم قدم اس کے ساتھ چلتی یہ کہتے ہوئے وہ گویا اسے پھر سے اسی جاں گسل لمحے کے ایک نئے سرے پر باندھنے لگی۔

" تمہاری آنکھیں اتنی لال کیوں ہیں؟ شب بھر جاگتے رہے ہو کیا؟ یہ آج گلال رنگت میں شامل ملال کیسا ہے؟ کون سی ایسی فکر، سوچ یا خیال ہے جس نے تمہیں یوں سونے ہی نہیں دیا؟ تمہیں کس بات کا غم ہے مصطفین؟"

بڑے ملفوف انداز میں پوچھے گئے اس کے اس بے ضرر سوال میں ایسا کوئی لہجہ اور ایسے کچھ لفظ پنہاں تھے کہ جو مصطفین شجاع کا دل کچلنے لگے۔

عشق کے ہاتھ لگا ہوا لہجہ۔۔۔ درد کے در پہ آئے ہوئے لفظ۔۔۔

زینوں پر رک کر وہاں بیٹھنے سے قبل اس نے خون رنگ آنکھوں سے صرف ایک بار اس کی چشمِ تر میں جھانکا اور وہاں آخری امید کے طور پر فقط خود کو جلتے دیکھ کر نگاہیں چراتا نیچے بیٹھتے ہوئے بولا۔

" آنکھوں میں لالیاں نہیں ہوتیں۔۔۔ شبِ غم سونے کی اجازت نہیں دے تو خواب پتلیوں میں خوں ہو کر اچھلتے ہیں۔ میری آنکھوں کی سرخی اور میری رنگت کا حزن بھی سب۔۔۔ میرے خوابوں کا نوحہ ہے۔

میرے سپنوں کے لاشے ہیں۔ وہی خواب اور وہی سپنے کہ جو رہگزارِ زیست میں بہت دور کہیں۔۔۔ دھول ہو گئے ہیں۔"

بات مکمل کر کے اوپر کی جانب دیکھتا وہ اس کے بیٹھنے کا منتظر ہوا تو اس کے زخم لہجے میں بسے کرب و ملال سے بندھی وہ ایک مخصوص ساکتی ردھم سے اس کے بالکل ساتھ ٹک گئی۔ اس سب گفتگو میں اس کے روشن تر چہرے پر تاریک سائے لہرانے لگے۔۔۔ کہ ہاں عشق کے ہاتھوں ہاری وہ ایک سیاہ بخت لڑکی تھی۔ وہ یوں ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی گویا اس کی تقدیر کے گرد آدھی کالی گرہیں اس محبت نے ہی باندھی ہوں۔ بخت کے پنجرے توڑ کر وہ جتنے بھی پر پھیلا لیتی۔۔۔ یہ روشن تر چہرہ اور یہ عزیز تر شخص اس کی دسترس میں تھا ہی نہیں۔

"سچ کہتے ہو مصطفین۔۔۔ سب سچ کہتے ہو۔ عشق رنگت نکھار دیتا ہے اس سے نہیں مفر لیکن۔۔۔ یہ کمبخت کہیں بخت کے حاشیوں سے جا لپٹے تو مساوات بدل جاتی ہے۔ ہاں اس میں فقط لالیاں نہیں ہوتیں۔۔۔ کسی کسی کے حصے کی سیاہیاں بھی ہوتی ہیں۔"

اس کی تائید میں جو اس نے بولنا شروع کیا تو پورا لہجہ بلک گیا تھا۔ بس اس سے اب مزید ضبط نہیں ہو سکتا تھا۔ محبت میں کوئی ملے نہ ملے۔۔۔ پر یوں بچھڑے بھی نہیں کہ لفظ دل کی سل پر نشتر خنجر ہونے لگیں۔ ہاں اس کا دل کٹنے لگا تھا۔ ہاں سفیر کی محبت کو بڑے مضبوط لہجوں اور دوٹوک لفظوں میں ٹھکراتی ثومیہ شاہجہاں کو مصطفین شجاع سے بنا اظہار ہوئے بچھڑن کا غم تھا۔

اب یوں ہوا کہ اپنی باتوں کے جواب میں اسے باقاعدہ آنسوؤں سے روتے دیکھ کر وہ بے طرح مچل گیا۔ وہ اسے کسی طور یوں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے آنسو اسے کائنات بھر کا عوض بھی روکنے پڑتے تو وہ روک لینے کو تیار تھا بالکل۔

"کیا ہوا ثومیہ۔۔۔؟ پلیز رونا تو بند کرو۔ دیکھو تمہیں روتے ہوئے دیکھ کر مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ پلیز یار۔ سنبھالو خود کو۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی کہ لایعنی و بے مقصد باتوں کے سبب رونے لگ جایا جائے؟ "خدا" کے لیے چپ کر جاؤ۔۔۔"

بے ساختہ کانچ کی چوڑیوں سے پُر اس کا دایاں ہاتھ کھینچ کر اپنے ہاتھوں میں دباتا وہ اسے خاموش کروانے

لگا تو اپنی چوڑیوں کو اس شخص کے ہاتھوں میں کھنکتے ہوئے دیکھ کر، پورے باندھ توڑتی وہ گھٹنوں میں سر دیئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہی وہ پل تھا جب متلاشی نگاہوں سے انہیں ادھر ادھر تاکتی مریم وہاں پہنچی اور انہیں باہم یوں "محو و گم" پا کر انہیں تنگ کیے بنا ایک طرف رک گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ان آخری پلوں میں وہ دونوں اپنا تعلق کیسے نبھاتے ہیں بھلا؟ ہاں وہ اس کہانی کی ابتدا سے لے کر اب تک گزرے اک ایک پل اور کیفیت پر عین عین گواہ رہی تھی۔

"ہر بار اس ذکر کو تم لایعنی نہیں کہہ سکتے۔ یہ سب بے مقصد ہرگز نہیں ہے مصطفین۔ میری زندگی کا حاصل۔۔۔ میری ذات کی کمائی ہے۔ میں تمہیں کیسے کہوں کہ میں......"

تڑپ کر اس کی بات رد کرتی گفتگو ادھوری چھوڑ کر وہ پھر سے رونے لگی تو انتہائی بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھتا وہ نچلی سیڑھی پر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔

"اچھا تم رونا تو بند کرو۔ میں اب اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ پلیز چپ کر جاؤ یار۔ "صرف میرے" لیے چپ کرو۔"

اور مسلسل سسکتی وہ جو "خدا کے لیے۔۔۔" بھی چپ نہیں کی تھی "صرف اس کے لیے۔۔۔" یکا یک ساکت ہو گئی۔ اسے خاموش پایا تو بنا کسی توقف کے اس نے گفتگو کو نئے موڑ اور نئی نہج پر لے جانا چاہا۔ ایسی سمت کہ جس پر وہ خود سے کبھی بھی اس سے بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آج آخری روز ہونے کی بدولت وہ مجبور ہو گیا تھا۔

"اب آنسو صاف کرو شاباش اور دھیان سے میری بات سنو۔ میں جو بھی کہوں گا اس پر بھرپور غور و فکر کرنا تم۔ اوکے؟"

اس کے صحرائی لہجے میں ایسا کوئی آب تھا کہ صدیوں سی پیاسی وہ بنجران لڑکی ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اس بات پر ان کی نظر کے زاویوں سے اوجھل ہو کر کھڑی مریم نے بھی مزید کان لگائے۔ وہ انتہائی متجسس ہوئی کہ گفت و شنید کو اتنے اہم پیرائے سے ہٹا کر وہ کس پہلو پر لے جانا چاہتا ہے۔

"تمہارے اور سفیر کے مابین جو بھی کشمکش چل رہی ہے میں اس سے واقف ہوں ثومیہ۔ پلیز تم اس کی

محبت پر یقین کرلو۔ میں اول روز سے جانتا ہوں کہ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ اور سچ بات تو۔۔۔"

سفیر کی محبت کے لیے سفارش کرتے ہوئے اس نے ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ اس کے یوں کہنے پر، پہلے پہل ہوئی بے پناہ حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں واپس کھینچ لیا۔

"بس کرو مصطفین۔۔۔ بہت کہہ لیا۔ اس سے دوستی کا حق خوب ادا کیا تم نے۔ بس اس سے آگے اب کوئی ایک لفظ بھی مت کہنا۔ اور نہیں سنوں گی میں۔"

اس کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں وہ اس قدر تیزی سے بولی کہ اس تلخی پر وہ اور مریم دونوں چونک اٹھے۔

"لیکن کیوں ثومیہ۔۔۔؟ اس کی محبت کے جواب میں تم ہر بار کیوں ایسا رویہ اپناتی ہو کہ جس سے صرف نظر اندازی جھلکتی ہے؟ اس کا تم سے محبت کرنا یا تم سے شادی کی خواہش رکھنا اتنا غلط کیسے ہے کہ تم اسے یوں مُسلسل رد کرو؟ بتاؤ یار۔۔۔ ایسا کیوں ہے؟"

اب کی بار نا چاہتے ہوئے بھی مصطفین کا لہجہ اسی کے جیسا تلخ و تند ہو گیا تو اس کے یوں جرح کرنے پر اس نے غصہ و رنج کی ملی جلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔۔۔ یعنی میں سمجھتی رہی کہ تمہیں علم ہی نہیں اس بات کا کہ وہ مجھ سے اظہارِ محبت کرتا ہے تبھی تم نے کبھی ذکر نہیں کیا اس بات کا۔ لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ یہاں تو تم اس کے ساتھ ساتھ شامل ہو۔" بڑے صدمہ و تاسف سے بات مکمل کرتی وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھی کہ بے ساختہ اس نے اسے ہاتھ سے تھام کر واپس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہ کوئی جرم ہے کیا یار؟ اس میں کہاں غلط ہے وہ؟ یا میں کہاں غلط ہوں؟ بتاؤ مجھے پلیز۔ آج تو لازمی بتاؤ۔"

اور اس کے یوں مصر ہونے پر بے تحاشا تپی ہوئی وہ سلگے ہوئے لہجے میں باقاعدہ چیخ پڑی۔

"کیا جس سے محبت کی جائے اس سے اظہارِ محبت بہت ضروری ہوتا ہے مصطفین؟؟؟ اور کیا یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ایسی ہر محبت کو تسلیم بھی کر لیا جائے جو آپ کے باقی رشتوں کو کہیں جڑ سے ہی اکھاڑ سکتی ہو؟"

دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے تھام کر باقاعدہ اسے جھنجھوڑتی ہوئی وہ جانے کون کون سی اذیت رونے لگی

تھی کہ وہ بالکل ساکت ہو گیا۔

" کیا جس سے محبت کی جائے اس سے اظہارِ محبت بہت ضروری ہوتا ہے مصطفین ؟؟؟"

اس کے جملے کا اک ایک لفظ اس کے کانوں کے گرد حروف کی مانند کھل کرنا چنے لگا۔ دائیں بائیں نظریں پھیرتا وہ یہاں سے غیاب چاہنے لگا کہ اسے بری طرح ہلاتے ہوئے وہ مزید جرح کرنے لگی۔

"اب یہ مت کہنا کہ تم کسی سے محبت نہیں کرتے ہو لہٰذا تمہیں اس سب کی نہیں خبر۔۔۔ تم کہو بھلے نہیں کہو لیکن جانتے تو تم بھی ہو کہ میں بھی سب جانتی ہوں۔ ہاں مصطفین اب نگاہیں مت چراؤ تم۔ اوپر میری طرف دیکھو۔"

اس کی معنی خیز بات پر اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتی وہ انہی رواں جذبات و کیفیات میں بہتی ہوئی مزید بولی۔

"چلو آج بتاؤ کہ جب ہر محبت کو تسلیم کرنا بہت ضروری ہوتا ہے تو وہ جو اپنی محبت کو چھپا چھپا کر رکھیں ان کا کیا؟ چلو آج یہ بھی واضح کر دو مصطفین شجاع کہ تمہیں ثومیہ شاہجہاں سے محبت نہیں ہے۔ کہہ دو کہ ہر بار میری جانب اٹھتی تمہاری ہر ایک نگاہ مجھ سے جھوٹ کہتی ہے۔۔۔ سراسر فول بکتی ہے۔۔۔؟ جواب دو مصطفین۔۔۔ مجھے آج تم سے ہر سوال کا جواب چاہیئے۔ بڑے آئے تم اس کے سفارشی بن کر۔۔۔"

بات مکمل کر کے اسے سوالیہ نگاہوں کے حصار میں رکھتی وہ یوں ہانپنے لگی گویا صدیوں کی مسافت کر کے اس لمحے میں آن رکی ہو۔ ہاں اس گھڑی کے لیے وہ صدیوں پار ہی آئی تھی۔

اس پل اداس تر آنکھوں کا حامل وہ دراز قد لڑکا اس کے قدموں میں یوں جامد بیٹھا تھا گویا کسی ماورائی کہانی میں کوئی حسین تر داس اک اپسرا یا دیوی کے چرنوں کو نہایت عقیدت سے چھونا چاہے۔

اس خاموشی یا توقف کے فقط ان چند لمحات میں ہی اس منظر میں آگے جو ہوا وہ مریم کے لیے بے حد پریشان کن رہا۔ اس نے دیکھا کہ جانے کب کمرہ امتحان سے نکل کر سفیر اس کے بالکل قریب آ چکا ہے۔ ان دونوں کی گفتگو سننے میں محو ہو کر وہ اس کی آمد پر دھیان نہیں دے سکی تھی۔ ابھی اسے بالکل قریب پا کر کبھی اسے اور کبھی رخ پھیر کر ایک نظر ان دونوں کی طرف دیکھتی وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اس وقت کیا ردعمل ظاہر کرے۔

اور اس کے ذہن و دل میں جاری اسی یک لمحاتی کشمکش میں ہی وہ اس کے ساتھ آن رکا۔

"تم یہاں کیا۔۔۔"

اس کا سوال لبوں پہ ہی تھا کہ ثومیہ کی آواز پر وہ بے طرح چپ ہوا۔

"بتاؤ مصطفین۔۔۔ کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں؟ اور یہ بھی کہہ دوں کہ تم مکر نہیں سکو گے آج۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔"

پہلے کی طرح اس کے شانے ہلا کر پوچھتے ہوئے اس کے لفظ تھے۔۔۔ سیال تھا۔۔۔ یا کوئی لاوا جو کہ کسی نے سفیر احمد کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔ اس نے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ صرف ایک نگاہ باہر زینوں پر ڈالتے ہوئے اپنی دوستی کا خون ہوتے دیکھا اور بے یقین سی بے یقین آنکھیں واپس مریم پر جما دیں۔ اس نے جواباً تسلی کے طور پر بے ساختہ اس کا شانہ سہلایا اور لب کچلتے ہوئے باہر جھانکنے لگی۔

"مصطفین ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ نہیں وہ اسے جھٹلا دے گا۔ نہیں مجھے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔"

بری طرح دھڑکتے ہوئے اپنے دل کو تھپکتا وہ مصطفین کا جواب سننے کے لیے بے قرار ہو گیا۔

"ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں ثومیہ۔ بے شک میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ لیکن۔۔۔ ایسی محبت کہ جو۔۔۔"

بالآخر مصطفین بولا تو ایک طرف جمے سفیر کی آنکھیں حیرت پھٹ پڑیں۔ اور اس کے لبوں سے جاری یہ ورد ابھی ادھورا ہی تھا کہ نہایت سرعت سے اپنی جگہ سے چھوٹتا وہ ان دونوں کے عین سامنے جا رکا۔

"تو یہ تھی تم دونوں کی رام کتھا۔۔۔ بھئی واہ۔ میں تو ایسے ہی سمجھتا رہا ہمیشہ کہ میں اس کہانی کا مرکزی کردار ہوں۔ اصل کہانی تو یہاں تم دونوں کے مابین جاری ہے۔"

ان دونوں کو اس کی طنزیہ آواز سن کر پتا چل سکا کہ وہ نا صرف ان کے اوپر کھڑا ہے بلکہ ان کی گفتگو کا انتہائی خطرناک ٹکڑا سن چکا ہے۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے بڑی متحیر نظروں سے ان دونوں نے بیک وقت اسے دیکھا اور پھر وہ دونوں ایک مخصوص ردھم سے اپنی اپنی جگہ پر ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔

"سفیر پاگل ہو گیا؟ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔"

مصطفین نے وضاحت وصفائی کے ضمن میں کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ اس نے انگلی کے اشارے سے اس کی جانب دیکھے بنا اسے ٹوک دیا۔

"فی الوقت تم بالکل خاموش رہو۔ ابھی مجھے صرف اس سے بات کرنی ہے۔"

اس کا لب ولہجہ اس قدر دوٹوک تھا کہ بے بس نظروں سے ثومیہ کو دیکھتا وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ بمشکل خود کو متوازن کرتی مریم بھی اسی پل وہاں "نمودار" ہوئی۔ اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ سفیر کو آتے ہوئے کیوں نہیں دیکھ سکی؟ دیکھ لیتی تو یقیناً یہ سب صورتحال اس حد تک سنجیدہ رخ اختیار نہیں کرتی۔

"جی تو یہ تھی تمہاری وہ انتہائی مضبوط وجہ کہ جس کی بدولت تم پہلے مجھے مُسلسل انکار کر رہی تھیں اور آج تو باقاعدہ دھتکار بھی دیا؟"

ایک زینہ اتر کر اس کے بالکل سامنے تن کر کھڑا ہوتا وہ جواب چاہنے لگا تو ثومیہ رخ ہی بدل گئی جبکہ مصطفین اور مریم نے حیرت در حیرت ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ وہ اس "آج باقاعدہ دھتکارے جانے" سے یکسر بے خبر تھے۔

"تم غصے میں ہو سفیر اور اس وقت تمہیں کچھ سمجھایا بھی تو تم نہیں سمجھ سکو گے۔"

ثومیہ کو رخ بدلتے دیکھ کر مصطفین نے پھر سے ٹکڑا دیا ہی تھا کہ بے تحاشا تپا ہوا وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"بکواس کی ہے ناں تم سے کہ تم سے مخاطب نہیں ہوں میں؟ تو منہ بند رکھو تم اپنا۔ آواز نہیں آئے مجھے تمہاری۔ سمجھے۔۔۔؟"

اس کی آنکھوں کے سامنے تنبیہی انداز میں انگلی نچاتے ہوئے وہ دھمکی دینے کے سے انداز میں بولا تو اس کے اندر کا زمیندار بھی ایک منٹ سے پہلے جاگ اٹھا۔

"یہ انگلی نیچے کرو یار اور تہذیب سے بات کرو۔ بالکل سلیقے کے ساتھ۔ ورنہ۔۔۔"

اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کمال ضبط کے ساتھ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو سفیر کے سر سے لگ کر پیروں پہ بجھی۔

"ورنہ کیا اوئے؟ کیا ورنہ۔۔۔؟ ایک تو دھوکے باز ہو اوپر سے ڈھٹائی دیکھو اپنی۔"

جواباً اس کا گریبان پکڑتے ہوئے اس نے ایک جھٹکا دے کر پوچھا تو مریم اور ثومیہ دونوں بیک وقت درمیان میں آ گئیں۔

"پاگل ہو گیا سفیر؟ بلکہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ تم ہو ہی پاگل۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ابھی اپنی حالت دیکھو تو کچھ بھی سمجھنے کی کیفیت میں نہیں ہو تم۔ چھوڑو اس کو۔ میں کہتی ہوں چھوڑو بھی۔۔۔"

اس کی مٹھی پر گرفت کر کے مریم اس کا گریبان چھڑوانے کی تگ و دو کرتے ہوئے بولی تو مصطفین نے مزاحمت ترک کر دی۔ وہ اس کی طرح بات کو بے وجہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔

"تمہیں سمجھ نہیں آ رہی بات اس کی؟ چھوڑو اسے سفیر۔ مجھ سے بات کرو جو بھی کرنی ہے۔ چھوڑو بھی اسے۔۔۔"

اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر بالآخر ثومیہ نے بھی اسے مخاطب کیا تو بنا کسی توقف کے ایک جھٹکے سے مصطفین کو خود سے دور کرتا وہ ثومیہ کو تھام کر جھنجھوڑنے لگا۔

"تو یہ تھی تمہاری محبت ثومیہ۔۔۔؟ یوں چاہ کی تم نے؟ آہ......کیا کہوں تمہیں۔۔۔؟؟"

اور فقط یہی کہہ کر کسی کے بھی روکنے سے پیشتر اسے چھوڑ کر وہ دو قدم سیڑھیوں پر واپس چلا اور بہت بے بسی سے اپنا سر تھامتے ہوئے پھر سے اس کے مقابل آن رکا۔

"میری صاف شفاف اور سیدھی سیدھی محبت کو بے دلیل، بے جواز اور بے سمت کہنے والی کی اس چورگھات جیسی محبت کو اب میں کیا نام دوں بھلا؟ بے کار، بے مہار، اور بے پر کی محبت۔۔۔ ہاں ثومیہ ایسی ہی محبت کی تم نے۔۔۔ بلکہ محبت تو تم نے کی ہی نہیں۔ بس میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔"

جذبات سے رندھا گلا لے کر وہ یوں اسے طعنہ زنی کرنے لگا کہ انتہائی بے بسی سے اسے دیکھتی وہ ان دونوں کو چھوڑ کر صرف مریم سے مخاطب ہوئی۔

"تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ یار۔ یہ ہمیشہ ہی سب کچھ بگاڑ دیتا ہے۔"

اور قسمت کا کوئی پھیر تھا کہ مقدر کا ایک وار۔۔۔ مریم کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر زینے اتر کر اب صحن میں

جا کھڑا ہوا مصطفین صلح جویانہ انداز میں بولا۔

"دیکھو سفیر جو تم سمجھ رہے ہو ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ ثومیہ کے اور میرے درمیان ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں کہ جس کا تمہیں علم نہیں ہو۔ جو بھی ہے تمہارے سامنے۔۔۔"

اور اس کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا تمام تر مفاہمتی لب ولہجہ نظر انداز کرتا ہوا وہ بڑی درشتی سے بڑھا اور اس کا گریبان تھام کر اسے موڑتے ہوئے زینوں کی سٹیل ریلنگ پر لٹا کر اس کے گلے پر بازو سے دباؤ بنایا۔ ثومیہ نے ایک بار پھر سے انہیں چھڑوانا چاہا تو دور راہداری سے اس جانب آتی دو تین لڑکیوں کو دیکھ کر مریم نے مزید تماشا بننے کے ڈر سے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دخل اندازی سے روک دیا۔ وہ بے چین سی ہو کر مسلسل پہلو بدلتی ہوئی بڑی مشکلوں سے رکی۔

"تمہیں پہلے بھی کہا میں نے کہ تم بکواس بند رکھو اپنی۔ مجھے تم جیسے دھوکے باز بندے کی کسی بات پر یقین نہیں ہے۔ مجھے تم سے کوئی وضاحت یا صفائی نہیں لینی۔ وہ اظہارِ عشق میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جو تو اس سے فرما رہا تھا۔ اب منہ نہ لگنا میرے۔ سمجھا۔۔۔؟ مجھے تمہاری شکل تو کیا تمہارے نام تک سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ میری دعا ہے میں آئندہ تمہیں کبھی نہ دیکھوں۔"

بار بار اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے، غصیلے لہجے میں وہ بس بولتا چلا گیا تو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ہلکورے لیتی بے پناہ نفرت سے مصطفین سچ مچ ہار گیا۔ اس کا سارا غصہ عجب یاسیت میں ڈھلا اور فقط ایک لحظے کے لیے آنکھوں میں امنڈ آئے بے شمار آنسوؤں کو ضبط کے پار روکتا وہ بس اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ یہی وہ پل تھا جب کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے ثومیہ تیزی سے زینے پھلانگتی ان کے قریب چلی آئی۔

"چھوڑو بدتمیز انسان۔۔۔ چھوڑو اس کو۔ تم اس قابل ہو ہی نہیں کہ تمہیں کوئی وضاحت، کوئی صفائی دی جائے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔"

مصطفین کی فق ہوتی رنگت کی جانب دیکھتے ہوئے وہ اس کے مضبوط بازوؤں پر مکے برسانے لگی تو مریم نے عجب کرب سے بندھ کر اس داستانِ آب و جو کو اس رنگ میں منتج ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے دوپٹہ پھسل کر شانے پر ایک جانب گر گیا تھا اور بکھرے ہوئے بالوں سنگ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرتی وہ ان کے

اندر آئی ہوئی کوئی جوگن لگتی تھی۔

"ہٹو تم۔۔۔ دور رہو مجھ سے تم بھی۔"

یکا یک سفیر نے اسے بھی ایک ہی ہاتھ کی مدد سے پوری طاقت سے دھکا دیا تو وہ لہرا کر سیڑھیوں پہ ان کے پیروں میں جا گری۔ اس کی کلائی لمبی ہو کر کچھ اس انداز میں ایک سیڑھی کے کنارے پر لگی کہ اس کی کانچ سے بنی ساری چوڑیاں ٹوٹ کر آس پاس بکھر گئیں۔

"آہ۔۔۔"

کلائی پر کانچ چبھنے کے سبب آئی چوٹ اور پھر اس سے بہتی خون کی دھاریں دیکھ کر اس نے ایک چیخ بلند کی تو مزاحمت ترک کر کے بالکل جاں بہ لب ہوتے مصطفین شجاع کو گویا نئے سرے سے ہوش آ گیا۔ ثومیہ کے ساتھ ہوا سلوک اس کی سفیر سے ہمدردی ختم کر گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کا بازو اپنی گردن سے ہٹاتے ہوئے وہ سیدھا ہوا اور پھر اسی کے انداز میں پہلے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے اس نے اسے بھرپور انداز میں جھنجھوڑا اور پھر اس کی گردن میں اپنا بازو گھساتے ہوئے اسے پیچھے دھکیل کر سیڑھیاں عبور کرتا دوسری طرف والی ریلنگ پر لے گیا۔ اب صرف ایک نگاہ مریم کو بڑھ کر ثومیہ کو سنبھالتے ہوئے دیکھ کر اس نے یک گونہ اطمینان سے پلکیں جھپکیں اور سفیر کو ریلنگ پر کمر کے بل لٹاتے ہوئے غرا کر بولا۔

"بس بہت ہو گیا تیرا۔۔۔ جی کرتا ہے یہیں مار مار کر بھرکس بنا دوں تمہارا۔۔۔"

اس نے مکا بنا کر اس کے منہ کے بالکل اوپر لہرایا تو بے ساختہ منہ پیچھے کر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"کہا تھا کبھی تم سے کہ ایک زمیندار کے سنگ اکھاڑے میں مت اترنا لیکن تجھے سنائی نہیں دیا شاید۔ پر کچھ بھی تجھے سنائی دیتا ہی کہاں ہے؟ تم بس وہی سنتے سمجھتے ہو جو سننا سمجھنا چاہتے ہو۔ اب کیا کہوں تم سے کہ مجھے افسوس ہے بس۔۔۔ تمہارے ساتھ گزرے ہوئے اک ایک لمحے پر۔ تمہارے ساتھ وابستہ میری ایک ایک یاد پر۔ اور یہ جو تم کہہ رہے ہونا کہ تمہیں میری شکل تو کیا میرے نام تک سے نفرت ہے تو سن لو کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی جو نام ہم سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ ایک وقت آتا ہے کہ اسی سے لپٹ کر رو دیتے ہیں۔"

یہاں تک آتے آتے اس کا لہجہ بتدریج عمیقیت میں ڈھل گیا اور جانے کس خیال و یاد یا شاید کسی احساس

سے بندھ کر اس نے اسے اچانک ہی چھوڑ دیا۔

"تو بس اب جا رہا ہوں میں۔۔۔ اور ہر روز دعا کروں گا کہ تمہاری زندگی میں وہ مقام کبھی نہ آئے کہ تمہیں میرے نام سے لپٹ کر کہیں رونا پڑے۔ خدا کرے تم اگر ڈھونڈنے بھی نکلو تو مصطفین شجاع تمہیں کبھی نہ ملے۔ مجھ سے نفرت باقی رکھ کر اگر تمہارے دل کو سکون ملے تو میں دعا کروں گا کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہی رہے۔"

بات مکمل کر کے جونہی وہ ثومیہ کی جانب پلٹا سفیر سیدھا ہو کر اپنا گریبان درست کرنے لگا اور پھر اسی پل وہاں نمودار ہوتی اپنی تین ہم جماعت لڑکیوں کو دیکھ کر رخ بدل کر کھڑا ہو گیا۔ ان لڑکیوں نے صرف ایک پل کو ٹھہر کر ان سب کو یوں آزردگی میں آمنے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا اور پھر ان کے چہروں پر رقم انتہائی سنجیدگی کے تاثرات کو یونیورسٹی سے بچھڑن اور باہمی دوری پر محمول کرتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ ان سے ان کی ایسی علیک سلیک کبھی تھی بھی نہیں کہ خصوصاً رک کر ان چاروں سے گفتگو کرتیں۔ ان کے جاتے ہی مصلحتاً ایک طرف رکا مصطفین جیب سے رومال نکالتے ہوئے تیزی سے ثومیہ کے قریب آیا اور جھکتے ہوئے لڑکیوں کی آمد کے سبب دوپٹہ میں چھپا لیا گیا اس کا زخمی بازو نکال کر اس پر اپنا رومال لپیٹتے ہوئے بولا۔

"مجھے معاف کرنا ثومیہ۔ آج کے بعد شاید ہم کبھی نہ ملیں۔ مجھے ہر اس اظہار کے لیے معاف کر دینا جو میں نے تم سے کیا ہی نہیں۔"

یہاں اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں امنڈ آئے بے شمار آنسوؤں سے نگاہ چراتے ہوئے وہ اس کے بازو پر رومال کی آخری گرہ لگاتے ہوئے تھوڑا اور نزدیک ہوا۔۔۔ اور بے حد آہستگی سے بولا۔

"اس کہانی میں سارے واقعات بدل کر بھی۔۔۔ میرا تم سے ملنا بنتا ہی نہیں۔"

اور یہیں اس کی کلائی ہوا میں چھوڑتا وہ مریم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"اور تم مریم۔۔۔ ہمیشہ خوش رہنا۔ ایسی ہی جیسی تم ازل سے ہو۔ مسکراتی ہوئی تم بہت اچھی لگتی ہو۔ پورا منظر ہنسنے لگتا ہے۔ تم دونوں کو خدا حافظ۔۔۔ اور تم کو الوداع پیارے۔ چلتا ہوں۔"

آخرش بڑی عقیدت سے صرف ایک بار مریم کا ہاتھ دبا کر باری باری ان دونوں کو خدا حافظ اور ایک نگاہ غلط

سفیر کی پشت پر ڈال کر اسے الوداع کہتا وہ وہاں سے نکلتا بھی چلا گیا تو اس کے پیچھے وہ دونوں آپس میں گلے لگ کر باقاعدہ رونے لگیں۔ انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کے جانے سے لگتا تھا کہ وہ کبھی رکے گا نہیں۔ جبکہ سفیر نے ایک بار بھی مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بالآخر جب اسے لگا کہ وہ دور جا چکا ہے تو آہستگی سے ان کی جانب مڑا اور اسے مڑتے دیکھ کر مریم کے شانے سے لگ کر سسکتی ثومیہ ایک بار پھر سے تن کر اس کے مقابل چلی آئی۔

"یہ تمہارا فتور تھا یا خناس کوئی جسے تم نے سدا محبت کا نام دیا ہے؟ ایسی ہوتی ہے محبت؟ ایسے کرتے ہیں؟ تمہاری اس محبت کے ہر ایک لمحے، ہر گھڑی اور ہر پل پہ لعنت ہے سفیر۔۔۔ بڑی گھٹیا محبت کی تم نے۔۔۔ سب برباد کر دیا۔۔۔ اور تمہیں خبر بھی نہیں تم نے کیا کیا ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ زندگی بھر کبھی بھول کر بھی میرے سامنے مت آنا تم۔ سمجھے۔ میں تمہیں معاف کرنے کا ظرف نہیں رکھتی۔۔۔"

بات مکمل کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں سے مکے جڑنے لگی تو اس سے ہمدردی ہونے کی بجائے اسے اب بھی اس کا مصطفین سے اظہارِ محبت چاہنا یاد آیا۔ اپنے چوڑے سینے پر برستی اس کی زخمی کلائی کو پوری طاقت سے تھام کر اس نے ایک جھٹکے سے ٹھہرایا اور دوبدو لہجے میں بولا۔

"معاف کرنے کا ظرف؟؟؟ ارے جاؤ یار۔۔۔ تم تو سرے سے ظرف ہی نہیں رکھتیں۔ اور محبت سر بھی چڑھے تو فتور یا خناس نہیں ہوتی۔۔۔ اس کے "ہونے" کا یقین بھلے نہ کرو لیکن اس کی توہین کی اجازت بھی نہیں ہے تمہیں۔ جا رہا ہوں میں۔۔۔ اور اب لکھ لو کہیں کہ کبھی لوٹ کر تمہارے در پہ نہیں آنا میں نے۔ خدا حافظ اور۔۔۔ بس خدا ہی حافظ۔ صرف الوداع۔۔۔!!"

تیز و ترش لہجے میں کہتے ہوئے حسبِ عادت اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر اسے الوداع بھی کیا اور جاتے جاتے مریم کی خاطر پھر سے رکا۔

"افسوس رہے گا اچھی لڑکی کہ تم سے آخری ملاقات اس رنگ میں ہوئی ہے۔ ٹھیک کہہ کے گیا ہے وہ۔۔۔ تم مسکراتی ہو تو منظر اچھے ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ یونہی رہنا تم۔ میں تم سے ملوں گا کبھی۔۔۔ لازمی اور ضرور ملوں گا۔ ابھی کے لیے خدا حافظ۔"

اور بات ختم کرتے ہی اس کا جواب سنے بنا وہ پلٹتا چلا گیا تو ان دونوں کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔

عجب دوراہے پر یہ کہانی تمام ہو رہی تھی کہ ہر ایک کردار بلک گیا تھا۔ مریم سب کچھ جانتی تھی کہ اپنی اپنی طرف سے ان میں سے ہر کوئی کامل، مکمل اور پورا سچا ہے۔ لیکن افسوس وہ کچھ سننے کی حالت میں نہیں تھے۔ ان کی منفیت اس قدر غالب آئی ان پر کہ یقین دہانی میں بے پایاں مہارت کی حامل مریم بھی شکست کی زد میں آن رکی۔

ثومیہ کو خود سے لگائے وہ دھیرے دھیرے ان ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے پاس بیٹھ گئی اور اس رنگ برنگ کانچ کی صورت فرش پر ٹوٹے محبت گزیدہ ان تینوں قلوب کا رنج رونے لگی۔

زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نازک تر محسوسات کی حامل انتہائی دلکش کہانیاں بھی بڑے شکستہ و پر ملال دوراہوں پر انجام پذیر ہوتی ہیں۔ ہاں یہ طے ہے کہ حسین تر خیالات کا بھی خوشگواری سے منتج ہونا کہیں طے نہیں ہوتا۔

نہایت رواں وشستہ کہانیوں کے انجام بھی اس بری طرح سے بگڑتے ہیں کہ اپنی اپنی جگہ پر متحیر و ساکت ہوئے تمام تر کرداروں کو اس مقام پر پوری حیرانی کا موقع بھی نہیں ملتا۔

ہاں ان سب کی کہانی بھی ادھوری حیرتوں کی زد میں آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

"علی مصطفٰی۔۔۔ آپ کا نام بے حد پسند آیا ہے مجھے۔ کب سے ہے یہ نام آپ کا؟"

ہوٹل پرل کانٹینینٹل کے خصوصی میٹنگ روم میں گیتی کے سامنے انتہائی عجز میں بیٹھا ہوا فوٹو گرافر علی مصطفٰی اس سوال پر بڑی دلکشی سے مسکرایا۔ وہ یہاں گائیتری دیوی کے ساتھ اپنے ایک ماڈل سفیر احمد سے رابطہ کرنے اور فلم میں اس کی سائننگ کی مد میں میٹنگ کرنے بمشکل تین سے چار منٹ قبل پہنچا تھا اور یہاں داخلے کے وقت سے وہ دل میں مُسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ اب کم از کم اگلے تین گھنٹے اسے "گیتی" کے انتظار کی کوفت اٹھاتے ہوئے گل کرنے پڑیں گے۔ ایسی ملاقاتوں میں یہاں فارغ ترین پاکستانی اداکاراؤں کے نخرے بھی اس حوالے سے آسمان سے کہیں پار ہوتے تھے اور یہ تو پھر مصروف ترین بھارتی اداکارہ تھی۔ لیکن اس کی توقع کے

برعکس اس کی آمد کی اطلاع پا کر وہ فوراً ہی آ گئی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اسے ریفریشمنٹ کے لوازمات پیش کیے گئے اور پھر مسکراتے ہوئے کیا گیا یہ سوال گویا تکلف کی دیواریں گرانے کے لیے تھا۔

"جی بہت شکریہ میڈم۔۔۔ میرے ماں باپ نے یہی نام رکھا تھا۔"

فلم انڈسٹری کے ہر شعبہ سے وابستہ افراد اپنا نام عموماً حقیقی نام سے بدل کر رکھتے ہیں لہٰذا اسے گیتی کا سوال بے معنی نہیں لگا۔

"بہت اچھے۔۔۔ میں واقعی متاثر ہوئی ہوں اس نام سے۔ چاہوں گی کسی فلم میں اپنے ہیرو کو یہی نام دوں۔ خیر مدعے پر آتے ہیں علی مصطفیٰ صاحب۔۔۔" اپنے دونوں ہاتھوں کو گرم جوشی سے باہم مسلتی ہوئی وہ یوں روانی سے بولی کہ سر کو تعظیمی خم دیتا وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"مجھے یہ بتائیں آپ کا وہ ماڈل سفیر احمد فلم میں کام کرنے پر راضی کیوں نہیں ہے؟ کوئی خاص وجہ ہے کیا؟ وہ بھارت میں میرے خلاف چلتی خبروں سے پریشان تو نہیں کہ کہیں وہ بھی ان کی زد میں نہ آ جائے؟ یا لالی وڈ سے کوئی اسے اس انکار پر اکسا رہا ہے؟ پلیز کھل کر بتائیں۔۔۔"

مختلف اندازے اور واہمے اس کے سامنے رکھتی وہ اس کے جواب سے پیشتر ہی ساتھ بیٹھی ناز سے بھی مخاطب ہوئی۔

"اور ناز تم رفیق سر سے رابطہ کرو پلیز۔ جہاں تک میرا خیال ہے انہیں کم از کم آدھا گھنٹہ قبل یہاں ہونا چاہیئے تھا۔ تاخیر کی وجہ پوچھو بھئی۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

بات مکمل کر کے وہ واپس علی مصطفیٰ کی جانب متوجہ ہو گئی تو بغور اس کا عجلت آمیز انداز دیکھتی ناز اثبات میں سر ہلاتے ہوئے موبائل پر رفیق نواز کا نمبر ملانے لگی۔

"جو آپ سوچ رہی ہیں ویسی کوئی بات نہیں ہے گیتی میڈم۔ آپ کے سب خدشات بے معنی ہیں۔ وہ ماڈل دراصل بہت پہلے کبھی صرف چند فوٹو شوٹس کے بعد اپنی تعلیمی مصروفیات کے باعث ماڈلنگ چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کئی برانڈز کے رابطہ کرنے پر اس نے صرف یونیورسٹی کا بہانہ کرتے ہوئے بالکل کام نہیں کیا۔ اور اب تو اس کی تعلیم بھی مکمل ہو چکی ہے۔ لیکن جب اس سے آپ کے مقابل کام کے لیے رابطہ کیا

تو اس نے نا صرف انکار کر دیا بلکہ اس کا رویہ کسی حد تک اکتایا ہوا سا لگا مجھے۔ یوں لگتا ہے جیسے اسے کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے رفیق صاحب کے کہنے پر اس سے بار ہا رابطہ کیا ہے میڈم۔۔۔ اور مجھے یقین ہے ہو گیا ہے کہ وہ لڑکا کام نہیں کرے گا۔"

اس نے مدھم آواز میں جامع رائے پیش کی تو فقط لبوں کو بھینچ کر "ہوں۔۔۔" کہتے ہوئے گیتی نے ناز کی جانب بھی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جو کہ رفیق نواز سے بات کر کے چپ بیٹھی تھی۔

"وہ پہنچ چکے ہیں۔ استقبالیہ پر روم پیمنٹ کے لیے رکے ہوئے تھے۔"

اس کی نظروں کا مقصود بھانپ کر اس نے جلدی سے جواب دیا تو وہ ہولے سے مسکرائی۔

"اب اس سفیر احمد صاحب سے کیسے نمٹا جائے یار؟ سن رہی ہو ناں۔۔۔ عجیب بندہ ہے کہ شہرت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔"

انہی نگاہوں سے اسے تاکتی وہ سراپا سوال ہوئی تو نازاسے چھوڑ کر علی مصطفیٰ کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"علی بھائی پھر بھی کوئی وجہ تو بتائی ہو گی اس نے کہ کیوں کام نہیں کرنا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ماڈلنگ فیلڈ میں داخل ہو کر اور ابتدائی توجہ پا کر بھی اسے ماڈلنگ میں یکسر دلچسپی نہیں رہی؟"

اس کے سوال پر گیتی نے بھی سوالیہ نظریں اس کی جانب موڑ لیں تو باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتا وہ با اعتماد لہجے میں بولا۔

"یہ سمجھنے سے تو میں بھی قاصر ہوں میڈم۔۔۔ اور سچ کہوں تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے رفیق صاحب سے یہی کہا تھا کہ میرے پاس اور بھی بہت سے ماڈلز ہیں جنہیں آزمایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حوالے سے کوئی جواب دینے کی بجائے انہوں نے کہا کہ میں ایک بار آپ سے لازمی مل لوں۔ اور اب گیتی میڈم سے مل کر میں سمجھ سکتا ہوں کہ انہوں نے ایسا کیوں کہا تھا؟"

نرمی سے کہتا یہاں وہ رکا تو ان دونوں نے بیک وقت بھنویں اس انداز میں اچکائیں گویا پوچھ رہی ہوں کہ "اچھا بتاؤ تو بھلا کیوں۔۔۔؟؟"

"مجھے لگ رہا ہے کہ یہ کسی خاص وجہ سے اسے کاسٹ کرنے پر بضد ہیں۔ کوئی ایسی بات لازمی ہے جو کسی

اور کی سمجھ میں شاید نہیں آئے گی۔ لیکن گیتی جی جانتی ہیں صرف کہ صرف وہی لڑکا کیوں ضروری ہے؟ ورنہ نئے چہرے تو ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہیں۔ جو بصد شوق و مسرت ان کے ساتھ کام کرنا چاہیں گے۔ بلکہ یہ تو کسی کے خواب سے بھی پرے کی بات ہو گی کہ وہ پہلی ہی فلم میں گائتری دیوی کے مقابل مرکزی کردار ادا کرے۔"

اور اس کی بات پر دل ہی دل میں اس کے اندازوں کی درستگی کی داد دیتی گیت اس کے محتاط و مودب انداز سے متاثر ہو کر بولی۔

"جی ایسا ہی ہے علی صاحب۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔ یہ میری ہی ضد ہے کہ مجھے اس فلم میں اپنے مقابل صرف سفیر احمد چاہیئے۔ اب آپ بتائیں کہ آپ اس حوالے سے مزید کیا مدد کر سکتے ہیں ہماری۔ ہاں بس یہ طے سمجھیں کہ کسی بھی قیمت پر اور کچھ بھی کر کے مجھے اپنے مقابل فقط وہی ہیرو درکار ہے۔ یعنی اس سے آپ یہ جان لیں کہ اس ماڈل تک ہماری رسائی ہونا کس قدر ضروری ہے۔ سو پلیز اس کا کوئی حل سوچیں۔۔۔" اپنے مخصوص یقین و اعتماد کے ساتھ لفظ لفظ ادا کرتی آخرش وہ اصرار بھی کرنے لگی تو اپنے ساتھ کئی اور ماڈلز کے لائے گئے پورٹ فولیوز پر ایک نگاہِ حسرت ڈالتا وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اسے اپنی بات کے جواب میں یوں مستغرق پایا تو ناز کی طرف مڑی۔

"کیوں ناں اس لڑکے سے خود سے ملا جائے؟"

اور اس کے یوں سہولت سے یہ بات کہنے پر پہلے تو ناز کی آنکھیں پوری کی پوری پھیل گئیں اور پھر کسی خیال کے تحت انتہائی متوازن ہوتی وہ گویا سمجھوتہ کرتے ہوئے بولی۔

"جہاں اتنا کچھ کر چکی ہو ایک یہ بھی کر دیکھو۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے؟؟؟ تم سے کوئی عمل، کوئی شے اب بعید تھوڑی ہے۔ کچھ بھی ہونا ممکن ہے بھئی۔"

بات ختم کرتے ساتھ ہی "واٹ ایور۔۔۔" کے سے انداز میں اس نے ہاتھوں کو منہ کے پاس بے وجہ جھلایا اور موبائل سکرین آن کرتے ہوئے نگاہیں اس پر جمائے بیٹھ رہی۔ اس کے شان بے نیازی کے سے اس مظاہرے پر گیت زیرِ لب مسکرا دی۔ علی مصطفیٰ بڑی دلچسپی سے انہیں خالص اردو میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھ

رہا تھا۔ گو کہ رفیق نواز اسے ان کے زبان و بیان سے متعلقہ تفصیلات سے آگاہ کر چکا تھا کہ انہیں اردو بولنے میں کوئی مسئلہ یا پریشانی درپیش نہیں لیکن یوں روبرو بیٹھ کر ان سے اردو سننا اس کے لیے ایک حیران کن تجربہ رہا۔ ان کے لب ولہجہ سے کسی طور نہیں لگتا تھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔

اور یہی وہ پل تھا جب ان سب کے کچھ بھی مزید بولنے سے قبل تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا رفیق نواز وہاں داخل ہوا۔ اپنے مخصوص متین وحلیم انداز میں فرداً فرداً سب سے علیک سلیک اور حال احوال دریافت کرتا وہ بیٹھا اور براہ راست مدعا پر آن رکا۔

" گیتی جی اس ماڈل کے متعلق تو یقیناً آپ کو تفصیلی طور پر آگاہ کر چکا ہوگا علی۔۔۔؟"

اس کے سنجیدگی سے پوچھنے پر سر کی فقط ہلکی سی مثبت جنبش دیتے ہوئے وہ اس کے مزید بولنے کی منتظر رہی تو گھٹنوں سے پینٹ اوپر کی جانب کھینچ کر وہ زیادہ آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

" گڈ تو اب صورتحال یوں ہے میڈم کہ " خدا کے بھگت " کا اگلا شیڈول کل سے آن فلور ہو رہا ہے۔ اور آپ جانتی ہیں کہ اس شیڈول کے تحت اس فلم کو فنش کر دیا جائے گا۔ یعنی ہم کیمرہ کلوز کر دیں گے۔ جونہی اس کا پوسٹ پروڈکشن ورک شروع ہوگا میں اسی وقت میں آپ کی دوسری فلم کا پہلا شیڈول مرتب کر رہا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس فلم کو بھی "اسٹارٹ ٹو فنش "شیڈول کے تحت ہی ختم کیا جائے۔ یعنی اس میں کسی قسم کا رخنہ ڈالے بنا لگاتار شوٹنگز کی جائیں۔"

وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا اور گیتی کسی کمرہ جماعت میں بیٹھے ہوئے فرمانبردار بچے کی مانند مسلسل سر ہلا رہی تھی۔

"مناسب ہے سر۔۔۔ میں اس سے متفق ہوں۔ لیکن وہ لوکیشن ہنٹنگ یا دیگر کاسٹ کے مراحل، یا سکرپٹ وغیرہ۔۔۔؟؟"

بالآخر وہ چپ ہوا تو گیتی نے اپنی فکر کو زبان دی۔

"وہ سب بھی ساتھ ساتھ ہو جائے گا میڈم۔ لوکیشن ہنٹنگ کی ضرورت یوں نہیں پڑے گی کہ میرے پاس جو دو سکرپٹس تیار ہو رہے ہیں ان دونوں سے متعلقہ مقامات میرے ذہن میں پہلے سے ہیں۔ مطلب کہانی

فائنل ہو جانے اور بطورِ فلم سکرپٹ آپ سے اپروول ملنے کے بعد، شوٹ کے لیے مقامات کا فیصلہ کرنا آسان ہو گا۔ فی الوقت سب سے اہم مسئلہ آپ کے من پسند ہیرو کی عدم دستیابی ہے۔ اس کا کوئی حتمی حل دیں۔ اگلے مراحل سب "خدا کے بھگت" کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بھی طے ہوتے جائیں گے۔"

جواباً اپنا مطمع نظر انتہائی صراحت سے اس کے سامنے رکھتا وہ گینداس کی جانب اچھال کر نیم دراز ہوتا گیا تو بنا کسی توقف کے وہ بھی یوں بولی گویا پہلے سے سب سوچ بیٹھی ہو۔

"ٹھیک ہے سر۔۔۔ میں جلد اس ماڈل سے خود مل رہی ہوں اور اگر اسے مل کر بھی میں اسے راضی نہیں کر پاتی تو پھر اس کا کوئی متبادل ڈھونڈ لیں گے۔"

اور اسے فقط اتنا کہہ کر وہ فوراً سے پیشتر علی مصطفٰی سے مخاطب ہوئی۔

"علی صاحب۔۔۔ آپ سے بس ایک گزارش ہے کہ کسی طرح جلد از جلد میری اس ماڈل سے ایک میٹنگ کا انتظام کر دیں۔ اس کے بدلے ہم آپ کے سٹوڈیو کو زیادہ سے زیادہ پروموٹ کریں گے اینڈ آف کورس آپ کو یہ ماڈل مہیا کرنے پر منہ مانگا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔"

اس کی بات پر ناز اور رفیق نواز بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف ہی دیکھنے لگے تو صوفے پر دھرے اپنے ساتھ لائے گئے دیگر پورٹ فولیوز سمیٹتا وہ بڑی عقیدت سے بولا۔

"بہت شکریہ میڈم۔۔۔ مجھے لگتا ہے یعنی مجھے امید ہے کہ یہ کام تو میں کر ہی سکتا ہوں۔ یعنی آپ کی اس سے میٹنگ لازمی ارینج کر لوں گا۔ اور معاوضے کی بات آپ سے کیا کرنی ہے گیتی جی؟ آپ ہماری مہمان ہیں اور رفیق صاحب دوست۔۔۔ آپ سے سوداگری نہیں بنتی میری۔"

اس کی بات پر ناز نے انتہائی تحسین آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا کہ اس کا ذہن اب پاکستانیوں کے حوالے سے قدرے صاف ہونے لگا تھا۔ جبکہ گیتی بے طرح مسرور ہو کر رفیق نواز سے کہنے لگی۔

"بھئی مان گئے سر آپ کو ہم۔۔۔ قائل تو ہم پہلے سے ہیں آپ کے اخلاق کے لیکن اب تو مداح بھی ہونے لگے ہیں۔ آپ سے جو بھی جڑتا ہے وہ پیسوں کے معاملات بھلا کر تعلق رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔"

اور یہاں ٹھہر کر واپس اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ مزید بولی۔

"بہت شکریہ علی مصطفیٰ صاحب۔ آپ کا پورا نام لینے کا بھی اپنا ایک لطف ہے۔۔۔ عشق وجو کی کسی کہانی کا خیال آنے لگتا ہے۔ یوں جیسے احمد بلال۔۔۔ یوں کہ گویا سوہنی مہینوال۔۔۔ بھئی واہ۔ رام کی سوگندھ منہ میٹھا ہو جاتا ہے پورا نام لینے سے۔ عشق و عاشقی کی کوئی داستان لگتا ہے یہ نام۔ علی۔۔۔ اور مصطفیٰ ایک ساتھ۔"

اس کے سراسر اسلامی نام کی یوں تعریف کرنے پر وہ حیرت در حیرت اسے تاکنے لگا تو رفیق نواز نے مسکراتے ہوئے ٹکڑا دیا۔

"زیادہ حیران مت ہو یار۔۔۔ ہماری گیتی جی ایسی ہی باکمال شخصیت ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ہندو ہونے کے باوجود یہ دیگر مذاہب اور خصوصاً اسلام سے ازحد لگاؤ رکھتی ہیں۔ ہمارے بزرگانِ دین کی حیات وزیست سے متعلقہ کتب پڑھنا ان کا ذاتی شوق ہے۔ خیر ہم بھی کہاں نکل گئے۔ تم بس یہ کام کردو یار میڈم کا۔ یہ ہمارے لیے اتنا کچھ سہن کر رہی ہیں کہ ہم انہیں کسی حوالے سے پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ بہت شکریہ۔"

گیتی کی مطالعے اور دیگر مذاہب سے شغف پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے اس کی حیرت دور کر دی تو اثبات وعقیدت میں سر ہلاتا وہ گفتگو سمیٹتے ہوئے بولا۔

"میں پہلے بھی ان کا مداح تھا رفیق صاحب لیکن اب تو باقاعدہ معتقد ہو گیا ہوں۔۔۔ ماشاءاللہ بہت اچھی لڑکی ہیں یہ۔ ان سے ہوئی اس چھوٹی سی ملاقات پر بھی مجھے تاحیات فخر رہے گا۔ اور بس اب مجھے اجازت دیں۔ تاکہ میں اپنے کام میں جت سکوں۔ اس سے رابطہ کر کے دو تین روز میں حتمی جواب دے دوں گا۔ بلکہ ان شاءاللہ ملاقات کے لیے وقت کا تعین کر کے اسی جگہ بلاؤں گا آپ کو یا جیسے آپ کہیں۔۔۔؟"

باری باری ان تینوں کی جانب دیکھ کر بات مکمل کرتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو گیتی بھی اس کے ساتھ ساتھ اٹھتے ہوئے بنا کسی توقف کے جواباً بولی۔

"جی بہتر جناب۔۔۔ آپ کی تشریف آوری اور اس قدر عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ ہمیں بھی آپ

سے ہوئی یہ چھوٹی سی ملاقات ہمیشہ یاد رہے گی۔ کبھی بھولیں گے نہیں ہم کہ کتنی محبت دی آپ نے ہمیں۔ جلد دوبارہ ملیں گے ہم اور جہاں آپ کہیں گے وہیں مل لیں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں آپ لوگ اس موقع پر۔۔ ہاں ان شاءاللہ۔"

خود سے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتی وہ اس کے دل میں مزید گھر کرتی چلی گئی۔ بہت سوچ کر اور نہایت احتیاط سے ادا کیے گئے اس کے "ان شاءاللہ۔۔" پر رفیق نواز نے بہت فخر وانبساط بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

گیتی کے بعد ان دونوں سے بھی الوداعی ہاتھ ملا کر وہ نکلتا چلا گیا تو ایک سکون بھرا سانس خارج کرتی گیت اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے واپس بیٹھ گئی۔ علی مصطفیٰ سے خود مل کر اس ماڈل کے حوالے سے اس کی فکر اگر پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی تو کم ضرور ہو گئی تھی۔ اب اسے رفیق نواز کے ساتھ سکرپٹ کے چناؤ کے حوالے سے مزید گفتگو کرنی تھی۔ جونہی وہ اپنی نشست پر واپس بیٹھی رفیق نواز نے بغور اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے یک گونہ اطمینان میں سے جھلکتا اضطراب پڑھا اور اس کے ماتھے پر پھیلی ایک ہلکی سی شکن پر نگاہ رکھتے ہوئے سوال کے لیے لفظ جوڑنے لگا۔ ہاں اس نے دیکھا کہ گیت کے چہرے پر اداسی کسی مستقل تاثر کی مانند جم سی گئی ہے۔

" کیا بات ہے گیتی جی۔۔؟ آپ پچھلے دو دن سے بہت پریشان لگ رہی ہیں مجھے۔ یوں ایکدم بجھی بجھی سی کیوں رہنے لگی ہیں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنے مخالف چلتی اس مُسلسل مہم جوئی سے متاثر ہو رہی ہیں۔ یعنی نا چاہتے ہوئے بھی اب آپ دباؤ میں آنے لگی ہیں۔ یہی بات ہے ناں؟؟ یا کوئی اور وجہ ہے؟ اپنا دیس، اپنا گھر اور اپنے لوگ یاد آ رہے ہیں کیا؟ مایوس ہو گئی ہیں کیا؟"

اس کے ہمدردانہ لہجے میں ایسا کوئی پیار بسا تھا کہ کسی بند خول میں اپنی فکریں سمیٹ رکھنے والی گیت ذرہ ذرہ چٹخنے لگی۔

"مایوس نہیں ہوں۔ بس یہاں کے لوگوں کے تکبر سے بڑی خائف۔۔ بڑی دلگرفتہ ہوں۔ لوگ کسی کو کسی طور بھی عزت نہیں دیتے شاید۔ ہاں ہیں اچھے بھی لوگ جہاں میں بہت۔۔ اور وہ سب ہی میرے جیسے

بے بس ہیں۔"

اس نے یوں کھوئے کھوئے انداز میں بولنا شروع کیا کہ رفیق نواز اور ناز دونوں پلکیں جھپکے بنا ہمہ تن گوش ہو رہے۔ وہ اسے ہر طرح سے بس بولنا دینا چاہتے تھے۔

"میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا سر۔ میں نے کبھی کسی سے نفرت نہیں کی۔ اور جو نفرت نہیں کرتے ناں کسی سے۔۔۔ ان کے لیے نفرت سہنا بھی بے حد عذاب ہوتا ہے۔ وہ بے چارے اس جذبے پر دوہرا کڑھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے سہتے اور جھیلتے ہیں وہ۔۔۔ دوسرا یہ کہ معاشرے میں وجود رکھتی اور لگاتار پنپتی اس منفیت کا غم بھی ہوتا ہے ان کو۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں ہم محبتوں اور مروتوں کے مارے لوگ سچ مچ مر کیوں نہیں جاتے؟"

ادھڑے ہوئے لہجے میں لفظ لفظ بلکتی یہاں وہ رکی، ایک پل کو آنکھیں جھکا کر گود میں دھرے اپنے خالی ہاتھوں کی جانب دیکھا اور خود کو کسی قدر سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوئی پھر سے بولی۔

"میرا دیس۔۔۔ میرا گھر۔۔۔ اور میرے لوگ۔۔۔ یہ لفظ بہت اجنبی سے ہو گئے ہیں۔ میں خوشبو کا ایک جھونکا ہوں اور خوشبو کا کہیں کوئی گھر نہیں ہوتا صاحب۔ یہ ملکوں ملکوں بستی ہے۔۔۔ یہ جنگل جنگل پھرتی ہے۔ یہ بستی بستی رہتی ہے۔۔۔ یہ ہوا ہوا میں اڑتی ہے۔ بس بکھر رہی ہوں میں بھی یوں۔ قطرہ قطرہ۔۔۔ رفتہ رفتہ۔۔۔ ہولے ہولے۔۔۔ اور ساری ہی۔ ایسے ہی اپنا آپ سمیٹے اس جہاں سے بھی کسی روز۔۔۔ چپ چاپ گذر جاؤں گی۔ شورزدہ سی خاک ہوں میں۔۔۔ یونہی راکھ ہو جاؤں گی۔"

اسی طرح گود میں دھرے خالی ہاتھوں پر نظریں گرائے وہ اشک بھی بہانے لگی تو اس کی کیفیات سمجھتی ناز تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

"بہادر بنو گیت۔۔۔ تم روتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔ تمہیں تو بہت مضبوط ہونا ہے ابھی۔ دلوں میں نفرت لے کر یہ لوگ جتنا مرضی زور لگا لیں۔۔۔ تم انہیں ثابت کر سکتی ہو کہ محبت ہی اصل زبان ہے کہیں بھی گفتگو کے لیے۔ تمہارے منہ میں یہ ہارے ہوئے لفظ بالکل نہیں جچتے یار۔ تم اس کہانی کا مرکزی کردار ہو۔ تم اس سب قصے کی اصلی والی ہیروئین ہو۔ پلیز خاموش ہو جاؤ۔"

اس کے گیلے رخسار پونچھ کر باقاعدہ انہیں چومتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگاتی وہ پہلی بار اسے ہر طرح سے ٹھیک گردانے لگی۔ رفیق نواز کو بھی اسے یوں روتے دیکھ کر دلی رنج ہوا۔ وہ اسے کمزور پڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بھی اس کی ہمت بندھانی چاہی۔

"ارے گیتی جی ہم تو آپ سے ہمت پاتے ہیں اور آپ ہمارے ہی سامنے رو دیں گی تو پھر کر چکے ہم باقی سب کا سامنا۔ بھئی ابھی تو چٹان ہونے کا وقت ہے اور آپ ہیں کہ ریت ہو رہی ہیں؟ آپ کی آنکھوں میں اشک نہیں بس وہ مخصوص قسم کی اک جوت بھلی لگتی ہے۔ یقین کی روشنی۔۔۔ اور اگلے کو پچھاڑ دینے والی نگاہ بس۔ یہی آپ کا خاصہ ہے اور یہی پہچان بھی۔۔۔ آپ کو کبھی اس سے ہٹنا نہیں چاہیئے۔ آپ تو ان لوگوں میں ہیں جو حالات کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیں۔ کجا کہ آپ خود ہی ہمت چھوڑ رہی ہیں۔ نہیں گیتی جی۔۔۔ ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا۔"

دھیمے دھیمے لہجے میں اس نے کچھ یوں بات مکمل کی کہ ناز نے بہت عقیدت و احترام سے اسے دیکھا۔ اس کے ڈھارسی و تقویتی لب و لہجہ کا اثر تھا کہ گیتی نے بھی فوراً ایک رومال سے اپنے گال خشک کیے اور نمناک آنکھوں سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک کہتے ہیں سر آپ۔ معذرت کہ میں بے وقت اور بے سبب جذباتی ہو گئی تھی۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ انسان کو کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیئے۔ حالات کو اپنے حق میں کرنے کی تگ و دو سے حالات واقعی بدل جاتے ہیں۔ میں نے زندگی بھر یہی کر کے دیکھا ہے۔ اور بھگوان کی کرپیا ہو تو میں اب بھی یہی کروں گی۔ دیکھ لینا آپ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔"

اور یہاں اس نے رومال کی مدد سے آنکھوں میں تیرتی باقی نمی کو بھی پونچھنے کے لئے یک لمحاتی توقف بھرا تھا کہ رفیق نواز نے پوری شد و مد سے اس کی تائید میں یہ جملہ کہا۔

"جی ان شاء اللہ ایسا ہو گا میڈم۔ مجھے یقین ہے آپ یہ کر سکتی ہیں۔"

اس کی بات سے اس کا خلوص پرکھتی، ہاتھوں میں دبے رومال کی ایک تہہ لگاتی وہ پورے دل سے مسکرا دی تو یوں روتے میں یکا یک مسکراتے ہوئے، وہ مبہوت کر دینے کی حد تک حسین و دلکش لگی۔

"ہمت بندھانے کا بہت شکریہ سر۔۔۔ آپ کا اخلاص میری زیست کی کمائی ہے۔ خیر۔۔۔ موضوع پر آتے ہیں۔ مجھے آپ سے سکرپٹ کی تیاری کے متعلق پوچھنا تھا کہ وہ کہاں تک پہنچی ہے؟ ابھی آپ نے بتایا کہ دو سکرپٹس تیار ہو رہے ہیں۔ تو کتنا کام باقی ہے دونوں کا؟ اور کردار کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے کس نوعیت کی کہانی ہوگی؟"

بالآخر خود کو بالکل متوازن کرتی وہ اگلی فلم کی کہانی کی بابت دریافت کرنے لگی تو اسے واپس اپنی جون میں لوٹتے دیکھ کر ناز نے کلمہ شکر ادا کیا اور اس سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ جبکہ رفیق نواز پرسوچ انداز میں میٹنگ روم کے عین وسط میں لٹکتے بڑے سے کانچ کے فانوس کو دیکھنے لگا۔

"بڑے بدتمیز، بے مہار اور سر پھرے کردار ہیں میرے۔ کوئی بات نہیں مانتے۔۔۔ کسی طور نہیں سمجھتے۔ بے ڈھنگ کی باتیں، رنگ رنگ کے قصے۔۔۔ ان کی کہانی اک جہانِ حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

وہیں فانوس کی سفید کانچ سی جھالروں کو دیکھتے ہوئے وہ تمہیدی انداز میں دھیرے دھیرے گویا ہوا تو سوالیہ نظریں اس پر جمائے وہ دونوں بھرپور ارتکاز سے بیٹھی رہیں۔

"سکرپٹ تو پہلا بھی اچھا ہے لیکن میں چاہتا ہوں فلمایا دوسرے کو جائے۔ میرا دل کرتا ہے اس بار اردو سینما پر کچھ کلاسک، کچھ ماورائی سے منظر پیش کروں۔ میں چاہتا ہوں گیتی جی کہ اس بار آپ ایک طوائف کا کردار ادا کریں۔ یقین کریں اس میں ڈھل کر آپ گویا آگ لگا دیں گی۔ مجھے یقین ہے۔"

بالآخر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ کچھ پراسرار، کچھ مخفی اور کچھ متجسس لب و لہجہ میں بولا تو پیچھے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتی وہ ایک پل کے لیے کسی خیال میں گم ہوگئی۔ یوں جیسے اس کی بات پر غور کر رہی ہو۔ ناز اور رفیق نواز ایک نظر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اس کے بولنے کے منتظر ہوگئے۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ سکرپٹ کے چناؤ کے لحاظ سے وہ "صرف کچھ" نہیں۔۔۔ بلکہ "بہت کچھ" سوچ کر بولے گی۔

اور آخر کار اس نے بولنا شروع کیا تھا۔

"آپ کی بات سے متفق ہوں کہ اردو سینما پر کافی عرصے سے ایسا کوئی کردار نہیں نبھایا گیا جو خالصتاً کسی طوائف اور اس کی زندگی کی عکاسی کرے۔ یعنی اس پر سوچا جا سکتا ہے۔ لیکن۔۔۔"

یوں تجسس پھیلاتے ہوئے اس نے "لیکن۔۔۔" پر گفتگو روک کر ان دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور بنا کسی توقف کے مزید بولی۔

"لیکن سر بہت معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ اردو ادب کا ایک المیہ یہ بھی رہا ہے کہ اس میں لکھاریوں کو لگتا ہے انہوں نے "طوائف" کو پہلے عشق اور پھر مذہب سے وابستہ دکھا کر بہت بڑا تیر مار لیا ہے۔ یا پھر طوائف کے لہجے سے معاشرے کے خلاف مُسلسل جھلکتی، وہی مخصوص اور گھسی پٹی کڑواہٹ کے علاوہ انہیں لکھنے کے لیے کچھ نہیں ملتا۔ اور کچھ پرانے قلمکار تو ماشاء اللہ ایسی علمبرداری کرتے ہیں طوائف خانوں کی کہ لکھاری سے بڑھ کر کوٹھوں کے دلال لگنے لگیں۔ اب اگر تو ایسا ہی سکرپٹ ہے وہ بھی جو صرف انہی مخصوص خطوط کی نشاندہی کرے تو اس پر کام نہ کرنا زیادہ بہتر یا مناسب ہوگا۔ کیونکہ سینما بین ایسی پکی ہوئی کہانیاں دیکھ دیکھ کر کے تھک چکے ہیں کہ جن کے پہلے منظر سے ان کا انجام بھی جھلک جائے۔"

اپنے مخصوص صریح و دو ٹوک اور نڈر لہجے میں اس نے بات مکمل کی تو پہلی بار رفیق نواز اس کے مقابل اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ گو کہ وہ اس کی باتوں سے جزوی متفق تھا لیکن اس کے خیال میں سب کے سب قلمکاروں کو ایک ہی چھڑی سے ہانک دینا بھی سراسر ناانصافی ہوگی۔

" آپ کی بات بجا ہے گیتی جی کہ طوائف ایسا موضوع ہے جسے مخصوص زاویوں سے آگے نہیں لکھا گیا۔۔۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ انہی مخصوص پہلوؤں سے ہٹ کر اس کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے؟ یعنی کس برتے کس بل پر اسے طوائف کہا گیا۔۔۔؟ یہی حقیقت "وجہ" ہے اس پر گفتگو کے لیے۔"

نپے تلے لفظوں میں اس سے اختلاف رائے کرتے ہوئے اس نے اس کے سامنے اپنا مطمع نظر رکھا تو وہ شائستگی سے مسکرا دی۔

"ہمم۔۔۔ بات تو بجا ہے آپ کی بھی۔۔۔ کہ بھئی ان پہلوؤں کو اگر اس کردار سے نکال باہر کریں تو باقی بچا ہی کیا ہے؟ خیر۔۔۔ ایک بار اور سوچ لیں سر آپ۔ پھر جیسے کہیں گے کر لیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

بنا کسی مزید تردد یا جرح کے وہ فوراً مان گئی تو وہ طمانیت سے مسکرا دیا۔ اسے اس کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی کہ وہ مثبت رویوں اور کھلے دل کی مالک لڑکی تھی جو سب کی بات کو اہمیت دینا جانتی تھی۔ ورنہ انتہائی

سخت گیر معاشرے میں بستے ہوئے وہ اکثر سوچتا تھا کہ منفی رویہ جات اور محدود طرزِ فکر و خیال کا سر کچلنے کے لیے جانے ہمیں وقت کے رتھ پر کتنی صدیاں مزید پار جانا ہوگا؟ اور صدیوں پار جا کر بھی شاید ہم یہ کر سکیں کہ نہیں۔۔ ۔؟؟ اس پر بھی فقط سوالیہ نشانات ہی ہیں۔

بس ایک دوسرے سے قائل و معترف ہونے کے انہی لمحات سے کچھ دیر بعد انہوں نے یہ ملاقات تمام کی اور ہوٹل کے مرکزی ڈائننگ ہال میں لنچ کے بعد رفیق نواز کو خوشدلی سے رخصت کرتی واپس اپنے کمرے میں آ گئیں۔

اب انہیں شام تلک لمبی تان کے سونا تھا۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی سے نکل کر وہ سیدھا باغِ جناح چلا آیا۔ اس کا دل اس کے جذبات کے پیروں میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کی محبت، یونیورسٹی تعلیم یا دوستی یوں منتج ہوگی اس نے کبھی وہم و گمان تک نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا ہم سب ایک ساتھ بیٹھیں گے، یونیورسٹی کی چیزوں سے دور ہونے کا غم منایا جائے گا، کینٹین میں کافی کے کپس پر آخری دفعہ گپ شپ ہوگی اور دوبارہ ملنے کے وعدوں اور ارادوں کے ساتھ بچھڑ جایا جائے گا۔ لیکن جو ہوا وہ ایسا تھا کہ۔۔۔ بس آہ و بکا اور واویلا۔

"وہ پہلے میری پوری بات سن تو لیتا۔۔۔ ایسے کیسے اس نے ایک پل میں ساری دوستی کو ایک طرف رکھ دیا ہے؟ یوں کس طرح وہ میری خود سے لگاوٹ بھول گیا؟ اف۔۔۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا سفیر۔ تم نے میرے جذبات کا قتل کیا ہے۔"

قائداعظم لائبریری کے سامنے لکڑی کی ایک نشست پر براجمان ہو کر وہ بے شمار کرب میں مبتلا تھا۔

"اور ثومیہ۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا یار؟ جب سب جانتے ہوئے بھی مسلسل چپ تھیں تو اب بھی چپ ہی رہ جاتیں۔ ٹھیک کہا تم نے کہ ہر محبت کا اظہار ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن جو محبت اظہار پا جائے وہ ضروری ہو جاتی ہے یار۔ اس پر پھر صبر نہیں آیا کرتا۔"

دونوں ہاتھوں میں سر کے بال جکڑتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اچھل کر بلند ہوتے مرکزی

فوارے کے پانی پر نگاہ جمائی اور اس کے تعاقب میں آسمان کی جانب منہ کر کے خدا سے کہا۔

"یا اللہ تو گواہ رہنا کہ میں کہیں غلط نہیں تھا۔ میں نے کوئی دل جان بوجھ کر نہیں توڑا۔۔۔ میں کسی کے مابین اپنی نیت سے نہیں آیا۔"

اور فوراً سر جھکا کر واپس اپنے پیروں کی زمین دیکھتا وہ پتھر ہو کر بیٹھ رہا۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ اشک رواں تھے۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا سفیر۔ تم نے میری دوستی پر کامل بھروسہ نہیں کیا۔ تم سن تو لیتے یار کہ میں پورے جملے میں کہتا کیا ہوں؟ تم دیکھتے تو سہی۔"

اس کے خوش رنگ لبوں سے انتہائی شکستگی میں لپٹی جواں تر سسکیاں تڑپ تڑپ کر خروج پانے لگیں۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا یار۔۔۔"

اسی ایک جملے کی دہرائی کرتا وہ خود سے کئی عزم باندھنے لگا۔ اور انہی محسوسات و کیفیات میں لپٹے رہ کر وہ جانے یہاں کتنی صدیاں اور بیٹھا روتا کہ کسی کی آواز سنتے ہوئے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

" کیا بات ہے میرے بچے؟ یوں رو کیوں رہے ہو آج؟"

جانے کس خواب نگر سے آکر وہی بانسری بجانے والے بزرگ آنکھوں میں بہت سے سوال لیے اسے محبت سے پوچھ رہے تھے۔ انہیں یوں اچانک اپنے بالکل سامنے پا کر وہ ایک بار پھر سے گڑبڑا جاتا کہ تھوڑا سا جھک کر اس کے ڈھلکے ہوئے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے اس کی نمی سے لبریز آنکھوں میں جھانکا۔

" لگتا ہے اب کی بار کوئی زخم لیے آئے ہو۔ تمہارے نین کٹوروں میں یہ صرف آنسو نہیں ہیں۔۔۔ سنگ ان کے کوئی درد بھی جل رہا ہے۔"

اور ان کی بات سن کر آہستگی سے اپنے شانوں سے ان کے ہاتھ ہٹاتا وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔ یعنی اب وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکا تھا۔ ہاں وہ جان گیا تھا کہ اس جہانِ حیرت میں لوگوں کا اچانک ملنا اور یونہی بچھڑ بھی جانا عین ممکن ہوتا ہے۔

"میری آنکھوں میں غور سے دیکھیں آپ۔ ان میں اس پل صرف درد نہیں جلتا ہوگا۔ میں ویسا عشق کر آیا

ہوں جیسا آپ نے مجھے کرنے کو کہا تھا۔ خدا کے لیے مجھ میں اس درد کی جگہ اب فقط سُر بھر دیں۔ مجھے بانسری سکھا دیں آپ۔۔۔ پلیز۔"

ان کی گہری رازدان سی آنکھوں میں مُسلسل جھانکتا وہ یوں بلک بلک کر بولا کہ ساری آنکھیں بجھنے لگیں۔

اوراس کی بات کا جواب دینے کی بجائے وہ یک ٹک اس کی پتلیوں کو تاکتے رہے۔

"دریائی کناروں سے پیاسی لوٹی ہوئی۔۔۔ صحرا آنکھیں۔"

اس کی منجمد آنکھوں کے ساحل پہ ٹوٹی، عشق کی بوسیدہ کشتیوں کی مشک پا کر انہوں نے زیرِ لب یہ ورد کیا اور ایک لمحے کا توقف بھر کر مزید بولے۔

"بڑا انجران ہونا پڑ جائے گا میرے بچے تب کہیں جا کر یہ سُر آئیں گے۔"

ان کی بات پر وہ بڑی اذیت سے مسکرایا۔

" کوئی صحرا گزیدہ شخص ہوں جناب۔ میں تو پہلے ہی سارا انجر ہوں۔"

دوبدو انداز ان کی آنکھوں میں تاکتا وہ آج ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"بانسری کی دھنیں اندر اتر جائیں تو دل خالی ہو جاتا ہے۔ محبت کو بے حسی میں ڈھال سکو گے کیا؟ ہاں یہ "طلب" سے بیگانہ کر دینے والی ہے۔"

ہولے سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے انہوں نے گویا ایک بار پھر اسے ارادہ سے باز رکھنا چاہا۔

"میں نے فقط چاہ کی تھی، طلب تو مجھے پہلے سے نہیں ہے۔ ہاں یہ کمال تر ہو کہ نارسائی کے دکھ پہ قرار پا لوں۔۔۔ پھر بھلے وہ بے حسی سے ملے۔"

دل کی ہر تڑپ کو سنبھال رکھتا وہ کسی طور نہیں مانا تو انہوں نے ایک آخری تلقین کی۔

"بانسری انسان کی ذات میں اتنے چھید یا سوراخ کرے جتنے اس کے اپنے اندر ہوتے تو تب کہیں جا کر اس کا کوئی پہلا سُر سجھائی دیتا ہے۔ بولو۔۔۔ یہ سب سہہ پاؤ گے؟"

اوران کی بات پر باقاعدہ شکستہ سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ عجب بے قراریوں سے لپٹ کر بولا۔

"میں اس سے بھی کہیں چھلنی، خالی اور۔۔۔ نامکمل ہوں۔ میری ذات بانسری سے زیادہ زخمی ہے شاید۔

ہاں میں اسی قدر ادھورا ہوں کہ درد کی آدھی دھنیں تو بانسری پورے کان لگا کر میرے اندر سے خود سنے گی۔"

وہ اتنے تیقن سے بولا فقط ایک پل کو ٹھہر کر اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے انہوں اپنی کلائی کا کپڑا ہٹا کر اندر کہیں سے بانسری برآمد کی اور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے۔

" کل سے ہر روز سہہ پہر چار بجے مجھے اس اونچی پہاڑی پر پانی والی ٹینکی کے پاس ملنا۔ اور یاد رکھنا کہ ایک منٹ کی تاخیر بھی برداشت نہیں کروں گا میں۔ اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

اور اپنی بات مکمل کر کے اسے اپنی جگہ پر ہکا بکا چھوڑتے ہوئے وہ پلٹ بھی گئے تو وہ بے یقین نظروں سے انہیں دور تلک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر بعد ہی بانسری کو ہر طرح سے چھو چھو کر محسوس کرتے ہوئے وہ خود کو یقین دلا رہا تھا کہ ہاں اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے۔

عشق کر کے وہ سچ مچ بانسری سیکھنے والا تھا اب۔

وہ بانسری کہ جس کے اک ایک سر میں وہ اپنی ذات گھول سکتا تھا۔

☆......☆......☆

ہم انسان اپنے آپ میں بے حد عجیب ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی پہ مر رہے ہوں تو اس کے پیروں کی خاک تک کو سر میں رو الیتے ہیں۔ اور اگر کسی کو سر سے اتار پھینکیں تو اس کی ذات تو کیا دھول تلک سے نفرت ہو جاتی ہے۔

تارکول کی طویل اور سیاہ ترین سڑک پر بے تحاشا بائیک دوڑاتے ہوئے سفیر بھی ان دونوں کی محبت کو سر سے اتار کر پھینک آیا تھا۔ وہ ان سے اگر نفرت محسوس نہیں کر رہا تھا تو نفرت کرنے کی کوششوں میں ضرور تھا۔

"اپنے اظہارِ محبت سے پہلے تمہیں ایک بار ثومیہ اور مصطفین کے مابین تعلق کی حقیقت کو بھی کھوج لینا چاہئیے۔"

اپنی ماں ذکیہ خاتون کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں کسی سیال کی مانند الٹ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے بار بار ثومیہ سے اظہارِ الفت کے لیے اکسانے والا مصطفین شجاع خود بھی کبھی اس سے اظہارِ

عشق کرتا ہوا پایا جائے گا۔

"آہ کہ بہت بھول ہوئی مجھے تم دونوں کو سمجھنے میں۔۔۔ کاش میں نے کبھی تم سے دوستی نہ کی ہوتی۔"

ان کی محبت سے اٹ چکے دل کو بمشکل بہلاتا وہ ان سے دور جا رہا تھا۔ ایک تھوڑی سی گفتگو۔۔۔ بلکہ اس گفتگو کے تھوڑے سے حصے نے صدیوں سا پرانا ان کا تعلق پل بھر میں بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔

گفتگو کی حقیقت کا ادراک ہونا دونوں طرف از حد ضروری ہوتا ہے۔ لفظوں سے آشنائی بذات خود ایک نعمت ہے کہ لفظ رگوں سے جا لپٹتے ہیں۔۔۔ روح تک میں جا اترتے ہیں۔ متعلقین کے لہجوں میں تفاوت ہو تو دوریاں ناگزیر ہو جاتی ہیں۔ ان سب کے مابین در آئی یہ دوری بھی لہجوں میں وقوع پذیر اسی جزوقتی تفاوت کے باعث تھی۔ وہ دکھ، تاسف اور رنج کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا تھا۔ انتہائی اکتایا اور ستایا ہوا ہونے کے سبب اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اس قدر چڑاہٹ کا اظہار کرے تو کس طرح کرے کہ بری طرح سلگتے ہوئے من کو کچھ قرار نصیب ہو؟ جذبات کی یورش اس قدر تیز تھی کہ اس کے اختیار میں ہوتا تو زمین اٹھا کہ کہیں آسمان پہ پھینک دیتا یا آسمان کھینچ کر زمین پہ لا پٹختا۔ ہاں وہ مچل رہا تھا۔۔۔ تڑپ رہا تھا۔۔۔ اور بلک تو رہا ہی تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے بائیک اسٹینڈ پر لگائی اور ایک جھٹکے سے اتر کر شانے سے بیگ اتارتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ادھر باورچی خانے میں کھانا بنانے میں مگن ذکیہ خاتون کو بیرونی در کے کھٹکے اور بائیک کی آواز سے اس کی آمد کی خبر ہوئی تو صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے گلاس میں پانی بھر کر باہر نکل آئیں۔

داخل ہو کر کسی سمت بھی نگاہ اٹھائے بنا اس نے بیگ صوفوں پر اچھالا اور لاؤنج کے دروازے کے بالکل ساتھ دھرے کانچ کے ایک قد آور گلدان کو زوردار دھکے سے فرش پر گرا دیا۔ اسی ٹوٹے ہوئے کانچ پر کرچ کرچ قدم دھرتا وہ اوپری منزل کو جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھا تو اس کی حرکات پر حق دق سی کھڑی ذکیہ خاتون تیزی سے آگے آئیں۔

"کیا ہوا ہے سفیر؟؟ اور یہ سب کیا ہے؟"

ٹوٹے ہوئے کانچ کی جانب دیکھتی وہ انتہائی فکر سے بولیں۔ پانی کا گلاس بھی جھک کر انہوں نے فوراً میز

پر رکھ دیا۔

"وہ دھوکے باز نکلی ہے ماما۔ وہ دونوں آج آخری روز وہاں بیٹھے آپس میں ہی محبت محبت کھیل رہے تھے۔ بس اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھیں۔ میں ثومیہ کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر آیا ہوں۔"

فقط ایک پل کو رک کر جلتی انگارہ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا وہ بھرپور غیض سے لپٹ کر بولا تو ان کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو سفیر؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ حیرت سے بولیں تو لب بھینچ کر وہ پھر سے اوپری منزل کو جاتے زینوں کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے پاس اس سے زیادہ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

"یہیں رکو اور رک کر میری بات سنو جاناں۔۔۔ یوں غصہ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے تم اپنا ہی کوئی نقصان کر لو گے۔"

انہوں نے بے ساختگی میں اسے بازو سے تھام کر روک لیا۔ وہ اس کے اتنے شدید غصے سے ڈر گئی تھیں۔ مزاج میں بہت تیزی ہونے کے باوجود وہ پہلے کبھی اتنا غصے میں نہیں آیا تھا۔

"ان دونوں نے دوستی کی آڑ میں جو جھانسہ مجھے دیا ہے اس سے میں سود و زیاں کے حساب سے بہت پار آ گیا ہوں ماما۔ میرا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔"

اپنا ہاتھ چھڑوا کر شکستہ لب و لہجہ میں کہتا وہ جانے کے مڑا اور جاتے جاتے پھر سے رکا۔

"صرف آپ کے کہنے پر میں نے کسی سے دوستی کی تھی۔ دوستی اگر یوں ہوتی ہے کہ اس میں پورا دل نہ رہے تو اس جذبے سے اب۔۔۔ عمر بھر کی پناہ۔"

لفظوں کی نمی کو لہجے کی مضبوطی میں لپیٹ کر کہتا وہ پلٹ بھی گیا تو ایک بار پھر سے دوڑ کر وہ زینوں کے ریلنگ پر اس کے مقابل، اس کے عین سامنے جا رکیں۔

"تمہاری حالت سے مجھے بہت ڈر لگ رہا بیٹا۔ میں تمہیں یوں اوپر نہیں جانے دے سکتی۔"

دونوں ہاتھوں کو اس کے سینے پر کسی ڈھال کی مانند رکھتے ہوئے انہوں نے اسے واپس دھکیل دیا۔ ان

کے لہجے میں سچ مچ سہمی ہوئی ایک ماں کے خدشات کا عکس تھا۔ انہیں لگ رہا تھا یوں غصے میں تنا ہوا وہ یقیناً خود کو کچھ۔۔۔ اور اس " کچھ " سے آگے کچھ بھی سوچنے کا تو ان میں حوصلہ ہی نہیں تھا۔ ان کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے وہ ان کی عمر بھر کی کمائی کی طرح تھا۔

" پلیز ماما مجھے اوپر اپنے کمرے میں جانے دیں۔ میں ابھی کسی گفتگو کی حالت میں نہیں ہوں۔"

بھرپور زچ ہو کر اس نے مضبوطی سے ریلنگ پر ہاتھ جمایا اور ان کے ایک جانب سے زینے پھلانگنے کی کوشش کی۔

" خدا کے لیے رکو جاناں۔۔۔ یوں میرا امتحان نہیں لو۔"

اب کی بار انہوں نے بھی اور زیادہ قوت سے اسے واپس دھکیلا تھا۔

" یہ بھی تو ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو؟ کیا پتا وہ دونوں کسی اور طرح سے بات چیت کر رہے ہوں؟ جن سے دل ملیں یا جو ہمارے اندر آ کر بستے ہوں ان سے کبھی بدظن نہیں ہوتے میرے بچے۔ کوئی سچا نہیں ہوا گر تو بلاوجہ ہماری روح نہیں چھو سکتا۔"

مختلف مفروضات کو دلائل کی مانند اس کے سامنے رکھتی وہ باقاعدہ منتیں سی کرنے لگیں تو جانے کن کن افکار سے بندھا وہ گویا خود سے لڑ کر بولا۔

" یقین کیجیے اذیت کی کئی حدود سہہ کر بھرپور تجربے اور کامل یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اپنے ذمستان ذات میں صرف وفقط " آپ " ہوتے ہیں۔ لوگ روح کو چھوتے ہیں لیکن بس وقتی۔۔۔ وہ بھی ہماری غلط فہمی ہوتی ہے اور اکثر تو خوش فہمی بھی۔۔۔ درحقیقت کوئی روح نہیں چھوتا۔ دراصل سب بکواس ہے یہ۔ وہ دونوں وہی چاند چڑھا رہے تھے وہاں جو میں کہہ رہا ہوں ماما۔ مجھے اس پر کوئی شک وشبہ یا ابہام نہیں ہے۔"

اس کا لہجہ اس قدر درشت و دوٹوک تھا کہ ایک پل کو وہ اپنی جگہ تھم سی گئیں۔ یہ کون شخص تھا اور کس لہجے میں بول رہا تھا؟ اتنی کم عمری میں ایسے عمیق تر تجربات سے جا لپٹے گا ان کا بیٹا انہوں نے کبھی گمان تک نہیں کیا تھا۔

" تب بھی تم وہاں بیٹھو سفیر۔۔۔ ہم اس پر مزید بات کرتے ہیں۔ پلیز جاناں۔۔۔"

انہیں کہنے کو اور کچھ نہیں ملا تو دوبارہ اپنی رٹ پر مصر ہوئیں۔

"پلیز ماما مجھے اوپر جانے دیں۔ میں کسی فضول شخص وفرد کے لیے اپنے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچاؤں گا یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ فی الوقت بس مجھے تنہائی درکار ہے۔"

جواباً اس نے بھی منت کے سے انداز میں کہا تو ریلنگ پر جمے اس کے ہاتھ پر ان کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔

"اچھا بس پانی تو پیتے ہوئے جاؤ ناں؟"

اپنی جگہ چھوڑ کر پانی کے گلاس کی جانب اشارہ کرتی وہ لجاجت سے بولیں تو وہ تیزی سے تین چار سیڑھیاں پھلانگ کر ایڑیوں کے بل گھوما۔

"مجھے بالکل پیاس نہیں ہے ماما۔۔۔ میں سارے جذبے پی آیا ہوں۔"

اور یہ کہتے ساتھ ہی وہ اوپر بڑھتا چلا گیا تو غیر مطمئن و متفکر سی نگاہوں سے اس کی پشت کو تاکتے ہوئے وہ ایک پل کو تاسف میں گھری ہوئی رکی رہیں اور پھر کف افسوس کے طور پر ہاتھوں کو باہم ملتے، ٹوٹے ہوئے کانچ کی طرف بڑھیں۔ انہیں جلدی جلدی کانچ سمیٹ کر اوپر اس کے کمرے کے باہر واقع راہداری میں مُسلسل ٹہلنا تھا اور تاوقتیکہ ان کے شوہر ڈاکٹر منصور عالم گھر واپس نہیں آجاتے۔

"محبت دورِ کہف کا ایسا سکہ ہے جس کا مول اس بھرے جہاں کی نئی منڈی میں ایک پیسے کے برابر بھی نہیں رہا۔ صدیوں پرانے اس جذبے پر ہم نے محسوسات کے قحط کا زنگ لگا دیا ہے۔ یہ وہ قفل ہے جو کوئی دل ادھیڑ بھی دے تو ہرگز نہیں کھلتا۔ ہاں بالکل۔۔۔ لوگوں کے مابین وہ پہلی سی محبت اب نہیں ہوتی۔ اب تو بس دکھاوا ہے، تنازعہ ہے۔۔۔ ضرورت ہے۔"

گو کہ اس انوکھی محبت کتھا پر ان کا دل کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنے سے فی الحال قاصر تھا لیکن سفیر کی پر یقین باتوں اور خصوصاً مضبوط تر لہجہ کے زیرِ اثر تھوڑی ہی دیر بعد جھاڑو سے ٹوٹا ہوا کانچ سمیٹتے ہوئے وہ خود سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

اس دوران ان کے کانوں کی لوئیں تک اوپری منزل سے اٹھنے والے کسی بھی متوقع کھٹکے پر جمی ہوئی تھیں۔

ہاں انہیں اب بھی اس کے غصے سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی سے واپس آکر ثومیہ نے پورا وقت بند کمرے میں گذارا تھا۔ راشدہ بیگم اور نمرہ نے اس کی زخمی کلائی کی بابت پوچھا تو اس نے ٹالنے کے سے انداز میں فقط یہ کہا کہ۔۔ "ایک موڑ مڑتے ہوئے کسی پتھر کی دیوار سے ٹکرا گئی ہوں۔"

کمرے میں بند ہو کر کلائی کے سلگتے ہوئے زخم کے ساتھ وہ لگاتار دل بھی سلگاتی رہی تھی۔ اس کی خواہشیں آتش ہونے سے قبل راکھ ہوئی تھیں۔ ہاں اسے خواہشوں کے بجھنے کا غم تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا سفیر۔۔؟ یہ کیا کیا تم نے؟ ساری وابستگیوں اور پورے جذبوں پر ایک دم پانی پھیر دیا ہے۔ آہ۔۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

بستر پر آڑھی ترچھی کروٹیں بدل کر بے تحاشا سلوٹیں چھوڑتی ہوئی وہ تاسف در تاسف گھلتی رہی تھی۔

"اس کہانی میں سارے واقعات بدل کر بھی۔۔ میرا تم سے ملنا بنتا ہی نہیں۔"

کھڑکی کی ویران سل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کانوں میں مسلسل گونجتا مصطفین کا یہ جملہ اس کے سائے تک سے خون رساتا رہا۔

دل کے نہاں خانوں سے پھوٹ کر سسکیوں میں لپٹی اس کی تمام تر التجائیں خالی لوٹا دی گئی تھیں۔ اس کی بے تابی وابتری پہ ترس کھا کر اس پل اس کے آس پاس رقصاں وقت کی ساری پہروں اور تیز وتند ہوا تک نے لہک لہک کر دعا مانگی کہ کاش اس کہانی کو خالقِ ازل نئی ابتدا سے لکھے اور سارے واقعات بدل کر اداس تر آنکھوں کا حامل وہ سوگوار شخص مصطفین شجاع۔۔ اس سے کہیں آن ملے۔ لیکن خالق اس کہانی کو کس کس نہج پہ لے جا کر کیسے کیسے موڑ دینے والا تھا؟ اس کی خبر وقت کو بھی نہیں تھی۔ وہ اس قدر رنج وغم میں مبتلا تھی کہ اس کا دل کر رہا تھا آج شبِ قیامت ہو جائے۔ وہ بے خبر تھی کہ جو کچھ آج ہونے جا رہا ہے بلحاظ اس کے۔۔ یہ شبِ قیامت ہی ہے۔

کھڑکی سے پار منظروں پہ شام ڈھلی تو لاؤنج سے آتی مدھم مدھم بحث کی سی آوازوں پر وہ چونک گئی۔ کھڑکی سے ہٹ کر دروازے پر آ کر کان باہر کی جانب لگاتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ شاہجہان عادل اور ماں راشدہ بیگم کسی بات پر آپس میں مباحثہ کر رہے ہیں۔ ذرا سا مزید غور کرنے پر ادراک ہوا کہ

موضوعِ متن اس کی اپنی ذات ہے۔ اس کی ساری حسیات سمٹ کر چہرے کی لال رنگت میں آن بسی تھیں۔ شاہجہان عادل کے چند لفظوں پر اس کے عضلات بے طرح تن گئے۔

"فواد اچھا یا برا جیسا بھی ہے میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ میں نے شہوار کو زبان دی ہے اور اب میں اپنا قول ہر صورت نبھاؤں گا۔ ویسے بھی کیا برائی ہے اس میں؟ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔ شکل وصورت پیاری ہے، کام دھندہ صحیح ہے، گھر بار بہترین ہے۔ تو اور کیا دیکھنا ہوتا ہے؟"

اور یہاں یک لمحاتی توقف سے ایک ہنکارا ابھر کر انہوں نے مزید کہا تھا۔

"بس کہہ دیا ہے میں نے کہ اس حوالے سے مزید کوئی گفتگو نہیں ہو گی تو اب نہیں ہو گی۔ یعنی یہ رشتہ طے سمجھو۔"

ان کے دوٹوک لہجے پر راشدہ بیگم تو بالکل گنگ ہو گئیں لیکن صبح سے ذہنی کشمکش ومخمصہ کی شکار ثومیہ تپ کر دو آتشہ ہو گئی۔ زندگی بھر یوں ڈر ڈر کر، چھپ چھپ کر دروازوں کی اوٹ میں رکتی جانے کیسے وہ اتنی دلیر ہو گئی کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر تن فن کرتی بڑھی اور تقریباً بھاگ کر راہداری عبور کرتی ہوئی لاؤنج میں بیٹھے اپنے والدین کے عین سامنے جار کی۔

"میرے خیال سے فیصلہ میری زندگی کے متعلق ہے تو اس پر میری رائے کا لیا جانا سب سے اہم ہونا چاہئیے۔" براہ راست اپنے باپ کی آنکھوں میں جھانکتی وہ جرات مندانہ انداز میں بولی تو ان کی کشادہ پیشانی پر بے شمار شکنیں نمودار ہوئیں۔

"اچھا۔۔۔ تو کیا رائے ہے تمہاری؟"

خشمگیں نظروں سے پہلے راشدہ بیگم اور پھر ثومیہ کی طرف دیکھ کر وہ لفظ لفظ پیس کر جواباً پوچھنے لگے تو بنا کسی توقف کے اس نے بھی پہلے کے سے تیوروں میں کہا۔

"میری رائے یہ ہے کہ اول تو مجھے فواد میں ایسی کوئی خوبی نظر نہیں آتی جو آپ اس کے کام دھندے اور گھر بار کی مد میں گنوا رہے ہیں اور اگر میں ان پر سمجھوتہ کر بھی سکوں تو مجھے اس کی شکل نہیں پسند۔ بلکہ صرف اتنی سی "پسند نہیں" کیا ہوا۔۔۔ میں تو اسے نفرت کی حد تک ناپسند کرتی ہوں۔ گزشتہ تمام عمر اس نے پھوپھو کی چمچہ

گیری اور ہماری الٹی سیدھی شکایات کے سوا اور کیا ہی کیا ہے؟ بس یہ طے ہے کہ میں کسی طور اس سے شادی نہیں کروں گی بابا۔ اور یہ "میرا بھی" آخری فیصلہ ہے۔"

دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے جو اس کے منہ میں بول بال کر جونہی وہ چپ ہوئی اب تک صدمے کی سی کیفیت میں اپنی جگہ بیٹھی یک ٹک اسے گھورتی راشدہ بیگم کی مریل سی آواز سنائی دی۔

"ثومیہ۔۔۔ یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو اپنے بابا سے؟ یہ بہت غلط بات۔۔۔"

اور ان کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ شاہجہان عادل نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"بس کرو تم بھی راشدہ بیگم۔ تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟ جیسی تربیت تم نے کی ہے ان کی، ایک نا ایک روز اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا کہ یہ اپنے باپ سے زبان درازی بھی کرنے لگیں۔"

دھاڑ کر انہیں خاموش کرواتے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ثومیہ کے عین مقابل جا رکے تو وہ جو پہلے کبھی ایسی صورتحال کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جانے کیسے اس پل ڈٹ کر اپنی جگہ جمی رہی۔ ہاں اسے ان سے رتی بھر بھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔ جانے یہ اس کی سب کچھ بگاڑنے کی کوشش تھی یا وہ سب کچھ سنوار دینا چاہتی تھی؟ فی الوقت اپنی بہکی ہوئی ذہنی رو کے ضمن میں اس کے پاس یہ سب سوچنے کا وقت تو کیا لمحہ بھی نہیں تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو کس سے کرنی ہے تمہیں اپنی پسند کی شادی؟ ذرا یہ بھی واضح کر دو مجھے۔ وہ لڑکا جو رات کو گھر آیا تھا سفیر احمد۔۔۔ اس سے کرنی ہے کیا؟"

اس کے سامنے ٹھہر کر طعنہ زن لہجے میں جو انہوں نے اگلی بات کہی اسے سن کر اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ ورطہ حیرت میں کھڑی وہ بمشکل خود کو اس طعنے کی گونج سے باہر نکال سکی۔

"بس کر دیں بابا۔۔۔ پلیز بس کر دیں۔۔۔ کبھی تو ہمیں بیٹیاں سمجھ کر ایک باپ کا سا برتاؤ کریں۔ آپ ہر بار لوگوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ آپ ہمیشہ باہر والوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے آپ کی نظر میں ہم "انسان" بھی نہیں ہیں۔ میں نے نہیں کرنی فواد سے شادی تو بس نہیں کرنی۔ اور صرف فواد ہی کیا مجھے سفیر سے بھی شادی نہیں کرنی۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے بابا۔۔۔ لیکن مجھے ان دونوں میں سے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔"

گالوں پر یکا یک بہتے ہوئے بے شمار آنسوؤں کے ساتھ وہ باقاعدہ چیخ پڑی تو باورچی خانے کی راہداری میں چھپ چھپ کر یہ سب تماشا سنتی نمرہ کانپتی ہوئی برآمد ہوئی اور صوفوں کی حد عبور کرتی گھوم کر اس تک چلی آئی۔ بات مکمل کر کے بے طرح بلکتی، سسکتی ہوئی وہ دھیرے دھیرے ان کے پیروں کے پاس یوں بیٹھی کہ اس کے لہجے سے کچھ پل قبل جھلکتی مضبوطی گویا کہیں دب سی گئی۔

"سمجھاؤ اسے نمرہ کہ اپنی حد میں رہے۔ ورنہ میں اس سے کسی اور طرح سے نمٹوں گا۔ اور تم بھی راشدہ بیگم۔۔۔ اسے سمجھا لو خود ہی نہیں تو خیر مناؤ اپنی۔"

اب کی بار پہلے وہ اس کے ساتھ ساتھ بیٹھتی ہوئی نمرہ اور پھر صوفے پر تھر تھر کانپتی اپنی شریکِ حیات کو مخاطب کر کے بولے تو ان کی لفظوں میں موجود واضح دھمکی نے ثومیہ کو جیسے نئے سرے سے جوش دلا دیا۔ رونا دھونا بھول کر آنسو صاف کرتی وہ ایک نئے عزم سے اٹھی۔

"آپ کو اپنی ان دھمکیوں پر جس صورت میں بھی عمل کرنا ہے ناں۔۔۔ آپ بے شک کر گذریں۔ میں کسی کے بھی سمجھانے بجھانے یا منت ترلے کے سبب اپنے فیصلے سے کوئی لفظ تو کیا ایک حرف بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ میں نے بھی ٹھان لی ہے کہ مجھے فواد سے شادی نہیں کرنی تو بس کسی طور نہ۔۔۔"

سنگلاخ لہجے میں پورے زور سے چلاتے ہوئے اس کی بات ابھی نامکمل تھی کہ گال پر پڑتے ایک زناٹے دار تھپڑ نے اس کے حواس معطل کر دیئے۔ اس کے بال کھل کر بھیگے ہوئے گالوں سے چپک گئے اور وہ پتھرائی ہوئی نظروں سے باپ کا غصہ ور چہرہ تاکنے لگی۔

"بس۔۔۔ بہت سن لی میں نے تمہاری یہ سب بکواس اور بہت دیکھ لی یہ بے جا ضد۔ ایک لفظ تو کیا ایک حرف بھی اس ضمن میں تم مزید بولیں تو تمہاری جان لے لوں گا میں۔ اور اسے صرف دھمکی مت سمجھنا۔ میں سچ مچ لے لوں گا۔"

اس کے جملے سے کچھ "لفظ و حرف" چرا کر اسی پر لوٹاتے وہ پہلے سے کہیں سخت لہجے میں بولے تو نمرہ کو لگا ان کی دھمکیوں ہی دھمکیوں میں وہ واقعی جان سے چلی جائے گی۔

"آپی ایک منٹ میری بات سنو پلیز۔۔۔"

کپکپاتے ہوئے لبوں سے اس نے ثومیہ کو کھینچ کر باپ کے مقابل سے ہٹانا چاہا کہ زندگی میں پہلی بار بہت بری طرح سے اس کا ہاتھ جھٹکتی وہ پھر سے چلا کر بولی۔

"اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے اس ایک بے بس سے تھپڑ کی گونج میں میری مضبوط تر آواز دب جائے گی تو یہاں آپ غلطی پر ہیں بابا۔"

اور اس کی بات کا مکمل ہونا ہی تھا کہ واپسی کو پلٹتے شاہجہان عادل اس کے یوں دوبدو ہونے پر یکا یک رکے اور ہاتھ کی پوری قوت سے اسے ایک اور طمانچہ جڑ دیا۔ اس تھپڑ پر وہ اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکی تھی۔ وہ لہرا کر قریبی صوفے کی نکڑ پر گری اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا مجنونانہ انداز میں واپس اٹھنے لگی۔ اس کے گرتے پڑتے ہوئے اٹھنے نے نمرہ کو خبردار کیا کہ اس تھپڑ پر وہ ابھی ٹھیک سے سنبھل بھی نہیں سکی ہے۔

"جتنا مرضی مار لیں بابا۔۔۔ بھلے جان سے مار دیں۔ لیکن فواد کے لیے میرے منہ سے ہاں آپ نکاح کے وقت بھی نہیں اگلوا سکتے۔"

دوبارہ ان کے سامنے کھڑی ہوتی وہ دائیں بائیں جھول کر بولی تو اس کی مخدوش ہو چکی حالت پر راشدہ بیگم حوصلہ چھوڑتی ہوئی بس پھوں پھوں رونے لگیں۔

اس کی بات پر کڑے تیوروں سے شاہجہان عادل ایک بار پھر سے اس کی جانب بڑھے تھے کہ دونوں ہاتھ ان کے سامنے تانتی ہوئی وہ کسی نئے عہد سے بندھ کر انہی کے کچھ جملے ان پر پلٹانے لگی۔

"بس وہیں رک جائیں بابا۔ اگر ایک بار بھی آپ نے مجھ پر مزید جبر کیا تو آپ کی بات ماننے کی بجائے میں چھت سے کود جاؤں گی۔ اور اسے صرف دھمکی مت سمجھنا آپ۔ میں سچ مچ کود بھی جاؤں گی۔"

ہاں وہ ان کی بیٹی تھی اور ارادوں میں انہی کے جیسی تھی۔ اس کی بات پر ان دونوں ماں بیٹی نے تڑپ کر اسے دیکھا۔۔۔ جبکہ اپنی جگہ پر جمے شاہجہاں عادل نے بس ایک لمحے کو رک کر اس کی عزم و جو سے چمکتی آنکھوں میں جھانکا اور اکسانے کے سے انداز میں بولے۔

"اوکے۔۔۔ تو کود جاؤ پھر۔ اس کے سوا تمہارے پاس دوسرا کوئی حل نہیں ہے۔"

ان کے لبوں سے ان جملوں کا کسی سرسراہٹ کی مانند نکلنا ہی تھا کہ فقط ایک بلکتی ہوئی بے بس سی نگاہ اپنی

عزیز از جان بہن اور ماں پر ڈالتی وہ دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے ہلی۔

"او کے۔۔۔ تو کود جاتی ہوں۔ یہ حل مجھے بھی اس مصیبت سے کہیں بہتر لگتا ہے۔ آپ سب کو خدا حافظ۔"

اور بات مکمل کرتے ہی وہ صوفوں کی حد سے نکل کر پچھلی راہداری میں واقع اوپری منزل کو جاتی سیڑھیوں کی جانب بھاگ گئی۔ اب یوں ہوا کہ سانس ساکن کیے کب سے ان کی گفتگو پہ ٹنگی ان دونوں ماں بیٹی نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر صورتحال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ چھوڑتی ہوئی سرعت سے اس کے پیچھے بھاگیں۔

ان کے نکلنے تک وہ راہداری کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ شانوں پر بڑی بے ترتیبی سے جھولتا اس کا زرد رنگ دوپٹہ بار بار اس کے پیروں میں رپٹ رہا تھا جس کا اسے بالکل ہوش نہیں تھا۔

"رک جاؤ ثومیہ۔۔۔"

"خدارا رکو آپی۔۔۔"

"ثومیہ صرف ایک بار رکو تو پلیز۔"

کب سے چھوڑے ہوئے ہاتھ پاؤں میں بمشکل اپنا آپ سنبھالتی وہ دونوں ماں بیٹی اسے طرح طرح کی پکاریں دیتی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھیں اور اسے روکنے کی کوشش میں ان دونوں نے دور سے ہی اپنے ہاتھ یوں آگے کی جانب پھیلا رکھے تھے کہ گویا آن کی آن میں ہی اسے چھو لینا چاہتی ہوں۔ لیکن ان کی کسی بھی صدا پر کان نہ دھرتی ہوئی وہ بے تحاشا۔۔۔ بس بھاگ رہی تھی۔

"آپی تمہیں اللہ کا واسطہ ہے رکو۔ پلیز ایک بار رکو۔ دیکھو تو ماما کا کتنا برا حال ہو گیا ہے۔ آپی رکو ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

بالآخر جونہی اس نے لکڑی کی ریلنگ پر مضبوطی سے ہاتھ جماتے ہوئے زینوں پر پہلا قدم رکھا اس سے چند قدم کی دوری سے بھاگ کر آتی نمرہ باقاعدہ دہائیاں دینے لگی۔ اور وہ جو ہر بار اس کی مرنے کی اسی دھمکی پر کچھ بھی کرنے سے رک جاتی تھی۔۔۔ وہ آج جانے کس خیال و گمان میں تھی کہ ہرگز نہیں رکی۔ بالکل نہیں رکی۔

دھپ دھپ قدمچے پھلانگتی وہ زینوں کی وسطی "لینڈنگ" تک آئی اور ایک نظر اپنے پیچھے ہاتھ بڑھا بڑھا کر اوپر چڑھتی نمرہ کو دیکھ کر اور شدت سے قدمچے پھلانگنے لگی۔ یوں گویا اسے ہر صورت نمرہ کی پہنچ سے دور ہونا ہے۔ یوں گویا اسے کائنات سے بھی پار جانا ہو کہیں۔ ہاں اس پل اس کا جنوں اس حد سے بھی کہیں بالا تھا شاید۔اور پھر چند ہی لمحات بعد نمرہ نے جو منظر دیکھا وہ اس کے فہم وگماں تک میں نہیں تھا۔

اس نے دیکھا کہ پانچ چھے مزید قدمچے پھلانگ کر جب ثومیہ چھت کے بالکل قریب پہنچی تو اس کے شانوں پر جھولتا اس کا طویل دوپٹہ اس کے پاؤں میں لپٹ گیا اور آگے کہیں ریلنگ پر ڈالنے کو اٹھا اس کا ہاتھ ہوا سے ہی لوٹ آیا۔ ہاں وہ پورے قد سے لہرا سیڑھیوں پر ہی ایک جانب گری اور اس کا سر پورے وزن کے ساتھ اطرافی ریلنگ کے ایک مضبوط تر پائے سے لگا۔

"آں......"

دونوں ہاتھوں کو اظہارِ حیرت کے طور پر منہ پہ جماتی نمرہ نے اس کے ماتھے سے ابلتے خون پر نگاہ رکھتے ہوئے ایک زوردار چیخ بلند کی تھی۔ پھر اسی حیرت واستعجاب میں گھر کر اس نے اسے لڑھک لڑھک کر سیڑھیوں سے واپس آتے دیکھا اور اوپر کی جانب بڑھنے کی ساری تگ ودو ترک کر دی۔ بت بنی کھڑی وہ ثومیہ کو پہلے لینڈنگ تک اور پھر اس سے بھی نیچے پھسلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ میری بچی کو مار دیا ظالم نے۔ ہائے نمرہ دیکھو اسے خدا کے لیے۔"

ہانپ ہانپ کر پہلے قدمچے پر آن رکی راشدہ بیگم نے بھی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر عین عین دیکھا تھا۔ ان کے واویلے پر نمرہ جیسے کسی سکتے سے چھوٹی اور خود سے دو سیڑھیاں اوپر کسی لاش کی مانند آڑھے ترچھے انداز میں پڑے ہوئے ثومیہ کے زخمی وشکستہ وجود تک آئی۔

"اٹھو آپی۔ پلیز اٹھو۔۔۔ اٹھو تمہیں خدا کی قسم۔ میں نے کہا تھا کہ نہ جاؤ یوں۔"

اس کا سر گود میں رکھ کر ماتھے کی ایک طرف سے پھوٹتے لہو پر اپنا دوپٹہ دباتی وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر چیخنے لگی۔ لیکن وہ تو بے ہوش ہو چکی تھی۔۔۔ بلکہ اسے ہوش تھا بھی کب؟؟ ادھر اب تلک لاؤنج میں جم کر کھڑے شاہجہاں عادل ان کی اس سب چیخ وپکار پر اسی سمت چلے آئے۔

"بابا ایمبولینس بلائیں پلیز۔۔۔ ثومیہ سچ مچ مر رہی ہے۔"

انہیں دیکھتے ہی وہ چلا کر بولی تو یہاں کا منظر دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔

"اوہ شٹ۔۔۔ یہ لڑکی پاگل ہے۔"

جیب سے موبائل نکالتے ہوئے وہ خود میں بڑبڑائے اور "1122" پر ریسکیو ٹیم کال کرنے لگے۔

ٹیم کو "حادثاتی طور پر بچی کے سیڑھیوں سے گرنے۔۔۔" کا بتا کر وہ راشدہ بیگم کی ایک جانب سے نکل کر جلدی جلدی اوپر ثومیہ تک آئے اور اس کے مُسلسل بہتے ہوئے خون سے گھبرا کر اس کی نبض پر ہاتھ جمایا۔

"ہٹو تم۔۔۔ اسے اٹھا کر صحن میں لے جانا ہوگا۔ ریسکیو ٹیم بس پہنچ رہی ہے۔"

سخت لہجے میں دیئے ہوئے اس حکم سے بھی ہمت کشید کرتی وہ فوراً ایک طرف ہوگئی تو انہوں نے اسے دونوں بازوؤں کے گھیر میں ڈال کر نہایت احتیاط سے اٹھالیا۔

"جا کر لاؤنج کا دروازہ کھولو نمرہ۔ اور یاد رہے کہ اگر سیریس اشو بنے تو یہی بیان دینا ہے کہ یہ چھت پر ٹہلنے گئی تھی اور واپسی پر حادثاتی طور پر پھسل گئی ہے۔ اپنی ماں کو بھی سب سمجھا دو شاباش۔"

دو سیڑھیاں اتر کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے انہوں نے اگلا حکم دیا تو وہ بس خالی خالی نظروں سے ان کے بازوؤں پر جھولتے ثومیہ کے زخمی ماتھے کی طرف دیکھنے لگی۔

"اسے کچھ نہیں ہوگا ان شاءاللہ۔۔۔ چلو تم۔"

مدھم آواز میں اسے تسلی دیتے وہ ایک ایک زینہ اترنے لگے تو وہ کسی روبوٹ کی طرح ان کے پیچھے لیکن تقریباً ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ راہداری میں اتر کر وہ لاؤنج کے دروازے کی جانب بڑھے تو راشدہ بیگم بھی بڑی فکر سے ثومیہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک طرف ان کی ہمراہی میں چل رہی تھیں۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ریسکیو ٹیم کی آمد ہوئی تو ابتدائی طبی امداد کے بعد اگلے آدھے گھنٹے میں وہ گھر سے نزدیک ترین "شالیمار ہاسپٹل" میں موجود تھے جہاں سر کی شدید چوٹ کے باعث ثومیہ کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔

☆......☆......☆

خون کافی بہہ جانے کے سبب انہیں ہنگامی بنیادوں پر ثومیہ کے لیے خون کا بندوبست کرنا پڑا۔ صد شکر کہ فقط انہی کی بتائی ہوئی توجیح پر بھروسہ کرتے ہوئے ڈاکٹرز یا ہسپتال کی دیگر انتظامیہ نے بھی مزید کوئی جرح نہیں کی اور علاج شروع کر دیا۔ آپریشن بے حد طویل دورانیے تک جاری ہے اور اس دوران وہ تینوں نفوس گویا سانس تک لیے بنا آپریشن تھیٹر کے باہر یہاں سے وہاں گردشیں کرتے رہے۔ بار بار ان کی نگاہ آپریشن تھیٹر کے باہر جلتی لال بتی کی طرف اٹھتی رہی جو کہ ان کے لیے فی الحال ثومیہ کے وجود میں جاں یا سانسیں باقی ہونے کی واحد نشانی تھی۔ یہ جاں گسل لمحات جب پونے دو گھنٹوں سے بھی پار ہوئے تو ایک گھڑی یہ بھی آئی کہ دل ہی دل میں جسم کے اک ایک ریشے تک سے اللہ کے حضور دعائیں مانگتی ہوئی نمرہ کی امیدیں۔۔۔ موہوم پڑنے لگی۔ البتہ تسبیح کے دانوں پر دانے گراتی راشدہ بیگم آس بھری نگاہوں سے اوپر کی طرف دیکھتی ہوئی بس اپنے رب سے التجائیں کر رہی تھیں۔ ہاں اپنے رب سے اپنے عمیق تر تعلق کی بنیاد پر اور دعاؤں کے بھروسے سے ان کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ثومیہ کو کچھ ہو جائے گا۔

بالآخر ان کا یہ طویل تر انتظار ختم ہوا اور آپریشن تھیٹر کا بھاری دروازہ کھول کر پہلا سینئیر ڈاکٹر باہر آیا۔ چہرے سے ماسک ہٹا کر اس نے بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور دائیں ہاتھ سے ماتھے پر آیا پسینہ خشک کرتے ہوئے وہ سنجیدہ تاثرات لیے شاہجہاں عادل کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بنا ڈاکٹر صاحب؟ اب کیسی حالت ہے میری بچی کی؟"

شاہجہاں عادل کو اپنی جگہ جمے دیکھ کر راشدہ بیگم تیزی سے ان تک آئی تھیں۔ نمرہ نے بھی بالکل قریب آ کر خدشات و سوالات سے پر آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"چوٹ بہت شدید آئی ہے۔ یقیناً مریضہ پورے وزن کے ساتھ اس پائے سے ٹکرائی ہیں۔ بہرحال دو باتیں ہیں۔"

تمہیدی انداز میں کہتے ہوئے اس نے باری باری ان سب کے چہروں کے تاثرات دیکھے تو ان سب کا پورا وجود گویا "کان" ہو گیا۔ ان کی رنگت میں گھل کر جم چکی پیلاہٹ سے پہلے ہی لگتا تھا کہ وہ پوری جاں سے ٹنگے ہوئے ہیں۔

"ایک تو یہ کہ شکر الحمدللہ سرجری کامیاب رہی ہے۔ یعنی وقتی خطرہ ٹل گیا ہے۔ لیکن چونکہ مریضہ ابھی ہوش میں نہیں ہے تو اگلے چھتیس گھنٹے انتہائی اہم ہوں گے۔ انہیں چھتیس گھنٹوں کے اندر اندر ہوش آنا چاہیئے لازمی۔ دعا کریں بس۔ بہت سی دعا۔ اللہ کریم مدد کرے گا۔"

اور بات مکمل کرتے ہی وہ شاہجہاں عادل کے ساکت شانوں پر تسلی بخش انداز میں ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تھا کہ نمرہ تیزی سے بول پڑی۔

"تو کیا وہ خطرے سے باہر نہیں اب تک؟ پلیز سر مجھے سچ سچ بتائیں۔ یہ چھتیس گھنٹوں والا کیا معاملہ ہے؟" اس کا لہجہ بھیگا ہوا تو تھا ہی نچڑا ہوا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی بجھتی جوت دیکھ کر ڈاکٹر کے قدم رک گئے۔

"فی الوقت وہ خطرے سے باہر ہے بیٹا۔ لیکن اگلے چھتیس گھنٹے انتہائی اہم ہیں۔ یعنی اگر اسے چھتیس گھنٹوں سے پہلے ہوش نہیں آیا تو یہ خطرے والی بات ہوگی۔ وہ۔۔۔"

اسے جواب دیتے ہوئے اس نے جملہ ایک "وہ" پر آ کر روک دیا اور پلٹ کر شاہجہاں عادل کی طرف دیکھنے لگا تو نمرہ کی لوئیں تک بلک اٹھیں۔

"اور وہ کیا ڈاکٹر صاحب؟ پلیز بتائیں مجھے۔ وہ میری بہن ہے۔ میرے بچپن کی دوست بھی۔۔۔ پلیز بتائیں ناں سر۔۔۔"

آخرش وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی تو ڈاکٹر نے جی کڑا کر کے کہا۔

"سر پہ لگی ہوئی چوٹ کے سبب ابھی میں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ اسے ہوش کب آئے گا؟ بس مجھے امید ہے کہ چھتیس گھنٹوں میں یا اس سے کچھ پہلے وہ لازمی ہوش میں آجائے گی۔ ان شاء اللہ۔۔۔ لیکن اگلے چھتیس گھنٹوں میں اگر وہ ہوش میں نہیں آئی تو خدشہ ہے کہ وہ کومے میں جاسکتی ہے۔ اٹس ڈیڈ سیریس۔"

اور انتہائی محتاط لفظوں میں اسے صورتحال کی سنگینی سے مطلع کرتے ہوئے وہ بڑھتا چلا گیا تو نمرہ نے ویران ویران آنکھوں سے پہلے راشدہ بیگم اور پھر شاہجہاں عادل کی طرف دیکھا۔

"لیکن اگلے چھتیس گھنٹوں میں اگر وہ ہوش میں نہیں آئی تو خدشہ ہے کہ وہ کومے میں جاسکتی ہے۔ اٹس ڈیڈ

سیریس۔۔۔" ڈاکٹر کے الفاظ کسی کاری ہتھوڑے کی مانند اس کے کانوں میں ضربیں لگا رہے تھے۔ راشدہ بیگم نے بڑھ کر اسے بازو سے تھام لیا اور ساتھ لگائے ہوئے ایک نشست پر بیٹھ گئیں۔ شاہجہاں عادل کو مخاطب کرنے کی کوشش ان دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ ہاں وہ ان کو لفظوں کی بجائے اپنی بے پناہ خاموشی کی سزا دے رہی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ثومیہ کو آپریشن تھیٹر سے نکال کر "انتہائی نگہداشت وارڈ" میں شفٹ کر دیا گیا اور انہیں ایک سوئی گرنے کے ارتعاش جتنی آواز بھی پیدا کیے بنا اسے صرف ایک ایک بار دیکھنے کی مشروط و محدود اجازت دی گئی۔ وہ دونوں ماں بیٹی پٹیوں میں جکڑی ثومیہ کے اوپر خاموش آنسو بہا کر واپس لوٹ آئی تھیں۔ جبکہ شاہجہاں عادل نے بھی ساکت و جامد تاثرات کے ساتھ اسے ایک نظر دیکھا ضرور تھا۔ ان کے ذہن و دل میں اس سارے حادثے کے بعد سے کیا کیا چل رہا ہے؟ وہ دونوں اس سے بے خبر تھیں۔

خیر قصہ المختصر۔۔۔ کبھی کسی کالم سے لگ کر، کبھی ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پر یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے، اور کبھی اندرونی خلفشار و افکار میں بے طرح ڈوب ڈوب کر دور نادیدہ تشبیہات کھوجتے ہوئے ان سب کی یہ رات "بخیریت" گذر گئی۔ ہاں بالکل۔۔۔ اس حد درجہ پریشانی اور ایسی شکستہ تر حالت میں بھی "خیریت" کا لفظ ان کے لئے فقط اس جہاں بھر کی ستائی ہوئی لڑکی کی ڈوب ڈوب کر ابھرتی دھڑکنوں سے منسوب تھا۔ اس کی چلتی ہوئی سانسوں کا یقین ملتا تو وہ صدیوں یونہی حالتِ دعا میں بسر کر سکتی تھیں۔

اور پھر سورج اپنے اولین اجالوں کے ساتھ ان کے لیے ضبط کا ایک نیا امتحان لے کر نمودار ہوا۔ ایک سٹیل بینچ پہ چڑھ کر اپنے گھٹنوں پہ سر رکھے نمرہ نیم وا آنکھوں سے دور کہیں طویل تر راہداری کے آخری سرے کو تاک رہی تھی کہ اس نے آنسوؤں کے پار دھندلائے ہوئے منظر سے پہلے کسی کی ہیولا اور پھر پوری شبیہہ بنتے ہوئے دیکھی۔ آنے والی شخصیت کو پہچان کر جھٹ سے پاؤں نیچے اتارتی ہوئی وہ چپل اڑسنے لگی اور نگاہیں فقط اسی جانب مرکوز رکھیں۔ ہاں اس نے دیکھا کہ کسی نہ کسی زاویے سے ثومیہ کی اس ناگفتہ بہ حالت کی حقیقی ذمہ دار شہوار پھوپھو اپنے سپوت فواد کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتی کوئی واویلا سا کرتی ہوئی اسی طرف آ رہی ہیں۔

انہیں یوں شور مچاتے ہوئے آتے دیکھ کر راشدہ بیگم اور شاہجہاں عادل بھی اپنی جگہ پر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اے کیا ہوگیا میری بہورانی کو؟ کیسے گرگئی سیڑھیوں سے میری بچی؟ ہائے میں کرموں جلی اسے پہلے ہی کیوں نہ بیاہ لے گئی؟"

ان کے بالکل پاس آ کر باری باری ان دونوں ماں بیٹی کو زبردستی کے جپھے میں لیتی وہ باقاعدہ بین کرنے لگیں تو ان کے ثومیہ کو "بہورانی" کہنے پر نمرہ بڑی اکتائی ہوئی سی کیفیت میں ڈھل کر ان سے الگ ہوتی ایک سمت کھڑی ہوگئی۔ اسی پل انہیں اس لفظ پر ٹوکنے سے اس نے خود کو بمشکل روکا۔

"بتاؤ ناں بھائی صاحب آپ ہی کچھ بتاؤ مجھ کو۔ کہہ دو کہ میری بہو اب بالکل ٹھیک ہے۔ کوئی خیر کی خبر ہی سنانا مجھے۔۔۔ میں سارے راہ بس رو رو کر دعائیں مانگتی آئی ہوں۔"

اسے یوں پیچھے کھسکتے دیکھ کر بظاہر ذرا بھر بھی محسوس کیے بنا وہ اپنی محبت کا ڈھکوسلا جاری رکھتے ہوئے شاہجہان عادل سے مخاطب ہوئیں اور پھر ان کے کسی جواب سے پیشتر ہی منہ لٹکائے اپنے پیچھے کھڑے فواد کو بازو سے کھینچ کر۔۔۔ بلکہ گھسیٹ کر کسی دلیل کے طور پر ان کے سامنے کیا۔

"ہائے میرے فواد کا تو کوئی حال نہیں جب سے سنا ہے اس نے۔ مرد ہے ناں تو رو تو سکتا نہیں۔۔۔ بس اندر ہی اندر گھل گھل کر دیکھو کیسا منہ نکل آیا ہے اس کا۔"

اس کا منہ دونوں جانب سے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں دبا کر انہوں نے یوں ہلایا کہ اس کے ہونٹ کھل کر سیٹی کے سے انداز میں گول ہو گئے۔

نمرہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بغور اس کی شکل جانچی۔

"توبہ۔۔۔ بس ڈرامے ہیں۔ ہو بہو پہلے کا سا منحوس تھوبڑا ہے اس کا۔ مجال ہے کوئی ایک لعنت پھٹکار بھی کم ہو کر برس رہی ہو۔"

اس سنگین صورتحال میں بھی اس کا دل فواد کے متعلق ازلی سرگوشیاں کرنے لگا تو بے ساختہ سر جھٹک کر وہ یوں تن کر کھڑی ہوگئی گویا کوئی اس کے خیالات پڑھ رہا ہو۔

"وہ ٹھیک ہے شہوار۔۔۔ سرجری تو کامیاب رہی ہے۔ بس دعا کرو اگلے چھتیس گھنٹوں میں اسے ہوش آ جائے۔ سرجری کی نوعیت کے تحت اس کا چھتیس گھنٹوں میں ہوش میں آنا ازحد ضروری ہے۔ ورنہ مشکل ہو سکتی

ہے۔" ان ماں بیٹی کو مسلسل خاموش پایا تو ساکت پانیوں سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں شاہجہاں عادل خود ہی اپنی بہن کو اس کی حالت سے آگاہ کرنے لگے۔ اور ان کے بات مکمل کرنے کی دیر تھی کہ پہلے کی طرح رنگ رنگ کی دہائیاں دیتی شہوار بیگم اپنے "بھائی صاحب" کے باقاعدہ گلے "پڑ" گئیں۔

"ہائے یہ کیا ہو گیا ہے میری بہو رانی کے ساتھ۔۔۔؟ ہائے میرے فواد کا کیا بنے گا؟ ہائے یہ کیا ہو گیا بیٹھے بٹھائے؟ ہائے۔۔۔"

اور ان کے بین ابھی راہ میں ہی تھے کہ سارا ضبط چھوڑ کر انہی کی مانند فواد کو کھینچ کر ایک طرف دھکیلتی نمرہ انہیں ناگواری سے اپنے باپ سے علیحدہ کرنے لگی۔

"یہ ڈرامے بازیاں بند کر دیں پھوپھو کہ ابھی وہ زندہ ہے۔ اور خدا نہ کرے کہ اسے کچھ بھی ہو۔ جاں پہ وہاں اس کی بنی ہوئی ہے اور آپ کو اس دکھاوے سے ہی فرصت میسر نہیں کہ آپ کے اس چغد سے بیٹے کا کیا بنے گا؟ یعنی کہ حد ہے بھئی کہ ہمارے مرنے پہ بھی لوگ۔۔۔ رونا اپنا ہی روتے ہیں؟"

اس کے تند لہجے میں ایسی کوئی تلخی کی ملاوٹ تھی کہ رونا دھونا بھول کر وہ ٹکر ٹکر بھتیجی کا منہ دیکھنے لگیں۔ لیکن کسی کو بھی بات کا موقع دیئے بنا وہ اسی لہجے میں مزید بولی۔

"اور یہ بار بار "بہو رانی" کا لفظ استعمال مت کریں اس کے لیے۔۔۔ بابا سے پوچھ سکتی ہیں آپ کہ صرف اسی ایک "مرتبے" پر فائز نہ ہونے کے لیے ہی وہ اس وقت موت و حیات کے مابین کہیں جھول رہی ہے۔ یہاں میرے سامنے آپ نے ایک مرتبہ بھی اور اس فضول لفظ کی گردان کی تو میں۔۔۔ تو میں فواد کا وہی حال کر دوں گی جو اس کی وجہ سے آج میری بہن کا ہوا ہے۔"

انتہائی مضبوط انداز میں بولتی وہ پہلے ہر پل ڈری سہمی سی رہتی نمرہ تو تھی ہی نہیں۔۔۔ ہاں اس پل اس میں ثومیہ شاہجہاں سی کوئی پر عزم لڑکی پوری شدت سے آن بسی تھی۔ بات مکمل کرتے ہوئے جونہی وہ پلٹنے لگی انہوں نے بے یقین سی بے یقین نظروں سے ماتھے پر بے شمار بل لیے لیکن انتہائی بے بسی سے کھڑے اپنے "بھائی صاحب" کی طرف دیکھا۔ ہاں یہی وہ پل تھا جب وہ جاتے جاتے پھر سے رکی۔

"اور ہاں۔۔۔ میری کسی بھی بات پر کوئی شبہ مت رکھیئے گا۔ میں وہ کر بھی گذروں گی جو میں نے کہا ہے

ابھی۔ اور بابا سے آپ یہ بھی پوچھ سکتی ہیں کہ آج کل ہم دونوں بہنیں وہ سب سچ مچ کر گزرتی ہیں جو کہ ہم کہیں۔۔۔"

طنزیہ لہجے میں کہتی ہوئی وہ مڑ گئی تو راشدہ بیگم شوہر اور نند کو وہیں آمنے سامنے تھمے ہوئے چھوڑ کر تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے سٹیل بینچ تک چلی آئیں۔

"یہ بہت غلط رویہ تھا میری بچی۔ پہلے بھی ہم مزاجوں کی اسی تندی کا بھگتان بھگت رہے ہیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تمہارا یوں منہ پھٹ انداز میں ان سے یہ سب کہنا۔ کچھ بھی ہو وہ پھوپھو ہیں تمہاری۔ اور پھر مہمان بھی ہیں۔ یہ بہت نامناسب حرکت کی تم نے نمرہ۔"

اس کے ساتھ ساتھ بیٹھتے ہوئے انہوں نے بھرپور لفظوں میں سرزنش کی تو دوبدو لہجے میں وہ ہاتھ جھلاتی ہوئی اسی قدر چڑاہٹ سے بولی۔

"انہی سب احترامات میں رہ کر ہی ہم آج تلک اپنا بیڑا غرق کرتی آئی ہیں ماما جان۔۔۔ اور اسی "لب بستگی" کی پاداش میں ہمیں کسی روز "دیوار گزیدہ" بھی کر دیا جائے گا۔ مجھے مت سمجھائیں خدارا۔۔۔ بالکل ٹھیک کیا ہے میں نے اور یہی کرنا بنتا بھی تھا۔"

اور اس کا دوٹوک انداز دیکھ کر انہوں نے لبوں کو یوں بھینچا کہ گویا اس حوالے سے کچھ بھی مزید کہنا سراسر لفظوں کے ضیاع کا باعث ہو۔ ہاں بالکل انہوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ بہن کی ایسی مردنی حالت کے سبب وہ اس پل کوئی سی بھی نصیحت سننے یا سمجھنے کی حالت میں نہیں ہے۔ خاموشی اختیار کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ شہوار بیگم اب فواد کو ساتھ لیے ہوئے شاہجہاں عادل کی ہمراہی میں دور ایک کونے میں واقع کینٹین کی جانب بڑھ رہی ہیں۔

یقیناً اب وہ نمرہ کے ناروا سلوک پر شکوہ کناں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے "بھائی صاحب" سے اس سارے واقعے کی تفصیلات بھی سننے والی تھیں۔ پیچھے ایک یاسیت بھری نگاہ ثومیہ کے بند کمرے کی جانب ڈال کر وہ انتہائی شکستگی سے سر جھکائے بیٹھ رہیں۔ جوان بیٹی کو جان کنی کی حالت میں چھوڑ کر وہ نند کی فکر میں اس سے زیادہ نہیں گھل سکتی تھیں۔

اور ہاں۔۔۔ ان کی تسبیح کا پھیر بھی رفتار پکڑنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

صبح صبح ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سفیر اپنے کمرے سے نکلا اور سست روی سے چلتا ہوا قدم قدم زینے اتر کر لاؤنج میں آن رکا۔ وہ شب کے لیے مخصوص ڈھیلے ڈھالے آرام دہ ملبوس میں تھا۔ یہاں جاگنگ سے ابھی ابھی واپس لوٹے ڈاکٹر منصور عالم صوفے پر بیٹھے اپنے پاؤں سہلا رہے تھے۔ یہ زندگی بھر میں چھٹی یا فرصت کا کوئی پہلا دن ہوگا کہ وہ ان کے ساتھ جاگنگ ٹریک پر نہیں گیا تھا۔ ورنہ عموماً وہ دونوں ایک ساتھ جاتے تھے۔ وجہ وہی اپنے دوستوں سے جھگڑے کے سبب پیدا ہوا اس کی طبیعت کا بوجھل پن تھا جس میں بے انتہا چڑاہٹ بھی شامل تھی۔ رات کو ان کے بارہا پوچھنے پر وہ بضد رہا تھا کہ مجھ سے اس موضوع پر مزید کوئی بات، گفتگو یا جرح نہیں کی جائے۔ بالآخر ان دونوں میاں بیوی نے اسے اپنے طور پر سنبھلتے دیکھ کر اپنا اصرار ترک کر دیا تھا۔

"آؤ سفیر۔۔۔ بہت دیر سے جاگے آج؟ پارک کے لیے نکلنے سے پہلے میں اوپر تمہارے کمرے کے باہر گیا تھا۔ سوچا تھا تمہیں ساتھ لیتا ہوا جاؤں لیکن تم سو رہے تھے۔"

اسے یونہی بازو لٹکائے ہوئے کھڑے دیکھ کر انہوں نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا تو پیر گھسیٹتا ہوا وہ جا کر ان کے ساتھ ٹک گیا۔

"میں جانتا ہوں بابا۔۔۔ آپ نے دستک بھی دی تھی لیکن صرف ایک بار۔۔۔"

ٹانگیں آگے کو پھیلاتے ہوئے وہ جمائی روک کر بولا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے مُسلسل تاکتے رہے۔

"سوری بابا۔۔۔ بس میرا من نہیں چاہ رہا تھا اٹھنے کا۔ کل سے باقاعدگی سے جائیں گے ان شاءاللہ۔"

ان کی نظروں کا مقصود سمجھتے ہوئے اس نے مبہم سی توجیح پیش کی تو وہ مدھم سا مسکرا دیئے۔

"کسی سے دل کی بات کر لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے بیٹے۔ یوں اکیلے کڑھتے رہنے سے تو انتہائی مضبوط انسان کا دل بھی ایسا ہی شکستہ ہو جاتا ہے۔"

اس کے شانے کو پدرانہ شفقت سے دباتے ہوئے انہوں نے بنا کسی اصرار کے کہا تو لبوں کو بھینچتا وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ انہیں اپنی دلی کیفیت نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اس ذکر سے صرف اور صرف

فرار چاہتا ہے۔
" کوئی بات دل کی بات نہیں ہوتی بابا۔۔۔ بس خود کو بہلانے کے خیالات ہیں سب اور بے شک اچھے ہیں۔ بھلے وقتی ہی سہی۔۔۔ قرار ملتا تو ہے ان سے۔"

خوش رنگ لبوں سے بڑی اذیت میں مسکراتے ہوئے اس نے کسی خود کلامی کی مانند یہ جملہ ادا کیا اور پھر باورچی خانے سے جوس کی ٹرے کے ساتھ برآمد ہوتی ذکیہ خاتون کو دیکھ کر سیدھے ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

" خیر۔۔۔ بس یوں ہوا ہے بابا کہ اب یوں دل بہلانا چھوڑ دیا ہے میں نے۔ اب یہ طے ہے کہ کہیں من نہیں " لگے " گا میرا۔"

اس کا لہجہ اول ترین شبِ فراق میں ہی صدیوں سا مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے لفظوں میں شب بھر میں ہی صحرا سی حرارت در آئی تھی۔ اس پل بغور اس کی ذہنی و قلبی کیفیات جانچتے ہوئے ڈاکٹر منصور عالم بالکل خاموش ہو گئے۔ تب تک یہاں کی گفتگو سے یکسر بے خبر ذکیہ بیگم جھک کر ٹرے میز پر رکھتی ہوئی بولیں۔

" تم بھی جاگ گئے جاناں۔۔۔ چلو اچھا ہے۔ میں تمہارے لیے بھی جوس لاتی ہوں۔"

ان کی بات پر وہ ہولے سے مسکرا کر کچھ کہنے لگا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

" آپ جوس پئیں منصور۔۔۔ میں بس ابھی آئی۔ پھر جلدی جلدی کلینک کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ میں آپ کا ناشتہ بھی بنا چکی ہوں۔"

بات مکمل کرتے ہی وہ پلٹنے لگیں کہ سفیر بول اٹھا۔

"میری بھی سن لیں ماما۔ میں کچھ نہیں لوں گا فی الوقت۔ کیونکہ برش تک نہیں کیا میں نے ابھی۔ پلیز آپ بیٹھیں۔"

اس کی بات پر وہ جاتے جاتے رک گئی تھیں۔ اور پھر اگلے ہی لمحے ایک معنی خیز و متجسس سی نگاہ شوہر کی طرف ڈال کر وہ آہستگی سے ان دونوں کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

" کم از کم برش تو کر آتے۔ یونیورسٹی سے فراغت ملنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ روٹین تباہ کی جائے۔"

ایسے ہی کوئی موضوع نہ ہونے کے سبب بات برائے بات کہتے ہوئے انہوں نے اس کی بجائے ساتھ

بیٹھے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا تو ان کی نظروں میں پنہاں پیغام کو سمجھ کر انہوں نے بھی سر اور آنکھوں کی خفیف سی منفی جنبش سے انہیں خبردار کیا کہ کوئی "خصوصی گفتگو" نہیں کی جائے گی۔ اس کی حالت کے پیش نظر ان دونوں میاں بیوی کے مابین رات میں ہی یہ طے پا گیا تھا کہ وہ خود سے اس سے یہ بات یا موضوع چھیڑنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

"صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔ کچھ بھی پیچھے چھوٹ جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ جینے کے اطوار بدل ڈالے جائیں۔ ہاں بالکل۔۔۔ کچھ پیچھے چھوٹ بھی جائے تو زندگی پہلے کی سی رواں رہنی چاہیئے۔"

ان کی سرسری سی بات کا اس نے یوں معنی خیزی سے جواب دیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بس دیکھ کر رہ گئے۔ اس کے لہجے میں وہ وہ بجھارتیں بسی تھیں کہ جن کا جواب کوئی صدیاں کھنگال کر پاتا ہے۔ اور یہیں ان دونوں کو پریشان ہوتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا کسی قدر بشاشت سے بولا۔

"میں فریش ہو آؤں دوستو۔۔۔ پھر ناشتہ ایک ساتھ کرتے ہیں۔ مدت ہوئی کبھی بابا کی سنگت میں ناشتہ نہیں کیا۔"

بات مکمل کرتے ہی وہ بڑھا اور واپس اوپری منزل کو جاتے زینے پھلانگنے لگا۔ اب تاسف بھری نگاہوں سے اسے پشت سے دیکھتی ہوئی ذکیہ خاتون بنا کسی توقف کے بولیں۔

"میں کہہ رہی ہوں منصور اس کی ذہنی حالت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ کل کی طرح شاید دوبارہ کوئی تماشا تو نہیں کرے گا لیکن اندر ہی اندر بے طرح کڑھتا رہے گا۔ یہ بات اس میں منفیت کو حاوی کر سکتی ہے۔ ہمیں اس سے بات کرنی ہوگی کہ یہ اب چاہتا کیا ہے؟"

اور اتنا کہہ کر ہاتھوں کو باہم ملتی، ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے وہ مزید بولیں۔

"حق ہاہ۔۔۔ ثومیہ مجھے ایسی تو نہ لگی تھی کہ اس کی محبت کو ٹھکرا کر کسی اور سے محبت کرنے لگے۔ بڑا دل موہ لینے والا انداز تھا اس کا منصور۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ بچی جان بوجھ کر کسی کا دل نہیں توڑ سکتی تھی۔ وہ تو سب کے دل رکھنے والی لگی تھی مجھے۔ آپ کیا کہتے ہیں اس پر؟"

اس پل ان کی آنکھوں میں ثومیہ شاہجہاں کے ہولے سے مسکراتے لب، جھجکتا ہوا انداز اور شرم و حیا سے لپٹا

ہوا سراپا تیر رہا تھا۔ ان کا دل مان کے ہی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اپنے آپ میں سمٹی لڑکی کسی کو "جھانسہ" دے سکتی ہے۔

ان کی بات پر ڈاکٹر منصور عالم نے بھی ایک طویل تر سانس بھرا اور جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔

"میں آپ سے متفق ہوں بیگم جان۔۔۔ لیکن فی الحال اس کے سامنے آپ ثومیہ کی وکالت کی غلطی مت کیجئیے گا۔ کسی غلط فہمی کی بنیاد پر ہی سہی۔۔۔ پر ابھی وہ اس سے صرف نفرت کر رہا ہے۔ دلائل، صفائیاں یا وضاحتیں دے کر بھی۔۔۔ ابھی وہ اس سے محبت نہیں کرے گا۔ رتی بھر محبت بھی نہیں۔"

انہوں نے کم لفظوں سے زیادہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی اور یقیناً وہ اس میں کامیاب رہے تھے۔ ذکیہ خاتون اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کسی گہرے خیال و جہاں میں کھو گئی تھیں۔ اب انہیں یوں اپنی سوچوں میں غلطاں و مستغرق پایا تو جلدی جلدی جوس کے آخری دو گھونٹ بھر کر منصور عالم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پریشان مت ہوں بیگم جان۔ ان شاء اللہ وقت ہر زخم پہ مرہم رکھ دے گا۔ جلد اسے بھی حقیقت سے آشنائی ہو گی۔ اور میرا ناشتہ لے آئیں پانچ سے سات منٹ تک بس۔ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔"

یہ کہتے ساتھ ہی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تو "جی اچھا۔۔۔" میں جواب دیتے ہوئے وہ ایک بار پھر اوپری منزل کی جانب دیکھنے لگیں۔

سفیر کی فکر میں گھلتے ہوئے ایک خیال انہیں یہ بھی تھا کہ جانے اس کہانی میں کون کتنا سچا ہے؟ کہ حقیقی علوم کا وارث تو بس رب ذوالجلال ہی ہے۔

ادھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپری راہداری میں داخل ہوتا سفیر تھوڑا سا چل کر یکایک رکا اور اسی جگہ ہارے ہوئے انداز میں گھٹنوں کے بل گرتا ہوا، جھک کر خودی سے لپٹ گیا۔

ابھی ابھی عشق میں ہارا وہ شخص صرف اپنے والدین کے سامنے مضبوط بنتے بنتے اندر سے پورا خالی ہو گیا تھا۔

وہ رو رہا تھا۔۔۔ اور مُسلسل۔

وہ تڑپ رہا تھا۔۔۔ اور لگاتار۔

ہاں اسے عشق میں "صبر" میسر نہیں آ رہا تھا۔

ہائے۔۔۔ عشق میں صبر آتا بھی کہاں ہے؟؟؟

☆......☆......☆

فواد شام تک واپس چلا گیا جبکہ پھوپھو شہوار ہسپتال میں ہی رکی تھیں۔ ہاں البتہ انہوں نے دوبارہ ایسی کوئی بات نہیں کی کہ جس سے نمرہ کی ان سے پھر بحث ہوتی۔ بلکہ بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ راشدہ بیگم کے ساتھ بیٹھ کر انہیں تسلی دلاسہ دیتی رہی تھیں۔ ان سب کے لبوں پہ فی الوقت صرف یہی ورد و دعا تھی کہ چھتیس گھنٹوں تک ثومیہ کو لازمی ہوش آ جائے۔ اس کے کمرے کے باہر راہداری میں کبھی یہاں تو کبھی وہاں بیٹھتے، اٹھتے اور ٹہلتے ہوئے بھی وہ سب اس وقت اکٹھے ہو کر ڈاکٹر کے گرد گھیرا بنا لیتے جب وہ گاہے بگاہے وارڈ کے راؤنڈ پر آتا۔ نہایت فکر سے اس کی تشویشناک حالت و کیفیت کی بابت پوچھتے ہوئے ان سب کے لہجوں میں بیک وقت کئی خدشات دھڑکتے تھے۔

ہر بار انہیں صرف و فقط دعا کی تلقین کرتے ہوئے ڈاکٹر کوئی نہ کوئی مبہم سا جواب دیتے ہوئے نکل جاتا تو ان سب کے اور خصوصاً راشدہ بیگم اور نمرہ کے دل میں کئی کئی اندیشے سرسرانے لگتے۔

اور بالآخر یوں ہوا کہ ثومیہ کو لگ بھگ تیس گھنٹوں بعد ہوش آ گیا۔ لیکن یوں کہ بس آہ و بکا۔۔۔ اور واویلا۔

اس وقت ایک نرس اسے کوئی ضروری ٹیکہ لگانے کے لیے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو حسبِ عادت نمرہ دوڑتی ہوئی دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کل سے یہی کر رہی تھی کہ جونہی کوئی اس کمرے میں داخل ہوتا وہ کان لگا کر اندر سے ابھرتے اک ایک کھٹکے پر غور کرنے لگ جاتی تھی۔ اندر نرس کے سرنج میں ٹیکہ بھرنے سے قبل ہی اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں تو حسبِ ہدایت سرنج کو واپس ٹرے میں پٹختی وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے باہر بھاگی۔ دروازہ کھول کر جونہی وہ باہر نکلی نمرہ ایک دم سے پیچھے ہوئی۔

"آپ کی سسٹر کو ہوش آ گیا ہے۔۔۔"

عجلت آمیز لہجے میں اسے مطلع کر کے اس نے قریب سے گذرتی ہوئی چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے

رکھی گئی "سٹاف" کو پکارا۔

"ماجدہ باجی ڈاکٹر صاحب کو بھیجیں فوراً۔ انہیں کہیں روم نمبر فائیو کی مریضہ کو ہوش آ گیا ہے۔ اور ذرا جلدی پلیز۔"

حکمیہ انداز میں کہتی وہ نمرہ کے پیچھے پیچھے واپس کمرے میں داخل ہوگئی تو "یا اللہ تیرا شکر ہے۔۔۔" کہتے ہوئے سب سے پہلے راشدہ بیگم، پھر شہوار بیگم اور پھر شاہجہاں عادل نے بھی جھٹ ان کی پیروی کی۔

اندر پٹیوں میں جکڑے سر کو حتی الامکان دائیں بائیں موڑتے ہوئے ثومیہ پورے کمرے میں نگاہیں دوڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سوجن زدہ آنکھوں میں تیرتی بے تحاشا الجھن سے نمرہ کو صاف محسوس ہوا کہ وہ اس اجنبی ماحول و منظر سے گھبرا رہی ہے۔

"شکر ہے تمہیں ہوش آیا آپی۔ جان ہی نکال دی تھی ہماری۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

تیزی سے نزدیک ہوتی وہ اس کے ہسپتال کی نیلی چادر میں ڈھکے ہوئے شانے کو بہت محبت سے چھو کر بولی تو جواباً اس نے اسے یوں خالی خالی آنکھوں سے دیکھا گویا پہچانتی ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں کی الجھن بھی بڑھ گئی تھی۔ اور اس کے یوں ساکن و ساکت سے ردعمل پر نمرہ کو کسی نہ کسی گڑبڑی کا شدت سے احساس ہوا۔

"تم ہسپتال میں ہو ثومیہ۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟"

سرسراتی ہوئی آواز میں کہہ کر اس نے اسی پل اپنے پیچھے آن رکتی اپنی ماما کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں تشکر کی نمی لیے بس ثومیہ کو تاک رہی تھیں۔

"مم۔۔۔ میں ثومیہ ہوں۔ تت۔۔۔ تو۔۔۔ تم کون ہو؟"

کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے جو پہلا جملہ ادا کیا اس سے یوں محسوس ہوا کہ اس کا نام تو کجا وہ تو گویا اپنے نام سے بھی بس ابھی ابھی واقف ہوئی تھی۔ اس کی بات پر وہ دونوں ماں بیٹی اسے چھوڑ کر بڑے اچھنبے سے بس ایک دوسرے کو تاکنے لگیں۔ نرس اس سب گفتگو سے باخبر رہتے ہوئے مسلسل اس کی دھڑکن کا ردھم، سانسوں کا اتار چڑھاؤ اور دیگر طبی نکات کا جائزہ لے رہی تھی۔ شناخت سے متعلقہ سوال کر کے ثومیہ کی آنکھوں میں الجھن کے ساتھ ساتھ اب وحشت بھی جاگنے لگی تو نمرہ نے بہت گھبرا کر نرس کو مخاطب کیا۔

"یہ۔۔۔ یہ مجھے پہچان نہیں رہی سسٹر۔ پلیز ذرا دیکھیں تو۔۔۔"

اس کا جملہ ابھی ادھورا تھا کہ شہوار پھوپھو نے ثومیہ کے عین اوپر جھک کر پیار "نچھاور" کرنا چاہا۔

"ہائے میں صدقے اپنی دھی رانی کے۔۔۔"

اوران کا اگلا سارا جملہ ثومیہ کی یکا یک بلند ہوتی بے طرح سی چیخ و پکار میں ہی کہیں دب سا گیا۔

" کون ہو تم سب۔۔۔؟؟ اور کون ہوں میں بھی؟؟ بتاتے کیوں نہیں؟؟؟ یہ کہاں ہوں میں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ دور جاؤ سب۔ دور رہو مجھ سے۔"

ان سب کے ساتھ ساتھ اپنی بھی شناخت سے یکسر انکار کرتی، اس پر بے تحاشا پریشان ہوتی وہ بری نولہ لگے ہاتھ سے انہیں دور ہونے کا اشارہ کرنے لگی تو اسٹینڈ پر ٹنگی ہوئی بوتل اور قریب دھرا دوسرا اپریٹس بھی جھول کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں در آئی اجنبیت سے نمرہ کو بہت خوف آیا۔ جبکہ پھوپھو بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے ایک طرف ہو گئیں۔ ایسی بھی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔۔۔ ایسا تو ان میں سے کسی کے بھی پسِ وہم وگماں تک میں نہیں تھا۔ اسے یوں شور مچاتے دیکھا تو نرس تیزی سے بڑھی اور انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں اسے بازو سے تھام کر آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے دھیرج کرنے لگی۔ اس کا بس اتنا اثر ہوا کہ وہ ایک پل کو چپ ہو گئی۔۔۔ اور پھر سر کو واپس تکیے پہ ٹکاتے ہوئے اس نے اس سے بھی التجا کی۔

" تم کون ہو؟ تم ان سب کو دور کرو مجھ سے پلیز۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

وحشت واجنبیت سے بھرپور اس کی آنکھوں میں آنسو بھی بھر آئے تو دوپٹہ منہ پر رکھ کر روتی راشدہ بیگم کا ہاتھ تھام کر قدم قدم پیچھے ہوتی نمرہ کو بھی آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا۔

اور وہ تو فقط رو رہی تھی۔۔۔ یہ مر جانے کا مقام ہوتا ہے جب انتہائی اپنوں کی آنکھوں میں بھی ہمارے لیے اس قدر بیگانہ پن در آئے۔

اسی پل تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر وہاں داخل ہوا اور اندر کی صورتحال دیکھ کر باری باری ان سب کی طرف مڑا۔

" آپ باہر جائیں پلیز۔۔۔ جلدی۔ مریضہ کے پاس ہجوم نہیں بنانا تھا۔ جلدی باہر نکلیں۔ جلدی

پلیز۔"

ہاتھوں کی مختلف حرکات سے انہیں باہر جانے کا حکم دیتا وہ فوراً "اپریٹس انڈیکیٹرز" کی طرف دیکھنے لگا اور پھر ان کے باہر نکلنے سے قبل ہی بڑی عجلت میں نرس کو کسی مخصوص ٹیکے کی محدود سی مقدار سرنج میں بھرنے کے لیے کہا۔ انہیں اپنے "کام" میں مگن دیکھ کر راشدہ بیگم، شہوار بیگم اور شاہجہاں عادل تو کمرے سے نکل گئے لیکن نمرہ دروازہ تھام کر پھر بھی کھڑی رہی۔ جیسے ہی نرس مطلوبہ ٹیکہ بھر چکی اس کے ہاتھ سے سرنج لیتے ہوئے ڈاکٹر نے مزید حکم دیا۔

"انجکشن میں خود لگا لیتا ہوں تم یوں کرو کہ ڈاکٹر زید لطیف اور راجا عامر صاحب کو بھی بلا کر لاؤ فوراً۔"

اور اسے باہر جانے کا اشارہ کرتی ہوئی نرس اسی طرف آنے لگی تو اس نے آخری نگاہ بس ڈاکٹر کو متوحش سی لیٹی ثومیہ سے مخاطب ہوتے دیکھا۔

"آپ پریشان نہیں ہوں بالکل۔ آپ ہسپتال میں ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ایک حادثے میں آپ کو سر پہ مائنر سی ایک چوٹ لگی ہے اور بس آپ آرام کریں تو سکون آتا جائے گا۔"

نرم لفظوں اور ہمدردانہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ نہایت مہارت سے برینولہ میں سرنج انجیکٹ کرنے لگا تھا۔

آہستگی سے دروازہ بند کرتی وہ نرس کے ساتھ ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی اور خالی خالی نظروں سے اس دروازے کی متوازی دیوار سے لگ کر کھڑی راشدہ بیگم کی طرف دیکھا۔ پھوپھو شہوار اور شاہجہان عادل بھی نزدیک ہی کھڑے نیچی آواز میں کوئی "آپسی گفتگو" کر رہے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ اگلا آدھا گھنٹہ وہ بلائے جانے والے دونوں ڈاکٹرز کے ساتھ دو تین سینئیر نرسوں کو بھی بار بار ثومیہ کے کمرے میں آتے جاتے دیکھتی رہیں اور دل ہی دل میں "سب خیر ہو۔۔۔" کی دعاؤں کا ورد جاری رکھا۔ ثومیہ کے یوں کسی کو نہ پہچاننے پر ایک دوسرے کو تسلی دلاسہ دیتے ہوئے شاید وہ ساتھ ساتھ خود کو بھی باور کروا رہی تھیں کہ جلد سب ٹھیک ہو جائے۔ ہاں ان شاء اللہ وہ سب کو پہچاننے لگے گی۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں بسی اجنبیت دیکھ کر اپنے لفظوں کی کاملیت پر ان کا بھروسہ نہیں ٹھہر تا تھا۔ وہ اس کے ہوش میں آنے پر پوری خوش بھی نہیں ہو سکی تھیں کہ پھر سے رونا پڑ گیا تھا۔ نئی فکریں لگ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد نمرہ نے دیکھا کہ پھوپھو اب اپنے "بھائی

صاحب" سے ذرا ساہٹ کر فون پر کسی سے مصروف گفتگو ہیں تو انتہائی اکتاہٹ سے بڑبڑائی۔

"بتا رہی ہوں گی اپنے عقل سے پیدل اس گھامڑ بیٹے کو ثومیہ کے اس طرح ہوش میں آنے کا۔ تاکہ وہ پورے خاندان میں کوئی چار چھے لفظ بڑھا کر تشہیر کر سکے بات کی۔ سب سے نمٹ لوں گی میں کوئی کرے تو سہی کسی بھی قسم کی کوئی منفی بکواس۔ بس بہت سہہ لیا ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ اب کیا سہنا؟"

غصے میں اٹھ کر وہ یہاں وہاں ٹہلنے لگی اور اسے مخصوص حدود میں پھرتے کوئی چوتھا پھیرا ہو گا کہ دروازہ کھول کر تینوں ڈاکٹرز ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ صرف وہی سینیئر ڈاکٹر ان سے بات کرنے کے لیے رکا جبکہ باقی دونوں ان کی طرف دیکھے بنا ہی دائیں سمت واقع دوسری وارڈ کی جانب بڑھ گئے۔ وہ سب ایک بار پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔

"کیا بنا ڈاکٹر صاحب؟ وہ تو کسی کو بھی پہچاننے سے انکاری ہے۔"

شاہجہاں عادل کے سنجیدگی سے پوچھے گئے سوال پر ڈاکٹر نے ایک لمحے کے توقف سے گویا لفظ ترتیب دیئے اور مبہم ہنکارا ابھر کر جواباً بولا۔

"سب سے پہلی بات تو یوں ہے محترم کہ آپ پریشان نہیں بس خدا سے دعا مانگیں۔ اہم بات بس یہ ہے کہ مریضہ کو ہوش آ گیا ہے۔ ہوش میں آنا از حد ضروری تھا۔ رہی بات کسی کی پہچان نہ ہو سکنے کی تو ایسی شدید ضرب لگنے پر وقتی طور پر یادداشت کا کھو جانا عام بات ہے۔ ایسے کئی کیسز دیکھ چکا ہوں میں کہ پہلی بار ہوش میں آنے پر مریض کسی کو نہیں پہچانتا لیکن دوسری یا اکثر تیسری بار دوبارہ جاگنے سے سب نارمل ہو جاتا ہے۔ یعنی آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میرے لیے ہوش میں آنے پر اس کی یادداشت کا عارضی طور پر کھو جانا متوقع بات تھی......"

لہجے کے مدھم زیر و بم میں انہیں جامع طور پر زیادہ سے زیادہ تفصیلات سے آگاہ کرتا یہاں وہ رکا اور باری باری سب کے چہروں پر پھیلے حیرت و استعجاب، تفکر و امید اور تجسس کے ملے جلے تاثرات دیکھتا گفتگو سمیٹتے ہوئے مزید بولا۔

"بہر حال آپ میں سے کوئی بھی دو افراد آدھے گھنٹے تک میرے روم میں آ جائیں تو ہم اس پر مزید بات کریں گے۔ ابھی نئے لیے گئے سکینز کو سٹڈی کرنے لگا ہوں میں تو یقیناً کئی باتیں یا پہلو اور بھی شامل ہوں گے

اس میں۔ آپ لوگ آدھے گھنٹے بعد آجایئے گا۔ شکریہ۔"

بات مکمل کرتے ہی تسلی کے انداز میں شاہجہان عادل کا شانہ تھپکتا وہ چلا بھی گیا تو وہ سب ایک غیر محسوس سی خاموشی سے لپٹ کر ایک دوسرے کو بس دیکھ کر رہ گئے۔

ایسی چپ تھی وہاں کہ جیسے ساری باتیں فضول ہوتی ہیں۔۔۔

ایسا سناٹا کہ جیسے گونج کا کوئی وجود کہیں ہو ہی نہیں......

ہاں انہیں ادراک ہو گیا کہ اندر بستر پر لیٹی لڑکی اس حالت میں آگئی تھی کہ اس کے لیے ان کی ساری باتیں، تمام گفتگو یا پورے اندیشے۔۔۔ سراسر بے کار ہو گئے ہیں۔

تو گویا زندگی اب ثومیہ شاہجہاں پہ کسی انوکھے رنگ وانگ سے عیاں ہونے والی تھی۔ ہاں زندگی ایسی ہی رنگ ساز و رنگ ریز ہوتی ہے۔۔۔ جو مرضی رنگ چڑھا کر پھر......اتار دینے والی بھی۔

☆......☆......☆

وہ ہر بار خوابوں سا ملتے تھے۔۔۔ اور کہانیوں سی ان کی سب گفتگوئیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ جس منظر میں رکتے تھے اس میں اداسیاں گھول دیتے تھے۔۔۔ وہ جس لمحے میں آتے تھے اسے صدیاں بناتے تھے۔

وہ دیوتا۔۔۔ وہ اپسرا۔۔۔ وہ عشق کے ہاتھ لگے ہوئے لوگ۔۔۔ آج ملے تو حسبِ سابق یوں کہ بس کہیں بھی مل گئے۔ دل کو بہت سے باندھ اور واسطوں سے روکتی وہ اپسرا آج بہت عرصے بعد لیکن بہت مجبور ہو کر شاہی قلعے چلی آئی تھی۔ دل پہ اس جبرِ مسلسل کی وجہ یہی کہ اول تو وہ ملتا نہیں تھا۔۔۔ مل جاتا تھا تو رکتا نہیں تھا۔۔۔ اور اگر رک جاتا تھا تو ہمیشہ کے لیے نہیں رکتا تھا۔ وہ گھڑی پہ وقت کی مانند تھا کہ بس گزرتا ہی چلا جاتا تھا۔۔۔ اور وہ کوئی ساکتی ہندسہ تھی کہ اپنے مقام سے کبھی ہٹی ہی نہیں۔

کسی جوگن، کسی درویش۔۔۔ اور کسی بھولے ہوئے راہی کی طرح شاہی قلعے کے عظیم و قدیم بام و در کے مابین جا بجا گھومتے ہوئے وہ آج اس حال میں تھی کہ کوئی حال نہیں تھا۔ ساکتی آنکھیں، گنجلک بال اور چہرے پہ جمی یاسیت کی بے پناہ سی گرد۔۔۔ وہ کوئی کنیز، کوئی داسی اور کوئی خادمہ تو تھی لیکن۔۔۔ اپسرا نہ تھی۔

وہ اس وقت شکستہ غلام گردشوں میں تھی۔ ان ادھڑی اکھڑی دیواروں کی بوسیدگی اور باس میں سے اسے

صدیوں کے سلاسل میں گرفتار کئی ان کہی، ان چھوئی، اور ان دیکھی محبتوں کے بین سنائی دیتے تھے۔ اسے ادراک تھا کہ ادھورے قصائص یہاں عشقیہ رقوص کرتے ہیں۔ اسے احساس تھا کہ بے سبب اداسیاں یہاں بال بکھیرے ناچتی ہیں۔ ہاں یہیں اندر بستی خامشی پہ کان لگا کر وہ گفتگوئیں نچھاور کرتی تھی۔ کسی کے بھی فہم و گماں سے بالا انہی سب محسوسات میں گھل گھل کر بہت دیر بعد وہ ان غلام گردشوں سے باہر نکلی اور پر شکوہ گولائی دار بروج کے درمیان سے گذرتی ہوئی اپنے خیالوں میں محو و مگن رہ کر آگے ہی آگے بڑھنے لگی۔ اس کا رخ قلعے کی بیرونی خستہ حال فصیلوں کی طرف تھا۔ اور جونہی خودرو جنگلی جھاڑیوں اور خشک و سبز میل سے اٹی ہوئی گھاس والا ایک درمیانی میدان عبور کر کے، ٹوٹے پھوٹے کناروں والے زینوں پہ قدم قدم چڑھتی وہ اوپر بیرونی فصیل پر آئی۔۔۔ اپنی جگہ پہ تھم سی گئی۔

وہ جس کے پیروں تلے آن سلگتی راکھ اٹھا کر وہ آنکھوں کا سرمہ بنا سکتی تھی۔۔۔ وہی دیوتا ایک بار پھر سے اس سے فقط چند قدموں کی مسافت پر تھا۔ شاہی قلعے کی بیرونی فصیلیں مضبوطی کے پیش نظر بنیادوں یا زمین کے پاس کم از کم پانچ فٹ اور اوپری یعنی اختتامی کناروں پر کم از کم تین فٹ چوڑی بنائی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے نیچے سے اوپر آنے تک یہ چوڑائی بتدریج کم ہوتی جاتی ہے اور اسی خاصیت کی وجہ سے دور سے دیکھنے پر یہ دیواریں جھکی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان دیواروں کے اوپر دونوں طرف اینٹوں کے کچھ اضافی وار لگا کر درمیان میں نقل وحمل کے لیے گذرگاہ سی بنائی گئی ہے۔ پرانے وقتوں میں اس ترتیب کا مقصد دشمنان کے حملے کی صورت میں محافظین قلعہ کی اپنی حفاظت بھی یقینی بنانا تھا جبکہ آج کل یہ صرف بیرونی گراوٹ سے بچاؤ کے طور پر گماں کی جاتی ہیں۔ آج بھی اس کی آمد اور موجودگی سے بے خبر وانجان وہ دیوتا انہی اطرافی گراوٹ سے ڈھال کے طور پر بنائی گئی چھوٹی دیواروں میں سے ایک پر پشت ٹکائے اس اپسرا سے مخالف سمت میں دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم میلتا ملاتا وہ جانے کن خیالات میں گم تھا۔ فصیلوں کے پار واقع شہر لاہور سے لپٹ لپٹ کر آتی ہوائیں، اس دیوتا کے پیروں کے آس پاس بکھری ریت اڑا اڑا کر اس اپسرا کے وجود پر کسی بوچھاڑ کی مانند برسانے لگیں تو بے ساختہ آنکھیں موند کر اس نے جانبِ یار سے آتی اس ریت کو بھی سانسوں میں اتار لینا چاہا۔ عشقِ آبگیں۔۔۔ اس کی ذات میں کسی مضبوط طلاطم کی مانند برپا تھا۔ ہاں فضائی وسعتوں میں رقصاں ہجرتی

پرندوں سی۔۔۔ اور دھنک رنگوں سے مزین ساتویں آسمان سی وہ لڑکی۔۔۔ اب کسی کی آب وجو میں ڈھل کر جھکی تو بس زمین ہو کے دم لیا۔ پہلے ذرہ ہوئی، پھر خاک، اور بعد مٹی ہو گئی۔۔۔ اور مٹی بھی ایسی کہ جو دھول سی بے مروت ہو کر خودی کی سانسوں میں چبھنے لگے۔ اذیت بنے اور خون کے سنگ سنگ ہو کر، رگ رگ تک میں جا اترے۔ ڈورِ عشق کے اول ترین سرے سے بندھی دھیرے دھیرے چلتی وہ اس کے قریب ہوئی اور کان لگا کر اس کی بے تاب سسکیوں کو سنا۔ ہاں کسی کی "یاد" سے لپٹا۔۔۔ وہ ہولے ہولے رو رہا تھا۔

"میری انگلیوں میں اب بھی تمہاری انگلیوں کے ہونے کا احساس سرسراتا ہے۔ میرے صحنِ تخیل پر تمہاری یاد بستی ہے۔ میرے وہم وگمان میں بھی تمہاری ذات باقی ہے۔ سنو یار تم لوٹ آؤ۔ خدارا "اب" تو لوٹ آؤ۔ تمہارے بنا میں مر جاؤں گا۔ روتے ہوئے نہیں تو بلکتے ہوئے ضرور۔۔۔ بلکتے ہوئے نہیں تو روتے ہوئے ضرور۔" ٹوٹے ہوئے لہجے میں خود کلام ہوتا وہ آج پھر سے کسی اذیت کو اکیلے جھیل رہا تھا۔

"جو انگلیوں کی پوروں میں احساس کی مانند باقی ہوں۔۔۔ وہ اتنے دور ہوتے ہی نہیں۔۔۔ کہ بلک بلک یار رو رو کر۔۔۔ ہمیں کہیں بھی مرنے دیں۔"

اس کے آبشاری لبوں سے پھوٹتے حیات افزا اس جملے پر اس نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر دیکھا اور پھر اسے دونوں ہاتھ ٹکا کر فصیل کی چھوٹی دیوار بیٹھتے ہوئے دیکھ کر نہایت سرعت سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ۔۔۔ آج بھی۔۔۔ اور وہ بھی یہاں؟؟؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے آپ کوئی۔۔۔ سایہ ہو۔"

آج پہلی بار رخ موڑے بنا، اس کے سامنے ہی گالوں سے بہتے نیر صاف کرتا وہ اس تک چلا آیا۔ "وہ بھی یہاں۔۔۔؟؟؟" پوچھتے ہوئے اس نے قدرے حیرانی سے فصیل کے آس پاس دور دور تک طاری بنجر پن پہ نگاہ کی تھی۔

"کاش میں ہوتی کوئی سایہ۔۔۔ بخت کے حاشیوں سے پار بھی کہیں۔۔۔ حسبِ خواہش دسترس تو رکھ سکتی تھی۔ وگرنہ ابھی تک تو یہ کمبخت۔۔۔ میرا بخت بڑا تیز رہا ہے مجھ سے۔ خواہشوں کو چھونے دیتا ہی نہیں۔ اس کی بات پر بنا کسی تردد کے وہ دوبدو انداز میں بولی تو جل جل بجھی اس کی فسوں گر آنکھیں پھر سے جل اٹھیں۔

دیپ سی روشن اس اپسرا کی مخمور آنکھیں۔۔۔ ایک پل کے لیے اسے گفتگو کے محور سے ہٹانے لگی تھیں۔

"یہ آج آپ کے حلیے کو کیا ہوا ہے؟ عجیب تر ہے۔۔۔"

بے ترتیب لٹوں سے لے کر اس کے دھول سے اٹے پیروں پہ نگاہ رکھتا وہ بے ساختگی میں سوال کر گیا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک مخصوص ردھم سے اس کے مقابل جمتی وہ بے حد برجستگی سے بولی۔

"وہی جو آپ کی جلتی ہوئی آنکھوں اور ٹوٹے ہوئے لہجے کو کہا ہے۔ عشق دھول گزیدہ ہے صاحب۔۔۔ کوئی مذاق تھوڑی ہے۔"

اور اس کے جواب پر بے طرح تڑپ کر اپنی جگہ سے ہٹتا وہ کچھ بھی کہے بنا فصیل سے پار بستے شہر کی طرف دیکھنے لگا تو وہ شکستگی سے مسکرا دی۔ تو گویا وہ آج بھی اس سے فقط "فرار" ہی چاہتا تھا۔

"جلتی آنکھیں، ٹوٹا لہجہ، بکھرے بکھرے بال۔۔۔ ہمیں گر معلوم ہوتا کہ عشق ایسا ہوتا ہے تو اللہ کی قسم ہم کبھی نہیں کرتے۔"

اس کے گرد گھوم کر جانے کب سے چھوٹے ہوئے کوئی ادھورے طواف کرتی وہ ایک رخ سے اس کا حسین و دلکش چہرہ تاکتے ہوئے بولی تو وہ بہت بے چین سا ہو کر اس کی سمت مڑا۔ کہ اپسرا نے دیوتا کی "جلتی ٹوٹتی" کیفیت اور اپنی "بکھری بکھری" حالت کے گرد عشق کا حصار کھینچا تھا۔

"عشق حالتیں بگاڑ دینے لگے تو جلتی آنکھوں، ٹوٹے لہجوں اور بکھرے بالوں سے کہیں پرے لے جاتا ہے۔ دریاراں پہ رک کے صدائیں نہ دلوائے تو عشق ہوتا ہی نہیں۔ "ہم" تو شاید اس سفر کی کسی ابتدا میں ہیں۔ ابھی سے عشق نہ کرنے کی آرزو نہ کریں آپ۔۔۔ ابھی تو یہ عشق نیا نیا ہے۔"

اس کے چاشن گر لہجے میں ایسی کوئی دردگری تھی کہ ٹکر ٹکر اس کے پیارے نین تاکتی وہ جہان بھر سے ہٹنے لگی۔ ابتدائے عشق کیا ہے۔۔۔ یا انتہائے عشق کیا۔۔۔؟؟؟ اس کے منہ سے نکلا صرف ایک۔۔۔ "لفظِ ہم" اسے سب کچھ بھلا گیا۔

تو بالآخر اس گفتگو، اس ذکر میں۔۔۔ اس دیوتا نے کہیں نہ کہیں اسے اپنے ساتھ شامل کر ہی لیا تھا۔

اس پل شاہی قلعے کی بیرونی فصیل پر پورے قد سے کھڑے وہ دونوں کردار آمنے سامنے تو تھے لیکن "مد مقابل" نہیں تھے۔ باہمی عشقیہ بولیاں بول بول کر ان کا لہجہ صدیوں سی تھکن اتار رہا تھا۔ فقط ایک لحظے کو اس کی گفتگو سے تھمی وہ اپسرا اس کے تھوڑا اور قریب ہوئی اور اس کے نینوں پر نگاہ رکھ کر مضبوط لہجے میں بولی۔

"انہی عشقیہ رموز سے آگاہی رکھ کر میں منزل کی چاہ میں لگ گئی ہوں۔ میں عشقن ہوں صاحب۔۔۔ درِ یاراں پر تو کیا۔۔۔ میں رہِ یاراں پر ہی جان وار دوں۔ یوں تو گھبرانے والی نہیں ہوں بالکل بھی۔ ہاں بس یہ کہ سوچتی ہوں عشق نیا ہو تو راہیں ذرا آہستگی سے پار ہونی چاہئیں۔ کہ مسافتوں کی دھول کا خمار منزلوں کو پا لینے کی خوشی سے کہیں پر لطف لگتا ہے مجھے۔"

اسے گھیر گھار کر من مرضی کی گفتگوؤں پر لاتی یہاں جیسے وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے رکی اور دید کو اس کے فسوں گر چہرے پر جا بجا وارتی ہوئی اس کی بلائیں لینے لگی۔

اسے یوں خود میں محو وگم پا کر وہ اپنی جگہ سے ہلا اور بڑے کرب سے لپٹا ہوا فصیل کی ایک طرف ٹک گیا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اندرون تک کھوج لانے والی اس اپسرا کی نگاہ اسے اپنے درد، اپنے خیالات کے محور سے ہٹا گئی تھی۔

"پتا نہیں یہ کیا ہے۔۔۔ لیکن آپ سے مل کر میں اپنی بات بھول جاتا ہوں۔"

وہ بولا تو اس کے لہجے کی بے بسی پر وہ شدت سے ہنس دی۔ ایسی ہنسی کہ جس میں کوئی رونا بھی شامل تھا شاید۔

"عشق کو اتنا جان کر بھی۔۔۔ جانے آپ اتنا ہنستی کیسے ہیں؟"

اور اس کی کھلکھلاتی ہنسی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا وہ سراپا سوال ہوا تو وہ یکا یک سنجیدہ ہو گئی۔

"جب یہ طے ہو کہ رونے سے حاصل کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ تو صرف ہنس دینا چاہیئے۔"

وہ بولی تو اس کے لہجے میں شکستگی ہی شکستگی تھی۔

"بجا فرمایا بالکل۔۔۔ لیکن کبھی کبھی آنسو بھی نہیں ہوتے اور ہنسی بھی نہیں آتی۔ وہ کہ جب انسان کسی خلا میں

ہوتا ہے۔"

اور جواب در جواب کہتے ہوئے اس کے لفظوں میں بس اضطراب پنہاں تھا۔اپنی حالت بیان کرتا وہ گویا کسی اور جہاں میں۔۔۔کسی اذیت نگر میں تھا۔اس کے درد گر سے لہجے پر وہ بالکل تھم سی گئی۔ہاں اسے سوچنا پڑا تھا کہ اب اسے مزید کیا کہے۔

اور انہی تفہیم کے لمحوں میں اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی۔۔۔پچھلی بار کی طرح اس دیوتا کا فون بجنے لگا۔

"عشق ادھورا دنیا ادھوری۔۔۔"

گانے کی مدھر آواز پر ان دونوں کو ہی چونک جانا پڑا۔اس نے جلدی جلدی موبائل نکال کر سکرین پر نگاہ کی اور بس ایک نظر اس اپسرا کو دیکھتا ہوا فون لیے اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔

"ہیلو۔۔۔تمہیں منع کیا تھا مجھے اس حوالے سے دوبارہ فون مت کرنا۔"

وہ تیز لہجے میں کسی سے مخاطب تھا اور وہ اس کی پشت کو بڑی محبت اور حسرت سے تاکتی ہوئی ماتھے پر دو حسین ترشکنیں لیے چپ چاپ کھڑی تھی۔

جانے کیوں اسی پل اس کا شدت سے دل چاہا کہ یہ گفتگو، یہ مقام، اور یہ دیوتاؤں سا شخص۔۔۔سب کچھ یہیں چھوڑ چھاڑ کر واپس پلٹ جائے۔

"مسافتوں کی دھول کا خمار منزلوں کو پالینے کی خوشی سے کہیں پر لطف لگتا ہے مجھے۔۔۔"

اس کے ذہن و دل میں اپنے ابھی ابھی کے ادا کیے ہوئے لفظ گونج رہے تھے اور وہ نبھانے کے لیے بہت بے تاب ہوگئی تھی۔

"کتنا مزہ آئے کہ یہ شخص مجھے یونہی سرِ راہ کہیں پھر سے ملے۔۔۔کیا ہی دلکش منظر ہو کہ وقت اسے لاکر پھر سے کہیں میرے سامنے رکھ دے۔"

بچھڑن کے اس عجب و عجیب خیال سے بندھ کر اس کے شگفتہ لب بے طرح مسکرانے لگے۔اللہ اللہ یہ عشق ایسا کہ کوئی بچھڑنے سے بھی کیف و سرور کشید کرنے لگے۔

"میرا عشق کامل ہوا تو تمہیں پھر سے کہیں سے کھینچ لائے گا۔میرا درد انتہا کو چھوا تو تم بندھے بندھے سے آؤ

گے۔تو بس اے دلپذیر شخص۔۔۔تمہیں صرف الوداع۔۔۔!!تو بس اے جاوداں سے فرد تمہیں صرف الوداع۔۔۔!!" اسے حصارِ نگاہِ عشق وجو میں رکھتی، طرح طرح کی سرگوشیاں کرتی وہ دھیرے دھیرے واپس پلٹ گئی تو اس کا طویل تر ریشمی دوپٹہ ان شکستہ فصیلوں پر دور دور تلک پھیل کر پھڑ پھڑاتا کئی عشقیہ رقوص کرنے لگا۔

ادھر اس کی واپسی سے بے خبر، ہاتھ جھلا جھلا کر وہ تا دیر کسی سے فون پر بات کرتا رہا اور بالآخر جب کئی لہجوں کی اونچ نیچ سے بات مکمل کر کے واپس پلٹا تو چوڑی فصیلوں کو تا حد نگاہ خالی پا کر ساکن و ساکت ہو گیا۔

"اف۔۔۔اب یہ کہاں چلی گئی ہے۔۔۔؟؟"

بے ساختگی میں ادھر ادھر دیکھتا وہ بڑھ کر اسی جگہ آیا جہاں وہ کھڑے تھے اور پھر نیچے میدان میں جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر دور جاتی اس اپسرا کو دیکھ کر سچ مچ پتھر ہونے لگا۔

کپڑوں، جوتوں اور مسلسل لہراتے ہوئے دوپٹے کی ذرا سی پرواہ نا کرتے ہوئے وہ یوں کھوئی کھوئی چل رہی تھی گویا سچ مچ کوئی "سایہ"۔۔۔کوئی پرچھائی ہو کسی کی۔

اس دیوتا کے گلال رنگ چہرے میں کئی رنگ ایک ساتھ آن کر شامل ہونے لگے۔

ملال رنگ۔۔۔انتظار رنگ۔۔۔اور سب سے افضل وہی۔۔۔عشق کا لجپال رنگ۔

☆......☆......☆

وہ پوری رات نمرہ نے ہسپتال کی راہداری میں ایک سے دوسرے سرے تک ٹہلتے ہوئے گزاری تھی۔ راشدہ بیگم بھی بہت دیر تک جاگتی رہیں لیکن ان کی اپنی طبیعت خراب ہو جانے کے خدشہ و اندیشہ کے پیش نظر اس نے انہیں بھرپور اصرار کرتے ہوئے ایک بینچ پر سلا دیا تھا۔ شاہجہان عادل اور شہوار پھوپھو وارڈ کی مرکزی نشست گاہ میں تھے اور وہ دونوں زیادہ تر وہیں رہتے تھے۔ یہاں سے وہاں جاتے ہوئے وہ ہر بار ثومیہ کے کمرے کی کھڑکی پر رکتی، شفاف شیشے سے اس پار اس کے لمبے وجود پر بچھی مریضوں والی نیلی چادر کو چند لمحات کے لیے بہت تاسف سے دیکھتی اور پھر اس کے سفید پٹیوں میں جکڑے ہوئے سر اور سرہانے کی دونوں طرف رکھے مختلف طبی آلات پر جلتی بجھتی مدھم نیلی، پیلی و لال، سبز روشنیوں سے دل مسوس کر رہ جاتی۔

"کاش ہماری ذات میں کوئی خلاء نہ ہوتا آپی۔۔۔کاش ہم بہنیں پوری ہوتیں۔۔۔تو تم کبھی یوں بغاوت

نہ کرتیں۔ اور اگر کوئی خلا رہنا ہی تھا۔۔۔ اور اگر ہمارا ادھورا پن ہی یقینی تھا تو۔۔۔ تو کاش ہم میں کوئی "خواہش" نہ ہوتی۔ کاش میں نے تمہیں اس حال میں کبھی نہ دیکھا ہوتا۔"

ثومیہ کو بے ہوشی کی دوا کے زیرِ اثر آنکھیں موندے تاکتی وہ دل ہی دل میں طرح طرح کے پچھتاوؤں میں مبتلا ہوتی اور پھر اپنی بے بسی کا ادراک رکھتے ہوئے نین کٹوروں میں لبالب پانی بھر کر پھر سے چکرانے لگتی۔ اپنی حساس تر بہن کو یوں ابتری میں دیکھنا اس کے حواس منجمد کیے دیتا تھا۔

کہ خواہشوں کے بن میں کبھی اتنی بے کراں تو وہ رہی ہی نہیں تھی کہ خواب سارے "یوں" آتش ہونے لگتے۔ اسی فکر و خلفشار میں رات کی ساری پہروں سرک گئیں اور صبح صادق کا اولین اجالا نرم تر دھوپ کی صورت میں باہر سر سبز و شاداب صحن میں اور ہسپتال کی راہداریوں میں بھی جا بجا جگمگانے لگا۔ آس پاس لوگوں کی آمد و رفت بڑھی تو اس نے راشدہ بیگم کو بھی آہستگی سے جگا دیا۔ وہ ایک نظر ثومیہ کو کشمکشِ موت و حیات میں محو دیکھتی ہوئی بہت سوگوار سی ہو کر اسی بینچ پر واپس جا بیٹھی تھیں۔ ساری رات ٹہل ٹہل کر تھک چکی نمرہ ہمت لیکن اب بھی نہیں ہاری تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ اسے ہوش میں لا دے مجھ کو۔۔۔ یا اللہ مجھے ثومیہ لوٹا دے۔"

قطار در قطار گالوں پر پھسلتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وہ ایک بار پھر سے شفاف شیشوں سے پار اس کے وجود پر نگاہیں جمائے ہوئے دعائیں مانگ رہی تھی۔

اور صبح کے اولین اجالوں میں اپنے پورے بدن کے اک ایک ریشے کو سراپا التجا کرتی اگلے ہی پل وہ چونک اٹھی تھی۔ ہاں بالکل عین اسی لمحے اس کی دعاؤں نے عرش عظیم چھو لیا کہ شیشوں سے پار لیٹی ثومیہ نے بالآخر کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی بند آنکھوں پر پڑے دبیز پپوٹوں کی حرکت سے زار و قطار روتی نمرہ چونک اٹھی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے فقط ایک نظر سر جھکائے بیٹھی اپنی ماما کی طرف دیکھ کر انہیں کچھ بھی کہے بنا وہ راہداری میں بھاگتی ہوئی نزدیکی نرسنگ کاؤنٹر تک آئی۔

"سسٹر۔۔۔ سسٹر۔۔۔ وہ ثومیہ کو ہوش آ گیا ہے۔ پلیز جلدی آئیں۔"

کاؤنٹر پر موجود نرسنگ سٹاف کو مطلع کرتی وہ تیزی سے واپس بھی بھاگ گئی تو اس کی حواس باختہ سی آمد سے

حیران و پریشان ہوئی دونوں نرسیں فٹافٹ اپنی جگہ چھوڑتی ہوئی ضروری دواؤں کا ٹرے لے کر اس کے پیچھے لپکیں۔

تب تک وہ راشدہ بیگم کو لیے ثومیہ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اندر ثومیہ آنکھیں کھول کر متوحش سی نظروں سے یہاں وہاں رکھے میڈیکل اپریٹس کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر اب بھی ویسا ہی "ناسمجھی" کا تاثر کندہ تھا۔

"اب کیسی ہے میری بیٹی؟ دیکھو تو یہ کیا حالت بنالی ہے؟"

اسے یوں اجنبی سے انداز میں خود کو تاکتے پا کر نمرہ یکایک رک گئی تو راشدہ بیگم آگے بڑھ کر بہت محبت سے بولیں۔ یہیں انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھنا چاہا تو اس نے کراہ کر سر کو پرے کھسکا لیا۔

"کک کون ہیں آپ؟"

یہ پوچھتے ہوئے اس کے لہجے میں جہاں بھر کی حیرانی اور آنکھوں میں فقط خوف ہلکورے لے رہا تھا۔ نمرہ کو فوراً احساس ہوا کہ اس کا اندیشہ درست ہے۔ اس کی یادداشت ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ وہ جلدی سے دو قدم آگے آئی اور راشدہ بیگم کو شانوں سے تھام کر نرمی سے ایک طرف ہٹایا۔

"میں نمرہ ہوں آپی۔ تمہاری چھوٹی بہن۔ اور تم ثومیہ ہو۔ اور یہ ہماری ماما ہیں۔ پلیز یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ہم بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔"

ملتجی لہجے میں کہتی ہوئی رات بھر کی تھکی وہ شکستہ تر لڑکی باقاعدہ رو پڑی تو بغور اسے دیکھتے ہوئے ماتھے پر بل ڈالے وہ گویا اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی وقت نرسیں اندر آئیں اور انہیں ثومیہ پر جھکے دیکھ کر بولیں۔

"ایک طرف ہو جائیں پلیز۔ ابھی مریضہ کو پریشان نہیں کریں۔ ڈاکٹر صاحب کو بلایا ہے وہ آپ کو چیک کر کے بتائیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پیشہ ورانہ انداز میں جلدی جلدی طبی آلات پر جلتے بجھتے انڈیکیٹرز اور "مریضہ" کا معائنہ کرنے لگیں تو نمرہ گویا بہت ہاری ہوئی سی بولی۔

"وہ کیا بتائیں گے ہمیں سسٹر؟ یہ تو ہمیں پہچان ہی نہیں رہی۔"

جواباً انہیں فقط یہی کہہ کر وہ پھر سے ثومیہ سے مخاطب ہوئی۔

"ثومیہ دیکھو ماما کتنی پریشان ہیں یار۔ پلیز تھوڑا ذہن پر زور دو۔ ہمیں پہچاننے کی کوشش تو کرو۔"

اب کی بار اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اصرار کیا تو اس کے لہجے کی شدت سے ڈر کر وہ سرعت سے پیچھے ہوئی۔ پھر فقط ایک لمحے کے لیے اس کی خالی خالی آنکھوں میں کسی خیال کا تاثر ابھرا اور بہت ٹھہر ٹھہر کر وہ کسی سرگوشی کی مانند بولی۔

"مم۔۔۔ میں۔۔۔ ثث۔۔۔ ثومیہ نن۔۔۔ نہیں ہوں۔ مم۔۔۔ میرا نام "بینا" ہے۔ مم۔۔۔ بینا ہوں۔"

اور اس کی بات پر نمرہ نے اسے یوں دیکھا گویا عالم حیرت میں ہو کہیں۔

"بینا۔۔۔؟ کون بینا؟"

بہت تڑپ کر اس کے لبوں سے کسی قدر اچھنبے سے نکلا تو اب کی بار وہ بھی بنا اٹکے ہوئے روانی سے بولی۔

"میں بینا ہوں۔ میں کوئی ثومیہ تو نہیں ہوں۔ کون ہو تم؟ میری کیا لگتی ہو؟ میں نہیں جانتی تمہیں۔"

اتنا کہہ کر اسے چھوڑتی وہ اس کے پیچھے کھڑی راشدہ بیگم کی طرف متوجہ ہوئی جو کہ نمرہ کے شانوں پر سے چہرہ کر کے اسے بہت متحیر سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اور آپ کون ہیں؟ میں آپ کو بھی نہیں جانتی ہوں۔ پلیز مجھے بتائیں آپ کون لوگ ہیں اور میں کہاں ہوں؟"

وہ یوں بلک بلک کر بولی کہ راشدہ بیگم سے اس کی آنکھوں میں در آئی اجنبیت برداشت کرنا دوبھر ہو گیا۔ سہارا لینے کے لیے انہوں نے بے ساختہ نمرہ کا ہاتھ تھام لیا تو ثومیہ کی "ابتری" کو بھول کر وہ ماں کی فکر میں لگ گئی۔

"آپ باہر جائیں ماما۔ میں بھی آتی ہوں بس۔"

تسلی دینے کے سے انداز میں ان کا شانہ تھپکتی وہ نرمی سے انہیں باہر کی طرف دھکیلنے لگی تو بڑی محبت سے ثومیہ کا بازو مسلتے ہوئے اسے شانت کرتی ہوئی ایک نرس بہت مصروف انداز میں ان دونوں سے مخاطب ہوئی۔

" آپ لوگ پلیز دونوں باہر چلے جائیں۔ یہ آپ کی موجودگی سے پریشان ہو رہی ہیں۔ اور یہ ان کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ پلیز۔۔۔"

اور اس کی بات ابھی شاید ادھوری ہی تھی کہ ایک جواں سال، طرح دار و خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ ڈاکٹر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ لڑکی کے لباس پر سفید گاؤن اور اس کی گلے میں موجود سٹیتھوسکوپ سے پتا چلتا تھا کہ وہ بھی ایک ڈاکٹر ہے۔

" آپ ایک طرف ہو جائیں پلیز۔ کیا صورتحال ہے یہاں زیمل نور؟ اب کیسی ہیں ثومیہ؟"

انتہائی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے اس نے پہلے ان دونوں ماں بیٹی کو ایک طرف ہونے کا کہا اور پھر ثومیہ کے ساتھ مصروفِ عمل اسی ہمدردانہ لہجے کی حامل نرس " زیمل نور " کو مخاطب کیا۔

" سر کنڈیشن ساری سٹیبل ہے۔ دھڑکن، سانس سب نارمل ہے۔ بی پی کنٹرولڈ ہے۔ لیکن میموری لاسٹ ہے۔ یہ اب بھی کسی کو پہچان نہیں رہیں۔"

تیزی سے اس کی حالت سے آگاہ کرتی نرس ایک طرف ہو گئی تو اس کے ساتھ آنے والی لڑکی ایک ہمدردی بھری نگاہ نمرہ اور راشدہ بیگم کی طرف ڈالتی بیڈ کے قریب گئی۔ ڈاکٹر نے بھی ایک طرف ہو کر اسے جگہ فراہم کی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا وہ کوئی خاص شخصیت ہے۔

" آپ کا نام کیا ہے سہیلی؟ پلیز مجھے بتاؤ۔"

اس کی نرم آواز میں جہاں بھر کی حلاوت شامل تھی۔ نمرہ نے دیکھا کہ ثومیہ کی آنکھوں کی وحشت یکا یک بجھنے لگی ہے۔

" میں بینا ہوں۔"

اس لڑکی کے ہونٹوں پر رقصاں حوصلہ افزاء سی مسکراہٹ کی طرف دیکھتی وہ قدرے اعتماد سے بولی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے بیڈ پر ہی ایک طرف بیٹھ گئی۔ یوں گویا اسے ازل سے جانتی ہو۔

" بہت پیارا نام ہے۔ مجھے بہت پسند آیا ہے۔ تو بینا آپ کا پورا نام کیا ہے بھلا؟"

ساکن پانیوں سے عمیق تر لہجے میں پوچھتے ہوئے اس نے اپنی حسین آنکھوں کو یوں نرمی سے میچ کر پوچھا کہ

گویا اسے اس کی بات پر کامل یقین ہو۔ اس کے انداز پر نمرہ تو سمجھ گئی کہ یہ ان کے پیشے کا تقاضا ہے لیکن راشدہ بیگم حیران سی سب کے چہروں پر درج تاثرات پڑھنے لگیں۔

"میں بینا ہوں۔۔۔ بینا بنت آدم۔۔۔ ہاں میں بینا بنت آدم ہوں۔"

جواباً آہستگی سے اپنا "پورا نام" بتاتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلاتی وہ ان سب کی طرف باری باری دیکھ کر اپنے نام کی دہرائی کرنے لگی تو آنسوؤں کو زبردستی نین کٹوروں سے پار روکتی نمرہ کا ضبط چھلکنے لگا۔

"تو آپ "بینا بنت آدم" ہیں۔ ہوں۔۔۔؟"

اس نئی لڑکی نے نرمی سے لیکن سوالاً ہی کہا تو سر کو اور زور سے ہلاتی وہ اسی اعتماد سے بولی۔

"جی۔۔۔ میں بینا بنت آدم ہوں۔"

اس کے جواب پر اس لڑکی کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تو آپ رہتی کہاں ہیں بینا؟ آپ کا گھر کدھر ہے؟"

وہ یوں عام بول چال کے سے انداز میں پوچھ رہی تھی جیسے دو لوگ دوستی سے قبل متجسس لہجے میں ایک دوسرے کا ابتدائی تعارف چاہتے ہیں۔ اس سوال پر اس کی آنکھوں میں وہی پہلے کی سی الجھنیں پھر سے امڈ آئیں اور پیشانی پر تفکرات کا جال لیے وہ کمرے کی چھت میں لگے پنکھے کو گھورنے لگی۔

"بتاؤ نا بینا۔۔۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟"

اس لڑکی کے قدرے مصر ہونے پر اس نے وہی الجھن بھری آنکھیں اس کی امید افزا مسکراہٹ پر جما دیں۔

"میں بینا بنت آدم ہوں۔۔۔ اور میں کہیں نہیں رہتی۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ اگر کوئی گھر ہے بھی۔۔۔ تو مجھے اس کا نہیں پتا۔ پلیز مجھے پریشان نہ کریں۔ آپ کون ہیں سب؟"

اپنے گھر کی بابت بتاتے بتاتے اس پر پھر سے وحشت طاری ہونے لگی تو وہ لڑکی غیر محسوس سے انداز میں اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

"سر۔۔۔ مجھے یہ پیشنٹ اپنی کنسلٹینسی میں چاہیئے۔ ہمیں بہت احتیاط سے ہینڈل کرنا ہوگا۔ ورنہ۔۔۔ اور ورنہ آپ بہتر سمجھتے ہیں۔"

اس ڈاکٹر کو مخاطب کرتی وہ گھمبیر سنجیدگی سے بولی تو جواباً اس ڈاکٹر کے کچھ بھی کہنے سے پیشتر آنسوؤں پر اختیار کھو کر نمرہ تیزی سے آگے آئی۔اس کی ویران و بنجران کیفیت نے اس کا ضبط الٹ دیا تھا۔

"تم ثومیہ شاہجہان ہو آپی۔ بینا بنت آدم نہیں ہو۔خدا کے لیے خود کو پہچاننے کی کوشش کرو۔تمہارا گھر ہے۔۔۔میں بہن ہوں تمہاری۔یہ ماما ہیں۔اور بابا کہیں باہر بیٹھے ہیں۔پلیز پہچاننے کی کوشش کرو۔"

ہاتھ جھلا جھلا کر کبھی ہوا میں، کبھی اپنی طرف، کبھی راشدہ بیگم کی طرف اور کبھی باہر کی طرف اشارہ کرتی وہ اسے اس کے "اپنوں" کے ہونے کا یقین دلانے لگی تو ثومیہ ڈر کر بالکل ایک جانب سمٹ گئی۔

"میں بینا بنت آدم ہوں اور میں بینا بنت آدم ہی ہوں۔میں ثومیہ شاہجہاں ہوں ہی نہیں۔کون ہو تم؟ پلیز جاؤ یہاں سے۔میں تمہیں نہیں جانتی۔چلی جاؤ پلیز۔میں بینا بنت آدم ہوں۔"

ہذیانی انداز میں چیختی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تو دونوں نرسیں گھبرا کر اسے واپس لٹانے لگیں۔

"کچھ نہیں ہوا بینا۔۔۔ہم انہیں باہر بھیج رہے ہیں۔آپ خاموش ہو جائیں پلیز۔آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

ڈاکٹر بھی "بینا" ہی پکارتے ہوئے اسے پرسکون کرنے میں مشغول ہو گیا تو وہ نئی لڑکی نمرہ کا ہاتھ پکڑ کر راشدہ بیگم کی طرف چلی آئی۔

"آپ لوگ پلیز تھوڑی دیر باہر جائیں۔اس کی کنڈیشن ایسی نہیں کہ اسے کسی بات پر فورس کیا جائے یا اس سے کوئی ضد لگائی جائے۔ہمیں بہرصورت صرف اسی کے منہ سے نکلے ہوئے لفظوں پر یقین کرنا ہوگا۔آپ دونوں میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟"

نرم و گداز لہجے میں تفصیلاً کہتے ہوئے اس نے باری باری ان دونوں کی کلائی تھام کر انہیں تسلی بھی دی آنسوؤں سے پر آنکھوں سے نمرہ نے بمشکل اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم باہر رکتی ہیں۔آپ پلیز دیکھیں اس کو۔"

پوری رضامندی سے فقط یہی کہہ کر اس نے راشدہ بیگم کا ہاتھ تھاما اور باہر چل دی تو اس کے فرمانبردار انداز پر وہ لڑکی بہت محبت سے اس کی پشت کو تب تک تاکتی رہی جب تک وہ کمرے سے باہر نہیں نکل گئی۔نکلنے سے قبل

اس نے ایک بار مڑ کر بہت بے بس سی نگاہوں سے ثومیہ کی طرف دیکھا تھا۔

باہر آ کر اس نے بے ساختہ شیشے والی کھڑکی سے اندر دیکھنے کی کوشش کی تو اسے مایوس لوٹنا پڑا کیونکہ وہ نرس زیمل نور عین اسی لمحے کھڑکی کا دبیز پردہ برابر کر رہی تھی۔ ماما کو ایک بینچ پر بٹھاتے ہوئے وہ بھاگی بھاگی گئی اور آرام سے نشست گاہ میں باہم گپ شپ کرتے شاہجہان عادل اور شہوار پھوپھو کو ثومیہ کے ہوش میں آنے کی بابت بتا کر ساتھ لیے ہوئے واپس آئی۔

"کیا بنا اب؟ کیسی طبیعت ہے اس کی؟ پہچان رہی تھی کیا سب کو؟ جلدی بتا میری دھی۔"

ہانپتی کانپتی اس کے ساتھ ساتھ چلتی پھوپھو مُسلسل سوال کرتی آئی تھیں لیکن وہ بھی اپنے باپ شاہجہان عادل کی گھپ خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے لب بستہ چلتی رہی۔

"اب کیسی حالت ہے اس کی راشدہ؟ تم ملی ہو کیا اس سے؟"

شاہجہاں عادل نے کمرے کے باہر پہنچ کر اس کی بجائے براہ راست اپنی شریک حیات سے سوال کیا تو وہ گہری سنجیدگی سے ان کی سوالیہ آنکھوں میں جھانکنے لگی تھیں۔ وہ جب سے ہسپتال آئے تھے انہوں نے آپس میں بہت کم، کم گفتگو کی تھی۔ دونوں طرف سے زیادہ تر نظروں، خاموشی اور چہرے کے تاثرات سے ہی کام چلایا گیا تھا۔

"وہ اب بھی نہیں پہچانتی ہمیں۔ خود کا نام کوئی بینا...... بینا بنت آدم بتاتی ہے۔ کہتی ہے میں ثومیہ شاہجہاں نہیں ہوں۔"

ہولے سے اثبات میں سر ہلاتی وہ گلوگیر لہجے میں گویا ہوئیں تو ان کے چہرے پر بے پناہ فکریں خیمہ زن ہونے لگیں۔

"اور ڈاکٹرز اب بھی اندر ہیں کیا؟"

کمرے کے بند دروازے اور کھڑکی کے پردوں کی جانب باری باری نگاہ کرتے ہوئے انہوں نے مزید پوچھا تو وہ دوبارہ اسی انداز میں بولیں۔

"جی اندر ہیں۔ آج کوئی نئی ڈاکٹر بھی آئی ہے ساتھ۔ اس سے کافی بات کی ثومیہ نے۔ وہ اس کے ساتھ

آسانی محسوس کر رہی تھی اور۔۔۔اور ہمیں کہا کہ آپ لوگ کون ہیں؟ کمرے سے باہر چلے جاؤ۔"

انتہائی تاسف سے بات مکمل کرتے وہ آخر پر رو پڑیں تو وہ سر پر کھڑی اپنی بہن شہوار بیگم کی طرف دیکھنے لگے۔

" آئے اللہ خیر کرے نہ پریشان ہوں بھابھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہماری ثومیہ کی جان بچ گئی ہے۔ابھی یہی بڑا ہے ہمیں۔ ذہنی ٹھیک بھی ہو جائے گی دیکھنا۔ خیر سے جلدی ہم سب کو پہچاننے لگے گی۔بس رونا بند کر دعا کریں آپ۔"

اور اپنے مخصوص مردمار انداز میں جو انہوں نے بھی بولنا شروع کیا تو ان سے لاکھ اختلافات کے باوجود اس پل ان کے دل کو ان کی پرامید باتوں اور خصوصاً پریقین لب ولہجہ سے بڑا اطمینان ملا۔

ہاں ہوتے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی۔۔۔کہ جن میں ہمیں ناخالص لوگوں کی باتوں سے بھی تسلی ملنے لگتی ہے۔ ہم اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ ان کے لہجوں کے مصنوعی پن سے بھی مثبت حرارتیں کشید کرنے لگتے ہیں۔

"شکریہ شہوار۔ ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

تھوڑے فاصلے سے خود کو مسلسل گھورتی اپنی بیٹی کہ گھوریوں سے نگاہ چراتے ہوئے انہوں نے ان کو نرمی سے جواب دیا اور ایک طرف ہو کر گویا انہیں بیٹھنے کی جگہ فراہم کر دی۔ وہ فخریہ نظروں سے کچھ جتانے کے سے انداز میں اپنے بھائی صاحب کی طرف دیکھتی ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھ رہیں تو نمرہ پاؤں پٹختی ہوئی واپس اس کمرے کے دروازے پر جا رکی۔

"بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر بھی ماما کو اس کی اس حالت کے حقیقی ذمہ داران کے ساتھ اخلاق بگھارنے سے فرصت نہیں۔ پھوپھو سے تو اب میں اپنے انداز میں نمٹوں گی۔"

ایک دیوار سے ٹیک لگائے طرح طرح کے عزم کرتی وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور سینیئر ڈاکٹر کے ساتھ وہ نئی لڑکی باہر چلے آئے۔ سب کچھ بھول بھال کر وہ تیزی سے ان کے پاس آئی۔

" کیا بنا سر؟ اب کیسی ہے وہ؟ وہ تو اب بھی ہمیں نہیں پہچان رہی۔ بلکہ اب تو وہ جانے کیا کیا کہہ رہی ہے۔ سراپا سوال ہوئی وہ باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی تو وہ نئی ڈاکٹر نے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ

میں لے لیا۔

"وہ ٹھیک ہے چندا۔ ڈونٹ وری۔ آپ کے بابا کہاں ہیں؟ ہمیں ان سے بات کرنی ہے۔"

کوئی خدائی ودیعت تھی کہ اس لڑکی کے لہجے سے ہر بے سکون بندہ سکون پا سکتا تھا۔ نمرہ بھی چپ چاپ اثبات میں جھپکتے ہوئے ان تک آتے شاہجہان عادل کی طرف دیکھنے لگی۔ اور ان کا قریب آنا ہی تھا کہ وہ ڈاکٹر ان کی طرف سے کسی سوال کا انتظار کیے بنا بولنا شروع ہو گیا۔

"آئیں جناب۔۔۔ اپنی بیٹی کی موجودہ حالت سے تو یقیناً آگاہی مل چکی ہو گی آپ کو؟"

اور یہاں فقط یک لمحاتی توقف سے ان کی آنکھوں میں تیرتے اثبات کو پڑھتا وہ مزید بولا۔

"تو صورتحال یوں ہے کہ فی الوقت ان سے تھوڑی سی اور گفتگو کے بعد ہم نے انہیں دوبارہ سلا دیا ہے۔ کیونکہ ان کا زیادہ سے زیادہ پرسکون ہونا ازحد ضروری ہے۔ بہر حال یہ ہماری بہت ہی ہونہار ساتھی اور ماشاءاللہ بڑی قابل ڈاکٹر "صبا اکبر گل" ہیں۔ یہ مینٹل ہاسپٹل لاہور میں سرکاری ملازمت پر ہیں اور کبھی کبھار یہاں کسی خصوصی دورے کے لیے آتی ہیں۔ اگلی بات آپ کو یہی بتائیں گی۔ اپنی طرف سے بس یہی کہہ دوں کہ میں ان سے مکمل طور پر متفق ہوں۔"

با اعتماد انداز میں لفظ لفظ بولتے ہوئے اس نے بات مکمل کی تو جواباً فقط "جی بہتر۔۔۔" کہتے ہوئے شاہجہاں عادل اس جواں سال لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئے جو بالکل ان کی بیٹیوں جیسی ہی تھی۔ نمرہ بھی دم سادھے سب کچھ بغور سنتی رہی۔

"اتنا پیارا تعارف کروانے کے لیے بہت شکریہ سر۔ جزاک اللہ خیر۔"

اس ڈاکٹر کو احتراماً کہتی وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سر بات یوں ہے کہ آپ کی بیٹی کسی کو اور خود کو بھی پہچان نہیں رہیں۔ بلکہ اب تو ان کے ذہن نے خود کی اک نئی شناخت گھڑ لی ہے۔ اب وہ کہتی ہیں کہ وہ کوئی "بینا بنت آدم" ہیں جن کا کوئی گھر نہیں ہے۔"

اس نے بولنا شروع کیا اور باری باری ان کے چہرے جانچنے لگی۔

"ان کی یہ حالت ایسی ہے کہ ہم ان سے کوئی بحث نہیں کر سکتے۔ وہ بہت سی ذہنی الجھنوں کا شکار ہوں گی۔

کیونکہ اپنا بھی کوئی اتا پتا ہی نہ ہونا۔۔۔ بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔اب ہماری کسی بھی جرح سے ان کا ذہن ذرا بھر بھی مزید الجھا تو۔۔۔تو وہ با قاعدہ پاگل ہوسکتی ہیں۔"

آخر پر ایک پل کے توقف سے کہہ کر اس نے دوبارہ ان دونوں کے تاثرات پڑھے تو بے چینی سے اپنی جگہ پر ہی قدم اٹھا اٹھا کر رکھتی نمرہ فکرمندی سے بول اٹھی۔

"وہ میں سمجھ رہی ہوں سب۔لیکن وہ ٹھیک تو ہو جائے گی ناں؟ اس کی حالت پر مجھے رونا آتا ہے۔میں اسے یوں اجنبی ہوا نہیں دیکھ سکتی۔"

اس کے لہجے میں کائنات بھر کا ملال بسا تھا۔

"جی اسی طرف آرہی ہوں کہ ان شاء اللہ وہ لازمی ٹھیک ہو جائیں گی۔بس یوں سمجھیں انہیں ایک لمبا بخار ہوا ہے، جسے ہم سب نے اپنے مثبت رویے اور زیادہ سے زیادہ توجہ سے مل کر اتارنا ہے۔اور ہماری کوششیں جلد از جلد اسی صورت میں کامیاب ہوں گی جب ہم انہیں یقین دلا دیں کہ ہم ان کی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔یعنی ان کی کسی بات کی کوئی بھی تردید۔۔۔ ہم نہیں کر سکتے۔وگرنہ دوسری صورت میں بجائے فائدے کے۔۔۔ نقصان ہوسکتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت ٹھہر ٹھہر کر جواباً کہتی وہ اسے ممکنہ خدشات سے آگاہ کرتی گئی تو نمرہ کے ہونٹ انتہائی فکروں سے لپٹ کر "اوہ۔۔۔" کے سے انداز میں سکڑے اور وہ بے ساختہ اپنے باپ شاہجہان عادل کی طرف دیکھنے لگی۔اسی پل راشدہ بیگم اور شہوار پھوپھی وہیں آکر متجسس نظروں ان سب کے سنجیدہ چہروں پر رقم تاثرات پڑھنے لگیں۔یہاں طاری کیفیات سمجھتے ہوئے انہوں نے کوئی سوال کرنے سے گریز ہی کیا تھا۔ڈاکٹر صبا اکبر گل نے اسے یوں کسی خیال و سوچ میں گم رہ کر مُسلسل اپنے باپ کو تاکتے پایا تو انہی کی طرف رخ کر کے گفتگو سمیٹتے ہوئے بولی۔

" آپ پریشان نہیں ہوں بالکل۔ان شاء اللہ وہ لازمی ٹھیک ہو جائے۔میں اسے کل سے اپنی نگہداشت میں لے رہی ہوں۔یعنی ہمیں اسے یہاں سے مینٹل ہاسپٹل میں شفٹ کرنا ہوگا۔"

اور اس کی بات سنتے ہی راشدہ بیگم اور شہوار بیگم نے اظہارِ تحیر کے طور پر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ان باپ بیٹی نے

بھی بیک وقت بڑے اچھنبے سے اسے دیکھا۔" مینٹل ہاسپٹل " کا نام ہی ان سب کے لیے بڑا ہولناک تھا۔ان کے چہروں پر یکا یک کچھ ایسے تاثرات ابھرے کہ انتہائی مہربان لہجوں کی مالکہ ڈاکٹر صبا اکبر گل چند ساعتوں کے لیے رک کر ان سب کے چہروں پر در آیا تحیر پڑھنے لگی۔

" مینٹل ہاسپٹل لے جانا ضروری ہے کیا؟ یہ علاج یہاں نہیں جاری رہ سکتا کیا؟"

اسی توقف میں شاہجہاں عادل نے بڑی بے چینی سے سوال کیا تو فقط ایک نظر ساتھ کھڑے ہوئے سینئیر ڈاکٹر کو دیکھتی وہ اپنے مخصوص ٹھنڈے میٹھے لہجے میں سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

" جی یہ بہت ضروری ہے انکل۔ضروری نہیں ہوتا تو ہم یہ شفٹنگ کبھی تجویز نہیں کرتے۔لیکن وہاں علاج زیادہ بہتری سے ہوگا۔ادھر اس حوالے سے زیادہ سہولیات ہیں۔وہاں ایسے مریضوں کے لیے خصوصی سیکشنز ہیں جو پاگل تو نہیں لیکن کسی نہ کسی ذہنی سقم کا شکار ہیں۔میری بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس سے کہیں بہتری سے علاج ممکن ہے وہاں۔ہمیں ان کو لازمی لے جانا ہوگا۔"

نرمی وحلاوت سے بولتے ہوئے اس کا لہجہ آخر تک آتے آتے بتدریج فیصلہ کن سا ہو گیا تو وہ سب ایک دوسرے کا منہ تاک کر رہ گئے۔یوں گویا کسی کے پاس کہنے کو کچھ بچا ہی نہ ہو۔

" ٹھیک ہے ڈاکٹر۔۔۔جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

بالآخر خود کو سنبھال کر کانپتے ہوئے لبوں سے نمرہ نے رضامندی کا اظہار کیا اور سب کے گرد سے گھوم کر اپنی ماما راشدہ بیگم کے ساتھ جا رکی۔تسلی کے سے انداز میں ان کا شانہ مسلتی وہ ان کی ڈھے چکی ہمت بندھانے لگی تھی۔

" سو نائس آف یو بریو گرل۔آپ اپنے بابا کے ساتھ ایک گھنٹے تک سر سے ان کے روم میں آ کر مل لیجیے۔ تب تک ہم کچھ اور ضروری ڈسکشنز کے بعد اس منتقلی کا حتمی وقت طے کر لیں گے۔اوکے۔۔۔؟"

ڈاکٹر صبا اکبر گل نے اس کے یوں ہمت کرنے پر خراج کے طور پر گردن کو تھوڑا سا تعظیمی خم دیتے ہوئے کہا اور جواباً فوری طور پر اس کے اثبات میں ہلتے ہوئے سر کو دیکھتی اس سینئیر ڈاکٹر کی ہمراہی میں واپس پلٹ گئی۔

ان کے جاتے ہی شہوار بیگم اور شاہجہاں عادل چہرے پر بڑی پریشان کن سوچوں کا عکس لیے ایک قریبی

سٹیل بینچ پر بیٹھ گئے جبکہ نمرہ اپنی ماما کو ساتھ لیے آہستگی سے چلتی کمرے کی اسی کھڑکی پر جارکی۔ کھڑکی کے دبیز پردے اب ہٹائے جاچکے تھے اور شفاف شیشوں سے اس پار مختلف طبی آلات کے مابین پڑا ثومیہ کا ساکت وجود انہیں خود سے صدیوں کی مسافت پر لگا۔ جسے وہ چاہ کر بھی چھو نہیں سکتی تھیں۔

"میں تقدیروں جلی جتنی تمہارے لوٹ آنے کی دعائیں کرتی ہوں تم بختوں ہاری اسی قدر مجھ سے دور ہوتی جاتی ہو۔ تم بالکل سچ کہتی تھیں آپی۔۔۔ کبھی کبھی ہمارے بس میں نہیں ہوتا کہ ہم پورا کرب جھیلیں اور مرجائیں" گالوں پر پھسلتے ہوئے بے شمار آنسوؤں کے ساتھ وہ جانے کن کن لمحوں کا ماتم منارہی تھی۔ مُسلسل ڈبڈباتی آنکھوں سے شیشوں کے پار کا منظر دھندلانے لگا تھا۔۔۔ اور یہ آئینے تھے کہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل میں بھی چبھ رہے تھے کہیں۔

☆......☆......☆

ریگزارِ زیست میں پل ریت کی مانند اڑتے ہیں۔۔۔ آبشارِ حیات میں لمحے پانی کی طرح اچھلتے ہیں۔ لیکن ہم اتنے بے کس ہوتے ہیں، تھوڑا رک کر کبھی ہواؤں سے لڑ بھی نہیں سکتے کہ کہیں ریگزاروں میں ریت کے جیسی اڑتی زندگی کو یوں تیزی سے سرکائیں نہیں۔ ہاں یہ وقت کہانیوں میں انہی تیز و تند ہواؤں سا چلتا ہے جو سب کچھ اپنے ساتھ بہائے لیے چلی جائیں۔

اور یہی کچھ اس کہانی میں بھی ہوا کہ وقت کے پاٹ میں اس تیزی سے گھومی کہ اس میں موجود ہر کردار بے پناہ حیرتوں کی زد میں آتے ہوئے پس کر رہ گیا۔

ڈاکٹرز کی پیش کردہ تمام تر توجیہات و دلائل سے قائل ہوتے ہوئے ان سب نے اپنے دلوں کو مضبوط کیا اور ثومیہ کو مینٹل ہاسپٹل لاہور کے "سپیشل مینٹل ڈس آرڈرز" سیکشن میں شفٹ کردیا گیا۔ یہاں بالکل نئے اصول، نئے لوگ اور حتیٰ کہ اک نیا جہاں ان کا منتظر تھا۔ یہ اس سیکشن کا خواتین کے لیے مخصوص حصہ تھا اور اس میں ڈاکٹرز، نرسز، میڈیکل سٹور سے وابستہ دیگر کلینکل سٹاف اور یہاں تک کہ صفائی ستھرائی کے اوپری کام کرنے والا عملہ بھی خواتین پر مشتمل تھا۔ ہسپتال کے اس حصے میں فقط ایسی ہی مریضائیں داخل تھیں جو ثومیہ کی طرح کسی نہ کسی حادثے کے سبب اپنی یادداشت کے عارضی طور پر کھو جانے کا شکار تھیں۔ ثومیہ کو جو کمرہ دیا گیا وہ

بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا اور اس کے حصول کے لیے شاہجہان عادل نے ہسپتال انتظامیہ کو اضافی رقم کی ادائیگی کی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر ہلکے رنگوں والا پینٹ کیا گیا تھا اور ان پر جابجا سرسبز و شاداب مناظر کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ کمرے کی سجاوٹ میں گہرے رنگوں کی آمیزش سے احتیاطاً اجتناب برتا گیا تھا تاکہ یہاں رہنے والے مریضوں کا ذہن بوجھل پن سے محفوظ رہے۔ مشرقی دیوار میں ایک کشادہ کھڑکی تھی جو کہ ایسے وسیع تر صحن میں کھلتی تھی جہاں اگا سبزہ اور اونچے لمبے درخت آنکھوں کو بھلے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں سے ہسپتال کے بیرونی و مرکزی دروازے کی جانب رہنمائی کرتی تارکول کی بنی چوڑی و طویل شاہراہ بھی دور تلک دکھائی دیتی تھی۔ کھڑکی پر لوہے کی انتہائی مضبوط گرل تھی جس کی وجہ سے مریض باہر نکل کر جھانک نہیں سکتا تھا۔ یہ انتظام یقیناً یہاں کے مریضوں کے اکثر بڑھتے ہوئے ذہنی تناؤ کے سبب کیا گیا تھا۔ نمرہ کو یہ جگہ اس حوالے سے بہت پسند آئی تھی کہ یہاں کے بام و در کی تمام تر اداسیوں میں بھی عجب سا کوئی سکون بستا تھا۔ یہاں اتنی خاموشی تھی کہ کسی کا بھی اپنے اندر جھانکنے کا اپنے آپ دل کرے۔ تیز ہوا چلتی تو کمروں والی ہاسٹل قسم کی عمارت کے دونوں جانب واقع صحنوں میں موجود قد آور ٹاہلیوں کی شاخیں لہک لہک کر جھومنے لگتیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے پتے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ماحول میں مدھر سرسراہٹیں اور سر بکھیرنے لگتے۔

نمرہ کو یہاں کا سارا عملہ بہت ہمدرد اور حساس قسم کا لگا۔ اس سیکشن کی انچارج ثومیہ کی یہاں منتقلی تجویز کرنے والی وہی ڈاکٹر "صبا اکبر گل" تھی اور اس کے ماتحت دو مزید ڈاکٹرز تھیں جن کے نام "ماہ نور سلیم" اور "شبانہ اسلم" تھے۔ یہ دونوں ڈاکٹرز بھی جواں سال تھیں۔ ڈاکٹر شبانہ اسلم شادی شدہ تھی اور اس کا ایک چھے سالہ معصوم صورت بیٹا "ہادی" بھی اس کے ساتھ اکثر یہاں ہسپتال میں آیا کرتا تھا۔ یہاں کی مریض لڑکیاں اور خواتین اس بچے ہادی کے ساتھ کھیلتی تھیں اور اس کی معصومانہ اداؤں سے ان کے چہروں پر کئی خالص رنگ بکھرے رہتے۔ دونوں ماتحت ڈاکٹرز کی باہم حد سے زیادہ دوستی تھی اور ہسپتال کی مختلف راہداریوں میں مریضوں کو چیک کرنے کے لیے جاتے آتے وقت وہ دونوں کئی جگہوں پر رک کر ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی گفتگو لازمی کیا کرتی تھیں۔ اس دوران ان کے چہروں پر پھیلی مدھم مدھم مسکراہٹیں ان کے شفاف تر اندرون کو ظاہر کرتی تھیں۔ ثومیہ کی طرح دیگر مریضوں میں سے بھی جس کسی کی پٹی وغیرہ بدلنی ہوتی وہ اس کے قریب

ہونے کے لیے پٹی بھی نرسز سے بدلوانے کی بجائے خود بدلتی تھیں۔ ان دو کے علاوہ ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر "زارا رضوان" جو کہ سائیکالوجسٹ تھیں ہفتے میں دو دن یہاں کا خصوصی دورہ کیا کرتی تھیں۔ان کی آمد کا مقصد یہاں موجود مریضاؤں کی حالت میں آنے والی بہتری کو دنوں کے حساب سے جانچنا اور اس کی حقیقی رپورٹ مرتب کر کے ہسپتال کے "ایڈمنسٹریٹو بلاک" کو جمع کروانا تھا۔

پہلا پورا ہفتہ انہیں ثومیہ کو اس بات کا یقین دلانے میں گذر گیا کہ وہ سب اس کی بات پر کامل بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ "بینا بنت آدم" ہے۔اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی ذات کا اعتماد واپس آنے لگا اور آنکھوں میں سراسیمگی کی جگہ کوئی "سوچ" پنپنے لگی۔اس کے سر کا زخم بھی دھیرے دھیرے مندمل ہو رہا تھا لیکن اسے پوری طرح بھرنے میں ابھی کافی وقت درکار تھا۔

یوں بھی ملے ہوئے زخم اتنی آسانی سے بھلا کہاں بھرا کرتے ہیں؟

ڈاکٹر صبا اکبر گل کے علاوہ وہ کسی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی۔ڈاکٹر ماہ نور سلیم یا شبانہ اسلم وزٹ کے لیے جاتیں تو وہ بس پوچھی ہوئی بات کا ہوں ہاں میں تھوڑا بہت جواب دے دیتی تھی اور اس کے علاوہ کوئی ایک لفظ تو کیا حرف بھی نہیں بولتی تھی۔ایک روز اس کی اسی خاموشی کو توڑنے کی خاطر ڈاکٹر شبانہ اسلم نے اس کے سر کی پٹی بدل کر چیزیں سمیٹتے ہوئے بڑی محبت سے اور بہ اصرار پوچھا تھا۔

" آپ خود سے کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟ کیا آپ کا دل نہیں کرتا کہ ہم سے باتیں کریں؟ ہوں۔۔۔؟"

اور اس کی محبت کے جواب میں بھی وہ بہت حراساں نظروں سے اسے دیکھتی بدک کر پیچھے ہوئی تھی۔

"نن۔۔۔نہیں۔۔۔مم۔۔۔مجھے کسی سے۔۔۔کک۔۔۔کچھ نہیں کہنا۔"

اس نے اٹکتے ہوئے بمشکل بات مکمل کی تھی۔

اس کے بعد سے ڈاکٹر شبانہ اسلم جب بھی کہیں اس کا ذکر کرتیں اس فقرے سے ابتدا کرتی تھیں۔

"ثومیہ شاہجہاں۔۔۔سہمی ہوئی سی اک حراساں لڑکی۔۔۔جسے کسی سے کچھ نہیں کہنا۔"

بظاہر عام سے اس جملے میں دنیا جہاں کا درد بسا تھا۔بھرپور معنویت اور عمیقیت کا حامل۔۔۔خاص تر جملہ۔

اس سے ملاقات کے لیے نمرہ اور راشدہ بیگم ہر روز صبح نو بجے کے قریب آتی تھیں اور پھر ان کی واپسی شام

چار بجے کے قریب ہی ہوا کرتی۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ بستر پر اس کا منہ ہاتھ دھلوا کر بڑی محبت سے اسے پھل یا پرہیزی کھانا کھلایا کرتیں تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہوئی حیرت در حیرت ان "اجنبی خواتین" کو اپنے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ ہاں یہ تھا کہ انہیں دیکھ کر اب وہ پہلے دو دن کے سے شدید ردعمل کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی۔ شاید اپنے دل میں اس نے ان دو اجنبی کرداروں پر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کیونکہ مردوں کو بہت مشکل سے اور انتہائی سخت حالات میں یہاں آنے کی مشروط اجازت ملتی تھی لہٰذا شاہجہان عادل کو ایک ہفتے بعد صرف ایک بار خصوصی اجازت نامے کے تحت یہاں ثومیہ کے کمرے تک آنے دیا گیا۔ اس میں بھی وہ فقط چند منٹ کے لیے رکے اور کھڑے کھڑے ہی اس خالی الذہن سی لڑکی "بینا بنت آدم" کو دیکھ کر واپس پلٹ گئے جوان کی بیٹی "ثومیہ شاہجہاں" سے کسی طور نہیں ملتی تھی۔ ان کے دل و دماغ میں اس حادثے اور اس کے بعد پیدا کردہ حالات و واقعات کے حوالے سے کیا جنگ جاری ہے اس سے وہ دونوں ماں بیٹی یکسر بے خبر تھیں۔ شہوار پھوپھو کے واپس چلے جانے کے بعد انہوں نے کبھی ان سے بات ہی نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی بس کبھی ضرورت کے تحت ہی ان سے مخاطب ہوا کرتے ورنہ زیادہ تر اپنے کمرے میں اکیلے بند رہتے تھے۔

یہ ثومیہ کو یہاں لائے ہوئے نواں روز ہوگا کہ صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر صبا اکبر گل نے نمرہ کو اپنے روم میں طلب کیا۔ راشدہ بیگم کو وہیں ثومیہ کے پاس چھوڑتی وہ حیران حیران سی اس کے کمرے میں چلی آئی کہ ایسی کیا خاص بات ہو سکتی ہے جس کے لیے اس نے اسے خصوصی بلا بھیجا ہے۔

"میرے خیال سے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ثومیہ کے ذہن کا تھوڑا امتحان بھی لیں۔"

مستطیل نما میز پر جونہی وہ اس کے سامنے بیٹھی صبا اکبر گل نے سامنے کھلی فائل سے نگاہ اٹھائی اور ہاتھ میں تھاما ہوا قلم فائل پر ہی چھوڑتے ہوئے کسی قدر عزم سے بولی۔ اس کی بات سن کر نمرہ نے کچھ کہے بنا سوالیہ نظروں سے بغور اسے دیکھا۔ وہ اس نرم خو سی ڈاکٹر کا اک ایک انداز سمجھ چکی تھی۔

"میں چاہتی ہوں آپ سب فیملی ممبران کے علاوہ کسی ایسے فرد کو اس کے سامنے لایا جائے جسے وہ بخوبی جانتی ہو۔ اور اگر وہ اسے پہچان لے یا پہچاننے کی کوشش بھی کرے تو وہ فرد اپنی شناخت بدل کر اس سے کوئی اجنبی بن کر ملے۔ یعنی ہمیں کسی نہ کسی طرح اس کے لاشعور کو چونکا کر اس کے شعور سے کہیں جوڑنا ہوگا۔ یہ طریقہ عموماً

تھوڑا بہت کام لازمی کر جاتا ہے۔تم بتاؤ نمرہ ایسا فرد کون ہو سکتا ہے؟"

اس کی آنکھوں سے سوال پڑھتی وہ لہجے کے زیر و بم میں تفصیلاً بولتی گئی تو جونہی وہ چپ ہوئی اس کا حرف حرف سمجھتی نمرہ کے لب بنا کسی توقف کے ہلے۔

"مریم جہانگیر۔۔۔آپی کی کلاس فیلو ہے اور بیسٹ فرینڈ بھی۔"

اور اس کے یوں فوری طور پر بات کو سمجھ جانے پر ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر صبا اکبر گل خوش دلی سے مسکرا دی۔

"گڈ۔۔۔تو پھر اسے بلاؤ اچھی لڑکی۔کل وہ مجھے یہاں ملے۔"

برجستگی سے کہتے ہوئے ہاتھوں کے اشارے سے اس نے اسے جانے کی اجازت بھی دے دی تو ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ "جی بہتر۔۔۔" کہہ کر آہستگی سے کرسی گھسیٹتے ہوئے نمرہ وہاں سے اٹھ آئی۔

آگے نمرہ کے لیے ثومیہ کے موبائل سے نمبر لے کر پہلے مریم سے اپنا تعارف کروانا اور پھر ثومیہ کے بیمار ہونے اور یوں مینٹل ہاسپٹل میں داخلے کی ساری تفصیلات سے مطلع کرنا بذات خود ایک صبر آزما کام تھا۔اس نے مریم کو بھی یہی بتایا تھا کہ وہ حادثاتی طور پر سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔یہ سب جان کر انتہائی فکر سے دوچار ہوتی وہ تو اسی وقت ہسپتال آنے کے لیے مچل گئی لیکن نمرہ نے اسے مختصراً ڈاکٹر کے احکامات بتاتے ہوئے کل آنے کی تاکید کی اور فون بند کر دیا۔

دوست اگر ہوں تو کسی کی بھی زیست کا حاصل ہوتے ہیں۔یہ کسی کو روتے ہوئے تنہا نہیں ہونے دیتے۔دو اشک بے وجہ ہی مل کر ساتھ بہاتے ہیں اور بوجھل دلوں کی ساری کثافت ہوا کر دیتے ہیں۔

اگلے روز وہ ماں بیٹی ہسپتال پہنچیں تو مریم کو خود سے بھی پہلے پہنچ کر اپنی منتظر پایا۔باہر باغیچے میں ڈاکٹر ماہ نور سلیم کے ساتھ کھڑی وہ ثومیہ کی ذہنی حالت کے متعلق مُسلسل مختلف قسم کے سوالات کر رہی تھی۔ڈاکٹر نے ان کی آمد پر ان کی جانب اشارہ کیا تو وہ تیزی سے بھاگتی ان تک چلی آئی۔اس کی آنکھوں میں گویا آنسوؤں کا کوئی سیلاب موجزن تھا۔

"السلام علیکم......ثومیہ کے ساتھ کب ہوا یہ سب؟ آپ نے مجھے اتنا دیر سے کیوں بتایا؟ مجھے اس سے جلدی ملوائیں پلیز۔وہ مجھے لازمی پہچان لے گی۔مجھے پورا یقین ہے۔میں مان ہی نہیں سکتی کہ وہ مجھے نہیں پہچانے گی"

مُسلسل بولتے ہوئے باری باری ان دونوں کے گلے لگتی وہ فوراً سے پیشتر اس سے ملنے پر بضد ہوئی تو اس کے لہجے میں بسی ثومیہ کی بے پناہ فکر و محبت دیکھ کر راشدہ بیگم نے آہستگی سے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔

"جیتی رہو بیٹی۔۔۔اپنے والدین کی ٹھنڈک رہو۔اللہ کرے ایسا ہی ہو کہ وہ تمہیں لازمی پہچان لے۔ آمین۔اور بس پتر کیا بتائیں کہ وہ کب بیمار ہوئی اور تمہیں کیوں نہ خبر کی ہم نے؟ یوں سمجھ لو کہ جو اس کے نصیب میں تھا اس نے دنیا سے لے لیا ہے۔"

فقط اتنا کہہ کر ان کی آواز بھرا گئی اور وہ سکوت بھر کر آنکھوں میں در آئی نمی پونچھنے لگیں تو نمرہ نے مریم کی کلائی پر بہت عقیدت سے ہاتھ رکھتے ہوئے گویا راشدہ بیگم کی ہی بات کو مکمل کیا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو اس سے ملواتے ہیں۔بس ایک ڈاکٹر سے مل کر کچھ ہدایات لینی ہوں گی۔میں نے فون پر بھی بتایا تھا ناں کہ انہوں نے کسی خاص مقصد کے تحت آپ کی ثومیہ سے ملاقات کروانے کا کہا ہے۔"

اس کے لہجے میں بسے اسرار کو بھانپتی وہ بے ساختہ سر کو اثبات میں ہلانے لگی تو نمرہ نے بنا توقف اسی پل ساتھ آن رکتی ڈاکٹر ماہ نور سلیم کو مخاطب کیا۔

"ڈاکٹر صبا موجود ہیں کیا؟ کل تو وہ لیٹ آئی تھیں۔"

جواباً ڈاکٹر ماہ نور کے لبوں پر ایک امید بھری مسکان سج گئی جو کہ اس کی مجموعی شخصیت کا لازمی عنصر تھی۔

"جی بالکل وہ آچکی ہیں۔اور اپنے روم میں موجود ہیں۔آپ اور مریم میرے ساتھ آجاؤ۔میں بھی اسی طرف جا رہی ہوں۔"

باری باری انہیں دیکھتے ہوئے اس نے اتنا کہا اور پھر راشدہ بیگم سے احتراماً بولی۔

"آنٹی جی آپ ثومیہ کے پاس ہی چلی جائیں۔تھوڑی دیر پہلے شبانہ بھی اسی جانب راؤنڈ کرنے گئی ہے۔ سو وہ بھی وہیں ہو گی۔"

اس کی بات پر اثبات میں سر کو اوپر نیچے جنبش دیتی وہ دونوں اس کے ساتھ ہولیں تو راشدہ بیگم سست قدموں سے کمروں والی عمارت کی جانب جاتی روش پر چلنے لگیں۔

خیر قصہ المختصر۔۔۔ڈاکٹر صبا اکبر گل سے مل کر ان کے مابین یہی طے پایا کہ ثومیہ کو احاطہ صحن میں ایک سنگی بینچ

پر اکیلے بٹھایا جائے گا اور مریم کچھ فاصلے سے اس کی جانب یوں والہانہ سی بڑھے گی گویا اس کی کوئی پرانی واقف کار ہو۔ اور اگر ثومیہ کی آنکھوں میں اس کے لیے کوئی رتی بھر بھی شناخت کی رمق جاگی تو وہ بالکل کسی اجنبی کی طرح اس سے تھوڑی بہت گفتگو کرتے ہوئے آگے نکل جائے گی۔ اس میٹنگ کے دوران مریم کے نینوں میں مُسلسل تیرتے آنسو دیکھ کر ڈاکٹر صبا اکبر گل نے یہ بھی کہا کہ۔۔۔

"جتنا رونا ہو اس کے سامنے جانے سے قبل اچھی طرح رو لینا۔ اس کے سامنے آپ کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہیں چھلکنا چاہیئے۔ وہاں آپ کو بے حد مضبوط رہنا ہے کیونکہ ہم مریض کو فقط چونکانا چاہتے ہیں۔ آنسوؤں سے اس کے ذہن کو جھٹکا بھی لگ سکتا ہے۔ اور فی الوقت ایسا جھٹکا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

اس پل اس کی ہدایت پر سختی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اس نے گویا خود کو بے انتہا مضبوط ظاہر کیا تھا۔

اور پھر کچھ دیر بعد اسی منصوبے کو جامہ عمل پہنانے کے لیے ڈاکٹر شبانہ اسلم نے ثومیہ کو اس کے کمرے سے نکال کر باہر صحن میں ایک سنگی نشست پر بیٹھا دیا۔ اس کے پاس اس کا دل بہلانے کے لیے ہادی کو بھی ایک چھوٹا فٹ بال دے کر کھیلتے ہوئے چھوڑا گیا۔

مریم نے دور پہلی منزل کی راہداری سے ثومیہ کو یوں بے خیالی سے خلاؤں میں تکتے ہوئے پایا تو اس کی مجنونانہ حالت پر اس کی آنکھیں ایک بار پھر سے بھر آئیں۔ بے ساختہ ایک دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھ کر آپس میں بھینچا اور یہ منظر سہنے کی تاب جمع کرنے لگی۔ ایک لمحے میں اس کی نظروں کے سامنے ثومیہ کا یونیورسٹی کی راہداریوں میں اور تاریخی مقامات پر بھی جا بجا بڑی شوخیوں سے کھلکھلاتے ہوئے چلنا گھوم گیا۔

کہاں وہ زندگی سے بھرپور لڑکی اور کہاں یہ۔۔۔ مری مری سی ثومیہ۔ آہ۔۔۔ بہت مشکل تھا اسے اس حال میں دیکھنا۔

"جانے سفیر اور مصطفین کہاں ہوں گے؟ ان دونوں کے رابطہ نمبرز مسلسل بند جا رہے ہیں۔ انہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ ان کے "دائروں" سے چھوٹ کر تم اس "خانے" میں آ بسی ہو۔"

اس کی ابتری دیکھ کر اسے ایک بار پھر سے ان دونوں کا خیال آیا جن سے رابطوں کی کوشش میں کل سے بار

بار ہاری تھی۔نمرہ نے اسے یوں ہمت چھوڑتے دیکھا تو اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں پر نگاہ رکھتی اس کے عین سامنے آن رکی۔

"مریم آپی۔۔۔سنبھالیں خود کو۔میں آپ کی حالت سمجھ سکتی ہوں۔لیکن اس وقت آپ کو بہت مضبوط رہنا ہے۔پلیز۔۔۔"

ردعمل میں اس نے قدرے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔

"آں۔۔۔ہاں میں جانتی ہوں گڑیا۔۔۔ڈونٹ وری۔یہ تو بس یونہی۔کبھی ایسا سوچا نہیں تھا ناں۔۔۔جو دیکھنا بھی پڑ گیا ہے۔تو شاید اس لیے۔۔۔"

جواباً کانپتی ہوئی آواز میں کہہ کر اس نے آنسو خشک کیے اور ایک نظر ایک ترتیب میں کھڑی دونوں ڈاکٹرز اور راشدہ بیگم پر ڈال کر زینوں کی جانب پلٹ گئی۔ڈاکٹر شبانہ اسلم اسے نچلے برآمدے میں یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے اپنی ہی منتظر دکھائی دی۔

"بہت احتیاط سے مریم۔۔۔آپ کو ساری ہدایات یاد ہیں ناں؟اور سنیں۔۔۔میرا بیٹا ہادی وہیں اس کے پاس کھیل رہا ہے۔امید ہے اس منظر میں وہ آپ کے لیے کافی مددگار ثابت ہوگا۔ہاں یہ بھی یاد رہے کہ اسے صرف "بینا" بلانا ہے۔"

اس کے سیڑھیاں اترتے ہی تیزی سے اس تک آتی وہ یقین دہانی کے طور پر بولی تو اس نے شائستگی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جی سب یاد ہے۔اور فکر نہ کریں میں اسے بینا ہی بلاؤں گی۔۔۔بینا بنت آدم۔"

اب ڈاکٹر شبانہ نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا تو دھیرے دھیرے چلتی وہ برآمدے میں اس روش کے سامنے آن رکی جس پر اتر کر اسے ثومیہ شاہجہاں کی جانب پیش قدمی کرنا تھی۔فقط ایک لمحے کو رک کر اس نے ایک طویل سانس بھرا اور ایک بار ہمت افزا نظروں سے خود کو تاکتی ڈاکٹر شبانہ کی جانب دیکھتے ہوئے اس روش پر اتر گئی۔

"ہادی۔۔۔کیا کر رہے ہو بیٹا؟یہاں آؤ میری طرف پلیز۔"

بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے، ثومیہ کو متوجہ کرنے کے لیے اس نے دور سے ہی فٹ بال کو پاؤں سے مُسلسل ٹھوکریں مارتے چھ سالہ ہادی کو پکارا تو بے ساختہ رک کر وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ ثومیہ نے بھی چونک کر اسی جانب نگاہ کی۔ مریم کے حسین چہرے پر کھلی شاداب سی مسکراہٹ دیکھتے ہوئے جانے اسے کیا ہوا کہ وہ اپنی جگہ پر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا واضح طور پر چونکنا اور پھر اٹھنا دیکھ کر مریم کے ساتھ ساتھ اس منظر کو مشاہدہ کرتی باقی تمام خواتین کا دل بھی بری طرح دھڑکا گیا۔ صرف ایک بار شوخ و بھرپور نظروں سے اسے ساکت کھڑے دیکھ کر مریم اسے یکسر نظرانداز کرتے ہوئے سیدھی اس سے کچھ فاصلے پر کھیلتے ہادی تک چلی آئی تو سرتاپا بغور اسے گھورتی ثومیہ کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے گویا کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ بہت حساس لمحات تھے۔ ان پلوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان سب کا حساب کتاب کہیں سے رتی بھر بھی چوک جاتا تو مساوات بننے کی بجائے مزید بگڑ بھی سکتی تھی۔ ان سب کے لیے اس ایک لمحے میں گویا صدیاں سمٹ آئی تھیں۔ سب کی سانس ساکن سا کن تھی۔ سب کے دل عجب وغضب لے و سر پر دھڑکنے لگے تھے۔

"چلو شاباش آپ کی ماما بلا رہی ہیں۔ وہ ادھر۔۔۔ اپنے روم کے باہر ہیں وہ۔ آؤ آؤ۔۔۔"

بڑے مصروف انداز میں ہادی کی پینٹ پر لگی تھوڑی سی گرد جھاڑتے ہوئے وہ اسے لیے واپس پلٹی تھی کہ بہت نپے تلے قدموں سے چلتی ثومیہ گویا بہت جھجکتے ہوئے اس کی راہ میں حائل ہوگئی۔ مریم اسے یوں سامنے آتے دیکھ کر ایک جھٹکے سے رکی۔ لاشعوری طور پر ہی بالکل چپ ہوئے ہادی کی انگلی پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔

"آ۔۔۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

کپکپاتے لبوں سے اس نے مریم سے اس کا نام دریافت کیا تو اس کی آنکھوں میں بیک وقت جلتی بجھتی اجنبیت اور شناسائی دیکھ کر مریم سے خود کو سنبھالنا کارِدار ہونے لگا۔ اس کی ذات میں در آئی ویرانیاں دیکھ کر اسے لگا وہ ابھی رو دے گی۔

ہاں بالکل۔۔۔ بہت اپنوں سے کہیں بھی اتنا بیگانہ ہو کر ملنے کے لیے بہت ہمت چاہیئے ہوتی ہے۔

لیکن اس کی واپسی کی خاطر اسے یہ ہمت کرنی ہی تھی اور۔۔۔اور اس نے یہ ہمت کر لی تھی۔

"میں زائشہ ہوں سہیلی۔۔۔زائشہ مریم۔"

بہت محتاط لہجے میں اس نے اسے اپنا نام تھوڑا بدل کر بتایا اور اگلے ہی پل وہ حیران رہ گئی۔ لگا تار اس کی آنکھیں تاکتی ثومیہ دو قدم اس کی جانب مزید بڑھی تھی۔اس نے بے ساختہ ہادی کو بھینچ کر اپنی ٹانگ سے چمٹا لیا۔ یہ شاید اسے "ایک پاگل" کے کسی بھی غیر متوقع ردعمل سے بچانے کے لیے اس کی ایک لاشعوری سی کوشش تھی۔

"مم۔۔۔مریم۔۔۔مریم نام ہے آپ کا؟ یہ۔۔۔یہ نام۔۔۔کچھ سنا سنا سا لگتا ہے۔"

انگلی اٹھا کر اس کی جانب اشارہ کرتی وہ بڑے غور سے اس کے چہرے کے نقوش پڑھنے لگی تو مریم کا دل کہیں زلزلوں کی زد میں آ گیا۔زائشہ بھول کر اس نے فقط اس کا حقیقی نام "مریم" پکارا تھا اور کئی طرح کے استقام وابہام کا شکار ہوئی وہ اسے پہچاننے کی کوششیں بھی کر رہی تھی۔ جواب دینے کی بجائے مریم بے ساختہ اوپری راہداری اور نچلے برآمدے کی جانب دیکھنے لگی تو اسے گنگ پا کر ثومیہ نے مزید کہا۔

"مم۔۔۔میں بینا۔۔۔بینا بنت آدم ہوں۔آ۔۔۔آپ مجھے جانتی ہیں کیا؟ مم۔۔۔میرے نام سے واقف ہیں کیا؟؟"

اپنی جانب اشارہ کرتی وہ یوں اصرار کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی گویا اس سے اپنی کوئی یقینی شناخت مانگ رہی ہو یا اپنے "بینا" ہونے کی سند چاہتی ہو۔اب کی بار اس کی آنکھوں میں پھیلتی یاس و آس کی لہریں دیکھ کر مریم سے ضبط چھوٹ گیا اور اس کی آئینہ تر آنکھوں میں دو آنسو جگمگانے لگے جنہیں اس نے پورے بدن کی توانائیاں صرف کرتے ہوئے بمشکل پلکوں سے پار روکا تھا۔

"نن۔۔۔نہیں بینا۔۔۔میں آپ کو نہیں جانتی۔"

پوری شدومد سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بہت کھوکھلے لہجے میں تردید کی اور آنکھیں ملتے ہوئے مزید کہا۔

"میری آنکھوں میں شاید کچھ چلا گیا ہے۔آپ یہیں رہتی ہیں کیا؟"

اس کے یوں مکرنے پر ثومیہ کی آنکھوں میں جلتی امید یکایک بجھ سی گئی اور وہ نظریں پھیر کر درختوں کے آس پاس منڈلاتے پرندے دیکھنے لگی۔اس کے چہرے پر کسی خیال سے نبرد آزما ہونے کے سے تاثرات رقم تھے۔ یوں گویا کوئی اپنے اندر خود سے بن بن کر۔۔۔پھر مٹ بھی رہا ہو۔

اس کی ناگفتہ بہ حالت پر مریم نے اپنے دل پر ہاتھ جماتے ہوئے اندر ہی اندر سرگوشی کی۔

"یا اللہ۔۔کسی کے پاس اکیلا رہنے، دل مضبوط کرنے یا پتھر ہونے کا کوئی راز ہو تو آج مجھے دان کر دے یا پھر زدمستان ذات میں نئی روح پھونک دے۔"

اور پھر دوبارہ ثومیہ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آہستگی سے اس کے قریب ہوئی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں بینا۔۔۔آپ یہیں رہتی ہیں کیا؟"

اب کی بار اس نے خلافِ ہدایت بہت محبت کے ساتھ اس کی کلائی کو باقاعدہ چھو بھی لیا تھا۔

"جج۔۔۔جی۔۔۔مم۔۔۔میں یہیں رہتی ہوں۔وہ اوپر۔۔۔میرا کمرہ ہے۔"

پرندے چھوڑ کر اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر دھرے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا اور پھر کوئی خاص تاثر دیئے بنا اوپری منزل کے کمروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔مریم نے محسوس کیا کہ بات کرتے ہوئے وہ بہت جھجک کر لب کھولتی ہے۔یوں جیسے بولنے کے دوران اسے لفظوں کے بھول جانے کا خدشہ واحتمال ہو۔۔ ۔یا پھر یوں جیسے بولنے سے پہلے اسے لفظ باقاعدہ یاد کرنے پڑتے ہوں۔یقیناً یادداشت کی اس گم گشتگی میں اس کی "لفاظی" اور "زبان و بیاں" بھی ایک مخصوص حد تک لازمی متاثر ہوئے تھے۔

"صحیح۔۔۔تو آپ وہ اوپر والوں کمروں میں سے کسی ایک میں رہتی ہیں۔۔۔"

تفہیمی انداز میں سر کو مُسلسل ہلاتے ہوئے اس نے بات برائے بات کہا تو وہ بھی سر کو زور زور سے اثبات میں ہلاتے ہوئے گویا اس کی تائید کرنے لگی۔

"لیکن یہ تو ہسپتال ہے بینا۔۔۔آپ کا اپنا گھر کہاں ہے؟"

اسے اپنے ساتھ اس گفتگو میں پرسکون پا کر اس کا حوصلہ بڑھا تو بہت محتاط لب و لہجہ میں کریدنے والے انداز میں مزید سوال کرنے لگی۔اب کی بار ثومیہ کے چہرے پر پھر سے کسی گنجلک خیال کا سا عکس جم گیا اور خالی

خالی نظروں سے اسے دیکھتی، مدھم تر آواز میں وہ فقط یہی بولی۔

"مم۔۔۔میرا کوئی گگ۔۔۔گھر نہیں ہے۔"

اس کے سرسراتے ہوئے لہجے میں عجب مسافتوں کی دھول بسی تھی کہ مریم ٹکر ٹکر بس اس کی مرجھائی ہوئی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ جواباً اسے بالکل خاموش پایا تو ایک بار پھر سے اس کے نقوش حفظ کرتی ثومیہ کی آنکھوں میں اس سے شناسائی و اجنبیت کے ملے جلے رنگ جھلملانے لگے۔ ادھر انہیں یوں ایک دوسرے کے سامنے بالکل ساکن و ساکت کھڑے پایا تو ڈاکٹر شبانہ اسلم برآمدے سے نکلتے ہوئے تیزی سے اسی روش پر چلتی ان کی جانب آنے لگی۔

"ہادی کو لے بھی آؤ یار۔ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔"

دور سے ہی مریم کو مخاطب کرتی وہ ان کے قریب آئی اور قریب آ کر اس کے ہاتھ سے ہادی کی انگلی چھڑواتے ہوئے مصنوعی حیرت سے ثومیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"ارے۔۔۔آج تو بینا بھی کافی دیر سے اپنے کمرے سے باہر ہیں۔ لگتا ہے یہاں بیٹھنا آپ کو اچھا لگا ہے؟"

اس کی بات پر باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ثومیہ نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"دیٹس گڈ۔۔۔چلیں ابھی میں آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ دوں۔ پھر آئندہ آپ روز یہاں آ جایا کریں۔ اوکے۔۔۔؟؟"

خوش اخلاقی سے کہتے ہوئے اسے گویا بولنے پر مجبور کرتی وہ اس کا جواب سننے کے لیے منتظر ہوئی تو ایک بار پھر سے اس کے ہر خیال و یقین کی بڑے بھرپور انداز میں ایسی کی تیسی کرتے ہوئے اس نے اب بھی سر کو اثبات میں فقط خفیف سی جنبش دی تھی۔ ردعمل میں ڈاکٹر شبانہ اسلم کا منہ اتر سا گیا تو ثومیہ کی اس معصوم تر ادا پر مریم کو اتنا پیار آیا کہ اس کا دل کیا اسے خود سے لگا کر زور سے بھینچ لے۔ کہیں دور تو جانے ہی نہیں دے۔ بس خود ہی سنبھالے اس کو۔

لیکن وہ مجبور تھی۔ چاہ کر بھی یہ نہیں کر سکتی تھی۔

"آپ ہادی کو لے کر برآمدے میں رکو۔ میں بینا کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر آتی ہوں۔"

مریم کو مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر شبانہ اسے لے کر عمارت کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی تو قدرے جھک کر ہادی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے مرجھائی مرجھائی سی ثومیہ کو دونوں بازو سینے پر باندھے ہوئے نہایت شکستگی سے چل کر خود سے دور جاتے دیکھا۔ ایک بار پھر سے اس کی آنکھوں میں بادشاہی مسجد کی طویل راہداریوں کا منظر گھوما جہاں ثومیہ دونوں بازو کھول کر مینارِ پاکستان کی جانب سے آتی تندرو ہواؤں سے گلے ملا کرتی تھی۔

"اچھا لگتا تھا کبھی۔۔۔دونوں باہیں وا کر کے۔۔۔خود کو گلے لگا لینا۔۔۔بہت قیمتی ہوتے ہیں اور بہت یاد آتے ہیں وہ لمحے۔۔۔جن میں کبھی ہم اپنے ساتھ ہنستے ہیں۔"

ہولے سے بڑبڑا کر اس نے کب سے ضبط کیے ہوئے آنسوؤں کو کھل کر بہنے کی اجازت دے دی اور ہادی کو لیے آہستہ آہستہ چلتی واپس برآمدے میں آن رکی جہاں ڈاکٹر صبا اکبر گل اور باقی سب بھی اس سے تفصیلات جاننے کے لیے ابھی نیچے اترے تھے۔

کسی کو سوال کا موقع دیئے بنا اس نے لگاتار بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان خود ہی دھیرے دھیرے پوری بات کہہ سنائی تو ان سب کے چہروں پر کئی فکر و خیال اور رنگ نمودار ہوئے۔ اور جونہی اس کی بات ختم ہوئی تو ایک ہنکارا ابھر کر ڈاکٹر صبا نے تفصیلاً کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے مریم۔۔۔یعنی ہم اپنے مقصد میں کافی کامیاب رہے ہیں۔ اس کا آپ کو دیکھ کر چونکنا، پھر اٹھنا اور پھر آپ کے غلط بتائے ہوئے نام پر توجہ دیئے بنا آپ کے اصلی و حقیقی نام پر زور دینا کہ کہیں سنا سنا سا لگتا ہے۔۔۔یہ سب مثبت علامات ہیں۔ وقت لگے گا۔۔۔لیکن یہ طے ہے کہ ان شاءاللہ وہ سب کو پہچاننے لگے گی۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ آپ کے چہرے پر بار بار غور کر رہی تھی۔ یقیناً یہ اس کی لاشعور میں موجود آپ کی شبیہہ کو اپنے شعور سے جوڑنے کی کاوش تھی۔ ویلڈن۔۔۔آپ نے بہت عمدگی سے ہینڈل کیا سب۔"

جواباً اس نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے نرم سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا تو گفتگو کو تمام کرتے ہوئے اوپری زینوں کی جانب قدم بڑھاتی وہ ایک بار پھر سے رکی۔

"بس ایک بات اور۔۔۔کہ اب میں آپ کو دو سے تین دن کے وقفے سے یہ زحمت ضرور دیا کروں گی۔ کیونکہ نمرہ کی بہ نسبت وہ آپ کے ساتھ زیادہ پرسکون تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ "زائشہ مریم"۔۔۔اس لڑکی "بینا بنت آدم" کی اچھی دوست ہوسکتی ہے۔"

اور بات مکمل کرتے ہی ایک نظر نمرہ کی جانب دیکھتی گویا باقی سب باتیں اسی پر چھوڑتی ڈاکٹر صبا اکبر گل بڑے متوازن اور بااعتماد قدموں سے چلتی واپس پلٹ گئی تو مریم نے لبوں کو بھینچ کر روتی ہوئی آنکھیں جھکا لیں۔ یوں آنکھیں جھکانا اس کی طرف سے صدق دل سے اپنی آمد کی یقین دہانی کا اک اظہار تھا۔

ثومیہ شاہجہان کی خاطر دو دن کے وقفے سے یا روز بھی آنا کجا۔۔۔وہ تو اس کے لیے یہاں مستقل ڈیرے ڈال سکتی تھی۔

ہاں وہ اس کی سب سے بہترین دوست تھی۔۔۔جسے اس کی زندگی کے ہر بگڑ چکے پہلو کو ازسرِ نو سنوارنا تھا۔ اسے ان سب حالات کی ترتیب بدل کر بھی۔۔۔ثومیہ کو واپس لانا تھا۔

اس پل "پاگل خانہ لاہور" کے اس برآمدے میں کھڑی وہ کسی عشقیہ کہانی پر گواہ ہوئی لڑکی۔۔۔اس کہانی کو نئی سمت سے لکھنے کا عزم کر رہی تھی۔

اس کہانی کے سارے واقعات بدل کر بھی۔۔۔اسے کسی کو کسی سے۔۔۔لازمی ملوانا تھا۔

☆......☆......☆

جب ہم کسی پہ مر رہے ہوں تو اس کے پیروں کی خاک تک کو سر میں رواں لیتے ہیں۔ اور اگر کسی کو سر سے اتار پھینکیں تو اس کی ذات تو کیا دھول تلک سے نفرت ہو جاتی ہے۔

سفیر نے بھی اس دن کے بعد اپنے سر سے اس دوستی و لگن کا بھوت اتار پھینکا تھا۔ ثومیہ اور مصطفین سے بہت زیادہ محبت کر لینے کے بعد وہ انہی سے بے تحاشا نفرت کر لینے کی راہ پہ چلا تو اس کی گویا کایا ہی پلٹ گئی۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ایک معروف فرم میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو اتنا مصروف کر لیا کہ اپنے دفتری امور کے علاوہ اسے کسی بھی دوسری جانب سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ اس نے ہر جگہ چپ اوڑھ لی تھی اور بلاضرورت کبھی کسی سے مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا اور اپنے کام کو اس قدر عمدگی

سے انجام دیتا کہ کوئی دوسرا خواہ اس سے زیادہ تجربہ کار ہی کیوں نہ ہوتا اس کے کام میں غلطی نہیں نکال سکتا تھا۔ اسی محنت ولگن کی بدولت پہلے ہی مہینے کے دوران اس کے دفتر میں اس کا ایک خاص مقام بن رہا تھا۔ باس کی طرف سے اس کی بات کو خصوصی اہمیت دی جانے لگی اور اس کی اس دفتر میں آمد سے لے کر اب تک ہوئی دونوں آفیشل میٹنگز میں گولائی دار میز کے اس پار سے باس نے اسے اپنی جگہ پر کھڑے کر کے سب کے سامنے ایک مثال کے طور پر پیش کیا تھا۔ لگے بندھے اسی روزمرہ میں اسے اتنی فرصت بھی میسر نہیں آتی تھی کہ دو گھڑی ٹھہر کر کبھی اپنے والدین سے کوئی ہلکی پھلکی گفتگو ہی کرے۔ اس کے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی کا تاثر کندہ ہوتا تھا اور اس سے ہٹ کر اگر کبھی اس کے چہرے پر کوئی عنصر ظاہر ہوتا تو وہ اکتاہٹ یا بیزاری کا ہوا کرتا تھا۔ اس کی دلکش پیشانی پر دو سے تین بل گویا مستقل طور پر جم چکے تھے اور ہنسنا تو در کنار وہ مسکراتا بھی نہیں تھا۔ کبھی بھولے سے بھی اس کے لب نہیں چٹکتے تھے۔ وہ سچ مچ پتھر لگتا تھا۔ نا قابلِ تسخیر تو وہ پہلے بھی تھا۔۔۔ نا قابلِ رسائی بھی ہو گیا تھا۔ دفتر میں بھی اس کے بے پناہ حسن و رعب کے سبب لوگ اس سے متاثر تو بہت تھے لیکن بات کرنے سے کتراتے تھے۔

ڈاکٹر منصور عالم اور ذکیہ خاتون لب بستہ رہ کر دن بدن اس کی ذات میں در آتا تبدل جانچ رہے تھے اور من ہی من اندر از حد پریشان بھی تھے کہ اس ایک واقعے کے سبب وہ پوری دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ اسے چپ کیا لگی ان کے پورے گھر میں سناٹے گونجنے لگے۔ حتٰی کہ ان کے کھانے کی میز پر کہ جہاں ہر وقت سفیر کا شور بلند رہتا تھا اب اتنی خاموشی طاری ہوتی تھی کہ پلیٹوں سے ٹکراتے چمچ تک کی آواز سماعتوں کو گراں گزرتی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی بغور اس کا ہر رویہ و انداز بھانپ رہے تھے لیکن فی الوقت خاموش تھے کہ وہ اسے اس مصروفیت میں ہی سنبھلنے کا موقع دے رہے تھے۔ وہ مغرب کے بعد بہت دیر سے دفتر سے اٹھ کر گھر آتا اور لاؤنج میں بیٹھے اپنے والدین سے رسمی سلام دعا کے بعد ان کے پاس رکے بنا سیدھا زینے چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ پیچھے وہ دونوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو بس دیکھ کر رہ جاتے۔ پھر آدھے گھنٹے بعد کسی آرام دہ ملبوس میں وہ دوبارہ نیچے اترتا تو وہ دونوں کھانے کی میز پر اس کے منتظر ہوتے تھے۔ سر جھکائے ہوئے کھانا کھا کر اور صرف پوچھی گئی بات کا ہوں ہاں میں جواب دیتے ہوئے وہ اسی چپ کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں لوٹ

جاتا جو اس کی ذات وشخصیت کا حصہ بن چکی تھی۔ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ جیسے ان سے بہت دور ہو گیا تھا۔اسے اتنا بدلا بدلا دیکھ کر ذکیہ خاتون اکثر اتنی دل آزار ہو جاتیں کہ ان کی آنکھیں بھر آنے لگتیں۔اور ان کے بھرے ہوئے نین دیکھ کر ڈاکٹر منصور عالم اپنے مخصوص فدائی لہجے میں تسلی کے طور پر یہ یا اس سے ملتے جلتے کوئی جملے دہرا دیتے۔

" بھئی کچھ دن صبر کریں بس۔اسے تھوڑا سنبھلنے دیں۔کم از کم ایک ماہ تو گزر جانے دیں۔پھر دیکھیئے گا کیسے میں آپ کے صاحب زادے کے کان کھینچتا ہوں کہ کیوں میری بیگم جان کو پریشان کرتا ہے؟ تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا محترم کو۔یہ جو محبت کا خود ساختہ روگ ہے ناں۔۔۔سب کا سب نکل جائے گا۔"

ان کی آخری بات پر وہ ہر بار تڑپ جاتی تھیں۔

" خود ساختہ روگ تو نہ کہیں خیر۔۔۔میرا بیٹا کملا گیا ہے اس لڑکی کی وجہ سے۔سوچتی ہوں ایسی لگتی تو نہ تھی وہ کہ کسی کا یوں دل توڑ دے۔وہ تو بڑی دل رکھنے والی لگتی تھی۔حق ہاہ۔۔۔"

بیٹے کے ساتھ ساتھ انہیں رہ رہ کر ثومیہ کا بھی خیال آجاتا تو اس کی ذات کے حوالے سے کئی بار کے دہرائے ہوئے اندازے پھر سے دہرانے لگتی تھیں۔

" کہتی تو آپ ٹھیک ہیں۔وہ بچی ایسی لگتی نہیں تھی کہ کسی سے فریب کرے۔"

جواباً ان کی تائید کرتے ہوئے وہ بھی کسی خیال میں کھو کر بولتے اور ان دونوں کی سرد آہوں سے ماحول عجب سا اداس وسوگوار ہونے لگتا۔

خیر وہ دونوں میاں بیوی دل پر جبر کر کے سفیر کو اس پتھرائی ہوئی حالت میں دیکھتے رہے اور اسی طرح روز و شب کے مُسلسل گل ہونے میں پورا ایک مہینہ گزر گیا۔بالآخر ایک روز جب ان کا صبر وضبط جواب دے گیا تو انہوں نے اسے دفتر سے واپسی پر لاؤنج میں ہی روک لیا۔

" کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو سفیر۔۔۔کتنے بدل گئے ہو تم۔تم تو یوں ہو گویا تم سے وابستہ صرف تم ہی ہو۔اور کوئی ہے ہی نہیں۔"

روکے جانے پر قدرے حیران سا ہوا وہ بہت آہستگی سے ان کے سامنے بیٹھا تو ذکیہ خاتون بڑی شکوہ کناں

سی نظروں سے اس کی دلکش آنکھوں میں جھانک کر بولیں۔ ان کی بات پر ایک پل کے لیے اس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں ماما۔ بس آفس کی مصروفیات ہیں تو وقت ہی نہیں ملتا۔ پھر بھی میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ کوشش کروں گا آئندہ آپ کو ایسی شکایت نہیں ہو۔"

اگلے ہی پل نہایت مفاہمتی لہجہ و انداز میں عذر پیش کرتے ہوئے وہ باقاعدہ معذرت طلب کرنے لگا تو وہ رخ پھیر کر اپنے شوہر کی جانب دیکھنے لگیں۔ ان کی نظروں کا پیغام سمجھ کر وہ بھی فوراً سے پیشتر بولے۔

"سفیر دیکھو یار۔۔۔ یہ خالی خولی معذرت سے کام نہیں چلے گا نہ تم ہمیں صرف ایک معذرت پر ٹرخاؤ۔۔۔ تمہیں اس سلسلے میں ہم سے باقاعدہ بات کرنی ہو گی۔ کیونکہ یہ تو سچ کہہ رہی ہیں بیگم کہ تم حد سے زیادہ چپ رہنے لگے ہو۔ نہ ہنستے بولتے ہو۔ نہ ہمارے پاس دو گھڑی بیٹھتے ہو کبھی۔ بھئی مانا کہ تمہاری دفتری مصروفیات ہیں لیکن ایسی بھی کیا مصروفیات ہیں کہ تم ہمی کو بھول جاؤ؟ اتنے چپ اور الگ تھلگ کیوں رہنے لگے ہو یار؟ ہمیں بہت فکر ہے تمہاری۔۔۔"

مُسلسل سوالیہ نظروں سے اسے تاکتے ہوئے انہوں نے لہجے کے زیر و بم میں بات مکمل کی تو اس نے اپنی جگہ پر یوں پہلو بدلا گویا فرار کی ہر اک راہ مسدود ہونے لگی ہو۔

"بابا جان کہہ تو رہا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ اور میری چپ کے پیچھے بس وہی وجوہات کارفرما ہیں جو میں نے دفتری مصروفیات کے حوالے سے بیان کی ہیں۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے کہ میرے یوں الگ رہنے سے آپ لوگ یوں بے طرح میری فکر میں گھلنے لگیں۔"

جواباً اپنی پہلی ہی بات پر مصر ہوتا یہاں وہ رکا اور ایک نرم سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے باری باری ان کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا مزید گویا ہوا۔

"میں تو آپ دونوں "لو برڈز" کو جی بھر کر فرصتیں عطا کر رہا تھا کہ میں کباب میں ہڈی نہ بنوں اور آپ دونوں زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ گذار سکو۔ اب آپ دونوں کو اعتراض ہے تو ٹھیک ہے بھئی۔۔۔ میں اب ہمیشہ یہیں پایا جاؤں گا۔ آپ دونوں کے عین وسط میں۔۔۔"

بھرپور شوخ لہجے میں کہتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جست بھرتا سچ مچ ان دونوں کے "عین وسط" میں آن بیٹھا تو اسے ایک مدت کے بعد یوں شرارت کرتے دیکھ کر ذکیہ خاتون کھل اٹھیں۔

"ہمارے ساتھ بس ایسے رہا کرو بیٹا۔ تمہارا یہی روپ ہمیں تا عمر چاہیئے ہوگا۔ ہمارے سامنے سنجیدہ اور اکتائے ہوئے مت رہا کرو۔ دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔"

فوراً اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر اپنے ساتھ لپٹاتی وہ مسرت آمیز لہجے میں بولیں تو اس نے جواباً کچھ کہنے کی بجائے اعتراف واقرار کی مد میں فقط آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر ایسا سکون اور ٹھہراؤ اتر آیا تھا گویا کہیں صدیوں سی بے امان مسافتیں بھر بھرا بھی تھک ہار کے گھر لوٹا ہو۔

اور پھر انہیں باتوں میں لگا کر کچھ دیر مزید وہاں بیٹھنے کے بعد وہ بہت غیر محسوس طریقے سے وہاں سے اٹھ آیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور اپنے ذہن کو ایک "مخصوص سمت" میں سوچنے سے ارادتاً باز رکھتے ہوئے اپنے پراجیکٹ سے متعلقہ ایک ضروری فائل کھول کر سکرین پر نگاہیں جمالیں۔ لیکن بہت دھیان لگا کر بھی جب اس کا ارتکاز نہیں بن پایا اور پہلی ہی سطر کو اسے دو سے تین بار پڑھنا پڑا تو اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کی سوچیں منتشر ہو چکی ہیں۔

ہوتا ہے زندگی میں کبھی کبھی کہ افعال کے بگڑنے سے ہمیں اپنی ذہنی رو کے بھٹکے ہوئے ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اور ایسا در حقیقت اس صورت میں ہوتا ہے جب ہم کہیں نہ کہیں اپنے اندرون کے شور پر توجہ نہیں دیں یا اپنی ہی ذات کی "اصلیتوں" سے نگاہیں چرانے کی کاوشوں میں ہوں۔

بہت ہارے ہوئے انداز میں لیپ ٹاپ بند کرتا وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چل کر اسی ٹیرس میں نکلتا، ریلنگ تھامے سر جھکائے ہوئے کھڑا ہوگیا کہ جس میں کبھی چلتی ہوئی ہواؤں کے مقابل رک کر اسے ثومیہ شاہجہاں سے اپنی محبت کا ادراک ہوا تھا۔ وہ اب اس طرف نہیں نکلتا تھا کیونکہ یہاں رک کر اسے ہمیشہ اس کی یاد آیا کرتی تھی۔

"میں تم سے نفرت کرتا ہوں اور بس نفرت ہی کرتا ہوں ثومیہ شاہجہاں۔ میں تم سے کبھی بھی اب محبت نہیں کروں گا۔ میں دعا کروں گا میرا کبھی تم سے سامنا ہی نہیں ہو۔ اور زندگی میں اگر کبھی تم میرے سامنے آئیں بھی۔

۔۔تو نگاہیں چراتے ہوئے یوں گذر جاؤں گا جیسے تمہیں جانتا ہی نہیں۔" اب بھی یہاں ٹھہر کر پہلا خیال اسی کا آیا تو اس کے متعلق طرح طرح کی سرگوشیاں کرتا وہ اندر ہی اندر جلنے لگا۔

"اور ماما بابا کہتے ہیں تم ہنستے نہیں ہو۔۔۔کیسے ہنسوں میں؟ کس طرح سے ممکن ہے؟ کسی کو خبر ہو تو مجھے بھی وہ راز "دان" کرے کہ اتنے درد میں کیسے ہنستے ہیں بھلا؟"

آنکھوں میں اُمڈ آئے آنسوؤں کو لگاتار بہنے کی اجازت دیتا وہ آج بہت عرصے بعد رو رہا تھا۔ہاں وہ خود کو بہت مضبوط ظاہر کرتے کرتے۔۔۔بہت زیادہ تھک گیا تھا۔

گھنے بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے اس نے بڑی شدت سے انہیں نوچ لیا اور پیارے پیارے نینوں کے ہر سوگوار دھارے کو دور کہیں خلاؤں میں ٹکاتے ہوئے خود کلام ہوا۔

"مسکراہٹ، شرارتیں اور بچپنا تو گویا وقت کے دامن میں چھید کرتے ہوئے زندگی سے نکل گئے ہیں۔ اب تو بس خیال ہے، فکر ہے اور حال ہے۔زندگی میں زندگی تو ہے ہی نہیں۔زیست۔۔۔شاید ہجر میں کہیں رہ گئی ہے اور میں ہوں کہ وصل کی حدوں تک سے بھی پار آ گیا ہوں۔اب کی بار زندگی سے کچھ ملے بھی تو مجھے کچھ نہیں چننا۔ہاں اب کے یوں ہوا ہے کہ میں ہر طلب سے دستبردار ہو گیا ہوں۔"

آس پاس سرسراتی ہوائیں اس کی تمام تر اذیتیں، پورا پورا کرب اور سارا درد سمیٹ کر یہاں کے بام و در کے ساتھ ساتھ پورے شہر پر بھی پھونکنے لگیں۔

تادیر وہاں رک کر گورِ محبت پر اشک بہاتے ہوئے وہ دل کے سنگ پوری جاں کو بھی سنگسار کرتا رہا اور پھر اندر ہی اندر سارے جذبوں کو تھپکتے ہوئے خود پر قابو پاتا چلا گیا۔

"لیکن صرف ماما بابا کی خاطر مجھے خود کو پھر سے بدلنا ہوگا۔میں انہیں پریشان نہیں کر سکتا۔"

کسی نئے عزم سے بندھ کر اس نے اپنی فسوں گر آنکھوں کو بڑے زور سے رگڑ ڈالا تھا۔

"جب یہ طے ہو کہ اس کارِ جہاں بھر میں کسی کی بھی موجودگی یا غیر موجودگی سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔تو کیا ضروری ہے کہ "کچھ "غیر ضروری لوگوں کی خاطر "بہت "ضروری لوگوں سے بھی دور جایا جائے؟ جب رشتوں کے عدمِ استحکام پر یقین آ ہی گیا ہو تو پھر من کو یوں جلانا کیا اور۔۔۔خود کو ہی ستانا کیا؟؟"

دلکش لبوں سے جاری بلکتے سلگتے اذکار کے ساتھ وہ لہراتے ہوئے پردوں سے مس ہو کر گذرتا واپس کمرے میں چلا آیا۔

اب اسے اپنے درد کو ایک نئے رخ سے تشکیل دینا تھا۔

☆......☆......☆

مصطفین شجاع کو پارک میں بانسری سیکھنے کے لیے آتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ مہینہ گذر چکا تھا۔ بانسری بجانے والے وہ پُراسرار بزرگوار اس پر منکشف ہوئے تو بہت مہربان ہو گئے۔ ان کا نام "سید ظفر علی نجمی" تھا اور اپنا نام بتانے کے سوا انہوں نے اپنے متعلق کی گئی اس کی ہر کھوج کو بہت سلیقے سے ٹال دیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کسی پر بھی اپنی ذات عیاں نہیں کرتے۔ لیکن اس پہلو سے قطع نظر عمروں میں بہت زیادہ تفاوت کے باوجود ان دونوں میں بہت زیادہ دوستی پروان چڑھی۔۔۔ اور کیوں نہ ہوتی دوستی کہ دونوں ہی "دردگری" سے خوب خوب واقف و آشنا تھے۔ انہوں نے اسے بانسری کا ہر گر اس قدر آسان کر کے بتایا تھا کہ سُر اور لے کے تمام تر رموز کو وہ بہت جلدی سمجھ اور سیکھ گیا۔ یعنی اس مختصر دورانیے میں بھی اس نے بانسری اور سانس کے باہمی تال میل پر حیران کن حد تک عبور حاصل کر لیا تھا۔ مدھر دھنیں تو گویا اس کے خوش رنگ لبوں کی گلال تر دھاروں پر دھری رہتی تھیں کہ جونہی وہ بانسری کو منہ تک لاتا، فضا بھر میں میٹھے ارتعاش بہنے لگتے تھے۔ آنکھیں موندے بانسری کے سوراخوں پر جا بجا انگلیاں تھرکاتے ہوئے وہ اپنا آپ بھی بھول جانے لگتا تھا۔ وہ یوں بے خودی سے نت نئی دھنیں ترتیب دیتا تھا کہ اسے یہ ہنر سکھانے والے ظفر علی نجمی بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ اس کے سینے میں بسے کرب کو گویا اظہار و بیان کی کوئی راہ سی مل جاتی تھی۔ اس کے خم دار لبوں کی ہر ہر جنبش سے بانسری کے حوالے صرف و فقط راس رسیلے درد ہوتے تھے۔

یونیورسٹی میں کبھی ثومیہ شاہجہاں نے اس کے متعلق ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ۔۔۔ "تم درد کو میٹھا کر جانتے ہو مصطفین۔۔۔"

اور یہ سچ تھا کہ بالآخر اس نے درد کو چاشن گر لہجوں میں بدلنا سیکھ لیا تھا۔

سید ظفر علی نجمی اس کی زیست پہیلی سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ ایک روز کہ جب وہ کسی اندرونی خلفشار کے

سبب بہت زیادہ دل آزار تھا،اس نے آنکھوں میں بے شمار آنسو بھر کر بہت مغموم لہجے میں انہیں اپنی "درد کتھا" سنائی تھی۔ وہ دونوں اس وقت باغِ جناح کے داخلی و مرکزی احاطے میں لکڑی کی ایک نشست پر براجمان تھے۔ اور ساکتی آنکھوں کے ساتھ نہایت خاموشی سے اس کی رودادِ دل شکستہ سن کرانہوں نے بس ایک طویل ہنکارا بھرا تھا اور اس کی آنکھوں سے چھلک کر گالوں پر بہنے کو بے تاب ہوا پہلا آنسو جھاڑتے ہوئے آتشیں لہجے میں فقط یہی بولے تھے۔

" آنکھوں میں در آئی اس نمی کو تم مت رونا۔۔۔ یہ محبت گزیدہ لوگوں کی روح کو روتے بسورتے اور سسکتے ہوئے جذبات کا خراج ہوتی ہے۔ یہ تسکین ہے ان زخموں کی جن کا مرہم کچھ بن نہ سکا۔"

یہ کہہ کر وہ اس کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے تھے اور وہ دور تلک ٹکر ٹکر ان کی پشت کو تا کتا رہ گیا تھا۔ ایسے ہی ایک اور دن کہ جب وہ آملوں کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے اسے بانسری کی کوئی سوگوار سی دھن سکھا رہے تھے،اس نے نہایت نرمی سے ان کا گھٹنا چھو کر پوچھا تھا۔

" سر یہ محبت میں ملن بہت ضروری ہوتا ہے کیا؟ کیونکہ المیہ دھنیں اور سوگوار نغمات سارے بچھڑن سے ہی منسوب ہوتے ہیں۔۔۔"

اور جواباً انہوں نے بانسری کو اپنے ہونٹوں کے بالکل قریب روک کر بہت ہی گہری نظروں سے گویا اس کی "ذات وہستی" تلک میں جھانکا تھا۔

" محبتیں سچی ہوں تو دوریاں معنی نہیں رکھتیں۔ سطحی ہوں تو پاس ہونا بھی فضول ہوتا ہے۔ ملن، سنجوگ۔۔۔ خواہشوں سے پار کا کوئی قصہ ہے۔"

بات مکمل کرتے ساتھ ہی انہوں نے بانسری کو لبوں پہ ٹکاتے ہوئے المیہ دھن چھیڑ دی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کیا کرتے تھے کہ تسلی کا کوئی ایک بھی بول بولے بنا اسے فقط درد سہنے کا درس دیتے تھے۔ اس طرح وہ مصطفین کو پہلے سے کہیں گہرے لگنے لگتے۔ یوں گویا بہت سا کرب پی چکے ہوں۔ بڑی سی کوئی اذیت کہیں جھیل چکے ہوں۔ کبھی کبھی اسے اپنی ذات ان کی ذات کا پرتو لگتی تھی۔

وہ دونوں پارک کے مخصوص گوشوں پر رہ کر بانسری بجایا کرتے تھے۔ اس حوالے سے عموماً پارک کے اندر

ٹینکی والی مصنوعی پہاڑی یا پھر اسی "بارہ دری" کا انتخاب کیا جاتا تھا جس میں کبھی وہ معروف لکھاریہ "عشنا کوثر سردار" سے ملا تھا۔ ایک اور اہم بات یہ تھی کہ مصطفین ہمیشہ بیٹھ کر بانسری بجاتا تھا جبکہ ظفر علی نجمی ہمیشہ سرسراتی ہوئی ہواؤں کے مقابل کھڑے ہو کر بانسری بجایا کرتے تھے۔ جب بھی وہ دونوں کہیں بھی رک کر بانسری بجانا شروع کرتے تو پورے باغ میں جہاں جہاں بھی آواز جایا کرتی لوگ بندھے بندھے سے اس جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ لیکن لوگوں کا بنتا ہوا ہجوم دیکھ کر وہ ہمیشہ اپنی دھنیں سمیٹ لیا کرتے تھے۔ ہاں وہ یہ المیہ سُر صرف اپنی اپنی ذات کی خاطر بکھیرا کرتے تھے۔ یعنی اس درد میں انہیں کوئی ہمدرد نہیں چاہیئے تھا۔

اور حساس تر پہلوؤں سے لپٹے ان کے اس منفرد سے تعلق پر ابھی پہلی بہار بھی نہیں اتری تھی کہ موسمی پیمانوں سے چھوٹ کر ان کے آس پاس والے منظروں پر خزاں اتر آئی۔ ہاں یہ انہی دِنوں کا ذکر ہے کہ جب باغِ جناح میں "فلاتھس ایمبلیکا" پر اگنے والے ننھے منے سے "آملے" مرجھائی ہوئی گھاس پر لاشوں کی مانند بکھرے پڑے تھے اور "بدھا" کے گولائی دار پیڑوں سے لپٹی انگوروں کی بیلوں کا رنگ سبز سے بدل کر لال و زرد اور پھر بھورا ہونے لگا تھا۔ ہاں ان کے الگ ہونے کا وقت آیا تو درختوں سے ان کے پتے بھی جھڑ رہے تھے۔ اس شام مینہ بڑے زوروں سے برس رہا تھا اور تیز ہواؤں کی آوازیں ماحول میں ہیبت ناک شور بپا کیے ہوئے تھیں۔ آسمان پر رقصاں کالے بادلوں کے گھیر سے پھوٹتے ہوئے کئی گھپ تاریک دھارے سرِ شام ہی منظروں پر طاری و حاوی ہونے لگے تھے۔ لحہ بہ لحہ بگڑتے ہوئے موسمی تیور بھانپ کر وہ ایک سائبان کے نیچے رکا تاریکیوں سے جھلکتے سبز پتے دیکھنے لگا۔ جانے کیوں اب اس کا بارشوں میں بھیگنے کا من نہیں کرتا تھا۔

ہاں یہ بجا و سچ ہے کہ بے پناہ کرب و اذیت میں لپٹے ہوئے دل جب بے طرح بنجران ہونے لگیں تو ٹھنڈی میٹھی پھواروں سے بھی ہریالی نہیں آتی۔

اسی سائبان کے نیچے رکے ہوئے اسے کافی وقت بیت گیا تو وہ ظفر علی نجمی صاحب کی متوقع آمد سے مایوس ہونے لگا۔ قدم بہ قدم ایک مخصوص و مختصر خط پر ٹہلتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکال کر وقت دیکھا اور ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے قدرے جھک کر چھتری نما سائبان کی جھکی جھکی چھت کے کناروں سے پار تاریک آسمان پر نگاہ جمائی۔

"موسمی آثار بتاتے ہیں کہ وہ آج نہیں آنے والے۔۔۔"

ان کی آمد سے متعلق خود کلام ہوتا وہ فقط ایک پل کو اسی حالت میں رکا اور پھر سے ٹہلنے لگا۔ اور اس کے بعد اندرونی تباہ کن افکار سے سلگتے ہوئے اسے تھوڑا ہی وقت مزید گذرا تھا کہ اسے چونک جانا پڑا۔ کالی برساتی پہنے ہوئے ظفر علی نجمی پارک کا مرکزی احاطہ عبور کرتے تیزی سے اس کی جانب آرہے تھے اور ان کے ہاتھوں میں کچھ پھول دبے تھے۔ جونہی وہ سائبان کے نیچے پہنچے سرعت سے ان کی طرف بڑھتا وہ بڑی بےتابی سے بولا۔

"السلام وعلیکم۔۔۔ مجھے لگا تھا آج آپ نہیں آئیں گے۔"

جواباً نہایت آہستگی و بھرپور متانت سے "وعلیکم السلام۔۔۔" کہتے ہوئے انہوں نے اس کے عجلت آمیز انداز سے نگاہ چرائی اور بدھا کے مرجھائے ہوئے سفید پھولوں کا گلدستہ اس کی طرف بڑھایا۔

"میری بات بہت دھیان سے سنو بچے۔۔۔"

ان کا متجسّس انداز بھانپتے ہوئے پھولوں کی ڈھلکی ہوئی پتیوں سے آنکھیں ہٹا کر سوالیہ نظروں سے انہیں تاکتا وہ ہمہ تن گوش ہو گیا تو بنا کسی پس و پیش کے بڑی روانی سے انہوں نے اپنا مقصود اگل دیا۔

"مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واپس اسلام آباد جانا ہے میرے بچے۔۔۔ اب میں کبھی لوٹ کر اس شہر میں نہیں آؤں گا۔ یہ شہر، یہ پارک، یہاں کی ہوائیں اور تم۔۔۔ مجھے بہت ہی یاد آؤ گے۔"

اور سنسناتے ہوئے لہجے میں جیسے ہی انہوں نے بات پوری کی بغور ان کا حرف حرف سنتے مصطفین کی سماعتوں کے گرد ہواؤں کا شور گونجنے لگا تھا۔ آہ۔۔۔ کہ کتنے حوصلے و آسانی سے انہوں نے اس سے دور جانے کی بات کر دی تھی۔

"تو گویا ایسے ہی وہ مقامات ہوتے ہیں جہاں سے بہت عزیز لوگ کسی بھی طور ہم سے راستے الگ کر لیں۔۔۔؟"

جواباً گلدستہ کے سفید پھولوں پر مُسلسل پیار سے ہاتھ پھیرتے، اپنی جگہ سے دو قدم آگے ان کے عین سامنے آتے ہوئے اس کے لبوں پر بڑی مغموم سی مسکراہٹ در آئی اور باقی سب کی طرح اس کے جملوں میں بسی دلکشی و معنویت کے دلی قائل و معترف ظفر علی نجمی صاحب نگاہیں پھیر گئے تھے۔ وہ جانتے تھے انہیں اس کی طرف

سے ایسے ہی کسی ردعمل کا سامنا درپیش ہوگا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ میرے یوں ایک دم سے چلے جانے سے تمہیں بہت دکھ ہوگا۔لیکن اپنی جگہ میں بھی بہت مجبور ہوں میرے بچے۔اس شہر سے، اس پارک سے اور یہاں سرسراتی ان ہواؤں کے ساتھ تم سے بھی۔۔۔یہ واسطہ فقط یہیں تک تھا۔مجھے خوشی خوشی اجازت دو۔۔۔اب کہہ دو کہ۔۔۔الوداع۔"

بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھام کرانہوں نے گویا اس کا دل بہلانا چاہا تو کرب در کرب وہ بڑے کرب سے مسکرایا۔

"جی سر۔۔۔یہ سب میں سمجھ سکتا ہوں۔اور نہیں بھی سمجھوں اگر تو اب میں اس سب کا عادی ہو چکا ہوں۔کہیں بھی کسی سے ملنا اور اچانک سے ہی بچھڑ جانا۔۔۔کوئی پہلی بار تھوڑی ہے۔میری زیست کا حاصل یہی کچھ ہے۔ایسی ہی نارسائی بس۔۔۔کوئی نہ کوئی ایسا موڑ۔۔۔"

لفظ لفظ بلکتے ہوئے جانے کیا کیا کہتا ابھی وہ یہیں تک پہنچا تھا کہ سرد ہواؤں کے جھکڑ بے پناہ شدت سے چلنے لگے اور اونچے درختوں کی اردگرد بڑھی ہوئی لمبی ٹہنیاں آپس میں گلے ملتی ملاتی ہوئی یکا یک ہی سرسراہٹوں میں لپٹے سے کئی بین بلند کرنے لگیں۔ایک لمحے کو اپنی گفتگو روک کر وہ دونوں باہر جا بجا بکھرتے ہوئے مختلف درختوں کے بے شمار پتوں کو دیکھنے لگے۔زرد پتوں کی یہ دربدری مصطفین کو عجب سا بے چین کر گئی۔اپنی جگہ سے چھوٹتا وہ سائبان کے ایک ستون سے جا لگا اور سامنے واقع تارکول کی کشادہ و طویل شاہراہ پر یہاں سے وہاں تک سرکتے گھسٹتے پتوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

" کوئی تیز ہواؤں سے کہہ دو کہ اپنی حد میں رہیں۔تندی کا مطلب یہ تو نہیں کہ درختوں سے سارے پتے ہی اتار پھینکے جائیں۔"

اس کا لہجہ بے پناہ کرب و اذیت میں جل رہا تھا۔۔۔اس کے انداز میں ہر کسی "بچھڑن" کا درد بسا تھا۔وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ان کے یوں ایک دم سے چلے جانے پر وہ اپنی قلبی حالت کا اظہار کیسے کرے۔ہاں بالکل۔۔۔کچھ جذبوں کچھ کیفیات کے اظہار ایسے ہوتے ہیں کہ ہم کبھی چاہ کر بھی انہیں "پورا" نہیں کر پاتے۔وہ ہمیشہ "ادھورے" رہتے ہیں۔لفظ و حرف اور انداز و بیان کی ہر ایک حد میں لا کر بھی۔۔۔کچھ باتوں کی تکمیل ممکن نہیں

ہوتی۔

اس کی بے قرار حالت و کیفیت بھانپ کر ظفر علی نجمی بھی دھیرے دھیرے چلتے اس کے پاس آن رکے اور اسی پل آسمانی بجلیوں کی لاتحاشا چمک اور گرج دیکھ کر بہت محبت سے اسے شانوں سے تھامتے ہوئے اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا۔

" آپ کے لفظ ایسے ہیں کہ شور کا ہر پہر منجمد کر دیں۔۔۔ سازوں کو چھیڑیں لیکن مدھم کر دیں۔ روشنی کو جلا بخشیں اور دیپوں کو۔۔۔ پاگل کر دیں۔۔۔"

اس کے کمال تر حرف و ہنر کو خوبصورت لفظوں سے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے یہاں وہ رکے اور بہت محبت و عقیدت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر گویا وہاں بہتے کرب پر کوئی روک لگانی چاہی۔

" خوش رہا کرو مصطفین۔۔۔ اس قدر اداسی اچھی نہیں ہوتی۔ مجھے اب جانا ہی ہوگا۔۔۔ کہ میں اب یہاں نہیں رک سکتا۔ یوں سمجھو میری کہانی مجھے واپس اپنے مدار میں بلا رہی ہے۔ اور یہ تو طے ہے کہ کہانیوں سے کہیں بھی بچھڑا ہوا ہر اک کردار بالآخر اپنی ہی کہانیوں میں آکر دم لیتا ہے۔"

ان کے شکستہ تر لہجے میں کئی دہائیوں کی مسافتوں سی دھول اڑ رہی تھی۔۔۔ اور ان کی بات سن کر دائیں بائیں دیکھتا وہ گویا ہواؤں سے سر پٹخنے لگا تھا۔

" ٹھیک ہے سر۔۔۔ آپ جا سکتے ہیں۔ میں جان گیا ہوں اب آپ رکیں گے نہیں۔ لیکن۔۔۔"

انہیں جانے کی اجازت دیتا یہاں وہ ایک لحظے کو رکا اور عجب بے بسی میں گھرا ہوا مزید بولا۔

" لیکن جانے وہ کون سی کہانیاں ہوتی ہیں جن سے بچھڑا ہوا اک ایک کردار ان میں واپس آن رکتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میری کہانی ایسی ہی کسی کہانی کا حصہ ہوگی۔ میری کہانی میں میری ذات سے بچھڑا کوئی بھی کردار کبھی واپس نہیں آیا۔ اور یہ بھی طے ہے سر کہ آپ کے جانے کے بعد میرا اس شہر میں رکنے کا ہر جواز ختم ہو گیا ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ میں بھی کہیں ہجرت کرنے والا ہوں۔"

بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں میں بے شمار موتی چمکنے لگے تھے جنہیں اس نے کمال تر ضبط سے پلکوں سے پار ہی روک لیا۔ اس کی بات سن کر انہوں نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور تسلی بخش انداز میں اپنے

ہاتھوں میں دباتے ہوئے بولے۔

"یاد رکھو کہ جن کہانیوں میں ان سے بچھڑے ہوئے کردار کبھی واپس نہیں آتے وہ کہانیاں امر ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ہمیشہ یاد رہ جانے کے لیے۔۔۔کبھی واپس نہیں آتے۔کبھی کبھی ہمیشہ ساتھ رہنا ہو تو۔۔۔ہمیشہ کے لیے بچھڑ جایا کرتے ہیں۔"

حرف حرف ان کی بات سمجھتے ہوئے اس کا سر اثبات میں ہلنے لگا تو بہت آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے انہوں نے اچانک ہی اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"اور ہاں ایک اور بات۔۔۔تم کہیں بھی جاؤ یارم۔۔۔ہمیں تم سے محبت ہے تو بس ہے۔تم مجھے ہمیشہ، ہر پل اور ہر گھڑی یاد آؤ گے۔دعاؤں میں یاد رکھنا۔۔۔بس اب خدا حافظ۔تمہیں الوداع۔۔۔"

اور اگلے ہی پل اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے ایک آخری نگاہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتا اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ واپس بھی پلٹ گئے تو اپنی جگہ پر ہی قدم قدم اٹھاتا دھرتا وہ عجب "لاحاصلی کیفیات" میں گھل کر رہ گیا۔ زندگی ایک اور پیارے و پسندیدہ فرد کو اس سے ہمیشہ کے لیے دور لے جا رہی تھی۔۔۔اور چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں روک نہیں پایا تھا۔

آنکھوں کی جلتی بجھتی جوت سے اس نے چھما چھم برستے بارشی قطرات کو دیکھا اور وہیں سائبان تلے دھری ایک سنگی نشست پر بیٹھا خاموش تر آنسوؤں سے رونے لگا۔ہاں اندرون پہ طاری بے پناہ کرب کے باوجود اس کے خم دار لبوں پر کوئی سسکی نہیں تھی۔

ہاں اسے درد کو سہنے میں مزہ آنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

ہوٹل پرل کانٹینینٹل میں اپنے کمرے کے ٹیرس میں ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑی گیت فون دائیں کان سے لگائے کسی سے گفتگو میں مگن تھی اور یہاں سے وہاں تک اضطراری انداز میں ٹہلتی ہوئی ناز بار بار اسے خشمگیں نظروں سے تاک رہی تھی۔گیتی زیادہ طویل بات کی بجائے بس "ہوں ہاں" سے کام چلا رہی تھی سو اندازہ کرنا مشکل تھا کہ دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا ہے۔آخر بہت دیر بعد جب اس نے فون کان سے ہٹاتے ہوئے

رابطہ منقطع کیا تو وہ سرعت سے اس کے قریب آئی۔

"تین دن کی بجائے پانچ دن انتظار کروانے کے بعد اب بھی اس نے کیا نیا بہانہ گھڑا ہے تم سے؟ ہوں؟"

بایاں ہاتھ اٹھا کر انگلیوں سے "تین اور پانچ" جتاتے ہوئے اس نے جواب طلبی کے سے انداز میں پوچھا تو اس فون کال کے سبب ذرا سی پریشان ہوئی گیتی کے لب بے ساختہ کھل اٹھے۔

"اچھا تو تمہیں یقین ہے کہ علی مصطفیٰ نے اب بھی کوئی بہانہ ہی گھڑا ہے؟ بھئی کیا پتا اس نے ہمیں سفیر احمد سے ملنے بلایا ہو؟"

ساری فکریں جھٹک کر جواباً اس نے بھرپور شرارت سے کہا تو پہلے سے تپی ہوئی ناز مزید چڑ گئی۔

"اب بس بھی کرو ہاں۔۔۔ تمہاری شکل بتاتی ہے کہ یہی بات ہے جو میں کہہ رہی ہوں۔ میں شرط لگا سکتی ہوں گیت اس نے اب بھی تمہیں ٹالا ہی ہے۔ بس فٹافٹ مجھے بھی وہ پوری تاویل سنا دو جو اس نے تمہارے سامنے رکھی ہے۔"

اس کے لہجے کی قطعیت پر اب کی بار گیتی بھی سنجیدہ ہوگئی۔ ریلنگ کی ٹیک چھوڑتے ہوئے وہ اندر کی جانب بڑھی اور ٹیرس میں کھلتا در تھام کر پلٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں یار اس نے تاویل تو رکھی ہے سامنے۔۔۔ پر وہ عقل میں آنے لائق ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ابھی سفیر احمد کسی بھی طور ملنے پر رضامند نہیں ہوتا کیونکہ وہ کچھ انتہائی ذاتی نوعیت کے مسائل سے دوچار ہے۔ اب اس نے مشورہ دیا ہے کہ پہلے میں اپنی اس فلم کے سکرپٹ و بقیہ کاسٹ کے حتمی چناؤ کے ساتھ ساتھ دیگر ضروری تیاریوں اور "خدا کے بھگت" کے آخری شیڈول کو بھی نمٹا لوں۔ تب تک وہ کسی نہ کسی طرح سفیر احمد کو بھی مجھ سے ملنے اور اس فلم میں کام کرنے پر راضی کر لے گا۔"

اطلاعاً بات مکمل کرتے ہوئے وہ اس کی رائے کی منتظر ہوئی تو اس کے "انتظار آ گیں" لہجے میں بسی یاسیت پر ناز کو بہت زیادہ ترس آیا۔

کون سوچ سکتا تھا کہ ہٹ کی پکی بھارتی "سپر اسٹار گائتری دیوی" کسی عام سے اور غیر معروف لڑکے کو اتنی اہمیت دے سکتی ہے۔ ناز بخوبی جانتی تھی کہ اس ضد کے پیچھے فقط اپنے دشمنوں کو یہ جتلانا مقصود تھا کہ جو وہ

سوچتی ہے کسی سے ڈرے بنا وہ بس وہی کرتی ہے۔

"اچھا۔۔۔پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

فوراً سے پیشتر لہجے کو ڈھالتی ہوئی وہ آہستگی سے چلتی اس کے سامنے آن رکی تو اس کے لہجے کے یکا یک بجھنے کا بھرپور ادراک رکھتے ہوئے گیت نے ٹیرس کا در چھوڑ کر بہت محبت سے اس کی کلائی پر ہاتھ جمایا۔

"حالات کی بدلی ہوئی ترتیب میں تم ہمہ وقت میری ڈھارس ہو ناز۔ میں کچھ بھی کہوں یا کچھ بھی کروں۔۔۔تمہارا مضبوط و سنگلاخ لہجہ ہی میری ہمت بندھاتا ہے۔یوں ہاری ہاری تم بار بار میرے سامنے ٹھہرو گی نا سہیلی۔۔۔تو میں اِس جنگ میں جیت نہیں پاؤں گی۔"

اس کی آنکھوں میں جھانک کر بڑے واشگاف سے کچھ اظہار کرتی ہوئی وہ موضوع سے یکسر ہٹ کر بولی تو ناز کا سر اپنے آپ ہی اثبات میں ہلتا چلا گیا۔وہ اسے یوں فکرمند نہیں دیکھ سکتی تھی۔اب ناز کو یوں خاموشی سے اقرار کرتے دیکھا تو وہ بھی فوراً اصلی موضوع پر پلٹ آئی۔

"اور میرا بھی یہی خیال ہے ناز کہ علی مصطفیٰ کو مزید وقت دیا جائے۔ یوں بھی میں کون سی ابھی بالکل فرصتوں میں ہوں کہ جو سفیر احمد کا آج کل میں ملنا از حد ضروری ہو۔ٹھیک ہے ہم سکرپٹ فائنل کرتے ہیں، باقی کاسٹ دیکھتے ہیں، لوکیشنز ہنٹ کرتے ہیں اور سب سے اہم یہ کہ "خدا کے بھگت" کو جلد از جلد تکمیل دیتے ہیں۔اس دوران میں گاہے گاہے علی مصطفیٰ سے بھی رابطہ میں رہوں گی۔ مجھے اس فلم کا ہیرو اسی دیس سے چاہیئے ناز۔۔۔اور مجھے اس فلم میں فقط سفیر احمد ہی چاہیئے۔ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے "سفیر احمد" اس فلم میں میرے مقابل لازمی پرفارم کرے گا۔"

مدھم آواز کے کہتے ہوئے اس نے دھیرے دھیرے بات مکمل کی تو اس کے لہجے کے پرسکون زیر و بم اور نرم نرم انداز و طور سے بندھی ناز کو اس پر بے شمار پیار آیا۔

"تم کتنی اچھی ہو گیت۔۔۔بالکل سچ۔صرف تم ہو جو ایسے کسی کو بھی حقیقتاً دیکھے ملے بنا ہی اس کی اتنی چاہ کر سکتی ہو۔کبھی کبھی میں سوچتی ہوں تم میں سونے جیسے خالص گن ہیں اور تم سے بے وجہ نفرت کرتے لوگوں کو اس کی خبر ہی نہیں۔تمہارے مخالفین کو پتا ہی نہیں کہ وہ کتنے خوبصورت دل کو یوں اذیت پہنچائے ہوئے ہیں۔ میرا دل

بہت زیادہ دکھتا ہے جب کوئی بھی تمہارے بارے میں منفی بات کرے یا تمہاری عزت نہ کرے۔تم سچ مچ عزت کیے جانے کے قابل لڑکی ہو۔"

بہت مدت بعد آج اس نے بھی کھل کر اس کے متعلق اپنی سوچوں کا اظہار کیا تو اس کے لبوں سے پھوٹتے اک ایک لفظ و حرف کے ساتھ گیتی کی آنکھوں میں بے پناہ ملال و رنج بستا چلا گیا۔اس کی ذہن و دل میں بھارتی قومی ٹی۔وی چینل "دوردرشن" پر اپنے متعلق استعمال ہونے والے تضحیک آمیز نعروں کی گونج بسنے لگی۔اسے یاد آتا چلا گیا کہ کیسے بظاہر بہت اپنے سے دکھائی دیتے لوگوں نے بھی اس کی پیٹھ میں بدلتے ہوئے رویہ جات سے اذیتوں بھرا کوئی تیز دھار نشتر چبھویا ہے۔فقط ایک پل کو پلکیں جھکاتی وہ سر اٹھا کر دوبارہ بولی تو اس کا آتشیں لہجہ عجب مضبوطیوں کا غماز و عکاس تھا۔

" دنیا سے عزت تو کیا کچھ بھی پانے کی چاہ نہ کرو۔یہ " کوثر" کے مالکوں کو بھی "نہروں" پر روک لے تو کہیں حق پرست "عیساؤں" کو سولی پہ ٹانگ دے۔یہ کسی کو کچھ دے سکے تو پھر "دنیا" کہلائے ہی نہیں۔ہاں بالکل۔۔۔صرف اپنا آپ سہارے چلتی یہ پوری دنیا مزاجاً یزید ہے۔اس دنیا کے بدلنے،مکرنے یا پھر جانے کا غم کبھی مت کرنا ناز۔۔۔تمہارا صبر رائیگاں نہیں جائے گا۔تم گائتری دیوی کی سہیلی ہو۔۔۔تم اس کی بہن ہو۔تمہیں سنگلاخ رہنا ہے۔۔۔تمہیں چٹان ہونا ہے۔یاد رکھنا ناز کہ کسی کے بھی بدلتے ہوئے رویوں کی کوئی پرواہ نہیں کرنی۔"اور اس کا شانہ ہلا ہلا کر عجب عجب سی کئی تلقینیں کرتی،اسے افتاں و حیراں چھوڑ کر وہ پلٹ بھی گئی تو اس کے لفظوں کی گونج میں آئی ناز نے خود کو مضبوط محسوس کرنے کے لیے بے ساختہ ٹیرس کے اسی در پر ہاتھ جمایا جسے کچھ دیر قبل گائتری دیوی نے تھام رکھا تھا۔

" کہاں سے ایسی ہمتیں کشید کرتی ہو گیت۔۔۔؟ کیسے اتنا پتھر ہوا جاتا ہے کہ کسی کے بدلنے کا کوئی رنج نہ رہے۔۔۔؟"

پیچھے اسے بڑے با اعتماد قدموں سے چل کر صوفے پر جا بیٹھتے دیکھتی وہ الم میں لپٹی سرگوشیاں کرنے لگی تو آس پاس سرسراتی ہواؤں نے بے تحاشا جھوم کر اس کی باتوں میں پنہاں درد کو بہت قریب سے ہو کر سنا تھا۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد سے مریم جہانگیر بلاناغہ ثومیہ کی عیادت و تیمارداری کی خاطر پاگل خانے آنے لگی۔ "زائشہ مریم" بن کر وہ گھنٹوں بیٹھی اس سے مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کیا کرتی۔ نمرہ اور راشدہ بیگم اسے یوں اس پر محبتیں، لگاوٹیں اور یورشیں لٹاتے دیکھتیں تو ممنون ہوئی جاتی تھیں۔ اور اگر کبھی وہ اس سے اس ممنونیت کا اظہار کر دیتیں تو وہ خفاسی ہو جایا کرتی۔

"میں نے اپنے پورے حواسوں میں کبھی اسے "دوست" کہا تھا یار۔ اب اسے اس "پاگل پن" کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میرا یقین کرو اگر اس کے پاس آپ سب گھر والوں میں سے کوئی نہیں آئے ناں۔۔۔ تو مریم لازمی اور ضرور آئے گی۔"

بھرپور قطعیت سے نمرہ کو کہتے ہوئے وہ اس سے آگے کوئی دلیل سننا گوارا نہیں کرتی تھی۔

جب کبھی ماحول و منظر بدلنے یا تفریح کی خاطر ثومیہ کو اس کے کمرے سے باہر لایا جاتا تو ہسپتال کی راہداریوں میں، مرکزی احاطے میں دھری سنگی نشستوں پر اور کبھی کبھی کئی زینوں پر بھی۔۔۔ وہ سایوں کی مانند اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ وہ اس سے بس وہی مخصوص سی گفتگو کیا کرتی تھی جس کی اسے روزانہ کی بنیادوں پر یہاں موجود تینوں ڈاکٹرز صبا اکبر گل، شبانہ اسلم اور ماہ نور سلیم سے ہدایات ملا کرتی تھیں۔ یہ بات چیت عموماً موسمی کیفیت، آس پاس مناظر یا کسی عام فہم کھیل کے متعلق ہوا کرتی تھی۔ کبھی اسے یہ ہدایات ملتیں کہ مختلف حیلوں بہانوں سے چھوٹے چھوٹے سوالات کی صورت میں اس سے پرندوں، جانوروں اور درختوں کے متعلق معلومات لی جائیں۔ ان سب عام و بے ضرر سے سوالات کا مقصد اس کی بچی ہوئی ذہنی استعداد کو جانچنا اور بڑھانا تھا۔ شروع شروع میں وہ بہت بے خیالی سے اس کی گفتگو سنا کرتی تھی۔ ساکت نظروں سے اسے تاکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں فقط یہی تاثر جمار ہتا تھا کہ گویا وہ بے سروپا و بے مقصد بول رہی ہے اور اسے اس کی باتوں کا کوئی ایک جزو بھی حقیقتاً سمجھ میں نہیں آ رہا۔ لیکن دو ہفتوں کے بعد یوں ہوا کہ اس کی باتوں میں اس کی دلچسپی بنتی چلی گئی۔ اب اس کی بے سروپا باتوں پر بھی اس کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔ دن بدن بڑے دھیان سے اس کی تمام تر گفتگو سنتے ہوئے وہ گویا نئے نئے جہانوں میں ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ وہ اس سے بہت زیادہ مانوس ہو چکی تھی۔۔۔ اس قدر مانوس کہ اگر کسی روز اسے آنے میں تاخیر ہو جاتی تو اپنے کمرے

میں کھڑکی کی جالیوں سے لپٹی وہ تادیر اس کی راہ تکا کرتی۔

تینوں ڈاکٹرز مریم کی اس محنت و کارکردگی سے بہت خوش تھیں۔ مریضوں کی کیفیات پر بھرپور معائنہ کے بعد ہفتہ وار رپورٹ مرتب کرنے والی ڈاکٹر "زارا رضوان" بھی اس کی یہاں آمد سے بہت مطمئن دکھائی دیتی تھیں۔اس کی آمد کے بعد سے ثومیہ کی حرکات و سکنات میں بتدریج لیکن واضح فرق محسوس ہونے لگا تھا۔اب وہ کسی سے بات کرتی تو بہت کم اٹکتی تھی۔اس کی زبان کی لکنت اور ذات کی جھجک کافی حد تک زائل ہو چکی تھی۔اس کے سر کا زخم بھی کافی حد تک مندمل ہو چکا تھا لہٰذا اب سر پر پٹیوں کے "خول" کی بجائے بس ایک سنگل پٹی دکھائی دیتی تھی۔جس کی اطراف سے اس کے کالے بال گولائی دار لہروں کی مانند نکل کر اس کی گردن کے گرد اور شانوں پر بکھرے رہتے۔

انہی گذرتے ہوئے بے مہار روز و شب میں ایک روز ڈاکٹر زارا رضوان خصوصی دورے پر اس سیکشن میں آئیں تو انہوں نے مریم اور نمرہ کو ایک ساتھ اپنے روم میں طلب کر لیا۔اس بلاوے کے متوقع مقصد سے متعلق باہم مختلف خیالات و خدشات کا اظہار کرتی وہ دونوں ان کے کمرے میں داخل ہوئیں تو انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھتی وہ دائیں دیوار میں موجود کشادہ و چوڑی کھڑکی کی جانب بڑھ گئیں۔

"مجھے لگتا ہے اب ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔کیونکہ ایسے کیسز میں تھوڑی سی بھی مزید دیر کر دینے کا مطلب بہت زیادہ دیر کر دینا ہو سکتا ہے۔"

انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتی پُراسرار سے لہجے میں کہتی ہوئی وہ کھڑکی سے پار کسی سبز منظر میں جھانکنے لگیں تو کسی قدر استعجاب سے پہلے ایک دوسرے کو اور پھر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتی وہ انہی کی جانب رخ موڑے ایک ایک نشست پر ٹک سی گئیں۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ ہم کچھ سمجھی نہیں ہیں ڈاکٹر۔۔۔"

یوں بیٹھتے ہی مریم نے ڈاکٹر زارا رضوان کو بڑے احترام و ادب سے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا جبکہ چھوٹی ہونے کے ناطے نمرہ نے بالکل خاموش رہ کر اسے سوال کا موقع دیا تھا۔اس کی آواز پر وہ دھیرے سے پلٹیں اور فقط ایک تولتی ہوئی نگاہ سے باری باری ان دونوں کی جانب دیکھا۔

"میں ثومیہ کی ریکوری کی بات کر رہی ہوں۔ہمیں اس پر بہت سوچ سمجھ کر ایک مخصوص نہج میں چلتے ہوئے خصوصی طریق سے محنت کرنی ہوگی۔"

وہ بولیں تو ان کی لہجے میں کوئی "نیا پن" تھا جسے سننے کی چاہ میں کوئی سوال کیے بنا وہ بس خاموشی سے ان کو تاکتی رہیں۔

"مجھے لگتا ہے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم "بینا بنت آدم" کو یہ احساس دلائیں کہ اس کے اندر کی اصلیت و حقیقت فقط "ثومیہ شاہجہاں" کی ذات ہے۔جسے اس نے ایک من گھڑت کردار میں بس کر کہیں گم کر دیا ہے۔

مزید یہاں تک کہتے ہوئے انہوں نے ایک ہنکارا ابھرا تھا کہ مریم جلدی سے بول پڑی۔

"ہم آپ کی بات سمجھ رہی ہیں ڈاکٹر۔۔۔لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ جو اپنا "نام" تسلیم کرنے کو تیار نہیں اسے اس کے "وجود" کا بھی ادراک کروایا جائے؟ وہ کسی ثومیہ شاہجہاں کو نہیں مانتی۔وہ پاگل پاگل سی لڑکی صرف "بینا بنت آدم" ہے۔"

بات مکمل کرتے ہوئے اس کا لہجہ آنسوؤں میں بھیگ سا گیا تو کھڑکی سے ہٹتے ہوئے ڈاکٹر زارا رضوان سیدھی ان تک چلی آئیں۔

"میں جانتی ہوں مریم کہ آپ سب اس کے لیے بہت دکھی ہیں۔لیکن ان جذبات میں آ کر بات کو بگڑنے نہیں دینا ہم نے۔آپ سب بہت محنت سے اسے یہاں تک لائی ہیں کہ وہ اب اپنے گرد کسی بھی اجنبی کو دیکھ کر بے وجہ "ری-ایکٹ" نہیں کرتی۔یوں کر کے سمجھیں آپ نے اس کی سمتوں پر باندھ لگایا ہے۔وگرنہ وہ سچ مچ پاگل ہو سکتی تھی۔ابھی بس جی کڑا کر کے ہمیں ذرا سا اور آگے بڑھنا ہوگا۔مجھے یقین ہے یوں کرنے سے ان شاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔"

بہت محبت سے اس کے دائیں شانے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ بناتے ہوئے انہوں نے ان کی محنت کو سراہا اور پھر پیار سے نمرہ کی تھوڑی کو چھوتے ہوئے یہاں سے بھی ہٹ کر واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھیں۔ان کی اسی لگاوٹ و لفاظی کا اثر تھا کہ ان دونوں نے فوراً سے پیشتر اپنی گھلتی ہوئی کیفیات کو مضبوطی میں ڈھال لیا۔

"جی ان شاء اللہ۔۔۔ایسا ہی ہوگا۔ہمیں بتائیں اب ہمیں کرنا کیا ہے؟؟"

انہوں نے ایک بار پھر سے سوالیہ نظریں ان پر گاڑ دیں تو وہ بہت حلاوت سے مسکرا دیں۔
" کچھ خاص نہیں ہے۔ بس وہی جو آپ گزشتہ کچھ ہفتوں سے کرتی آ رہی ہیں۔ اس سے عام سے موضوعات پر عام سی گفتگو کیا کرنی ہے۔۔۔ لیکن اس بار اس میں کچھ حقیقی لمحات کا ذِکر شامل کرنا ہے۔ یعنی ایسی باتیں کرنی ہیں جن میں وہ خود بھی کبھی آپ کے ساتھ شامل رہی ہو۔"
انہوں نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا تو ان دونوں کی آنکھوں میں شوق و حیرت کا ملا جلا عنصر پنپنے لگا۔ فقط ایک لمحے کو ٹھہر کر ان کے چہروں پر پھیلتا یہی دبا دبا سا جوش پڑھتے ہوئے وہ مزید بولیں۔
" ہمیں اسے کچھ ایسے مناظر کی تصویریں اور وڈیوز دکھانی ہوں گی جو اس نے بھی بہت بار دیکھ رکھے ہوں۔ جیسے اس کی یونیورسٹی یا گھر میں اس کا اپنا کمرہ، گلی محلے کی کوئی تصویر یا اس کے لیے کسی بھی مانوس شخص و فرد کا چہرہ۔ یعنی ہمیں اس کے لاشعور کو چھیڑنا ہوگا۔ اس کے زخم اب مندمل ہو چکے ہیں۔ اب اس کا ذہن پر زور دینا اتنا خطرناک نہیں ہوگا۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس طریقے سے اس کی یادداشت لوٹ آئے گی۔"
بات مکمل کرتے ہوئے انہوں نے رائے طلب کرنے کے سے انداز میں باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا تو بنا کسی کے توقف کے اس بار بھی مریم ہی بولی۔
" جی بہتر ہے۔ مجھے بھی لگتا ہے کہ اب میں بڑی سہولت سے اس سے یہ سب گفتگو کر سکوں گی۔ میرا بھی دل کہتا ہے کہ یہ طریقہ کارلازمی کام کرے گا اور ہمیں مطلوبہ نتائج حاصل ہو کر رہیں گے۔ ان شآءاللہ۔"
اس کی بات پر اسے بڑی جاندار سی اور بڑی حوصلہ افزا سی ایک مسکراہٹ سے نوازتی ہوئی وہ فوراً نمرہ سے مخاطب ہوئیں۔
" تو آپ کل سے گھر کے مختلف کونوں، گوشوں کی تصاویر لایا کریں گی۔ کوشش کیجیئے گا تصویری مقامات ایسے ہوں جہاں ثومیہ نے بہت سا وقت گذارا ہوا ہو یا اس جگہ سے اس کی بہت شاندار یادیں وابستہ ہوں۔ اوکے؟"
تلقین کرتے ہوئے آخرش انہوں نے سوالیہ طور پر "اوکے۔۔۔" کہا تو جواباً اس نے بہت فرمانبرداری سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔
" جی میں دھیان سے لے آؤں گی۔ اور مریم آپی آپ بھی اپنی یونیورسٹی، بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کی کچھ

تصویریں لائیے گا کیونکہ ثومیہ وہاں کا بہت زیادہ ذکر کیا کرتی تھی۔اس سب سے اس کی کئی حسین و دلکش یادیں وابستہ ہیں۔"

اوراس کی بات پر مریم فقط لبوں کو بھینچ کر رہ گئی تھی۔

اس نے اسے اب تک نہیں بتایا تھا کہ یونیورسٹی، بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے سے وابستہ ثومیہ کی اک ایک یاد کب سے آگ پکڑ چکی ہے۔ایک پل میں اس کی آنکھوں میں وہی یونیورسٹی کے آخری روز کا منظر گھوم گیا کہ جب سفیران سب سے لڑتا جھگڑتا ساری یادیں سلگا گیا تھا۔

بہت کھوئی کھوئی کیفیت میں نمرہ کے ساتھ ڈاکٹر زارارضوان کے سامنے سے اٹھ کر واپس ثومیہ کے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے وہ اندر ہی اندر بے شمار فکروں میں غلطاں ہوتی چلی گئی۔

رُتوں میں در آئے تغیر کے سبب منظروں پہ رنج اترے تو شہر بھر کی ہوائیں اور مزاج بدلنے لگے۔ یہ انہی دِنوں کا ذِکر ہے جب لاہور بھر کی طویل شاہرات پر جا بجا اڑتے درختوں کے خزاں رسیدہ پتے آتے جاتے راہگیروں کے پیروں سے لپٹ لپٹ کر اپنی باقی ماندہ سزاؤں کی مدت و دورانیہ پوچھا کرتے تھے۔ یہاں کی ہوائیں اور مزاج کیا بدلے۔۔۔عرصے سے یہاں قیام پذیر پردیسیوں نے بھی ہجرتی پرندوں کی مانند نقل مکانی کی ٹھان لی۔

یہ "سید ظفر علی نجمی" کے اسلام آباد چلے جانے سے دو روز بعد کا قصہ ہے کہ اپنے ہاسٹل والے کمرے کی کھڑکی میں چہرے پر بنجر ان تاثرات لیے کھڑا مصطفین شجاع ویران ویران سی نظروں سے تاحدِ نگاہ دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر طاری اس خالی پن سے عجب سی کوئی بے قراری بھی جھلک رہی تھی۔ یوں کہ گویا پختہ چھتوں اور اکھڑے ادھڑے پلستر والی ان دیواروں کو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ اور کیوں۔۔۔؟ کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہی یہ شہر چھوڑ کر کہیں بھی جانے والا تھا۔ ہاں بالکل۔۔۔وہ بہت جلدی کسی بھی "جگہ و مقام" کی بے پناہ محبت میں مبتلا ہو جانے والا شخص اس جگہ کو نظریں بھر بھر دیکھتے ہوئے "الوداع" کہہ رہا تھا۔ کتنے پاگل ہوتے ہیں وہ لوگ۔۔۔جو جگہوں کو بھی یوں "گلے مل" لیں۔ ایک بھاری سفری بیگ میں اس کا ضروری سامان اس سے کچھ فاصلے پر اس کی پشت کی جانب دھرا تھا جو کہ فقط کپڑے جوتے اور انتہائی اہم قسم کی چند دستاویزات و کتب پر مشتمل تھا۔ کمرے کا فرنیچر اور دیگر بھاری و غیر ضروری سامان کہ جو بھی وہ کسی "طویل مسافت" پر ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا اس نے اس ہاسٹل کے سامنے والی عمارت میں رہائش پذیر ایک غریب گھرانے کو تحفتاً پیش کر دیا تھا۔ اسی سامان میں اس کا موٹر سائیکل بھی شامل تھا۔

تادیر وہیں جم کر یہاں وہاں مختلف بام و در دیکھتا بالآخر وہ بہت شکستگی سے مڑا اور کھڑکی سے ہٹنے سے قبل نزدیکی دیوار پر بیرونی جانب آگے پیپل کے اس پیڑ پر بھی نگاہ ڈالی کہ جس کے پتوں سے ٹکراتی ہواؤں کے سبب ماحول میں گونجتی مدھر سرسراہٹیں سنتا وہ یہ سب نظارے کیا کرتا تھا۔

اور کچھ ہی دیر بعد کسرتی شانوں پر اپنا بھاری بیگ لٹکائے ہوئے وہ ہاسٹل کے زینے اتر رہا تھا۔ ہاسٹل کا

داخلی احاطہ گذرتے ہوئے اس نے چہرہ گھما گھما کر اپنی چاروں جانب واقع کمروں کی طویل قطاریں دیکھیں اور ایک لمبی راہداری عبور کرتا باہر سڑک پر آن رکا۔ ایک آٹو روک کر اس نے اندرون لاہور چلنے کا کہا اور اندر بیٹھا خاموشی سے اردگرد تیزی سے گذرتے ہوئے مناظر دیکھنے لگا۔ لبوں کو شدت سے بھینچتے ہوئے، پلکوں کو اٹھاتے گراتے اور کئی کئی بار میچتے ہوئے وہ اپنی بے قرار کیفیات کو تھپکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں سے اندرون لاہور کوئی زیادہ دور نہیں تھا لہٰذا سڑکوں پر کافی ہجوم ورش ہونے کے باوجود وہ بہت جلد "بھاٹی گیٹ" کے سامنے پہنچ گئے۔

"باؤ جی داتا صاحب کی طرف جانا ہے یا یہیں اترو گے؟ اندرون لاہور تو آ گیا ہے۔"

آٹو والے کی آواز پر وہ کسی قدر چونکتا ہوا اندرونی خلفشار سے باہر آیا تھا۔ ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے جواباً کہا۔

"یار اندر نیلی مسجد تک جانے دو۔ وہاں بس دو منٹ کے لیے رکنا ہے۔ چھوٹا سا ایک کام ہے۔ پھر مجھے لاری اڈا اتار دینا۔"

اس کا مغموم لہجہ اب بھی کسی خیال میں گم سا تھا۔ ڈرائیور نے بے وجہ مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا اور رکشہ اسٹارٹ کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا۔

"او آرام سے بھائی۔ گلیوں میں رش زیادہ ہوتا ہے۔ کسی کو لگ جائے گا۔"

بے ساختہ سامنے لگے ہینگر کو تھام کر مصطفین نے نصیحت کر دی تو ڈرائیور جو کہ عمر میں اس سے تھوڑا ہی بڑا ہو گا ہنستے ہوئے بولا۔

"باؤ جی تسی فکر نہ کرو۔ میری عمر گذر گئی انہی گلیوں میں۔ یہیں پاس ہی رہتا ہوں۔"

اور اس کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ چپ چاپ باہر آتے جاتے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ بھلا اسے اس بات میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ کہاں رہتا ہے یا عمر کدھر گذار دی؟ وہ تو اپنی تقدیر میں لکھی ہجرتیں بھگت رہا تھا۔ اسے کہیں ہمیشہ قیام والوں سے کیا لینا دینا؟

اور پھر اونچے چوباروں کی چھوٹی چھوٹی بالکونیاں اور پرانی اینٹوں سے بنی چھتوں کی بیرونی فصیلیں دیکھتا کچھ ہی دیر بعد وہ نیلی مسجد کے بالکل سامنے پہنچ چکا تھا۔

"وہ اس گلی میں جانے دو۔ وہاں بیکری سے تھوڑا پہلے روک دینا۔"

آٹو والے کو ایک بار پھر سے ہدایات جاری کرتے ہوئے وہ دور سے ہی ہمک ہمک کر باہر جھانکتا "خالہ کنیز" کا گھر دیکھنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ ہاں بالکل۔۔۔شہر چھوڑنے سے قبل وہ صرف ایک بار اس گھر اور یہاں کے بام و در کو سپردِ نگاہِ الوداع کرنے آیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اپنی مطلوبہ جگہ پر رکا وہ آٹو سے اترے بنا فقط سر باہر نکالتے ہوئے خالہ کنیز کے گھر کی دہلیز سے لے کر سامنے چوبارے کی بیرونی راہداری اور اس گھر کے اوپری آسمان میں اڑتے اکا دکا پرندوں کے غول تک کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ان سب سے بہت گہرا تعلق ہونے کے باوجود اندر جانے اور یہاں کے باسیوں سے ملنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہاں وہ اس جگہ سے ایک بار پھر سے نہیں بچھڑ سکتا تھا۔ کہ ابھی تو اس جگہ سے بچھڑن کے اس کے پہلے زخم نہیں بھرے تھے۔

اور یونہی چند لمحات کے لیے اس منظر کی "دید" میں محو و گم رہ کر جونہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے آٹو والے کو واپسی کے لیے کہا سامنے راہداری میں نمودار ہوتی ایمان راجپوت کو دیکھ کر بے طرح چونک اٹھا۔ ہاتھوں میں جھاڑن والا کپڑا تھامے ہوئے وہاں آتے ہی ادھر ادھر دیکھے بنا وہ لکڑی کے چھوٹے اور منقش ستونوں کی صفائی کرنے میں جت گئی تھی۔

"رکو رکو یار۔۔۔ایک منٹ بس۔"

تیزی سے اسے دوبارہ رکنے کا کہتے ہوئے وہ اتنا بے تاب ہوا کہ جست بھر کر آٹو سے باہر نکل آیا۔ ایک مدت بعد اس گلی میں قدم جماتے ہوئے اسے عجب سے کئی دلگیر محسوسات نے گھیر لیا تھا۔ اس کی موجودگی اور خود کو دیکھے جانے سے یکسر بے خبر ایمان بڑے مگن انداز میں پہلے ایک، پھر دوسرا اور اب تیسرا استون جھاڑ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔ ہاں وہ آسمان اور اس پر اڑتے ہوئے پرندوں سے بھی بے نیاز تھی۔ اس کے لبوں پر ایسا سکوت چھایا تھا کہ گویا صدیوں سے کبھی ہنسی یا بولی ہی نہ ہو۔

"میں نہ ہوں گی تو کیا ہوگا تیرا ایمانے۔۔۔؟ تو کسی کام کی نہیں ہے۔ بے وجہ ٹھٹھے لگاتی رہتی ہے۔ یہ نہیں کہ دو گھڑی کام میں ماں کا ہاتھ بھی بٹا دے۔ کمر دکھ گئی ہے اس جھاڑ پونچھ میں ہی میری۔"

مصطفین کو یاد آیا کہ خالہ کنیز کیسے اس سے یہ سب "جھاڑن پونچھن" کروانے کے لیے ہر روز کھپا کرتی

تھیں۔۔۔اور مجال ہے کہ اس نے کبھی ان کا دل رکھنے کے لیے بھی یہ سب کیا ہو۔ بلکہ وہ تو ان سے دوبدو ہو جایا کرتی تھی۔

"بس کریں امی۔۔۔کون کہتا ہے آپ کو کہ صرف مجھے سنانے بلکہ کوسنے کے لیے ہر روز صفائی میں جت جایا کریں؟ اس کرائے دار کو ملا کر کل چار جی ہیں ہم گھر میں۔۔۔اور ان میں سے بھی دو زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے ہیں۔ اب باقی دو یعنی ایک میں اور دوجی آپ کا کتنا کو بکھیڑا یا گند ہو سکتا ہے؟؟ نہ کیا کریں آپ بھی صفائی ستھرائی۔ کون کہتا ہے روز کریں؟؟"

اور اس کی جواب پر ماتھے پر ہاتھ مارتی خالہ کنیز بہت بے بس نظروں سے اس پل ایمان سے دبکے بیٹھے مصطفین کی طرف دیکھا کرتی تھیں۔

تب کی ایمان اور اب کی ایمان میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ تفاوت تھا۔ کہاں وہ بات بے بات تڑختی اکھڑتی لڑکی۔۔۔اور کہاں یہ سر جھکائے مصروفِ عمل ساکتی آنکھوں والی۔ حق ہاہ۔۔۔وقت لوگوں کو کیا سے کیا کر جاتا ہے وہ دیکھ رہا تھا۔

اور یونہی اپنے دھیان میں گم رہ کر ستونوں کو باری باری جھاڑتی ہوئی وہ یکا یک رکی اور چہرے پر الجھن کے تاثرات لیے پہلے جھک کر نیچے گھر کے صحن میں اور پھر باہر گلی میں بھی یہاں وہاں نظر دوڑانے لگی۔ شاید اسے خود کو مُسلسل دیکھے جانے کا ادراک ہو گیا تھا۔ اب اسے یوں چوکنا پایا تو مصطفین نے پہلے جلدی سے رخ بدلا اور پھر یونہی آٹو میں سوار ہو گیا۔

"چلو یار۔۔۔مجھے لاری اڈا اتار آؤ۔"

ہینگر پر اضطراری انداز میں ہاتھ مارتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو بڑھنے کے لیے کہا تو اس نے بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہے بنا رکشہ اسٹارٹ کر کے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے موڑنے لگا۔ یہیں بڑی احتیاط سے اس نے سیٹ پر تھوڑا جھکتے ہوئے دوبارہ اوپری منزل کی راہداری کی طرف دیکھا تو وہ جگہ اب اسے "خالی" ہی ملی۔ جھاڑن والا کپڑا وہیں ایک کھڑکی کی سل پر دھرا تھا لیکن ایمان راجپوت وہاں سے ہٹ چکی تھی۔۔۔اور بہت سا سُونا پن دل میں بسائے وہ بھی وہاں سے "ہٹ" آیا تھا۔

پھر "دومور یہ پل" کی طرف سے نکل کر "کشمیری گھاٹی" کے سامنے سے گذرتے ہوئے وہ لاری اڈا پہنچ گئے۔ یہ وہی سڑک ہے جو لاری اڈا اور لاہور ریلوے سٹیشن کے مابین رابطہ بناتی ہے۔ نیچے اتر کر کاندھے پر بھاری بیگ پہنتے ہوئے مصطفین نے اس ڈرائیور کو منہ مانگا کرایہ ادا کیا اور اس کے سلام کر کے چلے جانے کے بعد فٹ پاتھ پر ایک جانب آہستگی سے چلتا ہوا بس اسٹینڈ کی جانب بڑھنے لگا۔ پھر یوں ہوا کہ اک مخصوص خیال و کیفیت میں ڈھل کر تھوڑا چلنے کے بعد بہت یاسیت بھرے انداز میں ایک برقی کھمبے سے کمر ٹکا کر اس نے دائیں جانب رخ پھیرا اور دور بادشاہی مسجد و قلعہ کی بیرونی فصیلیں اور مینار یں تاکتے ہوئے من ہی من اندر کہیں بے شمار ہارنے لگا۔ گو کہ اس شہر کو چھوڑنے کے قصد سے دلی طور پر وہ از حد رنجیدہ تھا لیکن صرف "ظفر علی نجمی" صاحب سے ملنے کا فیض و ثمر تھا کہ کمال تر ضبط سے لپٹتے ہوئے اس کی آنکھیں اس بار نم نہیں تھیں۔ انہوں نے دھنوں کے ساتھ ساتھ اس کی ذات میں بے پناہ درد بھی بھرا تھا۔۔۔ ہاں سُروں سے شناسائی اسے راس آ گئی تھی۔ ساکت چہرے پر جامد تاثرات سجا کر خود کو پتھر کیے وہ درِ اندرون ہی کہیں دل و روح سے اٹھتے اک شور و بکا کو دبانے کی تگ و دو میں تھا۔ ہاں وہ پردہ ذہن پر بار بار کسی نقش کی مانند بنتے ابھرتے اور پھر مُسلسل ڈوبتے دو چہروں سے مفر پانے کی کاوشوں میں تھا۔ یہ چہرے۔۔۔ یہ نقش۔۔۔ اور بن بن کر ڈوبتے مٹتے۔۔۔ یہ سارے انگ و عکس۔۔۔ بالترتیب ثومیہ شاہجہاں اور سفیر احمد کے تھے۔ ہاں بالکل۔۔۔ خالہ کنیز کے گھر کے سوا اور بعد، اس سے اس شہر میں اور بھی کئی پیارے چھوٹ گئے تھے۔ اسے رہ رہ کر یونیورسٹی میں کبھی کبھی ثومیہ کا خود کو چوری چوری دیکھنا یاد آ رہا تھا۔ کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ وہ اسے بے خیالی میں تاکنے لگتی۔ کئی بار آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے سب کہہ کر۔۔۔ وہ گفتگوئیں لپیٹ لیا کرتی تھی۔ اور ایسا ہی عالم ادھر بھی تھا کہ بہت کم ہی سہی لیکن کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں۔۔۔ ایسا ہوا ضرور تھا کہ اسے کسی جگہ بے ساختگی میں ہنستے ہوئے دیکھ کر وہ بندھا بندھا سار کنے لگتا تھا۔

ابھی انہی سب منظروں کو سوچتے ہوئے اس نے بہت عقیدت سے آنکھیں بند کیں اور آس پاس سرسراتی ہواؤں کے رتھ پر ثومیہ کے نام اک پیغام دھر دیا۔

"میری آنکھوں کو تیری آنکھوں سے جوان کہی نسبتیں تھیں ناں۔۔۔ سب کی سب وہ کہیں "سرِ راہ" رہ گئی

ہیں۔تمہیں دیکھ دیکھ دل جو کبھی پاگلوں سا ہوتا تھا۔۔۔خاموش ہو گیا ہے۔دریائی کناروں سے بہت پیاسا لوٹ کر آیا ہوا شخص ہوں میں۔۔۔کہ یورشوں سے بے وجہ کترا گیا تھا میں۔"

اس کی سرگوشیوں میں بلا بلا کا کرب موجزن تھا۔آنکھیں کھول کر شانے سے ڈھلک چکا بیگ درست کرتا وہ پھر سے آگے بڑھنے لگا تھا۔اس کے قدموں میں وہی پہلے کئی سی شکستگی رپٹ رہی تھی۔اب اگلا خیال سفیر سے یونیورسٹی میں ہوئی آخری ملاقات سے متعلق تھا۔اسے یاد آیا کہ کس قدر تنفر سے اس نے اس کا گریبان جھٹکا تھا۔

"مجھے تمہاری شکل تو کیا تمہارے نام تک سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔میری دعا ہے میں آئندہ تمہیں کبھی نہ ملوں۔۔۔"اس روز سفیر کے بولے ہوئے یہ لفظ اس کے کانوں میں ابلے ہوئے سیسے کی مانند بہنے لگے۔اندر ہی اندر کئی طرح سے ٹوٹتا بھی یکا یک ہی وہ تیز تیز چلنے لگا۔

"تو بس اب جا رہا ہوں میں۔۔۔اور ہر روز یہ دعا کروں گا کہ تمہاری زندگی میں وہ مقام کبھی نہ آئے کہ میرے نام سے لپٹ کر کہیں رونا پڑے۔خدا کرے تم اگر ڈھونڈنے بھی نکلو۔۔۔تو مصطفین شجاع تمہیں کبھی نہ ملے۔"اس روز کے اپنے جوابی الفاظ و حروف کو یاد کرتے ہوئے اس کے پیروں میں گویا کوئی نئی سکت نئی توانائی بھر گئی تھی۔

"تمہیں اپنا یہ شہر مبارک ہو سفیر احمد۔۔۔اور جاؤ تمہیں ثومیہ کی سنگت بھی سونپ دی۔اس کہانی میں تم اپنی محبت جیت گئے ہو اور میں۔۔۔میں اپنی دوستی بھی ہار چلا ہوں۔"

اب کی بار اس کے ہونٹوں سے جاری یہ ذکر و ورد قصہ پارینہ ہو چکے اس"تعلق"پر اک نوحہ تھا۔

"تجھے یہ فخر ہو شاید کہ تو مجھ سے جیت گیا ہے۔۔۔اور میں ہوں کہ مجھے اپنی اس ہار پر غرور ہے۔"

اس کے سوگوار لبوں سے سسکیوں کی مانند پھوٹتے اس جملے میں بے شمار اذیت تھی۔۔۔اور جی جاں سے اس اذیت کو اپنے دل پر جھیلتے ہوئے وہ بے خبر تھا کہ قصہ اگر"حساس"لوگوں کے مابین ہو تو بچھڑن پر سود و زیاں اور ہار جیت کے سب حساب کھاتوں میں دونوں طرف فقط خسارے باقی رہتے ہیں۔

اسی دوران اپنے آپ میں ہی گم بے مہار چلتا وہ تب چونک کر رکا جب اس نے اپنے بالکل سامنے"لاہور جنرل بس اسٹینڈ"کے جگمگاتے ہوئے حروف دیکھے۔فقط ایک پل کو ٹھہر کر سارے جذبے اور خیالات جھٹکتا وہ

لاری اڈا میں داخل ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھے بنا بسوں کی ایک طویل قطار میں وہ پہلی دستیاب بس میں سوار ہونے لگا تو کلکیٹر نے اسے دروازے پر ہی روک کر کرایہ طلب کیا۔ بنا کسی حیل وحجت کے اس نے کرایہ کی رقم پوچھی اور ادا کرتے ہوئے ٹکٹ تھام کر بس میں سوار ہو گیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد اس لگژری بس کی آرام دہ نشست پر شیشے کی جانب بیٹھا وہ اس شہر کے ہر گزرتے منظر پر الوداعی نگاہیں ڈال رہا تھا۔ کسی انجان منزل کو رواں دواں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے جانا کدھر ہے؟

زندگی میں جب کبھی منزلیں طے شدہ نہیں ہوں تو ان کے متعلق فیصلہ راستوں پر چھوڑ دینا چاہئیے۔ تقدیر میں جہاں کہیں منزلیں لکھی ہوں گی۔۔۔ یہ راستے آپ کو اپنے آپ وہیں لیتے ہوئے جائیں گے۔

اور اس نے بھی یہی کیا تھا کہ منزلوں کا انتخاب راستوں کے حوالے کرتے ہوئے منظروں سے آنکھیں موند لی تھیں۔

اس نے کسی سے کہا تھا کہ حالات بتاتے ہیں کہ میں بھی اس شہر سے ہجرت کرنے والا ہوں۔۔۔ اور یہ ہجرت اس نے کر لی تھی۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد سے سفیر نے اپنا آپ ایک نئے سرے سے تشکیل دے لیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اپنی ذات میں در آئی اس بے پناہ سی چپ کو اسے فقط اپنی تنہائیوں میں جھیلنا ہو گا۔ اس کی بدولت وہ خود سے وابستگان کو رنج نہیں پہنچا سکتا تھا۔ تو یوں ہوا کہ سود و زیاں کے کل حساب کھاتوں میں اپنے تئیں فقط خسارے کمایا ہوا وہ شخص پھر کبھی کبھی ہنسنے بھی لگا۔ اپنے گرد بنایا ہوا سختی کا خول اس نے بتدریج نرمی میں ڈھال لیا تھا۔ اب وہ دفتر سے واپسی پر اپنے والدین ذکیہ خاتون اور ڈاکٹر منصور عالم کے ساتھ بہت سارا وقت گذارا کرتا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھ کر چائے کی گرم چسکیاں بھرتے ہوئے وہ انہیں دن بھر کی روداد سنایا کرتا تو کبھی ڈنر کرتے ہوئے ان سے ان کی مصروفیات کے احوال پوچھا کرتا تھا۔ گھر کے ساتھ ساتھ اس نے دفتر میں بھی اپنا طرز عمل تبدیل کیا۔ اب وہ کہیں سے گذرتا تو آس پاس موجود کولیگز سے ایک دو گھڑی رک کر رسمی علیک سلیک کیا کرتا تھا۔ ایسے کسی عالم میں اس کے ہونٹوں پر کبھی مدھم سی مسکان جاگ اٹھتی تو اس کے گلال چہرے کی یکا یک بڑھتی شفافیت پر وہ پورا

عالم ہی فدا ہونے لگتا۔اس کا رویہ بدلا تو لوگ اس کے قریب ہونے لگے۔اگر کوئی کسی کام کے حوالے سے اس سے مدد طلب کرتا تو وہ خوشدلی وخندہ پیشانی سے وہ کام کر دیا کرتا تھا۔سب لوگ اس کی شخصیت میں در آئے ایسے مثبت بدلاؤ پر شروع شروع میں حیران ہوئے، پھر خوش دکھائی دیئے اور اب وہ ان کی عادت بن چکا تھا۔ ہاں بالکل۔۔۔اس نے لوگوں کی عادت بن جانا سیکھ لیا تھا کیوں......؟ کیونکہ وہ کسی کی محبت نہیں بن سکا تھا۔ اس کی شخصیت میں چھا جانے کی قدرتی خاصیت تھی اور اپنے دفتری معمولات میں وہ اپنی اس صلاحیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا کرتا تھا۔کارکردگی کی دوڑ میں وہ بہت تیزی سے نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔کئی بار اس کا باس پرانے ملازمین کی نسبت اس کی بات یا صلاح ومشورہ کو زیادہ اہمیت دیتا تو اس سے سینئیر ایک دو لوگ جل جل جاتے۔ انہیں سفیر احمد سخت ناپسند تھا۔۔۔اور کیوں؟ کیونکہ وہ بہت تیزی سے اوپر آ رہا تھا اور اس کی وجہ سے انہیں اپنا مقام پھسلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔انہیں اس سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور وہ اس کے کیے گئے ہر بہترین کام میں بھی بے وجہ کیڑے تلاشنے کی تگ ودو میں رہتے تھے۔یہ الگ بات تھی کہ اس میں بھی جب کبھی کانفرنس ہال میں گول میز کے گرد سب کے مابین کھڑے ہو کر وہ متعلقہ فائل ہاتھ میں تھامے ہوئے دلکش انداز وبیان سے اپنے مقصود کی وضاحت کرتا تو ان سب کو منہ کی کھانی پڑتی تھی۔اس کے دلائل ونکات ان کی نسبت ہمیشہ مضبوط ہوا کرتے تھے۔اور اپنی ذات وصلاحیت پر اسی بھروسہ کا اثر تھا کہ اپنے کسی بھی سینئیر کو وہ چاپلوسی کے سے انداز میں بے جا احترامات سے نہیں نوازتا تھا۔اسی حوالے سے اس سے بالکل اگلی نشست پر بیٹھنے والا لڑکا "شاہ ویز" جو کہ خود بھی بڑا باصلاحیت تھا اور اس کی سفیر سے کافی دوستی بھی تھی، اس نے ایک روز اس سے کھل کر سوال کیا کرتا۔

"یار! یہ منصور صاحب اور لیاقت صاحب کو تم سے اصلی خار کیا ہے؟ کیوں بات بے بات تمہاری تیار کردہ فائلز پر اعتراضات اٹھاتے ہیں؟؟ اور جہاں باقی سب سے بڑا ہنس بول رہے ہوتے ہیں وہیں تم سے اتنا کھنچے کھنچے کیوں رہتے ہیں؟"

اور اس کی الجھن آمیز آواز سن کر بڑے دھیان سے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف عمل وہ شان بے نیازی سے بولا تھا۔

"سو باتوں کی ایک ہی بات کہ میں کسی کی عزت ہی کر سکتا ہوں۔۔۔خوشامد یا چاپلوسی نہیں۔اب جسے جو

پسند ہے۔۔۔وہ اسی لحاظ سے میرے قریب یا دور رہتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کام سے نگاہ تک نہیں اٹھائی تھی۔جواباً اپنے سامنے کھلی فائل پرے کھسکاتا ہوا شاہ ویز گویا سارا کام دھندہ چھوڑ چھاڑ کر اس کی جانب مڑا تھا۔

"لیکن اس دفتر میں ان سے بنا کر رکھنے میں ہی عافیت ہے یار۔وہ دونوں بڑی شخصیات ہیں۔تھوڑی بہت ان کی بھی مان کر چلا کرو۔یوں غیر محسوس انداز میں ان سے دوبدو ہو کر تم زیادہ دیر یہاں ٹک نہیں پاؤ گے۔"

اب کی بار قدرے مدھم آواز میں اس نے انتہائی خلوص سے کہا تو دلکشی سے اسے دیکھتا سفیر بڑی مدت بعد کھل کر مسکرایا۔پھر کچھ کہنے سے قبل لیپ ٹاپ بند کرتا وہ اٹھا اور کرسی کی پشت پر لٹکا کوٹ اٹھا کر پہنتے ہوئے بولا۔

"بڑی شخصیات کے رعب میں آ کر کچھ لوگ بات بے بات ان کی بے جا حمایت کرنے لگتے ہیں۔ایسا عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جن کی کوئی ذاتی فکر نہیں ہوتی۔۔۔اپنا خیال نہیں ہوتا۔وگرنہ اپنی بات پختہ و اٹل ہو تو کسی کے کھوکھلے لفظوں پر داد دینے کا دل نہیں کرتا۔"

قطعی لہجے میں کہہ کر میز پر دھرا اپنا موبائل، بٹوہ، اور چابیوں کا گچھا اٹھاتا اب وہ گھر واپسی کے لیے بالکل تیار تھا۔

"باقی سب کی طرح تم میری بھی سمجھ سے باہر ہو بھائی۔جاؤ شاباش۔"

اور اس کے بے نیازانہ انداز و ادا پر باقاعدہ ہاتھ باندھ کر شاہ ویز نے اسے جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

انہی لگے بندھے شب و روز کے تحت اس کی زندگی ایک مخصوص سمت و ڈگر میں رواں ہو چکی تھی کہ جس میں اس کی تنہائی ایک "خاص پہلو" سے اذیت و کرب سے لپٹتے ہوئے گذرتی اور کسی کے سامنے وہ انتہائی مضبوط، متوازن اور پرسکون رہا کرتا تھا۔اسے یوں بظاہر "سب ٹھیک ہے۔۔۔" کے سے انداز میں دھنا دھن وقت گذارتے دیکھ کر ذکیہ خاتون اکثر خاموش رہ کر بغور تاکنے لگتی تھیں۔انہیں اس کی مسکراہٹ بڑی مغموم اور کبھی کبھی کی ہنسی بہت کھوکھلی لگا کرتی تھی۔وہ مسکراتا یا ہنستا تھا تو کہیں نہ کہیں اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگتی تھی۔ایک شام اس کی دفتر سے آمد سے قبل انہوں نے ڈاکٹر منصور عالم سے اپنے اس خیال کا اظہار یوں کیا تھا۔

"منصور مجھے لگتا ہے کہ سفیر صرف ہماری خاطر یعنی فقط ہمارے سامنے دو گھڑی کے لیے ہنستا مسکراتا ہے۔ ورنہ اس کا دل نہیں کرتا ہنسنے کو۔ کبھی غور کیا ہے آپ نے کہ وہ ایسے نہیں ہنستا تھا پہلے جیسے وہ اب ہنستا ہے؟ نہ ہنسنے جیسی ہنسی۔۔۔ کھوکھلی ہنسی۔۔۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے اس کی مسکراہٹوں، کھلکھلاہٹوں پر یقین نہیں ہوتا۔ اور یقین کروں بھی کیسے؟؟ وہ اب۔۔۔ وہ ہے ہی نہیں۔ کوئی اور ہی ہے۔"

بڑے دھیان سے ان کی بات سن کر ایک مبہم ہنکارا بھرتے ہوئے وہ فقط یہی کہہ سکے تھے۔

"بات یوں ہے بیگم جان کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کی شخصیت بدلتی جاتی ہے۔ اور انداز و اطوار یا دیگر رویہ اور برتاؤ میں بھی لازمی فرق آتا ہے۔ میرے خیال سے تو آپ کا یہ مشاہدہ ایک ماں کی "مامتا" ہے اور بس۔ وگرنہ وہ بدل بھی گیا ہے تو مثبت ہے۔ کسی بات کو سر پر سوار کر کے بدلا ہوتا تو یقیناً منفی ہو سکتا تھا۔ جو کہ وہ نہیں ہے۔ اب اس حوالے سے آپ بے وجہ فکر کرنا چھوڑ دیں۔ یا نہیں تو آج جب وہ آئے آپ اس سے کھل کر بات کر لیجئیے گا۔ من ہلکا ہو جائے گا۔"

اور سکھ و شانتی سے بھرپور ان کے پر اثر لہجے پر تفہیمی انداز میں سر ہلاتی وہ چپ بیٹھ رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ گھر پہنچا تو چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ذکیہ خاتون سب کے لیے چائے بنانے چلی گئیں اور وہ وہیں نشست گاہ کے صوفے پر بیٹھا اپنے والد سے گپ شپ کرنے لگا۔ اور یہ اپنی شریکِ حیات کی فکروں یا باتوں کا اثر تھا کہ فقط چند رسمی باتوں کے بعد، ایک مخصوص حوالے سے ساری مصلحت و خاموشی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، انہوں نے آج اس سے براہ راست سوال کرنے کا قصد کیا۔

"یار ایک بات تو بتاؤ۔۔۔"

ان کے تمہیدی لہجے پر کچھ کہتا کہتا رک کر وہ ہمہ تن گوش ہوا تھا۔

"جی بابا۔۔۔؟" اس کا انداز بے حد مودب تھا۔

"تم یہ جو بھی تم ہنستے بولتے ہو ہمارے ساتھ اتنا مصنوعی سا کیوں لگتا ہے؟ ایسا کیوں لگتا کہ تم دل سے نہیں کرتے؟"

اس کی چمکدار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے انہوں نے پر یقین لہجے میں کہا تو فقط ایک پل کو ان کا سوال سمجھتے

ہوئے اس کی آنکھوں کی جوت بتدریج ماند پڑتی گئی۔اس کا چہرہ یوں بجھا کہ گویا کھلا کھلا کوئی سرخ گلاب یکا یک مرجھا گیا ہو۔

"اتنا تو ہنستا ہوں بابا۔اور کتنا ہنسوں بھلا؟" نظریں جھکائے وہ گویا اپنے آپ سے ہی مخاطب ہوا تھا۔

"ادھر دیکھو۔۔۔میری طرف۔"

ان کی نرم آواز پر اس نے آہستگی سے سر اٹھایا تھا۔

"تم اب تک اپنے دوستوں کو بھول نہیں سکے ناں؟ مجھے صرف سچ بتانا یار۔آج میں بس یہی سننا چاہتا ہوں۔"

ان کی اگلی بات پر فقط ایک پل کو اس نے آنکھیں موند لیں اور اگلے ہی لمحے بہت مضبوطی سے گویا اپنا اندرون جھٹکتے ہوئے بولا۔

"میں سب بھول چکا ہوں بابا۔ان کی اپنی زندگی تھی۔اپنی خواہش کے مطابق انہوں نے رشتوں کا انتخاب کیا۔مجھے یقین ہے وہ دونوں آپس میں بہت خوش ہوں گے۔"

پھر قریب پڑا اپنا لیپ ٹاپ والا اٹھا کر اس نے بے وجہ سے گود ہی میں رکھا اور زپ کھولنے لگا۔یوں کر کے شاید وہ اس ضمن و مدیا حوالے میں خود کو انتہائی بے پرواہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

"تو کیا اب تم ثومیہ سے محبت نہیں کرتے؟"

اس کے مفاہمتی اور متوازن انداز و بیاں کا اثر تھا کہ وہ بھی سبھی کچھ آج ہی پوچھ لینا چاہتے تھے۔ان کے سوال پر لیپ ٹاپ نکالتے اس کے ہاتھ ایک لحظے کو رک گئے تھے۔

" کئی لوگوں سے پیار ختم نہیں ہوتا بابا جان۔بس ہم ان پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔"

بڑے مصروف انداز میں کہتا وہ جیسے جلد از جلد اس "سوال و امتحان" کو پار کر لینا چاہتا تھا۔اب کی بار ڈاکٹر منصور عالم نے اسے بہت گہری و بھرپور نگاہوں کے حصار میں لیا اور اس کی نفسیات کا کامل ادراک رکھتے ہوئے بڑے محتاط انداز میں اگلا سوال کیا۔

"تو کیا تم انہیں معاف کرنے ظرف رکھتے ہو؟ اگر کبھی وہ تمہارے سامنے آ جائیں تو۔۔؟"

ان کی بات پر اس نے لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"میں انہیں معاف کر چکا ہوں بابا۔ بھلا میں کوئی بھی بات "صرف اپنے" دل میں رکھ کر کیا کرتا۔۔۔؟"

اس کا لہجہ عجب سونے پن کا غماز تھا۔ عشق سے تائب ہو چکا لہجہ......

"تو بتاؤ ناں۔۔۔ کہ اگر کبھی وہ تم سے دوبارہ ملنا چاہیں۔۔۔ تو کیا تم مل لو گے۔۔۔؟"

انہوں نے اس کا اندرون جانچنے کی خاطر آخری۔۔۔ اور انتہائی اہم سوال داغا تھا اور اس بار وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے بلا کی بے بس نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے گود میں دھرا لیپ ٹاپ پکڑتا وہ سرعت سے اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔

"معاف کر دینے کا مطلب دوبارہ بے وقوف بننا ہرگز نہیں ہوتا بابا۔"

آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی جل اٹھا تھا گویا۔ اور جواباً ان کے کچھ بھی بولنے سے قبل مزید یہ کہتا ہوا وہ اوپری منزل کو لے جاتے زینوں کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

"اینڈ پلیز ایکسکیوز می۔۔۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آج چائے پینے کا من نہیں ہے۔"

چائے سے انکار کرتے ہوئے اس کا لہجہ "کافیوں" سا تلخ تھا۔

پیچھے ٹکر ٹکر اس کی پشت کو تاکتے وہ ایک طویل ہنکارا بھر کر کوئی ایسا ٹھوس بہانہ سوچنے لگے جو کہ اب انہیں اس کی غیر موجودگی کے ضمن میں عذر کے طور پر اپنی "بیگم جان" کے سامنے رکھنا تھا۔

ادھر ایک ایک زینہ چڑھتے ہوئے بڑی اذیتوں میں رہ رہ کر وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور دروازے کو پاؤں کی ٹھوکر سے بند کرتے ہوئے جا کر بیڈ کی الٹی جانب ٹک گیا۔ ہاتھوں میں کسی کتاب کی مانند دبوچا ہوا لیپ ٹاپ اس نے بیگ سمیت بیڈ کے عین وسط میں پھینکا تھا جو گدے کے "سپرنگز" کی بدولت قدرے اچھل کر رہ گیا۔

اب دونوں ہاتھوں میں سر تھامے فقط ایک ساعت کے لیے وہ یہاں بیٹھا اور پھر اسی اضطراب سے اٹھ کر تیز تیز چلتا ہوا ٹیرس میں نکل آیا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے یوں گلا مسلا گویا سانس لینے میں مشکل درپیش ہو۔ ہاں بالکل۔۔۔ ثومیہ شاہجہاں اور مصطفین شجاع کے ذکر سے کیا۔۔۔ خیال سے بھی اس کا سانس رکنے لگتا تھا۔ اپنے والدین کی تسلی، تشفی یا دلاسوں کی خاطر وہ کچھ بھی کہتا۔۔۔ لیکن اسے ان دونوں سے نفرت تھی

تو بس نفرت ہی تھی۔وہ انہیں معاف نہیں کر سکتا تھا۔۔۔تو کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس حوالے سے اس کے اندر جو کچھ بھی پلتا، پنپتا تھا اس سب سے صرف وہ اور فقط وہ ہی واقف تھا۔کوئی دوسرا تو اس کی کیفیات میں شامل تھا ہی نہیں۔

یہ پہلو اپنے آپ میں انتہائی اہم ہے کہ جہاں کہیں بھی۔۔۔جو بھی اذیت آپ جھیل رہے ہوں۔۔۔وہ صرف آپ ہی جھیل رہے ہوتے ہیں۔یہ طے ہے کہ آس پاس سے گذرتے ہوئے لوگ کسی بھی مقام پر آپ کی حقیقی حالت کا حقیقی ادراک نہیں رکھتے۔اور یہ بھی بجا وحقیقت ہے کہ صرف آس پاس سے گذرتے ہوئے لوگ ہی کیا۔۔۔آپ کے ساتھ بسنے والے بھی آپ کی اندرونی کیفیات سے مکمل طور پر آگاہ وروشناس نہیں ہوتے۔ اوپر خدا کی ذات ہوتی ہے اور نیچے تنہا آپ۔یہ تسلیاں، دلاسے اور لگاوٹوں کی سب باتیں۔۔۔سب کا سب بے معنی ہے۔جب ذات ہی خالی ہو جائے تو ان سب باتوں سے کوئی بات کسی طور نہیں بنتی۔

اس پل اپنے کمرے کے ٹیرس میں ریلنگ تھام کر دور کہیں خلا تاکتے ہوئے سفیر احمد کی جگنوؤں سی آنکھیں۔۔۔سارے آسمانوں پر عجب بجھی بجھی سی راکھ چھڑکنے لگی تھیں۔

"کاش ثومیہ۔۔۔کاش۔۔۔کاش کہ میں نے تم سے کبھی محبت نہ کی ہوتی۔کاش کہ میں تم سے ملتا ہی نہیں۔" جذباتیت میں گھل گھل کر کئی یورشوں کا حامل اس کا لہجہ بالآخر بھیگنے لگا تھا۔

"اس دل میں تو کیا تم کو۔۔۔میں نے ذات میں رکھا تھا۔اور ذات ہی کیا اب تم۔۔۔دل میں بھی نہیں ہو کہیں۔" اپنے سینہ ودل پر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مدھم مدھم دستکیں دیتا وہ گویا خودی کو اس کے "نہ ہونے" کا باور کروا رہا تھا۔محبت سے یکسر انکاری وہ شخص۔۔۔محبت کے لیے ہی۔۔۔ذات ودل تو کیا۔۔۔روح تک سے ادھڑ رہا تھا۔

محبتوں کا یہی المیہ ہے کہ۔۔۔آنکھیں جگنو جگنو ہو کر آخر کو بجھنے لگتی ہیں۔لہجے جوش وجذبہ میں بھی کہیں جا کر بھیگ ہی جاتے ہیں۔اس دل میں جھیلیں کر کر کے۔۔۔کوئی پار سمندر رہتا ہے۔جو ذات کہیں سے چھلنی ہو۔۔۔ تب "ذات بدر" کوئی ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

اگلے آنے والے ہر روز میں مریم اور نمرہ کی کوششوں اور تگ و دو کی نئی نئی سمتیں متعین ہوتی رہیں۔ گو کہ پہلی بار کی ناکامی کے بعد بھی مریم نے بارہا سفیر اور مصطفین سے رابطہ کر کے انہیں ثومیہ کی موجودہ حالت کے متعلق آگاہ کرنا چاہا تھا لیکن ان سے رابطے کی ہر نئی کوشش میں بھی وہ ہمیشہ ناکام ہی رہی تھی۔ یقیناً وہ دونوں اپنے نمبرز تبدیل کر چکے تھے۔ اور یہ تو صد شکر کہ فقط ایک روز کے سرسری سے ایک ذکر کے سوا نمرہ نے کبھی اس سے یونیورسٹی کے "باقی دوستوں" کے بارے میں زیادہ سوال یا جرح نہیں کی تھی ورنہ اسے کوئی بہانہ گھڑنا مشکل ہو جاتا۔ اس نے بھی سفیر یا مصطفین کا نام لیے بنا اسے مجموعی طور پر یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ وہ باقی سب "فیلوز" کو بھی اس کے بیمار ہونے کے بارے میں بتا چکی ہے اور وہ سب اس کے لیے بہت فکر مند ہیں۔ ادھر نمرہ نے بھی چاہنے کے باوجود کبھی سفیر کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کہیں نہ کہیں اس سارے عذاب میں کچھ نہ کچھ حصہ اس کا بھی ضرور ہے۔ نہ وہ بنا اجازت ان کے گھر آتا، نہ بابا اتنا غصہ ہوتے اور نہ ہی اتنی جلدی فواد کے رشتے کی دوبارہ بات چھڑتی کہ جس سے چڑ کر ثومیہ بابا سے دوبدو ہوگئی تھی اور جواباً بابا کی طرف سے ملا سفیر کے نام کا طعنہ سن کر چھت سے کودنے کے لیے بھاگی تھی۔۔۔ الغرض دل ہی دل اندر سب کڑیاں آپس میں ملائے ہوئے۔۔۔ وہ بس خاموش تھی۔

راشدہ بیگم کو اب نمرہ اپنے ساتھ یہاں ہسپتال نہیں لایا کرتی تھی کیونکہ روز آنے جانے کی تھکاوٹ سے اور یہاں اس کی حالت پر کڑھ کڑھ کر وہ بذات خود بیمار پڑ جاتی تھیں۔ وہ اب ہفتے میں صرف دو چکر لگایا کرتی تھیں۔ مریم کی روز آمد و موجودگی کے سبب ہی انہوں نے بھی نمرہ کے اس فیصلے پر زیادہ حیل و حجت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کے ہونے سے ان کی فکر زائل ہوئی رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر انہیں سچ مچ تسلی مل جاتی تھی اور وہ اس کی ثومیہ سے بے پناہ لگاوٹ و محبت سے دلی طور پر مطمئن بھی تھیں۔

ادھر ثومیہ کی صحت یابی کے ضمن و مد میں وقتاً فوقتاً ڈاکٹرز سے ملتی ہوئی ہدایات پر وہ دونوں بخوبی عمل کر رہی تھیں اور بڑی تندہی سے ان کاوشوں میں تھیں کہ کسی طور اس پاگل پاگل دکھتی، ڈر ڈر کر بولتی "بینا بنت آدم" میں سے وہی برجستہ لہجوں کی مالکہ "ثومیہ شاہجہاں" کو واپس لا سکیں۔ لیکن الجھی الجھی عجب سے کسی رنج سے لپٹی "بینا بنت آدم" تھی کہ ثومیہ شاہجہاں کے حصارِ ذات سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ وہ اس میں یوں بس چکی تھی گویا

یہ۔۔۔وہی ہو۔

ڈاکٹر زارا رضوان کی خصوصی ہدایت کے عین مطابق پہلے مرحلے میں وہ اس کے سامنے آپس میں وہی گفتگو کیا کرتی تھیں جس میں کبھی ماضی میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک یا شامل رہی تھی۔ دورانِ گفتگو کبھی اپنے کمرے میں بیڈ پہ بیٹھے ہوئے، کبھی برآمدے کی خارجی سیڑھیوں پہ صحن کی کسی روش پر پاؤں دھر کر، اور کبھی صحن کے اونچے درختوں تلے دھری ایک سنگی نشست پر بیٹھے ہوئے وہ چہرے پر گھمبیر تاثرات لیے چپ چاپ ان کی شکلیں دیکھا کرتی تھی۔ جب کبھی کسی بات پر زور دیتے ہوئے وہ خصوصی طور پر اسے گہری نظروں سے دیکھتیں تو اس کے چہرے پر کئی طرح کی الجھنیں نمودار ہونے لگتی تھیں۔ یوں گویا اسے ان کی بات سے کچھ یاد آ رہا ہو اور۔۔۔وہ پھر سے اس یاد کو بھول بھی رہی ہو۔ یہ سارے سوانگ رچ رچ کر جب کبھی وہ اس کے پاس سے اٹھتی ہوئی کہیں چھپ کر خاموشی سے اس کا مشاہدہ کیا کرتیں تو ان کی باتوں کے اثر میں آئی وہ تادیر برآمدے میں اونچے اونچے ستونوں کے مابین کسی آسیب کی مانند یہاں وہاں چکراتی گویا اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی۔ اس دوران اس کے دن بدن کمزور پڑتے چہرے، ڈھل چکی رنگت۔۔۔اور اس کی حقیقی عمر کا آپس میں صدیوں کا تفاوت لگتا تھا۔ ہاں اس کے چہرے پر رقم تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں بھی گویا صدیوں کی مسافت طے کر کے وہ کہیں اور سے چلتی ہوئی اس دور میں آن رکی ہے جو کہ اس کے مزاج سے کسی طور نہیں ملتا۔ اور اسے یوں اپنے آپ میں گم سم، کھوئے کھوئے اور بولائے بوکھلائے ہوئے پھرتے دیکھتی مریم اکثر وہی جملہ زیرِ لب دہرایا کرتی تھی جو اس نے اس کے لیے ڈاکٹر شبانہ اسلم کے منہ سے سنا تھا۔

"ثومیہ شاہجہاں۔۔۔سہمی ہوئی سی اک ہراساں لڑکی۔۔۔جسے کسی سے کچھ نہیں کہنا۔"

اور یہ بالکل حقیقت تھی کہ وہ ہمہ وقت سہمی ہوئی سی رہتی تھی۔ ایک روز اس کی حالت قدرے متوازن دیکھ کر مریم نے بہت محتاط لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

"بیٹا۔۔۔آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر کیوں نہیں چلتیں؟ مجھے یقین ہے آپ اچھا محسوس کریں گی۔"

اور اسی پل اس کے ہر یقین کو تہس نہس کرتی وہ گویا بدک کر بولی تھی۔

"نہیں نہیں۔۔۔میں یہیں ٹھیک ہوں۔ وہ اوپر میرا کمرہ۔۔۔میرا گھر ہے تو سہی۔"

اور اس کی آنکھوں میں یکا یک لہراتے خوف کے سائے پڑھتی مریم بہت متاسف نظروں سے پہلے اسے اور پھر ساتھ بیٹھی نمرہ کو دیکھ کر رہ گئی۔ وہ ایک پل میں یوں بیگانی ہوگئی تھی گویا ان سے چند روز کی یہ تھوڑی بہت جان پہچان بھی نہ ہو۔ حیرت، وحشت، اجنبیت اور خوف وہراس کے انہی سب ملے جلے عناصر وعوامل نے اس کا حسن وجمال بالکل گہنا دیا تھا۔ زندگی کے سورج سے اتنی دھوپ تو اس نے سہی ہی نہیں تھی۔۔۔ کہ جس قدر وہ جل چکی تھی۔

حق ہاہ۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ عمر ڈھلنے سے قبل بھی چہرے ڈھل ہی سکتے ہیں۔ دھوپ جلنے سے بھی پہلے رنگ پھٹک ہی جاتے ہیں۔ چہروں کا حسن کوئی وقت سے مشروط تھوڑی ہے۔ حسن ماند پڑنے کو یہاں اور بہت سے پہلو ہیں۔ حالات کی سلوٹیں۔۔۔ وقت کی پہروں سے زیادہ سخت ہوتی ہیں۔

خیر قصہ المختصر۔۔۔ دن گذرے کہ جیسے ایک ہی عمل کے مُسلسل رونما ہونے سے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے بالکل یونہی وہ بھی ان دونوں کی ان ساری گفتگوؤں کی عادی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ ہی سہی لیکن اسے ان کے موضوعات میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کے چہرے کی الجھنیں بتدریج کم ہو کر ان کی جگہ اب وہاں شوق و تجسس ابھر آیا۔ جس کی بدولت اب وہ انہیں بڑے دھیان سے سنا کرتی تھی۔ بڑے ارتکاز ورغبت سے وہ ان کے تاثرات سمجھنے کی کوشش کرتی اور کئی باتوں پر، کئی بار تو آنکھوں میں کئی کئی دہائیوں کا عذاب بھر کر وہ یوں چاروں جوانب دیکھنے لگتی گویا اس ماحول میں گندھ چکی وہ کامنی سی لڑکی اسی ماحول سے اب ہراساں بھی ہو رہی ہو۔ ایسے عالم میں اس کے پورے وجود سے ایسی بے قراری جھلکنے لگتی کہ جیسے یہاں سے بھی کہیں بھاگ جانا چاہتی ہو۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایسے ہی کسی پل میں ایک روز دور سے ان تینوں کی اور خصوصاً ثومیہ کی حرکات وسکنات کا بغور مشاہدہ کرتی ڈاکٹر زارا رضوان نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا تھا اور بڑے انکشاف آگیں لہجے میں یہ پیشین گوئی کی تھی۔

" آپ دونوں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکی ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس کی بند ہو چکی یادداشت چٹخنے میں اب زیادہ وقت نہیں لگنے والا۔ ان شآء اللہ "

اور ان کی بات پر بازوؤں کو میز پر بہت تھک کر رکھتے ہوئے وہ دونوں گویا بیک زبان بولی تھیں۔

"لیکن آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

ان کی اس قدر حیرانی کی وجہ بس یہ بات تھی کہ ان کے خیال میں وہ صرف ان کے اندازِ بیاں اور خوش گفتاری کی بدولت ان کی باتوں کی طرف راغب ہوئی ہے۔ جواباً ایک دھیمی اور دلکش مسکان کے ساتھ ڈاکٹر زارا رضوان نے ان کا صدیوں سا بلکتا لہجہ پڑھا تھا۔

"ارے اچھی لڑکیو۔۔۔کئی بار کے اس ملنے میں تم شاید بھول رہی ہو کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہوں اس بات میں کئی پہلو ہیں۔ خیر تم دونوں کی خاطر صرف یہی بتائے دیتی ہوں کہ یہاں ہمارے آس پاس بس رویوں کا کھیل ہوتا ہے۔ میں نے اتنے سالوں کی خدمات میں ان رویہ جات ومشاہدات سے اخذ کردہ مفروضات کو ہی نتائج یا حقیقت ہوتے دیکھا ہے۔ تو بس یہ طے سمجھو کہ وہ ٹھیک ہونے والی ہے اور بہت جلد۔۔۔ان شاء اللہ۔"

قدرے مزاح میں کہتے ہوئے ان کا لہجہ۔۔۔اور انداز بھی بتدریج سنجیدگی میں ڈھلا تھا اور بات مکمل کر کے، مسکراتی ہوئی آنکھوں سے وہ مُسلسل انہیں دیکھتی رہیں۔

"یہ۔۔۔یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ الحمدللہ۔۔۔شکرن اللہ۔۔۔ہم جس قدر بھی شکر گزار ہوں کم ہوگا۔ یقین کریں اب تو یوں لگتا ہے کہ اس سے مزید اجنبی ہو کر رہنا ہماری جان لے لے گا۔"

انتہائی متشکر لہجے میں کہتے ہوئے نمرہ کی آنکھیں سچ مچ بھیگ گئیں تو مریم نے بے ساختہ اس کے دونوں شانوں کے گرد اپنے محبتیلے بازوؤں کا گھیر بنایا تھا۔

"جذبات پر بھرپور قابو پاؤ چندا۔۔۔ابھی آپ کو بہت مضبوط رہنا ہے۔ اب اگلا مرحلہ انتہائی اہم ہوگا۔"

اگلے ہی پل ڈاکٹر زارا رضوان کے متجسس لہجہ و بیانیہ پر نیر پوچھتی وہ دونوں سوالیہ نظروں سے چپ چاپ انہیں تاکنے لگی تھیں۔

"جو تصویریں اس روز تم دونوں لے کر آئی تھیں۔۔۔ایک ایک کر کے اسے سب دکھا دو۔ لیکن یاد رہے کہ اس دوران اس کی کیفیات پر لازمی توجہ دینا۔ اگر ذرا سی بھی گڑبڑی کے آثار پیدا ہوں تو گفتگو سمیٹ دینا۔"

سمجھانے کے سے انداز میں کہی گئی ان کی اگلی بات پر نمرہ فوراً سر کو اثبات میں ہلانے لگی تو مزید یہ کہتے

ہوئے انہوں نے بھی گویا گفتگو سمیٹ دینا چاہی۔

" گڈ۔۔۔بس پھر اس سے زیادہ کوئی احتیاط نہیں ہے۔ کیونکہ باقی سب ہدایات اس دورانیہ و مدت میں تم دونوں بخوبی سمجھ چکی ہو۔"

آخرش وہی مخصوص حوصلہ افزا سی مسکان لبوں پر سجائے، میز پر اپنے بائیں جانب پڑی ہوئی ایک فائل نزدیک کھسکاتے ہوئے انہوں نے گویا انہیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ جواباً نمرہ تو " جی بہتر۔۔۔" کہہ کر کرسی گھسیٹتے ہوئے اپنی جگہ پر اٹھ بھی گئی لیکن مریم کی آنکھوں میں اس بار یکا یک ہی کوئی الجھن تیرنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی خیال کا عکس ہونے کے ساتھ ساتھ یہ تاثر بھی کندہ تھا کہ گویا وہ کچھ کہنے سے کترا رہی ہو۔

" کیا بات ہے مریم۔۔۔؟ کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

وہ اس کے تاثرات فوری طور پر بھانپ گئی تھیں۔

" جی وہ۔۔۔"

ایک ہنکارا بھر کر کہتے ہوئے وہ پھر سے ٹھہر گئی تو نمرہ نے بھی قدرے حیرت سے اسے دیکھا اور آہستگی سے واپس ٹک گئی۔ اور ان دونوں کی سوالیہ نظریں پڑھتی وہ بالآخر بولنا شروع ہوئی۔

" میں نے چند روز قبل معروف مائکرو فکشنسٹ " سیدہ آیت گیلانی " کا ایک مائکروف پڑھا تھا۔ اس میں ایک اقتباس درج تھا کہ۔۔۔ ہست و نیست کے لطیف پردے میں الجھتی بھٹکتی اور فہم و شعور کی پگڈنڈیوں پر " تلاش " کی خاطر چلتی مسافر روحوں کا سب سے بڑا روگ یہی ہے کہ یہ جس قدر جان لیں اسی قدر انجان رہتی ہیں۔"

بہت خوبصورت لب و لہجہ میں " اقتباس " مکمل کر کے فقط یک لمحاتی توقف سے اس نے باری باری ان دونوں کے تفہیمی انداز میں مُسلسل ملتے سر دیکھے اور اسی لب و لہجہ میں مزید گویا ہوئی۔

" یہ اقتباس۔۔۔ اور ثومیہ کی حالت۔۔۔ مجھے ان کا بہت گہرا تعلق لگتا ہے آپس میں۔۔۔ اور سچ کہوں تو کبھی کبھی اس کے ساتھ کھپتے کھپاتے " زائشہ مریم " ہو ہو کر مجھے بھی یہی لگنے لگتا ہے کہ میں یعنی زائشہ مریم۔۔۔ ایسی ہی ایک انجان و بے قرار روح ہوں۔"

بہت ہارے ہوئے لہجے میں کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک گئیں تو جذبات سے رندھے ہوئے گلے سے رطوبتیں نگلتی وہ بڑی بلکتی ہوئی سی چپ ہوگئی۔اس کی گفتگو اور انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بہت ہی جذباتی کیفیات میں گھل رہی ہے۔نمرہ نے میز پر رکھے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی کے سے انداز میں دبایا اور خاموش رہ کر ڈاکٹر زارا رضوان کے بولنے کی منتظر ہوگئی۔وہ اس کی باتوں پر ایک یاسیت بھرا سانس بھر کر رہ گئی تھیں۔

"میں سمجھ سکتی ہوں مریم۔۔۔یہاں سالوں سے یہی "ادراک وشناخت" کا عذاب جھیلتی آئی ہوں۔اپنے ہر مریض کے ساتھ میں نے بھی ہر بار اپنی ذات کی پہچان کا سفر طے کیا ہے۔میں جانتی ہوں یہ آسان نہیں ہے۔میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اسے شاید ہر کوئی سمجھ بھی نہیں سکے گا۔لیکن یقین کرو چندا۔۔۔میں سیدہ آیت گیلانی کے اس اقتباس اور تمہاری کیفیات کے اک ایک حرف وانگ سے خوب خوب واقف ہوں۔اور ان سب پہلوؤں سے بھرپور آگاہی رکھتے ہوئے ہی کہوں گی کہ اپنے آپ کو سنبھالو۔۔۔خود پر قابو پاؤ۔بہت مضبوط ہو کر ہی ممکن ہے کہ تم ثومیہ شاہجہاں کی کوئی مدد کر سکو۔یوں اپنی ذات میں گم ہو کر خودی کی تلاش میں سرگرداں ہونے لگیں تو تم اس کے لیے مزید شاید کچھ بھی نہیں کر پاؤ گی۔ہمم۔۔۔"

ناصحانہ انداز میں کہے گئے ان کے تمام تر لفظوں سے سالوں کی ریاضت جھلک رہی تھی جسے پا کر اس نے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی۔بلاشبہ ان کے پاس اپنے دل میں سوال گھڑ گھڑ کے خود ہی ان کے جواب تراش لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"جی بہتر ڈاکٹر۔۔۔میں اور نمرہ۔۔۔ہم دونوں اس بات کا خصوصی خیال کریں گی۔بہت شکریہ آپ کا۔"

جواباً فقط یہی کہہ کر وہ ان کے سامنے سے اٹھ آئی تھیں۔

باہر برآمدے میں تھوڑا سا چلنے کے بعد ہی نمرہ کے قدم پہلے سست پڑے اور پھر وہ رک بھی گئی تو اس کی نظروں کے تعاقب میں مریم نے بھی بائیں جانب واقع وسیع وعریض احاطے کی طرف دیکھا۔احاطے سے اس پار ایک قدآور قدیمی درخت کے نیچے کھڑی ثومیہ وہاں موجود پرندوں کے ایک پنجرے میں مگن تھی کہ جس میں دانہ دنکا چگتے پرندے طرح طرح کی بولیاں بولتے ہوئے ماحول میں کئی سر بکھیر رہے تھے۔وہ ان میں یوں

مصروف تھی گویا باقی دنیا سے کوئی لینا دینا یا کوئی سروکار ہو ہی نہیں۔
اب مریم نے برآمدے کے آخری سرے پر ایک گروپ کی صورت میں کھڑی تینوں ڈاکٹرز صبا اکبر گل، شبانہ اسلم اور ماہ نور سلیم کی جانب دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی ثومیہ شاہجہاں کی طرف متوجہ ہیں۔
"ہائے۔۔۔" کے سے انداز میں ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے اس نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان تینوں کی طرف اچھالی اور آہستگی سے چند قدم بڑھتی ہوئی نمرہ کے قریب ہوئی۔
" لگتا ہے اسے پرندے بہت پسند ہیں۔ دیکھو تو کس قدر محو و گم ہے ان میں۔ آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں۔"
اس کی بات پر بنا کسی توقف کے وہ جواباً بولی۔
"جی آپی۔۔۔ بے حد پسند ہیں۔ گھر میں تو سبز طوطوں کے ساتھ اس نے دو فیزنٹ بھی پالے ہوئے ہیں۔"
بڑی لگن سے اسے مُسلسل تکتے ہوئے اس نے بات پوری کی تو مریم نے بہت محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ جمایا۔
"پریشان نہیں ہو نمرہ۔۔۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"
بارہا کی کہی گئی بات اس نے ایک بار پھر سے دہرادی تو قدرے بے یقین سے لہجے میں وہ جواباً بولی۔
"جی آپی۔۔۔ شاید۔۔۔ جیسے میرے اللہ۔۔۔ میرے مولا کو منظور ہوا۔۔۔ ہو جائے گا۔"
اس کے لہجے میں صبر بھی تھا۔۔۔ اور شکر بھی۔۔۔ اور ساتھ۔۔۔ بے پناہ اذیت تھی۔ مریم نے بہت محبت سے اسے دونوں شانوں سے تھام کر اپنی جانب موڑ لیا۔
" کیا بات ہے نمرہ۔۔۔؟ تم اتنی غمگین کیوں ہو آج؟ ابھی کہا ناں ڈاکٹر زارا نے کہ وہ اب جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔ تو پھر وہ ضرور ہو جائے گی۔ ان شاءاللہ۔"
اور اس کی اس محبت و تسلی پر نظریں جھکا کر جواب میں اس نے بہت شکستگی سے کہا تھا۔
"جی مریم آپی۔۔۔ ان شاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ اللہ مجھے۔۔۔ ماما اور آپ کو بھی۔۔۔

بس استقامت دیئے رکھے۔ یہیں ہسپتال میں باقی مریضوں سے ان کے ورثا کا رویہ بغور دیکھا ہے میں نے اور۔۔۔اور میں بہت ڈر گئی ہوں آپی۔ ہاں میں نے دیکھا ہے اس دنیا میں لوگ بہت جلدی بیماروں سے اکتا جاتے ہیں۔"

بھیگے ہوئے لہجے میں دھیرے دھیرے اس نے اپنی بات پوری کی تو اس کی باتوں سے جھلکتے ہوئے خدشات سمجھ کر مریم نے بے ساختہ اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور اس کے گلے لگی وہ ہولے ہولے سسکنے لگی تھی۔ مریم جانتی تھی کہ اس کا کوئی بھی خدشہ بے معنی نہیں ہے۔

واقعی ہم سب اپنے آپ میں بے حد عجیب ہوتے ہیں۔ کسی بھی چیز، رویے، احساس یا عمل کے مسلسل یا مستقل طور پر واقع ہونے سے ہم بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔ ایک انسان جو کہ کسی بھی بیماری یا ابتلا میں مبتلا ہو، اس کے متعلق ملتی ایک سی خبریں سن سن کر ہماری دلچسپی اس کی ذات میں کم ہونے لگتی ہے۔ حتٰی کہ ایک وقت آتا ہے کہ ہم اس کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتے اور اس کا نام تک اپنی سماعتوں پر بوجھ گردانے لگتے ہیں۔ یعنی اپنے تیئں ہم بھلے جس قدر بھی خالص ہوں۔۔۔ ہم جزوی تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ ہم وقتی محبت کرتے ہیں۔ لیکن اس پل صرف وفقط اپنی "اچھائی" میں محو و گم ہو کر ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہماری عمیق تر چاہتوں کا عادی اور طالب کوئی بھی ادھورا شخص بڑا سسک سسک کر جی رہا ہے۔ کہیں لپٹ رہا ہے خود سے ہی اور۔۔۔ تڑپ تڑپ کر مر رہا ہے۔

فقط ایک لحظے کو ٹھہر کر اس کی کمر تھپکتے ہوئے اس نے بڑی محبت سے کہنا شروع کیا۔

"پریشان نہیں ہو چندا۔۔۔ میں جانتی ہوں تم بالکل درست کہہ رہی ہو۔ یہی اس دنیا کی حقیقت ہے۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ مریم جہانگیر کبھی ثومیہ شاہجہاں سے تنگ نہیں آئے گی۔۔۔ کبھی اکتائے گی نہیں۔۔۔ میں اپنی جاں پر اس کے سنگ بیتے ہوئے بہت سے فسوں گر لمحوں کا قرض رکھتی ہوں۔ اس کی ذات میں شامل میری تمام تر وابستگیاں اتنی گہری تو ضرور ہیں کہ تا دمِ مرگ بھی تمام نہیں ہونے والی۔۔۔"

سحر گر لفظوں میں کہتے ہوئے وہ ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ نمرہ نے ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو کر اس کا دلکش چہرہ دیکھا۔

"ہاں نمرہ۔۔۔میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔یہ ماہ وسال تو کیا میں اس کے لیے یہاں۔۔۔صدیاں گذار دوں۔"

بڑی لگن سے بات مکمل کرتے ہوئے دور ثومیہ کی طرف اشارہ کرتی ہوئی وہ اس کا کوئی بھی جواب سنے بنا ہی روش پر اتر گئی اور دو قدم اسی کی جانب بڑھی ہی تھی کہ جانے کن کن کیفیات سے بندھی نمرہ بھاگ کر اس کے آگے ہوئی۔فقط ایک پل کو ٹھہر کر اس نے یوں روکے جانے پر اس کے چہرے پر طاری ہوتی حیرت کو پڑھا اور بڑے زور سے اسے کھینچتے ہوئے خود سے لگا کر عجب شدت سے بھینچ لیا۔ اسی پل اونچے درختوں سے چھن چھن کر برستی ہوئی سورج کی سفید کرنوں نے ان کے گرد روشنیوں کے کئی کئی ہالے بنا کر ان کا وجود ماورائی سا کر دیا تو ایک سمت کھڑی وہ تینوں ڈاکٹر زان کی باہمی محبت میں در آیا یہ جذباتی بہاؤ دیکھ کر بے طرح مسکرا دیں۔

اسپتال میں اس طرح کی جذباتیت اور ایسے مشاہدات۔۔۔ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

☆......☆......☆

علی مصطفٰی کی اس فون کال کے بعد سے گیتی نے اپنی ساری توانائیاں اور کل گھڑیاں فقط "خدا کے بھگت" کی تکمیل کے لیے صرف و وقف کر دیں۔فکر و خیالِ فردا و حال سے بے نیاز ہو کر وہ اس فلم میں یوں جت گئی کہ اس فلم سے وابستہ اک ایک شخص و فرد دنگ رہ گیا۔وہ فلم کے ہر ایک شعبہ میں بھرپور دلچسپی لیتی تھی۔ڈائریکشن سے لے کر سینماٹوگرافی تک اور دیگر تکنیکی امور میں، اسپشل ایفیکٹس یا وی-ایف-ایکس ٹیکنالوجی سے لے کر ساؤنڈ کوالٹیز تک کی ساری خصوصیات کا اسے نا صرف اندازہ تھا بلکہ ہر ہر اعتبار سے وہ ان سب پہلوؤں کی تمام تر باریکیوں سے بھی بخوبی واقف تھی۔حتٰی کہ فلم میں شامل ایک بہت ہی خاص "ہندوانہ دھارمک ٹریک" کی کوریوگرافی بھی اس نے خود کی تھی کیونکہ پاکستانی کوریوگرافر کو فلم میں شامل ہندوؤں کے اس مخصوص بھجن کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی اور وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کے لیے ناچ کی کون کون سی ترتیبات مقرر کرے۔فلم کے اس دوسرے شیڈول میں اس کی اس قدر دلچسپی و شمولیت کو دیکھ کر ہی رفیق نواز پر یہ عقدہ کھلا کہ اس سے قبل تو وہ شاید "آدھی" گیتی کو جانتا تھا۔۔۔اس کی مہارتیں تو صرف بطورِ اداکارہ خوشگوار یا المیہ ادائیں دکھانے سے کہیں آگے ہیں۔لیکن وہ اب بھی بے خبر تھا کہ "پوری" گائتری دیوی سے تو وہ اب بھی نہیں ملا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب "خدا کے بھگت" کی آخری چند شوٹنگز باقی تھیں کہ ایک شام کسی شوٹنگ اسپاٹ پر کافی پیتے ہوئے گیتی نے مانیٹر پر تازہ فلمائے گئے مناظر دیکھتے رفیق نواز کو سرسری لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

"سر فلم کی نمائش کے حوالے سے کیا پلان ہے؟"

جواباً اس کی طرف دیکھے بنا اس نے بڑے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

" بھئی کیا پلان ہونا ہے؟ لندن سے پوسٹ پروڈکشن ورک سے فراغت پا کر اس کا پہلا "پرومو" جاری کرنے والا ہوں۔ فلم فائنل پرنٹ تک پہنچ جائے تو ایک پریس کانفرنس میں نمائشی تاریخ کا اعلان کریں گے۔"

اس کے جواب پر مبہم سا ہنکارا بھر کر گیتی نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور سکرین کی طرف اس کا انہماک جانچتے ہوئے قدرے رازدارانہ لہجے میں مزید گویا ہوئی۔

"سر میں یہ نہیں کہہ رہی۔۔۔ میں کمائی اور اس میں منافع کی بات کر رہی ہوں۔ میں "پورا کا پورا" تو نہیں کہہ سکتی لیکن میں چاہتی ہوں کہ اس فلم کا "زیادہ سے زیادہ "منافع صرف "آپ" تک پہنچے۔"

اب کی بار رفیق نواز کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

" کیا مطلب۔۔۔؟ کھل کر کہیں گیتی جی۔"

مانیٹر چھوڑ کر اس نے کرسی باقاعدہ اس کی طرف موڑ لی تو اپنی بات میں یوں اس کی دلچسپی بنتے ہوئے دیکھتی وہ بہت کھنکتی ہوئی سی ہنسی ہنس دی تھی۔

"سر سنیں۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ پاکستانی سرکٹ میں سینماز اور ملٹی پلیکس مالکان باقاعدہ مافیا کا روپ دھار چکے ہیں۔ یہاں اول تو انڈسٹری اتنی مضبوط ہے ہی نہیں کہ کوئی بہت بڑے بجٹ سے فلم پروڈیوس کرتا ہو۔۔۔ اور آپ جیسے چند مخلص لوگ جو یہ رسک لے رہے ہیں وہ بھی سینما اونرز کے ہیر پھیر سے پورا منافع حاصل نہیں کر پاتے۔ سو روپے میں بنی پروڈکٹ کو یہاں چالیس روپے میں بیچنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔۔۔ یعنی آسان لفظوں میں کہوں تو جدید سینما اونرز ساٹھ فیصد یا اس سے بھی زیادہ منافع مانگتے ہیں اور اس میں بھی بیشتر ملٹی پلیکسز، ایک ایک سال بعد جا کر حساب کرتے ہیں۔ حالانکہ فلم بین تو انہیں روزانہ کی بنیاد پر کیش دیتے ہیں۔

اب اس سارے مشاہدے سے میں بالکل نہیں سمجھ پا رہی کہ ایسی صورتحال میں پروڈیوسر کو کیا ملتا ہوگا؟"

بہت یقین سے اور بڑے نپے تلے لفظوں میں اس نے پاکستان فلم انڈسٹری کے حقیقی و اصل آنکڑے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے تو وہ حیران رہ گیا کہ ان سب تجزیہ جات سے وہ کیسے اور کیونکر آگاہ و خبردار ہے۔ وہ بھول رہا تھا شاید کہ وہ گائتری دیوی ہے اور بہت جلد وہ یہاں ایک ہائی بجٹ فلم پروڈیوس کرنے والی ہے۔ کیسے ممکن تھا کہ اسے یہ سب معلومات نہ ہوتیں؟

اس کی دلنشین آنکھوں میں تیرتا سوال پڑھتے ہوئے اسے پہلی بار لگا کہ "پوری" گیتی سے وہ اب واقف ہو رہا ہے۔ لیکن وہ غلط تھا۔۔۔ پوری گیتی سے وہ تو کیا کوئی بھی واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ اعلیٰ ترین ظرف و گماں کی مالکہ وہ حساس ترلڑکی اس دنیا کے تمام حساب کھاتوں سے بڑی ماوراسی تھی۔

"ہاں صورتحال تو یہی ہے۔۔۔ لیکن کیا کیا جاسکتا ہے گیتی جی؟ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

بالآخر اس نے قدرے مایوسی سے کہا تو بنا کسی توقف کے وہ گویا اس کی بات اچکتے ہوئے بولی تھی۔

" کیوں نہیں کیا جاسکتا سر؟ بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ بڑی "بے لگامی" میں بھی اک نہ اک "لگام" لازمی ہوتی ہے۔"

اس کی پرجوش آواز پر واپس مانیٹر کی طرف متوجہ ہوتا وہ پھر سے چوکنا ہو گیا۔

"ہم اس فلم کی نمائش نئے اصول، نئے انداز اور نئی حکمت عملی کے تحت کریں گے۔ کسی بڑے بینر یا چینل کے اشتراک و توسط سے۔۔۔ اور ان کو بھی صرف پبلسٹی اور پیشکش میں معاونت کی مد میں بہت مناسب سا معاوضہ دیا جائے گا۔ میں آپ کی "رتیش گولاٹی" صاحب سے بات کرواتی ہوں۔ وہ "بی ریڈی پکچرز" جیسے بڑے گروپ سے منسلک ہیں جو کہ بین الاقوامی سطح پر کام کرتا ہے۔ وہ خاصے تجربہ کار اور ملنسار شخص ہیں۔ اس ریلیزنگ پلان میں وہ براہ راست شامل ہوں تو فلم کی ہائیپ کئی گنا بڑھ جائے گی۔ یوں ہائیپ بڑھا کر ملٹی پلیکسز سے ساٹھ کی بجائے چالیس فیصد پر ڈن کیا جاسکتا ہے۔ اور پھر اس ادارے سے وابستگی کی بدولت ہمیں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا سمیت تمام خلیجی ریاستوں میں بھی اپنی پروڈکٹ کی نمائش کے لیے آسانی و سہولت میسر آئے گی۔ یعنی اس بڑے ادارے کی شمولیت سے یقینی فائدہ ہوگا۔"

اسی رازدان سے لہجے میں اس نے بڑی سہولت سے بات مکمل کر دی تو وہ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ اپنے آپ میں مگن یہ چھوٹی سی لڑکی، فلمی صنعت کے مخفی کاروباری معاملات میں بھی کس قدر ید طولیٰ رکھتی ہے، اس چھوٹی سی نشست میں اس پر یہ راز پہلی مرتبہ آشکار ہو رہا تھا۔

ڈن کے سے انداز میں اس کی مٹھی پر مٹھی مارتا وہ طمانیت سے مسکرا دیا تھا۔

خیر قصہ الختصر۔۔۔ دن گذرے۔۔۔ موسم پلٹے۔۔۔ واقعات نے کروٹ لی اور گیتی کی زندگانی میں در آتے حالات ایک ایک کر کے بہت تواتر اور تیزی سے رنگ بدلتے رہے۔ فلم کے ہر اک فریم پر بڑی جانفشانی سے محنت کرتے ہوئے انہوں نے فیتوں پر فیتہ لپیٹا اور خدا کے بھگت کا کیمرہ کلوز کر دیا۔ ریلز (reels) پوسٹ پروڈکشن ورک کے لیے لندن روانہ ہوئیں اور ایک ہفتے بعد ہی فلم کا پہلا پرومو جاری کر دیا گیا۔ اس ٹریلر ریلیز کے ساتھ ہی چاروں طرف ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ پرومو میں کبھی بھگوان کی مورتی کے سامنے ہندو رسوم کی ادائیگی کرتی، کبھی مندر کی سیڑھیوں پر پرشاد بانٹتی اور کبھی مسلمانوں کی طرح سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے مصلے پر آنسو بہاتی گیت کے مناظر نے فلم بینوں کو بے تحاشا چونکا دیا۔ ہر ہر منظر میں اس کی دلکش ادائیں اور رعنا گر حرکات دیکھنے والوں پر عجب عجب سے کئی سحر و حصار باندھ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ٹریلر میں شامل ایک دو تین مکالموں نے بھی گویا پہلے سے لگی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کا سا کام کیا تھا۔ وہ یوں کہ ان ذو معنی مکالموں سے ناظرین پر یہ تاثر جا رہا تھا کہ "خدا کے بھگت" گیتی کی زندگی کی حقیقی کہانی ہے۔ پاکستان میں بھی ہر طرف یہی شور گونجنے لگا کہ گیتی اندر ہی اندر مسلمان ہو چکی ہے اسی لیے ہندوستان میں اس کے خلاف مظاہرے جاری ہیں اور جواباً اس نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی ذات کے یوں موضوع بحث ہونے سے بھی فلم کو براہ راست فائدہ پہنچا کہ بے طرح تشہیر ہوتی گئی۔ ہر طرف سے اٹھتی ہوئی افواہوں پر رتی بھر دھیان دیئے بنا گیتی نے باقی کاسٹ کے ساتھ مل کر پہلے سے طے شدہ فلم پروموشن پلان پر عمل شروع کیا اور اس مقصد کے لیے انہیں خصوصی لیکن محدود اجازت نامے کے تحت چند بڑے بڑے شہروں کا سفر کرنا پڑا۔ ہر شہر میں انہوں نے معروف خریداری مراکز کا سرپرائز وزٹ کیا اور وہاں موجود عوام کے ساتھ کچھ وقت گذارتے ہوئے انہیں سینما گھر جا کر "خدا کے بھگت" دیکھنے کی تلقین کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی "میڈیا میٹ اینڈ گریٹ" پروگرامز کا انعقاد کیا اور اپنی فلم

کے حوالے سے خوب تجسس پھیلایا۔اس سارے پروموشن پیریڈ میں جب بھی کسی نے اس کی ذات سے وابستہ اسراروں یا افواہوں کے متعلق سوال کیا تو اس نے خندہ پیشانی و نرمی سے اسے ٹال دیا۔ پاکستان میں اپنی پہلی ہی فلم سمیت اسے یوں پذیرائی پاتے دیکھ کر بھارت میں یکا یک ہی اس کی مخالفت میں اضافہ ہونے لگا۔اس کے مخالفین نے اس کے کردار سے متعلق منفیت پھیلانے میں ایک بار پھر سے بے دریغ پیسا لٹایا اور اس کی شخصیت مسخ کرنے میں ہر اوچھے ہتھکنڈے کا استعمال کیا۔ممتاز محمود جو کہ اب قصہ پارینہ بن چکا تھا اس سمیت دیگر کئی پاکستانی بکاؤ صحافی اس کے خلاف ڈھونڈ ڈھانڈ کر بری اور منفی خبریں نشر کرنے لگے۔لیکن صد شکر کہ ان کی پھیلائی ہوئی منفیت کو رد کرنے میں کئی چینل کی حقیقی رپورٹنگ نے انتہائی مثبت کام کیا اور لوگوں نے ان کی باتوں پر زیادہ کان نہیں دھرے۔گیتی یہ سب دیکھتے، سمجھتے ہوئے بھی اس طرف سے ازحد لاپرواہ تھی اور ناز کا دھیان تھا کہ ہمہ وقت اسی جانب مرکوز رہتا تھا۔ایک روز کہ جب وہ لاہور میں ہی تھیں اور "ایمپوریم مال" نامی کسی خریداری مرکز میں فلم کی تشہیر کے لیے ہوٹل سے نکل رہی تھیں ناز نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے سختی سے تاکید کی تھی۔

"میں تمہیں کہے دیتی ہوں گیت کہ آج اگر کسی نے تم سے کوئی بھی ذاتی سوال کیا تو تم اس کا جواب لازمی دو گی اور ہر ممکن کوشش کرو گی کہ تمہاری ذات سے وابستہ افواہوں کی رد ہو سکے۔تم سمجھ کیوں نہیں رہیں کہ تمہاری مخالفت بڑھ رہی ہے اور اس بار یہ سلسلہ سرحد کے دونوں جانب سے ہے۔"

بات مکمل کرتے ہی گاڑی کا دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے اس نے گویا اپنا غصہ نکالا تھا۔

"اور تم بھی کیوں نہیں سمجھ رہیں ناز کہ ابھی کچھ نہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا؟ ہماری فلم کی ہائیپ بڑھ رہی ہے اور ہمیں فی الوقت بس یہی چاہیئے۔ویسے بھی۔۔۔میں جو بھی کہوں گی اسے الٹ کر کے ہی پیش کیا جائے گا۔"

جواباً ایک دوسرے کے وسط میں خالی نشست پر اپنا بیگ، موبائل اور چشمہ رکھتے ہوئے، ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کرتی وہ نہایت لاپرواہی سے بولی تھی۔

"تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی ہو رہا ہے۔۔۔تم ہونے دو گی؟ اپنی ہی ذات پر لگا ہوا یہ سب تماشا یونہی چپ چاپ دیکھو گی؟"

اب کی بار سمجھا سمجھا کر بہت ہاری وہ بڑے دوٹوک انداز میں پوچھنے لگی تھی۔

"یہ اپنی ہی ذات پر لگا ہوا تماشا دیکھنے میں بھی بڑا لطف ہوتا ہے سہیلی۔ بس لگا وہ من مرضی کا ہو۔۔۔ تب۔"

اس کی گھمبیرتا کو ایک چٹکی میں اڑاتی وہ باہر مال روڈ کے کشادہ فٹ پاتھس پر جھانکنے لگی اور اس کے انداز پر تاسف سے ہاتھ ملتی ہوئی وہ بہت بے بس لہجے میں مزید بولی۔

" کیوں کر رہی ہو ایسا گیت۔۔۔ آنٹی اور انکل کتنے پریشان ہیں تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ رات آنٹی سے میری بات ہوئی تو وہ کہہ رہی تھیں کہ جب فلم مکمل ہوگئی ہے تو تمہیں لے کر میں ان کے پاس فوراً دبئی پہنچوں۔ تم سے مل کر، کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتے ہوئے وہ ہم سب کی بھارت واپسی کے لیے حالات سازگار کرنا چاہتی ہیں۔ بہت مشکل سے ان کو سمجھایا میں نے۔ بڑی تسلی دی کہ ہم جلد ان کے پاس دبئی آ جائیں گی۔ تم مان کیوں نہیں لیتی ہو گیت کہ اب اس ملک اور یہاں کے باسیوں سے ہمارا واسطہ نہیں رہا۔ ہمیں اپنے لوگوں میں ہی جانا ہوگا۔ کیوں اور مسئلے پیدا کر رہی ہو؟"

دھیرے دھیرے اپنا مقصود کہتی وہ اس پر سوالیہ نظریں گاڑے ہوئے چپ ہو رہی تو ایک نظر اسے دیکھتی گیت بے ساختہ نگاہ چرا گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بہت حد تک وہ بالکل سچ کہہ رہی ہے۔ لیکن چند ہی ثانیے بعد واپس اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی جب وہ دوبارہ بولی تو اس کا رنگ اور ڈھنگ کچھ عجب وعجیب تھا۔

"میں بھی بھارت واپس جانا چاہتی ہوں ناز اور یقیناً میں ضرور جاؤں گی۔ لیکن کسی شدت پسند یا انتہا پسند گروہ سے کوئی معاہدہ یا شرائط طے کر کے نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے دیش جانا ہے اور اپنی شرطوں پر جانا ہے۔ سر جھکا کر نہیں۔۔۔ سر اٹھا کر جانا ہے۔ اور یہ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں ناز کہ جس روز میں واپس گئی مجھے اک عالم۔۔۔ ایک جہاں۔۔۔ رک کر دیکھے گا۔ میرے استقبال کے لیے ایک دنیا آئے گی۔ نا صرف وہاں۔۔۔ بلکہ یہاں سے بھی لوگ مجھے نہایت محبت اور احترام سے رخصت کریں گے۔ میں ثابت کروں گی کہ گائتری دیوی پاکستان اور ہندوستان۔۔۔ دو ملکوں کی بیٹی ہے۔"

اس کا پرعزم لہجہ اور آنکھوں کی بڑھتی ہوئی سی جوت۔۔۔ ناز کو لگا اس کی ساری گفتگوئیں اور دلائل بے معنی یا

فضول ہو گئے ہیں۔

جواباً کچھ بھی کہے بنا نشست پر دھرے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتی وہ آنکھوں میں ہزار کیفیات چھلکائے شیشے سے باہر جھانکنے لگی۔ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔۔۔ لیکن شاید گیتی کے پاس سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اور سن بھی لیتی اگر تو یہ سب سمجھنے کی حالت میں۔۔۔ وہ یقیناً نہیں تھی۔

ان کی گاڑی اب نہر کے ساتھ ساتھ تیزی سے ٹھوکر نیاز بیگ کی جانب بڑھ رہی تھی کہ جس سے ذرا پہلے انہیں "ایمپوریم مال" کے لیے مڑنا تھا۔

☆......☆......☆

اب کی بار اک نئے ارادہ و عزم اور نئی ہمت کے ساتھ وہ اس جہت وسمت میں نکلی تھیں کہ ثومیہ شاہجہاں کو اس کا ماضی یاد کروا سکیں۔ ایک "وائیڈ سکرین ٹیبلٹ" پر مریم نے سب سے پہلے اسے شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد کے وہ سب مقامات دکھائے کہ جن میں کبھی وہ اس کے ساتھ ساتھ گھومی تھی اور اس کے خیال کے مُطابق ان جگہوں سے ثومیہ کی بہت سی حسین و دلکش یادیں وابستہ تھیں۔ صرف اس کے لیے یہ تصویریں لانے کی خاطر مریم نے ان جگہوں کا ایک خصوصی دورہ پھر سے کیا تھا۔ مختلف زاویوں سے لی گئی یہ سب تصاویر اس کے سامنے کرتے ہوئے وہ ان جگہوں کے متعلق گفتگو بھی ایسی ہی کیا کرتیں کہ جس میں زیادہ سے زیادہ جملے اُس کے اپنے منہ سے ادا کیے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن ان دونوں کی اتنی محنت کے باوجود وہ ان ساری تصویروں کو یوں اجنبیت سے دیکھتی تھی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ اگر اس کے چہرے پر دلچسپی کا کوئی ہلکا پھلکا تاثر نمودار ہوتا بھی تھا تو اس سے یہ عنصر ہرگز نہیں جھلکتا تھا کہ وہ اس جگہ سے کوئی خاص "تعلق، واسطہ یا لگاؤ" محسوس کر رہی ہے۔ وہ دلچسپی اتنی ہی عمومیت کی حامل ہوتی تھی کہ گویا کوئی دور دراز کا مُسافر کسی اجنبی منظر کو بصد شوق دیکھتا ہے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی کسی تصویر کو وہ صرف اس لیے بغور دیکھنے لگتی ہے کہ وہ منظر اسے خوبصورت لگتا ہے اور بس۔ سوا اس کے کچھ بھی نہیں۔

اور اس پل اس کے چہرے پر اس قدر پھیلی ہوئی بیگانگی و اجنبیت دیکھتی مریم اور نمرہ من ہی من اندر بے شمار ہارنے لگتی تھیں۔ یہاں کی سب ڈاکٹرز اگر کبھی انہیں یوں شکستہ شکستہ اور ہاری ہوئی سی دیکھتیں تو اپنے اپنے طور پر

چھوٹے موٹے جملوں سے ان کی ڈھارس و ہمت بندھا دیا کرتی تھیں۔

یہ ایسے ایک روز کا ذکر ہے کہ جب موسم ابر آلود ہونے کے سبب آس پاس منظروں میں عجب خوشگواریت در آئی تھی۔تیز ہواؤں کے سبب درختوں کی مُسلسل ہلتی شاخیں اور سرسراتے ہوئے پتے باہم ٹکرا ٹکرا کر کئی طرح کی مدھر دھنیں ترتیب دے رہے تھے۔سیاہ بادلوں کے سبب ماحول پر طاری ہوتی نیم تاریکی بتاتی تھی کہ بارش کی آمد آمد ہے۔ایسے موسم کیونکہ شروع سے ہی ثومیہ کو بہت پسند تھے لہٰذا اب یادداشت کھو جانے کے باوجود لاشعوری طور پر وہ ایسے موسموں سے عجب لگاؤ محسوس کرتی تھی۔مریم اور نمرہ اسے اس کے کمرے سے نکال کر باہر کھلے احاطے میں لے آئیں اور حسبِ سابق اس کے سامنے پرانے اذکار دہراتی ہوئی اسے شاہی قلعہ و بادشاہی مسجد کی مختلف تصویریں دکھانے لگیں۔اب صورتحال یوں بنی کہ ان کے ساتھ بیٹھی ثومیہ بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی ہوئی بغور ٹیبلٹ سکرین دیکھتی اور پھر ایک آدھ نگاہ آس پاس منظروں میں جھانکتی ہوئی آنکھوں کو بار بار طمانیت سے جھپکنے لگتی۔اس کی دلچسپی دیکھ کر ہاتھوں سے مختلف اشارے کرتی مریم لگاتار بولے جا رہی تھی۔

"اس دن میں وہاں ایک راہداری کے بیرونی زینوں پر بیٹھی تھی کہ میرا ایک کلاس فیلو اس گولائی دار حوض کے پاس اپنی دوسری دوست کو چھوڑ کر میرے پاس آ گیا تھا۔۔۔"

تصویر میں موجود بادشاہی مسجد کی طویل راہداریوں،ان کی داخلی سیڑھیوں اور وسیع تر صحن میں واقع گولائی دار حوض پر باری باری ہاتھ رکھتی وہ اسے ایک پرانا منظر تھوڑی سی ترتیب الٹ کر سنا رہی تھی کہ ثومیہ نے ایک بار دھیان سے وہ تصویر دیکھ کر یکایک ہی ٹیبلٹ پیچھے کر دیا۔اس کے تیور دیکھ کر وہ بھی فوراً چپ ہو گئی تھی۔

"میں وہ پرندے دیکھ کر آتی ہوں زائشہ۔۔۔آپ دونوں بیٹھیں۔"

جانے کیوں بہت لاتعلقی سے کہتی ہوئی وہ اٹھ کر پرندوں کے بڑے پنجرے کی جانب بھی بڑھ گئی تو مریم نے بڑی شکستگی سے شانے جھٹک کر نمرہ کی طرف دیکھا۔

"اس منظر میں سیڑھیوں پر "یہ خود" بیٹھی تھی یار۔اور سفیر "مجھے" حوض کے پاس چھوڑ کر اس کی طرف گیا تھا۔۔۔لیکن اسے کچھ یاد نہیں آتا۔"

اپنے لفظ لفظ پر بھرپور زور دیتی وہ یوں بے بسی سے بولی کہ گویا ابھی رو دے گی۔

"ہمم۔۔۔میں سمجھ سکتی ہوں مریم آپی۔اس کے یوں ایک دم سے لاتعلق ہو جانے پر میرا دل بھی جیسے چڑ سا جاتا ہے۔لیکن ہمارے پاس سوائے ان کوششوں کے کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

محبت سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اس نے اپنے طور پر تسلی دینا چاہی اور پھر اس کے جواباً کچھ بھی کہنے سے قبل مزید بولی۔

"اچھا چھوڑیں آپ پریشان نہیں ہوں۔۔۔ابھی مجھے وہ شاعری سنائیں آپ جو کل کہہ رہی تھیں کہ آپ نے خود لکھی ہے۔"

بشاشت سے کہتے ہوئے اس نے ارادتاً موضوع بدل دیا تو مریم نے ایک نظر اس احاطے سے پار پرندوں کے پنجرے کے پاس پہنچ کر جالیوں میں انگلیاں پھنساتی ہوئی ثومیہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں شاعری تو کی تھی لیکن وہ کوئی خاص نہیں ہے۔بس یونہی بیٹھے بٹھائے سوجھی تو لکھ ڈالی۔خیر تم سنو اور پھر بتانا کیسی ہے؟ایک آدھ ہندی لفظ بھی ہے اندر۔"

بہت نرمی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑواتی وہ اپنے موبائل "نوٹ پیڈ" سے وہ شاعری ڈھونڈنے لگی تو اب کی بار اس کے چہرے پر در آیا وقتی اطمینان دیکھتی نمرہ نے بھی بہت یاسیت سے مسکراتے ہوئے دور پرندوں کی حرکات اور بولیوں میں مصروف ومگن ثومیہ شاہجہاں کی طرف دیکھا۔اسی پل مریم نے بڑی دلنشیں آواز میں وہ شاعری سنانی شروع کر دی تو اسے ہمہ تن گوش ہونا پڑا۔

" کوئی عکس ہو سا کن پانی پر
تم جھلمل جھلمل لگتے ہو،
تمہیں چاہوں اور سِنڈُ ور کروں
تم اتنے قابل لگتے ہو،
میں ہوا ہوں پنکھ بنا اڑ لوں
تم بادل بادل لگتے ہو،
جذبوں میں رواں سی بحر ہو تم

دھڑکن کی ہلچل لگتے ہو،

میں موج تیری تم جہلم ہو

ہاں بالکل بالکل لگتے ہو،

بے سدھ میں پھروں اس دُنیا میں

تم پورے پاگل لگتے ہو۔"

لہجے کے مدھم زیر و بم میں اس نے غزل مکمل کر دی تو نمرہ بے ساختہ بول اٹھی۔

"ارے واہ مریم آپی۔۔۔آپ تو شاعرہ ہو گئیں۔ سچی بہت اعلیٰ ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔"

اور اس کی بات پر بے طرح ہنستی وہ گویا ہر تھکان بھول گئی۔

"بہت شکریہ نمرہ۔۔۔ایسے ہی یاد کروایا تم نے سنا دی ورنہ میں تو شاید کبھی اس کا ذکر بھی نہیں کرتی دوبارہ۔ ویسے بھی یہ غزل میں نے یعنی "مریم" نے نہیں۔۔۔بلکہ "زائشہ" نے لکھی ہے۔"

اس کا لہجہ بتدریج پھر سے سنجیدگی میں ڈھل گیا تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مریم جہانگیر اتنی گہرائی میں شاید کبھی نہیں سوچتی تھی نمرہ۔۔۔یہ تو بینا بنت آدم سے ملنے کے لیے جب سے "زائشہ مریم" ہوئی ہے ایسی گہری ہو گئی ہے۔ میں خاص چیزوں کو بھی عام لینے والی لڑکی تھی۔۔۔سمجھو اب بدلنا پڑ گیا ہے۔"

اس کی سوالیہ نظروں میں تیرتی حیرت کو تھپکتے ہوئے اس نے قدرے صراحت سے کہا تو نمرہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ اب ایسی بات کا وہ بھلا کیا جواب دیتی۔۔۔یہ بجا و حقیقت تھی کہ ثومیہ کی بیماری نے اس سے وابستہ اک ایک شخص و فرد کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

"اچھا چھوڑو یہ سب۔۔۔یہ بتاؤ راشدہ آنٹی کیسی ہیں؟ اور انکل؟ کل آنٹی آئیں گی کیا؟"

مریم نے اسے یوں لب بستگی سے کچھ سوچتے ہوئے پایا تو موضوع بدلتے ہوئے راشدہ بیگم کی بابت دریافت کرنے لگی۔

اِدھر یہ دونوں باہمی گفتگو میں مصروف تھیں اور اُدھر ان کے پاس سے اٹھ کر پرندوں والے پنجرے کی

جالیوں میں انگلیاں پھنسائے کھڑی ثومیہ اب تک بادشاہی مسجد کی ابھی ابھی دیکھی ہوئی تصویروں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جانے کیوں وہ ان تصویروں کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بادشاہی مسجد کی طویل راہداری کا اندرونی منظر اور وسیع تر صحن کی جزئیات نہیں ہٹ رہی تھیں۔ اس کے آزردہ چہرے پر کئی تفکرات کا جال بچھا تھا۔ پنجرے میں بند کبوتروں کی حرکات دیکھتے ہوئے اس کی نظریں آہستہ آہستہ جالیوں میں پھنسی ہوئی اپنی سفید انگلیوں پر آن رکیں اور اگلے ہی پل ایک جھماکا سا ہوا۔ کسی برقی کوندے کی مانند اس کے ذہن میں بادشاہی مسجد کی اسی تصویر والی راہداری کا منظر لپکا کہ جس میں ایک بار وہ یونہی سنگِ مرمر کی جالیوں میں انگلیاں پھنسا کر "مینارِ پاکستان" کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ ایک جھٹکے سے پنجرے کی جالی میں سے انگلیاں نکالتی وہ فوراً پیچھے ہٹی اور اپنے ہاتھوں کو یوں جھٹکنے لگی گویا ان سے کچھ لگ یا لپٹ گیا ہو۔ دوبارہ جالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پھر سے وہی منظر سوچنے کی کوشش کی لیکن وہاں سب کچھ محو ہو چکا تھا۔ سامنے بس وہی کبوتروں، چڑیوں اور آسٹریلین طوطوں والا جالی دار پنجرہ تھا جس میں بند یہ سارے پرندے یہاں وہاں چھوٹی چھوٹی اڑانیں بھرتے ہوئے مُسلسل چہچہا رہے تھے۔ اس کے گرد ہواؤں کا شور بڑھنے لگا اور حواس باختہ سی ہو کر وہ واپس مریم اور نمرہ کی طرف بھاگی۔ اسے یوں تیزی سے آتے دیکھ کر ساری باتیں چھوڑتی ہوئی وہ دونوں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

" کیا بات ہے بیٹا۔۔۔؟ کیا ہوا ہے؟ یوں رنگ کیوں اڑا ہوا ہے آپ کا؟"

جونہی وہ پھولی ہوئی سانسیں لیے ان تک پہنچی مریم نے تیزی سے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے پوچھا تھا۔

" کک۔۔۔ کچھ نہیں۔ وہ۔۔۔ وہاں کچھ تھا۔ پتھر کی جالیاں اور وہ۔۔۔ وہ تصویر۔۔۔"

بے ربط سے جملے میں اتنا کہہ کر وہ اپنے گلے کو یوں ملنے مسلنے لگی جیسے پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا ہو۔

ان دونوں نے حیرت در حیرت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ کچھ سمجھتے ہوئے باہم اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

" کچھ نہیں ہوا بیٹا۔۔۔ آپ یہاں بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔" اسے نمرہ کے حوالے

کرتے ہوئے وہ عمارت کی طرف مڑی ہی تھی کہ اس نے جلدی سے اس کی کلائی دبوچ لی۔

"نہیں۔۔۔مجھے پانی نہیں پینا۔آپ رکیں۔۔۔"

وہ یوں ڈر ڈر کر بولی جیسے اس کے کھو جانے کا خدشہ ہو۔۔۔کہ گویا وہ پانی لانے کے لیے گئی تو کبھی واپس نہیں آئے گی۔

"اچھا میں نہیں جاتی۔آؤ بیٹھیں یہاں۔۔۔"

فکر مندی سے پہلے اسے اور پھر نمرہ کو دیکھتے ہوئے وہ نشست کی جانب اشارہ کر کے بولی تو یونہی اس کی کلائی پر گرفت رکھتے ہوئے اسے ساتھ لیے وہ بڑھی اور سنگی نشست پر ٹک گئی۔بغور اس کی حرکات ملاحظہ کرتی نمرہ بھی دوسری طرف بیٹھ گئی تھی۔

"وہ۔۔۔وہ تصویریں۔۔۔"

بیٹھتے ہی اس نے نمرہ کے پاس موجود ٹیبلٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ نا سمجھی کے سے انداز میں بولی۔

"دوبارہ دیکھنا چاہو گی؟؟"

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کا انداز بڑا متجب تھا۔جواباً تھوڑا سا رخ موڑ کر مریم کو دیکھتی وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"ہاں۔۔۔وہ۔۔۔"

دوبارہ کچھ بولنے کی کوشش کرتی وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے اپنی بات کی کوئی وضاحت نہ مل رہی ہو۔نمرہ نے فوراً تصویریں کھول کر ٹیبلٹ سکرین اس کے سامنے کر دی۔یہ ان کے گلی محلے اور گھر کی تصویروں والا البم تھا۔آگے ہی آگے گذارتی وہ ہر ہر تصویر پر فقط سرسری سی نگاہ ڈال رہی تھی کہ ایک تصویر پر یکایک رک کر بغور اسے دیکھنے لگی۔یہ گھر میں ان کے مشترکہ کمرے کی کھڑکی کا منظر تھا۔اسے اس پر یوں رکتے دیکھ کر نمرہ اور مریم نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یہ۔۔۔یہ جگہ۔۔۔مجھے دیکھی دیکھی لگ رہی ہے۔لیکن۔۔۔لیکن یاد نہیں آ رہا۔۔۔کہاں دیکھی ہے؟

اٹکتے ہوئے اس نے سکرین پر انگلی رکھ دی تو نمرہ ششدر رہ گئی۔ان کا شک صحیح ثابت ہوا تھا کہ وہ

پنجرے کے پاس سے یوں حواس باختگی میں بے سبب نہیں لوٹی۔

"اور دیکھو بیٹا۔۔۔شاید اور کوئی جگہ بھی آپ کو ایسی دیکھی بھالی سی لگے۔"

لہجے کو حتی المقدور متوازن رکھتے ہوئے مریم نے اسے مزید تصویریں دیکھنے کی ترغیب دی تو ناسمجھی میں دائیں بائیں سر ہلاتی، ایک ہاتھ سے اپنا ماتھا پکڑتی وہ پھر سے تصویریں آگے گذارنے لگی۔اس کی بات سن کر اس کی کیفیات اور انہماک کا بھرپور ادراک رکھتے ہوئے ان دونوں کے چہروں پر دبا دبا سا جوش جھلکنے لگا تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی کئی گفتگوئیں کرنے لگیں۔اسی دوران تند ہواؤں کے جھکڑ اتنی شدت سے چلے کہ آسمان پر چھائے کالے بادل آپس میں گلے ملتے ملاتے یہاں وہاں رقص کرنے لگے اور نشست پر براجمان ہونے کے باوجود ان تینوں کے کپڑے بھی مُسلسل پھڑ پھڑانے لگے۔

" لگتا ہے بارش ہونے لگی ہے۔۔۔"

نمرہ نے مریم کو مخاطب کرتے ہوئے کن انکھیوں سے ثومیہ کی طرف بھی دیکھا تو جواباً فقط" ہوں۔۔۔یہی لگتا ہے۔" کہہ کر مریم نے ٹیبلٹ سکرین کی طرف دیکھا جہاں اب بادشاہی مسجد کی وہی صحن اور گولائی دار حوض والی تصویر نظر آرہی تھی جو اس نے کچھ دیر قبل ہی ثومیہ کو دکھائی تھی۔ان دونوں کی باہمی گفتگو سے یکسر بے نیاز ثومیہ کا سارا ارتکاز اسی تصویر پر تھا کہ دفعتاً اس کے ذہن میں پھر سے ایک جھماکا ہوا۔ایک ترتیب سے اس کی آنکھوں کی سامنے چند منظر لہرانے لگے اور بہت ڈر کر ٹیبلٹ کو نیچے گھاس پر پھینکتی وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ رہی۔نمرہ نے جھک کر ٹیبلٹ اٹھاتے ہوئے اسے بے تحاشا حیرت سے دیکھا۔

اپنے آس پاس ان دونوں کی موجودگی سے بے خبر اس کے ذہن میں یہ منظر بن رہا تھا کہ تصویر والی سیڑھیوں پر کسی لڑکی کا غیر واضح سا ہیولا بیٹھا ہوا ہے اور حوض کے پاس سے ایک دراز قد لڑکا کسی دوسری لڑکی کو وہاں چھوڑتے ہوئے آہستہ آہستہ اس سیڑھیوں والی لڑکی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ابھی وہ اسی پر غور کر رہی تھی کہ اس کے ذہن میں ایک اور برق کوندا سا لپکا اور اس نے دیکھا کہ دونوں بازو اطراف میں پھیلائے کسی لڑکی کی سایہ نما شبیہہ ہے جو اڑتے ہوئے کبوتروں کے اندر گول گول رہی ہے۔

اِس سے اگلے جھماکے میں وہی دراز قد لڑکا اسی لڑکی پر جھکتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔لفظ واضح نہیں تھے۔۔۔

گونج کی سی آوازیں تھیں بس۔

"تمہارے ساتھ۔۔۔اک ایک پل۔۔۔مجھے عید مبارک۔۔۔"

یہ راہداری کا اندرونی منظر تھا اور اس میں لڑکی کا وہ ہیولا اس لڑکے کی ایک جانب سے ہو کر راہداری کے زینے اتر جاتا ہے۔

غیر واضح شبیہیں بن رہی تھیں۔۔۔مبہم آوازوں کا شور اس کے ذہن و دل میں ہر کہیں گونجنے لگا تھا۔ یوں جیسے بہت سے جانے پہچانے چہرے اس کے اندر ہی اندر گلا پھاڑ پھاڑ کر پورا منہ کھولے ہوئے چیخنے چلانے اور اپنی پہچان کروانے کی کوشش کر رہے ہوں اور وہ ان سب سے آگے بہت دور کہیں بھاگتی ہی چلی جا رہی ہو۔ یہ کوئی بے ہوشی یا نیند نہیں تھی۔۔۔وہ پورے ہوش سے جاگتے ہوئے یہ سب محسوس کر رہی تھی۔ اور پھر اندر کے اسی شور و خلفشار سے گھبرا کر یکا یک ہی وہ اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مم۔۔۔مجھے میرے کمرے میں جانا ہے زائشہ۔۔۔ابھی کے ابھی۔۔۔"

انگلی سے دو دفعہ زمین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے "ابھی کے ابھی" پر زور دیا تھا۔ اس کی آواز اپنے اندر سر پٹختے ان تاریک ہیولوں کے خوف سے کانپ رہی تھی۔

ادھر کب سے اس کی حالت و کیفیت پرکھتی وہ دونوں بیک وقت اٹھیں۔

"ہاں بالکل بیٹا۔۔۔چلو ابھی چلتے ہیں۔ کیا ہوا؟ سب خیر تو ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے ناں؟"

اسے تھامے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھاتی نمرہ نے بہت محتاط لہجے میں سوال کیا تو ایک لحظہ کو رک کر باری باری بڑے غور سے ان دونوں کی شکلیں دیکھتی وہ آس پاس ماحول پر بھی یوں نگاہ گھمانے لگی گویا اسے کسی بھی شے کی حقیقت پر یقین نہیں ہو۔

"نہیں۔۔۔میرے سر میں درد ہے۔ بہت زیادہ درد ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔"

اپنی بات دہراتے ہوئے اپنے منہ پر بے وجہ ہاتھ پھیر کر وہ گویا اپنے بھی "ہونے" کا یقین چاہ رہی تھی۔

اب مریم نے پلکیں جھپک کر نمرہ کو مکمل خاموشی اختیار کرنے کا کہا تو اسی جرح کی مد میں مزید کچھ کہتی وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔ جونہی اس کی اڑی اڑی رنگت اور متفکر تاثرات کو دیکھتی، پرکھتی وہ دونوں نچلے برآمدے میں داخل

ہو کر اوپری منزل کے زینوں کے جانب بڑھنے لگیں باہر مینہ پورے زوروں سے برسنے لگا۔

قصہ المختصر یہ کہ ثومیہ کو اس کے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹاتے ہوئے، اس پر کمبل برابر کرتی وہ دونوں باہر نکلیں اور ڈاکٹر صبا کو اس کی موجودہ حالت کے متعلق آگاہ کرنے کے لیے تیز تیز قدموں سے چلتی اس کے کمرے کی جانب بڑھنے لگیں جو کہ اسی راہداری میں دائیں طرف واقع تھا۔ سوئے اتفاق جونہی وہ اس کے کمرے کے نزدیک پہنچیں اندر سے ہنستی مسکراتی ہوئی یہاں کی تینوں ڈاکٹرز یعنی صبا اکبر گل، شبانہ اسلم اور ماہ نور سلیم ایک ساتھ برآمد ہوئیں۔ موسم کا اثر تھا شاید کہ وہ سب بھی خلافِ معمول کافی خوشگوار موڈ میں تھیں۔

ان دونوں کو دیکھا تو کے چہروں پر رقم " تشویش " کا خاص تر تاثر پڑھتی ڈاکٹر صبا تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھی۔

" کیا بات ہے گرلز؟ خیر تو ہے؟ بینا۔۔۔ آئی مین ثومیہ تو ٹھیک ہے ناں؟"

بلا کے تجربہ کار لب ولہجہ میں سوال کرتے ہوئے اس نے بے ساختہ ثومیہ کے کمرے کی جانب بھی دیکھا۔

" وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔۔۔ پتا نہیں ڈاکٹر۔ لیکن ہمیں لگتا ہے اس کی یادداشت واپس آ رہی ہے۔۔۔"

جواباً بنا کسی توقف مریم نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا تو ڈاکٹر شبانہ اور ماہ نور سلیم بھی تین چار قدم مزید آگے بڑھیں۔

" کھل کر بتاؤ چندا۔ پوری تفصیل سے۔۔۔ کیا ہوا ہے؟"

ڈاکٹر صبا نے اس بار قدرے بے تابی سے پوچھا تو باری باری ان سب کو دیکھتی وہ انہیں کچھ دیر قبل کی ساری تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی۔ جبکہ ثومیہ کے رویہ و انداز سے متعلق ہر بات پر سر کو مُسلسل اثبات میں ہلاتی ہوئی نمرہ گویا اس کی باتوں کی تائید کرنے لگی۔ باہر کسی ٹین کی چھت پر چھاجوں برستا مینہ۔۔۔ ان کے چہروں پر چھائے ہوئے گھمبیر تاثرات پر سوگوار دھنیں ترتیب دے رہا تھا۔

اُدھر ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی ثومیہ نے خود سے کمبل اتار کر پرے پھینکا تھا اور اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنا سر دبانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس پل عمیق تر فکریں موجزن تھیں۔ وہ کچھ دیر پہلے کی اپنی حالت پر غور کر رہی تھی۔ کئی خیال تھے جو کسی بڑے سے سوالیہ نشان کی مانند اس کے سامنے باقاعدہ

ناچ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے اسے یہ کیوں محسوس ہوا تھا کہ وہ ان جگہوں سے کوئی خاص قربت یا تعلق رکھتی ہے؟ اسے کیوں لگا تھا کہ اس نے وہ جگہیں پہلے بھی کہیں دیکھ رکھی ہیں؟ اور پھر ان دونوں کی گفتگو سنتے ہوئے اسے اکثر یہ کیوں لگتا تھا کہ یہ گفتگو یہاں دہرائی جا رہی ہے۔۔۔یعنی پہلے بھی کبھی ہو چکی ہے؟

دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں ابھرتے ان سب منظروں کو پھر سے سوچنے کی کوشش کی جن میں چلتے پھرتے ہیولے گویا اسے کچھ کہنے، کچھ سمجھانے کی جستجو میں تھے۔ لیکن اس بار سوائے تاریکی کے اسے کچھ سجھائی نہیں دیا تھا۔ پردہ فکر سے پار کہیں سب کچھ محو و گم ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی ادھوری شبیہہ، ہیولا اور سایہ۔۔۔یا پھر کوئی مبہم گونج۔۔۔کچھ بھی نہیں تھا۔

سوچ سوچ ہاری، اپنے آپ میں ہی بے طرح جھنجھلائی ہوئی وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور بیڈ سے دور ہوتی ہوئی کمرے کی واحد سلاخ دار کھڑکی میں جا رکی۔ باہر برستی تیز دھار بارش نے ایک لمحہ سے قبل اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا لی۔ سر جھٹکتے ہوئے اپنے تئیں ساری فکریں اتار پھینکتی وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی سلاخوں پر جماتے ہوئے باہر کشادہ احاطے میں جھانکنے لگی۔ سرسبز و شاداب اونچے اونچے درختوں سے پھسل کر ہری بھری گھاس، پختہ روش اور تارکول کی بنی چوڑی شاہراہ پر کسی پھوار کی مانند گرتے بارشی قطرات عجب فسوں گر منظر پیش کر رہے تھے۔ بارشی بوچھاڑ سے کھڑکی کی سلاخیں بھی گیلی ہو چکی تھیں اور ان سے قطرہ قطرہ گرتا پانی اس کی جکڑی ہوئی مٹھیوں پر جمع ہو رہا تھا۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی یوں بھیگا کہ عجب عجب کیفیات سے بندھی وہ بے ساختہ ایک ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر اس پر گرتی ہوئی بوندیں دیکھنے لگی۔ اس عمل سے اس کا دل بہل گیا تھا گویا کہ پلکیں میچ میچ کر ماتھے اور ناک کو کھڑکی کی سرد سلاخوں سے ٹکاتی وہ اپنا چہرہ بھی اس بارش میں بھگو دینے کی خواہش کرنے لگی۔ سرشاری کے اسی عالم میں طمانیت سے مسکراتے ہوئے اس نے ہولے ہولے آنکھیں موند لیں۔ اور یہی وہ پل تھا کہ جب اس کے ذہن میں ایک اور جھماکا سا ہوا اور اس کی آنکھوں میں کچھ دیر قبل ایک تصویر میں دیکھی گئی اسی کھڑکی کا منظر لپک گیا کہ جسے دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ یہ جگہ مجھے کہیں دیکھی دیکھی لگ رہی ہے۔ ذہن میں بنتے اس منظر میں کسی لڑکی کی دھندلائی ہوئی سی اک شبیہہ تھی جو اسی کی مانند

کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اس پر بارش کا پانی جمع کر رہی تھی۔اس یک لمحاتی کیفیت و منظر سے خوف زدہ ہو کر اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں، بازو اندر کر کے گیلا ہاتھ جھٹکتی وہ سرعت سے کھڑکی سے چند قدم دور ہٹی اور ہراساں نظروں سے پہلے اپنے دائیں بائیں اور پھر پچھلی سمت یوں گھورا جیسے اس کے سوا یہاں کوئی اور بھی موجود ہو۔لیکن اپنے سوا کسی بھی دوسرے کو نہ پا کر اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں کم ہونے کی بجائے مزید گہری ہونے لگیں۔سینے پر ہاتھ رکھ کر بے ترتیب ہو چکی دھڑکنوں کو سنبھالتی وہ تیز تیز قدموں سے چل کر بیڈ کی الٹی جانب آن ٹکی۔دونوں ہاتھ اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں پھنسا کر اس نے کچھ سوچنا چاہا تھا کہ وہی کوندا ایک بار پھر سے لپکا اور اس نے دیکھا کہ بالکل ابھی کی اس کی حالت کی مانند، کوئی اور لڑکی ہے، جو کسی اور بیڈ کی الٹی جانب ٹک کر، بالوں میں یونہی ہاتھ پھنسائے بیٹھی ہے۔بس۔۔۔اب اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔بے پناہ ڈر کر ایک جھٹکے سے سر اٹھاتی وہ پوری قوت سے چلانے لگی۔

" کون ہو تم؟ میں پوچھتی ہوں کون ہو؟؟؟ کیوں ہر جگہ تم ہی تم نظر آتی ہو؟"

اور اس دوران کھڑے ہو کر ہوا میں بے تحاشا ہاتھ چلاتی ہوئی وہ گویا اس نادیدہ شبیہہ کو خود سے دور بھگانے کی کوشش کر رہی تھی جو کہ اس کی جان تک سے لپٹ گئی تھی۔

" نکلو میرے کمرے سے۔۔۔نکلو بھی۔۔۔یا خدا کے لیے بتاؤ کون ہو تم؟"

جانے کسے مخاطب کر کے ہذیانی انداز میں کیا کیا کہتی وہ اسی طرح کمرے سے باہر نکلی اور راہداری میں آ کر بھی یونہی ہوا میں ہاتھ چلاتے ہوئے کئی دہائیاں دے کر فلک شگاف چیخیں بلند کرنے لگی۔

اُدھر وہ سب جو بڑے دھیان سے اس کی حالت کے متعلق ہی گفت و شنید کر رہی تھیں اسے یوں پاگلوں کی طرح چیختے دیکھ کر ایک ساتھ اس کی طرف بھاگیں۔

" کیا ہوا ہے بیٹا۔۔۔؟ ریلیکس ڈیئر۔۔۔سنبھالو خود کو۔دھیرج کرو پلیز۔"

سب سے پہلے اس تک پہنچ کر ڈاکٹر صبا نے اس کے دونوں بازو پکڑے اور بہت محبت سے اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔لیکن بڑی وحشت سے اس کی گرفت سے چھوٹتی وہ قدم قدم پیچھے ہوتے ہوئے پہلے کے سے انداز میں بہت چیخ چیخ کر بولی۔

" کون ہے وہ؟ کیوں بار بار نظر آتی ہے مجھے؟ ان تصویروں میں کون ہے؟ وہ سارے منظر جوں کے توں میرے ذہن میں کیوں آتے ہیں؟ ان میں ہر کہیں بس وہی ایک لڑکی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کون ہے وہ؟؟ میں پوچھتی ہوں کون ہوں میں؟؟"

بلک بلک کر اس شبیہہ کے متعلق پوچھتے ہوئے آخرش وہ اپنی شناخت بھی مانگنے لگی تو انہیں اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ لفظوں کی اسی شورش و تکرار میں اس کی آواز پھٹنے لگی تو وہیں فرش پر بیٹھتی وہ سر جھکا کر گویا خود سے ہی لپٹ کر رونے لگی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال، چیختا چلاتا لب و لہجہ......اور اس پر اس قدر ابتر کیفیت۔۔۔ نمرہ اور مریم کا دل گویا کسی نے مٹھی میں بھر کر بھینچ دیا تھا۔ تینوں ڈاکٹرز کے ساتھ وہ ایک بار پھر سے بھاگ کر اس تک آئیں۔

" ریلیکس بیٹا۔۔۔ کام ڈاؤن۔۔۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کون ہے وہ؟ آپ پلیز آرام کریں تھوڑا۔ آپ کو صرف آرام کی ضرورت ہے۔ اٹھیں شاباش۔"

ایک گھٹنا موڑ کر فرش پر اس کے ساتھ بیٹھتی ڈاکٹر شبانہ اسلم اسے بہت محبت سے پچکارتے ہوئے شانوں سے تھام کر اٹھانے لگی تو جواباً اس نے بڑی ہراساں نظروں سے باری باری ان سب کی طرف دیکھا۔

" کون ہوں میں؟؟ خدا کے لیے مجھے بتاؤ کون ہوں میں؟ اور وہ لڑکی۔۔۔ جو بار بار مجھے دکھائی دیتی ہے وہ کون ہے؟"

حلق سے چیختے ہوئے وہ بدک کر پیچھے ہوئی تو دونوں گھٹنے زمین پر لگاتے ہوئے ڈاکٹر شبانہ اسلم سے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ مریم اور نمرہ ایک ساتھ آگے بڑھیں تو ڈاکٹر ماہ نور سلیم نے بازو آگے کرتے ہوئے جلدی سے انہیں روک لیا۔

" آپ لوگ آگے نہیں ہوں پلیز۔۔۔ خدشہ ہے کہ آپ کی وجہ سے وہ زیادہ ردعمل کا مظاہرہ کرے گی۔"

اس کی بات پر نینوں میں بے شمار "نیر" لیے وہ اپنے قدموں پر ہی جم گئیں تو ڈاکٹر ماہ نور بھی آگے بڑھ کر ثومیہ کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی پل دور راہداری کے ابتدائی سرے سے دو نرسیں بھاگتی ہوئی اس طرف آنے لگیں۔ یقیناً انہیں اس شور شرابہ کا پتا ذرا تاخیر سے چلا تھا۔ اِدھر خود کو ان تینوں ڈاکٹرز کی گرفت سے

آزاد کروانے کی کوشش کرتی ثومیہ اب فرش پر نیم دراز ہو چکی تھی اور اسے بازوؤں سے تھام کر کسی انتہائی جارحیت سے باز رکھنے کی کوشش میں وہ سب بری طرح ہانپنے لگی تھیں۔

"دور رہو سب مجھ سے۔۔۔کون ہو آپ لوگ؟ بتاتے کیوں نہیں کہ کون ہے وہ جو مجھے بار بار نظر آتی ہے؟ بتاؤ بھی۔۔۔وہ مجھے کیوں۔۔۔نظر۔۔۔آتی ہے؟؟؟"

اپنے لفظ لفظ پر بھرپور زور دیتے ہوئے وہ پوری جان سے چلائی اور آخرش ساری مزاحمت ترک کرتے ہوئے بالکل ڈھیلی سی ہو کر ان کے بازوؤں سے چھوٹتی ہوئی فرش پر گر گئی۔ہاں بالکل۔۔۔پہلے سے سدھ بدھ کھوئی ہوئی وہ پاگل پاگل سی لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔

"ہینڈ اسٹریچر لاؤ گڈی۔۔۔اسے فوراً کمرے میں شفٹ کرو۔"

اس کے بے ہوش ہوتے ہی ڈاکٹر صبا اٹھی اور ابھی ابھی قریب آن رکی دونوں نرسوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے حکم دیا۔سر کو تسلیم میں خم کرتی "جی اچھا۔۔۔" کہہ کر وہ اسی وقت سٹریچر لانے پلٹ گئی تو سب کو اپنی پشت پر چھوڑتی ڈاکٹر صبا بڑے متوازن قدموں سے چلتی مریم اور نمرہ کے عین سامنے آن رکی۔

"مریم تم اپنا آج رات کا قیام یہاں طے سمجھو۔۔۔اور تم نمرہ۔۔۔اپنے فادر سے کہو کہ ہماری پہلی ہی فون کال پر پندرہ منٹ کے اندر اندر یہاں ہسپتال پہنچنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔اوکے؟؟"

با اعتماد لہجے میں باری باری ان دونوں کو مخاطب کرتی وہ ان کا جواب سنے بنا پلٹنے ہی لگی تھی کہ ایک بار پھر سے رکی اور ان کے فق چہروں پر نظر دوڑا کر مزید بولی۔

"پریشان نہیں ہو پیاری لڑکیو۔۔۔خدا سب بہترین کرے گا۔دعا کرو۔۔۔اور بس دعا ہی کرو۔"

پھر انہیں افتاں و خیزاں چھوڑتی وہ مڑ بھی گئی تو وہ نا سمجھی کے سے انداز میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔کئی سوال تھے ان کے دل میں جو زبان پر آنے کو مچل رہے تھے۔۔۔کئی فکریں تھیں جن پر انہیں تسلی کے چند حروف چاہیئے تھے۔لیکن وقت کا دامن اس قدر تنگ پڑنے لگا تھا کہ جوابات کی کوئی گھڑی تو کیا یہاں ساعت بھی میسر نہیں آنے والی تھی۔

خیر۔۔۔ثومیہ کو اس حال میں چھوڑ کر جانا تو مریم نے یوں بھی نہیں تھا۔اور اب ڈاکٹر کی جانب سے بھی ملا

رکنے کا یہ حکم۔۔۔گویا کوئی حجت تمام تھی اس پر۔

اس کے بعد سارے خیالات جھٹک کر انہوں نے ثومیہ کو اس کے کمرے میں منتقل کرنے میں نرسز کی مدد کی تھی اور خاموشی سے ایک جانب کھڑے ہو کر ڈاکٹر صبا کو اس کی آنکھوں میں ٹارچ لائٹس مار کر معائنہ کرتے دیکھتی رہیں۔ بالآخر دو تین ٹیکے اور ایک ڈرپ لگا کر جب سارا اسٹاف کمرے سے باہر چلا گیا تو نمرہ ایک طرف سے جھک کر بے ہوش۔۔۔یا "اب" شاید سوئی ہوئی ثومیہ کا ماتھا چومنے لگی جبکہ مریم ایک طویل سانس بھر کر انتہائی خاموشی سے کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں آن رکی۔

باہر بارش کی شدت اب بھی وہی تھی لیکن منظروں پر اتر چکی شام کی بدولت نگاہیں دور تلک سفر کرنے سے قاصر تھیں۔

کان لگا کر رم جھم۔۔۔ٹپ ٹپ۔۔۔برستی ہوئی بوندوں کا شور سنتی مریم مُسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ یہ ابرِ رحمت ان کے مقدر میں کس قسم رات رکھنے آیا ہے؟؟

☆......☆......☆

نمرہ نے گھر فون کر کے راشدہ بیگم کو ثومیہ کی موجودہ حالت سے تفصیلاً آگاہ کر دیا تھا اور برستی ہوئی تیز تر بارش میں بھی ٹھیک ایک گھنٹہ بعد وہ ان کے پاس ہسپتال میں تھیں۔ وہ شاہجہان عادل کے ساتھ آئی تھیں جو اب ہسپتال کے آؤٹ ڈور وارڈ میں مردانہ انتظار گاہ میں بیٹھے ان کی طرف سے کسی بھی اطلاع کے منتظر تھے۔ تینوں ڈاکٹرز میں سے صرف سیکشن ہیڈ ڈاکٹر صبا اکبر گل اپنے روم میں موجود تھیں جبکہ ڈاکٹر شبانہ اسلم اور ماہ نور سلیم چھٹی کر کے ہاسپٹل سے ملحقہ اپنی رہائش گاہ میں واپس جا چکی تھیں۔ ڈرپ ختم ہونے پر جو نرس ڈرپ اتارنے آئی اس نے انہیں ڈاکٹر صبا کی طرف سے ملا یہ حکم پہنچایا تھا کہ جونہی مریضہ کو ہوش آئے ڈاکٹر صاحبہ کو فوراً مطلع کیا جائے۔ مریم اور نمرہ بڑی بے قراری سے راہداری میں یہاں سے وہاں ٹہلتی ہوئی من ہی من اندر خدا کے حضور ثومیہ کی صحت یابی کے لیے التجائیں کر رہی تھیں اور اندر کمرے میں راشدہ بیگم تسبیح کے دانے پر دانے گراتی ہوئی کچھ نہ کچھ پڑھتی مُسلسل ثومیہ پر پھونک رہی تھیں۔ شاید سکون آور دواؤں کا اثر تھا کہ دو تین گھنٹے گذر جانے پر بھی ثومیہ ہنوز نیند میں تھی۔

باہر راہداری میں ٹہلتی وہ دونوں ہر دوسرے یا تیسرے چکر میں اس کے دروازے پر رک کر، چھوٹے مستطیل نما شیشے سے ایک نظر اندر لازمی جھانکتی تھیں۔ ان سب کے بدن کا ریشہ ریشہ، رُواں رُواں اور اک ایک انگ اس انتظار میں تھا کہ کب ثومیہ کو دوبارہ ہوش آتا ہے۔ دعائیں تھیں کہ درِ مستجاب پر لگاتار دستکیں دیتی قبولیت کی سند چاہتی تھیں اور یہ انتظار تھا کہ صدیوں سی طوالت اختیار کیے جاتا تھا۔ اب تو باہر کب سے ایک ہی شدت سے برستی بارش کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا اور بادلوں کی مدھم گھن گرج کے ساتھ ہلکی پھوار برس رہی تھی۔ ان سب کے جذبات و محسوسات اپنی جگہ لیکن جو جو کیفیات ثومیہ شاہجہاں اپنی جان پر جھیل رہی تھی وہ کسی کی بھی فکری حدود سے بہت ماوراسی تھیں۔ اپنی ہستی کی پہچان کے سفر میں وہ کامنی سی لڑکی بھی گویا یونہی صفحہ ہستی سے اوجھل ہو رہی تھی۔ ہاں بالکل۔۔۔ اپنی ہی ذات و شخصیت کی شناخت یا ادراک نہ ہونا آسان نہیں ہوتا۔۔۔ انسان اندرونی شکست و ریخت سے ہی مِٹ مُٹ جاتا ہے۔

بالآخر مریم اور نمرہ جو کہ سارے دن کی ذہنی مشقت کے بعد یہ پریشانی بھی جھیل کر بہت تھک ہار چکی تھیں اندر کمرے کے ایک کونے میں دھرے سٹیل بینچ پر آن بیٹھیں اور کچھ ہی دیر بعد نیند کے غلبے کے باعث اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگیں۔ جبکہ اسی بینچ پر ایک جانب سمٹی بیٹھی راشدہ بیگم کی تسبیح کا پھیر بدستور جاری تھا۔

یہ کوئی نصف شب کا دورانیہ ہوگا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ثومیہ شاہجہاں کا تاریکیوں میں ڈوبا ذہن دھیرے دھیرے بیدار ہوا اور عالمِ خواب میں ہی اس کے لاشعور میں وہی دھندلائے ہوئے عکس پھر سے رواں ہونے لگے۔ وہی مسجد کا وسیع تر صحن۔۔۔ زینوں پر سر جھکائے بیٹھی لڑکی۔۔۔ کسی دوسری لڑکی کو گولائی دار حوض کے پاس چھوڑ کر اس لڑکی کی سمت بڑھتا وہ دراز قد لڑکا اور پھر سے وہی کبوتروں کے اڑتے ہوئے غول میں گول گول گھومتی لڑکی۔۔۔ تیزی سے بدلتے ہوئے مختلف مناظر میں سب کچھ کسی پرانی بلیک اینڈ وائٹ سکرین کی مانند آگے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ آوازوں کی وہی مخصوص سی گونج۔۔۔ اور اسی دراز قد لڑکے کے ایک جانب سے ہو کر نکلتی وہی شوخ سی لڑکی۔۔۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ لیکن اس بار ایک تبدل یہ آیا کہ اس نے اس منظر میں لڑکے سے کترا کر نکلتی اس لڑکی کے غیر واضح چہرے کی جانب بغور دیکھا تو اس کی پوری تصویر بننے لگی۔ ذرا سا دھیان اور لگانے پر اس کے پورے بدن کو ایک جھٹکا لگا تھا۔

ارے۔۔۔یہ تو وہ خود تھی۔۔۔بینا بنت آدم۔

جونہی اس نے اس خواب کی سی کیفیت میں خود کو پہچان لیا تو آس پاس گونجتی آوازیں بھی صاف ہونے لگیں۔

"اے سنو۔۔۔تم کہیں بھی جاؤ تو لوٹ آنا۔۔۔ان راہداریوں میں بھٹکتی ہوئی میری اک یاد ملے گی۔"

خواب میں اس لڑکی کو یعنی اسے خود کو پیچھے سے پکارتا وہ لڑکا بھی اب بالکل صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔اس کا چہرہ بھی بہت جانا پہچانا سا تھا۔وہ ذہن پر زور دینے لگی۔کون ہے یہ؟؟؟

"محبت کی ہے ناں۔۔۔؟ تو اس پر صبر بھی کرنا سیکھو۔ہاں سفیر۔۔۔محبت صرف محبت نہیں ہوتی۔۔۔محبت مرگ ہوتی ہے۔"

اگلی گونجتی ہوئی آواز سے منظر یکا یک بدلا اور کسی راہداری میں اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ بہت زچ سی ہو کر کہہ رہی تھی۔

اس لڑکے کی پہچان ہو گئی تھی۔۔۔وہ سفیر تھا۔لیکن اگلا منظر ایک بار پھر سے اسے پورے بدن سے ہلا گیا تھا۔وہ کسی صحن میں کھڑی تھی۔۔۔نیم تاریکی میں۔۔۔اور سفیر اس کے سامنے بڑے جذبات میں رہ کر بول رہا تھا۔

"محبت کی ہو ناں۔۔۔ تو اس پر صبر نہیں آتا ثومیہ۔محبت ہے۔۔۔کوئی مرگ تھوڑی ہے۔"

اور اسے اپنے چہرے کی پہچان کے بعد اپنا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔وہ ثومیہ تھی۔اور وہ صحن۔۔۔وہ اس کا اپنا گھر تھا۔ہاں وہ خود کو پہچان چکی تھی۔حالت نیند میں ہی اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ بینا بنت آدم نہیں بلکہ ثومیہ شاہجہاں ہے۔اور اگلے سارے مناظر اس پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔اس کے ذہن میں ایک ایک کر کے سارے واقعات کی کڑیاں بڑی ترتیب سے آپس میں ملنے لگی تھیں۔وہ مُسلسل اپنے ماضی کے تعاقب میں تھی۔

ادھر راشدہ بیگم نے پہلے اسے کسمساتے اور پھر پورے بدن سے جھٹکے کھاتے دیکھا تو بہت گھبرا کر ان دونوں کو کاندھے سے ہلانے لگیں۔

"اٹھو جلدی۔۔۔دیکھو ثومیہ کو کیا ہو رہا ہے؟ ڈاکٹر کو بلاؤ فوراً۔ میں تب تک تمہارے بابا کو اطلاع کرتی ہوں۔"

ان کے جھنجھوڑنے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھیں اور ثومیہ کو یوں لگاتار جھٹکے کھاتے دیکھ کر فقط ایک پل کو اس کے اوپر رکیں اور پھر دونوں ایک ساتھ باہر کی جانب ڈاکٹر صبا کو بلانے کے لیے بھاگ گئیں۔ جبکہ راشدہ بیگم ایک ہاتھ سے شاہجہان عادل کو فون ملاتی ہوئی دوسرا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھتی تیز تیز ہلتے ہونٹوں سے کوئی دم کرنے لگی تھیں۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر صبارات کے اس پہر آن ڈیوٹی ایک نرس کے ہمراہ ان دونوں کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آمد تک ثومیہ کو لگتے جھٹکے کافی کم ہو چکے تھے۔ بڑے پیشہ ورانہ انداز و مہارت سے اس نے ایک مخصوص وقفے سے مدھم مدھم جھٹکے کھاتی ثومیہ کا معائنہ کیا اور نرس کو ایک ضروری ٹیکہ لگانے کی ہدایت کرتے ہوئے ان تینوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اسے کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا۔ آپ سب پریشان نہیں ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا ان شاءاللہ۔" سب کو اجتماعی تسلی دینے کے بعد اس نے بنا کسی توقف راشدہ بیگم کو مخاطب کر کے پوچھنے کے سے انداز میں کہا۔

"آپ نے ان کے فادر کو اطلاع کر دی ہوگی؟ میں نے کہا تھا کہ جب اسے ہوش آئے انہیں یہیں روم میں بلوا لیجیے گا۔ خیر میں انٹر کام پر گارڈز کو بتا چکی ہوں۔ وہ آئیں گے تو انہیں روکا نہیں جائے گا۔"

جواباً انہوں نے مثبت انداز میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔

"جی بتا چکی ہوں۔ وہ بس آ رہے ہیں۔"

ان کے جواب پر نرمی سے مسکراتے ہوئے وہ نمرہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں اپنے روم میں ہوں چندا۔ اس کے ہوش میں آتے ہی۔۔۔ یا اس سے پہلے ایسی ہی کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فوراً بلا لینا۔"

اور اپنی بات مکمل کر کے وہ ابھی پلٹی بھی نہیں تھی کہ اسی پل گھبرائے ہوئے تاثرات کے ساتھ شاہجہاں عادل اندر داخل ہوئے۔ سب نے بیک وقت ان کی آمد پر دھیان کیا اور ان میں سے کوئی ایک بھی فرد ابھی کچھ بھی نہیں

بولا تھا کہ اسی ہی پل خواب میں اپنا باغی انداز میں اپنے بابا کے مقابل رکنا، دوبدو ہونا، پھر بھاگنا اور سیڑھیوں سے گرنا دیکھ کر بہت ڈری ہوئی ثومیہ ایک زوردار چیخ کے ساتھ اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی۔ اس کی سب سے پہلی نگاہ اپنے عین سامنے ایک ترتیب میں کھڑی مریم، نمرہ اور ڈاکٹر صبا پر پڑی اور پھر اس نے بے تحاشا حیرانی سے ایک طرف کھڑی راشدہ بیگم پر نگاہ کی۔ کمرے کا اجنبی ماحول، نرس، ڈاکٹر گاؤن اور اسٹینڈ پر ٹنگی ڈرپ دیکھ کر اسے فقط ایک لحظہ لگا ہوگا ساری صورتحال سمجھنے میں اور پھر وہ شاہجہان عادل کی طرف دیکھتے ہوئے ہراساں سی ہو کر بے طرح چلانے لگی۔

"میں شادی نہیں کروں گی نمرہ۔ بابا سے کہہ دو کہ میں فواد سے شادی نہیں کروں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن یہ شادی ہرگز نہیں کروں گی۔"

خوف سے سمٹتے ہوئے وہ یوں اپنا سر ٹٹولنے لگی جیسے کسی زخم کو تلاش کرنا چاہ رہی ہو۔ لیکن کسی زخم کو نہ پا کر اس کے چہرے پر یکا یک کئی طوفان امنڈ آئے۔ اور جونہی وہ سب اسے سنبھالنے کے لیے ایک ساتھ اس کی طرف بڑھیں اس نے اسی چیخ و پکار میں مریم کو مخاطب کیا۔

"مریم پلیز۔۔۔ انہیں بتاؤ کہ میرا اسفیر سے ایسا ویسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی۔"

ہاتھوں اور سر سے مُسلسل نفی میں اشارے کرتی وہ بار بار شاہجہان عادل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کے اس واویلے سے سب پر آشکار ہو گیا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہو چکی ہے۔ اور اس کی یادداشت ٹھیک اسی جگہ سے جڑی تھی کہ جہاں سے ٹوٹ گئی تھی۔

"بالکل ایسا ہی ہے جیسا تم کہہ رہی ہو۔ میں سب کو بتا بھی چکی ہوں۔ لیکن پلیز تم خود کو سنبھالو ثومیہ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔"

تیزی سے اس کے ہاتھ پکڑتی مریم نے اس پر جھکتے ہوئے اسے واپس لٹانے کی کوشش کی تو وہ بہت مچل کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

"نہیں مریم۔۔۔ بابا نہیں مانتے۔ یہ زبردستی میری شادی فواد سے کرنا چاہتے ہیں۔ میں چھت سے کود کر

جان دے دوں گی لیکن فواد سے شادی نہیں کروں گی۔ نمرہ بتاؤ ناں اسے سب۔۔۔ تم خاموش کیوں ہو؟ ماما۔۔۔ آپ بتائیں ناں۔۔۔ بولیں ناں پلیز کہ اس بات پر انہوں نے مجھے کتنے زوردار تھپڑ مارے تھے۔۔۔"

بری طرح روتی بلکتی ہوئی وہ بار بار شاہجہان عادل کی طرف ڈری سہمی نگاہوں سے دیکھ کر بولی تو ڈاکٹر صبا اور مریم نے ایک ساتھ حیرت در حیرت اس ساری "فیملی" کی طرف دیکھا کہ جنہوں نے ان سے ثومیہ کے سیڑھیوں سے "حادثاتی طور پر" گرنے کا جھوٹ بولا تھا۔ یہاں تو معاملہ ہی کوئی اور تھا۔ اس کے انداز پر وہ سب تو گویا پتھر کے ہو چکے تھے اور یوں ٹکر ٹکر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جیسے بیچ چوراہے کسی نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا ہو۔

ایک پل کے لیے نگاہیں زمین میں گاڑے ہوئے شاہجہان عادل کو یوں لگا جیسے یہ میدانِ حشر ہے اور وہ نامہ اعمال ہاتھوں میں لیے کسی کٹہرے میں کھڑے ہیں۔

اور انہیں ٹھیک لگا تھا۔۔۔ یہ روزِ حشر ہی تھا۔ کیونکہ اگلے ہی پل ثومیہ شاہجہاں کو اپنی پشت پر یونہی روتے، بلکتے اور چیختے ہوئے چھوڑتی ڈاکٹر صبا اکبر گل بڑی ثابت قدمی سے چلتی ہوئی ان کے عین مقابل آن جمی تھی۔

"جہاں تک ہماری اطلاعات ہیں یہ تو حادثاتی طور پر سیڑھیوں سے گری تھیں ناں؟ تو اب یہ سب کیا ہے شاہجہان صاحب؟"

ابروؤں کی دلکش تان کو مدھم جنبش دیتی وہ بلا کے کٹیلے لہجے میں گویا ہوئی تو انہوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس بار اس نے انہیں "انکل" کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ جواباً انہوں نے کچھ کہنے کی جسارت کی ہی تھی کہ ان کی بات کاٹ کر وہ مزید بولی۔

"آپ سب کی ساری وضاحتیں بعد میں آرام سے سنوں گی۔ ابھی بس یہ بتائے دیتی ہوں کہ ثومیہ کو اس کی مرضی کے بنا یہاں سے لے جانے کا سوچیے گا بھی مت۔ صبح شام مجھے بیسیوں کالز آتی ہیں مختلف این۔جی۔اوز کی طرف سے جو ایسی ہی کسی کہانی کی متلاشی ہوتی ہیں کہ جسے میڈیا پر اٹھا کر وہ نام اور فنڈنگ سمیٹ سکیں۔ لہٰذا محتاط رہیئے گا اور بس۔۔۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک لحظہ بھی مزید ان کے سامنے رکے بنا ہٹی اور بیڈ کے قریب افتاں وخیزاں کھڑی

نمرہ کو ایک طرف کر کے ہذیانی انداز میں چیختی ثومیہ کو دونوں بازوؤں میں بھر کر اپنے ساتھ لپٹا لیا اور نرس کو کوئی ٹیکہ بھرنے کا اشارہ کرتی باری باری ان سب کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

شاہجہان عادل نے شکستہ تر نگاہوں سے ایک نظر اپنی شریکِ حیات اور دونوں بیٹیوں کو دیکھا اور خاموشی سے واپس پلٹ گئے۔

اس کہانی میں اتنے موڑ آرہے تھے کہ اس سے وابستہ اک ایک شخص و فرد چونک جاتا تھا۔

☆......☆......☆

"تم دیکھ رہی ہو مریم کہ اس کی حالت کیا ہے؟ وہ بضد ہے اور ایک ہی گردان کیے جاتی ہے کہ اس کی شادی زبردستی فواد سے کروائی جا رہی تھی۔ اور افسوس ہے کہ وہ خودکشی کے ارادے سے چھت کی طرف جاتے ہوئے سیڑھیوں سے پھسلی ہے اور یہاں اسے حادثہ قرار دے کر ہمارے پاس رکھا گیا۔ پھر نمرہ اور ان کی ماما نے بھی ہمیں سچ نہیں بتایا کہ دراصل ہوا کیا تھا۔ تو ایسی صورتحال میں ہم کس پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟ تم دیکھ سکتی ہو کہ اس کی سوئی رات سے ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی ہے کہ مجھے فواد سے شادی نہیں کرنی۔ میں خودکشی کرلوں گی لیکن اس سے شادی نہیں کروں گی وغیرہ۔ وہ تو اپنے بابا کے نام سے ہی خوف کھاتی ہے۔ اب اس قدر بری، ابتر اور سہمی ہوئی حالت میں اسے ڈسچارج ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔"

اگلی صبح تاسف سے اپنی میز کی دوسری جانب سر جھکائے بیٹھی نمرہ کو دیکھتے ہوئے مُسلسل بولتی یہ ڈاکٹر صبا تھی جو کہ اسی کے ساتھ بیٹھی مریم جہانگیر سے مخاطب تھی۔ مریم اپنے طور پر اس سے ثومیہ کے حوالے سے تفصیلاً بات کرنے آئی تھی اور ابھی اس نے ٹھیک سے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ اس کی آمد کا مقصود سمجھ کر ڈاکٹر صبا خود سے شروع ہوگئی تھی۔ اس کی بات پر مریم نے فقط ایک نظر نمرہ کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں دھیرے دھیرے بولنا شروع ہوئی۔

"جی بالکل۔۔۔ میں جانتی ہوں ڈاکٹر کہ نمرہ کی غلطی ہے۔ اسے کم از کم ہمیں ضرور بتا دینا چاہیے تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ تا کہ ہم ذہنی طور پر تیار ہوتے اور اس بات کو سمجھنا یا قبول کرنا آسان ہوتا۔ یہ تو میرے لیے بھی بہت حیران کن بات رہی کہ ثومیہ کی شادی زبردستی اس کی پھوپھو کے بیٹے فواد سے کی جا رہی تھی اور ردعمل میں

انکار کرتے ہوئے اس نے خودکشی کا سوچ لیا تھا۔"

اس کے یوں کہنے پر نمرہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن کپکپاتے ہوئے لبوں کے ساتھ خاموش ہو رہی تو اس نے مزید کہا۔

"بہرحال میں ثومیہ کو ڈسچارج کرنے کا نہیں کہہ رہی۔ میں بس یہی کہنے آئی ہوں کہ کم از کم نمرہ اور آنٹی اس معاملے میں یقینی بے قصور ہیں۔ ثومیہ ان پر مکمل بھروسہ کر رہی ہے اور انہیں اپنے آس پاس موجود دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہے۔ رہی بات ہسپتال میں واقعہ کی اصلیت چھپانے کی تو ہمارے معاشرے کو آپ جانتی ہی ہیں کہ لڑکیوں سے متعلقہ کسی بھی ایسی بات کو کس کس زاویے سے موڑ کر کیا کیا رنگ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اسی خوف کہ کہیں اصل بات "پبلک" نہ ہو جائے انہوں نے مصلحتاً یہ جھوٹ نبھایا ہے کہ اس کا سیڑھیوں سے گرنا ایک حادثہ تھا۔ اور یقین کریں اگر حالات کا تجزیہ کیا جائے تو آپ بھی یہی کہیں گی انہوں نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ اس طرح لوگوں کے چبھتے ہوئے سوالات سے بچ کر صرف ایک طرف توجہ مرکوز رکھتے ہوئے وہ سب اس کی بہتر مدد کر سکے ہیں۔"

اس نے یہاں تک کہہ کر باری باری ان دونوں کے تاثرات جانچے تو ڈاکٹر صبا اپنی کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئی جبکہ نمرہ نے بہت ہی مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ نم نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"رہی بات ان کے بابا کی تو نمرہ اور آنٹی کا بھی یہی کہنا ہے کہ اس دن کے بعد سے وہ بالکل چپ ہو گئے ہیں۔ ان سے ان کا رویہ بھی بہت بدل گیا ہے اور اب وہ پہلے کی طرح سخت گیر بھی نہیں رہے۔ میں جانتی ہوں بہت مشکل ہوگا ثومیہ کو سمجھانا۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اسے قائل کر سکتی ہوں اور گھر جانے میں ہی تحفظ ہونے کا یقین دلا لوں گی۔ باقی ان کے اگلے گھریلو معاملات کے حوالے سے نمرہ اور آنٹی کا کہنا ہے کہ وہ خود سنبھال لیں گی اور یقیناً ثومیہ سے مزید کوئی زبردستی نہیں برتی جائے گی۔"

بات مکمل کرتے ہوئے اس نے سوالیہ نظریں ڈاکٹر صبا پر جمائے رکھیں تو باری باری ان دونوں کی شکلیں دیکھ کر اس نے ایک مبہم ہنکارا بھرا۔

"ہمم۔۔۔ میں ہر بات سمجھ رہی ہوں مریم۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی شادیوں کے

معاملے میں اپنی بیٹیوں سے یوں زور زبردستی کرتے ہیں۔اب دیکھوناں ان کے گھر کا معاملہ تھا یہ۔۔۔ جسے پیار سے سلجھایا جانا چاہیے تھا۔اور دیکھو کہ بات کہاں تک پہنچی۔۔۔ پاگل خانے تک۔۔کتنا جھیلا ہے اس معصوم نے ان کی اس بے جا سی ضد کو۔"

انتہائی متاسف لہجے میں کہتے ہوئے اس نے یہاں ایک چھوٹا سا توقف بھرا اور اپنی کرسی سے اٹھ کر نمرہ کی طرف آتے ہوئے مزید بولی۔

"خیر اب بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

نمرہ کے سامنے میز کے کونے پر ٹکتے ہوئے اس نے اس کی تھوڑی کو چھوا تھا۔وہ آنکھوں میں لبالب آنسو لیے اسے بس خاموشی سے دیکھنے لگی۔اسے یوں پراسرار انداز میں نمرہ سے "مصروفِ عمل" دیکھ کر مریم تیزی سے بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ انکل کو این۔جی۔اوز کی جو دھمکی آپ نے لگائی تھی اسے بس اس حد تک قائم رکھیں کہ ہمیں ثومیہ کو قائل کرنے اور واپس گھر لے جانے کا دورانیہ میسر آجائے۔اس سے زیادہ ہم اس بات کو اچھالنا نہیں چاہتے۔۔۔پلیز۔۔۔"

اور اس کی بات پر گردن موڑ کر ایک گہری نگاہ سے گویا اس کے لب ولہجہ اور لفظ و بیان کی حقیقت و مضبوطی پرکھتے ہوئے ڈاکٹر صبا اکبر گل جواباً فقط یہی بولی تھی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔اسے یقین دلاؤ کہ وہ محفوظ ہے اور اس کی مرضی کے بنا اس کی زندگی سے متعلق کوئی فیصلہ کبھی نہیں کیا جائے گا۔۔۔تو اسے واپس لے جاؤ۔مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

اور بات مکمل کرتے ہوئے ان کا کوئی بھی جوابی تاثر یا ردعمل دیکھے بنا میز کے کونے سے اٹھ کر کھڑکی کی جانب بڑھتی وہ پھر سے رکی تھی۔

"اور تم اچھی لڑکی۔۔۔"اس نے نمرہ کو مخاطب کیا تھا۔

"بہت سہہ چکی ہو پہلے۔۔۔اب ذرا سا ہنس بھی دو۔تمہیں بہن کی واپسی مبارک ہو۔جاؤ اور جتنا ہو سکے۔۔۔اس کا دھیان رکھو۔اس سے زیادہ سے زیادہ محبت کرو اور۔۔۔بس۔"

انہیں حیراں ہی چھوڑتی وہ کھڑکی کے پاس جا رکی تو نمرہ نے بے ساختہ بڑی ممنون نظروں سے مریم کی طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ کر ڈاکٹر صبا کی طرف رخ کرتے ہوئے مدھم سی آواز میں "بہت شکریہ" کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ مریم بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی تھی۔

باقی سارا دن انہوں نے ثومیہ کے ساتھ اس کے کمرے میں ہی گذارا تھا۔ راشدہ بیگم تسبیح پر تسبیح پھیرتے ہوئے اپنے پروردگار کا شکر ادا کر رہی تھیں بس کہ اس نے ان کی لاڈلی بیٹی کو صحت یاب کیا ہے جبکہ وہ دونوں ثومیہ کے نیند سے جاگنے کے بعد اس کا ڈر ختم کرنے کی تگ ودو میں رہیں۔ گو کہ اب وہ ان سے بھی قدرے ڈر جھجک رہی تھی لیکن یہ تھا کہ کسی جارحانہ ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس کے سامنے اس کی یادداشت کی گمشدگی سے لے کر یہاں پاگل خانے میں داخلے تک کی ساری حقیقت کھول دی تھی۔ جواباً بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ بس خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ جیسے پہلے اسے اپنا ماضی نہیں یاد تھا ایسے ہی اب اسے اپنی بیماری کا یہ عرصہ ودورانیہ بھی بالکل یاد نہیں تھا۔ اسے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کل رات سیڑھیوں سے گری تھی اور آج اسے ہوش آ گیا ہے۔ لیکن اپنے سر پر کسی بھی زخم یا درد کی غیر موجودگی وہ واحد دلیل تھی جو اسے ان سب کی بات ماننے پر مجبور کر رہی تھی کہ ہاں وہ تین ماہ بعد اپنے ہوش وحواس۔۔۔ اپنی خود کی زندگی میں واپس آئی ہے۔

خیر قصہ المختصر کہ اس کے بعد ہر گذرتے دن کے ساتھ اس کی ذہنی حالت پہلے سے بہتر ہوئی تھی۔ ہفتہ دو ہفتے مزید گذرے تو آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن ان سب پر اس کا اعتماد پوری طرح لوٹ آیا تھا۔ ایک طرح سے اب وہ بالکل ٹھیک تھی۔۔۔ لیکن اس کے ذہن ودل میں صرف یہ خوف جم چکا تھا کہ وہ گھر واپس گئی تو اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف زبردستی فواد سے کر دی جائے گی۔ اور اسی بدولت جونہی اس کی ذہنی رو کسی بھی طور وہاں اٹکتی تو بے پناہ دہشت زدہ ہو کر وہ پھر سے چلانے لگتی تھی۔ اس نکتہ و پہلو پر آ کر وہ گویا سب سے بدگمان ہو جاتی تھی۔ یوں چیختے ہوئے وہ سب سے یہی اصرار کرتی کہ مجھ سے دور ہو جاؤ۔۔۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے فواد سے شادی نہیں کرنی ہے اور ہرگز نہیں کرنی۔

اور ہر بار اس کی چیخ وپکار پر یہاں کی تینوں ڈاکٹرز میں کوئی بھی ایک۔۔۔ یا اکثر وہ تینوں بھی بھاگی بھاگی

آتیں اور انہیں اس سے دور رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اسے کسی سکون آور دوا کے زیرِ اثر سلا دیتی تھیں۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ بالکل سنجیدہ اور چپ چاپ ہو گئی تھی۔ بہت کم تھا کہ وہ خود سے کبھی ان سے کوئی بات کرتی ہو۔ زیادہ تر وہی اس سے بولتی رہتیں اور وہ خاموشی سے انہیں سنا کرتی۔ یوں تھا کہ گویا اس کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع یا لفظ و حرف رہے ہی نہ ہوں۔ اس کی یادداشت واپس آنے کے بعد راشدہ بیگم شروع میں ہر روز ہسپتال آئیں اور پھر اسی پرانی روٹین سے نمرہ نے انہیں تین چار دن کے وقفے سے آنے کا کہہ دیا۔ اپنے بال وہ صرف راشدہ بیگم سے بنوایا کرتی تھی اور چونکہ وہ بالوں کی چوٹی نہیں بنواتی تھی تو کبھی راشدہ بیگم کے زیادہ دن نہ آنے کی بدولت اس کے لمبے بال یونہی الجھی الجھی لٹوں کی صورت اس کے شانوں پر بکھرے رہتے تھے۔

مریم کا بہت دل کرتا تھا کہ اس سے سفیر اور مصطفین کے بارے گفتگو کیا کرے۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ ان دونوں سے رابطہ نہیں ہو پایا اور وہ اس کے اس قدر بیمار ہونے سے تاحال لاعلم ہیں۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ان دونوں کا ذکر بھی اس کے لیے تکلیف دہ ہو گا لہٰذا اس حوالے سے لب بستہ رہ کر صرف منتظر تھی کہ کب وہ ذہنی طور پر اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ خود سے ان کے متعلق بات چیت کرے۔ ان کی دوستی جس طرح ٹوٹی تھی وہ پہلو اس قدر شکستہ تھا کہ مریم چاہ کر بھی اسے اس نہج پر نہیں لے جا سکتی تھی۔ سو وہ بالکل چپ تھی۔۔۔ اور ثومیہ تھی کہ اس کے چہرے پر بھی ڈھونڈے سے کبھی ایسا کوئی تاثر و جذبہ نہیں ملتا تھا کہ جس یہ پتا چلے وہ ان دونوں کو یاد کرتی ہے۔ اس نے لبوں کے ساتھ گویا دل کو بھی مہر بند کر لیا تھا۔ اس کی ذات اتنی جامد چپ سے جا لپٹی تھی کہ وہ بڑی ساکن، گہری اور پر اسرار لگنے لگی تھی۔ ہاں کبھی عالمِ وحشت میں گلے کی رگیں تھام تھام کر وہ بے طرح چیخنے چلانے لگتی تو مریم کو اس کے آتشیں لہجے میں دور کہیں بلکتی ہوئی "اک محبت" بھی نظر آتی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ اس کے من میں اس تعلق کے یوں ٹوٹ جانے کا بے شمار رنج ہے۔۔۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس درد کا بہاؤ کس طور، کس سمت، یا کس پہر میں ہو گا۔ ساری باتیں، ہر ہر پہلو اور ان کی کہانی سے وابستہ اک اک جذبہ۔۔۔ سب کچھ گویا جھجک کی ایک بے نام سی دھند میں لپٹا ہوا سا تھا۔ ہاں بالکل۔۔۔ ہوتے ہیں کچھ اذکار، جذبے اور ان کے پہلو بھی ایسے کہ جن کو ہمیں بے وجہ ہی خود پر حرام کر دینا ہوتا ہے۔ ہوتی ہیں کچھ سمتیں بھی ایسی کہ جن پر بھلے ہم بے شمار بھی چاہیں تو۔۔۔ نہیں جاتے۔

یہ خزاں رسیدہ سی ایک سرد موسمی دوپہر کا ذکر ہے کہ جب مریم جہانگیر پاگل خانہ میں تارکول کی بنی کشادہ شاہراہ پر بڑے متوازن قدموں سے چلتی ہوئی خواتین کے لیے مخصوص حصہ میں داخل ہوئی اور بمشکل چار پانچ قدم مزید بڑھ کر ٹھٹک سی گئی۔ مرکزی احاطے میں بائیں جانب واقع پرندوں کے پنجرے کے پاس بڑی محویت سے کھڑی ثومیہ اسے دور گیٹ سے ہی دکھائی دے گئی تھی۔ وہ آہستگی سے اس کے پاس چلی آئی۔

"السلام علیکم۔۔۔کیسی ہو ثومیہ؟"

اس کے پکارنے پر چونکے بنا وہ بڑے آرام سے مڑی تھی۔

"وعلیکم السلام۔اچھی ہوں۔تم کیسی ہو؟"

کچھ توقف سے جواب دیتے ہوئے اس نے اس کا بھی حال پوچھا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔نمرہ اور آنٹی نہیں آئیں آج؟ اکیلی کھڑی ہو؟"

اس کی دھول آلودہ لٹیں دیکھتی وہ سرسری لہجے گویا ہوئی۔

"نمرہ آئی ہے۔میرا کمرہ صاف کر رہی ہے۔ ماما کل آئیں گی۔شاید۔۔۔"

ایک نظر واپس چہچہاتے ہوئے پرندوں کو دیکھتی وہ یوں بولی جیسے اسے ان کی آمد پر یقین نہیں ہو۔ وہ ایسی ہی ہوگئی تھی۔کوئی بات بھی پورے یقین و وثوق سے نہ کرنے والی۔۔۔

"ہمم۔۔۔صحیح۔" دو قدم بڑھتی وہ بھی پنجرے کی جالیوں میں انگلیاں پھنسا کر کھڑی ہوگئی۔

"مریم ایک بات پوچھوں۔۔۔"

سر جھکائے اپنے پاؤں کے انگوٹھے اور مٹی سے کھیلتی ثومیہ نے یوں اچانک اور بڑے پُراسرار انداز میں کہا کہ وہ بے ساختہ متوجہ ہوئی۔ جانے کیوں اس کے انداز سے اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ یہاں صرف اسی کی آمد کی منتظر تھی۔ تفہیمی انداز میں "ہوں۔۔۔" کہہ کر اس نے سوالیہ نظریں گویا اس پر جما ہی لیں۔

"وہ تم۔۔۔تم مصطفین سے ملی ہو کبھی؟"

نظریں دائیں بائیں گھماتے ہوئے بہت محتاط لہجے اس نے یوں مصطفین کا نام لیا جیسے کسی شجرِ ممنوعہ کو چھو لیا ہو۔ مریم ایک سانس بھر کر کے رہ گئی۔ تو وہ مقام آ گیا تھا کہ وہ اپنی "کہانی" کا سامنا کر رہی تھی۔

"میں تب سے تم سے یہ بات کرنا چاہتی تھی ثومیہ لیکن تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ کوئی آزردہ موضوع شروع کیا جاتا۔آخری روز جس طرح سفیر نے ساری دوستی کو تہس نہس کیا تھا اس سے۔۔۔"

پنجرے کی جالیاں چھوڑ کر اس کے اور قریب ہوتے ہوئے تمہیدی انداز میں کہتی وہ ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ لال انگارہ آنکھوں سے اسے بے طرح گھور کر ثومیہ نے بات کاٹ دی۔

"میں نے صرف مصطفین کا پوچھا ہے مریم۔۔۔ مجھے اور کسی کا مت سناؤ۔جس شخص کی "بات" کر رہی ہو اس کا "نام" بھی ایسا ہے کہ میں زیست بھر کبھی سننا نہیں چاہوں گی۔"

انگلی اٹھا کر عجب شدتوں سے کہتے ہوئے اس کے لہجے میں وحشت کے ساتھ ساتھ بڑی نفرت بھی تھی۔مریم کو اس کے انداز سے خوف آیا جو کہ ایسا تھا جیسے وہ ابھی پھر سے چیخ پڑے گی۔

"نن۔۔۔نہیں ثومیہ۔۔۔ مصطفین سے رابطہ نہیں ہوا۔وہ نمبر بدل چکا ہے اور بہت تلاشنے پر بھی مجھے اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔اسے تمہارے بیمار ہونے کا علم نہیں ہے۔"بہت گھبرائے ہوئے انداز میں وہ جلدی جلدی تفصیل بتانے لگی تو اس کی آنکھوں کی لالی اور جلن یکا یک ہی بڑھنے لگی تھی۔

"وہ نہیں ملے گا۔۔۔وہ کسی کو نہیں ملے گا۔وہ کھو گیا ہے مریم۔۔۔وہ اب کبھی نہیں ملے گا۔"

اس کے نہ ملنے کی گردان دہراتی وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے آنسوؤں کے بہنے پر صدیوں سا قرض رکھتی تھی۔دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر دائیں بائیں جھولتی وہ جیسے اس کے ملنے کی نفی کر رہی تھی۔اس کی آہ و فغاں میں نالہ تھا۔۔۔فریاد تھی۔۔۔اور انتہا کی بے بسی بھی تھی۔بے ساختہ بڑھ کر اسے اپنے ساتھ بھینچتی مریم کو اس پر بہت زیادہ ترس آیا۔محبت جیسی وہ لڑکی۔۔۔محبتوں کی زد میں آ کر بے شمار بکھر گئی تھی۔

اس سے وابستہ کوئی ایک بھی شخص و فرد۔۔۔اس بات سے آگاہ و خبردار نہیں تھا کہ اس کی کہانی آگے کون کون سی کروٹیں لینے والی ہے۔وقت کی پوری پہریں حیرت در حیرت اس کہانی پر صفحہ در صفحہ گواہ ہو رہی تھیں۔

زندگی۔۔۔چل رہی تھی،جاری تھی اور رواں تھی باہر۔۔۔جبکہ اندر سارا۔۔۔ساکن تھا۔

وقت مُسلسل سرک رہا تھا۔۔۔کہانی اُدھر کی اُدھر ہی تھی۔

کہانیوں کی ایک اہم تر خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں بسے کرداروں کو خبر تک نہیں ہوتی اور یہ کسی بھی کروٹ سے انجام پکڑنے لگتی ہیں۔ کسی طور، کسی پہلو یا کسی بھی انگ سے یہ اس رنگ میں کھلتی ہیں کہ ساکن و حیراں سے ہوئے کردار قطار اندر قطار اپنے اختتامی کناروں سے آن ملتے ہیں۔ ایک مخصوص مقام اور لگے بندھے روز و شب میں ٹھہر چکی ان سب کی کہانی بھی اچانک پھر سے چلنے لگی تھی۔

یہ انہی دِنوں کی بات ہے جب ثومیہ شاہجہاں کی یادداشت واپس لوٹ چکی تھی کہ مریم جہانگیر کو اپنے یونیورسٹی پروفیسر سر علی عبداللہ صاحب کی طرف سے ایک کال موصول ہوئی۔ وہ عمرہ ادائیگی کی سعادتِ سعید کے سلسلہ میں مقامات مقدسہ روانہ ہونے والے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں مریم ان کی جگہ پر یونیورسٹی میں بطورِ اسسٹنٹ پروفیسر اپنی خدمات پیش کرے۔ اسے ان کی بات ماننی پڑی تھی کیونکہ بطورِ ایک فرمانبردار شاگرد وہ انہیں انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ادھر ثومیہ کی حالت ایسی تھی کہ یوں تو وہ بالکل ٹھیک تھی لیکن واپس اپنے گھر جانے کی بات سن کر وہ بے پناہ دہشت، دباؤ اور انجانے خوف و خدشات سے لپٹ کر پھر سے چیخنے چلانے لگتی تھی۔ یعنی اس حوالے سے اس کا اعتماد ابھی تک بحال نہیں ہو سکا تھا۔

"مجھے جانا ہو گا ثومیہ۔۔۔ میں کوشش کروں گی کہ میں ہر روز اگر نہیں تو ایک دن چھوڑ کر ایک دن لازمی آیا کروں۔ میں نے سر کو بھی تمہارے متعلق بتایا تھا۔ وہ بہت افسوس کر رہے تھے۔ یہاں مردوں کے آنے کی اجازت نہیں اور کچھ ان کے پاس وقت کم تھا وگرنہ وہ بھی تم سے ملنے کے لیے آنا چاہتے تھے۔ تمہاری بابت سن کر بڑے پریشان ہو گئے تھے۔"

یونیورسٹی جوائن کرنے سے ایک دن پہلے اس نے ثومیہ کو ساری تفصیلات بتا کر اپنے ہر روز نہ آ سکنے پر عذر پیش کیا تھا۔ وہ اس وقت ثومیہ کے کمرے میں تھیں اور نمرہ بھی پاس ہی کھڑی خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔

"ہمم۔۔۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔ تمہیں سر کو نہیں بتانا چاہیئے تھا۔ خواہ مخواہ انہیں پریشان کیا۔ خیر۔۔۔ تم جاؤ یار۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ اور سر سے کہنا اس بارگاہِ ایزدی میں میرے لیے خصوصی دعا کریں۔ بس۔"

جواباً بڑے متوازن لہجے میں قدرے ٹھہر ٹھہر کر اس نے گویا اسے "رخصت" دی تھی۔ مریم کی نگاہیں اس کی ابتر حالت میں الجھنے لگیں۔

"کیا دعا کریں۔۔۔؟"

جانے کیوں لیکن اس کی گنجلک زلفیں دیکھ کر بے ساختہ ہی اس کے منہ سے یہ سوال پھسل گیا تھا۔ بھلا دعاؤں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟ یہ تو کسی ایک پہلو سے بھی لگیں تو مقدر سنوار دیتی ہیں۔

"یہی دعا۔۔۔ کہ خدا اب میرے دل کو قرار دے دے۔"

لبوں کی خفیف سی چٹک سے اس نے یوں سوگوار لہجے میں کہا گویا دل کے قرار کی نہیں "ٹھہر جانے" کی دعا چاہی ہو۔ نمرہ نے عجب تڑپ کر مریم کی طرف دیکھا تو وہ بڑی محبت سے ثومیہ کا ہاتھ تھام کر اسے آہستگی سے دبانے لگی۔

"اپنا خیال رکھنا ثومیہ۔۔۔ میں آتی جاتی رہوں گی۔"

سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے اس نے بڑی رنجیدگی سے کہا تھا۔ اور بات مکمل کرتے ہی وہ واپس پلٹنے لگی تھی کہ اس نے اس کا تھاما ہوا ہاتھ یوں زور سے جکڑ لیا کہ وہ اپنی جگہ پر ایک جھٹکے سے رکی۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتی ہو۔ پاس کھڑی نمرہ کو بھی یہی محسوس ہوا تو سینے پر بندھے ہاتھ آہستگی سے چھوڑتے ہوئے وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔

"میں ڈاکٹر صبا سے مل کر آتی ہوں۔"

جواباً کچھ بھی کہے بنا ان دونوں نے اس کے کمرے سے نکل جانے کا انتظار کیا تھا۔

"کیا بات ہے ثومیہ؟ کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنتی مریم نے سوال کیا تو اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے ثومیہ بیڈ سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"ہاں وہ۔۔۔" اتنا کہہ کر ایک پل کے توقف سے وہ پھر سے بولی تھی۔

"وہ میں نے کہنا تھا کہ اگر وہاں کبھی مصطفین آیا تو اسے۔۔۔ تو اسے میری حالت کا مت بتانا۔"

یہاں وہاں دیکھ کر اس سے نگاہیں چراتی وہ اس انداز میں بولی کہ مریم کو اس کے لفظوں میں دب کر بے طرح بلکتی سسکتی حسرتیں آس پاس ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔اس کے انداز سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اس سے اپنی حالت کو من وعن مصطفین شجاع کے سامنے بیان کر دینے کی عرض گذار ہو۔ساری کیفیات کو بخوبی سمجھتی ہوئی مریم نے آنسوؤں کو پلکوں سے پار دھکیلا اور زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"ہمم۔۔۔ڈونٹ وری۔میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی۔کوئی بات نہیں کہوں گی۔"

اس کی کانچ تر آنکھوں میں جھانک کر وہاں تیرتے خدشات تھپکتی وہ فقط ایک پل کے لیے رکی اور پھر مزید کچھ بھی کہے بنا اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑواتی ہوئی پلٹ کر کمرے سے بھی نکلتی چلی گئی۔پاگل خانے کے وسیع برآمدے میں اونچے اونچے ستونوں کے مابین چلتے ہوئے وہ اپنی آنکھوں سے بے اختیار ہوئے آنسو پونچھتی رہی اور پھر یونہی روتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر نیچے صحن میں کھڑی نمرہ کے پاس آن رکی۔

"چلتی ہوں نمرہ۔۔۔اس کا بہت خیال رکھنا۔میں کل یا پرسوں یا جتنا جلدی ممکن ہوا۔۔واپس آؤں گی۔"

اس کے گلے لگ کر وہ تسلی دینے کے سے انداز میں بولی تو جواباً نرمی سے اس سے الگ ہوتے ہوئے نمرہ نے جذبات سے لبریز نظروں سے گویا اسے جی بھر کر دیکھا تھا۔

"جی مریم آپی۔۔۔میں انتظار کروں گی۔آپ سے مل کر ہمیشہ یہی لگا ہے کہ میری ایک نہیں دو بہنیں ہیں۔ مجھے اس پیارے احساس سے دوچار کرنے کا بہت شکریہ۔۔۔"

اور اس کی بات پر پیار سے اس کا گال تھپکتی وہ تیز تیز قدموں سے پختہ روش پر چل کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

حساس دل لوگوں کے مابین گفتگو صرف لفظوں میں نہیں ہوا کرتی۔۔۔ایک دوسرے کے لیے ان کے انداز،عوامل، نظریں اور محسوسات تک بولتے ہیں۔اس پل نمرہ کی محبت پاش نگاہوں نے دور تلک مریم جہانگیر کے گرد اپنی چاہتوں کا حصار بنائے رکھا تھا۔☆

☆......☆......☆

پتھریلی عمارتیں انسانوں کی طرح جلدی جلدی اپنا رنگ وخو نہیں بدلتیں۔یونیورسٹی ویسی ہی تھی جیسی وہ سب

چھوڑ کر گئے تھے۔ وہی کشادہ صحن اور اس میں دھرا بڑا سا سجاوٹی پتھر، پختہ روش اور گلاب کی کیاریاں، انہی جیسے طلبا و طالبات کی ٹولیاں اور ہر فکر سے آزاد ان کے بلند و بانگ قہقہے، وہی اونچے ستونوں پر مشتمل لمبی لمبی راہداریاں اور باقی سارے بام و در۔۔۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ ہاں ایک تبدل آیا تھا اور وہ یہ تھا کہ صحن میں بنی کیاریوں میں اب "سفید گلاب" کی جگہ "کالے گلاب" اگتے تھے۔ شاید اس کہانی کے سب کرداروں کے ساتھ ساتھ ان سے وابستہ پھولوں کا مزاج بھی بدل گیا تھا۔ بطورِ اسسٹنٹ پروفیسر چارج سنبھال کر مریم بہت زیادہ مصروف ہوگئی تھی۔ وہ جو وعدہ کر کے آئی تھی میں کل یا پرسوں لازمی واپس آؤں گی اسے وفا نہیں کر سکی۔ اس مصروفیت میں اس نے اگلا پورا ہفتہ صرف فون کالز پر ثومیہ کا حال احوال دریافت کیا اور حتی المقدور تسلی و تشفی کے بول بولتی رہی۔ یہاں کلاسز میں طلبا و طالبات کے سامنے ڈائس پر کھڑے ہو کر، لیکچرز کے بعد یہاں کی راہداریوں میں بے وجہ چکراتے ہوئے، اور کبھی کبھار مرکزی احاطے میں ایک مخصوص خط میں یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے اس کی نگاہیں بار بار انہی منظروں سے جا لپٹتی تھیں کہ جن میں کبھی وہ سب ایک ساتھ ہنستے کھلکھلاتے تھے۔ یہاں کے بام و در پر جا بجا اسے اپنے گروپ کی شرارتیں، قہقہے اور ہنسیاں بکھری ہوئی ملتی تھیں۔

کتنا حسین تھا وہ وقت۔۔۔ جو وہ سب ایک ساتھ یہاں گذار گئے تھے۔

اور کتنی اذیت تھی ان لمحوں میں جن سے لپٹ کر وقت کی وہ سب اچھائی یہیں کہیں گم ہوگئی تھی۔

اب راہداری کے ان زینوں سے وہ بڑی تیزی سے گذرا کرتی تھی کہ جن پر آخری روز ان سب کا جھگڑا ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا اگر وہ ان زینوں پر ایک پل بھی رکے گی تو وہی منظر اسے خود میں کہیں واپس کھینچ لے گا۔ ہاں وہ پل پل اس منظر سے نگاہیں چراتی تھی کہ جس میں وہ اس داستاں کے ہر کردار کی سچائی پر گواہی نہیں دے سکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کچھ یادوں، باتوں، پہلوؤں اور لوگوں سے فرار کسی طور ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ سب آپ کے اندر ہی کہیں اپنا گھر بنا چکے ہوتے ہیں۔ ہاں ہوتے ہیں کئی منظر بھی ایسے کہ جو آپ میں یوں بس چکے ہوتے ہیں کہ ان سے بچھڑنے کا مطلب مرنا ہوتا ہے۔

مریم کے اختیار میں نہیں تھا کہ اس کہانی کے ہر کردار کو ایک بار پھر سے کہیں آمنے سامنے رو کے اور اپنے سارے مشاہدات ایک ایک کر کے من و عن ان سب کے گوش گذار کر دے۔ بڑی رنجیدگی میں ڈھل ڈھل کر وہ

اکثر رونے لگتی تھی۔۔۔بہت دل سے ان دونوں کے پھر سے کہیں مل جانے کی دعائیں مانگتی تھی تا کہ وہ انہیں حقیقت بتا سکے یا ثومیہ کی موجودہ حالت سے آگاہ کر سکے۔

اور بڑے خلوص سے بہائے ہوئے اس کے یہ سارے "نیر" اس رنگ میں مقبول ہو جائیں گے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

خزاں کی ایک ابر آلود دوپہر میں یونیورسٹی سے واپس ہاسٹل جانے کے قصد سے وہ سر علی عبداللہ صاحب کے کمرے سے نکلی اور دروازہ کنڈی ومقفل کر کے کندھے پر پرس جماتی بڑے مگن انداز میں راہداری کے خارجی زینوں پر آئی۔اپنے دھیان میں تیزی سے زینے پھلانگتی جونہی وہ مرکزی گیٹ کی طرف لے جانے والی پختہ روش پر اتری،اس کی نگاہ سرسری طور پر صحن میں واقع گلاب کی کیاریوں کی جانب اٹھی اور یہیں اسے چونک جانا پڑا۔یکا یک رک کر وہ دور کیاریوں کے پاس موجود اس دراز قد لڑکے کی چوڑی پشت کو بغور تاکنے لگی جو وہاں اگے "کالے گلابوں" پر جھک کر دھیرے دھیرے ان پر ہاتھ پھیرتا ہوا ان کی خوشبو بھی سونگھ رہا تھا۔ایک لحظہ سے بھی پہلے وہ اسے پہچان گئی تھی۔ہاں وہ سفیر احمد ہی تھا جو یونیورسٹی احاطے میں موجود کیاریوں کے پاس شاید پرانی کسی یاد کو دہرا رہا تھا۔ایک پل کے لیے اس کی یہاں موجودگی پر مریم بے پناہ حیرت سے دوچار ہوئی تھی لیکن پھر فوراً اس نے خود کو سنبھال بھی لیا۔اس کی نگاہوں میں ماضی کا وہ منظر گھوما کہ جس میں کبھی انہی کیاریوں میں اگے ہوئے سفید گلابوں کے گرد سے سفیر ایک ایک کر کے سارے کانٹے ہٹا رہا تھا اور اس کے پاس کھڑے مصطفین اور ثومیہ آپس میں کوئی گفتگو کرتے رہے تھے۔تب اس نے یہ منظر راہداری کی ایک کھڑکی میں کھڑے ہو کر بہت دور سے دیکھا تھا۔کچھ توقف اسے اپنی نظروں کے حصار میں رکھ کر دھیرے دھیرے چلتی وہ اس کی پشت پر آن رکی۔۔۔اور اپنی پشت پر اس کی موجودگی سے یکسر بے خبر وہ آج بھی اسی انہماک سے "کالے گلاب" کی نازک ٹہنیوں میں مصروف ومگن تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو سفیر؟؟؟ یہی ناں کہ اب سارے گلاب "کالے" ہو گئے ہیں۔۔۔؟"

اسے مخاطب کرنے کے لیے اسے اس سے بہتر لفظ نہیں ملے تھے۔نہیں وہ اسے کوئی رعایت نہیں دینا چاہتی تھی لیکن ہر گفتگو سے قبل کچھ تمہید ہوا کرتی ہے۔

ادھر وہ بھی فوراً سے پیشتر اسے پہچان گیا اور بنا چونکے، سیدھا ہو کر بڑے اعتماد سے اس کی طرف پلٹا۔ مریم نے دیکھا کہ اس کی چاشن گر آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں اور باہم جکڑے لب یوں تھے گویا کبھی ہنسے ہی نہ ہوں۔ وہ حسین تر شخص عجب سوگوار سا تھا۔

"ہاں۔۔۔ یہی دیکھ رہا ہوں۔۔۔ دیکھ رہا ہوں کہ کبھی ان کیاریوں میں سفید گلاب اگا کرتے تھے۔"

جواباً کہتے ہوئے اس کا لہجہ گہرے پانیوں سا ساکن تھا۔ اس میں کوئی خاص تسلسل، ہلچل یا حرارت۔۔۔ ہر گز نہیں تھی۔ البتہ اس کی بجھی بجھی سی آنکھوں میں مریم کو دیکھ کر یک گونہ خوشی کا تاثر امنڈ آیا تھا۔ بڑے توازن سے دو قدم آگے آ کر اس نے مریم سے ہاتھ بھی ملانا چاہا۔

"تو ذرا اور غور سے دیکھو۔۔۔ کیا خبر کہ سفید گلاب پر یہ کالکیں مل دینے میں کچھ حصہ تمہارا بھی رہا ہو؟"

مصافحہ کے طور پر بڑھا ہوا اس کا ہاتھ تھام کر، کچھ جتلانے کے سے انداز میں یہ کہتے ہوئے اس نے فوراً چھوڑ بھی دیا تو بے ساختہ پلٹ کر وہ ایک نظر پھر سے ان کالے گلابوں کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں بسے طنز کو اس نے صاف صاف محسوس کیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ اس سے آخری روز والے اس جھگڑے کی بدولت خفا و نالاں ہے۔ فقط یک لحاتی توقف سے یہ طنز نظر انداز کرتے ہوئے اس نے مزید کہنا چاہا۔

"وہ میں۔۔۔ یہاں سے گذر رہا تھا تو سر علی عبداللہ صاحب سے ملنے کے لیے۔۔۔"

اور اس کی اس "بے وجہ" سی وضاحت کو بھی اس نے بڑے دوٹوک انداز میں بیچ راہ سے ہی اچک لیا تھا۔

"سر علی عبداللہ صاحب یہاں نہیں ہیں۔ وہ عمرہ ادائیگی کے لیے گئے ہوئے ہیں اور ایک مہینہ وہیں رکیں گے۔"

وہ یوں بولی جیسے کہہ رہی ہو بس تمہاری آمد کا مقصد ختم ہو گیا سو ابھی کے ابھی واپس پلٹ جاؤ۔

جواباً ایک "ہمم۔۔۔" کے مابین لب بھینچ کر وہ اس کے بدلے بدلے انداز پر کھنے لگا۔

"تم کیسی ہو مریم۔۔۔؟ اور یہاں یونیورسٹی میں خیریت سے؟"

بالآخر اس نے یوں پوچھا جیسے اسے جتا رہا ہو کہ حال احوال پوچھنے کا یہ کام اولاً کرنے والا تھا۔

"میں اچھی ہوں سفیر۔۔۔ الحمدللہ۔ تم خبر گیری ان کی کرو جو اچھے نہیں ہیں اور تمہیں علم بھی نہیں ہے کہ وہ کس

حال میں ہیں؟"

اس کی بات پر اس نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔۔۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا وہ مزید بولی تھی۔"اور میں یہاں اس لیے ہوں کیونکہ سر علی مجھے بطورِ اسسٹنٹ پروفیسر یہاں مقرر کر کے گئے ہیں۔"

اب کی بار بغور اسے دیکھتا وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا۔

"اوہ۔۔۔تو یہ طنزیہ لب ولہجہ اسی بدولت ہے شاید کہ تم بھی ایک بڑی شخصیت ہوگئی ہو۔۔۔"

جواباً مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور اپنی بات مکمل ہونے دینے کا اشارہ کیا۔

"یہ گفتگو میں گلابوں پر کالک مل دینے کا ذکر۔۔۔یہ اتنی مدت بعد ملنے پر بھی دوبدو ہونے کا سا انداز وطور۔۔۔یہ سب دلیل ہے اس پر کہ تم اب ایک بڑی شخصیت ہو۔" اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے سوالیہ نظریں اس پر جما دیں تو فوراً کچھ کہنے کی بجائے اس نے اسے بڑے رنج اور تاسف سے دیکھا تھا۔

"تم کب سے اتنے سمجھدار ہو گئے ہو کہ لفظوں سے دلائل اپنے آپ اخذ کرنے لگو؟ تم تو ان میں سے ہو جن کے سامنے کسی بات یا پہلو کی حقیقی واصل جزئیات بھی رکھی جائیں تو وہ نہیں مانتے۔۔۔" کچھ توقف سے وہ بولی تو اس کا قطعی لہجہ کسی کو بھی چڑا دینے والا تھا۔اور اس کے یوں بار بار طنز کرنے پر وہ سچ مچ چڑ بھی گیا تھا۔

"تو تمہیں لگتا ہے میں سمجھدار نہیں ہوں؟" اس نے یوں پوچھا جیسے واقعی یہ بات سمجھ نہیں پا رہا ہو کہ اب اس سے کیا پوچھے؟

"میرے لگنے یا نہ لگنے کی بات ہے ہی نہیں سفیر۔تم سچ میں نہیں ہو۔"

اسی سکون واطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھتی وہ اسے مزید جلا گئی تھی۔اب فقط ایک نظر تھوڑے فاصلے پر کھڑے طلبا وطالبات کے ایک گروپ کی طرف دیکھ کر وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"تمہارے دل میں میرے خلاف جو بھی بات ہے وہ صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو؟ میں یہاں تم سے جھگڑنے، دوبدو ہونے۔۔۔اور حتیٰ کہ ملنے بھی نہیں آیا۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ تم یہاں ہو۔اور تم سے یوں اچانک مل کر میں تو بہت خوش ہوا ہوں۔ہم اچھے دوست ہیں مریم۔کیوں ایسے۔۔۔"

انگلی اٹھا کر قدرے لگاوٹ آمیز لہجے میں بھرپور صراحت سے کہتا وہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ اس نے ایک

بار سے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہم اچھے دوست "تھے" سفیر۔۔۔ہم اچھے دوست "ہیں" نہیں۔"

اور اس کا یہ دوٹوک اور اٹل انداز دیکھ کر اس کے سارے الفاظ و اظہار دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔

"میں اتنے پیار سے بات کر رہا ہوں مریم اور تم مُسلسل الٹی باتیں کیے جا رہی ہو۔۔۔تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" بہت چڑ کر وہ دوبارہ بولا تو وہ بڑے طنز سے ہنسی تھی۔

" کس سے بے خبر رہا ہوں کس کا حال نہیں پوچھا میں نے؟ تم بخوبی جانتی ہو کہ کوئی مجھ سے کرے یا نہیں لیکن میں سب سے محبت کرنے والا انسان ہوں۔"

سراپا سوال ہو کر، لفظوں کے درمیاں ہی کہیں جانے کیا کیا جتا تا وہ اس سے اپنا قصور جاننا چاہتا تھا اور سر تا پا بغور اسے دیکھتی وہ عجب دکھ میں کھڑی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اب اسے کیا کیا بتائے کہ کس سادگی سے اس نے کئی دل ادھیڑ ڈالے ہیں۔ عجب ملی جلی اور باہم متضاد سی کیفیات میں گھری وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کن لفظوں میں اسے اس کا "دوش" تھما دے۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں مریم۔۔۔؟ جواب دو۔"

اسے خاموش پا کر وہ اپنی بات پر مُصر ہوا تھا۔ بالآخر مریم نے بھی ساری ناراضی، فکریں اور خدشات جھٹک کر اسے حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے لب کھولے۔

"میں تم سے ثومیہ کے متعلق۔۔۔"

اور اس کے لبوں سے ثومیہ کا نام سنتے ہی اس نے بڑی تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"خدارا مریم۔۔۔مجھ سے اس کے۔۔۔بلکہ ان دونوں کے بارے میں کوئی بات مت کرنا۔ پلیز۔۔۔"

اس کا قطعی لہجہ کسی بھی قسم کی گنجائش یا رعایت سے بالکل عاری تھا۔ اپنی جگہ پر ساکت ہو کر یک ٹک اسے دیکھتی وہ من ہی من اندر بے طرح تڑپنے لگی کہ باہم اتنی نفرت کرتے ان سب کرداروں کو کیسے سمجھائے کہ کبھی اپنے مابین روا رہ چکے اس "اسمِ محبت" کو یوں بے مول نہ کرو۔ وہ واپس پلٹ کر انہی گلابوں کو بے وجہ چھونے لگا تھا۔ مریم نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس بار شدتِ جذبات میں ڈھل کر اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔

"اچھا۔۔۔؟ نام بھی نہیں لوں اس کا؟ ٹھیک ہے میں نہیں لیتی۔۔۔لیکن تم وہی ہوناں جسے اس سے محبت کا دعویٰ تھا؟ محبت میں محبؔ کی ذات سے ایسی بیزاری کہاں ہوتی ہے سفیر؟ مان جاؤ کہ تمہیں اس سے محبت تھی ہی نہیں۔۔۔" عجب اکسانے والے لب ولہجہ میں طعنہ زن ہوئی ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر سکی تھی کہ وہ تڑپ کر مڑا اور تیزی سے اس تک آیا۔

"کس محبت کی بات کرتی ہو۔۔۔؟ وہ جو میرے دل کے ٹکڑوں پہ پلی ہے۔۔۔؟ ہاں اب اس محبت کے نام پر میرے ذہن میں اک سکوت کے سوا کچھ نہیں گونجتا مریم۔ یہ لفظ میرے لیے اک بے کراں سا نوحہ ہے اور بس۔۔۔" بڑا اترخ کر کہتے ہوئے وہ بہت ہارا ہوا بھی تھا۔ لیکن جو حالت وہ ثومیہ کی دیکھ چکی تھی اسے اس پر رتی بھر بھی ترس نہیں آیا۔

"بس کرو سفیر۔۔۔خدا کے لیے بس کر دو۔ اپنی ان خود ساختہ اذیتوں سے نکل کر کبھی حقائق جاننے کی کوشش بھی کر دیکھو۔ ان دونوں کے گرد الزامات کے سب حصار بھی رکھ دو تو تمہارا عمل اس قابل نہیں کہ تم مجرم نہ ٹھہرائے جاؤ۔ میں گواہ ہوں اس پر کہ اس کہانی میں غلط اگر کوئی ہے تو وہ صرف تم ہو۔"

اس کی خود اذیتی کو پوری شدومد سے رد کرتے ہوئے وہ گویا آئینہ لیے پورے قد سے اس مقابل تن گئی تھی۔ اور اس کی باتوں پر بے پناہ لال ہوتی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کا ہر رُواں جلنے لگا تھا۔

"صرف میں ہی بس نہیں کروں مریم۔ بس تو تم بھی کر دو اب۔ سارا الزام میرے سر دھر کر تم اسے یوں آزاد کر رہی ہو جیسے میں نے ان دونوں کی گفتگو اپنے کانوں سے نہیں سنی تھی۔ اس کا۔۔۔ بلکہ ان دونوں کا قصور جاننے یا سمجھنے کے لیے مجھے کسی کی گواہی کی ضرورت ہے ہی نہیں۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

جواباً وہ اتنی مضبوطی سے اپنی ہٹ پر ڈٹ گیا کہ بے ساختہ مریم کی آنکھوں میں لبالب آنسو بھر آئے۔ ایک حرف بھی بولے بنا وہ بڑے دکھ سے اس کے بہت بدل چکے لہجہ و انداز پڑھتی گئی۔

"سنبھال کر رکھو تم اپنی یہ آدھی ادھوری گواہی اور سارے فریبی آنسو بھی۔ عورت ذات ہوناں۔۔۔تو تم تو اسی کی طرفداری کرو گی جو تمہارے جیسی ہے۔"

اسے خاموش پا کر وہ مزید بولا تو اس کی فضول سی بات پر مریم بے طرح تپ گئی۔

"اس میں عورت کی "ذات" کا کیا ذکر ہے سفیر؟ سچا جھوٹا کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اگر عورت ذات ہونے کے طور پر گواہی کی بات ہے تو میری آدھی گواہی اور پورا آنسو فریب پر مبنی نہ بھی ہوں تو مرد ذات ہونے کے ناطے تمہاری جھوٹی گواہی اور ادھورا سچ ہی ان پر بھاری پڑ جاتے ہیں۔"

اور اس کی مدلل گفتگو اسے رخ بدلنے پر مجبور کر گئی تھی۔ اس سے ہٹ کر وہ آس پاس گذرتے سٹوڈنٹس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں سفیر کہ یہ سب تماشا اب اور نہیں کرو۔۔۔ تم جان تو لو مجھ سے کہ حقیقت کیا ہے؟"

اسے خاموش اور دھیرج پا کر آگے بڑھتی وہ اس کے بالکل سامنے رک کر بولی تھی۔ اس کی بات سن کر وہ عجب کرب سے مسکرایا تو اس نے بڑی حیرت سے اس کی یہ بے وقت مسکان دیکھی۔

"یہی لفظ ہے وہ۔۔۔ تماشا۔۔۔"

اس بار اس کی سوالیہ نظروں سے جھانک کر وہ بڑی شکستگی سے ہنس بھی دیا تھا۔

"یہی کہہ کر وہ مجھے اکثر خاموش کروایا کرتی تھی کہ لوگوں کو تماشا نہیں دکھاؤ سفیر۔۔۔ محبت کی ہے تو اس پر صبر بھی کرنا سیکھو۔" یہاں اک مدھم ہنکارا بھر کر کسی خیال میں رہنے کی سی حالت میں وہ دو قدم بڑھا اور اس پر تھوڑا جھکتے ہوئے مزید بولا۔

"محبت میں صبر کیسے کرتے ہیں مریم؟ میری آنکھوں میں دیکھو۔۔۔ یہ میں اب تک نہیں سیکھ سکا ہوں۔"

اس کی ویران تر آنکھوں میں دور کہیں ثومیہ کے لیے اب تک مچلتی محبت دیکھ کر وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہو گئی تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کسی سے وابستہ تمام تر شدتیں بجھ بھی چکی ہوں تو وہ راکھ سلامت رہتی ہے۔۔۔ جذبوں سی حرارت دیتی ہے۔

"اور اب تم بھی یہی کہتی ہو کہ یہ تماشا نہیں کرو۔۔۔"

یکا یک اپنی جگہ سے ہٹ کر کبھی دائیں کبھی بائیں چلتا وہ یوں ہنسا جیسے وہ بھی پاگل تھا۔ جبکہ اسے مکمل بول لینے کا موقع دیتی وہ یک ٹک اس کی حالت و کیفیت جانچ رہی تھی۔

"زندگی اتنے ناچ نچاتی ہے کہ دنیا کو تماشائی ہونا ہی پڑتا ہے۔ دل کرتا ہے زندگی سے ضد لگا کر اب وہ، وہ

تماشے کر دوں کہ درشن کور کا ہر ایک شخص وفرد ساکن، ساکت اور منجمد سا ہو کر صدیوں میری کہانی پڑھے۔"

کف افسوس ملتا۔۔۔ مچلتا، بڑی بے قراری سے کہتا وہ پھر سے اس کے سامنے یوں آن رکا گویا اس سے اپنی اس بے مہار حالت کے حل چاہتا ہو۔ جواباً اس نے سرتا پا ایک عمیق تر نگاہ ڈالتے ہوئے گویا اس کی برداشت اور سہنے کا ہنر پرکھا اور ساری تمہیدیں بالائے طاق رکھ کر انکشاف کرتے ہوئے بولی۔

"سب کچھ بھول جاؤ سفیر۔۔۔ تم اپنے طور پر جس سے بے پناہ ضد لگائے ہو وہ اس حالت میں نہیں کہ اس ضد کو محسوس بھی کر سکے۔۔۔"

اس کی بات سن کر اپنی جگہ پر جمتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں سفیر۔۔۔ میں ثومیہ شاہجہاں کی بات کر رہی ہوں۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ جس روز تم سب کا جھگڑا ہوا تھا وہ اسی روز سے اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔ گو کہ اب وہ بہتر ہے لیکن ابھی بھی۔۔۔ پاگل خانہ میں ہے۔"

مُسلسل اس کی آنکھیں پڑھتی وہ بولتی چلی گئی تو سفیر کے چہرے پر یکا یک زلزلہ کے سے تاثرات نمودار ہوئے۔ بے یقینی سے اس کے ہلتے ہوئے لبوں کو دیکھتے ہوئے اسے لگا کہ کسی نے آسمان کو اٹھا کر پوری قوت سے زمین پر دے مارا ہے۔

"تمہاری دوستی یا شاید محبت کے اس سفر میں سارے خسارے اسی کے حصے میں آئے ہیں۔ اپنے تئیں محبت کا روگ پال کر بھی تم تو بڑے سوٹڈ بوٹڈ کھڑے ہو سفیر۔۔۔ اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہوں کہ اسے بال تک بنانے کی بھی خبر نہیں ہے۔"

وہ بولتی جا رہی تھی اور سفیر کو لگ رہا تھا آس پاس کے سارے منظر اور اشیاء ہوا میں تحلیل ہو کر ان دونوں کے اِردگرد کسی تندرو "گردباد" کی مانند اڑنے لگے ہیں۔ ہاں اسے یہ بھی لگا کہ کسی نے کائنات بھر کے نازک و معصوم پرندوں کو زہرِ ہلاہل دے دیا ہے۔

"تم غلط تھے سفیر۔۔۔ اس روز تم سراسر غلط تھے۔ میں گواہ ہوں اس پر کہ تمہارے ہر اظہار سے قبل ان دونوں کے مابین کچھ ان کہے سے روابط بن چکے تھے۔ ہاں صرف تمہاری دوستی کی خاطر مصطفین نے کبھی اس

سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔اس روز بھی تمہارے آنے سے پہلے وہ اسے تمہاری ہی محبت کے لیے قائل کر رہا تھا۔میں نے خود سنا تھا سفیر کہ وہ اس سے ضد لگائے بیٹھا تھا کہ وہ تمہاری محبت پر یقین کرتے ہوئے تم سے کوئی قول اقرار کرے۔لیکن جب تم آئے تو الٹا ثومیہ اس سے اس کی ان کہی محبت پر جرح کرنے لگی تھی۔اور یقیناً وہ اسے کوئی مناسب سا جواب دے کر ٹال دینے والا تھا کہ تم نے بات پوری ہی نہیں ہونے دی،اور لڑ جھگڑ کر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔یہ تم نے کیا کیا سفیر۔۔۔؟ کیسی محبت کی تم نے؟"

بڑے دکھ بھرے لہجے میں تفصیلاً کہتے ہوئے آخرش وہ اس کے گرد کئی سوالات کے حصار باندھ رہی تھی اور وہ تھا کہ سناٹوں کی زد میں آیا ہوا ملنے تک سے قاصر تھا۔

"تم پاگل ہو سفیر۔۔۔اور کسی روز مجھے بھی پاگل کر دو گے۔"

"ہٹو سفیر۔۔۔تم ہر پل بس اپنی ہی دھن میں رہتے ہو۔"

"محبت کی ہے ناں۔۔۔تو اس پر صبر بھی کرنا سیکھو۔ہاں سفیر۔۔۔محبت صرف محبت نہیں ہوتی۔محبت مرگ ہوتی ہے۔"

مختلف اوقات میں،ثومیہ شاہجہاں کے لبوں سے نکلے ہوئے یہ سب جملے،اس کی سماعتوں کے راستے رگوں میں اتر کر،پورے بدن میں کسی زہر کی مانند دوڑنے لگے تھے۔اس کی گھمسان ہوئی حالت کا ادراک کرتے ہوئے مریم نے دو قدم بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"کہاں گم ہو سفیر۔۔۔تم سن رہے ہو ناں؟"

اور جواباً پتھرائی ہوئی نظروں سے ایک تسلسل سے اسے تاکتا ہوا وہ اپنے گھٹنوں کے بل یوں زمین پر گرا گویا اک محبت کر لینے کی پاداش میں بصد شوق اپنا سر قلم کروانا چاہ رہا ہو۔

آس پاس سے گذرتے طلبا و طالبات اب قدرے فاصلوں پر رک رک کر اپنی نئی طرح دار پروفیسر کو ایک خوب صورت و حسین تر مرد کے ساتھ "مصروفِ عمل" دیکھ رہے تھے اور ان سب کی موجودگی یا رکنے کی پرواہ کیے بنا اپنے سامنے بکھر چکے اس کہانی کے سب کردار سمیٹ رہی تھی۔

"خود کو سنبھالو سفیر۔۔۔ابھی تو تم نے پوری حقیقت کا سامنا کیا ہی نہیں۔اس کہانی میں ابھی تو بہت کچھ ہونا

باقی ہے۔"

پیروں کے سہارے بڑی احتیاط سے اس کے عین سامنے بیٹھتے ہوئے "دلاسے" کے طور پر فقط یہی کہتی وہ اس کی ٹوٹی بکھری حالت بھی دیکھ رہی تھی۔اس کے فسوں گر نین یوں پانیوں سے تر تھے گویا "نیر سلاسل" ہو چکے ہوں۔واقعات، اشیاء یا افراد کی حقیقت، گمان سے یکسر متضاد نکل آئے تو حساس تر لوگوں کے لیے سوہانِ روح ہوا کرتی ہے۔کوئی "تماشا" سا تھا جو پورے جوبن پر تھا۔۔۔اور آس پاس "تماشائیوں" کا ہجوم بڑھنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

وہ آندھی طوفان کی طرح لاؤنج میں داخل ہوا تو ذکیہ خاتون اور ڈاکٹر منصور عالم اسے وہیں نشست گاہ میں چائے پیتے ہوئے ملے۔کسی بات پر بے طرح ہنستے ہوئے ان دونوں کے کھلے کھلے چہروں پر باہم گزری خوشگوار عمروں کا اطمینان درج تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔"

فقط ایک لحظے کے لیے وہاں رک کر اس نے مودب انداز میں کہا اور ان دونوں کی ایک ساتھ اپنی جانب اٹھتی نظروں سے نظریں چرا کر اوپری منزل کو لے جاتے زینوں کی جانب بڑھا۔

"وعلیکم۔۔۔ارے بیٹھو تو۔یہ بھاگے بھاگے اوپر کہاں جا رہے ہو؟"

اس کے عجلت آمیز انداز پر ذکیہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔وہ مڑے بنا زینوں کی ریلنگ تھام کر رک گیا۔

"میں فریش ہو کر تھوڑی دیر میں آتا ہوں ماما۔آپ دونوں بیٹھیں۔"

بات مکمل کرتے ہی انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بنا وہ دھپ دھپ زینے پھلانگ گیا تو انہوں نے یونہی کھڑے کھڑے اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھا۔

"یہ آج اسے کیا ہوا ہے منصور؟ میں اس کے انداز بڑی اچھی طرح پہچانتی ہوں۔مجھے کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔"

دورانِ سوال ان کی آنکھوں میں مُسلسل کئی کئی حیرتیں جمتی رہی تھیں۔

"افوہ۔بھئی بیٹھ جایئے بیگم جان۔۔۔بے سبب واہموں میں مبتلا نہیں ہوا کریں۔ہوگا دفتر کا کوئی چھوٹا موٹا

مسئلہ۔۔۔جو خدشات آپ کو تھے وہ تو کب سے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ ماشاءاللہ ٹھیک ہے وہ بالکل۔کسی بات کو کبھی سر پر سوار نہیں کیا اس نے۔"

جواباً بیٹھے بیٹھے تھوڑا اتر چھا ہو کر انہوں نے اپنی "بیگم جان" کا ہاتھ تھاما اور واپس صوفے پر بٹھاتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔ان کے لہجے میں سفیر کی مجموعی شخصیت پر اعتماد ویقین رکھنے کی جھلک تھی۔

"پتا نہیں منصور۔۔۔لیکن مجھے لگتا ہے وہ کبھی بھی ثومیہ کو بھول نہیں پایا۔میں نے بہت بار غور کیا ہے۔بظاہر سب ٹھیک ہو کر بھی سب ٹھیک نہیں ہے۔اس کا ہنسنا بولنا اور بات بے بات قہقہے لگانا۔۔۔سب کا سب مصنوعی ہے۔وہ دل سے نہیں ہنستا۔۔۔کچھ بھی کرے اب وہ۔۔۔دل نہیں کرتا۔"

ان سے ہاتھ چھڑوا کر واپس اپنی گود میں رکھتے ہوئے اس قدر دل گرفتگی سے بولیں کہ ایک پل کے لیے ڈاکٹر منصور عالم بالکل خاموش ہو گئے۔

وہ جانتے تھے وہ حرف حرف سچ کہہ رہی ہیں۔ان کی تسلی دلاسہ کے لیے وہ اکثر انہیں باتوں میں الجھا کر ٹال جایا کرتے تھے لیکن اپنے طور پر انہیں بھی یہی لگتا تھا کہ اب ان کے بیٹے کی خوب صورت ہنسی بھی بڑی کھوکھلی سی ہے۔اب تھوڑا اور قریب کھسک کر، ان کا ہاتھ واپس اپنے ہاتھوں میں تسلی بخش انداز میں دباتے ہوئے وہ انہیں مختلف باتوں میں الجھا کر ایک بار پھر سے بہلانے لگے اور دل ہی دل میں سفیر کی بے پناہ اداسیوں کا کوئی "مستقل حل" تلاش کرنے پر غور کرنے لگے۔

اِدھر وہ دونوں اس کی خوشی کے لیے پریشان ہو رہے تھے اور اُدھر اپنے کمرے میں بڑی بے قراری سے یہاں وہاں چلتا، اپنے غموں میں الجھ کر وہ باقاعدہ ہلکان ہو رہا تھا۔مریم نے اسے ابتدائی شاک سے سنبھلنے کے بعد کینٹین میں بیٹھ کر مزید تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔اس کی زبانی وہ اپنی دوستی کے ان ان مخفی پہلوؤں سے آگاہ ہوا تھا جس کی آج سے پہلے اسے خبر تک نہ تھی۔مریم کی باتوں پر کوئی شک وشبہ وہ کر ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ کسی بھی معاملہ و پہلو میں وہ ہمیشہ سفا کی کی حد تک غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتی ہے۔پھر اسے رہ رہ کر ان دونوں کا آپسی رویہ و برتاؤ بھی یاد آ رہا تھا۔وہ کئی مقامات پر ان دونوں کا آپس میں کوئی بات کرتے کرتے اچانک چپ کر جانا، کسی مخصوص سمت میں گفتگو سے مُسلسل کترانا، کبھی کبھار بڑی فرصت اور حسرت سے ایک

دوسرے کو دور دور سے تاکنا۔۔۔اور سب سے بڑھ کر مصطفین کے سامنے اپنے جذبوں کے ہر اظہار پر ایک دفعہ اس کا بالکل گنگ ہو جانا۔۔۔اب اسے سارا کچھ یاد آ رہا تھا کہ یہ سب بے معنی ہرگز نہیں تھا۔ہاں بالکل۔ اس نے آج جانا تھا کہ ہر سکون،ٹھہراؤ یا چپ کے پیچھے کوئی طوفان،بھنور یا گفتگو لازمی پنہاں ہوتی ہے۔

"مجھے اس سے ایک بار ملوا دو مریم۔۔۔صرف ایک بار۔ایک دوست ہونے کے ناطے مجھ پر یہ احسان کر دو۔میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔میں اسے منانا چاہتا ہوں۔مجھے آج سمجھ آیا ہے کہ میرے دل کو سکون کیوں نہیں ملتا تھا۔"

یکا یک بیڈ کے الٹی جانب ایک کنارے پر ٹک کر اپنے منہ کو نوچنے کے سے انداز میں دائیں ہاتھ میں جکڑتا مسلتا وہ پھر سے وہی الفاظ دہرانے لگا تھا جو یہ ساری حقیقت جاننے کے بعد وہ مریم سے کہہ کر آیا تھا۔

"وہاں مردوں کا داخلہ ممنوع ہے سفیر۔۔۔بڑا مشکل ہے تمہیں اجازت مل پائے۔لیکن تمہاری خاطر نہیں۔ ۔۔صرف اسی کی خاطر میں یہ کوشش لازمی کروں گی کہ ایک بار تم اس سے ضرور مل سکو۔شاید تمہارے معافی مانگ لینے سے اس کو کچھ قرار آ جائے۔تمہیں بہت برا لگے گا یقیناً۔۔۔لیکن مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی سفیر۔تم نے اس پر اعتماد نہ کر کے اپنی محبت کی توہین کی تھی۔"

جواباً مریم کے منہ سے کسی لاوے کی مانند نکلتے یہ لفظ یاد کر کے وہ ایک بار پھر سے جل اٹھا تھا۔کل پورے گیارہ بجے اسے پاگل خانہ آنے کا کہتی وہ اسے یونیورسٹی کینٹین میں اس گول میز کے گرد تنہا چھوڑ گئی تھی جس پر اس کے جانے کے بعد بھی اسی یک ٹک سی حالت میں،بڑے گم سم انداز میں بیٹھے ہوئے،اس نے دو گھنٹے مزید گل کیے تھے۔

مریم کا اک ایک لفظ اور درشت تر لہجہ یاد کرتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے سامنے دیوار میں لگے قد آور آئینہ میں اپنا وحشتوں میں لپٹا پورا وجود دیکھنے لگا۔فقط ایک نگاہ سر تا پا اپنی حالت دیکھ اس نے آئینہ سے یوں آنکھیں پھیر لیں گویا اپنا سامنا بھی نہیں کر پا رہا ہو۔

کبھی نہ کبھی،کہیں نہ کہیں ہم سے کوئی ایسا گناہ،قصور یا جرم لازمی سرزد ہوتا ہے کہ ہم میں ہمارا سامنا کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ ہم اپنے ہی عکس سے نگاہیں پھیرنے کے لیے

آئینوں سے رخ بدلنے لگتے ہیں۔اور پشیمانی کے اس عالم میں اگر کبھی ہم آئینوں کے مقابل رک کران میں جھانکنے کی جسارت کر بھی لیں تو آئینے وہیں رہتے ہیں بس۔۔۔ہماری آنکھیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

وہاں سے چھوٹ کر ٹیرس کے کھلے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ باہر کالونی پراترے شام کے سائے اب رات میں ڈھلنے لگے ہیں۔

"مجھے معاف کردو ثومیہ۔میں تم سے ٹھیک سے محبت بھی نہیں کر سکا۔"

ٹیرس میں نکلتے ہی ہواؤں سنگ اپنا ملال پھونکتے ہوئے وہ بے تحاشا رونے لگا تھا۔

شام پھیل کر راتوں میں ڈھل رہی تھی باہر۔۔۔اور اندر سارا اندھیر مچا تھا۔

سفیر احمد کی زندگی میں در آئی یہ رات۔۔۔ہمیشہ ٹھہر جانے والی راتوں میں سے ایک تھی۔

شہرِ لاہور میں دور کہیں راوی کی منڈیروں پر جلتے ہوئے دیوں کی مانند۔۔وہ بھی جی جان سے جلتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے مراحل میں مریم کو کافی مشکلات درپیش آئیں۔دوسرے روز نمرہ کو کال کر کے آج جلدی پاگل خانہ آنے کا کہتی وہ خود بھی صبح سویرے وہاں پہنچ گئی تھی۔ان دونوں کی ایک ملاقات کروانے کے لیے سب سے پہلے تو نمرہ کو رضامند کرنا ازحد ضروری تھا۔

"لیکن مریم آپی ہم کیسے سفیر کو اس کے سامنے لائیں؟ جبکہ آپ جانتی ہیں کہ وہ اپنی اس ناگفتہ بہ حالت کا ذمہ دار کسی نہ کسی طور اسے بھی ضرور گردانتی ہے۔میرے خیال سے تو وہ ہتھے سے اکھڑ جائے گی۔مجھے لگ رہا ہے کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

مرکزی احاطے میں اونچے لمبے درختوں کے نیچے کھڑی نمرہ نے اس کا مدعا سنتے ہی اس امر میں دبے دبے لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔

"میں سب جانتی ہوں نمرہ۔۔۔مجھے کس بات کی بھول ہے؟ لیکن مجھے یقین ہے۔۔۔کہ سفیر سے اس کی ایک ملاقات کروانے سے اس کی ذات میں در آیا وہ عجب سا جمود لازمی ٹوٹ جائے گا جس سے وہ نکلتی ہی نہیں۔ بھروسہ کرو مجھ پر۔۔۔میں اس کا برا نہیں چاہ سکتی۔"

قدرے تحمل سے اس کی بات سنتے اور سمجھتے ہوئے اس نے جواباً بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو نمرہ نے بے ساختہ اس کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔

"ارے۔۔۔کیسی باتیں کر رہی ہیں مریم آپی؟ آپ پر تو مجھے خود سے بھی زیادہ بھروسہ ہے۔میں تو بس اس کی حالت بگڑ جانے سے ڈر رہی تھی۔اگر آپ کو ایسے ٹھیک لگتا ہے تو ہم ڈاکٹر صبا سے اجازت لے لیتی ہیں۔ آپ سفیر احمد کو بلا لیں۔بس مجھے یہ بات ماما۔۔۔اور خصوصاً بابا سے چھپانی ہوگی۔"

اس کی باتوں سے قائل ہوتے ہوئے اس نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی تو یوں اپنا مان رکھے جانے پر وہ پورے دل سے مسکرائی۔

"شکریہ میری جان۔۔۔یہ تو بس تمہاری محبت ہے اچھی لڑکی۔اور ہاں واقعی یہ ملاقات بڑی رازداری سے ہونی چاہیئے۔خیر چلو ڈاکٹر صبا سے اجازت لے لیں۔سفیر کو تو میں پہلے سے بلا چکی ہوں۔"

بڑے پیار سے پچکار کر اس کی تائید کرتے ہوئے اس نے جواباً اور بڑی طمانیت سے باہم مسکراتی ہوئی پھر وہ دونوں اندرونی عمارت کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

اگلے مرحلے میں ڈاکٹر صبا سے اجازت لینا۔۔۔یعنی اسے سفیر اور ثومیہ کی اس ملاقات پر راضی کرنا بذات خود جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا تھا۔خیر ایک طویل تر بحث میں بہت سے دلائل وشواہد پیش کرنے کے بعد بالآخر مریم اسے بھی اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔

"تم دونوں یوں مُصر ہو تو میں اسے آنے دیتی ہوں۔لیکن بتلائے دوں کہ اگر ثومیہ کو زیادہ ناگوار گذرا تو وہ کوئی تماشا کھڑا کر سکتی ہے۔سسٹر نسرین سے کہہ کر برآمدے کی فولڈنگ گرِل درمیان میں کروا لو۔ دورانِ ملاقات یہ گرِل حائل ہو تو مریض کی طرف سے کسی بھی شدید ردعمل کی صورت میں بچاؤ ممکن ہوتا ہے۔"

نیم رضامندی سے کہتے ہوئے اس نے انہیں خبردار بھی کیا تھا۔

"شکریہ ڈاکٹر۔۔۔ہم گرِل آگے کروا لیتی ہیں۔آپ گیٹ پر کال کر دیں کہ اسے اندر آنے دیا جائے۔سفیر پہنچنے والا ہوگا۔"

دل ہی دل میں کلمہ شکر ادا کرتی جواباً یہ کہہ کر وہ اس کے سامنے سے اٹھ آئی تھیں۔

اس کے ٹھیک آدھے گھنٹہ بعد جب سفیر پہنچا تو حسبِ ہدایت گرِل کو برآمدے کے درمیان میں ایک سے دوسرے سرے تک کھینچ دیا گیا۔انہیں ایک دوسرے کے سامنے لانے کے لیے نمرہ ہواخوری کے بہانے ثومیہ کو بلا کر گرِل کے ایک جانب سے نمودار ہوئی جبکہ دوسری جانب کی سیڑھیاں چڑھ کر مریم اور سفیر اس منظر میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔سب کی دھڑکیں بے شمار خدشات و دھڑکات سے لپٹ لپٹ کر عجب سی لے پر تھرکنے لگی تھیں۔ترتیب یوں رہی کہ گرِل سے اُس پار ثومیہ ان دونوں کی جانب پشت کیے کھڑکی سے باہر نمرہ کے اشارات کے تعاقب میں جھانک رہی تھی جبکہ گرِل سے اِس پار سفیر اسے دیکھ کر کافی فاصلے پر سے ہی ٹھہرتا ٹھہرتا بالکل رک سا گیا تھا۔مریم اسے تھوڑا دور چھوڑ کر ہی گرِل کی جالیوں تک چلی آئی تھی۔

"دیکھو تو ثومیہ۔۔۔تمہیں ملنے کون آیا ہے؟"

قدرے محتاط لہجے میں دی گئی مریم کی اس پُکار پر وہ دونوں ہولے ہولے ان کی طرف مڑی تھیں۔ یک ٹک اس کا ملگجا حلیہ، بگڑی حالت اور الجھے الجھے میلے سے بال دیکھ کر سفیر پتھر کا ہو گیا تھا۔کوئی جوگن نما دکھتی یہ لڑکی وہ ثومیہ شاہجہاں تو تھی ہی نہیں جس سے وہ اپنے یونیورسٹی دور میں واقف رہا تھا۔

"کک۔۔۔کون آیا ہے؟"

مریم پر آنکھیں جما کر یہ پوچھتے ہوئے اس کی نظروں نے دھیرے دھیرے سفیر تک کا سفر کیا تھا اور پھر اسے دیکھ کر کسی حیرت کے اظہار کی بجائے یہیں اس کے لبوں پر ایک خوش رنگ و خوشگوار سی مسکان سج گئی تھی۔اس کی مسکان دیکھ کر وہ دونوں بے حد حیران ہوئیں جبکہ اس سے حوصلہ پکڑ کر سفیر نے دو چار قدم اس کی جانب مزید بڑھائے تھے۔

"سفیر۔۔۔"

ادھر کسی سرگوشی کی مانند زیرِ لب اس کا نام دہراتی وہ بھی بڑے والہانہ انداز میں اس کی جانب یوں بڑھی کہ ان دونوں کے سوا اس منظر کا اک ایک جز فضول ہو گویا۔مریم اور نمرہ نے حیرت در حیرت اس کے قرب و جوارِ وجود سے پھوٹتی اس بے پایاں خوشی کو دیکھا۔۔۔اور ان کی تمام تر حیرتیں ابھی کسی تکمیل کو چھو بھی نہ سکی تھیں کہ یہیں انہیں ایک بار سے چونک جانا پڑا۔لبوں پر خوش رنگ مسکان سجائے تیزی سے سفیر کی جانب بڑھتی وہ گرِل

سے کچھ فاصلے پر ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ یکا یک اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے گویا کسی کرب ناک یاد سے جا لپٹی ہو۔ اور گرِل کے اُس پار اِس کے لبوں کی بتدریج سکڑتی مسکراہٹ دیکھ کر سفیر کے کھلے کھلے لب بھی ساتھ ساتھ سمٹے تھے۔

"تم کیوں آئے ہو یہاں؟ تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی؟"

تنتناتے ہوئے پوچھتی وہ باری باری ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی تو مریم سر جھکا کر بڑے مضطرب انداز میں اپنی کلائی پر موجود کانچ کی چوڑیاں گھمانے لگی۔ جبکہ عذر کے چند حروف تراشتا سفیر کانپتے لبوں سے کچھ کہنے کی جسارت کرتے ہوئے گرِل سے دو چار قدم دور آن رکا تھا۔

"خبردار کوئی رام لیلا پھر سے شروع کی تو۔۔۔ کسی بھی صفائی یا وضاحت کی مد میں مجھے تم سے کوئی لفظ تو کیا ایک حرف بھی نہیں سننا۔ سب کچھ تو برباد کر دیا تم نے۔ اب کیا کہنے۔۔۔ کیا لینے آئے ہو؟"

اس کے کچھ بھی بولنے سے پیشتر بڑے غصہ ور انداز میں کہتے ہوئے وہ بیچ لگی گرِل کو یوں جھنجھوڑنے لگی گویا یہ گرِل ان دونوں کے مابین حائل نہ ہوئی ہوتی تو "سب کچھ برباد کر دینے" کی پاداش میں وہ اب تک اس کی جان بھی لے چکی ہوتی۔

"پلیز میری بات سنو ثومیہ۔۔۔ مجھے جونہی مریم نے تمہاری حالت کا بتایا میں بڑا بے چین ہو گیا۔ اور۔۔"

وضاحتی انداز میں کہتے ہوئے سفیر تیزی سے بالکل پاس آیا اور گرِل پر گرفت کیے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھنے چاہے۔

"ہٹو پرے۔۔۔ میں نے کہا دور رہو مجھ سے۔ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔"

اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑی سرعت سے گرِل پر سے اپنے ہاتھ کھینچ کر وہ بہت دھتکار کر بولی تو اس نے شرم سے اپنا چہرہ جھکا لیا۔

"پلیز ثومیہ مجھے بات کا ایک موقع تو دو۔۔۔"

فقط ایک لمحے کا توقف بھر کر سرگوشی کے سے انداز میں کہتے ہوئے اس نے دوبارہ سر اٹھایا تو رخ موڑ کر اس کی عرض والتجا کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے وہ یکا یک بڑھی اور گرِل میں سے ہاتھ گذار کر مریم کی کلائی

دبوچ لی۔

"اسے یہاں کیوں لائی ہو مریم؟ میں نے کہا تھا ناں مجھے اس کے نام تک سے نفرت ہے۔ پھر کیوں لائی ہو اسے؟ ہاں؟" اس کی کلائی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر وہ یوں ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی پوچھنے لگی کہ اس کے لبوں سے باقاعدہ کف اڑ رہی تھی۔ جواباً کچھ کہنے کی بجائے مریم نے بہت گھبرا کر سفیر کی جانب دیکھا تو اس نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنی چاہی۔

"پلیز ثومیہ۔۔۔اسے چھوڑ دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے بہت ضد کی تھی تو۔۔۔"

اور اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ اس نے مریم کی کلائی کے ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان بھی پکڑ لیا۔

"کیوں کی تھی تم نے ضد؟ بتاؤ مجھے۔ میری زندگی برباد کر تو دی تم نے۔۔۔اب کیا کرنا باقی رہ گیا تھا؟" مُسلسل اس کی قمیض جھٹکتے ہوئے وہ یوں جرح کر رہی تھی گویا کوئی جواب نہ ملا تو اسے زمین میں گاڑ دے گی۔ اس کا انداز اس قدر وحشت و جنون لیے ہوئے تھا کہ ایک پل کے لیے اس صورتحال کی تمام تر سنگینی بھول کر سفیر کی نگاہ اس کی دھول گزیدہ لٹوں، چیختے لبوں اور آنکھوں کے گرد پڑ چکے گہرے سیاہ حلقوں میں الجھ کر رہ گئی۔ وہ پوری قوت سے ان دونوں کو لگاتار جھنجھوڑ رہی تھی اور درمیان لگی لچکیلی گرِل زمین سے لے کر چھت تک ایک چھن چھناتی ہوئی آواز سے مُسلسل ہل رہی تھی۔ مریم کی چوڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے پیروں کے آس پاس گر رہی تھیں اور کانچ کے سبب اس کی کلائی پر لگتے زخموں سے خون نکلنے لگا تھا۔

"پلیز خود کو سنبھالو ثومیہ۔ وہ بس تم سے معافی مانگنے آیا ہے۔ اور میرا بازو چھوڑو یار۔ دیکھو خون ابل آیا ہے۔ آہ۔۔۔"

اس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑوانے کی تگ و دو کرتے ہوئے بہت تڑپ کر کہتی مریم کے لہجے میں بے پناہ اذیت تھی۔ یہ سب تماشا دیکھ کر نمرہ بھی اپنا سکتہ توڑ کر بھاگتی ہوئی ان تینوں تک چلی آئی تھی۔

"آپی پلیز چھوڑو ان کو۔۔۔دیکھو تم نے مریم آپی کو زخمی کر دیا ہے۔ پلیز چھوڑو ناں۔۔۔"

اس کی مٹھیوں پر اپنے ہاتھ جما کر انہیں ان دونوں سے الگ کرنے کی کوشش کرتی وہ دیکھ رہی تھی کہ مریم تو

اپنی کلائی چھڑوا رہی ہے لیکن سفیر کسی بھی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے یوں پشیمان کھڑا تھا جیسے ہر سزا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا عزم کیے ہوئے ہو۔

اور مریم یا نمرہ کی یہ کوشش ابھی "بار آور" نہیں ہو سکی تھی کہ مریم کی کلائی پر خون دیکھ کر اچانک ثومیہ نے خود ہی اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔

" کیوں آئے ہو تم سفیر؟ کیوں آئے ہو؟ کہا بھی تھا اب کبھی سامنے مت آنا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔ چلے جاؤ اور آئندہ کبھی نہ آنا۔"

اسی سنگلاخ لہجے میں چیختے ہوئے گرِل تھام کر وہ آہستہ آہستہ نیچے زمین پر بیٹھ گئی اور یہاں وہاں بکھری چوڑیوں کا کانچ دیکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی جگہ یونہی اپنی چوڑیوں کے ٹوٹنے کا منظر جاگ اٹھا تھا۔ اس کی حالت سے خوف کھا کر عجب کھوئی کھوئی کیفیت میں رہتا سفیر قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا۔

"اسے کمرے میں لے جاؤ نمرہ۔۔۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

اشارتاً سفیر کو گیٹ تک چھوڑ کر آنے کا کہتے ہوئے مریم نے نمرہ کو ہدایت جاری کی اور اپنی زخمی کلائی کو دبا کر آہستگی سے مڑتی ہوئی سفیر کے پیچھے آئی، جو اب پلٹ کر زینوں کے ابتدائی کنارے پر رکا ایک آخری نگاہ مُسلسل سسکتی ہوئی ثومیہ شاہجہاں کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا سفیر۔۔۔ بہت مشکل ہے کہ وہ تم سے ملنے پر رضامند ہو سکے۔"

اس کے کہنے پر ساکت ہوا کھڑا وہ کوئی جواب دینے کی بجائے دھپ دھپ کرتا زینے اتر گیا تو وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے اترنے لگی۔ تب تک وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نچلا برآمدہ عبور کرتے ہوئے صحن کی پختہ روش پر اتر چکا تھا۔

"میری بات سنو سفیر۔۔۔ اب کہاں یوں ایک دم سے بھاگے جا۔۔۔"

اپنی زخمی کلائی کے گرد دوپٹہ لپیٹتی وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تھوڑا آگے جا کر وہ اچانک رک گیا تھا۔

"تم نے دیکھا مریم وہ کس قدر رو رہی تھی۔ جیسے ہنسنا تو بالکل بھول چکی ہو۔ اور اس کی آنکھیں دیکھیں تم نے۔۔۔ ان کے گرد سیاہ ہالے پڑ چکے ہیں۔" واپس اس کی جانب مڑتے ہوئے وہ یوں بے قراری سے بولا کہ جیسے اس کے بس میں ہو تو ابھی ثومیہ کے لیے کائنات بھر کو اٹھا کر پلٹ دے گا۔ اس سے چند قدم کی دوری پر رکتے ہوئے مریم کو بے ساختہ بادشاہی مسجد کے وسیع و عریض صحن کا وہ منظر یاد آیا جس میں رک کر کبھی اس نے ثومیہ کی ہنسی اور آنکھوں کے متعلق کچھ اور لفظ ادا کیے تھے۔

"جب کبھی اسے ہنستے ہوئے دیکھتا ہوں ناں۔۔۔ تو اس کی ہنسی کہیں نہ کہیں کھوئی سی لگتی ہے۔ اور نیلے پانیوں سی اس کی جھیل آنکھیں۔۔۔ عجب ساکن و ساکت رہتی ہیں۔"

اس یاد یا منظر میں فقط ایک پل کو ٹھہر کر اسے اپنی عمیق تر نگاہوں کے حصار میں رکھتی وہ دھیرے دھیرے اس کے بالکل قریب آئی تھی۔

"افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس کی آنکھوں کے گرد تم نے فقط ہالے دیکھے۔ ان سے رستا کرب نہیں جانا۔۔۔ ان سے چھلکتا درد نہیں جانچا۔ جنہیں تم جھیل کہتے تھے ناں اب وہ سمندر ہو گئی ہیں۔ اب تم ان کو مت دیکھو۔ اب عشق تمہارا سب بہہ گیا ہے۔ ساکن و ساکت وہ پہلے تھیں۔۔۔ اب "نیر سلاسل" رہتی ہیں۔"

بڑے گونجتے ہوئے سے لہجے میں کہے گئے اس کے یہ سارے لفظ وطنز سفیر کے کانوں کے گرد چکر پھیریاں کھانے لگے تھے۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ وہ کس وقت، منظر یا یاد کا حوالہ دے رہی ہے۔ بے ساختہ رخ بدل کر وہ فقط یہی کہہ سکا۔

"میں جانتا ہوں مریم میں انتہائی غلط رہا ہوں۔۔۔ لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ میں دوسری، تیسری یا چوتھی بار بھی یہاں لازمی آؤں گا۔۔۔ حتیٰ کہ بار بار آؤں گا۔ تاوقتیکہ اس کا غصہ ڈھلے اور وہ مجھے معاف کرنے پر راضی ہو جائے۔"

گویا کسی عزم سے جڑ کر کہتے ہوئے وہ یکا یک اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا اور عجب شکستگی سے مزید بولا۔

"اور میری اس سب ریاضت کو دیکھنے ہو سکے تو تم بھی ہر روز لازمی آیا کرنا۔۔۔ چلتا ہوں۔ دعا کرنا۔۔۔"

بلکتے ہوئے سے لہجے میں کوئی التجا و اپیل سی کرتا وہ اپنے پیروں پر اس قدر تیزی سے پلٹ گیا کہ وہ اسے

روک بھی نہ سکی۔سوچتی ہوئی نظروں سے بہت دور تلک اس کی چوڑی پشت کو تاکنے کے بعد ایک طویل تر سانس بھرتے ہوئے وہ اوپری منزل کی جالی دار کھڑکیوں کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے کہا تھا وہ ثومیہ کو منانے کے لیے یہاں بار بار آئے گا اور اپنے کہے پر وہ اس قدر کھرا اترا تھا کہ ہر روز آیا تھا۔وہ اس وارڈ کے داخلی گیٹ پر رک کر کبھی کسی کام والی عورت کے ذریعے اور کبھی وارڈ کے ریسپشن ڈیسک پر فون کال کرتے ہوئے اندر پیغام بھیجتا کہ ثومیہ کو مطلع کیا جائے سفیر احمد اس سے ملنے آیا ہے۔جواباً اس کی طرف سے ہوتے مُسلسل انکار پر بھی وہ یہاں آنے سے باز نہیں آتا تھا۔وارڈ کی تمام تر ڈاکٹرز اس ساری صورتحال سے بخوبی آگاہ و خبردار تھیں اور ان سب کی دلی خواہش تھی کہ ثومیہ اس لڑکے سے ملاقات کر لے۔مریم کی زبانی انہیں ایک مناسب حد تک ان دونوں کے مابین چلتی کشمکش و کہانی کا پتا چل چکا تھا۔سفیر سے ملاقات کے لیے انکار کرنے کے بعد وہ ہر روز اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ کر اسے دور سے دیکھا کرتی تھی۔وہ اس کی کھڑکی سے کافی دور چوڑی شاہراہ پر اونچے لمبے درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کے درمیان سر جھکائے بہت ہارے ہوئے انداز میں واپس جایا کرتا تھا۔

ایسے ہی ایک روز کہ جب اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہ سفیر کو پاگل خانہ کے مرکزی گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی نمرہ اس کی پشت پر آن رکی۔

"مجھے لگتا ہے آپی تمہیں ایک بار اس سے مل لینا چاہیئے۔"

اس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے اس نے ترغیب دینے کے سے انداز میں کہا تو دور جاتے سفیر سے اپنی نگاہیں ہٹائے بنا وہ بڑے تیکھے لہجے میں جواباً بولی تھی۔

"اچھا۔۔اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟ میں اس سے کس وجہ سے ملوں؟"

اس کی بات پر نمرہ نے ایک بار بغور اس کا انداز پرکھا اور نظریں اس کی آنکھوں کے کناروں پر ٹکاتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہر بات کی کوئی وجہ ہو یہ ضروری نہیں ہوتا آپی۔اور اس سے ملنے کے لیے تو یہی وجہ کافی ہے کہ وہ ہر روز

یہاں آرہا ہے اور ہماری فیملی ویلیوز اس کا یوں روز روز آنا افورڈ نہیں کرسکتیں۔"

اس کا لہجہ بے حد قطعی اور دوٹوک تھا۔ آج بڑی مدت کے بعد ان دونوں بہنوں کے مابین یوں دلائل وشواہد پر گفتگو ہورہی تھی۔ سوالیہ نظریں لیے وہ جواب کی منتظر تھی اور ثومیہ کو اس کی بات سے گویا چپ لگ گئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ کل اگر یہ آیا تو اسے اوپر بلا لینا۔ لیکن میری شرط ہے کہ میں اس سے بالکل اکیلے میں ملوں گی اور اس بار درمیان کوئی گرِل بھی حائل نہیں ہوگی۔"

اب جانے یہ نمرہ کی بات کا اثر تھا کہ اسے سفیر کی روز روز کی اس یاترا پر ترس آگیا تھا کہ بنا مزید پس وپیش وہ اس سے ملنے پر رضامند ہوگئی تھی۔

"شکریہ آپی۔۔۔ مجھے منظور ہے۔ گرِل نہ ہونے کے حوالے سے بھی میں ڈاکٹر صبا سے بات کرلوں گی۔"

محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ دباتے ہوئے اس نے قدرے طمانیت سے کہا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔

"لیکن تھوڑا تم بھی دیکھنا ہاں۔۔۔ اس دن بھی تم نے غصے میں بھر کر مریم آپی کی کلائی چھیل دی تھی۔"

بڑے محتاط انداز میں اسے خود پر قابو رکھنے کا کہتی وہ جواب کی منتظر ہوئی تو وہ بے وقت ہنستے ہوئے اس کی جانب پلٹی تھی۔

"تم فکر نہ کرو یار۔۔۔ وہ مریم تھی اور یہ سفیر ہے۔ اور سفیر چوڑیاں نہیں پہنتا۔"

اپنی بات پر خود ہی ہنستے ہوئے وہ پھر سے جالی سے پار جھانکنے لگی تو نمرہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر پہلے تو کبھی نہیں لیکن اب شبہ ہو۔

"اگر یہ مذاق تھا ثومیہ تو بالکل فضول تھا۔ خیال کرنا۔۔۔ ورنہ گرِل تو میں لازمی آگے کروں گی۔"

بڑے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اسے وہیں کھڑکی میں چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ اب زیادہ دیر اس کے پاس نہیں رکا کرتی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق اسے سوچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اور تنہائی مہیا کرنا ضروری تھا۔

اب یہ محض اتفاق تھا یا سچ مچ تندوتیز ہواؤں اور بارشوں کو ان سب سے کوئی خاص لگاؤ تھا کہ اس کہانی کے تمام تر خاص مواقع پر آسمان ابر آلود ہوجایا کرتا تھا۔ اس سے اگلے روز کہ جب ثومیہ اور سفیر کی ملاقات متوقع تھی

موسم ایک بار پھر سے بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ نمرہ نے مریم کو بھی اس کے ملاقات پر راضی ہونے کے متعلق آگاہ کر دیا تھا اور اسی بدولت وہ یونیورسٹی سے قبل از وقتِ مقرر نکل آئی تھی۔ ہسپتال پہنچ کر اس نے صحن میں ہی رکتے ہوئے نمرہ سے ایک بار پھر سے اور اس بار بڑی تفصیل سے ثومیہ کی آمادگی کی وجہ سنی۔ ثومیہ کی بنا گرِل کے ملنے کی شرط نمرہ کے لیے قدرے پریشان کن تھی اور وہ بار بار اس کا اظہار بھی کر رہی تھی۔ یہ ساری جزئیات وتفصیلات جان کر مریم کے ماتھے پر ایک لکیرِ فکر ابھری۔

"مسئلہ نہیں ہے یار۔۔۔ اگر وہ کہہ رہی ہے تو یونہی گرِل کے بغیر ملنے دیتے ہیں۔ اب تک وہ خود کو بہت کچھ سمجھا چکی ہو گی۔۔۔ سو مجھے امید ہے اس بار سب ٹھیک رہے گا۔ میں ابھی ڈاکٹر صبا سے بھی بات کر لیتی ہوں۔ کیونکہ سفیر تو شاید آتا ہی ہو گا۔"

اسے تسلی دیتے ہوئے اس نے متوازن اور عام سے لہجے میں کہا اور اندر کی جانب بڑھنے لگی۔

"میں بات کر چکی ہوں مریم آپی۔۔۔ اگر ہم راضی ہیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ کہتی ہیں جو کرنا ہے اپنی ذمہ داری پر کرو۔"

اس کے ساتھ ساتھ پلٹتے ہوئے نمرہ نے مطلع کیا تو وہ وہیں ٹھہر گئی۔

"ہمم۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔ اور ثومیہ کیا کر رہی ہے؟"

ایک مبہم ہنکارا بھر کر اس نے ثومیہ کی بابت پوچھا۔

"وہ سو رہی ہے بلکہ آج تو کافی دیر سے سو رہی ہے۔ کہہ رہی تھی یونہی رات بھر نیند نہیں آئی۔"

جواباً کہتے ہوئے "یونہی" کو اس نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔

"ہمم صحیح۔۔۔" اب کی بار فقط یہی کہہ کر ایک اونچے درخت تلے دھری سنگی نشست کی جانب بڑھتے ہوئے مریم نے گویا موضوع بدلتے ہوئے کہا تھا۔

"ایسے ہی پچھلے دو تین دن سے میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ آج ہسپتال لازمی جایا جائے۔ لیکن یونیورسٹی سے فراغت ملتی ہی نہیں ہے۔ خیر سر واپس آئیں تو میری تو اس سر کھپائی سے جان چھوٹے یار۔ میں تو تھک بھی گئی ہوں۔"

اوراس کی بات پر نمرہ نے مسکراتے ہوئے تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

"ظاہر ہے آپی۔ اتنے بڑے بڑے سٹوڈنٹس کو ڈیل کرنا آسان تھوڑی ہے۔ میں تو بڑی حیران ہوئی تھی سن کر کہ آپ یونیورسٹی پڑھانے جائیں گی۔ آپ تو خود سٹوڈنٹ لگتی ہیں۔"

اس کے پیچھے آتے ہوئے وہ اشتیاق سے بولی تو مریم پورے دل سے مسکرا دی۔

اس کے بعد وہ دونوں وہیں نشست سنبھالے ہوئے تادیر ہلکی پھلکی گپ شپ کرتی رہیں اور باہم گفتگو کا یہ سلسلہ پھر سفیر احمد کی آمد کی شنید سے ہی رکا۔ کام والی ایک لڑکی داخلی گیٹ سے بھاگی بھاگی ان کی طرف آئی تھی۔

"باجی جی وہی سوہنا سا منڈا آیا ہے۔ کہتا ہے ثومیہ بی بی سے ملنا ہے۔ وہ روز آتا ہے جی۔ اب تو مجھے اس نمانے پر ترس آنے لگا ہے۔"

پھولی ہوئی سانسوں میں انہیں سفیر کی آمد کے متعلق بتا کر اس نے اپنا اظہارِ خیال بھی ضروری سمجھا تو وہ دونوں بس ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"تسی جاؤ پین جی۔۔۔ اور اس "سوہنے نمانے" نوں اج اندر بھیج دیو۔ تھوڑا ترس آج اس پر ہم بھی کھا ہی لیتی ہیں۔"

کچھ توقف سے مریم نے ہو بہو اسی کے انداز میں اور ٹھیٹ پنجابی لب ولہجہ میں کہا تو بے ساختہ نمرہ کے لب چٹکے۔ آج سنجیدہ سی مریم میں پہلی بار اسے شرارت کی جھلک نظر آئی تھی۔

خیر قصہ المختصر۔ جب وہ صحن سے اٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اندر کی جانب بڑھیں تو آس پاس سرسراتی ہواؤں کا زور بڑھنے لگا تھا اور آسمان پر چھائے کالے بادل یوں گرج رہے تھے گویا ابھی برس پڑیں گے۔

کمرے میں پہنچ کر انہوں نے نہایت نرمی سے ثومیہ کو جگایا تھا۔

"ارے۔۔۔ تم کب آئیں مریم؟ اور۔۔۔ اور تمہاری کلائی اب کیسی ہے؟ بہت معذرت یار کہ اس دن میں کافی جذباتی ہو گئی تھی۔"

مریم کو سامنے پا کر وہ بے طرح کھل اٹھی اور اپنے اس روز والے رویہ وسلوک کی معافی طلب کرنے لگی۔

"میں بس ابھی تھوڑی دیر پہلے پہنچی ہوں۔ اور وہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی یار کہ تم پریشان ہوتی رہو۔ میری

کلائی بالکل ٹھیک ہے۔دو تین خراشیں تھیں بس۔۔۔اور وہ بھی اب بھر چکی ہیں۔یہ دیکھو۔۔۔"
جواباً بڑی خوشگواری سے کہتے ہوئے اس نے اپنی خراش زدہ کلائی اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی تو بستر سے اوپر بیڈ کی پشت کی جانب ٹیک لگانے کے لیے اٹھتے ہوئے اس نے اس کی کلائی تھام کر اس پر باقاعدہ ہاتھ پھیر کر تسلی کی۔

"ہاں زخم تو اب نہیں رہے ہیں۔۔۔لیکن اس کھرنڈ کے اترنے پر نشانات لازمی باقی رہ جائیں گے۔"
لہجے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی بے پناہ تاسف تھا۔جواباً اس نے اسے ایک عمیق تر نگاہ کے حصار میں لیا تھا۔

" کچھ زخموں کے نشانات تعلقات میں تقدیس کی علامت ہوتے ہیں ثومیہ۔یہ ہنس کر سہہ لیے جائیں تو تعلق پائندہ باد رہتے ہیں۔فکر مت کرو تم۔۔۔میں نے بھی ان نشانات کا باقی رہنا بخوشی قبول کیا ہے۔"
وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ کلائی چھوڑ کر اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔وہ کچھ کہنا چاہتی تھی یہ اس نے بخوبی جان لیا تھا۔۔۔وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟اس کی آنکھوں میں یہ سوال مچلنے لگا تھا۔

"ہو سکے تو تم بھی یہ سب سہنا سیکھو ثومیہ۔کوئی دیئے ہوئے زخموں کی معافی طلب کرنے آئے تو۔۔۔اسے معاف کر دینا۔جانے کوئی خود سے لڑ کر کتنا ہارا ہوا واپس آیا ہو۔"
مُسلسل اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے بات مکمل کر دی تو یکا یک سر جھکائے وہ بالکل خالی خالی بیٹھ رہی۔اسے سچ مچ کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا کہ جواباً اب کیا کہے؟
اسی پل دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے وہی کام والی لڑکی اندر داخل ہوئی تو اس کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی نمرہ نے آگے بڑھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ثومیہ سے مخاطب ہوئی۔

"سفیر آ گیا ہے آپی۔۔۔اور وہ باہر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"
اس کی بات پر وہ یوں سر اٹھا کر مریم کو دیکھنے لگی جیسے اسے کسی جوابدہی سے نجات مل گئی ہو۔پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بیڈ سے اتری اور کچھ بھی کہے بنا پیروں میں چپل اڑس کر باہر کی جانب بڑھنے لگی۔اسے آتے دیکھ کر اس کام والی لڑکی نے ایک طرف ہو کر اسے راستہ فراہم کیا تھا۔

"پلیز خود کو سنبھالنا ثومیہ۔۔۔کوئی سین مت بنانا یار۔ہم تمہیں بالکل ٹھیک رویہ اپناتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔تم سمجھ رہی ہو ناں۔۔۔؟"

بڑے محتاط لہجے میں مریم نے پیچھے سے پکارا تو وہ دروازے کا پٹ تھام کر مڑی تھی۔

"میں سمجھ رہی ہوں یا نہیں۔۔۔پتا نہیں۔لیکن تمہاری بات پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کروں گی۔"

باری باری ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اس نے بات مکمل کی اور انہیں مزید کسی بات کا موقع دیئے بنا باہر نکل گئی۔ وہ دونوں اس کے بعد ہلتے ہوئے دروازے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ پھر مریم نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے اطلاع دینے کے لیے آئی اس کام والی لڑکی کو مخاطب کیا۔

"تمہارا بہت شکریہ پیاری دوست۔۔۔یہ لو کچھ پیسے اور وہیں اس کے آس پاس رہنا کہیں۔لیکن خیال رہے کہ اس کی نظروں سے اوجھل رہو۔ یونہی صفائی کے بہانے کسی نزدیکی کمرے میں چلی جاؤ۔اس نے کوئی گڑبڑ کی تو فوراً پہنچ جانا۔ویسے ہمارا دھیان بھی اسی طرف ہے۔"

تفصیلاً کہتے ہوئے اس نے چند نوٹ موڑ کر اس کی مٹھی میں دبائے تو "جی اچھا باجی جی۔۔۔" کہتی ہوئی وہ خوشی خوشی ثومیہ کے پیچھے چلی گئی۔

ادھر جونہی ثومیہ اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں نمودار ہوئی، وقت گذاری کے لیے اونچی منقش چھت اور چوڑے ستونوں کو دیکھتا سفیر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ثومیہ کو دیکھتے ہوئے اس کی فسوں گر آنکھوں میں اک درد تھا، کوئی کرب تھا اور بے تحاشا اضطراب تھا۔۔۔جبکہ دروازے سے تھوڑا آگے آکر مُسلسل اسے دیکھتی ہوئی اور ہولے ہولے رک جاتی ثومیہ شاہجہاں کی ویران تر آنکھوں میں بجھی بجھی سی یاس و آس کے سنگ دبی دبی سی راکھ تھی۔ وقت کی ساری پہریں ان دونوں کے گرد تھم سی گئی تھیں اور سانس ساکن کیے وہ دونوں ایک دوسرے کی دید میں یوں گم تھے گویا نظروں ہی نظروں میں باہم شکوہ کناں ہوں کہ دیکھ لو تمہاری بدولت یا تم سے بچھڑ جانے کے بعد میرا حال کیسا ہے؟

بالآخر کچھ دیر بعد یہ محویت توڑ کر وہ دونوں ایک مخصوص ردھم سے قدم قدم چلتے ایک دوسرے کی طرف بڑھے تھے۔

" کیوں آتے ہو یہاں بار بار؟ تمہیں روکا تو تھا کہ آئندہ کبھی مت آنا۔۔۔تو پھر کیا چاہتے ہو؟ اب کس بات کا انتظار ہے تمہیں؟"

اس کے عین مقابل رک کر فقط ایک پل کے لیے اسے مزید تاکنے کے بعد ثومیہ نے رخ بدلتے ہوئے پوچھا تھا۔اس کے لب ولہجہ وانداز سے اس بار جرح وجارحیت مفقود تھی۔۔۔بلکہ وہ بے حد شکستگی سے گویا تھی۔

" درِیار پر معافی کا ارادہ وخواستگاری لیے آیا ہوا کوئی بھی شخص وفرد اپنے پروردگار کی جانب سے فقط ایک "لفظِ کُن" کا منتظر ہوتا ہے ثومیہ۔۔۔اور میں بھی کسی بھی اور شے کی اک ایک طلب وجو سے دستبردار ہو چکا ہوں۔" بالکل درویشانہ انداز میں جواباً کہتے ہوئے اس نے اپنے سر کو یوں شدت سے دائیں بائیں جھٹکا جیسے دل میں ثومیہ کی خاطر اب تلک مچلتے بلکتے تمام تر جذبوں کی نفی کر رہا ہو۔اس کے لہجہ وانداز پر وہ عجب لوسی دیتی آنکھوں سے اسے پھر سے دیکھنے لگی۔فقط ایک پل کو ٹھہر کر اس نے یوں ہنکارا بھرا جیسے اس کے درویش پن کا جواب اسی لے وطرز پر دینا چاہتی ہو۔

" اگر یہ بات ہے تو تم جان لو کہ رب کا لفظِ کُن کسی کے ارادہ یا خواستگاری کا محتاج نہیں ہوتا۔اس کا امر ہوتا ہے تو ہی حالات بنتے ہیں اور تمام تر واقعات بھی تبھی رونما ہوتے ہیں جب وہ چاہتا ہے۔تم یہاں آئے کھڑے ہو یعنی وہ لایا ہے تمہیں۔۔۔اور تم یوں آئے ہو تو جاؤ تمہارا ہر قصور تمہیں پورے دل سے معاف کیا۔لیکن دوبارہ یہاں کبھی مت آنا۔۔۔"

وہ خود ہی خود میں الجھی بکھری لڑکی اس قدر مضبوطی سے بولی تھی کہ وہ چونک سا گیا۔رخ بدل کر دو قدم بڑھتا، حیرت در حیرت اسے تاکتے ہوئے وہ عین مقابل آن رکا۔

" میں بہت خوش ہوں ثومیہ۔۔۔کہ آج تم کافی بہتر ہو۔بس سوچ رہا ہوں کہ اتنا ٹوٹ کر بھی تم نے خود کو واپس سمیٹ کس طرح سے لیا۔۔۔؟ کاش کوئی ایسا کارگر ساگر میرے ہاتھ بھی لگ جائے۔۔۔کہ بہت ٹوٹنے کے بعد۔۔۔ کہیں سے جڑتے کیسے ہیں؟"

بات مکمل کرتے ہوئے وہ خفیف سا مسکرایا تو اس کے گلال لبوں کی اداس تر چٹک میں بھی اک دلکشی مترشح تھی۔واقعی حسن وجمال اس شخص پر بلا کا مہربان تھا کہ ہر ایک رنگ میں وہ پورے منظر پر چھا جاتا تھا۔

"وہ جس کا لفظِ کُن کسی کے ارادوں کا محتاج نہیں ہے ناں۔۔۔اس اللہ کی ایک اور بات مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔وعدے اور دلاسے بڑے مزے کے دیتا ہے۔میں نے خود کو خود سے کیا سمیٹنا تھا؟ میں بھی صرف اسی کی آسروں پر ٹکی ہوں۔۔۔"ایک پل کے لیے آنکھیں میچ کر جواباً وہ بڑے جذب سے بولی تو سفیر ٹکر ٹکر اس کی آنکھوں کے کناروں پر دھری بے تحاشا سوگوار یت پڑھنے لگا۔اسے یوں محویت سے خود کو تکتے ہوئے پا کر وہ قدم قدم اس سے پیچھے ہٹنے لگی تھی۔

"تم اب واپس جا سکتے ہو۔۔اسی بزرگ و برتر خدا کے لیے کہ جس کے امرِ کُن پر بھروسہ کر کے تم یہاں تک آئے ہو۔۔۔میں نے تمہیں معاف کیا۔"

اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں سے یہ سارے لفظ کئی نادیدہ اذیتوں سے لپٹ کر ٹپکے تھے کہ اسی کی مانند قدم قدم اس کی جانب چلتا وہ عجب عجب بے قرار ہوتا گیا۔

"معاف کر دیا ہے تو مجھ سے بات بھی کرو ثومیہ۔۔۔پلیز کچھ دیر کے لیے رکو تو سہی۔ہم بہترین دوست ہیں ناں۔۔۔"

بے تابی سے کہتے ہوئے وہ ابھی "لفظِ دوست" تک پہنچا تھا کہ الٹے پیروں چلتی وہ یکا یک ہی اپنی جگہ پر رکی اور یوں تڑپ کر اسے دیکھا کہ اس کی نظروں کی کاٹ سے وہ گویا زمین تک میں گڑ گیا۔

"محبت کی کچھ دعویداریوں میں تم نے مجھ سے میرے دوست بھی چھین لیے تھے۔۔۔اب اس لفظ کا کوئی حوالہ ہمارے درمیان ہے ہی نہیں۔میں نے کہا ناں۔۔۔تم چلے جاؤ اور دوبارہ لوٹ کر یہاں کبھی مت آنا۔مجھے کسی کی ضرورت ہے ہی نہیں۔"بڑا اتر رخ کر اسے واپسی کے لیے اشارہ کرتے ہوئے اس نے ہوا میں ہاتھ چلایا تو ایکدم کسی اذیت سے لپٹتے سفیر نے یوں سینے میں سانس بھرا گویا ہواؤں میں کسی نے زہر گھول دیا ہو۔اسی پل باہر چھائے بادل اتنے زور سے گرجے کہ ان دونوں کی توجہ آپس سے ٹوٹ کر کالے آسمان کی جانب مبذول ہو گئی۔اور بادلوں کی اس گرج کے ساتھ ہی چھما چھم برستا مینہ دیکھ کر سفیر کو جیسے باہمی دوستی میں دینے کے لیے اک نیا" حوالہ "مل گیا تھا۔

"میں ساری ضدیں ہار آیا ہوں ثومیہ۔۔۔خدارا مجھے دل سے معاف کرو۔برستی ہوئی ان تیز تر بارشوں کو

ذرا غور سے سنو۔شاید کہ تمہیں ان میں میرے کُچھ اشکِ ندامت بھی ملیں۔باہر دیکھو ثومیہ۔۔۔آسمان سے وہی موسم پھر سے اتر آیا ہے کہ جو کبھی ہماری دوستی کی اوائل و شروعات پر گواہ رہا ہے۔"

وہ بولا اس کا لہجہ چھما چھم برستی بارشوں پر ٹکی کسی شورش و لگاوٹ میں بھیگا ہوا سا تھا۔اور اس کی باتوں میں موجود دوستی کے حوالوں اور گواہی پر ثومیہ نے اسے یوں گھورا جیسے ابھی کھا جائے گی۔

" آسمانوں کا ہنر صرف بارشیں برسانا نہیں ہوتا۔۔۔کسی کسی کے حصے میں اذیتیں بھی یہیں سے نازل ہوتی ہیں۔اور کن بارشوں کی بات کرتے ہو تم۔۔۔؟ وہ جو ساری جوڑ کر تم نے میری آنکھوں میں ڈھک دی ہیں؟ جاؤ اے کوئی بھی اجنبی سے شخص۔۔۔اب تم میرے دوست نہیں رہے۔"

اب وہ بولی تو قطعیت سے پر اس کا شکستہ تر لہجہ۔۔۔عجب عجب سا بلک رہا تھا۔جواباً ایک پل کو ساکت ہوا سفیر کچھ بھی کہے بنا رخ بدل کر برآمدے کی کشادہ تر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا تو قدم قدم چلتی وہ پھر سے اس کے سامنے آن رکی۔

" میں نے تم سے کہا تھا ناں۔۔۔ایسی محبت مت کرنا کہ تمہاری محبت کی پاداش میں کوئی روح کہیں دیوار گزیدہ کر دی جائے۔ارے جاؤ جناب جی۔۔۔تم کیا جانو کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ بارشوں کو چھوڑو تم۔۔۔بس میرے لہجوں کو سنو۔یہ جو میرے لہجوں میں بلک رہی ہے ناں۔۔۔؟ محبت اس کو کہتے ہیں۔"

اپنے سامنے آنے پر اسے دائیں بائیں جھانکتے دیکھ کر نظر ہی نظر میں اس کی نظروں کا پیچھا کرتی، ایک ہاتھ سے اپنے گلے کو تھام کر دوسرے سے اسے شانے سے ہلاتے ہوئے متوجہ کرتی آخرش وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو سفیر کا اندر باہر کسی آگ سی کیفیت میں لپٹ کر جل جل گیا۔

" خدا کے لیے مجھے معاف کر دو ثومیہ۔۔۔میں خود بھی جانے کس کس سوچ میں ڈھل رہا ہوں۔مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا کہ میں اس پل تم سے مزید کیا کہوں؟ تم سے محبت کی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ بے پناہ کی تھی۔خدارا مجھے بتاؤ ثومیہ کہ اس میں اب میں کیا کروں؟"

بے ساختہ تڑپ کر اسے دونوں شانوں سے تھامتے ہوئے وہ یوں ہلا ہلا کر بولا کہ جیسے اس سے اپنی محبت کو "جرم" کہنے کا حساب مانگ رہا ہو۔اور کھوئی کھوئی کیفیت میں یک ٹک اسے دیکھتی ابھی وہ کچھ بھی نہ بولی تھی کہ

اسے چھوڑ کر، اس پر تھوڑا جھکتے ہوئے، اس کے گلے کی ابھری ہوئی رگوں کی جانب اشارہ کرتا وہ عجب تڑپتے ہوئے سے لہجے میں مزید بولا۔

"بلکتے ہوئے ان لہجوں کی قسم۔۔۔میں تم سے والہانہ عشق کروں۔"

اور یہیں اسے ساکت چھوڑ کر بڑی بے قراری سے واپسی کے پلٹتا وہ پھر سے رکا تھا۔

"جا رہا ہوں میں۔۔۔اور اب کی بار اسے لیتا ہوا آؤں گا جو میرے سبب تم سے کہیں بچھڑ گیا ہے۔ ہاں ثومیہ۔۔۔میں مصطفین شجاع کو لانے کے لیے جا رہا ہوں۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں تم سے کہ میں اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ شاید کہ مجھے پھر ہی تم سے معافی مل سکے۔ الوداع اور۔۔۔خدا حافظ۔"

انگلی اٹھا کر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ یکایک وہاں سے نکلتا بھی چلا گیا تو دور تلک اس کی چوڑی پشت کو تاکتے ہوئے وہ وہیں چوڑے برآمدے کے طویل ستونوں اور اونچی چھت تلے اپنے گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھتی بے تحاشا رونے لگی۔

اس کی حیات و زیست کی یہ بے سمت کہانی وہاں ہی پھر سے جڑنے لگی تھی۔۔۔کہ جہاں سے ٹوٹی تھی پہلے۔ بنا کسی اظہار و اقرار۔۔۔وقت اس کے حق میں محبت لکھنے والا تھا یا نہیں؟ اس کا جواب فی الوقت ان گذرتی ہوئی ساعتوں کے پاس بھی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد سے سفیر احمد نے مصطفین شجاع کو بہت ڈھونڈا۔ اس کے پاس اس کے گھر یا محلّہ و گلی کی کوئی نشانی یا نام و پتا موجود نہیں تھا لیکن وہ ہر اس جگہ گیا جہاں اس کے ہونے یا ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ اندرون لاہور کی تنگ و تاریک گلیوں کے ساتھ ساتھ اس نے بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے وہ سارے مقامات بھی چھان مارے کہ جہاں اپنی یونیورسٹی سے ملے مقالے کی تیاری کے سلسلہ میں وہ سب ایک ساتھ گھومے تھے۔ ان جگہوں سے ان کی اس قدر یادیں وابستہ تھیں کہ اس کا خیال تھا ان سب یادوں سے لگ لپٹ کر مصطفین بھی کبھی وہاں ضرور آئے گا۔ تاریخی مقامات پر جا بجا گھومتے ہوئے اسے بار بار مصطفین کی وہ باتیں اور جملے یاد آتے تھے جو کبھی اس نے اس کی دوستی میں بڑے خلوص سے ادا کیے تھے۔ ان مقامات پر ان جملوں کی

بازگشت اسے نئے نئے عذابوں سے دوچار کر دیا کرتی تھی۔ یہاں کے بام و در سے وابستہ مختلف یادوں میں لپٹتے ہوئے، اپنے کیے پر پہلے سے بہت شرمسار وہ اندر ہی اندر مزید کٹنے لگتا تھا۔ عہد ماضی میں کبھی مصطفین سے وابستہ اک ایک لمحہ اس کی روح تک کے لیے کچوکوں کا باعث تھا۔ اس نے بادشاہی مسجد کی طویل راہداریوں میں مصطفین کے ہاتھوں سے پتھریلی دیوار پر کندہ کچھ حروف ڈھونڈے اور انہیں پا کر گویا ان سے لپٹ کر رو پڑا تھا۔

اس نے ثومیہ، سفیر اور اپنے نام کو ایک پھول دار کنڈے کی شکل میں جوڑ کر یوں خوشخطی میں درج کیا تھا گویا ان سب کی حقیقت کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو گی۔ ہاں بالکل۔۔۔ اس کہانی میں تاریخی مقامات پر بے قرار ہوا پھرتا وہ شخص اور "وہ دیوتا" سفیر احمد ہی تھا۔ کبھی شاہی قلعہ تو کبھی بادشاہی مسجد اور اندرون لاہور میں اس کی تلاش میں سرگرداں رہ کر بہت ہارنے کے بعد اس نے مصطفین سے ملنے کی چاہ و طلب میں کئی نامور درباروں پر بے شمار منتیں بھی مانگی تھیں۔ لیکن اسے تلاشنے کی بارہا کی ان کوششوں میں جگہ جگہ در بدر ہو کر بھی مصطفین شجاع تھا کہ اسے ملتا ہی نہیں تھا۔

"اب جا رہا ہوں میں۔۔ اور ہر روز دعا کروں گا کہ تمہاری زندگی میں وہ مقام کبھی نہ آئے کہ تمہیں میرے نام سے لپٹ کر کہیں رونا پڑے۔ خدا کرے تم اگر ڈھونڈنے بھی نکلو تو مصطفین شجاع تمہیں کبھی نہ ملے۔"

ہر بار اور ہر جگہ اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہونے پر اس کے لبوں سے آزاد ہوا یہ ورد سفیر کا منہ چڑایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی دوستی میں ایسے ہی کئی پہلو تھے جو اسے مسمار کن کیفیات میں مبتلا کرتے تھے۔۔۔ کہ جنہیں سوچ سوچ کر وہ اپنے اندر کہیں منہ کے بل پورے قد سے گرتا تھا۔

اور یہیں مصطفین شجاع کو ڈھونڈنے کی اس تگ و دو اور جستجو کے دوران ایک روز جب بادشاہی مسجد کی طویل راہداریوں میں وہ عجب خود اذیتی کی سی حالت میں گرفتار تھا اسے وہ پری وش۔۔۔ وہ اپسرا ملی تھی کہ جس کی دلنشیں آنکھوں میں پھر سے خواب ہو چکی کچھ تعبیریں کسی راکھ کی مانند اڑتی تھیں۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ در حقیقت وہ کون ہے؟ لیکن وہ ہر اس جگہ اپنے آپ پہنچ جایا کرتی تھی جہاں جہاں وہ خود بھی بنا کسی پیشگی ارادے کے جایا کرتا تھا۔ جانے اسے اس کی کہانی میں کیا دلچسپی تھی کہ مُسلسل اسے جاننے کا اصرار کیا کرتی تھی؟ سفیر کے لیے سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ جب بھی اس سے ملتی تھی اسے ایسی گہری

نظروں سے دیکھا کرتی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی سرمائی آنکھوں میں جھانکنے اور پھر وہاں اپنی خاطر موجزن و مچلتے ہوئے جذبوں سے بندھنے بھی لگتا تھا۔ وہ اسے اسی واشگاف اور اندر تک چھان لانے والی نگاہ و نظر سے دیکھا کرتی تھی کہ جس سے دیکھے جانے کی سفیر نے کبھی مصطفین اور ثومیہ کے سامنے یونیورسٹی کی کلاس میں خواہش کی تھی۔

" جیسے سب لوگ مجھے دیکھتے ہیں یوں دیکھنا بھی کوئی " دیکھنا " ہے بھلا؟ جیسے کوئی چوری کر رہا ہو۔۔۔ یا جیسے کوئی پردے کی بات ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھے دیکھے تو یوں کہ مجھے پتا بھی چلے کہ کسی نے مجھے دیکھا ہے۔ نظر بھر کر، پورے دل سے، سارے کا سارا اور۔۔۔ واشگاف۔ کوئی یوں دیکھے کہ اس کے دیکھنے پر چونک جاؤں۔ اس کی نگاہ اس قدر عمیق ہو کہ میرا اندر کھنگال لے، مجھ پر اثر کرے، مجھے باندھ لے۔۔۔ میری ذات و شخصیت کا ہر راز پا لینے والی نگاہ ہو۔ یا میرا اندرون کھوجنے والی۔۔۔ جس طرح سے یہ سب لوگ مجھے دیکھتے ہیں ناں یار۔۔۔ اس سے میری خواہشیں ادھوری رہتی ہیں۔ اس میں کچھ خاص یا انوکھا نہیں ہے۔ تو جس نظر میں کوئی انفرادیت نہ ہو وہ " عام " ہوتی ہے اور عمومیت مجھے متاثر نہیں کرتی۔ "

ہر دفعہ اس سے ملنے پر اپنے یہ جملے اس کے کانوں کے گرد کسی بازگشت کی مانند ناچنے لگتے تھے۔

اس کی ان کھوجتی ہوئی سی نظروں کے سبب ہی پہلے پہل وہ جب بھی اس سے ملتا تھا تو آنکھیں پھیرے رکھتا تھا۔ جانے کیوں اس کی روشن تر آنکھیں پڑھتے ہوئے اسے لگتا تھا کہ وہ اپنی حقیقی کہانی کے دائرہ و مرکز اور حصار و مدار سے ہٹ رہا ہے۔ لیکن وقت گزرا کہ بار بار ہوتی ان ملاقاتوں میں وہ اپنے سب سوگوار منظروں میں اس اپسرا کی موجودگی و ہونے کا عادی ہو گیا تھا۔ پھر کبھی کبھی یوں بھی ہوا اگر وہ اسے کہیں کسی منظر میں دکھائی نہیں دیتی تھی تو مصطفین کو بھول کر وہ اسے بھی تلاشنے لگتا تھا۔

ہاں بالکل۔۔۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جہاں میں کہ جن سے ہمارا اک مضبوط تر تعلق بنا کسی اظہار کے بھی ہوتا ہے۔ کہ کسی بھی بے سبب خیال یا پہلو سے وہ یونہی ہی کبھی ہم میں ٹھنڈے میٹھے جھرنوں سے رواں ہو جاتے ہیں۔

اس کا بھی اس انجان اپسرا سے ایسا ہی ایک تعلق تھا۔ بنا سبب۔۔۔ لیکن بے حد رواں سا۔

پہلے فقط اُس انجان اپسرا کو ہی اس کی کہانی و شخصیت میں دلچسپی تھی لیکن اب دھیرے دھیرے وہ بھی اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

اسی عالم میں ایسے ہی ایک روز اندرون لاہور کی گلیوں سے مصطفین شجاع کا کوئی سراپا سراغ کھوجنے کے لیے دربدر بھٹکنے اور حسبِ سابق بالکل ناکام ہونے کے بعد وہ بادشاہی مسجد میں چلا آیا تھا۔ یہاں آکر جانے کیوں اسے مصطفین اپنے آس پاس محسوس ہوتا تھا۔ مسجد کے اونچے وضوخانہ سے وضو کرنے کے بعد وہ تین چار قدمچوں پر گیلے پاؤں کے نشانات چھوڑتا ہوا صحن میں اترا اور بڑی یاس و حسرت سے فقط ایک نظر بالکل ساتھ واقع، بیرونی جانب کی طویل تر راہداریوں کو دیکھتا ہوا، کشادہ و پتھریلے صحن سے گزر کر قدم قدم مسجد کے گنبد کی جانب بڑھنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کی آنکھوں کے سامنے عہدِ ماضی سے وابستہ کئی خوش نما منظر پھر سے جاگ اٹھے تھے تو اونچے دہانوں اور طویل قامت بام و در سے پھوٹ کر کئی محبت بھری سرگوشیاں اس کے ذہن و دل کا گھیراؤ کرنے لگی تھیں۔ کبھی وہاں ان سب کے مابین ایسی ایسی گلاب گفتگوئیں ہوئی تھیں کہ جواب مُسلسل کھلتے، بکھرتے کُچھ حروف کی مانند اس کی سماعت کے گرد محوِ رقص تھیں۔

اس کا اپنا پرتو اور مصطفین شجاع کا کوئی عکس تھا جو ابھی اس کے صحن میں چلنے کے دوران اس کی آنکھوں کے سامنے طویل راہداریوں میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"اتنا آہستہ آہستہ کیوں چل رہا ہے بھائی؟؟ یہیں کہیں گم ہو گیا ناں تو کوئی ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔۔۔"

راہداری میں تھوڑا آگے آگے چلتا اس کا پرتو مصطفین کے عکس کے اپنے بالکل قریب آجانے پر بولا تھا۔ صحن میں کسی خیال سے بندھا بندھا چلتا حقیقی سفیر گویا ان لمحوں کے فسوں میں تھا کہیں۔ وہ یک ٹک راہداریوں کو دیکھتے ہوئے ان ہیولوں کے ساتھ ساتھ آگے گنبد کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"ارے واہ۔ بڑی حرف گری کرنے لگا ہے تو بھی۔ چلو اچھی بات ہے کہ آنی چاہیئے یہ بھی۔۔۔اور مجھے یقین ہے کہ میں یہیں کہیں رہ گیا تو تم سب میں سے کوئی نہ کوئی تو مجھے ڈھونڈنے ضرور آئے گا۔ اب اپنی دوستی پر اس قدر یقین تو میں بہر طور کرتا ہوں۔"

راہداری میں اس کے پرتو کی آنکھیں پڑھ کر اک خاص تر لہجے میں کہتا مصطفین شجاع کا عکس صحن میں

کھڑے حقیقی سفیر کی طرف دیکھ کر بڑی ادا سے ہنسا تھا اور پھر وہ سارا منظر گویا ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

جبکہ مصطفین کے "اپنی دوستی پر اس قدر یقین" کی بازگشت میں رہ چکا سفیر اسی پل اپنی جگہ پر ہولے ہولے رک سا گیا تھا۔ بڑی بے قراری سے اپنی دونوں آنکھیں ملتے ہوئے اس نے جیسے اس منظر کو پھر سے جگانے کی کوشش کی تھی۔ اور اس تناظر میں مزید اس نے ابھی کوئی ایک جملہ تو کیا۔۔۔ لفظ بھی نہیں سوچا تھا کہ اپنی پشت سے آتی اک مخصوص و منفرد سی خوشبو پر بے تحاشا چونک گیا۔

" کچھ تو ہے ان راہداریوں میں۔۔۔ جو آپ ان سے یوں بندھے بندھے سے رہتے ہیں کہ اس دوران آپ کو آس پاس کا تو کیا ہوگا۔۔۔ اپنا بھی ہوش نہیں ہوتا۔"

اس اپسرا کی موجودگی و ہونے کا احساس کر کے وہ ابھی پلٹا بھی نہیں تھا کہ اس کی نغمگیں آواز سنائی دی۔ وہ یوں آہستگی سے اس کی طرف مڑا تھا جیسے کسی حسین خواب یا خیال کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو اور چند قدم کی دوری سے وہ اسے یوں نظر بھر کر دیکھ رہی تھی جیسے آنکھوں میں جذب کر لے گی۔

" کیسی ہیں آپ؟ اس روز بنا بتائے ہی چلی گئی تھیں؟ اس بار تو میں بھی یہی سمجھا تھا کہ اب شاید ہم کبھی نہ ملیں۔"

دو قدم اس کی جانب بڑھتے ہوئے سوال در سوال وہ یوں بے تابی سے بولا کہ اپنی اس لگاوٹ پر خود بھی حیران رہ گیا۔ اور اس کی بات سن کر اس اپسرا کا گلاب رنگ چہرہ بے طرح سے کھل اٹھا تھا۔

" کتنا مزہ آئے کہ یہ شخص مجھے یونہی سرِ راہ کہیں پھر سے ملے۔۔۔ کیا ہی دلکش منظر ہو کہ وقت اسے لا کر پھر سے کہیں میرے سامنے رکھ دے۔"

زیرِ لب مسکراتے ہوئے وہ اس دیوتا سے پچھلی ملاقات میں کی گئی اپنی اس خود کلامی کو یاد کر رہی تھی۔ اس کے شاداب تر چہرے اور دلنشین آنکھوں سے پھوٹتی یہ تمام تر خوشی اس دیوتا سے "سرِ راہ" ہوئے اس بے وجہ "ملن" کی تھی۔ وقت نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسے "یونہی" اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ ایک تو وقت کی یہ نوازشات۔۔۔ اور اس پر اس دیوتا کا نرم خو انداز اور مہربان لب و لہجہ۔۔۔ ایک پل کے لیے اس اپسرا کو لگا کہ گویا اس کی کاٹی گئی ساری "عشقیہ ریاضتیں" اثر پذیری کی خصوصیات میں ڈھل گئی ہیں۔

"یقین کریں میں بھی یہی سوچتی تھی شاید میں نے آپ کو کھو دیا ہے۔۔۔کہ شاید آپ مجھے دوبارہ نہیں ملیں گے۔لیکن آپ ہر بار مل جایا کرتے تھے۔اور اب آپ نے بھی یہی سوچا تھا کہ شاید اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ لیکن دیکھیں۔۔۔ہم مل گئے ہیں۔تو پھر آپ مان کیوں نہیں لیتے کہ یہاں پہ جو بھی بچھڑتا ہے وہ آخر مل ہی جاتا ہے؟تو پھر آپ اِس قدر اداس کیوں رہتے ہیں؟"

جواباً اک تیقن سے کہتے ہوئے کونہ کونہ اس کے سحر گر نین پڑھتی، ساری گفتگوئیں بھلا کر وہ پھر سے اپنے من پسند موضوع یعنی اس کی کہانی کی کھوج پر چلی آئی تو فقط ایک نظر اسے دیکھ کر سر کو دائیں بائیں جنبش دیتا وہ قدم قدم دوبارہ مسجد کے گنبد کی جانب بڑھنے لگا۔

" آپ میرا ہر سوال ہمیشہ نظر انداز کیوں کر جاتے ہیں؟ بتایا نہیں آپ نے کہ آپ اِس قدر بے چین سے کیوں پھرتے ہیں؟"اس کی ہمراہی میں قدم بڑھا کر وہ ایک رخ سے مُسلسل اس کا چہرہ تاکتے ہوئے بضد ہوئی تو سفیر کے دلکش لبوں سے کوئی سسکاری سی برآمد ہوئی تھی۔

"ہاں میں بے قرار رہتا ہوں۔۔۔کیونکہ وہ لوگ اور وہ لہجے بھی۔۔۔وقت کے ہاتھوں سے کہیں ریت ہو گئے ہیں کہ جو دل کو کبھی بے پناہ تقویتیں دیا کرتے تھے۔"

وہ یوں تڑپ کر بولا تھا کہ پورا منظر بلک گیا تھا۔جواباً ایک پل کو خاموش رہ کر اس ماورائی کہانیوں سی لڑکی نے کُچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ ہاتھ اٹھا کر اسے کُچھ بھی بولنے سے ٹوکتا وہ مزید گویا ہوا۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ کو میری ذات یا کہانی میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ میں بہت عام سا بندہ ہوں جو تعلقات رکھنے، نبھانے اور سنبھالنے میں ہمیشہ چوک جاتا ہے۔مجھ میں ایسا خاص تو کُچھ بھی نہیں کہ آپ یوں شدت سے میری تلاش کریں۔"عجب شکستہ تر لہجے میں جانے کیسے کیسے دکھ روتے ہوئے بات مکمل کر کے اس نے مسجد کے صحن میں واقع اس قدیمی حوض کے دائیں جانب رک کر سوالیہ نظریں اس اپسرا پر تان دی تھیں۔آج وہ سچ مچ اس سے اس کی ہر لگن و لگاوٹ کا دو ٹوک جواب چاہتا تھا۔جبکہ بغور اس کا لب و لہجہ پرکھتی وہ ہولے ہولے اس کے بہت قریب ہوئی تھی۔

" آپ کی ذات یا کہانی میں دلچسپی لینے کی میرے پاس بہت سی وجوہات ہیں۔۔۔ان عوامل میں سب سے

پہلے تو آپ کا یہ لہجہ شامل ہوتا ہے کہ اسی کی بدولت میں آپ کی کہانی میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوئی تھی۔"

بالکل کسی سرگوشی کی مانند اس نے یوں آہستگی سے کہا کہ وہ یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ جبکہ بہت فدا کن نظروں سے وہ اب بھی مُسلسل اسے ہی تاک رہی تھی۔

" آپ کے اس فسوں گر لیکن شکستہ تر لب ولہجہ پر دل کرتا ہے دل تو کیا میں " جاں " بھی واردوں۔ اور اس پر آپ کی یہ خوبصورت آنکھیں۔۔۔ واللہ گر پڑھ سکے کوئی تو اک جہانِ تحیر ہے ان میں۔ ہاں یہ منظروں پر طرح طرح کے رنگ نچھاور کرتی ہیں۔" اک دلنشیں ادا سے آس پاس منظروں کو دیکھتے ہوئے بات مکمل کرتی وہ گویا اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگی تھی۔

" سم۔۔۔ سمجھائیں اپنے دل کو۔ یہ کس راہ پہ چل پڑا ہے؟ یہاں اس قدر دھول ہے کہ پھونک پھونک کر آپ تھک جائیں گی۔ میں ان مسافتوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔۔۔ اور یقین کریں یہ روش بہت پر خار ہے۔"

اس کے لفظ وحرف میں پنہاں بے پناہ شدتوں سے گھبرا کر وہ رخ بدلتے ہوئے بولا تھا۔

" دل طفل تسلیوں سے کب بہلتے ہیں بھلا؟ ان کو تقویت کے لیے صرف وہی چاہئیے ہوتا ہے کہ یہ جس کسی کی بھی خواہش کرلیں۔" جواباً کہتے ہوئے دو قدم بڑھ کر وہ پھر سے اس کے مقابل آن رکی تو سفیر کو لگا کہ جذبات سے لبریز اس کی پرنم آنکھوں سے فرار مشکل ہے۔

" مم۔۔۔ مجھ سے کیا چاہتی ہیں آپ؟" اس کے دلکش نینوں سے آنکھیں چرا کر وہ اٹکتے ہوئے بمشکل یہی پوچھ سکا تو یکا یک سرشاری ہو کر وہ بے خودی میں ہنسی تھی۔

" ان آنکھوں سے مجھ پر اتنے رنگ چھڑک دو آپ۔۔۔ کہ میں دھنک سی ہو جاؤں۔"

عجب شاعرانہ رنگ میں کہتے ہوئے اس کی ہنسی طویل ہونے لگی تو وہ پتھر ہو گیا۔ وہ اپنے جذبات کا واضح تر اظہار کر رہی تھی اور وہ تھا کہ پذیرائی سے بالکل قاصر تھا۔

" میری بات سنیں محترمہ۔۔۔ میں وہ شخص نہیں جو کسی ایک چوکھٹ کا ہو سکے۔ در در کی ٹھوکریں کھاتا بہت بھٹکا ہوا انسان ہوں۔ یہیں سے لوٹ جائیں آپ اور ہو سکے تو آئندہ میری جستجو نہ کریں۔"

من ہی من اندر بے طرح جلتے ہوئے وہ اس لڑکی کے خود پر طاری ہوتے سارے جادو جھٹک کر بولا تو اس

کی سنگدلی پر اس اپسرا کے ہونٹوں پر دھرے سارے اذکار گویا بجھنے لگے تھے۔ وہ دیوتا سا شخص کسی بدولت پتھر تھا۔۔ اس بات کا اسے اندازہ تھا۔ لیکن وہ اس قدر پتھر تھا کہ کسی خوش رنگ اظہار کو بھی درِ خود اعتنا نہ جانے گا۔۔ وہ ہرگز نہ جانتی تھی۔ اندر باہر خالی خالی، سائیں سائیں کرتی کیفیات میں رہ کر، ٹکر ٹکر اس دیوتا کا چہرہ تاکتے ہوئے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مزید اب اسے کیا کہے بھلا؟

"میں کسی ایسے فرد کو ڈھونڈ رہا ہوں جو بالکل میرے جیسا تھا اور میری اک غلطی کے سبب مجھ سے کہیں کھو گیا ہے۔ اگر آپ کو میری ذات یا پھر میری کہانی سے دلچسپی ہے تو بس میرے حق میں یہ دعا کر دیں کہ میں اس کو کہیں سے بھی واپس پا سکوں۔"

اب اسے بالکل گنگ پایا تو لہجے کو قدرے ڈھال کر اک خود ترسی کی سی حالت میں رہ کر وہ مزید بولا تھا۔ اس کی آواز پر وہ یوں چونکی گویا کسی سکتہ و رنج سے چھوٹ رہی ہو۔ فقط ایک پل کے لیے اس کی سوالیہ آنکھوں میں جھانک کر اس نے اپنے سر کو یوں تاسف سے جھٹکا تھا گویا اس دیوتا کے سامنے درج کی ہوئی اپنی تمام تر "اپیلیں" خود ہی مسترد کر دی ہوں۔

"اول تو اس دُنیا میں ہمیں ہم سا کوئی۔۔ بس آئینوں میں ملتا ہے۔ اور اگر ہم سے باہر بھی ہمیں کوئی ہم سا مل جائے تو۔۔۔ پھر بچھڑتا کیسے ہے؟"

سوال در سوال گویا ہوئی وہ اب اپنے انداز سے یوں تاثر دے رہی تھی جیسے کچھ دیر پہلے ان دونوں کے مابین اظہار و مفر کا کوئی لمحہ آیا ہی نہ ہو۔ ہاں بالکل۔۔۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وقت نے ہمیں جن لمحوں پر من مرضی سے برتنے کا اختیار نہ دیا ہو ان سے نگاہیں چرانا ہی جینے میں مدد دے سکتا ہے۔

"وہ میری پرچھائی کی مانند تھا۔۔۔ لیکن اکثر پرچھائیاں اس قدر بڑھتی ہیں کہ اپنے وجود سے بھی چھوٹنے سی لگیں۔ بالکل یونہی وہ بھی مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔ ہاں وہ ایسی ہی اک پرچھائی تھا جو میرے وجود سے کہیں دور جا بسی ہے۔" اس اپسرا کی اندرونی حالت و کیفیت سے یکسر بے خبر عجب کھوئے کھوئے انداز میں وہ جواباً بولا تو کچھ بھی کہے بنا بے ساختہ مڑ کر وہ ان راہداریوں کی جانب دیکھنے لگی تھی جن میں اس نے اس دیوتا سے شخص کو کچھ اسما سے لپٹ کر بے تحاشا روتے دیکھا تھا۔۔۔ وہی تین نام کہ جن میں سے ایک نام سے وہ پہلے روز سے ہی

خوب خوب واقف تھی۔

"چلتا ہوں میں۔۔۔اور امید کرتا ہوں کہ میری بدولت آپ کی کوئی دل آزاری نہیں ہوئی ہوگی۔"

حسبِ عادت ماتھے پر ہاتھ لے جا کر اسے الوداع کہتا ہوا وہ مسجد کے گنبد کی جانب بڑھ گیا تو چند لمحات کے لیے وہیں ٹھہر کر پھر بے ساختہ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے، اس اپسرا نے آج اسے راہداری میں درج اس تیسرے نام سے اپنی شناسائی اور واقفیت کے متعلق آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"بات سنیں۔۔۔آپ جسے ڈھونڈ رہے ہیں وہ اب اس شہر میں نہیں رہتا۔"

وہ مسجد کے اندرونی حصہ کے داخلی زینوں پر پہنچ چکا تھا جب اس نے اسے پشت سے پکارا تھا۔ یکا یک رک کر ایک مخصوص ساکتی ردھم سے وہ اس کی جانب پلٹا تو اس اپسرا نے دیکھا کہ دیوتا کی ساحر آنکھوں میں کئی کئی حیرتیں جم چکی تھیں۔

"کیا۔۔۔؟ ابھی کیا کہا آپ نے؟"

انگلی اٹھا کر سوال کرتے ہوئے اس کی چمکتی ہوئی پیشانی پر کئی استعجابیہ لکیریں نمودار ہوئیں۔

"میں نے کہا کہ...... مصطفین شجاع اب اس شہر میں نہیں رہتا۔" کوئی راز آشکار کرتے ہوئے سے لہجے میں وہ پورے یقین سے بولی تو تیزی سے زینے اترتا وہ اس کے عین سامنے آن رکا تھا۔

"ارے۔۔۔لیکن آپ اسے کیسے جانتی ہیں۔۔۔؟ اور آپ کو کس طرح سے خبر ہے کہ میں اسی کو ڈھونڈتا ہوں؟" بڑی بے تابی سے پوچھتے ہوئے نظر بھر کر سر تا پا اسے دیکھتا وہ سراپا حیرت تھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس حسین تر اپسرا میں مصطفین شجاع کی کوئی جھلک ناپ رہا ہو۔ اس کے سوال پر کسی کھوئی کھوئی کیفیت میں ڈھلتی وہ بڑی آسودگی سے مسکرا دی تھی۔

"وہ ہمارا کرایہ دار تھا اور۔۔۔بس کرایہ دار ہی تھا۔ امی جان اور ابو نے تو اس سے ہزاروں رشتے استوار کر رکھے تھے۔ لیکن میرا اور اس کا تعلق کبھی کرایہ دار اور مکان مالکن کی حدود سے پار نہیں ہوا۔ پھر امی کی وفات ہوئی تو اپنی یونیورسٹی کے دوران ہی وہ ہمارے گھر سے چلا گیا تھا۔"

یک لمحاتی توقف سے وہ بڑے جذب سے بولی تو وہ حیرت در حیرت اسے بس تا کتا رہا۔ اس کے سان و

گماں تک میں نہیں تھا کہ جس کی تلاش میں وہ مارا مارا پھرتا ہے یہ ماورائی سی لڑکی بھی اسی شخص سے وابستہ ہے۔

"رہی بات یہ کہ میں کیسے جانتی ہوں کہ آپ اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس روز ہم پہلی دفعہ ملے تھے، میں نے آپ کو ان راہداریوں میں اک دیوار سے ماتھا ٹکا کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔اور آپ کے چلے جانے کے بعد پڑھا تو وہاں درج تین ناموں میں سے ایک نام مصطفین شجاع کا تھا۔اور یہ نام اتنا منفرد ہے کہ میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ سارے لاہور میں مصطفین شجاع فقط ایک ہی تھا۔وہی کہ جواب اس شہر میں یقیناً نہیں رہتا۔"

اسے خاموش پا کر دھیرے دھیرے بولتے ہوئے اس نے مصطفین سے اپنی شناسائی کے بعد،خود کے ہاتھ لگے ہوئے،اس کے راز کے سراغ کی بھی،کامل وضاحت کردی تو ٹکر ٹکر اسے دیکھتا وہ کسی خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟اور آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ مصطفین شجاع اب اس شہر میں نہیں رہتا؟"

اس کے سوال پر اس اپسرا کی آنکھوں سے گویا کئی سوگوار منظر جاگ پڑے تھے۔سفیر نے دیکھا کہ اس کے فسوں گر نینوں سے باقاعدہ"نیر" بہنے لگے ہیں۔

"میں ایمان راجپوت ہوں اور میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں مصطفین شجاع اب اس شہر میں نہیں رہتا۔۔۔اور کیوں کہہ سکتی ہوں؟ کیونکہ میری ماں کی تربت پر اب کسی بھی شام۔۔۔میرے جانے سے پہلے کوئی دیا نہیں جلتا۔"

وہ بولی تو اس کا بھیگا بھیگا لہجہ جذبات سے پر تھا۔سفیر نے واضح طور پر محسوس کیا کہ مصطفین شجاع کا اس نازک سی لڑکی کے خاندان سے سچ مچ کوئی خاص اور انوکھا تعلق تھا۔فوراً اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ ایک بار مصطفین نے بنا کسی پیشگی اطلاع یونیورسٹی سے کچھ اضافی چھٹیاں کی تھیں اور چند روز بعد واپس حاضری پر بتایا تھا کہ اس کی خالہ،جو بظاہر صرف اس کی مکان مالکن تھیں،کا انتقال ہو گیا تھا۔سر جھٹک کر ساری حیرتوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے وہ صحن میں کھڑی ایمان راجپوت کے بالکل پاس اتر آیا۔اب اسے اس اپسرا کو یہ کہانی اپنے سرے سے

سنائی تھی۔

"میں سفیر احمد ہوں۔۔۔اس کہانی کا تیسرا کردار۔وہاں دیوار پر مصطفین شجاع کے ساتھ درج دوسرا نام ثومیہ شاہجہاں کا تھا۔ہم تینوں کی یہ کہانی یونیورسٹی آف سینٹرل پنجاب سے شروع ہوتی ہے۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں جھانک کر مدھم مدھم بولتا وہ اپنی کہانی سنانے لگا تھا۔۔۔اور حرف حرف اس کہانی کو سنتے ہوئے ہر ہر موڑ پر آنکھوں میں جہاں بھر کا استعجاب بھر کر وہ اسے یوں تاکتی تھی گویا مصطفین سے وابستہ اک نئی نئی دنیا کے کسی انوکھے ترین پہلو سے روشناس ہو رہی ہو۔

جبکہ کئی عشقیہ قصائص پر گواہ ہونے والی شہرِ لاہور کی زہریلی ہواؤں نے، اس کہانی میں اک نئے انگ و رنگ سے جڑ کر، ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن رکے، ان دو خاص تر کرداروں کو، بڑا لہک لہک کر چھوا اور اس ملاقات کو کسی طاہر و مطہر راز کی مانند، بادشاہی مسجد کے تاریخی و قدیمی بام و در پر کسی راز کی مانند پھونک دیا۔ وہی ایسے کئی رازوں کے امین بام و در۔۔۔جو کہ اس کہانی کے ہر پرانے پہلو و کروٹ سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔

اڑتے وقت کی ساری پہریں بہت ساکن سی ہو کر ان دونوں کے اِرد گرد صدائے حیرت بلند کرنے لگی تھیں کہ کون کون سے کردار کس کس طرح سے باہم ملتے ہیں کہ طغیاں تر دریاؤں کی مانند کئی کہانیاں بھی عجب عجب سے رُخ بدلنے لگتی ہیں۔

☆......☆......☆

تاریخی مقامات پر جا بجا گھومتے ہوئے سفیر احمد کو بار بار ملنے والی وہ اپسرا سی لڑکی ایمان راجپوت تھی۔ وہی آسمان اور اس کی نیلاہٹوں پر پورے دل سے فدا رہنے والی ماورائی کہانیوں سی لڑکی جو اپنے گھر کی بالکونی میں رک کر کبھی گھنٹوں آسمان دیکھا کرتی تھی۔ جسے اس کی ماں کنیز بیگم کی موت نے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا اور ان کے دُنیا سے چلے جانے کا اس نے اتنا اثر لیا تھا کہ ماں کے بعد خواب دیکھنا، بے وجہ ہنسنا مسکرانا اور حتیٰ کہ اپنا پسندیدہ مشغلہ یعنی آسمان تاکتے ہوئے اس پر استحقاق جمانا بھی ترک کر دیا تھا۔کنیز بیگم کے بعد مصطفین نے بھی یہ گھر چھوڑ دیا تھا اور درِ اندرون کہیں اس کے یوں ایکدم چلے جانے نے بھی ایمان کی ذات و شخصیت کو الٹنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔اس کے باپ ظفر صاحب تو پہلے بھی اس کی کسی ضد سے انکار نہیں کرتے تھے لیکن خالہ رضیہ بیگم

نے بھی بہن کی وفات کے بعد اوائل میں اپنی اس معصوم سی بھانجی کی دلجوئی کے لیے بھرپور جتن کیے۔ان دونوں کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ ایمان کی کوئی بھی بات یا فرمائش ہرگز نہ ٹالی جائے۔خالہ رضیہ شروع کے دو ماہ تو مستقل طور پر ان کے گھر ہی منتقل ہوگئی تھیں اور اس کے بعد بھی ہفتہ کے چار روز وہ انہی کے گھر قیام کرتی تھیں۔

انہیں اس کے اکیلے رہ جانے کا درد ہر پل ستاتا تھا۔چند ماہ کے لیے ہر وقت کا ساتھ ہوا تو خالہ سے اس کی وہ جھجک یا تکلف بھی جاتا رہا جو کہ رشتہ داری میں لوگوں کے مابین عموماً موجود ہوتا ہے۔بہت تیزی سے ان دونوں کا آپسی رشتہ،خونی تعلق اور باہمی پیار مزید مضبوطی میں پنپ گیا تھا۔الغرض وہ اسے کسی طور یہ احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں کہ ماں کے بعد دنیا اس کے لیے ویران یا اندھیر ہوگئی ہے۔

لیکن کچھ حقائق اتنے تلخ ہوتے ہیں کہ ان پر شیرینی کے جتنے بھی لبادے اوڑھائے جائیں وہ میٹھے نہیں لگتے۔ماں کا یکا یک دُنیا سے کوچ کر جانا۔۔۔اس کے لیے بھی زندگی کا ایسا ہی ایک پہلو تھا کہ جو وہ کسی بھی طور نہیں بھول سکتی تھی۔ہاں بالکل ہوتی ہیں کچھ کمیاں ایسی بھی۔۔۔کہ وقت کے پاس جن کی بھرپائی نہیں ہوتی۔

اس کے ابو اور خالہ تو کوئی مناسب بر دیکھ کر اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا کہ امی کی وفات کے صدمہ سے نکلنے و سنبھلنے تک اس کے سامنے شادی کا ذکر تک نہ کیا جائے۔اور مجبوراً ان دونوں نے پھر چپ سادھ لی تھی۔

کنیز بیگم کی وفات کے بعد شروع میں خود کو مصروف رکھنے اور دل بہلانے کے لیے وہ محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی تھی اور پھر رفتہ رفتہ اس لگی بندھی روٹین سے بھی تنگ آ کر اس نے ایک کورس کرنے کا ارادہ کر لیا۔

چونکہ اسے مختلف جگہیں دیکھنے اور نت نئی دنیائیں کھوجنے کا بہت اشتیاق رہتا تھا تو اپنے اسی شوق کی تقویت و تسکین کی خاطر اس نے ایک ادارے میں "ٹورازم" یعنی سیر و سیاحت کے کورس میں داخلہ لے لیا۔اس کے ادارے کی طرف سے انہیں ہفتہ میں تین روز مختلف سیاحتی مقامات پر لے جا کر تدریس کی جاتی تھی اور باقی تین روز ادارے میں ہی سیاحت سے متعلقہ مختلف رموز سکھائے جاتے تھے۔

اور اسی کورس کے دوران ایک روز جبکہ وہ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ بادشاہی مسجد کی طویل راہداریوں میں گھوم رہی تھی اس نے یونانی دیومالائی کہانیوں سے اس کردار۔۔۔اس دلکش و حسین دیوتا کو دیکھا تھا۔وہ پہلی نظر

میں اس کی طرف متوجہ ضرور ہوئی تھی کیونکہ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ جسے کوئی آسانی سے نظر انداز کر سکے لیکن وہ اس کی پہلی نظر کی محبت نہیں تھا۔ محبت اسے اس سے بہت دھیرے دھیرے، ٹھہر ٹھہر کر ہوئی تھی۔ اس نے اول روز سے جان لیا تھا کہ اس شخص کی کہانی میں مصطفین شجاع کا اہم تر کردار ہے لیکن کیا کردار ہے؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ اور یہی جاننے کی تگ و دو میں وہ ہولے ہولے اس دیوتا کے کرب سے بندھ گئی تھی۔ جابجا روتے بلکتے وہ اسے اس قدر ٹوٹی بکھری حالت میں ملتا تھا کہ اس کا من بے وجہ ہی اسے سمیٹ لینے کی خاطر مچلنے لگا تھا۔ پہلے پہل اسے فقط اس کی کہانی میں دلچسپی تھی، پھر وہ اس کے درد سے بندھنے لگی اور آخرش اسے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اور محبت بھی اس قدر طغیاں کہ اگر چند روز وہ اسے دکھائی نہیں دیتا تھا تو وہ عجب عجب سی بے قرار ہونے لگتی تھی۔

اس سے ملنے کا ہی اثر تھا کہ خوابوں سے نچڑ چکی اس کی بنجران تر آنکھیں پھر سے خواب سجانے لگی تھیں۔ اس آسمان سے شخص کے لیے جانے اسے اپنے دل میں کیسی کیسی لگاوٹیں محسوس ہوتی تھیں کہ وہ پھر سے آسمان تاکنے لگی تھی۔ اس کی یاد میں محو و گم ہو کر ہر بار اسے لگتا تھا کہ اس کے بدن پر کئی سفید پنکھ اگ آئے ہیں اور طیور کی مانند وہ نیلی وسعتوں کے سینے پر اڑان بھرنے لگی ہے۔

ایسی ہی ایک شام کہ جب اس نے اس شخص کو کسی نئے نئے خواب کے جیسا نینوں میں سجایا تھا، وہ اوپری منزل کی راہداری میں کھڑی حسبِ سابقہ عادت آسمانی نیلاہٹوں کے سفر پر تھی کہ خالہ رضیہ نے اس کی یہ خاص محویت بھانپ لی۔

"آج کل تم کہاں کھوئی رہتی ہو ایمان؟ میں دیکھ رہی ہوں کہ دن بدن تمہارے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے ہیں۔" لہراتے ہوئے پردوں کے مابین اس کے بالکل پاس رکتے ہوئے انہوں نے اسے شانے سے چھو کر مخاطب کیا تھا۔ جواباً وہی خواب سجی آنکھیں اس نے ان پر گاڑ دی تھیں۔

"بس یونہی خالہ جان۔۔۔ دل ہے کہ اب بہلنے لگا ہے۔"

اک ادا سے کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر شرمگیں مسکراہٹ تھی۔

"بھئی کون ہے وہ؟" بغور اس کا ناز و ادا پرکھتے ہوئے انہوں نے بنا کسی توقف کے سوال داغا تو خواب سارے بجھ کر یکایک اس کی آنکھوں میں کئی حیرتیں جم گئیں۔

"ارے بھئی وہی۔۔۔ کہ جس کی وجہ سے تمہارا دل اب بہلنے لگا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے حیرت وسوال پڑھ کر، کوئی راز بوجھ لینے کے سے انداز میں انہوں نے مزید کہا تو دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتی وہ سمت ہی بدل گئی تھی۔

"لے جھلی نہ ہو تو۔۔۔ اب شرما گئی ہے۔ پتر میں خالہ ہوں تیری۔ سب پتا ہے مجھے کہ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ تمہارا یہ روپ بولتا ہے کہ بات یہی ہے۔ چلو بتاؤ شاباش کہ کون ہے وہ؟ سینٹر میں کوئی ساتھ پڑھتا ہے کیا؟" گھوم کر اس کے سامنے آتے ہوئے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتی وہ اصرار کرنے لگیں تو جواباً یک بیک بڑھ کر وہ ان کے گلے لگ گئی۔

"آپ کو بتاؤں گی خالہ جان۔۔۔ جلدی بتاؤں گی۔ لیکن بات ابھی بیچ راہ میں ہے۔ ابھی تو مجھے ٹھیک سے اپنے دل کا بھی نہیں پتا کہ میرے دل میں کیا کیا ہے۔ جیسے ہی کچھ خبر ہو گی۔ میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔"

یونہی ان سے لپٹے لپٹے وہ بات مکمل کر چکی تو ان کی جہاندیدہ نظروں میں کئی فکریں ہلکورے لینے لگیں۔

"ذرا خیال سے میری دھی۔۔۔ دنیا بڑی ظالم اور تو بہت بھولی سی ہے۔ باہر لوگوں میں لڑکیوں کو اپنا آپ بڑا سُنج سنبھال کر چلنا پڑتا ہے۔ ہر بندہ اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کے منہ لگا جائے۔ مجھے تو فکر لگا دی ہے تو نے۔ مُسلسل اس کے بالوں میں پیار بھری انگلیاں چلاتے ہوئے انہوں نے ان خدشات کا اظہار کیا تو وہ بھی اپنی مخصوص طرز و جون میں لوٹتے ہوئے بولی۔

"اف خالہ۔۔۔ آپ بھی ناں بے وجہ ہولتی رہتی ہیں اور ساتھ مجھے بھی ہولا دیتی ہیں۔ ایسی بھی کوئی خطرناک جگہ نہیں ہے یہ دُنیا۔ جو جس قابل ہوا سے اس حد میں رکھو تو سب کچھ ٹھیک رہتا ہے۔ اور آپ جانتی ہیں کہ میں ہمیشہ انہی قواعد و کلیات پر چلتی ہوں۔ اب چلیں نیچے مجھے بہت بھوک لگ گئی ہے تو اس بھاشن کے سوا بھی کچھ کھانے کو لازمی دیں۔" ہوا میں ہاتھ نچا نچا کر اپنی بات مکمل کرتی وہ ان کا ہاتھ تھام کر زینوں کی جانب بڑھ گئی تو دوسرے ہاتھ سے مصنوعی خفگی سے اس کے شانے پر تھپڑ جڑتی وہ فقط یہی بولی تھیں۔

"بس کر کڑیے۔۔۔ میری ماں نہ بنا کر۔ تیرے بھلے کو ہی سمجھاتی ہوں۔"

اور یوں تفصیلات بتائے بنا اس نے خالہ رضیہ کو بھی اپنے اس راز میں امین کر لیا تھا۔

اس کے بعد جوں جوں اس کی سفیر سے بنا کسی تعارف کی یہ ملاقاتیں بڑھیں توں توں اس کی ذات پر اس کی گہری چھاپ لگتی چلی گئی۔ وہ اس کے رنج کو جانے بغیر اپنے دل پر محسوس کرتی تھی۔ دوسری طرف اپنی سچی لگن پر بے پناہ یقین رکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں منتظر تھی کہ کب اس کے پاس کہیں فرصت سے ٹھہر کر، اس پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے وہ اسے اپنی پوری کہانی سنا دے گا؟ ملفوف تر لب ولہجہ اور واشگاف اشارے کنائے میں بھی۔۔۔ وہ ہر دو طرح اس سے اظہارِ الفت کر کے دیکھ چکی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ اپنی کہانی ہی کی طرح اک پُراسرار سی پرت میں ملفوف ہوا شخص، اس کی حالت و کیفیت سے مکمل آگاہ و خبردار ہو کر بھی، اس سے یکسر بے نیاز رہتا تھا۔ وہ جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھی وہ اسی قدر اس سے فرار چاہتا تھا۔ ہر ملاقات کے دوران وہ یوں ایکدم سے کہیں سے بھی گفتگو روک کر منظروں سے غیاب پا لیتا تھا کہ پیچھے ساکت کھڑی وہ فقط اس کی ہواؤں کو چھو کر رہ جاتی تھی۔ اور یوں آدھی ادھوری تشنہ ملاقاتوں سے جابجا سوگواریت سے لپٹا یہ شخص اس کے دل کو بھی عجب رنجیدگی سے دوچار کر جاتا تھا۔ اس سے ملنے کی آرزو میں وہ بہت بہت سے جتن اور کئی کاوشیں کیا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ کئی بار تو وہ اس قدر بے قرار ہوئی کہ اس سے ملنے کی خواہشیں لے کر درباروں پر منتیں تک مانگ آئی۔

ایسے ہی ایک روز منت مانگنے کے دوران وہ اسے صحنِ دربار داتا صاحب میں بھی ملا تھا اور اسی روز سے اس کا یقین اس بات پر پختہ ہونے لگا تھا کہ قدرت اس اُداس تر شخص کو اسی کے حق و حصہ اور تقدیر میں لکھ رہی ہے۔ اپنی اسی قسمت کو آزمانے کی خاطر وہ اس سے ہوئی اپنی پچھلی ملاقات کو خود سے ادھورا چھوڑ آئی تھی۔ وہ جانچنا چاہتی تھی کہ منتوں پر بھروسہ کر کے وہ اپنے دل میں جو اس دیوتا پر پورے استحقاق جمائے بیٹھی ہے، ان میں کس قدر سچی ہے۔ اور اس کی اس جانچ نے بادشاہی مسجد کے وسیع و عریض صحن میں اس وقت تکمیل پائی تھی جب وہ اپنے پاگل دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک بار پھر سے یونہی وہ ساری جگہیں اور مقامات گھوم رہی تھی کہ جہاں جہاں بھی وہ اسے پہلے کبھی مل چکا تھا۔

تو گویا اس کا عشق کامل تھا کہ جو اسے پھر سے کہیں سے کھینچ لایا تھا۔۔۔ کہ واقعی اس کا درد اسی انتہا کو چھو رہا تھا کہ وہ بندھا بندھا سا آیا تھا۔ آخری ملاقات میں اس نے اپنے دل کو انہی شرائط پر سمجھاتے ہوئے اس دلپذیر

شخص اور جاوداں سے فرد سے جدا کیا تھا۔ گو کہ وہ اسے اپنی کہانی وزیست میں شامل کرنے سے اب بھی گریزاں وانکاری تھا لیکن مصطفین شجاع سے اک منفرد اور خالص تر تعلق کی بنیاد پر وہ اپنے آپ اس کہانی کا حصہ تھی۔

اور یہی وہ آج اس دیوتا کو صحنِ مسجد میں ٹھہر کر اک عزم کی صورت کہہ آئی تھی۔

"میں نہیں جانتی یہ کہانی آگے کس کس نہج پر کون کون سے موڑ مڑنے والی ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ میں مصطفین شجاع کو ڈھونڈنے اور واپس لا کر اس لڑکی ثومیہ شاہجہاں سے ملوانے میں آپ کا ساتھ لازمی دوں گی۔ میں اس کھوج میں اپنی نہیں بلکہ صرف مصطفین کی خاطر شامل ہونا چاہتی ہوں۔" جب سفیر احمد اول و آخر اسے تمام تر کہانی سنا چکا تھا تو بہت مضبوط لہجے میں اس نے اسے اپنی شمولیت کا عندیہ دیا تھا۔

اس کی بات سن کر لبوں کو بھینچتے ہوئے جواباً اس نے فقط اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور پھر اسے وہیں صحنِ مسجد میں داخلی زینوں کے پاس چھوڑتی وہ گھر لوٹ آئی تھی۔

آج اس کہانی کا اک ایک اسرار و بھید اس پر کامل عیاں تھا۔ وہ دیوتا سا شخص یعنی سفیر احمد پہلے سے کسی سے محبت کرتا ہے۔۔ اس بات سے اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بے قرار حالت سے یہ اندازہ اسے پہلے بھی تھا۔ اس کے لیے زیادہ حیران کن بات یہ رہی تھی کہ مصطفین شجاع بھی کسی لڑکی سے بے پناہ لیکن خاموش محبت کرتا رہا ہے۔ گھر آ کر اس کے کمرے میں یونہی بے سبب اس کی باقی ماندہ چیزوں کو چھوتے ہوئے وہ تا دیر غور کرتی رہی تھی کہ کب کبھی اسے ماضی میں ایسا محسوس ہوا ہو کہ وہ بھی کسی سے محبت کرتا ہے؟ اور بار بار سوچنے پر بھی اس کے ذہن میں ایسا کوئی ایک لمحہ بھی نہیں آیا کہ جب مصطفین نے کبھی کسی محبت کا ذکر کیا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بے حد گہرا انسان تھا۔۔ لیکن اس قدر گہرا تھا یہ اسے آج معلوم ہو رہا تھا۔ اب وہ فکرمند تھی کہ سینے میں ہزاروں درد بسائے وہ جانے کہاں بس رہا ہوگا؟ بس بھی رہا ہوگا یا کہ نہیں؟

بے بہا اجڑے ہوئے دل اور گھر۔۔ واپس کہیں کب بسا کرتے ہیں۔

☆......☆......☆

آخرش رفیق نواز، گیتی اور پورے یونٹ کی شب و روز کی محنت رنگ لائی اور "خدا کے بھگت" ایک فائنل پروڈکٹ کی مانند ان کی ہاتھوں میں آ گئی۔ گیتی کے بتائے ہوئے طریقہ سے انٹرنیشنل ادارے "بی ریڈی پکچرز"

کی شمولیت سے فلم کی ہائپ سچ مچ زمیں سے آسمان پر جا پہنچی اور سینما اور ملٹی پلیکس اونرز سے بھی وہ لوگ اپنی شرائط پر ڈیل سائن کرنے میں کامیاب رہے۔ان کے اس گُر اور مہارت پر پوری انڈسٹری انگشت بدنداں تھی کہ یوں گویا انہوں نے اپنی پروڈکٹ کو ریلیز سے قبل اپنی میز پر ہی محفوظ۔۔۔یعنی منافع میں کر لیا تھا۔ہوٹل پرل کانٹینینٹل میں ہی منعقد کی گئی ایک دھانسو قسم کی پریس کانفرنس میں انہوں نے فلم کی نمائشی تاریخ کا اعلان کیا اور دھڑا دھڑ اس کی تشہیری مہمات میں جت گئے۔ہر طرف بس انہی کی فلم کا شور و چرچا تھا۔انڈسٹری کا ہر چھوٹا بڑا ہدایت کار گیتی سے ملاقات کا وقت چاہتا تھا۔سب کی ایک ہی خواہش تھی کہ سونے کی یہ چڑیا گائتری دیوی پاکستان میں اگلی فلم صرف انہی کی سائن کرے۔لیکن وہ تھی کہ رفیق نواز سے یوں جڑی بیٹھی تھی جیسے اس کے سوا کسی کو جانتی ہی نہ ہو۔ناز دیکھ رہی تھی کہ جوں جوں فلم کی ریلیز ڈیٹ قریب آتی جا رہی تھی، گیتی کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ اک فکر بھی طاری رہنے لگی تھی۔اور وہ بخوبی جانتی تھی کہ اسے کس بات کی فکر ہے۔ایسی صورت میں کہ جب بڑے بڑے ہدایت کاروں کی جانب سے گیتی تک پہنچنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اور ان کی طرف سے مبارک باد کی خوشامدی قسم کی فون کالز کا تانتا بندھا ہوا تھا، گیتی کو لحہ بہ لحہ کسی اور کی کال کا انتظار تھا۔ہاں وہ شدت سے منتظر تھی تو بس اسی بات کی کہ کب اسے سفیر احمد کی جانب سے کوئی مثبت پیغام ملتا ہے اور اس سے ملاقات کرتے ہوئے وہ اسے اپنے ساتھ فلم میں کام کرنے پر رضا مند کرتی ہے۔جبکہ ناز کا دل تھا کہ اب صرف وہ دونوں یہاں سے اپنے ملک واپسی کا کوئی حتمی لائحہ عمل ترتیب دیں۔اس کے ساتھ رہ رہ کر یہ سارا تناؤ جھیلتے ہوئے وہ سچ مچ بہت تھک چکی تھی۔

بالآخر ایک رات اس نے اس حوالے سے گیت سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ہوٹل کے مرکزی ہال میں ڈنر کے بعد وہ دونوں کمرے میں آئیں تو گیتی ایل-ای-ڈی آن کرتے ہوئے بے وجہ چینل سرفنگ کرنے لگی۔جبکہ ناز پاس بیٹھی من ہی من اندر اس سے بات کرنے کے لیے لفظ ترتیب دینے لگی۔اور یہی وہ پل تھا جب گیتی کا سیل فون بجنے لگا۔اب پہلے ایک نظر موبائل سکرین اور پھر ایک نظر پاس گم سم بیٹھی ناز کو دیکھتے ہوئے وہ موبائل کان سے لگا کر وہاں سے اٹھتی باہر ٹیرس میں نکل گئی تو پیچھے ناز نے یک بیک چونک کر پہلے اسے یہاں سے اٹھتے ہوئے اور پھر باہر نکلتے دیکھا۔پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر گویا بہت زچ ہوتے ہوئے اس نے

ایل-ای-ڈی سکرین آف کی اور کچھ دیر یہیں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کیا۔ جب وہ واپس نہیں آئی تو ناز بھی اٹھی اور بڑے نپے تلے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پیچھے ٹیرس میں نکل آئی۔ فون ہاتھ میں پکڑے ہوئے گیت حسبِ سابق ریلنگ تھامے نیچے مال روڈ سے اٹھتی روشنیوں کو تاک رہی تھی۔ اس کے بالکل ساتھ رک کر اسی کی طرح ریلنگ پر ہاتھ جماتے ہوئے بنا کسی توقف اس نے بہت ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا تھا۔

"میری بات مانو گیت۔۔۔ کہ بس اب ہم صرف ہندوستان واپسی کی کوشش کرتی ہیں۔ انکل آنٹی دبئی میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ تمہیں جس بات کا انتظار ہے مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوگا۔ اس لڑکے نے ماننا ہوتا تو تمہارا نام اتنا بڑا ہے کہ وہ انکار کرتا ہی نہیں۔ یقیناً اس انکار کی کوئی بہت مضبوط وجہ رہی ہو گی۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ پاکستان جیسی چھوٹی سی فلمی صنعت میں کوئی تمہارے یعنی گائتری دیوی کے ساتھ کام کرنے سے منع کر دے؟"

اس کے لہجے میں اپنے دیس کے لیے اداسی کے ساتھ ساتھ کئی خدشات بھی دھڑک رہے تھے۔ جواباً لبوں کو بھینچ کر مبہم مسکراتے ہوئے گیتی نے بڑے پیار سے اسے دیکھا۔

"تم ہندوستان کے لیے بہت اُداس ہوگئی ہوناں۔۔۔؟ میں جانتی ہوں ناز۔"

اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس نے الٹا سوال جڑ دیا تو ناز نے بڑے ہولے سے پلکیں جھپکیں۔

"کیا تم نہیں ہو اُداس۔۔۔؟ میں دیکھ رہی ہوں گیت۔ تم بھی اُداس ہو۔"

فقط یہی کہہ کر وہ بھی نیچے مال روڈ کے اونچے لمبے درختوں سے چھن چھن کر اوپر آتی روشنیاں دیکھنے لگی تو بغور اسے دیکھتے ہوئے گیتی کچھ دیر یونہی چپ رہی۔

"یہ علی مصطفیٰ کی کال تھی ناز۔۔۔ سفیر احمد مجھ سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اس نے کل شاہی قلعہ کے پائیں باغ میں ملاقات کے لیے بلایا ہے۔"

چند لمحات کے بعد اس نے کچھ سرسراتے ہوئے سے لہجے میں کہا تو ناز نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"واستو میں۔۔۔؟ وہ یوں اچانک کیسے مان گیا؟" ابھی ابھی کی گئی اپنی ہی باتوں کے زیرِ اثر آئی ملی جلی ہندی میں وہ فقط یہی کہہ سکی تو گیت بڑی خوشگواریت سے مسکرا دی۔

"ارے ہاں بھئی۔۔۔ واستو میں وہ راضی ہے۔"

جھک کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے جوش سے دبایا تھا۔

"لیکن گیت اس نے ملنے کی جگہ کیا رکھی ہے؟ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں لگ رہی؟"

اپنے سارے خیالات پسِ پشت ڈالتی اب وہ پوری طرح متوجہ ہوئی تھی۔

"ہاں ناں۔۔۔ بہت عجیب ہے لیکن ہماری کہانی میں اب تک اتنے عجائبات گذرے ہیں کہ اب کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی مجھ کو" مسکراتے ہوئے لبوں سے جواباً کہتی گیت کی بات میں بہت سے اذکار پنہاں تھے۔

"ہمم۔۔۔ صحیح کہہ رہی ہو۔ چلو خیر۔۔۔ مل کر دیکھتے ہیں کہ محترم کس مزاج کے بندے ہیں؟"

یہ کہتے ہوئے ناز نے کسی قدر منہ بسورا تو فضا میں گیتی کی مدھر ہنسی کا ارتعاش بکھر گیا۔

وہ بخوبی واقف تھی کہ نازنین کو سفیر احمد کے بڑے نخروں سے ملنے پر بہت سا غصہ ہے۔

☆......☆......☆

اگلی ملاقات کے لیے سفیر احمد نے کل ایک مخصوص وقت پر اسے شاہی قلعہ کے پائیں باغ میں آنے کا کہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد اسے مصطفین کے آبائی گاؤں کا نام و پتا فراہم کر دے تاکہ اسے تلاش کرنے اور منا کر واپس لانے کے لیے وہ ادھر بھی جا سکے۔ گھر آ کر ایمان نے گھریلو ڈائری سے مصطفین کا مستقل پتا اپنے پاس ایک کاغذ پر نقل کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ وہ اس اپالو سے یہ پہلی "باقاعدہ" ملاقات کرنے کے لیے بے حد مسرور تھی۔

"یہ دیر شام صحن کی بتی جلائے تم کیا کر رہی ہو ایمان؟ چلو شاباش سب کچھ سمیٹو اور آ کر کھانا کھاؤ۔"

وہ صحن میں گھٹنوں پر اک کیسر رنگی دوپٹہ پھیلائے اس پر کچھ موتی ٹانک رہی تھی جب لاؤنج کا دروازہ کھول کر رضیہ بیگم باہر نکلیں اور اسے بڑے انہماک سے سوئی چلاتے دیکھ کر حکمیہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"آ رہی ہوں خالہ۔۔۔ بس یہ تھوڑا سا کنارہ رہ گیا ہے۔ آپ جاؤ ناں تب تک ابو کو کھانا دے دو۔"

بڑے مگن انداز میں کہتے ہوئے اس نے فقط ایک لحظہ کو سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"اوہو دے دیا ہے کھانا ان کو۔ اٹھو تم بھی آ جاؤ۔ اسی مینا کاری میں سارا دوپٹہ بھر تو دیا ہے۔ اب اور کتنے موتی ٹانکو گی بھئی؟ چلو اٹھو شاباش۔" جواباً کسی قدر خفگی سے کہتے ہوئے پاس آ کر، گھٹنوں پر سے اس کا دوپٹہ

ہٹاتے ہوئے وہ آس پاس تخت پر بکھرے موتی بھی سمیٹنے لگیں تو ہاتھ والے موتی کو آخری گرہ لگا کر، دھاگا منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے دانتوں تلے پیس کر توڑ دیا۔

"اف۔۔۔ایک تو قسم سے آپ بڑا تنگ کرتی ہیں خالہ۔مجال ہے کوئی کام مجھے دل لگا کر کرنے دیں۔اور میرا بس چلے ناں تو۔۔۔ان مصنوعی موتیوں کی بجائے آج اپنی چنر میں جگنو تارے بھر لاؤں۔ بلکہ اتنا سا ٹکڑا چاند توڑ کر لا سجانے میں بھی حرج نہیں ہے۔"

تخت سے اتر کر پاؤں میں چپل اڑستی ہوئی وہ دور آسمان پر چمکتے ستاروں اور پھر چاند کو بھی دیکھ کر بولی تو اس کے اٹھنے پر جھک کر اس کا سامان اٹھاتی خالہ کے ہاتھ وہیں ساکت ہو گئے۔

"آنچل میں جگنو تارے سمیٹ لانے کی خواہشوں میں بڑا احتاط ہونا پڑتا ہے ایمان۔۔۔اتنا احتاط تو لازمی کہ ایسی کاوشوں میں ہاتھ انگاروں پر جا پڑنے کا اندیشہ نہ رہے۔اور "اتنا سا ٹکڑا" چاند چھونے کے تو خیال سے بھی پناہ مانگو۔تیز روشنی ٹھنڈی ہی سہی پر آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔۔۔دکھائی پھر کچھ نہیں پڑتا اور کہیں نہ کہیں حدت بھی۔۔۔یہ ضرور دیتی ہے۔"سیدھے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے انہوں نے بڑی فکر سے کہا تو ایک پل کو وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

"میں جانتی ہوں ایمانے۔۔۔میرے یوں بار بار سمجھانے سے تمہیں برا لگتا ہے۔پر میں جگ بیتی باتیں کرتی ہوں میری دھی۔۔۔میں نے یہ سب آنکھوں سے ہوتے دیکھا ہے۔"اسے خاموش پا کر انہوں نے مزید تاکید کی تو بے ساختہ بڑھ کر ان کے کندھوں پر جھولتی وہ ان کا منہ بھی چومنے لگی۔

"مجھے آپ کے سمجھانے سے کبھی برا نہیں لگتا خالہ۔۔۔بلکہ مجھے تو اچھا محسوس ہوتا ہے۔مجھے بالکل یہی لگتا ہے کہ امی اُس جہاں سے پھر سے لوٹ آئی ہیں۔"

بڑے دلار سے مُسلسل دائیں بائیں جھولتے ہوئے وہ ان سے اظہارِ لگاوٹ کرنے لگی تو جواباً انہوں نے بھی کُچھ کہنے کو لب کھولے۔لیکن اسی پل "شش" کرتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر انگلی رکھتی وہ خوابناک لہجے میں مزید گویا ہوئی۔

"میری اچھی خالہ۔۔۔میں جانتی ہوں آپ ہمیشہ ٹھیک کہتی ہیں اور میرے بھلے کا کہتی ہیں۔لیکن یہ جو میرا

نامراد دل ہے ناں۔۔۔یہ اب روز بروز مجھے نت نئے خواب دکھاتا ہے۔"

اور یہیں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ انہیں چھوڑ کر اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"ایک تو تُو اور اس پر تیرا یہ نامراد دل ایمانے۔۔۔بالکل نہیں سدھر سکتے۔اب پیچھے سے یہ سب بکھیڑا کیا میں ہی سمیٹوں گی؟ سدھر جا ایمان۔ ہر بار اسی لاڈ پیار سے بہلا لیتی ہے مجھے۔" بے ساختہ مڑ کر اسے گھورتے ہوئے وہ تب تک بولی تھیں جب تک کہ مڑ کر دیکھے بنا وہ لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر غائب نہیں ہو گئی۔

" جھلی نہ ہو تو۔۔۔دنیا کدھر کی کدھر پہنچ گئی ہے۔یہ بس جگنو تاروں اور آسمان پر خوش رہتی ہے۔حق ہاہ۔۔ ۔بن ماں کی بچی۔اس کے نصیب سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

اس کے منظر سے ہٹنے پر تخت سے اس کی چیزیں سمیٹتی ہوئی وہ خود کلام رہی تھیں۔

یہ اگلی صبح کی بات ہے کہ جب اسے شاہی قلعہ کے پائیں باغ میں سفیر سے ملنے جانا تھا، ایک طشتری (گولائی دار تھال) کہ جو لال کناری گوٹہ لگے زرد رومال سے ڈھکی تھی، ہاتھوں میں اٹھائے وہ اپنے کمرے سے نکلی اور طشتری کو استری سٹینڈ پر رکھتے ہوئے یہیں رک کر، لاؤنج میں جھانک کر صوفے پر براجمان خالہ رضیہ کی طرف دیکھا۔

" خالہ ابو دکان پر چلے گئے ہیں؟ کچھ پیسوں کا کہا تھا ان سے۔دے گئے ہیں کیا؟" انہیں اسی جانب تکتے ہوئے پا کر وہ گویا خود پر جبر کرتی ہوئی بولی تھی۔اس کے انداز سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے خالہ کو اس ڈھکی ہوئی طشتری کی بھنک لگے بنا گھر سے نکلنا چاہتی ہو۔

" تمہارے پیسے تو بھائی جان دے گئے ہیں۔۔۔پر یہ تم چوروں کی طرح کیوں جھانک رہی ہو؟ تو نے ادھر کچھ چھپایا بھی ہے ناں؟"

وہ بھی اسی کی خالہ تھیں۔۔۔فوراً بھانپ گئیں کہ کسی بات کی پردہ داری ہو رہی ہے۔جواباً بے طرح ہنستے ہوئے اس نے پلٹ کر طشتری اٹھائی اور ان کے پاس جاتے ہوئے بولی۔

" توبہ ہے خالہ۔۔۔جیمز بانڈ سے کم نہیں ہیں آپ بھی۔مجال ہے آپ سے نظر بچا کر میں کبھی کوئی کام کر سکوں۔اور منت کی یہ نیاز آپ سے کیا چھپانی تھی بھلا؟ یونہی سوچا کہ پہلے پیسے پوچھ لوں جاتے ہوئے اٹھا لوں

گی۔" بات مکمل کرتے ہوئے اس نے نیاز والی طشتری درمیانی میز پر رکھ کر پیسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ خالہ نے فقط ایک پل کے لیے ٹھہر کر پہلے بغور اسے اور پھر نیاز کی طرف دیکھا۔

" آج کدھر کا ارادہ ہے ایمانے؟ روز روز کی منتیں بھر کر تو تھکی نہیں ہے ابھی؟ جھلیے محبت یوں نہیں ملتی۔تو کوشش کر کے اسے کسی بھی طرح بھول جا بس۔خود ہی کہتی ہو وہ تمہارے دل سے بے خبر ہے۔پھر یوں بے وجہ اپنی جان جلانے سے کیا حاصل میری دھی؟ سچ کہوں تو تیری حالت دیکھ کر اب کبھی کبھی مجھے یہ ڈر لگتا ہے تو کہیں تعویز طلسم والے بابوں کے پیچھے نہ بھاگنے لگے۔" اسے پیسے پکڑا کر انہوں نے پہلے بھی بارہا ظاہر کیے ہوئے خدشے پھر سے دہرا دیئے تو اپنا دوپٹہ سر پر جمانے کی کوشش میں لاپرواہی سے انہیں سنتے ہوئے وہ بے طرح مسکراتی رہی اور پھر مڑ کر نیاز اٹھاتے ہوئے ان کی آخری بات پر بڑے زور سے ہنس پڑی۔

کچھ توقف سے ہنسی روک کر دوبارہ ان کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے عمیق تر لہجے میں کہا۔

" محبت۔۔۔منتوں کا فیض ہے۔یہ جادو یا طلمسات سے ہرگز نہیں ملتی خالہ۔وہ لوگ جو روح کے اس پار کہیں ہماری عندیت میں جل اٹھے ہوں ناں۔۔۔وہ سایوں کی مانند حصارِ جاں تک میں دھواں دیتے ہیں۔ فشار و راحتِ جاں کا اول و آخر سبب ہیں وہ۔ہاں وہ دھونکنی کی مانند ہماری سانس تک میں چلتے ہیں۔" ثقیل لفاظی میں جانے کیا کیا کہتی وہ اس قدر خود میں گم سم تھی کہ رضیہ بیگم بس ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔

" کسی کو دل میں بسا کر سرے سے بھول ہی جانا۔۔۔آسان نہیں ہوتا خالہ۔میں منتیں بھر کر آتی ہوں اور انشاءاللہ یہ سب لازمی بار آور ہوں گی۔مجھے پورا یقین ہے۔"

انہیں خاموش پا کر مزید حیران کرتی وہ پلٹ بھی گئی تو وہ پیچھے بس اس کی پشت پر جھولتا وہی رات والا دوپٹہ دیکھتی رہیں جس پر موتیوں کے ساتھ وہ کچھ جگنو تارے بھی ٹانک دینا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

یہ انہی دنوں کا ذکر تھا جب یونیورسٹی کے فوراً بعد، اپنی دوستی ختم ہو جانے کے باعث وہ بے حد ٹوٹا ہوا سا تھا کہ علی مصطفیٰ نے اس سے رابطہ کر کے بتایا کہ بالی وڈ سپر اسٹار گائتری دیوی جو پاکستان میں اپنی پہلی فلم کی عکس بندی کروا رہی ہے، وہ اپنی اگلی ایک فلم کے لیے اسے اپنے مقابل ہیرو کاسٹ کرنا چاہتی ہے۔اس غیر معمولی

پیشکش کو پا کر وہ ازحد حیران ہوا لیکن اپنی قلبی شکستہ ترکیفیات کے بدولت وہ اسے قبول نہیں کر سکا۔ ان دِنوں وہ دُنیا سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ کوئی بھی امر اسے خوشی فراہم نہیں کرتا تھا۔ سو اس نے اس پیشکش کے حوالے سے علی مصطفیٰ کو ایک ٹکا سا جواب دے دیا۔ مزید حیرت اسے تب ہوئی جب علی مصطفیٰ نے اسے قائل کرنے کی ضد ہی پکڑ لی اور بتایا کہ گیتی جی صرف ایک بار خود سے اسے ملنا چاہتی ہیں۔ ابتدا میں اس نے گیتی سے ملنے سے بھی مُسلسل انکار کیا لیکن پھر جب اس پر اپنی کہانی کی حقیقت کھلی اور اسے پتا چلا کہ اس نے بے وجہ ثومیہ شاہجہاں اور مصطفین کا دل دکھایا ہے، تو اس بدولت وہ قدرے نرم پڑ گیا۔ خصوصاً ثومیہ سے ملنے اور اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھنے کے بعد اس کا سختیوں میں ڈھل چکا دل بے حد پسیجا اور اپنے انکار میں گنجائش پیدا کرتے ہوئے اس نے علی مصطفیٰ کو بتایا کہ وہ گیتی سے ملنے کے لیے راضی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ فلم میں کام تو نہ اسے کرنا تھا اور نہ کرے گا۔۔۔ لیکن یوں صرف ایک بار ملنے سے مُسلسل انکاری ہو کر وہ ایک غیر ملک کی باسی گائٹری دیوی کی دل آزاری کا سبب کیوں بنے؟ اس نے ایمان راجپوت اور گیتی کو ایک گھنٹے کے فرق سے شاہی قلعہ کے پائیں باغ میں ملنے کے لیے بلایا تھا۔ گیتی کو "ہاں" کہلوا بھیجنے کے بعد اس نے مختلف سوشل میڈیا فورمز اور اخبارات کے ذریعے اس کی پہلی پاکستانی فلم کی سائننگ، یہاں آمد اور اس جرم و پاداش میں بھارت میں اس کے خلاف ہوتے مظاہروں سے لے کر اب تک اسے درپیش تمام تر حالات کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کی تھیں۔ اس کے بیانات اور تنازعات کے ہر امر و پہلو کا بغور جائزہ لینے اور انہیں اچھی طرح کھنگالنے کے بعد وہ اسے ایک متنازعہ لیکن انتہائی دلچسپ شخصیت لگی تھی۔

اگلے روز دفتر سے چھٹی کر کے وہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ قبل ہی شاہی قلعہ پہنچ گیا اور زندان کے بالکل ساتھ واقع پائیں باغ میں یہاں وہاں گھومتے ہوئے وقت گذاری کرنے لگا۔ ملاقات کے لیے متعین کردہ اوقات کے مطابق گیتی کی آمد پہلے متوقع تھی اور ایمان راجپوت کو اس سے ایک گھنٹے بعد آنا تھا۔ لیکن باغ میں ایک کیاری کے پاس کھڑے ہو کر بڑے انہماک سے وہاں اُگے سرخ گلابوں کو دیکھتا وہ اس وقت بے تحاشا چونک گیا جب اسے گیتی کی آمد سے بھی لگ بھگ دس منٹ پہلے، اپنی پشت پر سے ایمان راجپوت کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے۔۔۔آپ اور اتنی جلدی؟ اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ وقت سے کافی پہلے پہنچ گئے ہیں؟"

بنا کسی سلام دعا کے وہ بڑے جوش سے چلائی تھی۔اس کے انداز سے یوں ظاہر تھا جیسے اس نے اسے اچانک دیکھا تھا اور وہ وقت سے اتنا پہلے اس کی یہاں موجودگی کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"جی بالکل یہ میں ہی ہوں۔۔۔اور اگر میں بھی غلط نہیں ہوں تو آپ بھی اپنے وقت سے بہت پہلے آئی ہیں۔" آہستگی سے مڑتے ہوئے اس نے خوشدلی سے کہا تھا۔

کچھ فاصلے پر پوری سج دھج سے کھڑی وہ دلکشی سے مسکرا رہی تھی۔اس کا بھاری کامدار کثیر رنگی دوپٹہ، آنکھوں میں لگا گہرا کاجل اور ایک ترتیب سے شانوں اور گردن پر جھولتے لمبے سیاہ رنگ بال۔۔۔پہلی تاک سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ آج خصوصی بن سنور کر آئی ہے۔

"ایسے ہی بس۔۔۔میری عادت ہے مجھے کسی سے بھی ملنا ہو تو یونہی مقررہ وقت سے پہلے پہنچ جایا کرتی ہوں۔کسی کو انتظار کروانا مجھے بڑا نامناسب سا فعل لگتا ہے۔" متوازن و عام سے لہجے میں اپنے جلدی آنے کی وضاحت پیش کرتی ہوئی قدم قدم چلتی وہ اس کے بالکل قریب آ گئی تھی۔

"ہمم۔۔۔چلیں ٹھیک ہے۔اس کا پتا مل گیا تھا؟"

اس کی آنکھوں میں تاکتے ہوئے وہاں رقصاں کیفیات پڑھتا وہ مصطفین کے رہائشی پتا کی بابت پوچھنے لگا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، دایاں بازو اونچا کر کے اس نے اس کی آنکھوں کے عین سامنے مٹھی کھول دی جہاں اس کی گلابی ہتھیلی پر ایک پرچی دھری تھی۔

"یہ رہا اُس کے آبائی گھر کا پتا۔۔۔لیکن ایک بات آپ بڑے سلیقے سے گول کر گئے ہیں کہ آپ جلدی کیوں آئے ہیں؟" پر امید لہجے میں کہتے ہوئے وہ جانے اس سے کون سے من پسند اذکار سننا چاہتی تھی۔اس کی خواہشوں کو سمجھتا وہ بس ہولے سے مسکرایا اور اس کی ہتھیلی پر سے وہ پرچی اٹھا کر پڑھنے لگا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو پتا چل جائے گا کہ میں جلدی کیوں آیا ہوں۔سمجھیں آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔"

من ہی من اندر یہ سوچتے ہوئے کہ ایک بھارتی سپر اسٹار کو یہاں دیکھ کر وہ بے تحاشا حیران ہو جائے گی اس

نے بڑے پُر اسرار لہجے میں گویا کسی تجسس کو ہوا دی تھی۔ جواباً فقط ایک پل کے لیے ایمان کی دلنشیں آنکھوں میں اک شوق کی سی آتش چمکی اور پھر "چلو جی دیکھ لیتے ہیں۔۔۔" کہہ کر بڑی بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے وہ انہی گلاب کیاریوں میں ایک ترتیب سے اگے سرخ گلابوں کی طرف متوجہ ہوگئی جن میں کچھ دیر قبل وہ بھی محو و گم کھڑا تھا۔

"ویسے پہلی بار ہے کہ آپ یوں محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ ورنہ عمومی طور پر بے وجہ ہی اکتائے ہوئے سے ملتے ہیں۔ آج کی اس کایا پلٹ کی وجہ جان سکتی ہوں؟"

ایک گھٹنا موڑ کر زمین پر بیٹھتے ہوئے اس نے بلا جھجک اگلا سوال کیا اور گلِ گلاب کی خوشبو سونگھنے لگی۔ پچھلی ہوئی تمام ملاقاتوں میں وہ بخوبی جان چکا تھا کہ وہ ایسی ہی بے باک طبیعت کی مالکہ ہے کہ کچھ بھی پوچھنے یا کہنے سے قبل کسی بات کی اجازت طلب نہیں کرتی۔ اب صورتحال یوں تھی پھول سونگھتے ہوئے وہ جواب کی منتظر تھی اور چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں میں کچھ حروف ترتیب دیتا وہ لفظوں کو جوڑنے کی تگ ودو میں تھا۔

"بس بے رخی اور نفرتیں سہہ سہہ کر بخوبی جان گیا ہوں کہ جہاں بھر کا حقیقی واصل رخ تو صرف محبت ہوتا ہے۔" وہ بولا تو اس کا عمیق تر لہجہ کئی کہانیوں کا غماز تھا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے مڑ کر ایک نظر اسے دیکھتی وہ بڑے سلیقہ و دلکشی سے اٹھی تھی۔

"ہمم۔۔۔ یہ تو عینِ حقیقت ہے کہ محبت فاتح عالم ہے۔ اپنی زیست سے میں نے بھی یہی سیکھا ہے کہ لگن و طلب سچی ہو تو لازم ہے کہ مطلوب ملا کرتے ہیں۔ آپ کسی یقین سے بندھ کر تو دیکھیں۔ عشق۔۔۔ دل تو کیا روحیں بھی کھینچ لائے گا سرکار۔"

اس کے مقابل رک کر بڑی والہانہ نگاہوں سے اس کا اک ایک نقش تاکتی وہ جانے کون کون سے درس دینے لگی تھی کہ وہ بے ساختہ رخ ہی بدل گیا۔ اس سے دو قدم ہٹ کر زندان کی جانب نگاہ کرتے ہوئے وہ جواب در جواب کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی پل اس نے علی مصطفیٰ کو دو نقاب پوش خواتین کے ہمراہ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ بہت کچھ کہنے کی جستجو لیے وہ یونہی لب بستہ کھڑا رہا تو اپنی بات کی مد میں اس کے کچھ ڈھارسی حروف کی طالب ایمان راجپوت بھی اس کے بدلتے تاثرات دیکھ کر اس کی نظروں کے تعاقب میں نکل گئی۔

جونہی وہ تینوں ان کے قریب پہنچے تو سفیر نے آگے بڑھ کر پہلے علی مصطفٰی سے ہاتھ ملایا اور پھر اسے گلے لگاتے ہوئے یہ دیکھتا وہ بے طرح چونک گیا کہ چہرے سے نقاب ہٹا کر گائتری دیوی اس سے کوئی تعارف چاہنے کی بجائے چند قدم ہٹ کر کھڑی ایمان راجپوت کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"میرے خدایا۔۔۔گیتی آپ اور یہاں؟ مجھے یقین نہیں ہو رہا۔۔۔اف میرے اللہ۔۔۔"

جونہی اس نے نقاب الٹا تو سفیر نے حیرت میں ڈوبی ایمان کی چیخ نما آواز سنی تھی۔ من ہی اندر وہ بے طرح سرشار ہوا کہ یوں ایک طرح سے اس نے ایمان کو کسی خوشگوار حیرت سے دوچار کیا ہے۔۔۔لیکن اگلے ہی پل اسی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہونے کی باری اس کی اپنی تھی۔ کیونکہ گیتی کو زور زور سے گلے مل کر ایک طرف ہٹاتی وہ یہ کہتے ہوئے دوسری نقاب پوش خاتون کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"آپ یقیناً نازنین ہوں گی۔۔۔ ہے ناں؟ بھئی نقاب الٹ دیں اب۔ یہاں ہم سب کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔"

اس سے گلے ملتے ہوئے اس نے خود ہی اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تو جواباً ناز نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اب گیتی تک تو ٹھیک تھا کہ وہ ایک سپر اسٹار تھی۔۔۔لیکن اس کے یوں گرم جوشی سے ناز سے بھی جا ملنے پر سفیر اور علی مصطفٰی پر بیک وقت آشکار ہوا کہ وہ تینوں باہم واقف کار ہیں۔

"آپ لوگ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتی ہیں کیا؟"

سفیر کی آنکھوں میں ابھی حیرت باقی تھی کہ علی مصطفٰی نے گیتی سے سوال کیا۔

"ارے بالکل ہم جانتی ہیں۔ یہ بہت اچھی دوست ہے میری۔ ہماری پہلی ملاقات جی۔پی۔او مری میں ہوئی تھی اور اس کے بعد ایک بار دورانِ شوٹنگ ہم لاہور ریلوے سٹیشن پر بھی ملے تھے۔ کیوں ایمان۔۔۔؟ کہاں گم تھیں بھئی؟ بعد اس کے کوئی رابطہ ہی نہیں۔۔۔؟ ہاں؟"

بڑے جوش و جذبہ سے کہتے ہوئے گیتی پھر سے ایمان کے گلے جا لگی تو اس کی آنکھوں میں گیتی سے ہوئی پہلی ملاقات کا منظر گھوم گیا۔ "ٹورازم" کا کورس کرتے ہوئے آخری ہفتہ میں وہ اپنے ادارے کی طرف سے پوری کلاس کے ساتھ مری ٹور کے لیے گئی تھی اور وہیں جی۔پی۔او بلڈنگ میں اونچے چبوترے پر اس کی گیتی سے

ملاقات ہوئی تھی۔

"میں نے کئی بار فون کیا لیکن رابطہ ممکن نہیں ہوتا تھا۔ پھر سنا آپ کپادوکیہ جا چکی ہیں۔ اور پھر پاکستان واپسی کا بھی سنا تھا۔ لیکن میں نے سوچا آپ مصروف ہوں گی تو دوبارہ کال نہیں کی۔"

کچھ توقف سے بڑے سادہ و عام لہجے میں عذر پیش کرتے ہوئے وہ ابھی خاموش ہوئی تھی کہ اس کا گال چوم کر گیتی نے "او۔۔۔ پریٹی گرل۔" کہا اور باقی باتیں بعد پر ڈالتی ہوئی سفیر کی طرف دیکھنے لگی۔

"السلام علیکم گیتی جی۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟ اور مس نازنین آپ کا کیا حال ہے۔۔۔؟" انہیں متوجہ پا کر سفیر نے بڑے اعتماد سے باری باری ان دونوں کا حال پوچھا اور علی مصطفیٰ کا ہاتھ تھامے ہوئے قریب چلا آیا۔

"وعلیکم السلام سفیر صاحب۔۔۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کیسے ہیں؟"

حسبِ سابق دونوں کی طرف سے مشترکہ جواب دیتے ہوئے گیت بڑھی اور اس سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جواباً فقط ایک پل کی جھجک کے بعد اس نے اپنے ازلی اعتماد سے اس کا رعنائی ہاتھ تھام لیا تھا۔

"جی الحمدللہ میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت شکریہ۔"

یہ کہتے ہوئے سفیر نے بغور دیکھا کہ گیت کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی کا تاثر تھا اور وہ اس کے حسن و وجاہت سے بہت متاثر بھی دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ لیکن اسے اس کی آنکھوں میں یہ کہیں نہیں دکھا کہ اس کے حسن سے مرعوب ہو کر وہ اپنی ذات پر کسی قسم کی بداعتمادی کا شکار ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اسے یوں نظر بھر کر تاک رہی تھی گویا اپنی دریافت پر فخر کر رہی ہو۔

اب اس سے قبل کہ ان دونوں میں سے کوئی کچھ بھی بولتا انہیں یوں روبرو دیکھتی ایمان راجپوت بڑے اشتیاق سے اپنی جگہ سے چھوٹتی ان دونوں تک چلی آئی تھی۔

"تو آپ اس سرپرائز کی بات کر رہے تھے سفیر؟ یعنی کہ گیتی آنے والی تھیں۔ لیکن آپ دونوں ایک دوسرے سے کیسے واقف ہیں؟ اور پھر یہ ملاقات اور وہ بھی اس جگہ؟ یہاں چل کیا رہا ہے گائیز؟ کوئی مجھے بھی بتائے گا کیا؟"

سوالیہ نظروں سے باری باری انہیں دیکھتی وہ کافی حیران لگ رہی تھی۔ اس کی بات پر بڑی آہستگی سے سفیر

احمد کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے گیتی نے فقط ایک تشکراتی نگاہ اب تک خاموش کھڑے علی مصطفٰی پر ڈالی اور ہولے سے اس کی طرف رُخ کیا۔

" تمہیں میں بتاؤں گی سہیلی کہ میں ان سے ملنے کیوں آئی ہوں؟ لیکن اس سے پہلے تم بتاؤ کہ تم ان کو کیسے جانتی ہو؟" نرمی سے اس کے دائیں شانے پر ہاتھ جماتے ہوئے گیت نے کسی قدر متجسس لہجے میں پوچھا تو وہ خالی خالی سی نظروں سے سفیر کو یوں تاکنے لگی جیسے اپنے اور اس کے تعلق کا کوئی " نام " چاہتی ہو۔

" ہم صرف اچھے دوست ہیں۔۔۔"

کچھ دیر ٹھہر کر انتہائی مختصراً کہتے ہوئے اس نے واپس گیتی پر نگاہیں جمالیں۔ اس کے انداز سے یوں ظاہر ہوا جیسے اسے اپنے اس تعلق کی وضاحت کے لیے دوستی سے بہتر کوئی اور لفظ نہ ملا ہو۔ جبکہ اس کی بات سن کر بنا کسی توقف گیت نے بہت متوازن لہجے میں کہنا شروع کیا تھا۔

" تو سنو سہیلی کہ میں سفیر احمد کو اگلی پاکستانی فلم میں اپنے مقابل ہیرو کاسٹ کرنا چاہتی ہوں اور یہ محترم ہیں کہ کسی طور نہیں مان رہے۔ آج کی یہ ملاقات بھی۔۔۔ کہ جس کے لیے یہ بہت مشکلوں سے راضی ہوئے ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اب چونکہ اتفاقاً تم بھی یہیں مل گئی ہو۔۔۔ تو بس یہی سمجھو کہ میں تم سے تمہارا یہ اچھا دوست مانگنے آئی ہوں۔ میرے ساتھ کام کرنے کے لیے مجھے انہیں منا کر دو۔"

بڑے سلیقے سے اس کے سامنے اپنا مدعا و مقصود رکھتے ہوئے اس نے نہایت پرسکون نظروں سے تب سے چپ چاپ کھڑی ناز کی طرف یوں دیکھا جیسے کہنا چاہ رہی ہو کہ اب سفیر کے پاس انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ جبکہ ٹکر ٹکر کبھی گیتی تو کبھی سفیر کی شکل تاکتی ایمان راجپوت سوچ رہی تھی کہ اس دیوتا سے اپنی دوستی کی ان دعویداریوں کو اب کس طور نبھائے کہ منہ سے نکلے ہوئے لفظوں کا مان باقی رہ جائے۔

یہ بہت ہی عجیب اور غیر متوقع سی صورتحال بن گئی تھی۔ گیت نے اسی " تعلق " کا حوالہ دے کر سفارش چاہی تھی جو کہ ان دونوں کے مابین ابھی شاید پوری طرح سے پنپ ہی نہیں سکا تھا۔ سفیر نے بغور آنکھوں میں اک جہانِ آس لیے خود کو بار بار تاکتی ایمان کی طرف دیکھا اور اس کی پلکوں پر لرزاں، اک آدھا ادھورا سا خواب ٹوٹ جانے کا خدشہ و اندیشہ پڑھ کر عجب عجب سا بے قرار ہوتا گیا۔

" خواب آنکھوں سے جو گرتے ہیں تو کہاں جاتے ہیں بھلا؟ دستورِ جہاں بھر میں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کہیں دائروں سے چھوٹ کر۔۔۔ پھر روشنی پلٹ آئے۔" فقط ایک پل کے لیے یہ لفظ و حرف سوچتے ہوئے اُس نے ایمان راجپوت کا " دعوٰی دوستی " رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

" دیکھیں گیتی جی۔۔۔ بلاشبہ میں ان کی بات رد نہیں کر سکتا، اور پھر ان کی سفارشات سے قطع نظر آپ کا یہاں تک فقط میری خاطر چل کر آنا بھی میرے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔۔۔ لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری اپنی بھی اک کہانی ہے اور میں کبھی اپنی کہانی کے اس محور و مرکز سے ہٹ سکتا ہی نہیں کہ جس کے گرد میں مُسلسل گھوم رہا ہوں۔"

رہ رہ کر اس کی گرتی اٹھتی پلکوں پر کپکپاتے " اک خواب " کو ڈھارس دیتا وہ گیتی کی طلب سے مفر بھی کر گیا تو اپنا " بھرم " رکھے جانے پر ایمان نے بہت شکر گذار سی نظروں سے یک ٹک " اپنے دیوتا " کی طرف دیکھا۔

بھلے ان دونوں کا " باہمی تعلق " ابھی ہمہ قسمی اظہار و اقرار سے یکسر مبرا و ماورا سا تھا؛ لیکن یہ تو طے تھا کہ کسی مخصوص نام کے بنا بھی ان کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔

" ایمان کی رد بھی ممکن نہیں اور میرا چلے آنا بھی بڑی اہمیتوں کا حامل ہے۔۔۔ تو ان اہمیتوں کا مول کہاں ہے سفیر صاحب؟ اب کیا ہمیں فقط دلپذیر سے کُچھ لفظوں میں ٹالیں گے؟"

باری باری اک دوسرے پر ٹکے ان دونوں کے نین پڑھتی گیت نے جرح کے سے انداز میں سفیر سے پوچھا تو اس کے ساتھ ساتھ ایمان بھی گویا کسی خیال سے چونکی تھی۔ اس دیوتا کے خود سے کوئی تعلق باندھ لینے پر اپنی ساری خوش کن کیفیات اور سرشاری بھول کر وہ یکا یک منظر و ماحول میں حاضر ہوئی تھی۔

" پلیز انہیں انکار نہیں کریں سفیر۔۔۔"

اُس کے کسی بھی جواب سے پیشتر اِس نے عجب منتوں بھرے لہجے میں بولنا شروع کیا تھا۔

" آپ کو آپ کی کہانی سے جوڑے رکھنے کی ذمہ داری میں لیتی ہوں۔ جہاں بھر کو بھی کھنگال کر لاؤں تو میں مصطفین شجاع کو ڈھونڈ کر آپ کے پاس ضرور لاؤں گی۔ ان شاء اللہ۔ یہ ساری فکریں اب میرے حوالہ وسپرد کرتے ہوئے آپ براہ کرم ان کی بات مان لیں۔ دو دشمن ممالک کی عوام کے مابین فقط محبت پروان چڑھانے کے لیے یہ پہلے سے بہت کچھ سہہ رہی ہیں۔۔۔ اور اب اپنی تلاش وجستجو سے بندھ کر خدارا آپ بھی انہیں مایوس نہ کریں۔" نرم تر لہجے میں بات مکمل کرتی وہ ہولے ہولے چل کر اس کے عین مقابل آن رکی تو اس کی آنکھوں میں تیرتی لگن و جوت سے نگاہیں چراتا سفیر بے ساختہ ہٹ کر آس پاس، دائیں بائیں اور یہاں وہاں جھانکنے لگا۔ اس پل اس کی سوالیہ نظروں نے گویا اسے کسی بہت بڑی مشکل میں ڈال رکھا تھا۔ اس کی فدائی نظریں پڑھتے ہوئے، ہمیشہ کی اسے یہی لگا کہ وہ اپنی کہانی سے ہٹنے لگا ہے۔ جانے کیوں۔۔۔؟ لیکن اس کی سحر گر آنکھیں ہر بار اس کے مضبوط تر ارادوں کو بھی مسمار کرنے لگتی تھیں۔

ان دونوں کے علاوہ اس منظر میں موجود باقی سب کردار نازنین، گیت اور علی مصطفٰی۔۔۔ جیسے بالکل ساکن ہو گئے تھے۔ ہر کوئی سفیر کی بے حد گھمبیر اور پہیلی نما خاموشی کے ٹوٹنے کا منتظر تھا۔ گو کہ ان تینوں کو بھی سفیر احمد کی اس " کہانی " میں بھرپور دلچسپی پیدا ہوئی تھی جس کا اس نے ابھی ابھی اپنی گفتگو میں ذکر کیا تھا، لیکن فی الوقت اس سے متعلقہ ہر کھوج کو پس پشت رکھتے ہوئے وہ فقط اس کے کسی بھی جواب کے منتظر تھے۔

" ٹھیک ہے گیتی جی۔۔۔ میں آپ کے ساتھ کام کرنے پر رضا مند ہوں۔۔۔ لیکن یاد رہے کہ یہ صرف محدود اوقات میں ممکن ہو گا کہ میں آپ کے ساتھ کہیں ریہرسلز کر سکوں یا شوٹنگز کروا سکوں۔ یعنی میں ہمہ وقت دستیاب یا موجود نہیں ہوں گا۔" بالآخر کسی فیصلہ ونتیجہ پر پہنچتے ہوئے، یونہی ان سے رخ موڑے وہ گویا بادل نخواستہ بولا تو ایمان راجپوت کے یاقوتی لبوں پر ایک خوش رنگ مسکان سج گئی۔

" ارے واہ۔۔۔ کمال ہو گیا یہ تو۔ بھئی ہمیں آپ کی یہ آسان سی شرائط بصد شوق و مسرت منظور ہیں۔ بہت شکریہ۔۔۔"

تقریباً ایک نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے گیتی نے بے ساختہ بڑھ کر ایمان کو گلے لگا لیا تو آہستہ آہستہ ان کے بالکل قریب آتی نازنین بھی بہت دلکشی سے مسکرانے لگی۔

" میں نے کہا تھا ناں۔۔۔ کہ ہم اچھے دوست ہیں۔"

گیتی کے گلے لگی ایمان یوں لگاوٹ وعقیدت سے بولی کہ جیسے اسے یقین دلانے سے زیادہ وہ اپنے ہی دل کو یہ باور کروا رہی ہو کہ وہ سچ مچ اچھے دوست ہیں۔

علی مصطفیٰ بھی اپنی جگہ سے چھوٹ کر سفیر کے گلے لگتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرنے لگا تھا۔ جبکہ اس کے بہت گرم جوش سے شکریہ کا جواب فقط اک خفیف سی مسکراہٹ سے دیتا وہ خاموشی سے ان تینوں خواتین کی خوشی و چہک مشاہدہ کرنے لگا جو اس کے اقرار کے بعد ان کے چہروں اور لہجوں تک سے جھلک رہی تھی۔

تو اس کہانی کے اس شاندار سے دیوتا۔۔۔ اور اپسرا کا باہمی تعلق یوں مرتبہ و اظہار پا کر معتبر بھی ہو گیا تھا۔

"تم نے اسے واپس کیوں جانے دیا ثومیہ؟ وہ حقیقتاً بہت شرمسار تھا۔ بلاشبہ اس نے بہت غلط کیا تھا۔۔۔ لیکن اس نے جو کچھ بھی کیا وہ تمہاری محبت میں کیا تھا۔ اب اتنا گڑگڑانے کے بعد تو اسے معافی مل جانی چاہیئے تھی۔"

☆......☆......☆

پاگل خانہ کے مرکزی احاطے میں ایک مخصوص خط پر ثومیہ کے ہمراہ قدم قدم ٹہلتی مریم نے بہت محتاط ہو کر یہ سب لفظ ادا کیے تھے۔ یونیورسٹی کی مصروفیت میں وہ کافی دنوں بعد اس سے ملنے آسکی تھی اور اس نے محسوس کیا تھا کہ آج اس کی ذہنی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ نمرہ کی آمد سے بھی قبل وہ سویرے جلدی ہسپتال پہنچ گئی تھی لہٰذا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ دستیاب ومیسر اس تنہائی میں کچھ پہلوؤں کا کوئی نہ کوئی نتیجہ و نچوڑ نکال کر ہی واپس جائے۔

"میں اسے معاف کر چکی ہوں مریم۔۔۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ معاف کر دینے کے بعد اسے پلو سے باندھ کر یہیں اپنے پاس رکھ لیتی۔" بڑے متوازن لہجے میں جواباً کہتے ہوئے وہ یوں ہنسی جیسے اپنی بات کا حظ بھی اٹھا رہی ہو۔

"یہ کوئی مذاق نہیں ہے ثومیہ کہ جسے یوں بے معنی ہنسیوں میں اڑا دیا جائے۔ تم بھلے مانو یا نہ مانو۔۔۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہاری زیست کہانی سفیر احمد کی موجودگی کے بنا ادھوری و تشنہ ہی رہے گی۔ اس کہانی کی تکمیل کے لیے وہ لازمی جزو ہے۔" اب کی بار قدرے تیز لہجے میں کہتے ہوئے مریم نے اپنی جگہ پر رک کر اسے بھی کلائی سے تھام کر اپنے مقابل روک لیا تھا۔

"تو پھر سنو مریم کہ کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ تشنگی کا احساس نہ ہو تو کہانیوں کی تکمیل کا لطف بھی ادھورا رہتا ہے۔ میری زیست کہانی بھی ایسی ہی اک کہانی ہے۔" دوبدو انداز میں جواباً کہتے ہوئے وہ مریم کو بے حد مضبوط لگی تھی اور اس پل بالکل خاموشی سے اس کی پتھر آنکھیں تاکتے ہوئے وہ سمجھ ہی نہیں سکی کہ اپنی ہٹ پر اس قدر جم چکی اپنی اس دوست کو

اب مزید کیا کہے؟ بالآخر چند لمحات کے توقف سے، لہجہ و انداز کو بہت ڈھال کر وہ پھر سے بولی تھی۔

"یہ سب صرف لفاظی ہے ثومیہ۔۔۔ اور اپنے لفظوں پر بھروسہ و انحصار کرتے ہوئے کسی کی ذات و شخصیت کو سرے سے نظر انداز کر دینا کسی طور اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے تمہیں اُس کو پھر سے سمجھنے کی ضرورت ہے اور ہو سکے تو اس بار اُس کی شخصیت کو نئے زاویوں سے پڑھنے کی کوشش کرنا۔"

اور اس کے ملتجی لہجہ میں بھی اس کے لیے جانے کس کس پیرائے کا درد رکھا تھا کہ اس کی پتھر ہو چکی آنکھیں آخرش بھیگنے لگیں۔

"یہ انسان بڑے مشکل اور عجیب ہوتے ہیں یار۔ ان کو بغور پڑھنے لگو تو جس صفحے سے سمجھ میں آنے لگتے ہیں اس سے اگلے ہی صفحے پر دل سے اتر بھی جاتے ہیں۔ اور جو دل سے بہت اتر چکے ہوں ناں۔۔۔ نظر پھر ان پر دوبارہ نہیں ٹکتی۔ یقین کرو کہ زندگی میں کُچھ باب ہمیں ہمیشہ کے لیے اپنے اوپر بند کرنے پڑتے ہیں۔۔۔ اور میری زندگی کا بھی ایسا ہی اک باب ہو گیا ہے وہ۔"

گلوگیر لہجہ میں بات مکمل کرتی وہ اپنی جگہ سے چھوٹ اندرونی عمارت کی جانب بھی بڑھ گئی تو فقط ایک لحظہ و ساعت کے لیے اپنے پیروں پر ساکت ہوتی مریم ایک بار پھر سے اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔

"اور وہ جو تم سے وعدہ کر کے گیا ہے کہ مصطفین کو ڈھونڈ کر لائے گا اس کا کیا ثومیہ؟ کیا تب بھی تم اسے معاف نہیں کرو گی؟"

مصطفین کے نام پر برآمدہ سے کُچھ فاصلہ دور وہ ایک جھٹکے سے رکی تھی۔

"وہ جب لائے گا تب کی تب دیکھیں گے۔۔۔ میں اسے ایک ہی صورت دل سے معاف کر سکوں گی کہ جب اسے مصطفین سے معافی مل جائے۔" مڑے بنا یہ کہتی وہ پھر سے آگے بڑھنے لگی تھی۔

"صرف میرے کہنے پر تم ایک بار خود کو یہ سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں ثومیہ کہ۔۔۔"

دوبارہ اس کے ہم قدم چلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتی مریم مزید جانے کیا کہنے لگی تھی کہ یکا یک ایک بار پھر سے رک کر اس نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک لی تھی۔

"خدارا اس کی بے جا طرفداری نہ کرو مریم۔۔۔ میں بخوبی جانتی ہوں کہ تم ہر طرف سے بس اپنا حق دوستی نبھا رہی ہو۔۔۔ لیکن یہ طے ہے کہ خود کو لاکھ منانے یا بارہا سمجھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیالات کی جو جو بھی ترتیبات بدل

لو۔۔۔ذہن ودل میں پڑ چکی شکنیں ہٹانا ممکن ہی نہیں۔ذات ادھڑنے لگے تو اس بخیہ گری کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔"

دوٹوک انداز میں یہاں تک کہتے ہوئے اس نے فقط ایک پل کے لیے خاموشی اختیار کی اور مدھم ہنکارا بھر کر لہجے کو ڈھالتی ہوئی مزید بولی۔

"اس کی تسلی کے لیے اس سے ایک بار ملنا ضروری تھا سو مل لیا ہے۔اب بار بار اسے یہاں اپنے سامنے بلا کر میں گئے وقت کو پھر سے صدا نہیں دینا چاہتی۔جو بیت گیا ہے۔۔۔اس پر اگر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا تو میرا بھی نہیں تھا۔کیا یہی بہتر نہیں ہوتا کہ عہدِ ماضی سے وابستہ جو باتیں بہت تکلیف دہ ہوں انہیں جوں کا توں رہنے دے کر فقط بھولنے کی کاوشیں کی جائیں؟"

بات مکمل کر کے اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتی وہ گویا اسے یہ باور کروا رہی تھی کہ اس کی بات ہی ہر بات کی کل اور اصل ہے۔

"ہمم۔۔۔چلو اس بات کا فیصلہ وقت پر چھوڑتے ہوئے تھوڑا آگے بڑھتی ہیں۔اگر تم دھیرج رہنے کا وعدہ کرو تو مجھے تم سے ایک اور بات بھی کرنی ہے۔"

بہت نرمی سے اپنے شانے سے اس کا ہاتھ ہٹا کر ایک ہاتھ میں لیتی وہ گویا اس سے قائل ہو کر موضوع بدل رہی تھی۔

"بہت شکریہ یار۔۔۔اور ہاں تم نے جو بھی کہنا ہے بلا جھجک کہہ سکتی ہو۔میں کسی بھی قسم کا کوئی شدید ردعمل اب یقیناً نہیں دوں گی کہ میں اپنے دل میں عوامل کے کسی بھی طور وقوع پذیر ہونے پر سمجھوتہ کر چکی ہوں۔"

وہ بولی تو اس کا لہجہ خودی سے ہارا ہوا سا تھا۔

"اپنے گھر واپس چلی جاؤ ثومیہ۔۔۔تمہاری ماما اور نمرہ تمہارے یہاں رہنے سے بے حد پریشان ہیں۔میں جانتی ہوں تمہارے لیے یہ ایک مشکل ترین فیصلہ ہوگا لیکن مُسلسل یہیں رہنا بھی کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔اور جہاں تک مجھے لگتا ہے اب تمہارے بابا کو بھی سمجھ آ چکی ہوگی کہ وہ تم سے کوئی دھونس یا زبردستی نہیں کر سکتے۔" بنا کسی توقف بڑے نپے تلے لفظوں میں اس نے اپنا مقصود اگل دیا تو ثومیہ خالی خالی نگاہوں سے اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔اس ذکر پر اس کے چہرے کی رنگت اس بار بھی بدل گئی تھی لیکن اس سے زیادہ اس نے کوئی تاثر یا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

" گو کہ اپنے گرد موجود ان مضبوط تر دیواروں سے مجھے تحفظ کا احساس رہتا ہے۔۔۔لیکن صرف تمہارے کہنے پر میں اس پر مزید سوچوں گی۔اس کے علاوہ اور کوئی بات ہو تو وہ بھی کہہ دو۔"

جا بجا برآمدے کی طویل قامت دیواروں کو دیکھتے ہوئے وہ عجب یاسیت میں گھر کر بولی تو اپنے فیصلہ وارادہ پر اس کے یوں نظرثانی کا وعدہ کرنے پر مریم کو اس پر بے پناہ پیار آیا۔

"بہت شکریہ یار۔۔۔بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

اپنے ہاتھ میں اب تک دبا اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے مریم نے خوشدلی سے کہا اور پھر نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اوپری منزل کو لے جاتی سیڑھیوں جانب قدم بڑھاتی مزید بولی۔

"اب تم اپنے کمرے میں جا کر تھوڑا آرام کرلو۔۔۔میں ذرا ڈاکٹر صبا سے مل کر آتی ہوں۔امید ہے تب تک نمرہ بھی پہنچ جائے گی تو پھر خوب ساری گپ شپ کریں گی۔میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے اپنے طلباء وطالبات کے بہت سے قصائص ہیں۔"

جواباً فقط اثبات میں سر ہلاتے ہوئے، اس کی ہمراہی میں مُسلسل آگے بڑھتی وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم ہوگئی تھی۔ مریم کی باقی ہر بات کو پس پشت رکھتے ہوئے اس کا ذہن اب تک سفیر احمد میں ہی اٹکا ہوا تھا۔جانے کیوں اسے سفیر کی شرمندگی اور پھر معافی کی طلب بھی فقط پھر سے اپنے قریب ہونے کا اک بہانہ لگتی تھی۔

"نت نئے حیلے بنا کر پھر سے میرے قریب آنے کی کاوشیں نہ کرو۔جن وجوہات کی بنا پر تمہیں خود سے دور کیا تھا وہ وجہیں ابھی موجود ہیں۔۔۔وہ درد جُوں کا تُوں ہے جو تم دان کر گئے تھے۔۔۔وہ گھاؤ ابھی بھرے نہیں جو تم سے ملے ہیں۔" من ہی من اندر سفیر کو مخاطب کرتے ہوئے وہ مریم کی سنگت میں قدم قدم برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔

اس روز دوپہر کے کھانے میں استعمال ہونے والے برتن دھو کر نمرہ ابھی کچن سنک سے ہٹی نہیں تھی کہ راشدہ بیگم تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔نمرہ نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا اور بڑی لگاوٹ سے گویا ہوئی۔

"کچھ چاہیئے تھا تو آپ مجھے بلا لیتیں ماما جان۔۔۔ایسے ہی چھوٹی موٹی ضرورت کے لیے بھی آپ بھاگم بھاگ خود سے چلی آتی ہیں۔یوں مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

بات مکمل کرتے ہی وہ ہاتھ میں موجود صابن لگی پلیٹ کو کھلے پانی کے نل تلے گول گول گھمانے لگی تھی۔

"ہاں وہ۔۔۔بس ایسے ہی بیٹا۔"

جواباً قدرے غیر حاضر دماغی کے سے انداز میں فقط یہی کہہ کر وہ بالکل چپ ہو رہیں تو نمرہ پہلے ان کے انداز پر اور پھر باہر لاؤنج سے ابھرتی کچھ مانوس سی آوازیں سن کر بے طرح چونک اٹھی۔

"باہر کون آیا ہے ماما؟ پھوپھو ہیں ناں؟"

جلدی جلدی نل بند کر کے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی وہ سرعت سے ان کے قریب چلی آئی۔اس سوال کے ساتھ اس کے لہجہ و آنکھ سے کئی کئی خدشات بھی چھلک رہے تھے۔

"ہاں تمہاری پھوپھو آئی ہیں اور ساتھ فواد بھی ہے۔تم یُوں کرو کہ کیتلی میں چائے کا پانی چڑھا کر انہیں سلام کر آؤ۔۔۔میں تب تک ساتھ پیش کرنے کے لیے کُچھ لوازمات نکال لیتی ہوں۔"

اس کے خود سے پوچھ لینے پر ان کی گویا کوئی مشکل تھی جو اپنے آپ حل ہو گئی تھی۔اس کے لہجہ و آنکھ سے چھلکتے خدشات و دھڑکات کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے، انتہائی متوازن انداز میں وہ یُوں بولی تھیں جیسے روزمرہ کے طور پر اسے کہہ رہی ہوں کہ جاؤ جا کر اپنے بابا کو ایک گلاس پانی دے آؤ۔

"یہ کیا لینے آئی ہیں ماما؟ اب ان کا یہاں کیا کام ہے؟"

وہ بھی ثومیہ شاہجہاں کی بہن تھی۔۔۔اور جرح و بحث سے بچنے کی ان کی اس مصلحت یا کوشش کو سرے سے رد کرتی جواباً انتہائی درشت لہجے میں بولی تھی۔

"افوہ آواز نیچی رکھو نمرہ۔۔۔اور کیا مطلب کہ کیوں آئی ہیں اور کیا کام ہے؟ یہ شہوار کے بھائی کا گھر ہے اور بنا کسی کام کے بھی وہ یقیناً جب مرضی آ سکتی ہے۔تم ذرا اپنے تیور درست رکھو۔میرے لیے بلاوجہ کوئی نئی مصیبت نہ بنا لینا۔ انہی تیوروں کے سبب ہم پہلے بھی۔۔۔"

اس کی بات پر سختی سے اس کا شانہ دباتے ہوئے، اسے دھیرج رہنے کی تائید و تلقین کرتی وہ ابھی بات پوری بھی نہیں کر سکی تھیں کہ یک گونہ ان کے حکم کی تعمیل میں آواز نیچی کرتی وہ ان کی بات کاٹ گئی تھی۔

"ہاں یہ جملہ تو مجھے حفظ ہو چکا ہے ماما کہ انہی تیوروں کے سبب ہم پہلے سے بہت سا بھگتان بھگت رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔تو ٹھیک ہے ماما۔۔۔میں ان کے سامنے حتی المقدور کوشش کروں گی کہ میں خاموش ہی رہوں، لیکن اگر اس بار انہوں نے پھر سے کوئی "ہینکی پینکی" کی یا کوئی نیا شوشہ چھوڑا تو ثومیہ کی طرح میں نے بھی صاف صاف سنا دینی ہیں۔"

دوٹوک لہجہ میں کہتے ہوئے ریک سے چائے والی کیتلی اٹھانے کے لیے مڑتی وہ یکا یک پھر سے رکی تھی۔

"اور چائے تیار کر کے میں سب کُچھ خود ہی لے آتی ہوں، آپ باہر ان کے پاس ہی چلی جائیں۔اتنا ضروری نہیں ہے انہیں سلام کرنا کہ آدھا ادھورا سب چھوڑ چھاڑ کر پہلے در درشن کی حاضری کے لیے چلی جاؤں۔"

آواز اس کی اب پہلے سے بھی قدرے نیچی تھی لیکن لہجہ و انداز تھا کہ پہلے سے کہیں ترش تھا۔ایک پل کے لیے رک کر فکرمندی سے اسے چائے کا پانی چڑھاتے دیکھتی راشدہ بیگم چپ چاپ واپس پلٹ گئیں۔اس کا مزاج پرکھتے ہوئے وہ بخوبی جانچ گئی تھیں کہ اس سے اس ضمن و مد میں ہوئی مزید کوئی بھی بحث اس گھر میں کسی نئے جھگڑے بلکہ بغاوت کی داغ بیل ڈال دے گی۔

پھر یوں ہوا کہ منہ کے بگڑے ہوئے زاویوں کے ساتھ مُسلسل بولتے، بڑبڑاتے اس نے چائے تیار کی اور لوازمات کے ساتھ ایک بڑی ٹرے میں برتن سجا کر سلیقے سے اسے ڈھکتی باہر لاؤنج میں سب کے مابین چلی آئی۔

"السلام علیکم۔۔۔"

سپاٹ لہجے میں سب کو مشترکہ سلام "جھاڑتی" ہوئی وہ درمیانی میز پر ٹرے دھرنے لگی تھی کہ اپنے بھائی صاحب کی طرف جھک کر کچھ کہتی شہوار بیگم تیزی سے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھرتے ہوئے بولی تھیں۔

"اے وعلیکم السلام۔۔۔ ماشاءاللہ کتنی سوہنی لگ رہی ہے میری دھی۔ میں صدقے۔۔۔ کب سے پوچھ رہی ہوں کہ نمرہ دکھائی نہیں دے رہی۔آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کے لیے۔۔۔"

اوران کے یہ سارے لگاوٹی کلمات سن کر خطرے کا کوئی بڑا گھنٹہ تھا جو اس کی چہار سمت پورے زور و شور سے بجنے لگا تھا۔یکا یک کسی انتہائی گڑبڑی کا احساس کرتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے بے ساختہ اپنی ماما کی جانب دیکھا تو وہ نظریں ہی پھیر گئیں۔ان کے انداز پر اس کا شک کسی انہونی کے یقین میں بدلنے لگا۔

"میں چائے بنا رہی تھی پھوپھو۔۔۔ بن گئی ہے تو فوراً آ گئی ہوں۔"

لیے دیئے انداز میں کہتی وہ جیسے بے وجہ سی کوئی وضاحت پیش کر رہی تھی۔

پھوپھو یہ "جن جپھا" چھوڑتے ہوئے ہٹ کر اپنی جگہ پر واپس جا بیٹھیں تو اس نے باری باری سب کو چائے پیش کرنا شروع کی۔اس دوران اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ فواد کی پرشوق نگاہیں مُسلسل اسی کے سراپا و وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی اور فواد کا کپ بھی اس نے بنا اسے مخاطب کیے اس کے سامنے ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا۔

"بھائی جان آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟ ان حالات میں یہی مناسب ترین فیصلہ ہوگا۔تقریباً پورے خاندان کی یہی خواہش ہے اور سب کی نگاہیں اسی پر جمی ہیں کہ میں فواد کا رشتہ جلد از جلد بس کسی بھی طرح انہی کے ہاں

طے کر دوں۔ ماشاء اللہ سے سرکاری نوکری ہے۔ ہر کوئی یہی چاہے گا ناں کہ اس کی بیٹی سکھی رہے۔ سمجھ لیں میں بہت مجبور ہو کر آپ سے یہ سب کہہ رہی ہوں کیونکہ اس کے ددھیال میں بھی اس وقت سو رشتے ہیں۔ اب کس کس کو اور کتنا انتظار کرواؤں بھلا؟"

چائے پیش کر کے وہ اپنی ماما راشدہ بیگم کے بالکل ساتھ ایک خالی نشست پر ابھی بیٹھی ہی تھی کہ شہوار پھوپھو نے بہت منت بھرے لہجے میں اپنے بھائی جان کو مخاطب کیا تھا۔ نمرہ کو لگا جیسے وہ بات کو وہیں سے جوڑ رہی ہیں جہاں سے اس کی آمد کے سبب یہ گفتگو رک گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ شاہجہان عادل انہیں کوئی جواب دینے کی بجائے ماتھے پر لکیر فکر لیے اپنی شریکِ حیات کی طرف دیکھنے لگ گئے ہیں۔ ان کے انداز سے یُوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے انہیں کوئی جواب دینے میں اس پل انہیں کوئی تامل درپیش ہو۔ بات چیت کی نوعیت کا ادراک واحساس کرتے ہوئے بے ساختہ نمرہ کے کان کھڑے ہو گئے اور تھوڑی اکڑ کر بیٹھتی وہ گویا ہمہ تن گوش ہو گئی تھی۔

" کیا سوچنے لگ گئے ہیں بھائی جان؟ خدارا مجھے انکار نہ کیجیے گا۔ ثومیہ کو اللہ خیر خیریت سے واپس گھر لائے وہ مجھے بڑی پیاری ہے۔۔۔ لیکن اس وقت ہمارے گھر میں سب کو یہی لگتا ہے کہ فواد کا رشتہ نمرہ سے طے پانا زیادہ بہتر رہے گا۔ میں بہت مجبور ہو کر اب نمرہ کے لیے سوال کر رہی ہوں۔"

پھوپھو تو پتا نہیں مجبور تھیں یا نہیں لیکن ان کے اگلے ہی جملے نے نمرہ کو ضرور اپنی جگہ سے ایک ہی جھٹکے سے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

" کیا۔۔۔؟ کیا کہا پھوپھو آپ نے؟ آپ نے سوچا بھی کیسے کہ ایسا ممکن ہے؟ آپ کو اطلاعاً بتا دوں کہ آپ کو ثومیہ کا رشتہ بھی ہرگز نہیں ملنے والا۔ اپنے اس ہونہار سپوت کو جہاں مرضی بیاہیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہاں میرا اور آپی کا خیال دل سے مکمل طور پر نکال دیں۔"

پہلے ردعمل کے طور پر اس کے منہ میں جو آیا وہ بنا کسی توقف کے ایک ہی سانس میں بول گئی۔ اس کی اس قدر جرات پر راشدہ بیگم کا دل کیا اپنا ماتھا پیٹ لیں جبکہ فواد اور شہوار پھوپھو حیرت سے اسے یُوں بلا کسی خوف وخطر باپ کے سامنے اپنی رائے پیش کرتے دیکھ رہے تھے۔ اس نے فقط ایک پل کے لیے خاموش رہ کر باری باری سب کے تاثرات جانچے اور خصوصاً اپنے باپ کا بالکل خاموش دیکھ کر اسی مضبوط لہجے میں مزید گویا ہوئی۔

"اور میں بخوبی جانتی ہوں کہ اب آپ کو ثومیہ میں کیا برائی دکھائی دینے لگی ہے جو آپ اس سے ہٹ کر میرا رشتہ

مانگ رہی ہیں......یہی ناں کہ وہ کافی عرصہ سے پاگل خانہ میں ہے اور اس حوالہ سے آپ میں لوگوں کے سوالات کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔تو پھوپھو جان ہمارا بھی یہی ماننا ہے کہ رشتہ وہیں جچتا ہے جہاں کوئی ہماری ذات پر اٹھے سوالوں کا جواب تراش کر لوگوں کی زبانیں بھی بند کروا سکے۔اور ان زبانی کلامی محبت کے کھوکھلے دعوؤں سے کوئی زندگی تو نہیں گذرتی کہ ان کی خاطر جان عذاب کر لی جائے؟ میں بابا کے سامنے آپ کو خود ہی انکار کرتی ہوں۔میرے بارے میں ایسا کبھی سوچئیے گا بھی مت۔بہت شکریہ۔"

بات مکمل کرتے ہوئے وہ وہاں سے نکل کر جانے لگی تھی کہ سب کو گنگ پا کر قسمت کا مارا فواد بول اٹھا۔

"پتا نہیں تم دونوں بہنوں میں کس بات کا غرور ہے؟ تھوڑا سا پڑھ لکھ کیا گئی ہو جیسے سُرخاب کے پر نکل آئے ہیں۔مزاج ہی نہیں ملتے تمہارے۔۔۔پاکستان میں صرف اسی بدولت طلاق یافتہ عورتوں میں 97 فیصد شرح پڑھی لکھی عورتوں کی ہے کیونکہ وہ زبان دراز بہت زیادہ ہوتی ہیں۔اور۔۔۔"

تنفر و حقارت سے کہتا ابھی وہ یہیں پہنچا تھا کہ جاتے جاتے رک کر وہ یکا یک پلٹی اور قدم قدم اس کے عین مقابل آتے ہوئے اس کی بات اچک لی۔

"اور بس اب آپ نے بڑا بول لیا فواد بھائی۔۔۔اس سے زیادہ ایک لفظ بھی بولا تو میں بھول جاؤں گی کہ آپ مجھ سے بڑے ہیں اور میں حقیقتاً آپ کے گال پر ایک تھپڑ رسید کر دوں گی۔آپ کی جرات کیسے ہوئی ہماری ہی نشست گاہ میں بیٹھ کر بنا کسی تعلق یا رشتہ کے ہمیں طلاق جیسے گھٹیا لفظ سے ڈرانے کی؟"

دائیں ہاتھ کو حقیقتاً تھپڑ کے انداز میں ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے اسے یُوں غصے سے دھمکایا کہ اپنی جگہ سے پیچھے ہوتا وہ سچ مچ سہم گیا۔شہوار بیگم نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بے حد خاموشی سے یہ سب تماشا دیکھتے اپنے بھائی شاہجہان عادل کی طرف دیکھا اور دوپٹہ سے آنکھیں پونچھتے ہوئے با قاعدہ ٹسوے بہانے لگیں۔

"اور طلاق یافتہ عورتوں میں 97 فیصد شرح پڑھی لکھی عورتوں کی اس لیے ہے، کیونکہ کسی بھی یونیورسٹی میں یہ تعلیم نہیں دی جاتی کہ طبعاً 100 فیصد گھٹیا، غلیظ اور نجس مردوں کے ساتھ کیسے اور کیونکر رہا جا سکتا ہے؟ سمجھے۔۔۔؟ بڑے آئے سیانے۔۔۔"

ادھر انتہائی مضبوط اور دوٹوک لہجے میں اپنی بات مکمل کرتی وہ نہایت سرعت سے وہاں سے نکلتی بھی چلی گئی اور راہداری میں تھوڑا آگے جا کر ایک دیوار سے اپنی پشت سہارتی تیز تیز سانسیں لینے لگی۔پیچھے اب تک خاموشی تھی۔۔۔

اور وہ یقین کرنے سے قاصر تھی کہ وہ سچ مچ وہاں وہ سب بول کر آئی ہے جو اس کے اپنے کانوں میں بھی ابھی تک سرگوشیوں کی مانند رینگ رہا ہے۔

"اے عرش والے۔۔۔تو سب سنبھال لیناہاں۔"

بے پناہ افکار میں گھر کر منہ پر ہاتھ جماتے ہوئے اس نے نگاہیں اٹھائی تھیں اور۔۔۔اور عرش والے نے گویا اسی پل اس کی دعا کو شرف قبولیت بخش دیا تھا۔لاؤنج سے آتی شاہجہان عادل کی اگلی آواز پر کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی جو اس کی سماعتوں کے گرد مُسلسل رقص کرنے لگی تھی۔

"تم اپنی جگہ مجبور ہو اور میں اپنی جگہ ہوں شہوار۔۔۔ابھی تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ وہ راضی نہیں ہے۔اور پہلے یہی عالم ثومیہ کا بھی تھا۔۔اس سے میں نے زبردستی کی کوشش کی اور نتیجہ تمہارے ساتھ ساتھ پورے خاندان نے دیکھا۔میرا گھر سب کے لیے گُفتگو کا محور بن کر رہ گیا ہے۔لہٰذا اس بار تم میری مجبوری کو سمجھو میری بہن اور مجھے اس رشتے سے معافی دے دو۔جب وہ دل سے راضی نہیں تو میں اسے زبردستی نہیں منا سکتا۔میرے پہلے غلط فیصلے کے سبب میری ایک بیٹی کی ذہنی حالت ایسی ہے کہ وہ مجھے دیکھ بھی لے تو ڈر یا خوف سے چیخنے چلانے لگتی ہے۔اب میں ایک اور غلط فیصلہ کر کے اپنی دوسری بیٹی کو بھی خود سے دور نہیں کرنا چاہتا۔بہت معذرت۔۔۔لیکن ثومیہ یا نمرہ یعنی کسی سے بھی۔۔۔فواد کا رشتہ ہونا ممکن نہیں ہے۔تمہیں خاندان میں اور جہاں مناسب لگے تم رشتہ کر سکتی ہو۔ہمیں کوئی گلہ،شکوہ یا اعتراض نہیں ہوگا۔"

لہجے کے نرم تر حصار میں اپنی بہن کے سامنے اپنا مدعا و عرض رکھتے،انہیں قائل کرنے کی کوشش میں وہ جانے اس کے بعد اور بھی کیا کیا کہتے رہے تھے لیکن اس نے بس یہیں تک سنا اور اپنی سماعتوں کو مسرت کی تھپکیوں سے یقین کی لوریاں سناتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔تو اس کے بابا جان بدل گئے تھے۔۔۔بالآخر انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ان کے سخت تر رویوں کے سبب ان کی بیٹیاں ان سے بہت دور ہو چکی ہیں۔پھوپھو اور فواد کی حیران و پریشان حالت کا سوچ سوچ کر من ہی من اندر بے پناہ سرشار ہوتی وہ پورے کمرے میں یہاں وہاں گول گول گھومنے لگی۔

اسے اپنے بابا پر بھی بہت زیادہ پیار آنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

گیتی کا مزاج ایسا تھا کہ جو بھی اس سے ملتا بہت تیزی سے قریب تر چلا آتا تھا۔اس کے لب و لہجہ کی خوشگواریت کا اثر یا ثمر تھا کہ سفیر احمد بھی بہت جلدی اس سے گھل مل گیا۔اس سے روز ملنے کے بعد وہ اس کے حالات سے زیادہ بہتر طور

پر آگاہ ہوا تھا اور اسے ادراک ہوا کہ یہ نازک سی لڑکی اپنے آپ میں کسی مضبوط تر قلعہ کی سی حیثیت رکھتی ہے جسے کوئی اپنی منفیت سے پچھاڑ نہیں سکتا۔ سفیر سے ملاقات کے تیسرے روز گیتی کی فلم "خدا کے بھگت" پاکستان سمیت دنیا بھر میں ریلیز ہوئی اور نمائش کے پہلے ہی دن شائقین کے کھڑکی توڑ ہجوم کو دیکھ کر فلمی ناقدین نے اسے ہٹ قرار دے دیا تھا۔ ایسے عالم میں جبکہ ہر طرف گیتی کی مانگ اور چرچا میں اضافہ ہو رہا تھا وہ میڈیا نمائندوں اور فلم کی کامیابی کی مد میں بھی دی گئی پارٹیز سے کنارہ کش ہوئی سفیر کے ساتھ اپنی اگلی فلم کے سکرپٹ سیشنز میں دھیان لگائے ہوئے تھی۔ اگلی فلم کے لیے اس کے انہماک وار تکاز اور جی جان لگانے کی سی شمولیت سے ہدایت کار رفیق نواز بخوبی آگاہ و خبردار۔۔۔ اور اس سے بے پناہ خوش بھی تھا۔ اس کی صلاحیتوں پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے وہ دلی طور پر مطمئن اور معترف بھی تھا کہ فلم کے ہر ہر شعبہ میں گیتی کی اس قدر دلچسپی یقیناً رنگ لائے گی۔ سفیر احمد کی "سرپرائز سائننگ" کے متعلق بھی رفیق نواز نے ہی طے کیا تھا کہ اسے پہلی شوٹنگ کے بعد میڈیا سے متعارف کروایا جائے گا۔ گیتی کی اگلی فلم کے لیے یہ بھی ایک اولین تشہیری حربہ تھا کہ بالکل نئے نئے متعارف ہو رہے ہیرو کے متعلق فلمی صنعت میں لوگ اپنے طور پر اندازے لگائیں اور اس پر زیادہ سے زیادہ گفتگو ہوتی رہے کہ آخر یہ کون ہو سکتا ہے؟ سفیر عموماً دوپہر میں اسے سٹوڈیو یا کسی آوٹ ڈور لوکیشن پر ملا کرتا تھا جہاں وہ مکالموں کی ریہرسلز کے ساتھ ساتھ ذاتی نوعیت کی بھی خوب گپ شپ کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کا باہمی تعلق تادیر تکلفات و احترامات کی ہی کسی کہانی کی صورت جاری رہتا کہ ایک روز جب وہ سب دریائے راوی کی بارہ دری میں ریہرسل کی غرض سے گئے ہوئے تھے گیتی نے باہم موجود یہ فاصلہ سلیقے سے پاٹ لیا تھا۔

وہ یُوں کہ ریہرسل کے بعد ان سب سے جدا ہو کر سفیر دور ایک کنارے بیٹھا دریائی ریت پر کچھ لکھ رہا تھا کہ گیتی نے اسے اس طرح سے الگ تھلگ بیٹھے ہوئے دیکھا اور غیر محسوس انداز میں باقی سب سے علیحدہ ہوتی وہ بھی اس کے پاس چلی آئی۔ اس سے فقط چند قدموں کی مسافت پر رک کر اس نے دیکھا کہ وہ خشک ریت پر خوشخطی سے کسی کا نام لکھتا ہے اور ہوا کا کوئی تیز جھونکا آ کر ریت کے ساتھ ساتھ وہ نام بھی اڑا کر لے جاتا ہے۔ مُسلسل دو تین بار ایسا ہونے پر سفیر یکا یک اپنی جگہ سے اٹھا اور پینٹ پر لگی گرد جھاڑتے ہوئے یُوں خشمگیں نظروں سے آس پاس سرسراتی ہواؤں میں گھورا گویا بس میں ہوا گر تو ابھی ان سے دست و گریباں بھی ہو جائے گا۔

"یہ محبت بھی کتنی جراتیں عطا کرتی ہے ناں سفیر۔۔۔؟ ہواؤں تک سے لڑ پڑنے کی ہمت ہوتی ہے اس میں۔"

مزید انتظار کیے بنا وہ آہستگی سے اس کے بالکل قریب آ کر بولی تو ایک جھٹکے سے اس کی جانب پلٹتا وہ قدرے

چونک بھی گیا۔

"ارے آپ۔۔۔آپ کب آئیں گیتی جی؟ معذرت مجھے اندازہ نہیں ہوا ورنہ میں خود چلا آتا۔۔۔"

مودبانہ لہجہ و انداز میں کہتا وہ گیتی کو بے حد معصوم لگا۔

"میں بس ابھی ابھی آئی ہوں۔۔۔اور بھئی یہ گیتی جی کی بجائے مجھے صرف گیتی یا گیت اور آپ کی بجائے تم بلایا کرو۔تمہارے منہ سے یوں آپ آپ کی گردان سن سن کر تو مجھے لگنے لگا ہے کہ اب میں بالکل بوڑھی ہوگئی ہوں۔سچ۔"

جواباً خوشدلی سے کہتی ہوئی وہ ہاتھ بڑھا کر اس سے اس کنارے پر بیٹھنے میں مدد چاہنے لگی کیونکہ اس کا جوتا ریت میں پھنس کر اسے توازن سے کھڑا بھی نہیں ہونے دے رہا تھا۔اس کی بات پر عجب دلربائی سے مسکراتے ہوئے سفیر نے بلا جھجک اس کا ہاتھ تھاما اور سر کو گویا تسلیم میں خم کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈال کر اسے نیچے بیٹھنے میں مدد دی۔

"جیسا آپ کو مناسب لگے گیت۔۔۔آپ ہماری مہمان ہیں اور کسی بھی طور ہم آپ کو خفا نہیں کرنا چاہتے۔"

اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اس نے بات برائے بات کہا تو وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے تاکنے لگی۔

"تو یہاں ثومیہ شاہجہان کا نام درج کیا گیا تھا۔ہاں۔۔۔؟"

ہواؤں سنگ اڑ جانے کے باوجود ریت پر اس نام کی کچھ باقیات اب بھی موجود تھیں جنہیں دیکھتے ہوئے گیت نے اگلا سوال کیا تھا۔ایمان کی زبانی وہ اس کی تمام تر زیست کہانی سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی اور اسے یہ کہانی اپنے آپ میں بہت دلچسپ لگی تھی کہ وہ کئی بار سفیر سے مصطفین اور ثومیہ کا ذکر کر چکی تھی۔

"جی۔۔۔ثومیہ شاہجہان۔"اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ فقط یہی کہہ کر خاموش ہو رہا تھا۔

"یہ چاہ و طلب تو فقط ایسی ہی ہوتی ہے ناں۔۔۔کہ انت اخیر یا مستم مستم،اور رقصم رقصم پر۔۔۔لاحاصل۔یہی تو بات کی کل و اصل ہے کہ بس چاہتے ہی چلے جانے میں۔۔۔اپنا آپ فنا کر دو۔"

اس کی حالت و کیفیت کے عین مطابق یہ حروف پھونک کر وہ سوالیہ نظریں لیے مُسلسل اسے تاک رہی تھی کہ اب جواباً وہ بھی کچھ کہے۔سفیر جانتا تھا کہ وہ اس سے ایسی باتیں صرف اس لیے کر رہی ہے تاکہ کسی بھی طور اس کا کتھارسس ہو سکے اور اسے جلد از جلد سنبھلنے میں آسانی ہو۔

"مجھے تو لگتا ہے اس کی تمام تر وضاحتیں بیکار رہتی ہیں۔یہ کبھی بھی،کہیں بھی اور کچھ بھی ہو سکتی ہے۔میں نے یہی پایا ہے کہ خواب تو یہ ہوتی ہی ہے۔۔۔سنگ سفر بھی ہوتی ہے۔لیکن کیا کریں جی؟ یہ محبت تو کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔"

بالآخر وہ بولا تو یوں گویا محبت کی وضاحت پیش کرنے میں بہت سی مشکلات سے دوچار رہا ہو۔اس کی بات پر ایک مبہم ہنکارا ابھرتے ہوئے گیت پھر سے بولی تھی۔

"ہمم۔۔۔تمہاری کہانی میں بیان کردہ محبت حقیقتاً عجب ہے سفیر۔بہت کم لوگ ہوں گے جنہیں ایسی محبتیں سمجھ میں آتی ہوں گی۔خیر۔۔۔مصطفین کا بتاؤ؟کوئی اتا پتا ملا اس کا؟وہ آخر جا کہاں سکتا ہے؟ایمان بتا رہی تھی کہ دُنیا میں اس کے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے۔"

فراغت کے لمحات میں وہ ان چھوٹے چھوٹے سوالات کی صورت اسے اپنی کہانی سے باندھے رکھنا چاہتی تھی تاکہ کسی بھی طرح اسے اس ماحول میں یہ احساس نہیں ہو کہ اس سے جڑ کر وہ اپنی کہانی سے ہٹ رہا ہے۔

"اپنے گاؤں تو وہ نہیں گیا۔۔۔ہم نے پتا کروالیا ہے۔اس کے بچپن کے ایک دوست راجو سے بھی بات ہوئی تھی۔اسے بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟آج صبح میں اور ایمان اس کا ہاسٹل ڈھونڈتے ہوئے کئی جگہ گھومے ہیں۔ایک وارڈن نے بتایا کہ چار ماہ پہلے اس نام کا ایک لڑکا یہاں رہتا تھا لیکن پھر وہ یہاں سے چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا۔حلیہ بتانے پر ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ مصطفین شجاع کی ہی بات کر رہا تھا۔"

ٹھہر ٹھہر کر اور سرگوشی کے سے انداز میں اگلی تفصیلات بتاتا وہ گویا خود کو ہی کوئی کہانی سنا رہا تھا۔

"چلو تم پریشان نہ ہو وہ جلد مل جائے گا۔دیکھنا تم یونہی ایک دن اپنے آپ تمہارے سامنے آجائے گا۔ویسے کیسا لگتا ہے اسے پھر سے سوچنا سفیر۔۔۔؟" تسلی کے کچھ حروف کے ساتھ اگلا سوال اس نے یقیناً اسے مزید بولنے پر اکسانے کے لیے کیا تھا۔اس کی بات پر گردن موڑ کر اس نے صرف ایک نظر ہوا کے دوش پر لہراتی اس کی ریشمی لٹوں کو دیکھا اور دھیرے دھیرے پھر سے بولنے لگا تھا۔

"یہی محسوس ہوتا ہے کہ کسی سے اتنا بیر باندھا تھا کہ بالآخر اس سے محبت کر لی۔ہاں میں نے اس سے اتنی نفرت کی تھی کہ آخرش اس جیسا ہو گیا۔وہ جن جن باتوں پر بے طرح جلتا تھا ناں۔۔۔انہی پر میں بھی بے تحاشا پگھلنے لگا ہوں۔اس سے زیادہ شاید کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں کہ اس کے لیے کیا سوچتا ہوں میں۔۔۔؟"

سر جھکائے ہوئے ریت پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا وہ جانے کس کس اضطراب کو چند حاشیوں میں باندھ رہا تھا۔

"اور ان سب میں ایمان راجپوت کہاں کھڑی ہے سفیر۔۔۔؟کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تمہاری مسافتوں میں اس کے حصے کی تو فقط خاک اڑ رہی ہے۔وہ تو تمہارے پیچھے باقاعدہ کوئی جوگ لیے ہوئے ہے شاید کہ ہر پل جھلی ہوئی پھرتی

ہے۔تم بتاؤ کہ تم اس کے متعلق کیا سوچتے ہو؟"

اب کی بار ریت پر لکیریں بناتا اس کا ہاتھ بے ساختہ رک گیا تھا۔۔۔جبکہ شوخ لٹوں کو گول گول گھما کر سر پر جوڑے کی شکل میں جماتی گیت سوالیہ نظریں لیے جواب کی منتظر تھی۔

"ایمان راجپوت میرے دل کے بہت قریب ہے گیت۔ہوتے ہیں ناں کچھ لوگ ایسے بھی جہاں میں۔۔۔کہ جن کو سوچنے سے آس پاس رات ہو نہ ہو۔۔۔ستارے چمک اٹھتے ہیں۔میں بھی نہیں جانتا کہ کب سے۔۔۔لیکن میں بہت سوچتا ہوں اسے۔مجھے لگتا ہے میں اس سے بڑی انوکھی قسم کی محبت کرنے لگا ہوں۔یہ انہی لمحات کا قصہ ہے کہ جب افق کے پورے چاند میں بھی کچھ کچھ سونا پن تھا کہیں۔۔۔جب سازندوں کے ساز تو تھے پر ساری دھنیں ادھوری تھیں۔جب ہوا کے نرم سے جھونکوں میں کوئی آگ،اذیت بہتی تھی۔جب گگن کی سب نیلاہٹوں پہ بھی پریاں ساکن رہتی تھیں۔بس انہی محسوسات میں گھل گھل کر اک نئی محبت کے حاشیوں سے جا لپٹا ہوں۔میں نے کہا ناں۔۔۔کہ میں بھی نہیں جانتا کہ کب سے؟لیکن میں بہت سوچتا ہوں اسے۔"

نرم لہجوں میں عجب چاشنی سموئے وہ گفتگو میں یوں شاعرانہ آہنگ ملا کر بولا کہ گیتی کو اس کے جذبوں کی صداقت پر اپنے آپ یقین ہونے لگا۔یکا یک اُس کا دل چاہا کہ کاش ایمان یہاں ہوتی تو سفیر کے لبوں سے پھوٹتے یہ سب اظہار و اقرار۔۔۔اور محبت بھرے اذکار سن کر یقیناً سرشار ہو جاتی۔

"اس پل ایمان خود یہاں ہوتی تو اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آتا۔میری اس سے اس حوالہ و مد میں تفصیلاً بات ہو چکی ہے۔۔۔اور تمہیں چاہتے ہی چلے جانے پر اس کا فقط یہی کہنا و ماننا ہے کہ حکم و خیالِ یار کے آگے کوئی اور دلیل یا شواہد نہیں رکھے جاتے۔یہ وہ چوکھٹ۔۔۔یہ وہ در ہے جہاں سر کو فقط تسلیم میں خم کرتے ہیں۔"

بے ساختہ وہ دل میں اٹھے خیالات کو اظہار کی راہ فراہم کرتے ہوئے زبان دے گئی تو اس سب سے پہلے سے آگاہ سفیر بس لبوں کو بھینچ کر مبہم سا مسکرانے لگا۔

"تم جاؤ گیت۔۔۔میں کچھ دیر میں آتا ہوں تو پھر واپسی کے لیے نکلتے ہیں۔"

کچھ توقف سے گفتگو کو یکسر بدل کر وہ دور افق سے پار ہوتے سورج کی جانب دیکھتا ہوا اسے سر کی مدھم جنبش سے واپسی کا اذن دینے لگا تو اس نے بھی آسمان پر طاری بجھتے ہوئے سورج کی آخری لالیوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔

"مجھے بھی یہیں رکنے دو ناں سفیر۔۔۔کہ اُداس تر شاموں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی سے کچھ نہ کچھ نسبت

میری بھی بنتی ہے۔"اس کی ساحر تر آنکھوں میں جھانکتی وہ گویا کسی حقیقت کو چھو کر بولی تھی کہ پلکوں کو جھپک کر کوئی اقرار سا کرتا وہ بالکل خاموش ہو رہا۔اور پھر وقت کی بہت سی پہریں اک بے نام سی چپ کی نذر کرتا وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے میں بلا کی الجھنیں رقصاں تھیں۔

"اک خیال یہ بھی ہے کہ ہمیں شام رنگ ان منظروں میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟اکثر میں یہ سوچتا ہوں کہ ڈھلتے ہوئے سایوں سے ہماری روحوں کو کیا لینا؟کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں بے سبب اداس ہوں۔۔۔کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سارا کرب پیتے یا سہتے ہم کون لوگ ہیں؟"

عجب پیرائے سے سوالات اٹھاتا وہ گفتگو کو بہت اہم دوراہے پر لے آیا تھا۔۔۔کہ یہیں ریشہ اس کے چہرے کی دلکشی پڑھتی وہ عجب سوگوار سی دھن میں رہ کر جواباً بولی تھی۔

"ہم کہ جہاں بھر کے دھتکارے ہوئے لوگ۔۔۔ہم کہ اُداس شاموں سے نسبتوں والے۔۔۔ہم کہ جذبات سے ادھڑے ہوئے ہیں۔۔۔ہم کہ اپنوں سے کہیں بچھڑے ہوئے لوگ۔"

اور اس ذکر میں ایسی کوئی یورش ولگاوٹ تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے سفیر نے بے ساختہ گیتی کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اک ساکتی ردھم سے اسے بھی ریت سے اٹھاتا ہوا حرف حرف بولنے لگا۔

"ہم کہ اب لہجوں سے ہی پگھلے ہوئے ہیں۔۔۔ہم کہ کہیں لفظوں میں بہت دھڑکے ہوئے لوگ۔ہم کہ پھر ملن سے مجبور ہو رہے ہیں۔۔۔ہم کہ بہت تر سے بہت تڑپے ہوئے لوگ۔"

اور بات مکمل کرتے ہی وہ اسے لے کر دریائی پاٹ کو عبور کرتا ہوا واپس بارہ دری کی جانب بڑھنے لگا تھا کہ جہاں نازنین اور ریہرسل کے لیے ساتھ آئے باقی کچھ لوگ ان کے شدت سے منتظر تھے۔

احترامات وتکلفات سے لبریز ان دونوں کا باہمی تعلق اس روز ایک نئی دوستی کی صورت پروان چڑھا تھا کہ جس میں انہیں اک دوجے کے دکھ درد تک حقیقتاً رسائی تھی۔

☆......☆......☆

وہ لاہور سے نکلا تو کسی مقام کو بطورِ منزل متعین کر کے نہیں چلا تھا۔بس جہاں کہیں سفر سے تھک جاتا تو وہیں اتر کر پیدل چلنے لگتا تھا۔دریاؤں اور نہروں کے نجانے کتنے پل تھے جو اس نے پانی کا مدھم یا تیز رو بہاؤ ناپتے ہوئے گذارے اور پانیوں سے عاری وہ کتنی ہی پیاسی وبنجر ان زمینیں تھیں کہ جن کے آڑھے ترچھے کٹاؤ پر قدم قدم چلتے ہوئے وہ جانے

کن کن میدانوں میں یکسر تنہا کھڑا بے وجہ آسمان کو تاکتا رہا۔ ایسے عالم میں چہار سمت چلتی سرد وگرم ہواؤں کے ساتھ اس کے اپنے اندر باہر بھی صرف وفقط تنہائی سرسراتی تھی۔

" آج بے قرار اتنا ہوں ۔۔۔ تنہائی ایسی ایسی ہے ۔۔۔ کہ دل کرتا ہے آسمان میں ہاتھ ڈالوں اور ۔۔۔ خدا کو ساتھ لاؤں میں ۔ "

یونہی کبھی تنِ تنہا کسی ریگزار میں اک اونچے ریتیلے ٹیلے پر کھڑا، خدا کو اپنے قریب تر محسوس کرتے ہوئے، اپنے آپ سے خود کلام ہوتا وہ گویا اپنی تنہائی کو اس طور پچھاڑنے کی کاوشیں کیا کرتا تھا۔ تنہائی اس کی ذات میں اور آس پاس بھی یُوں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی کہ اپنے آپ کے سوا اسے کائنات بھر میں کچھ اور سجھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اور اس تنہائی میں بھی دوسراہٹ کا اگر کوئی احساس تھا تو اس کے لیے مزید سوہانِ روح یُوں تھا کہ اپنے علاوہ اس کے ہر خیال وگماں کا ہر قصہ سفیر احمد پر آن رکتا تھا۔ اس کے دل سے یہ بات نکلتی ہی نہیں تھی کہ اس نے اس کی دوستی کی توہین کی ہے۔

" کبھی کبھی ہر پل ساتھ بسنے والے بھی باہم اندازہ نہیں کر پاتے کہ دل کس کس بات سے کتنا کتنا دکھتا ہے۔ کبھی کبھی ہنسی کی واحد وجہ لوگ بھی یہ جاننے سے قاصر رہتے ہیں کہ ہجومِ دنیا میں مصروف رہ کر انہوں نے آبگینوں سا کوئی دل ادھیڑ ڈالا ہے۔ کبھی کبھی ہم اتنے تنہا ہوتے ہیں کہ " کوئی " تو کیا ہوگا ہمارے " ہم " بھی نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی ہم خود سے بھی ملنے کی خواہش میں بڑے ناکام رہتے ہیں ۔۔۔ اور تعجب ہے کہیں " گم " بھی نہیں ہوتے۔ "

ہمہ وقت، ہمہ جہت اور ہمہ طور اس تنہائی کو جیتے جیتے عجیب زندگی ہوگئی تھی کہ بے وقت اور بے نام مسافتوں سے وہ تھکتا ہی نہیں تھا۔ شوقِ سفر تھا کہ در در کی خاک چھان کر بھی مٹتا ہی نہیں تھا اور جنونِ دشت وبن ایسا کہ سو سو سبیلیں کر کے بھی نہیں بجھے۔

" کوئی ایسی مسافت بھروں کہ کبھی لوٹ کر نہیں آؤں ۔۔۔ کوئی ایسی ڈگر ہو کہ جس سے واپسی کی ہر راہ مسدود ہونے لگے۔ کوئی ایسی روش ہو جو تباہ کن افکار سے چھٹکارہ دے دے ۔۔۔ کسی کو دکھائی نہ دے سکوں کسی کو سنائی نہ پڑوں۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے آج اتنا چلوں کہ ۔۔۔ تھک کر بس مر ہی جاؤں۔ "

جانے اس کی کتنی ہی بڑبڑاہٹوں میں یہ سب لفظ وحرف کسی دعا کی مانند شامل رہے اور اپنا آپ بھلائے وہ بے سمت ہی بس ۔۔۔ چلتا رہا۔ کہیں تھکا بھی تو رکا نہیں اور کہیں رکا بھی تو تھکا ہرگز نہیں۔ کئی نو آباد کار بستیاں، ویران تر ندیاں، اُداس جنگل اور تپتے ہوئے صحراؤں کو عبور کرتا وہ جہاں کہیں بھی گیا لوگوں کو اس کی ذات سے لپٹی ایک سوگوار سی چپ میں

عجب عجب دلچسپیاں پیدا ہوئیں۔ ہر کسی کے لبوں پر اس کے لیے ایک ہی سوال ہوا کرتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں کی مسافتوں پر نکلا ہے؟ اور کونہ کونہ اک ایک سوالی کے نین پڑھتا مبہم سا مسکرا کر وہ گویا اپنے آپ پر ہنس پڑتا تھا۔

" کسی کے دعائیہ لبوں سے بہت پہلے کہیں ادھورا چھوٹ چکا اک ورد ہوں میں۔ کسی کہانی کی تکمیل سے قبل اس سے بچھڑا ہوا اک فرد ہوں میں۔۔۔ کون ہوں میں۔۔۔؟ یہ نہیں جانتا۔ میں ہوں بھی کہیں۔۔۔؟ یہ سوچ رہا ہوں۔ ڈھونڈوں جو کبھی ملتا ہی نہیں۔۔۔ دیکھوں جو اگر "چوگرد" ہوں میں۔"

جا بجا پوچھے گئے اس سوال کی مد میں ہر بار یہی وہ لفظ تھے جو وہ اپنے دل میں دہرا دیا کرتا تھا۔ اسے اپنی ذات سے متعلقہ کسی بھی کھوج و سوال کا کسی بھی شخص و فرد کو کوئی جواب نہیں دینا تھا۔ وہ گم ہو جانے کے لیے ہی تو دنیا میں یوں نکلا تھا کہ لگن و طلب کی ہر راہ مسدود تھی۔

یہیں مختلف قبائل اور علاقہ جات سے گذرتے ہوئے اس پر یہ راز اس طور آشکار ہوا کہ یہ ڈنیا ہر کہیں ہی فقط جھوٹے بارِ لوازمات پر چلتی ہے۔ اس کے عمیق تر مشاہدات کا حاصل یہی تھا کہ اس جہاں میں آپ کو کوئی آپ سا نہیں ملتا۔ آپ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں۔۔۔ بس تنہا تنہا ہوتے ہیں۔

" پتا نہیں کیوں مجھے اپنی ذات کے جھوٹے بھار و بھرم رکھنے نہیں آتے۔ جو ہوں جیسا ہوں سب کے سامنے ویسا ہی ہوں۔ جبکہ یہ لوگ، یہ دنیا اور اس جہان بھر کا اک ایک پہلو۔۔۔ تصنع پر جان دیتا ہے۔۔۔ بناوٹ پر دل لبھاتا ہے۔ جانے میرے مزاج کے لوگ کس دیس، کس نگر سے پار بستے ہیں کہیں؟؟؟ عجب قحط ہے کہ مجھ سے کوئی مجھ سا ملتا ہی نہیں ہے۔" اپنے خود ساختہ اضطراب کو کئی لفظوں میں ڈھالتا اور تولتا وہ ہر کہیں سے آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔۔۔ اسے کسی ایسی ڈگر، ایسے کنار کی تلاش تھی کہ جہاں ٹھہر کر وہ باقیاتِ زیست سے طمانیت کے چند پل کشید کر سکے۔

اور وہ جگہ و مقام اسے یوں میسر آئے گا کہ وہ وہیں کا ہو کر رہ جانا چاہے گا ایسا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ایک روز کہ جب وہ دور دراز کسی پہاڑی علاقے میں تھا اور ایک اونچے پہاڑ کے آخروی کنارے پر کھڑا نیچے گہری کھائی میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا اسے اس پہاڑ پر ٹولیوں کی مانند کھڑے سیاحوں کے مابین ایک بزرگ کے مُسلسل کُچھ بیچنے کی آواز آ رہی تھی۔ اپنی سوچوں میں غلطاں وہ اس بزرگ سے یکسر بے نیاز کھڑا تھا کہ اس کی عین پشت پر آ کر وہ اسے خود سے کُچھ خریدنے کی عرض کرنے لگے۔

" مجھے کُچھ نہیں چاہیئے جناب۔۔۔ بہت شُکریہ۔"

اپنے دھیان میں محوو گم رہ کر اس نے ان کی طرف دیکھے بنا جواب دیا تھا۔

"ایک کپ پی لو بیٹا۔۔۔گرم قہوہ تمہیں سردی سے بچائے گا۔"

وہ یقیناً بہت مجبور تھے کہ لجاجت سے اس کا شانہ ہلا کر اصرار کرنے لگے۔اور یہیں گویا ان سے کوئی چوک ہوگئی تھی کہ مصطفین کا توازن بے طرح بگڑا اور ہوا میں پرندوں کی طرح بازو اڑاتا وہ اپنے قدموں پر بمشکل سنبھل سکا تھا۔ایک لحظہ کی دیر تھی کہ وہ گہری کھائی کی نذر ہو سکتا تھا۔

"انکل آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔۔۔؟ ابھی میں گرنے لگا تھا۔آپ لوگوں کو بس اپنی چیزیں بیچنے کی پڑی ہوتی ہے اب اس کے بدلے کوئی اپنی جان سے جاتا ہے تو بھلے جائے۔ جب کہہ دیا تھا کچھ نہیں لینا تو نہیں لینا تھا ناں۔۔۔ کوئی زبردستی ہے کیا؟ اگر آپ کی چیزیں نہیں بک رہیں تو یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔اب اتنی انا اور عزت نفس تو ہونی چاہئیے کہ کوئی اک بار انکار کرے تو آپ اسے مُسلسل تنگ نہیں کریں۔حد ہوتی ہے۔"

غصے میں تنا ہوا بے ساختہ اپنی جگہ سے بڑھتے ہوئے، دونوں بازوؤں سے انہیں دبوچتا وہ یُوں سختی و درشتی سے بولا تھا کہ اس کے ایسے جھنجھوڑنے پر ان کی بوڑھی آنکھوں میں بے بسی و خوف ایک ساتھ امنڈ آیا تھا۔

"عزتِ نفس، ذاتی مسئلہ، اور انا بھی۔۔۔ یہ سب بھرے پیٹ کی باتیں ہیں صاحب۔بھوک زور پکڑ لے تو کئی ایک کو اس سب کے "سب" مفاہیم بھولنے لگتے ہیں۔زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور سب سے بڑی اذیت بھی۔۔۔صرف اور صرف "بھوک" ہے۔آپ نے کبھی اسے دیکھا بھی نہیں شاید۔اور میں صرف اسی کو "جھیلتا" ہوں۔۔۔" کانپتے ہوئے لب ولہجہ میں جواباً کہتے ہوئے ان کی آواز حقیقتاً بھیگنے لگی تھی کہ اپنی بے اختیاری پر شرمندہ ہو کر اس کی گرفت فوراً ڈھیلی پڑ گئی۔

"میں تم سے معافی چاہتا ہوں بیٹا کہ تمہاری بے دھیانی میں تمہیں ہلا کر متوجہ کرنا چاہا۔لیکن میں اپنی جگہ مجبور تھا۔"

اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی معذرت خواہانہ لہجہ و انداز میں کہتے وہ بزرگ ایک جانب واپسی کے لیے بھی چلنے لگے تو اپنے سخت ترر ویہ کی بدولت اب تک ساکت کھڑا وہ ٹکر ٹکر ان کی پشت کو گھور کر رہ گیا۔زندگی میں کئی بار ہم لوگوں سے ایسا منفی رویہ و سلوک اپناتے ہیں کہ جس کی توقع ہمیں خود بھی ہم سے نہیں ہوتی۔

"میری بات تو سنیں انکل۔۔۔ایک منٹ رکیں پلیز۔۔۔خدارا مجھے بتائیں کہ اس عمر میں بھی آپ یہ سب محنت مشقت کیوں کرتے ہیں؟"

فقط ایک لمحے کے توقف سے ان کے پیچھے آکر ان کے ہاتھوں میں موجود چائے والے برتنوں کی جانب اشارہ کرتا وہ یوں ملتجی لہجے میں بولا جیسے کسی بھی طور کچھ دیر قبل کے اپنے رویہ کی تلافی کرنا چاہتا ہو۔اس کے یوں چلے آنے پر تیزی سے اٹھتے اس بزرگ کے قدم یکا یک سست پڑ گئے تھے۔

"میں ایک چرواہا ہوں بیٹا۔۔۔ کچھ سال پہلے میرا جوان بیٹا ایک پہاڑ سے گر کر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔وہ یہاں آنے والے مسافروں کو اپنے ساتھ گھمایا کرتا تھا اور اسی سے ہماری بہترین گذر بسر ہو جایا کرتی تھی۔لیکن اس کے بعد اب ہم دونوں میاں بیوی کی ذمہ داری اٹھانے والا کوئی نہیں تھا تو یہ محنت مشقت مجھے پھر سے کرنا پڑی۔ یہاں پہاڑوں پر برف پڑنے سے پہلے میں اپنے پالے ہوئے سارے جانور بیچ دیتا ہوں اور اس کے بعد یہی قہوہ ہوتا ہے اور میں۔۔۔ بس۔۔۔"

مختصراً اپنا احوال سنانے کے بعد،تھوڑا جھک کر وہ جھری دار آنکھوں سے اسے اس طرح دیکھنے لگے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ "اب میاں۔۔۔؟ آگے کیا کہتے ہو۔۔۔؟"

اور اس پل حرف حرف اس پہاڑی چرواہے کی داستانِ رنج والم سنتے مصطفین شجاع کو شاید ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا کہ اس نے اپنی زندگی سے متعلق ایک اہم ترفیصلہ کر لیا۔

" کیا میں آپ کا بیٹا بن کر آپ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ سکتا ہوں؟ میں ہر ممکن حد تک آپ دونوں میاں بیوی کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میں مانتا ہوں انکل یہ شاید آپ کو بہت عجیب لگے گا۔۔۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دُنیا میں میرے سوا میرا کوئی بھی نہیں ہے۔"

بنا کسی توقف لہجے میں بلا کا یقین بھر کر اس نے اپنا مقصود اگل دیا تو حیرت در حیرت اسے تاکتے ہوئے اس بزرگ نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور پھر پشت پر جھولتے اپنے بھاری بھر کم بیگ کے ساتھ،دونوں ہاتھوں میں چائے والے برتن بھی اٹھائے ہوئے وہ جونہی اس پہاڑی کے دامن سے نکل کر اگلی پہاڑی کی چوٹی پر آیا،دوسری طرف واقع میدان میں اس بوڑھے چرواہے کے لکڑی سے بنے گھر کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

یہ حقیقتاً اس کے خواب وخیال کا سا گھر تھا۔

وہی گھر کہ جس کی اس نے کبھی بے شمار خواہشیں کی تھیں۔

تو اک طویل تر ہجرت کے بعد در در کی خاک چھانتے ہوئے مصطفین شجاع کو آخرش کہیں رکنے کے لیے اک ٹھکانہ وسبب مل ہی گیا تھا۔

☆......☆......☆

ادھر شب وروز کی تفریق بھلائے گائتری دیوی اپنے اگلے پراجیکٹ میں مصروف تھی اور ادھر "خدا کے بھگت" میں ایک ہندو لڑکی کے اسلام قبول کر لینے کی کہانی کو بنیاد بنا کر منفی عناصر کی جانب سے اس کے گرد سازشوں کا گھیرا تنگ کیا جا رہا تھا۔ اس فلم کی کامیابی پر بھارت میں اس کی مخالفت دوبارہ زور پکڑ گئی تھی اور جا بجا اس کے پتلے جلا کر انتہا پسند ہندوؤں کی طرف سے ایک بار پھر سے اس کی مخالفت میں یہی نعرے لگائے گئے کہ اپنی پاکستانی فلم میں ہندو دھرم کی یُوں توہین کرنے پر گیتی کو "دیس نکالا" دے کر اس کی بھارتی شہریت بھی برطرف کر دی جائے۔

"پانی اس بار سر سے بہت اونچا ہو رہا ہے گیت۔ جلد تمہیں اس کا کوئی سدباب کرنا ہوگا ورنہ یہ بہاؤ تمہیں اپنے ساتھ ہی کہیں بہالے جائے گا۔"

دورانِ مشق کسی سبب جز وقتی رکاوٹ آئی تو سٹوڈیو میں ایک جانب لگی ایل۔ای۔ڈی سکرین کے آگے سے اٹھتی ناز بہت تپی ہوئی گیتی کی طرف آئی تھی۔ وہ ابھی ابھی ایک بھارتی چینل پر اس کے خلاف مُسلسل چلتی خبروں سے پریشان ہوگئی تھی۔ اور یہیں گیتی کے جواباً کُچھ بھی کہنے سے قبل سفیر بول اٹھا تھا۔

"نازنین بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے گیت۔۔۔ میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں کہ حالات پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے تمہارے ہاتھ سے نکل رہے ہیں لیکن تم بے پرواہی سے سب کُچھ ہونے دے رہی ہو۔ میرے خیال سے اب تمہیں یہ سب پروپیگنڈہ کرنے والوں کو بھرپور جواب دینا چاہیئے۔ منفی حالات میں کسی بھی طور اپنا مطمع نظر بیان کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنا ہر کسی کا بنیادی حق ہے۔"

اس نے بڑے تحمل سے باری باری ان دونوں کی بات سنی اور ایک معاون سے تولیہ پکڑ کر گردن پونچھتی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ان دونوں کے عین سامنے ایک نشست پر ٹک گئی۔

"باہم لفظی جنگ ضروری نہیں ہوتی یار۔ کچھ لوگوں سے انتقام لینے کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنی کارکردگی کی بنیاد پر ہمہ وقت ان کے ناقص وکمتر اذہان پر سوار رہا جائے۔ اپنی صلاحیت کو اس قدر نکھارا جائے کہ حاسدین ودشمنان کو جواب آپ نہیں بلکہ وقت ہی دے۔ تو بس یہ طے ہے کہ اپنے غلیظ وخبیث نتھنے پھلا پھلا کر میرے متعلق کوئی کچھ بھی کہے، کچھ

بھی بھونکے۔۔۔جواباً مجھے کسی سے۔۔۔کچھ نہیں کہنا۔"

وہ بولی تو اپنی ہٹ پر اڑا ہوا اس کا لہجہ بلا کا تلخ تھا۔ان دونوں نے یُوں بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہوں کہ یہاں کُچھ بھی سمجھانا یا کہنا بیکار جائے گا۔بالآخر کچھ لمحات کے توقف سے بڑے تجزیاتی انداز میں سفیر نے جواباً ٹکڑا دیا تھا۔

"ویسے تمہارے خلاف ہوتے پروپیگنڈا سے ایک ہی بات سمجھ آتی ہے گیت کہ اس جہاں میں کچھ لوگ فقط اسی اصول وقاعدے پر چلتے ہیں کہ منہ اٹھا کر جب مرضی، جسے مرضی اور جو مرضی کہہ دینا ہے۔بس اپنے منہ سے ہی کہنا ہے ناں تو بس کھولا منہ اور جو منہ میں آیا بک دیا۔ہاں افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایسوں کو واہ واہ، اش اش کرنے والے بھی محدود ہی سہی۔۔۔لیکن میسر آ ہی جاتے ہیں۔صد افسوس یہ سب نہیں جانتے کہ بارگاہِ ایزدی میں ایسے ہر شخص وفرد کا شمار کہ جو کسی کی ذات پر بے وجہ کیچڑ اچھالتا ہو دھتکارے ہوؤں میں ہوتا ہے۔"

اس کی بات پر گیتی کو عجب سی کوئی تقویت ملی تھی۔اس نے ہولے سے مسکرا کر ناز کی طرف دیکھا اور دوبارہ بولی۔

"وہ عجیب لوگ ہیں یار جو اس زعم وخود ساختگی سے نکلتے ہی نہیں کہ ان کے افکار وخیالات کی پراگندگی وکمینگی ہی کسی کی ذات کا حقیقی واصل پہلو یا رخ ہوتی ہے۔لازمی ہے کہ کئی چیزیں، ہستیاں اور شخصیات۔۔۔نیچ سوچ کے حاملین و مالکین کی تمام تر ذہنی رسائی سے کہیں بلند وبالا ہوتی ہیں۔حقیقت واقعی یُوں ہے کہ کچھ لوگ کچھ "مخصوص" لوگوں کی گھٹیا فکری استطاعت سے کہیں پار پاکیزہ ہوتے ہیں۔اور تم مجھ سے یہ چاہتی ہو سہیلی کہ ایسوں کو ان کے مقام پر آ کر جواب دیا جائے؟"

آخرش اپنی بات کا اخروی سرا ہمیشہ کی طرح اسی کی گود میں رکھتی وہ باری باری ان دونوں کو یُوں تاکنے لگی جیسے اپنی "خاموشی" پر داد چاہتی ہو۔اب یُوں ہوا کہ فقط ایک نظر اسے گھور کر ناز وہاں سے اٹھی اور سٹوڈیو میں آرام کی غرض سے ترتیب دیئے گئے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔گو کہ بات ایک بار پھر سے آئی گئی ہوگئی تھی لیکن گیتی کی بے تحاشا بے پرواہیوں کے سبب وہ کسی بھی طرح مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔

"سچ کہوں سفیر تو زندگی اس موڑ یا مقام پر لے آئی ہے کہ اب اپنوں میں چھپے بیگانے اور بیگانوں میں کسی اپنے کی پہچان ہی نہیں رہی۔کسی بھی شخص وفرد کو سوچوں تو مجھے لگتا ہے اس کے متعلق میری سمجھ ابھی ادھوری ہے۔ایک ناز ہے بس جس پر میں خود سے زیادہ یقین کرتی ہوں۔۔۔اور میرے سوا اگر کسی کو میری زندگی پر کل اختیار ہے تو وہ یہی ناز کو ہے۔"

اس کے جانے پر بڑے یاسیت بھرے لہجے میں گیتی نے سفیر کو مخاطب کیا تھا اور بغور اس کی شفاف تر آنکھیں پڑھتا وہ بھی کسی خیال میں گم ہو گیا تھا۔

"ادھوری سمجھوں کے اسی جھول میل کا نام "دنیا" ہے گیت۔۔۔اپنوں میں کبھی یوں نہیں ہوتا کہ کسی بھی بات پر دوری اختیار کر لی جائے۔اپنے تو بنا کہے اور بنا اظہار ہی۔۔۔سب کچھ سمجھتے ہیں۔" عمیق تر لہجے میں جواباً کہتا وہ جیسے خود کو یہ سب اسباق پڑھا رہا تھا۔اس کے جواب میں وہ بڑی اذیت سے مسکرائی۔

"ہمم۔۔۔بالکل سچ کہہ رہے ہو تم۔اپنوں میں کبھی یوں نہیں ہوتا کہ کسی بھی بات پر دوری اختیار کر لی جائے۔لیکن یہ دُنیا اور یہ جہاں اک حیرت کدہ ہے سفیر۔۔۔کہ اکثر اس جہاں میں من پسند چیزوں کی ترتیبات تب بدلتی ہیں جب ہمیں ان کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہو۔کچھ لوگ اور کئی عزیز پل ہماری دسترس و رسائی سے یوں نکل جاتے ہیں کہ گویا ان پر ہمارا کوئی اختیار۔۔۔کبھی تھا ہی نہیں۔"

اب کی بار وہ بھی بولی تو یوں گویا خود ی سے محوِ کلام ہو۔

زندگی اکثر ہمیں اس مقام پر لے آتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ کی گئی سب گفتگوؤں میں بھی ہم صرف خودی سے بات کرتے ہیں۔

اس کی بات پر تفہیمی انداز میں سر ہلاتا سفیر کسی گہرے خیال میں گم ہو گیا تھا اور یوں وہ دن اسی حالت میں تمام ہوا کہ اس سب مباحثہ و گفت وشنید سے وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکے تھے۔۔۔یا اپنے اپنے طور پر شاید کوئی کیا بھی تھا۔

ادھر ان کی مشقیں مکمل ہوئیں اور فلم کی عکس بندی کے باقاعدہ آغاز کے لیے تاریخ مقرر کر لی گئی اور ادھر دو طرفہ حکومتی سطح پر پاک بھارت تعلقات میں بے پناہ کشیدگی در آئی۔ ہندوستانی علاقہ پٹھان کوٹ میں واقع ائیر بیس پر ایک دہشت گردانہ کاروائی میں بھارتی آرمی کو شدید جانی و مالی نقصان سہنا پڑا اور ائیر بیس پر ہوئے اس دھماکے کی بدولت ان کی دفاعی ساکھ الگ متاثر ہوئی۔اب ہوا یوں کہ بھارتیا سرکار نے اس دفاعی ناکامی پر اپنی خفت، سبکی اور پشیمانی مٹانے کی خاطر دہشت گردانہ کاروائی کا الزام پاکستان پر لگا دیا اور ان کے پردھان منتری کی طرف سے پاکستان کو سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیوں کے ساتھ ساتھ مُسلسل جنگی بیانیہ بھی جاری کیا جانے لگا۔اس سب صورتحال سے دونوں ملکوں کی جنتا و عوام میں بھی وقتی طور پر ہی سہی لیکن باہمی تفاوت در آیا کہ دونوں طرف کے اچھے خاصے سمجھدار لوگ بھی جنگ کو بچوں کا کوئی کھیل سمجھتے ہوئے سوشل میڈیا پر طرح طرح کی دھمکیاں دینے لگے۔گیتی پر اس سارے قصہ و واقعہ کا زوال یوں آیا

کہ ایک روز سفیر کی ہمراہی میں سٹوڈیو سے نکلتے ہوئے اسے مختلف چینلز کے نمائندگان نے گھیر لیا اور اسی حوالہ و مد میں طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔

" گائتری جی ان حالات میں کہ جب آپ پاکستان میں ہیں اور اپنی پہلی پاکستانی فلم "خدا کے بھگت" کی دھواں دار کامیابی کے بعد دوسری فلم کی عکس بندی میں بھی مصروف ہونے والی ہیں، آپ کے وزیراعظم یعنی پردھان منتری کی جانب سے مُسلسل جنگ وجدل کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ جبکہ دوسری جانب اس کشیدہ تر صورتحال میں بھی پاکستانی حکومت اور ذمہ داران کا رویہ امن کا پیغام دے رہا ہے۔ اس پر آپ کیا کہیں گی؟"

تنومند اور قد آور باڈی گارڈز کے حصار میں سب صحافیوں کے سوالات کو یکسر نظر انداز کرتی وہ خاموشی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اس سوال پر اس کے قدم اپنے آپ رک گئے۔ اس کے رکنے پر بے ساختہ سفیر بھی رک گیا تھا۔ تیزی سے قدم قدم ان کے ساتھ ساتھ چلتا وہ صحافی اور باقی سب لوگ بھی ایک جھٹکے سے رکے تھے۔

" حقیقت یوُں ہے کہ جب دو ممالک کے مابین سماجی، سفارتی یا دفاعی معاملات میں کسی بھی طور حالات کشیدہ ہو جائیں تو جنگ کرنے کا احمقانہ ترین فیصلہ کسی ایک فرد یا چند ایک شخصیات کا ہوتا ہے؛ لیکن اچھے برے اس فیصلہ کو ماننا اور پھر بھگتنا بھی۔۔۔ یقیناً دونوں طرف کی نہتی عوام کو ہی پڑتا ہے۔ تو اس حوالہ سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ دو ایٹمی طاقتوں میں سے جنگ یا بدامنی کی بات جو بھی کرے گا وہ اپنی جنتا و عوام ہی کا نہیں بلکہ کل انسانیت کا دشمن ہے۔ اب چاہے یہ جنگی بیانیہ کسی کی جانب سے بھی آیا ہو لیکن میں ہر حال میں اس کی شدید مذمت کرتی ہوں۔"

فقط دو گھڑی کو ٹھہر کر اپنے ازلی مضبوط لفظوں میں بات مکمل کرتی وہ پھر سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اِس پل اُس کا دوٹوک اور نڈر لب ولہجہ یوُں بجلیوں سی کڑک کا حامل رہا تھا گویا کوئی حق کسی باطل پر گرجتا ہے۔

اس رات گائتری دیوی کے اپنے ہی ملک کے پردھان منتری پر کیے گئے اس واشگاف طنز کی ہر ایک خبرنامہ میں خوب خوب تشہیر ہوئی۔ وہ کوئی عام ہستی و فرد نہیں تھی کہ جس کی بات یا رائے کو دونوں ممالک کی عوام کی طرف سے سرسری گمان کیا جاتا۔ ایک دُنیا اس کی قدردان تھی تو ایک عالم اس کا حریف بھی تھا۔ اس کے اس بیان کو بہت سی تعریفات و تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور راتوں رات ایک بار پھر سے وہ متنازعہ ترین خبروں کی زد میں آ گئی تھی۔ خصوصاً بھارتی میڈیا کی جانب سے گیتی کے ان الفاظ کو اپنے دیش اور سرکار سے غداری تسلیم کرتے ہوئے اسے سخت سے سخت سزا دینے کی مانگیں کی جا رہی تھیں۔ حالات تھے کہ انتہائی تیزی سے شدید منفی رخ اختیار کر رہے تھے اور گائتری تھی کہ سبھی مخالفتوں کو سن کر

بھی ان سنا کرتی ہوئی بس اپنی دھن میں محو و مگن تھی۔

دُنیا اس کے مزاج کی نہیں تھی یا اس کی ذات کا ہر موسم دُنیاوی میلان و رجحان سے میل نہیں کھاتا تھا۔۔۔ بہر حال جو بھی تھا وہ گائتری کو اس جہان بھر سے بہر طور الگ کیے رکھتا تھا۔ خیر قصہ المختصر یہ کہ حالات و واقعات کی انتہائی تیزی سے بنتی بگڑتی ترتیب و بنت میں وقت کی ساری پہریں لمحہ لمحہ سرکیں اور گیتی کے گرد سازشوں کا گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا چلا گیا۔ اور مختلف اوہام و خدشات میں گھر کر دھڑک دھڑک گذرتے انہی شب و روز میں بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا کہ جب ان کی فلم کا پہلا منظر فلمایا جانا تھا۔ یہ ایک معروف تجارتی مرکز میں سجاوٹی شیشوں سے لگایا گیا بہت خوبصورت سیٹ تھا جہاں رنگ برنگی روشنیوں اور اُن شیشوں سے منعکس ہوتے مختلف عکوس کے مابین رک کر گیتی اور سفیر کو باہم کچھ رومانوی مکالمات ادا کرنے تھے۔

وہ لوگ تقریباً نو بجے شوٹنگ اسپاٹ پر پہنچے جبکہ ان کا یونٹ عوامی آمد و رفت سے قبل صبح صادق سے ہی اس منظر کو فلمائے جانے کی ابتدائی تیاریوں میں مصروف تھا۔ گیتی اور سفیر کی مشترکہ دوست ہونے کے سبب ایمان راجپوت بھی ان کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے آئی تھی اور آج کا پورا دن وہ ان کے ساتھ ہی گذارنے والی تھی۔ سفیر اور گیتی میک اپ روم میں تیار ہونے کے لیے گئے تو وہ ناز کے ساتھ پورے سیٹ پر یہاں وہاں گھومتی، ہر ایک کانچ کو چھو کر باقاعدہ محسوس کرنے لگی۔ یہ عکس بندی دیکھنے کے لیے وہ اس قدر مسرور تھی کہ اس پل اس کے گلاب تر چہرے پر کسی خوش رنگ دھنک سے زیادہ رنگ تھے۔

کچھ دیر بعد گیتی اور سفیر تیار ہو کر وہاں داخل ہوئے تو سیٹ پر موجود اک ایک شخص و فرد گویا مبہوت ہو کر ان کی خوب صورت جوڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ فلم کے منظر کی مناسبت سے سفیر نے سادہ کاٹن کا سفید کرتہ شلوار زیب تن کر رکھا تھا اور گیتی بھی سفید ریشمی فراک میں تھی کہ جس کا طویل جالی دار دوپٹہ اس کے پیچھے فرش پر جا بجا بکھرا ہوا تھا۔

"تم دونوں ایک جیسے لگ رہے ہو۔۔۔ بہت حسین اور باکمال۔۔۔"

انہیں دیکھ کر تیزی سے ان کے قریب آتے ہوئے ایمان نے خوش دلی سے کہا تو گیتی پوری جان سے مسکرا دی تھی۔

"بہت شکریہ ایمان۔۔۔ بس دیکھتی جاؤ کہ ہم کیا غضب ڈھانے والے ہیں یہاں۔۔۔ بڑا دلچسپ منظر ہے۔ سچی۔۔۔" نہایت نرم خوئی سے کہتے ہوئے اس نے اس کا گال تھپتھپایا اور ابرو اچکا کر ناز کی طرف دیکھا تھا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔"

عجب محبت سے کہتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کی انگلی سے اپنی آنکھ کا تھوڑا کاجل اتارا اور اس کی گردن سے بال ہٹا کر وہاں نظر کا ٹیکا لگا دیا۔

اسی دوران رفیق نواز نے ان دونوں کو اپنی مخصوص جگہ پر آنے کا کہا تا کہ عکس بندی کا آغاز ہو سکے تو انہیں الوداعی ہاتھ ہلاتے وہ دونوں شیشوں کے عین وسط میں جا رکے۔اب ماحول یُوں تھا کہ "ڈائریکٹرز کیپ" پہنے، ایک ہاتھ میں مائیک تھامے مانیٹر کے عین سامنے بیٹھا رفیق نواز کیمرہ مین کو بھی بالکل مستعد رہنے کا اشارہ کر رہا تھا اور آمنے سامنے کھڑے سفیر اور گیتی ایک دوسرے کو بہت اعتماد سے دیکھ رہے تھے۔گو کہ سفیر کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ذرا بھر بھی گھبرایا ہوا نہیں ہے لیکن پھر بھی جھیل تر نگاہوں میں تسلیوں کے کئی حروف بھر کر گیتی نے بہت حوصلہ افزا انداز میں اس کا ہاتھ دبایا تھا۔ جواباً وہ ہولے سے مسکرا دیا اور یہی وہ پل تھا جب رفیق نواز اونچی آواز میں "لائٹس، کیمرہ۔۔۔اور ایکشن" چلایا تھا۔

"یُوں کھوجتی ہوئی نگاہوں سے کیا تاکتے ہو سجن؟ ان آنکھوں میں تمہیں خود کے سوا تو کُچھ نہ ملے گا۔۔۔"

ایک قدم آگے بڑھ کر سفیر کی آنکھیں پڑھتے ہوئے گائتری نے پہلا مکالمہ بھرپور جذب سے ادا کیا تھا۔اِس کا انداز اُس فدائی داسی کا سا تھا جو محبوب کی چاہت میں آنکھوں کے راستے دل بہا چکی ہو۔

سیٹ پر مہیب خاموشی تھی۔۔۔اور گیتی کے ساتھ ساتھ اک ایک شخص وفر دسفیر کے جواب کا منتظر تھا۔

"دیکھتا ہوں کہ لازم ہے تمہارے وجود پر ایک رنگ دھنک کا بھی ہو۔۔۔یُوں سفید ملبوس میں تو یہ آنکھیں بے وجہ سی اداس لگتی ہیں۔"

محبت پاش آنکھوں سے اس کے اک ایک نقشِ رخ پر دل نچھاور کرتا وہ انتہائی لگاوٹ سے اس کے بالکل قریب ہوا اور کمر کے گرد ایک بازو حمائل کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی آنکھوں کو چھوا تھا۔اس کا انداز یُوں وارفتگی لیے ہوئے تھا کہ آس پاس موجود ہر شخص حقیقتاً کہیں کھو سا گیا۔سب کے چہروں پر دبا دبا سا جوش جھلکنے لگا تھا اور ایمان تو اس قدر سرشار ہوئی کہ اس نے بمشکل خود کو سیٹی مارنے سے روکا تھا۔

"تمہارا ساتھ مل جائے تو آنکھوں کی ان اُداسیوں میں بھی میں بے وجہ مُسکرا دوں گی، اور ہولی کے بنا بھی کبھی میرے لیے۔۔۔تم تھالیوں میں رنگ لانا۔"

آنکھیں جھکا کر وہ یُوں دلآویزی سے گویا ہوئی کہ آس پاس منعکس ہوتے سارے رنگ شرم وحیا کی مانند اس کے

فسوں گر چہرے پر ٹک گئے۔ آس پاس طاری وہاں سارا عالم ھو کا تھا اور یہی وہ پل تھا جب ان کی اداکاری و جزئیات سے متاثر ہو کر "ڈن۔۔۔" کہتے ہوئے رفیق نواز تالیاں بجاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُدھر سفیر سے الگ ہو کر گیت نے نہایت فخریہ انداز میں اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور پھر اسے ساتھ لیے تیزی سے مانیٹر سکرین کے سامنے آ کر "عکس بندی" ملاحظہ کرنے لگی۔

"ویلڈن سفیر۔۔۔ تم نے تو کمال کر دیا یار۔" رفیق نواز نے بھی اسے شاباش دیتے ہوئے گلے سے لگا لیا تھا کیونکہ اس کی یہ اوائل کارکردگی ہی اسے بے حد متاثر کن لگی تھی۔

اور پھر جب اسی منظر کے اگلے مکالمہ جات کی ریکارڈنگ کے لیے گیتی کا میک اپ "فریش" کیا جانے لگا تو سفیر سب سے الگ ہو کر ایمان کے پاس چلا آیا۔

"تم بور تو نہیں ہوئیں؟ لگتا ہے کہیں گم سم ہو۔۔۔"

دوسری جانب رخ کیے وہ کانچ کی لڑیوں کو چھو رہی تھی جب وہ اس کے بالکل پاس ہو کر بولا تھا۔ اس کی خوشبو پا کر جواباً وہ نہایت تقویت سے مسکرادی تھی۔

"نہیں۔۔۔ ہرگز بھی نہیں۔ درحقیقت مجھے تو لطف آ رہا ہے۔ آس پاس بکھرا یہ سارا رنگ و نور کسی خوش رنگ خواب کی تکمیل کا سا لگتا ہے۔ نہیں۔۔۔؟"

انتہائی شوق و لگاوٹ سے جواب دیتے ہوئے آخرش اسے نے سوالیہ انداز میں "نہیں۔۔۔" کہا تو اس کے پر مسرت چہرے سے نظریں ہٹا کر سفیر نے پورے ماحول کا طائرانہ سا جائزہ لیا تھا۔

"ہمم۔۔۔ صحیح کہہ رہی ہو تم۔ ہے تو یہ کسی خواب سا۔۔۔ لیکن اس میں کانچ بہت ہے۔"

گھمبیر لہجہ میں کہتا وہ اس کے اور قریب ہوا تھا۔

"اور جس خواب میں اتنا کانچ شامل ہوناں۔۔۔ ہر پل اس کے ٹوٹ جانے کا خوف لاحق رہتا ہے۔"

اس کی روشن تر آنکھیں پڑھتا وہ جیسے اسے تعبیروں سے ڈرانے لگا تھا۔ اس پل کے لہجہ میں جانے کیا تھا کہ ایمان کو یکا یک مصطفین شجاع کی یاد آ گئی۔ خوابوں سے متعلق اس کی ہر گفتگو کے جواب میں وہ اسی کے جیسے عذر تراشا کرتا تھا۔

"کچھ لوگ جانے کیوں ایک سی گفتگو کرتے ہیں۔۔۔"

وہ بڑبڑائی تو سفیر نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا کہا تم نے۔۔۔؟ میں سمجھ نہیں سکا۔" قدرے جھک کر اس کا چہرہ تاکتے ہوئے وہ سراپا سوال ہوا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔۔۔تم جاؤ واپس۔تمہارا منظر تمہیں بلا رہا ہے۔"

دور سے تیار ہو کر آتی گیتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے اسے جانے کا کہا تو فقط ایک نظر اسے اور پھر اس سے آگے کچھ فاصلے پر کھڑی، فون سنتی ناز کو دیکھتا وہ یہیں گفتگو ادھوری چھوڑ کر واپس پلٹ گیا تھا۔

اب صورتحال یوں تھی کہ نپے تلے قدم اٹھاتا سفیر، گیتی کی جانب بڑھ رہا تھا اور لبوں پر دلکش مسکان سجائے گیت اسی کی جانب آ رہی تھی۔ان دونوں کو شیشوں سے بنے اس سیٹ کے عین وسط میں باہم ملنا تھا لیکن۔۔۔لیکن اس سے قبل ہی اپنے دائیں جانب کسی نجی کمپنی کی وردی پہنے ہوئے ایک لڑکے کو فرش کی صفائی کرتے دیکھ کر سفیر بے طرح چونک گیا تھا۔اس کے چونکنے کا سبب اس لڑکے کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ایک پر عزم سی چمک تھی جو کہ گیتی کو اپنے بالکل سامنے پا کر نمودار ہوئی تھی۔یکایک سفیر کو کسی انتہائی گڑبڑ کا احساس ہوا۔جس قدر بھی اس کا ذہن کام کیا وہ تیزی سے چند قدم واپس پلٹا اور ایمان سے مخاطب ہوا۔

"یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔۔۔کچھ بھی ہو جائے تم ناز کو براہ راست اس طرف آنے سے روکنا ایمان۔سمجھ گئی ہو ناں۔۔۔؟"

وہ یوں جلدی جلدی میں تلقین کر رہا تھا کہ ایمان کو کچھ سمجھ آیا یا نہیں لیکن اس نے سر کو بڑی شدت سے اثبات میں ہلا دیا تھا۔اور اسے سمجھا بجھا کر جونہی وہ واپس پلٹا ادھر بھی کایا پلٹ چکی تھی۔اس نے دیکھا کہ اچانک کلینزر ایک طرف دھکیل کر اس صفائی والے لڑکے نے اپنی جیب سے سائلنسر لگا پستول نکالا اور گیتی کی طرف رخ کر کے یکے بعد دیگرے چار فائر کر دیئے۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ چاروں کی چاروں گولیاں گیتی کو کہیں سینہ تو کہیں پیٹ میں لگی تھیں اور مسکراتے لبوں پر بھی آنکھوں میں جہاں بھر کر حیرت بھر کر اس نے دونوں طرف ہوا میں یوں ہاتھ پھیلائے تھے گویا پوچھ رہی ہو "یہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے۔۔۔؟"

کائنات کا اک ایک ذرہ و جز بھلائے سفیر دھیرے دھیرے نیچے گرتی گیتی کی جانب بھاگ گیا تھا اور اس منظر کو دیکھ کر سب کچھ فراموش کیے ایمان تیزی سے آگے بڑھ کر اسی جانب بھاگتی ناز کو روکنے لگی تھی۔دونوں بازوؤں میں نہایت سختی سے جکڑ کر اس نے بمشکل اسے قابو کیا اور ایک چوڑے ستون کے پیچھے کرتے ہوئے گویا قاتل سے چھپا لیا۔

ادھر اب تلک یہی تھا کہ آس پاس رکھے گئے کانچ سے مُسلسل ٹکراتی اور شیشے کی لڑیوں پر شکستہ ہتھیلیوں سے گرفت کرتی گیت نیچے گرنے سے بچنے کی کاوشوں میں تھی اور سفیر تھا کہ اسے سہارنے کے لیے پوری شدتوں سے بھاگ رہا تھا۔ بالآخر جب ساری ہمتیں ہار کر خون میں لت پت ہو چکی گیت اکھڑتی ہوئی سانسوں میں فرش پر پشت کے بل گرنے لگی تو پوری توانائیاں صرف کر کے اس سے فقط چار قدم دور پہنچ چکے سفیر نے دونوں بازو کھول کر جست لگائی اور مرمریں فرش پر پھسلتے ہوئے گیت کا وجود ایک جھٹکے سے سہار لیا۔ گیتی کا ماتھا اور پورا شریر پسینے سے شرابور ہو گیا تھا اور یہی حال سفیر کا بھی تھا۔

پیچھے سیٹ پہ محافظوں نے کب جوابی کارروائی کرتے ہوئے اس حملہ آور لڑکے کو بھی مار گرایا اور کب بھگدڑ سے سنبھل کر ہر شخص ان کی طرف متوجہ ہوا انہیں اس کی کوئی ہوش و خبر نہیں تھی۔

" آہ۔۔۔سف۔۔۔سفیر۔۔۔دیکھو تو میرے وجود پر۔۔۔اب ایک رنگ دھنک کا بھی ہے۔ تم کہہ رہے تھے ناں۔۔۔کہ۔۔۔کہ یُوں۔۔۔میری آنکھیں اداس لگتی ہیں۔" اس کے بازوؤں پر گر کر پہلے جھٹکے سے سنبھلتی گیت نے فقط یہی کہا تو سفیر کی آنکھوں میں دبے اشک کسی جھرنے کی مانند پھوٹ پڑے۔

"ایسے مت کہو گیت۔۔۔یہ سب کیا ہو گیا؟ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم ابھی تمہیں ہاسپٹل لے کے چلتے ہیں۔"

اسے اپنے ساتھ بھینچتا وہ بھرپور کرب سے بولا اور پھر اس کی کوئی بات سنے بنا رخ موڑ کر پوری قوت سے چلایا۔

" کوئی ایمبولینس کو کال کرو پلیز۔۔۔اور فرسٹ ایڈ کو یہاں بھیجو۔ گیتی کو گولیاں لگی ہیں۔"

اس کا یُوں پکارنا تھا کہ رفیق نواز سمیت بہت سے دیگر لوگ بھی اس حملہ آور کی موت کی تصدیق کے بعد ان تک پہنچ گئے۔ رفیق نواز کو آتے دیکھا تو گائتری بڑی اذیت میں ہو کر بھی مسکرا دی تھی۔ رفیق نواز نے کچھ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ وہ بڑے اضطراب سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"اور اب کچھ نہیں سر۔۔۔بس کیمرہ آن کروائیں۔ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

اور اس کی آواز پر رفیق نواز کا حکم ملنے سے پیشتر ہی کیمرہ مین نے کیمرہ آن کا سگنل دے دیا تھا۔ یہی وہ پل تھا جب ہانپتی کانپتی ایمان اور گرتی پڑتی نازنین بھی زخمی وجود لے کر سفیر کے بازوؤں میں لیٹی گائتری دیوی کے پاس پہنچی تھیں۔

"ایمبولینس بلاؤ کوئی بھگوان کے واسطے۔۔۔میری گیت مر رہی ہے یہاں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا گیتو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی یار۔"

چلا چلا کر بات مکمل کرتی ناز وہیں دوسری جانب سے بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں منتقل کرتے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔ اس پل نازنین کے چہرے سے وہ وہ پریشانی ہویدا تھی گویا کائنات تباہ ہوگئی ہو۔

"ناں سہیلی ناں۔۔۔ یہ جیون بس یہیں تک تھا۔"

ایک درد بھرا سانس لے کر اس نے فرسٹ ایڈ باکس تھامے ابھی ابھی وہاں آنے والے لڑکے کو بھی اشارے سے خود سے دور رہنے کا کہا اور جواباً انتہائی حیرت سے اسے تاکتا وہ اپنی جگہ پر جم سا گیا تھا۔

اب گیتی نے فقط ایک نگاہ باری باری ان سب کی طرف دیکھا اور اپنے سرہانے بیٹھ کر مُسلسل آنسو بہاتی ایمان کا ہاتھ پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"ہاں یار۔۔۔ یہ کیا ہوگیا تمہیں۔۔۔ ہم خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔"

بے قراری سے اس کا ہاتھ پکڑتی ایمان سسک اٹھی تھی۔ جواباً اس نے نہایت تشفی بخش انداز میں اس کا ہاتھ دبایا اور درد سے کراہتے ہوئے بولی۔

"بس جا رہی ہوں میں۔۔۔ اس دنیا، اس "اذیت خانے" سے پار کہیں۔ اس قصے میں میرا کردار فقط یہیں تک تھا ایمان۔۔۔" اس نے کہنا شروع کیا اور وہاں پر روتے اک ایک شخص و فرد کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں۔ رفیق نواز کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ کئی ملال اتر رہے تھے۔

"میرے مرنے پر کوئی نوحہ نہیں کہنا، ہو سکے تو تم کہانی لکھنا۔ تا کہ آئندگان اس کہانی سے نصوح پائیں۔۔۔ تا کہ جان سکیں لوگ کہ دین، مذہب، یا دھرم کے نام پر کٹنے والے سب گلے صرف انسانیت کے تھے۔ میری کہانی لکھنا تا کہ لوگوں کو خبر ہو سکے کہ ملکوں کے تفرق سے بھی ضروری نہیں ہوتا کہ باہم صرف نفرت کی جائے۔"

آخری دموں پر اس نے بہت دھیرے سے پیغام دیا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ سے ناز کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

ناز نے چہرہ اٹھا کر ایک زوردار چیخ بلند کی جبکہ ایمان کو سکتہ ہوگیا تھا۔ سفیر نے بہت دھیرج سے گیتی کا مردہ وجود ناز کی گود سے لے کر فرش پر لٹایا اور قریب کھڑے ایک سپاٹ بوائے کو دور ایک اسٹینڈ پر لٹکی سفید چادر لانے کا کہا تا کہ اس کا وجود ڈھک سکے۔

وہاں کرب تھا۔۔۔ آہ و بکا تھی اور تھا تو صرف واویلا۔

وہ جسے گگن کو چھونا تھا وہ گگن سے پار ہو گئی تھی۔

ہاں۔۔۔ یہ بالکل حقیقت تھی کہ محبتوں، چاہتوں اور الفتوں کی امین وہ۔۔۔ گائتری دیوی مر گئی تھی۔

حوادث کہیں نہ کہیں اسی دُنیا میں رونما ہوتے ہیں۔ ان سے آشنائی کی خاطر کوئی جہان نہیں بدلنے پڑتے۔ آپ بھلے کسی من پسند موڑ، مقام یا اونچائی پر ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ اتفاقات کو رد کر سکتے ہی نہیں۔

انتہائی دلگرفتگی سے لپٹا سفیر ایمبولینس میں سفید چادر تلے ڈھکے گیتی کے مردہ وجود پر نگاہیں گاڑے ساکن کھڑا تھا اور دونوں بازوؤں کے حصار میں نازنین کو لیے ایک طرف کھڑی ایمان مُسلسل نیر بہا رہی تھی۔ پاکستان میں اس واقعہ کی ابتدائی تفتیش اور ضروری کارروائی کے بعد گیتی کی میت کو بھارتیا سرکار کے حوالے کیا جا رہا تھا اور اس وقت وہ لوگ ایک قافلہ کی صورت میں میت کے ساتھ واہگہ بارڈر پر آئے تھے کہ جہاں سے یہ منتقلی ہونا طے پایا تھا۔

ایمبولینس پاکستانی سرے پر دفاعی لکیر کی خارجی حدود میں کھڑی تھی اور دونوں طرف عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جوان سوگوار لمحوں میں منہ لپیٹے یکسر لب بستہ و خاموش کھڑا تھا۔

"میں تم سے وعدہ کرتی ہوں ناز کہ جس روز میں واپس گئی مجھے اک عالم۔۔۔ اک جہان۔۔۔ رک رک کر دیکھے گا۔ میرے استقبال کے لیے ایک دُنیا آئے گی۔ ناں صرف وہاں۔۔۔ بلکہ یہاں سے بھی لوگ مجھے نہایت محبت و احترام سے رخصت کریں گے۔ میں ثابت کروں گی کہ گائتری دیوی پاکستان اور ہندوستان۔۔۔ دوملکوں کی بیٹی ہے۔"

سرحد پر دونوں طرف نگاہ گھماتے ہوئے ناز کو بھی بہت جوش و جذبہ سے بولے گئے گیت کے یہ الفاظ یاد آئے اور اس کی آنکھوں میں جم چکا سیل پھر سے رواں ہونے لگا۔ اسی پل رفیق نواز نے ایمبولینس کے دروازے سے سفیر کو دونوں شانوں سے تھام کر ہٹایا تو قدم قدم چلتا وہ ناز کے عین سامنے آن رکا۔

"ہم گیتی کی محبت کا حق ادا نہیں کر سکتے ناز۔۔۔ اسے یُوں بھی رخصت کرنا پڑ سکتا ہے کبھی سوچا تک نہ تھا۔"

اتنا کہہ کر اس کے رنجیدہ چہرے کو کھوجتا وہ ایک پل کو رکا تو جواباً ناز فقط ایک طویل سانس بھر کر رہ گئی تھی۔ اور اس کی خامشی سے کئی کئی مفاہیم چنتا وہ مزید گویا ہوا۔

"حالات کی کشیدگی کے سبب ویزہ نہیں ملا ورنہ لازم تھا کہ ہم تمہارے ساتھ چلتے۔ میں جانتا ہوں ناز کہ تم پاکستان نہیں آنا چاہتی تھیں، تمہارے دل میں کئی خدشات و دھڑکات تھے۔ اور مجھے بخوبی علم ہے کہ تمہیں یہاں بہت سے دکھ ملے لیکن......۔ لیکن ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا ناز۔ کیونکہ دو طرفہ سرحدوں کے باوجود اس ملک کے کچھ باسیوں کے

من میں بھارتی عوام کے لیے بے تحاشا پیار بسا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو فقط امن کے داعی ہیں۔۔۔ سکون چاہتے ہیں۔ بالکل۔۔۔ بالکل گائتری کی طرح ناز، جو فقط اسی محبت کو سمجھانے اور بتانے کے لیے جان تک سے چلی گئی ہے۔"

انتہائی شکستگی سے دھیرے دھیرے بات مکمل کرتے ہوئے آخرش اس کا لہجہ پورا کا پورا بھیگ گیا تو ایمان سے چھوٹ کر دو قدم اس کی جانب بڑھتی ناز آنسوؤں کے ساتھ بولی تھی۔

"مجھے اب جانا ہوگا سفیر۔۔۔ وہ دیکھو وہاں سے سب بلاتے ہیں۔ اور۔۔۔ اور تم کسی حوالے سے کوئی فکر نہیں کرو۔ وہاں جا کر میں پاکستان مخالف کوئی بھی بیانیہ نہیں دینے والی۔۔۔ کیونکہ امن و چاہ اور محبت کا جو بیج اس میں پنپتا تھا وہی وہ مجھ میں بو گئی ہے۔"

اس کی بات پر فقط ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ان دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور ان کی المیہ کیفیات سمجھتے ہوئے واپس ایمان کے گلے لگتی وہ اجازت طلب ہوئی تھی۔

"تم دونوں بہت اچھے ہو۔۔۔ جیون میں کبھی ممکن ہوا تو ہم پھر سے ملیں گے۔ الوداع۔۔۔"

اور ان سادہ جملوں سے پرے پرے اشکوں کی زبان میں بھی بہت کچھ کہتی وہ ایمبولینس کی جانب بڑھ گئی تھی کہ جہاں سے اسے اب اپنی ملکی حدود میں داخل ہونا تھا۔ جونہی ایمبولینس میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کیا تھا وہ لحظہ لحظہ دور ہونے لگی تھی۔ سب کے سب نمناک آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ سرحد کا مرکزی دروازہ کھلا اور وہ اپنے ملک داخل ہوگئی۔ ڈبڈبائی نظروں سے سفیر اور ایمان نے دیکھا کہ دوسری جانب پاکستانی ایمبولینس روک کر گائتری دیوی کے مردہ وجود کو اب اپنی ایمبولینس میں منتقل کیا جا رہا تھا۔

"اکثر اس جہاں میں من پسند چیزوں کی ترتیبات تب بدلتی ہیں جب ہمیں ان کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہو۔ کچھ لوگ اور کئی عزیز پل ہماری دسترس و رسائی سے یوں نکل جاتے ہیں کہ گویا ان پر ہمارا کوئی اختیار۔۔۔ کبھی تھا ہی نہیں۔" سفیر کو اس پل گیتی کے لبوں سے آزاد ہوئے یہ حرف و لفظ بہت شدت سے یاد آئے اور ایک سرد آہ بھر کر بہت اذیت سے جڑتا ہوا وہ واپس پلٹ گیا۔ ایمان نے ایک الوداعی نگاہ سرحد پار گائتری دیوی کے استقبالیہ جلوس پر ڈالی اور دھیرے سے پلٹتی ہوئی سفیر کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ کھنگالیں تو یہاں ایسے ہزاروں اندھے قتل ملیں گے جن کے قاتلین کبھی بے نقاب اور گرفتار نہیں ہو سکے۔ پاکستان سے لیاقت علی خان اور بینظیر بھٹو جبکہ بھارت سے اندرا گاندھی سمیت دیگر کئی اہم شخصیات

یُوں جبرِ دوراں کا شکار ہوئیں کہ لوگ بس ان کے قتل کے محرکات واسباب پر غور یا گفتگو ہی کرتے رہ گئے لیکن سالوں گذرے کہ ان کے "حقیقی قاتلین" کا نام ونشان تک نہ ملا۔ گائتری دیوی کا قتل بھی ایسا ہی ایک قصہ وداستان بننے والا تھا کہ جس کے محرکات واسباب واضح ہونے کے باوجود، پس پردہ موجود حقیقی قاتلین کبھی نہیں پکڑے جانے تھے۔ ابتدائی تفتیش وکھوج سے فقط یہی پتا چل سکا تھا کہ گیتی کا قاتل ایک افغانی تھا اور اسے بس ایک خاص مقصد یعنی گیتی کے خاتمے کے تحت غیر قانونی طور پر سرحد پار کروا کر پاکستان لایا گیا تھا۔ اس واقعہ کے حقیقی تانے بانے بن کر لائے جاتے تو گیتی کے قتل کی ساری کڑیاں بھارت سے جا کر ملتی تھیں، یعنی انتہا پسند ہندوؤں نے پاکستان میں دہشت گردانہ کاروائی سے گائتری دیوی کو قتل کرتے ہوئے نہ صرف اپنا انتقام لیا تھا بلکہ اپنے بکاؤ میڈیا چینلز کے ذریعے چیخ چیخ کر وہ لوگ اب بین الاقوامی سطح پر پاکستان کو ایک "غیر محفوظ" ملک بھی قرار دے رہے تھے۔ یہ سب ڈرامہ کوئی نیا نہیں تھا۔ بھارت کی ازل سے عادت ہے کہ پاکستان پر دشنام طرازی کرنی ہو تو وہ اپنے ہی ملک میں دہشت گردی کروا کر الزام پاکستان پر دھر دیتا ہے۔ خصوصاً الیکشن دورانیہ میں ایسے گھٹیا حربہ جات عام استعمال کیے جاتے ہیں کہ اپنے ہی دیش میں مختلف دہشت گردانہ سرگرمیوں کو ہوا دے کر، پاکستان کو خواہ مخواہ ہی سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور یُوں "جنگی کارڈ" کھیلتے ہوئے جنتا کی ہمدردی سمیٹ کر الیکشنز میں جیت کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

ان سارے آنکڑوں یا حساب کھاتوں سے مبرا و ماورا یہ پہلو سب سے جاں گسل تھا کہ محرکات بھلے جو بھی رہے ہوں لیکن اس ساری منفیت میں ایک محبت بھرا دل ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ گائتری دیوی مر گئی تھی اور اس کے بعد دونوں ملکوں کی تفتیشیں چاہے جو بھی نتائج دیتیں اسے کسی طور واپس نہیں آنا تھا۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جہاں میں۔۔۔ کہ جو تب بچھڑتے ہیں ہم سے کہ جب دن سارے سنورنے والے ہوں۔

حالات پے در پے کچھ اس طرح سے رہے کہ نظامِ دُنیا جاری تھا لیکن سفیر کے لیے "حرکت" گویا رک سی گئی تھی۔ پہلے دوستوں سے یُوں تار تار ہو کر بچھڑنے کا پچھتاوا اور اب گیتی کی اچانک موت۔۔۔ اس کے لیے یہ سب کسی سانحہ سے کم نہیں تھا۔ اب کی بار اس نے اس قدر صدمہ لیا کہ ساری مصروفیات ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس کے ذاتی اور گھریلو رابطہ نمبر پر اس کے دفتر سے منسلک مختلف جان پہچان والے افراد واشخاص اور کئی چینلز سے وابستہ بڑے نامور صحافیوں کی کالز کا تانتا بندھا ہوا تھا جو کہ اس سے گائتری دیوی کی موت کی بابت کئی کئی سوال کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ تھا کہ ہر کسی کی کھوج سے یکسر اکتایا بلکہ ستایا ہوا خود کو فقط خودی تک محدود کیے اپنے گھر میں ٹکا تھا۔ پولیس کو ابتدائی

بیانات جمع کروانے کے بعد وہ اس طرح سے ڈنیا سے بیزار ہو گیا کہ کئی دن گذرنے کے باوجود ایمان راجپوت یا مریم جہانگیر سے بھی دوبارہ ملاقات نہیں کر سکا۔ وہ دن میں اسے کئی کئی کالز کرتی تھیں لیکن اپنے کمرے میں بڑی بے چینی سے ادھر ادھر گھومتا وہ ایک پل کو رک کر موبائل سکرین پر ان کے نام جگمگاتے دیکھتا اور پھر نظرانداز کرتے ہوئے وہی پہلے کی سی بے چینیوں میں یہاں وہاں گھومنے لگتا۔ وہ کسی سے کوئی بھی گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن کب تک نہیں کرتا۔۔۔؟ چند دن گذرے، وقت سرکا اور کیفیات گھلیں۔۔۔ کہ اس نے باری باری ان دونوں سے بات کر لی تھی۔

" میں بہت معذرت خواہ ہوں مریم کہ نا چاہتے ہوئے بھی مجھے اپنی کہانی، اپنے مرکز سے چھوٹ کر کسی اور کہانی سے جڑنا پڑا تھا۔ اور وہ بھی میں اپنی کہانی سے مکمل غافل نہیں رہا ہوں۔ مصطفین کی تلاش مُسلسل جاری ہے اور تم دیکھنا کہ عنقریب میں اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔" بڑی شرمساری سے لپٹ کر وہ بہت دھیما دھیما بول رہا تھا اور دوسری جانب لب کچلتے ہوئے حرف حرف اسے سنتی مریم نے، پاگل خانہ لاہور کے مرکزی احاطہ میں رک کر، دور ایک کھڑکی سے لگی اداس اداس سی ثومیہ شاہجہان کی طرف دیکھا تھا۔

" کوئی بات نہیں سفیر۔۔۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ اپنی زیست کہانی میں ہم فقط خود سے نہیں جڑتے۔ کئی اور قصائص ہوتے ہیں کہ جو ہماری معاونت یا شمولیت کے بنا، شاید ادھورے گنے جائیں۔ میں خبروں میں سب کچھ دیکھ اور سن چکی ہوں۔۔۔ اور مجھے گیتی کی موت کا بہت افسوس ہے۔ یقیناً وہ ایک منفرد کردار تھی جو دو ملکی محبت میں اپنی جان بھی دے گئی۔ لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد تم اس حادثے سے سنبھلو اور اپنی کہانی میں لوٹ آؤ۔ ہاں یاد رہے سفیر کہ کہیں کھڑکیوں سے جھانکتے دو سوگوار نین، بڑی شدتوں سے تمہاری راہ تاکتے ہیں۔ ان کو بھول مت جانا کہ ان میں زندگی کی رمق صرف وفقط۔۔۔ تم جگاؤ گے۔" آواز کے دلکش زیر و بم میں بات مکمل کرتے ہوئے آخرش اس کا لہجہ قدرے بھیگ سا گیا تو سفیر کو یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہا کہ وہ اس وقت ان " دو سوگوار نینوں " کو باقاعدہ دیکھ رہی ہے اور وہ نین یقیناً ثومیہ شاہجہان کے ہیں۔

" ہاں۔۔۔ میں جلد آرہا ہوں اور اس بار مصطفین کے ساتھ آؤں گا ان شاء اللہ۔۔۔"

اس سے زیادہ خود کو یقین دلانے کے سے انداز میں اس نے فقط یہی عہد پھر سے دہرا دیا تو ایک مبہم سا ہنکارا ابھر کر، نہایت دھیمے سروں میں مریم نے اسے " خدا حافظ " کہہ دیا تھا۔

اس کے بعد اس نے بلا تاخیر ایمان راجپوت کا نمبر ملایا تھا۔ وہ اس وقت اپنے گھر کی اوپری منزل پر بیرونی راہداری

میں انتہائی اداسی سے ٹہل رہی تھی اور بے دلی سے موبائل سکرین پر نگاہ کرتے ہوئے جونہی اس نے سفیر احمد کا نام جگمگاتے دیکھا اس کا چہرہ کئی کئی حیرتوں کا مسکن بن گیا تھا۔

"ہیلو سفیر۔۔۔کیا واقعی یہ تم ہو؟ مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا؟ آہ۔۔۔کہاں ہو باس؟ کوئی خیر خبر ہی نہیں۔ پتا ہے کتنی کالز کیں میں نے؟ پتا ہے کس قدر پریشان تھی میں؟ اور اب تو میں سوچنے لگی تھی کہ۔۔۔"

کال اٹھاتے ساتھ ہی جو اس نے بنا تکان بولنا شروع کیا تو اس کی چیخ نما جوشیلی آوازیں سن کر ایک پل کو سفیر نے موبائل اپنے کان سے دور کر لیا اور پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تھا۔

"ارے۔۔۔ارے۔۔۔ارے دم تو لو محترمہ۔ کہیں نہیں گیا یہیں ہوں میں۔۔۔اور تم سے بھاگ کر بھلا کہیں جا سکا ہوں آج تک؟"

اور اس کی ذو معنی گفتگو میں پنہاں مفاہیم اخذ کرتے ہوئے یکا یک اس کی آنکھوں کے سامنے، شاہی قلعہ و بادشاہی مسجد کے بہت سے مناظر ایک ساتھ گھومے اور وہ یکلخت خاموش ہو گئی تھی۔ یعنی اب سفیر بخوبی جانتا تھا کہ بے تحاشا بولتی ہوئی ایمان راجپوت کو بالکل چپ کیسے کروانا ہے؟

"اچھا سنو۔۔۔کال بند کر کے میں اپنے گھر کا پتا بھیج رہا ہوں، اگر مناسب سمجھو تو کل تم آ جاؤ۔ مصطفین کی تلاش کے حوالہ سے تم سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔ باہر کہیں ابھی اس لیے نہیں مل سکتا کہ پھر میڈیا والے آس پاس تماشا لگا دیتے ہیں۔"

اسے خاموش پا کر اس نے اپنا مدعا و عرض بیان کیا تو اب تک ایک پاؤں پر کھڑی ہو کر دوسرے پاؤں سے اپنے سامنے زمین پر نصف دائرے بناتی ایمان راجپوت کا ایک دائرہ نصف سے بھی نصف رہ گیا تھا۔ اس کا اسے یوں اپنے گھر بلانا اس کے لیے کوئی عام بات نہیں تھی۔ اس کا چہرہ دھنک رنگ ہو گیا تھا۔

"اچھا۔۔۔پتا بھیج دو اور ذرا جلدی۔۔۔"

وفورِ شوق سے مُسکراتے ہوئے اس نے فقط یہی کہا اور کال کاٹ کر نچلی منزل کو لے جاتے زینوں کی جانب بھاگ گئی۔ اس کا طویل نارنجی رنگ دوپٹہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے پیچھے پیچھے فرش پر پھسل رہا تھا۔

اور اسے آنے کا کہہ کر اس کے ارادوں سے بے خبر سفیر احمد لمبی تان کر سو گیا تھا۔

یہ سہ پہر ڈھل کر جا بجا پھیلتے ہوئے، شام کے دھندلکوں کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر منصور عالم کے گھر کے عین سامنے ایک

ٹیکسی رکی اور نہایت اعتماد سے اترتی ہوئی ایمان راجپوت نے ایک نظر دو منزلہ عمارت کو دیکھ کر کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی کے رخصت ہونے پر نپے تلے انداز میں دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔ گھنٹی بجانے کے بعد اس نے یُونہی اپنا چہرہ تھپتھپایا اور سر پر سلیقے سے جمے دوپٹے کو اور کس کر جماتے ہوئے گویا کسی جھجک کا شکار بھی نظر آئی۔ ادھر صحن میں یہاں وہاں چہل قدمی کرتے ڈاکٹر منصور عالم اور ذکیہ خاتون نے گھنٹی کی یہ آواز سنی تو اپنی زوجہ کو وہیں روک کر یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر منصور عالم دروازے کی جانب بڑھے۔

"اس وقت کون آسکتا ہے؟ خیر میں دیکھتا ہوں۔"

اور ان کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے کر، دروازے کے قریب ہونے کے سبب غیر محسوس انداز میں ذکیہ خاتون بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دی تھیں۔ دروازہ کھول کر وہ جونہی باہر نکلے تو ایک خوب صورت اور طرح دار لڑکی کو کھڑے پا کر ان کی آنکھوں میں کئی کئی سوال ابھرے۔ وہ ان کے لیے یکسر اجنبی تھی اور اس کا با اعتماد انداز بتا تا تھا کہ وہ کوئی سیلز گرل بھی ہرگز نہیں ہے۔

"السلام علیکم۔۔۔ میں ایمان راجپوت ہوں انکل۔۔۔ سفیر احمد کی دوست۔ اور مجھے سفیر احمد سے ملنا ہے۔ وہ گھر ہے کیا؟" نہایت ادب سے سلام کرتے ہوئے ایمان نے ان کی آنکھوں میں ابھرتے وہ سب سوالات پڑھے اور فوراً سے پیشتر اپنا تعارف کرواتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بھی بتا دیا۔

اس کی بات پر ان کے چہرے پر کئی رنگ اترے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سفیر کو تلاشتے ہوئے اس کا کوئی دوست ان کے گھر تک آیا ہو اور وہ بھی ایک لڑکی۔۔۔ جو بلا کی حسین تھی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ جی جی بیٹا وہ گھر پر ہے۔ آپ تشریف لائیے۔ خوش آمدید۔۔۔"

خوشدلی سے جواباً کہتے ہوئے انہوں نے اسے گذرنے کی راہ فراہم کی اور پھر دروازے کے سامنے موجود ذکیہ خاتون کو دیکھ کر دوبارہ چہکے۔

"یہ ذکیہ خاتون ہیں اور میں منصور عالم ہوں۔۔۔ اور ہم دونوں کو سفیر احمد کے والدین ہونے کا شرف حاصل ہے۔" انتہائی شائستگی سے کیے گئے ان کے اس مزاح پر ایمان نرمی سے مسکرائی اور ذکیہ خاتون کے سامنے ادب سے سر جھکا کر سلام پیش کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹی۔۔۔ جیتی رہو۔ آمین۔"

اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے سوالیہ نظروں سے اپنے شوہر نامدار کی طرف دیکھا۔

"یہ ایمان راجپوت ہے بیگم جان۔۔۔ ہمارے سفیر احمد کی دوست۔ اور یہ سفیر احمد سے ملنے آئی ہے۔"

جواباً انہوں نے ہو بہو ایمان راجپوت کا ابھی ابھی ادا کیا گیا جملہ دہرا دیا تو ایمان کو احساس ہوا کہ تعارف کے لیے فقط یہ الفاظ انتہائی قلیل ہیں۔ لیکن وہ کیا کرتی کہ اسے لگتا تھا اس تعارف میں بھی اس نے اپنے آپ کو بہت بڑھا کر پیش کیا ہے۔ سو مزید کچھ نہیں سوجھا تو خاموشی سے سر جھکائے وہ فقط لب کچلنے لگی۔

"صحیح صحیح۔۔۔ بھئی بہت اچھا کیا میری بچی یہاں آ کر کہ اسی بہانے ہم بھی مل لیے ہیں۔ ادب آداب سے بھی ماشاءاللہ کسی سلجھے ہوئے گھر کی لگتی ہو۔"

وارفتگی سے دوبارہ اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے انہوں نے گویا اس کی مشکل کو آسان کر دیا تھا۔

"کیا میں سفیر سے مل سکتی ہوں آنٹی؟ وہ کہاں ہے؟" دلکشی سے مسکراتے ہوئے اس نے یوں لجاجت سے پوچھا کہ وہ بے ساختہ اوپری منزل کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بالکل مل سکتی ہو بیٹا۔۔۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہے، آؤ تمہیں ملواتی ہوں۔ پھر باقی تعارف اور باتیں۔۔۔ سب وہیں ہوں گی۔"

انہوں نے بہت محبت سے اس کا شانہ چھو کر کہا تو ان کی نظروں کے تعاقب میں اوپری منزل کی کھڑکیوں کی طرف تاکتی وہ مزید عرض گذار ہوئی۔

"اگر آپ برا نہیں مانیں تو کیا میں اس کے کمرے تک خود ہی چلی جاؤں؟ آپ بس رہنمائی کر دیں کہ اوپر کا راستہ کس طرف سے ہے اور اس کا کمرہ کہاں واقع ہے؟ دراصل میں اسے سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔۔۔" قدرے جھجک کر بات مکمل کرتی وہ باری باری ان دونوں کو یوں دیکھنے لگی جیسے ردعمل میں ان کے تاثرات جانچتی ہو۔

"جی بالکل جا سکتی ہو میری بچی۔۔۔ آؤ اندر تمہیں زینوں تک چھوڑ دوں۔ اور اوپری راہداری میں دائیں جانب تیسرا کمرہ سفیر کا ہے۔"

ایک پل بھی رکے یا سوچے بنا ذکیہ خاتون نے اندر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خوشدلی سے اجازت دے دی تو "بہت شکریہ آنٹی۔۔۔ بہت اچھی ہیں آپ۔۔۔" کہتی ہوئی وہ ان سے پہلے ہی آگے بڑھ گئی تھی۔

ڈاکٹر منصور عالم بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلے آئے اور لاؤنج میں داخل ہو کر ایمان زینوں تک چلی آئی تھی۔

"یہاں سے اوپر۔۔۔اور دائیں جانب تیسرا کمرہ ہے۔۔۔ہے ناں آنٹی؟"

وہ یوں اعتماد سے بول رہی تھی جیسے ان کے گھر اکثر آنا جانا رہا ہو اور اس پر اس کی دلکش سی مسکراہٹ۔۔۔ذکیہ خاتون تو بس اثبات میں سر ہلاتی چلی گئیں۔

"ہاں بیٹی۔۔۔بالکل ایسے۔تم جاسکتی ہو۔"

نرمی سے کہتے ہوئے انہوں نے قدم قدم اوپر چڑھتی ایمان راجپوت کے گھنے بالوں کو دیکھا تھا جو دوپٹہ سے بھی نکل کر اس کی پشت پر جھول رہے تھے۔

"کیا بات ہے بیگم جان۔۔۔؟کس سوچ میں گم ہیں؟"جونہی ایمان آنکھوں سے اوجھل ہوئی ڈاکٹر منصور عالم نے یک ٹک اسی جانب دیکھتی اپنی شریکِ حیات کو مخاطب کیا تھا۔

"یہ لڑکی۔۔۔یہ کتنی خوب صورت ہے ناں؟اور اس کے انداز سے تو مجھے۔۔۔مجھے ثومیہ شاہجہان یاد آ گئی۔وہ بھی اسی طرح مودب اور پر اعتماد انداز میں بات کرتی تھی۔"واپس ان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کچھ کھوئے کھوئے انداز میں بولیں تو وہ ایک پل میں سمجھ گئے کہ ان کے من میں کیا، کیا اور کیا چل رہا ہے۔

"ہاں مجھے بھی بہت اچھی لگی۔۔۔لیکن فی الوقت ان باتوں کو چھوڑیں اور اس کی خدمت سیوا کا کوئی انتظام کریں۔ بھئی وہ پہلی بار ہمارے گھر آئی ہے۔پھر اس کا مکمل تعارف بھی تو ابھی لینا ہے۔ہاں۔۔۔؟"

ان کی تائید کرتے ہوئے انہوں نے ایک نئی راہ سجھائی تو وہ بھی گویا کسی خیال سے چونکی تھیں۔

"ارے ہاں۔۔۔اسے دیکھنے ہی دیکھنے میں یہ سب تو میں بھول ہی گئی ہوں۔خیر میں بس پانچ منٹ میں آئی۔"

انتہائی نرمی سے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر، ایک عزم سے بندھتی ہوئی وہ باورچی خانہ کی جانب بڑھ گئیں تو پر سوچ نظروں سے ایک بار اوپری منزل کو دیکھتے ہوئے وہ واپس نشست گاہ میں آن کر بیٹھ گئے۔

ان کے من میں بھی ایمان راجپوت کے متعلق طرح طرح کے سوالات گردش کر رہے تھے کہ یہ لڑکی کون ہے اور سفیر سے اس کا ایسا کیا خاص تعلق ہے کہ وہ اسے ملنے گھر تک بھی چلی آئی؟اس پر اس کا اعتماد اور آنکھوں سے فقط سفیر کی خاطر جھلکتے کچھ انوکھے محسوسات انہیں نت نئے خیالات سجھا رہے تھے۔وہ جو کوئی بھی تھی۔۔۔یقیناً انتہائی اہم تھی۔

ادھر وہ اس کی ذات سے متعلق طرح طرح کے اندازے لگا رہے تھے اور ادھر وہ سفیر کے در پر ہلکی سی دستک کے بعد جواب کی منتظر تھی۔

"آجائیں ماما جان۔۔۔اب آپ کو بھی پوچھ کے آنے کی ضرورت ہے کیا؟"

بالآخر دوسری دستک کے بعد اس کی مودبانہ آواز سنائی دی تو زیرِ لب مسکراتی وہ دروازے کو ہولے سے دھکیل کر اندر داخل ہوگئی تھی۔

"تمہیں ابھی دستکوں کی پہچان نہیں ہے سفیر۔۔۔ یہ وہ بجھارتیں ہیں جن میں تم ہمیشہ چوک جاتے ہو۔"

انتہائی عمیقیت سے کہتے ہوئے قدم قدم چلتی وہ اس کی پشت پر جا رکی تو ٹیرس کی دہلیز پر رکا سفیر آنکھوں میں جہاں بھر کی حیرتوں کے سنگ پلٹا تھا۔

"ارے تم۔۔۔اور یہاں؟ میرا مطلب ہے آج ہی؟ تمہیں تو میں کل سہولت سے آنے کا کہا تھا ناں۔۔۔؟"

ہڑبڑا کر کہتے ہوئے اسے جیسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ اسے کہیں بیٹھنے کا کہے یا ساتھ ٹیرس میں لے چلے۔اور اس کی مشکل ایمان نے یُوں حل کر دی کہ خود ہی بڑھ کر بیڈ کی الٹی جانب ٹکتے ہوئے اسے بھرپور نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بس یُوں ہی۔۔۔تمہارا پتا ملا تو پھر مجھ سے رہا نہیں گیا۔"

اس کی بات پر وہ مدھم سا مُسکرا تو دیا لیکن جواباً کُچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

"تم تو منظروں سے یُوں ہٹ گئے ہو سفیر کہ گویا ان میں کبھی تھے ہی نہیں۔۔۔؟"

اسے خاموش پا کر اس نے بھی سنجیدگی اوڑھ لی۔

"بس یُوں ہی ایمان۔۔۔تم جانتی تو ہو سب۔گیتی کے ساتھ جو کُچھ ہوا وہ ہر بات سے دل اچاٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔مجھے بس اس بات کا غم ہے کہ وہ بنا کسی جرم ہی ماری گئی۔"

رنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ بڑھا اور بیڈ کی ایک طرف رکھے صوفہ پر جا بیٹھا۔ایمان نے اس کے چلنے کے ساتھ ساتھ اپنا رخ اس کی سمت موڑا تھا۔وہ جانتی تھی کہ وہ ایسی گُفتگو ضرور کرے گا سو کُچھ خیالات وہ بھی تراش کر لائی تھی۔

"اس کا جرم یہ تھا سفیر کہ وہ محبتوں کی پیامبر تھی اور اس دُنیا میں ایسے لوگ بہت کم ٹک پائے ہیں جو صرف وفقط محبت کا درس دیں۔یہاں پنپنے اور سانس لینے کے لیے طبیعتوں میں فقط مٹھاس ہی نہیں چاہیئے ،تھوڑا سا زہر بھی درکار ہے۔"

انتہائی تاسف سے کہتے ہوئے اس کا لہجہ بتدریج مغموم ہوتا گیا تو اندر ہی اندر پہلے سے بہت رندھا ہوا سفیر کا دل مزید پگھل گیا۔

"ہمم۔۔۔کتنے دکھ کی بات ہے ناں ایمان کہ اتنے اہم مقصد یعنی دوملکی عوام میں محبت پروان چڑھانے کی خاطر وہ

جان سے چلی گئی ہے اور دونوں طرف سے مذہبی انتہا پسند لوگ ہیں کہ اب بھی اسے مُسلسل باغی اور کافر کی رٹوں میں رٹ رہے ہیں۔ یہ لوگ کبھی نہیں سدھر سکتے۔۔۔ کوئی کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دے لے یہ نفرتوں سے باز نہیں آئیں گے۔" حرف حرف کہتے ہوئے وہ یُوں گھلتا چلا گیا کہ ایمان کو لگا اس کی ساری کیفیات اُس کے تپتے ہوئے لفظوں کے سنگ بہنے لگی ہیں۔

"اس جہان و دُنیا میں مذہب کے نام پر کٹنے والے گلے۔۔۔ بے شمار ہیں۔ کس کس کو روئیں اور کس کس کا غم کریں؟ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا سا ہے۔ یہی سچ ہے کہ کبھی کبھی مذہبی شدت پسندی انسان کو درندگی کی طرف لے جا کر انسانیت سے بھی گرانے لگتی ہے۔ حالانکہ کوئی یہودی، عیسائی یا مسلمان۔۔۔ اور حتیٰ کہ کافر بھی ہو تو فقط اپنی خاطر ہوتا ہے، لیکن بگاڑ فقط تب ہو گا جب کسی سبب کوئی جنونیت میں گھر کر کہیں انسانیت سے بھی جا گرے۔ ورنہ کسی ایک کے کچھ بھی ہونے سے یہاں کسی دوسرے کو کیا فرق پڑتا ہے؟ یقیناً کچھ بھی نہیں۔"

اس کی تائید میں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اُس کا لہجہ بلا کا مضبوط تھا کہ بغور اسے سنتے ہوئے سفیر کو یُوں لگا گویا کوئی ہولے ہولے اس کے چھالوں پر مرہم سا رکھنے لگا ہے۔

"تم سچ کہتی ہو ایمان کہ مذہبی جنونیت اور شدت پسندی ہی ایسی ہر منفیت کی جڑ ہے۔ اور صرف بھارت کی بات کیا کرنی ہے کہ ایک اسلامی ملک ہونے کے باوجود پاکستان میں بھی کچھ لوگوں کے منفی رویہ جات پڑھ کر کبھی مجھے لگتا ہے کہ قومی کھیل، قومی پرچم اور قومی ترانہ کے ساتھ ساتھ بحیثیت قوم ہی ہمارا اک مذہب بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ تبھی کچھ ممکن ہے کہ یہ قتل و غارت گری تمام ہو۔ یُوں اپنی اپنی نہج و سمت پر رواں تو ہم سب ایک دوسرے کے لیے فقط کافر ہی ہیں۔" وہ بولا تو اس کا زخم تر لہجہ کئی دھول گزیدہ اور لاحاصلی مسافتوں کا غماز تھا۔ اس کی بات سن کر ایمان یُوں چپ کر گئی گویا اس کے جملوں کی بازگشت میں ہی رہ گئی ہو کہیں۔ جبکہ سفیر نے اسے کچھ دیر بالکل خاموش پایا تو تاسف میں سر جھٹکتے ہوئے اٹھا اور قدم قدم ٹیرس کی جانب بڑھتے ہوئے مزید بولا۔

"خیر چھوڑو ایمان۔۔۔ ان سب باتوں کا حاصل اب کچھ بھی نہیں۔ بعد از گیت یہ سب گفتگوئیں سراسر فضول ہیں۔ تم سناؤ زندگی سے تمہاری کیسی نبھ رہی ہے؟"

اور اس کے یُوں بات بدل دینے پر بھی ایمان کو لگا اس کے لہجوں میں نمی تھی۔ لیکن بات بدلنے کی اُس کی اِس شعوری کوشش کو وہ بالکل نہیں سمجھی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر جواباً یہ کہتے ہوئے اس کے پیچھے چل دی۔

"ہمم۔۔۔تمہاری بات بجا ہے سفیر کہ اس ساری گفتگو کا حاصل اب کچھ بھی نہیں۔ہم اپنی دوست کو کھو چکے ہیں اور اب یہ دُنیا اپنے نظریات میں بھلے جس قدر بھی مثبت ہو جائے گیتی واپس نہیں آئے گی۔۔۔"

اس کی بات پر ٹیرس کی ریلنگ تھام کر سفیر نے بہت جلتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔اور انگلی کے ایک خفیف اشارے سے اسے مزید کوئی بھی بات کرنے سے روکتی وہ اس کے دائیں پہلو میں جا رکی تھی۔

"ہاں رہی بات اس زندگی کی تو یہ تو کٹ رہی ہے مُسلسل۔۔۔بھلا افراد کے جانے سے زندگی بھی رکی ہے کبھی؟ ہم اسے نہیں گذاریں گے تو ایک دن یہ ہمیں گذار جائے گی اور۔۔۔اور بس پھر کہانی ختم کہ۔۔۔آخرش دوام کسی کو نہیں۔"

لفظ لفظ کہتی وہ گویا اسے اک نئی داستان سے روشناس کروا رہی تھی اور کونہ کونہ اس کے نین پڑھتا وہ جیسے اپنی کہانی سے جڑ رہا تھا۔مُسلسل ان سحر گر آنکھوں کی "چاہ و طلب" دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ ایک "تلاش" اس کی بھی ہے۔

"مصطفین۔۔۔کی کوئی خبر ملی کیا ایمان؟اب تو بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ہمیں جلد از جلد اسے ڈھونڈنا ہو گا۔"

اس نے یوں جھجک جھجک کر مصطفین کا نام لیا تھا کہ ایمان کو لگا جیسے وہ سمجھتا ہو کہ وہ اس کا نام تک پکارنے کا بھی حق دار نہیں رہا۔

"نہیں سفیر۔۔۔بہت کھوجنے کے بعد بھی ہم اسے تلاش نہیں کر سکے۔جانے کو کدھر چلا گیا ہے کہ پیچھے کوئی نشان تک نہیں ملتا؟" بے ساختہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے نگاہیں نیچی کر لیں تو عجب بے قراری میں گھر کر سفیر نے ٹیرس سے باہر کالونی پر جا بجا پھیلتے ہوئے شام کے سائے دیکھے۔

"کچھ سوجھتا نہیں کہ وہ کہاں جا سکتا ہے؟اتنا ڈھونڈنے سے تو تم نے کہا تھا کبھی کہ خدا بھی ملے گا۔۔۔اور یہاں ستم ہے کہ ہمیں وہ بھی نہیں ملا۔سمجھ نہیں آتی کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔۔۔؟آخر کہیں تو ہو گا وہ؟"

کبھی ماتھے کو تھام کر تو کبھی سر کے بالوں کو نوچتا ہوا وہ اس طرح سے بے تاب ہوا کہ جیسے بس چلے تو مقصود پانے کے لیے ابھی کھڑا کھڑا زمین و آسمان تک کو کھنگال ڈالے۔اور یوُں حیرت در حیرت اس کی بے قراریوں کو تاکتی ایمان راجپوت کے ذہن میں جیسے یکلخت ایک جھماکا سا ہوا تھا۔سفیر کے لفظوں "زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔۔۔" سے آکر بہت پہلے ادا کیے ہوئے مصطفین کے کچھ لفظ تھے جو حرف حرف اور عین عین جڑنے لگے تھے۔

"میں گھر بنانا چاہتا ہوں زمین و آسمان کے درمیان کہیں۔۔۔یا کسی برفاب وادی میں اک خوش رنگ جھیل کے

سرسبز کنارے۔ میں گھر بنانا چاہتا ہوں کہیں نیل پروں کے مسکن میں۔۔۔ میں گھر بنانا چاہتا ہوں وہ چاند کے اُس پار ایمان کہ جہاں تمہاری خواہشوں کے پرندے مجھ سے کہیں پہلے فضا میں تیرا کیاں بھرتے ہیں۔ اور پیسے سے ان سب کا حصول کہاں ممکن ہے بھلا؟ خواہشیں قیمت سے ماورا ہوتی ہیں۔"

اور مصطفین کے اس جملے کا صحنِ دل پر اترنا تھا کہ بے ساختگی میں ہی سفیر کی دونوں کلائیوں کو تھام کر وہ انہی خواب خواب آنکھوں کے ساتھ کھوئے کھوئے انداز میں بولنے لگی۔

"میں جانتی ہوں وہ کہاں ہوگا۔۔۔ وہ ہوگا تو کہیں چاند کے اُس پار سفیر۔۔۔ اور یہ اگر ممکن نہیں تو کہیں زمین و آسمان کے درمیان ہوگا۔"

کئی کئی رموز سے پُر اس منفرد بیان پر سفیر نے یک ٹک اسے دیکھا تھا۔

"یا وہ ہوگا تو کسی برفاب وادی میں اک خوش رنگ جھیل کے سرسبز کنارے۔۔۔ یا پھر کسی ایسی جگہ جو نیل پروں کا مسکن ہو۔ ہاں سفیر۔۔۔ ہم اب تک اسے غلط جگہوں پر تلاشتے رہیں ہیں۔ اس دُنیا کا تو وہ تھا ہی نہیں۔"

اور اس کی آنکھوں میں تیرتی حیرانیاں پڑھ پڑھ کر بات مکمل کرتی وہ بے وجہ ہی رو دی تھی جبکہ سفیر کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے اور ماورائی کہانیوں سی اس ساری گفتگو کا مقصد کیا ہے؟

"میں سمجھا نہیں ایمان۔۔۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟ اور تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے؟"

اپنی کلائیوں پر سے انتہائی نرمی سے اُس کے ہاتھ ہٹاتا ہوا وہ سراپا سوال ہوا تو یک گونہ کائنات میں لوٹتے ہوئے وہ خیالات سے بھی باہر آئی تھی۔

"مجھے اچانک یاد آیا ہے سفیر کہ کبھی اُس نے ان سب جگہوں پر گھر بنانے کی خواہش کی تھی۔ اور یقین کرو کہ ہو نہ ہو وہ انہی میں سے کسی ایک جگہ پر ہوگا۔ ہمیں اسے ڈھونڈنے کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف جانا چاہیئے۔"

انتہا درجہ لگاوٹوں سے لپٹ لپٹ کر وفورِ شوق سے اسے دیکھتی وہ یُوں جوش و خروش سے بولی کہ گویا کسی پہاڑی کے دامن میں مصطفین کی موجودگی کا اسے سو فیصدی یقین ہو۔

"ہمم۔۔۔ چلو یہ بھی کر دیکھتے ہیں۔ کرے خدا کہ اس بار تمہارے لہجے کا یہ یقین سچ میں بار آور ہو۔ میں کل ہی تیاری پکڑتا ہوں۔ لیکن اتنی دور جانے کے لیے تمہیں گھر سے اجازت مل سکے گی کیا؟"

بغور اس کا لب و لہجہ و انداز پرکھ کر، فوراً سے پیشتر اس سے قائل بھی ہوتے ہوئے وہ ایک نئی تشویش میں مبتلا دکھائی

دیا تو کونہ کونہ اس کے دلکش نین پڑھتی ایمان کے لبوں پر ایک بھید بھری مسکان طاری ہوئی۔

"خالہ اور ابو میں سے کسی ایک سے جھوٹ بول کر اور دوسرے کو سچ بتاتے ہوئے کام چلانا پڑے گا لیکن یہ میں آسانی سے کرلوں گی۔تم بس تیاری پکڑو کہ ہمیں جلداز جلد نکلنا ہوگا۔"

وہ یُوں لاپرواہی سے کہہ رہی تھی جیسے وہ اسے شمالی علاقہ جات میں لے جانے کی نہیں بلکہ یہیں لاہور میں بادشاہی مسجد گھمانے کی بات کرر ہا ہو۔

اور اس سے قبل کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی مزید کچھ بھی کہتا نیم وا دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ہنستی مسکراتی ذکیہ خاتون وہاں داخل ہوئیں۔

"سفیر۔۔۔جاناں۔۔۔کیا اپنی دوست سے ہمارا پورا تعارف نہیں کرواؤ گے؟ میں تو جب سے اسے ملی ہوں اسے جاننے کے لیے بے تاب ہوں۔کتنی سوہنی ہے ماشاءاللہ۔میرا کریم اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔آمین۔۔۔"

تیزی سے ان کے قریب آ کر ایمان کی تھوڑی چھوتے ہوئے انہوں نے سوالیہ نظروں سے سفیر کی طرف دیکھا تو فقط ایک پل کے لیے رک کر،ان کی بات کے نتیجہ میں ایمان کے چہرے پر پھیلتی دھنک دیکھتا وہ جواباً بولا۔

"یہ ایمان راجپوت ہے ماما جان۔۔۔اور۔۔۔اور ہم اچھے دوست ہیں۔آپ پلیز ابھی تو نیچے چلیں ناں کہ سب کچھ یہیں کھڑے کھڑے پوچھیں گی؟ بابا کہاں ہیں؟"

اسے دوست کہتے ہوئے وہ یُوں ٹھہرا تھا جیسے اپنے اور اس کے تعلق کی نوعیت خود اس پر بھی ابھی ابھی ہی آشکار ہوئی ہو۔پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں مزید جرح سے روکتا وہ بات بدلنے لگا تو ایمان کے یاقوتی لب بے طرح سے کھلنے لگے تھے۔اس کے لیے یہ لمحہ عام ہرگز نہیں تھا کہ جسے من مندر میں کسی دیوتا کی مانند سجا سنوار کر رکھا تھا وہ آج پہلی بار اس سے اپنے تعلق کا اقرار کرر ہا تھا۔

"ماشاءاللہ۔۔۔بہت اچھی لڑکی ہے۔پہلے تو کبھی نہیں ملوایا۔اور ہاں آؤ نیچے تمہارے بابا ہے پاس ہی چلتے ہیں۔وہ نشست گاہ میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔" مبہم مسکراتے ہوئے انہوں نے بارہا یُوں رک رک کر ایمان کا چہرہ دیکھا جیسے اسے دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو رہی ہوں۔ایمان نے ان کی آنکھوں سے اپنے لیے جھلکتے انتہائی پسندیدگی کے یہ تاثرات دیکھے تو قدرے شرما کر چہرہ جھکالیا۔

"ماما کیا آپ اسے یُوں "تاڑنا" بند کریں گی پلیز؟ وہ کیا سوچے گی؟"

ان کے کانوں کے پاس جھک کر سرگوشیوں میں یہ کہتا سفیر آگے بڑھ گیا تو ایمان کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتی وہ بھی تیزی سے اُس کے پیچھے ہو لی تھیں۔

"مجھے تمہاری دوست بہت پسند آئی ہے جاناں۔۔۔کیا تم اسی سے شادی کرنے والے ہو؟"

ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسی کی طرح جھک کر اس کے کان میں کہتی وہ پھر سے مڑ کر ایمان راجپوت کو دیکھنے لگیں تو یکا یک رک کر یک ٹک انہیں گھورتے سفیر کو سوجھا ہی نہیں کہ اب جواباً انہیں کیا کہے؟

"اف۔۔۔کچھ بھی بول دیتی ہیں ماما۔۔۔یعنی کہ کچھ بھی؟ ایسے تھوڑی ناں ہوتا ہے۔۔۔میرا مطلب ہے یُوں راہ چلتے۔۔۔؟"

دائیں بائیں نفی میں سر ہلاتا وہ اس طرح سے چڑ کر بولا کہ ان ماں بیٹے کی تمام تر گفتگو سے بخوبی واقف اور اس راس رسیلی سی الجھن کو خوب خوب سمجھتی ایمان راجپوت سے اپنی ہنسی روکنا محال ہونے لگا۔

اور بالآخر ان دونوں کے ایک جانب سے ہو کر زینوں تک پہنچتی وہ کھلکھلا کر ہنس بھی دی تھی۔اس دیوتا کا قرب کیا ملا وہ پھر سے وہی پرانی ایمان راجپوت ہو گئی تھی کہ جس کی ہنسیوں پر اس کا اختیار نہیں ہوتا تھا۔

اب اسے یُوں کھلکھلاتے دیکھ کر سفیر ہولے سے مسکرا دیا تو ذکیہ بیگم کے چہرے پر بھی بے انتہا طمانیت پھیل گئی۔

ایمان سے پورا تعارف بعد میں سہی۔۔۔فی الوقت وہ اسی بات سے خوش تھیں کہ "پرانا عشق" اور اس سے ملے سارے درد بھلا کر ان کا جواں سال بیٹا پھر سے ہنسنے بولنے لگا ہے۔☆

☆......☆......☆

یہ برفیلی وادیوں کے دامن میں، دو بلند و بالا پہاڑوں کے مابین واقع ایک وسیع و عریض میدان کا دلپذیر منظر تھا۔ یہاں منظر و ماحول میں اس قدر فسوں گری تھی کہ اس میدان کے چوڑے سینے پر پہاڑی بیٹیوں سی سجی خوب صورت جھیل میں، آسمان کی ساری نیلاہٹوں کے پورے عکوس آن ٹھہرتے تھے اور اس جھیل کے نیلے پانیوں کی ساکن و برفاب سطحیں خوش رنگ تراوٹوں سے لبریز ہو کر یُوں دلفریب لگتی تھیں گویا نیل پروں کا مسکن ہوں۔تاحدِ نگاہ اور دور تلک ہلکی دھند میں لپٹے اونچے درختوں کے مخروطی اور چوڑے پتے۔۔۔زرد و سبز اور گلال رنگ تھے۔ان درختوں کے تنوں سے لپٹ لپٹ کر تناور ہوتی نیلی، بھوری اور کاسنی بیلیں گویا ان کا جلو بڑھاتی تھیں۔یہیں اس جھیل کے اس پار، ڈھلوانی چھتوں والے اپنے خوب صورت گھر کے باہر، پتھریلی تراش سے بنی چار دیدہ زیب سیڑھیوں پر بیٹھا، بوڑھے چرواہے کا جواں سال

بیٹا۔۔۔آنکھیں موندے، سروں میں ڈوبا۔۔۔بانسری بجاتا تھا۔اس کے سرخ یاقوتی لبوں پر رقصاں وتھرکتے فسوں خیز دھارے گویا منظروں کی جان تھے تو اس کی سحر گر آنکھوں کے خوش رنگ کناروں پر ٹکی یاس و آس کی ہر ہر جنبش دعوتِ دیدِ عام دیتی تھی۔وہ یُوں جذب سے سر بکھیرتا تھا گویا ماورائی پریاں اس کی مدھر دھنیں سن سن کر پورے میں ناچتی ہوں اور ان پریوں ہی کی ہمراہی میں ہواؤں کے نرمیلے رتھ پہ رہ کر وہ قریہ قریہ گھوم آئے۔جھیل کے ارد، گرد اگے رنگا رنگ پھولوں سے خوشبو چرا کر لہلہاتی ہوائیں وادی میں عطر پھونک دیتی تھیں اور آسمان کی وسعتوں میں رقصاں سفید پرندے ان خوشبوؤں کے حصار میں بندھ کر گھونسلوں میں لوٹ آتے تھے۔شام کے سرمئی اندھیروں میں یہاں جھینگروں کا شور جاگ اٹھتا تھا تو چہچہاتے پرندوں کی طرح طرح کی بولیاں سن سن کر جا بجا جگنو اڑنے لگتے تھے کہ گویا کسی نے تاروں بھرے آسمان کی چادر کھینچ کر ان پہاڑوں کے دامن میں جھاڑ دی ہو۔راتوں میں دور۔۔۔کہیں بہت دور بہتے ہوئے جھرنوں کا میٹھا شور۔۔۔اس منظر کے ہر جزو کو لوریاں سناتا تھا۔

"باہر سردی بہت بڑھ رہی ہے بیٹا۔۔۔اب اندر آ جاؤ۔"

شام کے پھیلتے ہوئے سایوں میں ایک روز بانسری بجاتے اس لڑکے کے لب گویا اس آواز پر ہوا میں ساکن رہ گئے تھے۔بہتی ہوئی مدھر دھن کیا رکی، اس کے ساتھ گویا پورا منظر بھی تڑپ کر آواز کی سمت مڑا تھا۔

"جی میں آ رہا تھا بس۔آپ چلیں۔"

پلٹ کر بوڑھے چرواہے کو دیکھتا وہ نہایت ادب سے بولا اور اپنے دائیں جانب ایک چھوٹے سے پتھر تلے دبے کچھ صفحات سمیٹنے لگا۔

"تمہاری کہانی مکمل ہوگئی کیا؟ یہ بہت طویل ہو رہی ہے بیٹا، اب اور کتنا لکھو گے؟"

اسے صفحات سمیٹتے دیکھ کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا تو لڑکے کے ہاتھوں کی حرکات تیز ہوتی گئیں۔وہ جانتا تھا کہ اسے ساتھ لیے بنا وہ اندر نہیں جائیں گے۔

"جن کہانیوں کے مرکزی کردار بچھڑ جائیں ان کے مقدر میں تکمیل نہیں ہوتی شاید۔"

یاسیت سے کہتا وہ آہستگی سے اٹھا اور دھواں دھواں سی سرد ہواؤں پر نگاہ کرتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

"ہاں۔۔۔سچ کہتے ہو بیٹا۔کردار پھر سے ملیں تو کوئی انجام بھی ہو۔"

بڑبڑانے کے سے انداز میں اس کی تائید میں کہتے وہ اس کے پیچھے ہو لیے اور اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

"تمہاری آنٹی آج سردی سے بچنے کے لیے جلدی بستر میں چلی گئی ہیں لہٰذا کھانا آج خود ہی باورچی خانے سے لے لینا اور ہاں۔۔۔تمہارے کمرے کا آتش دان بھی سلگا دیا ہے۔اس کے لیے تم چاہو تو مجھے شکریہ کہہ سکتے ہو۔"

اپنا کوٹ اتار کر دروازے کی ایک جانب لگی کیلی پر ٹانگتے ہوئے انہوں نے اسے مطلع کرنے کے سے انداز میں کہا تو زینہ چڑھنے سے قبل ریلنگ تھام کر وہ جواباً مسکرا دیا۔

"بہت شکریہ انکل۔۔۔آپ ہر بار دل جیت لیتے ہیں۔اور آنٹی نے اچھا کیا جلدی بستر میں چلی گئیں۔آج سردی واقعی بہت ہے۔میں کھانا لے لوں گا لیکن ابھی تو بھوک کا کہیں نام ونشان بھی نہیں۔" تعظیماً جھک کر شکریہ کہتے ہوئے اس نے خوش دلی سے بات مکمل کی اور مزید رکے بنا ایک ایک کر کے زینہ چڑھتا چلا گیا۔

"ہمیشہ بے قرار رہتا ہے۔۔۔کبھی دل سے نہیں ہنستا۔" اس کے پیچھے اس کی مسکراہٹوں کے کھوکھلے پن پر فقرہ بڑبڑاتے وہ ہولے ہولے اپنے کمرے کی جانب چل دیئے تھے۔

ادھر اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے بانسری میز پر رکھی اور صفحات کا پلندہ بھی بڑی ترتیب سے ایک طرف جما کر کھلی ہوئی کھڑکی میں آن رکا۔باہر دور تلک درختوں کی سبز شاخوں،ان کے مابین کہیں کہیں سے جھانکتے پہاڑوں اور سرد ہواؤں کے شور کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔اس نے جھک کر دیکھا تو برفاب جھیل کے ساکن کناروں پر اسے دو چکور اور ایک مور باہم اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دیئے۔انہیں یوں ہمک کر یہاں وہاں گھومتے دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک گہری مسکان ابھرنے لگی۔اس نے بارہا اس مور کو جنگل میں ناچتے ہوئے دیکھا تھا تو کئی بار وہ ان چکوروں کے دور افق کے چاند کو تاکنے پر بھی گواہ رہا تھا۔یوں چکور کے بڑی حسرتوں سے چاند کو تاکنے اور مور کے جنگلوں میں ناچنے میں اسے عجب عجب سی محبت محسوس ہوتی تھی۔اس کے علاوہ وہاں جھیل کے سرد پانیوں میں کچھ مچھلیوں کے ہونے کا احساس باقی تھا اور سطحِ جھیل پر جگنوؤں کے پیچھے جا بجا منڈلاتے کچھ پروانے بھی تھے جو اکثر اسی طرح سے ان مدھم مدھم روشنیوں کے پیچھے اڑ اڑ کر اس کی دل لگی کا سامان کیا کرتے تھے۔

اس نیم تاریک کمرے میں یونہی کھڑے کھڑے آنکھیں موند کر اس نے اپنے کچھ پیاروں کے چہرے یاد کیے تو صحنِ تخیل میں سب پہلے اترتا عکس اداسیوں میں لپٹی اک پھیکی سی لڑکی کا تھا۔ہاں وہی سوگوار سی لڑکی کہ جو اس کی محبت تھی۔۔۔اور ہاں وہی محبت کہ کسی نہ کسی سبب وہ جس سے بچھڑ گیا تھا۔

"چکور اگر چاند کو تاکنا ہی چھوڑ دے اور مور اگر جنگلوں میں ناچنا بھی چھوڑ دے۔۔۔پروانے کہیں شمع پر آن جلنا

ترک کردیں یا پانیوں کی مچھلیاں ہوا میں سانس بھرنے لگیں؛ الغرض اس دُنیا و جہان سے محبت کا اک ایک استعارہ مٹ بھی جائے تو میرے دل سے تمہاری محبت نہیں مٹ سکتی۔ یعنی اس جہانِ کل کی ہر حقیقت سے سوا و بالا ہے یہ پہلو کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔"

من ہی من اندر اس اداس لڑکی کو مخاطب کرتا وہ کئی کئی لگاوٹیں نچھاور کرنے لگا تھا کہ یکا یک اس کے خیالات میں ایک دوسرا عکس نمودار ہوا اور اس کے مسکراتے ہوئے لب یکبارگی سمٹ گئے۔ یہ عکس کسی دلکش و دلپذیر سے شخص کا تھا کہ جس سے اسے اب بھی محبت تو بہت تھی لیکن وہ کبھی اسے یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس شخص کا خیال آتے ہی اس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں عجب سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ کیسے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کبھی وہ اس کے سنگ کہیں طویل تر راہداریوں میں گھوما کرتا تھا۔

" کرے خدا کہ کسی طور ایسا ہو کہ تو پھر سے میری آرزوئیں کرے۔ مجھے چھونے کی خاطر بے تحاشا روئے، مچلے، بلکے، حتٰی کہ تڑپے بھی۔۔۔ لیکن میں تو کیا تمہیں مجھ کو چھو کر آتی ہوا تک نہ ملے۔"

بے ساختہ آنکھیں کھول کر وہ بڑھا اور کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے گویا اندر باہر سراسراتی ہواؤں سے اپنے آپ کو چھونے کا حق ہی چھین لیا۔ پھر کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر پر گرنے کے سے انداز میں لیٹتا وہ بہت سے اشک بہانے لگا۔ اس کے پاؤں اب تلک جوتوں میں مقید تھے لیکن عہدِ ماضی سے اپنی کہانی کے جزئیات کھنگالتا وہ ان پہلوؤں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

" کرائے دار ہو تو بس کرائے دار ہی رہو۔۔۔ ہمارے گھر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی کوششیں نہ کرو۔ سمجھے۔۔۔؟"

"اے مصطفین۔۔۔ وقت سے آ کر ناشتہ کر لو۔ پھر کہو گے خالہ تمہاری وجہ سے روز مجھے یونیورسٹی سے دیر ہو جاتی ہے۔"

"اس کہانی کے سارے واقعات بدل کر بھی۔۔۔ میرا تم سے ملنا بنتا ہی نہیں۔"

اس کی سماعتوں کے آس پاس کئی آوازوں کی بازگشت تھی اور میز پر دھرے اسی کہانی کے صفحات ان یورشوں سے بے نیاز کسی انجام سے دوچار ہونے کو بے تاب ہوئے جاتے تھے۔

ہاں اِس برفاب وادی میں اک خوش رنگ جھیل کے سرسبز کنارے اتنا بے قرار ہو کر یوں تڑپتا ہوا سا، بوڑھے

چرواہے کا وہ جواں سال بیٹا۔۔۔ مصطفین شجاع ہی تھا۔

یہ ایک فور بائے فور جیپ کے رکنے کی آواز تھی جس پر لکڑی کے ایک بڑے گولائی دار ڈیسک سے اس پار موجود "ماہا خان" نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور پھر اپنے سامنے کھلے " کھاتہ " پر مختلف حساب لکھنا ترک کر کے اسے دراز میں پھینکا اور دراز مقفل کر کے باہر کی جانب تاکتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دیکھو تو زین باہر کون آیا ہے؟"

اس کی آواز پر یہیں کسی کونے سے نکلتا لگ بھگ دس سالہ زین بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا تھا۔

" کوئی پیاری سی لڑکی ہے اور اس کے ساتھ ایک بہت حسین لڑکا آیا ہے۔"

کھڑکی کی جانب اشارہ کر کے اس نے گویا اس خبر کے حصول کا سبب بتایا اور اس کے مزید کچھ کہنے سے پیشتر ہی باہر بھاگ گیا۔ اس کی بات پر اثبات میں سر ہلاتی وہ اس ہال نما کمرے میں قرینے سے سجی مختلف میزوں پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑانے لگی اور پھر ایک میز پر تھوڑی بے ترتیبی دیکھ کر تیزی سے اس جانب بڑھی۔

ادھر احاطہ کے تین استقبالیہ زینے اتر کر زین نے دیکھا کہ وہ لڑکی اور لڑکا جیپ سے اتر کر اب عمارت کا جائزہ لے رہے ہیں۔

"ماہاز ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ۔۔۔ لیکن یہ ہوٹل سے زیادہ ایک گھر لگتا ہے۔ نہیں۔۔۔؟"

عمارت کی سامنے والی دیوار پر آویزاں ایک تختے سے ہوٹل کا نام پڑھ کر اس لڑکی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لڑکے کی رائے چاہی تو عمارت کے ساتھ ساتھ اس نے ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ قرب وجوار میں بھی گھمائی تھی۔

"ہمم۔۔۔ صحیح کہہ رہی ہو۔ یہ رہائشی عمارت ہی ہے اور بس تھوڑی سی ترمیم سے اسے ہوٹل کی صورت دی گئی ہے۔" مسکراتے ہوئے اس کی تائید میں کہتا وہ اندر کی جانب قدم بڑھانے لگا تھا کہ ابھی ابھی وہاں پہنچ کر ان کی گفتگو سنتا زین بول اٹھا۔

" لگتے تو آپ پنجابی ہو جی اور یقیناً پنجاب سے ہی آئے ہو۔"

اس کی آواز پر ان دونوں نے بیک وقت حیرت سے پہلے اسے اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"اوہو بھئی زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں زیادہ تر سیاح پنجاب سے ہی آتے ہیں۔ اب پہاڑ واسیوں کو بھلا ایک سے دوسری جگہ ہجرت کر کے صرف پہاڑ ہی دیکھنے سے کیا حاصل؟ ہاں۔۔۔؟"

اپنے اندازے کی درستی پر ان کی حیرت کو تھپکتا وہ انہیں مزید حیران کیے دے رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے اندازے کی درستی سے زیادہ وہ اس کی عمر اور اِس عمر سے کہیں بڑی باتوں کا باہمی تقابل کر رہے تھے۔

"اور یہ آپ دونوں کا سامان کدھر ہے جی؟ اسی جیپ میں ہوگا۔ ساتھ ہی لے آؤ ناں۔۔۔ یا بس کھانا کھانے آئے ہو؟" انہیں مُسلسل خاموش پا کر اس نے اگلا سوال کیا تو اس بار اُس لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"ہاں رہنا ہے بھئی رہنا ہے۔۔۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بھی کہتی، اس کی بات کاٹ کاٹتے ہوئے وہ ذرا اور قریب ہو کر بہت رازداری سے بولا تھا۔

"میں کہے دیتا ہوں کہ یہاں رہنا ہو تو ذرا سنبھل کر رہنا۔ یہ ماہا خان ہے ناں۔۔۔؟ بڑی تیز شے ہے۔ میڈم بن کر بس کاؤنٹر سے چپکی رہتی ہے۔ پندرہ سو کے کمرہ کا دو ہزار تک کرایہ لے لیتی ہے۔ آپ بس پندرہ سو کی ہی ضد کرنا کہ اس سے زیادہ ہم ایک روپیہ نہیں دیں گے۔ اب چلو اندر۔"

منہ کے آگے ہاتھ رکھ رکھ کر اور آنکھیں میچ میچ کر پوری بات سمجھا تا وہ انہیں بڑے کام کی شے لگا۔

" لگتا ہے تمہاری مالکن تمہیں کچھ خاص پسند نہیں ہے۔ ہاں۔۔۔؟"

اس کی باتوں سے فقط یہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے جواباً اس لڑکی نے بھی بہت رازداری سے پوچھا تو وہ گویا کرنٹ کھا کر اچھلا تھا۔

"مالکن۔۔۔؟ ہرگز نہیں۔ وہ میری بہن ہے محترمہ۔"

اور گویا انہیں اک نئی اطلاع دیتا وہ اندر بھی بھاگ گیا تو اس لڑکی نے قدرے خجالت سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا۔

"اف۔ ساشے پیکنگ میں موجود یہ لونگ بار۔۔۔ تیز کتنا ہے۔" ماتھے پر ہاتھ مارتی وہ اندر جانے کا اشارہ کرنے لگی تو اس لڑکے نے عمارت کے داخلی حصہ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"السلام علیکم۔۔۔ میں ماہا خان ہوں اور میرے ہوٹل پر آپ دونوں معززین کو خوش آمدید۔ امید کرتی ہوں ہماری خدمات آپ کو پسند آئیں گی۔"

جونہی وہ دونوں مرکزی ہال میں داخل ہوئے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکان سجائے کھڑی وہ تیزی سے ان کے

قریب آئی اور باری باری ان دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف پیش کیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔اور ان شاءاللہ پیاری ہم بھی یہی امید کرتے ہیں۔"

خوشدلی سے جواباً کہتے ہوئے اس مہمان لڑکی نے بہت گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور پھر اس کی آنکھوں میں رقصاں سوالات پڑھ کر مزید بولی۔

"میں ایمان راجپوت ہوں اور یہ سفیر احمد ہیں۔ہم دو سے تین دن کے لیے یہاں قیام کریں گے۔وہ پہاڑی سے نیچے ایک راہگیر نے آپ کے ہوٹل کا بتایا تو یہیں چلے آئے ورنہ ہم واپس "استور" جانے والے تھے۔"

اس کے تفصیلات بتانے پر ماہا خان کے چہرے پر طاری مسکان گہری ہوگئی تھی۔

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہاں قیام کے بعد آپ کو "استور" نہ جانے کا دکھ نہیں ہوگا۔زین کو چابی دیں یہ آپ کا سامان لے آتا ہے۔"

انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں کہتے ہوئے اس کی بات یقیناً ابھی راہ میں تھی کہ ایک طرف کھڑے زین نے چابی لینے کے لیے سفیر کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

"میں ساتھ چلتا ہوں۔بیگ وزنی ہیں تم سے نہیں اٹھائے جائیں گے۔"

نرمی سے کہتا وہ اسے ساتھ لیے باہر نکل گیا تو ماہا خان نے بطورِ میزبان ایمان راجپوت کو ایک میز کے گرد بیٹھنے کا کہا اور پینے کے لیے گرم قہوہ پیش کیا۔

"ارے۔۔۔یہ تو بہت اچھا ہے۔میں نے پوری زندگی اس سے مزیدار قہوہ نہیں پیا۔تم نے خود بنایا کیا؟"

قہوے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے ایمان نے کھلے دل سے تعریف کی تو وہ پہاڑی دوشیزہ ماہا خان شفافیت سے ہنس دی تھی۔

"جی بالکل۔۔۔یہاں کی شیف میں ہی ہوں۔ناشتہ اور رات کے کھانے سے لے کر چائے، کافی یا قہوہ تک سب میں ہی بناتی ہوں۔"

اس کی بات پر گھونٹ گھونٹ کر کے نیم گرم قہوہ اندر اتارتی ایمان نے شہادت کی انگلی کو گول کرتے ہوئے انگوٹھے سے ملا کر "شاندار۔۔۔" کا اشارہ کیا اور پھر گردن میں لپیٹا گرم مفلر اتار کر میز پر ایک طرف رکھ دیا۔

"یہاں بہت زیادہ ٹھنڈ ہے۔ہم لاہور سے آئے ہیں اور وہاں ان دنوں ٹھیک ٹھاک گرمی ہوتی ہے۔"

اس نے یُوں بات برائے بات کہا جیسے دو ضروری کرداروں سفیر اور زین کی غیر موجودگی میں باہمی گُفتگو کے لیے موضوع تلاش کر رہی ہو۔

" ہمم۔۔۔سردی تو یہاں واقعی بہت ہے۔اور سچ کہوں تو میں آپ کو دیکھ کر قدرے حیران بھی ہوں۔"

اس کی بات پر ایمان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

" دراصل ان دنوں یہاں برف پڑنے والی ہے تو ایسے موسم میں عام طور پر سیاح ادھر کا رخ نہیں کرتے۔"

بڑے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے وضاحت پیش کی تو قہوے کا آخری گھونٹ بھرتی ہوئی وہ مبہم سا مسکرا دی۔

" ہم بھی شاید نہیں آتے لیکن ہم کسی کو تلاشنے آئے ہیں۔تم دعا کرنا کہ وہ ہمیں ضرور ملے۔"

جواباً کئی کئی مسافتوں کے غماز لہجے میں ایمان فقط یہی کہہ سکی تو ماہا خان نے بغور اس کے غمگین چہرے کو کھوجا تھا۔

" کہنے والے اس وادی کو جنت نظیر کہتے ہیں، تو کیونکر ممکن ہے کہ یہاں کسی کو اپنا مقصود نہ ملے؟ سو جو بھی آپ دونوں ڈھونڈنے آئے ہو۔۔۔ان شاءاللہ ضرور ملے گا۔"

اپنی وادی کی شان بیان کرتے ہوئے اس نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعائیہ کلمات کہے اور پھر جانے کب سے وہاں آن رکے سفیر احمد پر نگاہ کرتے ہوئے فوراً اٹھی اور اس سے شناختی کارڈ طلب کرتی ہوئی بڑے گولائی دار ڈیسک سے پار چلی گئی۔ کُچھ ہی دیر بعد اس نے کمرہ بکنگ کے لیے ضروری کارروائی مکمل کی اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں دو الگ الگ کمروں کی چابیاں مہیا کر دیں۔

" ایک کمرہ کا کرایہ ایک ہزار روپیہ ہے اور یہاں کارڈ نہیں چلتا سو ادائیگی آپ کو نقد کرنا پڑے گی۔"

چابی پکڑاتے ہوئے سفیر کو جیب سے کارڈ برآمد کرتے دیکھ کر اس نے مطلع کرنے کے سے انداز میں کہا تو اثبات میں سر ہلاتے ہلاتے اس نے گویا کُچھ یاد آنے پر ایمان راجپوت کی طرف دیکھا۔ادھر وہ بھی انہی حیران تر نظروں سے اسے تاک رہی تھی۔

" تو وہ سا شے پیک جھوٹ بول رہا تھا۔یعنی کرایہ کم کرنے کی بجائے زیادہ کر رہا تھا۔"

ایمان کی شوخ آواز پر وہ ہولے سے ہنس دیا اور بٹوے سے کُچھ نوٹ نکال کر ماہا خان کی جانب بڑھا دیئے جو کہ ان دونوں کی گُفتگو سے معاملہ کی جڑ تک پہنچ گئی تھی۔

"اور کرایہ زیادہ بتاتے ہوئے اس نے یقیناً میری تھوڑی سی برائی بھی کی ہوگی تا کہ آپ اس کی بات پر یقین کر سکو۔ ہاہاہا۔۔۔ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں لیکن بہت سمجھانے پر بھی زین ایسی چالاکیوں سے باز نہیں آتا۔ بڑا "کاروباری" قسم کا ذہن ہے اس کا۔۔۔"

ہنستے ہوئے ان کے سامنے حقیقت رکھتی وہ پہاڑی دوشیزہ بلا کی دلکش لگی تھی۔ شفافیت سے پر اور ریا سے بہت پاک تھی اس کی ہنسی۔۔۔

"جی بالکل۔۔۔ ایسا ہی کیا تھا لیکن کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ کیا ہے ناں کہ اس کے منہ پر جھوٹ بھی سجتا ہے۔ ویسے وہ ہے کہاں؟ نظر نہیں آ رہا۔۔۔"

خوشدلی سے کہتی ایمان نے گویا بات کو جانے دیا تو ماہا نے بہت تشکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"نیچے گاؤں تک سودا سلف لانے جانا تھا اسے۔ شاید چلا گیا ہے۔ آپ لوگ آرام کریں میں شام کے کھانے پر بلا لوں گی۔" زین کی بابت بتا کر وہ ایک راہداری کی جانب بڑھ گئی تا کہ کمروں تک ان کی رہنمائی کر سکے۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں اس کے پیچھے اپنے اپنے کمرے میں چلے آئے۔

وہ گزشتہ کئی روز سے مختلف پہاڑی علاقوں میں مصطفین کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی کہ جہاں کہیں مصطفین شجاع کے ہونے کے امکانات ہوں اور انہوں نے اسے وہاں پہنچ کر ڈھونڈا نہیں ہو۔ شمالی علاقہ جات کے تمام معروف شہروں اور ان کے مضافات میں انہوں نے چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ یا بیس گھنٹے اسے ڈھونڈ نے میں صرف کیے تھے اور بہت مختصر تھا کہ کہیں آرام و قیام کیا ہو۔ شہری آبادیوں میں واقع مختلف قیام گاہیں کھنگالتے ہوئے ہر بار ان کے تھکن زدہ چہروں پر ایک نئی امید جگمگانے لگتی تھی کہ شاید مصطفین یہاں ملے کہ شاید وہ یہیں ہو۔ لیکن ہر بار ان کی بنائی ہوئی اک ایک آس یوں شدت سے مٹی کہ انتہائی دل گرفتہ ہو کر وہ بہت ہارتے بھی رہے۔

اور یہ گلگت سے آگے واقع ایک سیاحتی مقام "استور" تھا کہ جہاں کے موسمی پس منظر کی بدولت انہیں ایک آخری امید تھی کہ شاید وہ انہیں یہاں کہیں مل جائے۔ پچھلے دو روز سے انہوں نے خاص استور شہر اور اس کے مضافات میں واقع بہت سے گاؤں تلاشے تھے لیکن ابھی تک کامیابی کے کوئی امکانات دکھائی نہیں دیئے تھے۔ یہاں کے مقامی لوگوں سے انہوں نے بہت پوچھ گچھ کی لیکن مصطفین کے ملتے جلتے حلیے کا کوئی شخص انہوں نے ان کی بتائی ہوئی مدت کے دوران اپنے آس پاس یا اِرد گرد آن بستا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ قصہ المختصر یہ کہ جوں جوں ان کی واپسی کا وقت قریب آ رہا تھا توں توں

ان کی بے چینی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی کہ اے کاش وہ انہیں جلد از جلد ملے۔

"ماہاز ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ۔۔۔" میں یہ شام سے ذرا پہلے کا وقت ہوگا کہ جب دن بھر کا تھکا ہارا سفیر سو کر اٹھا اور پاؤں میں ایک آرام دہ چپل اڑس کر عمارت کے الٹی جانب کھلتے اپنے کمرے کے ٹیرس میں نکل آیا۔ سامنے کا منظر اتنا دلنشیں تھا کہ کئی پل گذرے اور وہ یک ٹک دیکھتا ہی رہا۔ ہاتھ بڑھا کر چھو سکنے کی سی دوری پر موجود نیل رنگ آسمان، اونچے اونچے پہاڑ، سر سبز و شاداب گھنے جنگلات اور اس سبزے میں سے بل کھا کر لہراتا ہوا پہاڑ کی گہری کھائیوں میں جا گرتا ایک خوب صورت جھرنا۔۔۔ الغرض اس منظر کی کل جزئیات اتنی دلفریب تھیں کہ اسے مبہوت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ بے ساختہ اسے اس ہوٹل کی مالکہ ماہا خان کا وہ جملہ یاد آیا جو اس نے ان کی آمد پر ایمان سے کہا تھا۔

" کہنے والے اس وادی کو جنت نظیر کہتے ہیں، تو کیونکر ممکن ہے کہ یہاں کسی کو اپنا مقصود نہ ملے؟ سو جو بھی آپ دونوں ڈھونڈنے آئے ہو۔۔۔ ان شاء اللہ ضرور ملے گا۔"

بانہیں پھیلا کر ایک طویل تر سانس بھرتے ہوئے اس نے ہوا سے تازگی جذب کی اور آنکھیں موند کر جھرنے کے تیز ترین بہاؤ اور مدھر سی آوازوں پر غور کرنے لگا۔

" بہتے ہوئے دودھیا جھرنوں اور ان میٹھے پانیوں کے درمیان، اگر کہیں تم نہیں ہو جاناں، تو کہہ دوں گا پروردگار سے کہ یہ پھر جنت نہیں ہے۔"

من ہی من اندر مصطفین کو یاد کرتے ہوئے اس نے اپنی دلنشیں آنکھیں کھولیں اور دور کہیں افق سے بھی پار یوں جھانکنے لگا گویا سچ مچ اپنے "پروردگار" سے مخاطب ہو رہا ہو۔

رات کے کھانے پر ان کی ماہا خان اور زین سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے یہاں کے قرب و جوار سے متعلقہ معلومات حاصل کیں۔ اِس سے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ جگہ پر فضا مقامات، کم کرایوں، سستے کھانوں اور دیگر بہت سی خصوصیات کی بدولت سیاحوں کی ترجیحات میں شامل ہوا کرتی ہے۔

"یہاں سے نیچے چار کلومیٹر کی مسافت پر " کٹھری زیریں " گاؤں ہے اور وہ جگہ حسین جھیلوں اور شفاف آبشاروں کی بدولت کافی مشہور ہے۔ لوگ وہاں مچھلی کا شکار کرنے جاتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہاں سے وہاں جانے کے لیے آپ کو خچر کی سواری کرنا پڑے گی۔ اس کے سوا وہاں رسائی ناممکن ہے۔"

سفیر کے یہاں قریبی کسی معروف جگہ کے متعلق پوچھے گئے سوال پر ماہا خان نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا تھا اور

اس کی بات پر خوشی سے چہکتی ایمان گویا ان دونوں کی گفتگو میں حائل ہوئی تھی۔

"واؤ۔۔۔یعنی میں اس سفر کا بھی لطف اٹھاؤں گی۔آج سے پہلے تو کبھی موویز میں ہی ایسے مناظر دیکھے تھے کہ کسی سلطنت سے کوئی شہزادی سر پر بڑا سا ہیٹ جمائے خچر یا گھوڑے کی سواری کرتی ہوئی اپنی رعایا کی خبر گیری کے لیے نکلتی ہے۔"اس کی نہایت عجلت میں دیئے گئے اس جواب پر سفیر نے اسے یوں دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہا ہو کہ "ہم یہاں تفریح کے لئے آئے ہیں کیا؟"

جواباً سنجیدگی اختیار کرتی وہ سر جھکا کر بیٹھ رہی تو ایک مبہم ہنکارا بھر کر سفیر شائستگی سے بولا۔

"ٹھیک ہے ماہا۔۔۔کل ہم وہیں جائیں گے۔کیا آپ ہمارے لیے خچر منگوا سکتی ہیں؟"

بات مکمل کر کے اس نے اب تک خلافِ عادت یکسر خاموش کھڑے زین کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی وہ شرارت نما چمک بڑھ گئی تھی۔

"ارے بالکل۔۔۔یہ سب انتظام ہو جائے گا۔میں خچر لے آؤں گا۔یہیں پاس سے ملتے ہیں۔"

اور اس کے لب و لہجہ سے پھر سے کسی چالاکی کی مشک پا کر ایمان راجپوت اسے بے ساختہ ہی ٹوک اٹھی۔

"اوئے ساشے پیک۔۔۔اس بار ریٹس ذرا مناسب رکھنا۔تم جانتے ہوناں کہ تمہارا راز کھل چکا ہے؟"

جواباً کچھ بھی کہنے کی بجائے، شکوہ کناں آنکھوں سے وہ اپنی بہن کی طرف دیکھنے لگا تو ایک ادا سے ہنستی وہ پہاڑی دوشیزہ بلا کی دلکش لگی تھی۔

"پریشان نہیں ہو سہیلی۔۔۔اس کی یہ اکنامکس یہاں بھی نہیں چلے گی کیونکہ مجھے اصل کرایوں کا پتا ہے۔"

ایمان کے شانے پر ہاتھ رکھتی وہ زین کو مزید چڑانے لگی تو وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر بھاگ گیا۔

خیر قصہ المختصر یہ کہ اگلے روز ناشتہ کے بعد وہ دونوں خچروں کی سواری کرتے ہوئے "کٹھری زیریں" گاؤں پہنچے اور یہاں واقع جھیل اور آبشار کنارے مختلف سیاحوں کے مابین اپنا "مقصود" کھوجتے رہے۔یہاں اتنا جم غفیر تھا کہ جھیل کے پاس ہی واقع ایک کھلے میدان میں سیاحوں نے شب بسر کرنے کی غرض سے عارضی خیمہ بستی آباد کر لی تھی۔

حسبِ سابق و معمول ان دونوں نے مصطفین شجاع کی موجودگی سے متعلق وہاں ہر طرح سے کھوج کی۔۔۔حتیٰ کہ دن ڈھلنے کے قریب چلا آیا لیکن ان کی اِس ساری تگ و دو کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔مصطفین شجاع کو نہ انہیں ملنا تھا وہاں اور نہ ہی وہ ملا۔بالآخر شام سے ذرا پہلے وہ انہی ساتھ لائے ہوئے خچروں پر واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے تو جھیل

کنارے رک کر مختلف سیاحوں کے رنگ برنگ چہروں پر ایک آخری نگاہ دوڑاتے ہوئے سفیر احمد کو بہت پہلے کبھی بولے گئے مصطفین شجاع کے یہ دو جملے بہت شدت سے یاد آئے۔

"بس یہ خیال کرنا سفیر کہ اسی ضد میں آ کر مجھے کہیں کھو نہ دینا تم۔ ورنہ تاریخ پر گواہ ان سب دیواروں سے پوچھ لو کہ یُوں کھویا ہوا کوئی بھی شخص۔۔۔ دوبارہ پھر نہیں ملتا۔"

"تو بس اب جا رہا ہوں میں۔۔۔ اور ہر روز دعا کروں گا کہ تمہاری زندگی میں وہ مقام کبھی نہ آئے کہ تمہیں میرے نام سے لپٹ کر کہیں رونا پڑے۔ خدا کرے تم اگر ڈھونڈنے بھی نکلو تو مصطفین شجاع تمہیں کبھی نہ ملے۔"

اور ان حروفِ بازگشت ایسی اک اذیت پنہاں تھی کہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی چھلک گیا۔

ماہاز ہوٹل پہنچنے تک ذہنی وجسمانی دونوں لحاظ سے وہ بہت تھک چکے تھے۔ نہانے کے بعد کھانے کی میز پر آئے تو مغموم لہجہ میں انہوں نے ماہا خان کو کل اپنی لاہور واپسی کا بتا دیا۔

"ہمارا خیال تھا آپ دونوں کُچھ روز مزید قیام کریں گے لیکن شاید آپ کو یہ جگہ زیادہ پسند نہیں آئی۔"

جواباً بہت محبت سے باری باری ان دونوں کو تاکتے ہوئے کہتی وہ پہاڑی دوشیزہ انہیں بہت اُداس لگی تھی۔

"ارے۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے ماہا۔ یہ جگہ، یہاں کے لوگ اور خصوصاً تم دونوں۔۔۔ ہمیں بہت پسند آئے ہو، لیکن واپس تو اب جانا ہوگا۔ ہم یہاں ہمیشہ کے لیے تھوڑی ناں رہ سکتے ہیں۔ اور یہ تمہیں کیا ہوا؟ کیا ہر مہمان کی واپسی پر یُونہی اداس ہو جاتی ہو؟"

اسی محبت سے اُس کا ہاتھ تھامتی ہوئی ایمان انتہائی لگاوٹ سے بولی تھی۔ اسے یہ پہاڑی لڑکی بہت بہادر لگی تھی کہ جس کی زیست کہانی بہت مختصراً یہ تھی کہ اپنے بیمار والدین اور چھوٹے بھائی کو معاشی سہارا دینے کی خاطر اس نے اپنی صلاحیت اور دانش کے بل بوتے پر اپنی رہائش گاہ کو سیاحوں کے قیام کے لیے ہوٹل کی شکل دے دی تھی اور اس کی انتھک محنت وکاوش کا ثمر تھا کہ اپنے قیام کے تقریباً چار سالہ عرصہ میں ہی اس کا ہوٹل کافی مشہور ہو چکا تھا۔

"ہم پہاڑ واسیوں کے دل بہت عجیب ہوتے ہیں ایمان۔۔۔ پتھروں میں رہ کر بھی اتنے نرم کہ کسی سے بھی لگ جائیں۔ اور یہ سچ ہے کہ ہر مہمان کے جانے پر میں یُونہی اداس ہوتی ہوں۔۔۔ لیکن اس بار یہ اُداسی یُوں سوا ہے کہ تم دونوں کے چہروں سے لگتا ہے کہ تم لوگ یہاں سے ناکام لوٹ رہے ہو۔"

اب کی بار وہ بولی اس کا لہجہ عجب کہانیوں کے کرداروں کا سا تھا۔ ایسے کردار کہ جو کہانیوں میں زیادہ شامل نہ ہو کر

بھی۔۔۔کسی کہانی کا اہم تر جزو ہوتے ہیں۔جیسا کہ اُن کی سنگلاخ مسافتوں کا بھرپور ادراک رکھتے ہوئے وہ ان کی کہانی اور اس سے وابستہ درد سے بھی بے وجہ سا ربط محسوس کر رہی تھی۔

"ہمم۔۔۔بھلے ہمیں وہ مراد نہیں ملی کہ جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے لیکن تمہارا بہت شُکریہ ماہا خان کہ تم نے ہمیں یوں محبت دی کہ ہم کبھی چاہ کر بھی تمہیں بھول نہیں پائیں گے۔"

اپنی جگہ سے اٹھ کر ایمان کو بھی اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سفیر نے اِس ساری گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا تو کُچھ بھی کہے بنا وہ نم دیدہ سی مسکرا دی تھی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دونوں یہاں کیا شے یا کس شخص کو تلاشنے آئے تھے لیکن جب سے وہ آئے تھے اُس نے بارہا ان کے لیے صدق دل سے دعا کی تھی کہ انہیں ان کا مقصود لازمی ملے۔اور اب انہیں یوں شکستگی سے لپٹ کر واپسی کی راہ ناپتے دیکھ کر وہ حقیقتاً بڑی دلگیر تھی۔

اس سے اگلی صبح کا وہ منظر بہت سوگوار تھا کہ جب ایک ایک کر کے سفیر اپنے بیگز جیپ میں منتقل کر رہا تھا اور اس کے ہر دفعہ بیگ اٹھانے پر، ہوٹل کے استقبالیہ زینوں سے جیپ تک اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا زین بڑی لجاجت سے اسے روکنے کی کاوشوں میں تھا۔

"صرف آج کے لیے رک جاؤ سفیر بھائی۔۔۔میں آپ کو بہت سی نئی جگہیں دکھاؤں گا۔ابھی اس پر میرا دل راضی نہیں ہوتا کہ آپ یہاں سے چلے جاؤ۔"

مُسلسل اسی تکرار کو سنتا سفیر بیگ شانوں پر لٹکائے ہوئے جیپ کی جانب بڑھتا یکا یک رک گیا تھا۔

"نہیں بھائی۔۔۔تو چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بھی بھاری بھاری ریٹس لگاتا ہے لہٰذا ہم نہیں رکنے والے۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ چند قدم کی مسافت پر کھڑی ماہا خان اور ایمان راجپوت کی طرف دوڑائی تھی جو کہ ایک دوسرے سے الوداعی ملاقات کر رہی تھیں۔

"قسم سے بھائی اب پورے ریٹس بتاؤں گا۔پلیز رک جاؤ ناں آج کا دن۔۔۔ابھی تو آپ نے ہمارا علاقہ پوری طرح سے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

اس کی بات پر اپنی کارستانیوں سے فوراً تائب ہوتا وہ اس پل بہت معصوم لگا تھا۔اتنا معصوم کہ ایک پل کو رک کر اس کے بنے ہوئے بال بگاڑتا سفیر بہت محبت سے کہنے لگا۔

"میں جانتا ہوں ساشے پیک کہ تم ہمارے جانے سے اُداس ہو۔۔۔اور یقین کرو یہاں سے جاتے ہوئے یہی

اُداسی ہمیں بھی ہے۔لیکن اب ہمیں جانا ہوگا۔ہم اس سے زیادہ قیام کہیں نہیں کر سکتے۔"

اور آخرش اس کا جواب سنے بنا ایمان کو آنے کا اشارہ کرتا وہ جیپ کی جانب بڑھ گیا تو منہ بسورتے ہوئے زین نے تادیر اس کی پشت کو گھورا۔ادھر ماہا خان سے اجازت لیتی ایمان دھیرے دھیرے چلتی اِس کے قریب آئی اور دوزانو بیٹھ کر اسے خود سے گلے لگاتے ہوئے اس کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا۔

ان دونوں بہن بھائیوں سے جدا ہوتے ہوئے وہ سچ مچ بڑی دلگرفتہ تھی۔

زین سے ملنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا کہ ماہا خان کو الوداعی ہاتھ ہلاتے ہوئے سفیر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا ہے اور اس کی جانب دیکھتا اب فقط اسی کی آمد کا منتظر ہے۔ایک نرم سی مُسکراہٹ سے ماحول کی سوگواریت کو کم کرتی ہوئی وہ ایک ساکتی ردھم سے بڑھی اور اپنی نشست پر جا بیٹھی۔اور اس کے بیٹھتے ہی ان کی جیپ کا پتھریلی شاہراہ پر ہولے ہولے سرکنا تھا کہ زین یوں اپنی جگہ سے چھوٹتے ہوئے ان کی جیپ کے پیچھے لپکا کہ جیسے اچانک سے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہو۔

"ایک منٹ سفیر بھائی۔۔۔ادھر ساتھ کے گاؤں کی بہت خوب صورت جھیل تو آپ نے دیکھی ہی نہیں۔وہ ایک چرواہے کی ذاتی ملکیت ہے۔پلیز آج رک جائیں ناں۔۔۔میں آپ کو وہ دکھا کر لاؤں گا۔"

جیپ کا دروازہ تھامے حسبِ سابق اس کے ساتھ ساتھ چلتا وہ بہت جوش سے بولا تو ان دونوں نے بہت بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"جاؤ زین۔۔۔پلیز۔اب ہم نہیں رک سکتے۔سمجھنے کی کوشش کرو۔"

جیپ سے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے سفیر نے قدرے رفتار بڑھا دی تو اُس نے اور تیزی سے چلتے ہوئے ایک بار پھر سے اسی جگہ پر گرفت کر لی۔

"اس چرواہے کا بیٹا بڑی پیاری بانسری بجاتا ہے سفیر بھائی۔مجھے یقین ہے کہ آپ سنیں گے تو آپ کو بہت پسند آئے گی۔" منت سماجت کے سے لہجہ میں گویا اک لالچ سا دیتا وہ اسے کسی بھی طور بس روک لینا چاہتا تھا۔

"نہیں زین۔۔خدارا تم واپس جاؤ۔ہمیں دیر ہو رہی ہے۔صرف بانسری سننے کے لیے ہم کہیں نہیں رک سکتے۔"

اب کی بار جیپ کی باڈی سے اس کا ہاتھ سفیر نے ہی ہٹایا لیکن یہ الفاظ ایمان نے کہے تھے۔اب یوں ہوا کہ زین کے چہرے پر روشن، امید کے سارے دیے یکا یک بجھ سے گئے اور جیپ سے پیچھے رہ کر فلک شگاف لہجے میں وہ بس یہی

چیخ کر رہ گیا تھا۔

" آپ لوگ بھی " خدارا " رک جاؤ۔۔ کہ چرواہے کا وہ بیٹا آپ ہی کے شہر لاہور سے آیا ہے۔ ارے جاتے جاتے ایک بار اُس سے مل تو جاؤ۔ "

ادھر جیپ میں من وعن اس کا حرف حرف سنتے سفیر اور ایمان نے بڑی بے یقین سی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اِرد گرد سے بے نیاز ہوئے گویا ساکتی مجسمہ ہو گئے تھے۔

" گاڑی روکو سفیر۔۔ تم نے سنا کہ اس نے کیا کہا ہے؟ "

ایمان کی لرزتی ہوئی آواز پر سفیر کو ہوش آیا کہ وہ تو منزل کے بہت پاس سے ہو کر پھر سے دور جا رہا ہے۔ اس نے ایک جھٹکے سے بریک دبائی اور اسے بھی اترنے کا اشارہ کر کے اپنی جانب کا دروازہ کھولتا تقریباً اچھلتے ہوئے باہر نکلا۔ اگلے ہی پل زین اور ماہا خان نے بیک وقت ان دونوں کو بے تحاشا سا مچل کر اپنی سمت واپس بھاگتے دیکھا تو اپنی جگہ سے چھوٹتے وہ دونوں بھی تیزی سے انہی کی جانب بڑھے۔

" کیا کہا تم نے؟ کس چرواہے کا کون سا بیٹا اور وہ کہاں سے آیا ہے؟ " ایمان سے پہلے زین تک پہنچ کر، اُسے دونوں بازوؤں سے تھامتے ہوئے، بڑی بے تابی سے ہلا ہلا کر پوچھتا سفیر اپنے ساتھ ساتھ پورے ماحول و منظر کو بھی بے قرار کرنے لگا تو ماہا خان نے بہت حیرت سے کبھی اسے تو کبھی ایمان کو دیکھا۔

" وہ ایک چرواہے کا بیٹا ہے اور پہاڑی سے اُس پار رہتا ہے۔ یہاں بیکری میں کچھ مقامی لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ وہ لاہور سے آیا ہے۔ اور آپ کا بھی تو وہی شہر ہے ناں۔۔۔ مجھے لگا شاید آپ اسے جانتے ہوں۔ "

قدرے گھبرا کر اٹک اٹک کر بتاتا زین نہیں جانتا تھا کہ وہ گویا اسے زندگی کی نوید سنا رہا ہے۔

" میرا دل کہہ رہا ہے سفیر کہ وہ مصطفین ہو سکتا ہے اور تم دیکھ لینا۔۔۔ کہ مصطفین ہی ہو گا۔ "

اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایمان نے تشفی آمیز لہجے میں کہا تو بہت آس سے اسے تاکتے ہوئے وہ زین کو چھوڑ کر اس کی جانب پلٹا۔

" لیکن کیا پتا وہ کوئی اور ہوا ایمان؟ کیونکہ یہ کہہ رہا ہے کہ وہ چرواہے کا بیٹا ہے۔ "

اُس کے آس بھری نظروں میں کئی خدشات بھی دھڑک رہے تھے۔

" یہ بات مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا ہو گا سفیر کہ اسے کسی کا بیٹا بن کر کہیں بھی رہنا خوب اچھے سے آتا ہے۔ ہونہ

ہو۔۔۔یہ وہی ہوگا۔ایک منٹ رکو۔۔۔"

جواباً کبھی اِسے اور کبھی ان دونوں بہن بھائیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے انتہائی یقین سے کہا اور پھر انگلی اٹھا کر اسے مزید کچھ بھی کہنے سے روکتی وہ سراپا حیرت ہوئے مُسلسل خود کو تاکتے زین کی طرف متوجہ ہوئی۔

" کیا تم نے اسے دیکھا ہے زین؟"

اس کے اس اچانک سوال پر وہ بے ساختہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

" کہاں؟ کیسا دکھتا ہے وہ؟ کیا اس کا قد سفیر جتنا یا اس سے تھوڑا کم ہے؟ اور بالوں کی مانگ یہاں سے یُوں دائیں جانب نکالتا ہے لیکن کچھ بال ماتھے پر گرے رہتے ہیں؟"

اِس کے اقرار کرنے پر بہت عجلت میں مصطفین کا حلیہ بتاتے ہوئے اُس نے اپنے بالوں کو ہو بہو اُسی کی طرز پر اشارے سے بنا کر دکھایا تو اب تلک خاموش کھڑی ماہا خان نے ایک بار پھر سے انہیں حیرت در حیرت یُوں دیکھا جیسے ان کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہو۔

"اسی بیکری میں دیکھا تھا۔اُس دن وہ وہاں سے کچھ سامان لینے آیا تھا تو اس کے جانے کے بعد لوگ اس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔وہیں سے مجھے پتا چلا کہ وہ لاہور سے آیا ہے۔۔اور ہاں جی بالکل وہ اسی طرح کا دکھتا ہے جیسے آپ بتا رہی ہیں۔"

تفصیلات بتاتے ہوئے وہ گویا اس کے گمان و یقین پر اک تصدیقی مہر ثبت کرتا چلا گیا تھا۔

" پلیز اسے کہو ماہا کہ ہمیں اس تک لے جائے۔وہی تو ہمارا مقصود ہے کہ جس کی تلاش میں ہم نے یہ سنگلاخ وادیاں کھنگالی ہیں۔ہاں ماہا۔۔۔اب ساری دعائیں مستجاب ہوئیں کہ اس جنت نظیر وادی سے وہ سچ مچ مل گیا ہے۔"

نم آنکھوں سے مسکراتی ہوئی اب کی بار وہ بے ساختہ بڑھی اور اسے گلے لگا کر ساری حقیقت عیاں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے جھلکتی ہر ہر حیرت کو تھپک دیا۔ایمان کی بات سن کر اس پہاڑی دوشیزہ کے لب بے طرح سے کھلنے لگے۔ اس کے خدا نے اس کے دعوؤں کا بھرم رکھ لیا تھا اور وہ اس بات پر بے انتہا خوش تھی۔

"ہاں یار ضرور۔۔۔وہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے۔شاید تم دونوں کو دور لگے لیکن پہاڑ واسیوں کو اتنا فاصلہ کچھ نہیں لگتا۔ زین ابھی لے جاتا ہے وہاں۔بس پہاڑی سے اُس طرف تم لوگوں کو پیدل اترنا ہوگا۔سفیر تم اپنی جیپ راستے سے ہٹا کر یہاں پارک کرو اور پھر چلے جاؤ۔"

مسرت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے وہ نرمی سے ایمان سے الگ ہوئی اور زین کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا اسے انہیں وہاں تک لے جانے کی تاکید کرنے لگی۔اس کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سفیر جیپ کی جانب پلٹ گیا تو خوشگواری سے مسکراتے ہوئے وہ سب اس کی واپسی کے منتظر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد دوسری جانب اترتے ہوئے جب وہ اس پہاڑی کے دامن میں موجود قدرتی میدان سے قریب پہنچے تو انہیں فضا سے بانسری کی دھن سنائی دینے لگی۔ایک پل کو رک کر ان تینوں نے سرد ہواؤں کے سنگ سنگ بہتے اس مدھر ارتعاش کو سنا اور پھر مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

میدان میں اتر کر لہلہاتے ہوئے دھنک رنگ پھولوں کے درمیان ایک طویل پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ان کی نگاہیں مُسلسل اسی مکان پر جمی رہیں کہ جہاں سے یہ میٹھے سر ابھرتے سنائی دے رہے تھے۔

یہ منظر اتنا دلفریب تھا کہ کبھی فرصتیں میسر ہوتیں تو یہیں کہیں آس پاس رک کر وہ صدیوں اسے بس دیکھنا چاہتے۔

اور اُسی نیل رنگ جھیل کے ساکن و برفاب کناروں کے گرد گھوم کر جونہی وہ سب اس گھر کے عین سامنے پہنچے، سفیر اور ایمان کو لگا کہ گویا کائنات بھر کی جزئیات سمٹ کر اسی ایک نظارے میں مقید ہو گئی ہیں۔

ہاں اس ڈھلوانی چھتوں والے خوب صورت گھر کے باہر، پتھریلی تراش سے بنی چار دیدہ زیب سیڑھیوں پر بیٹھ کر، آنکھیں موندے، سروں میں ڈوبا ہوا بانسری بجاتا وہ بوڑھے چرواہے کا جواں سال بیٹا۔۔۔ مصطفین شجاع ہی تو تھا۔

اسے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتی ایمان نے بے ساختہ سفیر کے مضبوط بازوؤں پر گرفت کی اور اِسے اور زین کو گھر کی دائیں جانب ایک اوٹ میں رہنے کا اشارہ کرتی، خود دبے پاؤں مصطفین کے بہت قریب چلی آئی۔ادھر جانے کب سے آنکھیں موند کر بانسری بجاتے مصطفین کو اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو کہیں درمیان سے ہی اپنی دھن کو توڑتے ہوئے اس نے ہولے سے آنکھیں کھول دیں اور ایمان کو بصد شوق و مسرت مُسلسل خود کو تاکتے پا کر اپنی جگہ سے یُوں جست بھر کر اٹھا کہ جیسے کسی نے شانوں سے تھام کر اسے ہوا میں اچھال دیا ہو۔

"ارے تم۔۔۔؟اور یہاں۔۔۔؟سچ مچ یہ تم ہی ہوناں ایمان۔۔۔؟"

آنکھوں میں اک جہانِ حیرت لیے ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترتا وہ یُوں بے یقینی سے بولا جیسے ابھی اسے چھو کر اس کے "ہونے" کا یقین کرے گا۔

"ہاں ہاں یہ میں ہی ہوں۔بھئی تمہارے چلے آنے کے بعد سے ہمارا کمرہ ابھی تک خالی تھا تو سوچا چلو اپنا کرایہ دار

ڈھونڈ لاتی ہوں۔۔۔اور دیکھو تو اتنا چھپنے کے باوجود میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا۔" لبوں پر طاری ایک دلنشیں مُسکراہٹ اور اندازِ بیان کی شوخیوں سے بالا، اس کا رنجور لہجہ صدیوں سی مسافتوں کا غماز تھا۔

"میں نے کہاں چھپنا تھا بھلا؟ تمہیں بتایا تو تھا کہ کہیں ایسی ہی کسی جگہ پر میں اپنا گھر بنانا چاہتا ہوں۔"

اس کے قریب آ کر رکتے ہوئے وہ عام تر لہجہ میں بولا تو وہ مبہم سا مُسکرا دی تھی۔

"ہاں۔۔۔یہی دیکھ رہی ہوں کہ بالآخر تم نے اپنے خوابوں سا گھر پا ہی لیا۔"

آس پاس سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے گویا اس کی تائید میں کہا اور پھر اس کے کُچھ بھی بولنے سے قبل مزید بولی۔" لیکن تمہیں بتانے۔۔۔بلکہ دکھانے کے لیے میرے پاس بھی کُچھ ہے۔۔۔"

اور اس کی بات پر اس نے عجب ناسمجھی کے سے انداز میں سر ہلایا تو وہ گویا اپنی بات کی وضاحت کرتی ہوئی بولی۔

"ہاں مصطفین۔۔۔تمہارے خوابوں سے اس گھر کی مانند میں نے بھی اپنے حصے کا آسمان چن لیا ہے۔"

اور اب کی بار وہ یُوں ٹکر ٹکر اس کی شکل جانچنے لگا جیسے وہ زمین سے نہیں ہو بلکہ مریخ زادی ہو۔

"سامنے آ جاؤ سفیر۔۔۔کہ کسی نگاہ کو تمہارا انتظار آج بھی ہے۔" جواباً بڑے اعتماد سے اُس کی سوالیہ نظروں میں جھانکتے ہوئے اس نے سفیر کو سامنے آنے کا کہا تو بڑے نپے تلے قدم رکھتے ہوئے، زین کا ہاتھ تھام کر وہ گھر کی دائیں اوٹ سے نکل کر اِن کے سامنے آ گیا۔۔۔اور فقط ایک بار اس پر نگاہ کر کے، پھر حیرت در حیرت ایمان کو گھورتے ہوئے مصطفین کی حالت ایسی گنگ تھی کہ گویا کاٹو تو بدن میں لہو ہی نہ ہو۔

"یہ۔۔۔یہ۔۔۔اسے کیوں ساتھ لائی ہو؟ اور تم۔۔۔؟ تم اس کے ساتھ؟؟؟ لیکن کیسے۔۔۔یعنی کس طرح سے؟" اٹک اٹک کہہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ میں دبی بانسری پر یُوں مضبوطی سے گرفت جمائی کہ جیسے ضبط و غم کی کسی انتہا پر آن رکا ہو۔

"خدارا مصطفین۔۔۔تم ایک بار اس سے بات تو کر کے دیکھو۔ یہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے اور میں گواہ ہوں اس پر کہ اپنی خطا کے ازالے کی خاطر اس نے تمہیں بے شمار ڈھونڈا ہے۔"

یکا یک اس کا بھڑکنا دیکھ کر، ایک قدم اس کی جانب بڑھتے ہوئے وہ بہت لجاجت سے بولی تھی کہ سفیر کی جانب غلطی سے بھی دیکھے بنا، فقط ایمان پر نگاہیں جمائے ہوئے وہ پہلے ہی کی طرح سے ایک ایک کر کے چاروں سیڑھیاں واپس چڑھ گیا۔

"مجھے بہت افسوس ہے ایمان کہ آخرش تمہارے چنیدہ، تمہارے حصے کے اِس آسمان کا سینہ بہت داغ دار ہے۔اور اِس کی خطاؤں سے متعلق تم مجھے کوئی صفائی یا وضاحت پیش ہرگز نہ کرو۔۔۔کہہ دو اس سے کہ ابھی کے ابھی یہاں سے واپس پلٹ جائے، کیونکہ بات کرنا تو درکنار مجھے اس کی صورت بھی نہیں دیکھنی۔"

اس کا تلخ تر لہجہ گویا زہر خند بھی تھا۔۔۔ایمان نے بڑی استعجابیہ نگاہوں سے یک ٹک مصطفین کا یہ انوکھا رنگ و روپ دیکھا کہ جس میں کسی خطاوار کے لیے معافی کا لفظ۔۔۔تو شاید تھا ہی نہیں۔اور بغور اُس کا لب ولہجہ و انداز سفیر احمد کو اِس پل یُوں لگا جیسے ذرا ذرا، تھوڑا تھوڑا کر کے، فقط جسم ہی کیا وہ روح تلک سے بھی مسمار ہو رہا ہے۔

ہاں بالکل۔۔۔کچھ لوگ اپنے تندوترش حرف ونگاہ سے ہماری ذات کو یُوں چھوتے ہیں کہ حصارِ جاں سے نکل کر ہم بھربھری سی کسی ریت کی مانند اپنی ہی اطراف میں بکھر جاتے ہیں۔

اب اس سے قبل کہ ان دونوں کی یہ گفتگو یا بحث مزید طوالت اختیار کرتی، بالآخر اُس نے دخل اندازی کا فیصلہ کرلیا۔

"اسے کہو ایمان کہ بھلے میری صورت نہ دیکھے لیکن اپنے کیے پر، پشیمانی کے اظہار کا کم از کم ایک موقع تو مجھے ضرور دے۔"

جواباً بلا تاخیر اس کی بات اچکتے ہوئے مصطفین یُوں درشتی سے بولا جیسے بین السطور اس سے لمحاتِ رائیگاں کا حساب چاہتا ہو۔

"اسے بھی کہہ دو ایمان کہ شرمساری کا کوئی ایک بھی حرف جذبات کی اس ناقدری کو چھو ہی نہیں سکتا کہ جو محبتوں کے کسی عروج پر کردی گئی ہو۔"

آخرش کمالِ ضبط سے اس کی آواز کانپنے لگی تو ایمان کو لگا جیسے وہ ابھی۔۔۔بس رو دے گا۔اس نے بہت بے بس نگاہوں سے لب بستہ کھڑے سفیر اور کبھی اِسے تو کبھی اُسے تاکتے ہوئے زین کی طرف دیکھا تھا۔

"تم ہی کچھ کہو سفیر۔۔۔اب میں تو بس ہاری۔"

دونوں ہاتھ اٹھا کر شانے اچکتے ہوئے وہ اس طرح سے ایک طرف ہوئی جیسے سفیر احمد کو مصطفین کے مقابل ٹھہرنے کے لیے راہ فراہم کر رہی ہو۔اُس نے بس ایک پل کے لیے اپنی جگہ پر رک کر ایمان کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھا اور چند قدم بڑھتا ہوا اِس کی کچھ دیر پہلے والی جگہ پر آن رکا۔ادھر اسے یُوں اپنے مقابل رکتے دیکھ کر، مصطفین نے اسی پل رخ بدلا اور قدم بڑھانے سے قبل ایمان کو اپنے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے سفیر کو بالکل نظرانداز کر گیا۔اب یُوں ہوا کہ اُسے قدم قدم دروازے کی جانب بڑھتے دیکھ کر سفیر نے اُس پر کوئی اسم پھونکنے کا فیصلہ کرلیا۔

"چلوتم مجھے معاف نہیں کرو مصطفین ۔۔۔لیکن جسے میرے پاس کبھی چھوڑ کر چلے آئے تھے کم از کم اس کی خبر گیری تو کرو۔تمہیں تو پتا بھی نہیں کہ تم سے جدا ہو کر وہ کس حال میں زندہ ہے؟"

اور اس کے تمام تر لہجہ و لفظ و حرف میں ایسا ہی کوئی اسرار بسا تھا کہ سچ مچ انہی قدموں پر رکتے ہوئے وہ بہت تعجب سے مڑا۔وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے۔ہاں اس پل اس کا روم روم پکارا کہ یہ ثومیہ شاہجہاں کا ذکر ہے۔

"کیا ہوا اسے؟ کیسی ہے وہ؟ جلدی بتاؤ مجھے۔یُوں پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟"

نہایت تیزی سے زینہ اترتے ہوئے، قریب آ کر، اس نے اسے دونوں شانوں سے دبوچا اور بڑے زور زور سے ہلاتے ہوئے یُوں بے قراری سے پوچھنے لگا کہ کئی کئی خدشات اس کے لہجے میں دھڑک اٹھے۔

"سر پر اک چوٹ لگنے کے سبب وہ پاگل خانہ میں داخل ہے مصطفین ۔۔۔لیکن اب اس کی حالت بالکل ٹھیک ہے۔اور یقین کرو اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

کبھی آنکھیں جھکا کر تو کبھی دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہتا وہ جیسے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔اس کی بات پر وہ جس نے ابھی ابھی کہا تھا کہ اس کی صورت تلک نہیں دیکھے گا یُوں ٹکر ٹکر اس کا چہرہ تاکنے لگا جیسے نگاہیں ابد تک کے لیے یہیں پتھرا گئی ہوں۔

"وہ ادھر دیواروں سے سر پھوڑتی ہو گی اور تم کہتے ہو کہ اس میں تمہارا کوئی دوش ہی نہیں۔اور جب وہ پاگل خانہ میں داخل ہے تو پھر بالکل ٹھیک کیسے ہے؟؟؟ کان کھول کر سن لو سفیر کہ مانو یا نہیں مانو لیکن اس کی ہر شکستہ حالت کے ذمہ دار صرف و فقط تم ہوں گے۔"

بالآخر کئی حیرتوں کی زد میں رہ کر، اپنی بے بسی کے اظہار کے طور پر کبھی دائیں تو کبھی بائیں جھولتا وہ یُوں بے قرار ہو کر بولا کہ ایمان کے ساتھ ساتھ سفیر اور چھوٹے زین کو بھی لگا کہ وہ ابھی اور بس ابھی ہی رو دے گا۔انہیں یُوں دوبدو ہوتے دیکھا تو اس بار یہ سب مباحثہ سمیٹنے کے ارادہ سے ایمان جلدی سے اندر آئی۔

"میری بات سنو مصطفین ۔۔۔یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے کہ ثومیہ شاہجہاں کی حالت کا ذمہ دار یہ ہرگز نہیں ہے۔اُن کا کوئی گھریلو معاملہ تھا جس کی وجہ سے اسے سیڑھیوں سے گر کر سر میں چوٹ لگی اور ذہنی توازن کھو کر وہ پاگل خانہ جا پہنچی۔لیکن یہ وقت اِن وضاحتوں کو کہنے سننے کا ہرگز نہیں ہے۔ابھی تم صرف یہ دیکھو کہ کتنی کوششوں سے وہ تمہیں ایک ایسی جگہ، ایسے مقام سے بھی ڈھونڈنے آیا ہے کہ جس مقام پر تمہاری موجودگی سے، تمہارے خدا کے سوا کوئی آگاہ ہی

نہیں تھا۔ابھی تم صرف واپسی کے لیے رختِ سفر باندھو اور ہمارے ساتھ چلو۔وہ تمہیں بلا رہی ہے مصطفین۔۔۔کیونکہ ذہنی ابتری کی اِس حالت میں اپنی ذات کے اعتماد کو پھر سے قائم کرنے کے لیے اُسے تمہاری ضرورت ہے۔پلیز۔۔۔"

نہایت نرمی سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر، لہجے کے زیر و بم میں، وہ یُوں حرف حرف سمجھانے لگی کہ نا چاہتے ہوئے بھی اسے قائل ہونا ہی پڑا۔جواباً مہر بہ لب رہ کر، ایک سلگتی ہوئی نگاہ سفیر احمد پر ڈالتے ہوئے، اس نے پہلی بار زین کی یہاں موجودگی کو محسوس کیا اور واپس پلٹتے ہوئے کمالِ ضبط سے بولا۔

"باہر ٹھنڈ بہت بڑھ رہی ہے ایمان۔۔۔تم لوگ اندر آ جاؤ۔تمہارے ایک ایک کپ قہوہ پینے تک میں ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔"

اور اس کی بات سن کر خلافِ عادت کب سے خاموش کھڑا زین اپنی جگہ سے چھوٹتا ہوا ان دونوں کے عین سامنے آن رکا اور سر سے کوئی بوجھ اتار پھینکنے کے سے انداز میں بولا۔

"چلو۔۔۔تم دونوں کی تو نکل پڑی۔وہاں سے تو بڑی خوشی خوشی ساتھ آیا تھا کہ کوئی اچھا سا استقبال ہو گا۔لیکن تم سب دوستوں کے آپسی "سہانے تعلقات" سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک قدم بھی اندر نہیں رکھنے دے گا۔ اف۔۔۔کسی کی ایسی جلی کٹی ملاقات پہلی بار دیکھی ہے۔"

ایک ہی سانس میں کب سے سنبھالے ہوئے لفظ اگلتا وہ جواب سنے بنا ان سے پہلے ہی اندر چلا گیا تو عجب کیفیات میں گھرے مُسلسل ایک دوسرے کو تاکتے وہ دونوں، اس کے طنز پر بس ہولے سے ہنس دیئے تھے۔

کئی بار من پسند لوگوں سے سنے گئے کُچھ تند و ترش لفظوں کی تھکن اتارنے کے لیے ہمیں یُونہی اپنے آپ میں بے وجہ سا ہنسنا پڑ جاتا ہے۔

حالات انسان سے وہ فیصلہ جات اور عوامل بھی کروا لیتے ہیں جنہیں انسان من ہی من اندر، بے شمار بار کبھی نہ کرنے کی ٹھان چکا ہوتا ہے۔اس سرد دوپہر میں ان دونوں کے سنگ واپسی کے لیے رختِ سفر باندھتے مصطفین نے بھی ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ دُنیا ادھر سے ادھر ہو یا بھلے کائنات ہل جائے۔۔۔وہ کبھی پلٹ کر لاہور نہیں جائے گا۔یہاں سے واپسی کا اک ایک منظر کسی اُداس پہر کی طرح اُس کی آنکھوں میں ہمیشہ کے جم گیا تھا۔اُسے بوڑھے چرواہے کی سن رسیدہ آنکھوں سے جھلکتا وہ اضطراب کبھی نہیں بھول سکتا تھا جو اس کی واپسی کے ذکر پر اُن آنکھوں میں یکا یک ہی کہیں سے آن بسا تھا۔مصطفین ان دونوں میاں بیوی کا سگا بیٹا تو نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ ایک بیٹے کی طرح ہی ان کا خیال رکھتا تھا اور

بہت تعظیم وادب سے پیش آتا تھا۔

"ابھی مجھے جانا ہوگا انکل لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد میں لوٹ آؤں گا۔۔۔آپ ہی تو کہتے تھے کہ اپنی زیست کہانی کو جلد از جلد تکمیل دو۔تو بس اس کہانی میں شامل کچھ کردار مجھے یہیں آن ملے ہیں اور کچھ بہت دور کسی کھڑکی کی سل پر سوگواری سے ہاتھ پھیرتے ہوئے میری راہ تاکتے ہوں گے۔لہٰذا مجھے اجازت دیں کہ کہانیوں کو انجام سے دوچار کرنے کے لیے اتنا طویل انتظار نہیں کرواتے......نہیں تو کردار برامان جائیں ناں،تو کہیں پر مر بھی جاتے ہیں۔"

یہیں واپسی کے عہد کرتے ہوئے،اجازت طلب لہجے میں جب اس نے اپنی مجبوریوں کو رویا تو وہ دونوں میاں بیوی بالکل خاموش ہو گئے تھے۔فقط ایک دکھ بھری نظر اُنہوں نے ایمان اور سفیر پر ڈالی اور باری باری مصطفین کو گلے لگا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

"ہاں تم چلے جاؤ بیٹا۔۔لیکن یاد رہے کہ اب کی بار یہاں آؤ تو اس کہانی سے اپنے حصے کا وہ مرکزی کردار بھی ضرور چن لانا کہ جس کی یاد کا موسم تمہیں کبھی کھل کر ہنسنے نہیں دیتا۔ہم تمہارا انتظار کریں گے۔خدا حافظ۔۔۔"

ان کے الوداعی لفظوں سے صرف اس کی خوشی ورضا اور محبت چھلک رہی تھی۔

وہاں سے رُخصت پا کر وہ لوگ اسی راستے سے پہاڑی چڑھتے ہوئے "ماہاز ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ۔۔۔" میں چلے آئے کہ جہاں داخلی صحن میں ہی یہاں سے وہاں چکراتی،شہزادیوں سی آن کی مالکہ وہ پہاڑی دوشیزہ ان کی شدّت سے منتظر تھی۔ان پر نگاہ ٹھہری تو وفورِ شوق سے مصطفین کو دیکھتے ہوئے وہ تیزی سے ان کے قریب آئی تھی۔

"ارے واہ۔۔۔آپ لوگوں کی کہانی کا تو ہر اک کردار سُندر رہے۔"

بے ساختگی سے کہتی وہ یکا یک ہی چپ ہو گئی تو اس کے کھرے پن پر وہ سارے بس مُسکرا دیئے۔اور سفیر کی آنکھوں کا مفہوم سمجھ کر،اُسی لحظہ وساعت میں ایمان نے بہت محبت سے اُس کی کلائی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بہت شُکریہ پیاری ماہا۔صد شکر کہ یہ مل گیا ہے۔بس اب ہمیں اجازت دو کیونکہ ہمیں پہلے سے بہت دیر ہو چکی ہے۔باقی اب ان شاءاللہ تم سے رابطہ رہے گا اور فون کالز کے ذریعہ سے تفصیلی گفتگو ہوتی رہا کرے گی۔ہاں۔۔۔؟"

اس کی بات پر وہ پہاڑی دوشیزہ ایک پل کے لیے لب کچلتی رہ گئی تھی۔

"ہمم۔۔۔میں سمجھ سکتی ہوں ایمان۔بے شک تم لوگ اب جا سکتے ہو۔لیکن بس اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری کہانی میں شامل تھوڑے سے دو کردار میں اور زین بھی رہے ہیں۔ہمیں کبھی بھولنا نہیں۔"

ایک طرف ہٹ کرانہیں جیپ کی جانب بڑھنے کا اشارہ کرتی وہ بہت اُداسی سے بولی تو سفیر اور مصطفین نے بہت عقیدت و احترام سے اُسے الوداعی ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گئے جبکہ ماہا خان سے گلے ملتی ایمان، گالوں پر دیئے گئے بوسوں کی صورت اس پر محبتیں نچھاور کرنے لگی تھی۔ سفیر کے جیپ نکال کر لانے تک مصطفین نے تھوڑا فاصلے پر رک کر اس کا انتظار کرنے لگا تو ایمان سے الگ ہوتی ماہا بہت نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر ہوٹل کے داخلی زینوں کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔

"لو یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ تم لوگوں کے لیے سوغات کے طور پر یہ کُچھ خشک میوہ جات پیک کیے ہیں جو کہ یہاں کی پیداوار ہیں۔ اب اچانک یاد نہیں آتا تو ادھر ہی دھرے رہنے تھے۔"

ایک زینے پر دھرے پلاسٹک بیگ کی جانب اشارہ کرتی، اپنے بھولنے کو کوستی وہ ماتھے پر ہاتھ مار رہی تھی۔

"ارے یہ تو تم نے تکلف کیا یار۔ بھلا اس کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ دونوں انہی لگاوٹوں اور تکلفات کے ذکر میں تھیں کہ جیپ کو پتھریلی شاہراہ پر نکالتا سفیر جیپ کو مصطفین کے قریب روکتا ہوا، اتر کر اِن تک چلا آیا۔

" کیا ہوا ماہا؟ لگتا ہے تم نہیں چاہتیں کہ ہم یہاں سے واپس جائیں۔"

بشاشت سے کہتا وہ باری باری انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو ماہا ہولے سے مُسکرا دی تھی۔

"دل تو واقعی نہیں چاہتا لیکن ابھی بس یہ تحفہ دینے کے لیے روکا تھا۔"

اس کی بات پر تشکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتی ہوئی ایمان نے جھک کر وہ بیگ اٹھانا چاہا تھا کہ سفیر جلدی سے آگے ہوا۔

"ارے رکو میں اٹھاتا ہوں۔ اور تمہارا بہت شُکریہ ماہا۔۔ یقیناً تم بہت اچھی لڑکی ہو۔"

اور بیگ اٹھا کر جواباً فقط یہی کہتے ہوئے وہ ایک دلکش و دلپذیر سی مُسکراہٹ ماہا خان کی طرف اچھالتا ہوا واپس بھی پلٹ گیا تو ایمان نے بے ساختہ قدرے فاصلے پر اب تک کھڑے مصطفین کو دیکھا جو بغور ان دونوں کے باہمی عوامل جانچ رہا تھا۔ اس نے ماہا خان سے گلے مل کر اسے الوداعی بوسہ دیا اور قدم قدم چلتی جیپ کی جانب بڑھنے لگی۔

" تمہیں اس کی کسی بھی بات سے لگتا ہے یہ تم سے محبت کرتا ہوگا؟ اس کی زبان پر زیادہ بھروسہ مت کرنا۔ تم اسے مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتیں۔"

مصطفین کی دھیمی آواز پر اس کے متحرک قدم اس کے بالکل پاس ساکن ہوئے تھے۔ سوالیہ نظریں اس پر گاڑے وہ اپنے جواب کا منتظر تھا۔

" پیار کسی بھی زبان یا بھاشا میں ہو تو سمجھ آتا ہے مصطفین۔۔۔ پیار صرف لفظوں میں نہیں ہوتا۔ کہیں یہ لہجوں کے ہنر، عوامل اور دیکھنے میں پنہاں ہے تو کہیں ان سب سے بھی ماورا ہوگا۔ کوئی جاوداں سی حرکت، کسی خیال کا قصہ۔ میری نظر میں تو اس نے میرے جھکنے سے پہلے جو وہ بیگ اٹھایا، وہ بھی اس کی محبت تھی۔ یقین کرلو کہ کسی کا ہلکا سا یا رتی بھر احساس بھی۔۔۔ سراسر محبت ہوتا ہے۔"

فقط ایک پل کو ٹھہر کر اس نے یہ لفظ ترتیب دیئے اور پھر حرف حرف اس کی آنکھوں میں الٹتی ہوئی اپنے آپ میں مُسکرانے لگی کہ اس بیان پر کئی حیرتوں میں گھرا وہ اسے بس تاکتا رہ گیا تھا۔

" چلو جیسے تمہیں مناسب لگے۔ اور یوں بھی۔۔۔ یہ تو طے ہے کہ اپنی دلپذیر اداؤں سے کسی کے بھی دل میں اتر جانا اسے خوب اچھے سے آتا ہے۔"

جواباً شانے اچکا کر سفیر کے متعلق رائے دیتا وہ اسے ساتھ لیے جیپ میں آن بیٹھا تو ان دونوں کی معنی خیز چپ پر دھیان و نگاہ رکھتے ہوئے سفیر نے جیپ کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا۔

تو بالآخر ان سنگلاخ وادیوں سے اپنا مقصود لیے وہ دونوں واپس پلٹ گئے تھے۔

گلگت پہنچ کر انہیں اسلام آباد کی فلائٹ لینی تھی لیکن چونکہ خرابی موسم کے باعث گلگت ائیر پورٹ بند کر دیا گیا تھا لہٰذا دو سے تین دن کے مزید زمینی سفر میں کہیں کہیں آرام کی غرض سے قیام کرتے ہوئے وہ لوگ آخرش لاہور پہنچ گئے۔

لاہور ویسا ہی تھا جیسا مصطفین چھوڑ کر گیا تھا۔۔۔ ہاں لوگ تھوڑے بدلے بدلے تھے اور بدل تو وہ خود بھی بہت سا گیا تھا۔

سفیر نے اسلام آباد سے ہی مریم جہانگیر سے رابطہ کر کے اسے کہہ دیا تھا کہ مصطفین شجاع مل گیا ہے اور اب وہ جلد از جلد اس کی ثومیہ شاہجہاں سے ملاقات کا بندوبست کرے۔ وہ جانتا تھا کہ پاگل خانہ لاہور میں خواتین سیکشن میں اس ملاقات کا انتظام کرنے میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور لگے گا اور اس کا یہ گمان یوں سچ ثابت ہوا کہ جس رات وہ سب لاہور پہنچے، ملاقات کا وقت اس سے ایک دن بعد کا مل سکا تھا۔

اس مختصر دورانیہ کے لیے مصطفین نے اپنی رہائش کا بندوبست کسی ہوٹل میں کرنا چاہا تو ایمان نے بری طرح جھڑک

دیا تھا۔

"بس کرو مصطفین۔۔۔امی چلی گئیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے گھر اور ہم سے تمہارا وہ تعلق بھی ٹوٹ گیا۔چپ چاپ میرے ساتھ گھر چلو شاباش۔ابو بھی اتنا یاد کرتے ہیں تمہیں۔۔۔"

اور اسے اپنی جون پر لوٹتے دیکھ کر انتہائی سنجیدگی سے بیٹھا وہ زیرِ لب مُسکرا دیا۔

"اف۔۔۔اپنے شہر پہنچتے ہی اسی پرانی ڈگر پر لوٹ رہی ہو تم۔"

بڑی طمانیت سے آنکھیں جھپکتا وہ یُوں گویا ہوا جیسے اس کے لہجے کو کبھی بہت یاد کرتا رہا ہو۔ جواباً کھل کر مسکراتی ہوئی ایمان راجپوت کے چہرے پر وہی ازل سی بے پرواہی عود کر آئی تھی۔

"یُوں بھی میں ابو کو سچ بتا کر اور خالہ سے جھوٹ بول کر آئی ہوں کہ میں اپنے ادارے کی طرف سے بطور ٹرینرِ گائیڈ ایک قافلے کے ساتھ پہاڑوں پر جا رہی ہوں۔اب تم ساتھ ہوں گے تو خالہ سے بولا ہوا جھوٹ نبھانا آسان ہو جائے گا اور کہہ دوں گی کہ واپسی پر اسلام آباد میں کہیں سے ملے ہو۔"

جلدی جلدی اسے گھر پہنچنے کی احتیاطیں بتاتی وہ اس کا جواب سنے بنا سٹیئرنگ سنبھالے بہت دلچسپی سے ان دونوں کا مکالمہ سنتے سفیر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اس کی باتوں پر نہ جاؤ اور تم ہمیں گھر چھوڑ دو پلیز۔"

اور نہایت فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بھی چپ چاپ، گاڑی کو یادگار چوک سے اندرون لاہور کو لے جاتی شاہراہ پر موڑ دیا تھا۔

خیر قصہ المختصر یہ کہ وہ دونوں گھر پہنچے اور بیرونی دروازے کو غیر مقفل پا کر آگے پیچھے اندر چلے آئے۔

" آئے شاواشے۔۔۔آج تو میرا پتری گھر آ گیا ہے۔"

جونہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئے، سامنے صوفوں پر براجمان کھانا تناول کرتے خالو ظفران دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر بہت حیرت سے چلائے تھے۔

"بس دیکھ لیں ابو۔۔۔میں نے کہا تھا ناں کہ اسے ڈھونڈ کر لاؤں گی تو لے آئی ہوں۔"

قدرے چہک کر کہتی ایمان نے ان دونوں کو بہت والہانہ انداز میں ایک دوسرے سے گلے ملتے دیکھا تو آنکھوں میں آئی نمی کو بمشکل پلکوں سے پار روک سکی تھی۔ایک دوسرے کو باہم بھینچتے وہ دونوں آپسی حال احوال دریافت کر رہے

تھے۔زندگی میں یہی ہوتا ہے کہ احباب کے مابین ہوتی طویل عرصے بعد کی ملاقاتیں بے شمار مسرتوں سے نوازنے کے سنگ بہت سی جذباتیت میں بھی مبتلا کرتی ہیں۔

"ہاں پتری۔۔۔مجھے یقین تھا تم کامیاب ہو جاؤ گی۔پر یہ سب باتیں اب بعد میں، پہلے چلو آؤ تم لوگ بھی کھانا کھاؤ۔" پلٹ کر ایمان سے گلے ملتے ہوئے خالو نے اُس کا ماتھا چوما اور پھر فوراً طعام میں شمولیت کی دعوت دی۔

"نہیں خالو جی۔۔۔ہم نے راستے سے کھانا کھا لیا تھا۔آپ کھائیں ہم یہیں بیٹھتے ہیں۔"

ایمان سے پہلے جواب دیتے ہوئے مصطفین نے انہیں دونوں ہاتھوں سے بازوؤں سے تھاما اور واپس ان کی پہلے والی جگہ پر بٹھا دیا۔خالو کے صدقے واری ہوتے اس انداز سے اسے بے ساختہ خالہ کنیز کی یاد آئی تو ایک افسردہ سانس بھر کر رہ گیا۔

"اور سناؤ یار۔۔کہاں چلے گئے تھے؟ بندہ کوئی اتا پتا دے کر جاتا ہے کہ کسی نے رابطہ کرنا ہو تو آسانی سے کر سکے۔"

اپنی نشست سنبھالتے ہوئے خالو پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے تو فقط ایک پل کو یہاں بیٹھتی ایمان انہیں گفتگو میں مشغول ہوتے دیکھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔اسے مصطفین کے لیے کچھ چائے پانی کا انتظام کرنا تھا۔

"کہاں جانا تھا خالو جی؟ بس یہیں تھا۔آپ سنائیں کام کیسا چل رہا ہے؟ اپنی صحت طبیعت ٹھیک رہتی ہے؟ خالہ رضیہ کیسی ہیں؟ کل آئیں گی کیا؟ ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔۔۔"

ایمان باورچی خانے کے دروازے کے پاس پہنچی تھی جب اس نے مصطفین کی یہ آواز سنی، جو کہ خالو کے سوال کو بہت خوب صورتی سے ٹال گیا تھا۔

مڑ کر فقط ایک نگاہ اس کی جھکی جھکی شرمساری نظروں پر کرتی وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئی تھی۔

یہ اگلی صبح کا منظر ہے کہ جب اوپری منزل کی راہداری میں اپنے کمرے سے باہر کھڑا مصطفین حسبِ سابق بازار کا معمول جانچ رہا تھا کہ بنا آواز سیڑھیاں چڑھتی ایمان راہداری کے دوسرے سرے پر آن رکی تھی۔

"ارے۔۔۔تم اتنی صبح صبح جاگ گئے؟ لگتا ہے رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی ہے؟"

اسے دیکھ کر قدرے حیرت سے کہتی وہ قریب چلی آئی اور اس کی مدھر آواز پر وہ مُسکراتے ہوئے پلٹا تھا۔

"نہیں نیند تو بہت مزے کی آئی تھی لیکن اب روز سویرے جلدی جاگنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔اس لیے اپنے مقررہ وقت سے دو منٹ بھی اوپر ہوں تو بستر چبھنے لگتا ہے۔خیر تم سناؤ کہ تم کب سے اتنی جلدی جاگنے لگیں؟ یاد ہے ناں خالہ کو

سب سے زیادہ غصہ تمہارے دیر سے اٹھنے پر آتا تھا۔"

جواباً خوشدلی سے کہتے ہوئے آخرش وہ تھوڑا اُداس بھی ہو گیا تو اپنی ماں کے ذکر پر ایمان کے لبوں پر طاری وہ اک جاندار سی جو مسکان تھی، شکستگی میں ڈھل گئی۔

"ظاہر ہے اب امی نہیں ہیں تو ابو کے صبح کے سارے کام میری ذمہ داری بن گئے ہیں۔اور ٹھیک کہا تم نے کہ امی سب سے زیادہ اسی بات پر ناراض ہوتی تھیں کہ جلدی جاگا کروں۔"

آنکھیں جھکا کر دھیما دھیما بولتی وہ فقط ایک پل کے لیے سانس لینے کو رکی تھی کہ مصطفین نے کچھ کہنا چاہا لیکن انگلی کے اشارے سے اسے منع کرتی وہ پھر سے بولنے لگی۔

"یہ زندگی میں بار بار ہمیں عادتیں بدل دینے کا کہنے والے، پھر ہماری بدلی ہوئی عادتوں کو دیکھنے کے لیے ٹھہرتے کیوں نہیں ہیں مصطفین۔۔۔؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کچھ لوگوں کو مرنے کی اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے؟"

اب کی بار وہ بولی تو لہجہ ولفظ وحرف کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔مصطفین کو لگا اس نے خالہ کا ذکر کر کے کوئی غلطی کر دی ہے کہ وہ بے پناہ اُداس ہو گئی تھی۔

"تم رو رہی ہو؟ ایسے نہیں کرتے ایمان۔۔۔ پیارے جب یُوں کہیں بیچ راہ ہی چھوڑ کر چلے جائیں تو اتنا رو رو کر آنسوؤں سے ان کی روحوں کو تکلیف نہیں دیتے۔تب ان سے ہمارا فقط اک دعا کا تعلق رہ جاتا ہے اور بس اسی کو عمدگی سے نبھاتے ہیں۔چلو آنسو پونچھو شاباش اور بتاؤ کہ صبح صبح، دبے پاؤں یہ بلیوں کی طرح کیوں گھوم رہی ہو؟"

نرمی سے سمجھاتے ہوئے آخرش اس نے ہلکے پھلکے لہجہ میں اس کی صبح صبح یہاں آمد کی بابت پوچھا تو اس کے اخروی لفظوں پر وہ روتے روتے بھی ہنس دی تھی۔اِس بے ساختگی پر اُس کی آنکھوں کا پانی چھلک کر گالوں پر بہہ گیا تھا۔

"میں دیکھنے آئی تھی کہ تم اگر جاگے ہو تو ناشتے کا پوچھ آؤں اور پھر مجھے وہ کہانی بھی چاہیئے تمہاری۔تم نے راستے میں بتایا تھا ناں کہ تم کوئی ناول لکھ رہے ہو؟ آج کا دن فراغت میسر ہے تو سوچا اسے ہی پڑھ ڈالوں۔۔۔اور پھر تمہاری پہلی قاریہ ہونے کا اعزاز بھی تو پانا ہے۔ہاں انکار کی جرات تو بالکل مت کرنا کیونکہ مجھے وہ کہانی چاہیئے ہی چاہیئے۔"

اس کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتی، اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے وہ بالکل پرانی ہٹ پر رہ کر بولی تو مصطفین کو بہت خوشگواری کا احساس ہوا۔

"ہاں ناشتہ ابھی لے آؤ اور کہانی اندر میز پر رکھی ہے۔گو کہ ابھی ادھوری ہے لیکن امید ہے تمہیں پسند آئے گی۔"

بنا توقف اس نے اسے اپنی کہانی پڑھنے کی اجازت دے دی تو بھرپور مان واستحقاق سے اسے دیکھتی ہوئی وہ واپس کمرے کی جانب مڑ گئی تھی۔

" مجھے یقین تھا تم مجھے انکار نہیں کرو گے۔ بہت شکریہ۔ ناشتہ تھوڑی دیر میں تیار ہو جائے گا تم نیچے آ جانا۔" ہاتھ جھلا جھلا کر بہت جوش سے کہتی وہ کمرے میں گھس گئی تو واپس بازار کی رونقیں تاکتا وہ پورے دل سے مُسکرا دیا تھا۔

اس کے بعد وہ اسے ناشتے کی میز پر ملی یا پورے دن میں صرف دوپہر کے کھانے کے وقت دوبارہ نظر آئی۔ اپنے کمرے میں مقید ہو کر اس کا ناول پڑھتے ہوئے وہ جیسے اس کی گھر میں موجودگی بھی بھول گئی تھی۔ وہ بھی دوپہر کے کھانے کے بعد گھر سے نکلا اور باقی سارا دن اندرون لاہور کی مختلف گلیوں میں بے مقصد گشت کی نذر کرتے ہوئے اذانِ مغربین کے بعد ہی گھر آیا۔ گھر آ کر رات کے کھانے کے دوران خالو ظفر سے تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی میں کھڑا نیچے اندھیرے میں ڈوبی تنگ گلی میں جھانکتا ہوا وہ کل ثومیہ شاہجہاں سے متوقع ملاقات کے متعلق سوچ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے ایمان اندر داخل ہوئی۔

" یہ لو چائے۔۔۔ اور یہ رہی تمہاری کہانی۔۔۔ میں نے پڑھ بھی لی ہے۔"

چائے کے ساتھ ساتھ اس نے بغل میں دبا کاغذوں کا پلندہ نکال کر اسے بھی میز پر رکھ دیا تھا۔

" بہت شکریہ اور اتنی جلدی پڑھ بھی لی؟ واہ۔۔۔ خیر کیسی لگی ہے؟ تمہاری سنجیدگی سے لگتا ہے خاص پسند نہیں آئی۔"

جواباً کہتے ہوئے وہ پلنگ کے گرد گھوم کر آیا اور چائے پکڑ کر واپس وہیں کھڑکی میں رکتے ہوئے رخ اس کی جانب کر لیا۔

" نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ سچ کہوں تو کہانی مجھے بہت پسند آئی۔ اور پھر اس میں میرا بھی تو اک کردار ہے۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ اپنی زیست کہانی میں مجھے جگہ دی ہے۔ ہاں خود سے ہٹ کر باقی سب کرداروں کی بھی بات کروں تو درحقیقت تم نے عشق وجو سے لبریز، راس رنگ سی اس کہانی کو امر کر دیا ہے اے عظیم مصنف۔۔۔ لکھا درد ہے پر میٹھا کر کے۔۔۔ کرب کو کیف میں بھر دیا ہے۔"

ہولے سے مُسکرا کر اسے بھرپور داد سے نوازتی وہ میز کے گرد دھری کرسی کھینچ کر بیٹھ بھی گئی تو مصطفین کو لگا وہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرنا چاہتی ہے۔

" ہمم۔۔۔ بہت اچھا لگا یہ جان کر کہ میرے آڑھے ترچھے اور آدھے ادھورے سے لفظ تمہیں اس قدر من بھائے

ہیں۔خیر یہ بتاؤ اس ناول کا نام کیا ہونا چاہئیے ؟" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے اس سے مشورہ طلب کیا تو وہ ہوا میں سوچنے کے سے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔

" یہ ناولز کا نام طے کرنے کا معیار کیا ہوتا ہے؟"

تھوڑی دیر سوچ کر بھی کچھ نہیں سوجھا تو وہ اسی سے سوال کرنے لگی۔

" کسی بھی ناول کا نام ایسا ہونا چاہئیے کہ سیدھے سبھاؤ ناول کی کہانی یا موضوع نہ عیاں کرتا ہوا سا ہو۔یعنی عنوان ایسا ہو کہ قاری کے ہاتھ براہ راست " نتیجہ " نہ پکڑا دے۔پھر ایسا بھی ضرور ہونا چاہئیے کہ کل کہانی کا احاطہ کرے۔ مطلب نام میں ہی موضوع و کہانی " پنہاں " ہونی چاہئیے۔ہاں اسے بہت منفرد لفظ وحرف میں بھی ہونا چاہئیے تا کہ اچھوتا لگے،نئے پن کا احساس دلائے اور شوق و تجسس بھی ابھارتا ہوا سا ہو۔"

ٹھہر ٹھہر کر حرف حرف سمجھا تا وہ پھر سے چائے پینے لگا تو انہی معیارات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایمان نے پھر سے سوچنا شروع کیا۔

"عشقِ آبگیں ۔۔۔ یہ نام ہونا چاہئیے تمہارے ناول کا۔گوشہ گوشہ،قریہ قریہ اور منظر منظر نیر سلاسل ہو چکی تمہاری اس کہانی پر اگر کوئی دوسرا نام جچتا ہے تو وہ "عشقِ آبگیں " ہی ہیں۔کیا کہتے ہو؟"

بالآخر اس کی کہانی کے لیے اک خوب صورت نام تجویز کرتے ہوئے اس نے ابرو اچکا کر اس کی رائے چاہی تو مبہم سا مُسکراتے ہوئے اس نے مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

" بالکل ٹھیک ۔۔۔ میں تم سے متفق ہوں۔"

اس کی جواب پر وہ جیسے بہت خوش ہو کر بولی۔

" اور اس کا انتساب ۔۔۔ وہ کیا لکھو گے مصطفین ؟ اس قدر عمدہ اور کمال و دلبر ناول کا انتساب بھی بہت شاندار سا ہونا چاہئیے ۔ہاں ۔۔۔؟"

اب کی بار اسی کی طرح کمرے کی چھت کو گھورتے ہوئے اس نے فقط چند لمحات کے لیے سوچا اور پھر بہت عقیدت مندی میں ڈھل کر بولا۔

" میرے لفظوں کی ہر ایک " عمدگی، کمال تری اور دلبری ۔۔۔" صرف و فقط معروف مصنفہ عشنا کوثر سردار کے نام۔میری استاد بھی ہیں اور محسنہ بھی۔میرے پہلے ناول " عشقِ آبگیں " کا اک ایک لفظ وحرف اور ہر جذبہ و کیفیت

بھی۔۔۔صرف وفقط اُنہی کے نام۔"

جواباً ایمان پورے دل سے ہنس دی تھی۔

"تم بڑی شاعرانہ سی نثر لکھتے ہو مصطفین۔۔۔اردو ادب میں ایسی نثر پہلے کہیں نہیں پڑھی۔"

اِس بات سے اُس نے جیسے اسے مزید گفتگو کے لیے کوئی تمہید فراہم کر دی تھی۔

"دراصل اردو ادب میں شخصیت پرستی بہت ہے۔ یہاں کچھ لوگوں کے قد ان کے کام سے بہت اونچے ہیں۔ بلکہ کچھ قلمکاروں کی نثر پڑھیں تو لگتا ہے کہ وہ نثر لکھتے نہیں ہیں بلکہ یہ نثر ان سے "سرزد" ہوتی ہے۔لیکن صد حیف کہ پھر مکھن مار قسم کے بہت سے ناقدین و مبصرین کی طرف سے ایسی ناقص و کمتر نثر کو بھی "پارہ" لکھا جاتا ہے۔۔۔شاہکار پکارا جاتا ہے۔" وہ بولا تو اس بار اس کا لہجہ انتہائی تلخ تھا لیکن اپنے مطالعہ کی بنیاد پر ایمان کو یقین تھا وہ بالکل درست تجزیہ پیش کر رہا ہے۔

"بالکل ایسا ہی ہے۔میں تم سے متفق ہوں۔لیکن مجھے امید ہے کہ تمہارا کام شائع ہوگا تو لوگوں کے اذہان بدلیں گے۔تمہیں تمہاری طرز کے قارئین لازمی میسر آئیں گے۔تمہارا کام ایسا ہے کہ اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کی تائید میں کہتی وہ بھرپور یقین سے بولی تھی کہ جانے کیوں وہ بہت تلخی سے ہنسا تھا۔

"نئے موضوعات تلاشنا اور پھر ایک دلچسپ کہانی تشکیل دیتے ہوئے مہارت سے انہیں پیش بھی کرنا۔۔۔مشکل ترین امر ہے۔لیکن پھر قارئین کو اس بات پر قائل کرنا کہ وہ کچھ نیا پڑھیں؛ انتہائی جوکھم اٹھانے جیسا کام ہوتا ہے۔اردو ادب کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں لکھاری یکسانیت کا شکار ہے تو قاری بھی یکسانیت پرست ہے۔ستم یہ ہے کہ وہ ایک سی لکیریں اور خطوط ہیں۔۔۔جو سبھی پیٹ رہے ہیں اور بالائے ستم یہ ہے کہ مُسلسل پیٹ رہے ہیں۔"

اب کی بار ایک لحظہ کے لیے ایمان لبوں کو بھینچ کر رہ گئی تھی۔وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن سوائے تسلی کے کچھ حروف پھونکنے کے اس کے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا۔۔۔اور یہی اس نے کیا تھا کہ تسلی کے چند حروف پھونکتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ بھی گئی تھی۔

"اچھا چلو چھوڑو ناں۔۔۔ابھی سے کیوں مایوس ہو رہے ہو؟ ان شاءاللہ سب بہترین ہوگا۔میرا دل کہتا ہے تم اس شعبے میں بہت نام کماؤ گے اور دیکھنا تم۔۔۔تم لازمی کماؤ گے۔میں اب چلتی ہوں۔بائے۔"

اسے دروازے کی طرف رخ کرتے دیکھ کر مصطفین نے جلدی جلدی چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور خالی کپ اس

کی جانب بڑھایا تھا۔

"او کے بائے۔۔۔خدا حافظ۔اور یہ کپ واپس لیتی جاؤ۔"

اس نے بھی جیسے گفتگو کو یہیں تمام کر دیا تھا۔

اس سے اگلا دن بہت نتیجہ خیز ثابت ہوا تھا کیونکہ ہر سرے سے سمٹ کر اس کہانی کے سبھی کردار ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے تھے۔مصطفین پاگل خانہ جانے کے لیے گھر سے نکلا تو ایمان بھی ساتھ ہو لی کہ اسے بھی ثومیہ شاہجہاں سے ملنا ہے۔

سفیر اور مریم جہانگیر ان دونوں سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے اور مرکزی دروازے کے سامنے واقع چوڑی شاہراہ پر یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے انہی کے منتظر تھے۔انہیں قریب آتے دیکھا تو مریم تیزی سے مصطفین کی طرف آئی تھی۔

"تم پاگل ہو گیا؟ ایسے غائب ہوتے ہیں کہ کوئی نشاں تک نہ ملے؟"

بے تکلفی سے اس کے شانے پر ایک زوردار مکا جڑتی وہ نہایت خفگی سے بولی تو ان دونوں کی دوستی کی نوعیت سمجھ کر ساتھ کھڑی ایمان خوشدلی سے ہنس دی۔

"بس تمہاری انہی اداؤں سے ڈر کر بھاگا تھا کہ تم مارتی بہت ہو اور پھر کہیں بھی مار لیتی ہو۔اور پھر یہ بھی نہیں دیکھتیں کہ ساتھ کوئی ہے یا نہیں۔۔۔"

جواباً اس سے ہاتھ ملاتا وہ نہایت خوشگواری سے بولا تو ساری خفگی بھول کر مریم بے ساختہ مُسکرانے لگی۔

"بکواس مت کرو۔۔۔"

اسے گھور کر کہتی وہ ایمان سے گلے لگ گئی اور بنا توقف دوبارہ بولی۔

"تم اس سے کہیں زیادہ پیاری ہو ایمان جتنی کہ سفیر ابھی بتا رہا تھا۔"

اس کی بات سے ان پر آشکار ہوا کہ ان کی آمد سے قبل سفیر اس کا تعارف کروا چکا ہے۔

"بہت شکریہ سہیلی۔۔۔تم بھی خوب صورت ہو اور مجھے تو بہت اچھی بھی لگیں کہ ان جیسے بگڑے ہوئے لڑکوں کی پٹائی شٹائی بھی کر لیتی ہو۔"

شریر لہجے میں کہتے ہوئے ایمان بہت محبت سے اس سے جدا ہوئی اور بگڑے ہوئے لڑکوں کی مد میں مصطفین اور سفیر دونوں کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔بس میں ایسی ہی ہوں۔اور ابھی کے لیے سب جلدی چلو شاباش اوپر نمرہ انتظار کر رہی ہے۔ہم نے

ثومیہ کو بتادیا ہے کہ تم دونوں آرہے ہو۔اور دوسری اہم خبر یہ بھی ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد ان کے بابا بھی ثومیہ کو یہاں سے لے جانے کے لیے آرہے ہیں۔لیکن وہ پورے دل سے گھر جانے پر رضامند نہیں ہے۔ہو سکے تو اسے اس پر بھی راضی کرنا۔آؤ اب جلدی کرو۔"

ایمان کو ہنس کر جواب دیتی وہ بنا رکے بتدریج سنجیدگی اختیار کرتی انہیں تفصیلات سے بھی آگاہ کرتی گئی تو اس کا حرف حرف سمجھتے ہوئے وہ دونوں اثبات میں سر ہلا کر،اس کی معیت میں وارڈ کی جانب چل دیئے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سب اوپری منزل کی اسی کشادہ و طویل راہداری میں داخل ہوئے کہ جس کے آخری سرے پر ثومیہ شاہجہاں کا کمرہ تھا۔

"تم لوگ یہیں انتظار کرو۔ہم اسے لے کر آتی ہیں۔"

انہیں ایک جگہ رکنے کا کہتی مریم،چپ چاپ ساتھ چلتی ایمان کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئی تو وہ دونوں وہیں اس مقام پر جیسے جم سے گئے تھے۔ایک دوسرے کو دیکھنے تک سے کتراتے وہ دونوں مریم کے جانے کی سمت نگاہیں کر کے بس اس کی واپسی کے منتظر تھے۔۔اور ان کا یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا کیونکہ اگلے ہی پل ثومیہ کا ہاتھ تھام کر مریم جیسے اسے کھینچ کر کمرے سے باہر لائی اور ان کی جانب رخ کر کے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔نمرہ اور ایمان بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکلی تھیں۔ان دونوں کے چہروں پر بھی اس منظر کی دید کی چاہ مچل رہی تھی۔

اب صورتحال یوں تھی کہ ایک طویل مدت کے بعد اس کہانی کے وہ سب مرکزی کردار باہم آمنے سامنے تھے اور آس پاس سرسراتی ہوئی ہواؤں کے سنگ گویا کائنات بھر کی حرکات رک سی گئی تھیں۔انہیں ایک ساتھ دیکھا تو قدم قدم ان کی جانب آتی ثومیہ شاہجہاں کی خواب خواب آنکھوں سے سارے خواب "بہنے" سے لگے۔

ہلتے ہوئے شانوں سنگ،سسکیوں میں روتی ہوئی وہ یوں ضبط و اختیار کھو رہی تھی کہ جیسے ابھی گرے گی اور گر کر مر بھی جائے گی۔اور اگلے ہی لمحے ایک ردھم و تواتر سے مُسلسل ان کی جانب بڑھتی وہ قدرے مسافت پر ایسے ٹھہر گئی کہ جیسے ایک قدم بھی آگے بڑھنے سے اس خواب سے منظر کے بکھر جانے کا خدشہ ہو۔اور اس کے اس طرح سے رک جانے پر ایک ساتھ اپنی جگہ سے چھوٹتے وہ دونوں اس کی طرف اس تیزی و شدت سے بڑھے کہ جیسے ایک پل بھی مزید قیام کیا تو یہیں پتھر کے ہو جائیں گے۔

"کیسی ہو ثومیہ۔۔۔؟یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟"

اس کے بالکل سامنے اور بہت پاس رک کر مصطفین نے اس بے قراری سے پوچھا کہ ثومیہ کے گالوں پر بہتے ہوئے پانیوں میں مزید روانی آ گئی تھی۔ بنا کچھ کہے اس نے اس کی سوالیہ آنکھوں میں یوں جھانکا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو کہ۔۔۔"خود ہی دیکھ لو مصطفین کہ تم سے بچھڑ کر میں کس کس حال کی ہو گئی ہوں۔"

اور اس کی آنکھوں کے اک ایک مفہوم کو عین عین سمجھتے مصطفین نے بے ساختہ ہی بہت شکوہ کناں آنکھوں سے سفیر احمد کی طرف دیکھا تھا۔

"تمہارے پاس میں اِسے اِس حال میں چھوڑ کر تو نہیں گیا تھا سفیر۔۔۔تم سے بس ایک اِس کی حفاظت نہ ہو سکی؟"

نا چاہتے ہوئے بھی اس پل اس کے لبوں سے یہ ذکر پھوٹ پڑا تو پہلے سے بہت شرمندہ سفیر مزید شرمسار ہو گیا اور نظریں جھکا کر بولا۔

"میں تم دونوں کا مجرم ہوں یار کہ یونیورسٹی کے آخری دن میں تم دونوں جیسا عالی ظرف نہیں بن سکا تھا۔ مجھے احساس ہے کہ حق دوستی کو استعمال کر کے میں نے خود کو اور اپنے فیصلوں کو بھی بارہا تم دونوں پر مسلط کرنا چاہا تھا۔ تم دونوں کو دغا باز کہتے ہوئے یہ محسوس ہی نہیں کر سکا کہ اصل جفا تو ہر اُس عہد سے میں کر رہا ہوں کہ جو بھی ابتدائے دوستی میں ہم نے باہم کیا تھا۔ میں نے تم دونوں کو جدا کیا اور اب میں ہی تمہیں ملوا بھی رہا ہوں۔ بس میں جا رہا ہوں واپس اور نہیں بتانا چاہتا کہ اس پورے سفر میں رائگانی کے کتنے سارے پل صرف میرے حصے میں آئے ہیں۔ ہاں کہیں زندگی کے خوشگوار لمحوں میں کبھی میری یاد آ جائے اور مجھے معاف کرنے کا حوصلہ بھی پاؤ تو میرے پاس چلے آنا۔ مجھے ہمیشہ تم دونوں کا انتظار رہے گا۔ الوداع۔۔۔"

بنا کسی توقف اپنے دل میں جانے کب سے پنپتا اک ایک خیال ان کے سامنے الٹ کر، آخرش الوداع کہتا وہ پلٹ بھی گیا تو پورے دھیان سے اس کا حرف حرف سنتے وہ دونوں بہت تڑپ کر ایک دوسرے کو تاکنے لگے۔ اُسے جاتے دیکھ کر ایمان بھی تیزی سے بڑھی اور بھاگ کر اِن دونوں کے بالکل ساتھ سے گزرتی ہوئی مُسلسل دور ہوتے سفیر کے پاس جا پہنچی۔

"رکو سفیر۔۔۔ان کا فیصلہ تو تم کر آئے ہو۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے کہ میرے حصے میں اب کیا آیا؟ تمہاری ہی طرح رائگانی کے ان سارے پلوں میں سے کچھ میں بھی سمیٹ لوں یا میرے بخت میں اپنی ہاں سے تم کوئی خوشی رکھ دو گے؟"

اس دیوتا کی ہمراہی میں چلتے ہوئے رخ بدل بدل کر اس کا چہرہ تاکتی وہ پھر سے وہی پہلے کی سی داسی ہو گئی تھی۔

یُوں اس کے ساتھ ساتھ چل کر لگاتار التجائیں کرتے ہوئے ایک پل کو تو اسے بھی لگا کہ اُس کے بخت میں بھی فقط یہ رائگاں مُسافت ہے۔

لیکن دوسرے ہی پل اسے بے طرح سے چونکنا پڑا کہ اپنی ہی دھن میں مُسلسل آگے بڑھتا سفیر اس کی التجاؤں پر بہت تڑپ کر رکا اور ایک جھٹکے سے اسے دونوں بازوؤں سے دبوچتے ہوئے خود سے بہت قریب کر کے بولا۔

" تمہیں کیوں لگتا ہے ایمان کہ تمہارا یہ عشقیہ جادو اب بھی میرے سر پہ نہیں چڑھا ہو گا کہ جب میری ہر خطا کے ساتھ تم نے مجھے بے شمار چاہا ہے؟"

سوالیہ آنکھوں سے اس کے متوحش نینوں میں تاکتا وہ بڑے جذبہ و یورش سے بولا تھا کہ اس غیر متوقع اور انتہائی پر جوش اظہار پر ایمان کا دل سینے میں یُوں دھڑکنے لگا جیسے ساری حدیں پھلانگ کر یہیں باہر آن گرے گا۔اور اس کے کسمسانے پر اسی پل اسے چھوڑتا وہ بہت محبت سے مزید بولا تھا۔

" جاؤ کہہ دو اپنے اس بے قرار من سے کہ تمہیں دیکھ کر فقط یہ دل ہی کیا، میرے آس پاس سرسراتی سب ہوائیں دھڑک اٹھتی ہیں۔" اپنے سینہ و دل پر ہاتھ رکھتا وہ جیسے اس کے دل کو بھی تھپک رہا تھا اور اس واضح تر اظہار و اقرار پر حیرت در حیرت اسے تاکتی وہ جیسے یقین کرنے سے قاصر تھی۔

تو بادشاہی مسجد لاہور کی راہداریوں میں ملے اس اپسرا و دیوتا کی کہانی یُوں پاگل خانہ لاہور کی راہداریوں میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔

اِدھر یہ دونوں آپسی معاملات سلجھانے میں مگن تھے اور اُدھر بغور اِس منظر کا مشاہدہ کر کے، تمام تر جزئیات کو بخوبی سمجھتی ہوئی ثومیہ شاہجہاں نے مصطفین شجاع کو مخاطب کیا تھا۔

"اس کی غلطی بس یہ تھی مصطفین کہ اپنے غصہ کی بدولت وہ بس وقتی طور پر ہم سے بدظن ہو گیا تھا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اپنی غلطی کا ادراک کر کے پھر اس نے تمہیں ڈھونڈنے کے لیے اک عالم کھنگالا ہے۔ مجھے لگتا ہے ہمیں اسے معاف کر دینا چاہیئے۔ یقین کرو کہ میرے بیمار ہونے یا اِدھر داخلے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ ہمارا دوست ہے مصطفین۔۔۔ہم اپنی زندگی سے اُسے یُوں کیسے نکال سکتے ہیں؟"

اس کے لیے عذر و وضاحت پیش کرتی وہ سراپا سوال ہو گئی تو مصطفین نے بہت بے بسی سے دور اب تلک ایمان کے ساتھ مصروفِ گُفتگو سفیر احمد کی طرف دیکھا تھا۔ثومیہ کو لگا کہ اس کی بات ماننے میں وہ کسی تامل کا شکار ہے تو اک

پرانے خیال میں کھو کر وہ مزید بولی تھی۔
"ہم دونوں کا ملن یونہی ممکن تھا مصطفین۔۔۔تم مان جاؤ کہ اس کہانی کے سارے واقعات بدلنے کے لیے ہم سب کا بچھڑنا بہت ضروری تھا۔"
اب کی بار مصطفین نے ایک جھٹکے سے اس کی انگارہ تر آنکھوں میں جھانکا تھا۔تو اسے بچھڑنے سے اس کا کہا ہوا، اک ایک لفظ و حرف عین عین یاد تھا۔
"اس کہانی کے سارے واقعات بدل کر بھی۔۔۔میرا تم سے ملنا بنتا ہی نہیں۔"
اسے یاد آیا کہ کیسے اس کی زخمی کلائی پر اپنا رومال لپیٹتے ہوئے اس نے بہت اذیت سے یہ جملہ ادا کیا تھا۔لیکن فوراً ہی اُسے اپنے اِس خیال سے باہر لوٹنا پڑا۔
"آؤ جلدی۔۔۔دیکھو وہ جا رہا ہے مصطفین۔۔۔ہمیں اسے روکنا ہوگا۔"
اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی وہ اس طویل راہداری میں پھر سے آگے بڑھ چکے سفیر اور ایمان کی جانب چلی تو چند قدم بعد ہی اس سے بھی آگے نکلتے ہوئے اس نے انہیں زینوں سے ذرا پہلے جا لیا تھا۔انہیں یہاں جمع ہوتے دیکھا تو اُدھر اب تک کمرے کی دروازے پر کھڑی نمرہ اور مریم بھی قدم قدم انہی کی جانب چلنے لگی تھیں۔
"او ہیلو۔۔۔رکو یہیں۔۔۔"
اس کی آواز پر ایمان سے کچھ کہتا سفیر بہت بے یقینی سے مڑا تھا۔
"تم کیا سمجھے تھے کہ ہیرو بن کر یہاں ایک دو جملے مارو گے اور منظر لوٹ کر نکل لو گے؟ ہرگز نہیں۔۔۔تم ہی اس کہانی کا مرکزی کردار ہو۔تو ہمیشہ کے لیے یہیں ہم سب کے ساتھ ٹھہرو ناں۔۔۔"
دونوں بازو وا کرتے ہوئے اس نے بہت سے پرانے حوالہ جات دے کر کہا تو فقط ایک پل کو رک کر جواباً کچھ بھی کہے بنا وہ اس کے چوڑے سینے سے یوں آن لگا جیسے کوئی بنجارہ کسی سنگلاخ دیوار سے اپنا سر پھوڑتا ہو۔اب صورتحال یوں تھی کہ ثومیہ اور ایمان روتی ہوئی آنکھوں سے یاروں کی اس یاری کا نیا آغاز دیکھ رہی تھیں اور ایک دوسرے کو گلے لگا کر زور زور سے بھینچتے ہوئے وہ دونوں باہم ایسے لپٹ رہے تھے جیسے اسی عالم میں صدیاں گذار دیں گے۔
"کہا تھا ناں۔۔۔میں ہر وہ ضد ہار دوں گا جو تمہیں مجھ سے دور کرے۔جاؤ تمہیں ثومیہ شاہجہاں مبارک۔" ہنستے روتے لفظوں میں یونہی لپٹے رہ کر سفیر نے کوئی پرانا ذکر دہرایا تھا کہ بے ساختہ مصطفین کی بھی آنکھیں برس پڑیں۔

"تو ہر بار دل جیت لیتا ہے یار۔تو ہمیشہ روح کھینچ لیتا ہے۔"

جواباً کہتے ہوئے اس نے ایک پل کے لیے الگ ہو کر اس کا حسین چہرہ دیکھا اور پھر سے گلے لگا لیا۔اور اس کہانی کو یُوں تکمیل پاتے دیکھ کر کب سے خاموش کھڑی نمرہ آہستگی سے مریم کی طرف جھکی تھی۔

"اس کہانی میں اتنے ٹوسٹ ہیں۔۔۔؟ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں تھا مریم آپی۔ میں بس یہ سوچ رہی ہوں کہ ان دونوں میں سے زیادہ ہینڈسم کون سا ہے؟"

اس کے شریر لہجے پر مریم بے ساختگی سے ہنس دی اور لبوں پر انگلی رکھ کر اسے "خاموش رہو۔۔" کہتی ہوئی آگے بڑھ کر ثومیہ شاہجہاں کے گلے لگ گئی۔

"تمہارے بابا آ گئے ہیں ثومیہ۔۔۔ پلیز ان کے ساتھ اب گھر چلی جانا۔تمہاری زندگی سے متعلق اب کوئی بھی فیصلہ ہوا وہ تم سے پوچھ کر ہی کریں گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

بہت محبت سے اس کی کمر تھپکتے ہوئے اس نے اسے خود سے الگ کر کے زینوں کی جانب اشارہ کیا تو ایک دوسرے سے الگ ہو کر اپنی جذباتیت پر بمشکل قابو پاتے سفیر اور مصطفین بھی اسی طرف متوجہ ہوئے کہ جہاں ایک ایک زینہ چڑھتے شاہجہان عادل اور شائستہ بیگم بھی اس منظر کا حصہ ہو گئے تھے۔اور اگلا ہی پل انہیں مزید حیرانی سے دوچار کر گیا کہ کسی سے کوئی ایک بھی لفظ کہے سنے بغیر ثومیہ بہت بے قرار ہو کر بھاگی اور یہ کہتے ہوئے اپنے بابا کے سینے سے جا لگی۔

"بابا۔۔۔میرے پیارے بابا۔"

اِدھر شاہجہان عادل نے بھی بہت شفقت و محبت سے اپنی بیٹی کے سر پر بوسے دینے شروع کیے تھے اور اُدھر بھیگی بھیگی آنکھوں سے نمی جھٹکتے ہوئے وہ سب بہت دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگے۔ان سب کی باہمی دوستی کا یہ انجام انتہائی خوشگوار تھا کہ روتے روتے وہ سب کردار اب پورے دل سے مُسکرانے لگے تھے۔

دعا کرو کہ ہر زیست کہانی میں بوقتِ انجام، لبوں پر جاگ اٹھنے والی مُسکراہٹیں اتنی وارفتہ اور بھرپور ہوں کہ "نیر سلاسل" ہو چکی آنکھوں کو لبوں کی اس چٹک سے بے ساختہ قرار آئے۔ آمین۔۔۔ثم آمین۔

......ختم شد......